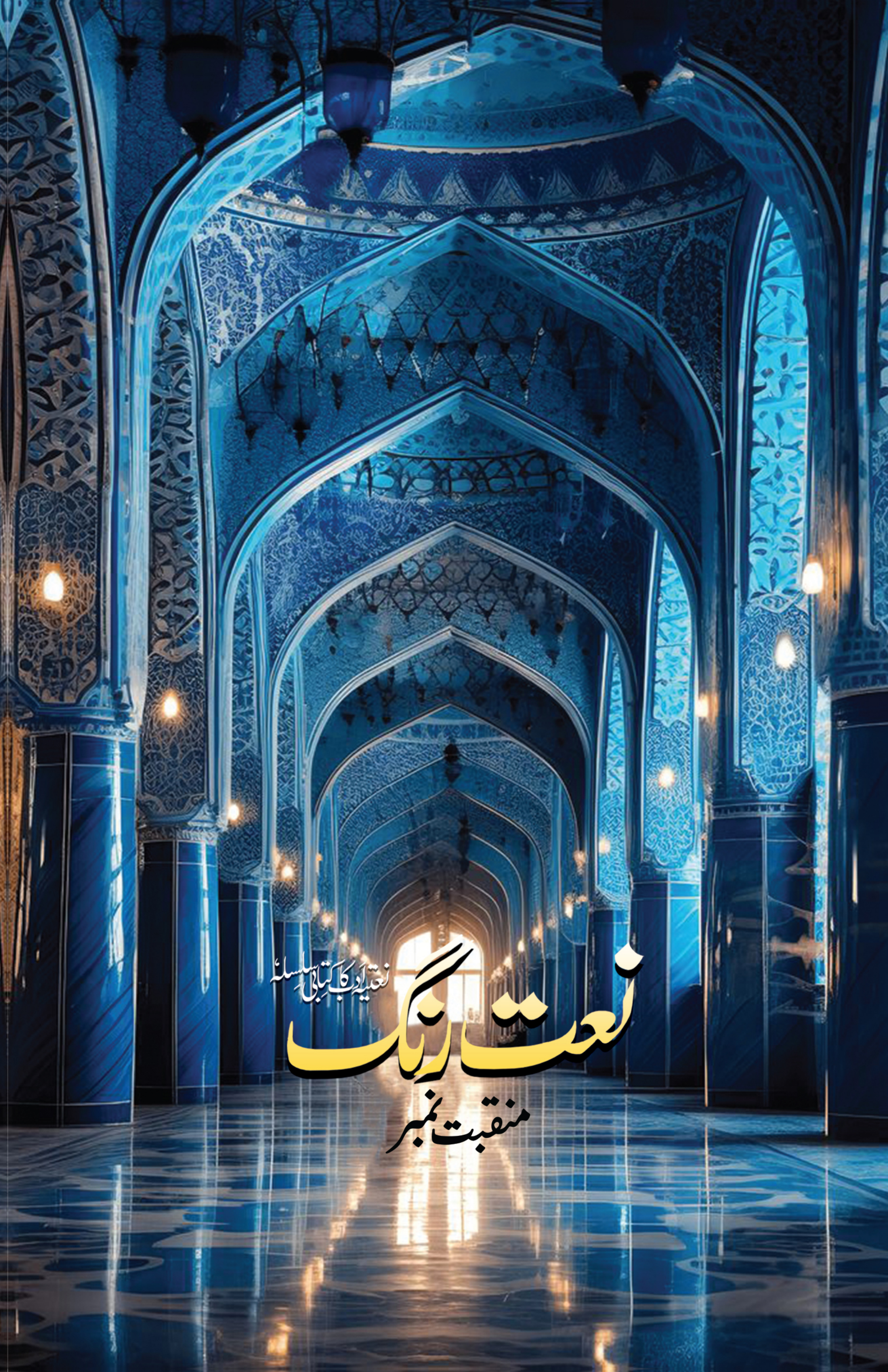

نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ
نعت رنگ
منقبت نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعت رنگ

نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ

نعتیہ ادب کا علمی تحقیقی و تنقیدی کتابی سلسلہ

شمارہ ۳۳ اگست ۲۰۲۵ء

منقبت نمبر

مرتب
سید صبیح الدین رحمانی



سرورق:
تصویر مزارِ شریف افغانستان

نعت رنگ
میں شامل تمام مقالات متعلقہ
ماہرین کی رائے اور منظوری کے
بعد شامل کیے گئے ہیں
مقالہ نگاروں کی آرا سے
مجلسِ ادارت
کا متفق ہونا ضروری نہیں

ریسرچ سینٹر

برائے رابطہ
بی ۳۰۶ بلاک ۱۴ گلستان جوہر کراچی
پاکستان

B-306 Block 14
Gulistan-e-Johar
Karachi - Pakistan
0332-2668266
Email: sabeehrehmani@gmail.com
www.sabih-rehmani.com

قیمت: -/1300 روپے | $ 20 انٹرنیشنل

بندۂ پروردگارم اُمّتِ احمد ﷺ نبی
دوست دارِ چار یارم ؓ تابع اولادِ علی ؓ
مذہب حنفیہ دارم ملّتِ حضرت خلیل ؑ
خاکِ پائے غوثِ اعظم ؓ زیرِ سایہ ہر ولی

انتساب

صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت ابوذر غِفّاری رضی اللہ عنہ

کے نام

صدیقؓ عکسِ حسنِ کمالِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
فاروقؓ ظلِ جاہ و جلالِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
عثمانؓ ضیاءِ شمع جمالِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
حیدرؓ بہارِ باغِ خصالِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است

دھنک

حمد باری تعالیٰ

فرش سے عرش تک ہے سب تیرا
واقعہ : وہم، حق : سبب ترا

قبل تخلیق خامشی تیری
بعد تخلیق ہر شغب تیرا

گیت، غزلیں، فسانے پائیں وجود
سازِ کُن نغمہ زن ہو جب تیرا

نفی و اثبات و خیر و شر یعنی
ہے تماشائے روز و شب تیرا

سحرِ وسواس میں یقیں روشن
سنگ میں نور مضطرب تیرا

تیرے عثماںؓ، علیؓ، عمرؓ، بوبکرؓ
ان میں شفقت تری، غضب تیرا

تُو سنے ہے شکایتیں بھی مگر
روکتا ہے مجھے ادب تیرا

(سلیم شہزاد)

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جس شخص کا ثانی ہے نہ ہمسر وہ محمد ﷺ
جو شخص ہے ہر شخص سے برتر وہ محمد ﷺ

جس شخص کے فاروقؓ نے پاپوش اُٹھائے
جس شخص کا صدیقؓ ہے نوکر وہ محمد ﷺ

جو شخص ہے صدیقؓ کے شانوں پہ بہ صد شان
جس شخص کے شانوں پہ ہے حیدرؓ وہ محمد ﷺ

جس شخص کی مرہون ہے عثماںؓ کی طہارت
جس شخص کا حیدرؓ ہے برادر وہ محمد ﷺ

جس شخص کے اصحابؓ نے اک دھوم مچا دی
جس شخص کا پیغام ہے گھر گھر وہ محمد ﷺ

(فائق تُرابی)

ابتدائیہ

سید صبیح الدین رحمانی

منقبت گوئی بھی نعت کی طرح ایک موضوعاتی صنف ہے۔ اردو کے ابتدائی ادوار ہی سے یہ صنف ہمیں ہیئتی تنوع کے ساتھ شعری سرمائے کا حصہ نظر آتی ہے۔ نعت کی ترویج، تفہیم، تعبیر اور تجزیہ و تنقید تو نعت رنگ کا بنیادی سروکار رہے، لیکن دوسری تقدیسی اصناف کو بھی نعت رنگ کے اشاعتی سلسلے میں خصوصی اہمیت دی گئی ہے، بلکہ شمارہ نمبر سات بہ طور ''حمد نمبر'' اگست ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس خصوصی اشاعت کو اہلِ علم نے حمد گوئی کی روایت، مبادیات، رجحانات اور مسائل و مباحث پر حوالہ جاتی دستاویز قرار دیا تھا۔ اب نعت رنگ کا منقبت نمبر پیشِ خدمت ہے۔ اس خاص نمبر کے حوالے سے گفتگو کے کئی ایک پہلو ہو سکتے ہیں جن کی بنیاد پر پورا ایک ڈسکورس قائم کیا جائے۔ زیرِ نظر شمارے میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں، اسی زاویۂ نظر سے کیے گئے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی علمی متن کے بارے میں اصل رائے وہی ہوتی ہے جو اس کا سنجیدہ قاری اپنے طور پر قائم کرتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ نعت رنگ کے قارئین یہ ذمہ داری نبھائیں۔

ادب و شعر کے ایک ادنیٰ قاری کی حیثیت سے اس نمبر کو مرتب کرتے ہوئے منقبت نگاری کے حوالے سے بعض توجہ طلب پہلوؤں پر مجھے ضرور غور و فکر کا موقع ملا جس کو پیش کرنے میں مجھے کوئی تأمل نہیں ہے۔ آج منقبت گوئی کے لیے صرف اظہارِ عقیدت کافی نہیں۔ فی زمانہ یہ تدبر صرف ادبی و فنی تقاضا ہی نہیں، بلکہ معاصر سماجی تناظر بھی اس کا متقاضی ہے۔ اصل میں آج نظریہ و مسلک کے فروغ کے لیے تقدیسی شاعری کو آلۂ کار بنانے کا رجحان ایک طرح کی فکری تخریب کاری کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ معاشرے کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی تخلیق کار کا ہر تیز رَو کے ساتھ تھوڑی دور تک چلنا، اس بات کا مظہر ہے کہ رہبری کی ضرورت اور رہبر کی پہچان کا قرینہ اب ہمارے یہاں سے تیزی سے اٹھتا جا رہا ہے۔

یہ سچ ہے کہ منقبت گوئی کا محرک شاعر کا جذبۂ عقیدت ہے، لیکن شاعر کو اپنا یہ منصب بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ ادبی اظہار صرف خود کلامی نہیں کہ اس کی آواز محض شاعر کی ذات تک محدود رہے، بلکہ ادبی اظہار تو شاعر کی عدم موجودگی میں بھی سنائی دیتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جو شخصیت موضوعِ منقبت ہو،

اس کے کردار و اوصاف کے پہلوؤں سے شاعر وہ حرارت حاصل کرے جو قاری کے لیے بھی قلب ماہیت کا ذریعہ بن سکے۔ یہاں دلوں کو پگھلا کر نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو سوزِ نفس درکار ہے، اس کا انحصار خود شاعر کی شخصی وابستگی پر ہے۔ جیسا کہ نعت گوئی میں اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ باقاعدہ نعت گو نہ کہلاتے ہوئے بھی ان کے ہاں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جذب و کیف کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ اظہارِ مناقب میں بھرپور شعریت بھی اسی وابستگی کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر اردو منقبت گوئی کے کثیر سرمائے پر نظر ڈالیے تو شدتِ احساس کی مثالیں کم کم اور مسلکی پرچار یا دفاعِ مسلک کا جذبہ زیادہ نظر آتا ہے۔ ایک حد تک تو یہ رویہ قابلِ فہم ہے کہ ہر مکتبِ فکر اپنی نمائندگی اور شناخت چاہتا ہے، لیکن ایک حد تک، اس سے سوا نہیں۔ اس لیے کہ شاعر صرف اپنے یا اجتماع کے جذبات کا عکاس ہی نہیں، فکر پرور بھی ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کے باطن میں جھانکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے داخل میں نمو پانے والے شعور و احساس کو معاشرے تک پہنچاتا بھی ہے۔ وہ اپنے قاری یا سامع کو اس سطح تک آنے کی دعوت دیتا ہے جسے اس کی بصیرت نے دریافت کر لیا ہو۔ اس عمل کو نعرے، وعظ یا تقریر سے ممیز رکھنا ہی شاعر کی ادبی ذمہ داری ہے۔

مذہبی شاعری میں امہات المومنینؓ، اہلِ بیتِ اطہار اور صحابہ کبارؓ کے ساتھ اولیائے کرامؒ و بزرگانِ دینؒ کے کرداروں کی تعلیمات عام ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت و حیات سے کیا اخذ کیا جانا چاہیے، یہ تقاضا محض رسمی ذکر سے پورا نہیں ہوسکتا۔ مناقب کے باقاعدہ مجموعوں کی بہ نسبت غزل اور نظم میں بعض شعرا کے استعاراتی و علامتی اسلوب نے فکر افروز معنویت پیدا کی ہے۔ شاعر کا انتخابِ موضوع کیا وقعت رکھتا ہے، یہ بات شعری سرمائے کی مقدار یا متواتر پیش کش سے واضح نہیں ہوتی۔ بلکہ شاعر کی بالیدہ فکر اور اس کا تاریخی شعور ایک آدھ اشارے سے کیوں کر ظاہر ہو جاتا ہے، اس کی چند مثالیں مختلف ادوار کی غزل کے اشعار میں دیکھی جاسکتی ہیں:

شیخ پڑے محرابِ حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو
سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں
(میر)

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
(محمد علی جوہر)

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

(اقبال)

جب شاعر کسی شخصیت اور اس کے کردار کا خصوصی اثر قبول کرتا ہے، تو یہ وابستگی اس کی شاعری میں سرایت کر جاتی ہے اور یہی انجذاب شاعر کی تخلیقی انفرادیت کا ایک رُخ قرار پاتا ہے۔ اقبال کے ہاں دلِ مرتضیٰؓ اور سوزِ صدیقؓ کی تمنا اسی وابستگی سے پھوٹتی ہے۔ وہ دلِ بیدار میں فاروقی و کرّاری صفات دیکھتے اور اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ مردِ فقیر دارا و سکندر سے اولیٰ ہے جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی موجود ہے۔ حسین علیہ السلام کا کردار اقبال کے ہاں کیسا جاں افروز استعارہ ہے:

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ان اشعار پر غور کیجیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بات کسی ایک کردار تک محدود نہیں، بلکہ عظیم اسلامی تاریخ کا پورا منظرنامہ اقبال کی فکر اور شعر و سخن کے تار و پود میں سمایا ہوا ہے اور اس امر کا غماز ہے کہ ان کرداروں میں صدق و اطاعت کا مشترک جوہر ہے جس کی پیروی اور عہد در عہد ابلاغ ہی درحقیقت محبت اور منقبت کی بنیاد ہے۔ منقبت گوئی کے اس اہم تر اور اوّلین تقاضے کا شعور بروئے کار نہ لایا جائے تو ان شخصیات سے عقیدت و محبت کا نہ صرف حق ادا نہیں ہوتا بلکہ اس صنفِ شعر کے فنی لوازم بھی پورے نہیں ہوتے۔ عہدِ حاضر میں بھی بعض شعرا کی غزل میں یہ جدت مستقل نظر آتی ہے۔ منقبتی یا تقدیسی شاعری سے ہٹ کر بھی غزلوں میں اس فکری عنصر کی حد درجہ پیوستگی اس وابستگی کے باعث ہے جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا۔ مثال کے طور پہ محسن نقوی کی غزلوں کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سانس لیتا ہوں آگہی کے لیے زندگی وقف ہے علیؓ کے لیے
آسماں جھک رہا ہے صدیوں سے علم کے در پہ بندگی کے لیے
ہجر کی شام جلنے لگتے ہیں ماتمی داغ روشنی کے لیے
ہے ہوائے بہشت سرگرداں کربلا کی ہر اک گلی کے
ساحلوں سے الجھ پڑے دریا ایک پیاسے کی دوستی کے لیے

یہ تخت و تاج و قبا سب انھیں مبارک ہوں مگر بہ نوکِ سِناں احترام کس کا ہے
فنا کے ہانپتے جھونکے ہوا سے پوچھتے ہیں جبینِ وقت پہ نقشِ دوام کس کا ہے
تمھاری بات تو حرفِ غلط تھی مٹ بھی گئی اتر گیا جو دلوں میں کلام کس کا ہے

خیر و شر میں فیصلے کا وقت ہے، ترکش نکال
اپنے لشکر سے مثالِ حُر نکلنا ہے تجھے

افتخار عارف کے ہاں بھی تاریخِ اسلام کے عظیم کرداروں کی پیش کش گہرے مذہبی، تاریخی اور تہذیبی شعور کے ساتھ ہوئی ہے اور قرینہ یہ کہ گویا عصری آلام کے لیے لائحۂ عمل بھی ان اشعار میں پرو دیا گیا ہے۔ اس شعری ہنر کو گوپی چند نارنگ نے ''قوتِ شفا'' سے تعبیر کیا ہے۔ افتخار عارف نے دائمی سجدے میں پڑے ہوئے اس نفسِ مطمئنہ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ جیسی شخصیات کا ذکر عقیدت و محبت کے تہذیبی تصورات کے ساتھ کیا ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو منقبت گو شعرا کے لیے توجہ طلب ہے۔

حقیقی منقبتی شاعری کے لیے ضروری ہے کہ شیرِ خدا کا ذکر اکتسابِ شجاعت کے واسطے سے ہو۔ خلفاے راشدین کے کردار اسلامی نظم و نسق کی تعلیم کرتے ہوں۔ ذکرِ حسینؓ انقلابِ حق کا پیش خیمہ ہو۔ سلمان فارسیؓ کا ذکر تلاشِ حق کا جذبہ بیدار کرے۔ اویس قرنیؓ کا ذکر ہجر میں لذتِ طلب کو بڑھانے کا سبب ہو۔ ابوذر غفاریؓ کا ذکر ہو تو شانِ فقر اجاگر ہو۔ اولیا اللہ کا ذکر شرعی و فقہی حدود سے متجاوز نہ ہو۔ محض کرامات شماری پر انحصار نہ ہو بلکہ ارادت مندوں کو ان مردانِ خود آگاہ کی ان ریاضتوں اور کردار کی عظمتوں سے روشناس کروایا جائے جو روحانی ترفع اور عملی سچائی کی طرف راغب کریں۔

منقبت گو کا منصب مکمل تحقیق، جذبہ و خلوص، جاں فشاں محنت اور شکیبائی مانگتا ہے۔ موجودہ سماجی و ادبی ماحول میں اگر دینی و علمی تفضّل کے حامل افراد بھی سامنے کی مقبولیت کی خاطر محدود حوالوں پر اکتفا

کریں گے تو نوجوان نسل میں اپنی بنیادوں کو جاننے اور اسلامی تاریخ کے ان عظیم کرداروں سے توانائی پانے کی تمنا کیوں کر جنم لے گی۔ دنیائے منقبت میں سوال خیزی کی تمنائے مکرر کے ساتھ میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لیے افتخار عارف کی اس نظم کو پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی صاحب کے بہ قول، افتخار عارف ہمارے زمانے کی نئی جاہلیت کی قاہر و جابر قوتوں کو للکارتے ہیں:

پرچمِ جیشِ اسامہؓ مرا اعزاز کہ میں
ترے ناموس کو کرتا ہوں سلام

اک طرف سارے نجیب ابنِ نجیب ابنِ نجیب
اک طرف ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام

حرمتِ حرفِ رسولؐ ایک طرف
چادرِ نخوتِ پارینہ کی اڑتی ہوئی دھول ایک طرف

اب بھی نخوت ہے وہی جبّہ و دستار کے بیچ
وہی معیارِ شرف درہم و دینار کے بیچ

اک غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
اب بھی نرغے میں ہے اک شہرِ دل آزار کے بیچ

نرغۂ اہلِ تکبر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیقؓ نہیں ہے کہ بچا لے مجھ کو

میری ان معروضات کا ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں منقبت نگاری کو مقصدی شاعری بنانا چاہتا ہوں۔ میں صرف اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ منقبت کی صنف معنوی قوت کیسے حاصل کر سکتی ہے، اور شعری روایت کے لیے توانائی کا باعث کیوں کر ہو سکتی ہے۔

ہمارے منقبت گو شعرا نے عموماً شخصیات کے واقعات کو منظوم کیا ہے یا سیرت نگاری کا فریضہ ادا کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ سیرت سے ہی منقبت کے مضامین اٹھائے جاتے ہیں، لیکن اکثر شعرا اسے جزوِ شعر بنانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔ بھرپور شعریت کے ساتھ منقبت کے جو اچھے نمونے ہمارے اہم شعرا کے ہاں ملتے ہیں، ان تمام کا احاطہ یہاں ممکن نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ

عقیدت کے جذبے کو تخلیقی احساس کی آنچ سے کندن کیے بغیر کسی صنف کی مقبولیت کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔

میرے ذہن میں اس وقت جو چند شعری مثالیں ہیں، انھی کو پیش کرنا کافی ہوگا۔ ان شعرانے جن محترم شخصیات کو منقبت کا موضوع بنایا ہے، ان کا نبی کریم ﷺ سے تعلق جس رچاؤ سے بیان ہوا ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ ان مناقب کا پیکر نظم کا ہے اور روح تغزل کی، پھر یہ نسبت ہی کا بیانِ محض نہیں ہے، بلکہ ان کرداروں کے حوالۂ عظمت کو جس طرح شعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے، اُس کا اثر یہ کہ دل تقدس سے نہال اور شعور پیروی پر مائل محسوس ہوتا ہے۔

فیصلہ ہے نظامِ قدرت کا
شاخ لازم ہے پھول سے پہلے
تیری تخلیق ناگزیر ہوئی
دو جہاں کے رسول ﷺ سے پہلے
تیری عظمت کا کیا ٹھکانا ہے
تجھ سے جبریلؑ ہم کلام ہوئے
آیتوں کے نزول سے پہلے
(ام النبی، سرشار صدیقی)

ترا کمالِ بصیرت ترا پیام ہوا
ترا جمالِ رفاقت اسی کے نام ہوا
جو ایک شخص تھا یکتائے عالمِ ایجاد
مری بساط ہی کیا ہے کہ لب کشائی کروں
فرشتے دیں گے ترے حسنِ انتخاب کی داد
(حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، سرشار صدیقی)

فراقِ دائمی کے سخت لمحے
جو تیری دھڑکنوں میں جذب ہو کر
جاوداں ٹھہرے

خدا کے آخری پیغام بر کی
حیاتِ ظاہری کے آخری سانس
ابد تک تیری آغوشِ وفا کی
امانت ہیں وہ الفاظ
(حضرت عائشہ صدیقہؓ، سرشار صدیقی)

ثروت حسین اور جاذب قریشی کے ہاں بھی خراجِ عقیدت کی ایک ایک مثال ملاحظہ کیجیے جہاں عقیدت نے شعریت کا دامن نہیں چھوڑا۔

کس کی خوں رنگ قبا آتی ہے
روشنی اب کے سِوا آتی ہے
گریہ و گرد کا ہنگام نہیں
دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے
ساعتِ علم و خبر سے پہلے
منزلِ کرب و بلا آتی ہے
(حضرت امام حسینؓ، ثروت حسین)

وہ ایک آواز
آسماں سے زمین تک کے سفر میں سچائیوں کی دہلیز پر کھڑی ہے
اسی نے اک دن کہا تھا یہ بھی
کہ میرا صدیق اپنی چاہت کے اپنی دولت کے ہر حوالے سے معتبر ہے
وہ محسنوں میں عظیم تر ہے
(حضرت صدیق اکبرؓ، جاذب قریشی)

غزل کے پیرائے میں بے شمار مناقب لکھے گئے۔ اکثر شعرا تقدیسی شاعری میں غزل کا خارجی پیکر اختیار تو کرتے ہیں لیکن داخلی طور پر شعریت کا فقدان رہتا ہے۔ البتہ ایسے کلام بھی کہے جا رہے ہیں جہاں محترم ہستیوں کے سیرت و کردار پر لکھتے ہوئے تغزل کی فضا قائم رہی ہے اور احساس کا رچاؤ نظر آتا ہے۔ یہاں چند مثالیں نقل کی جا رہی ہیں جن میں صحابہ و اہلِ بیت کرامؓ کے مناقب شامل ہیں:

تابندہ ہے دلوں میں لہو روشنائی سے
ہے خاک پر یہ کون ستارہ بدن شہید
دُنیا کے نام نامۂ سرور لکھا ہوا
جیسے ورق پہ حرفِ منور لکھا ہوا
(حضرت امام حسین: عرفان صدیقی)

لمس و لحن مصطفیٰ کی مایہ دار اولین
روشنی افزا تھا جس کی گود میں دُرِ یتیم
حامل سرِّ نبوت رازدان نور تھی
صورت فانوس کیسی پاسبان نور تھی
(اُم النبی: ریاض مجید)

آئینہ خانے اسے عکسِ جلی کہتے ہیں
زہے تقدیر کہ اس کا وہ معلّم ٹھہرا
لہجہ عشق میں ولیوں کا ولی کہتے ہیں
جس کی پرچھائیں کو نور ازلی کہتے ہیں
(حضرت علیؓ: مظفر وارثی)

کون ہے جس سے برآمد ہوئی وحدت اے دل
منعکس ہیں تیرے چہرے سے بہتّر چہرے
کنز ہے، کان ہے، معدن ہے، خزانہ ہے حسینؓ
کربلا کیا ہے ترا آئینہ خانہ ہے حسینؓ
(حضرت امام حسینؓ: میر احمد نوید)

خدا خوفی میں گم نیلے سمندر کی طرح خاموش
مقدس جسم کا مالک مقدس سوچ کا حامل
شب مہتاب کے پرنور منظر کی طرح خاموش
وہ مسجد کی طرح اجلا وہ منبر کی طرح خاموش
(حضرت ابوذر غفاریؓ: انجم نیازی)

ہے کلکِ نور سے فردِ عمل میں لکھا ہوا
قدم قدم متجسّس بہ فکر آسائش
ہر ایک لمحہ خدمت ہے کامیاب اس کا
تھا دیدنی شب اول وہ اضطراب اس کا
(حضرت ابوایوب انصاریؓ: ریاض مجید)

زندگی حسنینؓ کی فیروز تھی کتنی حسیں
جاگتی تھی اُن کے چہروں پر شباہت آپؐ کی
(حسنین کریمینؓ: محمد فیروز شاہ)

وہ قیصر و کسریٰ کے تمدن سے جدا ہیں
جو دائرے بنتے رہے پرکارِ عمرؓ میں
(حضرت عمرؓ: دلاور علی آزر)

تیرا مقسوم ہوئیں ثور کی شب ہائے نیاز
غار سے تا بہ مزار ایک رفاقت کا سفر
آپ اپنے ہی پہ نازاں ہوئی قسمت تیری
کتنی پاکیزہ و اطہر ہے معیت تیری
(حضرت ابوبکر صدیقؓ: جنید نسیم سیٹھی)

یہ چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں اور بہت سی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ منقبت گوئی کے جن تقاضوں اور لوازم کی طرف ان معروضات میں اشارہ کیا گیا ہے، ان کی بہتر تفہیم کے لیے اعلیٰ تخلیقی نمونے بھی یہاں پیش کیے جائیں تاکہ اس عہد کے ان شعرا کو جو منقبت گوئی کی طرف مائل ہیں، یہ سمجھنے میں آسانی رہے کہ منقبت میں بھی دونوں پہلو، یعنی جلال و جمال بہ یک وقت رونما ہوتے ہیں اور اس اکائی کو ہمارے سامنے لاتے ہیں جو انسانی وجود اور روح کی مظہر ہوتی ہے۔ ادب وفن کی اقدار میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بدلتے ہوئے عصری تناظر میں معنویت کے نئے زاویئے بھی سامنے آتے ہیں۔ اس عہدِ جدید میں منقبتی شاعری کو بالخصوص اسی پہلو سے دیکھنا چاہیے۔ یہ تہذیبوں کے انہدام کا زمانہ ہے، خاص طور پر وہ تہذیبیں جو کسی ضابطۂ اخلاق اور مذہبی تصور پر اپنی بنیاد رکھتی ہیں، وہ تو سخت مشکل حالات سے دوچار ہیں۔ ہماری تہذیب جس کی بنیاد اللہ کی وحدانیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خاتمیت اور اسلام کے ضابطۂ حیات پر ہے اور جس کے اعلیٰ نمونے سیرتِ طیبہ کے بعد اہلِ بیت اطہارؑ، صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ دینؒ کی زندگی میں ملتے ہیں۔ منقبت میں یہی نمونے شعری جمالیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس عہدِ جدید میں منقبت کی اہمیت ومعنویت کا یہی وہ زاویہ ہے جو الگ توجہ چاہتا ہے۔ منقبت کا شاعر اپنے کام کے ذریعے ایسے چراغ روشن کرسکتا ہے جو نسلِ نو کو اپنا مذہبی وتہذیبی ورثہ سلیقے اور اہتمام سے منتقل کرسکے۔ نعت رنگ کے اس منقبت نمبر کی تدوین کا مقصد بھی یہی ہے۔ اس شمارے میں شامل تحریروں کو اسی زاویے سے دیکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ اس شمارے کو منقبت کی تفہیم وتعبیر کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ پورا شمارہ تنقیدات پر مشتمل ہے۔ اس میں منقبت کا شعری انتخاب شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کوئی بھی انتخاب ایک الگ دفتر کا تقاضا کرتا ہے، یعنی یہ کام اجمال کا نہیں تفصیل کا ہے۔ دوسرے یہ خیال بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ یہ مضامین جو اس شمارے کا حصہ ہیں، ایسی تحریک پیدا کریں کہ پڑھنے والوں میں نئے لوگ سامنے آئیں اور وہ اپنے عہد کے شعور کو سامنے رکھتے ہوئے منقبت کے اچھے انتخاب پیش کریں اگر ایسا ہو تو میں سمجھوں گا کہ یہ کاوش بارآور ہوئی۔

وفیات

زندگی موت ہے تری منزل
دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں

موت ایک ازلی وابدی سچائی ہے جس سے ہم سب واقف ہیں اور تیار بھی، مگر ہمارے لیے غم و

الم کا اصل باعث تو یہ ہے کہ جانے والا کون تھا اور اس سے ہمارا کیا رشتہ تھا۔ کچھ لوگ محض ایک خبر کی صورت ہمارے رسمی اظہارِ افسوس کا باعث بنتے ہیں کچھ بہت قریب اور دُور کے رشتے ناتوں میں منسلک ہوتے ہیں ان کا ملال بھی دل کا زخم بنتا ہے مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے دل ونظر میں جگمگاتے اور روح میں سماتے ہیں اور ان کی جدائی ہمیں جس صدمے سے دوچار کرتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ میرے خیال میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں جو ایسی کیفیتوں اور حالتوں کو پورے طور پر بیان کرسکتا ہو۔ کم ازکم میرے پاس تو نہیں، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے سے قائم ہونے والے رشتوں کی جدائی کو برداشت کرنا میرے لیے زندگی کا سب سے زیادہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے ایک ایسا سانحہ جو بڑھتی ہوئی تیرگی میں چراغوں کے ایک تسلسل سے بجھتے چلے جانے کے غم کی طرح ہو۔

موت وجود پر طاری ہوتی ہے یادوں پر نہیں، سو بچھڑنے والوں کی یادوں کے چراغ کو دعاؤں کی محراب میں روشن رکھنا بھی ہمارے لیے سعادت کا باعث ہے سو یہ اہتمام ہم ہر شمارے میں کرتے ہیں۔ نعت رنگ شمارہ ۳۲ سے ۳۳ تک کے اشاعتی دورانیے میں یقیناً متعدد لوگ جدا ہوئے ہوں گے مگر جو چند نمایاں نام اس وقت حافظے میں محفوظ ہیں ان ہی کے ذکر پر اپنی بات کو اس احساس کے ساتھ مکمل کرتا ہوں:

تو ہوا رُخصت تو میں خود سے بچھڑ کر رہ گیا
اپنی اس چاہت کا مجھ کو خود بھی اندازہ نہ تھا

سیّد افتخار حیدر: ۱۴؍نومبر ۱۹۲۹ء گجرات شہر پاکستان/ ۱۰؍اپریل ۲۰۲۵ء ٹورانٹو کینیڈا

اردو دنیا میں سیّد افتخار حیدر کو ایک شاعر، ادیب، کالم نویس اور قرانِ حکیم پر غور وفکر کرنے والے طالبِ علم اور اس کو آسان پیرائے میں عوام الناس تک پہنچانے والے مدرس کی حیثیت سے جانا پہچانا گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات توّے کی دہائی کے آغاز میں ٹورانٹو کینیڈا میں ہوئی۔ میرے عزیز دوست معروف صحافی وادیب سجاد حیدر نے اس ملاقات کا اہتمام کیا جس میں امیر صولت جعفری بھی شامل تھے۔ اس ملاقات میں شاہ صاحب کی شخصیت اور فن کے کئی پہلوؤں سے واقفیت ہوئی جس میں ایک بڑا حوالہ ان کی نعت گوئی بھی تھا یہ حوالہ مشترک ہی تھا کہ ہم میں قربتیں بڑھتی رہیں اور ملاقاتوں کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔ نعتیہ مشاعرے، ڈاکٹر تقی عابدی اور سجاد حیدر کی رہائش گاہ پر ادبی نشستیں، چائے خانوں میں گفتگو کی محفلیں، غرض جب بھی اور جہاں بھی موقع ملتا ہم مل بیٹھتے ان نشستوں میں حنیف اخگر ملیح آبادی، ڈاکٹر عبدالرحمن عبد، کرامت غوری، اور منیف اشعر سمیت دوسرے ادیب وشاعر بھی شریک ہوتے رہے۔

شاہ صاحب ذی علم اور باکمال شاعر تھے ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں ''سوزِ ازل'' (غزلیات) اور ''صبحِ ازل)) (حمد، نعت و منقبت) شامل ہیں۔
نعت کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

نگاہِ عشق میں اصل جمال آپ کی ذات
وقارِ حسن ، ورائے خیال آپ کی ذات
مٹائی جس نے طریقِ حیات کی کلفت
وہ نرم خو ، وہ محبت خصال آپ کی ذات
سدا رہے گا عروج آشنا حضور کا نام
رہے گا حشر تلک لازوال آپ کا نام

عالمِ نور تیرا سینہ ہے
سارا عالم ترا مدینہ ہے

مطالعۂ قرآن کے فیض سے شاہ صاحب کی نعت گوئی میں ایک عالمانہ رنگ نمایاں ہوا جو مقام و مرتبہ شانِ رسالت کی بلندیوں، نزاکتوں اور عقیدت و محبت کے بیان میں حقیقت پسندی اور آداب و احترام کے تقاضوں پر پورا اترتا دکھائی دیتا ہے۔ قرآن فہمی کے شوق اور غور و فکر کے ذوق نے انھیں اس صراطِ نور پر سفر میں استقامت عطا کی اور وہ اپنے جذبوں کو فن کی لطافتوں کے ساتھ اجالنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی متعدد کتب شائع ہوئیں جن میں قرآن بہ زبان قرآن، صلات فی القرآن، انبیائے شریعت بہ زبانِ قرآن، سیّدالمرسلین بہ زبانِ قرآن، شامل ہیں ان کی کتابوں کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور اقبال اکیڈمی نے شائع کیا۔

شاہ صاحب کی کوششوں سے ٹورانٹو میں ایک نعت کانفرنس بھی منعقد ہوئی جس میں حضرت حفیظ تائب کو مدعو کیا گیا اس تقریب کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں اور تائب صاحب نے شاہ صاحب کی مہمان نوازی اور کانفرنس کی کامیابی کا ذکر مجھ سے بہت خوش ہو کر کیا۔

۳۱/دسمبر ۲۰۱۸ء کی ایک سرد شام شاہ صاحب سے میری آخری ملاقات ہوئی اس دن وہ باوجود علالت کے برادرِ عزیز سجاد حیدر کے ساتھ مجھ سے ملنے ہوٹل تشریف لائے چہرے پر بیماری اور تنہائی کے کرب کو جھیلنے کی وجہ سے نقاہت نمایاں تھی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں خوشی اور شکر گزاری کے آنسوں لیے وہ مجھ سے بہت گرم جوشی سے سے بغل گیر ہوئے اور اپنا ''ترجمہ قرآن'' مجھے پیش کیا۔

وہ اس ترجمے کی اشاعت سے سرشار تھے اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کی آواز میں ایک ارتعاش تھا جو اس سفر کے نکتۂ آغاز سے انجام تک کی روداد سنا رہا تھا۔ میں قرآنیات سے ان کی دل چسپی کو جانتا تھا مگر وہ ترجمہ بھی کر ڈالیں گے اس کا مجھے اندازہ نہ تھا بہر حال خوشی ضرور ہوئی کہ ان کے ذوق و شوق نے زندگی کے کینوس پر اپنا قوس مکمل کرتے ہوئے سعادتوں کی معراج پائی۔ ترجمے کے سرورق پر میری نظر ان الفاظ پر ٹھہر گئی۔ ترجمہ قرآن کے جلی حروف کے نیچے ذیلی سرخی تھی ''انسانی مقصد تخلیق کا فکری، قولی اور علمی میعار'' اس کے بعد ایک اور سرخی تھی ''غیر فرقہ وارنہ ترجمہ'' شاہ صاحب کی فکری نہج یقیناً ترجمہ قرآن کی عمومی روش سے بہت مختلف تھی لیکن انھوں جو سمجھا اور جیسا جانا اسے پورے خلوص سے پیش کیا۔ دعا ہے کہ ربِ کریم خلوصِ نیت کے ساتھ اُن کی خدماتِ قرآن کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

زندگی کے آخری دنوں میں انھوں نے کتاب چہرہ پر ایک ہی شعر کو کئی مرتبہ لکھا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی اس التجا پر اپنے احباب کو گواہ بھی بنا رہے ہیں اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے کرم اور توجہ کے طالب ہیں۔

ایک لمحہ مجھے خلوت میں عطا ہو آقاؐ
بات کرنی ہے شرمسار نے تنہائی میں

میری نظر سے جب یہ شعر گزرا میں نے بھیگی ہوئی پلکوں سے اس تمنّا کے قبول ہونے کی دعا کی۔ کیا عجب کہ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے انھیں یہ موقع عطا فرما دیا ہو اور زندگی بھر اپنی غلامی پر ناز کرنے والے اس غلام کو حرفِ تسلی سے نواز دیا ہو۔ اُمید ہے کہ شاہ صاحب اپنے سفرِ آخرت پر اس تسلی و تشفّی کے ساتھ روانہ ہوئے ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

غوث میاں: ۵رمئی ۱۹۵۵ء کراچی۔ ۸ردسمبر ۲۰۲۵ء کراچی

سیّد مقدس علی المعروف غوث میاں ایک معروف نعت کار اور اہم کتاب دار کی حیثیت سے تقدیسی ادب کے حلقوں میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی حمد و نعت کی تحقیق، تدوین، تعارف اور ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر رکھی تھی فروغِ حمد و نعت کے حوالے سے ان کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے لیکن چند کارنامے ایسے ہیں جو انھیں اس باب میں اپنے معاصر نعت کاروں سے ممتاز و ممیز کرتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۸۸ء میں حضرت حسان حمد و نعت بک بنک کراچی میں قائم کیا جو بلاشبہ حمدیہ و نعتیہ ادب کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ دور و نزدیک سے سیکڑوں محققینِ نعت

نے اس کتب خانے سے استفادہ کیا۔ان کی وقیع تالیفات میں خواتین کی حمدیہ شاعری،خواتین کی نعتیہ شاعری اورانتخابِ حمد بہت اہمیت رکھتے ہیں وہ ایک متحرک اور فعال انسان تھے،کسی نہ کسی جہت میں برابر فروغِ حمد ونعت میں مصروفِ عمل رہنا ان کا مشغلہ نہیں بلکہ مسئلہ تھا تحقیق کے حوالے سے ان کا انہماک اورشغف قابلِ داداورتدوینی حوالے سے ان کا سلیقہ وذہانت قابلِ تعریف رہی۔حال ہی میں معروف نعت شناس ڈاکٹر ریاض مجید کی نگرانی میں غوث میاں کی کتاب ''خواتین کی نعتیہ شاعری'' پر ایم فل کا ایک مقالہ رفاہ انٹرنیشنل یونی ورسٹی سے مکمل ہوا ہے جس میں غوث میاں کی تحقیقی وتالیفی صلاحیتوں کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ۹۰ء کی دہائی میں حضرت حسان حمد ونعت بک بنک ہر سال بہترین مطبوعات حمد ونعت پر انعامات دینے میں خاصہ فعال رہااس اہم ادارے نے ان مواقعوں پر تین یادگار مجلّے شائع کیے جن میں نعتیہ ادب پر اہم مقالات ومضامین کے علاوہ غوث میاں کی مرتب کردہ ایک اہم فہرست ''پاکستان میں مطبوعات حمد ونعت ۱۹۴۷ءتا ۱۹۹۲ء'' بھی شائع ہوئی مجلہ حضرت حسان نعت ایوارڈ میں سامنے آنے والی اس فہرست میں پاکستان میں اردوحمد ونعت کے ارتقائی سفر کا ایک وقیع منظرنامہ پیش کرکے مستقبل کے محققینِ حمد ونعت کے راستے منور کیے گئے اس فہرست کی افادیت اورمقبولیت کے باعث اس فہرست کومزید اضافوں کے ساتھ دوسری مرتبہ بھی ۱۹۹۴ء میں مجلہ حضرت حسان نعت ایوارڈ اور تیسری بار اسے ڈاکٹر آفتاب نقوی نے گورنمنٹ کالج شاہدرہ لاہور کے تاریخی نعت نمبر مجلہ ''اوج'' میں شائع کیا گیا۔ غوث میاں اپنے زندگی کے آخری وقت میں بھی اسی فہرست میں اضافوں پر کام کرتے رہےاوراس کی کمپوزنگ بھی کافی حدتک ہوچکی تھی لیکن ان کی طبیعت کی خرابی اس کتاب کی اشاعت میں رکاوٹ بنی اور اس کی اشاعت نہ ہوسکی۔غوث میاں کونعت کا انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا تھا محققین اکثر ان سے کسی شاعر یااس کی تصانیف کے بارے میں معلوم کرتے تو وہ فوراًاس کی تفصیلات سے آگاہ کرتے اور دعائیں سمیٹتے۔انھوں نے اپنی مرتبہ کتابوں پر جو مقدمے لکھے ہیں وہ موضوع پران کی گہری نظراورتنقیدی بصیرت کونمایاں کرتے ہیں۔ذاتی زندگی میں ان کی سادگی شرافت،خوش خلقی، وضع داری، ہمدردی اورمہمان نوازی جیسے اوصاف نے ان کی شخصیت میں محبوبیت کے کئی رنگ اُجاگرکر دیے تھےجس کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔محدودوسائل میں غوث میاں نے جوکام کیے اورجن کاموں کوکرنے کا عزم لیےاس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے اس پر مجھےشکیل بدایونی کا یہ شعر یاد آرہاہے:

میں تو اس عالم کو کیا سے کیا بنا دیتا مگر
کس کی چلتی ہے حیاتِ مختصر کے سامنے

اللہ کریم ان کی خدمات کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے اور اس عاشقِ نعت کی مغفرت فرمائے۔آمین!

خالد علیم: ۳۰/اگست ۱۹۵۶ء کراچی/ ۱۰/فروری ۲۰۲۵ء لاہور

خالد علیم کا شمار پاکستان کے معتبر ادیبوں اور صاحبِ فن شعرا میں ہوتا ہے۔انھوں نے شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی اور اس خوش اسلوبی سے اپنی فنی وفکری صلاحیتوں کو بروے کار لائے کہ اہلِ دانش نے ہر سطح پر داد وتحسین سے نوازا۔ان کی تخلیقات وتدوینات پر مشتمل ۱۲ کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔نعت گوئی سے انھیں خاص تعلق تھا اس باب میں اُن کی پہلی کتاب ''اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری'' ۱۹۹۵ء میں مکتبہ فانوس سے شائع ہوئی جس میں تیموری عہد سے عصرِ موجود تک کی اہم نعت گو شاعرات کے کلام پر تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا تھا۔اس کتاب کے بعد نعت گوئی پر مشتمل ان کے تین مجموعے شائع ہوئے جن میں ''محامد محمد'' (۲۰۰۴ء)، ''نعت نما'' (نعتیہ غنائیہ ۲۰۲۱ء) اور آخری مجموعہ ''نعتیہ قصائد'' (۲۰۲۴ء) شائع ہوا۔''اردو شاعرات کی نعت گوئی'' کے مطالعے نے میرے دل میں ان سے ملاقات کا شوق پیدا کیا۔کچھ عرصے بعد لاہور جانا ہوا تو حضرت حفیظ تائب مجھے حفیظ الرحمٰن احسن صاحب سے ملوانے ''سیارہ'' کے دفتر لے گئے وہیں پہلی بار خالد بھائی سے میری ملاقات ہوئی نہایت شفیق، مہذب اور باصلاحیت انسان تھے۔رابطہ قائم ہوا تو کبھی کبھی فون پر بات ہوتی رہی۔ان کی تخلیقات اور مضمون بھی نعت رنگ کا حصہ بنتے رہے۔پھر ایک طویل خاموشی کے بعد اچانک نوید صادق نے ان کی بیماری کے تشویش ناک احوال سے مطلع کیا، میری خواہش پر ان سے بات کروائی ان کی آواز میں نقاہت بہت نمایاں تھی مگر نعت پر بات کرتے ہوئے وہ پُرعزم و پُرسکون محسوس ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔چند دن بعد ۱۰/فروری کو نوید صادق صاحب نے ان کی رحلت کی خبر سنادی، دل بیٹھ گیا۔ایک درویش صفت انسان، ایک باکمال شاعر، اسلامی وروحانی اقدار کا علَم بردار ادیب اور شفیق دوست رخصت ہوا اپنی آخری سانسوں تک انھوں نے نعت سے اپنا رشتہ بحال رکھا وہ ابھی اس یقین کے ساتھ:

بہانہ ہے بخشش کا مجھ جیسے عصیاں شعاروں کو خالدؔ
بہ صد صدقِ دل موت تک نعت گوئی کا رستہ کھلا ہے

ان کے لیے دعاے مغفرت کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے ان کی یہ مختصر نظم ذہن میں تازہ ہو رہی ہے آپ بھی پڑھیے اور ان کی مغفرت کی دعا میں میرے ہم ساتھ شامل ہوجایئے:

کیا ہے میری دلیلِ کم کوشی شکم آزاری و بدن پوشی
ہر قدم ایک دامِ اسرافیل ہر نفس ایک سرد سرگوشی
روزِ محشر جواب کیا ہوگا اے مری آخرت فراموشی !

حافظ محمد مستقیم خان مستقیم: ۲۸؍جولائی ۱۹۵۷ء کراچی ۔ ۱۱؍مارچ ۲۰۲۵ء کراچی

حافظ مستقیم کی شہرت اور مقبولیت کے کئی حوالے تھے ۔ وہ حافظِ قرآن، قاریِ قرآن اور معلّمِ قرآن تھے۔ نہایت خوش آواز، خوش ادا، اور خوش اطوار تھے ان کی نشست و برخاست اور گفتگو میں نفاست تھی، کسرتی بدن پر ان کی جامع زیبی ان صفات کو مزید چار چاند لگاتی تھی۔ انہوں نے نعت خوانی کے منظر نامے پر ایک ایسے عہد میں اپنے لئے جگہ بنائی جب نعت گوئی میں ادیب رائے پوری، خالد محمود نقشبندی، قمر الدین احمد انجم اور سیّد ریاض الدین سہروردی جیسے مقبول شعرا اور نعت خوانی میں قاری وحید ظفر قاسمی، صدیق اسماعیل، سعید ہاشمی، محمد یوسف میمن، خورشید احمد اور سیّد فصیح الدین سہروردی کی شہرت و مقبولیت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ اس منظر نامے میں حافظ مستقیم کی خوبصورت آواز، شاعری اور ان کی منفرد پڑھت نے سننے والوں کو ایک نئے انداز و آہنگ سے متعارف کروایا۔ وہ انداز جس میں والہانہ و عاشقانہ لے عارفانہ رنگ میں نمود کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر نعت خوانی کرتے اس کیفیت میں جب نعتوں کے اشعار میں پوشیدہ قرآن و احادیث کے مضامین کو عوام الناس کے درمیان وارفتگی سے بیان کرتے تو مجمع پر اس کا بہت گہرا اثر ہوتا اور لوگ دیر تک ان کی پڑھی ہوئی نعت کے سحر میں گم رہتے

نعت گوئی میں انہیں جس شخصیت کے فیض نے کندن بنایا وہ حضرت شاہ انصار الہ آبادی تھے ان ہی کی دعاوں، توجہات اور نظر نے حافظ صاحب کی زندگی اور فن دونوں میں برکتوں کے ظہور کا سامان پیدا کیا۔ حافظ کے دو نعتیہ مجموعے شائع ہوئے معراجِ سخن پہلے شائع ہوا اس کے کچھ ہی عرصے بعد اسے نئے مجموعے تاجِ سخن کے ساتھ ملا کر دوبارہ بہت خوبصورت انداز میں یکجا شائع کیا گیا۔ رنگِ سخن ملاحظہ کیجیے:

شاہ کونین سا شہکار نہ دیکھا نہ سنا
ایک انساں کا یہ معیار نہ دیکھا نہ سنا
ذرے ذرے میں مدینے کے دماغ و دل ہیں
خاک کو محرم اسرار نہ دیکھا نہ سنا

☆

جب مہ طیبہ کی سینے میں جھلک پاتا ہے دل
جلوہ گاہ طور سے آگے نکل جاتا ہے دل
اے سخی! میں آخرش کس جرم پر محروم ہوں
آپ کے دربار میں جاتا ہے دل آتا ہے دل

اپنے شعری سفر کے آغاز میں مجھے حافظ صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل رہا جس کا دورانیہ بہت مختصر رہا مگر اس عرصے میں انہوں نے ایک شفیق استاد کی طرح میری ہر ممکن رہنمائی فرمائی۔ مجھے ان کے ساتھ اندرون سندھ کئی محافل میں شرکت کی غرض سے سفر کا موقع ملا جس کی خوبصورت یادیں اور باتیں اب ہمیشہ دل و دماغ کو مہکاتی رہیں گی۔

۱۰ ؍رمضان المبارک کی رات ان کے گھر میں دس روزہ تراویح کے اختتام پر ختم القرآن کی محفل منعقد ہوئی جس میں حافظ صاحب نے ہر سال کی طرح مکمل قرآن سنایا بعد ازاں محفل مدح ثنا کا اہتمام ہوا اور حافظ صاحب نے محفل کو ہنگامِ درود و سلام تک پہنچایا اور مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام کے نغمہ جاں فزا کے کلمات کو ادا کرتے ہوئے جان دی۔ یوں جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اعترافِ غلامی کی سعادت سے اپنی زندگی کے آخری صفحے کو منوّر کرکے اسے اپنے لیے توشۂ آخرت بنالیا۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ان سعادت آثار لمحات کے تصوّر ہی سے ان کا ایک شعر لوحِ ذہن پر تازہ ہوگیا ہے، ملاحظہ کیجیے ؎

جاں بہ لب ، چشم قلب محوِ جمال
موت بھی آئی اہتمام کے ساتھ

جس کریم اللہ نے انہیں اس سعادت سے نوازا اسی سے دعا ہے کہ سفر آخرت کی باقی منزلیں بھی آسان فرمائے آمین

□□□

مقالات و مضامین

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

زاں پیشتر کہ روے نماید خلافتش
صدّیق امامِ انفس و آفاق گشتہ بود
(اس سے پہلے کہ ان کی خلافت ظاہر ہو، حضرت ابوبکر صدیقؓ سبھی روحوں اور تمام جہانوں کے امام بن چکے تھے۔)

صوفی رسید تا بہ نہایاتِ جذب و وجد
چوں خاکِ راہِ قبلۂ عشاق گشتہ بود
(صوفی اگر جذب و وجد کی انتہا کو بھی پہنچ جائے، تو بھی وہ صرف عاشقوں کے قبلے [قبلہ= سیدنا صدیق اکبرؓ] کی راہ کی خاک بن سکتا ہے۔)

اوصافِ نفسِ ملہمہ، احوالِ واصلاں
از نسبتش بدایتِ اخلاق گشتہ بود
(نفسِ ملہمہ کی صفات اور وصال الی الحق کی منزل کو پہنچنے والے عارفین کے احوال، اُنؓ کی نسبت سے ہی اخلاق کی ابتدا بنے تھے۔)

اقطاب کفش بر سر و اغواث سفتہ گوش
کو رو بتافت از درِ حق عاق گشتہ بود
(قطب ان کے جوتے سر پر رکھتے، اور غوث ان کی بات غور سے سنتے ہیں، جو ان کے در سے منہ موڑتا ہے، وہ حق سے محروم ہو چکا ہوتا ہے۔)

(احمد جاوید)

عربی اور فارسی منقبت گوئی کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر احسن زیدی

ABSTRACT: This is a short article, derived from Dr. Ahsan Zaidi's detailed PhD thesis on MANQABAT, which describes the historical background and various forms of evolution of MANQABAT poetry in Arabic and Persian. In this article, the author has provided some basic forms of MANQABAT poetry after Islam, especially during the era of the Companions. After that, he has presented examples of prominent poets of the Persian language who wrote MANQABAT in general, and also presented examples from Persian poetry in the subcontinent. Also, by presenting a critical review at the end, he has identified the merits, intellectual and artistic scope, and overall style of Arabic and Persian MANQABAT writing, which shows us that there has been a strong and stable academic tradition of MANQABAT writing in Arabic and Persian, under the shadow of which MANQABAT in Urdu began its development.

عربی شاعری ظہورِ اسلام سے پہلے

عربوں کو شاعری سے گہری وابستگی رہی ہے۔ان کے نزدیک سب سے بڑا علم شعر وشاعری کا علم تھا۔یہی ان کا ادبی اثاثہ تھا اور ان کے نزدیک اسی کی شہادت معتبر تھی اور اس کے مقاصد کی تکمیل سب سے زیادہ اہم تھی۔

ابن رشیق نے لکھا ہے:''پہلے یہاں سارے کا سارا کلام نثر میں تھا، پھر عربوں کو اپنے مکارمِ

اخلاق، خاندان کی پاکیزگی، اچھے دنوں کے ذکر، دور دراز کے وطن، بہادر گھوڑ سواروں اور سخیوں کے گیت گانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ان کے نفس بھی کارِ کریمانہ کے لیے حرکت میں آجائیں اور وہ اپنے بیٹوں کی اچھے اخلاق کی طرف رہنمائی کر سکیں۔ لہٰذا اُنھوں نے چند عروضوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر اُنھیں کلام کے لیے وزن بنالیا اور جب وزن مکمل ہو گیا تو اس کا نام شعر رکھ دیا کیونکہ اُنھوں نے اس کا شعور حاصل کرلیا تھا۔ یعنی اسے سمجھ لیا اس فن پر اُنھیں پورا عبور حاصل ہے اس لیے ان کی زبان میں مفہوم ادا کرنے کے لیے بہت زیادہ وسعت ہے، ان کا ماحول خیال آفرینی کے لیے مناسب و موزوں ہے۔ ان کی طبیعتیں پاکیزہ اور ان کی زندگیاں سادہ ہیں۔ قوت، عصبیت اور جذبۂ آزادی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ نیز ان کا جزیرہ ان تمام مواقع سے خالی ہے جو ذہن کو غور و فکر کی راہ سے روکیں''۔(۱)

عربوں میں ایک رسم تھی جس سے شاعری اور شاعر کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب ان کے قبیلے میں شاعر ظہور پذیر ہوتا تو دیگر قبائل آکر اُنھیں اس امر پر مبارک باد دیتے، ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا جاتا اور عورتیں اکٹھی ہو کر ساز بجاتیں اور گیت گاتیں جیسے کہ عام طور پر شادی بیاہ کے موقع پر کرتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو بشارت دیتے کیونکہ ان کے نزدیک شاعر ان کی عزتوں کو بچانے والا، ان کی مدافعت کرنے والا، ان کے کارناموں کو ہمیشگی بخشنے والا اور ان کی شہرت کو دُور دُور تک پھیلانے والا ہوتا تھا۔'' ان کے ہاں صرف تین موقعوں پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی تھی۔ لڑکا پیدا ہونے پر، گھوڑی کے بچہ جننے پر اور شاعر بننے پر''۔(۲)

وقت اسی طرح آگے بڑھتا رہا اور شاعری اور شاعر کی عزت و تکریم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس زمانے میں شعر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ چند شعر ایک بڑی جنگ کی آگ بھڑکا سکتے تھے یا لگی ہوئی آگ کو بجھا سکتے تھے۔ اشعار اس زمانے میں اشتہار کا درجہ رکھتے تھے اور ان سے اکثر وہ کام لیا جاتا تھا جو موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ سے لیا جاتا ہے۔

عربی شاعری ظہورِ اسلام کے بعد

سیّد دو عالم جب دنیا میں تشریف لائے تو اس وقت عربوں کی زندگی میں جاہلانہ ذہنیت اور قبائلی عصبیت مستحکم ہو چکی تھی۔ شاعری ان جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے اور اُبھارنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان شاعروں کی حوصلہ شکنی کی جائے جو جنگ کے شعلے بھڑکانے اور عصبیت کے شر کو پھیلانے کا سبب بنتے ہوں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ '' وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ''(۳) یعنی شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ آتا ہے

''وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ'' (۴) اور ہم نے اس (نبی) کو شاعری نہیں سکھائی اور وہ شاعری اس کی شان کے شایان ہے۔ چنانچہ ابتدا میں مسلمانوں نے شعر گوئی سے پہلوتہی سے کام لیا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ مذہب کلی طور پر شاعری کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ شاعری کی محض اس قسم کو ناپسند کرتا ہے جو اتحاد واتفاق کو پارہ پارہ کرتی ہے اور دِلوں میں پوشیدہ بغض وعداوت کو اُبھارتی ہے۔

جب اسلام کی دعوت عام ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں زبانوں اور نیزوں کو استعمال کیا جانے لگا۔ شعرائے عرب غیر جانب داری سے دُور کھڑے ہو کر حق و باطل، توحید پرستی، اور بت پرستی یعنی سرورِ کائنات اور قریش کے درمیان ہونے والے معرکے کے انجام کا انتظار کرنے لگے۔ اس جھگڑے میں قریشی شاعروں کے سوا کسی نے حصہ نہیں لیا۔ قریش کی طرف سے زبانی حملے کا آغاز عبداللہ بن الزہری، عمرو بن العاص اور ابوسفیان کی طرف سے ہوا۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے متبعین کو دل خراش ہجووں کے ذریعے سخت اذیت پہنچائی جس سے مسلمانوں میں بھی جذبۂ شاعری بھڑک اٹھا۔ (۵) اور اُنھوں نے خواہش ظاہر کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُنھیں مخالف شاعروں کے جواب میں شعر کہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''جن لوگوں نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے ہتھیاروں سے مدد کی ہے، ان کو کیا چیز روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے ان کی مدد نہیں کرتے''۔

حضرت حسان (۶) نے یہ سن کر اپنی زبان نکال کر کہا: ''بخدا اگر میں اسے چٹان پر رکھ دوں تو اس کے دوٹکڑے ہو جائیں اور بالوں پر رکھ دوں تو یہ بال مونڈھ ڈالے''۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم قریش کی ہجو کیسے کرو گے جب کہ میں بھی اُنھی میں سے ہوں۔ اس پر حضرت حسانؓ نے فرمایا ''میں آپ کو اس طرح صاف نکال لوں گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے سے بال''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جاؤ ابوبکرؓ سے ملو وہ تم کو ان لوگوں کے کمزور پہلو سمجھا دیں گے، پھر ان کی ہجو کرو۔ جبرائیلؑ تمھارے ساتھ ہیں''۔

چنانچہ وہ شعرا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دریدہ دہنی کا ثبوت دے رہے تھے، اُنھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بھی زبان درازی شروع کر دی۔ اس کے ردِعمل کے طور پر مسلمان شعرا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مناقب بھی بیان کرنے شروع کر دیئے۔

ایک رات تمام اہلِ مکہ نے سنا کہ کوئی شخص بڑی دل نشین آواز میں چند اشعار پڑھ رہا ہے اس کی

آواز اس قدر صاف تھی اور اس میں اتنی جاذبیت تھی کہ ہر ایک نے یہ اشعار سنے اور ہر ایک کو ان کا ایک ایک لفظ یاد رہ گیا، مگر وہ کون تھا اور کہاں تھا یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ لوگ اس سمت کی طرف بڑھے جدھر سے آواز آ رہی تھی مگر کسی کو اس کا سراغ نہ مل سکا۔ اس لیے عوام میں مشہور ہو گیا کہ کوئی جن ہو گا۔ چنانچہ ان اشعار کو شعر الجنی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

۱۔ پروردگار عالم بہتر سے بہتر صلہ ان دونوں رفیقوں کو دے جو امِّ معبد کے خیموں میں ٹھہرے تھے۔(۷)

۲۔ وہ دونوں حسن سلوک کی علامت بن کر آئے اور اسی شان سے رخصت ہوئے۔ بڑا ہی خوش بخت ہے وہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سفر بنا۔

۳۔ بنوکعب کے قبیلے کو مبارک ہو، ان کی دختر کا ٹھکانہ جو اہل ایمان کے انتظار میں بیٹھنے کی جگہ بن گیا ہو۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زمین میں پورا قصیدہ کہہ دیا (۸) جو ان کے دیوان میں موجود ہے، مگر بعض لوگوں نے ان اشعار کو بھی ان مذکورہ بالا تین شعروں کے ساتھ ملا کر ''کسی نامعلوم شاعر'' کے اشعار قرار دیا ہے۔ چنانچہ نجد کے مشہور عالم شیخ محمد بن عبدالوہاب (جن کے نام سے وہابیت کی نسبت ہے) نے اپنی کتاب (۹) میں چودہ اشعار نقل کیے ہیں۔ تیرھویں شعر کا ترجمہ یہ ہے:

''ابوبکر کو قسمت کی یاوری مبارک ہو جو رسول کی رفاقت سے حاصل ہوئی۔ اللہ جس کو نوازے وہ خوش قسمت ہو ہی جاتا ہے''۔

عربی کی پہلی منقبت

جمہرۃ اشعار العرب کے مصنف نے عبداللہ بن عباس کی سند سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف زبان درازی کی ہے۔ آپ نے منبر پر تشریف فرما ہو کر خدا کی حمد وثنا بیان کی پھر ارشاد فرمایا ''تم میں سے کسی نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ اپنی جان اور مال سے میری اعانت نہیں کی۔ تم نے مجھے جھوٹا سمجھا لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچا جانا۔ اگر میں دوست بناتا کسی کو تو دوست بناتا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو۔ آگاہ رہو کہ تمھارا صاحب اللہ کا دوست ہے''۔ پھر حضرت حسان رضی اللہ عنہ (۱۰) کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ لاؤ''۔ حضرت حسان نے یہ اشعار پیش کیے:

۱۔ جب تو کسی قابل اعتماد بھائی کا ذکر کرے تو اپنے بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر کر، ان کارہائے نمایاں کی وجہ سے جو اُنھوں نے سرانجام دیئے ہیں۔

۲۔ وہ اپنی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے ہیں۔ ان کی خصائص محمود ہیں، وہ تمام مخلوق میں سب سے

پہلے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔

۳۔ وہ دو میں سے دوسرے ہیں اس بلند غار میں جب دشمن نے چکر لگائے اس کے گرد جب وہ اس پر چڑھا۔

۴۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں اور لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ مخلوقات میں کوئی بھی ان کے برابر کا نہیں ہے۔

۵۔ وہ مخلوق میں بہترین ہیں۔ان سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔ نبی کے بعد اور اُنھوں نے پورا کر دِکھایا اس ذمہ داری کو جوان کو سونپی گئی‘‘۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار کو سن کر فرمایا: ’’حسان! تم نے سچ کہا‘‘۔

منقبت نگاری کی تاریخ میں یہ شعر نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں سادگی ہے‘ سچائی ہے‘ روانی ہے اور یہ مبالغہ اور غلو سے پاک ہیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ پہلی عظیم المرتبت شخصیت ہیں جو منقبت نگاری کا موضوع بنی۔شعر الجنی میں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر موجود ہے لیکن وہ بنیادی طور پر نعتیہ اشعار ہیں۔اگر چہ بعد میں منقبت نگاری کا انداز یہ بھی رہا کہ اسے نعت کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا گیا کیونکہ بزرگانِ دین کا مقام اور مرتبہ بھی دراصل سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی ہی کا نتیجہ ہے۔لیکن منقبت نے الگ حیثیت سے بھی اپنا وجود منوایا، اس کی امتیازی خصوصیت موضوع ہے۔ فارم یا ہیئت نہیں ہے جس طرح نعت مختلف ہیئتوں میں لکھی گئی ہے لیکن اس کا معتد بہ حصہ نعتیہ قصائد کی شکل میں موجود ہے اسی طرح منقبت نے صحابہ کرامؓ‘ آئمہ عظام اور بزرگانِ ذی احتشام کے مدحیہ قصائد کی صورت میں اپنا وجود قائم رکھا۔

حسان بن ثابتؓ مخضر م شعراء میں سے ہیں۔یعنی ان کا شماران شعراء میں ہوتا ہے جو جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں عمدہ شاعری کرنے والے ہیں۔ان کی زبان مستند تھی‘ فصاحت و بلاغت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اپنی بلندیِ فکر‘ شوکت الفاظ‘ قدرت فن اور طرفگی ادا کے سبب ہم عصر شعرا میں سر برآوردہ شمار ہوتے تھے۔ان کا کلام معنی آفرینی‘ ترکیبوں کی چستی الفاظ کے حسن انتخاب‘ جوش اور روانی کی خوبیوں سے مزین تھا۔ وہ غزوات کے ہر موقع پر فتح کے کارناموں کو بیان کرتے، شہدا کا مرثیہ کہتے اور اسلام کی برتری کا سکہ اغیار کے دِلوں میں بٹھاتے۔ان کے لیے سب سے بڑی سرفرازی کی بات یہ ہے کہ آنحضرت نے ان کو یہ اعزاز بخشا کہ مسجد نبوی میں ان کے لیے منبر رکھوایا جس پر بیٹھ کر وہ شعر سناتے تھے۔عرب شعرا نے جھوٹ اور مبالغے کو کبھی شاعری میں جگہ نہیں دی۔اُنھوں نے جس چیز کو درست اور سچ جانا اسی کو اپنے شعر کی زینت بنایا۔عرب اوّلاً تو کسی کی شاعرانہ مدح عار سمجھتے تھے اور

اگر کرتے بھی تھے تو کبھی صلہ اور انعام لینا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو تو اس نے کہا ''افعل حتی اقول''، ''کچھ کر کے دِکھا، تو کہوں''۔

حسان بن ثابتؓ کے قصیدوں میں مبالغہ اور غلو نہیں ہے۔ اُنھوں نے وہی باتیں کہی ہیں جن کا اُنھوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ اُنھوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھی تو فرطِ عقیدت سے اسے حمد نہیں بنایا اور رسول کو خدا کے مرتبے تک نہیں پہنچایا۔ اُنھوں نے دینی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی ہے۔

''حضرت حسانؓ کے نعتیہ کلام کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ دینِ حق کی مدد کرنے والوں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ تخلیق کا شاہکار خیال کرتے ہوئے ان کی تعریف کو بھی نعت رسول میں شامل کر لیتے تھے۔ یوں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی منقبت بھی نعتیہ مضامین میں شامل ہو گئی۔ نعت میں منقبت صحابہؓ کے اوّلین نمونے آپ ہی کے کلام میں ملتے ہیں''۔(۱۱)

عہد نبوی میں جن شعرا کو خصوصی شہرت نصیب ہوئی، ان میں کعب بن زہیر کا نام بڑا نمایاں ہے۔ ان کی شہرت کا بڑا سبب ان کا وہ قصیدہ لامیہ ہے جو 'قصیدہ بانت سعادُ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ساٹھ اشعار ہیں۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ جب کعب اس شعر پر پہنچے:

ان الرسول لنور یُستَضَآءُ به
مهند من سیوف الله مَسلُوْل

تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ردائے مبارک اُنھیں عطا فرمائی۔ اس وجہ سے اس قصیدے کو قصیدہ بُردا بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے اشعار میں صحابہ کی مدح ہے۔

۵۸۔ اگر اُنھیں جنگ میں کامیابی ہوتی ہے تو اتراتے نہیں اور اگر کوئی صدمہ پہنچے تو گھبراتے نہیں۔

۵۹۔ وہ میدانِ جنگ میں سفید اونٹنیوں کی طرح وقار کے ساتھ جاتے ہیں۔

۶۰۔ نیزے ان کے سینوں پر ہی لگتے ہیں پیٹھ پر نہیں لگتے اور نہ وہ میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔(۱۲)

عربوں میں قبائلی عصبیت ہمیشہ طرح طرح کے فتنے جگاتی رہی۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی یہی صورتِ حال رہی، البتہ یہ آگ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہوتی رہی۔ خلافت ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں، ان کے حسن تدبیر' کمال عدل اور عوام کے جہاد اور فتوحات میں مصروف کار رہنے کی وجہ سے دبی رہی، لیکن جب اقتدار کی زمام حضرت عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے ہاتھ آئی تو اختلاف کا آغاز ہوا اور بقول احمد حسن زیارت ''اب صرف خلیفہ ہی رائے دینے والا نہ تھا، اس کے خاندان نے بھی عربی قومیت کو چھوڑ کر اموی تعصب کو ہوا دیتے ہوئے حکومت شروع کر دی''۔ (۱۳) چنانچہ ایک فتنہ جاگ اُٹھا جس کا خاتمہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت پر ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی اور معاویہ کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوگئی جس سے نظامِ حکومت درہم برہم اور اتحادِ اسلامی پارہ پارہ ہوگیا اور عربوں کی تلواریں دشمنوں سے جہاد کرنے کی بجائے آپس میں ٹکرانے لگیں۔ شام میں بنواُمیہ کی پشت پناہی کرنے والے موجود تھے۔ حجاز میں ابن زبیر کے حمایتی ان کے لیے کام کر رہے تھے۔ عراق میں اہل بیت کے مؤلدین تھے جو خلافت پر ان کا حق فائق سمجھتے تھے۔

شاعری اپنے ماحول کی ترجمان ہوتی ہے۔ وہ اس دورِ پُرآشوب کی تعصب پرستی اور جنگ جویانہ طرزِ عمل سے کس طرح بچ سکتی تھی۔ چنانچہ وہی ان تفرقوں اور فتنوں کے اظہار کا وسیلہ بنی اور ایک دوسرے سے ٹکرانے والوں نے اس سے وہی خدمت لی جو آج کل ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سے لی جاتی ہے۔ اسی کے وسیلے سے جنگ کے شعلے بھڑکائے جاتے تھے اور اسی کی بدولت مفاہمت اور رواداری کی فضا پیدا کی جاتی تھی۔ شاعری ہی سے قائدین کی حمایت اور مدافعت کی جاتی تھی اور اسی سے مخالفین کے بخیے اُدھیڑے جاتے تھے۔ عصر اموی اسلامی قدروں کے انحطاط کا زمانہ تھا۔ اکثر شعرا شراب اور تغزل کی طرف مائل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ بالواسطہ اس قسم کے اشعار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے لوگوں کی عقیدت و محبت میں اضافہ ہوتا تھا اور حکمران خاندان ان کو اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ہشام بن عبدالملک نے اپنے باپ کے زمانے میں خانہ کعبہ کا طواف کیا اور کوشش کی کہ حجراسود تک پہنچ کر اسے چوم سکے لیکن وہ بھیڑ کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ لہٰذا اس کے لیے ایک کرسی بچھائی گئی اور وہ لوگوں کو دیکھنے لگا اس کے ساتھ سردارانِ شام بھی تھے۔ اس نے دیکھا کہ امام علی زین العابدین تشریف لائے، اُنھوں نے طواف کیا اور جب حجراسود کا رُخ کیا تو لوگوں نے اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ بنا دیا۔ ایک شامی نے ہشام سے پوچھا کہ یہ کون ہے جس سے لوگ اس قدر مرعوب ہو گئے ہیں؟ ہشام نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا ''میں نہیں جانتا''۔ عہد اموی کا ایک ممتاز شاعر فرزدق (۱۴) وہاں موجود تھا اسے یہ جواب بہت بُرا لگا اور اس نے امام زین العابدین کی شان میں ایک زوردار قصیدہ کہا۔ حکمرانوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور فرزدق کو قید کرا دیا گیا اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

هذا الذی تعرف البطحا وطاته
والبیت یعرفه والحل وَالْحَرَمُ

''یہ وہ ہے جسے سرزمین بطحا پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ، حرم اور غیر حرم سب ہی مقامات ان کو جانتے ہیں''۔

ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں کہ عربی میں منقبتی شاعری کا آغاز فرزدق سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے امام زین العابدین کی منقبت میں اس نے شان دار قصیدہ میمیہ لکھا جو آن کی آن میں سارے عرب میں پھیل گیا اور اس کی شہرت میں آج تک کمی واقع نہیں ہوئی۔ (۱۵) اس میں کوئی شک نہیں کہ فرزدق کا یہ قصیدہ اس کی فنی مہارت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا عمدہ اظہار ہے اور اس سے اس کی شہرت میں بڑا اضافہ ہوا، لیکن یہ عربی میں منقبتی شاعری کا حرفِ آغاز نہیں ہے۔ اس سے بہت پہلے حسان بن ثابت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مدح میں اشعار لکھ چکے تھے جو سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر آپؐ کی موجودگی میں پڑھے جا چکے تھے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ ان اشعار میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خصائص سیدھے سادے انداز میں اور آسان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں اور ان میں جذبات کی وہ حرارت اور الفاظ کا وہ شکوہ موجود نہیں جو فرزدق کے قصیدے کا طرۂ امتیاز ہے۔

کمیت بن زید اسدی (۱۶) اپنے قصائد ''ہاشمیات'' کی وجہ سے بنو ہاشم کا بے مثال شاعر تھا۔ اس نے پُرخلوص دل اور رواں اور پُرجوش طبیعت سے ان کی حمایت کی۔ وہ اپنے ایک قصیدے میں اہل بیت کی محبت کا اظہار یوں کرتا ہے۔

> ''میں مصیبت کے وقت ان کو اللہ کی طرف سے وسیلہ بناتا ہوں۔ میں اگر کسی سے ناراض ہوتا ہوں تو ان کے لیے۔ خوش ہوتا ہوں تو ان کی خاطر۔ لوگ مجھ سے عداوت رکھتے ہیں، مجھے برا کہتے ہیں کہ میں بنی ہاشم اور اہل بیت سے کیوں محبت کرتا ہوں۔ میرے لیے تو آلِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی مقتدیٰ ہیں اور وہی میرے مرجع ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے قریش قابل تعظیم ٹھہرے۔ ان کے فضائل کے خیمے بڑے لمبے چوڑے ہیں۔''

ابوالاسود (۱۷) الدوَلی کہتے ہیں: میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت کرتا ہوں اور عباس، حمزہ اور وصی سے۔ یہ نبی کے چچا کے فرزند ہیں اور اقربا میں سے ہیں۔ ساری مخلوق میں یہ مجھے محبوب تر ہیں۔ اگر ان کی محبت صحیح ہے تو بھی مجھے پہنچے گی اور اگر غلط ہے تب بھی پہنچے گی۔

ابونواس (۱۸) آلِ علی رضی اللہ عنہ سے اپنی محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''جو شخص علوی نہ ہو اس کے لیے کبھی کوئی فخر نہیں۔ اللہ نے مخلوق بنائی تو اُنھیں پاکیزہ بنایا۔ وہ ملاء اعلیٰ ہیں۔ ان کے پاس

علمِ کتاب ہے۔ان کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو درود اور سلام بھیجا جاتا ہے۔''

اس کے چند اور اشعار کا مفہوم یہ ہے: ایک شخص کہنے لگا تو آل طٰہٰ کی بڑی تعریف کرتا ہے' کیا تجھ پر فرض ہو گیا ہے کہ ساری مدح ان پر ختم کر دے؟ میں نے کہا' کیا کروں ساری مخلوق ان سے استفادہ کرتی ہے۔ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ اگر میرا گناہ حُبّ آلِ محمد ہے تو میں اس گناہ سے کبھی توبہ نہیں کروں گا۔

عربی شاعری کا جائزہ

صحرائی زندگی کی سختی' بے کیفی اور سادگی نے عربوں کی شاعری کو ایک خاص امتیازی شان عطا کر رکھی تھی۔ چنانچہ عربی شاعری کی پہلی خصوصیت راستی اور سچائی ہے۔ اس میں جذبے کی سچی عکاسی اور فطرت کی صحیح ترجمانی موجود ہے اور آرائش زبان و بیان اور تکلفات شعری سے یہ شاعری بالکل مبرا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس شاعری میں فکری تسلسل پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس لیے شعروں میں منطقی ربط مفقود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر شعروں کی ترتیب بدل دی جائے یا بعض شعروں کو قطعی طور پر محذوف کر دیا جائے تو بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔عرب کی فضا ایک دیہاتی فضا تھی اور ''دیہاتی فلسفیانہ نظر نہیں رکھتے' ان کی نگاہ میں تمام اشیا اور حوادث ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہوتے ہیں جنھیں کوئی رشتہ باہم نہیں ملاتا۔ یہی سبب ہے کہ عربوں میں شاعری پرکھنے کا معیار ایک شعر ہوتا ہے' پوری نظم نہیں ہوتی'' (۱۹) ان کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز عام طور پر کھنڈرات اور مکانات کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عرب خانہ بدوش زندگی گزارتے تھے۔ آج یہاں خیمے نصب کر لیے تو کل وہاں' جہاں کچھ سبزہ اور پانی نظر آیا وہاں کا رُخ کر لیا۔ چنانچہ اسی آمدورفت میں جب کوئی شاعر پہلی جگہ سے گزرتا تو اسے اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آ جاتا۔ وہ ان دوستوں کو یاد کرتا جو اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پھر وہ لطیف یادیں اسے بے قرار کر دیتیں۔

''عربی شاعری جاہلیت اور اسلام میں اپنے ظاہر و باطن اور اپنی قسم کے اعتبار سے اواخر عہد بنو اُمیہ تک ایک ہی طریقے پر رہی۔ سیاست' تمدن اور نئے مذہب کے اثر نے بھی اس کو کسی نئے راستے پر نہیں ڈالا البتہ ان چیزوں نے اس کے بہت سے گوشوں کو اُجاگر اور معانی و مضامین کو وسیع تر کر دیا جس سے شاعری کے بعض موضوعات مثلاً ہجو کو تقویت پہنچی اور بعض میں کوئی نمایاں خصوصیت پیدا ہو گئی مثلاً غزل' بھلا شاعری میں جدت طرازی کا امکان کس طرح پیدا ہوتا جبکہ تمام شعرا دیہاتوں اور جنگلوں سے آتے تھے''۔(۲۰)

احمد حسن زیات کی یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔عربی شاعری مدح' ہجو، رثا اور تشبیب پر

مشتمل تھی لیکن طلوعِ اسلام کے ساتھ موضوعات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کی طرف اُنھوں نے اشارہ نہیں کیا۔ خدائے واحد کے اقرار کے علاوہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے مسلمانوں کو والہانہ محبت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر رفقاء کو بھی وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ آپ کے اہل بیت بھی ان شیفتگی کا مرکز تھے لہٰذا حمد، نعت و منقبت کے مضامین بھی شاعری میں داخل ہو گئے۔ اگر چہ یہ مدح ہی کی ایک صورت تھی لیکن اس کا انداز قدیم مدحیہ شاعری سے بالکل مختلف تھا۔ ایک ایسی شیفتگی کا اظہار تھا جس کی مثال ادب عالم میں نہیں ملتی۔ شاعری کا اسلوب اگر چہ قدیم ہی رہا۔ خدا کی حمد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور ان کے خلفاء کی مدح نے شاعری کے نئے اُفق واضح کر دیئے اور قلم کی زبان ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوئی۔

قدیم اقوام نے رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کی شکل میں اپنی تہذیب و معاشرت کو محفوظ کر رکھا ہے لیکن عربی میں ایسی شاعری کا کوئی وجود نہ تھا اس لیے کہ ان اصناف میں طبع آزمائی کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور عرب غور و فکر سے بے نیاز، برجستگی اور بدیہہ گوئی کے عادی تھے۔ ان کلاسیکی اصناف میں دوسروں کے کرداروں اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے لیکن اہل عرب اپنے آپ میں اس قدر محو تھے کہ اُنھیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ اصناف طوالت اور تجزیہ کی طالب تھیں۔ اہلِ عرب اختصار کے رسیا تھے۔ اُنھیں طویل سفروں اور اَن دیکھے جزیروں سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ ان کہانیوں اور قصوں سے محروم تھے جو رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کے سرچشمے کہلاتے ہیں۔

فارسی میں منقبت نگاری

۲۱ھ کا سال ایرانی تاریخ میں فیصلہ کن سال شمار ہوتا ہے اس سن میں نہاوند کے مقام پر ایرانیوں اور عربوں میں زبردست جنگ ہوئی جس میں ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کو شکست ہوئی اور ایران عربوں کے تابع ہو گیا اور دو سو سال تک عرب ایران پر حکومت کرتے رہے۔ دینِ اسلام کی اشاعت کی وجہ سے ایران میں عربوں کا سیاسی غلبہ معنوی غلبے میں تبدیل ہو گیا اور عربوں کا اثر ایرانیوں کی روح تک اُتر گیا۔ ان دو سو سالوں میں فارسی شاعری کی سرزمین بالکل بنجر رہی اس طویل عرصے میں عربی کی حکمرانی رہی۔ یہ سیاست اور مذہب کی زبان تھی۔ ایران کے شاعر اور دانش وراس کو اپنی زبان پر ترجیح دیتے رہے۔ اُنھوں نے عربی میں شعر کہے، اسی میں خط و کتابت کی اور اس کی ترویج میں ہمہ تن مصروف رہے۔ چنانچہ کئی فارسی شعرا جو اپنی زبان میں زمزمہ ریزی کرتے رہے، گم نامی کے گوشے میں دفن ہو گئے اور کسی نے ان کی آواز نہ سنی۔ کئی نغمہ طراز اپنے نغموں کو پہلو میں سمیٹے پیوند زمین ہو گئے اور کسی کو ان کے وجود کا احساس تک نہ ہوا۔

بنواُمیہ عرب عصبیت کا بری طرح شکار تھے۔ اس لیے اُنھوں نے غیر عرب ایرانیوں سے اچھا سلوک نہ کیا۔ اس صورتِ حال نے ایرانیوں کو اس تحریک کا حامی اور مؤیّد بنا دیا جو شعوبیہ تحریک کے نام سے بنواُمیہ کے خلاف چل رہی تھی۔ اس وقت اہل بیت النبی بنواُمیہ کے ہاتھوں پریشان حالی کا شکار تھے۔ چنانچہ ایرانیوں نے بنواُمیہ سے اپنی نفرت کا اظہار حمایت اہل بیت سے کیا۔ پروفیسر براؤن کہتے ہیں کہ ''علی زین العابدین کے ساتھ ان کی وابستگی کو اس خیال نے بھی مستحکم کر رکھا تھا کہ ان کی والدہ ایران کے شاہی خاندان کی شہزادی تھیں''۔(۲۱)

چنانچہ جب مختار ثقفی نے بنواُمیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ایرانیوں نے اس کا ساتھ دیا اور ان سے ان کی زیادتیوں کا بدلہ لیا۔

عباسیوں کا دور زندگی کی تشکیل نو کا دور تھا۔ اب شاعر جنگوں کی بات نہیں کرتے تھے بلکہ اُنھوں نے اپنے آپ کو درباریوں میں ڈھال کر خلفا کی مدح خوانی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا اور ان کی شاعری ان کی زندگی کی طرح تصنع، تکلف اور مبالغے کی شاعری بن گئی تھی۔ یہ دور ایرانیوں کے لیے حیاتِ نو کا پیغام تھا۔ اس میں ایرانی طرزِ معاشرت اور علوم وعقائد نے رواج پایا۔ اسی زمانے میں فارسی زبان نے دوسو سال کی گمنامی کے بعد موجودہ فارسی کی صورت اختیار کی۔ شاعروں نے اس زبان میں شعر کہے اور نثر نگاروں نے فارسی نثر کا آغاز کیا۔

سامانی خاندان کے دور میں ایرانی علم و ادب کو نئی زندگی عطا ہوئی۔ سامانیوں نے بخارا کو دارالحکومت بنایا جو اس وقت بڑے بڑے شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کا مرکز تھا۔ اس دور میں کسائی مروزی پیدا ہوا جو اپنے زمانے میں دانش وروں اور شاعروں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں اشعار کہے''۔(۲۲) وہ پہلا شاعر تھا جس نے دینی عقائد اور حکیمانہ اشعار لکھے اور اخلاقی پند و نصائح کو نظم کا لباس دیا، لیکن منقبت نگاری کے سلسلے میں پہلا قابل ذکر شاعر فردوسیؔ ہے۔

سیّد علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں: ''ایرانی تمدن کے احیا کے ساتھ ہی فارسی شاعری کا آغاز ہوا اور قصیدے کے ساتھ عربی سے جو شعری روایات فارسی شاعری میں داخل ہوئیں ان میں ایک منقبت کی روایت بھی تھی جس کے اوّلین ترجمانوں میں فردوسی طوسی ممتاز حیثیت کا مالک ہے''۔(۲۳)

فردوسی کی عظمت شاہ نامہ کی مرہونِ منت ہے۔ یہ رزمیہ مثنوی اپنے اندر بڑا تنوع رکھتی ہے۔ اس میں دلیری اور بہادری کی داستانوں کے علاوہ ایران کی قدیم تاریخ اور ملی کہانیاں ہیں اور بادشاہوں، وزیروں اور دیگر بڑی شخصیات نے جو نصیحتیں اپنے لواحقین کو کیں، ان کا شاعرانہ اظہار ہے۔ اس مثنوی کا

آغاز خدا کی حمد وثنا سے ہوتا ہے، اس کے بعد عقل کی تعریف ہے، پھر آفرینش عالم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تخلیق آفتاب و ماہتاب کا تذکرہ ہے اور بعد ازاں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اہل بیت کی مدح ہے۔

چہ گفت آن خداوند تنزیل وحی   خداوندِ امر و خداوندِ نہی
کہ خورشید بعد از رسولان مہ   نتابید بر کس ز بوبکر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار   بیاراست گیتی چو باغِ بہار
پس از ہر دوان بود عثمان گزین   خداوندِ شرم و خداوندِ دین
چہارم علی بود جفت بتول   کہ او را بخوبی ستاید رسول
کہ من شہر علمم علیم درست   درست این سخن قول پیغمبر است
منم بندۂ اہل بیت نبی   ستائندۂ خاکِ پائے وصی

فردوسی نے مدح پیغمبر کے بعد صحابہ کرامؓ کا ذکر محض برکت طلبی اور خیر جوئی کے لیے کیا ہے، البتہ اہل بیت سے اسے خصوصی محبت ہے، اس لیے ان کا تذکرہ ذرا وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔

فارسی منقبت نگاری میں دو واضح رجحانات موجود تھے۔

۱۔ خلفائے راشدین کی منقبت
۲۔ اہل بیت النبی کی منقبت

بعض شاعروں کے ہاں یہ دونوں رجحانات اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ایک ہی نظم میں خلفائے راشدین اور اہل بیت کے اوصاف وفضائل بیان ہوئے ہیں۔ فردوسی نے بھی اسی روایت کی تقلید کی۔

ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں: یوں تو سب سے پہلے کسائی مروزی نے مذہبی قصیدے لکھے، لیکن ناصر خسرو (۲۴) پہلا شاعر ہے جس نے قصیدے کو ایک تحریک کی صورت میں مذہب اور عقیدے سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد قصیدے، حمد، نعت اور اولیائے دین کی منقبت میں ہیں جن میں اس نے فلسفیانہ طرز اختیار کیا ہے۔ (۲۵)

ناصر خسرو نے پری چہرہ معشوقوں اور گل رنگ شراب کی جگہ روحانی اور اخلاقی مضامین کو بھی اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی۔ یہی خصوصیت اس کی شاعری کا انفرادی رنگ بن گئی اس کا دیوان، فلسفۂ اخلاق، پند و موعظت، عقل و دانش اور مذہب ایسے موضوعات پر مشتمل ہے۔ نعت و منقبت کو یکجا کرنے کا اس کا ایک اپنا رنگ ہے جس کی چمک دمک قاری کو متاثر کرتی ہے۔

قراں بود و شمشیر پاکیزہ حیدرؓ   دو بنیاد دینِ متینِ محمدؐ

چو ہاروں ز موسیٰ علی بود در دین ہم انباز و ہم ہم نشینِ محمدؐ
ز فرزندِ زہرا و حیدر گرفتم من این سیرت راستین محمدؐ

شاعری کا صوفیانہ انداز

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ فارسی شاعری میں منقبت نگاری کے دو واضح رجحانات تھے۔ مناقب اہل بیت اور مناقب اصحابِ رسول۔ تصوف کے زیر اثر صوفیانہ سلسلوں کے شیوخ بھی منقبت نگاری کا موضوع بن گئے۔ چونکہ اشاعتِ اسلام، سلسلہ طریقت کی توسیع اور مریدانِ باصفا کی تربیت کی طرف ان حضرات کی توجہ مبذول رہی اور بے شمار لوگ ان کے روحانی فیوض اور ان کی بلند و ارفع تعلیمات سے بہرہ مند ہوئے۔ اس لیے شعرا نے ان کی زندگی کے اس پہلو کو اپنی منظومات کا موضوع بنا کر اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

حکیم سنائی (م ۵۴۵ھ) پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا۔ علامہ شبلی کہتے ہیں کہ ''اس سے پہلے حضرت ابوسعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی تھیں لیکن ان میں صرف جوشِ عشق کو پُرزور طریقے سے ادا کیا گیا ہے۔ تصوف کے مسائل اسرار اور معارف نہیں، بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصانیف ہیں۔(۲۶) حدیقۃ الحقیقۃ ان کی معروف مثنوی ہے، جس میں تصوف کے اکثر مقامات مثلاً صبر، رضا، توکل، قناعت وغیرہ مستقل عنوانات رکھے گئے ہیں اور ان کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مثنوی میں حکیم سنائی نے اہل بیت کی مدح بھی لکھی ہے اور بنواُمیہ کی مذمت بھی کی ہے۔

ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں: ''مذہبی قصیدہ نگاری کو سنائیؔ نے فروغ دیا''۔(۲۷) اُنھوں نے ''در نعت خواجہ لولاک و اصحاب پاک'' میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں عقیدت و نیازمندی کا خراج پیش کرنے کے بعد خلفائے راشدین کی مدح بھی لکھی ہے۔ اُنھوں نے ایک قصیدہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں لکھا ہے۔

ای امیرالمومنین ای شمع دین ای بوالحسن ای بیک ضربت ربوده جانِ دشمن از بدن
از برای دینِ حق آباد کرده شرق و غرب کردی از نوکِ سنانت عالمی را پُرسنن
این جلال و این کمال و این جمال و منزلت نیست کس را در جهان جز مرترا ای بوالحسن

امام علی موسیٰ رضا کی منقبت میں فارسی کا پہلا قصیدہ بھی سنائی نے لکھا۔ قصیدے کا مطلع ہے:

دین را حرمیست در خراسان

دشوار ترا بہ محشر آسان

چند اور اشعار ملاحظہ کریں:

از خاتم انبیا درو تن از سیّد اوصیا درو جان
مہرش سببِ نجات و توفیق کینش مدد ہلاک و خذلان

سنائی نے شیخ خواجہ امام محمد بن محمد کی مدح میں ایک ترکیب بند بھی تحریر کیا ہے۔ مدح کا انداز یہ ہے:

مہتر راہ شریعت اوست کا کنون چون سراج نور او روشن ہمی دارد رہِ ہمنام را
ای محمد خلق یوسف خلقت اندر صدر تو حسن خلقت کرد چون ما چرخ راز احسان تو

سنائی کے یہاں منقبت نگاری کے تینوں رنگ موجود ہیں۔ مدح صحابۂ مدح اہل بیت اور مدح بزرگانِ دین، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی رنگ گہرا ہے اور کوئی ہلکا۔ اہل بیت کے ساتھ اس کی محبت میں والہانہ پن اور شیفتگی زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا کلام پختہ اور برجستہ ہے۔ کہیں کہیں طرز ادا میں جدت اور اچھوتا پن بھی ہے۔

فارسی کی صوفیانہ شاعری میں جن لوگوں نے کمال حاصل کیا ان میں شیخ فرید الدین عطار (م ۶۲۷ھ) خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن 'منطق الطیر' ان کا شاہکار ہے۔ یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے جس میں وحدت الوجود کے مسئلے کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز حمد وثنا سے ہوتا ہے، اس کے بعد نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور پھر خلفائے راشدین کے مناقب بیان ہوئے ہیں۔

پہلی منقبت خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں ہے۔

خواجۂ اوّل کہ اوّل یار اوست ثانِی اثنین از ھُما فی الغار اوست
ہرچہ حق از بارگاہ کبریا ریخت در صدر شریف مصطفی
آں ہمہ در سینۂ صدیق ریخت لاجرم تا بود ازو تحقیق ریخت

دوسری منقبت خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے بارے میں ہے۔

خواجۂ شرع آفتاب جمع دین ظلِّ حق فاروق اعظم شمع دین
آنکہ دارد بر صراط اوّل گزر ہست او از قولِ پیغمبر عمر
کار دین از عدل او انجام یافت نیل جنبش زلزلہ آرام یافت

تیسری منقبت میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے:

خواجۂ سنت کہ نور مطلق است بل خداوند دو نورِ پُر حق است

سیّد سادات گفتے بر فلک　　شرم دارد دائم از عثمان ملک
جون نبود او تا کند بیعت قبول　　بد بجائے دست او دست رسول

چوتھی منقبت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں لکھتے ہیں:

خواجۂ حق پیشوائے راستین　　کوہ حلم و بابِ علم و قطب دین
ساقیِ کوثر امام رہنمای　　ابن عم مصطفی شیر خدای
مرتضای مجتبا جفت بتول　　خواجۂ معصوم ، دامادِ رسول

شیخ عطار نے ان نظموں میں کہیں بھی غلو اور مبالغے کو داخل نہیں ہونے دیا۔ زبان بے تکلف' رواں اور سادہ استعمال کی ہے اور کہیں بھی ابہام اور پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دی۔ خلفائے راشدین کے مناقب بیان کرتے ہوئے ان کے قلم نے فرطِ عقیدت سے لغزش نہیں کھائی اور ان کے ان اوصاف ہی کا ذکر کیا ہے جو قرآن و حدیث یا کتب سیرت میں مذکور ہیں۔ پختگی' برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا روم (م ۶۷۲ھ) کی پہچان ان کی مثنوی ہے جس میں اُنھوں نے رموزِ معرفت کو کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہاں خلفائے راشدین اور دیگر صحابہؓ کی مدح بھی موجود ہے۔ دیوان شمس تبریز میں اُنھوں نے اہل بیت کی تعریف میں بھی اشعار لکھے ہیں۔

جز کتاب اللہ و عترت ز احمد مرسل نماند　　یادگاری کان توان تا روزِ محشر داشتن

لیکن منقبت نگاری کی تاریخ میں ان کی غزلیات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ شمس الدین تبریز کی مدح بھی لکھی ہے۔ بعض غزلوں میں تو اُنھوں نے شمس الدین کی ردیف بھی استعمال کی ہے۔ ان کی اکثر غزلیں ان ہی کے نام پر ختم ہوتی ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے:

شمس تبریزی کہ نور مطلق است　　آفتابست و ز انوار حق است
این نفس جان دامنم برتافتہ ست　　بوی پیراھان یوسف یافتہ ست
کز برای حق صحبت سال ہا　　باز گو حالی از آن خوش حال ہا
من چہ گویَم یک رگم ہشیار نیست　　شرح آن یاری کہ او را یار نیست

شعرا نے عام طور پر منقبت نگاری کے لیے قصیدہ یا مثنوی کی ہیئت استعمال کی ہے۔ مثنوی مولانا روم فارسی زبان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ وہ روایتی انداز میں یا ذرا تفصیل کے ساتھ یہاں اپنے شیخ کی مدح لکھ سکتے تھے اور اُنھوں نے کئی جگہ ان کا ذکر کیا بھی ہے لیکن اُنھوں نے مدح شیخ کا حق ادا کرنے کے لیے غزل کا میدان منتخب کیا۔ عشق کی حرارت' جذبات کی گہرائی اور گیرائی کے اظہار کے

لیے غزل سے بہتر اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ لہٰذا مولانا نے اپنے لیے ایسی ہیئت کا انتخاب کیا ہے جو ان کے احساسات کی شدت اور جذبات کے سوز و گداز کے لیے سب سے مؤثر وسیلۂ اظہار ہوسکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے پیرو مرشد کی دینی خدمات، رسول کی اتباع، احکامِ دین کی پابندی وغیرہ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ ایک مجذوب پیر تھے، لیکن اپنے بیان میں غیر معمولی اثر اور اپنی ذات میں ایک زبردست کشش رکھتے تھے۔ مولانا روم اسی مقناطیسی قوت کے اسیر تھے اور ان کے اشعار پر شیفتگی کی قوسِ قزح محیط نظر آتی ہے۔

شیخ سعدی (م۶۹۱ھ) کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے، واعظ تھے، حسن پرستی اور رندی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ تصوف کی تعلیم اُنھوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے حاصل کی اور اُنھی کے فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراحل طے کیے۔ شیخ کے والد مذہب کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے اس لیے مذہبی میلان طبع اُنھیں ورثے میں ملا تھا۔ نعتیہ اشعار کی طرح ان کے منقبتی اشعار بھی سادگی اور خلوص کے جوہر رکھتے ہیں، اسی لیے ان میں اثر بھی ہے اور سوز بھی۔ ان کی گلستان اور بوستان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اس کا سبب یہی دل نشین پیرایہ بیان ہے۔ ان کے یہ اشعار زبانِ زدِ خاص و عام ہیں۔

خدایا بحق بنی فاطمہ		کہ بر قولِ ایمان کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول		من و دست و دامانِ آلِ رسولؐ

ان کے قصائد میں خلفائے راشدین کی مدح یوں کی گئی ہے:

اے یارِ غار سیّد و صدیق نامور		مجموعۂ فضائل و گنجینۂ صفا
دیگر عمر کہ لایق پیغمبری بدی		گر خواجۂ رسل نبدی ختم انبیا
دیگر جمال سیرت عثمان کہ ہر نکرد		درپیش روی دشمن قاتل سر از حیا
کس را چہ زور و زہرا کہ وصف علی کند		جبار در مناقب اور گفتہ 'ھل اتیٰ'

اہل بیت اور خلفائے راشدین کی مدح لکھتے ہوئے اُنھوں نے خیال آرائی اور مضمون آفرینی سے کام نہیں لیا بلکہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں مدح کا راستہ متعین کیا ہے۔ وہ علم و دین پر مکمل عبور رکھتے تھے اس لیے حفظ مراتب سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

عراقی (م۶۸۸ھ) عراق کے رہنے والے تھے اسی لیے عراقی تخلص کیا۔ ایک قافلے کے ساتھ برصغیر آئے یہاں شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا علم و عرفان کی محفلیں آراستہ کیے ہوئے تھے، جن کی ضیاباریوں نے ایک عالم کو منور کر رکھا تھا۔ عراقی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ شیخ نے بڑی شفقت فرمائی اور اُنھیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

عراقی، فارسی زبان کے ممتاز شعرا میں سے ہیں۔ ان کا کلام سادہ اور رواں ہے۔ اُنھوں نے جذباتِ عشق ومحبت کو بڑی خوب صورتی سے نظم کیا ہے۔ جذب وکیف کی جو حرارت عراقی کے یہاں ہے، وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ اُنھوں نے جو قصائد شیخ الاسلام خواجہ بہاؤ الدین زکریا کی مدح میں لکھے ہیں، ان میں عراق کی فنی چابک دستی کے علاوہ شیخ سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

شیخ شیوخ جہان قطب زمین و زمان — غوث ہمہ انس و جان مُعتقِ مالکِ رقاب
ناشر علم الیقین، کاشف عین الیقین — واجدِ حق الیقین ہادیِ مہدی خطاب
پرسی اگر از جہان کیست امام الامام؟ — نشنوی از آسمان جز زکریا جواب
سالک مسلوک را بر در او بازگشت — طالب مطلوب را از در او فتح یاب
روشنان آئینۂ دل چو مصفا بینند — روئے دلدار دران آئنہ پیدا بینند
خاص حق صاحب قدوس بہاء الاسلام — غوث دین رحمت عالم زکریا بینند
خاک پایش بتبرک ھمہ در دیدہ کشند — تا مگر از مددش نور تجلاّ بینند
قطب وقت اوست ہمہ عالم از آسودہ — ہر درس زمرۂ ابدال تولاّ بینند
شیخ ربانی بہاء الحق والدین آنکہ ما — بوسہ برخاک درش چون قدسیان ہردم زنیم
پائے چون روح القدس بردیدۂ صورت نہیم — آتشی از سوز دل درسنگرِ آدم زنیم
خرمن ہستی بباد بے نیازی در دہیم — دست درفتراک صاحب ہمت اعظم نہیم
خاک رویم از سرکویش بہ جاروب وفا — ور بماند گرد کے از دیدہ اورانم زنیم

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے فیوض و برکات سے سارا ملک مطلع انوار بنا ہوا تھا۔ آپ کے عہد کو خیرالاعصار کہا جاتا ہے۔(۲۸) آپ علوم ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے مقامات و احوال میں کامل تھے۔ ان کے علمی فیضان اور روحانی کمالات کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم عراقی کے اشعار پڑھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ عقیدت کی انتہائی بلندیوں پر پرواز کرنے کے باوجود اُنھوں نے بے جا مبالغہ آرائی کو شعار نہیں بنایا اور وہی کچھ لکھا جو اُنھوں نے محسوس کیا یا مشاہدہ کیا۔

جامی (م ۸۹۸ھ) خراسان کے علاقہ جام میں پیدا ہوئے اس لیے جامی کہلائے۔ ہرات کے مدرسہ نظامیہ سے علومِ دینی کی تعلیم حاصل کی۔ ایک بزرگ سعد الدین تفتازانی خواجہ بہاء الدین نقش بندیہ کے خلیفہ تھے۔ ان کی بدولت سلسلہ نقش بندیہ میں شامل ہوئے۔ جامی ممتاز عالم دین اور قادرالکلام شاعر تھے۔ نعت گوئی ان کا میدانِ خاص ہے، ان کا نعتیہ کلام اس اخلاص اور شیفتگی کا آئینہ دار ہے جو اُنھیں سیّد دوعالم کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ کیف ومستی اور جذب وشوق ان کے کلام کا

امتیازی وصف ہے۔ اُنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں شعر کہے ہیں:

نوح را عبداً شکورا گفت در اسریٰ ولے　　سعیکم مشکور آمد مر ترا در ہل اتی

لیکن اُنھوں نے اپنے شعروں میں خاص طور پر خواجہ بہاء الدین نقش بند کے ساتھ دِلی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے۔ اُنھوں نے ایک تیس اشعار کی نظم ’’درمنقبت قطب الطریق غوث الخلائق خواجہ بہاء الملت والدین محمد بخاری المعروف نقش بند قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز‘‘ لکھی ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے:(۲۹)

در خم ایں دائرہ نقش بند　　چند شوی بند بہر نقش بند

مدح کا انداز یہ ہے:

قطب دین نقطۂ توحید او　　خلعتِ دین خرقہ تجرید او
اوّل او آخر ہر منتہی　　آخر او جیبِ تمنا‘ تہی
صورت اوٗ راست بہ میزان شرع　　جان وی و زندگی از جان شرع
حق طلبان را بہ نظرہای خاص　　دادہ ز اندیشۂ باطل خلاص

یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں قابل ذکر ہیں۔ ان میں بھی جامی نے مثنوی نگاری کی روایت کو نبھایا ہے اور نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیر طریقت خواجہ عبیداللہ نقش بند کی منقبت لکھی ہے۔ جامی کے ہاں تکلف اور تصنع نام کو نہیں‘ ان کا اسلوب سادہ‘ رواں اور شیریں ہے اور جو شخص فارسی سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

محتشم کاشانی (م۹۹۶ھ) صفوی دور کا مشہور شاعر تھا۔ ابتدا میں عشقیہ شعر کہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے لیکن صفوی خاندان کے دینی رجحانات کو دیکھ کر ایسے اشعار لکھے جن میں اہل بیت کی تعریف اور ان کے مصائب کا تذکرہ ہوتا تھا۔ شاعری کے اس انداز نے بہت جلد ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا مرثیہ گو تسلیم کر لیا گیا۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی شہرت اور عظمت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسے فارسی میں وہی مقام حاصل ہے جو اُردو میں میر انیس کا ہے۔ اس کی زبان سلیس‘ رواں اور بے ساختہ ہے اور لفظی صنائع بدائع سے پاک ہے اس کا ہر مصرع خلوص وصداقت کا آئینہ دار ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں چند اشعار دیکھیے:

صورت معنی فطرت باعث ایجاد خلق　　بہترین نسل آدم نفس خیر المرسلین
آنکہ مداحش خدا ہمدم رسول اللہ بود　　گر کسے ہمتاش باشد ہم رسول اللہ بود

باخدا و مصطفی رائے تو یک رو داشتہ　　از خدا و مصطفی شمشیر دوختر یافتہ
بندۂ بے چارہ کاشی از دل و جان سال و ماہ　　روز و شب درخطۂ آمل ثنا خوانِ شما است

قاآنی (م ۱۲۷۲ھ): شجاع السلطنت فتح علی شاہ قاچار اور ناصر الدین کے مصاحبوں میں شامل تھے، اس لیے ان کی شاعری درباری شاعری ہے جس میں سلاطین و امرا کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے خاص طور پر نمایاں ہیں۔لیکن ایک مدحیہ قصیدہ امام ہشتم کی شان میں ہے جس کا مطلع ہے:

بگردون تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

۸۵ شعرون کا یہ قصیدہ قاآنی کی طباعی اور سخن وری کا کمال ہے۔سیّد امداد امام اثر اس قصیدے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس قصیدے کے اشعار تشبیب شوکت لفظی و معنوی ایسے رکھتے ہیں کہ کمتر کسی قصیدے کے اشعار تشبیب اس صفت خاص سے متصف دیکھے گئے ہیں۔فصاحت کا فائدہ نظر آتا ہے۔فصاحت کے ساتھ بلاغت کی آمیزش شاعری کی ممتاز صورت دِکھا رہی ہے۔رنگینیِ الفاظ کا یہ عالم ہے کہ مینا کاری کا حکم رکھتی ہے جو لفظ جہاں پر ہے، وہ ایک جڑاؤ جوہر ہے۔ان سب ندرتوں کے ساتھ عالی خیالی، بلند پروازی، نفاست، پاکیزگی، تمکنت اس درجہ ہے کہ جس کی اعلیٰ درجے کی شاعری متقاضی ہے۔ان محاسن کے علاوہ یہ اشعار نیچرل خوبیوں سے مملو ہیں''۔(۳۰)

حافظ شیرازی (م ۷۹۳ھ) نے قصیدے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ان کے زمانے میں شیراز کے جو جو حکمران گزرے ہیں ان سب کی مدح میں اُنھوں نے قصیدے لکھے ہیں۔سلطان محمود کی مدح مثنوی میں لکھی ہے لیکن ان کے اصل جوہر غزل میں کھلتے ہیں۔روانی، برجستگی اور صفائی کے علاوہ جوش بیان ان کی غزل گوئی کی صفت خاص ہے۔اُنھوں نے عام اور پامال مضامین کو بھی چھوا تو اسے حسن اسلوب اور جدت آراء سے دل آویز اور لطیف بنا دیا۔حافظ بزرگانِ دین سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے اس سلسلے میں ایک واقعہ ان کے اکثر تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے۔

حافظ کے زمانے میں شعر و سخن کے چرچے عام تھے۔چنانچہ اُنھوں نے بھی شاعری شروع کی لیکن طبیعت موزوں نہ تھی۔بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا رفتہ رفتہ ان کی لغو گوئی کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی۔لوگ تفریح کے لیے ان کو صحبتوں میں بلاتے اور لطف اُٹھاتے۔دو سال تک یہی حالت رہی۔لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ہوا۔ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور باباکوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔نام دریافت

کیا تو معلوم ہوا کہ امیر علیہ السلام ہیں‘‘۔(۳۱)

حافظ بنیادی طور پر رندی و سرمستی کے شاعر ہیں، لیکن ان کے دیوان میں ایک منقبتی غزل بھی موجود ہے جس میں حضرت علی اور امام ہشتم حضرت موسیٰ رضا کی مدح کی گئی ہے اور ان سے والہانہ محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مطلع ہے:

اے دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

دو اور شعر اس طرح ہیں:

امروز زندہ ام بولائے تو یا علی
فردا بروح پاک امامان گواہ باش
قبر امام ہشتم سلطان دین رضا
از جان ببوس و بر در آن بارگاہ باش

امام موسیٰ رضا کی منقبت میں پندرہ بندوں کی ایک مسدس بھی لکھی ہے۔

جد تو سلطان کونین ست یعنی مصطفیٰ جدۂ تو فاطمہ اُمِّ امام مجتبیٰ
جد دیگر حیدر صفدر علی مرتضیٰ ہم غریب و ہم شہیدی چون حسین کربلا
از محبت ہر زماں گوئیم و باشد ورد ما
کالسلام اے حضرت شاہ خراسان السلام

حافظ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں ایک زوردار قصیدہ بھی لکھا ہے جس کا مطلع ہے:

مقدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار
سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

اس کے چند اشعار یہ ہیں:

علی امام و علی ایمن و علی ایمان علی امین و علی سرور و علی سردار
علی علیم و علی عالم و علی اعلم علی حکیم و علی حاکم و علی مختار
علی نصیر و علی ناصر و علی منصور علی مظفر و غالب علی سپہ سالار

آخری تین شعر یہ ہیں:

بدشمنان منشین حافظؔا تولا کن نجات خویش طلب کن بجان ز ہشت و چہار
متابعت بمنافق چہ میکنی؟ بگذر زیادہ گفتن نامش ہزار استغفار

حافظ کے فن کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے مختصر سے الفاظ میں گہرے مطالب اور لطیف معانی ادا کیے ہیں۔ شیرینی، سادگی اور ایجاز ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان کی منقبت نگاری میں مولا کے ساتھ تبرا کا رنگ بھی نمایاں ہوا ہے جس نے اُردو شاعری میں بھی اپنی چمک دَمک دِکھائی ہے۔ اُنھوں نے جہاں اہل بیت کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہاں ان کے مخالفوں پر دشنام کے تیر بھی برسائے ہیں

برصغیر کے معروف فارسی گوشعراء

امیر خسرو (م ۷۲۵ھ): خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید باصفا تھے اور اُنھی سے اُنھوں نے سلوک، طریقت اور درویشی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ ازلی تھا۔ وہ سرتاپا عشق تھے اور یہ بجلی ان کی رَگ رَگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء سے بیعت کے بعد جو کچھ نقد و اسباب تھا، سب لٹا دیا اور ہر وقت خواجہ صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ خواجہ صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا نظام الدین کیا لائے ہو تو خسرو کو پیش کروں گا۔ (۳۲)

امیر خسرو کو ہندوستان میں فارسی کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے۔ بلندیِ فکر اور جودتِ طبع ان کا خاص وصف ہے۔ ان کے قصائد کا ذکر کرتے ہوئے شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اہل سخن کے نزدیک شاعر کی جودتِ طبع کا اندازہ گریز سے لگایا جاتا ہے اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں''۔ (۳۳)

ان کی غزلوں میں سوز و گداز کے علاوہ جدتِ تشبیہات، مضمون آفرینی اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور ''ان کی مثنویوں کا جواب تو ایران میں بھی نہ آیا''۔ (۳۴)

امیر خسرو کا دیوان جس میں بیشتر قصیدے سلاطین دہلی کے نام ہیں، پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے تین حصوں یعنی تحفۃ الصغر، وسط الحیٰوۃ اور غرۃ الکمال میں خواجہ نظام الدین اولیاء کی مدح میں قصائد موجود ہیں۔

اُنھوں نے اپنی مثنویوں میں بھی مدح شیخ کا حق ادا کیا ہے۔

مثنوی مطلع الانوار کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

شیخ امم، قطب حقیقت نظام   خضر و مسیح از دم یحیی العظام
آن بولایت شدہ سلطان پناہ   دوختہ از ترک دو عالم کلاہ

مفتخر از وے بغلامی منم خواجہ نظام ست و نظامی منم

امیر خسرو کو اہل بیت‘ خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی محبت وعقیدت ہے۔اس کا اظہار اُنھوں نے مختلف اشعار میں کیا ہے۔

یکی یگانہ ابوبکر ثانی اثنین که بوده است به راه خدای جان افشاں
دوم عمر که ز بهر نفاذ فرمانش بر آبِ نیل رود بهر کور می شیطان
سوم چراغ دو شمع آفتاب ذوالنورین هر آسمان کرم ابر با حیا عثمان
چهار مین علی آن شهسوار دین کف برد حسام سر فلکنش گو می نصرت از میدان
دگر حسین و حسن نور دیدهٔ زهرا که واجب است هر احسان هر دو استحسان
صحابه هر همه خاص انذ خاصه معشرعشر همه مبشر رحمت شده به سیر خبان

عرفی (م۹۹۹ھ)صفوی دور کا اہم شاعر تھا۔اس نے جب شعر کہنے شروع کیے اس وقت شاعری کے میدان میں محتشم کاشی‘ وحشی یزدی اور غیرتی کے نام گونج رہے تھے۔اس کے باوجود عرفی نے اپنی ذہانت اور فنی مہارت کے سبب نام پیدا کیا۔یہ وہ دور تھا جب پاک وہند میں شاعری کے بڑے چرچے تھے۔بادشاہوں اور امرا کی فیاضیوں کی گونج دُور دُور تک سنائی دے رہی تھی۔عرفی نے جب یہ سنا تو برصغیر کا رُخ کیا اور یہاں دربارِ شاہی کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔اس کی شاعرانہ صلاحیتوں نے یہیں نشوونما پائی۔اس نے قصیدے‘ غزلیں اور قطعے لکھے ہیں۔اس کے مشہور قصیدوں میں سے ایک قصیدہ وہ ہے جو حضرت علی کی شان میں لکھا گیا ہے اور جس میں ۱۸۴ شعر ہیں۔عرفی کا یہ قصیدہ اس کے کمال فن کا آئینہ دار ہے۔اس میں وہ مضمون آفرینی، نازک خیالی‘ جدت تشبیہ‘ ندرت،طرفگی،طرز ادا تمام شعری وسائل کو بروئے کار لایا ہے۔اس کا مطلع یہ ہے:

جہاں بگشتم و دردا کہ ہیچ شہر و دیار
ندیده ام که فروشند بخت در بازار

چند مدحیہ اشعار دیکھیے:

غبار صحن سرائے تو اوج ہفت اورنگ شکنج زلفِ سخائے تو موجِ دریا بار
اگر نہ قہرِ تو یاد آرد آسمان شاید کہ خطہ منطقہ اش برمیان شود زنار
محیط بر کف جود تو کرد موج فدا سپہر بر سر جاه تو کرد اوج نثار

حسنِ تشبیہ وخوبیِ استعارہ کے علاوہ مترنم تراکیب کا استعمال بھی قصائد عرفی کی اہم خصوصیت ہے۔سبکِ ہندی کی ایک نمایاں خوبی خیال بندی ہے۔شاعر ایک خیال سے کچھ اس طرح نکتہ آفرینیاں

کرتا جاتا ہے کہ اشعار فکر کا ایک خوب صورت تار بن جاتے ہیں۔عرفی کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ ۱۸۴ اشعار کا مندرجہ بالا قصیدہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے محض رسمی قصیدہ نہیں لکھا بلکہ اسے اپنے ممدوح کے ساتھ دِلی محبت ہے اور اس کے ساتھ شاعری میں وہ اپنا ایک مخصوص رنگ و آہنگ رکھتا ہے۔

غنیمت کنجاہی (۳۵) خاکِ برصغیر پاک و ہند سے جنم لینے والے فارسی شعرا میں غنیمت کنجاہی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک بزرگ سیّد صالح محمد کے مرید تھے جو غوث الاعظم جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے اور خود بھی صاحبِ کمال تھے۔ ان کے فیض صحبت تھے۔غنیمت کی شخصیت میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور ان کی شاعری کے رگ و ریشے میں تصوف سرایت کر گیا۔عقیدے کے لحاظ سے وہ سنی المذہب تھے اور تصوف کے قادری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔حضرت غوث الاعظم کے ساتھ ان کی وابستگی عشق بلکہ جنون کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے سامنے جب غوث الاعظم کا نام لیا جاتا تو فوراً سجدے میں گر جاتے۔اُنھوں نے غوث الاعظم کی شان میں بڑے زوردار قصیدے لکھے ہیں۔

ایک قصیدے کا مطلع ہے:

آہ زین طائفہ ای لافِ محبت بزبان
جملہ یک گرہ ی بوسہ بشوق لب نان

مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں

می زدندی رہ دین گر نشدی رہبر من — قبلۂ پاک دلان' کعبۂ ومقصود جہان
غوث اعظم' شہ شاہان زمان محی الدین — قطب اقطاب جہان مظہر فیض یزداں
آنکہ از شمع سر تربت او حاصل شد — قدسیان را بفلک نو چراغ ایمان

ایک اور قصیدے کے چند اشعار دیکھیے:

من و خاک جناب قبلہ ای جان شاہ گیلانی — کہ می بازد بنامش اسم اعظم عشق پنہانی
خیالش ہر کہ را عرض تجلی کرد در خاطر — برنگِ مردمک گردید داغ سینہ نورانی
بود در بارگاہش بندگان شوق پرور را — شکستت شیشہ ای دلہا صدای کوس سلطانی

مخصوص اور جذبے کی سچائی غنیمت کے کلام کی اہم خوبی ہے۔اُنھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ سادہ' سلیس اور رواں انداز میں کہا۔ان کا ادبی اثاثہ فارسی ادب کے قابل قدر ذخیرے میں شمار ہوتا ہے۔

عبدالقادر بیدل (۱۰۵۴ھ تا ۱۱۳۳ھ) کا تعلق شاعری کے اُس دبستان سے ہے جو سبک ہندی کے نام سے موسوم ہے۔ان کے زمانے میں یہ اسلوبِ شاعری ارتقا کی منزلیں طے کر کے اپنے منتہائے

کمال کو پہنچ چکا تھا۔ ان کی باریک بین اور نکتہ سنج طبیعت کو یہ انداز بہت پسند آیا اور اس میں ان کے جوہر خوب کھلے۔ بیدل کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد شیخ عبدالقادر جیلانی سے گہری عقیدت رکھتے تھے، اسی لیے اُنھوں نے اپنے بیٹے کا نام اُنھی کے نام پر عبدالقادر رکھا۔ چنانچہ تصوف سے وابستگی اُنھیں ورثے میں ملی تھی۔ اُنھوں نے خواب میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو ان کے ساتھ تعلق خاطر اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔

بیدل نے بہت سی اصنافِ سخن قصیدہ، غزل، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعیات میں طبع آزمائی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر صنف میں ان کی انفرادیت اور امتیازی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے فکر وزبان کو شاہان روزگار کی مدح و ستائش سے آلودہ نہیں کیا۔ جس طرح ان کی زندگی کا انداز قلندرانہ اور بے نیازانہ تھا وہی شان استغنا اُن کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے بیشتر قصائد حمد باری تعالیٰ، نعت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ہیں۔ ان کا مدحیہ قصیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے۔ یہ انوریؔ کے جواب میں لکھا گیا ہے اور عرفان وحکمت کی گوہر ریزی کے باعث انوریؔ کے قصیدے سے کسی صورت بھی کم نہیں ہے۔ شینیہ قصیدہ بھی آپ کی منقبت میں ہے۔ اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

کدامین شیر یزداں مرتضیٰ آن صفدر غالب — کہ می خوانند مردان حقیقت شاہ مرد انش
دو طاق منظر رحمت خم محراب ابرویش — دو مصراع در علم نبی لب ہائے خندانش
چو ذات حق بچندین دستگاہ عالم اسما — بخود گنجیدہ چندانے کہ نتواں یافت پایانش

مرزا غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ وہ اُردو کے مقابلے میں فارسی شعرگوئی کو باعث افتخار تصور کرتے تھے۔ ایک قطعے میں وہ ذوق کو اس طرح خطاب کرتے ہیں:

فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ مناسبت دیکھی گئی ہے۔ مرزا بھی اس کُلیے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تصوف، حب اہل بیت، احساسِ تفاخر، شوخی، ظرافت، عشق ومحبت کسی میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ جدت طرزِ ادا، ندرت تشبیہ واستعارہ، ایجاز واختصار، رمزیت اور پہلوداری کے علاوہ نکتہ آفرینی اور تخیل کی بلند پروازی ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ غالب نے حمد میں ایک قصیدہ اور نعت میں صرف دو قصیدے لکھے ہیں، البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں پانچ

قصیدے کہے ہیں اور جو قصیدہ نعت اور منقبت دونوں پر مشتمل ہے۔ وہ غالب کی اس محبت وعقیدت پر دلالت کرتا ہے جو اُنھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہے اور جن کے اوصاف سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جیسے ہیں۔ مجموعی طور پر فارسی کے چونسٹھ قصیدوں میں سے بارہ قصیدے حمد ونعت کے علاوہ حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت عباس علم دار اور بارھویں امام مہدی سے متعلق ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے نصیریوں کے ہم خیال ہوجاتے ہیں۔

یارب ز یاعلی نشناسم قلندرم — یک مے بہ آبگینہ و ساغر بر آورم

در دل بہ جستجو ہمہ ایزد در آورم — وز لب بہ گفتگو ہمہ حیدر برآورم

نصیریوں کی ہم خیالی ایک اور قصیدے میں بھی ہے۔

نفس نبیؐ، خدائے نصیریؔ، امام خلق — آن منت عظیم کہ حق بر جہان نہاد

پروردگار ناطقۂ عارفان علی — کز حزنِ حق بکام زبان داستان نہاد

فارسی قصائد میں ایک قصیدہ جو امام حسین رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے، وہ اپنا جواب آپ ہے۔ وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

ابر اشک بار و ما خجل از ناگریستن

دردا تفاوت آب شدن تا گریستن

مدح کے چند شعر دیکھیے:

اے آنکہ در حرم حجر الاسود ازغمت — دارد بخود نہان چو سویدا گریستن

سیمائے ماتم تو ستایم کہ زین شرف — شد روشناس دیدۂ حورا گریستن

رضوان بہ آبیاریِ گلشن نمی رود — درماندہ در گریستن و وا گریستن

مجموعی تنقیدی جائزہ

انسان کا طرزِ زندگی اس کی سوچ اور فکر کو متاثر کرتا ہے۔ جس دور میں فارسی کا آغاز ہوا اس میں زندگی تکلفات سے مبرا تھی۔ اس لیے اس دور میں شاعروں نے سادہ، بے تکلف اور صاف الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اُنھوں نے غیر مانوس تشبیہیں اور نا قابل فہم استعارے استعمال نہیں کیے اور جس مضمون کو چاہا، کسی اینچ پینچ کے بغیر سادگی کے ساتھ بیان کیا۔ یہی سادگی اور بے تکلفی فارسی شاعری کے دورِ اوّل کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ فردوسی، ناصر خسرو اور حکیم سنائی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایرانیوں کو اپنی تاریخ اور تہذیب وتمدن پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ چنانچہ فردوسی نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی شاہنامہ لکھ کر قدیم ایرانیوں کو زندہ جاوید کر دیا۔ مثنوی ایرانیوں کی ایجاد ہے اور اُنھوں نے

ہی اس کی روایات کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑی شدت سے پایا جاتا ہے کہ جس کام کا آغاز خدا‘ رسول اور بزرگانِ دین کے نام سے ہو، اس میں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ چنانچہ مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ‘ نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم‘ ذکر صحابہ و اہل بیتؓ سے ہونے لگا۔ مثنوی جیسی نئی صنف سخن کے لیے حمد نعت اور منقبت کی یہ ترتیب شعر گوئی کا ایک نیا انداز ثابت ہوئی اور بعد میں آنے والے مثنوی گوشاعروں نے اسے اپنے لیے ایک روشن مثال تصور کیا اور اس کی پیروی کی۔

فارسی شاعری کا دوسرا دور ساتویں صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کا دامن تاتاریوں کی یلغار اور بربریت سے خونچکاں ہے۔ اس ظاہری شکست و ریخت کے باوجود فارسی شاعری کا یہ دور رخشندہ و تابندہ ہے اس دور کی شاعری میں صنائع بدائع کے علاوہ سادگی‘ جوش اور پختگی ہے۔ غزل ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے اُبھرتی ہے۔ شاہی درباروں سے شاعروں کا تعلق کم نظر آتا ہے جو حتی المقدور خوشامد اور تعلق سے آزاد ہے۔ شعرا نے شعر و سخن کو وسیلۂ تبلیغ بنایا اور فقر و تصوف کے مضامین کو دل آویز اور رنگین پیرائے میں بیان کیا۔ عطار‘ رومی‘ سعدی‘ حافظ‘ جامی اور امیر خسرو اس دور کے اہم شعرا ہیں۔ اس دور میں لاکھوں انسان تلوار کے گھاٹ اُتار دیئے گئے اور بے شمار گھر بے چراغ ہو گئے۔ چنانچہ خارج سے باطن کی طرف رجوع‘ صوفیانہ مسائل‘ دنیا کی ناپائے داری اور انسانی زندگی کی ہیچ مقداری جیسے موضوع عام ہو گئے۔

فارسی شعر و سخن کا تیسرا دور دسویں سے بارھویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا ہے۔ دسویں صدی کے اوّائل میں ایران پر صفوی خاندان کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ صفوی حکمرانوں کی ذاتی دلچسپی کے باعث ان کے دور میں مذہبی شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ مضمون آفرینی‘ صنائع لفظی و معنوی کا استعمال‘ تمثیل نگاری‘ باریک بینی‘ بلند پروازی اس دور کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ محتشم کاشی‘ عرفی‘ قاآنی‘ بیدل اور غالب اس طرزِ سخن کے علم بردار ہیں۔ صفویوں کے دور میں مرثیہ اور منقبت نگاری کو خصوصی فروغ حاصل ہوا۔

معاشرتی انحطاط کے سبب اخلاقی قدریں ٹوٹنے لگیں‘ ہر شخص اپنی ذات کے خول میں مقید ہو گیا۔ دوستی کا وہ معیار نہ رہا کہ دوسروں کی خاطر جان کی بازی لگا دی جائے۔ خلوص و محبت اور مہر و وفا کی شمعیں بجھنے لگیں‘ ظلم و ستم کا دور دورہ ہوا‘ انصاف دنیا سے اُٹھ گیا‘ شرافت اور حیا نے اپنا چہرہ چھپا لیا‘ طبیعتوں سے غنا جاتی رہی اور لوگ سونا چاندی جمع کرنے کے پیچھے لگ گئے۔ علم و فضل‘ بہادری و فتوت‘ غریبوں اور مسکینوں کی دل داری جیسی صفات ختم ہوگئیں۔ لوگ ہمت اور حوصلہ ہار گئے اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونا ان کے بس میں نہ رہا۔ اس صورتِ حال میں منقبت کو شعرا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے خلوص و وفا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی غنا اور شرافت و حیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم و فضل اور شجاعت و بہادری کو موضوع شعر بنایا۔ مشائخ طریقت اور بزرگانِ دین کی صحبت انسان کے زخمی دل پر مرہم کا کام دیتی ہے۔ شاعروں نے ان کے ذکر سے دُکھی انسانیت کو سکون و راحت کا پیغام دیا۔ اس دور میں جو منقبت نگاری ہوئی، وہ رسمی نہیں مقصدی ہے۔ یہ وقت کی ضرورت تھی جسے فارسی شعرانے بطریق احسن پورا کیا۔

حوالہ جات

۱۔ العمدہ ص ۲۰ مطبوعہ مصر

۲۔ تاریخ ادب عربی: احمد حسن زیات: ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی ص ۶۷

۳۔ سورہ الشعراء آیت ۲۳۴

۴۔ سورۂ یٰسین آیت ۶۹

۵۔ تاریخ ادب عربی۔ از استاد احمد حسن زیات ص ۱۸۴

۶۔ دربارِ رسول کے ممتاز شاعر، ۵۴ھ میں ایک سو بیس برس کی عمر میں آسودۂ خاک ہوئے۔ ان کی عمر کے ساٹھ سال زمانۂ جاہلیت میں گزرے اور ساٹھ سال اُنھوں نے اسلام کی خدمت کی۔

۷۔ اُم معبد کے خیمے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

۸۔ عربی میں نعتیہ کلام از عبداللہ ندوی ص ۴۷

۹۔ مختصر سیرۃ الرسول

۱۰۔ شرح دیوان حسان بن ثابت از عبدالرحمن البرخونی مطبوعہ مصر ص ۲۹۹

۱۱۔ اُردو نعت۔ ڈاکٹر ریاض مجید غیر مطبوعہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ص ۱۰۳

۱۲۔ تاریخ ادب عربی۔ ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی ص ۱۷۸

۱۳۔ تاریخ ادب عربی۔ ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی ص ۱۷۸

۱۴۔ بصرہ میں پیدا ہوا۔ اہل بیت کی مدافعت اور حمایت میں اس کے کچھ قابل تعریف کارنامے ہیں۔ بنیادی طور پر ہجو گو شاعر تھا۔ ۱۱۰ھ میں فوت ہوا۔

۱۵۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۹۴

۱۶۔ کمیت بن زید اسدی ۶۰ھ کو کوفہ میں پیدا ہوا۔ زبان سیکھنے کے بعد ادب اور علم میں مہارت حاصل کی۔ ایک دفعہ بنی اُمیہ کی مذمت اور بنو ہاشم کی مدح کرنے پر ہشام نے اس کے قتل کا حکم دیا لیکن وہ جیل سے بھاگ نکلا اور شام جا کر معاویہ بن ہشام کی قبر سے پناہ گیر ہوا جس پر خلیفہ نے اسے معاف کر دیا۔ ۱۲۶ھ میں انتقال کیا۔

۱۷۔ شاعر ہونے کے علاوہ عربی صرف ونحو کا ماہر تھا۔م ۶۹ھ
۱۸۔ شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن خمریات کی وجہ سے خصوصی شہرت حاصل کی۔م ۱۹۹ھ
۱۹۔ تاریخ ادب عربی، احمد حسن زیارت، ص ۷۹
۲۰۔ ایضاً ص ۱۷۷
۲۱۔ Litrary history of persia P.194
۲۲۔ ترجمہ تاریخ ادبیات ایران۔رضا زادہ شفق ص ۵۹
۲۳۔ مقالات جلال پوری ص ۹۵
۲۴۔ ناصر خسرو(م ۴۸۱ھ) عہد سلجوقیہ کے ابتدائی دور کا ایک ممتاز شاعر، نامور سیاح اور اسماعیلی مبلغ تھا۔اس نے شاعری کو اپنے عقائد کی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔
۲۵۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، ص ۱۱۲
۲۶۔ شعر العجم جلد اوّل ص ۱۴۷
۲۷۔ اُردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ص ۱۱۵
۲۸۔ تذکرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، ص ۷۵
۲۹۔ مثنوی تحفۃ الاحرار، ص ۳۵
۳۰۔ کاشف الحقائق، جلد دوم، ص ۲۲۴
۳۱۔ شعر العجم، شبلی نعمانی، جلد دوم، ۱۶۱
۳۲۔ ایضاً، ۹۸
۳۳۔ ایضاً، ۱۲۷
۳۴۔ نقد ونظر، حامد حسن قادری، ۱۶۸
۳۵۔ ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہوسکیں۔اتنا معلوم ہے کہ ان کا دور اورنگ زیب کا دور تھا۔

□□□

آلِ نبیؐ سفینۂ بحرِ نجات ہے
اصحابؓ ہیں نجوم سرِ آسمانِ خیر

(حفیظ تائبؔ)

اُردو منقبت کا فکری تنوع: ایک جامع جائزہ

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

ABSTRACT: Dr. Yahya Nasheet's article, titled "The Intellectual Diversity of Urdu Manqabat: A Comprehensive Review," offers a chronological exploration of the thematic and intellectual evolution of manqabat in Urdu literature—beginning with Khwaja Banda Nawaz Gesu Daraz and culminating in the works of Josh Malihabadi. Covering the pre-Partition era, the essay systematically surveys the ideological depth and thematic range of manqabat across the classical Urdu literary tradition. It critically engages not only with the prominent poets but also with the devotional poetry of their disciples, thereby presenting a layered understanding of the genre. The author's style combines rigorous research with analytical insight and shows a clear command of normative literary criticism. Biographical references are strategically employed to illuminate the religious dimensions of the poets' works. Within a single, well-structured study, the author brings together the essential literary corpus relevant to manqabat until the formation of Pakistan. This essay stands as a vital academic resource; any serious engagement with classical Urdu manqabat would be incomplete without reference to this work—a fact that underscores its enduring scholarly value.

منقبت سے مراد اہلِ بیت نبی ﷺ، اصحاب کبار اور اولیاء اللہ کی تعریف ہے۔ اصحاب کبار اور اہل بیتِ نبیؐ کی عظمت و بزرگی کی گواہی تو قرآن حکیم میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کی عفت اور آپ کی پاکیزہ، مطہر، بے داغ زندگی کی شہادت سورۂ نور میں موجود ہے۔ عبداللہ بن ابی، زید بن رفاعہ اور مسطح بن اثامہ وغیرہ نے حضرت عائشہؓ پر جو بہتان باندھا تھا، اللہ رب العزت نے سورۃ النور

میں اس بہتان سے آپؓ کی برأت کا اعلان کیا اور ان افواہوں کو بہتانِ عظیم سے تعبیر کیا۔ دراصل سورہ نور میں اس ''واقعۂ افک'' کی تردید حضرت عایشہؓ کی منقبت ہی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو قرآن میں ''صاحب النبیؐ'' (سورہ توبہ آیت ۴۰) کہا گیا ہے۔ یہ توصیفی الفاظ گویا آپؓ کی شانِ مبارکہ میں منقبت ہی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق مسلم شریف کی ایک حدیث ہے کہ 'آپ نے ازواجِ مطہرات سے نصیحتاً کہا تھا ''بعید نہیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تم سے بہتر بیویاں آپؐ کو عطا فرما دے۔ حضرت عمرؓ آگے کہتے ہیں کہ میں اللہ کا شکر بجالاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ امید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق فرمادے گا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد سورۂ تحریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ''عسیٰ ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجاً خیراً''، یعنی بعید نہیں کہ اگر نبیؐ تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی بیویاں تمھارے بدلے میں عطا فرمادے جو تم سے بہتر ہوں۔ حضرت عمرؓ کے قول کی منجانب اللہ تصدیق ہو جانا، کیا حضرت عمرؓ کی منقبت و مدح نہیں ہے؟ حضرت عثمانؓ کی سخاوت کے متعلق بھی قرآن حکیم میں اشارے ملتے ہیں۔ رہے حضرت علیؓ تو سورۃ الدہر کی شانِ نزول ہی آپؓ کی عظمت و بزرگی کی مظہر ہے۔ علامہ زمخشری، امام رازی اور علامہ نظام الدین نیشاپوری نے حضرت علیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات حسنینؓ کی شفایابی کے لیے حضرت علی اور آپ کی زوجہ حضرت فاطمہؓ نے تین روزوں کی نذر مانی تھی۔ مفلسی اور جودِ طبع کی وجہ سے آپ دونوں کو تین دن تک سحر و افطار کے لیے کچھ نہ مل سکا اور آپ بلا کچھ کھائے روزے رکھتے رہے۔ اس پر ''الدھر'' کی جو آیتیں نازل ہوئیں، وہ اہلِ بیت کی گویا منقبت میں ہیں۔

اہل بیت اور اصحاب کبارؓ کی منقبت میں ایک باب ہی احادیث کی کتب میں پایا جاتا ہے۔ مشکوٰۃ کی ایک حدیث میں حضرت انسؓ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ جس طرح لذیذ کھانے کے لیے نمک ضروری ہے، اسی طرح میری امت میں میرے اصحاب کی حیثیت ہے۔ دوسری جگہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ''میرے صحابہ نجوم کی مانند ہیں۔''

ترمذی میں عبد اللہ بن شقیق روایت کرتے ہیں ''میں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب میں کون حضورؐ کو زیادہ محبوب تھے؟ فرمایا: حضرت ابوبکرؓ۔ ایک حدیث میں حضرت ابوبکر و عمرؓ کو آپؐ نے کان اور آنکھ سے تشبیہ دی۔ حضرت ابو عمرؓ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابوبکرؓ سے فرمایا: ''تم حوض پر میرے ساتھی ہو اور غار میں بھی''۔ دوسری جگہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جس قوم میں ابوبکرؓ ہوں اس کو نہ چاہیے کہ ان کے سوا کوئی اور ان کی امامت کرے۔''

(ترمذی باب المناقب، مترجم سیّد نذیر الحق قادری، دہلی ص: ۶۸۰۔۶۸۱)

حضرت عمر بن الخطاب کے متعلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کوئی پیغمبر ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتے۔'' (ترمذی) دوسری جگہ ارشاد گرامی ہے: ''پہلی امتوں میں محدث (فقیہ) ہوا کرتے تھے، اب اگر میری امت میں کوئی ہے تو عمر بن خطاب ہیں۔'' ایک جگہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''عمر! تم سے شیطان ڈرتا ہے، میں بیٹھا تھا وہ بجاتا رہا اور ابوبکر و عثمان اور علی داخل ہوئے تب بھی وہ بجاتا رہا، مگر اے عمر! جب تم داخل ہوئے تو اس نے دف کو رکھ دیا۔'' (ترمذی، ص: ۶۸۴)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنت میں اپنا رفیق کہا ہے۔ بیعتِ رضوان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا تھا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے، یعنی یہ عثمان کی بیعت ہے۔ ایک اور حدیث میں حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور بغرضِ نماز ایک جنازہ لایا گیا، لیکن آپؐ نے اس پر نماز نہیں پڑھی۔ استفسار کرنے پر ارشاد ہوا کہ یہ عثمان سے بغض رکھتا تھا، تو اللہ نے اس سے بغض رکھا۔''

حضرت علیؓ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہا کرتے تھے: ''بلا شک و شبہ علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔'' دوسری جگہ آپ کا قول صادق ہے: ''جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔'' حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں ''ہم لوگ منافقوں کو علی کے بغض سے پہچانتے تھے۔'' دوسری حدیث میں مومن اور منافق کی پہچان یہ بتلائی گئی ہے کہ مومن علی سے نفرت اور منافق آپؓ سے محبت نہیں کر سکتا۔'' ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''میں حکمت و دانائی کا گھر ہوں اور علیؓ اس کے دروازے ہیں۔''

حضرت فاطمہؓ سے متعلق آپؐ نے فرمایا: ''فاطمہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے۔''

یہ تمام احادیث اہل بیت اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی اگرچہ فضیلت اور منقبت میں ہیں، لیکن ابوہریرہؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں سے جاہلیت کا نسلی و آبائی فخر و غرور دور کر دیا ہے۔ یا تو اب پرہیزگار مومن ہے یا بدکار شقی۔ یعنی اب بزرگی اور فضیلت اور ذلت و نکبت کا معیار اچھے یا برے اعمال ہیں۔ لوگ آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔''

تقدیسی اصنافِ سخن میں سوائے مرثیہ کے اور کسی صنف کی بارگاہِ نقد و ادب میں اتنی پذیرائی نہیں ہوئی، جتنا کہ اس کا حق تھا۔ حالانکہ ان کی سلوٹوں میں بلاغت کے عمدہ نمونے پوشیدہ ہیں۔ ان کی اثر انگیزی، انقلاب آفرینی اور جمالیاتی اقدار دیگر اصنافِ سخن سے کم نہیں، بلکہ اہلِ نظر کے یہاں کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ناقدین شاید معتقدانہ ادب سے پہلو تہی برتنے ہی میں اپنی نجات متصور کرتے رہے ہیں۔ درآنحالیکہ افلاطون جیسا دانا، جس نے اپنی جمہوریت سے شاعروں کو جلاوطن

کرنے کا کہا تھا، ہومر اور اس کی ایلیڈ کے اشعار سے منحرف ہوجانے کے باوجود ایسی شاعری جس میں حمد یا بزرگوں کی مدح ومنقبت ہو، قبول کرلیتا تھا۔ اس شہادت کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دنیائے ادب میں باوجود اغماض برتا جانے کے، تقدیسی ادب ہی کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔

عربی میں منقبت

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں مدح وقصیدے کو خوب فروغ حاصل تھا۔ ان قصائد میں مدح و تعریف کے ساتھ نسلی وآبائی فخر وغرور اور شانِ خودداری کا ذکر بھی ہوتا تھا۔

امراؤالقیس، اعشیٰ وغیرہ کے قصائد میں مذکورہ عناصر مل جاتے ہیں۔ قرنِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں البتہ شعرائے اسلام کی مدحیہ شاعری کا مرکزی کردار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات شریفہ بنی تو وہ شعرا جو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سرشار اور کبر وتکبر اور خوشامدانہ جذبات سے بیزار تھے، ان شعرا کا مطمعِ نظر حضورؐ کے علاوہ بھی کوئی ہوسکتا تھا؟ ہاں! حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات پر ان شعرا نے مرثیے ضرور کہے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں کعب بن زہیر، حسان بن ثابت وغیرہ نے نعتِ رسولؐ کے علاوہ شاید ہی کسی خلیفہ کی مدح کی ہو۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے زیرِ اثر آبائی بزرگی و برتری سے اجتناب اس دور میں برتا جانے لگا تھا، لیکن خودداری اور انانیت جو عربوں کے ضمیر کا جوہرِ خاص ہے، اس کی بدولت بھی شاید خدا اور رسولؐ کے بعد انھوں نے کسی کو لائقِ مدح وتحسین نہیں سمجھا۔ البتہ بعض ایسے شعرا ضرور مل جاتے ہیں، جنھوں نے منقبت کی بجائے مرثیے کو ترجیح دی۔ مثلاً ابو ہریرہؓ کے وہ اشعار جو انھوں نے حضرت عثمان کی شہادت پر کہے تھے۔

سیّد سبط الحسن نے اپنی کتاب 'عربی مرثیہ کی تاریخ' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابنِ معاویہ نے مشہور شیعہ علی ابوالاسود الدؤلی کے پاس تحفۂ شہد بھیجا۔ اسود کی بچی نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ یہ اس لیے بھیجا کہ ہمارے دین میں ہم کو دھوکا دے۔ یہ سن کر بچی جس کی سرشت میں اہل بیت کی محبت تھی، کہہ اٹھی: "اے پسرِ معاویہ! کیا زعفران ملے ہوئے شہد کے عوض ہم اپنا دین و نیکیاں تیرے ہاتھ بیچ ڈالیں گے؟ پناہِ خدا، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ ہمارے مولیٰ امیر المومنین علیؓ ہیں۔" (سیّد سبط الحسن، "عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ"، لکھنؤ ۱۹۴۴ء، ص: ۲۶-۲۵)

کعبؔ اور حسانؔ کے برسوں بعد اموی دور میں فرزدقؔ، الکمیتؔ بن زید الاسدی، وعبلؔ اور مہیار الدیلمی وغیرہ کے یہاں اہل بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح ملتی ہے، جس کے لیے انھوں نے 'ہاشمیات' کا عنوان منتخب کیا تھا۔ اسی دور میں 'توابین' جماعت کے شعرا بھی اہلِ بیت کی مدح میں اشعار کہا کرتے

تھے۔ ان کے علاوہ امام شافعی، علی بن محمد بن منصور، طوسی، نظام الدین محمد اور سعد بن محمد کے یہاں بھی اہلِ بیت کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ البتہ عرب ناقدین کے نزدیک پہلی باقاعدہ منقبت حضرت حسان کی وہ نظم ہے، جو حضرت ابوبکرؓ کی شان میں کہی گئی تھی۔ اس کا ترجمہ پیش ہے۔

(۱) جب تو کسی قابلِ اعتماد بھائی کا ذکر کرے تو اپنے بھائی ابوبکر کا بھی ذکر کر، ان کارہائے نمایاں کی وجہ سے جو انھوں نے سرانجام دیئے ہیں۔

(۲) وہ اپنی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے ہیں۔ ان کے خصائص محمود ہیں۔ وہ تمام مخلوق میں پہلے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی۔

(۳) وہ دو میں سے دوسرے ہیں اس بلند غار میں جب دشمن نے چکر لگائے اس کے گرد جب وہ اس پر چڑھا۔

(۴) وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب ہیں اور لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ مخلوقات میں کوئی بھی ان کی برابری کا نہیں ہے۔ (شرح دیوانِ حسان بن ثابت، ص:۲۹۹)

سیدنا حسان کے ان اشعار در مدح ابوبکر کے بعد فرزدق کو عربی مناقب کا پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اس کا اولین منقبتی قصیدہ 'قصیدہ میمیہ' اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی اسے پڑھا جاتا ہے۔ تاریخ میں یہ واقعہ نقل ہوا ہے کہ "ہشام بن عبدالملک نے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے وقت حجرِ اسود کو چومنے کی کوشش کی، لیکن وہ زائرین کی بھیڑ کی وجہ سے وہاں تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اتنے میں امام علی زین العابدین تشریف لائے اور طوافِ کعبہ کے بعد حجرِ اسود کا رخ کیا، تو زائرین نے آپؓ کے لیے راستہ بنا دیا۔ ہشام کو بڑا تعجب ہوا کہ لوگوں نے میری پروا نہیں کی اور اس شخص کو جگہ دے دی۔ ایک شامی نے جب ہشام سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا تو اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ فرزدق وہاں موجود تھا اس نے امام زین العابدین کا تعارف اس طرح کرایا:

ھٰذالذی تعرف البطحاَ و طأته   والبیت یعرفة، و لحلّ والحرام

یعنی یہ وہ ہے جسے سرزمینِ بطحا جانتی ہے۔ اور خانہ کعبہ، حرم اور غیرِ حرم تمام مقامات آپ کو پہچانتے ہیں۔ یہ خیر العباد کا فرزند ہے۔ یہ تقی، نقی، طاہر اور سردار ہے۔ یہ حضرت فاطمہ کا بیٹا ہے۔ اس کے نانا ختم المرسلین ہیں۔ اگر تو انھیں نہیں جانتا تو اس سے ان کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یہ نرم خو ہیں اور کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔ اس کے نانا تمام انبیا سے افضل ہیں، جن کی امت کے سامنے ساری امتیں بے وقعت ہیں۔"

ہشام کو فرزدق کے یہ اشعار پسند نہیں آئے۔ اس نے انھیں گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔

ابونواس کے یہاں آلِ علیؓ سے محبت کا اظہار کرنے کا ڈھنگ کچھ علاحدہ ہے۔ وہ آلِ رسولؐ کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو شخص علوی نہ ہو اس کے لیے کوئی فخر نہیں۔ اللہ نے تمام مخلوقات میں پاکیزہ بنایا۔ وہ ملاء اعلیٰ ہیں۔ ان کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو درود وسلام بھیجا جاتا ہے۔ ایک شخص نے جب ابونواس سے پوچھا کہ تو آلِ طٰہٰ کی بڑی تعریف کرتا ہے، تو اس نے جواب دیا: ''میں ان لوگوں کی کیا مدح کر سکتا ہوں جن کے والد بزرگوار کا خادم جبرئیلؑ تھا۔''

کعب بن زید اسدی اپنے قصائد 'ہاشمیات' کی وجہ سے بنو ہاشم کے شاعر کہلاتے تھے۔

دورِ جدید میں جب جمال الدین افغانی کے اصلاحی پیغامات عربوں تک پہنچے تو معاصرین شعرا غیر معمولی طور پر ان سے متأثر ہوئے۔ چنانچہ احمد محرم نے 'الالیاذۃ الاسلامیہ' میں رسول اللہ اور صحابہ کرام کے کارناموں کو اشعار کے پیکر میں ڈھال کر منقبت اور مدحِ رسولؐ کا حق ادا کر دیا ہے۔ حافظؔ ابراھیم نے اپنی تصنیف 'العمریہ' میں تاریخِ فاروقی کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے جو جدید عربی شاعری میں مناقبِ عمر فاروقؓ کا عمدہ نمونہ ہے

اہلِ بیت اور صحابۂ کرام کے بعد اولیائے کرام کی مدح سرائی کا بھی ایک دستور رہا ہے۔ اگرچہ ولی کے لغوی معنی دوست یا مددگار ہوتے ہیں، لیکن اصطلاحاً ولی سے مراد عشقِ الٰہی میں مست اور معرفتِ خداوندی میں ڈوبے ہوئے لذاتِ نفسیہ و بہیمیہ سے دور رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں علاوہ انبیائے کرام کے، جن نفوسِ قدسیہ کا ذکر ملتا ہے، وہ سب منقبت کے ذیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ عربی ادب میں اولیائے کرام کی مدح کے نمونے بھی دستیاب ہیں، چنانچہ مولوی باقر آگاہ بیجاپوری نے اپنی کتاب 'محبوب القلوب' میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ (م ۵۶۱ھ/ ۱۱۶۶ء) کی مناقب میں لکھی ہوئی عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) انوار الناظر فی مناقب السیّد عبدالقادر	از شیخ ابوبکر عبداللہ بن نصر شافعی
(۲) روضۃ النواظر ونزہت الخواطر فی مناقب السیّد عبدالقادر	از امام محمد بن سعید ریحانی
(۳) بہجۃ الاسرار ومعدن الانوار	از شیخ نور الدین شطنوفی
(۴) خلاصۃ المفاخر فی مناقب السیّد عبدالقادر	از امام عبداللہ یافعی، شافعی
(۵) روض الناظر فی مناقب سیّد عبدالقادر	از شیخ مجدالدین فیروز آبادی
(۶) روض الزاہر فی مناقب السیّد عبدالقادر	از حافظ احمد بن محمد قسطلانی شافعی
(۷) درالفاخر فن مناقب السیّد عبدالقادر	از سیّد عبدالقادر عیدروسی

مناقب کی ان کتابوں میں باقر آگاہ نے بہجۃ الاسرار کو سب سے زیادہ پسند فرمایا ہے۔ ڈاکٹر

ابوالفضل سیّد محمود قادری نے بھی اپنی مرتبہ کتاب 'نذرِ عقیدت' مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۵۶ھ میں مناقبِ سیّد عبدالقادر جیلانی کی جن عربی کتابوں کے حوالے دیے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) المواعظ الزواجر (۲) زفرات الاشواق (۳) المجموعۃ الفریدہ

(۴) کحل الجواہر (۵) فتح المبین وغیرہ

عربی شعرا کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ وہ اپنے ممدوح کی جھوٹی تعریف نہیں کرتے بلکہ 'فعل حق اقول' کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ بیت کبار کے حق میں لکھے گئے ان کے مناقب میں مبالغہ یا غلو نہیں ملتا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں وہی باتیں لکھی ہیں جن کا انھوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ اولیائے کرام کے متعلق جو بھی کچھ مدحیہ اشعار عربی میں ملتے ہیں وہ بھی تصنع اور مبالغہ آرائی سے خالی نظر آتے ہیں۔ مثلاً سیّد عبدالقادر بن سیّد بہاء الدین جیلانی حضرت غوثؒ کی یوں تعریف بیان کرتے ہیں:

قطب الکمال الفاخر الطاہر ابن الطاہر
الباز عبد القادر سلطان الکل الاولیاء
قد نال غایات العلیٰ فضلاً علیٰ ا ھل الولا

اور شیخ حسن الکیانی الحلبیؒ مدح غوثؒ میں یوں سرشار نظر آتے ہیں:

یا قطب الاقطاب الالوان غوث الزماں
لفضلك اعترف الثقلان انس و جاں
یا باز یا عبد القادر شمس الدنیا
کنت کبیراً عن اکابر فی الاولیاء

فارسی میں منقبت

عربی ادب کے بعد جب ہماری نظر فارسی زبان وادب پر مرکوز ہوتی ہے تو خاندانِ صفویہ ہی کے زمانے سے اہلِ بیتِ اطہار کی مدح سرائی کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ اس دور کے شعرا اہلِ بیت کے محاسن اور فضائل بیان کرتے رہے ہیں۔ چونکہ ایران میں اُس وقت تک اثنا عشری مذہب رواج پا چکا تھا، اسی کے زیرِ اثر حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کی مدحت طرازی وہاں کے ادب کا حصہ بن چکی تھی۔ اہلِ تشیع کے یہاں تولاّ سے مراد اہلِ بیت کی تعریف ہے۔ یہ حضرات اہلِ بیت یعنی پنجتن پاک ہی کے لیے تولا کرتے ہیں۔ کچھ ایسے شعرا بھی ہوئے ہیں جو خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی شان میں بھی منقبتیں لکھتے رہے ہیں۔ لیکن سلجوقی دور میں برصغیر میں تصوف ایک علم کی صورت میں تشکیل پا کر شاذلیہ، نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ جیسے مختلف خانوادوں میں تقسیم ہوا، تو شاعری کو ایک موضوع ملا اور متصوفانہ شاعری وجود

میں آئی۔ ابوسعید ابوالخیر اور سنائی جیسے قدیم شعرا نے متصوفانہ شاعری میں بڑا کام کیا۔ رفتہ رفتہ خانقاہوں کے اکابرین اور اولیائے کرام کی یاد میں عرس کے نام پر سالانہ فاتحہ خوانی کی مجلسوں، صندل کے گشتوں اور سماع کی محفلوں میں قوالوں کے ذریعہ مناقب پڑھنے کی روایت قائم ہوئی تو شعرا نے مناقب کے دفتر لکھنے پر آمادگی کا اظہار کیا اور برصغیر کی زبانوں میں اچھا خاصا منقبتی ادب وجود میں آیا۔ اس طرح منقبتی شاعری کے تین واضح عنوانات قائم ہوئے۔ (۱) خلفائے راشدین کی منقبت (۲) اہل بیت کی منقبت اور (۳) اولیائے کرام کی منقبت۔ اردو کے تقدیسی ادب میں ان تینوں قسم کی ترجمانی ہوئی ہے۔ سطورِ بالا میں ہم عربی کی منقبتی شاعری کا مختصر سا جائزہ لے چکے ہیں اب فارسی ادب میں منقبتی شاعری کے خدوخال کا جائزہ لیں گے۔

فارسی میں سنائیؔ ایسا شاعر ہے جس کی تقدیسی شاعری میں مستقل تصانیف پائی جاتی ہیں۔ مثلاً 'حدیقہ' ان کی معروف مثنوی ہے جس میں متصوفانہ مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔ 'صدیقیہ' میں اہلِ بیت کی مدح اور بنو امیہ کی مذمت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے علاوہ سنائی کے یہاں منقبتی قصائد بھی پائے جاتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی مدح کرتے ہوئے سنائی کہتے ہیں:

خواجۂ حق، پیشوائے راستیں کوہِ حلم و بحرِ علم و قطبِ دیں
مرتضیٰ و مجتبیٰ جفتِ بتول خواجۂ معصوم و دامادِ رسول
سیّدِ سادات گفتے بر فلک شرم دارد دائم از عثماں ملک

مولانا رومؒ (م ۶۷۲ھ) کی مثنویِ معنوی خالصتاً صوفیانہ نکات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں حسن اخلاق، تقویٰ وطہارت اور تعلیمات اسلام کو سمجھانے کے لیے تاریخ و نیم تاریخی واقعات اور تمثیلات کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان ہی واقعات میں حضرت عمرؓ کے فقر و شان بے نیازی اور کبر وغرور سے یکسر پاک وصاف سیرت کی تصویر کشی جس انداز میں کی گئی ہے وہ خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین حضرت عمرؓ کی بہترین منقبت قرار پاتی ہے۔ اس منقبت میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے مختلف واقعات نظم ہوئے ہیں۔ قیصر روم کے ایلچی کا حضرت عمرؓ سے ملاقات کا تأثر رومیؔ یوں بیان کرتے ہیں کہ قیصرِ روم کے ایلچی نے جب حضرت عمرؓ کو خرمے کے درخت کے سائے میں زمین پر لیٹا ہوا دیکھا تو اسے بڑا تعجب ہوا، کیونکہ وہاں جاہ وحشم، طمطراق، شان وتجمل اور غرور وتمکنتِ شاہی کا نام ونشان نہیں تھا۔ پھر بھی آپؓ کو دیکھتے ہیں اس پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور وہ ہمت بٹور کر آپؓ سے چند سوالات پوچھتا ہے اور واپس اپنے وطن لوٹ جاتا ہے۔

مولانائے رومؒ نے اپنے مرشد کی مدح سرائی کے لیے مثنوی کی صنف کی بجائے غزل کا سہارا لیا

ہے۔ ان کی اکثر غزلوں میں خواجہ شمس الدین تبریز کے مدحیہ اشعار مل جاتے ہیں جن میں اپنے پیرو مرشد کے تئیں شاعر کی والہانہ وابستگی کا اظہار، عشق کی گرمی اور شوق کی وارفتگی کے ساتھ ہوا ہے۔ مولا رومیؒ کی طرح فارسی میں اور بہت سارے شعرا ہوئے ہیں جنھوں نے اہل بیت کبار اور خلفائے راشدین کی ثنا خوانی کے ساتھ ہی اپنے مرشدین اور بزرگان دین کی شان اقدس میں مدحت کے گل ہائے معطر کے نذرانے بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً عراقیؔ (م ۶۸۸ھ) تلاشِ حق میں مختلف علاقوں کا سفر کر کے بہاؤالدین زکریاؒ کی بارگاہ میں پہنچے تو شیخ طریقت نے انھیں بیعت کرلیا اور خرقۂ خلافت سے نوازا۔ خلافت ملنے کے بعد سے وہ اپنے پیر و مرشد کی شان میں قصائد لکھتے رہے:

روشناں آئنۂ دل چو مصفا بینند		روئے دلدار دران آئنہ پیدا بینند
خاص حق، صاحب قدوس، بہاء الاسلام		غوث دیں، رحمت عالم، زکریا بینند
خاک پایش بتبرک ہمہ در دیدہ کشند		تا مگر از مددش نور تجلا بینند
شیخ شیوخ جہاں قطب زمین و زمان		غوث ہمہ انس و جان معتقِ مالکِ رقاب
ناشر علم الیقین، کاشفِ عین الیقین		واجد حق الیقین ہادیِ مہدی خطاب
پرسی اگر از جہان کیست امام زمان؟		نشنوی از آسمان جز زکریا جواب
سالکِ مسلوک را بر در او بازگشت		طالبِ مطلوب را از در او فتح یاب

'یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں' جیسی شہرۂ آفاق مثنویوں کے شاعر مولانا جامیؔ نے نعت کے ساتھ منقبتیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں خلفائے راشدین کے علاوہ اپنے مرشد خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی ثنا خوانی بھی کی ہے۔

امیر خسروؔ (م ۷۲۵ھ) ہندوستان میں فارسی کے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے سلوک و معرفت کی تعلیم حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے حاصل کی تھی۔ ان کے یہاں غزل، مثنوی، قصیدہ وغیرہ اصناف میں منقبت کو جگہ ملی ہے۔ خسروؔ کی پانچ مثنویاں 'خمسہ' کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ خسروؔ نے انھیں نظامی گنجوی کے جواب میں لکھا تھا۔ 'مطلع الانوار، شیریں خسرو، مجنوں لیلیٰ، آئینۂ سکندری اور ہشت بہشت' ان کے نام ہیں۔ ان میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے مطابق حمد و نعت کے بعد منقبت بھی شامل کی گئی ہے۔ جیسے ان کی مثنوی مطلع الانوار میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مدحت میں وہ یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں:

شیخ امم ، قطب حقیقت نظام		خضر و مسیح از دم یُحْیِ الْعِظَامَ
آں بولدیت شدہ سلطان پناہ		دوختہ از ترک دو عالم کلاہ

مثنوی کے علاوہ خسروؔ نے سلاطین دہلی کی مدح میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔ سکندر نامہ خسروی، نہہ سپہر کے علاوہ تحفۃ الصغر وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال ان کے نام ہیں۔ 'نُہ سپہر' دیگر مثنویوں کی طرح اس انداز میں لکھی گئی ہے کہ ہر واقعہ کا عنوان ایک شعر ہوتا ہے۔ ان تمام اشعار سے مثنوی کا خلاصہ نکل آتا ہے۔ نُہ سپہر کی منقبت کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

در وصف فقر و ذکر بزرگی کہ ذاتِ او
درکار دین نظام و فرید است و بختیار

اس سرخی کے ذیل میں خسروؔ نے حضرت نظام الدینؒ، حضرت فریدؒ اور بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہم کی مدح سرائی کی ہے۔ انھوں نے صنف غزل میں بھی منقبتیں کہی ہیں، جیسے درمنقبتِ حضرت علیؓ میں وہ فرماتے ہیں:

بیا ای بندۂ مومن! بہ مہر خواجہ قنبر		امام حاضر و غائب امیر المومنین حیدر
ولی ظاہر و باطن ، وصی مصطفیٰ سرور		قبای 'لافتیٰ' بردوش و تاج 'ھل اتیٰ' برسر

دوسری جگہ خسروؔ لکھتے ہیں:

یکی یگانہ ابوبکر ثانی اثنین		کہ بودہ است بہ راہ خدا می جان افشان
دوم عمر کہ ز بہر نغاز فرمائش		بسر آب نیل رود بہر کور می شیطان
سوم چراغ رو شمع آفتاب ذو النورین		بر آسمان کرم ابر با حیا عثمان
دگر حسین و حسن نور دیدۂ زہرا		کہ واجب است بر احسان ھور و استحسان

امیر خسروؔ کے مجامع قصائدتحفۃ الصغر ،وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں چند منقبتی قصائد درج ہیں۔ حضرت نظام الدینؒ کے انتقال کے وقت خسروؔ بنگال کے کسی علاقے میں شاہی فوج کے ہمراہ تھے۔ خبر سنتے ہی وہ دہلی لوٹ آئے اور مرشد کے مزار پر حاضری دے کر پردرد انداز میں یہ شعر کہا تھا:

گوری سووے سیج پر مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسروؔ گھر آپنے سانج بھئی چوندیس

پیرومرشد کے انتقال کے رنج میں خسروؔ کے تاسف، ملال، تڑپ، درد اور اضطراب کی جھلک اس شعر میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ امیر خسروؒ کے بیشتر ہندی فارسی اشعار حضرت نظام الدینؒ کے تئیں خسروؔ کی والہانہ محبت وانسیت کی گواہی دیتے ہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۸۶۹ء) ہمارے تقدیسی ادب میں شاعری کے ذیل میں حمد و

مناجات، نعت ومنقبت اور سلام ونوحہ کا شمار ہوتا ہے۔ غالبؔ نے شغلِ مے وبادہ کے ساتھ ہی صہبائے عقیدتِ مذہبی کو بھی نوش جان فرمانے کے شعوری طور پر جتن کیے تھے۔ ان کی شوخ اور چلبلی طبیعت (جو کشاکشِ حیات کے ردعمل کا نتیجہ تھی) کی وجہ سے بظاہر مذہب جیسے قشف آمیز امر میں بھی وہ غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں، لیکن بباطن ان کا ایمان وایقان بڑا پختہ تھا۔ ان کا مذہبی شعور بڑا بالیدہ تھا اور عقیدۂ مذہبی ان کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے یہاں دنیاوی لذات کے مضامین غیب سے اتنے نہیں اترتے جتنے مذہبی نوعیت کے مضامین ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ سیّد تقی عابدی کی مرتبہ کتاب 'غالبؔ: دیوانِ نعت ومنقبت' سے عیاں ہوتا ہے کہ غالب نے فارسی اور اردو ہر دو زبانوں میں تقدیسی اصناف پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کے سارے کلام پر غالب آ گیا ہے۔ غالبؔ کے اس دیوان میں تقدیسی اصناف کا شمار کچھ اس طرح ہے: کل حمدیں 2، کل مناجاتیں 3، کل نعتیں 8، کل نعتیہ رباعیات 1، کل نعتیہ قطعات 2، کل نعتیہ مفرد اشعار 5، کل منقبتیں 16، کل منقبتی رباعیات 2، کل منقبتی قطعات 1، کل منقبتی مفرد اشعار 44، کل مرثیے 2، کل سلام 1، کل نوحے 5، دعای صباح، دعای زین العابدینؑ 1، مثنوی ابر گہر بار 1، مغنی نامہ 1 اور ساقی نامہ 1۔ اس طرح اس دیوان کے کل تقدیسی اشعار کی تعداد 2888 / دو ہزار آٹھ سو اٹھاسی بنتی ہے۔ ان میں مناقب کی تعداد زیادہ ہے۔

حضرت علیؑ کی منقبت میں وہ یوں گل افشانی کرتے ہیں:

صبحی کہ در ہوای پرستاریِ وثن — جنبد کلید بتکدہ در دست برہمن
شاہِ نجف، وصیِ نبی، مرتضیٰ علیؑ — آں از آئمہ اول و ثانی ز پنجتن
ذاتش دلیل قاطع ختم نبوت ست — وقت غروب مہر دمد ماہ بے سخن
پیغمبر آفتاب و فروغش جمال دین — بعد از نبیؐ امامؑ مہ و پیروان پرن

مخمس:

در مہد دستبرد بہ اژدر کند علیؑ
رفع نزاع باز و کبوتر کند علیؑ
از جور چرخ پرسش من گر کند علیؑ
زور آزمائی کہ بہ خیبر کند علیؑ
دانم ہمان بہ گنبد بے در کند علیؑ

ترجمہ دعاے صباح: یہ دعا حضرت علیؑ سے منسوب ہے۔ غالبؔ نے اس عربی دعا کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا ہے:

اے خدا اے داورا کوبر کشاد　　از درخشیدن زبان بامراد
بار ہای تار شب را آفرید　　پردہ ہای تار ظلمت در کشید
ای خدا وندی کہ تاب آفتاب　　کرد یکجا با فروغ التہاب

غالبؔ نے دومناجاتیں فاتحہ کے نام سے ایسی لکھی ہیں، جن میں چودہ معصومین کا ذکر ہوا ہے۔ دعاے صباح کی طرح غالبؔ نے حضرت امام زین العابدین کی دعا کا بھی فارسی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بھی منقبتی عناصر شامل ہے۔ ان کے یہاں شہید کربلا حضرت امام حسینؑ پر تین، حضرت سجادؑ پر ایک ،امام مہدی و عباس پر ایک ایک منقبت ، چند نوحے اور ایک سلام وغیرہ کو بھی منقبتی منظومات میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح دیوانِ غالب کے فارسی ایڈیشن میں منقبتی شاعری کا وافر حصہ مل جاتا ہے۔

اردو میں منقبت

جہاں تک اردو کی منقبتی شاعری کا تعلق ہے،تو وہ تصوف کی گود میں پلی بڑی ہوئی۔سلاطین کے دور میں تبلیغِ دین کی خاطر جوصوفیائے کرام برصغیر میں وارد ہوئے تھے، انھوں نے لوگوں کوراہِ راست پرلانے اوران کے نفس کی اصلاح کی خاطر مقامی زبان کواپنایا۔ان صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو برصغیر میں ان کی کثرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ صوفیائے کرام اپنے مرشدین کو ولی صفت گردانتے تھے۔ اس لیے ان کی تعظیم وتوقیر میں وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیتے اور اللہ و رسولؐ،خلفائے راشدین اور اہل بیت اطہار کے ساتھ اپنے مرشدین کی مدحت طرازی کو اپنا شعار بنائے رکھا تھا۔ ان صوفیائے کرام کے ملفوظات اور منقبتی اشعار میں ابتدائی فارسی کی جھلک نمایاں تھی، بعد میں دھیرے دھیرے مقامی سادھو سنتوں اور جوگیوں کی وانی اور ان کی یوگ، سادھنا کی اصطلاحات اپنا کر انھوں نے اپنی تعلیمات کوعوام تک پہنچایا،جن میں مقامی زبانوں کا میل جول کانوں میں رس گھولتا ہے۔ اردو کی متصوفانہ شاعری کی وجہ سے اردو زبان کوسیکڑوں لفظیات اور بیسیوں اصطلاحات حاصل ہوئی ہیں جواردو کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

برصغیر میں تصوف کی ابتدا بعض کے نزدیک حضرت خواجہ معین الدین چشتی (۱۱۴۲ء-۱۲۳۶ء) سے ہوئی ہے۔ اور بعض ابوالحسن علی ہجویریؒ بن عثمان (۱۰۰۹ء۔ ۱۰۷۲ء) جنھیں داتا گنج بخش بھی کہا جاتا ہے، کو ہند میں تصوف کا اولین مبلغ مانتے ہیں۔ 'کشف المحجوب' علی ہجویریؒ کی کتاب ہے، جس میں صوفیانہ نکات کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔ اس کتاب میں تصوف کے بارہ سلاسل کی تفصیل بھی درج ہے۔صوفی کی زندگی سراسر عشق ہی سے عبارت ہے، جس کی سرشاری محب ومحبوب میں جذبۂ

استیناس وشوقِ استیلاف پیدا کر دیتی ہے۔ وارفتگی شوق اور غلبۂ محبت ’ساختن‘ کو ’سوختن‘ میں بدل دیتے ہیں۔ فرقِ مراتب مٹ جاتے ہیں۔ من وتو کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ محبوب کبھی بندۂ عاجز دکھائی دیتا ہے، کبھی عاشقِ صادق۔ فرطِ محبت اور وارفتگی شوق میں اس کا غلو اتنا بڑھتا ہے کہ وہ فراقِ یار میں تڑپنے لگتا ہے۔ اس طرح جیسے ایک عورت فطری طور پر اپنے ’پیا‘ کے فراق میں تڑپتی ہے۔ صوفیائے کرام نے سالک کے دل میں ’حب اللہ‘ پیدا کرنے کے لیے عورت کی اسی نفسیات کو اپنے فلسفۂ محبت میں جگہ دی ہے۔ ایسی محبت چونکہ تقشّف، رطب و یابس اور بے کیفی سے پاک ہوتی ہے اور معمولاتِ زندگی میں اس سے روزانہ سابقہ پڑتا ہے، اس لیے زُود اثری میں یہ اپنی مثال ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متصوفانہ تصانیف میں ’محبت‘ کے ذکر میں عشق کی کسک میں نسائیت کا جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ بایزید بسطامیؒ کے یہاں ’الکامل التام‘ بزرگوں کے لیے ’عرائس اللہ‘ کی اصطلاح رائج تھی۔ خدا سے عشق کرنے والے صوفیوں کو انھوں نے ’اللہ کی دلہنیں‘ کہا ہے۔ کیا بعید ہے کہ ہمارے صوفیا نے اسے اصطلاحی معنی کی بجائے لغوی معنی میں قبول کیا ہو اور اسے مقامی رنگ دے کر اس میں شگفتگی و دل آویزی پیدا کرنے کی سعی فرمائی ہو۔ معرفتِ الٰہی کے راز ہائے سربستہ کی عقدہ کشائی میں جب عقل وفہم پائے چوبیں ثابت ہوجاتے ہیں، خرد حیران و پریشان اور درماندہ نظر آنے لگتی ہے، تو پھر معرفتِ الٰہی کی عقدہ کشائی کے لیے قلب کا سہارا لیا جاتا ہے اور طرزِ دلالت و اصول وحکمت کے بالمقابل وجدان کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ اہل اللہ خوب جانتے ہیں کہ ’گرمیِ عشق‘ سے کائنات پگھل سکتی ہے۔ روح کی بالیدگی کے لیے ’محبت‘ سے بڑھ کر دوسرا وسیلہ نہیں۔ عقل تو ’کارافزا‘ ہوتی ہے جبکہ محبت ’روح افزا‘۔ اسی لیے تصوف کے سالاروں نے سالکان حق شناسوں کی تربیت کے لیے ’محبت‘ پر زور دیا۔ ان کے دل ناتراشیدہ کی تہذیب وتذہیب کی اور ’عشق‘ سے اسے معمور کیا تا آنکہ وہ نشاطِ سرمدی سے آشنا ہوجائے۔

محبت کے لیے یک گونہ جنسیت از بس ضروری ہے۔ ہم جنس سے وابستگی اور قربت سے جو ذوق اور حظ حاصل ہوتا ہے، اسی کیفیت کا نام محبت ہے۔ اس سببِ وابستگی سے ہم جنسوں میں باہمی کشش پیدا ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے عشقِ الٰہی میں وارفتگی اور افزونی پیدا کرنے کے لیے صوفیائے کرام نے عشقِ مجازی کو مہمیز بنایا ہے، اور سماع میں ارضی عشق میں سرشار رہنے والے عشاق کے قصوں کو مباح فرمایا ہے، بلکہ بعض صوفیا نے تو اللہ تعالیٰ سے دل لگانے کے لیے خود کو معشوق (بہ شکلِ زن) اور خدا کو عاشق (بہ صورتِ شوہر) متصور کیا ہے۔ وہ اس لیے کہ محبت میں ہم جنسیت سے شدت پیدا ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے صوفیا کی مجالس میں مولانا جامیؔ کی مثنوی ’یوسف وزلیخا‘ کو بنظرِ استحسان دیکھا گیا ہے۔ اردو کے قدیم متصوفانہ ادب میں اس قسم کی بیسیوں مثنویوں میں جنسی کیفیات سے مملو ارضی عشق کے قصے

کہانیاں موجود ہیں۔ جیسے مولانا داؤد کی 'چنداین'، قطبن کی 'مرگاوتی'، منجھن کی 'مدھو مالتی'، عثمان کی 'چتر اولی' اور جائسی کی 'پدماوت'، طبعی کی 'بہرام وگل اندام'، فائز کی 'رضوان شاہ و روح افزا'، نصرتی کی مثنوی 'گلشن عشق'، ابنِ نشاطی کی 'پھول بن'، صنعتی کی 'قصۂ فغفور چین'، عبد السبحان کی 'قصۂ حضرت سلیمان'، امین گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' اور حسرت دہلوی کی 'مثنوی طوطی نامہ'۔

علاوہ طوطی نامہ کے مذکورہ تمام مثنویاں فارسی روایت کے مطابق حمد و نعت اور منقبتوں سے شروع ہوئی ہیں۔ افسوس کہ تحقیق وتنقید میں ہماری سہل انگاری کی وجہ سے درج بالا مثنویوں میں سے ابتدائی پانچ مثنویاں اردو ادب میں شمار نہیں ہوتیں۔ حالانکہ ان کے مخطوطات دیوناگری نہیں، فارسی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں۔ خیر! ان مثنویوں کی منقبتی شاعری کا ذکر اپنی جگہ ہوگا، یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ہمارے صوفی شعرا نے اپنی منقبتوں میں خلفائے راشدین اور اہل بیت کے بعد اپنے اکابرین، مرشدین، اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کا بھی ذکرِ خیر کیا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری محسوس ہو رہی ہے کہ ہماری خانقاہوں کی منقبتوں میں مشائخ و مرشدین سے عشق کے اظہار کے لیے زن وشو کے تصور ہی کو روا رکھا گیا ہے۔ اردو منقبتوں کے ذیل میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔

اردو ادب کی ابتدا بالعموم خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تخلیقات سے کی جاتی ہے۔ اگرچہ ان کے تمام اردو کلام پر قلمِ توثیق نہیں پھیرا گیا، مگر ان کی مثالیں اردو کی ابتدا کے احوال میں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اس مقالہ میں ہم بھی اردو کی منقبتی شاعری کی ابتدا کے احوال کا ذکر گیسو دراز کی تخلیقات کے حوالے سے کریں گے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ

'سیرِ محمدی' کے مولف محمد علی سامانی کے مطابق خواجہ بندہ نواز ۳ ستمبر ۱۳۲۱ء کو دلّی میں سیّد یوسف حسینی معروف بہ شاہ راجو قتال کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان محمد تغلق کے حکم سے دلّی کے عوام، علما، عمائدین اور مشائخین ترکِ وطن کر کے دیوگری (دولت آباد) میں منتقل ہو گئے، اس وقت شاہ راجو قتال بھی ان مشائخین میں شامل تھے اور خواجہ بندہ نواز چار برس کے تھے۔ دکن میں شاہ راجو قتال کے فوت ہو جانے کے بعد جب گیسو دراز کی والدہ دہلی منتقل ہو گئیں تو گیسو دراز پندرہ برس کے ہو گئے تھے۔ اس وقت سلطان الاولیا حضرت نظام الدینؒ کے وصال کے بعد دہلی میں حضرت نصیر الدین اودھی چراغ دہلوی کی خانقاہ شائقینِ سلوک کا مرجع بن گئی تھی۔ ان کے تبحرِ علمی، سلوک و کشف اور کمالات کا ذکر سن کر خواجہ گیسو دراز نے چراغ دہلویؒ کے ہاتھوں بیعت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اپنی والدہ کے ہمراہ جیسے ہی دلی پہنچے، تو اپنے بھائی سیّد حسین چندن کے ساتھ حضرت نصیر الدین

چراغ دہلویؒ کے آگے زانوئے ارادت تہ کر لیے۔ مرشد نصیر الدین اپنے مرید سیّد محمد حسینی معروف بہ بندہ نواز گیسو دراز سے یک گونہ نظر التفات رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار مریدین کے ہمراہ مرشد کی پالکی اٹھائے ہوئے چل رہے تھے کہ پالکی میں ان کے دراز گیسو الجھ گئے اور انھیں شدید تکلیف ہونے لگی، مگر انھوں نے پالکی کاندھے سے علاحدہ نہیں کی اور برابر چلتے رہے۔ جب مرشد کو اس واقعے کی خبر ملی تو حضرت نصیر الدینؒ بہت متاثر ہوئے اور فی البدیہہ یہ شعر کہا:

ہر کہ مرید سیّدِ گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

خواجہ بندہ نواز کی عمر ۲۷ برس تھی۔ اس وقت دہلی میں ایک وبا پھیل گئی تھی اور اس وبا میں خواجہ صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ حضرت نصیر الدینؒ کو خبر ملتے ہی انھوں نے خواجہ صاحب کے علاج کے لیے ایک طبیب مقرر کر دیا۔ جس کے علاج سے انھیں افاقہ ہو گیا۔ اس کے بعد نصیر الدینؒ نے خواجہ بندہ نوازؒ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا۔ وفات سے تین دن قبل مرشد نے اپنی جانشینی کے لیے خواجہ بندہ نوازؒ کو منتخب فرمایا اور اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ خلافت ملنے کے بعد گیسو درازؒ نے چوالیس برس تک لوگوں کی رہنمائی کی۔ تیمور لنگ کے حملے کے وقت وہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے اور بہ ہزار دقّت و پریشانی دوبارہ دولت آباد پہنچے۔ وہاں اپنے والد کی قبر کی زیارت کرنے کے بعد گیسو دراز نے گلبرگہ کی جانب مراجعت کی اور اپنے مریدین کے ساتھ وہاں کی جامع مسجد کے قریب ایک خانقاہ میں قیام فرمایا اور عرصے تک تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ بالآخر ۱۴۲۲ء سوموار کے دن حضرت سیّد محمد حسینی معروف بہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اس جہانِ فانی کو خیر آباد کہا اور وہیں مدفون ہوئے۔ آج بھی ان کا مزار مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔

سیّد بندہ نواز گیسو درازؒ کثیر التصانیف تھے۔ 'سیرِ محمدی' کے پانچویں باب میں ان کی عربی فارسی کی چھتیس کتابوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ مولوی عبد الحق اور عبد القادر سروری نے گیسو دراز کی چند دکنی تصانیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان میں معراج العاشقین، رسالہ شرح کلمہ طیبہ، شکار نامہ، خلاصۂ توحید، در الاسرار، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود وغیرہ کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ گیسو درازؒ سے منسوب ایک کتاب 'جوامع الکلم' بھی ہے۔ اس کی ماہ رجب میں ہوئی مجلس کی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ گیسو دراز فقہ حنفی کے پابند تھے اور خلفائے راشدین، کل صحابہ کرام اور اولیائے کرام کے قائل تھے۔ اس لیے ان سے منسوب کلام میں ان اصحاب کے منقبتی اشعار پائے جاتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے گیسو درازؒ کی تین دکنی نظموں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں ان کے مرشد حضرت

خواجہ نصیر الدینؒ کی شان اقدس میں منقبتی انداز پایا جاتا ہے:

خواجہ نصیرالدین جنے سائیاں پیو بنائی جیو کا کُٹھ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائی
رکھے سیّد محمد حسینی شاہ ایں اپنا پاوں

سوئے عاشق شہباز ہے دوہوں جگ کہلار خواجہ نصیرالدین سائیاں پنٹ راکھے ہمارا
نسنکہ کھیل توں پندر عشق کا تھارا

درمقام رام کلی راگ میں لکھی گئی اس نظم میں خواجہ بندہ نواز نے شطرنج کے کھیل کے ذریعہ تصوف کے نکات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے سخت مراحل میں بھی بندہ نوازؒ کو اپنے پیر کا خیال رہتا ہے۔ ان مثالوں میں شاعر نے اپنے مرشد نصیر الدینؒ کو سہارا بہم پہنچانے والا سائبان، قربت کا احساس دلانے والا سائیں رسیّاں اور ہمیشہ خوش رکھنے والا پیو بھی کہا ہے۔ اس لیے شاعر کہہ رہا ہے کہ اس پر قربان ہونے (بلی بلی جانے) کو جی چاہتا ہے۔ ان منظومات میں مرشد کی حاضر باش ہونے کی صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فخر الدین نظامیؔ بیدری

اردو ادب کے شعری سرمائے میں تقدم زمانی کے لحاظ سے نظامیؔ کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کی اولیت تسلیم کر لی گئی ہے۔ داخلی شہادتوں کی روشنی میں یہ مثنوی علاء الدین شاہ کے دورِ حکومت ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۵ء میں تصنیف کی گئی تھی۔ نظامی کی شخصیت اور ان کے کارہائے نمایاں کے بارے میں تاریخی شواہد ہماری خاطر خواہ رہنمائی کرنے میں قاصر نظر آتے ہیں۔ البتہ بیدر میں فخر الدین نام کے دو بزرگوں کے مقبرہ نما مزارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے جو بھی نظامیؔ رہا ہے وہ اپنے وقت کے بزرگوں میں شمار کیا گیا ہوگا۔

نظامیؔ نے ہمارے قدیم صوفیائے کرام کی ڈگر پر چل کر اپنی مثنوی میں وہی ہندوی عناصر داخل کر دیئے جو ان صوفیائے کرام کی مثنویوں کا طرز و اسلوب تھا۔ چنانچہ نظامیؔ کی مثنوی پر چندائن، مرگاوتی، مدھومالتی وغیرہ قدیم مثنویوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مذکورہ مثنویوں کی طرح نظامیؔ نے کدم راؤ پدم راؤ میں ہندوستانی فضا کو مقدم رکھا ہے اور یہاں کی تہذیب و معاشرت نیز یہاں کی مذہبی رسومات و روایات کا برملا اظہار کیا ہے۔ ان سب کے باوجود نظامیؔ نے فارسی تقلید میں مثنوی کی ابتدا حمد ونعت اور منقبت سے کی ہے، جن میں تقدیسی عنصر نمایاں ہے۔ مثنوی کے منقبتی اشعار کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نظامیؔ مسلک کے اعتبار سے حنفی تھا۔ اس کے یہ منقبتی اشعار ملاحظہ ہوں:

نبی یار تھے یار تے جھار جھار بچارن نبیؐ کام کرتے بچار
رتن چار تھے لے گئے چار جن رتن بے جتن جم رہے جیو کہن

ابا بکرؓ ساچا، عمرؓ کا نیاؤ   کہ عثمانؓ بھنڈاری علیؓ کھڑگ راؤ

(نظامی [مرتبہ: جمیل جالبی] 'کدم راؤ پدم راؤ' کراچی، ص: ۱۷)

شاعر نے ان ابیات میں خلفائے راشدین کی مدح میں ان کے مشہور اوصاف کی ترجمانی کی ہے۔یعنی ابوبکر کا صدق، حضرت عمرؓ کا انصاف، حضرت عثمانؓ کی سخاوت اور حضرت علیؓ کی شجاعت۔ یہ منقبت مختصر مگر جامع ہے۔

شاہ میراں جی شمس العشاق

صوفیا کے مریدین کے طویل سلسلوں سے ان کی روحانی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دکن میں خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی تعلیمات کو عام کرنے اور عوام الناس کی تربیت اور انھیں خدا کی ذات سے جوڑنے کے لیے ان کے مریدین کا سلسلہ بھی طویل نظر آتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی شمس العشاق کی ذات گرامی ہے۔ دکن میں ان کے روحانی فیوض وتصرفات کو عام کرنے میں مریدین کے علاوہ ان کے اہل خانہ کے تبلیغی مشن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس مشن سے جڑے اہم ناموں میں شمس العشاق کے فرزند برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین اعلیٰ ہیں۔ شاہ میراں جی شمس العشاق پر کی گئی تحقیق کے مطابق ۹۰۲ھ ان کا سال پیدائش ہے۔ یہ تاریخ 'شمس العشاق' کے مادے سے نکلتی ہے اور مولوی عبدالجبار ملکاپوری کے مطابق میراں جی کا انتقال ۹۷۰ھ میں بیجاپور میں ہوا۔ میراں جی کے متعلق ان ہی سے منسوب خودنوشت میں کہا گیا ہے کہ ۲۲ سال کی عمر میں جب وہ حاضری کے لیے مدینہ گئے تو وہاں خواب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انھیں ہندوستان میں شاہ کمال الدین بیابانی سے ملاقات کرنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں میراں جی ہندوستان میں وارد ہوئے اور شاہ کمال کے ہاتھوں بیعت ہو کر ان کے مرید بن گئے۔ اپنے کلام میں میراں جی نے شاہ کمال کی مدح سرائی کی ہے۔ اس لیے بھی کہ خانقاہی نظام میں پیر کی مدحت سرائی ضروری قرار دی گئی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں سیّد محمد اکبر حسینی سے منسوب ایک کتاب کے حوالے سے پیر کی مدح میں ان کے اشعار پیش کیے ہیں:

دھو کر زباں کوں اپنی پہلے پیر سوں بیاں پر   بولوں صفت خدا کی کر شکر میں زباں پر

بے پیر کے جو ہیں گے دارو جو کھا جیا کر   بے شک جیا تو جانو اس کو ہوا وو کافر

بے پیر ہیں گے دارو کھا کر اگر موا تو   ایماں سلب ہو تس پر مرتا ہے بے ایماں ہو

بے پیر کے جو ہت کا پانی طعام کھاوے   ہو گوشت جوں سور کا اس کوں حرام پاوے

(بحوالہ: گیان چند جین/سیّدہ جعفر، 'تاریخ ادب اردو' جلد دوم، قومی کونسل دہلی، طبع دوم ۲۰۱۱ء، ص: ۶۷-۶۶)

ان اشعار کی وضاحت شاعر نے نثر میں کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں 'جس کوں پیر نئیں اس کوں دین نئیں۔ جسے دین نئیں اسے بوج نئیں ہور جسے بوج نئیں اسے عشق نئیں ہور جسے عشق نئیں اسے صحبت نئیں ہور جسے صحبت نئیں اسے پیر نئیں۔ بے پیر ہو کر رہنا محض کفر ہے۔' (ایضاً)

خانوادۂ تصوف میں پیر و مرشد کی مدح سرائی کی روایت رہنے کی وجہ سے صوفیانہ شاعری میں ہمیں پیر طریقت اور مرشد کامل کی مدحت طرازی میں منقبتی اشعار ملتے ہیں۔ اس روایت کو اپناتے ہوئے میراں جی شمس العشاق نے بھی اپنے پیر شاہ کمال کی مدح کچھ اس طرح کی ہے:

اس کمالیت کے سنگ اس خانوادے کے رنگ
ان کمالے اپنا حال تو ہووے پیر کمال

(میراں جی، 'شہادۃ التحقیق' بحوالہ: علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ص: ۲۱۴)

اس قبیل کے چند اشعار میراں جی نے ''نغز مرغوب'' میں بھی نقل کیے ہیں، لیکن ان کی زبان قدامت لیے ہوئے ہے۔ اس لیے انھیں صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ میراں جی کی ایک نظم 'خوش نامہ' بھی ہے۔ یہ ہندی دوہے کی صنف میں نظم ہوئی ہے۔ اس میں شاعر نے سچے پیر کا تعارف کچھ اس انداز میں کرایا ہے:

پیر وہی جو پریم لگاوے نور نشانی عین منزہ کی سُدھ لکھاوے جہاں دسے نہ رین
جس مارگ تھیں جیو سنچرے ہی سو مارگ سار مارگ چھوڑ چلے کو مارگ تن کا نہیں بچار

میراں جی نے آگے نفس پرست شیوخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہر کیف! مدحِ شیوخ کا یہ سلسلہ دورِ قدیم سے تا حال برابر جاری دکھائی دیتا ہے اور برصغیر کے ہر حصے میں اس کی آبیاری کے آثار ملتے ہیں۔ چنانچہ دکن کے بعد جب ہم گجرات کی جانب رخ کرتے ہیں تو یہاں کی صوفیانہ تخلیقات میں حمد و نعت کے ساتھ مناقب، مناجات اور سلام وغیرہ جیسی تقدیسی اصناف کو بھی پاتے ہیں۔ یہاں کی قدیم اردو (گجری) میں تقدیسی شاعری (حمد و نعت و منقبت وغیرہ) متصوفانہ رنگ لیے ہوئے ہے اور اس کا سلسلہ دراز دکھائی دیتا ہے۔ گجری ادب کے شعرا نے حمد و نعت کے علاوہ اپنے شیوخ اور مرشدین کی شان میں منقبتیں بھی لکھی ہیں، جو اردو کی منقبتی شاعری سے مختلف لب و لہجہ رکھتی ہیں اور تصوف کے نکات کی حامل ہوتی ہیں۔ گجری منقبتوں کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

شیخ بہاء الدین باجنؔ

باجنؔ نویں صدی ہجری کے صوفی شعرا کی صف میں سب سے بلند مرتبے پر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ احمد آباد گجرات میں وقت کے نامور صوفی حاجی معز الدین کے گھر ۷۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تخلص باجن تھا۔ انھیں تصوف سے از حد لگاؤ تھا۔ باجنؔ نے اپنے مرشد شیخ رحمت اللہ کے ہاتھ پر بیعت

کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مرشد شیخ رحمت اللہؒ کی رحلت کی خبر جب شیخ بہاء الدین کو پہنچی تو وہ قبر کے پاس مودب کھڑے ہو گئے اور مرشد کا دیا ہوا خرقہ قبر پر ڈال دیا تو قوالوں نے یہ اشعار پڑھنا شروع کیے:

شاہ رحمت اللہ منج پی بلاؤ
تم باج لاگوں کس کے پاؤ

تو قبر سے ندا آئی:

باجن لاگے تیرے پاؤ

اس وقت سے بہاء الدین کا لقب باجنؔ مشہور ہو گیا اور وہ بطور تخلص اسے استعمال کرتے رہے۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ باجنؔ کو موسیقی سے از حد لگاؤ تھا، اور بعض آلاتِ موسیقی بجانا جانتے تھے، اس لیے باجن کہلائے۔ موسیقی کی دھنوں اور راگ راگنیوں کی لے پر گائی جانے والی ان کی منظومات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ باجنؔ تخلص ان کے حسبِ حال تھا۔ باجنؔ کی مشہور تصنیف 'خزائن رحمت اللہ' ہے، جسے خزانۂ رحمت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب باجنؔ کے مرشد کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ شاعر نے اس کتاب کا نام اپنے پیر و مرشد کے نام کی رعایت سے رکھا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کو خزانہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ پھر ہر خزانے کی جزوی تقسیم بھی کی گئی ہے۔ پہلے باب کی جزوی تقسیم کو 'منقبت' کا نام دیا گیا ہے، دوسرے باب کی جزوی سرخی 'مفتاح' کہلاتی ہے۔ تیسرے باب کی جزوی سرخی 'فتح'، چوتھے کی 'مفتوح'، پانچویں اور چھٹے ابواب کی مختلف جزوی سرخیاں ہیں اور ساتواں باب باجنؔ کے گجری کلام کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ باجنؔ نے خود اس باب کے متعلق کہا ہے:

''در ذکر اشعار کہ مقولہ ایں فقیر است بزبان ہندوی جگری خوانند وقولاں ہند آنرا در پردہ ہا سرودمی نوازند بعضے در مدح پیر و دستگیر و وصفِ روضۂ ایشاں و وصف وطن خود کہ مقامِ گجرات است وبعضے در ذکر مقصد مقصودات مریداں و طالباں وبعضے در ذکر عشق و محبت دریں خزینہ بالتفصیل جمع کردہ شد بنام پردہ ہا سرودہا۔''

(ڈاکٹر شیخ فرید، 'شاہ بہاء الدین باجن: حیات اور گجری کلام'، احمد آباد ۱۹۹۲ء، ص: ۱۴)

خزانۂ اول میں جن لوگوں کے مناقب ہیں، ان میں شیخ رحمت اللہ کے تفصیلی حالات، منقبت دوم میں شیخ عزیز اللہ کا بیان، منقبت سوم میں شیخ لطیف الدین کے حالات اور منقبت چہارم میں محمد ابن زاہد یوسف چشتی، شاہ جلال اور شیخ فرید گنج شکر کا بیان ہے۔ سات انبیائے کرام میں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، حضرت ایوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر شیخ فرید نے اپنی اس کتاب میں باجنؔ کی کتاب 'خزائن رحمت اللہ' کی

تلخیص کر دی ہے، جو فارسی زبان میں مرتب کی گئی تھی۔ باجنؒ کا اہم کام اس کتاب میں یہ ہے کہ صوفیائے کرام کے فارسی ملفوظات کے موضوعات کی وضاحت اپنے گجری اشعار کے ذریعہ کر دی ہے، جن میں منقبت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔اردو میں منقبتی شاعری کی جو روایت چلی آ رہی ہے، اس میں منقبت نگاری کی چند جہتیں یا اقسام نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ منقبت میں ممدوح کی سیرت بیان کی جاتی ہے۔ دوم یہ کہ ممدوح کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں۔ سوم، ممدوح کی کرامات کا ذکر ہوتا ہے اور چہارم یہ کہ منقبت میں ممدوح کی تعریف وتوصیف اور مدح و ستائش کی جاتی ہے۔ اس مدح و ستائش میں عقیدت میں غلو کی فراوانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

شاہ بہاء الدین باجنؒ کی منقبتی شاعری میں درج بالا چاروں جہتیں پائی جاتی ہیں۔اپنے مرشد شیخ رحمت اللہؒ کی شب بیداری کے وصف کو باجنؒ گجری اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

تنکے ہو بلہاری جی نت دھیان دھنی کے لاگیں
کھڑے کھڑے اور کھک جگاویں پہر پہر بیٹھے جاگیں

آپیں جاگیں اورن بھی جگاویں پھرے پھرے سبد سناویں
النگ النگ بیٹھے ہیں جوگی ات جاگو لوگاں جاتی ہے رات

(ڈاکٹر شیخ فرید''شاہ بہاء الدین باجن: حیات اور گجری کلام ص:۴۷)

باجنؒ نے اپنے مرشد کے فقر وغنا کا بیان کرتے ہوئے چند تاریخی واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ ان میں حضرت ابراہیم ادہمؒ کے متعلق لکھا ہے:

تارک الکونین سلطان ابراھیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ بہ محبت حق پیوست ہفتاد ہزار حرم و ہژدہ لک اسپ و بادشاہی بلخ گذاشتہ درویشی اختیار کردند۔ چنانچہ برزبان ہندی کسے گفتہ است:

ستّر سہس سہیلیاں تری اٹھارہ لک
سائیں کیری کارن چھوڑا شہر بلخ

(ایضاً،ص:۵۳)

ابراہیم ادہم کے متعلق اس خیال میں سچائی نہیں۔ یہ اسطوری فکر ہندوؤں کے یہاں سے مستعار ہے۔کہا جاتا ہے کہ کرشن جی کی ستّر ہزار گوپیاں تھیں۔ابراہیم ادہم (م۷۷۶ء) جو بلخ کے مسلم بادشاہ تھے، اپنی تمام سلطنت کو چھوڑ کر تارکِ دنیا ہو گئے تھے۔کیا اس نیک صفت انسان کی عورتوں کی تعداد ستر ہزار رہی ہوگی؟ اوپر کے گجری شعر اور فارسی عبارت میں جو کہا گیا ہے کہ ابراہیم ادہم نے عشقِ الٰہی میں ستر ہزار حرم اور اٹھارہ لاکھ گھوڑوں کو چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی، آپ کی پاکیزہ شخصیت کے عین

منافی نظر آتا ہے۔

مذکورہ کتاب کے ساتویں خزانے میں باجنؔ کا فارسی کلام ہے۔ یہ سارا کلام راگ راگنیوں میں کہا گیا ہے، اس لیے اسے موسیقی کے سروں کے نام دیئے گئے ہیں۔ 'در پردۂ صباحی' کے عنوان سے خزائن رحمت اللہ کے ساتویں باب میں باجنؔ نے اپنے مرشد حضرت شاہ رحمت اللہ کی شان اقدس میں یہ منقبت کہی ہے:

عقدہ

سیوے جے شیخ رحمت اللہ   شیخ سیویں پائے اللہ
روشن گنبد برسے نور   حاجت مندوں کی حاجت پور
باغ سہا وا ہے دربار   واک، چنبیری ہور انار
سانبھر کنارے تمھارا ٹھانہ   زیارت آوے شاہ شہانا

تخلص

شیخ عزیز اللہ تن قطب جہانگیر   باجنؔ کو تہی ہو دستگیر
شاہ رحمت اللہ ہے سانچا پیر

(ایضاً، ص:۱۷۵)

باجنؔ نے اس منقبت میں اپنے مرشد کی فضیلت، ان کے مقبرے کی عظمت اور بادشاہوں کی حاضری نیز باغ جنت جیسی رونق وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں حاجت مندوں کی حاجت پوری ہوتی ہے۔ اسی لیے اس دربار میں بادشاہوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس منقبت کے بعد والی نظم 'در پردۂ للت' میں شاعر کہتا ہے کہ "لوگو! لوری گاؤ، تاکہ میرے مرشد جاگ جائیں اور میں ان کے چہرے کا دیدار کرسکوں، جس سے میری دلدّری یعنی نحوست ختم ہوجائے۔" ایک منقبت میں باجنؔ نے مرشد کو اپنا 'پیا' اور خود کو اس کی بیوی (زن) مان کر عشق کے نسائی جذبات کی عکاسی اپنے منقبتی اشعار میں کی ہے، وہ کہتے ہیں:

در پردۂ دھناسری

ہونتو جانسوں بڑیا ں (؟) تہیں ری   وا میرا ہرئ چھین ری
میں تو روی روی نیہ تیراری اکھیا   میں تو کڑوا میٹھا چاکھا ری
میں تو یہ دکھ کس تھیں نہ اکھیا ری   انہیں لیتا جیو پرانا ری
کت بوجھے لوک اجانا ری   ہوں اس کے روپ لوبھانا ری

تخلص

شیخ عزیز اللہ پیو پیارا ری باجنؔ داس تمھارا ری

شیخ رحمت اللہ پیر ہمارا ری

(ایضاً ص:۱۸۶)

منقبت نگاری میں عاشقِ صادق یعنی مرشد سے نسبت قائم کرنے کے لیے نسائی جذبات کا سہارا لینے کی روایت ہندی سنت کاویہ کی دین ہے۔ اردو میں اس کا چلن امیر خسروؔ کی ہندوی تخلیقات سے مانا جاتا ہے۔ اسی لیے اردو کی متصوفانہ شاعری میں محبوب (مرشد) کے لیے پیا، پریتم، پیو، ساجن وغیرہ جیسی لفظیات استعمال ہوئی ہیں اور محبوب کے تئیں نسائی لب و لہجے میں عشق کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ درج بالا نظم میں بھی مرشد کو 'پیا' مان کر ہی اس سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔

قاضی محمود دریائی

باجنؔ کی اس ادبی روایت کو آگے بڑھانے میں گجرات ہی کے ایک صوفی شاعر قاضی محمود دریائی کا نام نہایت اہم مانا جاتا ہے۔ یہ گجرات کے خواجہ خضر کہلاتے ہیں۔ کیونکہ جب کبھی دریائی اسفار میں کشتیوں کو طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا، تو مسافر قاضی محمود دریائی ہی کو یاد کرتے۔ اس لیے ان کا لقب 'دریائی' ہوگیا۔ صاحب 'تحفۃ الکرام' نے ان کے لقب کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اکثر در کشتی ہائے تباہی کہ یاد ایشاں می نمود بساحلِ مرادمی رسیّدند۔ ازیں سبب 'دریائی' لقبِ خاص مقرر گشت'' (تحفۃ الکرام، مطبوعہ بمبئی، جلد اول ص:۹۷)

قاضی محمود دریائی بیر پور میں قاضی حمید الدین چاولندھا کے گھر ۸۷۴ھ/۱۴۱۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شیر خوارگی کے زمانے ہی میں قاضی حمید الدین اپنے بیٹے کو شاہ عالم کے پاس لے گئے۔ انھوں نے بچے کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اتنا اوپر اٹھایا کہ اس کے پیر حضرت کے شملے کو چھونے لگے۔ شاہ عالم اس دوران کہتے جاتے تھے 'قاضی کا شملہ بڑا، قاضی کا شملہ بڑا' یہ قاضی محمود دریائی کی عظمت اور بزرگی کی ایک پیش گوئی تھی۔ وہ بچپن ہی سے سخت ریاضت اور مجاہدہ کرتے۔ چلہ کشی ان کا شعار تھا۔ عمرِ شعور کو پہنچنے کے بعد وہ اپنے والد کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کے والد انکار کر دیتے۔ آخر انتقال کے ایک دن پہلے انھوں نے قاضی محمود کو اپنا مرید بنالیا، لیکن والد ماجد سے بیعت کے باوجود انھیں حضرت شاہ عالم معروف بہ منجھن شاہ سے خصوصی لگاؤ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم کے انتقال کے وقت انھوں نے چند تبرکات اپنے مرید قاضی محمود دریائی کے لیے اپنے خلیفہ کے سپرد کیے جنھیں دینے سے خلیفہ نے اس لیے انکار کیا کہ محمود دریائی نے پیر کا نام ان کے لقب کے ساتھ لیا تھا۔

بالآخر محمود دریائی خود مرشد کی قبر پر پہنچے اور فریاد کرنے لگے:

کی کروٹ لی اہرا سائیں　　اوس رہن کی بیلا ناہیں
ملِ بچھڑے کی اب بیلا آئیں
قطب عالم تن جو ہو پاؤں　　چن چن کلیاں سیج سجاؤں
آج میتھا منجھن شاہ پاولا گے ماؤں

اس فریاد کا یہ اثر ہوا کہ شاہ عالم سینے تک قبر سے نکل آئے، اور وہ تبرکات محمود دریائی کو مرحمت فرما دیئے۔ محمود دریائی کی منقبتی شاعری میں اپنے مرشد کا ذکر بار بار آیا ہے۔ وہ کبھی تو اپنے مرشد کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، کبھی ان سے امداد طلب کرتے ہیں، کبھی ان کی کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے:

قاضی محمد تن شاہ چاپلندھا میرا　　سب دکھ کے وہی اولاوے
محمد سنوری سائبان مجہ　　اس بن اور نہ بھاوے
مجھ درسن سائیں کا بھاوے　　چنت میری اورن آوے
جب ہنس مکھ آپ دکھلاوے　　سب سہیلیاں باوری لاوے
چھپ چاند اُبجار جاوے
اس روپ کاوے کھیّا　　دیکھ تاروں تیج نہ سھیّا
کر بیٹھ سورج مکھ رہیّا
قاضی محمد میرے من بھایا چاؤں　　چاپلندھا پیر میں لایا
اُن محمود کوں میت ملایا

اپنے پیر کی 'جوہار' پرستش کے لیے قاضی محمود یوں سجتے سنورتے ہیں:

نینوں کاجل، مکھ تنبولا ناک موتی، گل ہار
سیس نماؤں، نیہ اپاؤں، اپنے پیر کروں جوہار

وہ اپنے پیر شاہ چائلندھا کی ثنا و توصیف کے ساتھ ہی ان سے التجا بھی کرتے ہیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا کیا جائے:

سائیں کن ایک بار اکھار　　ہوں دکھیا کروں جوہار
تیرے مکھڑے کے بلہار
محمود سائیں سیوک تیرا　　توں تو سائیں سمرت میرا
کریں ہماری سار

والد کے ہاتھ بیعت سے خوش ہو کر قاضی محمود دریائی نے فی البدیع یہ چوپائی کہی تھی:

کہی منجھ پنڈت داس پجاری کوسوں گرہا منجھ سر بھاری

کی مجھ ہنس مکھ ویسے باہاں کی سادھ رہے من مانہاں

یاد رہے کہ یہ سارا کلام قاضی محمود دریائی نے راگ راگنیوں میں لکھا تھا۔ شاید اس دور کے گجرات کے اکثر صوفی شعرا موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے، اور اپنے کلام کو لے سر میں ڈھالنے کا جتن کرتے تھے۔ قاضی محمود دریائی کے کلام کی یہ مثالیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخِ ادبِ اردو' کے حوالے سے پیش کی گئی ہیں۔

شاہ علی محمد جیو گامدھنی

گجری صوفی شعرا کی صف میں ایک اہم نام شاہ علی محمد جیو گامدھنی کا بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا نام شاہ ابراہیم جمال اللہ اور لقب قطبِ عالم تھا۔ ان کے جد امجد سیّد احمد کبیر رفائی بطائحی (م ۵۷۸ھ/ ۱۱۸۲ء) حضرت غوث پاک شیخ عبد القادر جیلانی کے معاصرین میں تھے اور ان کے عقیدت مندوں میں سیّد احمد کا شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار سیّد احمد کبیرؒ وعظ فرما رہے تھے، تو اچانک انھوں نے اپنی گردن جھکا کر کہا 'علی رقبتی' یعنی میری گردن پر آپ کا قدم ہے۔ سامعین نے عرض کیا آپ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ فرمایا اس وقت بغداد میں غوثِ اعظم کہہ رہے تھے کہ 'قدمی ھذہ علی رقبۃ کل ولی اللّٰہ' یعنی میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔ تو میں نے تعمیل ارشاد میں اپنی گردن جھکا دی۔

شاہ علی محمد جیو گامدھنی نے منقبتی شاعری میں اپنے متقدمین و معاصرین شعرا ہی کی پیروی کی ہے۔ یعنی اہل بیت اطہار کی ثناگستری کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کی نہایت عقیدت مندانہ تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ جیو گامدھنی کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے 'سخنورانِ گجرات' میں لکھا ہے کہ جیو گامدھنی کا انتقال ۷۷ برس کی عمر میں ہوا۔ کتابوں میں ان کے انتقال کی تاریخ ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۵ء درج ہے۔ اس اعتبار سے ان کی تاریخ پیدائش ۸۹۵ھ ۸۹۶ھ رہی ہوگی۔ جیو گام دھنی کا مولد و مرقد احمد آباد ہی ہے۔ ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ گامدھنی کے دیوان کا نام 'جواہر اسرار اللہ' ہے، جسے ان کے دو شاگردوں نے مرتب کیا تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے اور وحدۃ الوجود و شہود کی باتیں بتائی گئی ہیں، جو ہندوی اسطور و فلسفہ سے متأثر دکھائی دیتی ہیں۔ جیو گامدھنی نے تصوف کے نہایت مشکل نکات کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ اس لیے عام قاری کو قدیم گجری زبان میں ان دقائق کا سمجھنا دشوار ہے۔ جواہر اسرار اللہ کی منقبتی شاعری میں جیو گامدھنی نے اہل بیت کبار کے ساتھ

اپنے مرشد کی مدح بھی کی ہے۔ نیز وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور اپنے جدامجد حضرت سیّد احمد کبیرؒ کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ 'علی گڑھ تاریخِ ادب اردو' کے ایک مقالہ نگار کے مطابق گامدھنی کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے سیّد احمد کبیرؒ رفاعی اور ماں کی طرف سے حضرت عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ ان دونوں کی منقبتوں میں شاعر نے بعض تاریخی واقعات قلم بند کیے ہیں، جو ان دونوں کی کرامتی عظمت کے موید ہیں۔ ولی کی گردن پر پاؤں کا واقعہ تو اوپر گزر چکا ہے۔ یہاں سیّد احمد کبیر رفاعیؒ کی عظمت و بزرگی ظاہر کرنے والا قبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ان کی حاضری کا واقعہ (جو اولیاء کرام کی سیرت کی کتابوں میں بکثرت جگہوں پر موجود ہے) گامدھنی نے بھی اپنی ایک منقبت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''شیخ عزالدین عمر ابوالفرح فرماتے ہیں کہ ۵۵۵ھ کے حج میں میں اپنے شیخ وملجا اور اپنے سردار ابوالعباس قطب وغوث شیخ سیّد احمد رفاعی کے ہمراہ تھا۔ اس سال آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ جب حضرت رفاعیؒ مدینہ پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حجرے کے سامنے کھڑے ہو کر لوگوں کی موجودگی میں بلند آواز سے عرض کیا، السلام علیک یا جدی یعنی اے میرے جد آپ پر سلام ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وعلیک السلام یا ولدی۔ اے میرے بیٹے تم پر بھی سلامتی ہو۔ اور اس جواب کو مسجد نبوی میں موجود ہر شخص نے سنا۔ اور یہ سن کر سیّدنا احمد رفاعی پر جذب طاری ہو گیا۔ آپ تھرا اٹھے۔ آپ کا رنگ زرد پڑ گیا، گریہ وزاری کرتے ہوئے گھٹنے کے بل کھڑے ہو گئے اور دیر تک سسکیاں لیتے رہے۔ پھر عرض کیا: اے جد کریم! دوری کی حالت میں اپنی روح وخیال کو بھیجا کرتا تھا، جو میری نیابت میں آستاں بوسی کرتے تھے اور آج یہ دور افتادہ درِ دولت پر حاضر ہے۔ لہٰذا آپ اپنے دست کرم کو دراز فرمائیں تاکہ میرے لب دست بوسی کی سعادت حاصل کر سکیں۔ تو رسول اللہ نے اپنے معطر دست مبارک کو قبر سے باہر نکالا، جسے نوے ہزار زائرین کے ہجوم میں امام رفاعی نے چوما۔ یہ سارے لوگ دستِ مبارک کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت مسجد میں حجاج کرام کے درمیان شیخ حیات بن قیس حزانی، شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ بھی موجود تھے۔ ہم نے بھی ان حضرات کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاکیزہ دست مبارک کی زیارت کی اور اس دن شیخ احمد قیس حزانی نے سیّد احمد کبیر رفاعی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور آپ کے مریدین میں شامل ہو گئے۔''

تاریخ سے ثابت ہے کہ سیّد احمد کبیر رفاعی ۵۱۲ھ میں بطائح کے ایک قصبے ام عبیدہ میں پیدا

ہوئے تھے، اور ان کا انتقال ۵۷۸ھ میں عراق کے مقام ام عبیدہ میں ہوا۔ اور اپنے دادا شیخ یحییٰ بخاری کے گنبد تلے دفن ہوئے۔ اس کے علی الرغم ہندوستان میں منگلور نامی دو جگہوں پر آپ کا مقبرہ موجود ہے۔صوبہ کرناٹک کے 'چکِ منگرول' میں سیّد احمد کبیر رفاعیؒ کی درگاہ مرجعِ خلائق ہے۔ وہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ سیّد احمد کبیرؒ بطائح سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور چک منگرول میں قیام کیا تھا، یہیں ان کا مزار ہے۔ صوبۂ مہاراشٹر میں بھی واشم ضلع میں منگرول نام کا ایک شہر ہے، یہاں بھی ایک تاریخی درگاہ ہے۔ جس کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ سیّد احمد کبیر رفاعی بطائحی کی ہے۔ اس علاقے میں انھیں دادا حیات قلندر کہا جاتا ہے۔ عبد الجبار ملکاپوری 'محبوب ذی المنن تذکرۂ اولیائے دکن' جلد اول صفحہ ۳۸۱ پر سیّد احمد کبیر کے متعلق رقم طراز ہیں:

''آپ کا نام سیّد احمد کبیر شاہ بدرالدین لقب ہے۔ حیات قلندر عرف ہے۔ آپ کا اصلی وطن ملک روم میں موضع بطائح ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سیّد یحییٰ رفاعی تھا۔ آپ وطن مالوفہ سے سیاحت کرتے ہوئے ہند میں وارد ہوئے۔ ہند سے ملک برار دکن میں آئے۔ آپ نے ۲۲ جمادی الثانی ۶۵۹ھ میں رحلت کی۔ بعض کا گمان ہے کہ یہ مزار مصنوی ہے کسی بزرگ کا چلہ گاہ ہے یہ گمان غلط ہے۔ اس کی کچھ اصل نہیں۔ آپ کا سالانہ عرس ۲۲ جمادی الثانی کو ہوتا ہے۔''

(عبد الجبار ملکاپوری، 'محبوب ذی المنن تذکرۂ اولیائے دکن'، مطبع رحمانی حیدرآباد ۲۰۰۱ء، جلد اول ص:۳۸۱)

اس طرح کی ایک ہی شخصیت کے تین تین مزارات، مقامات کے ناموں اور سوانحی حالات میں یکسانیت عقیدتمندوں کے لیے اشتباہ پیدا کردیتے ہیں۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی چونکہ اہل بیت اطہار کے بھی معتقد رہے ہیں اس لیے ان کی منقبتیں بھی جواہر اسرار اللہ میں ملتی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں کہی گئی منقبت میں وہ کہتے ہیں:

علی علی کا راتا ماتا علی علی منہ کرے سو پاتا
علی علی سوں چینی نباتا
علی علی ہس آپ دکھاوے علی علی سوں لاون لاوے
علی علی پر واری جاوے

(بحوالہ: تاریخ ادب اردو ص:۲۱۵)

دکن کے شاہ برہان الدین جانمؔ بھی اپنی تصنیف 'ارشاد نامہ' میں اپنے والد ماجد میراں جی شمس العشاق کی منقبت میں ممدوح کو پیر کامل کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

صفت کروں کچھ اپنا پیر جس تھے روشن ہوئے ضمیر
دُہوں جگ میں منج میت رہی سمروں رے میں نیت وہی
پیر میراں جی شمس العشاق دُہوں جگ رب تجہ کیا کشاف

(شاہ برہان الدین جانمؒ،'ارشاد نامہ'[مرتبہ قدیم اردو] ص:۱۳۲-۱۳۳)

فیروز بیدری

دکن میں جس شاعر کا نام اس کے معاصر شعرا کی زبان پر ہو، اور وہ اس کے کلام کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہوں، جس کی استادی کو وجہیؔ جیسا مغرور شاعر تسلیم کرتا ہو اور ابنِ نشاطی تو 'پھول بن' میں اپنے فن کی داد اسی شاعر سے طلب کرتا ہے۔ ایسے نامور شاعر کی تاریخِ پیدائش وموت کا سراغ دکنی ادب کی تاریخ میں موجود نہیں۔ اس کا وافر کلام محفوظ نہیں۔ اس شاعر کا نام فیروزؔ ہے۔ وہ اپنے نام اور وطن کا ذکر اپنی تصنیف 'پرت نامہ' میں اس طرح کرتا ہے:

مجے نانوں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

کہا جاتا ہے کہ فیروزؔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد بیدر سے گولکنڈا جا بسا۔ ملا وجہیؔ نے 'قطب مشتری'(۱۰۱۸ھ) میں فیروزؔ کو یوں یاد کیا ہے:

کہ فیروز محمودؔ اچتے جو آج تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونوں بی اس کام میں رکھیا نئیں کتے بول اچھوں نام میں

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ فیروزؔ کا انتقال ملا وجہی کی قطب مشتری کے سال تصنیف (۱۰۱۸ھ) سے بہت پہلے ہو چکا تھا، اور اس کا کلام شاہوں کے درباروں اور عوام الناس میں پسند کیا جاتا تھا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء۔۱۶۱۱ء) خود کہتا ہے:

اگر محمودؔ ہور فیروزؔ بے ہوش ہویں عجب کیا ہے
ہوئے تج وصف نا کر سک ظہیر و انوری بے ہوش

ابن نشاطیؔ نے پھول بن میں فیروز کو اس طرح یاد کیا ہے:

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچ مری داد

دکنی ادب کے قدیم ذخیرے میں فیروزؔ کی ایک منقبتی نظم 'پرت نامہ' اور چند غزلیں دستیاب ہیں۔ پرت نامہ ایک سو اکیس اشعار پر مشتمل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؓ اور فیروزؔ کے مرشد و پیر شیخ ابراہیم

مخدوم جی (م ۱۵۶۴ء) کی منقبت ہے۔ دکنی شاعری میں حضرت غوث اعظم کی مدحت میں غالباً یہ اولین مستقل تصنیف ہے۔ پیرومرشد کی تعریف وتوصیف میں بعض جگہ شاعر نے غلوئے عقیدت میں غیر مصدقہ اور ضعیف روایات کا بھی سہارا لیا ہے، جیسے اس نظم کے اٹھائیسویں شعر سے ایک قصہ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی کے متعلق بیان کیا گیا ہے:

ھینڈن نکلیا خضر یک دن جنگل — جو سوتا اتھا مرد یک جھاڑ تل
کہیا من میں کہ اس مرد کوں — جگاؤں، جو سیوؤ ہو اس فرد کوں
اٹھیا ناد از ہاتفِ غیب تب — کہ اے خضر ہو دور! راکھیں ادب
اچنبا ہوا خضر سن کر ندا — کہ ایسا کَوَن مرد ہے اے خدا
بڑا عبد القادر محی الدین ولی — ھینڈیں جملہ معشوق اس کی گلی
تہیں قطب اقطاب، جگ پیر ہے — تہیں غوثِ اعظم جہانگیر ہے
کہ باغِ علی کوں تو گلشن کیا — چراغِ حسن کوں، تو روشن کیا
حسن کے سو دریا کا موتی تہیں — حسیناں منے جگ جیوتی تہیں
محی الدین میرا نگہدار سچ — دنیا سوں نکو کر گرفتار منج
مجے دین بھاتا نہ بھاتی دنیا — انکھے دین آتا و جاتی دنیا

(فیروز بیدری [مرتبہ: ڈاکٹر مسعود حسن خاں] 'پرت نامہ' حیدرآباد ۱۹۶۵ء، ص: ۳۵۰-۳۵۲)

'پرت نامہ' میں منقبت کی تکنیک کچھ اس طرح ہے کہ شاعر خواب میں غوث اعظم کو دیکھتا ہے تو ان کے قدموں میں گر جاتا ہے، لیکن جب غوث اسے مرید ہونے کی بشارت دیتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر گریز کرتا ہے کہ میں نے خواب میں غوث کا دیدار کیا، لیکن بیداری میں تو مخدوم جی کو پا لیا۔ اس کے بعد فیروز غوث کی ساری خصوصیات اپنے مرشد مخدوم جی میں دیکھنے لگتا ہے اور غوث کے در پردہ مخدوم جی کی تعریف کرنے لگتا ہے۔

پچھلے صفحات میں کہا جا چکا ہے کہ اردو کی منقبتی شاعری شعری محاسن سے بڑی حد تک معریٰ رہی ہے۔ جہاں تک اس میں عقیدت کا عنصر ہے، وہ بھی محض رسمی ہے یا پھر افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ بزرگانِ دین اور اکابرین کی مدح کرتے وقت حفظِ مراتب کا بھی خیال اکثر نہیں رکھا گیا۔ بر بنائے عقیدت، منقبت کے ممدوحین فوق البشریت کے دائرے میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں صرف تصور اور تخیل ہی پہنچ سکتے ہیں۔ ممدوحین کی کرامتوں کے ذکر میں اکثر موضوع روایات، اسطوری افکار اور من گھڑت کہانیوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہی شاعری، شاعر کے مذہبی ذہن کا پتہ بھی دیتی ہے۔

چنانچہ محققینِ ادب بڑی حد تک شاعر کے مسالکِ دینیہ کا پتہ لگانے کے لیے اس کی منقبتی شاعری ہی کا سہارا لیتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہی سلطنت گولکنڈے کا پانچواں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ تھا۔ وہ ۱۴/اپریل ۱۵۶۵ء کو پیدا ہوا۔ وہ اپنے باپ کا تیسرا بیٹا تھا۔ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد وہ ۵/جون ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی علمی لیاقت اگرچہ اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں معمولی تھی، لیکن سیاسی امور میں تدبر اور بیدار مغزی لاجواب تھی۔ اسے فنِ تعمیر سے دلچسپی تھی۔ خوش نویسی، مصوری اور شاعری جیسے فنون لطیفہ سے اس کا لگاؤ دیدنی تھا۔ سیاسی امور میں بھی وہ آزاد منشی، منصف مزاجی، صلح جوئی اور امن پسندی کا قائل تھا۔ اس کے دادمحل کے دروازے فریاد رسی کے لیے ہمیشہ کھلے رکھے جاتے تھے۔ اگرچہ بعض مورخین محمد قلی قطب شاہ کو عیش پسند رنگین مزاج بادشاہ سمجھتے رہے ہیں، لیکن اس نے اپنے جانشینوں کے لیے جو مستحکم اور پر امن سلطنت چھوڑی تھی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطنت کے بست وکشاد سے کبھی غافل نہیں رہا تھا۔ اپنی وسیع سلطنت، تعمیرات اور شاعری کی کلیات اس کے یادگار اثاثے ہیں۔ اس کا انتقال عارضۂ تپ کی وجہ سے ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء کو ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کے اشعار سے اس کا ترکِ مسلک کرنا ثابت ہوتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

میں آپ دین چھوڑ پکڑیا اس دین کا مارگ
پنانے اجھوں مو کوں ہندوئے فرخ
یک دھیان یک چت سوں دل ہور جیو میرا
حیدر سوں صدق لایا صلوات بر محمد

(محمد قلی قطب شاہ [مرتبہ ڈاکٹر سیّدہ جعفر] 'کلیات محمد قلی قطب شاہ' نئی دہلی ۱۹۹۸ء، ص: ۱۳۳۱ اور ۳۶۷)

محمد قلی قطب شاہ کی کلیات کے حصۂ اول کا تین چوتھائی حصہ مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد ونعت ومنقبت اور مناجات کے علاوہ عیدین، نوروز اور بسنت، دیپاولی ہولی وغیرہ پر بھی نظمیں ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ مذہبی رواداری کا قائل تھا، اور تمام مذاہب کا احترام کرتا تھا۔ جلوہ، سالگرہ، مہندی جیسی رسومات اور مختلف کھیلوں پر بھی ان کی کلیات میں نظمیں ملتی ہیں۔ یہ منظومات ثقافتی رشتوں کو مضبوط کرنے اور آپسی بھائی چارہ بڑھانے میں محمد قلی قطب شاہ کی دلچسپی کی مظہر ہیں۔ گولکنڈا کے قطب شاہی خاندان کے تمام بادشاہ اہل تشیع تھے اور اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ بھی اسی مسلک کا پیرو تھا۔ اس کی کلیات میں بیسیوں اشعار اس کے

اس مسلک کی گواہی دیتے ہیں:

میں جو عاجز داس تیرا یا علی منج دستگیر — ہے محمد قطب بارہ اماماں کا غلام

نبیؐ ہور علیؓ کی دَیا سوں سُہایا — اماماں مَیا ہے محمد قطب پر

ہزاروں رحمت ہے تجھ پر جو حیدر کا دھریا دامن قطب شہ دو جگت میں سروری ہے تج وہ سرور تھے۔

کلیات کے ان اشعار کے علاوہ عیدِ غدیر، عید میلاد علیؓ، یوم ولادت رسولؐ، قصیدہ یا علیؓ، مناقب علی و مدح فاطمہؓ وغیرہ منظومات بھی اس کے مسلکاً شیعہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ جس طرح 'یومِ ولادت رسولؐ' دھوم دھام سے مناتا، اسی طرح 'یومِ میلادِ علیؓ' بھی بڑی شان سے مناتا تھا۔ اس کی کلیات میں عید میلاد علیؓ پر نو نظمیں ملتی ہیں، جن میں عقیدت کی فراوانی بھی ہے اور جذب و کیف کا اظہار بھی۔

مرتضیٰ بارہ اماماں عید ہے معبود کا — موموناں خوشیاں کرو ہے آج دن مولود کا

جِن کرے یہ عید وو طالعٔ مسعود کا — مصطفیٰ ہور مرتضیٰ اس دن میں کیتے ہیں ظہور

کوئی نبی نا پایا اے حرمت اتے چاواں سیتی — کعبے میں ہوئے تولد مرتضیٰ شیرِ خدا

(محمد قلی قطب شاہ [مرتبہ: زور مرحوم] ''کلیات محمد قلی قطب شاہ'' حیدرآباد ۱۹۴۰ء، ص: ۶۳، ۶۸، ۷۰)

کلیات میں عید غدیر پر آٹھ نظمیں ملتی ہیں۔ یاد رہے کہ ''یوم غدیر'' اہل تشیع کے نزدیک ''یوم الخلافت'' ہے۔ حجۃ الوداع سے واپسی پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے 'غدیر خم' (نام ایک تالاب کا) کے پاس پڑاؤ ڈال کر اپنے رفقائے کرام سے خطاب کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ سے سرگوشی میں کچھ باتیں کی تھیں۔ اہلِ تشیع اسی واقعہ کو حضرت علیؓ کی خلافت کے متعلق بطور توجیہ پیش کرتے ہیں۔ بہر کیف! محمد قلی قطب شاہ نے اسی یومِ غدیر کی سرخی کے تحت اپنی کلیات میں آٹھ نظمیں لکھی ہیں۔ شاعر مئے حب علیؓ کی جرعہ کشی میں مست ہو کر عالمِ سرمستی میں جھوم جھوم کر کہہ اٹھتا ہے:

موالیاں سب کرو خوشیاں کہ آیا دن خلافت کا
خلافت دے رسولؐ آپی بیاں کیتے شرافت کا
ساری عیداں کا خوشی سنپور ہے اس عید تھے
تو اسی عیداں میں دِستا ہے بڑائی بے نظیر

تب موموناں خوشیاں سوں کسوت کیے شہانی — حق تے نبی علی کوں اپ جانشیں کیے آج

عیداں منے یو عید بڑا ات گھنبیر ہے — سب جگ کرے آنند کہ عیدِ غدیر ہے

دو جگ اپر امیر سوں حضرت امیر ہے — روشن ہوا ہے دین دنیا آج کے دنا

(کلیات محمد قلی قطب شاہ [مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر] مختلف صفحات)

محمد قلی قطب شاہ نے مناقب لکھنے کے لیے قصیدے کی صنف کو بھی آزمایا ہے۔ کلیات میں گیارھواں قصیدہ بعنوان 'شان علیؓ' ہے۔ یہ ناقص الاول ہے۔ اس میں تشبیب، گریز وغیرہ جزئیات کا استعمال نہیں ہوا، صرف مدح و توصیف ہی کو اس میں جگہ دی گئی ہے۔ شاعر کی علیؓ کے تئیں مدحت طرازی میں والہانہ جذبۂ عشق دکھائی دیتا ہے:

سب انبیا پرور تمہیں ہے اولیاء رہبر تمہیں — حیدر تمہیں صفدر تمہیں امت کو اهدا یا علی
دانش تمن تھے آیا جگ پنت تمارا دھایا — بینش تمن تھے پایا جگ میں سو پیدا یا علی
بندا تمارا ترکماں تج داس ہے دونوں جہاں — منگتا سدا امن و اماں تمنا تھے قطبا یا علی

(ایضاً ص: ۲۵۔ ۲۴ے)

ان نظموں اور قصائد کے علاوہ قلی قطب شاہ نے 'در منقبت علیؑ' اور 'در بیانِ علیؑ' کے عنوان سے چھے نظمیں زینت قرطاس کی ہیں۔ ان میں صوفیانہ نکات بھی ہیں اور صادق جذبۂ عشق بھی۔ تغزل کا رنگ بھی ان کے مناقب میں جھلکتا ہے۔ عشقیہ انداز میں لکھی ہوئی یہ منقبت ملاحظہ کیجیے:

تم ہمن میں قول کیاں، با تا ں ہو یاں تھیا ں رات سب
رات کیاں باتاں صُبا نہیں ہیں تمہیں روشن ضمیر
بیکس و ناکس ہوں میں کس سوں کروں پیرت کی بات
میرے روں روں خط کو ں پڑتا ہے تمارا دل دبیر

(ایضاً ص: ۳۰۷)

مدح علیؓ کے ساتھ ساتھ شاعر نے حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی تعریف میں دو نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں آپؓ کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے:

ازل تھے بی بی فاطمہ بھاگ ساجے — کہ جلوے دمامے عرش میانے باجے
سُہاگاں کا کلسر ازل تھے بندے ہیں — کہ داونی کا پھندنا او باہاں پہ ساجے

(ایضاً ص: ۳۰۹)

حضرت فاطمہ سے متعلق دوسری منقبت میں آپؓ کے نام پر کی جانے والی کسی عید کا ذکر ہے۔ اس دن گھر گھر حضرت فاطمہ کی آمد کا تصور کر ضیافت کے سامان سجائے جاتے ہیں۔ شاعر نے اپنے انداز سے ضیافت کی اس محفل کا نقشہ کھینچا ہے:

گھر و گھر، بندے سب گھرے گھر کرتے آنند میزبانی
فاطمہ بی بی دیئے تشریف مج جم جم شہانی

عاشقاں مل عاشقی سوں سب نوے غمزے دکھاویں
ساقیاں پھر آؤ تم مجلس منے مے ارغوانی
پاتراؤں نو ناؤ کے غمزے دکھاویں گھنگرومیں
تال دھاری گاونا مندے دھکاری شادمانی

(ایضاً ص:۳۱۰)

یوں تو مناقبِ ائمہ کرام اور مدح اہل بیت نبیؐ لکھنے کا التزام بیشتر شعرا نے کیا ہے۔اس میں دکنی یا شمالی ہند کے شعرا کی تخصیص نہیں۔متقدمین شعرا میں شہباز حسینی، خوب محمد چشتی، افضل پانی پتی، ابراھیم عادل شاہ ثانی جگت گرو، عبدل دہلوی، ابوالحسن قادری، حسن شوقی وغیرہ سبھی نے مناقب اہل بیت پر طبع آزمائی کی ہے جو عقیدت و اخلاص اور شگفتگیِ قلب کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ذیل میں ان میں سے اہم شعرا کی منقبتی شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو

شمال میں اکبر اعظم، گولکنڈا میں محمد قلی قطب شاہ اور بیجاپور میں ابراھیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کی حکم رانی تھی۔دکن کے یہ دونوں بادشاہ سیف وقلم کے دھنی مانے جاتے ہیں جبکہ اکبر شہنشاہ ہندان پڑھ تھا لیکن اس نے اپنے سیاسی تدبر سے سرزمین ہند کو سیاسی اعتبار سے غیر منفصل (اکھنڈ) بنا دیا تھا۔ پچھلے صفحات میں ہم نے محمد قلی قطب شاہ کی منقبتی شاعری پر غور کیا تھا، اب ابراہیم کی شاعری میں منقبتی پہلو تلاش کریں گے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۷۸ھ/ ۱۵۷۰ء میں پیدا ہوا تھا۔اس کے والد شاہ طہماسپ، علی عادل شاہ اول کے بھائی تھے۔ چونکہ علی عادل شاہ اول لا ولد تھے، اس لیے انھوں نے طہماسپ کے بچوں کی پرورش و پرداخت اپنی اولاد کی طرح کی تھی اور اپنی زندگی ہی میں ماہ شوال ۹۷۸ھ/ ۱۵۷۰ء کو طہماسپ کے بچے ابراہیم عادل شاہ کو ۹ برس کی عمر میں اپنا جانشین وولی عہد بنا دیا۔علی عادل شاہ کے انتقال (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء) کے بعد ابراہیم نے سلطنت کی باگ ڈور خود سنبھالی۔ چونکہ ابراہیم نو برس ہی کا تھا اس لیے ابراہیم عادل شاہ اول کے وکیل سلطنت افضل خاں کو اس کم سن بادشاہ کا نائب سلطنت مقرر کر دیا گیا۔ بڑا ہو کر ابراہیم عادل شاہ ثانی 'جگت گرو' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے عہد میں بیجاپور علم و ادب اور فنون لطیفہ کا مرکز بن گیا تھا۔ خود بادشاہ سلامت موسیقی کا ماہر، تاریخ کا جانکار اور شاعری کا شیدائی تھا۔اس کی جمالیاتی حس کا یہ عالم تھا کہ اس نے لفظ 'نورس' کو اسماء وصفات کے طور پر استعمال کیا تھا۔مثلاً کتاب نورس (نام کتاب) نورس (شاعری) نورس (شراب) نورس

(علم) نورس (شاہی نشان) نورس (عید) نورس (سکہ) نورس (محل) وغیرہ۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں دنیا بھر کی نامور شخصیتیں جمع ہوگئی تھیں۔ مثلاً محمد قاسم فرشتہ، رفیع الدین شیرازی اور اسد بیگ جیسے مورخین اورظہوری، ابو طالب کلیم، باقر کاشی، حسن عسکری کاشانی، ملک قمی، سنجر کاشی، عبدل (ابراہیم نامہ) اورحیدر ذہنی جیسے شعرا۔ظہوری نے تو بادشاہ کی کتاب 'کتاب نورس' کا مقدمہ فارسی زبان میں لکھا تھا، جو اتنا مشہور ہوا کہ فارسی نثر کا بہترین نمونہ اسے سمجھا گیا۔اورظہوری کا یہی پیش لفظ 'سہ نثرظہوری' کے نام سے معروف بھی ہوا۔ ان کے علاوہ اس کے دربار میں چند مشہور کاتب اورخطاط بھی تھے،جن میں عبداللطیف مصطفیٰ،عبدالرشید،عبدالحلیم بن مصطفیٰ، باقر کاشانی وغیرہ شامل ہیں۔

'کتاب نورس' ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کی وہ کتاب ہے،جس میں راگ راگنیوں کے مطابق ۵۹ گیت لکھے گئے ہیں۔ان گیتوں پر ہندو دیومالا کا اثر کافی گہرا ہے۔اس کتاب کی ابتدا سرسوتی دیوی کی تعریف سے ہوئی ہے۔شاعر اسے اپنی ماں کہہ کرمخاطب کرتا ہے۔شاعر کا عقیدہ ہے کہ اس دیوی کے فضل سے ابراہیم کے گیت دیر زمانے تک قائم رہیں گے۔ نورس کے بعض گیتوں میں منقبتی عنصر بھی موجود ہے۔ابراھیم عادل شاہ ثانی کوحضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے والہانہ عقیدت تھی۔اس نے آپؒ کے مزاراورمقبرے کی آرائش وزیبائش کے لیے شاہی خزانے سے خطیر رقم وقف کر دی تھی، اور عرس کے موقع پر درگاہ کے رنگ ونور کا بھی خود ذاتی طور پر خیال رکھتا تھا۔اس کے منقبتی اشعار میں عقیدت کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔دکنی ادب میں حضرت گیسودراز کا 'شکارنامہ'، نظامی بیدری کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اور ابراھیم عادل شاہ کی 'کتاب نورس' سمجھنے کے لیے کافی دشوار مانی گئی ہیں۔اس لیےمثالوں میں دیئے گئے گیتوں کے ساتھ ان کا سلیس ترجمہ بھی دیا جارہاہے:

من ساگر دان مُکُتا چکرنگ جگ پورس
سیّد محمد پیر مَدَث یو روشنائی دَرَس
ابراہیم پایا اُتّم مَنُسا ناری نورس

کتاب کا یہ گیارھواں گیت در مقام حجیز نورس میں گانے کے لیےلکھ گیا ہے۔اس میں بڑی صاحبہ (ابراہیم عادل شاہ کی والدہ) کی توصیف بیانی کرتے ہوئے ضمناً خواجہ بندہ نواز کی بھی مدح شامل کر لی گئی ہے۔ پورے گیت میں شاعر کہہ رہاہے کہ 'اے بڑی صاحبہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں۔خدا کرے آپ کا سایۂ عاطفت اپنےلڑکے پراس وقت تک باقی رہے، جب تک زمین وآسمان چانداور سورج باقی ہیں۔' پھر دعائیہ کلمات کے بعدخواجہ بندہ نواز کی مدح سرائی کچھ اس طرح کی گئی ہے۔'دل سمندر ہے،سخاوت موتی ہیں اور دنیا ہنس کی مانند ہے جوان موتیوں کو چگ رہا ہے۔اے میرے ہادی

سیّد محمد! آپ اپنا روشن چہرہ دکھایئے آپ ہی کی برکت و دعا سے مجھے ایک عالی ہمت خاتوں ملی ہے۔'

کتاب نورس کے اٹھائیسویں گیت میں ابراہیم نے سیّد محمد خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تعریف و توصیف میں قدیم روایت سے ہٹ کر نیا انداز اپنایا ہے۔ اس دور میں گویا شاعری میں یہ ایک قسم کی جدت تھی۔ شاعر کہتا ہے:

در مقام گوَری نورس

سیّد محمد میرے دل پر نانو   جیوں رسول کر لکھے عرش ٹھانو
بین
گُمتُ دِسے جیوں خرُو مدینا   کئے غلیف بھَر موتیوں چونا
جیوں دیپک میں دِسے مدھ نائک نگینا   مشک عَبیر بچھائے انگنا
سِیوے آوِیں ذو قعد مہینا
ابھوگ
پُوت نبی کا پیر مردانا   جِس پگ پَرس ہوئی زمینا
ابراہیم خاک پرسوں ہووا سونا   جِیو ں نورسور تھیں لے چاند ہوا روشنا
کِیے نوازش سب بخشے گنہا

شاعر کہہ رہا ہے کہ سیّد محمد (خواجہ بندہ نواز گیسودراز) کا نام میرے دل پر ایسا ہی نقش ہے جیسا کہ عرش پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام کندہ ہے۔ ان کی درگاہ کا گنبد ایک چھوٹے شہر یا آئینہ کی مانند دکھائی دیتا ہے اور آپؒ کے مزار کا غلاف چنندہ اور بڑے موتیوں سے ٹنکا ہوا ہے۔ ایسے موتی جو چراغ کے اجالے میں دمک کر بڑے ہیرے معلوم ہوتے ہیں۔ آپؒ کی درگاہ کے صحن میں مشک وعنبر بکھرا ہوا ہے۔ ذی قعد کے مہینے میں (عرس کے موقع پر) رعایا اس درگاہ کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اولاد کے پیر (بوڑھے) بھی جواں مرد کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے قدم زمین کے جس حصے کو چھو جاتے، اے ابراھیم وہ زمین کیمیا ہو جاتی۔ جس طرح چاند اندھیرے کو زائل کرنے کی خاطر سورج سے نور لے کر چمکتا ہے اس طرح اے بندہ نواز میرے بھی گناہ بخش دیں اور میرے دل کی کدورت ختم فرمادیں۔

گیت کے آخری مصرع میں استمداد یہ انداز عقیدت میں غلو ہے۔ یہ ایمانیات کے خلاف جاتا ہے اور ''اِیَّاكَ نَسْتَعِينُ'' کی نفی کرتا ہے۔ شاعر نے ایک اور منقبتی گیت میں نہایت زبردست طریقے سے شعری صنعتوں کا استعمال کر کے گیت کے کھردرے پن کو حسین وجمیل بنا دیا ہے:

مخدوم سیّد محمد حسینی گیسودراز عاشقِ شہباز سرفراز
تماری قبر سیپی سیّد محمد آچھے موتی
اوپر غلیف دریا آسمان گُمتی دِیوے تارے کلس قدرتی
بہشت دروازے فرشتے خدمت گارا اُود کا دھواں بھرے ہر دو جہاں پارا
مقامِ ابراھیم تُمارا ٹھارا

یعنی اے سیّد محمد حسینی گیسودراز عاشقِ شہباز آپ کی قبر سیپ کی مانند ہے اور آپ اس قبر میں مثل موتی کے آرام فرما ہیں۔ قبر کے اوپر گردش کرتے ہوئے دریائے آسمان کا غلاف مانند گنبد ہے اور اس کے تارے چراغ کے مانند ہیں۔ اس درگاہ کا دروازہ جنت اور فرشتے خادم ہیں۔ درگاہ سے اٹھنے والا عود کا دھواں دونوں جہاں میں بھرا ہوا ہے۔ مقام ابراہیم (کعبۃ اللہ میں ایک مقام کا نام) آپ کی قیام گاہ ہے۔ یعنی آپ اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں۔ اسی کتاب کے بتیسویں گیت میں شاعر نے بڑے عارفانہ انداز میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ جس طرح سکندر بحر ظلمات تک حضرت خضر کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی طرح میرا پیو (خدا) جو دل کی گہرائیوں میں بیٹھا ہے، میں اسے تلاش کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میرے پیر سیّد محمد گیسودراز، میری رہبری فرما کر مجھے خدا سے ملا دیں گے۔ گیت نمبر باون مکمل طور پر منقبتی ہے۔ اس میں ابراہیمؔ نے حضرت بندہ نواز گیسودراز کی مدحت سرائی میں شاعرانہ انداز اپنایا ہے۔ وہ کہتا ہے:

صفت کیا کروں تیرا سو جیب ہووے تو تھوڑا
جیوں تارے چاند کو چِپیں اَجیت نکلیا سب چھپیں
تیوں سب پر غالب سیّد محمد آپیں
حسن تمھارا یوں بھرے دائم سور اُس دیکھنے پھرے
چاند سوں لاجوں جھورے
ابراھیم پکڑیا ہے آس جب آوے سیّد محمد کی باس
تب ہووے گا اُلاس

اشعار کا مطلب ہے کہ میں آپ کی تعریف کیسے بیان کروں اگر منہ میں سو زبانیں بھی ہوتیں تو بھی میں آپ کی تعریف کرنے سے قاصر ہوں۔ جس طرح ستارے چاند کے اردگرد اس کی پرستش کرتے ہیں اور جیسے ہی سورج نمودار ہوتا ہے سب ستارے چھپ جاتے ہیں، اسی طرح اے سیّد محمد گیسودراز آپ کو بھی تمام پر فوقیت حاصل ہے۔ آپ کا حسن لاجواب ہے۔ خود سورج آپ کے نور کا متلاشی ہے، اور چاند آپ کا نور پانے کی خاطر شرمندہ اور غمزدہ رہتا ہے۔ ابراہیم کو امید ہے کہ سیّد محمد گیسودراز کی (یادوں کی) خوشبو سے مسرت حاصل ہوگی اور شوق کا غلبہ ہوگا۔

عبدلؔ دہلوی

ابراہیم عادل شاہ جگت گرو جیسے علم پرور بادشاہ کا 'نوی بات' کہنے والا درباری شاعر، جو دہلی سے آکر بیجاپور میں بادشاہ کا منظورِ نظر بن جاتا ہو، شعرائے دکن کی فہرست میں اس کا نام نہ ہونا کیسی بوالعجبی ہے! عبدلؔ کے تئیں شعراو محققین کا اس اجتماعی اغماض کے پس پشت پتہ نہیں کون سی ذہنیت کارفرما رہی ہوگی، درآنحالیکہ دکنی ادب کے قدیم دور میں ملا وجہیؔ کی قطب مشتری اور عبدلؔ کی ابراہیم نامہ دونوں طبع زاد مثنویاں دو برس کے فرق سے علی الترتیب ۱۰-۱۶۰۹ء اور ۱۲-۱۶۱۱ء میں تصنیف ہوئی تھیں۔ یہ دونوں مثنویاں ایک قسم کے شاہ نامے ہیں۔ وجہیؔ نے افسانوی انداز میں گولکنڈہ کے شہزادے محمد قلی کے احوال قطب مشتری میں قلم بند کیے ہیں، جبکہ عبدلؔ نے بیجاپور کے تاجدار ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کی حکمرانی کے احوال کی تاریخ 'ابراہیم نامہ' میں جمع کر دی ہے۔ بہر حال! یہ دونوں کتابیں وقت کے سلاطین کی شان میں لکھے گئے قصائد ہیں، جنھیں مثنوی کے پیرائے میں نقل کیا گیا ہے۔ ایک میں واقعات کو افسانوی رنگ دیا گیا ہے، دوسرے میں عصری واقعات کی تاریخ مرتب کر دی گئی ہے۔

عبدلؔ کے ابراہیم نامہ مرتبہ مسعود حسین خان میں اشعار کی کل تعداد ۱۳۱۷ ہے۔ صنفِ مثنوی کے لحاظ سے ابراہیم نامہ حمد، نعت، منقبت سے شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں بادشاہِ وقت ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کی تعریف وتوصیف بیان ہوئی ہے، اس لیے اس میں قصیدے کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے۔ شاعر سنی المسلک ہے، اس لیے نعت کے بعد مثنوی میں خلفائے راشدین کی مدحت طرازی بھی کی گئی ہے، نیز شاعر نے اپنے پیر حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی بھی تعریف کی۔ مدحت کے یہ دونوں حصے منقبتی شاعری کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حمد ونعت کے بعد شاعر یارانِ رسول کی مدح میں یوں گل افشانی کرتا ہے:

نبیؐ پریت کے تھے سنو چار یار بَلِکُ وُ رتن چار، چارو کنار
پدک دین مجلس جڑے وُ رتن کندن صدق سوں لگ رہے وُ جتن
ہوئے مدہ سو نائک نبی درمیاں سریا ھر دوعالم میں جس جوت آں

اس تعریف کے بعد ہر رتن کا وصف بیان کیا گیا ہے کہ پہلا رتن ابوبکر ہیں، جس کی صدیقیت بیان کرنا دشوار ہے۔ دوسرا رتن حضرت عمرؓ ہیں، جن کا عدل مشہور ہے۔ تیسرا رتن حضرت عثمانؓ ہیں، جن کی حیا مشہور ہے اور چوتھا رتن حضرت علیؓ ہیں، جو شجاعت، سخاوت، ولایت کے پیکر ہیں۔ آگے شاعر کہہ رہا ہے کہ حضرت محمد جڑ ہیں تو علیؓ پیڑ ہیں، جن سے چودہ خانوادے وجود میں آئے۔ خانوادۂ تصوف میں علمِ تصوف کا مرجع حضرت علیؓ مانے جاتے ہیں۔ دنیا کی خلافت حضرت علیؓ کو حاصل ہوئی، تو بیعت کے

پھولوں کے پھل بھی لگے۔ شاعر یہ بھی کہتا ہے کہ جوکوئی پیر کونہیں مانتا وہ بالتحقیق مشرک ہے۔خلفائے راشدین کی مدحت کے بعد عبدلؔ مرشد شہباز حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تعریف وتوصیف کرتا ہے:

زباں اب سنور شاہ مرشد آواز　　محمد حسینی جو گیسوُ الدراز
وہی ہے علی کے نسب کا چراغ　　وہی ہے نبی آل کا خاص باغ
کیا شاہی سو دور فیروز گھر　　نوازیا سو احمد گدا شاہ کر

(عبدل دہلوی [مرتبہ: مسعود حسین خاں] 'ابراہیم نامہ' دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۲-۱۳)

منقبت کا یہ آخری شعر ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ یہاں فیروز سے مراد فیروز شاہ بہمنی اوراحمد سے مراد احمد شاہ بہمنی ہیں۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ فیروز شاہ بجائے احمد شاہ کے اپنے بیٹے حسن شاہ کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔عوام الناس احمد شاہ کی تائید کررہے تھےاور حضرت بندہ نواز کی دعائیں بھی اسے ہی حاصل تھیں۔ بالآخر دونوں بھائیوں کے درمیان معرکہ پیش آیا، اوراحمد شاہ بہمنی کو فتح حاصل ہوئی اور وہ ۱۴۲۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ان اشعار کے بعد شاعر استعانت کا طالب ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی شاعری کا سارے ہی عالم میں غوغا ہوا۔ ابراہیم نامہ کی ختم کتاب کی تاریخ شاعر نے خود عنوان باندھ کر 'شہور سنہ ۱۰۱۲' بتائی ہے۔ افسوس کہ ایک درباری شاعر ہونے کے باوجود عبدلؔ کی تاریخِ ولادت ملتی ہے، نہ تاریخِ وفات کا کسی تذکرے میں پتہ چلتا ہے۔

شاہ ابوالحسن قادری

شاہ ابوالحسن قادری بیدر میں پیدا ہوئے تھے،لیکن کسی تذکرے میں ان کی تاریخِ پیدائش کا ذکر نہیں۔ ان کے والد سیّد شاہ بدرالدین حبیب اللہ بیدر کے مشہور شیخ طریقت تھے۔ابوالحسن کے جدامجد عبدالقادر یوسف ترک وطن اختیار کرکے بغداد سے ہندوستان آ گئے تھے۔اس زمانے میں بیدر علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا،اس لیے وہیں بود و باش اختیار کی اور یہیں سپردِ خاک ہوئے۔سیّد بدرالدین کے تین فرزند تھے۔سیّد شاہ ابوالحسن قادری، مصطفیٰ قادری اور قاسم قادری۔ ابوالحسن کا بچپن اورعنفوان شباب یہیں گزرا۔ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے عہد حکومت میں وہ بیدر کوچھوڑ کر بیجاپور میں آ کر بس گئے۔ بعد میں بدرالدین کے پورے خاندان نے بیجاپور میں سکونت اختیار کر لی۔سیّد شاہ بدرالدین حبیب اللہ کے تینوں لڑکوں کے روحانی فیوض و برکات کا دکن میں بڑا چرچا تھا۔ان روحانی تصرفات سے ہٹ کر بھی یہ تینوں لڑکے شعری ذوق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس خاندان کے ادبی ذخیرے میں مثنوی 'علم سلوک'، 'صحیفۂ اہل ہدا'، 'وصیت نامہ'، 'توصیف'، 'سکھ انجن' وغیرہ شامل ہیں۔

'سکھ انجن' شاہ ابوالحسن قادری کی تصنیف ہے۔ اس میں تصوف وسلوک اور حکمت کی باتیں

سمجھائی گئی ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں اس کتاب کے دو نسخے موجود ہیں۔ اُنھی کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے سکھ انجن کو مرتب کیا تھا۔ یہ ایک مثنوی نما گیت ہے، جس کی بحر نہایت مختصر ہے۔ بعض جگہ 'آنکھ مچانی کڑوا تیل' اس مصرع کو دہرانے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے اسے گیت کی طرز پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی میں بچوں کے ایک معروف کھیل 'آنکھ مچانی/ مچولی' کے سہارے عورتوں کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کھیل کے سہارے تصوف کے نکات بالخصوص مراقبہ اور توجہ الی اللہ والی کیفیات کی توضیح بھی کی گئی ہے۔ شاعر نے اس مثنوی میں قرآنی آیات کے معنی و مفہوم کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی بھی کوشش کی ہے۔ جیسے: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ یعنی کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ تمھارے نفسوں کے درمیان ہے اور، هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ یعنی وہی تمھارے ساتھ ہے جدھر دیکھو، کی گویا تفسیر اس کے اشعار میں پنہاں ہے۔ آنکھ مچانی اگرچہ بچوں کا کھیل ہے، لیکن اس میں عشقِ مجازی کے تناظر میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

کھیل میں ایسا کھیل ہووے پیا ملن کا میل ہووے
جس کوں یہ کھیل سوجے گا پیو کی مارگ بوجے گا
جس جا گا میں چھپنا ہووے چھپنا اس کا سینا ہووے
چھپنے جینے کا سو کھیل آنکھ مچانی کڑوا تیل
آنکھ مچانی کھیل کھلائے پیو پانے کا میل ملائے

(ابوالحسن قادری 'سکھ انجن' [مخطوطہ] ادارہ ادبیات اردو، مختلف صفحات)

مثنوی سکھ انجن حمد و نعت اور منقبت سے شروع ہوتی ہے۔ شاعر نے حضرت علیؓ کی مدح کرتے ہوئے کہا ہے:

'لا' کا لے کر ذوالفقار
اللہ دلدل ہوا سوار

آگے حضرت علیؓ کے رونے سے دوزخ کی آگ ٹھنڈی ہو جانے کا واقعہ قلم بند کیا گیا ہے:

اوس کا ہیگا یوں بستار حضرت شاہ ذولفقار
یک دن سورہ کھوئے تھے نیناں رو رو دھوئے تھے
اوس رونے کے فضلاں دیکھ دوزخ ٹھنڈا ہو رہے نیک
ایسا رونا قسمت کس کہیں ہو عطراں پنجتن جس

(ایضاً ص: ۱۲)

ابوالحسن قادری کی ایک اور تصنیف 'توصیف' بھی ہے۔ یہ ایک مختصر نظم ہے اور اس میں محبوب کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ نظم میں حمد و نعت وغیرہ موجود نہیں۔ شاہ ابوالحسن قادری سلوک کی تعلیمات عام کرتے ہوئے رمبھا پور میں ۲۴ر ربیع الثانی ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء کو ابدی نیند سو گئے۔

ملا اسداللہ وجہیؔ

محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک نہایت معتبر معروف شاعر اور نثر نگار گزرا ہے۔ نثر میں 'سب رس' اور شاعری میں 'قطب مشتری' اس کی مشہور کتابیں ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں اسے ملک الشعرا کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ شاعر نے اپنے فارسی دیوان میں اپنے آبائی وطن کے متعلق کہا ہے:

من ز ہند آشکار گشتم لیک
طبعِ پاکِ من از خراسان است

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خراسان سے ہندوستان آیا تھا اور دکن میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ دکن کی تعریف وہ اس طرح کرتا ہے:

دکن سا نئیں ٹھار سنسار میں		کہ سب ملک سر ہور دکن تاج ہے
دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے		تلنگنا اس کا خلاصہ اہے

اس نے ایک شعر میں اپنے نام کی وضاحت بھی کر دی ہے:

اسم اسد اللہ وجیہہ است تخلص
آرائش د کا نچۂ بازارِ کلام است

ملا وجہیؔ جس کی ادبی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں، جس کی 'سب رس' کو اردو نثر کا اولین نقش تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس کی عبارت آرائی میں انشائیہ کا سا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس وقت سے جب انشائیہ کا نام عالمی ادب میں عنقا تھا۔ افسوس کہ اتنے بڑے ادیب و شاعر کی تاریخ پیدائش اور وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاریخ سے البتہ یہ ثابت ہے کہ اس نے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں اس کی ولادت ہوئی اور ۱۶۵۹ء میں وہ فوت ہوا۔ اس نے بادشاہ کی ایما پر 'قطب مشتری' ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء میں لکھی تھی:

تمام اس کیا سنسار بارا منے
سنہ یک ہزار ہور اٹھارا منے (۱۰۱۸ھ)

اس میں بادشاہ کے عشق کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ابراہیم قطب شاہ کی مدح اور قلی قطب شاہ کی ولادت کا ذکر بھی موجود ہے۔ وجہی ان دو کتابوں کی وجہ سے دکنی ادب میں نہایت بلند

مقام پر پہنچا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے اس کے دینی مسلک کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ محققین نے ان کتابوں میں درج منقبتی متون سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اہلِ تشیع میں سے تھا۔ سب رس کی ابتداء میں لکھا ہے:

'اول خدا ہے، نبی دوم، سوم ہے ولی (علی)'

محمد کوں جس رات ہوئی معراج
وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج

سب رس کے ان مصرعوں کا عنوان ہے:

'درنعت محمد مصطفیٰ و چہار یار و منقبت علی مرتضیٰ'

محققین کا کہنا ہے کہ عنوان میں جب چہار یار آ گئے، تو پھر علاحدہ سے منقبتِ علی مرتضیٰ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ 'چہار یار' کی عبارت الحاقی ہے۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ مذکورہ عنوان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

'حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ بارہ برس کی عمر میں ۱۶۲۶ء میں تخت پر بیٹھا تھا۔ عبداللہ کی والدہ حیات بخشی بیگم دختر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت تھی۔ بقول پروفیسر ہارون خاں شیروانی حیات بخشی بیگم بہ نفس نفیس اورنگ زیب عالم گیر کے فوجی کیمپ میں گئی اور صلح کے لیے شرائط نامے پر دستخط کئے تھے۔ اس میں پہلی شرط یہ تھی کہ شاہی خطبہ سے شیعیت کی رنگ آمیزی ختم کی جائے اور سنی عقائد کے مطابق خطبہ کو ڈھالا جائے۔ وجہی ان حالات کی نزاکت سے واقف تھا۔ اس لیے منقبت میں 'چہار یار' کا ذکر کیا ہے''۔

(بحوالہ، تاریخ ادب اردو جلد سوم، ڈاکٹر سیّدہ جعفر، دہلی ۲۰۱۱ء، ص: ۳۴۴)

'سب رس' کے متن میں حضرت علیؓ کے اکثر اقوال کا برملا استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے سب رس کے متن میں وہ حضرت علی کا یہ قول نقل کرتے ہیں: 'سکر الحکومۃ افضل من سکر الخمر' یعنی حکومت کا نشہ شراب کے نشہ سے افضل ہے۔ کیونکہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ کے تحت سلطانِ وقت کی اطاعت واجب سمجھی جاتی ہے۔ وجہیؔ کہتا ہے: 'مست ہتی بادشاہ ہور باگ یو تینوں بھی ایک جنس کی آگ۔ اس آگ میں پڑے سوں تھوڑے کوئی سلامت بھار آئے۔' اس کے باوجود ملوکیت کے دور میں بادشاہ کو ظل اللہ تصور کیا جاتا ہے۔ بہرحال! سب رس میں باوجود نثری تصنیف ہونے کے وجہیؔ نے اس میں منقبت کے عناصر داخل کر لیے ہیں۔ اس کی دوسری تصنیف 'قطب مشتری' ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے، جس میں بادشاہِ وقت کے عشق کی داستان نظم ہوئی ہے۔ مثنوی کے

اجزائے ترکیبی کے مطابق اس میں حمد ونعت کے بعد منقبت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے:

محمد کی جاگا کنے پائے نا تج اچھتے کسی ہور کوں آئے نا
خلافت سے اونچا ترا ٹھار تھا خلافت تجے بیسنا عار تھا
بڑا تونچ آخر بڑا توں اصل توں ظاہر میں آخر ہے باطن اول
ترا مرتبا اونچ تے اونچ ہے اول توں ہے آخر کوں بی تونچ ہے
علی کا محب نیں جکوئی سچ تو جان حرامی پنے کا وہی ہے نشان

حضرت علیؓ سے عقیدت میں شدت شاعر کو دشمنانِ علیؓ پر سب وشتم کے لیے اکسارہی ہے۔علی سے محبت میں اس طرح کا غلو علی کا اندھا پرستار ہی کر سکتا ہے۔ایک جگہ وجہی 'قطب مشتری' میں حضرت علی کی مدحت میں ایک تاریخی واقعہ نظم کرتے ہیں:

توں جگ کا پیارا توں جگ کا ادھار خدا کا توں ہمدم نبی کا توں یار
اتھے یار سب یار بند بھوت کر بھروسا نبی کا اتھا تج اوپر
بڑا یار یاراں منے یار توں کہ پایا محمد کیرے ٹھار توں

(ملا وجہی [مرتبہ ڈاکٹر زور مرحوم] 'قطب مشتری' حیدرآباد ۱۹۴۰ء، ص:۱۱)

ان اشعار میں شاعر کا اشارہ اس واقعے کی طرف ہے کہ:

''حکمِ فرضیت حج (۰۹ھ) کے سال آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی امارت میں تین سو رفقائے کرام حج کے لیے مکہ روانہ کیے۔ساتھ ہی حضرت علیؓ کو ایک دوسری ذمہ داری سونپی کہ وہ سورہ برأت کی پہلی چالیس آیات اس اجتماع میں سنائیں اور حکم خداوندی کے مطابق ضروری اعلانات لوگوں تک پہنچائیں۔''

(نعیم صدیقی 'محسن انسانیت' طبع دوم ۱۹۵۶ء، ص:۶۷۴)

حضرت علیؓ کی اس ماموریت کو اہلِ تشیع کے یہاں بڑی اہمیت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ وقعہ اسلامی تاریخ میں بڑا اہم ہو کر رہ گیا ہے۔اب رہی تیسری کتاب 'قطب مشتری' تو ادبی اعتبار سے وہ اپنا ایک مقام رکھتی ہے، لیکن اس کی تقدیسی شاعری میں بالخصوص منقبت میں شعری حسن کی کمی اور لہجے کا سپاٹ پن زیادہ نظر آتا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ

عبداللہ قطب شاہ ۱۰۲۳ھ/ ۱۶۱۲ء میں حیات بخشی بیگم کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔یہ سلطان محمد قطب شاہ کا چہیتا فرزند تھا۔دکن کی وسیع سلطنت کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے اس کی ولادت پر بڑی

خوشیاں منائی گئیں۔ دربار میں تہنیتی قصائد گائے گئے۔ نجومیوں نے اس کے زائچہ تیار کیے اور اس بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ ولادت وعقیقے کی رسومات ختم ہونے کے بعد شہزادے کی پرورش اور تربیت کے خاص انتظامات کیے گئے۔ زائچہ تیار کرنے والے نجومیوں نے کہہ دیا تھا کہ بادشاہ کو ۱۲ برس تک شہزادے کی صورت دیکھنی نہیں چاہیے۔ اس لیے شہزادے کو ایک بزرگ امیر قطب الدین نعمت اللہ کے سپرد کر دیا گیا۔ جب بزرگ کا انتقال ہو گیا، تو شہزادے کی پرورش کی ذمہ داری مرحوم نعمت اللہ کے داماد مرزا شریف شہرستانی کے سپرد کی گئی۔ مرزا کے فوت ہو جانے کے بعد جب شہزادے کی عمر آٹھ برس کی ہو گئی، تو اسے ایک عالی شان محل تعمیر کروا کر اس میں رکھا گیا اور اس کی پرورش اور تعلیم کے لیے خواجہ مظفر علی منشی اور مولانا حسین شیرازی کو مامور کیا گیا۔ انھوں نے بڑی توجہ سے شہزادے کی تربیت کی۔ عربی، فارسی کی کتابیں پڑھائیں اور علومِ متداولہ سمجھایا۔ مولانا کے انتقال کے بعد سلطان محمد قطب شاہ نے شہزادے کو اپنے پاس بلا لیا۔ بارہ سال کے بعد باپ بیٹے کی ملاقات ہو رہی تھی، اس لیے اس ملاقات کو تقریب کی شکل دے دی گئی۔ دربار منعقد کیا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے انعام ووظائف دیئے گئے۔ اس اثنا میں سلطان محمد قلی قطب شاہ اچانک بیمار ہوا اور دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ بعد میں شہزادہ عبداللہ قطب شاہ کو تختِ سلطنت پر بٹھا دیا گیا اور انتظامِ سلطنت کے لیے بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم اور دادی خانم آغا کی نگرانی میں ایک مجلس تولیت تشکیل دی گئی۔ بادشاہ چونکہ کمسن تھا، اس لیے سیاسی انتظامات سے بے پروا ہو کر وہ سیر وتفریح میں مشغول رہا۔ ایسے حالات میں انتظامات میں کمزوری آجانے کی وجہ سے سیاست کا نظام درہم برہم ہونے کی نوبت آ گئی تو مغل بادشاہ شاہ جہاں نے فوجی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب کو دکن پر فوج کشی کرنے کے لیے بھیجا گیا تو عبداللہ قطب شاہ نے مغل بادشاہ کی تمام شرائط مان لیں۔ اس توہین آمیز سلوک سے بادشاہ بددل ہو گیا اور گوشہ نشینی کی حالت میں ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء میں فوت ہو گیا۔ عبداللہ قطب شاہ اگرچہ سیاسی امور میں نہایت کمزور ثابت ہوا تھا، لیکن اس نے اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی ادبی اور تہذیبی روایات کی مکمل طور پر پاسداری کی تھی۔ وہ خود اچھا شاعر تھا اور اپنے دربار میں شعرا کا جمگھٹا لگائے رکھتا تھا۔ غواصیؔ، ابن نشاطیؔ، سیّد میراں حسینی، ملا قطبیؔ، جنیدیؔ اور طبعیؔ جیسے سربرآوردہ شعرا عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں شاعری کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کا دیوان اگرچہ مکمل صورت میں ناپید ہے، مگر جو کلام محفوظ رہ گیا، اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا کی طرح مذہبی تقریبات کو ثقافتی رنگ دے کر دھوم دھام سے منایا کرتا تھا۔ اس کے دیوان میں حمد ونعت و منقبت غزل کی ہیئت میں لکھی ہوئی ملتی ہیں، جیسے:

علی شیرِ حق شاہِ دلدل سوارا گھندل کفر کے دَل بھجن کرن ہارا
چھٹے تھر تھری باوٗ اگن خاک جل کوں کھڑا ہووے جب ہات لے ذولفقارا
کیا فرش اپس چاند پاواں تل اس کے لیا عرش کھاندے پر اس کا پھرارا
فِدا نانو پر اس کے تل تل کوں ہووے خدا کا جو عالم ہے ہژدہ ہزارا

اس منقبت میں دلدل اور ذولفقار حضرت علی سے منسوب بالترتیب گھوڑا اور تلوار کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ اس منقبت میں عقیدت میں غلو کو روا رکھا گیا ہے۔ معنی آفرینی کی بہ نسبت مضمون آفرینی کا منقبت میں زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ ایک اور منقبت میں مدحت علیؓ یوں بیان ہوئی ہے:

علیؓ جو ہے دونوں جہاں کا امیرا ہمن کون نئں اس بن دوجا دستگیرا
مشرف ہو اس کی عنایت نظر سوں شرف جگ میں پایا ہے خُمِ غدیرا
سدا اس کے دربار کا سیوکی ہو کیا حلقہ در گوش بدرِ منیرا
غبار اس کے نعلین کا جھڑ پڑیا سو سُرگ اپسریاں کے ہے تن کا عبیرا

(عبداللہ قطب شاہ[مرتبہ سیّد محمد ایم۔اے] 'دیوان عبداللہ قطب شاہ، سلسلہ یوسفیہ، شمارہ۹، ص:۹۱اور ۵۶)

اس منقبت کے دوسرے شعر میں 'غدیرِ خم' کا ذکر ہوا ہے۔ دیوان کی ۹۴ ویں غزلیہ منقبت میں بھی 'عید غدیر' پر خوشیاں منانے کی بات کہی گئی ہے۔ دراصل غدیر خم کے واقعہ کو اہل تشیع بطور عید مناتے ہیں۔ دکن کے بادشاہوں کے یہاں اس عید کو منانے کے تاریخی ثبوت مل جاتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے یہاں تو حکومت کی جانب سے 'یومِ غدیر' تہوار کے طور پر منایا جاتا تھا۔ خیر! عبداللہ قطب شاہ نے اپنی ایک غزل میں اپنی مختلف قسم کی امیدوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں تیسری امید عشق علیؓ کے متعلق ہے اور چودھویں امید میں چودہ معصومین کے تئیں مہر و محبت میں اضافہ کے لیے ایک قسم کی درخواست ہے۔ اسی قسم کی ایک غزل میں عبداللہ قطب شاہ کہتا ہے:

اے مومناں! خوشیاں کے چشمیاں کوں نیر آیا یعنی جہاں میں سر تھے عیدِ غدیر آیا
ہے عید یو شرف کا شاہنشہ نجف کا سارے ولیاں کی صف کا وے ہو امیر آیا
فرمان تھے ربی کے رتباں سو صاحبی کے امت کوں سب نبیؐ کے ہو دستگیر آیا
حضرت رسولؐ صاحب کا سو وہی ہے نائب تو مظہر العجائب ہو بے نظیر آیا
جم اس کی آل تھے یوں روشن جہاں اچھے تیوں ہر یک امام سو جیوں بدرِ منیر آیا

(ایضاً: ص ۵۶)

اہلِ تشیع یوم غدیر کو عید کے تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔ شہنشاہ نجف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی

یاد میں ظاہر ہے آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی آتے ہوں گے۔ خوشی اور غم کی اس ملی جلی نفسیاتی کیفیت کو شاعر نے نہایت خوب صورت انداز میں اشعار میں ڈھالا ہے۔ حضرت علی کی کنیت ابوتراب اور مظہر العجائب والغرائب بھی ہے، شاعر نے دوسری کنیت کا استعمال منقبت کے شعر میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر اگر عبداللہ قطب شاہ کی منقبتوں کا جائزہ لیا جائے تو حضرت علیؓ کے تئیں اس کی عقیدت نمایاں نظر آتی ہے۔

شیخ حسین بہاء الدین غواصیؔ

غواصیؔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا، ابراہیم عادل شاہ کے دورِ حکومت میں پیدا ہوا۔ ابو محمد اس کی کنیت تھی۔ وجہیؔ نے (جسے انا پرست شاعر کہا جاتا ہے) جب اپنے زعم میں بادشاہ کے حکم سے 'قطب مشتری' لکھی تھی، اس وقت گولکنڈہ میں غواصیؔ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وجہی کو غواصیؔ کی ذات میں اپنا حریف نظر آرہا ہوگا۔ اسی لیے اپنی انا پسندی کے زعم میں وجہیؔ کہنے لگا:

اگر غوطے لک برس غواص کھائے
تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے

تو جواب میں غواصیؔ نے بھی اپنا منہ کھولا:

بچن کے سمندر کا ہوں غواص میں / دھرنہار ہوں موتیاں خاص میں
جگت جوہری سب میرے پاس آئے / میرے خاص موتیاں کوں جیو کر لجائے
جتے ہیں جو طوطی ہندوستان کے / بھکاری ہیں منج شکر ستان کے

دکن میں بہمنی حکومت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد یہ سلکِ گوہر چار حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا، اور قطب شاہی، عادل شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی جیسی آزاد حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ان میں قطب شاہوں اور عادل شاہوں کے عروج کا زمانہ کافی طویل رہا۔ سلطنت کا نظام پر امن طریقے سے انجام دیا جا رہا تھا۔ دونوں سلاطین میں خوش گوار تعلقات تھے۔ ثقافتی امور میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ البتہ درباری شعرا میں انا پرستی کے سبب 'ناک کا مسئلہ' درپیش رہتا۔ ہر شاعر چاہتا کہ اسی کی ناک اونچی رہے۔ غواصیؔ اور وجہیؔ (بیجاپور و گولکنڈہ) کے معاملے میں بھی یہی امر کارفرما رہا تھا۔ ایک شاعر نے جہاں قطب مشتری اور سب رس کیا لکھی، دوسرے نے اس سے بڑھ کر مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ لکھ کر اپنے حریف کو مات دینے کی کوشش کی۔ لیکن رنجش کا فائدہ یہ ہوا کہ ان دونوں سلطنتوں کے زمانے میں نہایت عمدہ ادب سامنے آیا جس کی قدر دانی آج تک ہو رہی ہے۔ لیکن انا پرستی کی وجہ سے پیدا ہوئی یہ رنجش حالات کے دیگر گوں ہو جانے پر ختم بھی ہوتی گئی۔ چنانچہ خود غواصیؔ اپنے اور جہیؔ کے متعلق بادشاہ سے فریاد کناں دکھائی دیتا ہے:

اس دکن کے شاعراں میں تج شہنشاہ کے نزیک ہے
غواصیؔ اور وجہیؔ شاعرِ حاضر جواب
عارفاں ہیں تو کتے ہیں یوں کہ آج اس دور میں
'شیر' ہیں یوں شعر کے فن میں بحق بو تراب
اس ضعیفی ہور پیری وقت پر اے دستگیر
مہر باں ہو کچ سخن دانوں کی جمعیت کے باب

یہ قصیدہ غواصیؔ نے محمد قطب شاہ کے دربار میں پیش کیا تھا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ غواصیؔ نے حسنِ طلب کے موقع پر بھی حضرت علیؓ کی مدح کا خاطر خواہ خیال رکھا، چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تفویض کردہ لقب 'بوتراب' کا استعمال شاعر نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ سیرتِ علیؓ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک بار حضرت علی اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان ناراضگی پیدا ہوگئی، تو حضرت علیؓ غصہ کی حالت میں مسجد نبوی میں چلے گئے اور کھلی زمین پر لیٹ گئے، جس کی وجہ سے آپؓ کے جسمِ اطہر پر مٹّی لگ گئی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کا علم ہوا تو حضرت علی کو منانے کے لیے آپؐ مسجد تشریف لائے اور حضرت علیؓ کے جسم پر مٹی دیکھ کر اسے جھاڑتے ہوئے آپ کو 'بوتراب' کہہ کر مخاطب کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دیا ہوا یہ لقب حضرت علی کو ایسا پسند آیا کہ آپؓ نے اسے اپنے نام کا جزو بنا لیا۔ غواصیؔ نے اپنی مثنوی 'طوطی نامہ' کے غیر منقبتی حصے میں اپنے مرشد کو بھی یاد کیا ہے:

اُچا دم بسم اللہ کے نام سوں — متا رہ سدا عشق کے جام سوں
جو ہے رہنما پیر حیدر تیرا — ہم اللہ وہی ہم پیمبر تیرا
کُچ خواست ترا ہے سب اس پو چھوڑ — دنیا ے علاقے سے لے دل کوں توڑ

غواصیؔ نے تیسرے مصرع میں اپنے پیر و مرشد کے لیے غلوے عقیدت میں شرک کا ارتکاب کر لیا ہے، استغفر اللہ! اللہ محفوظ رکھے۔ غواصیؔ کے پیر سیّد شاہ حیدر ولی اللہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۳۳ھ میں ہوا۔ ان کی کشف و کرامات 'خوارقِ حیدری' میں درج ہیں۔ عبدالجبار ملکا پوری نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شرع کے پابند تھے۔ سلاطینِ قطب شاہیہ آپ کے معتقد تھے۔ ایک لاکھ دہن سالانہ کی جاگیر بادشاہ کی جانب سے تفویض ہوئی تھی۔ حیدر ثانی کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ آپ کے مرید شاہ ابوالحسن خاموشؔ ان مرغ کے نگراں تھے، مگر اس کام سے دل برداشتہ رہتے تھے۔ اس کی خبر حاسدوں نے پیر صاحب تک پہنچادی تو آپ نے مرغ بازی ترک کردی۔ شاہ ابوالحسن خاموشؔ اس اعتبار سے غواصیؔ کے پیر بھائی ہوئے۔ غواصیؔ کی کلیات میں حضرت علیؓ کی مدح میں شعیت غالب نظر آتی ہے۔ مثلاً:

یہی حبیبِ خدا کا رسول ہے برحق یہی طبیب یہی ہے شفیعِ روز حساب
جو دو جہاں میں ہے داماد بے بدل اس کا علی ولی اسد اللہ حیدر کرار
صاحبِ معراج کے من کے مندھر کا چراغ یعنی علی ولی حیدر دلدل سوار
(غواصی: کلیات غواصی حیدرآباد ص: ۴۴، ۴۹ اور ۱۷۷)

غواصیؔ اپنی مثنویات میں بھی خلفائے راشدین، اہل بیت اطہار اور اپنے مرشد کی مدح کرتے ہوئے ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور ہر ایک کی صفتِ جمیلہ اور وصفِ حمیدہ بیان کرتے ہیں۔ 'مینا ستونتی' میں شاعر کہتا ہے:

امام ہے ابو بکر ایمان کے خلیفے نبی بعد انسان کے
عمر کے عدل کا رہیا ہے نشاں خجل جس اگے عدلِ نو شیرواں
منور مکمل تھی عثمان ذات حیا کے اتھے گوہراں جس کے ہات
سو شیراں میں ہے شیر حضرت علیؓ انو کی شجاعت کی ہے کھل بلی
شہیدوں میں سرور حسین و حسن حسن بعد ازاں میر میراں رتن
محی الدین معشوق جس کا ہے ناؤں ولیاں جس قدم کا لیے سر کو چھاؤں
(غواصیؔ: میناستونتی (مخطوطہ) ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ورق ۱۲۱ الف)

اپنی دوسری تصنف 'سیف الملوک و بدیع الجمال' میں غواصیؔ کی 'مدح حضرت علیؓ' ان کی قادری الکلامی اور استادیِ فن پر دلالت کرتی ہے۔ شاعر کے کلام کی معنی آفرینی، بلاغت، شگفتگی، محبت و وارفتگی اور جذبۂ شوق کی فراوانی ان کے ریاض فن اور عقیدت کی پختگی کی بین مثال پیش کرتی ہیں:

تہیں ساتو جگ کا ولی یا علی ولیاں تیرے جگ کے قلی یا علی
جو کوی غوث اور قطب اقطاب ہے جکوئی جلالت میں اصحاب ہے
رہیں خاک ہوخم تیرے پاؤں تل کریں زندگانی تیرے چھاؤں تل
ولایت کے اسمان کے بھار جیوں تیرا کھرگ نکلیا سورج سار جیوں
چندر تارے دہشت سوں چھپ گئے تمام سحر فکر کرنے تے سب رہے تمام
(غواصیؔ: سیف الملوک و بدیع الجمال [قلمی] ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، ورق ۳ب۔۴ الف)

شاعر نے اپنی تصانیف میں ان اکابرین کے علاوہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز، پیر حیدر اور حضرت غوث اعظم کی بھی تعریف وتوصیف کی ہے جو سچی محبت اور حسنِ عقیدت کی غماز ہے۔ غواصیؔ کے عہد ہی میں مقیمیؔ، قطب رازی، قطبیؔ، محمد بن احمد عاجزؔ، ابن نشاطیؔ ملک خوشنودؔ، جنیدیؔ وغیرہ نے بھی گلشن

منقبت کی آبیاری کی ہے۔ عاجزؔ چاروں خلفا کے علاوہ بارہ اماموں کی بھی مدح کرتا ہے:

ابا بکر ایمان کا ہے امام عدل داد میں ہے عمر نیک نام
تھے عثمان حق خوی میں با حیا علی نے ختم جا نشینی کیا
انو بعد برحق ہیں بارہ امام ہے پیری مریدی انو تے تمام

(عاجزؔ: ''لیلیٰ مجنوں''، ص:۵۲)

شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطیؔ

تاریخ کی کتابوں میں ابن نشاطیؔ کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ اس کی تاریخ پیدائش قیاساً ۱۰۴۰ھ تا ۱۰۴۵ھ مان لی گئی ہے کیونکہ اپنی تصنیف 'پھول بن' (۱۰۶۷ھ) میں وہ خود کو جوان کہتا ہے:

مطلل کر تو میری زندگانی تو برخوردار کر میری جوانی
یو پھیلیں تین مہینے لگ لگایا پنم کا چاند ہو پورا تو آیا

ابن نشاطیؔ کی رحلت کی تاریخ سے بھی محققین بے خبر ہیں۔ کسی دکنی تذکرے میں اس کی موت کا ذکر نہیں ہے۔ نشاطی کے نام کے آگے 'شیخ المشائخ' کا لکھا ہونا اس کے روحانی مرتبے کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن کسی روحانی بزرگ سے اپنی وابستگی کا اس نے ذکر نہیں کیا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے بھی اس کے تعلقات نہیں تھے۔ البتہ 'پھول بن' میں اس نے دربار سے تعلقات قائم ہو جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کی تخلیقات کو شاہی پذیرائی حاصل ہو جائے۔ مثنوی 'پھول بن' ابنِ نشاطی کی مختصر سہی، لیکن دکنی ادب کا شاہکار ہے۔ اس میں شاعر نے چھیاسٹھ جگہوں پر انتالیس صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ اس سے اس کی قادر الکلامی اور فنِ شاعری پر اس کی دست رس کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثنوی 'پھول بن' میں شاعر کے کہنے کے مطابق ۱۷۴۴ اشعار ہیں، لیکن بعض نسخوں میں اشعار کی تعداد کچھ زیادہ ہے، جنھیں الحاقی کلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ دیوی سنگھ چوہان کے نزدیک مدحِ صحابہ کے اشعار الحاقی ہیں۔ اس قیاس سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابن نشاطی سنی المسلک تھا۔ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ چونکہ بادشاہ اہل تشیع میں تھا، اس لیے اسے خوش کرنے کے لیے شاعر نے حضرت علی کی منقبت علاحدہ سے لکھ کر اپنی مثنوی میں شامل کر دی تھی۔ بہر حال! ابن نشاطیؔ نے خلفائے راشدین، اہل بیت اور شہدائے کربلا سبھی کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار 'پھول بن' میں کیا ہے۔ نعت سیّدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری حصے میں وہ خلفائے راشدین پر سلام پیش کرتے ہیں:

اول صدیق ابابکرؓ ہے اصحاب کہ جس کوں صدق سوں ہے دین میں لاب
سٹیا جس دین میں صدق کا پایا سبب اسلام کا جن صاف لایا
سو وو ہو کر اتھا سو یار ہور غار وو چاروں یاروں میں کا یار کبّار
عمرؓ عادل عدالت کا سو سردار عدالت عدل کوں ساجے وو سردار
اول داماد با اخلاص عثمانؓ کہ جس تے ہے جمع سالیم قرآن

ان خلفائے ثلاثہ کے بعد ابن نشاطی نے امیر المومنین حضرت علیؓ کی منقبت کے لیے علاحدہ باب باندھا ہے۔ 'منقبت حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ' کا عنوان دے کر شاعر نے حضرت علیؓ کی ثنا و توصیف کچھ اس طرح کی ہے:

زباں کوں میں ادب سوں اپنی کھولوں نبی ؐ کے جانشیں کا مد ح بو لوں
ولیاں جگ کے ستارے ہیں علی بھان ولایت کی ولایت کا ہے سلطان
ترے آگے دلیراں جگ کے رد ہیں شجاعت کی گوئی کے تم اسد ہیں
تری خنجر جو ہے وو جھل جھلاتی سو اس کا میان ہے دشمن کی چھاتی

(ابن نشاطی، 'پھول بن' قومی کونسل دہلی ۲۰۰۸ء، ص: ۸۴)

ابن نشاطی کی اس منقبت میں شاعر کی صناعی کی جھلکیوں سے بھی آپ لطف اندوز ہو سکتے ہیں:

گگن پر کہکشاں کا ہے جو وو ہار نہیں ووہار، ہے تجہ ہات کا وو وار
قلابا جو اگر اچھتا زمیں کوں پھرا کر اس کوں پل میں مارتا توں
جو سرمہ گرد تجہ نعلین کا ہے شفا وو عین میری عین کا ہے

(ایضاً ص: ۸۵)

ابن نشاطی کی خواہش ہے کہ وہ کربلا کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے:

دکن تے کربلا کوں جس گھڑی جاؤں چلوں خامے کے نمنے، سر کوں کر پاؤں
اول انجھواں سوں واں پانی چھنک خوب کروں گا بعد ازاں پلکھاں سوں جاروب
کروں قندیل واں میں من کوں اپنے بچھاؤں فرش کر، واں تن کوں اپنے
پھر اس مرقد اپرتے اپسیں واروں دُک اپنا دل کے لھو سوں واں نگاروں
فرات اپنے دو نیناں کر دکھاؤں لہو رو، کربلا تن کر دکھاؤں

(ایضاً ص: ۸۷)

ان اشعار میں شاعر نے حضراتِ شہدائے کربلا کی قبروں کی زیارت کا تصور نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ابن نشاطی مسلکی اعتبار سے اہلِ تشیع سے قریب تھا، لیکن سنی العقیدے سے بھی یگانگت کا جذبہ رکھتا تھا۔

کمال الدین خاں رستمیؔ

رستمیؔ، سلطان محمد عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس کے والد اسماعیل خاں سات پشتوں سے عادل شاہی دربار میں خطاطی کا کام کرتے رہے ہیں۔ اس لیے انھیں 'خطاط خاں' کا خطاب دیا گیا تھا۔ رستمیؔ کو محمد عادل شاہ نے اسی خطاب سے نوازا تھا۔ بلوم ہارٹ اور ڈاکٹر زور نے اسماعیل خاں کا نام خطاط خاں بتایا ہے۔ مثنوی کی اندرونی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ رستمیؔ عوام الناس میں کمال خاں دبیر کے نام سے مشہور تھا:

خلق کہتی ہے مجھ کمال خاں دبیر
تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

رستمیؔ فارسی زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ محمد عادل شاہ کی اہلیہ ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو نہایت ستھرا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ انھوں نے اعلان کروا دیا کہ جو کوئی ابنِ حسام کے فارسی 'خاورنامہ' کا منظوم ترجمہ پیش کرے گا، اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا جائے گا۔ رستمیؔ نے ملکہ کی مرضی کے مطابق فارسی خاورنامہ کا اردو میں منظوم ترجمہ ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء میں کیا اور ملکہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ منظوم ترجمہ دکنی مثنویوں میں سب سے طویل تر ہے۔ خاورنامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے اور اس میں حضرت علیؓ کی جنگوں، محاربوں ارضی و بحری عفاریت سے مقابلوں کا ذکر ہے۔ یہ اگرچہ آپؓ کے جنگی کارناموں کے احوال ہیں، پھر بھی اس میں ایک قسم کی سیرتِ علی قلم بند ہوئی ہے۔ اس لیے اسے منقبت کے زمرے میں رکھا جا سکنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں تسلسل کہیں مجروح نہیں ہوتا۔ قصہ مربوط و مسلسل آگے بڑھتا ہے اور واقعات کا ربط برابر قائم رہتا ہے۔ خاورنامہ چونکہ ابنِ حسام کے فارسی کلام کا ترجمہ ہے، اس لیے شاعر نے اس کا ہو بہو ترجمہ کیا ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ اس میں ملکہ کے لیے مدحیہ اشعار نہیں ملتے۔ حمد کے بعد نعت کے اشعار ہیں پھر 'فی المناجات' کے تحت لکھے گئے دعائیہ اشعار میں شاعر نے محمدؐ اور آلِ محمد سے توسل رکھے جانے کا اعتراف کیا ہے، جس میں عقیدت کی غمازی ہوئی ہے:

اپس کرتے کر بھار سگلا فضول　　خدا کی کتاب بس ہور آل رسولؐ
جو منگنا گنہ تھے اچھے پاک توں　　بخش سب گنہ تو گنہگار کوں

نکو ہات تھے چھوڑ راہ صفا   پکڑ جیو سوں تو دامن مصطفیٰ
محمد پر صلوٰۃ کر توں مدام   درود بھیج اس آل پر صبح شام

(بحوالہ: گیان چند جین، تاریخ ادب اردو جلد دوم ص: ۵۱۲)

حضرت علیؓ کی طہماسپ سے جنگ کا یہ منظر ملاحظہ ہو:

عجب کیتے حیدرِ نامدار   اُچائے اپنے سر اوپر ذالفقار
مارے سر اُپر تیغ آہن گزار   سہر سر اُپر اس ہوا جوں غبار
جوں اس شیر کی تیغ کاٹی سپر   چرایاں بھی طہماس بد خواہ سر
گھوڑے کی عنین کوں پھرایا او تیز   چلیا تازی کوں لے کر راہ گریز

(ایضاً ص: ۵۱۴)

رستمی کی اس مثنوی خاور نامہ میں دریائی سفر کے حالات بھی بیان ہوئے ہیں، جن میں بحری سفر کی دشواریوں کا ذکر ہے۔ بہر حال! یہ طویل مثنوی چونکہ ترجمہ ہے، اس لیے دکنی ادب میں اس کی پذیرائی حتی المقدور نہیں ہوئی۔

صنعتی

'تاریخِ ادب اردو' جلد دوم میں سیّدہ جعفر نے 'گلدستہ' کے حوالے سے صنعتی اور اس کے والد کے نام کی وضاحت ان اشعار سے کی ہے:

بھی اس دہر تج دھریا عین ہے   مسمیٰ حسن شاہ محی الدین ہے
خلف مرتضیٰ قادری نامور   اے نس نام عرفی شاہ حضرت کگر

میرے پاس بمبئی مطبع کی چھپی ہوئی کتاب موجود ہے، مگر اس میں یہ اشعار صنعتی کے مرشد حضرت میراں محی الدین کی شان میں کہے گئے ہیں۔ اپنے کسی مضمون میں میں نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں چنداں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ البتہ رستمی کی مثنوی 'خاور نامہ' کے بعد دکنی ادب میں صنعتی کی مثنویات بھلائی نہیں جاسکتیں۔

رستمی کے بعد صنعتی کی مثنوی 'قصہ بے نظیر' اور 'گلدستہ' یا 'قصہء فغفور چین' میں بھی منقبتی عناصر مل جاتے ہیں۔ صنعتی نے اپنی اول الذکر تصنیف میں صحابی رسولؐ حضرت تمیم الداریؓ کے بحری اسفار کا تذکرہ کرتے ہوئے دجال اور جساسہ سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ بیان کردہ اس واقعہ کی بعض باتیں احادیث سے ثابت ہوتی ہیں، البتہ شاعر نے کہیں کہیں اساطیر کا بھی سہارا لیا ہے۔ چونکہ اس مثنوی میں ایک صحابی کے حالات بیان ہوئے ہیں، اس لیے منقبت کی ذیل میں اسے ڈالا جا سکتا ہے۔

صنعتی کی مثنوی 'گلدستہ' میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے مطابق حمد و نعت کے بعد منقبت بھی شامل ہے۔شاعر نے خلفائے راشدین کی مدحت طرازی میں ان کے اوصاف عالیہ کو بیان کیا ہے۔

مقرب جو اصحاب تھے چار یار ۔۔۔ بچن سن ہر ایک او کئے جیو نثار
اول تھے ابو بکرؓ صادق سچے ۔۔۔ صداقت کا جن نام فایق اچھے
عمرؓ کا عدل سوں ہے اظہر نشاں ۔۔۔ کہ فرزند پر حد لیے خوں فشاں
کہ او یار تیسرے ہیں عثمانؓ دین ۔۔۔ کئے ہیں جمع جن کلامِ متین
چہارم ولی شاہ کا مل علیؓ ۔۔۔ ولایت کے شاہیں سدا ات بلی
شہیداں میں افضل حسین و حسن ۔۔۔ بدل دیں کیے کربلا کا وطن
اونن آل میں ہوکے یو نامدار ۔۔۔ کئے ہیں مذہب حنبلی استوار

صنعتی نے اصحاب کبار کے بعد اپنے مرشد میراں محی الدین کی بھی ثنا و توصیف عقیدت کے ساتھ کی ہے:

محبت کی دریا کا غواص ہو ۔۔۔ لے آیا تو باہر دُراں خاص کو
مکمل ولی صاحب ِ تخت و تاج ۔۔۔ کہ جس تل ستیں پائے ہیں یو رواج
ترے لطف کی چھاؤں میں برقرار ۔۔۔ حشر ہول میں دستگیر نامدار
پڑا ہوں تیرے در پہ ہو کر اسیر ۔۔۔ پکڑ ہت کھڑا کر مجھے دستگیر
لوّامہ تھیں کر پار تو مجھ کوں زود ۔۔۔ گذر محل سوں میں کروں جا سجود
میرے من کو پروردہ کرتوں تمام ۔۔۔ رہوں سیر چو طرف کا کر مقام

(صنعتی: 'گلدستہ/ قصہ ٔفغفور چین'، مطبع نامی کریمی بمبئی ۱۳۴۹ھ، ص:۷۔۶)

مرشد کے تئیں شاعر کا یہ استمداد یہ طرز فکر رب العالمین پر ایمان رکھنے والوں کو شاق گزر سکتا ہے۔

شیخ غلام محمد داولؔ

گیارھویں صدی ہجری میں دکن کی صوفیانہ شاعری کو بڑا عروج حاصل ہوا تھا۔مختلف خانوادے خانقاہی نظام کے تحت روحانیت کی تعلیم کو عام کرتے ہوئے اپنے مریدین کی اصلاح و تربیت کی کوشش کرتے رہے۔اس زمانے میں مرحومین کی مدح سرائی کے ساتھ ہی مرشدین ذی حیات کی بھی منقبتیں لکھی جانے لگی تھیں۔ چنانچہ سیّد محمد اکبر حسینی، میرانجی شمس العشاق، برہان الدین جانم، شہباز حسینی، صنعتی، قادر لنگا، شیخ محمد داول، محمد حسینی معظم وغیرہ پیراں و مریدین کا مربوط سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔شمالی ہند میں بھی صوفیائے کرام شعرا کے ایسے سلسلے ملتے ہیں۔ شیخ غلام محمد داولؔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

شیخ داولؔ شاہ برہان الدین جانمؔ کے مرید اور خلیفہ تھے، اور سالک کی تربیت کے لیے انھیں کی تخلیقات سے استفادہ کرتے تھے۔ مرشد کے کلام کی جھلکیاں داولؔ کے کلام میں بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ کتابت ان کا پیشہ تھا اور یہ اچھے کاتب تھے۔ ہند و پاک کے مختلف کتب خانوں میں داولؔ کی خطاطی کے نمونے مل جاتے ہیں۔ داولؔ بیجاپور میں اندرون حصار دروازہ شاہ پور بازار کی مسجد کے قریب رہتے تھے۔ ان کی اہلیہ شیخ ملک کی صاحب زادی تھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق داولؔ کا انتقال ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء میں ہوا تھا۔ شیخ محمد داولؔ کی چار کتابیں ہم دست ہوئی ہیں۔ کشف الانوار، چہار شہادت، کشف الوجود اور ناری نامہ۔ اس کے علاوہ بہت سارے 'خیال' ان سے منسوب ہیں، جو غزل کی ہئیت میں لکھے جاتے ہیں۔ شاہ داولؔ نے اپنی ہر تصنیف میں اپنے پیر و مرشد کو یاد کیا ہے۔ 'کشف الانوار' میں وہ کہتے ہیں:

حق کا واصل کامل ذات ہر حل ہارا حق کے سات
سانچا حضرت شاہ برہاں شہرت ہو کر کہتا واں
کہتے طالب کیا نہال کامل مرشد گیان کمال

'چہار شہادت' یہ نہایت مختصر مثنوی ہے۔ اس میں صوفیانہ اصطلاح یعنی چار شہادتوں (شہادت مبداء، شہادت عمداء، شہادت وجداء اور شہادت شہداء) کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں بھی داولؔ اپنے پیر کی بڑائی کرتے نظر آتے ہیں:

حق سوں بولوں چار شہادت سانچے کر کے گیان چانچا گرو مرشد میرا حضرت شاہ برہان
جن یو نکتہ کھول بتایا سیّدے مارگ اربا ابرہا کی رے آگ بجھا مجہ مینہ کا پریم چکا یا

(بحوالہ: تاریخ ادب اردو جلد سوم ص: ۱۲ اور ۱۵)

مذکورہ مثالیں بتا رہی ہیں کہ داولؔ اپنے شیخ سے انتہائی خلوص و عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ اپنے ذی حیات مرشدانِ کامل کی مدح کرنے والوں میں جانمؔ بھی ہیں۔ شاہ برہان الدین جانمؔ، میرانجی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ جب وہ پندرہ برس کے ہوئے تو اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اپنے وقت کے صوفیائے کرام میں جانمؔ کا شمار ہوتا ہے۔ جانمؔ نے اپنے باپ کی تصنیف و تالیف کی روایت کو قائم رکھا اور انھیں تخلیقات کے ذریعہ اپنے مریدین کی اصلاح کی۔ نثر و نظم میں ان کی بعض کتابیں یہ ہیں: سکھ سہیل، کلمۃ الحقائق، کلمۃ الاسرار، ارشاد نامہ، مقصود ابتدائی، معرفت القلوب، رسالۂ تصوف وغیرہ۔

جانمؔ کی تاریخ پیدائش اور وفات کے متعلق صرف قیاساً کہا گیا ہے کہ وہ ۹۵۰ھ میں پیدا ہوئے

اور ۱۰۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا، اور بیجاپور ہی میں اپنے والد ماجد کے گنبد کے نیچے انھیں دفنایا گیا۔ صوفی عبدالجبار ملکاپوری نے جانمؔ کی خرقِ عادات، ان کی عاجزی اور فروتنی اور خاکساری وکسرِ نفسی کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام اوصافِ کریمانہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے داولؔ نے اپنی منقبتوں میں ان کا ذکر خلوص نیت کے ساتھ کیا ہے۔

اپنے مرشد کی تعظیم وتوقیر کے اظہار کے لیے اس طرح کی منقبتیں لکھنا اُس دور کے صوفی شعرا کا شعار بن گیا تھا۔ اس طرز کو نبھانے والے شعرا میں معظم کا بھی نام لیا جاسکتا ہے۔

محمد حسینی معظمؔ قادری

معظمؔ کا نام محمد حسینی قادری تھا۔ اپنی تصنیف 'شکارنامہ' میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اس کارنامے کی شرح فقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرمائے ہیں۔ اس واسطے کہ یو عاجز اس گھر حیثیت میں طالب ہوا، ہور امین الدین اعلیٰ کوں سجدہ کیا، اون کے تصدق سوں یو فقیر اس راز کو پونچا ہے''۔ 'گلزارِ چشت' میں اپنے نام کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے خود کو قادری اور اپنا لقب سلطانِ معظم بتایا ہے۔ وہ چشتیہ مسلک کے پیروکار تھے اور کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے بیجاپور میں امین الدین اعلیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ 'مفتاح الاسرار' میں وہ کہتے ہیں:

اب تو جا بیجا پور ہے پور وہاں شہ پور
وہاں امیں اعلیٰ ہے پیر ہے روشن دیکھ ضمیر
اب ہونا جا کر طالب گر عشق تجھے ہے غالب
میں کیتا امر قبول جو بولے نبی رسول

امین الدین اعلیٰ نے اس کے بعد اپنے خاص مرید سیّد عبدالقادر لنگا کے حوالے معظمؔ کو کر دیا۔

ہے پیر ترا تو قادر او حاضر ہے تو ناظر
اوس پیر ناہیں بسر تو اور اس کو دل میں دھر تو

معظم کی مثنوی 'آزاد نامہ' جسے قلندر نامہ یا گنجِ مخفی بھی کہا گیا ہے، سیّد عبدالقادر لنگا کی مدح میں ڈیڑھ سو اشعار کی نظم ہے۔ اس میں معظم نے اپنے پیر کے اندر پائے جانے والے قلندرانہ اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ گویا معظم نے اپنے مرشد سیّد عبدالقادر لنگا میں کامل فقیر کا پرتو دیکھا ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں معظمؔ کہتے ہیں کہ، ولی صفات شخصیتوں کا سردار میرا مرشد قادر ہے اور وہ انھیں اسرار ومعرفت کے جام پلانے والا ساقی ہے:

وہ قادر انوں کا تو ساقی کتے
پلاتا ہے مے بھر کے ساقی کتے

معظمؔ نے اپنی ریختی نما غزلوں میں اپنے مرشد کو 'پیا' کے روپ میں دیکھا ہے:

تمھیں عارف قدر داں میں کتے تمنا کوں قادر شاہ
کدھیں او سیج میں اپنے بلاوے تج کوں قادر شاہ
نویلا لال قادر شاہ سنگاتی سیج کا میری
تمہیں عارف قدر داں میں کتے تمنا کوں قادر شاہ
نویلا لال قادر شاہ میرے گھر آپ آیا کر
اتا زہرہ سوں بل مل کر منگل شہ پر پلاتی ہوں
نویلا لال قادر شاہ او دے گا داد سب میرا
اسی کا پیار بس جی کوں یہی احسان منگتی ہوں

عشق کی یہ کیفیت متصوفانہ شاعری میں عبد و معبود کے درمیان تعلق باللہ کا اظہار کرنے والی ہوتی ہے، مگر بعض جگہ اس نسبت کا اظہار عقیدت کے زعم میں مرید و مرشد کے درمیان پائی جانے والی محبت کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ گجری ادب میں اس کی وافر مثالیں مل جاتی ہیں۔ خیر! دکنیات کے ماہر جناب ابوالنصر خالدی نے معظمؔ کی مثنوی 'شجرۃ الاتقیا' سے ان کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

''معظمؔ نے گیسو دراز کے بارے میں لکھا ہے کہ (ان کے) پیش امام کمال الدین علم حصولی میں کامل تھے۔ جب بیعت کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا کسبی علم بھول کر، کفر و اسلام ترک کر کے اپنے آپ کو پیر میں ضم کرو۔ اس کو رسول مانو اور ذات سے نفی نبی کی کرلو تو بقا حاصل ہوگی۔ کمال الدین نے بے چوں و چرا یہ باتیں مان لیں مرید ہوئے اور بلند مرتبہ پایا۔ یہ معظمؔ کا بیان ہے، مگر تحریری نوشتوں اور زبانی روایتوں سے کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ گیسو دراز علیہ رحمہ نے تحصیلی علم بھلا کر کفر و اسلام کا فرق نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ ان پر الزام بلکہ اتہام ہے۔''

(ماخوذ از 'برہان' دہلی [معظمؔ کی مثنویاں: ابوالنصر محمد خالدی] دسمبر ۱۹۷۱ء ص: ۴۱۶)

ہمیں یہاں معظمؔ کی اس طرح کی تحریروں کو کفر و ایمان کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا ہے، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اولیا و اکابرین کی مدح و ثنا خوانی میں ان کے یہاں عقیدت میں غلو بہت زیادہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کی والہیت اور محبت کی وجہ سے رہا ہو، جو انھیں ان بزرگوں سے تھی۔ 'شجرۃ الاتقیا' کے منقبتی

حصے میں اصحاب کبارؓ کی مدح کے بعد محمد حسینی گیسو دراز اور ان کے خلفاء خواجہ جمال الدین اور کمال الدین مغربی کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ حضرت گیسو دراز کی مدح کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

مبارک عجب نام ہے شاہ باز محمد حسینی ہیں گیسو دراز
او ہی خانوادہ ہے اک چشت کا دیا ہات حق اس گل بہشت کا

معظم کی دوسری تصنیف 'گلزار چشت' ہے، جس میں سترہ چشتیہ بزرگوں کی مدح و توصیف بیان ہوئی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں بزرگوں کی بیشتر کرامات اور خوارک عادات ہی بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بھی تقدس و تبرک کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ۱۳۰۷ ابیات کی اس مثنوی میں کم و بیش سوا تین سو اشعار بیت نمبر ۳۸ سے بیت نمبر ۳۵۶ تک چشتیہ سلاسل کے بزرگوں کے احوال میں ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں، حضرت معین الدین چشتی، قطب الدین کا کیؒ، حضرت فرید الدینؒ، حضرت نظام الدین اولیاء، منتخب الدین زرزری بخشؒ، شاہ راجو قتالؒ، برہان الدینؒ، حسن شیریںؒ، پیر بخاریؒ، پیر سانگڑے صاحبؒ، جلال الدین گنج رواں، زین الدینؒ وغیرہ۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے شوقِ موسیقی کے متعلق معظم کہتے ہیں:

تصرف اتھا شاہ کا بے شمار کلاونت تھے شاہ کنے کئی ہزار
بجتّر کتے شاہ کے قوال تھے وہ قوال خود مست احوال تھے
کبھی گائیں جب وہ حسینی مقام مجالس کو تب حال آوے تمام
کبھی شوق آ بجاویں رباب نہ رہتا اتھا کچھ بھی عالم میں تاب

اور برہان الدین کے ریاض کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

بجز راگ دیگر نہ کچھ کام تھا
سدا مئے محبت کیرا جام تھا

اوپر معظم کی تصنیف 'آزاد نامہ' یا 'گنجِ مخفی' کا ذکر ہوا ہے۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے مطابق اس میں درج منقبت میں حضرت علیؓ کی مدح یوں بیان کی گئی ہے:

نبی کا نیابت علی کوں دیا علیؓ کوں تو شاہ ولایت کیا
علیؓ کے دیا ہات جب ذوالفقار ہوا دین تب سوں دیکھو آشکار

معظمؔ کے معاصرین میں سے سیّد علی اکبر، افضلؔ، لطفیؔ، بلاقی، ایاغیؔ، شغلیؔ، قادرِ مرتضیٰ اور شاہ حسینی کی تصانیف مناقب سے خالی نہیں ملتیں۔ چنانچہ سیّد علی اکبر کے 'رسالۂ تصوف' میں سیّد میراں کی منقبت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سو ہادی سیّد میراں پیر　　روشن مقبول پاک ضمیر
سیّد میراں ہادی حق روشن　　کیئے عالم کوں دیئے درشن
(سیّد علی اکبر: ''رسالۂ تصوف'' [قلمی] سالار جنگ ورق ۴ب)

افضلؔ

افضلؔ ایک غیر معروف شاعر ہے۔ اس نے 'محی الدین نامہ' شاید سقوطِ گولکنڈہ کے سال ہی لکھا تھا۔ اپنی اس تصنیف میں اس نے عبدالقادر جیلانی کی مدح کی ہے۔ اس منقبت میں شاعر نے آپؒ کی کرامات اور فضائل کا تذکرہ کیا ہے۔ عبدالقادر جیلانی کا ایک نام محی الدین بھی ہے اور فاتحِ دکن اورنگ زیب کا نام بھی محی الدین ہی تھا۔ شاید اسی مناسبت سے شاعر نے اپنی تصنیف کا نام 'محی الدین نامہ' رکھ دیا ہو۔ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے افضلؔ کہتا ہے کہ "فرید الدین عطار کے پیر شیخ صنع کفر کے خارزار میں بھٹک گئے تھے۔ مرید نے مرشد کی یہ حالت دیکھی تو انھیں حضرت غوث اعظم کے پاس لے گئے، جہاں آپؒ کی دعا اور نظر کرم سے شیخ صنع گناہوں سے پاک ہو گئے۔" افضلؔ کہتے ہیں:

دیوانہ ہوا سب کفر میں تمام　　او کرنے لگیا سب برائی کے کام
ہوا عاشق ایک کفر کے ناز کا　　گریں یو جا دیوال کی سنسیار کا
گلے باندھ لی لنگ چراویں سور　　ہوا کفر میں مست او بے خبر
شراب پی کو قرآن کو جا لیا اونے　　جو ہوے سنگت اس کے دیواں کنے

شیخ فرید الدین جب مرشد کی یہ حالت دیکھتے ہیں تو:

مرید ایک ان کا فرید الدین عطار　　دیکھے پیر کوں کفر میں خار زار
کہا پیر یوں دستگیر نام ہے　　کہ سلطان صاحب جہاں کے اہے
گیا جب او سلطان کے سامنے　　کھڑا جوڑ کر ہات کو شہ کنے
گزارا کئی اس نے فاتحہ بارہ برس　　دیکھے پھر کے سلطان اس کی طرف
کہے یار تج کوں یہ کیا کام ہے　　کھڑا ہے سو تیرا کیا کام ہے

شیخ فرید الدین عطار اپنے پیر کی حالت بیان کرتے ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ پیر کو گناہوں سے نجات دلا دیجیے:

گناہ بخش اوس کو گنہ گار کا　　نظر کر تو اوس پر کرم پیار کا
محی الدین کرم اوس پر ایسا کرے　　بھی جھولیاں ولیاں کی وُ لا بھر دیئے
(افضل: ''محی الدین نامہ'' [قلمی] ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد۔ ورق ۲الف، ۲ب)

افضلؔ کے محی الدین نامہ کی طرح لطفیؔ کا 'دستگیر نامہ' اور شہ میرؔ کا 'مدحِ غوث الاعظم' بھی ہے۔ حضرت غوث کی مدح سرائی میں ان دونوں کے یہاں والہانہ پن اور عقیدت کا پرتو نظر آتا ہے۔ لطفیؔ کی نظم ترجیع بند میں ہے ٹیپ کا مصرع 'دستگیری کر مرے یا غوث اعظم دستگیر' شاعر کی عاجزی کا مظہر بن گیا ہے۔ شہ میرؔ کے یہاں 'یا قادری میری مدد' کی تکرار شاعر کی بے بسی و بے کسی کو ظاہر کرتی ہے۔ لطفیؔ کہتے ہیں:

والیِ کونین تم بیشک ہو اے پیرانِ پیر — جلوۂ حق کا سیس پر تیرے چھتر ہے بےنظیر
دو جہاں کی سلطنت اور عرش تیرا ہے سریر — صدق دل سے بولتے ہیں شہ فقیر و میر و پیر
دستگیری کر مرے یا غوث اعظم دستگیر

اور شہ میر اوصاف غوث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سر مست ہے معبود کا، یا قادری میراں مدد — محبوب ہے موجود کا، یا قادری میراں مدد
توں قطب ربانی سہی، محبوب سبحانی سہی — یعنی ابوالقاسم سہی، یا قادری میراں مدد
جگ کا محی الدین پیر ہے، پرزور و کھمبیر ہے — ہر کام اس کا ھیر ہے، یا قادری میراں مدد
تج وصف کا بیحد بیاں، ہے تج صفت ظاہر عیاں — مقبول تو ہر دو جہاں، یا قادری میراں مدد

لطفیؔ اور شہ میر دونوں نے 'اِيَّاكَ نَسْتَعِيْن' کو بالائے طاق رکھ کر استعانت و استمداد کے لیے ان بزرگوں کو پکارا ہے۔ اللہ معاف فرمائے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ

اس عہد میں دکن کے خانوادۂ تصوف کی بزرگ ہستیوں میں شاہ امین الدین اعلیٰ کا بلند مقام ہے۔ صوفی شاعر کی حیثیت سے برھان الدین جانمؔ کے بعد ہی آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کی تمام تر تصانیف صوفیانہ رنگ میں اور چشتیہ تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ اسی تعلیم کے زیر اثر آپ نے پیر و مرشد کی مدح بالاخلاص کی ہے۔ 'فنا فی الشیخ' کی صوفیانہ اصطلاح اسی منہاج محبت کی انتہا قرار پاتی ہے۔ اسی لیے صوفیوں نے اپنی تصانیف کو مدح شیخ سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ امین الدین اعلیٰ دکن کے صوفی خاندان کے بزرگ میرانجی شمس العشاق کے پوتے اور شاہ برہان الدین جانم کے فرزند تھے۔ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۲۳ر رمضان ۱۰۰۷ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ برہان الدین جانم نے اپنے چھوٹے بھائی عطا اللہ حسینی کو تلقین کی تھی کہ وہ ان کے بچے کی پرورش کرے۔ چنانچہ امین الدین اعلیٰ کی تربیت امین الدین کے چچا نے کی تھے۔ حتیٰ کہ اپنا خاندانی خرقہ اُنھی نے پہنایا تھا۔ شجرۃ الاتقیا میں معظمؔ کہتے ہیں کہ امین الدین اعلیٰ کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری جانمؔ نے سیّد علی گنج گوہر کو دی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ذمہ داری شیخ محمود خوش دہاں کو سونپی گئی تھی۔ انھوں شاہ امین الدین اعلیٰ کو قادریہ و چشتیہ

مسالک میں بیعت کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امین الدین اعلیٰ پر جذب وسرمستی اور محویت واستغراق کی کیفیت شب وروز طاری رہتی۔ اس اثنا میں ان کے چہرے سے ایسا جلال ظاہر ہوتا کہ مریدین بے ساختہ سجدے میں گر جاتے۔ سقہ قسم کے علما کرام نے اس سجدے پر اعتراض کیا تو انھوں نے سجدۂ بندگی اور سجدۂ تحیت کا فرق بتادیا۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی تاریخِ وفات کے متعلق مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ حسینی شاہد نے ایک شجرے کے سہارے ان کی تاریخ وفات ۱۰۸۵ھ بتائی ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری کے یہاں یہ تاریخ ۱۱۱۶ھ ہے جبکہ کسی نے 'ختم ولی' کے مادۂ تاریخ سے ان کی تاریخ وفات ۱۰۸۶ھ تحریر کی ہے۔ محمد ابراہیم زبیری صاحبِ 'روضۃ الاولیائے بیجاپور' نے بھی امین الدین اعلیٰ کی تاریخ وفات ۲۴ رمضان ۱۰۸۵ھ ہی بتائی ہے۔

امین الدین اعلیٰ نے اپنی علمی خاندانی روایت کو آگے بڑھانے کے جتن کیے ہیں۔ شمس العشاق کی طرح ان کا متصوفانہ ادبی ذخیرہ کافی وسیع ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ امین الدین اعلیٰ کی بیشتر کتابوں میں عرفانِ نفس کی توضیح اور وجود ذات نیز تنزّلات، مرتبۂ احدیت و واحدیت اورتنِ ناسوتی کے عناصر ترکیبی ہی پر غور کیا گیا ہے، جو علم تصوف کے نہایت ادق نکات ہیں۔ ان کی یہ کتابیں نثر ونظم میں موجود ہیں۔ جہاں تک ان کی شعری تخلیقات کا تعلق ہے، ان میں مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ جانم کی طرح انھوں نے گجری شعری اصناف کو بھی برتا ہے۔ ان کی مثنویوں میں حمد ونعت کے بعد منقبت کو بھی شامل کیا گیا ہے، مگر اکثر مناقب شیخین کی مدح ہی میں قلم بند ہوئے ہیں۔ ان کی ایک شعری تخلیق 'مدحِ شاہ برہان الدین جانمؒ' مستقل مدحیہ نظم ہے اور محققین نے اسے قصیدہ کہا ہے۔ لیکن یہ نظم قصیدے کی صنف پر پوری نہیں اترتی، بلکہ مجالسِ میلاد میں جس مدحیہ نظم کو قصیدہ کہا جاتا ہے، یہ اسی نوع کی نظم ہے، جس میں امین الدین اعلیٰ نے اپنے والد برہان الدین جانمؒ کے فیوض وبرکات اور ان کی عظمت و بزرگی کو سراہا ہے۔ منقبتی شاعری میں یہ نظم اپنے آپ میں علاحدہ مقام کی حامل ہے کہ اس میں شاعر نے خود اپنے والد کی تعریف کی ہے:

اکمل ولایت تج عطا ثابت ثبوت نافی — خطاخبر عین حق دیگر نہ تھا برہان بن میراں اُپر
علمِ لدُن مقدور تج نکتے خفی مکشوف تج — اشکال مشکل حل کیا برہان بن میراں اپر
نیکو سرشت رحمٰں دیا عظام شاں یزداں کیا — احسن خلق حق تھی لیا برہان بن میراں اپر
ہادی توں ہے راہ خدا عامل توں ہے حق میں فدا — واعظ توں ہے راہ خدا برہان بن میراں اپر
رکھیں امیں خادم کمیں دم دم سرن کل بر زمیں — مقبول ہو گفتار امیں برہان بن میراں اپر

(بحوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ''تاریخ ادب اردو'' جلد اول ص: ۳۱۳)

ایک دوسرے قصیدے میں امین الدین اعلیٰ برہان الدین کی توصیف یوں بیان کرتے ہیں:

قمریں متین تیرے ساحر ہوئے ہموں کوں — گمراہ کر بھلا دے قوس قزح بھوں کوں
راہ پل صراط جوں سر مانگ جو بھری ہے — کاہے کشاں سما پر محب بلاونے کوں
تیرے قدم مبارک سوں سب ظہور جلوہ — قصدِ قدم کیا جب اوّل توں آونے کوں
فیضوں قدم کے تیرے پُر نور ہو جمالت — اے صاحبِ جمالہ یہ فیض تج قدم کوں
چرخِ فلک کواکب گرداں میں تج خدامت ملزوم — کرتے سجدے تیرے قدم قدم کوں

(بحوالہ:نصیرالدین ہاشمی، ''دکن میں اردو'' قومی کونسل دہلی،ص:۲۲۷)

امین الدین اعلیٰ کے معاصرین میں ابوالحسن تانا شاہ ان کے پیر بھائی طبعیؔ کے علاوہ محبؔ، عبد الملک، خواصؔ، فتاحیؔ، قدرتیؔ، سیوکؔ مہدویؔ، مختارؔ اور فائزؔ کا شمار ہوتا ہے۔ طبعیؔ کی مثنوی 'بہرام وگل اندام' مثنوی کی دکنی روایت میں اہم اضافہ ہے۔ ابھی تک دکن میں فارسی کے نظامیؔ اور جامیؔ کی مثنویوں کے تراجم پر اکتفا کیا گیا تھا، لیکن طبعیؔ نے امین سبزواری کے قصے 'بہرام وگل اندام' کا دکنی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس مثنوی میں ترجمے کے علاوہ طبعیؔ کے طبع زاد اشعار بھی درج ہیں، جن میں وہ خود اپنے فن کی تعریف کرتے ہیں:

زباں آشنا کر سلاست سیتی — فصاحت، بلاغت، ملاحت سیتی
لگیا میں جو یو مثنوی بولنے — یوں موتیاں نچھل گیان کیاں رولنے

طبعیؔ کے حالاتِ زندگی سے ہم کلی طور پر آ گاہ نہیں۔ مثنوی 'بہرام وگل اندام' سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابوالحسن تانا شاہ کا پیر بھائی تھا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا ہم عصر تھا اور شاہ راجو قتال سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ مرشد کے علاوہ طبعیؔ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح میں بھی اشعار کہے ہیں۔ حضرت علی کی منقبت میں طبعیؔ کہتے ہیں:

علی با ولی توں ہے شیر خدا — کہ تج پرتی ہے جیوٗ میرا فدا
غلط میں سچا توں علی با ولی — تیری شان میں ہے یو نادِ علی
رسولِ خدا کا توں داماد ہے — تجے رات ہور دن خدا یاد ہے

تیری مدح بن کچھ نہ دھرتا ہے کام
یو طبعیؔ ہے بن دام تیرا غلام

(طبعیؔ [مرتبہ ڈاکٹر نورالسعید اختر] ''بہرام وگل اندام''، قومی کونسل،ہلی ۱۹۹۹ء ص:۱۳۱)

'قصیدہ در مدح شاہ راجو حسینی قدس اللہ سرہٗ کے عنوان سے جو نظم طبعیؔ نے رقم کی ہے، اس میں حضرت

شاہ راجو قتال کی تعریف وتوصیف بیان کی گئی ہے:

ولی توں بڑا ہے کگر شاہ راجو — چل آیا ہے شہ تیرے گھر شاہ راجو
اچھیں گا قیامت کے دن رو سفید — تیرا موں دیکھیا سو کہتر شاہ راجو
مریداں سو تیرے کنول کے ہیں پھولاں — اُنن میں تو بھوگی بھور شاہ راجو
توں مخدوم سیّد محمد کے گھر کا — بہت بے بدل ہے گہر شاہ راجو
خدا پاس اُچا ہات کرتا ہے طبعیؔ — دعا تج کوں شام و سحر شاہ راجو

اس منقبت کا تیسرا شعر ہندی اسطور سے متأثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ہندی ادب میں کرشن پریم بھکتی کے اہم شاعر سورداس مانے جاتے ہیں۔ ان کی ایک طویل نظم 'بھرمر گیت' ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک بھنورا کنول (گل نیلوفر) سے بہت پیار کرتا ہے۔ پھول کے حسن کے بالمقابل یہ کالا کلوٹا ہوتا ہے، مگر پھول سے از حد محبت کرتا ہے۔ نیلوفر کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ شام ہوتے ہی وہ اپنی پنکھڑیاں بند کر لیتا ہے، گویا نیند کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔ بھنورا جدائی کے اس صدمے کو سہہ نہیں سکتا، اس لیے وہ پنکھڑیاں بند ہونے سے پہلے اس پھول کے اندر سما جاتا ہے اور صبح ہونے تک پھول کے آغوش میں سو جاتا ہے۔ محبت میں قرب اور باہمی وصل کا یہ خیال اردو شاعری میں نادر ہے۔ شاعر اس مثال کے ذریعہ کہنا چاہتا ہے کہ بھنورا جس طرح کنول کے پھول میں سما جاتا ہے، اسی طرح اے شاہ راجو حسینی آپ بھی مریدوں کے دل میں سمائے ہوئے ہیں۔

محبؔ

محبؔ، ابوالحسن تانا شاہ والیِ گول کنڈہ کے زمانے کا شاعر تھا۔ اس نے اپنی مثنوی میں اس بادشاہ کی مدح کی ہے۔ اس کی مثنوی کی بعض داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن ہی میں اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی نے اس کی پرورش کی تھی۔ محب اپنے مرشد کو حضرت بڑے کہا کرتا تھا۔ محققین کا کہنا ہے کہ حضرت بڑے سے مراد شاہ راجو قتال ہیں۔ شاعر خود اپنے مرشد کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا جانشین کہتا ہے:

بڑے صاحب اس شاہ کے جانشیں — خلافت کے وارث شہ داد دیں
دسے شہ کی جاگے کے اپرال یوں — محمد کی جاگے پہ حیدار جوں
سو اپنی خلافت میں تھے وہ گمبھیر — پس افتادگاں کے ہوئے دستگیر

محبؔ کی مثنوی کا نام 'معجزۂ حضرت فاطمہؓ' ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ یہ ایک فارسی قصے کا ترجمہ ہے:

جو یو قصہ تھا فارسی سوں اول
کیا اوس کوں دکنی زباں سوں بدل

مثنوی کی تاریخ تصنیف کے متعلق شاعر نے اپنے اشعار میں وضاحت کر دی ہے:

شب قدر ہور تھا وہ ماہ صیام کیا ختم ترتیب سوں وہ کلام
اتھے یک ہزار و اسّی آٹھ سال دیا بار اس مثنوی کا نہال

مثنوی میں حضرت فاطمہؓ کے فضائل بیان ہوئے ہیں ساتھ ہی آپؓ کے ایک معجزے کو بھی نظم کیا گیا ہے:

کہوں مدح میں قصۂ فاطمہؓ جو ہے مدح عصمت وہاں خاتمہ
سو وہ پاک دامان بنت رسولؐ رہے حق کی درگاہ میں نت قبول
وہ خاتون جنت ہے خاتونِ دیں یو دنیا سوں ہے بندۂ کم تریں

اس کے بعد ایک معجزے کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح آپؓ کی بدولت چالیس عورتوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

محبؔ کے بعد عبدلملک عبدؔ نے ''نامۂ حضرت سلطان' کے عنوان سے ایک منقبت لکھی تھی، جس میں حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی ثناو توصیف کی گئی ہے:

محی الدین سلطان قادر اہے جکوئی جان کر یاد حاضر اہے
محی الدین ساچا تو سلطاں اہے دیون ہار توں دان ایماں اہے
محی الدین سوں دین روشن ہوا علی کا چمن خاص گلشن ہوا
حسنؓ کا خلاصہ محی الدین اہے حسینؓ کا نواسہ محی الدین اہے

(عبدالملک عبدؔ: 'نامۂ حضرت سلطان' [قلمی ۱۰۸] ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ورق، ۲الف)

خواصؔ کا 'قصہ حسینیؒ' اور شاہ عبدالرحمٰن قادری کا 'باغِ حسینیؒ' مرثیہ سے زیادہ منقبت سے قریب رہے ہیں۔ قدرتیؔ کی 'قصص الانبیا' میں بہت سے پیغمبروں کی منقبت بیان ہوئی ہے۔ سیوکؔ کا 'جنگ نامہ محمد حنیف' رزمیہ تصنیف ہے، لیکن اس میں منقبتی عنصر شامل ہے۔ فائزؔ اور مختارؔ کا تعلق بھی اسی دور سے رہا۔ 'معراج نامہ' اور 'رضوان شاہ و روح افزا' بالترتیب ان ہی کی تصانیف ہیں۔ مختارؔ نے اپنے معراج نامے میں خلفائے راشدین کی مدح کرتے ہوئے ان کے اوصاف حمیدہ کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعر حضرت ابوبکرؓ کی ثنا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

بیاں صدق کا کیوں کیا جائے گا پڑے کام تو فہم میں آئے گا

اوسی عاشقاں میں جو سردار ہے نبیؐ کوں اونے غار کا یار ہے
کتے ہیں جو صدیق اکبر اسے عجب صدق کا ہے سو گوہر اوسے

عدلِ عمرؓ کا بیان شاعراس طرح کرتا ہے:

نہیں مثل اوس کی عدالت منے عدالت کی ساری حکایت منے
مبارک ہے ناؤں سو اس کا عمرؓ عجب عشق کے درج کا ہے گہر

حضرت عثمانؓ کی حیااور علیؓ کی شجاعت کا بیان شاعراس طرح کرتا ہے:

حیا کے گھونگٹ میں عجب لاجتا گھونگٹ یو دیکھو اوس کوں کیا ساجتا
نبیؐ کا اوسے عشق اپر وپ تھا کہ سب عاشقاں میں او محبوب تھا
مسلماں کوں حجت ہے ایمان کا سو عثمان فرزند عفان کا

اور حضرت علیؓ کے متعلق شاعر کہتا ہے:

اتھا دلدلِ عشق پر او سوار شجاعت سخاوت کا تھا نور یار
دیا سب کوں عرفان ایمان کا او نقطہ ہے سب علم قرآن کا
علی نام حیدر سوں کر رار ہے کہ سب حیدر اپنے او سردار ہے

(مختارؔ: ''معراج نامہ''[قلمی]ورق:۳ب،۴ب)

اس کے علاوہ مختارؔ نے شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔ بقول ڈاکٹر زور مرحوم ’مختارؔ کے یہ منقبتی اشعار جو محبوب سبحانی کی شان میں لکھے گئے ہیں، ایک مختصر سی مثنوی ہی بن گئے ہیں۔ مناقب غوثِ اعظم دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ شاعر آپ کا بے حد معتقد اور گرویدہ تھا۔ عقیدت میں اس کا غلو اتنا زیادہ ہے کہ بعض جگہ تو شرکِ صفاتی تک کا گمان ہوتا ہے۔ جیسے:

کہ میں غوثِ اعظم ہوں عالم منے
کروں فیض حوا و آدم منے

(زور مرحوم: تذکرۂ مخطوطات اردو، جلد چہارم ص:۵۹)

اب رہے فائزؔ تو انھوں نے اپنی مثنوی ’رضوان شاہ وروح افزا‘ میں ’در مدحِ صحابہؓ کے عنوان سے جو باب قائم کیا ہے، اس میں صرف حضرت علیؓ کی ہی منقبت ہے، جس میں آپؓ کی عظمت، بزرگی، نسبی برتری، شجاعت ودلیری اور سخاوت وعطوف القلبی کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کی محبوب ومطلوب صرف علیؓ کی ذات ہے۔ وارفتگیِ شوق ان کی منقبت کے ہر شعر سے عیاں ہے:

نبوت کے رتبے میں یو تھے نبی سو وہ بیگماں شاہ مرداں علیؓ

امیرِ عرب شاہِ دلدل سوار شہ ِ لا فتیٰ صاحب ِ ذوالفقار
توں حلاّل مشکل توں مفتیِ دیں توں فاضل توں کشاف علم الیقیں
علم کے نگر کا ہے دہلیز توں کہاں راہ تج میں ہے نا چیز کوں

(فائزؔ [مرتبہ: سیّد محمد، ایم۔اے] 'رضوان شاہ وروح افزا' عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۵۶ء ص: ۸۔۷)

فائزؔ کے عہد یعنی سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ اور اس کے درباری شاعر نصرتیؔ، سیّد میراں ہاشمیؔ کے علاوہ ضعیفیؔ، عبدالعلی راجیؔ اور اولیاءؔ وغیرہ کے کلام میں بھی منقبتی عناصر بآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ

سلطان محمد عادل شاہ نہایت خلائق پرور حکمراں تھا۔ برسوں اس کے گھر میں سلطنت کو سنبھالنے والی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ ہمیشہ دعا میں مصروف رہتا۔ بالآخر ۱۶ ربیع الثانی بروز جمعہ ۱۰۴۸ھ کو بادشاہ کے محل میں ایک لڑکا تولد ہوا۔ عادل شاہ اس کا نام رکھا گیا۔ عادل شاہ کی پرورش خدیجہ سلطان بڑے صاحب کی گود میں ہوئی۔ انھی کے سایۂ عاطفت میں عادل شاہ کی تعلیم و تربیت ہوئی اور شہزادے نے کم عمری ہی میں مختلف فنوں سیکھ لیے۔ محمد عادل شاہ کے انتقال کے بعد خدیجہ سلطان اور وزیر مملکت مدار خاں نے باہم مشاورت سے شہزادے عادل شاہ ثانی کو ۱۰۶۷ھ میں تخت پر بٹھا دیا۔ علی عادل شاہ باپ کی طرف سے عقیدتاً اہلِ سنت والجماعت سے تھا، لیکن خدیجہ سلطان کی عاطفت میں رہنے کی وجہ سے اس نے شیعہ عقائد قبول کر لیے تھے۔ وہ نہایت جفاکش اور مدبر حکمراں ہونے کے باوجود عیش وعشرت کا بھی دلدادہ تھا۔ چنانچہ ایک رات جب اس نے ممسک دوائیں استعمال کر لیں تو اس کے اثرات سے عادل شاہ ثانی کو فالج ہوگیا اور اسی مرض سے ۱۳ شعبان ۱۰۸۳ھ کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی حکمرانی کے زمانے میں اگرچہ فتنہ وفساد کا دور دورہ تھا، پھر بھی اس نے اپنی شاعری میں جنسی تلذذ سے بھرے عشقیہ مضامین کو جگہ دی ہے۔ یہ موضوعات نہ صرف غزلوں اور گیتوں تک محدود ہیں، بلکہ منقبت جیسی مطہر صنف میں شاہیؔ کے یہاں ان رنگوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ جیسے تشبیب کے اشعار:

آرے کلال مج کوں پیالا پلا میا کا تا مست ہو کے دیکھوں مکھڑا علیؑ پیا کا
جوبن پھڑک کتے ہیں پیوست ہوملیں گے آلنگ بدل رہوں اب بند کھول انگیا کا

اور گریز کے یہ دو شعر:

بھید یا ہے مد بدن میں پیوسات رہے انندلے عاشق ہوں میں پیا کی پروانہ جیوں دیا کا
پیالے کی بھانت کہتے ہوی مست مج رسن سب منگتا ہشیار ہونے لے نانوں ایلیا کا

اورگریز کے بعد شاعر مدح کی جانب بڑھتا ہے ۔

شاہ نجف ولی ہے تِس نانوں سو علیؓ ہے وو راز دانِ احمد سلطان اولیا کا
چاتک ہوا ہے مُج دل کہتا ہے پیو پیو کر سیوک ہوا ہوں دائم توں سائیں مج جیا کا

شاہیؔ نے ایک مدحیہ قصیدے میں بارہ اماموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں علی مرتضیٰ، حسن المجتبیٰ، حسین مقتدیٰ، زین العابدین، باقر امام، جعفر امام کاظم امام، علی موسیٰ رضا، امام متقی امام نقی، امام عسکری اور امام مہدی کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں شاہیؔ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شجاعت اور ذوالفقار کی تعریف میں غلو سے کام لیا ہے، جو قصیدہ نگاری کا ایک وصف ہے۔ شاہیؔ کی ایک مثنوی 'خیبر نامہ' ہے۔ اس میں غزوۂ خیبر میں حضرت علیؓ کی دلیری اور بہادری کے کارناموں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شاہیؔ کی ایک منقبت میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی توصیف بیان کی گئی ہے۔ یہ منقبت مثمن میں ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ مرتبہ کلیات شاہیؔ، فلکیاتی تشبیب کے زیر اثر اسے 'چرخیات' میں شمار کرنا چاہتی ہیں، جو قصیدے کی ایک صنف ہے۔ اس منقبت کے متعلق وہ آگے رقم طراز ہیں:

> ''حضرت خواجہ بندہ نواز سے عادل شاہیوں کو بڑی عقیدت تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً بارگاہ خواجہ پر حاضری دیا کرتے (تھے)۔ ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کی ایک لڑکی خواجہ صاحب کے خاندان میں بیاہی گئی تھی۔ محمد عادل شاہ اسی خاندان میں مرید تھا۔ مختصر یہ کہ خواجہ صاحب سے عقیدت کا جذبہ شاہیؔ کو ورثے میں ملا تھا اور اس نے اپنے قصیدے میں اس کا بھرپور اظہار کیا ہے۔''

(علی عادل شاہ ثانی [مرتبہ: ڈاکٹر زینت ساجدہ] 'کلیات شاہی' اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، ۱۹۶۲ء، ص: ۴۷)

شاہیؔ کی عقیدت کا انداز دیکھیے، کتنا جذب و کیف لیے ہوئے ہے:

نور تے پیدا ہوا سچ فاطمہ کا لال توں مصطفیٰ ہور مرتضیٰ کے سب چلیا ہے چال توں
عشق ہور عرفاں سوں دائم ہے مالا مال توں اِس زمیں کے اولیا میں ہے بلند اقبال توں
نت حقیقی ہور مجازی کا ہے صاحب حال توں سن معمے رمز کے سمجا دیوے فی الحال توں

عاشقی کا مرتبہ دھرتا ہے بالے بال توں
عارفاں میں شاہ کر راکھیا ہے تج کوں بے نیاز

دے کرامت کا شرف رب تج کوں جب پیدا کیا بندگی کا مرتبہ توں صدق تے برپا کیا
جب تصوف تے توں اپنا دھیان سب بالا کیا راز کے ہر کام توں جو کچھ کیا برجا کیا
جب اپس سینے تے توں وسواس کوں نیارا کیا ہر گھڑی میں کے براں ابلیس کوں رسوا کیا

رکھ قدم اس باٹ میں توں سب عمل زیبا کیا
تو ندا ہاتف تے تج آیا کہ عاشق شاہ باز

بچن مدح میں اس ذات بابرکات کی کھولیا رَسن تِس رَیَن محفوظ ہو اَت شوق سوں کیتے
حق کیا قدرت سوں عالم تس میں یک روشن بدن طبع مج بولیا مثمن خوش عبارت خوش وزن
اس زمیں کے کیا اتھے طالع جو کیتا ہے وطن سو محمد ہے حسینی سیّدِ قطبِ دکن

کھان سو یہ دھرت ہور تِس میں توں ہے جیو رتن
جن لقب پایا ہے اپنے پیر تے گیسو دراز

(ایضاً ص: ۶۵۔ ۶۳)

ملا محمد نصرت نصرتیؔ

دکنی ادب بالخصوص شاعری کو عبوری دور بلکہ بام عروج پر پہنچانے میں نصرتیؔ کے کلام کو خاص دخل ہے۔ اس نے شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اپنی مثنویوں اور قصیدوں کی وجہ سے دکنی ادب میں اس کا قد نہایت بلند دکھائی دیتا ہے۔ نصرتیؔ کے والد بیجاپور کے شاہی سلح دار تھے اور دربار میں اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ علی نامے کی اندرونی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نصرتیؔ نے عادل شاہی حکم رانوں کی جنگوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ اسے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اساتذہ سے حاصل کی ہوئی تعلیم کے ساتھ اس نے اپنے ذاتی مطالعے کے سہارے بھی بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ دکنی ذخائر میں پائی جانے والی اس کی تین کتابوں (گلشنِ عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری) سے اس کی تبحرِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔ نصرتی کی علمی قابلیت کو سرھاتے ہوئے اسے دربارشاہی سے ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ صاحبِ 'گلشنِ گفتار' نے لکھا ہے کہ 'مد مالت' کو ہندوی میں بہ نزاکت نظم کرنے کی جہ سے اسے یہ خطاب ملا تھا، جبکہ عبدالجبار ملکا پوری کے نزدیک یہ خطاب علی عادل شاہ نے نصرتی کو 'علی نامہ' لکھنے کی وجہ سے عطا کیا تھا۔

نصرتی کی تاریخ پیدائش کا تو پتہ نہیں چلتا، البتہ 'نصرتی شہیدا ہے' سے جو تاریخ برآمد ہوتی ہے، یعنی ۱۰۸۵ھ نصرتی کا سالِ وفات ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے 'اردو مخطوطات: کتب خانہ سالار جنگ میوزیم' کے صفحہ ۱۰۶ پر اس قطعۂ تاریخ کو تلاش کیا تھا:

جا کے جنت میں خوش ہو رہے ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ
یوں کہے ''نصرتی شہیدا ہے'' ۱۰۸۵ھ سالِ تاریخ آ ملایک نے

عبدالحق نے اپنی کتاب 'نصرتی' کے صفحہ ۱۳ اور ۱۴ پر اس کے باپ کا نام شیخ مخدوم اور دادا کا نام شیخ ملک لکھا ہے۔ انھوں نے شیخ مخدوم کے تین لڑکوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں شیخ منصور اہل دل اور خدا رسیّدہ بزرگوں کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نواز سے انھیں عقیدت تھی۔ ان کا مزار نگینہ باغ کے قریب سیّد شاہ عبدالرزاق کی درگاہ میں موجود ہے۔ دوسرے بھائی شیخ عبدالرحمٰن نے سپاہی پیشے کو اختیار کر لیا تھا اور تیسرے ملا نصرتی تھے، جنھوں نے شاعری میں ملک الشعرا کا خطاب حاصل کر لیا تھا۔ نصرتی نے مودت و عقیدت کے اپنے خاندانی سلسلے کا خود اعتراف کیا ہے 'گلشن عشق' میں وہ کہتے ہیں:

بحمد اللہ کرسی بہ کرسی مرے
چلے آئے ہیں بندگی میں ترے

(ملا نصرتی [مرتبہ سیّد محمد ایم۔اے] 'مثنوی گلشن عشق'، سلسلہ یوسفیہ شمارہ ۸، حیدر آباد، ص: ۲۷)

جہاں تک نصرتی کے مسلکی عقائد کا تعلق ہے، تو ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے تاریخ ادب اردو جلد سوم میں ڈاکٹر زور کی کتاب 'اردو شہ پارے' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''نصرتی سنی عقائد کا حامل تھا، اس نے اپنی مثنوی میں خلفائے راشدین کی منقبت بڑے پر جوش انداز میں کی ہے جس سے اس کے مذہبی تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نصرتی کے رفقائے خاص قاضی کریم اللہ شاہ ابوالمعانی اور شاہ نور اللہ دونوں سنّی تھے اور نصرتی ان کے ساتھ نماز بھی پڑھا کرتا تھا۔ نصرتی سیّد کریم اللہ کی علمیت کا بڑا معترف ہے تاریخ عادل شاہی کے مصنف نور اللہ کی بھی تعریف کرتا ہے۔'' (تاریخ ادب اردو جلد سوم: گیان چند جین، سیّدہ جعفر، قومی کونسل دہلی ۲۰۱۱ء، ص: ۷۳)

لیکن جب نصرتی کی دونوں مثنویوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ اس نے اپنی دونوں مثنویوں میں علاوہ حضرت علیؓ کے، خلفائے راشدین میں سے کسی کی کہیں بھی مدح بالراست نہیں کی ہے۔ واقعۂ معراج کے بیان میں البتہ ایک ایک شعر میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمان کا ذکر ہوا ہے۔ بہر حال! علی عادل شاہ شاہی کے درباری شاعر ملا نصرتی کو باشاہ کی ہمت افزائی اور قدر دانی 'گلشن عشق' اور 'علی نامہ' جیسے فن پاروں کو وجود بخشنے کی ترغیب دلاتی ہے جنھوں نے دکنی ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ نصرتی کی ان مثنویوں میں منقبت کے عناصر ہمیں ملتے ہیں جو حسنِ لطافت کا نادر نمونہ بھی ہیں اور عقیدت و برکات کا بیش بہا خزینہ بھی۔ حمد و نعت و قصائد میں والہانہ جذبات کی ترجمانی کرتے وقت بالعموم اور مناقب علیؓ میں بالخصوص نصرتی کی ذہنی صلاحیتیں، معنوی لطافتیں اور فنی نزاکتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ حضرت علیؓ کی مدح میں ان کی منقبتیں گلشن عشق و عقیدت بن جاتی ہیں اور وسعت بیان و رفعت تخیل

ان مناقب کوعلی نامہ بنا دیتے ہیں، جو نہ صرف لفاظی سے عاری ہیں، بلکہ معنی آفرینی کا عمدہ نمونہ بن گئی ہیں۔شاعر نے مناقب علیؓ سے متعلق احادیث کا برجستہ منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ ذیل میں دیئے ہوئے مناقب علیؓ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

علیؓ تھا برادر محمدؐ کو ں یوں — سو موسیٰ پیمبر کوں ہارون جیوں
نبیؐ علم کا شہر ہے منجلی — در اس کا تہیں نامور اے علیؓ
پنچ میں دونو کا نور یک صفا — تو کہہ لحمک لحمی اس مصطفیٰ
کہے تھے سو الفقر فخری رسولؐ — کیا ہے تو وہ فخر آپیں قبول

(ملا نصرتی [سیّد محمد ایم۔اے] ''گلشن عشق'' سلسلۂ یوسفیہ شمارہ ۸ ص: ۲۴۔ ۲۳)

جسے حق عنایت کیا ذوالفقار کیا — دیکے دلدل نول شہ سوار
سورج کوں کیا عالم افروز توں — کیا بات تس سات جس روز توں
سورج عصر کا توں کرے گر نماز — ڈوبیا تھا سو بہار آ ہوا سرفراز
تہیں لا فتا کس صفت تج کوں چھوڑ — تہیں در کوں خیبر کے توڑیا مروڑ

(ملا نصرتیؔ [مرتبہ: سی عبدالمجید صدیقی] ''علی نامہ'' حیدر آباد ۱۹۵۹ء، ص: ۱۹ اور ۲۱)

ان مناقب میں نصرتیؔ نے حضرت علیؓ کے تمام اوصاف کاملہ اور عادات شریفہ نہایت عقیدت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔ شجیع وقانع علی، عادل وصابر علی، سخی وولی علی، فقر وفاقہ کے پیکر علی، صاحب النبیؐ علی، علم کے دروازے علی، خیبر شکن علی، صاحب ذوالفقار، شاہ نجف وغیرہ تمام اوصاف نصرتیؔ نے قرآن واحادیث اور تاریخ سے لے کر یکجا کر دیئے ہیں۔

گذشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ عادل شاہیوں کے یہاں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ سے عقیدت رکھنے کی خاندانی روایت رہی ہے، جس کی وجہ سے شاہی درباروں سے وابستہ افراد بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ عقیدت ومودت کا یہ سلسلہ عادل شاہی خاندان کے افراد آج تک نبھاتے آرہے ہیں۔ ملا نصرتیؔ چونکہ عادل شاہی دربار سے وابستہ تھا، اس لیے اس نے بھی خواجہ بندہ نواز سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے اپنی مثنویات میں منقبت خواجہ کو شامل کیا ہے، چنانچہ علی نامہ کے منقبت حضرت علیؓ کے باب میں حضرت بندہ نواز کا ذکر نصرتیؔ اس طرح کرتے ہیں:

نپٹ اڑ رہیا ہوں توں ہو مجھ رشید — کہ ہوں تجھ خلف کا کمینہ مرید
جسے نانوں عالم میں بندہ نواز — محمد حسینی ہے گیسو دراز
محبت سوں اپنے توں فرزند کے — توں دل جوے کاری یو دل بند کے

نچا نے کوں اس تشنگی تے جلا　　محبت کا یک جام ایسا پلا
جو سب تن میں حق عشق کا چڑ اثر　　قیامت کے رہوں ہول تے بیخبر

(ایضاً علی نامہ ص:۳۲)

شاعر نے یہاں خواجہ کو وسیلہ بنا کر حضرت علیؓ سے قیامت کی ہول ناکیوں سے بے خبری کی دعا کی ہے۔ البتہ ’گلشن عشق‘ میں ایک مسلسل منقبت حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی شان میں کہی گئی ہے:

باں دھو کے پھل نیر سوں مکھ میں لیا یو　　یو سیّد محمد حسینی کا نانو
جتے عاشقاں میں اچھے سرفراز　　جنے جگ کا مخدوم بندہ نواز
وہ شہ باز جس عرش اچھے آشیاں　　جسے صید گہ وسعتِ لا مکاں
صدی آٹھویں میں تہیں اے ولی　　کیا تازہ جنت میں جانِ علیؓ
جو شاہ دکھن ہے علی جس کو نانو　　تیر ا سایہ تس سر اچھو چتر چھانو

(ایضاً، مثنوی گلشن عشق، ص؛۲۸)

شاعر نے اس منقبت میں سیّد محمد حسینی گیسو دراز کو شاہ نجف کا سچا خلف، قرب کی بزم کا مُل اور سیادت کے باغ کا گُل کہا ہے۔ نصرتی یہ بھی کہتا ہے کہ خواجہ کے عالموں کا شرف انبیا کے اسلاف سے زیادہ ہے۔ گیسو دراز کے باطنی فاضلوں کے سامنے ظاہری علما کی کوئی بساط نہیں۔ علم لدنی کی فضیلت گیسو دراز کو عطا ہوئی ہے۔ وہ جامعِ فضائل ہیں اور ان کی وجہ سے سیادت کی بیل پروان چڑھی ہے۔ طریقت میں تیرے طالبان رشید اور پیران کاملاں مرید ہیں۔ جو حکومت تیرے اجداد کے ہاتھوں میں ہے وہاں تک میری رسائی نہیں۔ دکھن کی خاک نہایت بختاور ہے، کیونکہ اس زمین میں تمھاری خواب گاہ ہے۔ تمھارا کرم جس نے پایا، وہ زمانے میں سورج کی مانند مشہور ہوا۔ شاہ دکن علی عادل شاہ جس کا نام ہے، اس کے سر پر تیرا سایہ چتر چھاؤں بن گیا ہے۔ وغیرہ۔

سیّد میراں ہاشمی

ہاشمی کا اصل نام سیّد میراں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدائشی اندھا تھا۔ بعض کے نزدیک جوانی میں چیچک کے مرض کی وجہ سے اس کی بصارت چلی گئی تھی۔ اس کی غزلیات میں رنگوں کے عجیب امتزاج کا ذکر اور ملبوسات و زیورات کے فنکارانہ بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی اندھا نہیں تھا۔ ہاشمی نے اپنی بینائی کے چلے جانے کا ذکر نہایت پر درد انداز میں اپنی مثنوی ’یوسف زلیخا‘ میں کیا ہے:

آنکھیاں نہیں پروں کیوں موتیاں کے ہار
رتن ڈھونڈ کے کیوں لاؤں آبدار

دونوں انکھیاں معذور ہوں تس پر پڑیا نئیں یک حرف
کیوں شعر بولو بولنا پختہ سو پاکیزہ بھنور
اسی فکر سوں نئیں ہے خاطر کوں تھیر
انکھیاں نئیں ہیں کیوں جاؤں دریا کو تیر

ہاشمیؔ بیجاپور کا متوطن اور مہدوی مذہب کا پیرو تھا۔ علی عادل شاہ شاہیؔ کے دربار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے فکر معاش سے آزاد تھا۔ اس لیے اپنا سارا وقت شعر و شاعری میں صرف کرتا تھا۔ ہاشمیؔ چونکہ مہدوی مسلک کا پابند تھا، اس لیے اس نے بیجاپور کے شاہ ہاشم حسینی کو اپنا مرشد تسلیم کرلیا اور ان ہی کی پیروی میں زندگی گزار دی۔ ہاشمی کا انتقال ۱۱۰۹ھ میں ہوا تھا۔ سخاوت مرزا کے مطابق اس کا مزار برہان پور میں ہے۔

سیّد میراں ہاشمیؔ کی شعری تصانیف میں معراج نامہ، قصۂ یوسف زلیخا، مثنوی عشقیہ، مخمس در مدحِ مہدی جونپوری اور دیوانِ ہاشمی کا شمار ہوتا ہے۔ اس کا دیوانِ حمد و نعت و منقبت سے خالی ہے البتہ اس کی مثنویوں میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے تحت منقبت کو جگہ دی گئی ہے۔ ۳۸ بندوں پو مشتمل اس کے مخمس میں مہدی جونپوری کی مدح کی گئی ہے۔ اس میں حمد و نعت و معراج اور مدحِ اہل بیت کے ساتھ مہدی جونپوری کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ نیز شاعر نے مہدیِ موعود کے پانچ خلفا (میراں سیّد محمود، خواند میر، شاہ نعمت، شاہ نظام اور شاہ دلاور) کا ذکر ایک ایک بند میں کیا ہے:

میراں سیّد محمد فرزند اہے — جسے سب نے مہدیچ ثانی کہے
دوجے پر ہوا ہے سو خوند میر نام — صفت قاتلوا ہو اقتلوا تمام
تیجا یار سو شاہ نعمت اہے — ہے بدعات کی مقراض مہدی کنے
رہے یار چوتھا ہے شاہ نظام — خدا کن تھے طے ہے زمیں جس مدام
پنجم شاہ دلاور ہے مہدی کا یار — لدّنی رہے علم جس دن منجھار

مخمس کے پانچوں بند کے اشعار میں ان پانچ صادقوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد باقی بندوں میں شاعر نے اپنے مرشد کی ثنا و توصیف نہایت عقیدت مندانہ انداز میں کی ہے۔ مخمس کے علاوہ ہاشمیؔ نے 'مثنوی یوسف زلیخا' میں بھی اپنے مرشد کی مدح میں منقبت کہی ہے:

یو مہدی میں سب ہے پیمبر کا شان — یو موعود رب کا وہی ہے نشان
نشانیاں تو کیا کیا اچھے اس میں سب — یو سیّد محمد ہے جس کا لقب
نبوت ولایت کا یوں یک ہے بھید — کہ جوں ایک موتی کے تئیں دو ہیں چھید

یو مہدی خلیفہ ہے رحمٰن کا ۔ بیاں جن کیا جگ یہ فرقان کا
تو آیا ہے مہدی اسی کام کوں ۔ دیکھائے خدا خاص ہور عام کوں

(بحوالہ: تاریخ ادب اردو جلد سوم قومی کونسل دہلی ۲۰۱۱ء، ص: ۱۷۳-۱۷۲)

ہاشمی ریختہ گو شاعر کی حیثیت سے معروف ہے اس لیے زنانہ زبان کی جھلکیاں اس کے منقبتی اشعار میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اپنے پیر شاہ ہاشم سے وہ یوں دل لگائے بیٹھا ہے:

گدا ہو کر منگوں گی یوں میرا سب کام ہووے گا ۔ سخن اب شاہ ہاشم سوں درس کا واں جو پاؤں گی
ہے یو صفت مجھ پیر کی ہے شاہ ہاشم ناوں اس ۔ تھا نقش جس کے دل منے نت حق گیری گفتار کا
نبی کی شریعت کا ہے چھتر سیس ۔ اچھے تخت مہدی کا مدعا نو سیس
اے ہاشمی خوشی سوں کہتی ہوں تج مکرر ۔ آ کر پیا ملے سوں آیا ہے لاج مج کوں

اپنے پیر شاہ ہاشم کی مدح میں کہے گئے درج بالا منقبتی اشعار میں ہاشمی نے مہدی اور نبی کے فرق کا لحاظ نہیں رکھا اور فرطِ عقیدت میں گمراہ کن باتیں سپرد قلم کر دیں۔

عبدالعلی راجیؔ

ہاشمی کی وفات (۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء) کے ایک سال بعد شاہ عبدالعلی راجیؔ نے 'نامۂ علیؓ' کے عنوان سے حضرت علیؓ کی شان میں ایک رزمیہ مثنوی لکھی تھی، جس میں آپؓ کی سخاوت اور جوانمردی کے متعلق چند روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ شاعر نے اس مثنوی میں جو قصہ بیان کیا ہے وہ اس طرح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس مدینہ منورہ میں ایک فقیر نے دستِ سوال دراز کیا۔ اسے سات ہزار درہم کی ضرورت تھی۔ حضرت علیؓ نے اس کی مدد کا وعدہ کیا اور فقیر کو اپنی آنکھیں بند کرنے کا کہہ کر اسے اپنی پشت پر بٹھا لیا۔ جب فقیر نے آنکھیں کھولیں، تو اپنے آپ کو حضرت علی کے ساتھ ایک اجنبی خطے میں موجود پایا۔ حضرت علی نے اس سے کہا کہ یہ بربر کا علاقہ ہے اور یہاں کا راجہ میرا دشمن ہے۔ تو مجھے قشمشاؔ نامی غلام کی حیثیت سے اس راجہ کے حوالے کر دے اور اپنی ضروت کی رقم اس سے حاصل کر لے۔ مختصر یہ کہ فقیر نے حضرت علی کو راجہ کے حوالے کر دیا۔ راجہ نے حضرت علی کے ذریعہ اپنے دشمنوں کا خاتمہ کروایا اور آخر میں یہ کہا کہ میرا ایک دشمن علی بھی ہے، جو مدینہ میں رہتا ہے تو اس کا بھی خاتمہ کر دے۔ اس پر علی نے کہا کہ میں ہی علی ہوں۔ یہ سنتے ہی تمام لوگ وہاں سے بھاگ گئے۔ بربر کے راجہ نے حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مسلمان ہو گیا۔ راجیؔ نے اس منقبت میں واقعات کے تانے بانے نہایت عمدگی سے جوڑے ہیں کہ کہیں بھی تسلسل مجروح نہیں ہوتا۔ شاعر کی زبان مراٹھی اثر لیے ہوئے ہے۔ تقریباً دوسو اشعار کی اس مثنوی میں شاعر نے حضرت علی کی مدح بھی بیان کر دی ہے اور

آپؓ کی سخاوت وشجاعت اور کریمانہ فضائل وخصائل بھی نظم کر دیئے ہیں۔ پھر ان واقعات کو قصے کا رنگ دے کر عوام کی پسندیدگی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نامۂ علی کے یہ چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

اوٹھے ہور بولائے علی ہات سوں ‌ ‌ ‌ فقیر کوں دلاسا دیئے بھات سوں
بزاں اوس کوں انکھیاں موچو کہے ‌ ‌ ‌ سو انکھیاں کو پٹکا جو باندو کہے
اپن پیٹ پر لے او حملہ کیے ‌ ‌ ‌ اوتر شہر میں بعد ازاں یوں کہے
علی نے کہے شہر بربر ہے اوں ‌ ‌ ‌ کہ ہے میرے دشمن کا سویا نچہ ٹھاؤں
میرا ناؤں ہرگز نکو لے یہاں ‌ ‌ ‌ سمجھتے میرا ناؤں ملک جہاں
او پوچھے تو ناؤں قشمشا کہنا ‌ ‌ ‌ ترے دشمناں کوں کرے یو فنا

(شاہ عبدالعلی راجیؔ: ''نامۂ علی'' [قلمی] ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ورق ا۔الف تا ۴۔الف)

اسی دور میں شمالی ہند کے ایک غیر معروف شاعر اسمٰعیل امروہی 'وفات نامہ حضرت فاطمہؓ' ترتیب دیتے ہیں۔ اگرچہ اس تصنیف کا عنوان 'وفات نامہ' ہے، لیکن اس میں حضرت فاطمہ کی ولادت سے وفات تک کے حالات قلم بند ہوئے ہیں، جو عموماً روایتی قصوں میں مل جاتے ہیں۔ شاعر کی زبان میں دیہاتی پن صاف جھلکتا ہے۔

گجرات میں اسی عہد میں کئی مذہبی مثنویاں لکھی گئیں۔ امین گجراتی کی 'یوسف زلیخا'، فتح شریف بلخی کی 'یوسف ثانی'، فاضلؔ کی 'منقبت عمرؓ' اور شاہ نصیر الحق کی 'خدیجہؓ' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ 'معجزۂ فاطمہؓ' کے عنوان سے ایک مثنوی کسی امین نامی شاعر کی سالار جنگ کے کتب خانے میں ہمیں نظر آئی۔ شاعر نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۹۹ھ بتایا ہے۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی امینؔ ہیں جن کی تصنیف 'یوسف زلیخا' ہے۔ بہرکیف! اس مثنوی میں شاعر نے حضرت فاطمہؓ سے متعلق ایک واقعہ نظم کیا ہے۔ قصہ مختصر یوں کہ ''ایک بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنگل کی کسی غار میں جا کر بیٹھ گئے اور کئی دنوں تک گھر نہیں لوٹے۔ آپؐ کے صحابہ بے چین ہو کر آپ کو تلاش کرنے نکل پڑے تو ایک غار میں حضورؐ کو سجدہ ریز پایا۔ سبھی نے آپؐ کو آواز دی، لیکن آپ نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ آخر حضرت فاطمہؓ وہاں پہنچیں اور سر نہ اٹھانے کا سبب دریافت کیا، تو آپؐ نے جواب دیا کہ ایک دن جب میں سو رہا تھا تو جبرائیلؑ نے آ کر مجھ سے کہا کہ تم اتنے بے فکر کیسے سوئے ہو؟ اللہ تمھاری امت کو دوزخ میں ڈالے گا۔ اس لیے کچھ کرو۔ حضرت فاطمہ یہ سن کر گڑگڑاتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں فریاد کرنے لگیں:

فریاد زاری کر شروع رونے لگی درگاہ میں ‌ ‌ ‌ دکھڑا بھرا سینے منے انکھیاں انجھوسوں بھیگی تر

کہنے لگی یہ فاطمہؓ، اے خالق ارض و سما دھرتی سوں سر اونچا کرے، جب آپنا، میرا پدر
میں بی سوتب سر آپنا اونچا کرونگی ا زز میں ورنہ قیامت روز لک کرتی آزاری مگر
آیا رسول اللہ پر تب حق تعالیٰ کا حکم جبرئیل نے آکر کہے بخشے امت اب کیا ہے ڈر
(امین، 'معجزہ فاطمہؓ' [قلمی] کتب خانہ سالار جنگ، حیدرآباد، ورق ۷-الف)

فتح شریف کی 'یوسف ثانی'، صنعتیؔ کے 'گلدستہ' یا 'قصہ فغفور چین' کی طرز میں لکھی ہوئی ہے۔ اب رہے فاضل اور شاہ نصیر الحق، تو فاضلؔ نے ۱۱۳۰ھ میں حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا ایک واقعہ اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ مثنوی میں جو قصہ بیان ہوا ہے، وہ اس طرح ہے کہ ''ایک دن حضرت عمرؓ کو راستے میں کپڑے میں لپٹا ہوا ایک نو زائیدہ بچہ ملا۔ بچہ کے ساتھ ایک خط اور چند اشرفیاں بھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے نہایت کاوشوں کے بعد اس نوزائیدہ کے والدین کا پتہ چلایا اور سمجھا بجھا کر ان کا عقد کروا دیا۔ اس قصے کا مرکزی کردار حضرت عمرؓ ہیں۔ شاعر نے آپؓ کا تقویٰ، عوام الناس سے رکھی جانے والی محبت اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں آپ کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی نہایت عمدگی سے کی ہے۔

شاہ نصیر الحق نے ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء میں 'خدیجہ' نامی تصنیف میں، جہاں خصائلِ محمدیؐ پیش کیے ہیں، وہاں خدیجۃ الکبریٰ کا آپؐ کے ساتھ نکاح، آپ کے اخلاقِ فاضلہ، ثروت و مرتبت وغیرہ کا بیان بھی نہایت چابک دستی سے کیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اس نے یہ واقعہ 'روضۃ الشہداء' سے لے کر گوجری میں منظوم کیا ہے۔ اس کی مثنوی میں اگرچہ واقعاتِ عربی ہیں، لیکن ان کی فضا اور ماحول خالص ہندوستانی دکھائی دیتے ہیں۔

دکن میں اسی دور میں ضعیفیؔ، قاضی محمود بحریؔ، شاہ عنایت، حسین ذوقیؔ، عشرتیؔ، فراقیؔ وغیرہ بھی ادب و مذہب کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان میں قاضی محمود بحریؔ اور عشرتیؔ اپنی کہنہ مشقی کی وجہ سے کافی مقبول ہوئے۔ بحریؔ کی مثنوی 'من لگن' اور ان کی کلیات میں ہمیں کئی منقبتی اشعار مل جاتے ہیں، جن میں عقیدت و محبت کی فراوانی ہے۔ عشرتیؔ کی 'دیپک پتنگ' میں بھی حضرت علیؓ کی منقبت شاعر کے اخلاص و محبت کا پتہ دیتی ہے۔ شاعر نے اس منقبت میں شعری حسن کو قائم رکھنے کوشش کی ہے۔ اس کے لیے مختلف صنعتوں کا استعمال بھی کیا ہے:

نبوت سمدر نور اس کا صدف ہے نرمل گہر تس میں شاہ نجف
نبی پاک نے تربیت کر بلند رکھی خاص اخلاص میں کر پسند
سراپا جو در نجف جیب سوں ڈھلی جل ہو موتی پکل سیپ سوں
(سیّد محمد عشرتیؔ، 'دیپک پتنگ' [قلمی] کتب خانہ سالار جنگ، حیدرآباد، ورق: ۸/الف اور ۱۱/الف)

مندرجۂ بالا شعرا ولؔی کے معاصرین میں سے ہیں۔ ولؔی تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان کافی نکھر گئی تھی۔ اب اس میں شمال و دکن دونوں اطراف کے لسانی اثرات مترتب ہوتے جا رہے تھے۔ اس عہد میں فارسی کی ادبیت اور مذہبی اعتبار سے اثنا عشریت اردو زبان و ادب پر غالب نظر آنے لگی تھی۔ ولؔی کے منقبتی کلام میں یہ دونوں عناصر ہمیں ملتے ہیں۔

سیّد ولی محمد ولؔی

دکنی زبان و ادب کو شمالی اردو سے جوڑ کر ولؔی نے جس نئی ادبی روایت کو مستحکم کیا، اسے ریختہ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ ولؔی ان دونوں ادبی سلاسل کو جوڑنے والی مضبوط کڑی ہیں۔ اس نئے ادبی معیار کا آغاز ولؔی کے دم خم سے ہونے کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اس کے پس پشت بعض سیاسی عوامل بھی کارفرما رہے ہیں۔ دراصل سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں سقوطِ گولکنڈہ کے بعد دہلی اور دکن مل کر غیر منفصل ہندوستان کے وجود میں آجانے کی وجہ سے دونوں جانب کے ادبی، تہذیبی اور ثقافتی رشتوں میں یکسانیت ہی نہیں، باہمی مطابقت پیدا ہوگئی اور اس باہمی مطابقت نے ایک ادبی معیار قائم کر دیا۔ یہ ایسا ادبی معیار تھا، جس میں فارسی کی تقلید کو روا رکھا گیا اور زبان کو شگفتہ و عام فہم بنایا گیا۔ اسی زمانے میں ولؔی سیّد ابوالمعالی کے ہمراہ دکن (اورنگ آباد) سے دہلی پہنچتے ہیں، جہاں ان کی ملاقات شاہ سعد اللہ گلشن سے ہوتی ہے۔ ولی کا کلام سن کر شاہ گلشن نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ دکنی لفظیات کی جگہ فارسی کا استعمال کیا جائے اور فارسی شاعری میں جو مضامین مستعمل ہیں، انھیں اردو میں استعمال کیا جائے۔ شاہ گلشن کے مشورے کے مطابق جب ولؔی نے اپنا کلام دہلی والوں کے سامنے رکھا، تو شمال کے شعرا بھی اس سے متأثر ہوئے اور اردو شاعری میں ایک انقلاب آ گیا۔

ولؔی کے وطن کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے باپ دادا نے گجرات سے دکن ہجرت کی تھی، لیکن گجرات سے ان کا وطنی رشتہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے ولؔی باوجود گجراتی ہونے کے ولی دکنی ہی کہلائے۔ وہ خود کہتے ہیں:

ولؔی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکھن ہے

ولؔی کا انتقال ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۵ء کے درمیان کسی سال میں ہوا تھا اور گجرات (احمد آباد) میں ان کی تدفین عمل میں آئی تھی۔ اردو شاعری کے اس بابا آدم کے سوانحی حالات سے ایسی بے خبری تعجب خیز ہے۔ خیر! ولؔی قادر الکلام ہمہ جہت شاعر تھے۔ ان کے یہاں مختلف اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ وہ قلندرانہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دیوان میں چھے قصائد خالصتاً مذہبی

موضوعات پر ہیں۔ بادشاہِ وقت کی تعریف و مدح میں ان کے یہاں کوئی قصیدہ نہیں۔ پہلے قصیدے میں حمد و نعت کے بعد خلفائے راشدین اور شہیدان کربلا کی مدح و توصیف کی گئی ہے:

بعد اس آفتاب انور کے　　چار ہیں اہلِ علم و اہلِ عمل
ہیں یہ چاروں ستون شرع متیں　　دین کا ہے ان سوں مستقیم محل
ہیں یہ اسلام کے صحیفے پر　　چار اطراف صورتِ جدول
صاحب صدق و عدل و علم و حیا　　ایک سوں ایک اکمل و افضل
ان کو اصحاب میں سباقت ہے　　دین کو جو کیے قبول اول
ہیں دُجے وہ کہ دین کے بل سوں　　کفر کے دست و پا کوں کئے شل
ہیں تجے وہ کہ جن کے لوہو سوں　　رنگ پکڑا کلام عز و جل
ختم خلفا کی کیا کروں میں بات　　جس کے رتبے کا عرش پر ہے محل

(ولی دکنی [مرتبہ: نورالحسن ہاشمی] ''کلیات ولی''، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۵ء ص: ۳۳۴)

اس کے بعد حضرت علیؓ کا وصف شجاعت پانچ اشعار میں بیان ہوا ہے۔ ایک اور منقبت میں ولی کہتے ہیں:

قبلۂ اہلِ صفا شمشیر ہے　　ہادیِ مشکل کشا شمشیر ہے
کیوں نہ دشمن کے کریسینے میں جا　　ناخنِ شیر خدا شمشیر ہے
ہے کلید فتح بابِ مدعا　　ناخنِ مشکل کشا شمشیر ہے

(ایضاً ص: ۲۱۴)

اس قصیدے کے آخر میں شاعر نے حضرات حسنینؓ کی ثنا گستری میں عقیدت کا رنگ بھرا ہے:

بعد ان کے ہیں دو امام جہاں　　نور چشمِ پیمبرِ مرسل
ہر دو سلطان کشور کونین　　ہر دو مقبول شاہِ روزِ ازل
ایک کا تن ہوا ہے اطلس سبز　　ایک خوں سوں زمین کیا مخمل

آخری شعر میں تلمیح ہے۔ روایت ہے کہ حضرت حسن کو زہر دے کر شہید کیا گیا اور حسینؓ کو قتل کیا گیا۔ شاعر نے اس شعر میں صنعتِ تشبیہ کے ذریعہ زہر کو سبز اطلس کی مانند اور خون کے رنگ کو سرخ مخمل جیسا کہا ہے۔ ولی کا ایک اور قصیدہ حضرت علیؓ کی مدح ہی میں ہے اس کے ۱۳۳ اشعار میں صرف حضرت علیؓ ہی کی ثنا و توصیف اور تعریف و مدحت کی گئی ہے۔ اسی طرح پانچواں قصیدہ میراں محی الدین دکنی اور چھٹا قصیدہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی تعریف و توصیف کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ حضرت

علوی کی ستائش وہ اس طرح کرتے ہیں:

رکھے نظر سوں اگر یہ جمال نورانی　　شرم سوں مصر لیے جاکے ماہ کنعانی
مشائخاں جو کئے ہیں مدام کسب شرف　　تیری جناب سے پائے ہیں قرب حقانی
تیری گلی میں میسر ہوں جس کوں بسترِ خاک　　قصور ہے کہ منگے بھر کے قصر کیوانی
یو دین پاک میں بیشک ہے تو وجیہ الدین　　عدم ہے آج زمین کے اُپر تیرا ثانی
تیری جناب سوں ہے فیض طالباں کوں مدام　　تیرے کرم سوں ہے اکثر کوں قرب حقانی

ولیؔ نے اگرچہ وجیہ الدین کا زمانہ نہیں پایا، لیکن احمد آباد میں رہتے ہوئے انھوں نے خانقاہ علویہ میں بھی قیام فرمایا اور وجیہ الدینؒ کے مزار سے روحانی فیض بھی حاصل کیا تھا۔ قصیدے کے علاوہ ولیؔ نے ایک ترجیع بند میں بھی وجیہ الدین علویؒ کی تعریف کی ہے۔ مدحت طرازی کا یہ انداز دکنی منقبتی شاعری کے اسلوب اور طرزِ نگارش کو کافی دور چھوڑ دیتا ہے۔

اے امام جمیع اہل یقین　　قبلۂ راستاں وجیہ الدین
عشق تیرے کی آگ میں خورشید　　سر سوں لے پگ تلک ہوا ہے اگن
دیکھنے کوں تیرے ہوا مشتاق　　گل نرگس سیں کھول چشم چمن

ولی کی کلیات میں دو مثنویاں بھی ہیں۔ ان میں بھی منقبتی اشعار موجود ہیں۔ انھوں نے عاشقانہ غزلوں میں بھی آئمۂ عظام کو احتراماً یاد کیا ہے۔ مندرجۂ بالا مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ولیؔ کی بزرگوں کے تئیں عقیدت میں غلو کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے مشائخ کی تعریف و توصیف میں حدِّ شریعت کا خیال رکھا ہے، اور کوئی ایسی بات نہیں کی جو شرعی گرفت کی وجہ بن جائے۔

ولیؔ دکنی کے معاصر شعرا میں ولیؔ ویلوری کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی دو کتابیں 'روضۃ الشھداء' اور 'دعائے فاطمہ' منقبتی شاعری کے عمدہ نمونے قرار پاتے ہیں۔ اول الذکر کتاب تو ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے، جس میں شہید اعظم حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور کربلا کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی دراصل منقبت سے زیادہ مرثیہ سے قریب تر ہے، لیکن کہیں کہیں منقبتی عنصر اس میں جھلکتا ہے۔ جیسے مجلسِ دوم میں شاعر نے حضرت فاطمہ کی وفات کا ذکر کیا ہے وہاں آپ کی سیرت مبارکہ بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے:

خدیجہؓ سوں جو اولاد پیمبر　　اتھے سب دو پسر اور چار دختر
نِنھے تھے فاطمہ سب دختراں　　میں ولے جوں چاند اچھتا اختراں میں
مناقب ان کا کاں لگ کوئی کرے گا　　قیامت لگ کرے تو نا سرے گا

زباں کی تیغ کو کرکے ملمع | مناقب میں کہوں میں ایک شمہ
کھلاتے تھے نبی اس پاک تن کوں | نچھل کانِ نبوت کے رتن کوں

(ولی ویلوری: 'روضۃ الشہداء' مطبع حیدری بمبئی ۱۳۰۱ھ ص: ۱۰۔۹)

اسی عہد کے سیّد احمد خاں ہنؔر اور وجدیؔ جیسے شعرا کی مثنویاں بھی دستیاب ہیں، جن میں منقبتی اشعار وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اثنا عشری عقیدے کو ماننے کی وجہ سے ہنرؔ کی مثنوی 'نیہ درپن' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کی منقبت ملتی ہے۔ اس میں شعری محاسن کا بھرپور استعمال ہوا ہے:

شرف گہ ووجو ہے دیں سروراں کا | نہایت گاہ ہے پیغمبراں کا
امامت کے فلک پر نجم پارا | اگیارہ نجم، علی ہے چاند سارا
محمدؐ لفظ علیؓ ہے معنی کامل | محمدؐ شہر، علیؓ ہے باب حاصل
نہیں لخت جگر احمدؐ سوں نیارا | ہے جوڑا فاطمہؓ کا حق کا پیارا
کفر کے کاٹنے کوں صاحب سیف | رکے پن حکم رب بن سب اپر حیف
کہاں ہوتی وصف جس کا حق تعالیٰ | تو حق تعریف انساں سوں ہے بالا

(سیّد احمد ہنرؔ: 'نیہہ درپن' [قلمی] سالار جنگ کتب خانہ، ورق: ۶ الف تا ۷ الف)

ہنرؔ کی اس منقبت میں احادیث کا برجستہ اور برموقع استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً تیسرے شعر میں ''انا دار الحکمۃ و علی بابھا'' اور چوتھے شعر میں ''انما فاطمۃ بضعۃ منی'' کی طرف اشارے ہیں۔ رہے وجدیؔ، تو انھوں نے فرید الدین عطار کی فارسی مثنوی 'منطق الطیر' کا آزاد ترجمہ 'پنچھی باچھا' کے عنوان سے کیا تھا۔ اس مثنوی میں وجدیؔ نے اصحاب کبار کی مدح میں جو اشعار کہے ہیں، وہ شاعر کی عقیدت مندانہ طبیعت کی شہادت دیتے ہیں۔ وجدیؔ نے حضرت ابوبکرؓ کے صدق وصفا، حضرت عمرؓ کے عدل و وفا، حضرت عثمان کی شرم وحیا اور حضرت علی کی جود وسخا جیسے اوصاف حمیدہ کی ترجمانی وارفتہ دلی سے کی ہے۔

ولیؔ دکنی کے قیام دہلی کے زمانے میں ان کا کلام دلّی والوں کو پسند آنے لگا تھا۔ فائزؔ، آبروؔ، بیدلؔ، حاتمؔ وغیرہ نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی منہ لگایا اور پھر وہ منہ کی لگی ایسی چڑھی کہ چھڑائے نہ چھٹی۔ چنانچہ جعفر زٹلی کو جب اس کا چسکا لگا تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پورا دیوان اسی منہ لگی زبان میں لکھ ڈالا۔ جعفر زٹلی کے معاصر شیخ محمد افضل لاہوری کے اردو کلام میں ہمیں منقبتی اشعار مل جاتے ہیں۔ حضرت عبدالقادرؒ کی بارگاہ میں وہ دست دعا یوں بلند کرتے ہیں:

اے شاہِ شاہاں پیرمن، لینی خبر نا مرد کی | کرنا توجہ از کرم پاؤں خلاصی درد کی

تجھ بن نہ کوئی ہے مرا اے شاہِ شاہاں دستگیر کر کر نظر اک مہر کی فریاد سن دم سرد کی
تم شہ غریب نواز ہو، بر سروراں سر تاج ہو بنتی سنو اے بادشاہ افضلؔ مسافر مرد کی

(بحوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ''تاریخ ادب اردو'' جلد اول ص: ۷۶۴)

فائزؔ کے یہاں بھی اشعار میں منقبتی عناصر مل جاتے ہیں۔ ان کے یہاں مدح کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے، لیکن اپنے ایک خطبے میں وہ کہتے ہیں کہ 'آئمہ ہُدا کی مدح کرنا چاہیے کہ موجبِ ثواب اور کارِ خیر ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق لکھی گئی منقبت میں شاعر کا خلوص اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلام میں عربی فارسی کی اصطلاحیں، احادیث کا برجستہ استعمال شعر کے معنوی حسن کو بوجھل کر دیتا ہے:

شاہِ ولایت اسد اللہ علیؓ اس سے ہے اسلام سراسر جلی
لحمک لحمی ہے اسی شان میں درستی اس کی نبیؐ کی جان میں
علم اسے علمِ نبیؐ کا تمام بابِ مدینہ کہا خیر الانام
جس نے پیا نبیؐ کے منہ کا لعاب علم کا وہ کیوں نہ ہوے جگ میں باب

فائزؔ نے اپنی منقبت میں اولادِ علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی بھی تعریف و توصیف نہایت خلوص کے ساتھ کی ہے:

باغِ نبوت کے دو ریحانتین اس کے دو فرزند حسن و حسین
شبّر و شبّیر نبیؐ کے عزیز جن سے کیا اہل حسد نے ستیز
حضرت زہرا ہی تھی بضع رسولؐ اس کے منافق ہیں سبی دیو و غول

(فائزؔ [مرتبہ سیّد مسعود حسن رضوی] ''دیوانِ فائزؔ'' دہلی ۱۹۶۵ء ص: ۱۰۵ اور ۲۲۷)

شاہ سراج الدین سراجؔ

ولیؔ اور فائزؔ کے معاصرین میں سب سے مشہور نام سراجؔ اورنگ آبادی کا مانا جاتا ہے۔ دکن میں ولیؔ کے بعد ان ہی کا طوطی بولتا تھا۔ اردو کے صوفی شعرا میں ان کی اپنی علاحدہ شناخت ہے۔ درویش صفت ہونے کے باوصف وہ سماجی سروکاروں سے بیزار نہیں تھے۔ وہ صوفی شاعر تھے، لیکن تصوف کے ادق مسائل سے انھوں نے گریز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ذہن کو تھکا دینے والی متصوفانہ خیال آرائی ان کی شاعری کا جزو نہیں بن سکی۔ سراجؔ ولیؔ کے جانشین ہیں، اور دکنی ادبی تہذیب کے سلاسل کی آخری کڑیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہ اس دور کے پروردہ ہیں، جب شمال کے سیاسی غلبہ کی وجہ سے دکنی تمدن گہنا تا جا رہا تھا۔ ایسے نازک زمانے میں اس دکنی فقیر کی نوا درویشوں اور فقیروں کی پرسوز آواز کے ساتھ شمال میں پہنچی۔ وہاں کے لوگ سراجؔ سے اگرچہ بے خبر تھے، لیکن ان کے کلام سے آشنائی اس قدر تھی کہ سراج

کی زمینوں میں شاعری کی جانے لگی تھی، ان کی لفظیات کو اپنایا جا رہا تھا، ان کے اشعار پر تضمینیں لکھی جا رہی تھیں۔ غرض یہ کہ دکن میں جب اردو شعر و ادب کا گلستاں مہک رہا تھا، شمال میں اردو گلستاں سنوارنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گولکنڈہ (حیدرآباد) بیجاپور، ویلور اور اونگ آباد سترھویں صدی کی ابتدا ہی سے ادبی مرکز بن گئے تھے اور انھیں خسروانہ سرپرستی حاصل تھی۔ دوسری جانب خانقاہوں کے نظام میں درویشوں اور صوفیوں کے فقر و حال والی کیفیتوں کو بیان کرنے والی متصوفانہ شاعری پروان چڑھ رہی تھی۔ اس زمانے میں اورنگ آباد دوسرے ادبی مراکز کے بالمقابل خالصتاً صوفیانہ ماحول لیے ہوئے تھا۔ یہاں خانقاہوں میں رشد و ہدایت اور فلاح و اصلاح کی کوششیں ہوتیں اور سالکین کی تربیت کے لیے عربی فارسی سے زیادہ اردو زبان و شعر و ادب کو ترجیح دی جاتی ایسے پاکیزہ ماحول میں سراجؔ نے آنکھیں کھولی تھیں۔

سراجؔ کا اصل نام سیّد شاہ سراج الدین تھا۔ ان کے آبا و اجداد ساداتِ کاظمیہ سے تھے اور مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے دہلی سے قریب جانسٹھ نامی ایک قصبہ میں رہنے لگے تھے۔ سراجؔ کے والد سیّد درویش روزگار کی تلاش میں دکن کی سمت چلے گئے اور اورنگ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ان کے گھر سراج پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے خود 'ظہورِ احد' سے سراج کی تاریخِ پیدائش مستخرج کی تھی، جس سے ۱۱۲۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ جب سراج ۱۳ برس کے سن کو پہنچے تو سلطانِ عشق کا ان پر غلبہ ہوا اور وہ اس حالت میں جنگل میں نکل جاتے یا حضرت برہان الدین غریب کی درگاہ میں پڑے رہتے۔ دیوانگی کے عالم میں ان کی زبان سے بے اختیار فارسی اشعار نکل جاتے۔ انھوں نے خلدآباد کے مشہور صوفی سیّد شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور مرشد کے حکم سے شاعری ترک کر دی تھی، پھر بھی سراج کا دیوان کافی ضخیم ہے۔ اس میں مثنوی، غزلیں، رباعیات اور دیگر اصناف میں مناجات، نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مناقب مل جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے مرتبہ کلیاتِ سراج میں کوئی منقبت درج نہیں، صرف مناجات کے ذیل میں حضرت علی سے استعانت طلب کی گئی ہے، لیکن زور مرحوم نے 'تذکرۂ مخطوطاتِ اردو' کی جلد سوم اور پنجم میں سراجؔ کی 'صفت چہار یار' اور میر عباس علی کی بیاض سے 'منقبت علیؓ' کا تعارف کرایا ہے۔ حضرت علیؓ پر سراج کی یہ دونوں منقبتیں مناجاتی لب و لہجہ لیے ہوئے ہے:

ہوں سخت بے کسی میں گرفتار یا علیؓ — تیرے بغیر کون ہے اب یار یا علیؓ
بیتاب ہو اگر نہ کہے حال دل سراجؔ — یہ درد کس سیں جا کرے اظہار یا علیؓ

(بیاض میر عباس علی)

اور کلیات سراج میں مناجات کے ذیل میں درج بالا بحر ہی میں یہ اشعار قلم بند ہوئے ہیں۔ یہاں البتہ قافیہ بدلا ہوا ہے:

رتبہ دیا ہے تم کوں جو سبحان یا علیؓ ۔۔۔ دیکھے نبیؐ نے عرش پہ او شان یا علیؓ
حق کی تو کائنات کا سلطان یا علیؓ ۔۔۔ تمنا پہ ملک دل کا ہے قربان یا علیؓ
تعریف تیری کیا کرے انسان یا علیؓ ۔۔۔ جبریل تیرا بھات تو جمان یا علیؓ

(تذکرۂ اردو مخطوطات جلد پنجم، ص: ۱۱۲)

آلِ رسول کی محبت میں سراجؔ نے جو پایا ہے، اس کا بیان وہ یوں کرتے ہیں:

پایا ہوں پنجتن کی محبت میں پنج گنج
قربان ہو سراج محمد کی آل پر

اصحابِ کبار کی توصیف وہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

تھے اول ابابکر صدیق یار ۔۔۔ رفیق و وفا کیش تھے غم گسار
عجب گلشنِ صدق کے پھول تھے صداقت ۔۔۔ میں سب جگ کے مقبول تھے
دوجے تھے عمرؓ صاحب عدل و داد ۔۔۔ کہ احمد سیں رکھتے تھے لئی اتحاد
تجے دوست حضرتؐ کے عثمان تھے ۔۔۔ کہ وہ جامعِ جملہ قرآن تھے
تھے چوتھے علیؓ صاحب ذوالفقار ۔۔۔ گلِ باغ دیں شاہ دلدل سوار

حضرت فاطمہ کی تعریف وتوصیف میں سراجؔ کے یہاں عقیدت کا زور دکھائی دیتا ہے:

پچھے دخترِ احمدِ پاک ذات ۔۔۔ کروں کیا میں اس ذات کی کچھ صفات
تھی عصمت کے گلزار کی نونہال ۔۔۔ حیا کے چمن کی کلی بے مثال
وہ ہیں قرۃ العینِ رسولؐ ہیں ۔۔۔ برحق وہ خاتونِ جنت بتول

(سراجؔ [مرتبہ] عبدالقادر سروری 'کلیات سراج' ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۲ء، ص: ۱۳۱، ۲۶۴، ۵۷۹)

سراجؔ کی اس منقبتی شاعری میں جو مناجاتی رنگ جھلکتا ہے وہ ''اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن'' کی گویا نفی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ استعانت کے لیے بجائے اللہ کو پکارنے کے حضرت علیؓ سے مانگنا شرعی اعتبار سے درست نہیں۔ ہوسکتا ہے سلطانِ عشق کا غلبہ اس کی اجازت دیتا ہو۔

معاصرین سراجؔ میں داؤدؔ کی شخصیت سراج کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے، مگر داؤد میں انانیت زیادہ تھی، جبکہ سراج کی شخصیت سادگی سے پُر تھی۔ پھر بھی سراجؔ کو جو وقار اور شہرت حاصل تھی، وہ داؔؤد کو اورنگ آباد میں نصیب نہ ہوسکی۔ ان میں تعلّی کا اس قدر غلبہ تھا کہ اپنے اشعار کی وہ خود تعریف کرتے تھے

اور سوائے سراجؔ کے کسی کو اپنا مدّمقابل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۷۵۵ء میں ہوا۔ داؤد کو حضرت علیؓ سے خاص عقیدت تھی۔ ان کے کلام میں حضرت علیؓ کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ گویا حبِّ علی کے نور سے انھوں نے اپنے قلب کو منور کر لیا ہے، اس لیے انھیں تاریکیِ عصیاں کا خوف نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

مجھ کو اے داؤد کیا تاریکیِ عصیاں سوں خوف — حب حیدرؓ دل میں میرے شمع نورانی ہوا
ہے میرے دست دل میں دم کی سمرن — علی کا اسم ہے اوراد میرے من کا
اسے ہے باد مخالف سوں ناخدا کیا خوف — علیؓ کے عشق میں جو دل کے تئیں جہاز کیا
آزاد ہے وو روز جزا کے عذاب سوں — داؤ د جو غلام علی مرتضیٰ ہوا
کیا ہے اے داؤدؔ اوسے روز جزا سوں زیاں — حب علی جس کے تئیں مایۂ ایماں ہوا

داؤد کی غزلوں میں بھی منقبتی عنصر موجود ہے:

جب میسّر سجن کا دید ہوا — مجہ کوں وو روز روزِ عید ہوا
اسمِ خیبر کشا علی ولی — قفل دل کا مرے کلید ہوا
کاش ہم بحرِ خوں میں ہوتے غرق — جب حسین علی شھید ہوا

(داؤدؔ [مرتبہ، خالدہ بیگم] 'دیوانِ داؤد'، حیدر آبا ۱۹۵۸ء، ص: ۱۲، ۱۶، ۱۹، ۲۱، ۲۲)

سراجؔ اور داؤدؔ کی منقبتوں کا تقابل کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ داؤد کے یہاں پایا جانے والا یقینِ کامل سراجؔ کے یہاں مفقود ہے، لیکن امید کی روشنی ان کی منقبتی شاعری میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

اب رہے عشقؔ اورنگ آبادی تو یہ بھی اپنے اشعار میں اکثر و بیشتر منقبتی افکار کو جگہ دیتے ہیں:

عشق ہے بال سے باریک صراط محشر — یا علی کہہ کے تبھی اس پہ سنبھل جاؤں گا
شاہنشہِ بحق کے اعجاز یاد سیتے — درِ نجف ہوا ہے دل کا میرے نگینا

(عشق اورنگ آبادی: 'دیوان عشق' حیدر آباد، تاریخ ندارد، ص: ۲۳-۲۲)

اسی عہد کے ایک ارکاٹی شاعر شاہ غوثی کی 'قصص الانبیا' خالصتاً منقبتی تصنیف ہے۔ اس کے پہلے باب میں حضرت آدمؑ، ابراھیمؑ، اسمٰعیلؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ایوبؑ وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں ذوالقرنین، فرعون و موسیٰ، حضرت خضر، یوشع، اشموئیل، داؤد وسلیمان، حضرت ذکریا اور حضرت یحییٰ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ غوثی کی اس تصنیف میں اگرچہ شعری محاسن کا فقدان ہے، لیکن عقیدت کی فراوانی ہے۔ شاعر نے محض اجر و ثواب کی خاطر بعض کمزور روایات بھی بیان کر دی ہیں، جو صوفیہ کرام کے یہاں مروج ہیں۔ جیسے ابوشحمہ کا واقعہ وغیرہ۔ اس قصے کو امینؔ اور اولیاؔ نے بھی نقل کیا ہے۔

ظہور الدین حاتمؔ

ولیؔ کی دلّی میں آمد کے بعد شمالی ہند کی اردو شاعری کا نہ صرف مزاج بدلا، بلکہ لہجہ بھی بدل گیا ورنہ یہاں تو ایہام گوئی کا بول بالا تھا۔ پیچیدہ خیالی کے ذریعہ معنی میں الجھاؤ پیدا کرنے کی ایک ہوڑ سی لگی تھی۔ اگر چہ مقامی طور پر شمالی ہند میں مرزا مظہر جانِ جاناں نے اردو شاعری سے ایہام گوئی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ولیؔ کی آمد کے بعد شمالی ہند سے ایہام گوئی دھیرے دھیرے ختم ہوتی چلی گئی، اور شعرا نے صنعتوں کے گورکھ دھندے سے چھٹکارا پایا۔ شمالی ہند کے ایہام گوشعرا میں حاتمؔ کا بھی شمار ہوتا ہے، مگر انھوں نے تصنع اور خیال آرائی سے شاعری میں اجتناب کیا۔ وہ شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوانِ شاعر ہیں۔ ان کے دیوان میں اکثر کلام طرحی ہے، یا معاصر شعرا کی زمین میں کہا گیا ہے۔ اس لیے بیک نظر ان کے کلام سے ان کا انفرادی اسلوب اور لے وآہنگ تلاش کرنا اور اپنی انفرادی شناخت ذرا مشکل دکھائی دیتی ہے۔ دراصل یہ ان کی سادہ لوحی اور نام ونمود سے بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ ان کا ضخیم دیوان جس میں غزلیں، رباعیات، قصائد وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ حاتمؔ نے ان پر بالکل بھی توجہ نہیں دی اور آخر عمر میں ایک چھوٹا سا دیوان 'دیوان زادہ' کے عنوان سے شائع کروادیا۔

حاتمؔ کا اصل نام شیخ ظہور الدین تھا۔ 'ظہور' ان کا تاریخی نام ہے، جس سے ۱۱۱۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۱۹۷ھ میں جہان آباد میں سپردِ خاک ہوئے۔ ان کے والد شیخ فتح الدین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سپاہی پیشہ تھے۔ اس زمانے میں صاحب سیف وقلم ہونے کو معزز ومحترم سمجھا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے حاتمؔ نے اس پیشے کو اپنا لیا تھا۔ وہ خود کہتے ہیں:

اے قدر داں کمالِ حاتم
دیکھ عاشق و شاعر و سپاہی ہے

حاتمؔ فارسی میں صائبؔ کی پیروی کرتے رہے اور اردو میں ولیؔ کو اپنا معنوی استاد تسلیم کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے معاصرین کی غزلوں پر غزلیں کہیں، لیکن ولیؔ کی غزل پر غزل کہنے کو ان کی گستاخی سمجھتے تھے۔ نواب کے حکم پر انھوں ولی کی غزل پر غزل لکھی تو یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ:

اے ولی مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے
یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

حاتم کا 'دیوان زادہ' اگر چہ منتخب کلام ہے، لیکن ان کے استادِ فن ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کے شاگردوں کی فہرست میں اردو کے قدآور شعرا کے نام ہیں۔ جیسے سوداؔ، رنگینؔ، سعادت یار خاں، تاباںؔ، لالہ مکند رائے فارغؔ وغیرہ۔ حکیم قدرت اللہ قاسم نے دیوان حاتم کے مقدمہ میں ان کے

پینتالیس شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر بھی میرؔ اپنے تذکرے 'نکات الشعرا' میں از راہِ بغض و عناد انھیں 'مرد جاہل و متکمن' کہتے تھے۔ لیکن حاتمؔ کی شرافت نفسی، کہ انھوں نے کبھی شکایت نہیں کی۔ حاتمؔ نے مجردانہ زندگی گزاری۔ جوانی میں انھوں نے سپہ گری اختیار کی تھی۔ بعدہ وہ نوابوں کے مصاحب بنے پھرتے رہے۔ پھر عمدۃ الملک نواب امیر خاں کے باورچی خانے/مطبخ کے داروغہ بنے۔ قائمؔ چاند پوری نے 'مخزنِ نکات' میں اس امر کی توثیق کی ہے۔ لیکن بڑھتی عمر میں یہ ذمہ داری نبھانا دُوبھر ہو گیا تو انھوں نے نواب کی خدمت میں منظوم استعفیٰ پیش کر دیا:

ہوا ہوں جب سے داروغہ ترے باورچی خانے کا
اگر شکوہ کروں اس کا تو یہ کفران نعمت ہے
ولے قیدی کیا ہے بسکہ رات اور دن کی محنت نے
ہے مطبخ کانِ نعمت پر مجھے زندانِ نعمت ہے
یہی ہے عرض خدمت میں تری حاتم بکاول کی
کہ یہ خدمت اسے دے جو کوئی خواہانِ نعمت ہے

اب حاتمؔ دنیاوی عیش و عشرت سے بیزار سے ہو گئے تھے اور فقر و فاقہ اور صبر و رضا کو ترجیح دینے لگے تھے۔ بالآخر انھوں نے اپنی مرشد میر بادل علی شاہ سے بیعت کر لی اور قلندرانہ زندگی گزارنے لگے:

خودی کو چھوڑ آ حاتمؔ خدا دیکھ ۔۔۔ کہ تیرا رہنما ہے شاہ بادل
جنابِ حضرتِ حق سے نہ ہو کیوں فیض حاتم کو ۔۔۔ ہوا ہے تربیت وہ بادلِ عادل کی صحبت میں

بادل علی شاہ کی رحلت کے بعد حاتمؔ نے شاہ تسلیم کے حلقۂ ارادت کو قبول کر لیا اور ان ہی کے تکیہ پر کم و بیش پچاس سال تک شعر و ادب کی مجالس میں شریک رہے اور رشد و ہدایت بھی کرتے رہے۔ اپنے دوسرے مرشد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے حاتمؔ کہتے ہیں:

اب ہندوستاں کے درویشوں میں حاتمؔ ہے
تسلیم و رضا میں شاہ تسلیم

غرض یہ کہ حاتمؔ نے علم دین تکیوں اور خانقاہوں کے سایے میں حاصل کیا تھا۔ مدارس کی چوکھٹ پر جبہ سائی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرشد سے عقیدت کا دریا ان کے اشعار میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مخمس در وصف مرشداں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یا امامِ جہان و مہترِ دیں ۔۔۔ زیر تیرے قدم کے خلدِ بریں
ماہ و خورشید و آسمان و زمیں ۔۔۔ سب کہیں ہیں یہی بصدق و یقیں
یا محمدؐ امیں کمی نا غمیں

شک نہیں آلِ مصطفیٰ ہو تم خاص فرزندِ مرتضیٰ ہو تم
حق سیں کب یک دم جدا ہو تم میری کشتی کے نا خدا ہو تم
یا محمدؐ امیں کی نا غمیں

تم محمدؐ کے ہو چرن بردار میں چرن پر ترے ہوا ہوں نثار
کیوں نہ پاؤں جہاں میں عز وقار کہ میرے تم ہو وارث و سردار
یا محمدؐ امیں کی نہ غمیں

حاتمؔ اب تک تھا ناقص و جاہل تم کو پایا ہے مرشدِ کامل
تجھ غلامی میں حق کیا حاصل یا سخی شاہ بادل باذل

(شاہ حاتم [مرتبہ: پروفیسر عبدالحق] ’دیوان حاتم‘ دہلی ۲۰۰۸ء، ص: ۲۴۴-۴۵)

اپنے مرشد کے تئیں حاتمؔ کی اس منقبت میں روایتی انداز سے ہٹ کر کچھ نیا پن ضرور ہے۔ اس میں شاعر کو اہل بیت، بارہ اماموں اور چودہ معصومین کے اوصاف اپنے مرشد میں نظر آئے ہیں اور ان ہی اوصاف کی بدولت حاتمؔ کے مرشد کو وہ بلند مقام حاصل ہوا۔

’’عشق ہے‘‘ ردیف والے اشعار میں حاتمؔ نے اللہ، نبیؐ، اہلِ بیت اور اولیائے کرام سے عشق کے جذبے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ منقبت کا یہ انداز بھی نیا ہے۔ صوفی صافی کے دل میں پیدا ہونے والی عشقیہ کیفیات کا اظہار منقبت کے ان اشعار میں کیا گیا ہے۔ شاعر نے محبت/عشق کے اس جذبے کا تعلق خدا اور خدا کے برگزیدہ بندوں سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ عشق کی پذیرائی کو وہ یوں بیان کرتا ہے:

سب ستی اول خدا کوں عشق ہے بعد اس کے مصطفیٰ کوں عشق ہے
شیرِ حق دامادِ ختم الانبیا دیں کے والی مرتضیٰ کوں عشق ہے
سیّدِ عالی نسب یعنی حسنؓ اور حسینِ مجتبا کوں عشق ہے
عابدین و باقر و جعفر کے تئیں موسیٰ و موسیٰ رضا کوں عشق ہے
ہم تقی و ہم نقی و عسکری مہدیِ راہ نما کوں عشق ہے

(شاہ حاتم [مرتبہ: پروفیسر عبدالحق] ’’دیوان حاتم‘‘ دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۱۱)

حاتمؔ کے دیوان میں ایک مسدس ایسا بھی ہے جس میں حمد و نعت و منقبت تینوں اصناف شامل ہیں۔ خدا کی بڑائی سے لے کر نعت رسول ﷺ اور مدح اہل بیت کے ساتھ پیر کی بزرگی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ تلقین کی طرز میں لکھے گئے دو تین بند ملاحظہ ہوں:

بادشاہِ جہاں خدا کوں جان جس نے پیدا کیا زمین و زمان
اس کی قدرت کو دیکھ کر پہچان کہ وہی ہے تری پناہ و امان
اس ستی یار ہو خدا کی قسم
سب سوں بیزار ہو خدا کی قسم

سرورِ اولیا ء محمدؐ ہے مقصدِ انبیاء محمدؐ ہے
رہ بر و رہنما محمدؐ ہے شاہِ روزِ جزا محمدؐ ہے
اس پہ ہوں گا فدا خدا کی قسم
دل سوں ہوں مبتلا خدا کی قسم

صاحبِ ذو الفقار ہے حیدر شاہِ دلدل سوار ہے حیدرؓ
مظہرِ آشکار ہے حیدرؓ بیچ مشکل کے یار ہے حیدرؓ
وو مرا جان ہے خدا کی قسم
سب کا ایمان ہے خدا کی قسم

(ایضاً:ص:۵۴-۲۵۲)

اس طرح اس مسدس میں حمد ونعت ومنقبت سبھی شامل ہو گئے ہیں۔

حاتمؔ کی منقبتی شاعری اور اس کے تلقینی انداز سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں نہایت خلیق مرد درویش تھے۔ انھوں نے اپنی قلم اور زبان سے ہجو گوئی کو روکنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ اور شاعری کی فرسودگی کو مٹایا۔ خوب چند ذکاؔ نے شاید اسی لیے لکھا ہے کہ ’’عجیب خلیق واہل محبت وصاحب دل سراپا شفقت بود کہ در ایں ایام ہمچو او مروی بزرگ و زیرک متصف باقسام کرم وخوبی بہم رسیّدن اشکال است‘‘

محمد رفیع سوداؔ

سوداؔ اپنے عہد کے دوسرے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے والد محمد شفیع دہلی کے مشہور سوداگر تھے۔ یہیں ۱۷۱۲ء میں سوداؔ پیدا ہوئے۔ باپ کے پیشے سے انھیں فطری لگاؤ نہیں تھا، اس لیے بڑے ہو کر فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن وہ پیشہ بھی انھیں راس نہ آیا، بالآخر انھوں نے مصاحبت کو چن لیا۔ مزاج میں شگفتگی تھی، اس لیے یہ پیشہ انھیں راس آ گیا۔ سوداؔ دہلی کے مختلف امرا کے درباروں سے جڑے رہے۔ اولاً انھوں نے ایک خواجہ سرا بسنت علی خاں کی مصاحبت کی پھر سیف الدولہ احمد علی خاں

کے مصاحب ہوئے۔ بعدہ وہ نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے ملازم بنے۔ جب دہلی کے حالات دیگر گوں ہوئے تو فرخ آباد کے نواب مہرباں خان رندؔ نے سوداؔ کو عماد الملک سے مانگ لیا۔ پھر ایک عرصے کے بعد سوداؔ نے فیض آباد کے شجاع الدولہ کے دربار میں ملازمت کر لی۔ آصف الدولہ نے جب فیض آباد کی بجائے لکھنؤ کو دارالحکومت بنالیا تو سوداؔ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۱۷۸۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میر و سودا کے زمانے پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت برصغیر کی تمام مسلم حکومتوں میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ یہاں ہندوستان میں نادر شاہ کے حملوں ۱۷۳۸ء کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی جارہی تھی، بلکہ پے در پے مغلیہ سلطنت کو شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس پر طرفہ یہ کہ فرانسیسی/فرینچ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیاں دن بہ دن بڑھنے لگی تھیں۔ دشمنوں کو مسلم مکاروں کی وجہ سے تقویت مل رہی تھی۔ بکسر کی جنگ ۱۷۶۴ء اور ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء نے انگریزوں کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی انحطاط اور زوال کے ایسے ماحول اور حالات میں علماء دین و صوفیائے مبین نے مسلم قوم کی ڈوبتی نیّا کو بچانے کے لیے تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی مساعی جمیلہ سے مایوسی آس میں بدلی اور قوم کے دلوں میں امید کی کرن جاگی۔ عبد الحق محدثؒ (م ۱۶۴۲ء) کی وفات کے کم و بیش نصف صدی بعد شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۲ء) نے اسی زمانے میں مجدد الف ثانی اور ان کے رفقا کے دینی اور اصلاحی کام کو آگے بڑھانے کی وجہ سے مسلم معاشرے کی یاسیت میں کمی آئی۔ خوف و ہراس کے ماحول میں سکون قلب کے لیے قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ خانوادوں کی تعلیمات کو ان لوگوں نے عام کیا۔ نیز عوام الناس میں قرآن فہمی کا شوق پیدا کرنے کی خاطر فارسی اور اردو میں اس کے تراجم کروائے۔ انھوں نے 'ازالۃ الخفاعن الخلفا' جیسی کتاب لکھ کر مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ غرض یہ کہ ہمت شکن حالات میں مسلم معاشرے کی جرأت بڑھانے کے لیے اس قسم کی تدابیر اختیار کی جانے لگی تھیں۔ شعرا نے ہمارے اسلاف کے کارہائے نمایاں کو اپنے اشعار کے ذریعہ عوام میں متعارف کرایا، جو مناقب و مراثی کی شکل میں اردو ادب کا حصہ بنے۔ یہی زمانہ ہے جب ان دونوں اصناف کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ میرؔ، سوداؔ، میر دردؔ، سوزؔ، اثرؔ وغیرہ اس دور کے ایسے شعرا ہیں، جن کے کلام میں مناقب کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

شمالی ہند کے متقدمین شعرا میں سوداؔ اپنی قصیدہ نگاری کے لیے معروف تھے۔ مدح و قدح ان کے قصائد کے دو رخ ہیں۔ انھوں نے جہاں بادشاہوں اور نوابوں کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ہیں، وہاں ان سے ناراضگی پر ہجویں بھی لکھی ہیں۔ تن پروری کے لیے جہاں ان باتوں کو معمول بنایا گیا تھا، وہاں سوداؔ نے روح کو مجلّٰی کرنے کے لیے تقدیسی شاعری کو بھی پروان چڑھایا۔ چنانچہ بادشاہ وقت

کی مدح وستائش کرنے والے دربار شاہی سے خلعت یافتہ فائز المرام شاعر سوداؔ، آستانۂ آئمہ و بزرگان دین پر دست کشکولِ عقیدت پھیلائے، سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔ حضرت علی کی چاکری انھیں مصاحبتِ شاہی سے زیادہ عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدت کی روشنی ان کے یہاں قصائد سے زیادہ مناقب میں نظر آتی ہے۔ منقبت نگاری میں سوداؔ کے غلوئے عقیدت پر نقد نظر ڈالتے ہوئے شیخ چاند رقم طراز ہیں:

”وہ اپنے عقیدے میں اس قدر راسخ اور پختہ تھا کہ اس سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ (وہ) مذہبی جوش میں اکثر نقطۂ اعتدال سے ہٹ جاتا تھا اور حد تمکین سے تجاوز کر جاتا تھا۔ اس کا مذہبی جوش وخروش تعصب کی حد تک پہنچتا ہے۔“ (شیخ چاند: 'سوداؔ' اورنگ آباد، ص: ۱۰۳)

منقبتی قصائد میں سوداؔ کے یہاں ایک نئی چیز یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ انھوں نے نعت ومنقبت علیؓ ایک جگہ جمع کر دی ہے۔ گویا دونوں ممدوحین کا موازنہ ومقابلہ کیا جا رہا ہو۔ حبِّ علیؓ میں شدت نے ان کے یہاں رسول وصحابی کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ حب علی کے زعم میں سوداؔ نے شاہ ولی اللہ اور مولوی ساجد شاہ آبادی جیسے معتبر و نامور سنی المسلک علما کی توہین میں ہجویں لکھیں۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے جھوٹے پیر و مرشد پر بھی اپنی ہجویہ شاعری میں طعن وتشنیع کی ہے۔ یہ مذہبی جوش ان کے یہاں جنون کی حد تک تھا کیونکہ مادری اور پدری دونوں جانب سے اہل تشیع میں سے تھے اور امامیہ مسلک کے پیروکار تھے۔ حب اہل بیت میں شدت کا وہ برملا اظہار کرتے ہیں:

پنج تن پاک کا تو اپنے تئیں کہیو غلام
تیرے مذہب کی اگر بزم میں تکرار چلے

جس قصیدے میں سوداؔ نے نعت ومنقبت کو یکجا کر دیا ہے، اس کی تشبیب مثالی ہے۔ اس میں دو کے عدد سے جڑنے والے اکثر مظاہر فطرت کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ گویا ممدوحین کے اوصاف کی تمثیل بن جاتے ہیں۔ جیسے:

چہرۂ مہر وش ہے ایک، سنبل و مشک فام دو
حسنِ بتاں کے دور میں، ہے سحر ایک، شام دو

اس قصیدے میں تشبیب کے بعد گریز کا شعر بھی بڑا معنی خیز ہے اور بالراست مدح کا باب کھولتا ہے:

مطلع نعت و منقبت کہہ تو چکا ہے میرے دوست
بس مجھے آگے مانگ لے، کر کے تو اب کلام دو

اب اصل مدح یوں شروع کرتے ہیں:

مثلِ زبانِ خامہ ہیں، گر نبیؐ و امام دو — معنی تو ان میں ایک ہیں، گو کہ ہوئے یہ نام دو

ہونے نہ دے غروب ایک بہر نماز مہر کو — ایک کرے اشارے سے قرصِ مہِ تمام دو
سجدہ کرے ہیں مہر و مہ در پہ انھوں کے روز و شب — مبرہن اس سے یوں ہوا، داغی ہیں یہ غلام دو
وصفِ براق و دُلدُل اب، کہہ تو کروں میں کیا بیاں — شرق سے راہ تا بہ غرب، جن کے تئیں ہیں گام دو

(سوداؔ [مرتبہ رشید حسن خاں] ''انتخاب سودا''، معیاری ادب ۲۷ مکتبہ جامعہ دہلی ص: ۵۱ اور ۵۳)

ایک اور قصیدے میں موازنہ کا یہی انداز ملاحظہ ہو:

ہے علمِ الٰہی سے وہ امی لقب آ گہہ — واں عقلِ کل اور طفلِ دبستاں ہے برابر
دونوں کا نہیں امر، کم از امرِ الٰہی — دونوں کی حدیث، آیۂ قرآں ہے برابر
ہے وزن مساوی انھوں میں حلم خدا کا — خالق کے وہ دو پلۂ میزاں ہے برابر
سوداؔ! بہ دوئی بول مت آگے، کہ نبیؐ سے — اس مرتبہ وہ اشرف الانساں ہے برابر

(ایضاً ص: ۵۵)

سوداؔ نے خالصتاً حضرت علیؓ کی منقبت میں بھی قصیدے کہے ہیں:

بغیر ناخنِ شیر خدا، جہاں میں کوئی — کسی کے کام سے کھولے نہ زنہار گرہ
ثبات ِ چرخ یہ اس کی نہیب کے آگے — کہ جوں دھویں کی نہیں رکھتی اعتبار گرہ

(ایضاً ص: ۵۸)

ایک منقبتی قصیدے میں سوداؔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اوصاف و عظمت کاملہ کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

اب کہیں عالم میں اے سوداؔ نظر آتا نہیں — جز پناہ اس آستاں کے موضع امن و اماں
جس کا پائے قدر ایسا ہے کہ دیکھے ہیں جسے — تھام کر دستار اپنی، عرش کے باشندگاں
کعبے کو بت خانے سے ہر گز نہ کرتا کوئی فرق — گر نہ ہوتا اس کا واں پائے تولد درمیاں
پس ید اللہ بے شک و لا ریب بازوے نبیؐ — قوتِ ہر یک ضعیف و طاقتِ ہر ناتواں
ہے کڑوڑوں کوس شعر و شاعری سے اس کی مدح — دیکھیو، کرتا ہو یاں زورِ طبیعت امتحاں

(ایضاً ص: ۶۳، ۶۴، ۶۹)

سوداؔ نے 'چاروں ایک' کی زمین میں جو منقبت لکھی ہے، وہ ان کے تبحرِ علمی کا نادر نمونہ اور حسنِ شاعری کا بیش بہا خزینہ ہے۔ یہ استادانہ کلام جہاں شاعر کے علمی ذوق اور فنی مہارت کی نمائندگی کرتا ہے، وہاں اس کی عقیدت اور مذہبی فکر کی غمازی بھی کرتا ہے۔ حضرت علیؓ کو موجبِ خلق کائنات بتاتے ہوئے سوداؔ کہتے ہیں:

شاہِ مرداں! تیری خلقت جو نہ ہوتی منظور ہوتے عنصر نہ کبھی مل کے بہم چاروں ایک
آفت و قہر و بلا و غضب،آفاق کے بیچ ہو کے پوجے ہیں،تری تیغ کا دم، چاروں ایک

(ایضاً ص:۵۷)

انھوں نے اثناعشری عقائد کے تحت بارہ اماموں کی مدح میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ ان میں امام موسیٰ رضا، امام حسن عسکری، امام زین العابدین،سیّدہ فاطمۃ الزہرہ، امام جعفر صادق، امام باقر اور امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ اہم ہیں۔ سودؔا کی ہر منقبت ان کی عقیدت اور اکرام و احترام کی عکاسی کرتی ہے۔اس میدان میں اپنا زورِ طبع دکھانے میں اعتقاد کی رہنمائی انھیں حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مناقب آئمہ دین،قصائد شاہی سے زیادہ پر اثر، دلکش اور پرلطف ہوتے ہیں۔

سودؔا کے بعد میر اثرؔ کے یہاں منقبتی شاعری کے لیے مستقل مضامین نہیں ملتے ،مگر اپنے والد عندلیبؔ کے 'طریقۂ محمدیہ' سے متاثّر ہوکر انھوں نے حضرات حسنینؓ سے والہانہ عقیدت کا اظہار اپنی مثنوی میں کیا ہے:

ذاتِ حسنین قرۃ العین سر تاج تمام اولیا کا
فیضِ خاصے یافت از روحِ حسن تخم آں را کشت اندر ایں چمن

(میر اثرؔ [مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی] ''دیوان اثرؔ'' دہلی ص:۱۸۷،۲۷۵)

سودؔا ہی کے معاصرین میں میر سوزؔ اور بیدارؔ کے یہاں منقبتی عناصر مل جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی صفت جود وسخا بیان کرتے ہوئے سوزؔ کہتے ہیں:

یا علیؓ پہونچا ہے تیرے در تلک یہ سوزؔ آج
پھیرنا محروم ہے اوس آستانے سے بعید

(میر سوزؔ [مرتبہ حسرت موہانی] ''دیوان سوز'' علی گڑھ ۱۹۰۵ء ص:۶)

اور چشتیہ فیوض و برکات کے متلاشی حضرت بیدارؔ آستانۂ حسنین پر سلام بھیج کر اپنے مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں:

جو بھیجے صدق سے تم پر سلام یا حسنین حصول اس کے ہوں مقصد تمام یا حسنین
رکھے ہیں وہ صدف آغوش میں در مقصود وظیفہ جن کا تمھارے ہیں نام یا حسنین

(میر محمد علی بیدارؔ [مرتبہ: جلیل احمد قدوائی] 'دیوان بیدار' الہ آباد، ۱۹۳۷ء، ص: ۵۵)

شاہ سیّد غلام حسین ایلچ پوری

متوسط ہندوستان میں برار کا علاقہ صوفیوں کی سرزمین کہلاتا ہے۔ یہاں شاہ دولھا رحمٰن غازی (م ۱۰۰۲ھ)، دادا حیات قلندر (۱۲۵۲ھ) شاہ محمد اسمٰعیل چشتیؒ اور شاہ، سیّد غلام حسین چشتی کی خانقاہیں اور مزارات ہیں۔ ان بزرگوں میں سب سے زیادہ ادبی ذخیرہ موخرالذکر کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے شجرۂ مشیخت کے تین سلاسل ہیں۔ (۱) سلسلۂ چشتیہ (۲) سلسلۂ قادریہ اور (۳) سلسلۂ نقشبندیہ۔ حضرت غلام حسین تینوں سلاسل کے بزرگوں سے بیعت تھے۔ ان کی کتابوں میں دیوان اردو، دیوان فارسی، قال حال، الہامات، جہاد الرحمٰن، رحیما اور مکتوبات شامل ہیں۔ تاریخ امجدی کے مطابق شاہ صاحب نے ۱۲۱۰ھ/ ۱۷۹۵ء میں انتقال فرمایا۔

شاہ صاحب کے اردو دیوان کی ابتدا مجموعی طور پر حمد و نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد سلسلۂ قادریہ، سلسلۂ نقشبندیہ اور پھر سلسلۂ چشتیہ کو منظوم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حصۂ غزل شروع ہوتا ہے۔ یہاں بھی حمد و نعت کے مضامین یکجا ہوگئے ہیں۔ غزلوں کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ غلام حسین ایلچ پوری خانقاہی نظام میں مشیخت کی دوکان داری کے قائل نہیں تھے، بلکہ للٰہیت و اخلاص اور استخلاص کے موید تھے۔ اس مضموں کو انھوں نے اپنی ایک غزل میں بیان کر دیا ہے:

ہے کنچن روپ دنیا کنچنی کا — تم اس پیچھے سپر وائی نہ ہونا
ہزاروں سوں مریداں مونڈ لے کر — دہن کے مونڈ چری نائی نہ ہونا
مشیخت کی بڑی دوکاں لگا کر — شہر ٹھگنے کوں حلوائی نہ ہونا

(سیّد غلام حسین چشتی [مرتبہ: ڈاکٹر سیّد عبدالرحیم] 'دیوان'، کامٹی ۱۹۹۸ء، ص: ۱۱۵)

دیوان کی ردیف 'ر' کی ابتدا ایک دعائیہ غزل سے ہوتی ہے، اس میں انھوں نے بارگاہ عبدالقادرؒ میں استعانت کی دعا کی ہے:

مشکل مری آساں کرو یا پیر یا پیران پیر
مجھ درد کوں درماں کرو یا پیر یا پیران پیر
سب حال ہے تم پر عیاں پھر پھر لے کیا بولوں بیاں
ہونا ہمن پر مہر باں یا پیر یا پیران پیر
کیوں کر پھروں میں گھر بہ گھر خواری ہے اس میں سربسر
مجھ کوں نہ کرنا در بہ در یا پیر یا پیر ان پیر

مانگیا حسین احقر دعا جو کچھ تھا اس کا مدعا
اس کوں نہ کر دل سوں جدا یا پیر یا پیر ان پیر

(ایضاً ص:۱۲۷)

اسی دعائیہ غزل کے بعد شاعر نے اپنے مرشد کامل حضرت شاہ اسمٰعیلؒ کی بارگاہ میں استعانت کے لیے دستِ سوال دراز کیے ہیں۔ ان کے غزلیہ اشعار میں شاہ اسمٰعیل کی مدح کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ شاہ حسین کا پورا دیوان متصوفانہ شاعری کا عمدہ نمونہ ہے، جن پر بھکتی تحریک کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی منقبتوں میں استمدادیہ پہلو نمایاں ہے۔ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ اسمٰعیلؒ (۱۱۶۶ھ) کی وفاتِ حسرت ناک پر شاہ حسین نے ایک مرثیہ نما غزل کہی تھی۔ ان کے دیوان میں یہ مرثیہ، ردیف 'ے' کی غزل نمبر ۹۹ ہے۔ شاعر نے منقبت کے تمام لوازمات اس غزل نما مرثیے میں یکجا کر دیئے ہیں:

شاہ اسمٰعیل مرشد حق کے واصل حق ہوئے — حق سوں حق کوں دیکھ کر پھر حق ستے مل حق ہوئے
گئے مسافر ہو کے اس دارالفنا سوں کوچ کر — آخرش دارالبقا میں کر کے منزل حق ہوئے
بوند تھے دسنے میں پن موتی تھے سب سوں بے بہا — ذات کے دریا کے بھیتر ہو کے شامل حق ہوئے
کیوں نہ رووے ہم مریداں طالباں اس درد سوں — ہادیِ برحق ہمارے پیر کامل حق ہوئے
کیوں نہ ہووے اہل دلاں کے اوپر آزار سخت — وو شفا بخشِ دوائے درد ہر دل حق ہوئے

(ایضاً ص:۱۵۹)

غزلیات کا حصہ تمام ہوتے ہی مستزاد کی صنف میں ایک نعت ہے، اس کے بعد ایک مخمس چار یار کی شان میں رقم ہوا ہے۔ اس کے ہر بند میں خلفا کی شان میں اشعار درج ہیں۔ اس مخمس میں ہر بند کا آخری شعر بار بار ہر بند میں دہرایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مخمس حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔ اس منقبت میں بھی اسمدادیہ عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔ شاعر بار بار حضرت علی سے مدد کا خواستگار ہے۔ اس کے بعد ایک مخمس میں شاہ حسین اپنے مرشد سے التجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس میں رقت و تضرع کی کیفیت شاعر کی بے بسی کی مظہر ہے۔ دیوان کا اگلا حصہ منظومات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس میں یک رنگ نامہ، قلندر نامہ، لگن نامہ، جھولنا نامہ، سکھی نامہ، اودھو نامہ اور سفر نامہ شامل ہیں۔ یہ سفر نامہ اردو کا اولین منظوم سفر نامہ ہے۔ طرفہ یہ کہ اس سفر نامے میں حضرت شاہ نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے لیے مدحیہ انداز اپنایا گیا ہے۔ ۱۸۸ اشعار کا یہ سفر نامہ ''منزل منزل'' کے عنوان سے درج ہے اور اس میں ایلچ پور سے اورنگ آباد اور خلدآباد تک کے سفر کی روداد درج ہے۔ دیوان کے آخری حصے میں سیّد عبدالقادر جیلانی، شاہ دولھا رحمٰن

غازی، خواجہ معین الدین چشتی اور دادا حیات قلندر کی شان میں مدحت طرازی ہے۔ ان مخمسات میں عبد القادر جیلانی کے لیے ۱۹ مناقب، شاہ دولھا رحمٰنؒ کی شان میں چار منقبتی قصیدے ۲۴ مخمسات اور چار مدحیہ منظومات ہیں۔ خواجہ معین الدینؒ کی مدح مخمس سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اٹھارہ مدحیہ منظومات ہیں اور آخر میں دادا حیت قلندرؒ کی شان اقدس میں ۱۳ مدحیہ منظومات درج ہیں۔ ان مناقب کا خاص وصف یہ ہے کہ ان میں عرس کے موقعہ پر ہونے والے شبگشت (براری بولی میں 'شرگت') صندل، لنگر، قوالی، محفلِ سماع کا ذکر ہوا ہے۔ شاہ حسین نے ان اولیا کرام سے منسوب شہروں، گاوؤں دیہاتوں کا ذکر ہی اپنے سفر نامۂ منظوم میں کیا ہے۔ یعنی ایلچ پور، منگرول پیر، بالاپور، دیول گھاٹ، اورنگ آباد اور خلدآباد۔ ان مقامات کے تمام اولیائے کرام کی ثناو توصیف اس منظوم سفر نامے میں ہوئی ہے۔ یہ سفر آج سے کم وبیش تین سو برس قبل کیا گیا تھا، جب آمدورفت کے ذرائع سوائے بیل گاڑی کے کچھ نہ تھے۔ یاد رہے کہ مرزا غالبؔ نے بھی کلکتہ جاتے ہوئے باندہ سے لکھنؤ تک کا سفر بیل گاڑی اور گھڑسواری کے ذریعہ کیا تھا۔ بہرکیف! شاہ حسین کا یہ مکمل دیوان متصوفانہ انداز اور خانقاہی ماحول میں لکھا گیا منقبتی دیوان ہی ہے۔

محمد باقر آگاہ

مولانا ابوالحسن قربیؔ ویلوری کے ارشد تلامذہ میں مولانا محمد باقر آگاہؔ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد خاندان نوائط سے تعلق رکھتے اور مسلکاً شافعی، قادری تھے۔ آگاہؔ کے ننھیال اور ددھیال کا وطن بیجاپور تھا، لیکن زوال بیجاپور کے بعد آگاہؔ کے والد محمد مرتضیٰ نے مستقلاً ویلور کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہیں ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء کو محمد مرتضیٰ کے گھر آگاہؔ پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا شیخ حبیب اللہ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ بعد میں آگاہ نے قربیؔ کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا، اور عربی فارسی میں استعداد حاصل کی۔ جب شیخ حبیب اللہ کا تبادلہ ترچنا پلی ہوا تو آگاہؔ بھی اپنے چچا کے ہمراہ وہاں چلے گئے، وہاں آگاہؔ دکن کے مشہور صوفی بزرگ عالم شاہ ولی اللہؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ ترچنا پلی میں دو سال قیام کے بعد آگاہؔ دوبارہ ویلور پہنچے اور اپنے مرشد شیخ قربیؔ ویلوری کی خدمت میں حاضری دی۔ استاد کی اجازت سے وہ ہر جمعہ جامع مسجد ویلور میں عربی خطبہ دیا کرتے تھے۔ اپنی اکثر مثنویوں میں آگاہؔ نے اپنے شیخ و مرشد کی ثنا وتوصیف میں منقبتی اشعار کہے ہیں۔ 'ہشت بہشت' میں حمد و نعت و منقبت حضرت غوثؒ کے بعد وہ اپنے پیر و مرشد کی یوں مدح کرتے ہیں:

خاصا قربی و شیخ زمن — عرفاں کے گھر کا پاک رتن
ہے علم و معرفت میں جعفر — ہے کرم میں معن اس کا چاکر
معرفت میں تھا او بحر بیکنار — ہر بچن اوس کا تھا در شاہ وار

مقتدا ہے وہ میرا عرفان میں آشنا مجھ کو کیا ہے گیان میں

(بحوالہ: علیم صبا نویدی، 'تاریخ ادب اردو تمل ناڈو، حصہ دوم' ۲۰۱۸ء، ص:۵۱)

اپنے مرشد کے علاوہ انھوں نے اپنے پیر دوست حضرت سیّد شاہ عبد اللطیف ذوقیؔ ویلوری کی شان میں بھی توصیفی اشعار کہے ہیں۔ جہاں تک ان کی مثنویوں میں منقبتی ابواب کا تعلق ہے تو مثنوی کے صنفی ضابطوں کے مطابق انھوں نے منقبتوں کو ان مثنویوں میں شامل کیا ہے۔ آگاہؔ کی تصانیف میں (۱) رسالۂ عقائد (۲) تحفۃ النساء (۳) ہشت بہشت (۴) محبوب القلوب (۵) ریاض الجناں (۶) تحفۃ الاحباب (۷) فراید در فوائد (۸) گلزارِ عشق (۹) روضۃ الاسلام (۱۰) خمسہ متحیرہ اوج آگاہی (۱۱) مثنوی روپ سنگار (۱۲) دیوان ہندی (۱۳) مراثی آگاہ (۱۴) ابیات ستہ اور (۱۵) مناجات آگاہ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں آگاہ نے دیباچے اردو نثر میں لکھے ہیں، جو اردو شعری تنقید کا اولین نمونہ قرار پاتے ہیں۔ ان دیباچوں سے ان کے تنقیدی شعور کو آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے۔

'ہشت بہشت' آگاہؔ کی سب سے مشہور تصنیف ہے اور اردو کی منظوم سیرتِ رسول ﷺ کی کتابوں میں سب سے طویل اور لاجواب ہے۔ یہ آٹھ منظوم رسالوں کا مجموعہ ہے۔ ان آٹھ رسائل میں آٹھ ہزار چھ سو پچاس اشعار ہیں۔ یہ آٹھ رسالے من دیپک، من ہرن، من موہن، جگ سوہن، آرام دل، راحت جاں، من درپن اور من جیون ہیں۔ منقبت میں لکھی گئی آگاہؔ کی سب سے اہم تصنیف 'محبوب القلوب' ہے۔ یہ حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے احوال پر مبنی کتاب ہے۔ آگاہ سے پیشتر فیروزؔ کی 'پرت نامہ'، افضل کی 'محی الدین نامہ'، لطفیؔ کی 'دستگیر نامہ'، شاہ میرؔ کی 'مدح غوث الاعظم' اور مختارؔ کی 'مناقب غوث الاعظم' لکھی جا چکی تھیں، لیکن باقر آگاہؔ کی 'محبوب القلوب' ان سب میں جامع اور مبسوط ہے۔ یہ کتاب ایک نثری دیباچہ کے ساتھ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ گیارہ کی تعداد اس لیے ہے کہ گیارہ ربیع الثانی حضرت غوثؒ کا یومِ وفات ہے۔ میلاد خواں حضرات اس مہینے کے گیارہ دنوں میں محافل میلاد کا انعقاد کرتے ہیں۔ انھیں ہر روز ایک موضوع پر میلاد پڑھنا آسان ہو جائے اس لیے 'محبوب القلوب' کو گیارہ فصلوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ہر فصل کو 'وصل' اور جزوی باب کو 'جلوہ' کہا گیا ہے۔

محبوب القلوب کی پہلی فصل کے دو جزو ہیں۔ ان میں حضرت عبد القادر جیلانی کی پیدائش اور اولیائے کرام کی بشارتوں کا ذکر ہے۔ دوسری فصل میں آپؒ کے نسب پدری کا بیان ہے۔ اس کے بعد آبائی سلسلے کے القاب اور ان کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی مادری اجداد کا بیان ہے۔ اس کے بعد آپ کی پیدائش اور صغرسنی کے احوال درج ہیں۔ فصل سوم کے چار جزو ہیں۔ ان میں آپؒ کے

تحصیل علم کو بیان کیا گیا ہے، نیز اولیائے کرام اور مشائخ کی صحبتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ فصل چہارم میں آپؒ کے شمائل و اخلاق پیش کیے گئے ہیں۔ فصل پنجم میں نادر اماموں کے طریق واردت اور اثبات و استقامتِ تجلیات کا ذکر ہے۔ فصل ششم میں وعظ اور اس کے اثرات، فصل ہفتم میں اولیائے کرام کے طریقۂ اعمال ذکر ہے۔ فصل ہشتم میں سلسلہ غوثیہ و قادریہ کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ فصل نہم میں کرامات غوث اعظم کا تذکرہ ہے۔ فصل دہم میں اولیاء متقدمین کی زبانی حضرت غوث اعظم کی شان میں کی گئی مدح و توصیف کا ذکر ہے اور فصل یازدہم وفاتِ حضرت عبدالقادر جیلانی اور آپ کی اولاد کے بارے میں ہے۔ آخر میں باقر آگاہ نے غوث پاک کی جناب میں بطور مناجات اپنا دکھڑا رکھ دیا ہے۔ اس مناجات کا انداز ایسا ہے گویا نعوذ باللہ وہ صاحبِ قبر، شاعر کی اعانت فرمائیں گے۔ اس کی گیارھویں فصل میں شاعر نے دو قصائد لکھے ہیں، جن میں ان کرامتوں کا ذکر ہے، جو اصل کتاب میں درج نہ ہو سکی تھیں۔ باقر آگاہ نے 'محبوب القلوب' کے ماخذات کی طویل فہرست بتائی ہے، جس میں عربی، فارسی کی کتب شامل ہیں اور ان سے شاعر نے استفادہ کیا۔ ان کتب میں آگاہ نے شیخ نور الدین سیوطی شافعی کی تصنیف 'بہجۃ الاسرار' کو مقدم رکھا۔ شاعر حضرت غوثؒ کی ولادت کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ سرور کا تولد ہے بجیلان — بسالِ چار صد ہور ستّر جان
کہا ہے شیخ جند اللہ عیسیٰ — کیا جب غوث کو قیوم پیدا
کیا بھوت اصفیا کو تب وہ مخلوق — کہ ہوویں ہم نشینِ بزم معشوق
نہ کوئی وقت اتنے اولیا تھے — نہ کوئی محفل میں اتنے اصفیا تھے
روایت ہے کہ امّ الخیر اکرم — کہ ہے وہ مادرِ غوثِ مکرم
سبوں سے بولتی تھی اس بیاں کو — جنی میں جب سے اس جانِ جہاں کو
نہ پیتا تھا کبھی رمضان میں دودھ — صبح سے شام تک از فضل معبود

(باقر آگاہ 'محبوب القلوب' [قلمی] ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ورق-۲۲ب)

باب ہشتم میں فضیلت و شرفِ سلسلۂ غوثیہ بروایت شیخ تقی الدین محمد، امام ابو محمد عبداللہ اور شیخ عبد الملک عراقی بیان ہوئی ہے:

تھا کرسی پر ہمارا شیخ والا — کوئی اس وقت اس سرور سے پوچھا
تیری خدمت میں جو رکھتا ہے نسبت — بیاں کر اوس کی تو ہم کو فضیلت
کہا منجہ سلسلے کا جو ہے انڈا — ہے بے شک وہ الف کا مول والا

جو چوزہ ہے ہمارے سلسلے کا　　نہیں ہے مول ہر گز اوس بھلے کا

(ایضاً۔ورق ۱۰۰ب)

اس طرح باقرؔ نے حضرت غوثؒ کی مدح سرائی کی ہے۔بموجب شاعراس کتاب میں چار ہزار ترسٹھ ابیات ہیں جو ۱۲۰۶ھ میں اختتام کو پہنچے۔

آگاہؔ کی دوسری تصنیف 'ریاض الجنان' ہے۔اس میں اہل بیت اطہار کے مناقب ہیں۔یہ کتاب ۱۲۰۷ھ میں مکمل ہوئی تھی۔شاعر نے تاریخ تصنیف یوں بیان کی ہے:

جب تھے بارہ سو اوپر سات برس
تب بنا ہے یہ نسخۂ اقدس

سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

سن تو یہ بات اے رفیق شفیق　　دیوے مولا مجھے تجھے توفیق
کہ محبت نبیؐ کی ہے جوں فرض　　الفت اس کی ہے آل کی یوں فرض
سارے اوصاف اون کے بالتفصیل　　عربی فارسی میں ہیں بے فیل
اُمّیاں اور عورتاں اکثر　　رکھتے نیں یہ دو زباں سے خبر
اس لیے میں بنایا یہ منظوم　　تا بہ آسانی سب کو ہو مفہوم

(بحوالہ:علیم صبا نویدی،'تاریخ ادبِ اردو' حصہ دوم، چنئی ۲۰۱۸ء،ص:۷۰)

شاعر نے اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ دکنی میں اس موضوع پر ولیؔ ویلوری کی 'روضۃ الشہداء' اور نوازش علی خاں شیداؔ کی 'روضۃ الاطہار' موجود ہیں، لیکن ان میں روایتیں غلط اور بے اصل ہیں۔مناقب کی یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ہر باب کو روضہ اور ان کی ذیلی سرخیوں کو خیابان کہا گیا ہے۔اس مدحیہ مثنوی میں تین ہزار ننانوے ابیات ہیں۔

باقر آگاہ کی تیسری مدحیہ تصنیف 'تحفۃ الاحباب در مناقبِ الاصحاب' ہے۔یہ مثنوی ۱۲۰۷ھ میں مکمل ہوئی اور اس میں تین ہزار چار سو چھتیس ابیات ہیں۔مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے مطابق یہ حمد و نعت و منقبت سے شروع ہوتی ہے۔منقبت میں انھوں نے اپنے مرشد قربیؔ کی بھی مدح کی ہے۔یہ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں چھ فصلیں ہیں، ان میں صحابی کی تعریف، صحابیت کی کیفیت، صحابہ کی کثرت، عدالتِ صحابہ، طبقاتِ اصحاب اور تعداد و مدارجِ خلفا۔دوسرے باب میں ان آیات کا بیان ہے جو اصحاب کی شان میں نازل ہوئیں۔تیسرے باب میں صحابہ کے فضائل بیان کرنے والی احادیث ہیں۔چوتھے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مناقب ہیں۔اس باب میں کل سترہ

فصلیں ہیں جن میں ابوبکرؓ کی مکمل سیرت وسوانح بیان کی گئی ہے۔ پانچواں باب حضرت عمرؓ کی تمام سیرت کے لیے مختص ہے۔ چھٹے باب میں حضرت عثمان غنی کے مناقب ہیں۔ ساتویں باب میں پندرہ فصلیں ہیں اوران میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ثنا وتوصیف کی گئی ہے۔ آٹھویں باب میں حضرت حمزہؓ کے مناقب ہیں۔نواں باب حضرت عباسؓ کے لیے مختص ہے۔ دسویں باب میں حضرت زبیر اسدیؓ کا ذکر ہے۔ گیارھویں باب میں سعد بن ابی وقاص کے مناقب ہیں۔ بارھویں باب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، تیرھویں میں حضرت طلحہؓ، چودھویں میں ابوعبیدہ عامر بن الجراح اور پندرھویں باب میں سعید بن زیدؓ کے مناقب درج ہیں۔ مذکورہ بالا خالص منقبتی مثنویوں کے علاوہ باقرؔ نے بعض افسانوی اور دینی امور پر بھی مثنویاں لکھی ہیں، جن میں مثنوی نگاری کے اصولوں کے لحاظ سے منقبتوں کو جگہ دی گئی ہے۔

قاضی محمد یوسف مرگھے

باقر آگاہ کے معاصر ایک غیر معروف شاعر قاضی محمد یوسف مرگھے کی ایک تصنیف 'روضۃ المناقب' (۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء) یا زین المجالس حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مناقب پر مشتمل ہے۔ شاعر نے اسے گیارہ مجالس میں منقسم کیا ہے۔ پہلی مجلس میں حضرت غوث پاک سے قبل کے اقطاب دینؒ کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ دوسری مجلس کے متعلق شاعر کہتا ہے:

کہ اس میں ہے کمال مولدِ پیر
تولد کے بیاں کی خوب تقریر

تیسری مجلس میں مناقبِ عبدالقادر جیلانی ہیں:

کہ اس مجلس میں ہیں ان کے مناقب
جو ہیں شیخ المشارق و مغارب

(محمد یوسف مرگھے: 'زین المجالس' کریمی پریس، بمبئی ۱۳۲۳ھ، ص: ۱۳۷ اور ۷۰)

حضرت غوث کے مناقب بیان کرتے ہوئے شاعر نے اکثر ضعیف روایات کا سہارا لیا ہے۔ اس مجلس میں شاعر نے آپؒ کے طالب علمی کے زمانے کا وہ مشہور واقعہ نقل کیا ہے کہ آپؒ کی صدق گفتاری کے اثر سے لٹیرے اور راہزن ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے تھے۔ چوتھی مجلس میں آپ کی جلالت وکمالت پانچویں میں آپ کے مناقب، چھٹی مجلس میں آپؒ کے قدم کے مراتب بیان ہوئے ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں مجالس میں آپ کے فیوض وبرکات، نویں میں آپ کی عنایات وعطیات اور دہم میں آپؒ کی رحلت کا بیان ہے۔ اور گیارھویں مجلس میں حمایت ووفا کا ذکر ہوا ہے۔ محمد یوسف مرگھے کی یہ کتاب مجالس میلاد کے لیے لکھی گئی تھی جس کے عوض شاعر نام ونمود نہیں ثواب ومغفرت کا تمنائی ہے۔

اسی عہد کے دکنی شاعر اسحٰقؔ کی ’ریاض العارفین‘ دکن کی آخری طویل مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اسحٰق نے یہ مثنوی مولانا روم کی تقلید میں لکھی ہے۔ شاعر نے اس مثنوی میں مروجہ طریقہ کے مطابق منقبتی اشعار کو بھی جگہ دی ہے۔ شاعر نے خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت عبد القادر جیلانی کی بھی مدح میں اشعار کہے ہیں۔ خلفائے راشدہ کی مدحت طرازی شاعر نے قرآن کی روشنی میں کی ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ کی توصیف وہ اس طرح کرتے ہیں:

اوّلیں صدیقِ اکبر یار ہیں　　ثانی اثنین اذ ہما فی الغار ہیں
جن کی یاری کا بیاں پروردگار　　آپ فرمایا کلام اللہ مجھار

حضرت عثمان کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں:

حضرتِ عثمان بن عفان ہیں　　عارفِ حق جامع القرآن ہیں
یوسفِ ثانی بقولِ مصطفیٰ　　گوہرِ بحرِ حیا کانِ وفا

اور محبوب سبحانی کے متعلق وہ کہتے ہیں:

ثمرۂ شاخِ علی مرتضیٰ　　بلبلِ گلزارِ عرفانِ خدا
اولیا سارے ستاریاں کے مثال　　ذات ان کی تس میں جوں بدرِ کمال

(اسحٰق بیجاپوری: ’’ریاض العارفین‘‘ ص: ۹۔۱۰۔۱۱)

میر محمد تقی میرؔ

میرؔ ۱۷۲۲ء میں اکبر آباد (آگرہ) کے مشہور صوفی محمد علی کے گھر پیدا ہوئے۔ کم سنی میں باپ کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے اپنے سوتیلے بھائی کے سہارے رہنے لگے، مگر بھائی محمد حسن کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ اس لیے میرؔ نے کم سنی کے زمانے میں تلاشِ معاش کے لیے آگرہ کو خیر باد کہہ دیا اور دہلی میں صمصام الدولہ کے دربار تک رسائی حاصل کر لی تو دربار سے میرؔ کے لیے روزانہ ایک روپیہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اس لیے میرؔ لوٹ کر آگرہ واپس آئے اور اطمینان سے زندگی گزارنے لگے۔ صمصام الدولہ کے انتقال کے بعد یہ وظیفہ بند ہو گیا تو وہ دوبارہ دہلی پہنچے اور سوتیلے ماموں خان آرزو کے یہاں رہنے لگے، مگر ان کا سلوک بھی میرؔ کو راس نہ آیا، تو بحالتِ مجبوری انھیں پھر سے دہلی چھوڑنی پڑی اور وہ تلاشِ معاش میں لکھنؤ پہنچے۔ یہاں آصف الدولہ نے میرؔ کے لیے دوسو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ میرؔ اس کے بعد آخر دم تک لکھنؤ ہی میں رہے اور ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

اردو کے غزل گو شعرا میں میرؔ کا مقام نہایت بلند ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔ انھوں نے غزل کے علاوہ بھی بہت ساری اصناف میں

شاعری کی۔مثنوی،قصیدہ،مرثیہ،واسوخت،رباعی،مسدس،مخمس،مستزاد،ترجیع بند وغیرہ سے ان کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ان کے دواوین کی تعداد چھے ہے۔ان کے علاوہ ایک خودنوشت،ایک تذکرہ نکات الشعرا ایک فارسی دیوان،ایک رسالہ فیضِ میران کا قلمی اثاثہ ہے۔مولوی محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں لکھا ہے کہ:

''میر صاحب کی زبان شستہ،کلام صاف،بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔دل کے خیالات جو کہ سب طبیعتوں کے مطابق ہیں،محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں۔ایک مضمون بن جاتی ہیں۔اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے،بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔وہ گویا اردو کے سعدی ہیں۔''

(محمد حسین آزادؔ:'آبِ حیات'،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۳ء،ص:۲۰۲)

میرؔ نے یوں تو تقریباً تمام اصناف میں شاعری کی ہے،لیکن غزل ان کے لیے میدانِ میرؔ ہے۔وہ اگرچہ غزل کے بادشاہ ہیں،لیکن مذہبی رنگ بھی نمایاں ہے۔ان کے پاس ایمان کی کسوٹی حبِّ علیؓ ہے۔چنانچہ وہ کہتے ہیں:

جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں ہو گر شریفِ مکہ، مسلمان ہی نہیں
جو معتقد نہیں ہے علیؓ کے کمال کا ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا

میرؔ آل بیت اطہار سے محبت رکھتے ہیں یہی قلبی لگاؤ انھیں نجاتِ آخرت سے بے فکر رکھے ہوئے ہے:

فکرِ نجات میرؔ کو،کیا مدح خواں ہے وہ
اولاد کا علیؓ کی محمدؐ کے آل کا

(میر تقی میرؔ:'کلیاتِ میر'،رام نرائن لال بینی مادھو،الہ آباد، ۱۹۷۲ء،جلد اول،ص:۱۲۹)

میرؔ اگرچہ اپنے آبائی مذہب کے لحاظ سے سنّی العقیدہ تھے،لیکن دہلی کے قیام کے بعد ہی ان کے خیالات اور اعتقادات تبدیل ہونے لگے تھے اور انھوں نے جلد ہی اپنے شیعہ ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔یہ تبدیلیِ مذہب ان کے ماموں خان آرزو پر شاق گزری اور جلد ہی اس نے جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر لی۔اسی لیے میرؔ نے اپنے ماموں کے گھر کو خیر باد کہا۔اس واقعہ کے بعد حضرت علیؓ کے متعلق جو عقیدت اہل تشیع کے یہاں پائی جاتی ہے،میرؔ نے اسے اپنا لیا۔مثلاً واقعہ معراج میں

حضرت محمدؐ کا سدرۃ المنتہیٰ کے بعد حضرت علیؓ سے ملاقات کرنے کی روایت اہلِ تشیع کے یہاں مشہور ہے۔ میرؔ ایک منقبتی غزل میں کہتے ہیں:

پایا علیؓ کو جا کے محمد نے اس جگہ
جس جا نہ تھا لگاؤ گمان و خیال کا

میرؔ آپؓ کی مدحت کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں:

شخصیت ایسی کس کی تھی ختم رسل کے بعد — تھا مشورت شریک حقِ لا یزال کا

(ایضاً ص:۲۵۸)

تیری قدر و منزلت ختم رسل سے پوچھے — تیری قدر و منزلت میں ہے کسی کو کیا کلام

(ایضاً جلد دوم ص: ۴۷۳)

مولانا حسن کاشی کی تقلید میں میر نے بھی حضرت علیؓ کی منقبت 'ہفت بند' میں کی ہے:

السلام اے رازدارِ داورِ جاں آفریں — السلام اے لا مکاں کے حاکمِ مسند نشیں
ذات تیری جوں خدا کی ذات ہے والا صفات — بے شریک و بے عدیل و بے نظیر و بے قریں

اللہ اللہ زور بازو قدر و قدرت دیدنی — رتجھنے کی جائے حشمت سیر قابل اقتدار

ہے جہاں تیری سخا واں بحر و بر کا کیا شمار — جب برسنے تو لگے گنتی میں آوے کب سحاب

کیا تسلط کیا تحمل کیا تمول کیا شکوہ
تو جہاں ہو ایک، واں گویا کہ ہیں دونوں جہاں

اے چراغِ جملہ نورِ خاندانِ مصطفیٰ — اے مرے والی مرے مقصود ہم نامِ خدا

اے امامِ واجب التعظیم و باب احترام — اے سزائے عزت و مسجود و انبوہِ انام

(ایضاً ص:۴۶۹ تا ۴۷۵)

'ہفت بند' کے ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ حضرت علیؓ اور اہل بیت کے لیے دل میں خصوصی جذبہ رکھتے تھے اور اس جذبہ کا برملا اظہار اشعار کی صورت میں کر دیتے تھے۔ انھوں نے حضرت علیؓ کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار مخمسوں میں کیا ہے:

ہادی علی، رفیق علی، رہنما علی — یاور علیؓ محمد علیؓ آشنا علیؓ

مرشد علیؓ کفیل علی ؓ پیشوا علیؓ مقصد علیؓ مراد علیؓ مدعا علیؓ
جو کچھ کہو سو اپنے تو ہاں مرتضیٰ علیؓ

(ایضاً ص:۳۸۸)

ان مثالوں کے علاوہ 'حیدری ہوں حیدری'، 'یا علی یا علی کہا کرو' اور 'یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں' ایسی منقبتیں ہیں جو میرؔ کے جذبۂ عشق کی غمازی کرتی ہیں۔

میرؔ کی طرح ہی جرأتؔ حضرت علیؓ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ کی شان میں کہے گئے جرأتؔ کے منقبتی اشعار احترام و تقدس کا اچھا نمونہ ہیں۔ لکھنؤ اور فیض آباد کے مذہبی ماحول میں پروان چڑھی ان کی شاعری کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ شاہ کمال کے اس قول سے ہوتا ہے:

''دیوانِ جرأتؔ آصف الدولہ کے پلنگ پر ہر لحظہ رہتا تھا اور نواب اس کے مطالعہ سے مسرور ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ آصف الدولہ بڑے مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ ظاہر ہے کہ جرأتؔ کا مذہبی کلام بھی وہ پسند کرتے رہے ہوں گے۔''

(ڈاکٹر اکبر حیدری، 'اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا' لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص:۲۰۲)

جرأتؔ کے کلام کو آصف الدولہ کی شرف قبولیت حاصل ہونے کی ایک وجہ ان کے مرثیے اور اہل بیت کی مدح گوئی بھی ہوسکتی ہے۔ جرأتؔ کے کلام سے چند منقبتی اشعار بطور مثال پیش کیے جا رہے ہیں، جن میں آئمۂ عظام کی مدح کی گئی ہے:

جو کہیے سو لاریب علیؓ نامِ خدا ہے یارا ہے کسے اس کے مراتب کے بیاں کا
اس مہرِ ولایت سے جو ذرہ بھی رکھے بغض مردودِ دو عالم ہے نہ یاں کا نہ واں کا
معصوم دہ و چار سے چودہ یہ طبق ہیں ہر ایک انھوں میں سے ہے سرور دو جہاں کا

(جرأتؔ [مرتبہ: نورالحسن نقوی] 'کلیات جرأت' علی گڑھ، ۱۹۷۱ء، ص:۲۸)

جرأت نے اس آستانۂ عالیہ سے اپنی آنکھوں کی روشنی بھی مانگی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی آنکھوں کی بینائی ختم ہوگئی تھی:

تمھارا یا علیؓ مداح ہے جرأتؔ کی آنکھوں میں
بحقِ قرۃ العین نبی اب روشنائی ہو

'قرۃ العینِ نبیؐ' سے یہاں حضرت فاطمہؓ مراد ہیں۔ حدیث میں یہ اصطلاح آپؓ ہی کے لیے آئی ہے۔ شاعر نے ذو معنیٰ میں اس کا استعمال کیا ہے۔ دوسری جگہ وہ کہتے ہیں:

اسی عالم میں سدا روؤں اور رلاؤں میں
بصارت آنکھوں میں پاؤں نجف کو جاؤں میں
(ایضاً ص: ۴۰۲)

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

اردو کے نہایت پر گو شعرا میں مصحفی کا شمار ہوتا ہے۔ وہ امروہہ کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام ولی محمد اور دادا درویش محمد تھے۔ مصحفی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں وثوق سے کچھ کہا نہیں جاتا، البتہ وہ ۱۲۴۰ھ بمطابق ۱۸۲۴ء کو لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ اپنے دور کے شعرا میں ان سے زیادہ زود گو شاعر دکھائی نہیں دیتا۔ فارسی کے علاوہ ان کے آٹھ دیوان تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں اردو شعرا کے دو تذکرے بھی لکھے ہیں۔ حصولِ معاش کی خاطر انھوں نے امروہہ کو چھوڑا اور ٹانڈہ چلے گئے۔ وہاں کے نواب محمد یار خاں شعرا نواز تھے اور قائم چاند پوری سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ قائم چاند پوری نے مصحفی کو نواب صاحب کے دربار سے وابستہ کر دیا۔ مگر 'استر تال' کی لڑائی کے بعد جب ٹانڈہ کی محفل اجڑ گئی تو مصحفی لکھنؤ پہنچے، یہاں مرزا سلیمان شاہ اپنا دربار سجائے ہوئے تھے۔ مصحفی کو جب وہاں پذیرائی حاصل ہوئی تو انشاء اللہ خاں انشاؔ سے ان کے ادبی معرکے ہوتے رہے۔ ان معرکوں کا مصحفی پر کافی اثر ہوا اور وہ بددل ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

ان کے سلسلۂ نسب سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ درویش صفتی ان کا شعار رہا ہے۔ وہ خود بھی صوفیانہ طرز زندگی پسند کرتے تھے۔ امروہہ میں رہتے ہوئے وہاں کے بزرگوں سے ارادت رکھتے تھے، البتہ دہلی پہنچنے کے بعد شاہ فخر الدینؒ کے آگے انھوں نے زانوئے ارادت تہ کیا تھا۔ جب مرشد کا انتقال ہوا تو فرط غم میں مرشد کی شان میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے کی تشبیب میں دہلی سے اپنی محبوبیت کو واضح کرتے ہوئے گریز کے بعد اپنے مرشد کی مدح کی گئی ہے:

جنیدِ وقت فخر الدین محمد مولوی صاحب — جنھوں کا آفتابِ فیض مجھ پر سایہ گستر ہے
اگر اکسیر کی ترکیب پر قادر ہو تھوڑا سا — نگاہِ لطف ان کی نسخۂ کبریت احمر ہے
کمالات ان کے میں کس منہ سے اے یارو بیاں کرتا — میری فہمید سے ان کا مقام البتہ برتر ہے

(بحوالہ افسر صدیقی، مصحفی: حیات و کلام، مکتبہ نیا دور، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۵۱)

مصحفی کی کثیر الکلامی نے ان کے دواوین کو رطب و یابس سے بھر دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کا عمدہ کلام بھی بھرتی کے اشعار میں گم ہو گیا۔ البتہ ان کے قصائد سوداؔ، ذوقؔ کے ہم پلہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کلیات میں آٹھ منقبتی قصیدے حضرت علیؓ کی مدح میں ہیں۔ ایک منقبتی قصیدے میں حضرت

حسنؓ کی مدح کے ستّر اشعار ہیں۔امام حسینؓ کی منقبت میں اور حضرت زین العابدین کی منقبت میں سینتالیس اشعار درج ہیں۔اس قصیدے میں حضرت حسینؓ کے گھوڑے کی تعریف میں انیسؔ کی محاربتی تصویر کا عکس نظر آتا ہے:

تیری شجاعت اور سخاوت کے وصف میں　　　میری زبان تو کیا کہ زبانِ قلم ہے لال

ہے یہ جو ذوالجناح تیرا رخش باوقار　　　میں لکھ سکوں گا اس کی ثنا کیا مری مجال

ان قصائد کے علاوہ مصحفیؔ نے جناب علی اکبرؓ کی شان میں بھی دو قصائد لکھے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی بعض اشعار میں منقبتی عنصر پایا جاتا ہے:

اللہ رے تری شان کہ با ایں ہمہ شوکت

پیدا نہ کیا پھر یدِ قدرت نے علی سا

(مصحفی[مرتبہ: نثاراحمد فاروقی]'کلیات مصحفی' دیوان اول،علمی مجلس دہلی ۱۹۶۹ء،ص:۹۹)

جرأتؔ، انشاءؔاور مصحفیؔ کے بعد نظیراکبرآبادی، رنگینؔ، حضرت شاہ نیازؔ بریلوی، شاہ نصیرؔ وغیرہ کے یہاں بھی شاعری میں منقبتی عناصر مل جاتے ہیں۔

نظیراکبرآبادی

نظیراکبرآبادی اردو کے ایسے منفرد شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو درباروں اور خانقاہوں سے نکال کر بازاروں اور چوپالوں کے ماحول میں پہنچادیا۔ان کا نام شیخ ولی محمد اوران کے والد کا نام شیخ محمد فاروق تھا۔نظیرؔ ۱۷۴۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اوراحمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت انھوں نے دہلی کو چھوڑ آگرہ بسالیا اور وہیں رہتے ہوئے گزراوقات کے لیے اتالیق کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ روزانہ بچوں کو پڑھانے کے لیے آگرے کے محلوں اور گلیوں میں گھومتے۔ یوں نظیر نے عام زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اوراسی میں رچ بس گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عوام الناس کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ان کی شاعری کا جائزہ لینے والوں نے نظیرؔ کوعوامی شاعر کہا اوراردوشعری ادب میں وہ اسی نام سے مشہور بھی ہوئے۔ میلوں ٹھیلوں میں گھومنے اور تیج تہواروں میں شریک ہونے کی وجہ سے نظیرؔ نے انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور عام زندگی سے جڑی ضروریات، کھیل تماشے، بدلتے موسم (برسات، ٹھنڈ کالا/سرما اور دھوپ کالا/گرما) موسمی پھل، ترکاریاں، تہوارِ عید، بقرعید، دیوالی، راکھی، ہولی، جنم اشٹمی، شادی بیاہ اورعرس وصندل، محرم کے جلوس، اکھاڑے کی کُشتیاں وغیرہ متحرک زندگی کے تمام عوامل ان کی شاعری کے موضوعات بنے۔انھوں نے اذانیں دیں توسنکھ بھی بجائے۔غرضکہ نظیرؔ کی زندگی قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ان کی شاعری میں رام، کرشن جیسے اوتاروں کا ذکر ہے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، خلفائے راشدین، بزرگان دین، اولیائے کرام کے ساتھ ہی گرونانک، سنت کبیر اور بابا

فرید جیسے بزرگوں کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔ خلفائے راشدین کی منقبتیں نظیرؔ کے یہاں اکثر نعتیہ اشعار سے شروع ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں مضمون آفرینی میں کچھ زیادہ تنوع نہیں، البتہ خیال آفرینی کے لیے نئے نئے پہلو تراشے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شانِ ارفع میں کہی گئی منقبت میں انھوں نے بالعموم وہی مضامین کا اعادہ کیا ہے، جو احادیث میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان مضامین کے بیان میں تخیل کی جولانی دیکھتے بنتی ہے:

علی کی یاد میں رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں علی کا وصف کچھ کہنا سعادت اس کو کہتے ہیں
علی کی مدح کا پڑھنا کرامت اس کو کہتے ہیں علی کے نام کا لینا حلاوت اس کو کہتے ہیں
علی کی حب میں مرجانا شہادت اس کو کہتے ہیں

(نظیرؔ: 'کلیات نظیر، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء، ص: ۳۰۰)

اس خمسے میں سات بند ہیں۔ شاعر نے حضرت علیؓ کی مدحت طرازی میں بعض ضعیف روایتوں کا سہارا لیا ہے، جنھیں عام طور پر میلاد کی محفلوں میں نہایت عقیدت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ان کی کلیات میں خانقاہی رسم و رواج کے مطابق مختلف رسومات کا بھی ذکر ہوا ہے۔ جیسے صندل، عرس، سماع وغیرہ۔ اسی مناسبت سے وہاں برتی جانے والی چیزوں کا بھی بیان ہے۔ مثلاً غلاف، مورچھل، عود، عنبر، چادر، صندل، لنگر وغیرہ۔ ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر ان درگاہی رسومات کو نہ صرف قریب سے دیکھتے تھے، بلکہ ان میں برابر شریک بھی ہوتے تھے۔ دورِ اکبری میں فتح پور سیکری کے ایک بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتی صاحبِ کرامات مانے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر کے یہاں ان ہی کی دعاؤں کی بدولت ایک لڑکا تولد ہوا تھا، اکبر نے اس کا نام ان بزرگ کے نام پر سلیم رکھا تھا۔ تاریخ میں جسے جہانگیر کہا جاتا ہے۔ نظیر نے ان بزرگ کی منقبت میں ان رسومات کا ذکر کیا ہے:

باغِ جنت ہے آج یہ درگاہ پھول پھولے ہیں فیض سے دل خواہ
دیکھو رضواں بہار یاں کی واہ دل میں کہتا ہے دم بدم واللہ
رشک میں گلشنِ بہشتی کا
عرس حضرت سلیمؒ چشتی کا

کتنے واں سیم تن بھی پھرتے ہیں غنچہ لب گلبدن بھی پھرتے ہیں
شوخ گل پیرہن بھی پھرتے ہیں دل ربا دل شکن بھی پھرتے ہیں
رشک میں گلشن بہشتی کا
عرس حضرت سلیم چشتی کا

(ایضاً ص: ۳۰۱)

اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے علاوہ نظیرؔ نے ہندوؤں کے اوتار اور دیوی دیوتاؤں کی تعریف بھی کی ہے بالخصوص کرشن کنہیا اور شنکر کی تعریف تو وہ عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔

اسی دور میں بریلی کی خانقاہی تہذیب کے پروردہ حضرت شاہ نیاز بریلوی اپنی دھن اور جذب و کیف کی مستی میں اولیائے کرام کی ثنا و توصیف کرتے نظر آتے ہیں دیکھیے! اپنے پیر عبدالقادر جیلانی کی مدحت میں ان کے استغراق کا عالم۔ 'یا پیر الغیاث' کی سرخی لگا کر وہ حضرت عبد القادر جیلانیؒ کی یوں مدح کرتے ہیں:

لایا تمھارے پاس ہوں یا پیر الغیاث کر آہ کے قلم سے میں تحریر الغیاث
لاہوت سے اتر کے ہوں ناسوت میں پڑا کیا کچھ ہوئی مقام کی تعمیر الغیاث
یا غوث الاعظم ! آپ سوا کون ہے مِرا کس کس کنے میں جا کروں تقریر یا غیاث

(نیاز بریلوی، 'دیوان نیاز'، ص: ۱۴۰-۱۴۱)

نیازؔ بریلوی کی اس منقبت میں صوفیانہ رنگ کچھ گہرا دکھائی دیتا ہے۔ شاعر نے غلوئے عقیدت میں عبدالقادر جیلانی کو دستگیر، شاہ اولیا، مشکل کشا اور غوث الاعظم جیسی صفات سے متصف بتایا ہے۔ ان ہی کے معاصر سعادت یار خاں رنگینؔ نے تو 'قصیدۂ غوثیہ' کا اردو میں منظوم ترجمہ کر اپنے آپ کو غوث پاک کے معتقدین میں شامل کر لیا۔ رہے شاہ نصیرؔ، تو ان کی شاعری میں بھی منقبتی عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی یہ تضمینی منقبت ملاحظہ ہو:

جہاں ہو یا اسد اللہ، عقل کل حیراں وہاں ہو کیا ترے اوصاف کا بشر سے بیاں
جو دور میں، میں حقیقت سے دیکھتا ہوں عیاں تو یہ زباں پہ لاتا ہوں شاہ کون و مکاں
'خطت کلامِ کلیم و رخت کلام اللہ چہ خط چہ رخ چہ جبیں لاالٰہ الا اللہ'
فقط نہ دست، ید اللہ ہے ترا یا شاہ کہ قد بھی ہے الف انّما پر ید اللہ
غرض کے آگے ہے سر رشتۂ سخن کوتاہ کہے ہے حور، یہ خلد بریں میں کر کے نگاہ
'بہ پیش روئے تو گلہائے باغ را چہ کنم چو آفتاب بر آید چراغ را چہ کنم'

(بحوالہ: ''اردو ادب''، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۱ء ص: ۱۵۲)

منقبتی شاعری کے حوالے سے آتشؔ کے یہاں بھی مدح علیؓ کے اشعار تلاش کیے جا سکتے ہیں:

عاشق و شیدا علیِ مرتضیٰ کا ہو گیا دل میرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا
کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مولا مرے کعبہ، پیدائش سے تیری گھر خدا کا ہو گیا

اگرچہ کعبہ میں حضرت کی ولادت کے واقعہ کو مختلف شعرا باندھ چکے ہیں مثلاً ناسخؔ کہتے ہیں:

ہے ازل سے وہ مرا قبلۂ ایماں ناسخؔ
جس کو خالق نے کیا کعبہ کے اندر پیدا

لیکن آتشؔ نے صنعت ایہام کے ذریعہ اور معنی خیز بنا دیا ہے۔

اس عہد سے تعلق رکھنے والے شعرا میں حضرت غمگینؔ، نظام الدین ممنونؔ، مومنؔ اور تسکینؔ کے کلام کا جائزہ لینے پر ہمیں منقبتی اشعار مل جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت غمگینؔ کہتے ہیں:

یہ یاد رکھیو کہ آلِ نبیؐ ہیں کشتیِ نوح ۔۔۔ نہ قصد کیجو دلا اور تو سفینے کا
جو حق میں ان کی احادیث اور ہیں آیات ۔۔۔ نہیں ہے اور کا مذکور اس سلیقے کا

(محمد یونس خالدی: 'مطالعۂ غمگین' انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۳ء، ص:۱۰۸)

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے 'مثل اهل بيتي كسفينة نوح' اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں اہل بیت رسولؐ کو کشتی نوح سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ممنونؔ نے فارسی کی مشہور لامیہ ردیف میں حضرت علیؓ کی منقبت میں ایک قصیدہ لکھا ہے، جو ان کی قادر الکلامی اور محبت و عقیدت کا گویا مظہر ہ:

شکل ثانی کی تیرے محو یہاں تک کہ نہ پائے
وہم و آئینہ و آب اس کو بہ چشم احول
عہد میں تیرے یہاں تک ہے عدالت کا ہجوم
کیجیے جمع جو رد ضد کو تو ہووے نہ خلل

(ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں منشا، 'مطالعہ میر نظام الدین ممنون' حیدر آباد ۱۹۷۳ء، ص:۵۵)

ممنونؔ کی غزلوں میں بھی حب علی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جیسے:

لبالب نورِ عشقِ مرتضیٰ سے سینہ ہے اپنا ۔۔۔ مقابل مہر عالم تاب کے آئینہ ہے اپنا
نہیں سرمایۂ دل داغ عشق آل احمد بن ۔۔۔ سدا لبریز نقد جعفری گنجینہ ہے اپنا

(ایضاً ص:۱۰۶)

روز محشر ہوں محبان علی میں محشور کیجو ۔۔۔ ممنونؔ میرے حق میں دعا میرے بعد

(ایضاً ص:۱۹۸)

نہ خورشید محشر کا ممنوں ہے ڈر ۔۔۔ ردائے علی کا ہے سایہ ہمیں

(ایضاً ص:۲۷۹)

محمد مومن خاں مومنؔ

اردو شاعری کے زریں عہد کے اہم شعرا میں نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ و مومنؔ کا شمار ہوتا ہے۔ دراصل

کئی بار اجڑنے کے بعد دہلی بار بار بسی، لیکن انگریزون کے ہاتھوں اجڑنے کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں لال قلعہ کی شعری مجالس میں رونق عود کر آئی تو دہلی کی گلیاں شعر و نغمہ اور عود و سرود کی صداؤں سے گونج رہی تھیں۔ اسی لیے اس زمانے کو اردو شاعری کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ ذوقؔ و غالبؔ تو ظفرؔ کے دربار سے وابستہ تھے، لیکن مومنؔ نے درباری وابستگی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ طبابت ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس کے علاوہ علمِ نجوم سے بھی انھیں دل چسپی تھی۔ ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا۔ انھیں شاہ عبدالعزیز سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنے بچے کا نام انھوں نے صاحبِ موصوف کی ایما پر ہی مومن رکھا تھا۔ شاہ عبدالعزیز ہی کے خاندان میں مومنؔ کی تعلیم و تربیت ہوئی، چنانچہ اسی خاندان کے ایک فرد شاہ عبدالقادر نے انھیں تعلیم سے آراستہ کیا۔ طب مومنؔ نے اپنے خاندان کے افراد سے سیکھی تھی۔ شاعری کا چسکا انھیں بچپن ہی سے لگا تھا۔ اس لیے شاہ نصیرؔ کے آگے انھوں نے زانوئے ادب تہ کیا اور غزل کے استادوں میں مومنؔ کا شمار ہونے لگا۔ غالبؔ جیسے باریک بیں اور سخن شناس مومنؔ کی شاعری کا لوہا مان گئے تھے۔ وہ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مومنؔ کی زندگی میں مذہبی انقلاب سیّد احمد شہید کا مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زاہدانہ بے عملی کی بجائے مجاہدانہ جوش و عقیدت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری، وہ چاہے حسن و عشق کے واقعات سے مربوط ہو یا حمد و نعت و مناقب کا مجموعہ ہو، ایک جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے، جس سے ایمان میں قوت اور دل میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ خلفائے راشدین صحابہ کرام اور اہل بیت کی مدح و ستائش میں مجاہدانہ جوش دیکھیے! کس قدر عروج پر ہے۔ دستورِ صداقت طراز حضرت ابوبکر کی ثنا بیان کرتے ہوئے مومنؔ کہتے ہیں:

مسند آرائے محفل تقدیس   اولیں جا نشین پیغمبر
خاک ساری پسند عرش مقام   آدمی صورت و فرشتہ سیر
چرخ آشوب دور میں اس کے   جوشِ ماجوج، سد اسکندر
ہے سراپا تو مہرۂ تریاک   تم کو کیا نیش مار سے ہو ضرر
قصرِ جاہ و جلال میں تیری   مشت کاشانہ ہے فلک منظر
گر تری بے رضا کرے گردش   ٹوٹے دولاب چرخ کا محور

(مومنؔ [مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں] 'کلیاتِ مومن'، الٰہ آباد، ۱۹۷۱ء، ص: ۱۳-۱۴)

مومنؔ اوصافِ عمرؓ یوں بیان کرتے ہیں:

امامِ اہلِ یقیں، شہر یار کشور عدل   امیر لشکر دین و مبارزِ مقتل
بلند پایۂ عمر جس کے قصرِ رفعت کا   گدائے خاک نشیں شاہِ آسماں منزل

شہِ سریرِ خلافت شہِ سپہرِ کمال محیطِ ابر نوال و سحاب دریا دل
(ایضاً ص:۱۷)

ذوالنورین حضرت عثمانؓ کی مدح سرائی میں شاعر کی سرشاری و وارفتگی کمال درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ شاعر نے آپؓ کی حیا، جود وسخا اور عدل و انصاف جیسے اوصاف اپنے منقبتی قصیدے میں یوں بیان کیے ہیں:

ہوئے ہیں زیب دہِ تخت خلافت عثمانؓ جس کی مسند کے حسد سے فلک اطلس خوار
لطف سے اس کے زمیں غیرتِ باغ فردوس خلق سے اس کے زماں رشک دکانِ عطار

مومنؔ نے ان مناقب میں نہ صرف یہ کہ تخئیل کی جولانی دکھائی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے بلکہ احادیث وتاریخی واقعات سے مزین بھی کیا ہے۔ مثلاً عثمانؓ کی منقبت میں بیعت رضوان کو یوں نقل کر دیا ہے:

شرط ایمان ہے پیمانِ خلافت اس کا
ورنہ کوئی نہیں ہم دست رسولِ مختارؐ

احادیث میں حضرت عثمانؓ کی حیا سے متعلق ایک مشہور واقعہ بیان ہوا ہے کہ "درِ دولتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب خلفائے ثلاثہ کی آمد ہوئی، تو آپ بدستور ویسے ہی بیٹھے رہے کہ تہبند آپؐ کی ساقِ مبارکہ کے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی، لیکن حضرت عثمانؓ کی آمد پر آپؐ سنبھل کر بیٹھ گئے اور تہبند سے اپنی پنڈلیوں کو بھی ڈھک دیا۔ مومنؔ نے ذیل کے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

پایۂ عرش پہ ہو کیوں نہ غلاف اطلس
چرخ پوششِ ساقِ نبیؐ تیری حیا سے ہے آزار
(ایضاً ص: ۲۴)

مومنؔ کی زبانِ کلک گوہر نثار حیدر کرار حضرت علیؓ کی مدح وتعریف میں منکرانِ حق کے لیے تیغ آبدار بن جاتی ہے:

آئی ہے لب پہ خدا وند ذوالفقار لے جاؤں منکروں کے لیے ارمغانِ تیغ
شیرِ خدا علی، کہ شجاعت جس کی ہے سر پنجۂ اسد پہ زنخ زن بنان تیغ
(ایضاً ص:۲۶)

مومنؔ ثواب جہاد کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے ایسے ممدوحین کا انتخاب کیا ہے جو شجیع بھی ہو اور مجاہد بھی۔ چنانچہ اپنی بیشتر رباعیوں میں انھوں نے شہید اعظم حضرت حسینؓ اور دیگر شہدائے

کربلا کی مدح کی ہے:

روشن ہے جو ہے آل عبا کا پایا ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایا
قندیل ہے عرش کی جو ہر جان شہید کیا ہوئے گا شاہِ شہدا کا پایا

(ایضاً ص:۱۹۹)

صدر السطور میں جیسا کہ کہا گیا ہے کہ مومنؔ پر سیّد احمد شہید بریلوی کی فکر کا کافی غلبہ تھا، اور وہ سیّد احمد سے ایک خاص عقیدت رکھتے تھے۔ بالاکوٹ کی لڑائی میں سکھوں کے ساتھ لڑتے ہوئے وہ اور سیّد اسمٰعیل شہید ہو گئے تھے۔ سیّد احمد شہید کی تاریخ وفات مومنؔ نے یوں مستخرج کی ہے:

جو سیّد احمد امام زماں و اہل زماں کرے ملاحدہ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا خروج مہدیِ کفار سوز کلک تفنگ

۱۲۴۲ھ

مومنؔ استخراجِ تاریخ کے ماہر تھے اور نہایت آسانی سے بامعنی مادۂ تاریخ نکال لیا کرتے تھے۔ اس فن کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں متعلقہ فرد کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ مومنؔ سیّد احمد کو اپنا آئیڈیل سمجھتے تھے، اس لیے ان سے رکھی جانے والی عقیدت کا انھوں نے برملا اظہار کر دیا۔ مثنوی جہاد میں وہ سیّد احمد کی یوں تعریف کرتے ہیں:

زہے سیّد احمد قبولِ خدا سرِ امتحانِ رسولؐ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
خدا نے مجاہد بنایا اسے سرِ قتلِ کفار لایا اسے
دم اس دست بازو پہ دیوے اجل لبِ تیغ کے بوسے لیوے اجل
کہوں کیا لوائے امامت کا بوجھ کہ ہیں غوث و ابدال سب اہل فوج

(ایضاً ص:۴۴۳)

مومنؔ کے قصائد کے مدحیہ پہلو میں مذہبی رنگ نمایاں ہے۔ روایتی قصائد کی طرح منقبتی قصائد میں بھی وہ قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا خیال رکھتے ہیں، یعنی ان میں تشبیب، گریز، مدح اور دعائیہ عنصر موجود ہوتا ہے۔ ہاں ان میں مالی منفعت کی بجائے اخروی کامرانی طلب کی جاتی ہے۔ ان منقبتی قصائد میں شاعر نے پر شکوہ لفظیات کو بھرپور جگہ دی ہے، جس کی وجہ سے بعض قصائد کی اصطلاحاتِ دینیہ سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے۔ مومنؔ نے بعض جگہ تو بحورِ علوم ہی انڈیل دیئے ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مدح کے باب میں ان کے یہاں غلو کی حدیں شرعی تصورات سے متجاوز نہیں ہوتیں،

نیز بزرگوں کے تئیں فرطِ عقیدت میں شاعر کے یہاں وحدت و رسالت کے مراتب میں تخفیف کا پہلو غالب نہیں آتا۔

مومنؔ کے بعد ذوقؔ، ظفرؔ، غالبؔ، ناسخؔ، شوقؔ، انیسؔ و دبیرؔ کی شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان شعرا کا استادانہ کلام اردو شعری سرمائے میں امتیازی مقام رکھتا ہے۔ ذوقؔ اثنا عشری عقیدے کے قائل تھے اور تاجدارِ ہند بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بحیثیت استادِ شاہ انھیں عزت و مرتبہ حاصل تھا۔ اس لیے وہ کھل کر برملا اپنے عقائد کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی منقبتی شاعری میں استمدادی لہجہ نمایاں ہے اور 'یا علی مدد'، 'ہو العلی' جیسے عنوانات لگے ہوئے ہیں۔ حضرت علیؓ کی مدح کو انھوں نے فوقیت دی ہے۔ حبِ علی ان کے ہر شعر میں جھلکتا ہے:

ذوقؔ حیراں ہے بہت فکرِ کشادِ کار میں یا علی مشکل کشا یہ وقت ہے امداد کا
اے ذوقؔ نہ کر نور میں ظلمت کی ملاوٹ کیا کام تبرّا کا محبت میں علیؓ کی

(ذوقؔ [مرتبہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی] 'کلیاتِ ذوق' ترقی اردو بیورو، دہلی ۱۹۸۰ء، ص:۸۵)

ایک رباعی میں ذوقؔ کہتے ہیں:

کیا جانیں گے ذوقؔ بجز خاص و عام
اعلیٰ جو علی کی ہے امامت کا مقام
جو لوگ صفِ اول میثاق میں تھے
پوچھے کوئی ان سے وہ کیسا تھا امام

(ایضاً ص:۲۶۸)

ذوقؔ نے اپنے مرشد سیّد عاشق نہال چشتی کی منقبت میں ایک مدحیہ قصیدہ بھی لکھا تھا۔ رشید حسن خاں کے مطابق اس کا شمار ذوقؔ کے کمزور ترین قصائد میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی شان میں کہے گئے قصیدوں سے بھی کمزور ہے۔ اس قصیدے میں سست بندشیں اور جمالیات کی کمی ہے۔ کلیاتِ ذوق مرتبہ تنویر احمد علوی دہلی کے صفحہ ۳۳۰ پر اس قصیدے کا عکس بھی ہے۔

وہ ابر در فشاں ہے چمن میں کمال کے عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہال کے
ہے چشمِ مہر و ماہ میں اب یہ جو روشنی روشن ہیں دونوں، نور سے اس کے جمال کے
اس کی شمیمِ لطف سے، ہو دم میں مشک بو ہے وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے

(ایضاً ص:۳۳۱)

اس قصیدے کے متعلق مرتب قصائد ذوق جسٹس ڈاکٹر محمد سلیمان صاحب لکھتے ہیں:

''استاد ذوق نے ان شیخ (عاشق نہالؒ) کے حالات سائیں نثار علی شاہ کی زبانی جوان دنوں دلی آئے ہوئے تھے سنے تھے اور ان حالات سے کچھ ایسے متأثر ہوئے کہ ان جذبات وعقیدت کونظم کی صورت میں ظاہر کیے ہی بن پڑا۔''

(ذوقؔ [مرتبہ: جسٹس محمد سلیمان] ''قصائد ذوق''، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء ص: ۳)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

ذوقؔ کے ہم مجلس مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا دینی مسلک تا حال محتاجِ تحقیق ہے۔ ان کے مکاتیب اور شاعری میں متضاد قسم کے مسلکی میلانات پائے جاتے ہیں، جن سے ان کے اصلی مذہب کا واضح تصور نہیں ابھرتا۔ حالیؔ نے مرزا کے مذہب کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلحِ کل تھا، مگر زیادہ تر ان کا میلان اہلِ تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جنابِ امیرؑ کو وہ رسولِ خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔''

(حالی، 'یادگارِ غالب' رام پال اگروال، الہ آباد، تاریخ طبع ندارد، ص: ۷۲)

مرزا کا اپنے آپ کو آدھا مسلمان گردانناا ور قید کیش وملت سے آزاد ہونے کا اقرار کرنا، ان کی اپنی مذہبی آزادی پر دلالت کرتے ہیں۔ میکش اکبر آبادی مرزا کے مذہب کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں:

''مرزا صاحب ایسے صوفی تھے جو وحدۃ الوجود پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو اور ایسے سنّی تھے، جو حضرت ابوبکرؓ وعمر کی خلافت کو حضرت علیؓ کا عطیہ مانتا ہو اور حضرت علیؓ کو ہر حیثیت سے سب سے افضل سمجھتا ہو۔ اسی طرح وہ ایک ایسے شیعہ تھے، جو حضرات ابوبکر وعمرؓ کو خلیفہ تسلیم کرتا ہو اور حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل نہ مانتا ہو اس طرح وہ درحقیقت آزاد رو تھے اور تقلید کو شاعری کی طرح مذہب میں بھی روا نہیں رکھتے تھے۔''

(میکش اکبرآبادی، 'مرزا غالب کا مذہب' مشمولہ ماہنامہ شاعر [غالب نمبر] بمبئی، ۱۹۶۹ء ص ۵۴)

غالبؔ نے عبادات وفرائض و واجبات میں سے صرف توحید وجودی اور دوسرے نبیؐ اور اہل بیت سے محبت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھے اپنے خط میں غالبؔ فرماتے ہیں:

''میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ

اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔ اور امام من اللہ علی السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔

ع بریں زیستم، ہم بریں بگزرم

''ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ مشرکین اور منکرین نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اس میں جلیں۔''

(غالب [مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم] 'غالب کے خطوط' جلد اول غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۹۳ء ص ۳۹۷)

بہر کیف! ان کی اردو شاعری میں حضرت علیؓ کی مدح و توصیف عقیدے کی تمام رعنائیوں اور تقدس کی تمام آرائیشوں کے ساتھ ہوئی ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست ۔۔۔ مشغولِ حق ہوں بندگیِ بو تراب میں
نقش لا حول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر ۔۔۔ یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں ۔۔۔ تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جاں ۔۔۔ نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے ۔۔۔ غلام ساقی کوثر ہیں مجھ کو غم کیا ہے

(غالبؔ ''دیوان غالب''، ایوان کمپنی الہ آباد ص: ۸۳، ۱۸۵۔۱۸۷)

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کے مرتبہ دیوان 'غالب: دیوانِ نعت و منقبت' میں دو قصیدے منقبتی لہجے میں ملتے ہیں۔ ایک 'سازِ یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار' اور دوسرا 'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں' دونوں مناقب حضرت علیؓ کی شان میں کہی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ غالب کا ایک منقبتی قطعہ بھی اس دیوان میں موجود ہے۔

غالبؔ کا مذہبی شعور بڑا بالیدہ تھا اور عقیدۂ مذہبی ان کی رگ و پے میں سرائیت کیے ہوئے تھا۔ اردو کے ساتھ اس کا عکس ان کے فارسی کلام میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کے مرتبہ دیوان میں اثنا عشری عقیدے کے تحت غالبؔ کی بارہ اماموں کی مدح میں لکھی منقبتیں، دعاے صباح کا فارسی منظوم ترجمہ اور حضرت زین العابدینؓ کی نہایت رقت انگیز دعا کا منظوم ترجمہ شامل ہے۔ حضرت زین العابدین کی دعا میں رقت کا طاری ہونا ان کی خدا خوفی اور رقت قلبی کی دلیل ہے۔ ان دعاؤں میں بندے کی عاجزی الحاح و زاری نمایاں ہے۔ حضرت زین العابدین یہ وہ امام ہیں، جن کے فقر کے سامنے سطوتِ خسروی نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ یہی حضرت زین العابدین جب بارگاہِ ایزدی میں

دستِ دعا دراز کرتے، تو مارے خوفِ خداوندی کے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ایک بار آپؒ حج کے لیے احرام باندھ رہے تھے مگر 'لبیک' زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ حالت متغیر ہوتی جارہی تھی۔ کسی نے آپ سے پوچھ لیا کہ 'لبیک' کیوں نہیں کہتے تو فرمانے لگے کہ 'مجھے ڈر ہے کہیں ادھر سے جواب 'لا لبیک' نہ آجائے۔ ساتھیوں کے منانے پر جب آپ نے 'لبیک' کہا تو کہتے ہی بیہوش ہو کر اونٹ پر سے نیچے گر پڑے۔ حضرت امام کی اسی تضرع آمیز دعا کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے، جس میں جذب وضطرار اور عجز و انکسار کے علاوہ بندے کی بے بسی و بے کسی نمایاں ہے۔ غالبؔ کے اردو دیوان میں غزلیات کے ذیل میں بعض منقبتی اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ شروع کے صفحات میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

بہادر شاہ ظفرؔ

غالبؔ کے ممدوح ظفرؔ اگر چہ آخری مغل تاج دار تھے، لیکن ان کی قیصری اور خسروی اکثر انگریزوں کے رحم و کرم کی محتاج رہی۔ یہی وجہ ہے کہ خود باشاہ نے اپنے آپ کو بدنصیب کہا اور محافلِ شعر و شاعری میں اپنی عافیت تلاش کر لی تھی۔ ذوقؔ جیسے استادِ فن اور غالبؔ و مومنؔ جیسے نکتہ رس و نکتہ شناسوں کی صحبت ظفرؔ کو میسر آ گئی تھی۔ اپنی محرومیوں سے دل شکستگی کو بھلانے اور ناکامیوں میں حوصلہ پانے کے لیے دربار کی یہ محفلیں ظفرؔ کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھیں۔ انھیں محفلوں میں ان کا ذوقِ شعری پروان چڑھا اور وہ شاعری کرنے لگے۔ ان کی شاعری میں مذہبی عنصر نمایاں ہے۔ بارگاہِ قدس میں سجدہ ریزی کے علاوہ وہ کبھی کبھی آستانوں کی چوکھٹ پر بھی پہنچ جاتے تھے اور مرشدانِ کاملین اور بزرگانِ دین کی مدح و توصیف کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں بھی کرتے تھے:

مرشدِ پاک رواں فخر الدین — قبلہ و کعبۂ جاں فخرالدین
میں گدا ہوں ترے دروازے کا — جاؤں اس در سے کہاں فخرالدین
رکھ ظفرؔ ہر نفس و ہر ساعت — شغل دل، وردِ زباں فخر الدین

(بہادر شاہ ظفرؔ، 'کلیات ظفر' فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص: مختلف)

یاد رہے کہ جتنے بھی سلاطین نے دہلی کو پایۂ تخت بنا کر ہندوستان میں حکومت کی ہے، ان میں سے بیشتر کا رجحان آستانہ پرستی اور آستانہ پروری رہا ہے۔ چنانچہ دہلی کے اولیائے کرام سے لے کر اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتی، فتح پور سیکری کے حضرت شیخ سلیم چشتی، گلبرگہ کے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے مقدس مقامات میں آرام فرما اولیائے کرام کی درگاہوں کی مالی خدمات کی ذمہ داری ان شاہوں نے اپنے سر اٹھائی تھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے اکثر اشعار میں ان اولیائے کرام سے عقیدت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے:

مرید قطب الدیں ہوں خاک ہائے فخر الدیں ہوں
میں اگرچہ شاہ ہوں ان کا غلام کمتریں ہوں میں
مجھے تو خانقاہ و میکدہ دونوں برابر ہیں
ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہوں کہیں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفرؔ ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں (ایضاً ص:۲۰۲)

حضرت نصیر الدین اولیاؒ کی منقبت میں ایک غزل میں ظفرؔ نے اسمداد و اعانت کا ملجا و ماوا ان بزرگ کو قرار دیا ہے اور ان ہی کی بارگاہ میں تمھی تو ہوٴ کہہ کر دست سوال دراز کیے ہیں جو انتہائی لاچاری، عاجزی اور بے کسی کی مظہر ہے۔ انھوں نے خلیفۂ رابع حضرت علیؓ کی مدح و توصیف میں بھی اشعار کہے ہیں۔ مسدس میں کہے گئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

زور بازوئے مصطفیٰ ہے علیؓ　　صفدر عرصہ وغا ہے علیؓ
میری کشتی کا ناخدا ہے علیؓ　　میرا ہادی ہے رہنما ہے علیؓ
میرا حامی ہے پیشوا ہے علیؓ
میرے ہر درد کی دوا ہے علیؓ

ناسخ لکھنوی

دلی سے ہٹ کر جب ہماری نظر لکھنؤ کے دبستانِ شاعری پر پڑتی ہے، تو وہاں استاد شاعر کے طور پر ناسخؔ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اصلاحِ زبان کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان کا اصلی نام شیخ امام بخش اور تخلص ناسخؔ تھا۔ ان کے والد شیخ خدا بخش تاجر تھے۔ ناسخ ۱۷۷۱ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن ہی میں وہ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں اپنی ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم مکمل کی۔ انھوں نے زبان کی اصلاح کے لیے جو اصول مرتب کیے، ان کی سختی کے ساتھ پابندی کی۔ اسی لیے اردو کے نقاد انھیں اردو زبان و ادب کا ڈکٹیٹر کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اولاً سنّی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں انھوں نے امامیہ مسلک اختیار کر لیا اور پھر آخر تک اسی کی پیروی کرتے رہے۔ ان کے معراج نامے میں اثنا عشری عقائد کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ یوں تو ناسخؔ غزل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے تین دیوان کے علاوہ چار مثنویاں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ مذہب امامیہ کی جانب جھکاؤ ہونے کی وجہ سے ان کی منقبتوں میں اثنا عشری رجحان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار میں منقبت کے مضامین شامل ہو گئے ہیں:

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا
انگشتر اپنی دے کے سلیمان کر دیا طاعت میں بھی سوال سنا گر فقیر کا
یا رب !حصارِ امن میں رکھیو مجھے مدام مداح ہوں ازل سے شہہِ قلعہ گیر کا
ہے ازل سے وہ مرا قبلہ ٔ ایماں ناسخؔ جس کو خالق نے کیا کعبے کے اندر پیدا

ناسخؔ [مرتبہ: رشید حسن خاں] ''انتخابِ ناسخ'' مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۲ء ص: ۱۳۳ اور ۱۳۹)

حضرت علیؓ کی ثنا و تقدیس صرف ناسخ کی غزلوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کی مطبوعہ کلیات ۱۸۴۲ء کے صفحہ نمبر ۳۶۲ کے حاشیہ پر ایک مذہبی مثنوی درج ہے، جس کا عنوان درج نہیں۔ مگر بعض لوگ اسے 'نظمِ ناسخ' کہتے ہیں۔ اس میں حضرت علیؓ کے فضائل درج ہیں۔ ناسخؔ نے آلِ نبیؐ کی شہادت پر ایک مثنوی بھی لکھی تھی، جسے 'شہادت نامۂ آلِ نبی' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مختلف غزلیہ اشعار میں بارہ معصومین کی مدح سرائی کی ہے۔

نظر آئی ضریحِ تربتِ شبّیر لوہے کی زیادہ سیم و زر سے ہوگئی توقیر لوہے کی
عندلیبِ روحِ ناسخؔ اڑ کے پہنچی خلد میں ہو پرِ پروانہ الفت جعفرِ طیار کی

(ایضاً ص: ۲۲۰)

ناسخؔ کے معاصرین میں شیفتہؔ اور مرزا شوقؔ لکھنوی نے بھی حضرت علیؓ کی مدح کے ترانے گائے ہیں۔ اپنی مثنویوں میں منقبت کے ذیل میں شوقؔ کے یہاں یہ اشعار ملتے ہیں۔ بہارِ عشق میں وہ کہتے ہیں:

ہے علیؓ نے وہ مرتبہ پایا ھل اتٰی جس کی شان میں آیا
خاتم الانبیاء کا نائب ہے بخدا مظہر العجائب ہے

(شوقؔ لکھنوی [مرتبہ ڈاکٹر سید عبد السلام] 'کلیاتِ نو' لکھنؤ، ۱۹۷۸ء ص: ۱۱۹)

اپنی مثنوی ''زہرِ عشق'' میں وہ کہتے ہیں:

کون حیدرؓ کا مرتبہ سمجھا
کوئی بندہ کوئی خدا سمجھا (ایضاً [زہرِ عشق] ص: ۱۵)

ان اشعار میں شاعر کی عقیدت غلو سے بڑھ کر کفر و شرک تک پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

بات چونکہ لکھنؤ تک پہنچی ہے، تو وہاں کے مرثیہ گو میر انیسؔ کی منقبتی شاعری کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ گلشن قدس کے بلبلِ خوش نوا میر انیسؔ عاشقِ سبط نبیؐ، ذاکرِ شہیدانِ کربلا اور مداحِ امامِ اطہار تھے۔ اہلِ بیت اور آئمہ عظام کی مدح و توصیف کے گلہائے رنگارنگ کو انھوں نے سو رنگ سے باندھ کر

گلدستۂ عقیدت و تقدس سجائے ہیں۔ امام اول حضرت علیؓ سے انھیں والہانہ عقیدت تھی۔ شاعری کے جام و سبو انھوں نے حبِّ علیؓ سے بھر رکھے تھے۔ اسی کے نشّہ میں سرشار جب انیسؔ ثنائے علیؓ کے نغمات بلند کرتے ہیں تو روح کی بالیدگی اور قلب کی پاکیزگی کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ رباعیات ملاحظہ ہوں:

لا ریب مظہر العجائب ہے علیؓ　　حقا کہ رسولِ حق کا نائب ہے علیؓ
اللہ اللہ صورتِ ذاتِ خدا　　ہر جا حاضر اور غائب ہے علیؓ

فیاض، علیؓ کو ہر بشر سے پایا　　ہاتھوں کو کشادہ بحر و بر سے پایا
وا رہتا ہے بابِ خیر واں آٹھ پہر　　حق سے مانگا علیؓ کے گھر سے پایا

بیزار علیؓ کو مال و زر سے پایا　　رتبہ پایا تو کس بشر سے پایا
اللہ نے دی تیغ نبیؐ نے دختر　　رتبہ یہ ادھر وہ اودھر سے پایا

(انیسؔ مراثی انیس، منشی نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۱۶ء ص: ۲۸، ۶۴، ۸۳)

شوقؔ لکھنوی نے بھی اسی معنی کا مضمون اس طرح باندھا ہے:

آبرو دونوں نے برابر دی
تیغ حق نے نبیؐ نے دختر دی

میر انیس نے میلادِ حسین کے واقعہ کو جس انداز میں قلم بند کیا ہے وہ اہل بیت سے عقیدت اور منقبتی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے:

ہاں اے فلک پیر! نئے سر سے جواں ہو　　اے ماہ شبِ چار دہم! نور فشاں ہو
اے ظلمتِ غم! دیدۂ عالم سے نہاں ہو　　اے روشنیٔ صبحِ شبِ عید! عیاں ہو
شادی ہے ولادت کی ید اللہ کے گھر میں
خورشید اترتا ہے شہنشاہ کے گھر میں

یا ختمِ رسل! گوہرِ مقصود مبارک　　یا نورِ خدا! اخترِ مسعود مبارک
یا شاہِ نجف! شادیٔ مولود مبارک　　یا خیرِ نسا! اخترِ مسعود مبارک
رونق ہو سدا، نور دوبالا رہے گھر میں
اس ماہ دو ہفتہ کا اجالا رہے گھر میں

(انیس [مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری] 'باقیات انیس' لکھنؤ ۱۹۷۹ء ص: ۴۔۵)

میر انیسؔ کے معاصرین میں مرزا دبیرؔ بھی مداحینِ اہل بیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مراثی و

رباعیات کے علاوہ دبیرؔ کی تمام تر مثنویاں اہل بیت کی ثنا و توصیف اور تاریخ و سیر کے بیان میں ہیں، لیکن 'مثنوی احسن القصص' سب سے طویل ہے اور اس میں اشعار کی تعداد ۳۳۱۶ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے لے کر حضرت امام آخر الزماں مہدی علیہ السلام تک کے واقعات قلم بند ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے شبلی نے دبیر کی طویل مثنوی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی تھی۔

اس مثنوی کے علاوہ دبیرؔ نے خالص مناقب میں پانچ مثنویاں لکھی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) مثنوی اسناد الحمد و فضائل چہاردہ معصومین۔ یہ ۱۴۵ اشعار پر مشتمل مثنوی ہے۔

(۲) مثنوی شہادت امیر المومنینؑ۔ یہ چودہ اشعار کی مثنوی ہے۔

(۳) مثنوی عزائے حیدرؑ کرار بہ غرہ ماہ شوال کہ روز عید ست۔ اس میں سولہ اشعار ہیں۔

(۴) مثنوی تواریخ ولادت و وفات حضرات چہاردہ معصومؑ۔ ۱۱۸ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ہے۔

(۵) مثنوی واقعہ شہادت حضرت علی اکبرؑ۔ اکسٹھ اشعار کی یہ مثنوی ہے۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے دبیر کا سارا کلام یکجا کر کے شایع کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے دبیرؔ کا کلام محفوظ ہو گیا۔ ان مثنویات کی خاص بات یہ ہے کہ مثنوی کی شکل میں چہاردہ معصومین کی ایک منظوم تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔ مرزا دبیرؔ نے اپنے مراثی کے اکثر بندوں میں آئمہ کرام کی مدح بیان کی ہے۔ مثلاً اپنے ایک مرثیہ 'مظہر العجائب و معجز نما علیؑ'، میں حضرت علیؑ کی یوں تعریف کرتے ہیں:

کیا مظہر العجائب و معجز نما علیؑ — بے فصل جا نشینِ رسولِ خدا علیؑ
کیوں منصفو! اگر نہیں مشکل کشا علیؑ — مشکل میں کیوں زباں سے نکلتا ہے یا علیؑ

جس دم لیا یہ نام خدا کی مدد ہوئی
انساں پہ جو بلا ہوئی نازل وہ رد ہوئی

(بحوالہ: ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا''، اکبر حیدری کاشمیری، لکھنؤ ۱۹۸۱ء ص ۵۶۴)

مرزا دبیرؔ میدان کربلا کے علم دار حضرت عباسؑ کی منقبت یوں بیان کرتے ہیں:

سلک گہر و لعل علم دار مکرم — لمعہ دہ الماس و در و لعل دو عالم
ہر لعل علم دار ملا روح کا ہمدم — دم مژدۂ صد سالہ کو حاصل ہوا ہر دم

والہ ہوا ہر لعل علم دار کا لالا
گوہر کا ہر اک لولوئے لالہ ہوا لالا

(ڈاکٹر سیّد صفدر حسین 'نادراتِ مرزا دبیر' چمن بک ڈپو دہلی ۱۹۷۱ء ص: ۱۲۱)

اس مرثیہ کی نمایاں خصوصیت اس کا بے نقطہ ہونا ہے۔ ایسی صنف کے استعمال میں شاعر کے تخیل

کی پرواز الفاظ کی پابند ہو جاتی ہے۔لیکن مرزا دبیر کا کمال یہ ہے کہ باوجود غیر منقوط الفاظ استعمال کرنے کے آورد کا شائبہ نہیں ہوتا۔اس پر مستزاد یہ کہ ربط و تسلسل مجروح نہیں ہوتا۔

لکھنوی ادبی تہذیب سے متأثر ہو کر اپنی شاعری کو پروان چڑھانے میں مرزا دبیرؔ کے بعد منیرؔ شکوہ آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ان کے یہاں منقبتی شاعری میں مدحِ اہل بیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے، بالخصوص ان کے مقاطع میں یہ عنصر نمایاں ہے:

پہنچے حرم سے تا نجفِ پاک اے منیرؔ　　ہر سنگِ کعبہ میل رہ مستقیم تھا
یا علی حشر میں محروم نہ رہ جائے منیر　　لے کے جنت میں اسے اے مرے مولا جانا
حیدر کے غلاموں میں منیرؔ اپنی ہے کتنی　　جبریل کی تسبیح میں ہے اک دانہ ہمارا
نزع میں بھی،قبر میں بھی دیکھ لینا اے منیرؔ　　مرشدِ روح الامیں مولیٰ علی پیدا ہوا

(بحوالہ:''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' ابواللیث صدیقی ص:۴۳۹)

منیرؔ کا قصیدۂ لامیہ بھی منقبتی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔

اس عہد کے معروف شعرا میں امیر مینائی،مجروحؔ،داغؔ وغیرہ کے کلام میں منقبتوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔امیرؔ نے تو 'یزید' کا قافیہ باندھ کر بھی حب حسینؓ کی ترجمانی کی ہے:

اللہ رے انقلابِ جہانِ پلید کا　　خونِ حسین غازہ ہے روئے یزید کا
مجھ کو محب سمجھ کے حسینِ شہید کا　　کرتا ہے تنگ قافیہ تک بھی یزید کا

خلفائے راشدین کی رفاقت کو وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں:

اے امیرؔ ! احمد مرسل کے جو ہیں چار وزیر
چار یاری ہوں مجھے اس پر برابر چار دن

(امیر مینائی''مراۃ الغیب''نول کشور پریس کانپور ص:۹۴ اور ۱۹۲)

امیرؔ مینائی نے جس طرح خلفائے اربع کی یاری قبول کی تھی اسی طرح میر مہدی مجروحؔ بھی علیِ مرتضیٰ کی خدمت گری کو ناموس اکبر گردانتے ہیں۔کیونکہ حضرت علیؓ نفس ناطق مصطفیٰ ہیں، وہ شہسوار لا فتیٰ، یداللہ، صبر و شکر اور حلم و کرم کے پیکر، نائبِ خدا اور بندوں کے پیشوا ہیں۔ مجروحؔ کے پاس ان کا نام لینا بھی حصول مدعا کا باعث ہے:

لیا جب نام ہم نامِ خدا کا　　سنا مژدہ حصولِ مدعا کا
جھکیں سر کیوں نہ یاں گردن کشوں کے　　یہ در ہے شہسوار لا فتیٰ کا
بفرمانِ خدا وندِ دو عالم　　علی ہے نفس ناطق مصطفیٰ کا

جسے کہتے ہو تم ناموس اکبر وہ خادم ہے علیِ مرتضیٰ کا

(میر مہدی مجروحؔ، ''دیوان مجروح''، مطبع کریمی لاھور تاریخ ندارد ص: ۷)

دوسری جگہ حضرت علیؓ کی مدح شاعر یوں کرتا ہے۔

یا علی نائب خدا ہو تم کیوں نہ بندوں کے پیشوا ہو تم
کس کا ادراک جز پیمبر کے کون سمجھے تمھیں کہ کیا ہو تم
صابر و شاکر و حلیم و کریم مرکز ان سب کے مرتضیٰ ہو تم

(ایضاً ص: ۶۵)

نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی

داغؔ نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں دہلی کے لال قلعے میں پیدا ہوئے۔ لال قلعے کی شعری سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے غالبؔ مومنؔ کے برعکس ذوقؔ کے رنگ کے اثر کو قبول کیا۔ ان کے مجامع کلام میں گلزارِ داغ، مہتابِ داغ، یادگارِ داغ اور فریاد داغ اہم ہیں۔ حسن و عشق کی واردات کے بیان میں ان کے یہاں بے باکی پائی جاتی اور عشقیہ معاملات کو بیان کرتے وقت محاورہ بندی کے ساتھ شوخی کا بھی دخل ہوتا ہے۔ بعض وقت فرطِ جذبات میں عامیانہ پن ان کے اشعار میں جھلک جاتا۔ لیکن تقدیسی شاعری میں وہ نہایت محتاط نظر آتے ہیں۔ انھوں نے صحابۂ کرام کی اطاعت ہی کو دولت دین کا ذریعہ بنالیا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

یہ داغؔ ہے صحابۂ عظام کا مطیع یہ داغؔ جاں نثار ہے آلِ رسول کا
میری مشکل ہوئی اے داغؔ آساں تصدق اپنے میں مشکل کشا کے

داغؔ [مرتبہ: محمد علی زیدی] ''دیوان داغ''، رام نرائن لال پبلشر الہ آباد ۱۹۷۶ء ص: ۴)

داغؔ اولیائے کرام کے بھی والا و شیدا تھے۔ مثنوی فریاد داغ کے دیباچہ میں تمکین کاظمی نے داغ کا قول نقل کیا ہے کہ:

''مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو اب تک میرے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہیں۔ ایک یہی منّی حجاب کا اور دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتیؒ کا۔''

(آئینۂ ادب لاہور، تمکین کاظمی، ص ۱۷)

داغؔ مختلف درباروں میں رہے۔ دہلی کے قلعہ معلیٰ میں تو ان کی پرورش ہوئی۔ پھر نواب کلب علی خاں والی رامپور کے دربار سے منسلک ہوئے لیکن جب نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا اور ریاست میں بدامنی پھیلنے لگی تو داغؔ نے دکن کا رخ اختیار کیا اور نواب محبوب علی خاں والیِ سلطنت

حیدرآباد کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔نواب نے نہایت گرم جوشی سے داغؔ کا استقبال کیا اور انھیں خطاب عطا کیا۔ داغ نے اس موقع پر دو قصیدے لکھے تھے ایک نواب صاحب کی شان میں اور دوسرا وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ کی تعریف میں۔ دکن کے سفر کے لیے داغؔ نے جو راہ اختیار کی اس میں اجمیر درمیان میں پڑتا تھا۔ داغؔ حاضری کے لیے وہاں رکے اور قبر مبارک پر پہنچ کر ان سے مدد طلب کی:

یا خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند غریب نواز
فریاد تمھیں سے ہے میری تکلیف سہی ہے کیسی کیسی
ہو داد طلب کی داد رسی سلطان الہند غریب نواز

اولیائے کرام کی قبروں سے فیض حاصل کرنے کا وہ پکا عقیدہ رکھتے تھے، اس لیے فرماتے ہیں:

مزارِ اولیا سے فیض حاصل کر لے اے ناداں
ہمیشہ زندہ رہتے ہیں کہیں یہ مرنے والے ہیں !

داغؔ نے سلطان الاولیاء شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانیؒ کی شان میں بھی مدحیہ غزل کہی ہے:

یہ دل محبوبِ سبحانی کے صدقے محی الدین جیلانی کے صدقے
نثار قبہ انوارِ مہ و مہر فرشتے قبر نورانی کے صدقے
تمھارے لطف پنہائی کے قرباں تمھارے اسم لاثانی کے صدقے
تمھاری ذات سے ہے نظمِ عالم جہان بانی کے سلطانی کے صدقے

(ماخوذ از ''نذر عقیدت'' مرتبہ ابوالفضل سیّد محمد، حیدرآباد، ۱۳۵۶ھ ص: ۱۶۲)

داغؔ نے اولیائے کرام کی بارگاہ میں سلام بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے اس صنف کے لیے مجرا کا بھی استعمال کیا ہے:

سلام اس کو کہا جس کے نام چار طرف اسی کے نام درود و سلام چار طرف
ان کو مجرا، تھے جو زیرِ آسماں بیٹھے ہوئے بھوکے پیاسے بے وطن بے خانماں بیٹھے ہوئے

موقع ومحل کے لحاظ سے یہاں سلام کے متعلق چند باتوں کی وضاحت ضروری محسوس ہو رہی ہے۔ ''سلام'' مرثیہ کی ایک ضمنی صنف ہے، جس کا ماخذ قرآن حکیم ہے۔ قرآن میں سات مقامات پر خصوصیت سے اس لفظ کا ذکر ہوا ہے۔لغت میں ''ہفت سلام'' کی اصطلاح غالباً یہیں سے لی گئی ہے۔ وہ سات مقامات درج ذیل ہیں:

(۱) سلامٌ قولا من رب الرحیم (یسٓ آیت نمبر ۵۸) مہربان پروردگار کی طرف سے سلام کہا

جائے گا۔

(۲) سلٰمٌ علیٰ نُوحٍ فی العالمین (والصٰفٰت آیت ۷۹) نوح پر سلام ہو عالم والوں میں۔

(۳) سلامٌ علیٰ ابراھیم (ایضاً آیت ۱۰۹) ابراہیم پر سلام ہو۔

(۴) سلامٌ علیٰ موسیٰ و ھارون (ایضاً آیت ۱۲۰) موسیٰ و ہارون پر سلام ہو۔

(۵) سلامٌ علیٰ آل یاسین (ایضاً آیت ۱۲۰) آل یاسین پر سلام ہو۔

(۶) سلامٌ علیٰ المرسلون (ایضاً آیت ۱۸۱) پیغمبروں پر سلام ہو۔

(۷) سلامٌ ھی حتیٰ مطلع الفجر (القدر آیت ۵) یہ رات طلوعِ صبح تک سراپا سلام ہے۔

ان آیاتِ کریمہ کے علاوہ سورہ احزاب میں صلوٰۃ وسلام کی تاکید کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ کام خود اللہ اور اس کے فرشتے کرتے ہیں، لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم بھی کرو۔ فرمان خدا ہے:

''اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً'' (سورۃ الاحزاب آیت ۵۶) بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت (سلامتی) بھیجتے ہیں (ان) پیغمبر پر، اے ایمان والو! تم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر سلام بھیجا کرو۔

قرآن حکیم میں ایک طرف 'سلام' کی صراحت ہے اور دوسری طرف فرمانِ خدا۔ یہ دونوں اردو شاعری میں سلام کی روایت کے اصل الاصول ہیں۔ ان صریح شواہد کے بعد بھی علی جواد زیدی کا یہ کہنا کہ ''ہندوستان میں بھگتی اور عقیدت کی عام فضا سے متاثر ہو کر یہاں کے فارسی گویوں نے سلام لکھے ہیں'' (انیس کے سلام، ص: ۱۷) محلِ نظر ہے۔ اردو شاعری میں سلام کے ارتقا پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں واقعۂ کربلا، ذکرِ مصائبِ فاطمہ و آئمہ کرام اور رحلتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے موضوعات ہوا کرتے تھے۔ بعد میں میلاد النبی کی مجالس میں بھی سلام پڑھنے کا اہتمام کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں، دورِ جدید میں تو قومی نشان اور مادرِ وطن کے لیے بھی سلام پڑھنے کی روایت قائم ہوئی۔ وقت کی رفتار اور سماجی نظام کے ساتھ ساتھ سلام کی ہیئت میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سلام کے مترادف الفاظ صلوٰۃ و فاتحہ کا استعمال بھی رائج ہوا۔ آگے چل کر جاگیردارانہ تمدن کے اثرات اس پر مرتب ہوئے اور سلام کی جگہ 'مجرا' اور 'سلامی' جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ یہ نئی اصطلاحات اعتقاد کی بہ نسبت شکست و ریخت اور مایوسی و بے چارگی کی مظہر نظر آتی ہیں۔

داغؔ کے شاگرد نوحؔ ناروی بھی اولیاء اللہ کی مدح سرائی میں رطب اللساں رہتے ہیں۔ حضرت معین الدین چشتیؒ کی تعریف و توصیف ان کے یہاں والہانہ جذبات سے پر ہے۔ مداح کی عاجزی اور ممدوح کی دستگیری کی تصویر اس منقبت میں دیکھی جا سکتی ہے:

ہر طرف خلق میں جلوے ہیں تمھارے خواجہ
میرے پیرے ہو تمھیں اے میرے پیارے خواجہ
نوحؔ آیا ہے بڑی دور سے گرتا پڑتا
تم دِیا کرتے ہو گرتوں کو سہارے خواجہ

(نوحؔ ناروی: ''سفینۂ نوح'' اسٹنڈر پریس، الہ آباد ۱۹۳۴ء ص: ۱۳۰)

ایک اور منقبت میں نوحؔ قبلۂ لطف و کرم حضرت معین الدین چشتیؒ کو اپنا ہادی و سرور اور مالک و رہبر مانتے ہیں:

مرے مالک مرے سرور معین الدین اجمیری — مرے ھادی مرے رہبر معین الدین اجمیری
اسے حاجت نہیں رہتی کہیں پھر اور جانے کی — جو آیا آپ کے در پر معین الدین اجمیری
تمھارا مرتبہ جو کچھ ہے اس کو ہم سمجھتے ہیں — کہ تم ہو آلِ پیغمبر معین الدین اجمیری

(ایضاً ص: ۱۳۳)

داغؔ و مجروحؔ ہی کے زمانے میں مولوی محمد محسنؔ کاکوروی اپنی نعتوں کی وجہ سے کافی مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ جس طرح ان کا نعتیہ کلام حسنِ عقیدت اور تقدس کا مرقع ہے، اسی طرح صحابہ کرام سے بھی وہ بے حد عقیدت و انسیت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں اصحاب کبارؓ کی مدح میں جو اشعار ملتے ہیں وہ انہی صالح جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ابوبکرؓ لاثانیِ روزگار — کہ تھا ثانی اثنین یارانِ غار
عمر نام و ناموسِ نام آوری — معمائے اسرارِ پیغمبری
سخا جلوہ عثمان عالی مقام — انیسِ پیمبر علیہ السلام
علی شیرِ یزدان و عالی وقار — یداللہ اور قبضہ میں ذوالفقار

(محسنؔ کاکوروی [مرتبہ: محمد نورالحسن] ''کلیات محسن''، لکھنؤ سنہ طباعت ندارد ص: ۲۸۸)

محسنؔ نے اپنی مثنوی 'چراغِ کعبہ' میں حضرت جبرئیلؑ کی مدح کی ہے، جو منقبتی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے:

عمّانِ کرم کے در منشور — قرآن شریف کے سورۂ نور
مانندِ دوا زمیں پہ نازل — مانندِ دعا سپہر منزل
منشورِ اوامر و نواہی — عنوانِ صحیفۂ الٰہی

(ایضاً ص: ۹۵)

قدیم شعری روایت کے پوری طرح پابند رہنے والوں کی فہرست میں محسن کاکوروی (م۱۹۰۵ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے معاصر مولوی محمد حسین آزاد (م۱۹۱۰ء) نے جدید اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ان کے مجموعۂ کلام 'خم کدۂ آزاد' میں کہیں کہیں مذہبی رجحان کے حامل اشعار بھی مل جاتے ہیں۔

الطاف حسین حالؔی

آزادؔ ہی کے مکتبِ فکر کے شاعر اور غالبؔ کے پرستار الطاف حسین حالؔی کا تمام کلام تقدس مآب نظر آتا ہے۔ نعت نگاری اور تاریخ اسلام ان کے مذہبی رجحان کو منکشف کرتے ہیں۔ ان کی کلیات میں اگرچہ مستقل منظومات منقبت پر نہیں ملتیں، لیکن 'مسدسِ حالی' جس میں تاریخِ اسلام کے عروج و زوال کی داستان نظم کی گئی ہے۔ اس میں بر سبیلِ تذکرہ خلفائے اربعہ کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ 'حضرت حرؑ' کی مدح میں ایک رباعی اور ایک شعر ان کے یہاں ملتا ہے:

چور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حرؑ
راحت اس تکلیف میں پائی بہت

(حالؔی [مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی] ''کلیات نظم حالی''، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء جلد اول)

حُر کہتا تھا اے دل شہ ذی جاہ سے مل   گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگی کوئے ضلالت کب تک   اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

(ایضاً ص:۲۱۷)

مسدس حالؔی میں خیر القرون کے خلفائے راشدین کی انصاف پسندی کا ذکر کرتے ہوئے حالؔی لکھتے ہیں:

وہ عہدِ ہمایوں جو خیر القروں تھا   خلافت کا جب تک کہ قائم ستوں تھا
نبوت کا سایہ ابھی رہنموں تھا   سماں خیر و برکت کا ہر دم فزوں تھا
عدالت کے زیور سے تھے سب مزین
پھلا اور پھولا تھا احمدؐ کا گلشن

نبیؐ نے کہا تھا انھیں فخرِ امت   جنھیں خلد کی مل چکی تھی بشارت
مسلم تھی عالم میں جن کی عدالت   رہا مفتخر جن سے تختِ خلافت
وہ پھرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کے در در
کہ شرمائیں اپنا کہیں عیب سن کر

(ایضاً جلد دوم ص:۱۱۹)

حالیؔ کے ہم خیال شاعر مولانا شبلیؔ نعمانی نے نثر میں جس طرح اسلام کے عظیم کرداروں پر بہت کچھ لکھا ہے، شاعری میں اسی طرح ان نفوسِ صالحہ اور تقدس مآب ہستیوں کے حالاتِ زندگی بطورِ نمونہ پیش کیے ہیں۔ اہلِ بیتِ رسولؐ حضرت فاطمہؓ کی زندگی کی جھلک شبلیؔ کی اس نظم میں ملاحظہ ہو:

افلاس سے تھا سیّدۂ پاک کا یہ حال — گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھی ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں — چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینے پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار — گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے — جھاڑو کا مشغلہ بھی جو صبح و شام تھا

(علامہ شبلیؔ ''کلیاتِ شبلی''، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۵۴ء ص: ۳۴)

رفقائے سرسیّد میں حالیؔ و شبلیؔ کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے ادب میں اصلاحی تحریک کو استحکام نصیب ہوا۔ اس تحریک کے علم برداروں میں اسمٰعیلؔ میرٹھی اور اکبرؔ الہ آبادی کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو درسِ اخلاق عام فہم اور سیّدھی سادہ زبان اور شاعری میں دیا۔ درسِ اخلاقیات کے لیے ان کے پاس صرف اسلام کی تعلیمات ایک ذریعہ تھا یا پھر اس کی عظیم شخصیتیں۔ اکبرؔ نے حضرت علیؓ کی مطہر زندگی لوگوں کے سامنے رکھی۔ آپؓ سے والہانہ عقیدت و محبت شاعر کا وتیرۂ زیست رہا ہے:

سرورِ روح ہے حاصل دُلائے حیدر سے — میں جام کوثر و تسنیم ہوں یہیں پیتا
حبِ علیؓ سے ہوگی دلوں کو شگفتگی — کلیوں کو احتیاج نسیم و صبا کی ہے
روبہ مزاجیاں سگِ دنیا کی دیکھ لیں — حسرت اب زیارتِ شیرِ خدا کی ہے
آراستہ ہے ایک طرف بزمِ مومنیں — کثرت لبوں پہ حمد درود و دعا کی ہے
پوچھا جو اس سماں کا سبب بول اٹھے ملک — پیدائش آج حضرتِ مشکل کشا کی ہے

(اکبرؔ الہ آبادی: ''کلیاتِ اکبر'' جلد اول ص: ۱۰۱ اور ۱۰۴)

ان اشعار میں بوئے عقیدت کے ساتھ شعریت کا حسن بھی جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ جیسے سرور کی مناسبت سے جام، کوثر، تسنیم۔ کلی کی مناسبت سے شگفتگی، نسیم اور صبا اور تیسرے شعر میں رعایت لفظی کے تحت 'روبہ'، 'سگ' اور 'شیر' کا تذکرہ وغیرہ۔ رہے اسمٰعیل میرٹھی تو ان کے کلام کا بڑا حصہ ادب الاطفال کے زمرے میں آتا ہے۔ انھوں نے طلبہ کی اصلاح کے لیے جو منظومات لکھی ہیں ان میں کہیں کہیں اہل اللہ کی تعریف و توصیف کی گئی ہے، جنھیں منقبت کی ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اکبرؔ کے بعد کئی شعرا ہوئے ہیں جن کا کلام مذہبی رجحانات کا حامل ہے اور بزرگانِ دین و اکابر عظام کے تقدس و عقیدت سے مملو ہے۔ احمد علی شوقؔ قدوائی، عظمت اللہ خاں، سیّد وحید الدین سلیم پانی

پتی، شاد عظیم آبادی، مولانا محمد علی جوہرؔ، بے نظیر شاہ وارثی، ریاضؔ خیرآبادی، اصغر گونڈوی اور ظریفؔ لکھنوی کے نام اس ضمن میں لیے جاسکتے ہیں، ان میں سے چند کا منقبتی کلام بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہرؔ اپنے معتقدانہ جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہوں جو کثرت ہی کے قائل ان پہ کیا
رازِ فتح سبطِ پیغمبر کھلے

(جذبات جوہر ہاشمی پریس میرٹھ ص:۱۰)

حضرت ریاضؔ تو مئے عشقِ خواجہ میں سرشار نظر آتے ہیں:

جاتے ہی، میکدہ مجھے اجمیر ہو گیا اتنی ملی کہ پینے سے جی سیر ہو گیا
تڑپا رہا ہے ذوقِ زیارت مجھے بہت میرا بھی قصد اب سوئے اجمیر ہو گیا
پہنچا کہاں ریاضؔ سا سجدہ گذارِ حق تھا قصد کعبہ، رخ سوئے اجمیر ہو گیا

(ریاض خیرآبادی، ''ریاض رضواں'' حیدرآباد ۱۹۳۸ء ص:۶۶۔۶۵)

ان تمام شعرا میں ظریفؔ لکھنوی (م ۱۹۳۷ء) کے کلام میں منقبتی اشعار کی بہتات ہے۔ ان کے یہاں باوجود ظرافت کے تقدس کا رنگ غالب دکھائی دیتا ہے:

حسین ابن علی اے کریم ابن کریم خدا گواہ کہ تو ہے مرادِ ذبحِ عظیم
گلِ ریاضِ نبیؐ فخر آلِ ابراہیم شہیدِ راہِ خدا سب کا واجب التعظیم
خود اپنا وعدۂ طفلی نباہنے والا
نبیؐ کی امتِ عاصی کا چاہنے والا

ذبیح خنجر ظلم و شہیدِ کرب و بلا نہ تجھ سا تھا کوئی پہلے نہ اب ہوگا
ترے کرم کا ہے شہرہ جہان میں مولا کہ جس نے سر بھی دیا راہِ حق میں گھر بھی دیا
نہ ''لا'' زبان سے نکلا تری شہ ذی جاہ
مگر یہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

(ظریف لکھنوی [مرتبہ: صفی لکھنوی] 'دیوانچی/یعنی کلیاتِ ظریف' لکھنؤ ۱۹۴۹ء، ص ۱۴۴)

ناسخؔ اور رشکؔ کے شاگردوں میں منیرؔ شکوہ آبادی کا نام اہمیت کا حامل مانا جاتا ہے۔ انھوں نے مرزا دبیرؔ کے آگے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیے تھے۔ ان کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ قصائد و مثنویاں بھی ملتی ہیں۔ ان کی دونوں مثنویوں کا آغاز حمد و نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔ مثنوی کے ان تقدیسی عناصر میں شاعر نے روایتی انداز کو ترجیح دی ہے۔ پہلی مثنوی 'حجاب زنان' عشقیہ مثنوی ہے، لیکن ان کی

دوسری مثنوی 'معراج المضامین' خالصتاً منقبتی ہے۔منیرؔ نے سبب تالیف کے ذیل میں لکھا ہے کہ 'غازی پیر کے رہنے والے الطاف حسین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آئمہ کرام کے مختلف فضائل جو مختلف قصائد میں بکھرے پڑے ہیں، اگر یکجا کر دیئے جائیں اور ساتھ ہی عام زبان میں اختصاراان مطالب کو بیان کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو'۔بس اسی ایک اشارے پر منیرؔ نے 'معراج المضامین' لکھ کر مثنوی کی صورت میں پیش کر دیا۔ معراج المضامین روایتی انداز میں لکھی ہوئی مثنوی ہے۔ اس کے موضوعات اہل بیت کے فضائل و کرامات ہی کو احاطہ کرتے ہیں۔شاعر نے ہر واقعے کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔حضرت علیؓ کی تفضیل وہ یوں بیان کرتے ہیں:

علی مسند نشیں ھل اتیٰ ہے　　علی نقشِ نگیں انّما ہے
علی ہے موج سب عالم سفینہ　　علی ہے علم کا بابِ مدینہ
علی ہارون ہے موسیٰ پیمبر　　پیمبر شہرِ علمِ حق علی در

حضرت علیؓ کے فضائل بیان کرنے کے بعد شاعر نے فاطمۃ الزہراؓ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔

جنابِ فاطمہ صدیقہ پاک　　گرامی دختر سلطان لولاک
جگر بندِ نبیؐ، محبوبۂ حق　　فلک کی روشنی جنت کی رونق
خدا و مصطفیٰ کرتے تھے خاطر　　فرشتے خدمتِ اقدس میں حاظر
کریمہ، طاہرہ، مخدومۃ، زھرا　　شفیعۃ، صادقۃ، معصومیۃ، زھرا

(ڈاکٹر زہرہ بیگم یاسمین: 'منیر شکوہ آبادی حیات وکلام' لکھنؤ، ۱۹۷۰ء، ص۱۹۶)

یہ پوری منقبت اسی طرح حضرت فاطمہ کی مدحت طرازی کرتی چلی گی ہے۔اس کا ہر شعر گلہائے عقیدت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ منیرؔ شکوہ آبادی نے ۲۹ قصائد بھی لکھے ہیں جن میں سے آٹھ قصیدے منقبت میں اور دو نعت رسولؐ میں ہیں۔منقبت میں دو حضرت علیؓ کی مدحت میں ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت فاطمہؓ کی شان میں،ایک حضرت علی اکبرؓ کی منقبت میں دو قصیدے امام مہدی کی شان میں اور بقایا ایک ایک آل عباس اور علی موسیٰ رضا کی منقبت میں ہے۔ان قصائد میں ممدوحین شخصیات کی عظمت و جلال اور قصیدے میں پر شکوہ الفاظ نیز بلندیِ فکر،قصیدہ نگاری کے فن کو اونچا مقام عطا کرتے ہیں۔قصیدے کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے مدح کے بعد شاعر حسن طلب میں ممدوح کے سامنے اعانت کے لیے دست سوال دراز کرتا ہے۔منیرؔ بھی حضرت علیؓ کی بارگاہ میں استعانت کی بھیک مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اے خطیب منبر اوج سلونی اے امام
عالم علم لدنی شہر علم دیں کے باب
خلعت امن و اماں دو اس قصیدے کے عوض
ہند سے باغ نجف میں مجھ کو بلواؤ شتاب
اے مرے مولا ! خدا و مصطفیٰ کے واسطے
رحم فرماؤ، نہیں ہے اب شکیبائی کی تاب

(ایضاً ص:۱۹۷)

منیرؔ کے یہاں اس طرح ہر قصیدے میں استمداد یہ لہجہ دکھائی دیتا ہے۔حسن طلب میں رقت اور ناداری کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے:

یا سیّدہ ! منیرؔ حزیں کی مدد کرو — یہ تیرہ روز گار بھی جویا ہے نور کا
خدا کے واسطے امداد کیجیے جلدی — کہ ضیقِ رزق سے ہوں مبتلائے کرب عظیم
نجات کا مرے دل کو یقین دو ایسا — کہ تا ہو گرمیِ امید برق و من پیہم

مولانا احمد رضا خاںؒ بریلوی

۱۸۵۷ء کی یورش کے بعد جب پورے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا اور مسلم حکمرانوں کو گویا بے دست و پا کر دیا گیا تو علمائے کرام نے مسلمانانِ ہند کی دنیاوی واُخروی زندگی سنوارنے کے لیے کمر کس لی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دلوں میں جاگزیں کرنے اور راہ راست پر امت محمدیہ کو چلانے کے لیے ان کی تربیت کا انتظام و انصرام کیا گیا اور دیوبند و بریلی جیسے مرکز قائم کیے گئے۔ یہاں کے علمائے کرام اگر چہ فکری و مسلکی سطح پر متفق نہ رہے، لیکن منفعتِ امت کے لیے دونوں کا ہدف ایک تھا۔ بریلی علما کے ان سپوتوں میں مولانا احمد رضا خاںؒ اہلِ سنت و جماعت کے امام کہلائے۔ ان کی تبحرِ علمی کا لوہا ان کے مخالفین بھی مانتے تھے۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کی ولادت جون ۱۸۵۶ء میں اور وفات ۱۸/اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی تھی۔ یوں تو آپ کی کتابوں کی تعداد سیکڑوں میں پہنچتی ہے لیکن ترجمہ قرآن 'کنزالایمان'، فتاویٰ رضویہ اور نعت کا دیوان 'حدائقِ بخشش' مشہور و مقبول ہیں۔ مذہبی خدمات کے علاوہ آپ کی سماجی خدمات کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

احمد رضا خاںؒ بریلوی نے ادب میں صنف نعت اور سلام کو ایسی توانائی عطا کی کہ اردو دنیا کے کونے کونے میں ان کا شہرہ ہے۔ مولانا کے فکر و تفحص ہی کی وجہ سے اردو میں تنقید و تحقیق کو اہم موضوعات ملے۔ ''حدائق بخشش'' میں نہ صرف نعتیہ کلام ہے بلکہ اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور

حضرت عمرؓ کے مناقب ہیں، ام المومنین حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہؓ کی شان اقدس میں مدحت کے ترانے ہیں۔ ان کے علاوہ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ اور مولانا سیّد احمد نوری میاںؒ کے مناقب بھی درج ہیں۔ آپ کے مناقب میں اکثر۔قرآن و احادیث کے حوالے ملتے ہیں، مثلاً حضرت ابوبکر صدیق کی مدح سرائی میں وہ یوں قرآن کی آیات قلم بند کرتے ہیں:

یہی ہیں اکرمکم اور یہی ہیں اتقیٰ کم
یہی ہیں ثانی اثنین از ہما فی النار

حضرت عمر فاروق کی شان اقدس میں رضاؔ حدیث کی لفظیات اپنے شعر میں یوں شامل کرتے ہیں:

نظر سوئے لو کان بعد نبی
خیال اقتدرا بالذین کی جانب

اور حضرت عائشہؓ کی مدح میں مولانا گلہائے عقیدت یوں نچھاور کرتے ہیں:

تیرے جلوے سے رہی مسندِ افتا روشن
عہدِ صدیقؓ سے تا دورِ حیاتِ حیدرؓ

حضرت غوثؒ کی شان میں کہی گئی آپ کی منقبت کو تو بڑی مقبولیت حاصل ہے:

واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا
اونچے اونچوں کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا

مولانا احمد رضاؒ نے جو قصائد لکھے ہیں ان میں عمر فاروقؓ کی مدحت میں لکھا گیا قصیدہ فن و ہنر کی بہترین مثال ہے۔ اس قصیدے کی ردیف نہایت دشوار ہے اور شاعر نے مسلسل ۲۱۶ اشعار میں اسی مشکل ردیف کو نبھایا ہے۔ اس طویل قصیدے میں عہدِ فاروقی کے نہایت اہم واقعات قلم بند کیے گئے ہیں، جس کی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت اور تاریخ دونوں سامنے آجاتے ہیں۔ عہدِ فاروقی کے محاربات کی تصویر کشی مولانا نے ضرور کی ہے، لیکن اس میں تیر و تفنگ اور شمشیر و سنان کا ذکر دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں! ممدوح کی مدحت طرازی سے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حدائقِ بخشش میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح میں دو قصائد ملتے ہیں۔ پہلا قصیدہ اس طرز میں لکھا گیا ہے، مانو مداح ممدوح کے سامنے اپنے دل کے بھید کھول رہا ہے۔ دوسرا قصیدہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی غوثیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کی دوسری فصل میں آپ کے فضائل بیان ہوئے ہیں، تیسری فصل دشمنانِ غوث کے درمیان آپ کی تفضیل اور چوتھی فصل عبدالقادر جیلانیؒ سے استعانت و امداد کی طلب میں ہے۔ اس قصیدے میں غوثؒ سے تخاطب شاعر کی وارفتگی اور والہانہ محبت کا آئینہ دار ہے۔ احمد رضا خاںؒ نے صنف سلام کو بھی رواج دے کر ترقی کی منزل پر

پہنچادیا۔آپ کے یہاں منقبتی سلام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔حضرت ابوبکرؓ وعثمانؓ کی بارگاہ میں وہ یوں سلام پیش کرتے ہیں:

سایۂ مصطفیٰ، مایۂ اصطفا عز و نازِ خلافت پہ لاکھوں سلام
یعنی اس افضل الخلق بعد الرسل ثانی اثنین ہجرت پہ لاکھوں سلام
در منشور قرآن کی مسلک یہی زوج دو نور عفت پہ لاکھوں سلام
یعنی عثمان صاحب قمیص ھدیٰ حلہ پوشِ شہادت پہ لاکھوں سلام

ان اشعار میں وہ تاریخی کوائف شامل ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔حضرت مولانا احمد رضا بریلویؒ نے خلفائے راشدین کے علاوہ اہل بیت کے سپوتوں پر بھی نذرانۂ سلام پیش کیے ہیں۔پھر ائمہ کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور دیگر اولیائے کرام کی خدمت میں بھی سلام پیش کیے گئے ہیں۔

علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؔ

دور جدید میں جہاں تک علامہ اقبالؔ کی شاعری کا تعلق ہے،تو اس میں بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے شاعر نے اسلامی تعلیمات ہی کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔اسلامی طرز فکراور طریقہ ہائے زندگی کی توضیح وتفہیم ہمیں اقبالؔ کی شاعری میں ملتی ہے،لیکن اقبالؔ کی شاعری کا مقصد اسلام کی تبلیغ کبھی بھی نہیں رہا۔انسانیت کی فلاح کے لیے انھوں نے جہاں تعلیمات ونظریاتِ اسلامی کو اپنی شاعری میں جگہ دی،وہیں اس کے عظیم کرداروں کی حیات طیبہ کو بھی اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے،جن کی پاکیزہ روشِ زندگی پر گامزن ہونے میں ہماری کامرانی ہے۔حضرت بلال کی منقبت میں اقبالؔ نے ایک نکتہ پیدا کیا ہے کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کے فیض نے بلالؓ کو دوام بخشا اور زندہ جاوید بنادیا،ورنہ یہاں تو رومیؔ بھی فنا ہوگیا ہے:

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومیؔ فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

(اقبالؔ،''کلیات اقبال''[بانگ درا] ناز پبلیشنگ ہاؤس دہلی تاریخ ندارد،ص:۱۸۲)

حضرت بلال کی توصیف بیان کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا ہے ؎

چمک اٹھا جو ستارا ترے مقدر کا حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

نظر تھی صورتِ سلماں ادا شناس تری شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

(ایضاً)

اقبالؔ اپنی تعلیم کے لیے انگلستان جارہے تھے۔ جانے سے قبل وہؔ حضرت محبوب الٰہی دہلی کے مزار پر دعا مانگنے کے لیے حاضر ہوئے تو یہ دعا کی کہ میری زبان وقلم ذریعۂ دل آزاری نہ بنے۔ میں پھر لوٹ کر اپنے مادر و پدر کے قدموں میں رہوں۔ اس کے بعد اپنے استاد اور بھائی کے لیے بھی دعا کرتے ہیں۔ دعا کا ابتدائیہ حصہ صاحب قبر کی مدح میں بڑی عقیدت کے ساتھ قلم بند ہوا ہے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے قائم ہیں نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

(ایضاً ص:۷۳)

اقبالؔ نے آخری شعر میں حسب مراتب کا خیال نہیں رکھا۔ حضرت خضر کی شخصیت کے تعین میں تو اختلاف ہے کہ آیا وہ پیغمبر تھے یا فرشتہ لیکن حضرت مسیحؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر پر کسی بڑے سے بڑے اور عظیم المرتبت بزرگ یا ولی اللہ کو ترجیح دینا توہین رسالت کے زمرے میں آئے گا۔ نبوت ہی وہ کمالِ انسانیت ہے جس میں کسب وکوشش کو دخل نہیں ہے۔ یہ عظمت تو خداداد ہوتی ہے، جسے اللہ اپنے برگزیدہ و چنیدہ بندوں کو ودیعت کرتا ہے اور وہ ہستیاں نبوت سے سرفراز کر دی جاتی ہیں۔ اس سرفرازی کے لیے مشق ومجاہدہ کام نہیں آتا، اقبالؔ نے خلفائے راشدین کی مدح سرائی کے نغمے بھی الاپے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایثار، قربانی اور جود وسخا کے اوصاف کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے تاریخی شواہد سے مدد لی ہے۔ غزوہ خندق کا وہ تاریخ ساز واقعہ جب مسلمانوں کو مالی امداد کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلان کر دیا کہ اس کارخیر میں ہاتھ بٹائیں۔ کہنے کی دیر تھی کہ مال جمع ہونے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی نصف دولت ملت بیضا کے لیے وقف کر دی اس گمان میں کہ اب مجھ سے زیادہ کوئی دے نہیں سکے گا۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سارا مال واسباب سمیٹ کر حضورؐ کی خدمت میں رکھ دیا تو حضورؐ نے دریافت کیا کہ اولاد کے لیے گھر میں کیا رکھا تو جواباً عرض کیا گیا کہ اللہ و رسولؐ کافی ہیں۔ اقبالؔ نے اسی واقعہ کو اشعار میں پیش کر کے ابوبکر صدیق کی عظمت بیان کی ہے:

لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار
ملک یمین و درہم و دینار و رخت وجنس اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدۂ انجم فروغ گیر — ہے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

(کلیاتِ اقبال [بانگ درا] ص:۱۶۹)

اقبالؔ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ بزرگوں اور اولیائے کرام کے مزارات سے فیض حاصل کرنے اور صاحب قبر کے توسّل کے قائل تھے۔ چنانچہ سرکشن پرشاد شادؔ کو خط لکھ کر نا گپور کے بابا تاج الدین کے متعلق استفسار کرتے ہیں کہ ان کی بزرگی کا کیا عالم ہے؟ ان کی کلیات میں بیشتر جگہوں پر مزارات کی حاضری کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ وہ گورستانِ شاہی میں بھی پہنچتے ہیں تا کہ عبرت حاصل ہو سکے۔ ان کی کلیات میں بعض تاریخی شخصیات اور اولیائے کرام کے کارناموں کا ذکر ہے، جن میں منقبتی انداز یعنی تعریفی لب و لہجے میں بات کی گئی ہے۔ اتنا ہی نہیں، انھوں نے غیر مسلم سیاسی شخصیتوں اور برادرانِ وطن کے سادھوسنتوں اور دیوتاؤں کا ذکر بھی نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے۔

مولانا حسرتؔ موہانی

اردو کے رئیس المتغزلین حسرت موہانیؔ کا نام سیّد فضل الحسن ہے۔ وہ موہان ضلع اناؤ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ آزادی کی تاریخ میں وہ مجاہد آزادی کے صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ اگر چہ وہ شاعر و ادیب تھے اور دیوان کے علاوہ محاسنِ سخن، تذکرۂ شعرا، شرح دیوانِ غالب ان کی نثری تصانیف ہیں۔ 'اردوئے معلیٰ' اپنے دور کا مشہور ادبی رسالہ انھوں نے ہی جاری کیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کے لیے ان کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ مردِ مجاہد تھے اور انگریزوں کے ساتھ گوریلا جنگ لڑنے کے قائل تھے۔ جنگِ آزادی میں 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ حسرتؔ ہی نے دیا تھا۔ عشقیہ شاعری کے علاوہ ان کے کلام میں مذہبیات کے پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا نے نفوس قدسیہ کی حیات طیبہ کے گلوں سے اپنے گلشن شاعری کو سجانے کے جتن کیے ہیں، حضرت عبد القادر جیلانی سے وہ بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے پاس اولیاء اللہ کی شان صرف ایمان و اتقا ہی سے ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ وہ بقول قرآن: حکیم اولیائے کرام بے حزن و بے خوف ہیں۔ (سورۂ یونس رکوع ۶) بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ غم؛ پر ایمان رکھتے تھے۔ حسرتؔ کہتے ہیں۔

ایمان و اتقا ہی نہیں شان اولیا بے حزن وخوفِ غیر بھی ہے جانِ اولیا
ہر سو عیاں ہے صبغۃ اللہ کی ہی بہار رونق پہ ہے خزاں میں بھی بستانِ اولیا

(حسرتؔ موہانی، ''کلیاتِ حسرت''، مکتبہ اشاعت اردو دہلی طبع اول ۱۹۵۹ء، ص: ۲۰۳)

حضرت عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں حسرتؔ کی محبت اوج پر نظر آتی ہے:

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ میرِ بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ
حالِ دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للہ

(ایضاً)

دوسری منقبت میں وہ یوں گل افشانی کرتے ہیں:

علی کے لال زہرہ کے دلارے رسول اللہ کی آنکھوں کے تارے
نمونے شیوۂ خلق حسن کے نمایاں ہے تری سیرت میں سارے
کرو حسرتؔ حضورِ میرِ بغداد جمالِ نورِ مطلق کے نظارے

(ایضاً ص: ۳۰۳)

حضرت علیؓ کی مدح کرتے ہوئے حسرتؔ اس درگاہ عالیہ میں اس طرح التجا کرتے ہیں:

گم راہوں کی رہنمائی کیجیے یا علی مشکل کشائی کیجیے
کچھ ہمیں بھی اے امیرِ اولیا دیجیے، پاسِ گدائی دیجیے
خواہشِ ظاہر سے باطن کی طرف اہلِ دل کی دلربائی کیجیے

(ایضاً---)

حسرتؔ نے ان بزرگوں کے علاوہ خواجہ اجمیریؒ اور پانی پت کے اولیائے کرام کی بھی مدح سرائی کی ہے۔ان میں والہانہ پن بھی ہے اور تقدس وعقیدت بھی۔ان کے یہاں منقبتوں میں تغزل کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔حسرت کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نعتوں میں بھی منقبت کے مضامین شامل کرنے کے جتن کیے ہیں:

علی آگاہ ہو کے جس سے باب علم کہلائے وہ رازِ عشق ہم کو بھی بتا دو یا رسولؐ اللہ
تمنائے محبت کو لقائے غوث اعظم کی ہمیں بغداد کا رستہ دکھا دو یا رسولؐ اللہ
روشن ہے نور صبر و سکوں سے سواد شام تاباں ہے صبح عشقِ درخشانِ اولیاء
روز ہوجاتی ہے رویاء میں زیارت حسرتؔ آستاں شہ رزاق کا ہے زنداں کے قریب

مثال میں پیش کیا گیا آخری شعر حسرتؔ کے جیل میں بیتے واقعہ کی ایک روداد ہے۔تحریک آزادی کے سپوتوں کو جب قید و بند کی سزائیں دی جارہی تھیں تو حسرتؔ کو بھی فیض آباد کی جیل میں رکھا

گیا۔ پھر سینٹرل جیل اور وہاں سے بند گاڑی میں لکھنؤ کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔لیکن انھیں اس مقام کی خبر تک نہیں ہونے دی گئی۔ ایک شب خواب میں انھیں اپنے مرشد مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کی زیارت ہوئی۔ آپ نے انھیں تسلی دی کہ وہ شاعر کی جیل سے قریب ہی ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کی حضرت کی قبر مبارک اس جیل خانے سے قریب ہی ہے۔اس وقت حسرتؔ نے فرط خوشی میں یہ غزل نما منقبت لکھی تھی:

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

حشر میں اپنے گناہوں سے مجھے خوف ہو کیا
ان کی رحمت بھی تو ہے منزلِ جاناں کے قریب

وہ جو ہیں پاس تو محبس بھی ہے اک باغ ہمیں
کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب

لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار
کھینچ لایا ہے دل اک شاہد پنہاں کے قریب

(ایضاً ص:۲۷۸)

فیوض و برکات کے مبدءِ ارضی اولیائے کرام سے عقیدت ومحبت کے اظہار کے لیے ہمارے شعرا نے سخن طرازی کی نئی جہتیں اور فنکارانہ کمالات ایجاد کیے ہیں، اور ثنا گستری کی بنیاد ایسے حقائق پر رکھی ہے، جو دلوں کو گرما دے، ذہن کو مسرور کر دے۔ حضرت امجدؔ حیدرآبادی نے اولیائے کرام سے جو عقیدت ومحبت استوار کر رکھی تھی، یہ اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ انھیں 'محمدؐ' کے دونوں 'میم' کا پرتو حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی اور حضرت معین الدین چشتی میں نظر آتا ہے:

دیکھ کر حسنِ محمدؐ کہتے ہیں اہل نظر
نور مطلق ہو گیا ہے جلوہ گر تعین میں

ایک محی الدین میں اور اک معین الدین میں
دیکھتے ہیں ہم تو دو میم محمد کا ظہور

(امجدؔ حیدرآبادی، ''رباعیات امجد''، حصہ سوم، حیدرآباد طبع سوم ص:۱۰۲)

سہیلؔ عظیم آبادی نے تو حضورؐ کے شمائل کے ذیل میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے اوصاف بیان کر کے نعت میں منقبت کو داخل کر لیا ہے:

وہ دینِ حق کی اساس محکم وہ قصرِ ایماں کے رکن اعظم
وہ جس کو خود مقصدِ دو عالم بصد تمنا بلا رہے ہیں
عمر کی آمد کا غلغلہ ہے تو قصر وکسریٰ میں زلزلہ ہے
عجم کے والی لرز رہے ہیں حرم کے بت لڑکھڑا رہے ہیں
کسے میسر کہاں ہے ممکن یہ فقر ظاہر شکوہ باطن
غلام، اشتر سوار لیکن پیادہ پا آپ جا رہے ہیں

(بحوالہ: ''اردو'' کراچی)

متاخرین شعرا میں حفیظؔ جالندھری، تلوک چند محروم، شاکرؔ میرٹھی، عرشؔ ملسیانی، اثرؔ اور جوشؔ ملیح آبادی کے نام لیے جاسکتے ہیں، جنھوں نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ منقبتیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سارے شعرا ہیں، جن کی منقبتوں کو پذیرائی حاصل ہورہی ہے۔ ان شعرا میں اہم نام حفیظؔ جالندھری کا ہے۔ 'شاہ نامۂ اسلام' ان کا کارنامہ ہے جس میں انھوں نے تاریخ اسلام کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ حفیظؔ کی یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکی تھی، اس کا بقایا حصہ ماہنامہ تجلّی کے مدیر عامر عثمانی نے پورا کیا۔ علاوہ اس شاہکار بیانیہ نظم کے، ان کی شاعری کے چند مجامع بھی ہیں، جن میں 'نغمہ راز' اور 'سوز و ساز' اہم مانے جاتے ہیں۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ انھوں نے گیت بھی لکھے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح اور شہسوارِ کربلا ان کے یہ گیت کافی مشہور ہوئے ہیں۔ ان کے منقبتی اشعار میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے عکس دکھائی دیتے ہیں، حضرت زہراؓ کی منقبت میں حفیظ کی مدح سرائی کا انداز ملاحظہ ہو:

وہ زہرا ہاں وہی زہرا رسول اللہ کی بیٹی — وہ زہرا شہنشاہوں کے شہنشاہ کی بیٹی
وہ کملی اوڑھنے والے مجسم نور کی دختر — وہ عبداللہ کی پوتی، آمنہ کے لال کی دختر
وہ صبح چشم نورِ رحمۃ للعالمیں زہرا — نگیں خاتم نبیین ختم المرسلیں زہرا

ان اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رکھی جانے والی حضرت زہرا کی نسبتوں کے سہارے آپؓ کے فضائل اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حفیظؔ نے اپنی نظموں میں حضرت حسینؓ کی شجاعت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ الفاظ کے برجستہ استعمال اور چھوٹی بحروں نے ان کی نظموں میں ترنم پیدا کردیا ہے، کربلا میں حضرت حسینؓ کی شہسواری کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

لباس ہے پھٹا ہوا غبار میں اَٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ جس کی ایک ضرب سے کمالِ فنِ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغۂ دو سر کہ ایک ایک وار پر
اٹھی صدائے الاماں زبانِ شرق و غرب سے
یہ بالیقیں حسین ہے نبیؐ کا نورِ عین ہے

(حفیظ جالندھری، ''سوز و ساز''، مجلس اردو لاہور سنہ اشاعت ندارد ص:۶۶)

شبیر حسین خاں جوشؔ ملیح آبادی

جوش کے دادا سنّی مسلک میں اعتقاد رکھتے تھے لیکن دادی اہل تشیع میں سے تھیں۔ اس لیے گھر میں دونوں مسلک کی رسومات ادا کی جاتی رہیں۔ بالخصوص ان کے گھر میں امام باڑا بھی بنوایا گیا تھا۔ جہاں عزاداری کی جاتی۔ پھر انھیں جو اتالیق کلب علی مانی جائسی ملے۔ وہ بھی اہل تشیع میں سے تھے۔ ملیح آباد سے جوش جب لکھنؤ آئے تو شعیت کا رنگ ان پر اور بھی گہرا ہوتا گیا اور انھوں نے حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کو اپنا رہبر تسلیم کر کے ان کے اسوۂ حسنہ کو اپنی منقبتوں میں پیش کرتے رہے ہیں۔ 'شعلہ و شبنم' میں جوشؔ کی مشہور نظم بعنوان 'حسین اور انقلاب' نہایت مشہور ہے۔ یہ نظم ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ کے آغائی امام باڑے میں پڑھی گئی تھی۔ مسدس کی ہئیت میں لکھی اس نظم میں حضرت حسینؓ کی شجاعت اور حریت پسندی کو اس انداز میں اجاگر کیا گیا ہے کہ آہ و فغاں کی بجائے جوش و ولولہ اور جذبۂ ایثار بیدار ہو جاتے ہیں:

اے زمیں! خوش ہو کہ تیری زیب و زینت ہے حسین
تیرے سنّاٹے میں محو خوابِ راحت ہے حسین
جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے، پھر کچھ بھی نہ پایا وہ حسین
مرتبہ اسلام کا جس نے دو بالا کر دیا
خون نے جس کے دوعالم میں اجالا کر دیا

(جوشؔ ملیح آبادی، ''شعلہ و شبنم''، بمبئی ص:۱۸۹)

اور منقبت کا یہ والہانہ انداز بھی دیدنی ہے۔ 'آوازۂ حق' جوش کی نظم ۱۹۲۰ء میں کہی گئی تھی اور غالباً اسلامیات کے سلسلے کی یہ پہلی نظم ہے۔ اس وقت ترکی سے خلافت کا خاتمہ ہو رہا تھا، جبکہ اس وقت خلافت کا باقی رہنا بہت ضروری سمجھا گیا تھا۔ اس نظم میں جوشؔ نے امت مسلمہ کو جھنجھوڑنے کے لیے کردار حسین کی یاد دلائی ہے:

اک روز ہوا شوق مرے دل میں یہ پیدا اس راہ سے گزرے ہیں جو نام آور و یکتا
حالات بھی کچھ ان کے میں دیکھوں کہ وہ تھے کیا اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو اُلٹا

فہرست میں اک نام تھا جو سب سے جلی تھا
مژدہ ہو کہ وہ نام حسینؓ ابن علیؓ تھا

قربان ترے نام کے اے میرے بہادر　　تو جانِ سیاست تھا، تو ایمان تدبر
معلوم تھا باطل کے مٹانے کا تجھے گرُ　　کرتا ہے تری ذات پہ اسلام تفاخر
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا
تلوار کے نیچے بھی وہی نعرۂ حق تھا
ہر چند کہ ایوبؑ بھی اس فن میں تھے یکتا　　یونسؑ نے بھی اک حد تک اسے خوب نبھایا
یعقوبؑ نے بھی زور تحمّل کا دکھایا　　پر سب سے رہا بڑھ کے محمدؐ کا نواسا
حیرت میں پیمبر ہوئے وہ کرکے دکھایا
مرتے نہیں کس طرح، اسے مر کے دکھایا

(ایضاً ص: ۲۲۳، ۲۳۳)

جوشؔ کا ایک مسدس 'اے مرتضیٰؓ'، حضرت علیؓ کی مدحت طرازی کا عمدہ اور انوکھا نمونہ ہے، جس میں شوکتِ الفاظ کی گھن گرج ہر قاری کے کانوں کو گرماتی ہے:

اے مرتضیٰؓ مدینۂ علمِ خدا کے باب　　اسرارِ حق ہیں تیری نگاہوں پہ بے نقاب
اے تیری چشم فیض سے اسلام کامیاب　　ہر سانس ہے مکارمِ اخلاق کا شباب
نقشِ سجود میں، وہ تیرے سوز و ساز ہے
فرشِ حرم کو، جس کی تجلی پہ ناز ہے
اے مرتضیٰؓ! امامِ زماں، شیرِ کردگار　　عرفاں کی سلطنت میں نہیں تجھ سا تاجدار
تیری ادائے حرب کا اللہ رے وِقار　　اک ضرب پر عبادتِ ثقلین ہو نثار
تو خندہ زن ہے فتنۂ بدر و حنین پر
پیغمبری کو ناز ہے تیرے حسین پر

(ایضاً ص: ۱۹۲، ۱۹۳)

اپنی ایک نظم 'آنسو اور تلوار' میں جوشؔ نے حضرت حسینؓ کی وصف بیانی کے لیے انوکھی تشبیہات کا استعمال کیا ہے:

قلبِ اعدا پر حسینؓ ابن علیؓ کا رعب و داب　　قطرۂ بے مایۂ شبنم پہ گویا آفتاب
رسم و راہ حق سے ربط، آئینِ باطل سے عناد　　عہدِ جانبازی، سرِ مردانگی، عزمِ جہاد
شوقِ آزادی، خیالِ سرفروشی، ذوقِ مرگ
یہ تھے انصارِ حسینؓ ابنِ علی کے ساز و برگ

مرد کو ملتی ہے ترکے میں جھلکتی ذوالفقار　　عورتوں کو شاخِ گل کا لوچ، شبنم کا نکھار
مرد کو ہوتا ہے حاصل فاتحانہ قہقہہ　　عورتوں کو ہچکیوں کی گونج، شیون کی صدا

(ایضاً ص:۲۰۸۔۲۰۹)

جوشؔ کے یہاں حریت کے اس جذبے کو دلوں میں پیوست کرنے کی خاطر امت کو غیرت دلانے کا یہ وتیرہ اپنایا گیا ہے۔ اس نظم میں جوشؔ کی حریت پسندی اور انقلابی جذبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ انقلاب تند خو کو پسند کرتے ہیں اور اس کے آنے کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ سوگواران حسین کو وہ یوں تسلی دلاتے ہیں:

انقلابِ تند خو جس وقت اٹھائے گا نظر　　کروٹیں لے گی زمیں، ہوگا فلک زیر و زبر
کانپ کر ہونٹوں پہ آجائے گی روحِ بحر و بر　　وقت کا پیرانہ سالی سے بھڑک اٹھے گا سر
موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا
ہاں مگر نامِ حسین ابن علیؓ رہ جائے گا

(ایضاً ص:۲۱۳)

جوشؔ کے اس مجموعہ کلام 'شعلہ وشبنم' کا پہلا باب آتشکدہ ہے، دوسرا باب 'رنگ و بو' اور تیسرا باب 'اسلامیات' کے لیے مختص ہے۔ اس تیسرے باب کی تمام منظومات کا موضوع مناقبِ علیؓ وحسینؓ ہی ہے۔ شاعر نے اس باب کی ابتدا ہی میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں یہ دعا کی ہے کہ:

اے خدا سینۂ مسلم کو عطا ہو وہ گداز　　تھا کبھی حمزہ و حیدر کا جو سرمایہ ناز
پھر فضا میں تری تکبیر کی گونجے آواز　　پھر اس انجام کو دے گرمیِ روحِ آغاز
نقش اسلام ابھر جائے، جلی ہو جائے
ہر مسلمان حسین ابنِ علی ہو جائے

(ایضاً ص:۱۸۳)

اس طرح جوشؔ کی حریت پسندی کا عکس ان مناقب میں نظر آتا ہے۔ یہ جذبہ ان کے یہاں اہل بیت کے ان جانبازوں سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

"اُردو منقبت کا فکری تنوع: ایک جامع جائزہ" کے عنوان سے اس مقالے کو میں جوشؔ کی منقبتی شاعری پر اس لیے ختم کر رہا ہوں کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے لیے مہاجرت اختیار کرنے والے غالباً جوشؔ ہندوستان کے آخری ادیب وشاعر رہے ہیں۔

اردو میں منقبتی شاعری کا یہ تجزیہ تقسیم ہند کے زمانے تک محدود ہے۔ وہ اس لیے بھی کہ ترقی پسند اور

رومانی تحریکات کے زیر اثر تقدیسی ادب قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا۔ جہاں عالمی سطح پر مذہبی ادب سے جڑی تخلیقات کلاسک کے درجات پر فائز ہو رہی تھیں۔ وہاں اردو میں تقدیسی ادب کو دائرۂ ادب سے خارج کرنے کی فکریں ہو رہی تھیں، بلکہ ادب برائے ادب کے پرستاروں نے تو ادب کی مقصدیت ہی سے انکار کر دیا تھا۔ بہرحال! آج اللہ کے فضل سے ہمارے ادیبوں میں دینی شعور بیدار ہو رہا ہے اور تقدیسی ادب کے نام نہاد غیر دینی اداروں میں بھی تقدیسی ادب پر تحقیقی کام ہونے لگا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ عزیزم سیّد صبیح الدین رحمانی ''نعت رنگ'' کو صرف تقدیسی ادب کے لیے مختص کر کے اس میں نعت کے ساتھ حمد و مناجات اور اب منقبت پر بھی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا کرے یقیناً قرآن و احادیث کے بعد اکابرینِ امت کی صالح زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، اسی لیے ان سے وابستہ تقدس و عقیدت کے گل ہائے رنگا رنگ کو شعرائے کرام نے اپنی شاعری کے گلدستے کا جزو بنایا ہے جو منقبت کی صورت میں اردو شاعری میں جلوہ گر ہے۔

□□□

وہ ابراہیم ہیں اُنؑ کا لقب خلیل اللہ
ہر اک نظر میں درخشاں مقام ہے اُنؑ کا
شعائر اُنؑ کے عبادات کا اثاثہ ہیں
حضورؐ کا ہے جو پیرو، غلام ہے اُنؑ کا
ہے ابراہیم کی اور آلِ ابراہیم کی نذر
ہمارا سارا درود و سلام ہے اُنؑ کا
خوشا نصیب کہ تعمیرِ خانہ کعبہ میں
فضیلت اُنؑ کی ہے خاص اہتمام ہے اُنؑ کا
حضورؐ پاک سے بڑھ کر کوئی نہیں واقف
جو انبیا و رسل میں مقام ہے اُنؑ کا

(ریاض مجید)

اردو میں منقبت نگاری تاریخ و ارتقا

ڈاکٹر احسن زیدی

ABSTRACT: Dr. Ahsan Zaidi was the first scholar to author a PhD dissertation on the subject of MANQABAT in the Urdu language. The present article is a brief excerpt from his comprehensive thesis. Due to its scholarly significance, it was deemed essential to include it in "NAAT RANG". This article delves into the literal and technical definitions of MANQABAT, examining its themes, objectives, scope, and its intellectual and academic dimensions. Furthermore, it outlines foundational principles for crafting an artistic and stylistically refined form of MANQABAT. Undoubtedly, this article represents a foundational and pioneering academic contribution to the exploration of the literary identity of MANQABAT.

لغوی اور اصطلاحی مفہوم

منقبت عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ (ن۔ق۔ب) ہے۔ مناقب اس کی جمع آتی ہے۔ نقب کی مختلف صورتوں پر بحث کرتے ہوئے المنجد (۱) کے مؤلف نے اس کی کئی معنوی پرتوں پر یہاں روشنی ڈالی ہے۔

نقب: نقب الحائط = دیوار میں سوراخ کرنا

نقب: نقابه علی القوم صار نقیباً علیهم = قوم کا سردار

تنقب: بہت تحقیق اور کرید کرنا

النقیب: جمع نقباء شاهد القوم وضمینهم وعریفهم وسیدهم سمی بذالك ولانه ینقب عن امورهم۔

قوم کا گواہ، قوم کا ضامن، قوم کا عریف (نمبردار) قوم کا سردار۔ یہ نام اس کا اس لیے ہے کہ وہ ان کے امور میں نقب لگاتا ہے یعنی ان کے امور کی تحقیق اور کرید کرتا ہے۔

المنقب: الرجل العالم بالاشیاء الکثیر البحث، عنھا والتنقیب علیھا۔

بہت زیادہ تحقیق و تجسس اور بحث کرنے والے عالم۔

المنقبہ: ج مناقب = الفعل الکریم

مناقب الانسان ماعرف بہ من الخصائل الحمیدہ والاخلاق الجمیلہ۔

انسان کے مناقب وہ فضائل حمیدہ اور اخلاقِ جمیلہ ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے۔

لغات الحدیث میں اس لفظ کی وضاحتیں یوں آئی ہیں:

نقب: پھاڑنا، سوراخ کرنا، تفتیش کرنا، پیوند لگانا

نقابۃ: نقیب بنا (یعنی نگرانِ حال، خبر رکھنے والا)

نقب: پھٹ جانا، ننگے پاؤں ہونا

تنقیب: چلنا، جائے پناہ کے لیے خوب ڈھونڈنا، تلاش کرنا

مناقبۃ اور نقاب: مناقب بیان کر کے دوسرے پر فخر کرنا

انقاب: چلنا، حاجب یا نقیب بنا

منقبۃ: تعریف اور فضیلت کا کام جیسے مثلبہ عیب اور مذمت کا کام مناقب اور مثالب جمع ہیں۔

جمھرۃ اللغتہ کے مؤلف ابن درید نے لفظی بحث کے بعد منقبت کا مفہوم یہ لکھا ہے:

المنقبہ ضد المثلبہ والجمع مناقب وھی مافیہ وفی ابائہ من خصال جمیلۃ۔(۲)

ترجمہ: منقبت ضد ہے مثلبت کی اور اس کی جمع مناقب آتی ہے اور یہ کسی کے ذاتی اور اس کے آباء کے عمدہ فضائل سے عبارت ہے۔

سیّد محمد مرتضیٰ الزبیدی نے تاج العروس میں منقبت کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

المنقبۃ : کرم الفضل وجمعھا مناقب یقال انہ لکریم المناقب من النجدات وغیرھا وفلاں فی مناقب جمیلہ ای اخلاق حسنہ وفی الاساس رجل ذومناقب وھی المآثر والمخابر۔

ترجمہ: عمدہ افعال، اس کی جمع مناقب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شخص اپنے نمایاں خصائل وغیرہ کی وجہ سے کریم المناقب ہے اور فلاں شخص کے مناقب جمیل ہیں یعنی وہ صاحبِ اخلاقِ حسنہ ہے، اساس میں ہے صاحب مناقب فرد، یعنی ایسا مرد جو صاحب احوال و آثار ہیں۔

عربی کی ایک اور معروف لغت لسان العرب نے اسی مفہوم کی نشاندہی کی ہے۔

ان عربی لغت نویسوں کے نزدیک اعمال پسندیدہ اور اوصافِ جمیلہ جن پر انسان فخر کر سکے' منقبت کہلاتے ہیں۔ اس میں اس کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ اس کے آباواجداد کے کمالات کے حوالے سے بھی اس کی تعریف ہوسکتی ہے۔

نقب کا لفظ قرآن مجید میں تین جگہ استعمال ہوا ہے۔

۱۔ ''اور ہم تم سے قبل بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو قوت میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے اور تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے تو کیا انھیں کہیں بھاگنے کو جگہ ملی۔ (۳)

۲۔ بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں کے سرداروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ''بے شک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) قائم کیے۔ (۴)

۳۔ سد سکندری اور یاجوج ماجوج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''نہ تو وہ اس دیوار پر چڑھ ہی سکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے''۔ (۵)

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نقبوا کا صیغہ استعمال فرما کر جستجو' تلاش اور کاوش کا مفہوم ظاہر کیا۔ دوسری آیت میں نقب کو نقیب یعنی سردار کے معنوں میں استعمال کیا اور تیسری آیت میں نقب کو نقباً کے صیغے میں نقب لگانے یعنی سوراخ کرنے کے مفہوم میں استعمال کیا۔

حضرت ابن عباس ''فنقبوا فی البلاد'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ وہ چکراتے پھرتے تھے اور ایک سے دوسرے سفر کی طرف لوٹتے تھے۔ (۶)

علامہ سیوطی اس آیت کی تفسیر میں امام ابن جریر اور ابن المنذر کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ نقب کا معنیٰ آثروا ہے یعنی تلاش کرتے تھے یا گھومتے تھے۔ (۷)

الطشی کے حوالے سے انھوں نے حضرت ابن عباس کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ جب نافع بن الارزق سے فنقبوا کے معانی پوچھے گئے تو انھوں نے کہا کہ لغت یمن میں اس کا معنیٰ هَرَباً ہے یعنی وہ بھاگتے پھرتے تھے اور پھر جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ لفظ لغت عرب میں متعارف ہے تو کہا کہ ہاں! میں نے عدی بن زید کا شعر سنا ہے۔

ترجمہ: وہ شہروں میں موت کے ڈر سے بھاگتے پھرتے تھے اور زمین میں چکراتے پھرتے تھے (۸)

سرورِ کائنات نے فرمایا: جو شخص کوئی بات پوچھے پھر اس کا کھوج لگائے۔ (۹)

ایک اور حدیث میں فرمایا: عبادہ بن صامت انصار کے نقیبوں میں سے تھے۔ (۱۰) حضور نے لیلۃ القدر میں انصار کی ہر شاخ کا ایک نقیب مقرر کیا تھا کہ وہ اپنے لوگوں کو سمجھا بجھا کر اسلام کی طرف

لائیں۔ عبادہ بن صامت کو بھی ایک شاخ کا نقیب بنایا تھا۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ

''مجھے چودہ وزیر، نقیب اور نجیب عطا ہوئے ہیں''۔(۱۱)

ان مفاہیم کے علاوہ تمام کتب حدیث میں منقبت کا لفظ فضائل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

۱۔ باب مناقب الصحابہ ۲۔ باب مناقب اہل بیت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

۳۔ باب مناقب العشرہ ۴۔ مناقب المهاجرين و فضلهم

عربی سے یہ لفظ فارسی میں منتقل ہوا۔ چنانچہ حبیب اللہ آموزگار نے اس کا معنیٰ یوں لکھا ہے۔

منقبت: اسم، مقام و درجہ پیشوائی قوم

مناقب: (ج) منقبت، کارنیکو، خوہائے پسندیدہ

یہ تقریباً وہی مفہوم ہوا جس میں یہ لفظ قرآن مجید کی آیت اثنیٰ عشر نقیبا میں استعمال ہوا ہے۔

صاحب غیاث اللغات نے اس کا معنی اوصافِ حمیدہ لکھا ہے اور فرہنگ فارسی نے آنچہ مایہ ستائش دیگراں وفخر ومباہات شخص باشد لکھا ہے۔(۱۲) لغات کشوری کے مطابق منقبت ہنر اور تعریف کو کہتے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد ثنائے اہل بیت نبی و اصحاب کبار ہے۔

اُردو میں یہ لفظ ''تعریف، توصیف، ثنا خصوصاً اہل بیت اور صحابہ کی'' کے معنوں میں آیا ہے۔(۱۳) نسیم اللغات کے مؤلف نے اسے بزرگانِ دین کی مدح قرار دیا ہے اور اس میں اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور دیگر اولیائے عظام کی تخصیص نہیں کی۔

اُردو میں حمد، نعت، منقبت اور مدح تعریف وتوصیف کے لیے آتے ہیں اور لغوی اعتبار سے ہم معنی ہیں لیکن ان کے اصطلاحی معنی مختلف ہیں۔ اور ان کا استعمال ممدوح کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر ممدوح ذاتِ خداوندی ہے تو یہ حمد ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے تو یہ نعت ہے۔ اگر صحابہ کرام، اہل بیت اور بزرگانِ دین ہیں تو اس کے لیے منقبت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر مطلقاً کوئی سربرآوردہ شخصیت ہے تو اس کے لیے مدح کا لفظ لاتے ہیں۔(۱۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں ''اصطلاح میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے بزرگ، صحابی یا امام کی تعریف کی جائے تو اسے منقبت کہیں گے''۔(۱۵)

یہ درست ہے کہ بزرگانِ دین کے فضائل و مناقب نظم نثر دونوں میں بیان ہوئے ہیں۔ مگر ان بزرگوں کی منظوم مدح سرائی ہی کو اصطلاحی معنوں میں منقبت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اقسام شعر کے زیر عنوان چھپنے والے مضمون میں شمیم احمد نے منقبت کو شعر کی ایک الگ صنف قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ایسے اشعار جن میں صحابۂ رسول علی الخصوص حضرت علی یا آئمہ کرام یا صوفیا کی تعریف کی گئی ہو

منقبت کہلاتے ہیں۔ یہ کسی نظم کے حصے کے طور پر یا الگ سے نظم یا قصیدے کی شکل میں لکھے جاسکتے ہیں‘‘۔

منقبت کی شخصیات

اب تک منقبت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم پر جو بحث ہوئی ہے اس کی روشنی میں منقبت کا موضوع صرف وہ اعلیٰ دینی شخصیت بن سکتی ہے جس میں دو خوبیاں موجود ہوں۔

۱۔ وہ پیشوائی قوم کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہو۔

۲۔ وہ پسندیدہ فضائل کی حامل ہو۔

دینی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے کارلائل رقم طراز ہے:

’’ایک خوش کن بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی صحبت بڑی نفع بخش ہوتی ہے۔ ہم جب بھی کسی دینی اور روحانی طور پر بڑے آدمی کو دیکھتے ہیں تو اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایک روشنی کا فوارہ ہے جس کے قریب ہونا ایک خوش گوار تجربہ ہے۔ وہ روشنی جو دنیا کی تاریکی کو دُور کر کے اسے منور کرتی ہے وہ ایک روشن قندیل نہیں، چمکتا ہوا منبع نور ہے جو قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے......

کہا جاتا ہے کہ انسان کا مذہب اس کے بارے میں سب سے بڑی حقیقت ہے لیکن مذہب سے مراد وہ باتیں نہیں ہیں جن کا وہ زبانی اقرار کرتا ہے بلکہ وہ اعمال ہیں جو اس سے انجام پاتے ہیں۔

کسی بڑی روحانی شخصیت کے ساتھ وفاداری کا نام ایمان ہے۔ اور یہی وفاداری معاشرے کی روح ہے۔ کسی بڑی شخصیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی معاشرے کی بنیاد ہے۔ یہ لوگ کرنسی نوٹوں کی طرح ہوتے ہیں جو دراصل سونا ہیں۔ عظیم شخصیات کے ساتھ عقیدت اور محبت کا تعلق اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتا جب تک کہ کرۂ ارض پر بنی نوع انسان موجود ہے......

علم انسانوں کی حالت خشک لکڑی کے ڈھیر جیسی ہوتی ہے جو اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی بجلی آسمانوں سے آئے اور اسے روشن کرے۔ بڑی شخصیات کی حیثیت اس بجلی کی سی ہے جو اپنے گرد و پیش کو اپنی طرح شعلہ بداماں کر دیتی ہے...... بڑے آدمیوں کی عظمت پر ایمان نہ لانا اپنے چھوٹے پن کی دلیل ہے۔‘‘ (۱۶)

بڑی دینی شخصیت وہ ہے جو صرف اپنی گفتگو سے مذہب اور روحانیت کے ساتھ وابستگی کا اظہار نہ کرے بلکہ اس کے اعمال و افعال بھی اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اِنھی خصوصیات کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ابوالفتح محمد صغیرالدین نے اہل بیت اطہار، صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کو منقبت کا موضوع قرار دیا ہے۔ ان میں سے ہر فرد اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے اور اخلاق جلیلہ سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کی رہبری کا فریضہ سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مذہب ان کے کالبد خاکی میں روح کا درجہ رکھتا ہے اور مذہبی اقدار کے ساتھ گہری وابستگی ان کا طرۂ امتیاز اور شانِ تفاخر ہے۔

اب ان میں سے ہر جماعت کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ اہل بیت اطہار

اہل بیت اطہار منقبت نگاری کا نہایت اہم موضوع ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ان کے فضائل کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''آپ کہہ دیجیے کہ میں اس پر (یعنی تبلیغ اسلام پر) اجر کا سوال نہیں کرتا سوائے محبت ذوی القربیٰ کے''۔(۱۷)

حضرت عباس سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے دریافت فرمایا یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قرابت دار کون ہیں جن کی محبت ہم پر فرض کی گئی ہے؟ فرمایا: علیؓ فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے۔

صحیح مسلم میں حضرت سعد بن وقار سے روایت ہے کہ جب آیہ مباہلہ نازل ہوئی تو جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ زہراؓ حسن اور حسین کو بلا کر فرمایا کہ خداوندا! یہ میرے اہل بیت ہیں اور پھر آیۂ تطہیر تلاوت فرمائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک دن صبح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکلے اس وقت ردا چنبری بالوں والی آپ کے کندھے پر تھی کہ اتنے میں حسن بن علیؓ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنی چادر میں داخل کر لیا۔ حسینؓ آئے انھیں بھی اس ردا میں داخل کر لیا پھر فاطمہؓ آئیں تو اس ردا میں جگہ ملی پھر علیؓ آئے تو انھیں بھی اس چادر میں داخل کر لیا۔ پھر فرمایا: ''بہ تحقیق اے اہل بیت رسول! خدا ارادہ کر چکا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دُور رکھے اور تم کو ایسا طاہر کر دے جیسا کہ طہارت کا حق ہے''۔(۱۸)

یہ حدیث مؤطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل میں بھی بیان ہوئی ہے اور اسی بنا پر اہل بیت رسول کو آل ردا یا آل قبا کہا جاتا ہے۔ جناب امیر المومنین کے سوانح میں ہے کہ آپ نے روزہ رکھا' افطاری کا وقت آیا تو کسی مسکین نے صدا دی۔ آپ نے کھانا اس کے حوالے کر دیا اور خود فاقے سے رہے۔ اس کے بعد دو دن ایسا ہی ہوا۔ اہل بیت فاقے سے رہے اور کھانا سائلوں کو دے دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

''اور وہ کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت میں مسکین' یتیم اور اسیر کو''۔(۱۹)

۲۔صحابہ کرامؓ

صحابہ کرامؓ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثاروں کی وہ جماعت ہے جو حضورؐ کی صحبت سے فیض یاب ہوئی اور جنھوں نے دامے، درمے، سخنے ہی نہیں بلکہ اپنی جان کی بازی لگا کر نخلِ اسلام کی آب یاری کی۔ خدا تعالیٰ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔قرآن وحدیث میں ان کی تعریف وتوصیف یوں ہوئی ہے:

''وہ مہاجرین وانصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت لی نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔یہی عظیم الشان کامیابی ہے''۔(۲۰)

''جولوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں اور ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے''۔(۲۱)

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔تم جب دیکھو گے انھیں رکوع وسجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوش نودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہؓ کو برا بھلا نہ کہا کرو۔ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان کے ایک مد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا''۔(۲۲)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ میرے بعد ان کو طعن وتشنیع کا ہدف نہ بنالینا جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتا ہے اور جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے میرے بارے میں اس کے دل میں جو بغض ہے اس کی وجہ سے اس سے بغض رکھتا ہے۔جس نے میرے صحابہؓ کو اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔جس نے مجھے اذیت پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت پہنچائی۔اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی تو اللہ اس کو اپنی گرفت میں لے لے گا''۔(۲۳)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے، راہِ ہدایت پاؤ گے''۔(۲۴)

عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اُمت کا بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان سے ملتے ہیں (یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) پھر وہ جو ان سے ملتے ہیں (یعنی تابعین)'' (۲۵)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ منقبت نگاری کی روایت کا نقطۂ آغاز ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے کہ: 'دو میں سے دوسرا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد کی ایسے لشکروں سے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا سر نیچا کر دیا''۔(۲۶)

سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کے ہمراہ تھے۔ مکہ سے نکلے تو راستے میں غارِ ثور میں قیام فرمایا۔ اہل مکہ تلاش کرتے ہوئے اس غار کے دھانے تک پہنچ گئے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطرے کو محسوس کر کے پریشان ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ یہیں سے یارِ غار کی ترکیب وضع ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے میرے سینے میں ڈالا' میں نے اسی چیز کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے میں ڈال دیا''۔(۲۷)

ایک روز سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے پوچھا کہ اے حسان! ''کیا تم نے شانِ صدیق میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں؟'' انھوں نے عرض کی ''ہاں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں سننا چاہتا ہوں''۔

حسان نے عرض کی: ''آپ دو میں سے دوسرے تھے اس بابرکت غار میں اور دشمن نے اس کے گرد چکر لگایا جب وہ پہاڑ پر چڑھا۔ ابوبکر اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کے محبوب تھے اور لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق میں سے کسی کو آپ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے''۔

حسان کے یہ شعر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور فرمایا کہ ''اے حسان! تم نے سچ کہا' ابوبکر ایسے ہی ہیں''۔(۲۸)

روایت ہے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کسی کا احسان ہم پر ایسا نہیں جس کا بدلہ ہم نے نہ دیا ہو سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے۔ ان کا احسان جو ہم پر ہے

اس کا بدلہ ان کو اللہ قیامت میں دے گا۔ اور اتنا مجھ کو کسی کے مال نے نفع نہ دیا جتنا نفع پایا میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے۔ اور اگر میں دوست بناتا کسی کو تو دوست بناتا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو۔ آگاہ رہو کہ تمھارا صاحب اللہ کا دوست ہے''۔(۲۹)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''تو میرا غار کا ساتھی ہے اور تو حوضِ کوثر پر بھی میرا ساتھی ہوگا''۔(۳۰)

سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے تم لوگوں کی طرف بھیجا مگر تم نے مجھے جھوٹا سمجھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچا سمجھ کر اپنے مال اور جان سے میری خدمت کی''۔(۳۱)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ''اے اللہ کے رسول! تجھے اللہ تعالیٰ اور اتباع کرنے والے مومن کافی ہیں''۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ ''اس آیت کے نازل ہونے کا سبب حضرت عمر فاروق کا اسلام ہے''۔(۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ نے جاری کر دیا حق کو عمرؓ کی زبان اور دل پر''۔(۳۳)

رسول اللہ ﷺ نے دعا کی کہ ''اے اللہ! ابوجہل اور عمر بن خطاب دونوں میں سے جو پیارا ہو اس کے ذریعے اسلام کو قوی کر۔'' ان دونوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ کو پیارے نکلے۔(۳۴)

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کیا خوب شخص ہے ابوبکر' کیا خوب شخص ہے عمر اور کیا خوب شخص ہے ابوعبیدہ بن جراح''۔(۳۵)

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس آدمی نے رومہ کنواں کھدوایا' وہ جنتی ہے۔ (اور یہ کنواں حضرت عثمانؓ نے کھدوایا تھا) اور جس شخص نے جیش عسرہ کے لیے سامان مہیا کیا' وہ بھی جنتی ہے (اور یہ سامان حضرت عثمانؓ نے فراہم کیا تھا)''۔(۳۶)

بیعت رضوان کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو اہل مکہ سے گفتگو کے لیے بھیجا تھا۔ وہ بیعت کے وقت موجود نہ تھے۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر فرمایا ''یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور پھر بائیں ہاتھ پر مارتے ہوئے فرمایا یہ بیعت عثمان ہوئی''۔(۳۷)

حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں مدینے کے ایک باغ

میں حاضر تھا کہ کسی نے آ کر دروازے پر آواز دی۔ آپ نے مجھ کو دروازہ کھولنے اور جنت کی خوش خبری سنانے کا حکم دیا۔ دیکھا تو ابوبکر تھے۔ چنانچہ ان کو بلایا اور جنت کی خوش خبری دے دی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور کچھ دیر بعد کسی دوسرے شخص نے دستک دینی شروع کی۔ آپ نے فرمایا دروازہ کھول دو اور جنت کی خوش خبری بھی سنا دو۔ اب جو دروازہ کھولا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے انھیں بھی حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مطلع کر دیا۔ یہ سن کر وہ بھی شکر خدا بجا لائے۔ تیسرے شخص نے دروازہ کھلوانا چاہا' آپ نے پھر فرمایا دروازہ کھول کر اس کو بھی جنت کی بشارت ان حادثات پر جو اس کے اوپر آنے والے ہیں' دے دو۔ دروازہ کھولا تو حضرت عثمان کھڑے تھے۔ میں ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مطلع کر دیا۔ یہ سن کر انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ میرا تو اللہ ہی مالک اور مددگار ہے۔ (۳۸)

حضرت عثمان دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحب زادیاں یکے بعد دیگرے آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کہا جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر اہل بیت کے ساتھ ہو چکا ہے۔

۳۔ اولیائے عظام

ولی کے لغوی معنی دوست یا مددگار کے ہیں لیکن اصطلاح میں ولی اس شخص کو کہا جائے گا جو معرفتِ خداوندی رکھتا ہو' طاعاتِ خداوندی پر قائم رہے' عصیان اور معصیت سے کنارہ کش رہے اور لذاتِ شہوانیہ سے پرہیز کرتا رہے۔ (۳۹)

مولانا عبدالرحمٰن جامی لکھتے ہیں کہ ولی وہ شخص ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت کو اپنے ذمے لے لے۔ پس اس کی عبادت اور بندگی تسلسل کے ساتھ اس پر حاوی رہے کہ اس کے درمیان گناہ نہ آئے۔ اور اس کی اطاعت کے دوران معصیات خلل نہ ڈالیں۔ اور یہ دونوں صفتیں ولی میں ضروری ہیں۔ جب یہ دونوں صفتیں اس میں موجود ہوں گی تب حقیقت میں وہ ولی ہوگا اور ہر حال میں خوشی میں اور تنگی میں ہمیشہ اللہ کو یاد رکھنا اور اس پر نظر رکھنا اس کا کام ہوگا۔ (۴۰)

قرآن مجید میں ہے: ''سُن لو! اللہ کے دوستوں پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہمیشہ پرہیز گاری کرتے رہے' ان کے لیے دنیا کی زندگی میں خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی''۔ (۴۱)

ایک اور آیت میں ہے: ''اس کے اولیا تو صرف پرہیز گار ہی ہیں''۔ (۴۲)

اولیائے عظام وہ مبارک ہستیاں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات نازل ہوتی رہتی ہیں۔

اوران کوخاص توفیق عطا ہوتی ہے جس کی بدولت وہ محیر العقول کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ’’جب کبھی زکریا علیہ السلام اس (مریم) کے پاس اس کی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے تو اس کے پاس رزق پاتے۔ پھر زکریا نے مریم سے پوچھا کہ یہ رزق تیرے پاس کہاں سے آیا؟ کہا: اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے' بے حساب روزی دیتا ہے‘‘۔(۴۳)

قرآن مجید میں ایک اور ولی کا ذکر یوں آیا ہے: ’’تو جس کے پاس علم کتاب تھا اس نے سلیمان سے عرض کی کہ میں آپ کے پلک جھپکانے سے پہلے اس تخت کو آپ کے سامنے لاسکتا ہوں پھر جب سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو اپنے پاس دیکھا تو فرمایا' یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنی ہی بھلائی کے لیے شکر کرتا ہے اور جو کوئی ناشکری کرے تو بے شک میرا رب سب سے بے پرواہ ہے‘‘۔(۴۴)

منقبت نگاری کی قسمیں

اہل بیت اطہار' صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے ذکر و توصیف میں لکھے گئے اثاثہ مناقب پر اگر گہری نظر ڈالی جائے اور اس صنف کا اس کے تخلیقی پس منظر اور محرکات کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو اس کی دو واضح قسمیں دِکھائی دیتی ہیں۔

۱۔رسمی منقبت

یہ وہ منقبت ہے جو محض ایک شعری روایت کے مطابق تبرکاً اور رسماً لکھی جاتی ہے۔ شعرا نے اپنے دواوین کی ترتیب اور مثنوی یا منظوم داستان کا آغاز کرتے ہوئے حمد و نعت کے بعد اہل بیت' خلفائے راشدین اور اپنے اپنے پیرومرشد اور خاص طور پر شیخ عبدالقادر جیلانی کی توصیف میں چند اشعار ضرور لکھے ہیں۔ بعض شعرا نے صرف اہل بیت کے ذکر کو کافی سمجھا ہے' بعض نے اپنے عقیدے اور مسلک کو سامنے رکھتے ہوئے صرف خلفائے راشدین کی تعریف کی ہے اور بعض شعرا کے ہاں مذکورہ بالا تینوں صورتیں موجود ہیں۔ مدح اہل بیت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایت کو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم شعرا نے بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس التزام کے محرکات دراصل وہی ہیں جو حمد و نعت کے ہیں یعنی حصولِ ثواب اور برکت طلبی۔

منقبت گوئی کا اساس محرک اہل بیت' صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ دین کی محبت و عقیدت ہے۔ اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا منقبتی کلام خلوصِ صداقت سے عاری ہے مگر اس جذبے کا اظہار محض عقیدہ کی بِنا پر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اُردو کے موجودہ سرمایۂ منقبت کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا

ہے کہ رسمی انداز میں لکھے جانے والے مناقب کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن چونکہ ان کے لکھنے والوں نے انھیں محض حصولِ ثواب اور خیر و برکت کی طلب کے لیے حمد نعت کے ساتھ بطور تبرک لکھا ہے لہٰذا ان کی حیثیت محض رسمی ہے اور ان کے اندر وہ کیف نہیں ہے جو حقیقی منقبت کی روح ہے۔

۲۔ مقصدی منقبت

منقبت کی دوسری قسم مقصدی منقبت ہے۔ یہ وہ قسم ہے جو منقبتی شاعری کے معیاری سرمائے پر مشتمل ہے اور جس کے لکھنے والوں نے اسے نہ صرف ادبی صنف سخن کے طور پر قبولیت عام بخشی بلکہ شاعری کے فنی لوازمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پورے جذب وانہماک سے اسے ایک ادبی اور فنی معیار عطا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

مقصدی منقبت میں بھی حصولِ ثواب کا تصور کارفرما ہوتا ہے مگر رسماً یا عقیدتاً نہیں ہوتا۔ یہاں ممدوح کے اوصافِ حمیدہ، روحانی تصرفات اور ذاتی یا اجتماعی مسائل کے حل کے سلسلے میں اعانت طلبی کا رجحان گہرا اور تفصیلی ہوتا ہے۔ منقبت میں ان بزرگوں کے حوالے سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اظہارِ محبت و شیفتگی بھی ہوتا ہے جو بین السطور دیکھا جا سکتا ہے۔ عصر جدید میں ممدوح کی عظمت کردار کو واضح کر کے قوم کو عمل پر اُبھارنے کا انداز نمایاں ہوا ہے اس سلسلے میں جوش کی نظم ''حسین اور انقلاب'' کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

منقبت کے مضامین

ا۔ اظہارِ عقیدت

ظہورِ اسلام کے بعد مسلمانوں میں جب اصناف شاعری مقبول ہوئیں، ان میں نعت و منقبت سرفہرست ہیں۔ نعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذہبی شاعری کے مقدمات میں شامل ہے جس کا تعلق دینی اساس صدق، اخلاص اور محبتِ رسولؐ سے ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی شاعری کی ابتدا میں نعت کو اوّلیت حاصل ہے تو یہ زیادہ صحیح ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو جو گہری محبت اور والہانہ شیفتگی ہے اس کے سبب آپ کے اہل بیت، اصحاب اور اولیا بھی محترم ٹھہرے اور شعرا نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اس طرح نعت کے ساتھ منقبت بھی صنف سخن کے طور پر رائج ہوئی۔ سیّد عالم خدائے بزرگ و برتر کے نور کی اوّلین جھلک ہیں اور اہل بیت رسول اور اولیائے کرام ذاتِ نبی سے مستنیر ہیں۔ اس تصور نے بھی عقیدت مندی کے جذبات کو گہرائی عطا کی اور منقبت نگاروں نے اس سلسلے میں بڑے آبدار شعر نکالے۔

عقیدت مندی کے اظہار کے لیے ایک خاص لہجے کے علاوہ ایک خاص زبان بھی درکار ہوتی ہے جس کے الفاظ پاکیزہ ہوں، لطیف وشیریں ہوں، استعارات وتشبیہات عامیانہ نہ ہوں، ان میں ایک خاص شانِ دل آویزی ودل فریبی ہو اور عقیدت ومحبت کا اظہار لطافت اور پاکیزگی سے کیا گیا ہو۔ چنانچہ منقبت نگاروں نے ایسی ہی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا جس کی وجہ سے منقبت کی فضا پاکیزہ اور پُرنور ہو جاتی ہے۔

۲۔ بزرگانِ دین کی زندگی کی جھلکیاں

منقبت نگاروں نے صحابہ کرام، آئمہ عظام اور بزرگانِ ذوی الاحترام سے اظہارِ عقیدت کے علاوہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایسے اشعار اخلاقی درستی کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ اس قسم کی نظمیں مذہب سے لگاؤ اور محبت پیدا کرنے میں بڑی مدثابت ہوتی ہیں۔ ہادیانِ امم اور داعیانِ حق کسی ایک گروہ یا قبیلہ کی ہدایت کے لیے نہیں آتے بلکہ تمام بنی نوع انسان کو صراطِ مستقیم دِکھانے کے لیے آتے ہیں اس لیے ان کا پیغام عالمگیر ہوتا ہے اور ہر مذہب وملت کا فرد ان کے پیغام اور سیرت پاک سے فیضان حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ نعتیہ اور منقبتی شاعری میں صرف مسلمان شاعروں نے ہی گل ہائے عقیدت پیش نہیں کیے بلکہ غیر مسلم شاعروں نے بھی آئمہ اہل بیت اور دوسرے بزرگانِ دین سے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔

۳۔ نجاتِ اُخروی

جو مدحیہ قصائد کسی دنیوی بادشاہ یا امیر کی شان میں لکھے جاتے ہیں، وہ اس بادشاہ یا امیر کے انتقال کے بعد داستانِ پارینہ بن جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ شاعر کے سامنے مادی منفعت ہوتی ہے اور وہ اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لیے انتہائی مبالغے سے کام لیتا ہے اور ایک کمزور امیر کو رستم کی طرح بہادر، حاتم کی طرح سخی اور قیصر روم سے زیادہ پُرشکوہ بنا دیتا ہے۔ امیر اس جھوٹی تعریف کو سنتا ہے، اس کا نفس موٹا ہوتا ہے اور وہ شاعر کا دامن نوازشات سے بھر دیتا ہے۔ لیکن دین کی برگزیدہ ہستیاں کسی شاعر کی جھولی مال و دولت سے نہیں بھرتیں اس لیے ان کا ذکر، ذکر خیر سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ ایسا ذکر جو مادی منفعت کے بجائے نجاتِ اُخروی کا سامان فراہم کرتا ہے اس احساس کے پس منظر میں یہ تصور کارفرما ہے کہ انسانوں میں سے سب سے افضل ذکر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اس کے بعد صحابہ کرام، اہل بیت او اولیا کا تذکرہ باعث برکت ہے اسی لیے یہ نظمیں داخلی شاعری کا عمدہ نمونہ اور صداقتِ جذبات کا اعلیٰ مرقع پیش کرتی ہیں۔ مدحیہ قصائد میں بے جا مداحی اور غلو کی وجہ سے معاشرے میں جو غلط روش پیدا کی ان کی تلافی ان نظموں نے کر دی ہے۔ مدحیہ نظموں کی یہ وہ قسم ہے جو کبھی زوال

پذیر نہیں ہوگی اور نہ کبھی اس کی افادایت میں کمی آئے گی۔

اس قسم کے قصائد کے بارے میں سیّد امداد امام اثر لکھتے ہیں: ''قصیدہ کی اصل غایت یہ ہے کہ شاعری کے پیرائے میں مسائل اخلاقی و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو۔ یا حمد خداوند نعت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور منقبت علی المرتضیٰ و آئمہ باصفا سے شاعر کو ثوابِ عقبیٰ حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا اور رسول و آئمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو''۔(۴۵)

۴۔اعانت طلبی

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ قادرالمطلق ہے اس کی ذات تکالیف و مصائب میں اپنے بندوں پر کرم فرماتی ہے۔ وہی عبادت کے لائق ہے اور اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔ تمام کائنات کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ وہی ہے جس نے آدم کو پیدا کیا اور اسے علم اشیا عطا فرما کر فرشتوں پر اسے فضیلت بخشی۔ وہ جسے چاہتا ہے' جتنا چاہتا ہے' دیتا ہے اس نے اپنے نیک بندوں کو بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے اس کی بے گراں عنایتوں نے اپنے ولیوں کو صاحبِ تصرف و کرامت بنایا ہے۔ ان بزرگوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے' گمراہوں کو ہدایت ملتی ہے۔ وہ رسول کے نائب ہیں اور ان کے معارف و علوم کے وارث ہیں۔ وہ نورِ بصیرت سے کائنات کے اسرار کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان پر غیب کے حجابات کھل جاتے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں سے ہر اس شخص کی اعانت کرتے ہیں جو ان کو پکارتا ہے اس تصور نے منقبت نگاری میں اعانت طلبی کے مضامین کو شامل کیا ہے۔

غوثِ اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرتؔ
بس کہو حاضر دربار ہوں شیئاً للہ

(حسرت موہانی)

بزرگوں سے لوگوں کو کیا فیض ملتا ہے اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے لکھا ہے:

''اکبر آباد میں مرزا محمد زاہد کے درس سے واپسی کے دوران راستہ میں ایک لمبے کوچے سے میرا گزر ہوا۔ اس وقت میں شیخ سعدی کے یہ اشعار پڑھ رہا تھا اور خوب ذوق و شوق حاصل تھا:

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است
جز سر عشق ہرچہ بخوانی بطالت است
سعدی بشو تو لوحِ دل از نقش غیر حق
علمے کہ راہِ حق ننماید جہالت است

چوتھا مصرعہ میرے ذہن سے نکل گیا اس سبب سے میرے دل میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ اچانک ایک فقیر منش دراز زلف ملیح چہرہ، مرد پیر ظاہر ہوا اور کہا:

علمے کہ راہِ حق ننماید جہالت است

میں نے کہا جزاک اللہ خیرالجزاء۔ آپ نے میرے دل سے بہت بڑی بے چینی اور اضطراب کو دُور فرمایا۔ پھر میں نے ان کی خدمت میں پان پیش کیا۔ مسکرائے اور فرمایا ''یہ یاد دِلانے کی اُجرت ہے؟'' میں نے عرض کیا ''نہیں یہ شکرانہ ہے'' فرمایا ''میں نہیں کھاتا'' پھر فرمایا ''مجھے جلدی جانا ہے'' میں نے کہا ''میں بھی جلد چلوں گا'' فرمایا ''میں بہت جلد جانا چاہتا ہوں'' اور قدم اُٹھا کر کوچے کے آخر میں رکھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ روح مجسم ہے۔ میں پکار اُٹھا ''مجھے اپنے نام سے تو آگاہ کیجیے تا کہ فاتحہ پڑھ سکوں'' فرمایا ''سعدیؔ یہی فقیر ہے''۔(۴۶)

شاہ ولی اللہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''شیخ عبدالباقی لکھنوی ایک ایسا مرد تھا کہ جس نے وحدت الوجود کی بہت سے کتابیں دیکھی ہوئی تھیں۔ قصورِ فہم کی وجہ سے طاعات اور اعتقاد اسلامیہ میں ایک طرح کا تساہل کرتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد حضرت والا (والد بزرگوار) اس کی قبر پر تھوڑی دیر بیٹھے اور فرمایا: اس تساہل کی وجہ سے وہ ماخوذ تھا لیکن میں نے اس کی شفاعت کر دی ہے''۔(۴۷)

حدیث شریف میں ہے کہ فرمایا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میرے رحم دل اُمتیوں سے حاجتیں مانگو' ان سے فضل طلب کرو' ان سے بھلائی چاہو' رزق پاؤ گے' مرادوں کو پہنچو گے' ان کے دامن میں آرام سے رہو گے' ان کی پناہ میں چین کرو گے' ان میں میری رحمت ہے''۔(۴۸)

صرف زندگی ہی میں نہیں انتقال کے بعد بھی اولیا کے تصرفات جاری رہتے ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر عزیزی میں اکابر اولیا کا حال بعد انتقال رکھتے ہیں: ''اولیاء اللہ بعد انتقال دنیا میں تصرف فرماتے ہیں اور ان کے استغراق کا کمال اور مدارج کی رفعت ان کو اس سمت توجہ دینے کی مانع نہیں ہے۔ اویسیاں اپنے کمالاتِ باطنی کا اظہار فرماتے ہیں اور حاجت مند لوگ اپنی مشکلات کا حل اور حاجت روائی اُنھی سے طلب کرتے ہیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں''۔(۴۹)

اعانت از مزاراتِ اولیا

اعانت از مزاراتِ اولیا کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: ''ترکستان میں ایک شقلہ نامی مرید تھا جس نے اس راہ (راہِ طریقت) کا ذوق پیدا کیا تھا۔ بخارا میں آیا اور خواجہ نقشبند کے مزار پر اس انتظار میں بیٹھا کہ اسے کسی ولی اللہ کی اطلاع ملے۔ آخر کار خواجہ نقشبند نے خواب میں انھیں فرمایا کہ تیرا پیر ہندوستان میں دہلی شہر کے اندر ہے اور حضرت والا (والا گرامی شاہ ولی اللہ) کی شکل اسے

دِکھائی۔ اس کے دل میں خیال گزرا کہ دہلی بہت بڑا شہر ہے اس بزرگ کو وہاں تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہوگا۔ خواجہ کو اس کے اس خیال کی خبر ہوگئی۔ فرمایا: جس روز تم دہلی پہنچو گے اس روز انھیں وعظ کرتے ہوئے پاؤ گے۔ پھر شوق اسے کشاں کشاں دہلی لے آیا۔ حضرت والا معلوم حلیے کے مطابق ملے۔ نماز کے بعد جو وعظ فرمایا، اس سے بھی اس کی تائید ہوئی۔ جمعہ سے فراغت کے بعد گھر آیا' پگڑی اُتار کر پاؤں میں رکھ دی۔ حضرت نے بیعت وتلقین سے مشرف فرمایا''۔(۵۰)

اولیا کرام کی بعداز وصال فیوض وبرکات اور کرامات وتصرفات بھی ان کی شخصیت کا جزو بن گئیں اور منقبت نگاروں نے ان کی سیرت اور مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے روحانی تصرفات کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ چنانچہ داغ دہلوی کہتا ہے:

مزار اولیا سے فیض حاصل کر کہ اے ناداں
ہمیشہ زندہ رہتے ہیں کہیں یہ مرنے والے ہیں

مرزا مظہر جان جاناں کہتے ہیں کہ: اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت سے جمعیت کا فیض طلب کرو اور مشائخ کرام کی ارواحِ طیبہ کو فاتحہ اور درود کا تحفہ پہنچا کر بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ بناؤ۔ کیونکہ ظاہر وباطن کی سعادت اس سے حاصل ہوتی ہے''۔(۵۱)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیا توسل اختیار کرنا بھی اعانت طلبی کا ہی ایک رُخ ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سنن ابن ماجہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک شخص نابینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور معروض ہوا کہ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو عافیت دے۔ آپؐ نے فرمایا اگر تو چاہے اس کو ملتوی رکھوں اور یہ زیادہ بہتر ہے۔ اگر تو چاہے تو دعا کروں۔ اس نے عرض کی دعا ہی کیجیے۔ آپؐ نے اس کو حکم دیا کہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے اور دو رکعت پڑھے اور یہ دعا کرے:

''اے اللہ! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں اور آپ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ بوسیلہ محمد نبیِ رحمت کے۔ اے محمد میں آپ کے وسیلے سے اپنی اس حاجت کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا ہوں کہ پوری ہو جائے۔ اے اللہ! آپ کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما''۔(۵۲)

مولانا تھانوی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے توسل صراحتاً ثابت ہوا ہے اور چونکہ آپ کا اس کے لیے دعا فرمانا کہیں منقول نہیں، اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح توسل کی دعا جائز ہے اسی طرح توسل دعا میں کسی کی ذات کا بھی جائز ہے اور حاصل توسل فی الدعا یہ ہے کہ اے اللہ! فلاں بندہ آپ کا مورِدِ رحمت ہے اور مورِدِ رحمت سے محبت اور اعتقاد رکھنا بھی مؤجب جلب رحمت ہے اور ہم اس سے محبت اور اعتقاد رکھتے ہیں۔ پس ہم پر بھی رحمت فرما اور توسل بالاعمال میں بھی تھوڑے

تھوڑے تغیر کے ساتھ یہی مراد ہے کہ یہ اعمال آپ کے نزدیک مؤجب رحمت ہیں اور ان کا فاعل بھی مرحوم ہوتا ہے اور ہم نے یہ اعمال کیے ہیں۔ پس ہم پر بھی رحمت فرما''۔(۵۳)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں شدید قحط پڑا۔ انھوں نے خدا کے حضور بارش کے لیے بڑی زاری کی اور حضرت عباس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا کہ اے اللہ! ہم تیرے آگے تیرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا کو شفیع بناتے ہیں کہ ہم سے قحط کو دُور کر دے اور ہمیں بارش سے سیراب کر دے۔ لوگ ہٹنے نہ پائے تھے کہ بارش سے سیراب کر دیے گئے اور آسمان چند روز تک ان پر برستا رہا۔(۵۴)

مولانا تھانوی لکھتے ہیں کہ ''اس حدیث سے غیر نبی کے ساتھ توسل بھی جائز نکلا جبکہ اس کو نبی سے کوئی تعلق ہو قرابت حسیہ کا یا قرابت معنویہ کا''۔(۵۵)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بالواسطہ اظہارِ محبت

اہل بیت رسول، صحابہ کرام اور اولیائے عظام کی تعریف وتوصیف کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گہری وابستگی ہے۔ وہ قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ سنت نبویؐ کو بھی اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھتے ہیں اسی لیے اُنھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہونے کا منصب حاصل ہے۔ مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ محبت ہے یہی محبت اور شیفتگی مسلمانوں کے ایمان کا پیمانہ ہے۔ بزرگانِ دین کا حضور کے ساتھ والہانہ عقیدت رکھنا ہی ان کے محترم ہونے کا سبب ہے اس لیے منقبت نگاری بالواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص میرے صحابہؓ سے محبت کرتا ہے، وہ میری وجہ سے کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے، وہ میرے بارے میں اس کے دل میں جو بغض ہے اس کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے''۔

یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے دین کو پھیلانے میں اور اس کے روحانی پہلوؤں کی ترویج کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ لہٰذا ان سے عقیدت ومحبت کا اظہار بھی بالواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے عقیدت ومحبت کا اظہار ہے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں کہا: ''وہ اپنی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے ہیں، ان کے خصائص محمود ہیں، وہ تمام مخلوق میں سب سے پہلے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی''۔

فرزدق نے حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہا: ''یہ خیر العباد کا فرزند ہے، یہ نقی، تقی طاہر اور سیّد ہے۔ یہ ابن فاطمہ ہے، اگر تو ناواقف ہے۔ ان کے نانا خاتم المرسلین ہیں''۔

کمیت اسدی نے اہل بیت کی تعریف میں لکھا: ''میرے لیے تو آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی مقتدیٰ ہیں اور یہی میرے لیے مرجع حق ہیں''۔

امام شافعی نے آل عبا کی منقبت میں کہا: اگر میرا گناہ حب آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو میں اس گناہ سے کبھی توبہ نہیں کروں گا''۔

فردوسی کا شعر ہے:

منم بندۂ اہل بیت نبی ستائندۂ خاکِ پائے وصی

ناصر خسرو

قرآن بود وشمشیر پاکیزہ حیدر دو بنیاد دین متین محمد

امیر خسرو مثنوی مطلع الانوار میں خواجہ نظام الدین اولیا کی منقبت لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

سکۂ کارش بفروع و اصول تابع قال اللہ وقال الرسول

مومن نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصیدہ مدحیہ میں کہا:

معاندو! جو کہا خاتم رسالت نے
کہ میرے بعد نبوت کے تھا عمر قابل
یہی خلافتِ راشد کی اس کو بس ہے دلیل
یہی امامت برحق کی اس کو بس ہے سجل

علامہ اقبالؒ نے حضرت صدیق اکبر کے بارے میں کہا:

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

جمهرة اللغة نے منقبت کی جو تعریف کی ہے اس کی رو سے منقبت گوئی میں حضور کا ذکر جمیل منقبت کا ایک لازمی جزو ہے۔ سیّد دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی گہرا رابطۂ والہانہ شیفتگی، عقیدت و محبت کی رفعت ان بزرگوں کی تعریف و توصیف کا سبب بنی۔ اور منقبت نگاروں نے اس حوالے سے ان کی تحسین کی اور اپنی دعاؤں میں ان کا توسل اختیار کیا ہے۔

تحفظ ناموس بزرگانِ دین

اپنی دینی اور روحانی مصروفیات اور حضور سے رشتہ نیازمندی کی بدولت جب بزرگانِ دین دشمنوں کے طعن و تشنیع کا ہدف بنے تو منقبت نگاروں نے اپنے قلم سے ان کے ناموس کا تحفظ بھی کیا۔

حسان بن ثابتؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنی نظم کا موضوع اس وقت بنایا جب دشمنانِ اسلام نے ان کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ فرزدق نے اپنا مشہور عالم قصیدہ میمیہ اس وقت تحریر کیا جب ہشام نے حضرت امام زین العابدین کے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ بنواُمیہ کے دور میں جب اہل بیت کی عزت ظالموں کی زبان اور ان کے ہاتھ سے غیر محفوظ ہوگئی تو کمیت اسدی جیسے محبانِ اہل بیت نے ''ہاشمیات'' کے نام سے بنوہاشم کی حمایت میں زوردار قصائد لکھے۔ جب آل عبا کی محبت رفض کا مترادف تصور ہونے لگی تو امام شافعیؒ جیسے فقیہوں نے بھی اپنے اشعار میں ان کی پُرزور تردید کی۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ بزرگانِ دین کی عزت کی حفاظت اور ان کی دینی خدمات کا اعتراف بھی منقبت نگاری کا ایک محرک رہا ہے۔

منقبت نگاری کے مجلسی اور دیگر محرکات

ا۔عرس

منقبت نگاری کے محرکات میں جن تقریبات کو اساسی حیثیت حاصل ہے ان میں عرس کو اوّلیت حاصل ہے اس کا لغوی مفہوم ''مہمانی وطعام عروسی و نکاح'' ہے ''مجازاً بمعنی مجلس طعام فاتحہ بزرگان کو بروز وفات بعد از سالی کنند چرا کہ رحلت از غمکدہ دنیا بمنزلہ شادی عروسی است'' (۵۶) مجازی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی لکھتے ہیں:

''بزرگوں کے دنیا چھوڑنے کو وصال کہتے ہیں۔ وصال کے معنی ملن کے ہیں۔ بزرگوں کا انتقال کرنا عام لوگوں کی موت جیسا نہیں ہوتا۔ یہ حضرات اللہ کے لیے زندہ رہتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے جان دیتے ہیں۔ ان کو ہمیشہ کی زندگی ملتی ہے اور موت کا دن ان کے لیے گویا اپنے محبوب اور مطلوب اور مالک خدا سے ملنے کا دن ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی سالانہ برسی کو عرس کہتے ہیں۔ عرس کے معنی شادی کی دعوت یا قافلے کے پڑاؤ کے ہوتے ہیں جس طرح شادی کے دن دولہا دُلہن ملتے ہیں اور دھوم دھام کی دعوت ہوتی ہے یا قافلہ ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچ کر پڑاؤ کرتا ہے، اسی طرح بزرگ بھی دنیا کی منزل سے کامیاب گزر کر آخرت کی منزل کو پہنچتے ہیں اور ان کے خدا کو ملنے کی خوشی میں شادی کی سی دھوم دھام کی جاتی ہے''۔(۵۷)

بزرگوں کی برسی پر عرس کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں۔ ان محفلوں میں علمائے دین' دین کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور یوں یہ محفلیں تبلیغ دین کے سلسلہ میں اہم خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں اولیاء اللہ کی اخلاقی تعلیمات اور فیوض و برکات کا تذکرہ ہوتا ہے اور صاحب عرس کی

عظمت وفضیلت پر تقریریں ہوتی ہیں۔ شعرا اس موقع پر اشعار کے ذریعے اپنی عقیدت اور نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنے ممدوح کے حالاتِ زندگی اور روحانی کمالات کو سامنے لاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں تصوف کے مختلف سلاسل سے وابستہ صوفیا مشائخ اور بزرگانِ دین کے اعراس کا ایک پھیلا ہوا سلسلہ ہے۔ سال میں بمشکل کوئی ایسا ہفتہ ہوگا جس میں کسی قطب، غوث، ولی یا بزرگ کا عرس نہ منایا جا رہا ہو۔ تقویم دارالاحسان ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء کے مطابق سال میں اعراس المیلاد المبارک کی تعداد ۱۵۰ کے قریب بنتی ہے۔ ان میں میلاد النبی کے علاوہ خلفائے راشدین، صحابہ کرام، صوفیاء مشائخ، بزرگانِ دین اور دوسری دینی، مذہبی اور ملی شخصیات کے اعراس المیلاد کی نشاندہی کی گئی ہے''۔(۵۸)

سماع

عرس کے ساتھ محفل سماع کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ سماع کے لغوی معنی سننے کے ہیں مگر اصطلاح تصوف میں اس کے معنی ''قوال کا اپنی فطری آواز سے موزوں اشعار پڑھنا'' ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سماع کے انداز بدلتے گئے اور آواز کے ساتھ ساز بھی شامل ہو گئے۔ سماع کو صوفیا نے چند تحفظات کے ساتھ مباح قرار دیا ہے اور اسے تزکیہ نفس اور صفائی باطن کا اہم ذریعہ خیال کیا ہے۔ نیز طبیعت کے انقباض کو دُور کرنے اور انشراح صدر کے علاوہ رِقت اور گداز کے لیے بھی ضروری تصور کیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت جنید بغدادی کا یہ قول بھی توجہ طلب ہے کہ ''اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ نماز نفل سماع سے بہتر ہے تو بھی میں نوافل میں مشغول نہ ہوں اور سماع سنوں''۔ سیّد نورالحسن مودودی اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت جنید نے یہ اس لیے فرمایا کہ نغمہ کو روح کے ساتھ یوم الست سے ایک خاص تعلق ہے دوسرے سماع میں جو یکسوئی حاصل ہوتی ہے وہ عام طور پر نوافل میں میسر نہیں آتی اور کل دارومدار سکون قلب پر ہے''۔ انھوں نے اس سلسلے میں حضرت شیخ المشائخ خواجہ مودود چشتی قدس سرہ کے اس جواب کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے امام شمس الائمہ گرگاتی کے سوال (کہ فقہی مسئلہ سے قطع نظر سلوک میں سماع بہتر ہے یا نفلی نماز) کا جواب یہ دیا کہ اگر کوئی شخص دوگانہ نماز نفل بہ تمام شرائط اور ارکان مقرب یا اخلاص تمام ادا کرے تو اللہ کے نزدیک اس کے قبول ہونے میں احتمال ہے مگر سماع کا جذبہ، جذباتِ حق میں سے ہے اور عین مقبول ہے''۔ سماع کی ان محفلوں میں نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ صاحب عرس بزرگ کے مناقب بھی پیش کیے جاتے ہیں اس طرح منقبت نگاری کو تحریک ملتی ہے اس کا ذوق وشوق بڑھتا ہے۔ چنانچہ کئی ایسے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو ایسے موقعوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔ سماع میں پڑھا جانے والا کلام عارفانہ نوعیت کا ہوتا ہے اور اس میں حمد، نعت اور بزرگانِ دین کی منقبت شامل ہوتی ہے۔ سلوک کی ایک منزل فنا فی الشیخ کی منزل ہے

جس سے آگے فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی منزلیں آتی ہیں۔ فنا فی الشیخ کی منزل پر فائز ہونے کے لیے ایک طریقہ مدحِ شیخ کی سماعت بھی ہے۔

۲۔ منقبتی مشاعرے

مشاعرے شاعری کے فروغ کا اہم ذریعہ ہیں۔ اُردو میں مشاعرے کی روایت بہت پرانی ہے۔ مذہب کے حوالے سے جو مشاعرے منعقد ہیں ان میں نعتیہ مشاعرے سرفہرست ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں ان مشاعروں کو خصوصی فروغ حاصل ہوا ہے اور مختلف ادبی تنظیموں کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی ایسے مشاعروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ منقبتی مشاعروں کا آغاز لکھنؤ سے ہوا۔ لکھنؤ میں یکم محرم سے آٹھ ربیع الاوّل تک زمانۂ عزا مقرر ہوا تھا۔ ان سوا دو مہینوں میں تمام شہر سوگوار رہتا تھا۔ چنانچہ جذبات کی تطہیر کے لیے حضرت ناصر الملت کے شریعت کدہ چہاردہ معصومین میں سے ہر ایک کی ولادت کے موقع پر محافل میلاد منعقد ہوتی تھیں، جن میں مشاعرے کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا، جن میں ولادت معصومین کے علاوہ ان کے فضائل و مناقب کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ حال ہی میں بعض شہروں (۵۹) میں خلفائے راشدین کے ناموں سے منسوب مشاعروں کا اہتمام کیا گیا جن میں ملک کے مقتدر شعرا نے شرکت کی اور جن کو سامعین نے بڑے جذب شوق سے سنا۔

۳۔ اخبارات و رسائل

دینی تعلیمات کو پھیلانے اور فکر و نظر کو مضبوط مذہبی بنیاد فراہم کرنے میں دینی رسائل نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ ان رسائل میں بزرگانِ دین کے احوال و آثار کے علاوہ ان کے بارے میں منظوم نذرانۂ عقیدت بھی شامل ہوتا ہے۔ بعض رسائل نے خصوصی نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں قومی اخبارات سے ملی اور اسلامی ایڈیشنوں سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ان اشاعتوں میں اہل بیت اور دیگر بزرگانِ دین کے مناقب بھی شائع ہوتے ہیں۔

منقبت اور سلام

شبلی نے سلام کے آغاز پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اُردو شاعری کی اصل بنیاد غزل پر قائم ہوئی۔ اقسام سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ ہوا۔ عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے مسدسوں کا طریقہ اختیار کیا لیکن غزل کے لیے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا ہے اسی بنا پر انھوں نے غزل کی طرح سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحر وہی ہوتی ہے جو غزل کی ہوتی ہے۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام

کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اورنئی، بندش سادہ اورصاف، مضمون دردانگیز اور پُرتاثیر ہو‘‘۔(۶۰)

سلام پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صفدر حسین رقم طراز ہیں:

’’اُردو شعر و ادب میں سلام ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں غزل کی عروضی ہیئت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، آئمہ کرام، اہل بیت اطہار اور خاصانِ خدا کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح وتعبیر کی جاتی ہے خصوصاً کربلا کے ہیرو حضرت امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار کا تذکرہ پیش نظر ہوتا ہے۔ ان مقربانِ خدا نے چونکہ حق وصداقت اور دین کی حمایت میں عظیم قربانیاں پیش کی تھیں اس لیے ایسے موضوع بھی شاعر کے دائرۂ فکر میں آجاتے ہیں جن سے اعلیٰ اقدار حیات اور محاسن انسانی کی ترویج و اشاعت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ گویا سلام کے احاطہ خیال میں مسائل حیات کائنات پر بھی تبصرہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ تاکہ منشائے الٰہی، اسوۂ رسول اور فکر اہل بیت کی وضاحت کرکے عمل خیر کی ترغیب دی جاسکے‘‘۔(۶۱)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلام وہ نظم ہے جو غزل کی عروضی ہیئت میں لکھی جاتی ہے اور جس میں رسولِ اکرم، آئمہ عظام اور دیگر اہل بیت کا تذکرہ ہوتا ہے اس کے علاوہ اخلاقی اور تمدنی امور بھی اندراج جاتے ہیں اور حیات وکائنات کے مسائل پر بھی اظہارِ خیال کی گنجائش ہوتی ہے۔ سلام گوئی کا لطف یہ ہے کہ وہ شوخی کلام اور رنگینی بیان کے باوجود غزل سے الگ نظر آئے۔

اوّل اوّل ’’سلام‘‘ کا مقصد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر بزرگانِ دین کی روحوں پر درود و سلام بھیجنا ہوتا تھا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ شاعر غزل کی عروضی ہیئت استعمال کرے۔ متقدمین کے ہاں مثلث، مربع یا مخمس میں بھی سلام موجود ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ادبی شعور بھی ترقی کرگیا اور مرثیہ گو شاعروں نے مجلس عزا کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت سلام کی ہیئت اور نفس مضمون میں بھی تبدیلیاں کردیں۔ چنانچہ غزل کا عروضی سانچہ اس کے لیے مناسب خیال کیا گیا اور موضوع کو پھیلا کر واقعہ کربلا اور تذکرہ اہل بیت اس میں شامل کردیئے گئے۔

میرحسن، مصحفی، قائم چاند پوری وغیرہ نے مذہبی شاعری کی طرف خصوصی توجہ دی اور رباعیات، سلام، قصائد اور مرثیے لکھ کر مذہبی شاعری کو اپنے عہد کے ادبی معیار کے قریب کردیا۔ چنانچہ جب میر ضمیر، میر خلیق اور مرزا فصیح وغیرہ کا دور آیا تو انھوں نے ہزارہا سلام لکھ کر اس صنف ادب کو اپنی رنگین بیانیوں سے مالامال کردیا۔ اب مجلس عزا کا دستور یہ بن گیا کہ مرثیہ نگار منبر پر بیٹھ کر چند رباعیات پڑھتا پھر سلام کے اشعار سے سامعین کے ذوقِ سماعت کو اُبھارتا اور جب وہ پوری طرح شاعر کی طرف متوجہ ہوجاتے تو اصل نظم یعنی مرثیہ پڑھا جاتا۔ اس لحاظ سے ہم سلام کو مرثیہ کا ابتدائیہ (Prologue) (۶۲)

کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال سلام میں شاعر حمد، نعت اور منقبت کے مضامین بھی شامل کرسکتا ہے اور تزکیۂ نفس کے لیے دنیا کی بے ثباتی، فقر و فاقہ، حلم وحیا حق وصداقت اور ایثار وقربانی کا درس بھی دیا جا سکتا ہے لیکن شعرا زیادہ تر ذکر اہل بیت ہی کو اس کا موضوع بناتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ سلام کا آغاز دینی شخصیات اور خاص طور پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے ہوا لیکن مرثیہ گو شاعروں نے اسے ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور اسے مرثیے کے ابتدائیہ کے طور پر پڑھا جانے لگا لیکن وہ شعرا جنہیں مرثیہ گوئی سے جذباتی وابستگی نہیں تھی انھوں نے سلام کا اصل انداز قائم رکھا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائلِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ آپؐ پر درود و سلام کے لیے اس صنف سخن کو مخصوص کرلیا۔ چنانچہ شمیم احمد کا کہنا ہے:

''وہ نظمیں جن میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی جاتی ہے اور جن میں لفظ سلام استعمال ہوتا ہے، وہ بھی سلام کہلاتی ہیں''۔ (۶۳)

ایسے سلاموں میں مولانا احمد رضا خاں کا سلام: ''مصطفی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس سلام میں ۱۶۹ اشعار ہیں اور اس کے اشعار عام طور پر محفلِ میلاد کے اختتام پر پڑھے جاتے ہیں۔ طوالت کے سبب سارا سلام پڑھنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے صرف چند اشعار پر بھی اکتفا کی جاتی ہے۔ اسی طرح اکبر میرٹھی کا یہ سلام بھی زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔

یا نبی سلام علیک یارسول سلام علیک
یاحبیب سلام علیک صلوٰت اللہ علیک

جدید دور میں حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں کو بھی خصوصی شہرت حاصل ہوئی ہے۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

(حفیظ جالندھری)

اس سلام میں حضور کے اوصاف کے ذکر جمیل کے ساتھ شاعر کا جذبۂ محبت بھی کارفرما نظر آتا ہے اور الفاظ وتراکیب کا حسن انتخاب موسیقی کا سماں باندھتا ہے۔ کلام میں جذب و مستی اور کیف وسرور کی فضا سننے والے کو مسحور کردیتی ہے۔

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دست گیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

(ماہر القادری)

یہاں شاعر یکے بعد دیگرے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتا ہے اور آپ کی سیرت کا ایسا نقشہ پیش کرتا ہے جس میں دنیا کے لیے بصیرت اور ہدایت کا سامان موجود ہے۔

منقبت اور سلام میں نمایاں فرق ہیئت اور موضوع کا ہے۔سلام کے لیے ایک ہیئت معین ہے۔ یہ غزل کی فارم میں لکھا جاتا ہے۔منقبت کے لیے کوئی فارم مخصوص نہیں ہے اس لیے غزل، قصیدہ، رباعی اور مخمس وغیرہ کوئی پیمانہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔سلام کا موضوع بزرگانِ دین کے علاوہ دنیا کی ہیچ مقداری، فقروفاقہ، صبر وبرداشت وغیرہ ہوتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بھی اس کا موضوع بن سکتی ہے۔منقبت میں براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم ک کی مدح وستائش نہیں ہوتی۔البتہ کسی بزرگ کے حوالے سے کہ اُنھیں یہ مقام اتباع رسول کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی آ سکتا ہے۔سلام، مجلس عزا اور محفل میلاد میں پڑھا جاتا ہے۔مناقب پڑھنے کے لیے عرس یا محفل سماع یا آئمہ میں سے کسی کے یومِ ولادت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

منقبت اور قصیدہ

قصیدہ قدیم اصنافِ سخن میں ایک مقبول اور باعظمت صنف تھی، بلکہ عربوں کے نزدیک تو شاعرانہ کمال کا انحصار ہی قصیدہ نگاری پر تھا۔قصیدہ کی رفیع الشان عمارت تشبیہ، گریز، مدح، حسن طلب اور دعا سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔قصیدہ کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے سیّد جلال الدین احمد لکھتے ہیں:

''مختلف شاعرانہ مضامین کے لیے قصیدہ سب سے بڑا میدان ہے۔ہر قسم کے مضامین صرف قصیدے کے ذریعے ادا کیے جا سکتے ہیں۔مثلاً کوئی دوست جدا ہو رہا ہو، کوئی مؤثر منظر نظر سے گزرا، کسی نے کوئی ناموری کا کام کیا، کسی نے اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے فرائض کو ترک کر دیا۔غرض کہ اس قسم کے تمام مضامین قصیدے میں عمدگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور فی الحقیقت اسی غرض و غایت کے لیے اس صنف کا ایجاد ہوا ہے۔عرب کے قصائد انِھیں مضامین سے مملو ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد جذبات سے لبریز ہیں۔(۶۴)

ابتدا میں قصیدہ کی یہی صورت تھی۔عرب اس بے جا مداحی اور مبالغہ سے گریز کرتے تھے جو بعد میں فارسی شاعری میں قصیدے کا بنیادی وصف بنا۔خلوص وصداقت اس کے اصلی جوہر تھے۔چنانچہ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو اس نے کہا:''**افعل حتی اقول**'' کچھ کر کے دِکھاؤ تو لکھوں۔

بلحاظ موضوع قصیدے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک مدحیہ جس میں کسی ممدوح کی

تعریف ہو۔ دوسرے ہجو یہ جس میں کسی کی ہجو ہو۔ تیسرے وصفیہ جس میں اخلاق و پند و نصائح وغیرہ ہوں یا نفس کو مخاطب کر کے بے ثباتی عالم کا نقشہ دِکھایا جائے اور چوتھے بیانیہ مثلاً شہر آشوب وغیرہ۔ رفتہ رفتہ شعرائے باکمال نے اپنی مضمون آفرینی اور وقت پسند طبیعتوں سے ایسے قصیدے کہے کہ اس صنف کو چار چاند لگ گئے اور اس کے الفاظ میں شان و شوکت، بندش میں حسن، خیالات میں رفعت، مضامین میں جوش، کلام میں جزالت بیان میں تسلسل اور طرز ادا میں جدت پیدا ہوگئی۔ (۶۵) استعارات و تشبیہات اور صنائع بدائع کے استعمال نے اس کے حسن میں اور نکھار پیدا کر دیا۔

قصیدے سے زیادہ تر درباری اور مذہبی مداحی ہوتی ہے، اس لیے اکثر نقادوں نے قصیدے کو محض مدح سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن قصیدہ محض مداحی نہیں ہے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''قصیدہ مدح گستری تک محدود نہیں، اس میں بہت سے اور مضامین بھی ہوتے ہیں اور شاعری کے ایسے محرکات بھی اس میں کارفرما ہوتے ہیں جو حقیقی شاعری میں شامل ہیں......قصیدے کی تشبیب میں غنائی شاعری کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ وصف کے عمدہ سے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ بعض اوقات مکالمے کے ذریعے تمثیل کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح مدح میں وصف نگاری، جزئیات نگاری اور بیانیہ نگاری کی صورتیں نکل آتی ہیں اور آخر میں یہ کہ قصیدہ نگاروں نے نظمیہ تفصیل اور مسلسل مطالب کے لیے اس صنف کو خوب خوب استعمال کیا ہے۔

غرض قصیدہ ایک مرکب صنف ہے جس میں سریکل، بیانیہ، تمثیلیہ اور صنفیہ شاعری کے نمونے ملے جلے موجود ہیں''۔ (۶۶)

قصیدہ ایک مخصوص ہیئت رکھتا ہے اس میں جو کچھ لکھا جائے گا وہی قصیدہ کہلانے کا مستحق ہے۔ سودا کا قصیدہ ''تضحیک روزگار'' موضوع کے اعتبار سے قصیدہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس لیے قصیدہ ہے کہ وہ قصیدہ کی مخصوص ہیئت میں لکھا گیا ہے اور میر تقی میر نے آصف الدولہ کا ''شکار نامہ'' لکھا۔ یہ مثنوی کی طرز پر ہے اس لیے اس کو قصیدہ نہیں کہتے حالانکہ اس میں درباری مداحی مکمل طور پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ غزل، قطعہ اور رباعی وغیرہ میں بھی مدح کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔

مدحیہ قصائد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ قصائد جن میں کسی بادشاہ یا امیر کی تحسین پیش نظر ہوتی ہے۔

۲۔ وہ قصائد جن میں شاعر کسی مذہبی شخصیت سے اظہارِ عقیدت کرتا ہے۔

قصیدے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں یا دنیوی، ان میں تمام آورد ہوتی ہے اور وجہ صاف

ہے، شاعر ارادتاً کسی بادشاہ کی تعریف یا کسی بزرگ کی مدح پر کمر کستا ہے اور اس تعریف اور مدح میں مبالغہ کے انتہائی مدارج طے کرتا ہے۔

قصیدے میں شاعر زورِ طبیعت کے اظہار کے لیے نامانوس اور اجنبی قوافی استعمال میں لاتا ہے۔ (۶۷) علمیت کی نمود و نمائش کے لیے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں سے اپنے ایوان کو سجاتا ہے۔ رعب و دبدبہ کی خاطر عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ میں تراکیب لاتا ہے اور اس طرح ایک ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے جس میں شان و شوکت تو ہوتی ہے لیکن تاثیر غائب ہوجاتی ہے۔

قصیدے کی نشوونما میں درباری زندگی نے اہم کردار ادا کیا۔ شعرا کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوتے تھے اور امرا و سلاطین کی خوشامد ان کے لیے حصولِ زر کا ذریعہ تھیں جب برصغیر میں مسلمان سیاسی زوال سے دوچار ہوئے اور انگریزی اقتدار کے سائے پھیلنے لگے تو دربار ختم کردیے گئے اور اس طرح قصیدہ نویسی کے تنزل کا آغاز ہوا۔

عہد ماضی میں ذرائع ابلاغ کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ جو آج کل موجود ہیں اس وقت نہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اخبارات و رسائل تھے۔ نہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن تھے جو آن کی آن میں انسانی آواز کو اکنافِ عالم میں پھیلا دیتے ہیں۔

یہ ان باکمال شاعروں کے قصائد ہی تھے جو ملک کے گوشے گوشے میں بادشاہوں اور امیروں کی شہرت کے چراغ روشن کرتے تھے اور لوگوں کے دِلوں میں ان کی تکریم بڑھاتے تھے۔ بعض نقادوں کے نزدیک قصیدہ ایک معتوب صنف سخن ہے مگر پروپیگنڈا کے نقطۂ نظر سے جو حکمرانی کی نہایت اہم ضرورت ہے، اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں شبلی لکھتے ہیں:

''یورپ میں سینکڑوں ہزاروں اشخاص نام و نمود کے منبر پر نمایاں ہوئے ہیں اور صرف یہ بات ان کے حوصلوں اور ارادوں کو روز بروز بڑھاتی اور تیز کرتی ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں' اخبارات اور تصنیفات کے ذریعے فوراً تمام عالم میں اس کی آواز پھیل جاتی ہے۔ قوموں کا بننا' اُبھرنا' ان کے جذبات کا تازہ اور مستقل ہوئے رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے اوصاف کی صحیح داد دی جائے۔ ان کے کارنامے نمایاں کیے جائیں' ان کا ہر کام تاریخی صفحات پر چمکایا جائے۔ قصیدہ درحقیقت اسی کام کو انجام دینے کا آسرا تھا''۔ (۶۸)

مذہبی قصائد یا مناقب بھی بزرگانِ دین کے اعمال و افعال اور فیوض و برکات کا تذکرہ ہیں۔ یہ قصائد پھیل کر دینی اقدار کے فروغ کا باعث بنتے ہیں اور عوام الناس کو اعمالِ حسنہ کی طرف راغب کرتے ہیں، اس لیے نیکی اور خیر کو معاشرے کے جسم میں داخل کرنے کے لیے ان کی افادیت اور

اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی قصائد کے محرکات ختم ہونے کے باوجود ایسے مذہبی قصائد کی تحریک موجود رہتی ہے، کیونکہ دنیا دینی شخصیات سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ ان کے فیوض و برکات سے انسان ہمیشہ کسب فیض کرتا رہتا ہے۔ ثواب اور نجاتِ اُخروی کا خیال اس کے دل میں ہمیشہ موٴجزن رہتا ہے، لٰہذا دینی قصائد اور مناقب لکھے جاتے رہیں گے۔

قصیدہ گوئی چونکہ قدرت زبان اور وسعت مطالعہ و مشاہدہ کا تقاضہ کرتی ہے اس لیے اس کی بدولت زبان میں وسعت پیدا ہوئی۔ سینکڑوں نئے الفاظ، نئی ترکیبیں اور محاورے وجود میں آئے مختلف علم وفنون کا وافر ذخیرہ داخل زبان ہوا جس سے زبان کا دامن وسیع اور معیار بلند ہوا اور زبان میں پُرزور اور متین خیالات کے ادا کرنے کا وسیع ذخیرہ مہیا ہو گیا۔ اگر ہم قومی اور ملکی مضامین لکھنا چاہیں تو قصائد کی زبان ان خیالات کے ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔(۶۹)

قصیدہ اور منقبت دونوں کی غایت کسی ممدوح کی تعریف وتوصیف ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی راہیں کہاں سے جدا ہوتی ہیں۔ قصیدے میں کسی سلطان یا امیر کی تعریف ہوتی ہے اور اس سے قصیدہ گو کا مقصد دنیاوی مفاد حاصل کرنا ہوتا ہے اسی لیے حسن طلب قصیدے کا ایک اہم جزو ہے اور شاعر اپنی پوری صلاحیتیں طلب کے انداز کو خوب صورت بنانے میں صرف کر دیتا ہے تا کہ ممدوح خوش ہو اور شاعر کا دامن گوہر مراد سے بھر دے۔ قصیدہ ممدوح کی زندگی کے دنیاوی پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ شاعر اس کے عدل و انصاف، شجاعت اور بہادری اور جود وعطا وغیرہ کی تعریف کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی ان خوبیوں کو اُجالتا ہے اور سامنے لاتا ہے جو فی الحقیقت اس میں نہیں ہوتیں۔ اسے کمزور سے کمزور بادشاہ بھی رستم سے زیادہ بہادر، حاتم طائی سے زیادہ فیاض کیخسرو اور کیقباد سے زیادہ جاہ وحشم رکھنے والا نظر آتا ہے۔ اس طرح قصیدے کی عمارت غلو اور مبالغے کی بنیاد پر اٹھائی جاتی ہے۔

منقبت میں شاعر صحابہ کرام، اہل بیت اطہار اور اولیائے عظام کی مدح سرائی کرتا ہے اور اس میں نجاتِ اخروی کا سامان تلاش کرتا ہے۔ قصیدے کا تعلق دنیاداری سے ہے جبکہ منقبت انسان کے مذہب اور ایمان سے علاقہ رکھتی ہے۔ منقبت ممدوح کے روحانی اوصاف کو سامنے لاتی ہے اور بعض اوقات کہیں کہیں مادی اوصاف کا ذکر کرتا ہے۔ جن سے ممدوح کی ذات حقیقتاً متصف ہوتی ہے۔ وہ ان کی عبادت اور ریاضت کا ذکر کرتا ہے۔ اتباعِ رسول کو سامنے لاتا ہے، ان کے روحانی تصرفات کو موضوع بناتا ہے اور اس طرح دینی اقدار کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔

اکثر منقبت نگار شعرا نے قصیدے کی ہیئت استعمال کی ہے اور تشبیب میں عاشقانہ مضامین

باندھے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''اس قسم کی عاشقانہ اور رندانہ تشبیہیں صرف امرا سلاطین کی مدح میں لکھی جاسکتی ہیں مقدس لوگوں کی شان میں جو قصائد لکھے جاتے ہیں ان میں اس قسم کی تشبیہوں کا لکھنا گستاخی و بدتمیزی ہے۔ چنانچہ رضی نیشاپوری نے ایک بزرگ کی مدح جن کو وہ فدائیگان شریعت اور پناہِ ملت کہتا ہے۔ شراب و کباب کی تمہید کے ساتھ لکھی ہے اور اس پر المعجم فی معائر اشعار العجم میں یہ تنقید کی گئی ہے۔''

''کسے را کہ خدائیگان شریعت و پناہِ ملت خوانند نسیب مدح رو بہ شراب و مستی و صبوح لائق نباشد''۔ (۷۰)

قصیدے کے علاوہ منقبت، غزل، مثنوی، قطعہ اور رباعی وغیرہ مختلف اصنافِ سخن میں لکھی جاسکتی ہے۔ منقبت کا مضمون ہر صنف سخن کے پیکر بن ڈھل سکتا ہے لیکن قصیدے کے لیے ایک ہیئت مخصوص ہے اس کے دائرے سے باہر نکل آئے تو قصیدہ قصیدہ نہیں رہتا۔

منقبت اور مرثیہ

مرثیہ اور منقبت مذہبی شاعری سے پھوٹنے والی دو شاخیں ہیں لیکن دونوں مختلف ذہنی اور سماجی ماحول کی پیداوار ہیں اور دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں۔ منقبت جس صورت حال میں تخلیق ہوتی ہے اس کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس کے مقصد اور غایت پر بھی سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے۔ مرثیہ رثا سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی مرنے والے کی تعریف و توصیف ہے۔ انگریزی زبان میں اس صنف کے لیے (Elegy) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دی ڈکشنری آف انگلش لینگوئج میں اس کا مفہوم یہ لکھا ہے:

''نغمہ ماتم: ایسی شاعری تخلیق جو مرنے والے یا مرنے والوں کے کارناموں کے ذکر، ان کی توصیف اور ان کی موت پر اظہارِ غم سے عبارت ہو''۔ (۷۱)

انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا میں اس کے یہ معانی درج ہیں: "ELEGY" بین اور اظہارِ غم کی ایک مختصر نظم ہے جس کی وجہ تخلیق کسی محبوب یا قابل احترام ہستی کی موت ہو''۔ (۷۲)

لیکن اُردو کی اصطلاح میں یہ وہ نظم ہے جس میں میدانِ کربلا میں اہل بیت کے مصائب اور ان کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔ ایران میں اس میں اس طرح کے مرثیے صفویوں کے دور میں لکھے گئے تھے۔ اس دور میں مرثیوں کی ترقی حکمرانوں کے مخصوص مذہبی عقائد کی مرہونِ منت تھی اور محتشم کاشی اس دور کا عظیم مرثیہ گو شاعر تھا۔ اُردو شاعری میں جو مرثیے لکھنوی دور میں تخلیق ہوئے فنی لحاظ سے منفرد ہیں اور ان کی کوئی مثال عربی یا فارسی ادب میں نہیں ملتی۔

مرثیے میں پہلی چیز چہرہ ہے۔ اس میں کبھی تو مناظر فطرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ کہیں کوئی تاریخی واقعہ بیان ہوتا نظر آتا ہے۔ کبھی شاعرانہ تعلیٰ ہوتی ہے پھر جس کا مرثیہ ہے اس کی مدح ہوتی ہے۔ اجمال

کے ساتھ اس کے سوانح حیات کا ذکر بھی ہوتا ہے پھر اصل مضمون کی طرف گریز، جہاد کے لیے رخصت طلبی اور روانگی، میدانِ جنگ میں رجز خوانی اور مبارز طلبی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، لڑائی، مرکزی کردار کا تہور، فوج مخالف کی بزدلی، مرکزی کردار کا لڑتے لڑتے شہید ہو جانا، امام علیہ السلام کا اظہارِ الم وغیرہ۔

یہ مرثیہ کی ہیئت ترکیبی ہے اور اس ہیئت نے اُردو مرثیہ کو وہ انفرادیت عطا کر رکھی ہے جو کسی اور زبان میں لکھے جانے والے مرثیہ کو حاصل نہیں ہے۔ مرثیہ مجلس میں پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے جس طرح ڈرامے کے لیے سٹیج ضروری ہے اسی طرح مرثیہ کے لیے مجلس کا انعقاد لازمی ٹھہرتا ہے۔ ان مجالس میں مرثیہ نگار شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتا ہے اور سامعین اسے سن کر اشک بار ہوتے ہیں اور یوں بین و پکار مرثیے کا بنیادی مقصد قرار پاتا ہے۔

مرثیہ اپنی بنت کے اعتبار سے قصیدہ، مثنوی اور ڈرامہ کی بعض خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''تعریف کے ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شعرائے قصیدہ میں مبالغہ آرائی کے رجحان کو بطورِ خاص اپنایا ہے اور گھوڑے، تلوار، جنگ اور دوسری باتوں کے بیان میں تخیل سے مدد لی ہے۔ البتہ مرثیہ اور قصیدہ کے زرمیہ عناصر میں فرق ہے کہ قصیدہ کی مبالغہ آرائی کے پس پشت مطالب براری کا جذبہ کارفرما ہے۔ جبکہ مرثیہ کے پس پشت خوش اعتقادی اور مذہبی جوش وموجزن ہے۔ جہاں تک مرثیے میں داستان کا تعلق ہے شعرا نے واقعاتِ کربلا کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے کرداروں کو اُبھارا اور ان کے جذباتی ردعمل کو اُجاگر کیا ہے۔ مثنوی کا وصف ہے کہ وہ اپنے زمانے کی معاشرت کے نقوش کو محفوظ کرتی اور مختلف کرداروں میں شاعر کے اپنے احساسات و جذبات کو منتقل کر کے پیش کرتی ہے۔ ان مرثیوں میں بھی موجود ہے''۔ (۷۳)

منقبت اور مرثیہ اپنے اپنے مخصوص پس منظر اور اثر آفرینی میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ منقبت میں ممدوح کی مدح وستائش اور اس کی دینی خدمات اور روحانی تصرفات کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ کسی بھی ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے جبکہ مرثیہ کی ایک مخصوص ہیئت مروج ہے اور یہ عام طور پر اس میں لکھا جاتا ہے۔ منقبت داخلی صنف شاعری ہے۔ شاعر کسی دینی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے تاثرات کو جن میں اس کا خونِ جگر بھی شامل ہوتا ہے، شعر کی صورت میں ڈھال کر منقبت تخلیق کرتا ہے یہاں عقیدت و محبت کی حرارت بھی ہے اور سچی لگن کا ذائقہ بھی خودسپردگی کی کیفیت بھی ہے اور عاجزی اور نیازمندی کا والہانہ اظہار بھی۔ ایک مقدس فضا ہے جس میں شاعر سرتاپا ڈوبا ہوا ہے اس کی نگاہ ممدوح کی مقناطیسی شخصیت پر مرکوز ہے اور ذرا ادھر ادھر نہیں بھٹکتی۔

مرثیہ میں یہ کیفیت نہیں ہے۔ مرثیہ داخلی اور خارجی شاعری کا خوب صورت امتزاج ہے۔

مرثیہ نگاروں نے حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں میں شجاعت، صبر، وفا، بردباری، زہدوتقویٰ، تسلیم ورضا، حق گوئی و بے باکی جیسی صفات کو اُبھارا ہے۔ منقبت میں بھی اہل بیت کی اِنھی صفات کا تذکرہ ہوتا ہے، مگر جب دوسرے بزرگانِ دین منقبت کا موضوع بنتے ہیں تو ان کی صفات کا دائرہ کچھ محدود ہو جاتا ہے کیونکہ انھیں اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس طرح کی صورتِ حال اہل بیت کے سامنے تھی۔ لہٰذا منقبت نگار صرف ان کے زہدوتقویٰ، اتباعِ رسول، روحانی تصرفات اور دیگر فیوض و برکات کا ذکر کرتے ہیں۔

مرثیہ اپنے دکنی دور اور شمالی ہند کے ابتدائی دور میں ایک مخصوص مذہبی طبقے کے لیے لکھا جاتا رہا ہے اس لیے اس میں عام لوگوں کے لیے کوئی اپیل نہیں ہوتی تھی جبکہ منقبت کا دامن اس سے بہت وسیع ہے اور اس کا حلقہ اثر ہر اس شخص تک پھیلا ہوا ہے جس کے لیے مذہب میں کوئی دلکشی موجود ہے اور جو روحانیت پر یقین و اعتقاد رکھتا ہے۔

مرثیہ کا ایک اہم حصہ بین ہے۔ یہ بھی مرثیے کو رزمیہ ہونے سے روکتا ہے۔ رزمیہ میں المیہ کے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں لیکن دردناکی کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو مرثیہ میں ہوتی ہے۔ مرثیہ کا مقصد ہی رونا رُلانا ہے۔ یہ محرم میں منبر پر بیٹھ کر مجلس میں پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے اور اس کے سامعین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اس عقیدے کے حامل ہوتے ہیں کہ جس نے غم حسینؓ میں آنسو بہائے، وہ جنت میں داخل ہوا۔ میر انیس جب سامعین کو رونے کی ترغیب دیتے ہیں تو ''ایک باکمال رزمیہ نگار کی کرسی سے نیچے اُتر کر صرف مجلس کے ایک ماتمی بن جاتے ہیں''۔ (۷۴)

منقبت کے لیے مختلف ہیئتوں کا استعمال

محسن کاکوروی اپنے معروف نعتیہ قصیدہ میں لکھتے ہیں:

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ میرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

یہ شعر لکھتے ہوئے شاعر کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ نعت کا اپنا کوئی عروضی پیمانہ نہیں ہوتا اور یہ غزل، قصیدہ اور قطعہ وغیرہ کی شکل میں لکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات منقبت کے بارے میں بھی درست ہے۔

مختلف ہیئتیں قاری پر مختلف ردِعمل ظاہر کرتی ہیں۔ ہیئت سے مراد شعر کا ظاہری پیکر اور اس کی اندرونی فضا دونوں ہیں۔ قصیدہ شکوہ الفاظ سے، غزل گرمیِ جذبات سے، مثنوی اپنے قصے اور بیانیہ انداز

سے اور رباعی اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین اور ترنم ریزی سے سننے والے کو متاثر کرتی ہے۔

منقبت لکھتے ہوئے شاعروں نے مختلف ہیئتوں کا پیمانہ استعمال کیا ہے۔ کسی نے اظہارِ عقیدت کو قصیدہ کا رنگ دیا، کسی نے قطعہ کا، کسی نے اپنی داخلی کیفیات کو غزل کے آبگینے میں ڈالا اور کسی نے رباعی کے روپ میں، کسی نے مثنوی کا رواں دواں انداز اپنایا اور کسی نے مخمس یا مسدس کا۔ غرض لیلائے منقبت کے مختلف روپ ہیں اور ہر روپ میں ایک اپنا حسن اور نکھار ہے۔

اصناف شعر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی عروضی اور موضوعی۔ عروضی اصناف وہ ہیں جن کا اپنا ایک خاص عروضی ڈھانچہ ہے۔ مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ اور موضوعی اصناف میں حمد، نعت اور منقبت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اصناف کی اپنی کوئی عروضی پہچان نہیں ہے۔ ان کا مابہ الامتیاز ان کا موضوع ہے۔ یہ کسی بھی عروضی پیکر میں ڈھل سکتی ہیں۔ ان کی حیثیت اس خانہ بدوش کی سی ہے جس کا اپنا نہ کوئی ٹھکانہ ہے اور جو جہاں چاہتا ہے، پڑاؤ ڈال لیتا ہے۔ اس لحاظ سے انھیں خانہ بدوش اصنافِ سخن کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عہد ماضی میں منقبت نگاروں نے زیادہ تر قصیدے کی ہیئت استعمال کی ہے اس دور میں قصیدہ بڑی مقبول صنف سخن تھی، اسے شاعر کی قادر الکلامی اور زورِ بیان کا امتحان تصور کیا جاتا تھا اور موضوع کے اعتبار سے دربار میں رسائی حاصل کرنے یا مذہبی عقیدت کے اظہار کے لیے یہ بڑا عمدہ ذریعہ تھا۔ چنانچہ عربی، فارسی اور اُردو میں بزرگانِ دین کی مدح کے لیے یہی پیمانہ استعمال کیا گیا ہے اور شاعروں نے اسی میں اپنے کمال فن کی داد دی۔

مذہبی شاعری اور پروپیگنڈا ادب

مذہبی ادب ان تخلیقات سے عبارت ہے جو مذہبی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ منقبت مذہبی ادب کی ایک شاخ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ شاعر اپنے ممدوح کے اوصاف کا ذکر اس طرح کرے اور اس کی عظمت کو اس انداز سے اُجاگر کرے کہ قاری اس کی شخصیت سے متاثر ہو، اس کے دل میں مذہب کی قدر و قیمت بڑھے اور خیالات کی طہارت اور پاکیزگی میں اضافہ ہو۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ مذہب اور ادب کے موضوع پر اپنے مضمون میں لکھتا ہے:

''دیکھنا یہ ہے کہ شعر و ادب سے محبت رکھنے والے مذہبی شاعری کے متعلق کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو براہِ راست شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس کا استحسان کر سکتے ہیں۔ نہ کہ ان لوگوں سے جو شاعری کی اس خصوصی شاخ کے کلام کو مذہبی شاعری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ تو آپ واضح طور پر اس کو محدود کر رہے ہیں۔ کیونکہ شاعری کے دل دادگان کی اکثریت

مذہبی شاعری کو ادنیٰ شاعری کی ایک قسم سمجھتی ہے۔ مذہبی شاعر سے مراد وہ شاعر نہیں ہے جو اپنا سارا کلام مذہبی رنگ میں بیان کرتا ہے، بلکہ وہ ایسا شاعر ہے جو اپنے موضوع کے محدود حصے کا ذکر کر رہا ہے اور ان جذبات کو نظر انداز کر دیتا ہے جنھیں لوگ اعلیٰ جذبات سے تعبیر کرتے ہیں اور اس طرح ان سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتا ہے''۔(۷۵)

ایلیٹ کے اقتباس سے یہ احساس اُبھرتا ہے کہ جو شاعری مذہبی اساس رکھتی ہے اسے عظیم ادب میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں اعلیٰ انسانی جذبات کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ لیکن ادبی دنیا کے کئی عظیم شاہکار مذہبی اساس رکھتے ہیں۔ مثلاً رامائن' ایلیڈ' فردوس گم گشتہ وغیرہ انھیں محض اس وجہ سے عظیم ادب کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تار و پود میں مذہب کا خون رواں دواں ہے۔ البتہ ایسے پروپیگنڈا یا تبلیغی نوعیت کے ادب کو عظیم ادب کے ایوان سے خارج کیا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا براہِ راست پروپیگنڈا یا تبلیغی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔

حمد' نعت اور منقبت وغیرہ مذہبی شاعری کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ داخلی شاعری کے عہدہ کا نمونہ ہیں۔ یہاں شاعر اپنے ممدوح کی چند نمایاں صفات سے متاثر ہو کر (جنھیں وہ سچے دل سے درست خیال کرتا ہے) ان کے اعتراف کا برملا اظہار کرتا ہے لہٰذا ان نظموں میں شاعر کی ذات کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں خلوصِ دل' گہری عقیدت اور سچی تڑپ کا مزہ ملتا ہے۔ ان نظموں میں مدح کی بنیاد شاعر کے اندرونی مہیجات اور وجدانی کیفیات پر ہے۔ محض چند نظریات کے پروپیگنڈے پر نہیں ہے یہاں شاعر دامن کو چھوڑ کر مبلغ کا روپ نہیں دھارتا۔ وہ اخلاقی اور مذہبی اقدار کے حق میں تقریر نہیں کرتا' وہ جذبات اُبھارتا ہے' نصیحت نہیں کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر وہ اشاروں کنایوں میں تبلیغ بھی کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس طرح سے ادب کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

مذہب ایک بہت بڑی قوت ہے جو معاشرے کو متحد رکھتی ہے۔ یہ ایک منزل ہے جو بکھرے ہوئے عناصر کو یکجا کرتی ہے اور اُنھیں فکری ہم آہنگی عطا کرتی ہے۔ فریڈرک شبل کے حوالے سے سکاٹ جیمز لکھتا ہے: ''فریڈرک شبل نے کہا کہ ادب کسی قوم کی ذہنی زندگی کا ہمہ گیر جوہر ہے۔ اس نے اس بات سے انکار کیا کہ زندگی اور ادب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور کہا کہ دونوں کا تعلق ایک ہی عالم سے ہے۔ اس نے چند حدود کا ذکر بھی کیا جو انسانی برادری کو متحد رکھتی ہیں اور ان کی تحریکات کی رہنمائی کرتی ہیں۔ زر اور تجارت کی قوت' ریاست کی قوت' مذہب کی قوت اور فکر اور سوچ کی قوت''۔(۷۶)

ادب جب معاشرتی رجحانات و میلانات کا علم بردار ہے تو معاشرے کو رشتہ اتحاد میں پرونے

والی ایک اہم قوت سے کس طرح اغماض برت سکتا ہے۔ ادب میں موضوع کے ساتھ ساتھ اس کا ٹریٹمنٹ بھی اہم ہوتا ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ ادیب نے موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ادبی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے یا نہیں؟ اور ادب میں وہ شاعرانہ حسن وصداقت موجود ہے؟ جو کسی ادب پارے کو عام پروپیگنڈا ادب سے الگ کرتا ہے۔

حمد‘ نعت‘ مرثیہ وغیرہ اصنافِ سخن جو مذہب کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ پروپیگنڈا ادب کی ذیل میں نہیں آتیں۔ یہاں شاعر نظریات کی تبلیغ نہیں کر رہا بلکہ اظہارِ محبت کرتا ہے۔ ذاتِ حقیقی سے یا چند عظیم تاریخی شخصیات سے جو حسن اتفاق سے اس کی مذہبی رہنما بھی ہیں۔ شاعری میں خلوص اور صداقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ان نظموں میں اس کی کمی نہیں یہاں اعلیٰ انسانی جذبات کے اظہار کی پوری گنجائش موجود ہے اس لیے انھیں ادنیٰ شاعری کے نمونے کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔

آنحضرت کی ذاتِ گرامی کے بارے میں جو نعتیہ اشعار لکھے گئے ہیں‘ مسلمانوں کے مذہبی ادب میں اس کی روایت بڑی مضبوط ہے۔ شاعروں نے ان اشعار میں اپنے قلب وجگر کا خون شامل کر کے ایسی شاعری کی تخلیق کی ہے جو مذہبی ہونے کے باوجود اپنے اندر شعر کی ساری خوبیاں رکھتی ہے۔ منقبت نگار شاعروں نے بھی نعتیہ شاعری کی روایت کو سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے اصحابِ رسول ؓ‘ اہل بیت رسول ؓ اور نائبین رسول ؒ (اولیائے کرامؒ) کو موضوع بناتے وقت شاعری کے لوازمات کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور عمدہ شاعری تخلیق کی ہے۔

اُردو کا شعری ادب فارسی شاعری کے زیر سایہ پروان چڑھا۔ جن لوگوں نے اُردو شاعری کا آغاز کیا یا جنھوں نے اس کی نشوونما میں حصہ لیا۔ شاعری کے بارے میں ان کا تصور فارسی شاعری سے الگ کچھ نہ تھا۔ اُردو میں شعر کہنے والوں کے سامنے فارسی شاعری کی روایت موجود تھی۔ انھوں نے اس کی پیروی کی اور اصنافِ سخن سے لے کر تشبیہ، استعارہ اور دیگر لوازمات شعری تک اس کو معیارِ سخن تصور کیا۔ منقبت نگاری کا جو انداز عربی شاعری میں شروع ہوا تھا‘ وہ ایران کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ فارسی شاعری میں منتقل ہو گیا۔ فارسی شعرا نے اپنے کمال فن سے اس کا دامن وسیع کیا اسی کے زیر اثر اُردو میں منقبت نگاری کا پودا پھلا پھولا۔

حوالہ جات

۱۔ المنجد، مادہ: ن ق ب، مطبوعہ بیروت‘ ص ۸۲۹

۲۔ پارہ ۲۶‘ س ق‘ آیت ۳۶‘ و کم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشاً۔ فنقبوا فی البلاد۔ ھل من محیص۔

۳۔ پارہ ۶ س' المائدۂ' آیت ۱۲ القد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل و بعثنا منھم واثنیٰ عشر بنقبا۔

۴۔ پارہ ۱۶ س' الکھف' آیت ۹۷ 'فما استطاعوا ان یظھروہ ما استطعوا اللہ نقیبا۔

۵۔ فنقبوا فی البلاد' فطافوا وتغلبوا فی الاسفار' تفسیر ابن عباس مع الدر المنثور' ج ۵' ص ۲۶۰

۶۔ اخرج ابن جلیل وابن المنذر عن ابن عباس فی قولہ فنقبوا فی البلاد قال اثروا۔ (تفسیر الدر المنثور' ج ۶' ص ۱۰۹)

۷۔ تفسیر کشاف ج ۴ ص ۴۰۶

۸۔ انی لم اومر ان انقب قلوب الناس ولا اشبطونیھم۔ (بخاری کتاب المغازی ص ۶۲۴)

۹۔ من سال عن شئی فنقب عنہ۔ بحوالہ لغات الحدیث ص ۱۲۷

۱۰۔ وکان عبادہ من النقباء۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۶

۱۱۔ المعجم الفھرس لا الفاظ والاحادیث النبوی، مطبوعہ بیروت ص ۵۳۱

۱۲۔ فرہنگ آموزگار مرتبہ ڈاکٹر محمد معین مطبوعہ تہران

۱۳۔ جامع اللغات

۱۴۔ مضمون صحابہ کرامؓ کی نعت گوئی ڈاکٹر محمد صغیر الدین، مطبوعہ نعت نمبر صریر خامہ، شعبہ اُردو سندھ یونیورسٹی

۱۵۔ اُردو کی نعتیہ شاعری ص ۲۱

۱۶۔ Sartor Resartus E' on heroes E' heroworship

۱۷۔ بخاری شریف

۱۸۔ ابن ماجہ

۱۹۔ س الاحزاب آیت ۲۳

۲۰۔ س توبہ آیت ۹۹

۲۱۔ س انفعال آیت ۴۷

۲۲۔ صحیح مسلم

۲۳۔ ترمذی شریف

۲۴۔ ریاض النضرہ فی مناقب العشرہ: محب طبری ج ۱ ص ۱۸

۲۵۔ مسلم شریف

۲۶۔ س التوبہ آیت ۴۰

۲۷۔ اُردو ترجمہ مکتوبات ربانی دفتر سوم ترجمہ عالم الدین مکتوب ۱۲۲

۲۸۔ ابن عساکر

۲۹۔ ترمذی شریف

۳۰۔ ترمذی شریف

۳۱۔ بخاری شریف

۳۲۔ ترجمہ مکتوبات امامِ ربانی ص ۷۹ ص ۲۹۰ دفتر سوم

۳۳۔ ترمذی شریف

۳۴۔ ترمذی شریف

۳۵۔ ترمذی شریف

۳۶۔ بخاری شریف

۳۷۔ بخاری شریف

۳۸۔ بخاری شریف

۳۹۔ تکمیل الایمان از شیخ عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ پیر اقبال احمد ص ۱۸۲

۴۰۔ نغمات الانس ترجمہ محمد ادریس انصاری ص ۵۱

۴۱۔ س یونس، آیت ۶۲

۴۲۔ س انفال آیت ۳۴

۴۳۔ س آل عمران، آیت، ۳۶

۴۴۔ س النمل، آیت ۴۰

۴۵۔ کاشف الحقائق جلد دوم ص ۱۹۶

۴۶۔ انفاس العارفین ۸۰

۴۷۔ انفاس العارفین ص ۸۴

۴۸۔ الامن والعلیٰ از مولانا احمد رضا خان ص ۷۰

۴۹۔ بحوالہ الامن والعلیٰ از مولانا احمد رضا خان ص ۵۴

۵۰۔ انفاس العارفین ص ۹۵

۵۱۔ تذکرہ مشائخ نقشبند علامہ نور بخش توکلی ص ۳۰۲

۵۲۔ نشر الطیب ص ۳۰۰

۵۳۔ نشر الطیب ص ۳۰۱

۵۴۔ صحیح بخاری
۵۵۔ نشر الطیب ص ۳۰۲
۵۶۔ فرہنگ آنند راج
۵۷۔ تذکرہ نظامی ص ۶۰
۵۸۔ اُردو نعت، غیر مطبوعہ مقالہ ڈاکٹر ریاض مجید پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۵۹۔ کراچی، ملتان، جھنگ وغیرہ
۶۰۔ موازنہ انیس و دبیر، سرتاج بک ڈپو لاہور ص ۲۱۲
۶۱۔ رزم نگارانِ کربلا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ص ۱۶۷
۶۲۔ یہ ٹریجڈی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو پہلے گیت سے بھی پہلے ہوتا ہے (بوطیقا، ترجمہ عزیز احمد ص ۵۷)
۶۳۔ درسِ بلاغت، ترقی اُردو بیوروئی دہلی ص ۱۵۵
۶۴۔ تاریخ قصائد اُردو ص ۱۲
۶۵۔ مباحث، ص ۹۷، ۵۲۶، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور
۶۶۔ ایضاً،
۶۷۔ ارسطو کے قول کے مطابق خاص اور غیر مانوس الفاظ کسی نظم کا امتیازی وصف ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے الفاظ کے استعمال میں احتیاط کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر غیر مانوس لفظوں کا بے محل استعمال ہو یا استعاروں کی بھرمار ہو تو ایسی زبان لفظوں کا ملغوبہ بن کر رہ جائے گی، شاعرانہ زبان نہیں ہوگی۔
۶۸۔ شعر العجم، حصہ پنجم، مطبع معارف اعظم گڑھ ص ۲۱۔۲۲
۶۹۔ ایضاً ص ۲۹
۷۰۔ قصیدے پر ایک نظر۔ صریر خامہ، قصیدہ نمبر، سندھ یونیورسٹی ص ۷۰
۷۱۔ مطبوعہ لنڈن ۱۹۳۴ء، ص ۳۵۰
۷۲۔ جلد ۸، ص ۳۴۴
۷۳۔ اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ۳۲۰
۷۴۔ ڈاکٹر محمد عقیل، کتاب میر انیس ایک مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر احراز نقوی ص ۴۵۹
۷۵۔ Selected Essays p.390
۷۶۔ Making of literature بحوالہ اُردو مرثیے میں دبیر کا مقام، مظفر حسن ملک ص ۲۰۳

□□□

دکنی ادب میں منقبت نویسی کا فکری تجزیہ

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

ABSTRACT: This article, written by Dr. Aqeel Hashmi under the title "A Critical Analysis of MANQABAT Writing in Dakhni Literature", offers an in-depth scholarly examination of the intellectual and aesthetic dimensions of MANQABAT poetry within the Dakhni literary tradition. Rooted in the spiritual and cultural milieu of the Dakhni era, the study reveals how poets of the period employed the genre of MANQABAT not merely as a vehicle of devotional expression, but as a refined literary form deeply intertwined with the theological, mystical, and cultural consciousness of their time.Through a critical analysis of representative poetic texts, the article demonstrates how Dakhni poets, while drawing upon indigenous linguistic idioms and regional sensibilities, articulated a profound veneration for the Ahl al-Bayt and Sufi saints. The paper highlights the fusion of artistic creativity and religious thought, showcasing how elements such as symbolic imagery, rhythmic structures, and spiritual ideology coalesce within the poetic.

’’منقبت کے لغوی معنی تعریف کرنا ہیں۔ اصطلاحاً شاعری میں اہلِ بیتِ اطہار اور اصحابِ کبار کی ثنا کو منقبت کہا جاتا ہے‘‘(۱)۔

جس طرح مدح کی ذیل میں حمد کو پروردگارِ عالم اور نعت آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے مختص کر لی گئی، اسی طرح منقبت کو اصحاب و آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ تمام اولیاء اللہ بزرگانِ دین کی خدمت میں اظہارِ عقیدت سے تعبیر کیا گیا۔ تاریخِ ادبیات کے لحاظ سے درباری قصائد کہنے والے بیشتر شعرا نے محض اپنے جذبات واحساسات، قلبی اور مذہبی اساس و عاقبت سنوارنے کی خاطر سے اسلام کی قابلِ قدر ہستیوں کی جناب میں منقبتیں پیش کیں۔

منقبت نگاری میں شعرا، بزرگانِ دین، اولیاء اللہ، صوفیائے کرام اور سلاسلِ طریقت کے شیوخ سے اپنے ربط و تعلق کے ساتھ ساتھ ان کی عظمتِ کردار، علم و عمل، طاعتِ الٰہی، خشیتِ پروردگار، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و اہلِ بیتِ اطہار و صحابہ کرام کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید بنی نوعِ انسان کے لیے صلاح و فلاح کی راہوں کا تعین کرتا ہے۔ داعیِ اسلام نے صاف اور صریح انداز میں اوامر و نواہی کا اعلان فرمایا اور انھی احکام کی پابندی اور اسلامی طریق پر عبادت و ریاضت کے ذریعہ حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ تزکیۂ نفس و تطہیرِ قلب کے سلسلے میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مینارۂ نور ہے۔ تب ہی تو آپؐ کے بعد اصحابِ کرام، آئمۂ عظام اور بزرگانِ دین نے قرب و معیتِ الٰہی، وجودِ ہستی، فنا و بقا، محبتِ رسولؐ کے لیے افعال و اعمال کا قرینہ، سلیقہ و شعار مقرر فرمایا جو یقیناً رسالت مآب کی مبارک زندگی سے اکتساب کردہ تھا اور یہ "وابتغوا الیہ الوسیلۃ" کی بنیادوں پر اسلامی زندگی کے آئین و دستور بنا۔ ویسے بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس بات کی تاکید ملتی ہے کہ تمھارا جینا، تمھارا مرنا سب اللہ کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ○ (91-9،10)

(بیشک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ کر لیا اور بیشک وہ ناکام رہا جس نے اسے بگاڑ دیا۔)

اہل اللہ نے نفس کی اسی اصلاح اور زندگی میں ایمانِ صحیح و عمل صالح کی تلقین کی، جسے عرصہ بعد تصوف سے مراد لیا گیا۔ جبکہ اس کا شرعی نام احسان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے جانشینوں نے افراط و تفریط کے قطعِ نظر تبلیغِ دین صحیح اور خدمتِ خلق، تطہیرِ معاشرہ کا اعلیٰ ترین مظاہرہ فرمایا۔ ابتدا اس طریق و منہاج کو تصوف نہیں کہا گیا، لیکن بعد میں شاہانِ وقت کی بے اعتنائی دین، عیش و عشرت، ظلم و زیادتی کے برعکس اکابرینِ امت نے توکل و استغنا، صبر و شکر، محبتِ رسولؐ اور قربتِ حق تعالیٰ کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق، رواداری، حسنِ سلوک، مساوات و مشاورت، تقویٰ و طہارت، توبہ و استغفار وغیرہ کی تعلیمات کا خاص انداز اختیار کیا، وہ تصوف کہلایا۔

اسلام کے ان بنیادی اصولوں اور بزرگانِ ملت کی اس پر عمل آوری نے انھیں عزت و توقیر بخشی، کیونکہ صحیح معنوں میں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "ان العلماء ورثۃ الانبیا"، اور قرآن مجید اس کی تائید کرتا ہے، یعنی "یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ" تزکیۂ نفس، تعلیمِ کتاب اور حکمت، یہ تینوں امور جدا جدا ہیں۔ اسلام اپنے مخصوص فکر و نظر سے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج حیات تک پہنچنے کا راستہ بتلاتا ہے۔ اس میں جسم، قلب اور روح، ظاہر و باطن، دین و دنیا سب کی ترقی مضمر ہے۔ اولیاء

اللہ کا منصب ہی رہا کہ وہ عامتہ الناس کو اس جانب رغبت دلائیں اور خود ان پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو اس طرف متوجہ کریں، تاکہ وہ بھی اس کی پابندی کریں۔ ارشاد ربانی ہے کہ ''واسبغ علیکم نعمة ظاهرةً وباطنة'' اور پوری کردی ہم نے تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں (سورہ لقمان)

واضح رہے کہ ہمارے دین اور ہماری زندگی میں ابتدا سے انتہا تک ہر جگہ ہر چیز میں ظاہر و باطن کے جلوے موجود ہیں۔ خود قرآن کی آیات کے بھی ظاہری اور باطنی معنی ہیں انھی معاملات کے لیے بزرگانِ اسلام نے مختلف انداز وفکر سے چند ایک اصول قواعد مرتب کیے، جس کے تحت انسان اپنے خدا اور رسول اور اپنے دین سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اس کی خوشنودی اور انعام کا مستحق بھی ہوسکتا ہے۔

اس طرح مختلف سلاسلِ طریقت منصۂ شہود میں آئے، جن کی بنیاد شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رکھی گئی۔ ان میں سے چند ایک باتوں کے سوا، جو شاید ہر سلسلہ کی اپنی شناخت و پہچان ہوگی، سبھی سلاسل کا منشا و مقصد ایمان و اسلام سے جدا نہیں۔ انھی عظمتوں کے پیشِ نظر منقبت نگار شعرا نے مختلف بزرگانِ دین کی تعریف و تحسین کی۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اہل اللہ کی تعلیمات، مسلکِ تصوف کی آئینہ دار ہیں۔ اس مشن کے ذریعہ بزرگوں نے اپنے علم وفضل کے تحت دینِ صحیح اسلام کی تبلیغ وترویج کا کام بھی انجام دیا اور اس کی اساس حدیثِ احسان پر رکھی۔

''ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك'' (کتاب الایمان بخاری)

(یعنی تو اس طرح اللہ کی عبادت کر جیسا تو اس کو دیکھ رہا ہے اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔)

اسی تصوف کی تعلیمات کے ذریعے وجود باری تعالی، عظمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال پیدا کیا جاتا ہے۔ احترامِ انسانیت اور صلہ رحمی، رواداری، فقر ومسکینی، نیکی واخلاق، سنجیدگی و خاموشی، ذکر وفکر، عبادت وریاضت، تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب وتجلیۂ روح، دنیا وآخرت میں نفع وضرر کے اندیشے، ادب و احترام کی مختلف منزلیں طے کر کے ایک مومن ''من عرف نفسه فقد عرف ربه'' کے مقام و مرتبہ کو پا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیرویِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شریعتِ محمدی کے تقاضوں کی تکمیل ہی انسان کو حاملِ عزت وتوقیر بناتی ہے اور یہ تصوف کی پابندی سے ممکن ہے۔ گویا خلوص و نیک نیتی سے محبتِ رسول اور اطاعتِ حق کا روح میں جذب کر لینے کا دوسرا نام تصوف ہے اور اس پر عمل آوری قرآن وحدیث کی شرح بھی ہوگی۔ صوفی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے۔ معاشرت، معیشت، اخلاق و معاملات، حقوق العباد وحقوق اللہ، حدودِ حلال وحرام میں اس کا عمل دخل ہوگا۔

تصوف کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہمیں صوفیا کے دو گروہ ملتے ہیں۔ ایک جماعتِ وجودیہ اور

دوسری شہودیہ کہلائی۔ وجودیہ گروہ کے عارفین نے وحدت کے معنوں میں یکتائی مراد لیا، یعنی وحدہ لاشریک لہ کے نظریہ کے تحت خدا کی وحدانیت اور شرک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ حضرات وحدت الوجود کی تعلیم دیتے ہیں۔ شاید یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر حضرت بایزید بسطامی نے سبحان ما اعظم شانی اور منصور حلاج نے انا الحق کا نعرہ لگایا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ کے تحت جب انسان کی خودی، ذاتِ حق میں ضم ہو جائے تو "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی عرفان و آگہی کو وحدت الوجود سے مراد لیا گیا۔ بقول حضرت بندہ نواز گیسو دراز:

پانی میں نمک ڈال ذرا گھولنا اسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

جب کہ وجودی نظریہ کے برعکس وحدت الشہود جس کے بانی شیخ رکن الدین علاء الدولہ ہمدانی ہیں اور اس طریقِ تصوف کو بعد میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے فروغ دیا۔ کہتے ہیں "لاشہود الا ھو" ہی سچ ہے، کیونکہ خدا اور دنیا دو علیحدہ حقیقتیں ہیں۔ ایک خالق دوسری مخلوق کسی عارف پر جب عشق غالب آتا ہے تو وہ خدا کو اپنے قریب دیکھتا ہے اور اس کے نزدیک تفریق من و تو نہیں رہتی اس کیفیت بے خودی میں خدا کے ماسوا ہر چیز کو فنا جانتا ہے۔ اس کا تصور عشق حقائق کی پردہ پوشی کرتے ہوئے ہر شے میں اپنے محبوب خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اور یہی وحدت الشہود ہے۔

ہندوستان میں تصوف کے متعدد خانوادے اور سلسلے سرگرم عمل رہے ان میں قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ کے ساتھ سلسلہ شطاریہ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ دکنی کے بیشتر شعرا کسی نہ کسی طریق سلوک کے پابند تھے۔ یا ان سلاسل سے عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے شیوخ اور ان کارناموں اور کرامات کی تفصیل بیان کرنے کی غرض سے بھی ان کی منقبتیں کہی ہیں جس سے ان کا ربط و تعلق بھی ظاہر ہوتا ہے۔

منقبت کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اس صنف شعر کو مدحیہ قصیدہ ہی کی ذیل میں گنا جائے گا اور وہ بھی مذہبی مدح، اب اس کے معیار و مرتبہ کے لیے کسی طرح کے اصول و ضابطے بنانا، تحصیلِ حاصل سے جدا نہیں کیونکہ اس میں مداح اور ممدوح کے مابین محبت و مودت، ربط و ضبط والہانہ عقیدت و ارتباط باہمی کا معاملہ ہوگا اس پر کسی طرح کی شرائط عائد نہیں کی جاسکتیں۔ کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ قصیدہ کا معیار و محک عروضی ہوتے ہوئے بھی مبالغہ، غلو سے ہم آہنگ ہیں۔ اب چاہے حمدِ پروردگار ہو یا نعتِ رسول اللہ یا پھر منقبتِ اولیا۔ اس میں اخلاص اور تعلق خاطر و نسبت کی اہمیت ہوگی جو مداح کو ممدوح سے ہوتی ہے۔ ممدوح جتنا عالی مرتبت ہوگا، منقبت کا انداز اتنا ہی بلند و بالا ہوگا۔

منقبت اپنی ہیئت میں قصیدہ سے جدا نہیں مگر اس میں تشبیب، گریز، حسنِ طلب اور دعا کی گنجائش ہوگی اور نہیں بھی۔ قصیدہ میں مقتضب اور مشبب کا انداز واضح ہے، اس طرح منقبت میں بھی اسی رنگ و ڈھنگ کو جائز قرار دیا گیا۔ گو عربی کے بعد فارسی زبان و ادب میں جب غزل، رباعی مثنوی اور قطعہ وغیرہ جیسی اصناف مستعمل ہونے لگیں تو منقبت کو بھی اس اقسام شاعری میں پیش کیا جانے لگا۔ بہت سے فارسی شاعروں نے تاریخی، نعتیہ، منقبتی، وصفیہ (منظر نگاری) اور رثائیہ قصیدے لکھے، لیکن ناصر خسرو وہ پہلا شاعر ہے جس نے قصیدے کو ایک تحریک کی صورت میں مذہب وعقیدے سے روشناس کرایا۔ اس کے قصیدے حمد ونعت اور اولیائے دین کی منقبت کی صورت میں ہیں۔ اس نے فلسفیانہ طرز اختیار کرتے ہوئے بحث واستدلال کے ذریعے اپنے عقائد کو صحیح ثابت کیا ہے۔ ناصر خسرو کے قصیدوں میں خلوص اور وابستگی عشق کا بڑی شدت سے اظہار ملتا ہے۔ وہ ہر حال میں مذہبی آداب کا خیال رکھتا ہے۔ بعد ازاں مذہبی قصیدہ نگاری کو حکیم سنائیؔ نے فروغ دیا۔ فارسی میں پہلا منقبتی قصیدہ حضرت امام علی موسیٰ رضا سنائی نے لکھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے 'شعر العجم' میں فارسی کے نامی گرامی شعرا کی قصیدہ نگاری کی تفصیل درج کی ہے۔ عربی شاعری کے بعد فارسی شاعری میں اس صنف سخن کے کئی معرکے سامنے آئے۔ رودکیؔ سے لے کر دقیقیؔ، فردوسیؔ، عنصریؔ، فرخیؔ، کسائیؔ مروزی کے علاوہ انوریؔ، خاقانیؔ، ظہیرؔ فاریابی کے بعد عہدِ تیموریہ کے سب سے بڑے شاعر سعدیؔ شیرازی جو غزل کے پیمبر مانے جاتے ہیں۔ قصیدہ نگاری سے دامن کش نہ ہو سکے۔ ان کے مدحیہ قصیدے امرا کی بے سرو پا مدح گستری کے بجائے اپنے ممدوح کو وعظ ونصیحت سے دو چار کرتے ہیں، بلکہ آدابِ حکمرانی سکھاتے ہیں۔ سعدیؔ نے صنفِ قصیدہ کو مختلف موضوعات کے لیے استعمال کیا اور بے باک مداحی بھی کی۔ بے ثباتیِ دنیا پر پند و نصیحت، نیز حمد ونعت بھی لکھی۔

ہندوستان کے شعرا میں عرفی کا نام سرفہرست ہوگا جس نے قصیدہ وغزل کے محاذ آرائی کے دوران قصیدے کی رعنائی و دلفریبی کے مرقعے پیش کیے اور پھر ہندوستان میں مختلف زبانوں کے آمیزے، ادبی سرمایہ اور اس کے خمیر سے اٹھنے والی زبان اُردو میں قصیدہ نگاری کی روایات نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ فارسی اُردو زبان کی ابتدا وارتقا کے مختلف نظریات سے قطعِ نظر یہاں یہ بات مان کر موضوع سے متعلق تفصیلات کو درج کیا جائے گا کہ اُردو کا آغاز دکن سے ہوا (حالانکہ اس امر سے اختلاف کی گنجائش ہوگی) اور اب تک کی تحقیق کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی کی پیش کردہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء) کو اولیت حاصل ہے اور یہ تاریخی حقیقت بہمنی سلطنت کے قیام سے مربوط ہو جاتی ہے، لیکن بہمنی دور میں قصیدے کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی

کہ یہاں اس کا چلن عام تھا۔ البتہ بہمنی سلطنت کے بکھر جانے کے بعد وجود میں آنے والی پانچ ریاستوں میں سے شاید عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کے فروغ و استحکام نے اس صنف سخن کی جانب توجہ دلائی ہو۔ تب ہی تو ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی ریاستوں میں اُردو زبان اپنے تشکیلی دور میں تھی، اور فضا سازگار ہونے کی ضرورت سے دوچار بھی۔ خود سلاطین و امرا بھی فارسی کی جانب مراجعت کرتے اور کبھی اُردو کی طرف ملتفت ہوتے۔ کیونکہ اُردو اس عہد تک ایسی زبان نہ بن سکی، جو قصیدہ جیسی صنف سخن کا بار اٹھا سکتی تھی اور نہ ہی اس کی ترجمانی تاہم اس کشاکش کے دور میں دکنی زبان کے متوالوں نے راست قصیدہ نہ سہی، مثنوی کے ذریعہ اپنے جذبات اور احساسات کو پیش کرنے کی سعی و کاوش کی تھی۔

اردو مثنوی کی ابتدا و ارتقا کے متعلق متعدد بحثیں کی جا چکی ہیں۔ ویسے بھی دکنی اور اس کی شاعری کے ابتدائی نمونے محض مثنوی کی صورت سے ملتے ہیں۔ دیگر اصناف شاعری کی طرح مثنوی بھی عربی لفظ ثنیٰ سے مشتق ہے، جس کے معنی دو کے ہیں۔ چونکہ اس صنفِ سخن میں ہر شعر ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوتا ہے، اس لیے دو مصرعوں کی رعایت سے اس کو مثنوی سے تعبیر کیا گیا۔ یہ ایک مسلسل نظم ہے اور تسلسل ہی اس کی بنیادی خصوصیت، بقولِ امداد امام اثر: ''ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی'' (۲)۔

اور بقول سید محمد عقیل رضوی: قصیدہ کی طرح اس میں چند چیزوں کا ہونا ضروری خیال کیا گیا ہے جیسے (۱) حمد (۲) نعت (۳) منقبت (۴) تعریفِ بادشاہ (۵) تعریفِ سخن (۶) قصہ یا واقعہ (۷) خاتمہ۔ مگر مثنویوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ امور مثنوی کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ بلکہ اسلام یا اسلامی تہذیب سے متاثر شاعر حمد و نعت و منقبت سے ابتدا کو خیر و برکت سمجھتا تھا اور پھر ایک بہت بڑی تعداد مثنویوں کی ایسی ہے جس میں حمد و نعت و منقبت کا سرے ہی سے پتہ نہیں ہے'' (۳)

حقیقت تو یہ ہے کہ شاعروں نے مثنوی میں صرف بیان، واقعات، قصہ در قصہ میں ابتدا، انتہا اور اختتام کو ملحوظ رکھا۔ اب اس کو چاہے ارکانِ مثنوی سمجھا جائے یا لوازم یا پھر اجزائے مثنوی سے تعبیر کیا جائے، بہر حال مثنوی میں موضوع کی کوئی قید نہیں۔ ہر انسانی فکر و جذبہ اس کا موضوع بن سکتا ہے۔ رزمیہ، غنائیہ، وعظیہ، عشقیہ، صوفیانہ، سیاسی، صیدیہ، ہجویہ، مدحیہ وغیرہ وغیرہ۔ مولانا حالی نے اس بارے میں خوب کہا:

''مثنوی اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے۔ کیونکہ غزل یا قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔'' (۴)

دکنی کی کم و بیش سبھی مثنویاں مذہبی مزاج یا موضوع سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ

مثنوی نگار از راہِ عقیدت و محبت مثنوی کی شروعات حمدِ پروردگار سے کرتا ہے۔ بعد ازاں نعتِ رسول ﷺ اور پھر منقبتِ اہلبیت اطہار و صحابہ یا پھر اولیاء اللہ کی منقبت لکھتا۔ اور یہ ایک عام رجحان و رواج تھا، مگر یہ لازمی نہ تھا۔ چنانچہ اب تک کی دریافت شدہ دکنی کی اولین مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' از فخر دین نظامیؔ بیدری ۸۶۷ھ میں یہ التزام نہیں ملتا۔ یعنی شاعر نے حمد و نعت کے فوری بعد قصہ شروع کر دیا، منقبت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ نظامیؔ کی اس مثنوی کے بعد تقریباً دسویں صدی ہجری تک کسی اور تصنیف (مثنوی) کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ دسویں صدی ہجری کے شروع ہی میں اشرف کی 'نوسرہار' (۹۰۹ھ/ ۱۵۰۴ء، ۱۵۰۳ء) (۵) حزنیہ شاعری کا پیکر دستیاب ہوتا ہے۔ اسے ڈاکٹر زینت ساجدہ نے ایڈٹ کیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ شاعرِ خوش بیاں، حمد کے بعد نعتِ سرکارِ دو عالم کے کوئی ۱۲۱ ابیات تحریر کرتا ہے۔ اور اس کے بیچ منقبتِ صحابہ کرام اور وہ بھی خلفائے راشدین سے متعلق محض دو شعر پر اکتفا کرتا ہے:

بو بکر صدیق ایک سسرا عمر خطاب بہم، دوسرا
ای دو بزرگ پیر آزاد عثمان علی دوئی، داماد

البتہ دسویں صدی ہجری کے دوسرے باکمال شاعر خوب محمد چشتی قادری شطاری گجراتی ہیں (۹۴۶ھ تا ۱۰۲۳ھ) جو علاوہ شاعر ہونے کے نثر نگار بھی تھے۔ حضرت کو کمال محمد صاحب سیستانی سے بیعت تھی۔ تاریخ اُردو ادب میں حضرت کو ان کی مثنوی 'خوب ترنگ' سے شہرت ملی جس کی تاریخ تصنیف ۸۹۶ھ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی دیگر اور تصانیف کا پتہ بھی چلا ہے، جن میں رسالہ 'صراط مستقیم'، رسالہ 'جام جہاں نما'، 'مفتاح التوحید' اور 'رسالہ عروض اور قافیہ' (چھند چھنداں) مثنوی 'خوب ترنگ' اردو کے محققین میں کافی مقبول ہوئی۔ حتیٰ کہ اس کی شہرت یورپ تک جا پہنچی۔ ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کو یوروپی مخطوطے سے نقل کر کے ۱۹۳۳ء میں شائع کروائی۔ اس مثنوی کا کوئی چودہ برس بعد ۱۰۰۰ھ میں خود شاہ صاحب نے 'امواجِ خوبی' کے نام سے فارسی نثر میں لفظی ترجمہ کیا۔ اپنے مرشد کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں مرشد تھیں سنیاں بیان دی مرشد صاحب عرفان
جھنوں مجھی سکھلا دیں جھنیں مجھ دل ہوا یقیں
جیلانی بسطامی شاہ بغدادی جس تر کلاہ
ہر ماضی پر حجت لیکھ ہوں معتقد ہوا ان دیکھ
وارث محمدی پر تھانوں شیخ کمال محمد نانوں

کیا عروج مقام، اقدم اللّٰھم اغفر و ارحم
کہ تاریخ تہنوں کی خوب جن عددوں 'ذاکر محبوب' (۶)

ذاکر محبوب سے ۹۷۹ھ تاریخ وصال پیرومرشد برآمد ہوتی ہے۔ خوب محمد چشتی سے قبل حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے خلیفہ حضرت میراں جی شمس العشاق المتوفی ۹۰۲ھ کا 'خوش نامہ' اور آپ کے صاحبزادہ برہان الدین جانم المتوفی ۹۹۹ھ کا 'ارشاد نامہ' ملتا ہے 'ارشاد نامہ' میں جانم نے میراں کی مدح لکھی ہے۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے 'قدیم اردو' ۱۹۷۱ء کے تحت اسے شائع کیا۔ ۱۰۰۱ھ تا ۱۱۰۰ھ تک دکن میں ایسے بیسیوں شعرا کا پتہ چلتا ہے جنھوں نے اُردو شاعری (مثنوی) میں کئی لازوال قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے۔ ان متعدد شعرا میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر جو حسنِ اتفاق سے داعیِ سلطنت بھی تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ سرفہرست ہے، جس نے اب تک کی تحقیق کے مطابق مثنویات سے قطعِ نظر زیادہ تر کلام غزل، نظم، نعت و منقبت، رباعی کی شکل میں لکھا ہے۔ خاندانِ قطب شاہیہ کے اس صاحب علم و فضل، عز و جاہ حکمران کا دور حکومت ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء تک رہا۔ اُردو شاعری (دکنی) کا ایک ضخیم کلیات بطورِ یادگار چھوڑ گیا، جسے اس کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے بڑے اہتمام سے مدون کروایا اور کلیات کی بابت ایک منظوم خطبہ بھی تحریر کیا۔

سو کچ شاعری پیچ شہ وہر کمال
بچن کہہ کے موتیاں نمن صدف ڈھال

عرصہ بعد سلسلۂ یوسفیہ کے تحت پہلی بار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ۱۹۴۰ء میں کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ کو اپنے مبسوط و محقق مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، جس میں اُس کی زندگی اور شاعری سے متعلق بہت ساری باتیں لکھی گئیں۔ اس میں اس امر کی وضاحت بھی کی گئی کہ اپنی موزونیِ طبع، قوتِ مشاہدہ، بلندیِ تخیل کے علاوہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ہاں حافظؔ شیرازی کے بعد انوریؔ، خاقانیؔ، نظامیؔ عنصری، ظہیرؔ کے ساتھ ساتھ دکن کے دو شاعر محمود اور فیروز کے نام بھی ملتے ہیں۔ گو کہ محمد قلیؔ قطب شاہ کے قصائد اور مثنویاں دستیاب نہیں ہیں، لیکن جس قدر بھی کلام ہمدست ہوا ہے، اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قلی قطب شاہ نے غزلوں اور نظموں سے ہٹ کر حمد و نعت اور منقبتوں کا خاص اہتمام کیا ہے۔ خاص طور پر مقطع میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت علی سے نسبت کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ اس پر وہ فخر کرتا ہے۔ اس امتیاز و افتخار سے اس کا سارا کلیات بھرا پڑا ہے:

حق کی نظر تھے قطبا ترا بڑا ہے رتبا صدقے نبی علی ہے تج باعث ہور بانی
نہ کرتے تھے ہرگز سوختم کلام بغیر اُن علی کا لیے باج نام (۷)

اس کا رنگِ شاعری عشق و عاشقی سے مزین ہے، تو تصوف کے مسائل سے مملو۔ حمد، نعت اور منقبت کے تمام و کمال کا مرقع بھی ہے۔ مزید اس کی شاعری میں متعدد نظمیں زبانِ حال سے اپنی رنگینیوں، جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے اس زمانے کے رسم و رواج، تقاریب، تہواروں کا ذکر دراصل اس کی زندگی سے ہمہ جہتی، دلچسپی، ملک اور رعایا کے ساتھ اس کے تعلقات محبت، رواداری کو ظاہر کرتا ہے۔ خصوصیت سے شہر حیدر آباد (بھاگ نگر) کے بنائے جانے کے بعد اس کی ترقی و خوشحالی کی بابت اس کے احساسات قابل قدر ہیں۔ مذہبی رجحان کے لحاظ سے محمد قلی قطب شاہ کا شیعہ عقائد کا پیرو ہونا ثابت ہے۔ گو اس نے اپنے عہدِ حکومت میں سنیوں اور ہندوؤں کو بھی برابر کے مواقع دیے تھے، مگر مذہبِ اثنائے عشری سے اسے خاصی دلچسپی تھی۔ اس نے اس ضمن میں کئی ایک نظمیں کہی ہیں، جن میں خصوصیت سے عیدِ مولودِ علی، عیدِ غدیر، نوروز، محرم کے ساتھ ساتھ بیسیوں مرثیے لکھے۔ ۱۰۰۳ھ میں اس نے ایک بادشاہی عاشور خانہ بھی تعمیر کروایا تھا، جہاں وہ محرم کی مجالس میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوتا۔ جہاں مرثیہ خوانی اور آئمہ معصومین کی مدح کی جاتی ہے اور خطیب بآوازِ بلند فاتحہ پڑھتا۔ اس طرح عزاداری کے علاوہ مناقب کا اہتمام سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں صاف نظر آتا ہے۔ اس نے حضرت علی کی شان میں کوئی سات منقبتیں کی ہیں اور سات رباعیات بھی اور مدح بی بی فاطمہ عنوان کے تحت اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے یہ تمام منقبتیں صنفِ غزل میں کہی ہیں۔ چونکہ قلی قطب شاہ کی مثنویات اور قصائد دستیاب نہیں اس لیے ان میں مناقب کا کیا انداز ہوگا کچھ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ انتخاب میں شامل مناقب میں مضامین کے لحاظ سے حضرت علی کی شجاعت، آپ کے بابِ علم ہونے اور وصیِ رسول ہونے کی بابت یقین رکھتا ہے، اور یہ بات مذہبِ اثناعشری کے عقیدے کے عین مطابق ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ اپنی حکومت، اپنے عزّو جاہ کو وہ حضرت علی کی عطا اور بخشش سے تعبیر کرتا ہے۔ آپ کی نصرت و مشکل کشائی پر کامل ایقان رکھتا ہے۔ ایک منقبت میں اس نے ترکمانؔ اور قطبؔ کے تخلص بھی استعمال کیے ہیں۔ اس طرح حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا کی مدح میں اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ آپ تمام خواتینِ جنت کی سردار، ان کے سر کا تاج ہیں اور آپ ہی کی عنایت سے مجھے تاجِ خسروانہ، دولتِ شاہانہ نصیب ہوئی ہے۔ رباعیات میں بھی ایسے ہی مضامین کا ترفع نظر آتا ہے۔ چونکہ رباعی اپنی ہئیتی ترکیب سے بڑی اہم مانی جاتی ہے، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کا بطور خاص خیال رکھا کہ آخری مصرعے میں کوئی اہم نکتہ بیان ہو۔ اور یہ ساری رباعیاں حضرت علی کی شان میں ہیں۔ غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک پر گو عظیم شاعر ہے۔ اس کے کلیات میں ہر طرح کی شاعری موجود ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے بعد مولوی محمد اکبر الدین صدیقی نے اس کے کلام پر مشتمل ایک انتخاب ۱۹۷۲ء میں شائع کیا تھا۔ اور ۱۹۸۵ء میں پروفیسر سیدہ جعفر نے بھی 'کلیاتِ قلی قطب شاہ' کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ترقی اُردو بیورو دہلی سے شائع کروایا۔ اس کے علاوہ اس کی شاعری سے متعلق کئی ایک مضامین وقفہ وقفہ سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں کئی ایسے شاعروں کے کارنامے ملتے ہیں جن سے ان کے شعری ذوق وشوق سے ہٹ کر تبحرِ علمی اور عظمت کا اندازہ ممکن ہے۔ چنانچہ دربار محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا ملا وجہی بھی ان شعرا میں شامل ہے جنھوں نے دکنی شعروادب کو پروان چڑھانے میں دانستہ اور شعوری طور پر اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن وجہی سے قبل یہاں فیروز بیدری کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا، جس کا ذکر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں موجود ہے۔

فیروز بیدری کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ سلطنت بہمنیہ کے دورِ انتشاری کے بعد گولکنڈہ آ گیا ہو، جہاں بعہدِ ابراہیم قطب شاہ، سخن نوازی، داد و دہش کا چرچا عام تھا۔ یہ وہی مسلم الثبوت استاد ہے جس کی عظمت و فیروزمندی کا اعتراف دبستانِ گولکنڈہ کے اکثر شعرا کرتے ہیں بہ قول ڈاکٹر مسعود حسین خان: 'قطب الدین (قطب دین) قادری المتخلص بہ فیروز بیدر کا نامور شاعر اور دبستانِ گولکنڈہ کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ وجہی اور ابن نشاطی جیسے سخن نے فیروز کو استاد تسلیم کیا ہے اور اپنی شد اور اپنی شاعری کی اس سے اس سے داد چاہی ہے۔' (۸) وجہی نے اپنی مثنوی 'قطب مشتری' (۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء) فیروز کی زبانی اپنے شعر کی فضیلت کا اظہار یوں کیا ہے:

کہ فیروز آخواب میں رات کوں دعا دے کے چومے مرے بات کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس

وجہی کے بعد ابن نشاطی نے اپنی مثنوی 'پھول بن' (۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۵ء) میں فیروز کی استادی کو ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعر کی کچھ میری، داد

سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ''تذکرۂ اُردو مخطوطات'' میں فیروز کی مدحیہ مثنوی موسوم بہ 'توصیف نامۂ میراں محی الدین' کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" جون ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر نذیر احمد نے فیروز کی اس مکمل مثنوی 'پرت نامہ' سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ عرصہ بعد قدیم اُردو کی اشاعت کے موقع پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے

ادارہ ادبیات اُردو اور انجمن ترقی اُردو، ان دونوں کے نسخوں کا مقابلہ کر کے اسے ازسرِ نو مدون کیا۔ اس طرح پرت نامہ کا ۱۲۱ ابیات پر مشتمل متن تیار ہو گیا۔ (۹)

فیروز بیدر کا باشندہ اور سلسلہ قادریہ سے نسبت رکھتا تھا۔ ذیل کے شعر سے اس کا نام مولد اور سلسلہ کا پتہ چلتا ہے:

منجے ناؤں ھے قطب الدین قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

تاریخی لحاظ سے بیدرؔ کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ماہرینِ لسانیات کی رائے میں معیاری دکنی دبستانِ بیدرؔ میں جنم لے چکی تھی اور یہیں ارتقا کے تمام مدارج بھی طے کر چکی تھی۔ جبکہ دبستانِ گولکنڈہ پر اس کا راست اثر پڑا۔ اس لسانی میلان و تتبع کو منتقل کرنے میں استاد فیروزؔ کا زبردست ہاتھ تھا۔ فیروزؔ کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ 'فیروزؔ ایک پختہ زبان اور اسلوب کے ساتھ گولکنڈہ پہنچتا ہے، مرا خیال ہے کہ فیروز کی دبستان گولکنڈہ میں وہی اہمیت تھی جو استاد ذوق کی دبستان دہلی یا شیخ ناسخؔ کی دبستانِ لکھنو میں تھی۔ یعنی بنیادی طور پر وہ استاد تھا اور استاد کی حیثیت سے زبان داں تھا۔' (۱۰)

مثنوی 'پرت نامہ' کے بارے ڈاکٹر مسعود حسین خاں ڈاکٹر نذیر احمد کے ہم خیال ہیں کہ یہ مثنوی ایسا کوئی غیر معمولی ادبی شہ پارہ نہیں، البتہ ایک مرید کا نذرانۂ عقیدت ہے، جس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کی گئی ہے۔ ضمناً شاعر کے پیرِ طریقت شیخ ابراہیم مخدوم جی (۱) (المتوفی ۹۷۲ھ/ ۱۵۶۴ء) مخدوم جی اپنے زمانے کے مشہور و مقبول صوفی اور صاحب تصنیف عالم تھے۔ جنھیں وہ محی الدین دوجے کہتا ہے، کی توصیف بھی شامل کر دی ہے۔ کہتے ہیں کہ فیروزؔ ان ہی کے کہنے پر گولکنڈہ آیا تھا۔ چونکہ پوری مثنوی منقبتِ شیخ جیلانی پر مشتمل ہے۔ اس منقبت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے حسب نسب کی عظمت کو نمایاں کرتے ہوئے آپ کے فضائل و محامد کو بیان کیا ہے۔ لسانی اعتبار سے فیروز نے اپنے عہد کی معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے الفاظ میں کہا جائے تو ''گولکنڈہ میں ابتدا سے بیدری زبان کے تتبع میں پراکرتی الفاظ کا متناسب فارسی عربی الفاظ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے اور اس میں زوال سلطنت گولکنڈہ تک کوئی فرق نہیں پڑتا'' (۱۱)

منقبت میں قصیدۂ مدحیہ کے اجزا کے بطور کسی طرح کی تشبیب کا اندازہ نہیں ہوتا، بلکہ شاعر نے ابتدا ہی سے مناقب کا بیان شروع کر دیا ہے۔ اس طرح مثنوی کی صورت سے بھی اس میں حمد و نعت کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ اٹھارھویں شعر کے بعد سے وہ منقبتِ غوث الاعظم میں اپنے پیرو مرشد کے محاسن کو بھی خلط ملط کر دیتا ہے۔ بقول مولوی اکبر الدین صدیقی: 'اس نے حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی مدح میں یہ

مثنوی لکھی ہے، اس میں اس نے مختلف ایسی حکایتیں جمع کی ہیں جن کا تعلق حضرت کی کرامت سے ہے۔ بعد میں اس نے مختلف گناہوں سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ زبان اگرچہ مشکل ہے، لیکن اس میں بلا کی روانی اور بہاؤ ہے۔' (۱۲)

اسی لیے ہم نے اس کے ابتدائی اشعار کا انتخاب کیا ہے، جس میں لسانی نقطہ نظر سے دکنی کا مزاج مترشح ہوتا ہے۔ بہرحال فیروز کی استادی کا شہرہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے کلام کو شاملِ انتخاب کیا جائے۔ فیروز کی طرح دبستانِ گولکنڈہ کا ایک اور شاعر احمد شریف گجراتی اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء) کے ذریعہ شہرت رکھتا ہے۔

احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے جامع و مانع مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''جب ۱۵۲۷ء میں بہمنی سلطنت کا چراغ گل ہوا، تو دکن میں قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی سلطنتوں کی شمعیں فروزاں ہوگئیں۔ تا حال اردو تحقیق کو ماضی کے سرمائے سے جو گوہرِ آبدار دستیاب ہوئے ہیں، ان میں احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ جنوبی ہند کی ان پانچوں ریاستوں کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے۔ دکن میں اس سے قبل ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء میں بہمنی دور کے نظامی نے 'کدم راؤ پدم راؤ' کے نام سے اپنی مثنوی پیش کی تھی۔ اشرف کی 'نوسرہار' ۹۰۹ھ/ ۱۵۰۴ء حزنیہ شاعری کا پیکر ہے اور فیروز بیدری کا 'پرت نامہ' (قبل ۱۵۶۴ء) مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ بقولِ پروفیسر مسعود حسین خاں: 'یہ کوئی ایسا بڑا ادبی نقش نہیں، جو استاد فیروز کی شہرت کے شایان شان ہو، یہ دراصل ایک مرید کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ عبدل کا 'ابراہیم نامہ' (۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء، ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۲۱ء) بھی جو بیجاپوری ادب کا پہلا کامیاب نقش سمجھا جاتا ہے۔ مثنوی 'یوسف زلیخا' کے بہت بعد لکھا گیا ہے۔ وجہی کی 'قطب مشتری' (۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء، ۱۶۱۰ء) ابھی تک گولکنڈے کی پہلی مثنوی سمجھی جاتی تھی، 'یوسف زلیخا' کے بعد کی تصنیف قرار پائی ہے۔ مثنوی کی داخلی شہادتوں کی بناء پر 'یوسف زلیخا' کا سنہ تصنیف ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء تا ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہ اس طرح احمد گجراتی کی اس مثنوی کو وجہی کی 'قطب مشتری' پر ربع صدی سے زیادہ عرصے کا تقدم حاصل ہے۔' (۱۳)

احمد گجراتی کا پورا نام احمد شریف وطن گجرات ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں: 'شیخ احمد گجرات کا رہنے والا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے مقطع میں کیا ہے:

احمد دکن کے خوباں ہوتیاں ہیں ملاحت
تو توں دکھن کو اپنا گجرات کر کے سمجھیا' (۱۴)

متعدد تذکرہ نگاروں نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ میں احمد گجراتی کا نام 'دکن کے شاعروں' کے تحت درج کیا ہے۔ محمود شیرانی، ابراہیم زبیری کے علاوہ شمس اللہ قادری اُردو قدیم میں لکھتے ہیں کہ:

''قطب شاہی دور کے شعراء میں احمد، فیروز، محمود اور وجی سب سے قدیم شاعر ہیں۔ ان میں ملا احمد سلطان محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ ملا احمد نے بادشاہ کی فرمائش سے لیلیٰ مجنوں کی داستان منظوم کی تھی''۔(۱۵)

ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کی تاریخ اور علی گڑھ تاریخ ادب اُردو میں احمد گجراتی کا ذکر وجہی کے ہم عصروں میں کیا ہے۔(۱۶)۔

دبستانِ گولکنڈہ کے مشہور شاعر ابنِ نشاطی نے بھی اپنی مثنوی 'پھول بن' میں احمد گجراتی کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے اس امر میں تاسف کا اظہار کرتا ہے کہ آج استاد احمد نہیں، ورنہ اس کے کام اور ہنرمندی کی داد دیتا:

نہیں اس وقت پر وہ شیخ احمد
سخن کو دیکھتے باندھیا سو میں سر (۱۷)

احمد گجراتی سنی العقیدہ اور شاہ وجیہ الدین گجراتی کا مرید وخلیفہ تھا۔ اس نے اپنی مثنوی 'یوسف زلیخا' میں حمد، مناجات اور نعت کے بعد مدح امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ میں منقبت کی۔ بعد ازاں اپنے پیر ومرشد شیخ وجیہ الدین کی تعریف وتوصیف بھی کی ہے، مگر خلفائے راشدین کی مدح نہیں کی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس سلسلہ میں وضاحت کی ہے کہ 'شاعر حضرت علی کی مدح کو محمد قلی قطب شاہ کی خوشنودی کا وسیلہ تصور کرتا ہے۔'(۱۸)

ویسے اس نے اپنے پیر ومرشد حضرت وجیہ الدین (۱۹) کی مدح کرتے ہوئے انھیں خضر کا استاد 'قطبِ زمانہ' اور 'تاجِ اولیا' بھی کہا ہے۔ احمد گجراتی کا بعض تذکرہ نویسوں نے مدرس، فقیہ اور مثنوی میں خود شاعر علومِ متداولہ میں اپنی استعداد اور مختلف زبانوں سے واقفیت کا ذکر کرتا ہے۔ جن میں علمِ کلام، صرف ونحو، عروض ومعانی وبیان کے ساتھ ساتھ نجوم وفلکیات بھی شامل ہے۔ مثنوی 'یوسف زلیخا' میں مدحِ امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے بعد اپنے پیر ومرشد کی تعریف شاعر کے عقیدے کو ظاہر کرتی ہے۔ مدح، قصیدہ کے طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس میں بھی تشبیب کا کوئی رجحان نہیں۔ چونکہ یہ مثنوی سے مربوط ہے، اس لیے سلسلہ حمد ونعت کے بعد اس کو جگہ ملی ہے۔ منقبت حضرت علی میں شاعر کا غالب رجحان، بابِ علم کی تعریف وتوصیف ہے، جس کو ایمان سے متصل مانتا ہے۔ آپ کی ولادت کا قائل اور

دشمنانِ اسلام کی بیخ کنی کی روشن دلیل سمجھتا ہے۔آپ کی رضا کو خدا کی رضا سے تعبیر کرتا ہے۔اس طرح آپ کے فرزندانِ ذی احترام کو نہ ماننے والوں کو ابلیس کے مترادف سمجھتا ہے اوران کی پیروی کو دینِ اسلام کی کچی پیروی خیال کرتا ہے۔تعریفِ شیخ وجیہ الدین میں خود شاعر کی عقیدت کھل کر سامنے آتی ہے۔وہ اپنے پیرومرشد کو آ گاہِ حقیقت،تخت نشینِ ولایت بلکہ تاجِ اولیا کا مقام دیتا ہے۔ان کے حسب ونسب اورآلِ رسول ہونے پر ناز کرتا ہے اور آپ ہی کی تعلیم وتربیت میں دینِ صحیح کے قیام کا راز چھپا دیکھتا ہے۔کیونکہ وہی راہِ طریقت کے قطبِ اکبر ہیں۔غرض احمد گجراتی کی اہمیت دبستان گولکنڈہ میں غیر معمولی ہے،جس کا اظہار خود اس کے کلام سے جا بجا نظر آتا ہے اوراس عظمت و بزرگی کو وہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی علم پروری،قدردانی،شاہی عنایت کا موجب قرار دیتا ہے اوراپنی خوش نصیبی پر شاداں و فرحاں بھی ہے۔

احمد نے 'یوسف زلیخا' کے علاوہ،مثنوی 'لیلیٰ مجنوں' بھی لکھی۔کئی غزلیں اورعید نامے کہے ہیں اور دیگر اصناف سخن پر بھی اس کو دسترس حاصل تھی۔شمس اللہ قادری نے 'اُردوئے قدیم' میں احمدؔ کو فیروزؔ اور محمودؔ کا ہم عصر شاعر بتایا ہے۔(۲۰)

احمدؔ گجراتی کا ایک اور ہمعصر شاعر وجہیؔ تھا، جو بقول ڈاکٹر زور گولکنڈہ کا پہلا ملک الشعرا تھا۔احمدؔ گجراتی کا انتقال ۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۷ء میں ہو چکا تھا۔(۲۱) اسد اللہ وجہیؔ عہد قطب شاہیہ کا نامور اورعظیم المرتبت شاعر اور نثر نگار تھا۔دکنی زبان ادب میں اس کے شاہکار نظم ونثر یعنی مثنوی 'قطب مشتری' اور 'سب رس' یادگار ہیں۔وجہی نے گولکنڈے کے چار بادشاہوں ابراہیم قطب شاہ ۱۵۵۰ءتا ۱۵۸۰ء، محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ءتا ۱۶۱۱ء، محمد قطب شاہ ۱۶۱۱ءتا ۱۶۲۵ء اورعبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۵ءتا ۱۶۷۲ء (کذا ۱۶۷۲ء؟) کا زمانہ دیکھا۔

وجہیؔ اپنے نام اورتخلص کا اظہار یوں کرتا ہے:

اسم اسد اللہ وجیہ است تخلص
آرائیش وکانچۂ بازار کلام است

اس کے معاصر شاعر اور بعد کے شاعروں نے اس کی عظمت کا لوہا مانا ہے جیسے عہد عبداللہ قطب شاہ کا ملک الشعرا غواصیؔ کہتا ہے:

اس دکن کے شاعراں میں تجہ شہنشہ کے نزیک
ہے غواصیؔ ہور و جہیؔ شاعر حاضر جواب (۲۲)

شاہ افضل قادری (مصنف محی الدین نامہ) نے اپنے ایک قصیدے میں، دورانِ مدح عبداللہ

قطب شاہ، وجہیؔ کے کمال فن کا اظہار کیا ہے اور اس کو عاقل، گیانی اور گنبھر کہتا ہے:

تجھ ایسے شاہ کوں ہو نا سو وجہی سار کا شاعر
نپٹ عاقل نپٹ کامل نپٹ گیانی نپٹ گنبھر (۲۳)

نیز ابنِ نشاطی کے برخلاف طبعیؔ نے اپنی مثنوی 'بہرام وگل اندام' میں یوں اپنا خراج پیش کیا ہے:

یو وجہی مرے خواب میں آے کر مکہ اپنا سورج ناد دکھلاے کر
سراسر سینا جو مری مثنوی کہیا بات طبعیؔ ہے تری نوی (۲۴)

وجہیؔ کے حالات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں، تاہم اس کے نام اور کام کے بارے میں مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔ خاص طور پر اس کے نثری کارنامہ 'سب رس' پر زیادہ گفتگو ہوئی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنی کتاب 'تحقیقی نقوش' میں اسداللہ وجہیؔ کے عنوان سے کتابیات مرتب کی ہے۔ وجہی کی تصانیف میں 'قطب مشتری' (۱۰۱۸ھ) سب رس کے علاوہ تاج الحقائق اور ایک فارسی دیوان دیوانِ وجہی (مخطوطہ نمبر ۵۱۱/ب/نظم فارسی داخلہ نمبر ۲۴۵ سالار جنگ میوزیم) موجود ہے۔ اس کے علاوہ چند ایک غزلیں سخاوت مرزا اور مولوی اکبرالدین صدیقی نے دریافت کیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے وجہی کا اور بھی کچھ کلام دریافت کیا ہے۔ (۲۵)

قطب مشتری کو بابائے اُردو نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کی جب کہ مولوی صاحب نے لکھا: ''اس مثنوی میں سلطان محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کے عشق کا حال ہے۔ مگر پروفیسر سیدہ سیدہ جعفر نے اس بات کو درست نہیں بتایا وہ لکھتی ہیں: اس کی مشہور مثنوی قطب مشتری حال کی تصنیف ہے جس کا محمد قلی قطب شاہ کی نجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔'' (۲۶)

وجہیؔ سنّی العقیدہ چشتیہ مسلک کا پیرو تھا، اور اسی سلسلہ کے بزرگ پیر شاہ علی متقی کا پیرو تھا، اور پیر علی متقی کو پیر شاہ باز کا مرید و خلیفہ بتایا گیا ہے۔ (۲۷)۔ قطب مشتری میں وجہیؔ نے حمد، مناجات، نعت اور ذکرِ معراج کے بعد منقبت مولائے کائنات کا اہتمام کیا ہے۔ اس کی شعر گوئی کے سبھی معترف ہیں جبکہ وہ خود محمودؔ اور فیروزؔ سے اپنے کلام کی داد چاہتا ہے۔

کہ فیروز آخواب میں رات کوں دعا دے کے چومے مرے ھات کوں
کیا ہے توں یو شعر ایسا سرس کہ پڑھنے کوں عالم کرے سب ھوس
تو ایسی طرز دل تے نیچا، نوی کہ دسرے کریں سب تیری پیری
وجیہی ترا ذہن جیوں برق ہے تجھے ھور بعضیاں میں لئی فرق ہے
تراش عرسن دل یگلتا ہے یوں کہ بانی تے ابلوج گلتا ہے جیوں

تو وجہی کھیا شعر کی ڈھات کا	ھوا زیارت تج نے مزا بات کا (۲۸)

وجہیؔ جس قدر باکمال شاعر ہے اتنا ہی وہ اعلیٰ پایہ کا نثر نگار بھی تھا۔ 'قطب مشتری' بقول مولوی عبدالحق: ''گو یہ مثنوی اعلیٰ پایہ کی نہ ہو تاہم اس میں بعض بڑی خوبیاں ہیں۔'' جبکہ وجہیؔ کی تحریر کردہ 'سب رس' ۱۰۴۵ھ جو ادبی اعتبار سے دکنی نثر کا پہلا کامیاب نقش اور اہم کارنامہ ہے۔ لیکن اس میں بھی وجہی نے ابتدا میں حمدِ پروردگارِ عالم کا اہتمام کیا۔ بعد ازاں 'در نعتِ محمد مصطفیٰ و چہار یار و منقبتِ علی مرتضیٰ' کے عنوان سے چار شعر درج کیے اور نثر میں بھی اسی قرینہ کو برقرار رکھا۔

حمدِ پروردگار اور نعتِ آقائے نامدار کے سلسلے میں یہ بات مطالعہ میں آئی کہ خود عہدِ نبوت میں بعض صحابہ نے نظم و نثر میں یہ التزام پیدا کیا۔ جیسے حضرت جعفر طیار کا دربارِ نجاشی میں خطبہ نثر میں نعت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اردو زبان میں علامہ شبلی نعمانی کی مشہور و معروف نثر 'ظہورِ قدسی' اور علامہ سید سلیمان ندوی کے 'خطباتِ مدراس' میں نثر کی نعت کے عمدہ نمونے ہیں۔ جبکہ وجہیؔ نے حمدِ حق تعالیٰ کے ساتھ نعتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد منقبتِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جو اظہار کیا، وہ غیر معمولی ہے۔ قطب مشتری میں موجود منقبتِ علی کا اسلوب وجہیؔ کے رنگ و آہنگ سے مربوط، اور جیسا کہ کہا جا چکا، وجہیؔ سنی العقیدہ چشتیہ مسلک کا پابند تھا، اسی لیے اس نے منقبتِ علی میں محامد و محاسن کی صورت گری یوں کی کہ حضرت علی ہی رسول اکرم کے سچے جانشین ہیں۔ آپ کی شجاعت بے مثال، سخاوت لازوال ہے۔ نیز آپ کی کرامتوں میں اژدھا کو چیر دینا معمولی سی بات ہوگی۔ آپ کے نعرۂ الٰہی سے زمین و آسمان دہل جائیں۔ غرض حضرت کی شخصیت منبعِ جود و کرم، فضل و عنایت کی آئینہ دار ہے۔ اور اگر حبِّ علیؑ کی کسی دل میں جگہ نہیں ہے، تو سمجھ لیں وہی حرامی پن کی نشانی ہے۔ مزید وجہیؔ نے کم و بیش یہی طور و طریق اپنی نثری تصنیف 'سب رس' میں اختیار کی ہے۔ چنانچہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و چہار یار، منقبتِ علی مرتضیٰ کہہ کر اس نے اول چار اشعار میں خلفائے راشدین کی مدح بیان کی، بعد ازاں نثر میں بھی اسی انداز کو قائم رکھا، جس سے اس کے عقیدے اور محبتِ رسولؐ و اصحابِ رسولؐ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ابا بکر صدیق ہیں سب سوں خاص	کیے خارجیاں کوں شریعت میں راس
عمر حب نبیؐ کے اُمت میں ہوئے	یہودی عرب نے جو تھے سر نوے
جمع کر جو عثمان قرآن کوں	شرم کا دیے زور ایمان کوں
تو ٹیا کفر علی ہت تے ذوالفقار	خدا بعد محمد بھی چارو ہیں یار

عشق خدا کوں بھید یا تو اپنا حبیب کر محمد کوں پیدا کیا، عشق خدا کوں بھید یا تو اس کی خاطر آسمان زمین ہویدا کیا۔ اگر محمد نا ہوتا تو آسمان زمین نہ ہوتا۔ اگر محمد نہ ہوتا تو ماہ و پروین نا ہوتا، اگر محمد نہ ہوتا تو

دنیا ہور دین نا ہوتا، صاحب طٰہٰ ویٰسین، صاحب الا رحمۃ العالمین جس کے نور تے عالم نے پایا روشنی۔ لولاک لما خلقت الافلاک کا دھنی، اول خدا ہے نبی دویم سویم ہے ولی، یوتین نانوں تھے مومن کے دل کو تجلی - محمد کوں جس رات ہوئی معراج، وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج، گیان دھیان کے کام تمام محمد نے لیایا، جو کچھ پانا تھا سو محمد نے پایا، جو کچھ محمد نے پایا سوں علی کو سمجھایا، یو سمجھ علی کے تقسیم آیا، علی خدا کوں بھایا رسول کو بھایا محمد نبی، علی ولی، نبوت خدا کی پیشوائی، ولایت محبوبی ہور استغنائی نبوت کارسازی، ولایت بے نیازی، ولایت ہار گلے یار کا، نبوت دھندا گھر دار کا، ولایت آ کر نبوت آتی، نبوت آئے تو کیا ولایت جاتی، فرق دھندے کا مانک میانے آتا، کسے کچھ نپڑتا کوئی کچھ پاتا، حضرت کہیں خدا شاہد انا وعلی، من نور واحد تن سوں تن، جیو سوں جیو، دم سوں دم، نبوت محمد پر ولایت علی پر ختم۔ ابا بکر عمر ہور عثمان جنوں کی نیکی جانتا سب جہان حضرت کے پیاراں ہیں بزرگواں میں ایکس تے ایک سب بھلے جیوں خدا رسول فرمایا تھا یتوں چلے، لاف نئیں کیے خلاف نہیں کیے حق پر چلنہارے ایسچ اچھتے ہیں خدا کے پیارے، حضرت کے یار جنوسوں حضرت کرتے تھے۔ بچار آخر بعد از حضرت کے بیٹھے حضرت ٹھار:

ہر ایک حال خدا کوں یقیں سو جپنا
ولایت ہور نبوت یو قُرب ہے اپنا

ولایت کی جاگا پر نبوت کے جا صدر، ایکس تے ایک خوب ایکس تے ایک خوب تر، خدا بہوت بڑا سب ٹھار حاضر سب ٹھار کھڑا، سب میں اپنا نور بھریا کسے کچھ کسے کچھ کسے سب کچھ کریا۔ (۲۹)۔

ملا وجہی کے بعد دبستانِ گولکنڈہ کا ایک اور ملک الشعرا ملا غواصیؔ عہدِ عبداللہ قطب شاہ کا عظیم شاعر گذرا ہے۔ اس کی زندگی کے حالات پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہے، تاہم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے 'اُردو شہ پارے'، مولوی نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اُردو'، میر سعادت علی رضوی نے 'سیف الملوک بدیع الجمال' اور 'طوطی نامہ' میں، پروفیسر غلام عمر خاں نے 'مینا ستونتی' میں اور ڈاکٹر محمد علی اثر نے 'غواصی شخصیت اور فن' میں ملا غواصیؔ کے بکھرے ہوئے چیدہ چیدہ حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کتابوں اور کلام کی داخلی شہادتوں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غواصی عہد ابراہیم قطب شاہ ۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء تا ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں پیدا ہوا۔ تاریخی لحاظ سے وہ ملا وجہیؔ کا نوجوان معاصر ہے۔ اس کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو دیکھ کر وجہیؔ نے اس پر طعن و تشنیع کے وار بھی کیے۔

اگر غوطے لک برس غواص کھائے — تو یک گوہر اس دھات امولک نہ پائے
یو موتی نہیں وہ جو غواص پائیں — یو موتی نہیں وہ جو کس ہات آئیں
نہ پہنچا نہ پہنچا ہے گن گیان میں — سو، طوطی منجہ ایسا ہندوستان میں

غواصی نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور شاعرانہ کمال سے اس طنز کا جواب دیا ہے:

بچن کے سمند کا ہوں غواص میں　　دھر نہار ہوں موتیاں خاص میں
جگت جوہری سب مرے پاس آئے　　مرے خاص موتیاں کو جیو کر لجائے
جتے ہیں جو طوطی، ہندستان کے　　بھکاری ہیں منج شکرستان کے

اس معاصرانہ چشمک کے باوصف غواصی نے اپنے کلام میں کسی پیشرو یا ہمعصر شاعر کے کلام کی مداح سرائی کی اور نہ کسی کو اپنا مدمقابل یا استاد تسلیم کیا۔(۳۰)

''غواصیؔ کو عبداللہ قطب شاہ نے (۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۵ء تا ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء) ملک الشعرا مقرر کیا اور اس کی عزت وتوقیر میں اس طرح اضافہ کیا کہ جب محمد عادل شاہ والیِ بیجاپور کا قاصد ملک خوشنود واپس ہوا تو اس نے بھی اپنے دربار کے ملک الشعرا کو سفیر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا بلکہ 'فصاحت آثار' کے خطاب سے نوازا۔

ہزار شکر جو خوش ھو کے یوشہ عارف
خطاب منج کوں دیا ہے''فصاحت آثاری'' (۳۱)

بیجاپور میں غواصی نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور صاحب کمال کا ایسا عمدہ مظاہرہ کیا کہ وہاں کے بڑے بڑے شاعر، ملک الشعرا نصرتی اور مقیمی نے اپنی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا اور اس بنا پر غواصی کی شہرت دکن کی حد تک محدود نہ رہی، بلکہ شمالی ہند تک جا پہنچی، جہاں کے تذکرہ نگاروں جن میں میر حسنؔ، قائمؔ چاند پوری اور میر تقی میرؔ نے غواصیؔ کے بارے میں لکھا جب کہ اس عہد کے دیگر ممتاز شعرا وجہیؔ اور خود قلی قطب شاہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔(۳۲)

غواصیؔ سنی العقیدہ اور سلسلہ قادری میں بیعت تھا۔

ہوسند قادری ہوں غواصی
یا بھلا یا برا جکیج ہوں میں

اس کے پیرومرشد سید شاہ ابوالحسن علی حیدر ثانی جو میراں سید شاہ حیدر ولی قادری کے نام سے بھی مشہور تھے، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اولادوں میں سے تھے۔ آپ کا نسبی سلسلہ حضرت بندہ نواز سے ساتویں پشت میں اس طرح ملتا ہے۔ (۱) شاہ ابوالحسن ثانی (۲) بن شاہ عبدمن اللہ (۳) بن شاہ ابوالحسن اول (۴) بن شاہ کلیم الدین (۵) بن شاہ من اللہ (۶) بن سید محمد اصغر (۷) بن سید محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ اسرارھم (۳۳)

حضرت حیدر ولی قادری کے حالات اور ان کے خرقِ عادات پر ایک مستقل تصنیف موسوم بہ

خوارقِ حیدری‘ ملتی ہے۔ وہ حیدرآباد میں محلہ حسینی علم میں رہتے تھے۔ ۱۸۰۹ء میں وفات پائی اور احاطہ شاہ علی قطب ثانی بیدر درگاہ شاہ ابوالحسن الفیض میں مدفون ہوئے۔ غواصیؔ نے متعدد موقعوں پر ان کی مدح لکھی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے غواصی کے بیعت المصافحہ اور شجرہ بیعت کو اپنی کتاب ’دکنی غزل کی نشونما‘ میں درج کیا ہے۔ (۳۴)

غواصی کے کلیات، مثنویات ’سیف الملوک بدیع الجمال‘، ’طوطی نامہ‘ اور ’مینا ستونتی‘ کے مطالعہ سے یہ چند باتیں واضح ہوتی ہیں کہ اس نے سیف الملوک اور مینا ستونتی میں حسبِ طریق وروایت حمد و دعا، نعت کے بعد مدحِ امیر المومنین حضرت علی، نیز مدحِ عبدالقادر جیلانی کا اہتمام کیا ہے۔ بلکہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی منقبت بھی کہی۔ لیکن ’طوطی نامہ‘ میں صرف منقبتِ علی کا التزام رکھا۔ اس بارے میں طوطی نامہ کے مرتب پروفیسر محمد بن عمر کا کہنا کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ’یہ عبداللہ قطب شاہ کے مذہبی غلو اور درباری زندگی سی وابستگی کا نتیجہ ہے۔‘ (۳۵)

سیف الملوک (۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۵ء) میں اور طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ م ۱۶۳۹ء) اور مینا ستونتی (۱۰۲۸ھ م ۱۶۱۸ء) کو پروفیسر غلام عمر خاں قدیم اُردو جلد اول ۱۹۵۶ء میں شامل کیا۔ اس مثنوی میں آغاز قصہ سے قبل حمد و نعت خلفائے راشدین کی مدح پھر حضرت امام حسن امام حسین، حضرت عبدالقادر جیلانی اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی منقبت کے اشعار ملتے ہیں۔ اس سے شاعر کے مذہبی عقائد کے اظہار میں احتیاط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یعنی سیف الملوک میں حمد و نعت کے بعد خلفائے ثلاثہ کی مدح میں محض دو شعر اور حضرت علی کی منقبت میں ۲۴ اشعار اور پھر خواجہ بندہ نواز کی مدح اور آخر میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف میں ایک طویل نظم، گویا سیف الملوک کی تصنیف کے وقت وہ دربار سے وابستہ نہ تھا اور طوطی نامہ کی تحریر درباداری اور عروج کا زمانہ ہے۔ انتخاب میں شامل غواصی کی کہی ہوئی مناقب میں اول مینا ستونتی میں درج منقبت حضرت علی سے پہلے منقبت خلفائے راشدین آلِ نبی وغوث الاعظم، پھر منقبتِ علی۔ مزید غوث الاعظم کے دو منقبتیں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے پیرو مرشد حضرت پیر حیدر ولی قادری کی شان میں اشعار ملتے ہیں۔ غواصی ایک قادرالکلام پرگو شاعر ہونے کے ناطے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ غواصی نے ان مناقب میں زبان و بیان پر دسترس کا بہترین مظاہرہ کرتا ہے۔ منقبتِ خلفائے راشدین، آلِ نبی وغوثُ الاعظم کے تحت محض پانچ شعر کہتا ہے، جبکہ ہر خلیفہ کے لیے ایک ہی شعر میں ان کی محبت اور کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ پھر حضرت علی اور امام حسن و امام حسین کی مدح اور غوث الاعظم کی توصیف کے ساتھ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بارے میں ایک شعر کہتا ہے۔ منقبتِ حضرت علی کے مضامین چونکہ صنف غزل میں بیان کیے گئے ہیں، اس

لیے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس میں غواصیؔ نے مقامات و مدارجِ حضرت علی کو بیان کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ سلسلہ مناقب غوث الاعظم یعنی اپنی دونوں منقبتوں میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی عظمت و بزرگی، عشق الٰہی و عشقِ رسول کی جانب اشارے کیے ہیں۔ وہ عرفان و ایقان کی تازگی وعلویت کا تذکرہ کرتا ہے اور خود کو آپ سے وابستہ کرنے میں عزت وتوقیر سمجھتا ہے۔ اور جب مدحِ پیر حیدر پاشاہ کی سمت قدم بڑھاتا ہے، تو اس کی عقیدت ومحبت کا رنگ ہی جداگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے پیر کے قدموں کی خاک کو اکسیر اور ان کے جمال کا رِ میثاق کو خدائے برتر و بزرگ کا کرم اور سایہ گستر سمجھتا ہے۔ واضح رہے کہ یہی اندازِ بیان اس کے دیگر شاہ کار یعنی سیف الملوک بدیع الجمال میں بھی ہے۔ منقبتِ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ میں اس نے آپ کے محاسن ومحامد میں کعبۃ اللہ میں بتوں کو ڈھانے کے وقت نبی اکرم کے دوشِ مبارک کا سہارا لینے کی بابت وضاحت کرتا ہے۔ نیز صلابتِ ذوالفقار کی جانب بھی اشارے کرتا ہے۔ البتہ دشمنانِ اسلام کی صورت سے خارجیوں کو پیش کرتا ہے اور یہ بھی کہ اگر کوئی آپ کی ولایت میں شک وشبہ کی گنجائش رکھتا ہے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی منقبت کے بیان سے ہی میں دونوں جہاں میں سرافراز ہوگا۔ اس طرح کے جذبات و احساسات کو اس نے منقبت میراں محی الدین میں بیان کیا ہے کہ غوث الاعظم سارے ولیوں کے سرتاج ہیں۔ آپ کے ۹۹ نام ہیں جو بطور اوراد و وظائف پڑھے جاتے ہیں اور جو کوئی آپ کی عظمت ولایت کو نہ مانے وہ خدا اور رسول اللہ اور علی کا بھی نہیں۔ غرض غواصی کو خود اپنی علمیت اور مقبولیت کا خوب اندازہ تھا۔ وہ کہتا ہے:

طوطیاں سب ہند کے رغبت کریں تیوں آج خوش
زمانے آج کے مجنوں ہوا پیدا
شکرستان ہو غواصی شکر افشانی کیا
ہوا مشہور غواصی دکھن میں

بہرحال غواصی دبستانِ گولکنڈہ کا منفرد شاعر ہے، جس کے کلام میں اظہار و بیان کی سادگی، روانی اور بے ساختگی ملتی ہے۔ اس کے ہاں تاثر، شعریت، پاکیزگی اور علویت کے ساتھ ساتھ توازن اور دل نشینی پائی جاتی ہے۔ اب چاہے وہ روایتی شاعری کررہا ہو یا پھر تقلیدی، حمد ونعت اور مناقب میں بھی اس کا لب ولہجہ صاف ستھرا اثر آفریں ہوتا ہے، اسے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

قطب شاہیہ سلطنت میں عبداللہ قطب شاہ کا عہد بھی اپنی علم پروری و سرپرستی کے لیے مشہور ہے۔ اسی دور میں ملا نظام الدین احمد، جو سلطان کا داماد بھی تھا۔ ملا عبدالحکیم کی تاریخ محمد قطب شاہی "

حدیقۃ السلاطین " کی تکمیل پر مائل کیا۔ ویسے وہ بادشاہ کی قدردانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی مثنوی میں امر واقعہ کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا:

مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں ثریا کے تارک پو اس کا ہے پاؤں
دیکھت زور ور طالع اوس راج کے ضل دار، روشن زلال، آج کے
ہیں یوں بحق علی ولی کہ پھر جب میں آیا محمد قلی
ڈوبے تھے ہنر مند سو پھیر کر نکل آئے تجہ دور میں تیر کر
دیا جیو پھر راگ ہو رنگ کوں کیا دور سنیاں پو کے زنگ کوں(۶۳)

اس کے علاوہ کئی ایک علما شعرا کی ایک خاصی تعداد موجود تھی جن میں جنیدیؔ مثنوی ماہ پیکر ۱۰۶۴ھ، مثنوی ماہ پیکر کو پروفیسر سیدہ جعفر نے اپنے وقیع تحقیقی مقدمہ کے ساتھ قدیم اُردو ۱۹۸۶ء (جلد ششم) کے تحت شعبہ اُردو عثمانیہ سے شایع کیا۔ جس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ احمد جنیدی عہد عبداللہ قطب شاہ کا شاعر اور" ماہ پیکر" ایک نایاب مثنوی ہے۔ اس کے ساری دنیا میں دو ہی نسخے ہیں۔ ادبی، تاریخی اور لسانی حیثیت سے گراں قدر بھی۔ دکن کے تذکرہ نگاروں نے احمد جنیدی کا ذکر تو کیا لیکن تفصیلی حالات نہیں بتلایئے۔ جیسے 'اُردو شہ پارے'، 'دکن میں اُردو'، 'اُردوئے قدیم' اور صاحبِ 'حدیقۃ السلاطین' وغیرہ۔ پروفیسر صاحبہ نے نہایت عرق ریزی سے اس کے حالات یکجا کیے۔ اس کی رُو سے احمد جنیدی فرقہ مہدویہ سے تعلق رکھتا ہے۔ احمد نے مثنوی کے آخر میں اپنے پورے سلسلۂ بیعت کی وضاحت کردی ہے۔ ان میں جن بزرگوں کے نام لیے ہیں، ان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، امام حسن، امام حسین، امام زین العابدین محمد باقر، جعفر صادق، علی بن موسیٰ رضا ہیں۔ اس کے بعد داود طائی، معروف کرخی، خواجہ جنید بغدادی، محمد سراج طوسی، حسن سرخی اور سعید بن ابوالخیر۔ تاہم اس شجرۂ بیعت نظم کرتے ہوئے سید محمد جون پوری کا نام نہیں لیا، صرف القاب درج کر دیے۔ اس طرح مثنوی میں خلفائے راشدین کی مدح شاعر نے تین بار کی ہے۔ احمد جنیدی کے پیرِ طریقت ناصر ولی تھے، اور انھیں میراں محی الدین محمد سراج اور خواجہ جنید بغدادی سے بڑی عقیدت تھی۔ مثنوی میں حمد ونعت کے بعد منقبت کے پیرایہ میں یہ اشعار دیدنی ہوں گے۔ جبکہ منقبت کے آخری اشعار میں اپنے پیر ومرشد ناصر ولی کے ساتھ حضرت جنیدؒ، میراں محی الدینؒ اور محمد سراجؒ کا ذکر کرتا ہے:

ترے یار میں چار تجہ نور تے کہ روشن اوک ہے چندر مور تے
ابا بکر صدیقی جس نانون ہے بڑا مرتبہ اس کوں حق ٹھانوں ہے
نبی، بعد ازاں او امامت کیا کہ اسلام کوں زور سرسوں دیا

عمر ہے سو عادل عدالت منے کی بے مثل ہے اور شجاعت منے
ندی نیل کوں حور سی شہہ پری کہ ایک عدل اس کوں لگی تھرتھری
اگر توں نہ آسی تو ماروں ذرا کہ اس دھاک سوں اس میں پانی بھرا
مناجات منگے نبی یوں سرا عمر کوں سو مجہ دین میں لیا خدا
نبی کا سودا ماد عثمان ہے کہ ہر دو جہاں میں اسے مان ہے
جمع کر سو فرقان کوں سربسر دیتا اس کو ترتیب ہم یک دیگر
شرم میں نہ تھا کوئی اس را کا نظر اس اوپر ہے سو کرتار کا
علم کے شہر میں علی باب ہیں جکوئی اس کوں مانے اُسے لاب ہے
حکم جو کرے ڈونگراں گر پڑے کفر سارا اس دھاک تل گر پڑے
خلافت کو ظاہر ہے باطین کا عطا تج نبی تے ہے گھر دیں کا
علی سے ولی آج افضل بنا محمد علی ایک نئیں کچھ جدا
ہزاراں درود اور ہزاراں سالام نبی آل پر ہور یاراں تمام

کہ ناصر ولی پیر دل سوز ہے مو، داس ولی کا شب و روز ہے
کہ خواجہ جنید تجہ پہ ہے دستگیر اسی راستے جیو ہے مرا گھنمبیر
کہ میراں محی الدین منجہ سر چھتر جلچے میں کھونگا سو ہے خوب تر
محمد سراج کا سو میں ہوں غلام کہ ہوے گا یو مقبول ترا کلام

اس کے علاوہ ابن نشاطیؔ (مثنوی ’پھول بن‘ ۱۰۶۶ھ) صاحبِ ذوق، انشا پرداز عوامی شاعر تھا جسے دربار سے زیادہ عوام سے تعلق تھا۔ ابن نشاطیؔ، قطب شاہی سلطنت کے دارالخلافہ گولکنڈہ کا رہنے والا تھا۔ تاریخ ادبیات دکنی میں اس کی شہرت مثنوی ’پھول بن‘ سے ملتی ہے۔ یہ مثنوی، وجہیؔ اور غواصیؔ کی مثنویوں کے بعد دبستان گولکنڈہ کی سب سے اہم شاہکار مثنوی سمجھی جاتی ہے۔’’ابن نشاطیؔ کا پورا نام شیخ محمد مظہرالدین شیخ فخرالدین ابن نشاطیؔ ہے۔‘‘(۳۷) ’پھول بن‘ کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے شایع کیا اور ۱۹۵۵ء میں شیخ چاند ابن حسین نے انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی سے دوبارہ شایع کیا۔ چونکہ اس مثنوی کے علاوہ ابن نشاطیؔ کی کوئی تصنیف دریافت نہیں ہوئی، اس لیے حالاتِ زندگی پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ شیخ چاند کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ابن نشاطیؔ درباری شعرا میں شامل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ کہتا ہے:

حضور یاں میں مرا گھر ملک اچھتا — گھر ریز اس نے میرا ملک اچھتا
فراغت اس تے گر ٹک صبح کوں ہوتا — لیے موتیاں خوب میں اس تے پروتا
بڑیاں کے ناد اچھتا تو بڑا بن — مسیحا کا دکھاتا بات میں فن
زمانہ نہ سمجھے کر قدر میرا — بچھایا بے ولی ہوں صدر میرا (۳۸)

اور بقول شیخ چاند: ''البتہ اپنی آخری عمر میں وہ اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کا شمار اس زمانے کے ممتاز مشائخ میں ہونے لگا تھا، اور اسی لیے اس کو شیخ المشائخ کے اعلیٰ لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔'' (۳۹)

ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن ۱۰۶۶ھ محرم ۱۶۵۵ء میں تصنیف کی اور اس میں ان اساتذۂ سخن کو بھی یاد کیا جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔ حیرت ہے کہ ان میں فیروز، محمود، ملا خیالیؔ اور احمدؔ کا ذکر ملتا ہے، مگر وجہیؔ کا نام نہیں۔ مثنوی 'پھول بن' میں روایتی انداز سے حمد، مناجات و نعت کے بعد منقبتِ حضرت علی کا اہتمام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مدحِ امام حسین کے عنوان سے بھی مدحیہ اشعار ملتے ہیں۔ لیکن اس کلام سے اس کے مذہبی اعتقادات کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثنوی میں حمد کے بعد نعت کے بعد ہی منقبت کا اہتمام ملتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ ''پھول بن'' کا وہ نسخہ جو شیخ چاند نے ۱۹۰۰ء میں مرتب کر کے کراچی سے شائع کیا، اس میں خلیفۂ اول، دوم اور سوم کے منقبتی اشعار موجود نہیں ہیں۔ جبکہ ۱۹۵۷ء میں عبد القادر سروری کے مدوّنہ نسخے میں منقبتِ اصحابِ ثلاثہ یا خلفائے راشدین موجود ہے۔ ہم نے ان دونوں کتابوں سے مناقب کو یکجا کر دیا۔ خلفائے راشدین میں ابن نشاطیؔ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اس نسبت ومعیتِ فی الغار کو نمایاں مقام دیا اور حضرت عمر فاروقؓ کی عدالت اور فاروقیت کے اس جذبہ کی وضاحت کی جس میں انھوں نے اپنے صاحبزادہ ابوشحمہ پر حد تعزیر جاری کی تھی۔ اسی طرح خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی جو جامع قرآن مشہور ہیں، نیز آپ کے حلم وحیا، عبادت وشب بیداری سے آشنا کیا ہے۔ ان تینوں خلفائے کرام کے لیے شاعر نے محض ۱۳ اشعار کہے ہیں۔ اور منقبت علیؓ میں کوئی ۳۱ شعر، جس میں حضرت علیؓ کو وصیِ رسولؐ ہونے کی بجائے جانشین بتلایا، شجاعت، ولایتِ علم وعرفان، کرامت وسیادت، صاحبِ سیف وقلم کا مصداق کہہ کر اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے اور آپ کی نسبت پر یقین رکھتا ہے۔

ابن نشاطی کی طرح سید بلاقیؔ (معراج نامہ ۱۰۸۰ھ) شاہ راجو میراں جی خدا نما، میراں یعقوب عالم واحمد جیسے شعرا کے نام بھی ملتے ہیں، جو عہد عبداللہ قطب شاہ کی پیداوار ہیں۔ ان میں عالم کا وفات نامہ ۱۰۸۷ھ اور احمد کا نور نامہ ۱۰۹۸ھ کے درمیان شاہ راجو، جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی اولادوں میں سے ایک با اثر صوفی اور مرشد ہیں۔ ان کے کئی ایک مرید ومعتقد تھے جن میں طبعی

اور عابد قابل ذکر ہیں۔خود شاہ راجو کی مختلف نظمیں اور مرثیوں میں تصوف اور عرفان سے مملو مضامین ملتے ہیں۔عابد جسے ان کے مرشد شاہ راجو نے عابد شاہ کا لقب عطا کیا تھا اپنی مثنوی 'گلزار السلاطین' میں اپنے پیرومرشد کی تعریف یوں کرتا ہے:

میرا پیر مجھ تن کوں بتلایا　　اسی تن میں احمد کوں دکھلا دیا
اسی نور کوں لے پھرا تن منے　　تو پایا خدا تن کے گلشن بنے
الٰہی بحق شفیع الامم　　توں رکھ شاہ راجوؔ یہ اپنا کامتو رکھ
الٰہی بحق وصی مصطفی　　تندرست ان کے تیئں تا بقانوں توں
الٰہی بحق حسین و حسن　　رکھ ان کو آفات سے نت جتن

عابد شاہ نے حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی فارسی کتاب کا بھی ترجمہ کیا، جبکہ میراں جی حسن خداوند خدا نما نے کئی رسالے اور نظمیں لکھیں۔ان میں رسالہ وجود یہ اور شرح مرغوب القلوب مشہور ہیں۔کہتے ہیں انھوں نے ایک چکی نامہ بھی لکھا۔میراں جی خدا نما کے ایک اور مرید میراں یعقوب نے ۱۰۸۷ھ میں حضرت برہان الدین اولیا اورنگ آبادی کی کتاب 'شمائل الاتقیا' کا اردو نثر میں ترجمہ کیا، اس میں انھوں نے اپنے مرشد کا ذکر منقبت کے انداز میں کیا ہے: "سید السادات عارف ذات وصفات محققان کے قطب موحداں کے پیشوا، مریدوں کے دستگیر، طالبان کے رہنما، بوجھنہارے علم لدنی کے، سوچھنہار حقیقتاں دین و دنیا کے، پیر میراں سید میراں چشتی قدس اللہ سرہ، سرہ کی خدمت انجام سو پرورش پاتا تھا، ہور دن دن اس اس شعور مور اس ہوئیں میں آتا تھا جب بلوغیت میں اگر دستِ بیعت نعمت پایا، تب ارشاد و تلقین کی لذت سوں آ گیا یا شریعت طریقت کے وضع وضع کے مزے چکھائے ہور مغفرت و حقیقت کے جنس جنس کے تماشا دکھائے۔" (۴۰)

عبداللہ قطب شاہ خود شاعر تھا۔اس کا داماد و جانشین ابوالحسن تانا شاہ(۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ / ۱۶۷۳ء تا ۱۶۸۶ء) بھی اپنی سخن گستری علم وادب کی سرپرستی کے لیے اپنے پیش رَو سلاطین سے جدا نہ تھا۔ابوالحسن تانا شاہ کا ایک پیر بھائی اور شاہ راجو کا مرید طبعی بھی قطب شاہی سلطنت کا آخری اعلیٰ پایہ کا شاعر گذرا ہے۔

طبعیؔ، ابن نشاطیؔ کے بعد گولکنڈہ کا مسلم الثبوت استاد رہا ہے۔اس نے بھی ابن نشاطی کی تقلید میں دربار سے کوئی تعلق یا ربط نہ رکھا۔اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے ابوالحسن تانا شاہ کے دربار کا ملک الشعرا بن سکتا تھا۔کیونکہ وہ تانا شاہ کا پیر بھائی ساتھی تھا۔اس نے دبستانِ گولکنڈہ کی روایات کو آگے بڑھایا اور ایک مثنوی بہرام وگل اندام ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۰ھ میں لکھی۔یہ مثنوی قریب ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل

ہے، جسے اس نے محض چالیس دن میں مکمل کیا۔ بقول ڈاکٹر زور: ”معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم میں ابوالحسن کے بادشاہ بننے کے بعد طبعی نے شاہ راجو کے ساتھ ابوالحسن کی مدح کے اشعار اضافہ کیے تھے۔“ (۴۱) اس کے دیباچہ میں اپنے اور بادشاہ کے مرشد شاہ راجو کی تعریف میں متعدد بیتیں لکھی ہیں۔ طبعی نے اس مثنوی میں شعری لوازم کے ساتھ ساتھ سلامت اور نزاکتِ زبان وادب کا خاص خیال رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر زور: ”طبعیؔ اپنے پیشرو اساتذہ وجہیؔ، غواصیؔ اور ابن نشاطیؔ تینوں پر بھی سبقت لے گیا ہے۔“ اپنی شاعرانہ عظمت وخصوصیت کی داد وجہی سے چاہی بلکہ خود کو مثل یا ثانی وجہیؔ کہا:

لگیا میں جو یو مثنوی، بولنے — یو موتیاں نچھل ڈھال تیوں رولنے
یووجہی مرے خواب میں آئے کر — مکھ اپنا سورج ناد دکھلائے کر
سراسر سینا جو مری مثنوی — کیا بات طبعیؔ ہے تری نوی
ہو خوش حال سن کر یو باتاں مرے — آپس کے لے ہاتاں میں ہاتاں مرے
بڑے پیارسوں آپنا یو مثل — سینا سو پڑیا خواب تھے میں اوچھل (۴۲)

غرض طبعیؔ عہد ابوالحسن تانا شاہ کا قابل ذکر شاعر ہے۔ اس کے بعد بھی بہترے شعرا موجود تھے لیکن گولکنڈہ میں امین، خواص، سیوک، افضل اور غلام علی (۴۳) کے سوا ایک فائز (جس نے اپنی مثنوی رضوان شاہ ۱۱۰۴ھ میں روح افزا کے نام سے لکھی۔) کوئی عظیم و باکمال شاعر پیدا نہیں ہوا۔ البتہ سقوطِ گولکنڈہ کے بعد بھی یہاں کی علمی ادبی سرگرمیوں میں انحطاط ضرور آیا، مگر وہ بالکلیہ ختم نہیں ہوئیں۔ چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر کی اس تہس نہس کے بعد اکثر اہلِ علم گوشہ نشین ہو گئے اور بعضے دربار سے متعلق۔

افراتفری کے اس دور میں جسے ڈاکٹر زور نے ’دورِ انتشار‘ (۴۴) سے تعبیر کیا۔ دو ایک باکمال شاعر نظر آتے ہیں۔ جس میں سید محمد خاں عشرتی کا نام نمایاں ہوگا۔ سید محمد عشرتیؔ کے بارے میں دکنی کے اکثر و بیشتر تذکرے خاموش ہیں، اور کسی نے بھی اس کے حالات زندگی اور فن پر کھل کر گفتگو نہیں کی۔ اس کی مثنوی ”دیپک پتنگ“ کی تصنیف کا زمانہ دکن پر مغلیہ حکومت کے تسلط کا ہے۔ اس وقت قاضی محمود بحری من لگن ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۶ء اردو فارسی کے شاعر اور ناشر کے علاوہ کتنے ہی شاعر دکن سے نکل گئے۔ ڈاکٹر زور نے اس پورے دور کے شعرا کی تفصیلات مہیا کی ہیں۔ ان میں چند شاعروں نے زمانے کے انقلاب کے بعد خود کو اس کے ہم رنگ بنا لیا۔ جیسے شیخ داؤد ضعیفیؔ کے علاوہ سید محمد خاں عشرتیؔ ایک بڑا شاعر ملتا ہے۔ جو اپنی خاندانی وجاہت اور لیاقت کی وجہ سے اورنگ زیب عالم گیر کی سرپرستی سے فیض یاب ہو سکا۔ ڈاکٹر زور نے اُردو شہ پارے اور داستان ادب حیدر آباد میں اس کے حالات لکھے ہیں جبکہ مولوی عبدالحق نے ’حیدر آباد کا ایک شاعر خاندان‘ (۴۵) کے عنوان سے عشرتی کے حالات، خاندان اور

شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ مزید مولوی نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' اور وضاحتی فہرست سالار جنگ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ راقم الحروف نے ۱۹۸۰ء میں عشرتیؔ کی مثنوی 'دیپک پتنگ' کو اپنی پی ایچ ڈی کا موضوعِ تحقیق بنایا اور تدوین کی۔ عشرتیؔ کے متعلق یہ بات صاف طور پر کہی جاسکتی ہے کہ وہ صحیح النسب سادات، درویش اول، عہد محمد عادل شاہ میں اپنے والد سید یوسف حسینی کے ہمراہ عراق سے بیجاپور پہنچتا ہے۔ اس کے والد کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ عشرتی کی ابتدائی زندگی عادل شاہی حکومت سے وابستہ رہی۔ اس نے تین عادل شاہی حکمرانوں کے ادوار دیکھے۔ محمد عادل شاہ (۱۶۲۶ء تا ۱۶۵۶ء) علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۳ء) اور سکندر عادل شاہ (۱۶۷۲ء (کذا) تا ۱۶۸۶ء) اس طرح محمد عادل شاہ کے عہد کا یہ نوعمر شاعر، علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دور کے ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے ابھرا۔ شاید اسی بنا پر عشرتی کے اخلاف عشرتی کو ملک الشعرا ملا نصرتی کا مدمقابل قرار دیتے ہیں۔ (۴۶)

ادھر ڈاکٹر زور عشرتی کو ابن نشاطی کا حریف شاعر بتاتے ہیں۔ (۴۷) عشرتیؔ کے ایک پوتے ملا علی احسان نے اپنی تصنیف 'گلشنِ احسان' ۱۷۰۰ء میں اپنے دادا کے کارنامے اور خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے عشرتیؔ کو نصرتیؔ کا مدمقابل قرار دیا ہے۔

برکت کا باعث بزرگوں کا نام ہے روشن کہ اس کارگہ کا تمام
کروں نام سید محمد کا یاد سادت کے گھر کا ہے ذات المحاد
تخلص ہے مشہور اس عشرتیؔ معارک سخن کا تھا خود نصرتیؔ

عشرتیؔ نے بھی اپنے مثنوی 'دیپک پتنگ' میں ایک جگہ غواصیؔ سے خود کا تقابل کرتے ہوئے یوں شاعرانہ تعلّی کی ہے:

غواصی اگر دیکھتا ہے آج کوں موتی کے نمن جل میں ڈوب لاج سوں
مجے حبیب دھر صدف لب مجھار دعا کے گہر مجے پو کرتا نثار

بہر حال ان معلومات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عشرتیؔ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے اجڑنے اور مغلیہ اقتدار کا دیدہ وشنیدہ شاعر ہے گویا عشرتیؔ نے بیجاپور کے سیاسی حالات سے باخبر رہتے ہوئے گولکنڈہ کا قصد کیا۔ جیسے کہ عرصہ قبل فیروز گولکنڈہ پہنچا تھا مگر عشرتیؔ کے گولکنڈہ آنے کی تاریخ پردۂ خفا میں ہے۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ عالمگیر کے ہاں صاحبِ عزت ووقار، منصب و خدمت کا حامل رہا۔ غالباً اعزازات ومراتب نے عشرتی کو اورنگ زیب کی مدح لکھنے پر مائل کیا ہو۔ دکن میں داؤدؔ ضعیفی کے بعد عشرتی ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے عالمگیر کی مدح لکھی، جبکہ اورنگ زیب کی ہجو میں اس سے پہلے کے شعرا خاص طور پر نصرتی نے کئی اشعار لکھے ہیں۔ (۴۸) جبکہ رحمان قادری

نے اپنی مثنوی ’باغِ حسینی‘ میں عالمگیر کی سخت مذمت کی ہے۔

عشرتی کی مثنوی ’دیپک پتنگ‘ دراصل ملک محمد جائسی کی پدماوت کا دکنی ترجمہ ہے۔ واضح رہے کہ عہد ابوالحسن تانا شاہ کے شاعر غلام علی نے بھی پدماوت کا ترجمہ کیا، لیکن وہ مکمل نہیں ہے۔ عشرتی نے ’دیپک پتنگ‘ کی تصنیف کی اساس عاقل خاں رازی کی مثنوی ’شمع و پروانہ‘ پر رکھی، گو اس کا اظہار نہیں کیا۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کی رو سے اس تصنیف کا زمانہ ۱۱۱۴ھ م/ ۱۷۰۲ء ہے، لیکن انھوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ پروفیسر سروری نے عشرتی کی دو مثنویوں کا تذکرہ کیا۔(۴۹) مزید ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر منظر اعظمی وغیرہ کی بحث و تمحیص کے بعد اس مثنوی کا سن تصنیف ۱۱۰۷ھ۔ ۱۲۹۵ھ قرار پاتا ہے۔ جبکہ عشرتی کی دوسری مثنوی ’چت لگن‘ ۱۱۱۰ھ م/ ۱۶۹۸ء اور دیگر تلخیص ’پدماوت‘ (فارسی) کا سنہ تصنیف بھی ۱۱۱۰ھ م/ ۱۶۹۸ء رہی ہے۔ ’دیپک پتنگ‘ کے مطالعہ سے دکنی زبان وادب کے اس دور کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ایک بات جو صاف کہی جاسکتی ہے کہ عشرتی کی زبان پر بیجاپوری اسلوب محیط ہے۔ مثنوی میں حمد ونعت منقبت کے بعد اپنے دوست خواجہ علی کی تعریف اور عشق کے معاملات پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔(۵۰) مثنوی میں اختصار و جامعیت کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت کرداروں اور دیو مالائی عناصر سے اجتناب کیا ہے۔

مثنوی میں منقبتِ حضرت علیؓ کا عنوان نہیں اور نہ ہی اس نے حمد ومناجات ونعت میں اس کا اہتمام کیا ہے، مگر درمیانی فصل اور اشعار سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ منقبتِ علی میں کسی طرح کی تشبیب کا اظہار نہیں، بلکہ راست اس نے مناقب کا بیان شروع کر دیا۔ ۹۹ اشعار پر مشتمل اس طویل منقبت میں اس نے اس امر پر فخر کیا ہے کہ وہ مداحِ علی کی نسبت سے ایک ترتیب رکھتا ہے۔ یعنی وہ اپنے اجداد کے ربط و تعلق کو اجاگر کرتا ہے، اور پھر حضرت علی کرم اللہ وجہ کی عظمت و بزرگی، عبادت وریاضت، علم وعمل، شجاعت وعدالت، ربط ونسبت کے بارے میں بڑے طمطراق سے اظہار خیال کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ عشرتی کی زبان و بیان پر بیجاپوری اثرات غالب ہیں۔ اس لیے گولکنڈہ کی کہی ہوئی مثنویوں کے برخلاف عشرتی کی اس مثنوی میں مرہٹی اور سنسکرت کے الفاظ کی زیادتی ہوگی، ویسے بھی مثنوی دیپک پتنگ سقوطِ گولکنڈہ کے بعد کی مثنوی ہے۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے بعد جو پانچ بڑی ریاستیں لسانی اور ثقافتی اساس پر قائم ہوئیں، ان میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔ قطب شاہوں کی طرح عادل شاہی حکمرانوں میں کم وبیش سبھی ذی علم، صاحبِ ذوق، فنونِ لطیفہ کے شائق، شعر وادب کے دلدادہ اور اس کے سرپرست تھے۔ یہ صحیح ہے کہ

بہمنی سلطنت میں دکنی اردو کا چلن خاطر خواہی ہی رہا تھا اور ان دونوں سلطنتوں کے حاکمین نے اس زبان، اس کے شعر وادب کی ترویج، ترقی وفروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسے اپنی مملکت کی زبان قرار دی۔ عادل شاہی بادشاہوں میں یوں تو سبھی علم دوست تھے، لیکن ان میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ م/ ۱۵۸۰ء تا ۱۰۳۷ھ م/ ۱۶۸۶ء) محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ م/ ۱۶۲۶ء تا ۱۰۶۷ھ م/ ۱۶۵۶ء) اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۲۷ھ م/ ۱۶۵۶ء تا ۱۰۸۳ھ م/ ۱۶۷۳ء) مشہور زمانہ ہے۔ ان سلاطین کے در حکومت میں بیجاپور علم وادب اور موسیقی و تعمیرات کا گہوارہ بن گیا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب 'اردو کی ادبی تاریخ' میں اس پورے عہد کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ جیسے ابراہیم عادل شاہ ثانی (جو جگت گرو بھی کہلاتا تھا) کے زمانے میں اردو نثر کے اولین نثر نگار حضرت میراں جی شمس العشاق گذرے ہیں۔ شاہ جی حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے سلسلے صوفیا میں سے تھے، نیز صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔ انھوں نے اُردو (دکنی) ہی میں تعلیم و تلقین فرمائی۔ کئی ایک رسالے اور نظمیں لکھیں۔ ان میں 'خوش نامہ'، 'خوش نغز' اور 'شرحِ مرغوب القلوب' اور 'شہادت الحقیقت' مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ خود بادشاہ نے موسیقی سے متعلق ایک نایاب کتاب 'نورس' لکھی، جس کے لیے ملاظہوری نے دیباچہ لکھا، جو 'سہ نثر ظہوری' کے نام سے مشہور ہے۔ ابراہیم عادل شاہ حضرت خواجہ بندہ نواز اور آپ کی اولاد کا بہت معتقد تھا۔ اس کی کتاب میں خواجہ صاحب کی منقبت کے یہ چند شعر ملتے ہیں:

سید محمد پتی مرا		جیوں رتن میں اتم ہیرا
محل محل صدر سنوارے		اس نمونے بہشت ایارے
انند ہوتا ہے صدا بہارے		ارتی لیائے انبر بھر تارے
کدم کستوری جو چند نالائے		بادل کانے ہو رنگ برسائے (۵۱)

ابراہیم عادل شاہ کے بعد محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور میں ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر حضرت شاہ برہان الدین جانمؔ (۱۵۴۳ء تا ۱۵۹۱ء) موجود تھے، جو حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ ان کی بھی کئی کتابیں ملتی ہیں جن کا موضوع تصوف تھا۔ جانم کی تصانیف میں 'ارشاد نامہ'، 'سکھ سہیلا'، 'بشارت الذکر'، 'وصیت الہادی'، 'منفعت الایمان'، 'رموز السالکین'، 'کفر نامہ' وغیرہ مشہور ہیں۔ بقول مولوی اکبرالدین صدیقی جانم کا آخری دور ابراہیم عادل شاہ کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب 'بجھتے چراغ' میں جانم کے گیارہ گیت پیش کیے، جن میں جانمؔ بطور تخلص استعمال ہوا ہے۔(۵۲) حضرت کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نہ صرف علم وعروض پر قادر تھے، بلکہ موسیقی میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔

شاہ برہان الدین جانم نے 'ارشاد نامہ' (ڈھائی ہزار ابیات) میں حمد و نعت کے بعد اپنے پیرو مرشد اور والد حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی مدح لکھی ہے۔ پھر تصوف کے مضامین منظوم کیے۔ ارشاد نامہ میں سنسکرت کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے مریدین و معتقدین کی تعلیم و تلقین کے لئے خود جانم نے اس کی شرح بعنوان 'کلمتہ الحقائق' تحریر کی، جو اردو کی اولین نثر ہے۔ شاہ میراں جی کی منقبت کے چند اشعار یہ ہیں:

صفت کروں کچھ اپنا پیر　　جسے تھے روشن سوے ضمیر
دھوں جگ میں منجہ میت وہی　　سمروں لے من نیت وہی
تس کوں کریں تن میں شاد　　جس کا رہے منجہ پرساد
جگ میں رہے توں ہی رتن　　پردے میں لے کروں جتن
راکھیا کو دن کو اس ٹھاون　　تل تل سمروں لے اس ناؤں
پیر میراں جو شمس العشاق　　دھواں جگ اب تجہ کیا کشاف (۵۳)

اسی دور میں ایک اور شاعر عبدلؔ بھی ملتا ہے، جس نے ۱۶۰۳ء میں اپنے محسن ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کے حالات سے متعلق ایک طویل مثنوی ابراہیم نامہ قلم بند کیا۔ اس میں بھی حمد و نعت کے بعد منقبت کا التزام یوں ملتا ہے کہ مدحِ یارانِ رسول (اصحابِ کرام) خلفائے راشدین، تعریفِ مرشد سید محمد حسینی گیسو درازؒ سے شروع کی ہے۔ (۵۴) ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے 'قدیم اردو' کے تحت ۱۹۶۹ء میں عبدل کے 'ابراہیم نامہ' کو مقدمہ مع حواشی شعبہ لسانیات علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا۔

عبدلؔ کی طرح عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ایک اور معروف شخصیت حکیم محمد امین آتشیؔ کی ہے۔ ان کی بھی تین تصانیف کا پتہ چلا ہے، جن میں 'محبت نامہ' اور 'محمد انوار' کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ (۵۵) جبکہ قصہ 'چندر بدن و مہیار' اور 'مجموعہ قصائد' کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایرانی مراد حکیم آتشیؔ کا عروج اصلاً عہد سلطان محمد عادل شاہ میں ہوا۔ ڈاکٹر زور کے حوالہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں کئی شعرا بامِ عروج پر پہنچے اور کئی ایک نے اس کے بیٹے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں اوجِ کمال حاصل کیا۔ انھی میں حکیم آتشی بھی ایک تھا۔ آتشی اپنی طویل مثنوی محبت نامہ ۱۰۸۶ھ م ۱۶۵۶ء لکھی۔ چندر بدن و مہیار فارسی کے علاوہ اس کی چوتھی کتاب 'مجموعۂ قصائد' ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ ان قصائد میں پہلا قصیدہ حمد یہ ہے۔ دوسرا نعت اور باقی تمام قصائد حضرت علی کی منقبت میں ہیں۔ (۵۶) حکیم آتشی کے ساتھ مرزا محمد مقیم غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ گو تذکرہ نگاروں نے مقیمیؔ کی جانب کم ہی توجہ کی ہے۔ جبکہ مرزا محمد مقیم کا ایک دیوان خمسہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا

کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔(۵۷) مقیمی کے والد ملا رضائی ۹۸۸ھ میں بیجاپور میں تھے۔ وہ ابراہیم کی شہرت فیاضی سن کر استر آباد(ایران) سے بیجاپور آئے تھے۔ ابراہیم زبیری نے 'بساتین السلاطین' میں حکیم آتشؔ کے ذکر کے بعد مرزا محمد مقیم کے متعلق لکھا ہے۔ مقیمیؔ کے بارے میں دکنی تذکرے تفصیلات سے خالی ہیں۔ البتہ 'برہانِ مآثر' سے ابتدائی کچھ معلومات دستیاب ہوتے ہیں جسے ڈاکٹر زور نے 'اردو شہ پارے' میں اور نصیر الدین ہاشمی نے 'یورپ میں دکھنی مخطوطات' میں درج کیا ہے۔ عرصہ بعد اکبر الدین صدیقی نے مقیمی کی مثنوی 'چندر بدن ومہیار'۸ ۱۶۳ء کو مرتب کر کے ۱۹۵۶ء میں مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے زیر اہتمام شائع کروایا۔ جس میں مقیمیؔ کے بارے میں چیدہ چیدہ واقعات کو یکجا کیا گیا ہے اس کی رو سے مقیمی کا پورا نام مرزا محمد مقیم اور والد کا نام میر محمد رضا رضوی (ملا رضائی مشہدی تھانہ کہ استر آبادی) یہ دونوں باپ بیٹے اپنے زہد وتقویٰ علم وفضل کی بدولت عوام میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ عہد ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ میں نظام شاہی اور قطب شاہی درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دیئے اور بعض لڑائیوں میں سلطان محمد عادل شاہ کے ہم کاب رہے۔ اس کے بعد مقیمی، سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ م ۱۶۵۶ء تا ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء) کے دربار میں بھی ممتاز مقام کا حامل رہا۔ (۵۸) مقیمی نے علاوہ مثنوی کے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، قصاید اور ترجیع بند میں محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کی مدح کی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ گوئی سے بھی اس کو رغبت تھی۔ جیسے علی عادل شاہ کی پیدائش، نیز خود سلطان محمد عادل شاہ کی شادی، اور دیگر مواقع پر کہے ہوئے تاریخی قطعات وابیات ملتے ہیں۔ مقیمی کی مثنوی چندر بدن ومہیار ابراہیم عادل شاہ کے عہد کا ایک سچا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جسے مقیمی کے بعد کئی اور شعرا نے نظم کیا۔ جیسے مقیمی کے معاصر امین نے، مثنوی بہرام وحسن بانو ۱۰۴۸ھ میں لکھی۔

یکا یک مرے دل میں آیا خیال
قصہ یک لکھوں میں مقیمی مثال

لیکن وہ اس مثنوی کو مکمل نہ کر سکا۔ مگر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اسے تکمیل کیا۔ مثنوی کے آخر میں دولت نے لکھا:

ہوئے بیت چار صد، ہور ایک ہزار — بیاں اس کا دولتؔ نے کیا آشکار
امین نے ناقص رکھا تھا اسے — کہ دولتؔ نے پورا کیا اب اسے

عرصہ بعد محمد باقر آگاہ نے ۱۱۱۴ھ میں اسی قصہ کو 'ندرتِ عشق' کے نام سے لکھا اور شاہ تجلی نے اپنی تاریخ 'تزکِ آصفیہ' میں اس قصے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ ابراہیم عادل شاہ کے دور کا ہے

جو مقام کدری کوٹہ پر پیش آیا۔ یہی نہیں، بلکہ شمالی ہند میں سیف اللہ نے بھی 'چندر بدن و مہیار' کی کہانی نظم کی۔ حتیٰ کہ اکبرالدین صدیقی نے میر تقی میرؔ (۱۱۲۵ھ تا ۱۲۲۵ھ) کی مثنویاں 'دریائے عشق'، 'شعلۂ عشق'، 'اعجازِ عشق' کے بارے میں قیاس ظاہر کیا ہے کہ میر نے سیف اللہ کی طرح چندر بدن کا قصہ سنا ہو اور اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ مثنویاں اپنے انداز میں لکھیں۔ (۵۹) خود میرؔ نے 'اعجازِ عشق' کی بابت یہ کہا کہ یہ کہانی انھوں نے کسی فقیر سے سنی تھی۔

کسی معتبر سے روایت ہے ایک
کہ درویش سے یہ حکایت ہے ایک

جبکہ مقیمیؔ نے یہ مثنوی غواصیؔ کی 'سیف الملوک بدیع الجمال' سے متاثر ہو کر لکھی۔ کہتا ہے:

قصہ اک کہوں میں گہر بار کا — سو چندر بدن ہور مہیار کا
منے کوئی مجکوں دعا یاد کر — رہے ہور تعجب سوں دل شاد کر
بنا تو غواصیؔ کا باندیا ہوں میں — سخن مختصر لیا کے ساند یا ہوں میں
ولے میں اپس کو سرایا نہیں — شعر میں کسی کا پھرایا نہیں

تاریخی لحاظ سے یہ مثنوی بیجاپور کی پہلی اُردو مثنوی ہے، جبکہ گولکنڈہ میں اس سے پہلے قطب مشتری ۱۰۱۸ھ اور سیف الملوک بدیع الجمال ۱۰۳۵ھ لکھی جا چکی تھیں۔ بقول اکبرالدین صدیقی مقیمی کی مثنوی ادبی نقطہ نظر سے بعد کی مثنویوں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس میں نہ غواصی کا زورِ بیان پایا جاتا ہے نہ نادر اور اچھوتی تشبیہات ہی ہیں۔ مثنوی کی روایات کے لحاظ سے مقیمی بھی حمد مناجات، نعت کے بعد منقبت کا التزام و اہتمام کرتا ہے۔ در منقبتِ چہار یار کبار کہہ کر حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے محامد بیان کیے ہیں، اور اس امر کا اظہار کیا کہ ان چاروں حضرات قدس میں کوئی فرق و امتیاز کرے وہ احمق ہے۔ اور جو کوئی ان سے اعراض کرے وہ یقینا محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دُور ہے۔

سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے بھی کئی نامی گرامی شخصیتیں وابستہ تھیں۔ دکنی شعر و ادب کے کئی شعرا جن میں کمال خان رستمیؔ، ٹھیٹ بیجاپوری شاعر تھا۔ دکنی میں اس نے اپنی ضخیم مثنوی 'خاور نامہ' ۱۰۵۹ھ (چوبیس ہزار ابیات) ابنِ حسام کے فارسی خاور نامہ کا بیت بہ بیت ترجمہ انعام و اکرام کی خاطر کیا ہے۔ یہ مثنوی فردوسی کے شاہنامے کی طرز پر اُردو کی طویل ترین مثنوی ہے۔ جس میں حضرت علیؓ کی لڑائیاں بیان کی گئی ہیں۔ (۶۰) نصرتیؔ کے 'علی نامہ' کے بعد 'خاور نامہ' سب سے اہم رزمیہ مثنوی ہے۔ نیز ملک خوشنودؔ جو اصل میں گولکنڈہ کا باشندہ تھا، جس نے بعد کو بیجاپور میں سفیر کی حیثیت لے لی۔

اپنی مثنویوں 'یوسف زلیخا'، 'بازارِ حسن' اور 'ہشت بہشت' کے سبب شہرت حاصل کی۔اس کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے عہدِ عادل شاہی کے ایک من موجی شاعر حسن شوقی کے بارے میں تفصیلات دی ہیں جو نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں سے متعلق رہا، مگر اس کا قیام زیادہ تر بیجاپور میں ہی رہا۔ شوقی کی عظمت کا اعتراف ابن نشاطی سے ولی دکنی تک اردو کے کم وبیش تمام بلند پایہ شعرا نے کیا ہے۔(۶۱) شوقی کی مثنوی 'فتح نظام شاہ' جنگ تالی کوٹ ۹۷۲ھ تا ۹۷۶ھ کے بارے میں ہے۔ جو محمد عادل شاہ کے عہد میں لڑی گئی۔ نصرتی اور ہاشمی نے حسن شوقی کو احترام سے یاد کیا ہے۔ مثنوی میں خلاف توقع حمد کے فوری بعد احوال جنگ بیان کر دیے گئے۔ نعت اور منقبت کا کوئی اندراج و اہتمام نہیں۔

عادل شاہی خاندان کے چھٹے بادشاہ سلطان محمد عادل شاہ کا ایک اور معاصر شاعر محمد ابراہیم صنعتی ہے جس نے اپنی مثنوی، قصہ بےنظیر ۱۶۴۵ء (حضرت تمیم انصاری کا واقعہ) سے شہرت حاصل کی۔

ہزار یک پر سال پنجاہ و پنج ۱۰۵۵ھ
ہوئے تب ہوا پر جواہر یو گنج

عرصہ تک تاریخی اعتبار سے پردۂ تاریکی میں رہا۔ سلسلۂ یوسفیہ کے شمارہ ۴/ ۱۳۵۷ھ میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے اسے مرتب کر کے شائع کروایا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس مثنوی کی اہمیت قدیم کارناموں میں یہ ہے کہ یہ طویل ادبی نظموں کے اولین نقوش میں سے ہے۔ اس سے پہلے بیجاپور میں صرف ایک مثنوی چندر بدن ومہیار ۱۰۴۸ھ سے قبل ایسی لکھی گئی جو اہم ہے۔" (۶۲) عہد محمد عادل شاہ میں لکھی گئی اس مثنوی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس نے اپنی عمر یونہی گنوا دی، اور کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہ دیا۔ اس لیے اپنی یادگار بصورتِ مثنوی لکھنے کی ٹھان لی۔ (۶۳) چنانچہ سبب تالیف کے طور پر جوابیات لکھی ہیں اس میں کہتا ہے:

اسے فارسی بولنا ذوق تھا	ولے لئی عزیزاں کوں یوں ذوق تھا
کہ دکنی زباں ہوں اے بولتا	جو سیپی تے موتی ثمن رولتا

قصے کی زبان کے متعلق بیان کرتا ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کم استعمال کیے ہیں۔ تا کہ قصہ سمجھنا سہل ہو جائے:

کھیا کم سنسکرت کے اس میں بول	ادک بولنے تے رکھیا ہوں امول
جے فارسی کا نہ کچھ گیان ہے	سو دکھنی زباں اس کو آسان ہے

اس مثنوی میں فرضی واقعات کی عجیب وغریب کہانیاں ملتی ہیں جس کا حضرت تمیم انصاری کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے اپنی ماہرانہ استعدادِ شعری سے حسنِ

کلام کا جادو جگایا ہے۔ حمد و نعت کے بعد منقبت کے تحت اس نے تشبیب بھی اختیار کی اور مناقبِ حضرت غوث اعظم عبدالقادر جیلانی کی شان میں ندرت پیدا کرنے کی سعی و کاوش کی ہے۔ بعد ازاں محمد عادل شاہ کی مدح کی، لیکن کسی طور شاعر کے حالات سے آگہی حاصل نہیں ہوتی۔ البتہ صنعتی کے زمانے میں بیجاپور اور گولکنڈہ میں اُردو شاعری کے دیو قامت اعلیٰ پایہ کے شعرا و انشا پرداز موجود تھے جیسے رستمی، ملک خوشنود، وجہی اور غواصی وغیرہ گویا صنعتی کا مقابلہ ایسے ہی زبردست اور بلند پایہ شاعروں سے تھا، یہی اس کے حقیقی مخاطب تھے۔ اعلیٰ صلاحیت اور بلند ذوق رکھنے والے شعرا کی موجودگی کا اثر کسی ادبی کارنامے پر نہایت ترقی پرور ثابت ہوتا ہے۔ صنعتی پر بھی یقیناً اس کا اثر تھا۔ (۶۴)

عادل شاہیہ کا نامور حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا دور تاریخی اعتبار سے بہت اہم مانا جاتا ہے۔ یہ بادشاہ شعر و شاعری کا بڑا رسیا اور تعمیرات کا شائق تھا۔ اردو کی ادبی تاریخ میں اس کی متعدد تعمیرات کی تفصیل ملتی ہے۔ جبکہ اس کے عہد حکومت میں ملک الشعرا نصرتی، ہاشمی بیجاپوری اور مرزا جیسے شعرا کے ساتھ فارسی عالم عبداللطیف نور عبدالنبی کے علاوہ اس زمانے کی ایک اور برگزیدہ ہستی حضرت امین الدین علی اعلیٰ کی تھی۔ سلطان محمد عادل شاہ کے بیٹے علی عادل شاہ کی پرورش تعلیم و تربیت میں ملکہ خدیجہ سلطان کا بڑا دخل تھا، جو محمد قطب شاہ کی بیٹی اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی تخلص کرتا تھا اور کبھی کبھی مظفر علی شاہ، علی عادل شاہ اور مدن روپ بھی استعمال کیا ہے۔ اسے فارسی سے زیادہ دکنی سے رغبت تھی۔ وہ ایک قادر الکلام پر گو شاعر تھا۔ اس کے کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مخمس و مثمن کے علاوہ فردیات، دوہرے، کبت آیت اور جھولنا سبھی کچھ مل جاتے ہیں۔ (۶۵) اسے خوش نویسی، خطاطی اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے دربار کے ملک الشعرا نصرتی نے اپنی مثنویوں میں اس جانب اشارے کیے ہیں۔ شاہی مذہب امامیہ کا پیرو خوش عقیدہ، رند مشرب اور رنگین مزاج شخصیت کا حامل تھا۔ اس کے کلام کا قابلِ لحاظ حصہ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ اور بزرگانِ دین کی مدح پر مشتمل ہے۔ بقولِ مرتبِ کلیاتِ شاہی: ”شاہی خود بادشاہ تھا، اس لیے کسی دنیوی شخصیت کی مدح میں وہ قصیدہ کیا کہتا۔ خوش عقیدہ تھا، اس لیے حمد و نعت و منقبت لکھی اور بزرگانِ دین کی مدح سرائی کی۔“ (۶۶) شاہی عربی، فارسی اور سنسکرت سے بھی واقف تھا۔ جبھی تو اس نے کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے نامانوس الفاظ کو جگہ دینے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے شاہی کا کلام محمد قلی، غواصی اور حسن شوقی کے مقابلے میں کسی قدر ادق معلوم ہوتا ہے۔ اس کے شاعرانہ کمالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت وہ اپنے باپ محمد عادل شاہ سے کہیں زیادہ دادا ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کا سچا جانشین ثابت ہوا۔ شعر و نغمہ سے اس کی فطری دلچسپی و لگاؤ

ابراہیم کی یاد دلاتی ہے اور یہ سب کا سب اسے ورثہ میں ملا تھا۔ نصرتی 'گلشن عشق' میں کہتا ہے:

زہے شاہ عادل علی حق گزیں — تو سلطان محمد کا ہے جانشین
جگت گر ابراہیم شاہِ زمن — گیا تھا جو کر باغ ملک دکھن
جو سلطان محمد ہوا نام دار — دیا باغ کو اس جنم کو بہار
یتا خلق سوں خلق پرور ہوا — پدر نامور نے پسر در ہوا

اور 'علی نامہ' میں لکھتا ہے:

جگت گر کے نورس کو نورس دیا
ہر یک رس چکھانے تو سورس دیا

علی عادل شاہ ثانی شاہی کی طرز حکمرانی ومہمات اور دیگر امور پر نصرتی کا کلام دال ہے۔ بلکہ اس کی سخن سنجی، سخن فہم اور شاعری کی روشن مثال ہے۔ اس کے کلیات کی تدوین ۱۰۸۱ھ میں اس کی وفات سے کوئی دو سال قبل ہوئی۔(۶۷) ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ''وہ ولی عہدی کے زمانے ہی میں ایک اچھا شاعر بن گیا تھا۔ اسی زمانے میں وہ علما اور شعرا کو اپنے پاس بلاتا اور ان کی خوب آؤ بھگت کرتا تھا۔ اسے ادب سے اس قدر شغف تھا کہ اپنے ساتھیوں، حتیٰ کہ ملازموں کو بھی شعر کہنے پر مجبور کرتا۔ مزید برآں شعر کہنے کی اسے خود اس قدر مشق ہوگئی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی نظمیں خود درست کرتا تھا۔ اس لیے وہ استادِ عالم کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔'' (۶۸)

نصرتی نے متعدد اشعار میں شاہی کو استادِ عالم کے نام سے یاد کیا ہے:

ہوا جب سے استادِ عالم، علی
سخن کو سکٹ دے گیا مہبلی

شاہیؔ کے کلیات میں دکنی قصائد سب سے پہلے آتے ہیں، جن میں حمد نعت اور منقبت حضرت علیؓ کے ساتھ ساتھ قصیدہ یازدہ امامین کا اہتمام ملتا ہے۔ شاہی نے ان قصاید میں ان تمام لوازم کو برتا ہے جو قصیدہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ یعنی تشبیب، گریز، مدح اور دعا۔ اپنی طبیعت اور دکنی سے مناسبت نے اس کے قصاید ہی نہیں، بلکہ پوری شاعری کو وقیع بنا دیا ہے۔ خصوصیت سے قصاید میں نصرتیؔ کے بعد شاہی کے قصیدے شوکتِ لفظی، علوِ مضامین اور زورِ بیان کے آئینہ دار ہیں۔ چنانچہ قصیدہ در منقبتِ حضرت امیر المومنین علیہ السلام میں علی عادل شاہ نے تشبیب اختیار کی اور یہ بڑی رنگین و رندانہ ہے۔ اس پر ہندی شاعری کا پرتَو صاف دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ حضرت علیؓ کی شجاعت، عبادت، علم اور مشکل کشائی کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے بعد قصیدہ بارہ اماموں کی منقبت میں بھی عشق کی مدح

سرائی بطورِ تشبیب اختیار کی اور اپنی وابستگی کو واضح کیا۔ اس قصیدہ میں شاہیؔ کی قادر الکلامی کا مظاہرہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اس نے چڑئے، بڑے، کھڑے جیسی سخت ردیفوں کی پابندی کی ہے۔ قصاید ہی کے سلسلے میں شاہی کا وہ مثمن بھی آجاتا ہے جو اس نے حضرت مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ کی مدح میں لکھا تھا۔ اس مثمن کے بارہ بند ہیں اور بارھویں بند میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے:

سن لو بارہ کھن کہیں اہل سخن پا کر ہوس
یو عبارت خوب ہور مضمون ہے سارا سرس

اس مثمن میں شاہی، حضرت بندہ نواز کی عظمت کو بڑی عقیدت سے بیان کرتا ہے۔ نیز آپ کی سیادت، ولایت، اوصافِ حمیدہ، تصوف کی تعلیم و تلقین کی طرف اشارے کیے ہیں۔ غرض! علی عادل شاہ کے ہاں حقیقت نگاری، روانی، برجستگی کے ساتھ ساتھ جذبات کے اظہار و اسلوب میں دکنی زبان و بیان کی تمام تر روایات ملتی ہیں۔ اس لیے شاہی کا دبستانِ بیجاپور کے صفِ اول کے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ علی عادل شاہ شاہی کا بھی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح عین جوانی کے عالم میں مرضِ فالج سے ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۳ء انتقال ہوا۔

علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کے عہد کے ممتاز و قابل قدر شعرا میں نصرتیؔ کا نام سرفہرست ہوگا۔ وہ نہ صرف بیجاپور بلکہ دکنی شاعروں کا سرتاج بھی ہے۔ نصرتیؔ کا اصل نام محمد نصرت، تخلص نصرتی تھا، پیشہ کے لحاظ سے سپاہی اور خاندانی اعتبار سے معزز تھا۔ اس کا باپ فوج میں سلح دار تھا، جس نے نصرتی کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا تھا۔ گلشنِ عشق میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

کہ تھا مجھ پدر سو شجاعت مآب — قدیم ملک سلحدار جمع رکاب
کہ میں اصل میں یک سپاہی اتھا — فدا درگہ بادشاہی اتھا (۶۹)

تذکرۂ چمنستانِ شعرا، تذکرۂ شعرائے دکن اور دیگر کتب میں نصرتی کے حالات ملتے ہیں۔ نیز سلطان علی عادل شاہ ثانی کی قدر افزائی اور سر پرستی کی تفصیلات بھی علی نامہ میں ملتی ہیں۔ ایک شعر میں اس جانب اشارہ کرتا ہے:

اے شاہ رتن کا کھن ہوا مجھ فن سو ترا فیض سے
کچھ کسب موروثی نہ ہوئی حق کہ مجھ یو شاعری

نصرتی نے پہلی مثنوی (۱۶۵۷ء/۱۰۶۶ھ) میں یعنی محمد عادل شاہ کے انتقال کے ایک سال بعد اور دوسری مثنوی علی نامہ ۱۶۷۰ء اس کے مربی علی عادل شاہ ثانی کے ابتدائی عہد حکومت میں لکھی اور اسے دکن کا شاہنامہ قرار دیا۔ تیسری اور آخری مثنوی 'تاریخ اسکندری' ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۳ء میں لکھی۔

جس سال علی عادل شاہ فوت ہوا اور سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ اس طرح نصرتیؔ نے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ نصرتی رزم و بزم کا شاعر تھا اس نے اپنے کلام میں خوبصورت تشبیہات، استعاروں اور ضرب الامثال و کہاوتوں سے کام لیا ہے۔ کمال فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے۔ اسلوب کے اعتبار سے عربی اور فارسی تراکیب و الفاظ کا استعمال زیادہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے فتوت کے تذکرۂ ریاض حسنی کے حوالے سے بیان کیا کہ اورنگ زیب عالمگیر نے جب بیجاپور کے تمام شعرا کو حاضری کا حکم دیا تو ان میں نصرتی شامل تھا۔ اس کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کر کے اسے خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز کیا۔ (۷۰) لیکن اس کی توثیق نہیں ہوسکی۔ نصرتی کو بیجاپوری دربار میں وہ عزت اور توقیر حاصل تھی، جو کسی اور دکنی شاعر کو کسی جگہ حاصل نہ ہوئی۔ وہ علی عادل شاہ کا بچپن کا ساتھی اور مقرب تھا۔ رزم و بزم دونوں میں اس کا شریک تھا۔ نصرتی کو ہر صنفِ سخن میں یکساں مہارت حاصل تھی، مگر اس کی شہرت کا سبب اس کی دو مثنویاں گلشن عشق، اور علی نامہ ہیں۔ گلشن عشق کو سید محمد صاحب نے مرتب کر کے مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات کے تحت شائع کی۔ 'علی نامہ' کو پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'دیوانِ نصرتی' مرتب کر کے ۱۹۷۳ء میں لاہور سے شائع کیا۔ نصرتیؔ دبستان دکن کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ قصیدہ، مثنوی اور غزلوں کے علاوہ مخمسات، قطعات، رباعیات اس کی ایک ہجو بھی ملتی ہے۔ بلندی فکر، شوکتِ لفظی، زورِ بیان اس کے کلام کا خاصہ ہے۔ نصرتی کو خواجۂ دکن بندہ نواز گیسودراز سے غیر معمولی عقیدت تھی اور کئی پشتوں سے آپ کے سلسلے میں مریدی بھی۔ اس نے اپنی ہر تصنیف میں حمد و نعت کے بعد آپ کی مدح لکھی ہے۔ بقولِ زور: "ان باتوں پر اس نے اپنی کتابوں میں بڑا فخر کیا ہے۔" (۷۱)

چنانچہ اپنی ایک رباعی میں خواجہ بندہ نواز کی مدح کرتا ہے:

اے تجہ تو ولی حق سوں اچھے نت ہمراز	درگاہ تری قبلۂ ارباب نیاز
مخدوم توں مرا، تو ترا خادم میں	کر بندہ نوازی سوں مجھے سرفراز

مثنوی 'گلشن عشق' میں حمد اور نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فوری بعد خلفائے راشدین کی مدح میں محض ایک ایک شعر کہتا ہوا منقبتِ علیؓ کی شروعات کرتا ہے، جس سے اس کے مذہبی اعتقادات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم نصرتی کے مذہبی رجحانات کے بارے میں ہنوز کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اشعار کی نوعیت سے اسے امامیہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے۔ منقبت حضرت علیؓ میں بلا کسی تشبیب نصرتی نے حضرت علی کے اوصافِ حمیدہ رقم کیے ہیں۔ اور محض آپ کی تعریف و توصیف کے کوئی خاص بات نہیں کی بعد ازاں ثنائے سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز کا اہتمام کرتا ہے۔ اس منقبت میں نصرتیؔ نے

حضرت بندہ نواز کی عظمت و بزرگی، علم وعرفان کے متعلق صاف لب ولہجہ اختیار کیا ہے اور اپنی والہانہ عقیدت مندی کا اظہار بھی۔ مثنوی 'علی نامہ' میں بھی کم وبیش نصرتی کے کلام کے یہی تیور ہیں۔ گلشن عشق کے مقابلہ میں علی نامہ کے اشعارِ منقبت میں رجز کا سا انداز جھلکتا ہے۔ مزید حضرت علیؓ کے وصیِ رسول ہونے، بابِ علم کا اعزاز پانے، شجاعت ومشکل کشائی کی جانب واضح اشارے بھی کیے ہیں۔ منقبت کے آخر میں حضرت بندہ نوازؒ کی مدح بھی کہہ گیا ہے۔ تاریخ ادب میں نصرتیؔ اور اس کے معاصر دیگر شعرا کی مناقشات کا ذکر ملتا ہے۔ خود نصرتی نے بھی ایک ہجو میں اپنے ہم عصر نابینا ریختی گو شاعر ہاشمیؔ کی پھبتی اڑائی ہے۔ عرصہ بعد قطب شاہیؔ دور کا شاعر عشرتیؔ کے اخلاف نصرتیؔ کو عشرتیؔ کا مقابل خیال کرتے ہیں:

تخلص ہے مشہور اس عشرتیؔ
معارک سخن کا تھا خود نصرتی (۷۲)

غرض نصرتیؔ کی عظمت و بزرگی نے اس کے حاسدوں کو پیدا کیا جنھوں نے آخرِ کار اسے شہید کر دیا۔ 'گلشن عشق' کے ایک قدیم نسخے مکتوبہ ۱۱۹۸ھ میں یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔ جس میں 'نصرتی شہیدا ہے' سے ۱۰۸۵ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں، جو اس کا سنِ وفات ہے، جسے نصیر الدین ہاشمی نے 'اُردو مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ' صفحہ ۶۰۱، میں بھی نقل کیا ہے۔

ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ ملائک نے یوں کہے 'نصرتی شہید اہے'

نصرتی کے علاوہ سید میراں میاں خاں ہاشمیؔ بھی علی عادل شاہ ثانی کے دور کا ایک مقبول شاعر گزرا ہے۔ وہ سید شاہ ہاشم مہدوی بن سید اللہ بخش کا مرید تھا۔ اپنے مرشد کے نام کی مناسبت سے اس نے ہاشمی تخلص اختیار کیا تھا۔ (۷۳) تذکرہ نگاروں نے اسے مادرزاد اندھا بتایا ہے اور خود ہاشمی نے بھی اپنے کلام میں اس کا جابجا ذکر کیا ہے:

ولے کیا کروں مجہ پو ہے لا علاج
ہر یک کوئی عاجز ہے انکھیاں کے باج (۷۴)

ہاشمیؔ (۱۰۹۹ھ م ۱۶۸۷ء) ایک پر گو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ۱۹۶۱ء میں دیوانِ ہاشمی کو مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد سے شائع کروایا۔ ہجویہ مثنوی اور قصائد کو ڈاکٹر محمد علی اثر نے شائع کیا۔ جبکہ اس کی دیگر تمام تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ جس میں مثنوی 'احسن القصص'، 'یوسف زلیخا' مشہور ہے۔ ہاشمیؔ باوجودیکہ نابینا تھا، لیکن اسے مختلف زبانوں جیسے عربی، فارسی، دکنی، تلگو اور مراٹھی پر ماہرانہ عبور حاصل تھا:

موے موں کہ دو کیا ہوں گے اے سب رابطہ ہاں
عربی، فارسی، دکھنی، تلنگی ہور مراٹھی کا (۷۵)

ہاشمیؔ کے غیر مطبوعہ کلام میں مخمس در مدحِ مہدی جونپوری، معراج نامہ، مثنوی قصہ وغیرہ شامل اور قابلِ ذکر ہیں۔ ہاشمیؔ کو ریختی کہنے میں کمال حاصل تھا اور شاید اس صنفِ سخن کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بھی۔ ہاشمیؔ کے ہاں موضوعات کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ زبان و بیان کی ندرت بھی خصوصیت سے ریختیوں میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ہاشمیؔ کے بعد بیجاپور میں اس قامت و آہنگ کا کوئی اور شاعر نظر نہیں آتا۔ جبکہ شاہ معظمؔ عادل شاہی دور کے آخری حکمران سکندر عادل شاہ ۱۶۸۳ء تا ۱۶۸۶ء کے عہد کے ایک صوفی منش شاعر گذرے ہیں۔ شاہ معظمؔ کا پورا نام سید محمد حسینی قادری تھا۔ وہ سلسلہ قادریہ اور چشتیہ دونوں میں علی الترتیب حضرت امین الدین علی اعلیٰ، حضرت برہان الدین جانم اور عبدالقادر لنگا کوتالی کے مرید تھے۔ بقول ابوالنصر خالدی: "معظمؔ نے جس جس صنف سخن میں اپنے افکار بزرگوں کے حالات یا فن تصوف کے مسائل قلم بند کیے ہیں ان سب میں امین الدین علی اعلیٰ کے ساتھ ساتھ یا ان کے بغیر 'قادر' کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور اس کا التزام کیا ہے کہ کوئی مقطع بغیر لفظ 'قادر' نہ لکھا جائے۔"

مجہ کو امین علی قادر سوں کر مشرف
بولے اتا معظم تجہ پر وصال دوست (دیوان)
عاشق معظم تب ہوا دیکھا ولایت سربسر
قادر کنے القاب ہے حیدر کرار کا (دیوان) (۷۶)

خالدی صاحب اور آگے لکھتے ہیں کہ "معظم نے قادر کا لفظ کہیں علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ کے لیے استعمال کیا ہے کہیں شیخ عبدالقادر جیلانی کے لیے اور کہیں اس طرح کہ قادر اور حیدر ایک ہی مسمیٰ کے دو اسم ہیں اور کہیں امین الدین کے لیے، کسی ایسے خلیفہ کے لیے جن کے نام کا ایک جزو قادر تھا۔" (۷۷)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معظمؔ کی بیجاپور کے مشہور بزرگ حضرت امین الدین علی اعلیٰ سے بیعت تھی اور اس کا ذکر متعدد ابیات میں کیا ہے:

مرے پہ یہ سب راز کھولے اس نے
حقیقت انو کا یہ بولے امین (گنجِ مخفی)
وہاں امین علی ہے پیر
ہے روشن دیکھ ضمیر (رسالہ وجودیہ)

معظمؔ کی تربیت ان کے پیر و مرشد حضرت امین الدین علی اعلیٰ اور قادر لنگا کوتال نے کی بلکہ معظم

کا نام یا لقب بھی ان ہی کا عطا کردہ ہے:

قادر ہے نام شہ کا کیا اسم با مسمی
کر منج کوں پنج ہزاری معظم دیا لقب (دیوان)

خود قادر مہیار کیا ہے مجہ رویت آپ دیا ہے
میں عاجز اور میں مظلوم اوصاف حیّ القیوم
مجھ راکھا ناؤں معظم اور ایتا کتب محرم

(رسالہ وجودیہ)

شاہ معظم کثیر التصانیف شاعر ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے 'دیوانِ معظم' کی نشاندہی کی جبکہ ان کی دیگر کتابوں میں 'شجرۃ الاتقیا'، 'رسالہ وجودیہ'، 'گلزارِ چشت'، 'گنجِ مخفی'، 'معراج نامہ'، 'گفتارِ عشق و عقل'، 'رسالہ وجود العارفین'، 'شرحِ شکار نامہ' اور 'نظم سہ حرفی' قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے 'گفتارِ عشق و عقل'، 'گنجِ محقی' اور قصیدہ کو ابوالنصر خالدی نے 'قدیم اردو' جلد اول ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اور ان کے حالات پر بھی روشنی ڈالی جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب اورنگ زیب عالمگیر نے بارگاہ حضرت برہان الدین غریب (خلد آباد) میں پناہ لی تھی، شاہ معظم حیات تھے۔ 'گنجِ محقی' میں بعد حمد و نعت، مدح و منقبت، تک شاعر کا جوش کسی نہ کسی حد تک آدابِ شاعری کو ملحوظ رکھتا ہے، لیکن اس کے بعد اس کی روانی مضامین کی فراوانی دیدنی ہے۔ دراصل 'گنجِ محقی' میں ایک طرح سے نصابِ تصوف کی تعلیم ہے کہ جب سالک راہِ طریقت و شریعت کی پابندی کرتے ہوئے حقیقت و معرفت تک پہنچتا ہے، تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ نیز منزلِ ناسوت و ملکوت و جبروت و لاہوت اور باہوت میں اس پر کیا احوال طاری ہوتے ہیں اور دورانِ سلوک کیسے کیسے مقامات سے گزرتا ہے۔ بقول ابوالنصر خالدی: "معظم جیسے صوفی شاعر کے طبعی جوش و خروش پر امر مبنی نے وہی کام کیا، جو سمندِ شوق پر 'تازیانہ' کیا کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے چھپے خزانے کے دروازے بلا تاخیر جلد جلد کھول دیے۔ دیکھنے یا داخل ہونے والے جدھر سے چاہیں، جیسا چاہیں، داخل ہوں اور اپنے اپنے ذوق و ظرف کے مطابق بہرہ ور ہوں۔" (۷۸)

یہی حال کم و بیش شاہ معظم کے قصیدے کا ہے، جس میں انھوں نے تصوف کے مسائل بیان کیے ہیں، یا پھر اس سلسلہ کے بزرگوں کی کرامتیں۔ نیز اس کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معظم نے ان افکار و مسائل کے بیان کرنے میں دانستہ طور پر بعض صوفیوں اور فقیہوں کو مدنظر رکھا، یا پھر اپنے کسی رفیق کی فرمائش پر یا اپنے پیر بھائیوں کے لئے مجملاً تعلیم و طریقے کو پیش کر دیا ہے۔ اس لیے قصیدہ کے بنیادی عناصر سے بھی صرفِ نظر کیا ہے اور محض اکیس ابیات میں تصوف کا لبالب پیش کر دیا۔ (۷۹)

ویسے بھی صوفیوں کا موضوعِ سخن اتنا کچھ دقیق گہرا اور نازک ہوتا ہے کہ عام بول چال میں اس کی وضاحت ممکن نہیں۔قصیدہ میں منقبت کا انداز محض دوایک شعر سے ظاہر ہے:

تو ملالال قادر شہ صورت لے سب پیمبر کا　　ھوا تر لوک پر نموغا کہ ثانی آیا یوسف
وہ شافعِ روزِ محشر ہے وہ ساقیِ حوضِ کوثر ہے　　وہی مہر راہ دکھلانے امین الدین ہو آیا

اس طرح 'گنجِ محقق' میں حمد نعت کے ساتھ ساتھ منقبتِ حضرت علی کے اشعار ملتے ہیں، جس میں حضرت علیؓ کے بابِ علم اور صاحبِ ذوالفقار ولایت کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ خانوادۂ چشتیہ کی تخصیص بھی مترشح ہے۔

شاہ معظمؒ کے علاوہ، علی عادل شاہ کے دربار سے باہر کئی ایک شعرا دکنی زبان و ادب میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ان میں شاہ عالم شغلی سیوا اور محمد امین ایاغیؔ کے ساتھ ساتھ خود حضرت امین الدین علی اعلیٰ کی شخصیت مہتم بالشان ہوگی۔شغلی کی ایک مذہبی مثنوی 'پند نامہ' اور ایاغی کی مثنوی 'نجات نامہ' جس کے دوسرے نام 'قیامت' اور 'نصیحت نامہ' بھی ہیں۔موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔انھی شعرا کے درمیان حضرت امین الدین علی اعلیٰ (۱۵۹۱ء/ ۱۰۰۷ھ تا ۱۶۷۵ء/ ۱۰۸۵ھ) صاحبِ رُشد و ہدایت تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔آپ کثیر التصانیف ہیں اور نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھیں۔ان میں 'رموز السالکین' (مدحِ برہان الدین جانم) 'سہیلا قربیہ'، 'گفتار شاہ امین'، 'گنجِ محقق'، 'عشق نامہ'، 'شرح حکمتہ طبیب' اور 'کلمتہ الاسرار' قابلِ ذکر ہیں۔آپ اپنے والد کے انتقال کے چند ماہ بعد پیدا ہوئے اور اپنے دادا حضرت میراں جی شمس العشاق کی طرح صاحب علم و عرفان تعلیم و تلقین کے حامل رہے۔آپ کی تربیت کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ جانم کی وصیت کے مطابق شیخ محمود خوش دہاں، شاہ سید داول اور سید خداوند شاہ خلفائے جانم کے ہاتھوں ہوئی۔(۸۰) ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب 'سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے' میں حضرت سے متعلق ہر جہت پر گفتگو کی ہے۔آپ نے اپنے مریدوں کو عرفان و سلوک کی تعلیم دی اور آپ کے خاندان میں بڑے بڑے اولیا پیدا ہوئے، جن سے دکن میں چشتیہ سلسلہ خوب پھیلا۔مولوی عبدالحق نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ اردو جنوری ۱۹۲۸ء میں اس کی تفصیلات دی ہیں، جس میں کتبہ کے اشعار نقل کیے ہیں۔آپ نے اپنے والد کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کی ردیف 'برہان بن میراں اپڑ' ہے۔آپ کا انتقال ۱۶۷۵ء/ ۱۰۸۵ھ میں ہوا۔ڈاکٹر محمد علی اثر نے بھی امین الدین علی اعلیٰ کی شاعری خصوصاً غزل گوئی پر بحث کی ہے۔(۸۱)

غرض دبستانِ بیجاپور کے شعرا کی مثنویوں میں قاعدہ کے حساب سے حمد و نعت و منقبت کا رجحان عام تھا۔سوائے چند ایک کے، جنھوں نے محض اپنی نظموں میں تصوف کی تعلیم کو مدنظر رکھا۔پھر یوں ہوا کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء اور ۱۶۸۷ء میں یکے بعد دیگرے دکن کی ان عظیم الشان

ریاستوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ عالمگیر کی اس مہم نے اردو زبان و ادب کی تاریخ پر بہت بڑا اثر مرتب کیا۔ کیونکہ بہمنی حکومت اور اس کے بعد دکن کی ان دو حکومتوں کی سر پرستی میں اردو نے اپنی ترقی و ترویج کی شاندار منزلیں طے کی تھیں۔ وہ ان ریاستوں کی شکست و ریخت کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئیں۔ لیکن سقوط گولکنڈہ اور بیجاپور کے بعد ایک مدت دراز تک دکن کا یہ علاقہ افراتفری و انتشار سے دوچار رہا، مگر اس طواف الملوکی میں بھی چند ایک ادیب و شاعر اس زبان کی خدمت کیے جا رہے تھے، جس نے شعر و ادب کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ ترین معیارات قائم کیے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ۱۶۸۶ء، ۱۶۸۷ء کے بعد دکن میں اس زبان و ادب کا کوئی سر پرستی کرنے والا نہ تھا۔ تاہم بیجاپور سے قطعِ نظر گولکنڈہ کی صورت حال مختلف تھی۔ مغل شہنشاہ نے جب دکن میں اپنا صوبہ دار مقرر کیا اور اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا، تو جلد ہی یہ شہر تمدنی، ثقافتی اور لسانی حیثیت سے ابھر آیا۔ اور اس پر آشوب عہد میں دکن کے عزلت نشین اور شکستہ حال شعرا نے اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو ضائع ہونے نہ دیا۔ انھی میں یہ دو نام سرِ فہرست ہوں گے۔ ایک ولی اورنگ آبادی اور ان کے بعد سراج اورنگ آبادی۔

تاریخی حیثیت سے اہلِ علم نے ان دونوں شاعروں کو دکنی اردو کے آخری شاعر مانا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد دکنی زبان و ثقافت کی خصوصیت برقرار نہ رہ سکی۔ اس پر شمالی ہند کے لب ولہجہ روز مرہ محاوروں کا اثر پڑنے لگا تھا۔ اور دکنی شعری روایات دھندلا گئیں۔

ولیؔ اورنگ آبادی کے نام اور کام سے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں اور محققین کو اختلاف ہے۔ تاہم بیشتر ماہرین ادب اس بات پر متفق ہیں کہ ولی اورنگ آبادی، وہی ولی ہے جنھوں نے دکنی زبان و ادب کے انتشاری دور یا آخری ایام میں اپنی طلاقتِ لسانی اور مشاقی کے جوہر دکھائے۔ بقول مرتبِ کلیات ولی: ''ولی کے دیوان میں ٹکسالی یعنی شاہ جہاں آبادی اُردو کے نمونے بہ اِفراط موجود ہے۔ مگر چونکہ ہر غزل اور ہر صنف سخن میں جا بجا دکنی لب ولہجہ وترکیب موجود ہے، کوئی مبصر اس کو شاہ جہاں آبادی اُردو نہیں کہہ سکتا۔'' (۸۲)

گویا ولیؔ کا عہد وہ زمانہ ہے، جہاں دکنی شاعری کا عظیم دور ختم ہو رہا ہے اور عالمگیری حکومت کے توسط سے شمالی ہند کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ یوں شاعری کا ایک نیا باب وا ہو رہا تھا۔ دکنی کی عظیم روایات کی پاسداری کرتے ہوئے مہان شاعر ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے، جہاں ہمیں جدید اردو کا نقشِ اولیں صاف دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ ولیؔ کے ہاں قدیم دکنی شعرا کے اسالیب جھلکتے ہیں۔ وہی سادگی، حقیقت نگاری، برجستگی اور تہذیب وثقافتی عناصر و آثار۔

ولیؔ دکنی کے جائے پیدائش کا تعین بھی دشوار گزار مرحلہ ہے۔ ہمارے بیشتر محققین نے اس

بارے میں کئی بحثیں اٹھائیں، جن کا محصل یہ ہے کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔(۸۳) اور گجرات خصوصیت سے احمد آباد میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور وہیں علومِ مروجہ میں دسترس پائی۔ ان کے کلیات میں موجود دو مثنویوں میں سے شہر سورت سے متعلق ایک مثنوی اس کی شاہد ہے۔ گجرات ہی میں ولی نے حضرت شاہ نورالدین صدیقی سہروردیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور ان کے پیر و مرشد شاہ وجیہ الدین کی مدح لکھی۔(۸۴) دراصل ولی کے وجدان نے جس ماحول میں نشوونما پائی، وہ خالص تصوف کی نمائندگی کرتا تھا۔ اور یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ ہر قوم کا دورِ زوال دورِ تصوف ہوتا ہے۔ شاعر یا اہلِ ہند ستم رسیدہ قومی تباہی سے متاثر، عالمِ کرب و اضطراب میں اپنے درد کے درماں کو اشراق و تصوف میں ڈھونڈتا ہے۔ اس منزل پر ولی کا کلام ہمیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ صوفیائے کرام کا اصولِ اعتقاد، عشقِ مجازی اور حقیقی گتھیوں میں الجھا ہوا ہے۔ ولی کو اس جذبۂ وجدان سے مفر نہیں۔ مسلکِ تصوف کی تعریف اپنی قادرالکلامی کے ذریعہ یوں کرتا ہے:

تواضع خاکساری ہی ہے ہماری سرفرازی ہے
حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے

ولی اورنگ آبادی نے کم و بیش ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے مطبوعہ کلیات میں دو مثنویوں کے علاوہ غزلیں، قصیدے، رباعیات، قطعات، ترجیع بند، مستزاد، مخمس سبھی کچھ شامل ہے۔ ان میں ولی نے ہندوستان کے مذاقِ سخن، احوال و آثار کا خصوصی تذکرہ کیا ہے اور شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی ہے گویا وہ تصور پرست نہ تھا اور شاید اس کے سفرِ دلی نے شمالی ہند کے بیشتر شعرا کو مرقع نگاری، تصویر پرستی سے چھٹکارا بھی دلانے کا کام کیا ہو۔ بالفاظِ دیگر ولی نے فارسی کی روایات کے پس منظر میں اُردو شاعری کی جانب رغبت دلائی۔ یہ صحیح ہے کہ ولی کی ابتدائی شاعری میں شمالی ہند کے طمطراق کی بجائے دکنی کی سادہ لوحی، حقیقت بینی کے ساتھ ساتھ مخصوص دکنی لب و لہجہ، محاورے، روزمرہ اور اسالیب نظر آجاتے ہیں، جو یقیناً اس کے سفرِ دلّی کے کلام میں کسی قدر مدھم یا پھیکے پڑ گئے۔ ولی کے قصائد بھی اپنی انفرادیت کے ترجمان ہیں۔ ولی کے ہاں کل چھے قصائد ملتے ہیں۔ پہلا قصیدہ لامیہ ہے جس میں حمد و نعت و منقبت اور موعظمت سبھی کچھ ہے۔ دوسرا قصیدہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں ہے۔ تیسرا جنابِ امیر المومنین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی منقبت میں۔ چوتھا در مدحِ بیت الحرام، پانچواں میراں محی الدین قدس سرہ اور چھٹا شاہ وجیہ الدین اعلی اللہ مقامہ کی شان میں ہے۔(۸۵) ولی کے ان قصائد میں تشبیب بھی ہے، گریز بھی اور کسی حد تک تغزل کا عنصر بھی جب کہ خاتمہ اور دعا کا پہلو بھی نمایاں ہے۔

دراصل ولی کی شاعری اس وقت شروع ہوئی جب کہ دکن کے دو عظیم الشان سلطنتوں کا شیرازہ

بکھر گیا۔ ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا پر تنزل و انحطاط و اَدبار کے بادل چھا گئے تھے۔ ولی کے یہ قصائد موافق موسم اور مناسب آب و ہوا سے یکسر محروم رہے۔ نہ شاہی سرپرستی وقدردانی تھی اور نہ عوامی دلچسپی و انہماک، چنانچہ ولی نے محض اپنی مہارت و تخیل دکھایا ہے۔ یوں بھی زورِ کلام قصیدہ کی جان ہوتا ہے اور ولی نے اس کا بہترین مظاہرہ کیا۔ قصیدۂ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہی کیا، بلکہ منقبت میں بھی اس رنگ و آہنگ کو برقرار رکھا۔ جب کہ ولی نے اپنے ترجیع بند میں اس کا کمال دکھایا ہے۔ یوں بھی شاعری میں ترجیع بند ایک اچھی صنفِ سخن ہے۔ غزل کی طرح ایک مطلع اور پھر کئی اشعار متفق یا مختلف المضامین لاکر ایک بیت کی، جس کا قافیہ الگ ہوتا ہے، گرہ لگائی جاتی ہے۔ یہ بیت اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے اور ہر بند کے آخر میں بار بار لائی جاتی ہے۔ ولی کا ترجیع بند مضمون ومطالب کے لحاظ سے اگر چہ بلند پایہ نہ سمجھا جائے، لیکن ان میں زبانی سلاست و لطافت قابلِ تعریف ہے اور اس دور کے ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ۔ واضح رہے کہ ولیؔ کی مذہبی معلومات بہت وسیع ہیں اس باب میں ولی نے تصوف اور اس کے متعلقات کا بڑا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ مسئلۂ توحید، تعینات وتنزلات، عروج، الوہیت، معیت یا منازلِ سلوک، خدا کی ذات، واجب الوجود، ذاتِ خلق عدم قابل الوجود یعنی اضافی یا ممکن الوجود، صفاتِ وجود، سبعہ صفات: یعنی حی، علیم، کلیم، سمیع، بصیر قدیر اور مرید سے کما حقہ واقف ہے۔ کیونکہ ولی نے شاہ نورالدین صدیقی سہروردی سے درس سلوک لیا تھا اور رسم سلوک پر سہروردی مسلک کی روشنی میں ایک کتاب 'نور المعرفت' تصنیف کی اور اپنے پیر ومرشد کے نام سے معنون کر دی۔ (۸۶) اس مسلک کے اعتبار سے زیادہ تر حسن ونور کا نظریہ زیرِ گفتگو ہوتا ہے۔ (۸۷) اور ولی نے اس کی پابندی کی ہے۔ اس طرح ولی نے قصائد میں اپنے افکار وخیالات کو رقم کیا ہے۔ غرض ولی نے مناقب کی ذیل میں اس کا اہتمام کیا ہے کہ محبت ومعرفت کے نکات بیان کیے جائیں۔ ولیؔ اورنگ آبادی کے بعد سراجؔ اورنگ آبادی بھی دکنی شاعری کا ایک بلند قامت قابلِ قدر شاعر ہے، جس نے دکنی شاعری کی روایات کو تابندگی اور عظمت سے دوچار کیا۔ سراج کا عہدِ دکنی کا آخری دور ہے۔ بلکہ کسی قدر تکلف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سراج کے زمانے میں یعنی (۱۱۲۸ھ م ۱۷۱۵ء تا ۱۱۷۷ھ م ۱۷۶۳ء) میں شمالی ہند کے فارسی اثرات تصنع، مبالغہ آرائی اور تصور پرستی کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ اور حقیقت پسندی و واقعہ نگاری کے عناصر تقریباً مفقود ہونے لگے تھے۔ (۸۸)

سراجؔ ایک فطری شاعر تھے۔ اوائلِ عمر ہی میں علومِ مروجہ میں دسترس حاصل کی۔ اکثر تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ ایامِ طالب علمی ہی میں ان پر جذب ومستی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اکثر بے خودی کے عالم میں گھر سے نکل جاتے اور اپنا بیشتر وقت حضرت برہان الدین غریبؒ

خلیفہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانے پر گزارتے۔اسی سرشاری کی حالت میں اشعار کہتے تھے۔سراج کا تذکرہ اولاً میر تقی میر نے نکات الشعرا میں کیا ہے لیکن وہ مختصر ہے: ”سراج، تخلص دراورنگ بادشنیدہ می شود۔شاگرد سید حمزہ، ہمیں قدر از بیاض سید سطور متضادمی گرد سخن او خالی از مزہ نیست۔“(۸۹)

میرؔ نے سراجؔ کا نمونۂ کلام بھی درج کیا، لیکن اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔اس کے بعد کئی ایک تذکرہ نویسوں نے سراج کے حالات لکھے۔ان میں تحفۃ الشعرا از افضل بیگ خان قاقشال اورنگ آبادی ۱۱۶۵ھ، گلشنِ گفتار از حمید خان اورنگ آبادی ۱۱۶۵ھ اور بعد میں مخزنِ نکات از قائمؔ چاند پوری وغیرہ۔ان سب میں قاقشال نے قدرے تفصیل سے سراج کے حالات واقعات درج کیے ہیں۔ان قدیم تذکروں کے بعد ۱۹۴۰ء میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے بیش بہا مقدمہ کے ساتھ کلیاتِ سراجؔ مرتب کر کے مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات (سلسلۂ یوسفیہ) حیدرآباد سے شائع کیا۔اس کلیات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سراجؔ ایک صوفی صافی مجذوب صفت انسان تھے۔اوائلِ عمر یعنی ۱۹، ۲۰ برس میں حضرت شاہ عبدالرحمن چشتی سے بیعت ہوئے۔کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے پیرومرشد کے کہنے پر شاعری کو ترک کر دیا۔جب کہ محض ایک قلیل مدت میں ان کا اتنا ضخیم کلیات تیار ہو چکا تھا۔جس میں علاوہ غزلیات، فردیات، رباعیات، مستزاد، مخمسات، ترکیب بند، مثنویاں وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ خصوصیت سے ان کے دیوان میں حمد، مناجات، نعت کے بعد ’درصفتِ چار یار‘ کے عنوان سے مناقبِ خلفائے راشدین دستیاب ہوتے ہیں۔جبکہ ان کی مثنوی ’بوستانِ خیال‘ میں اس طرح کا کوئی اہتمام نہیں ملتا۔سراج نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ان کا ماہرانہ وشاعرانہ وصف، فارسی دانی کی مہارت اور دلچسپی کے ساتھ دکنی شاعری کے بنیادی رجحان سے وابستہ رہا، جس کی وجہ سے ان کے کلام میں اخلاص اور دردمندی، کیف اور وارفتگی و سرشاری، سوز وگداز کی فراوانی مترشح ہے۔تصوف کی تعلیمات اور وہ بھی چشتیہ مسلک کی وابستگی نے سراجؔ کے جذبۂ عشق ومستی میں یک گونہ بے خودی پیدا کر دی تھی۔سراج نے درصفتِ چار یار کے تحت خلفائے راشدین کے اوصافِ حمیدہ کے بعد اسی میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی بھی ثنا کی ہے۔جبکہ منقبتِ علی کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع منقبت تحریر کی، جو یقیناً اُن کے مزاج، مسلک کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔درحقیقت شعرا کے طرزِ بیان یا اسلوب کے ذریعے ان کے عقائد کا پتہ لگانا زیادہ دشوار نہیں۔خصوصاً مذہبی اعتقادات کے بارے میں جاننا۔موضوع کا لحاظ کرتے ہوئے یہ صاف طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مناقب میں تعریف وتوصیفِ صحابہ کرام و اولیاء اللہ کا اہتمام ان کے مسلک اور مذہب ومشرب کی نشاندہی ہوگی، حالانکہ نعتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد مدحِ صحابہ یا مدحِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اختصاص ہمارے بیشتر

قارئین کے مطالعہ کا باعث ہو جاتا ہے کہ فلاں شاعر سنی العقیدہ اور فلاں شاعر شیعہ۔ فی الواقعی شیعہ اور سنی اصولی یا فروعی جو کچھ اختلاف ہے، اس کی ابتدا یہ ہے کہ اہلِ سنت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد خلفائے اربعہ کو بالترتیب افضل واعلیٰ مانتے ہیں اور شیعہ حضرات صرف حضرت علی کو۔ آپ کے بعد آپ کی اولادوں اور گیارہ اماموں کو منصوص و مامور اور امام جانتے ہیں۔ ان معتقدات کے لحاظ سے جہاں کسی کے کلام میں صرف آئمہ اہلِ بیت کی منقبت دیکھی جاتی ہے، وہاں اکثر ناواقف اس کے مصنف یا شاعر کو شیعہ کہنے لگتے ہیں جو حقیقت سے بعید ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے محبت وعقیدت کا شیوہ ہر زمانے میں قائم رہا۔ بلکہ سلاسلِ طریقت کے سبھی خانوادے سوائے سلسلہ نقشبندیہ حضرت علی پر منتہی ہوتے ہیں۔ مزید سلسلہ نقشبندیہ اور سلسلہ مداریہ وغیرہ جس کے سرخیل حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں، وہ حضرات بھی حضرت علی ؓ کی عزت وعظمت میں رطب اللسان ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ کم وبیش سبھی سنی مسلمان صوفی بزرگ، اہلِ خانقاہ، عبادات وفرائض واجبات کے بعد اکثر دعاؤں میں اشعار میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے استعانت و استمداد اور مشکل کشائی کے لیے ملتمس اور ملتقی رہتے ہیں۔ غرض دکنی کے بیشتر شعرا اپنے مختلف عقیدوں کے باوصف اپنے کلام میں حمد و نعت کے بعد منقبت کا اہتمام کرتے ہیں اور اکثروں نے صحابہ کی منقبت کے علاوہ خصوصیت سے حضرت علی کی منقبت کا خصوصی اہتمام کیا اور بیشتروں نے اپنے اپنے بزرگانِ طریقت کی بھی مدح کی ہے۔ جو ان کے مزاج، محبت اور عقیدت کی آئینہ دار ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سید تصدق حسین رضوی، لغات کشوری، ص ۵۰۷

۲۔ امداد امام اثر، کاشف الحقائق، حصہ دوم، ص ۲۹۷

۳۔ سید محمد عقیل رضوی، 'اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)، ص ۱۹

۴۔ مقدمہ شعروشاعری، ص ۲۶۶

۵۔ اشرف، قندھار شریف کے مشہور بزرگ سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان المتوفی ۱۴۰۳ھ کے بھانجے اور خلیفہ شاہ ضیاء الدین بیابانی کا جانشین تھا۔ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۱۹

۶۔ انوارِ محبوبی ترجمہ امواج خوبی، تصنیف خوب محمد چشتی مترجم معزّ قادری الملتانی، حرف آغاز، ح، مطبوعہ دائرہ پریس، حیدرآباد، ۱۹۶۹ء

۷۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ، ص ۱۵

۸۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ پرت نامہ از فیروز بیدری، قدیم اردو، جلد اول، ص ۳۳۳، ۳۳۶، مطبوعہ ۱۹۶۵ء

۹۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ پرت نامہ از فیروز بیدری، قدیم اردو، جلد اول ص اول، ۳۳۳،۳۳۶، مطبوعہ ۱۹۶۵ء،

۱۰۔ ایضاً ص ۳۴۳،۳۴۰

۱۱۔ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص

۱۲۔ محمد اکبرالدین صدیقی، بجھتے چراغ، ص ۲۳۸

۱۳۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، یوسف زلیخا، از احمد گجراتی، مطبوعہ ۱۹۸۳ء، ص ا

۱۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۴۲۲

۱۵۔ شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، ص ۶۲

۱۶۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ۳۸۲، دکنی ادب کی تاریخ ص ۶۳

۱۷۔ شیخ چاند، پھول بن، از ابن نشاطی، ص

۱۸۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، یوسف زلیخا از احمد گجراتی، ص ۱۲

۱۹۔ شاہ وجیہ الدین (ولادت ۱۱۹ھ (کذا) م ۱۵۰۵ء، وفات ۹۹۸) جمیل جالبی نے انھیں شیخ محمد غوث گجراتی ۹۷۰ھ م ۱۵۶۲ء کا مرید بتایا ہے۔ جسے مولوی عبدالحق بھی مانتے ہیں۔ وہ علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے جنھوں نے درس وتدریس میں ساری عمر گزاری روضۃ الاولیا بیجاپوری کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ آپ حنفی مذہب شطاری مشرب اور علوی نسب تھے۔ شیخ ۹۱۰ تاریخ ولادت، شیخ وجیہ الدین ۹۹۸ تاریخِ وفات ہے۔

۲۰۔ شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، ص

۲۱۔ سیدہ جعفر، یوسف زلیخا، ص ۵۷

۲۲۔ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۶۳

۲۳۔ شاہ افضل قادری، دکنی شاعری، تحقیق وتنقید، ص ۴۷

۲۴۔ طبعی، بہرام وگل اندام مرتبہ ڈاکٹر نورالسعید اختر، ص ۱۳۶

۲۵۔ محمد علی اثر، دکنی غزل کی نشوونما، ص ۱۱۹

۲۶۔ بھاگ متی اور اس کا نودریافت مقبرہ (رسالہ آج کل جولائی ۱۹۸۰ء)

۲۷۔ ڈاکٹر طیب انصاری، قطب مشتری، ص ۵۰۴

۲۸۔ مولوی عبدالحق، قطب مشتری از وجہی، انجمن ترقی اردو (کراچی) پاکستان، ۱۹۵۳ء، ص ۴

۲۹۔ شمیم انہونوی، سب رس، ص ۷۷/۴ مطبوعہ ۷۳

۳۰۔ ڈاکٹر محمد علی اثر، دکنی غزل کی نشوونما، ص ۱۷۷

۳۱۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں، مینا ستونتی، از غواصی، ص ۶، اردو جلد اول ۱۹۶۵ء
۳۲۔ پروفیسر محمد بن عمر، کلیات غواصی، ص ۱۲، ۱۹۵۹ء
۳۳۔ اکبر الدین صدیقی، کلیات غواصی، ص ۱۴
۳۴۔ ڈاکٹر محمد علی اثر، دکنی غزل کی نشو ونما، ص ۱۸۱، ص ۱۸۲
۳۵۔ پروفیسر محمد بن عمر، کلیات غواصی، ص ۱۴
۳۶۔ ڈاکٹر زور، داستان اور حیدر آباد، ص ۲۷
۳۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ اردو ادب، ص ۴۸۷
۳۸۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، داستان ادب حیدر آباد، ص ۳۲
۳۹۔ شیخ چاند، پھول بن از نشاطی، ص
۴۰۔ ڈاکٹر زور، داستان اور حیدر آباد، ص ۳۶
۴۱۔ ڈاکٹر زور، داستان اور حیدر آباد، ص ۳۸
۴۲۔ ڈاکٹر زور، داستان اور حیدر آباد، ص ۳۹
۴۳۔ قصہ ابو چشمہ ۱۰۹۰ھ، امین وخواص نے قصہ حسینی نے منظوم کیا، سیوک نے جنگ نامہ محمد حنیف ۱۰۹۲ھ میں اور افضل نے محی الدین نامہ ۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۷ء نے تصنیف کی۔ کہ غلام علی نے جائسی کی مثنوی پدماوت کا ۱۱۰۱ھ میں اردو میں ترجمہ کیا)
۴۴۔ ایضاً، ص ۴۹
۴۴۔ ڈاکٹر زور، داستان ادب حیدر آباد، ص ۴۹
۴۵۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اردو، قدیم اردو، ص ۱۰۱، ص ۱۹۳۹ء
۴۶۔ قصہ حاتم طائی و گلشن احسان، ۱۱۶۹ھ
۴۷۔ ڈاکٹر زور، داستان اور حیدر آباد، ص
۴۸۔ ایضاً، ڈ ۴۸
۴۹۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی، دیپک پتنگ کا تنقیدی جائزہ، مجلہ تحقیقات اردو، ص ۲۶، شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۵۰۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی، دیپک پتنگ (مخطوطہ) ص ۱۰۰
۵۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۲۲۶
۵۲۔ اکبر الدین صدیقی، بجھتے چراغ، ص ۱۳
۵۳۔ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۲۲
۵۴۔ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص ۳۲

۵۵۔ ۵۶،۵۷،۵۷۔ اکبرالدین صدیقی، چندر بدن ومہیار،ص۲۶،۳۰،۹
۵۸۔ اکبرالدین صدیقی، چندر بدن ومہیار،ص ۱۴
۵۹۔ اکبرالدین صدیقی، چندر بدن ومہیار،ص۵۰،۵۶
۶۰۔ ڈاکٹرزور، دکنی ادب کی تاریخ،ص ۴۰
۶۱۔ ڈاکٹرجمیل جالبی، تاریخ اردو ادب،ص۲۷۸
۶۲۔ پروفیسرعبدالقادرسروری، صنعتی،ص ا
۶۳۔ ڈاکٹراشرف رفیع، دکنی مثنویوں کا انتخاب،ص ۹
۶۴۔ پروفیسرعبدالقادرسروری، صنعتی،ص ز
۶۵۔ ڈاکٹرمحمدعلی اثر، دکنی غزل کی نشوونما،ص ۲۹۸
۶۶۔ مبارزالدین رفعت، کلیات شاہی،ص ۴۰،۳۹
۶۷۔ ایضاً
۶۸۔ ڈاکٹرزور، اردو شہ پارے،ص ۵۱
۶۹۔ سیدمحمد، گلشن عشق،ص ۴
۷۰۔ ایضاً،ص ۷
۷۱۔ ڈاکٹرزور، دکنی ادب کی تاریخ،ص ۴۵
۷۲۔ مبارزالدین رفعت، کلیات شاہی،ص ۵۳
۷۳۔ ڈاکٹرمحمدعلی اثر، دکنی غزل کی نشوونما،ص ۳۱۸
۷۴۔ مثنوی احسن القصص (یوسف زلیخا)، ۲۵۳
۷۵۔ ڈاکٹرمحمدعلی اثر، دکنی غزل کی نشوونما،ص، ۳۲۰
۷۶۔ قدیم اردو، جلداول،ص ۲۲۵، ۲۲۷
۷۷۔ ایضاً
۷۸۔ ابوالنصرخالدی، گنج مخفی، قدیم اردو، جلداول،ص ۲۴۴، ۲۳۹
۷۹۔ ایضاً
۸۰۔ محمداکبرالدین صدیقی، بجھتے چراغ،ص ۶۳
۸۱۔ ڈاکٹرمحمدعلی اثر، دکنی غزل کی نشوونما،ص ۲۷۳
۸۲۔ احسن مارہروی، کلیات ولی،ص ۸۴
۸۳۔ ڈاکٹرجمیل جالبی، تاریخ ادب اردو،ص

۸۴۔ حضرت شاہ نورالدین صدیقی، سہروردی سلسلہ کے بزرگ عالم بہ عمل گزرے ہیں۔محبوب زمن تذکرہ شعرائے دکن، اور آب حیات میں ولی کے مرشد کا نام شاہ نورالدین لکھا ہے مرتب کلیات ولی نے ماثرالکرام(آزاد بلگرامی) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا نورالدین صدیقی ابن شیخ احمد صالح احمد آبادی، یگانہ روزگار عالم متبحر، ۱۰۶۴ھ بمقام احمد آباد پیدا ہوئے۔احمد سلیمان احمد آبادی اور ملا فرید الدین احمد آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۱۴۳ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور مختلف سلاسل و خانوادوں سے خلافت حاصل کی۔احمد آباد میں مدرسہ رفیع الشان تعمیر کروایا۔کوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف تھے۔جن میں تفسیر کلام اللہ مختصر و تفسیر نورانی فی السبع المثانی، بارہ ہزار ابیات، تفسیر ربانی بر سورۃ البقرۃ ۳ ہزار بیت، حاشیہ بر اوائل تفسیری بیضاوی، نورالقادری شرح صحیح البخاری طریق امم، شرح فصوص الحکم، شرح مثنوی مولانا روم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔بعمر ۹۱ سال ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی۔اعظم الاقطاب تاریخ انتقال ہے۔(ترجمہ ماثرالکرام، ص۲۱۹)

۸۵۔ لطیف النساء بیگم، نذر ولی، (مضمون ولی کا تخیل، ص۱۸) مطبوعہ ۱۹۲۷ء، حیدرآباد، سلسلہ مطبوعات ادبیات اردو، شمارہ ۴

۸۶۔ لطیف النساء بیگم، نذر ولی، (مضمون ولی کا تخیل، ص ۴۷) مطبوعہ ۱۹۲۷ء، حیدرآباد، سلسلہ مطبوعات ادبیات اردو، شمارہ ۴

۸۷۔ سلسلہ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (ابوالخمس عمر بن محمد المتوفی ۶۳۲ھ اپنے وقت کے صاحب علم و عمل بزرگ تھے۔آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ان میں عوارف المعارف مشہور زمانہ کتاب ہے۔جو دنیائے تصوف میں حضرت ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش کی تصنیف کشف المحجوب کے بعد تیسری اہم کتاب مانی گئی ہے۔سہروردیہ اعتقادات کے مطابق عشق در حقیقت ستائش حق کا نام ہے اور عشق کا رجحان ہر انسان میں طبعی طور پر موجود ہے۔اس طبعی یا فطری میلان کی بدولت ہر موجود اپنے مافوق تک پہنچنا چاہتا ہے جس کی آخری منزل کمال ہے۔اس عشق و حسن کی کشش کا نام وجود ہے۔وجود مطلق حقیقت میں حسن مطلق کو چاہتا یا طلب کرتا ہے۔ورنہ عدم اور یہی ایک حسن یا نور قاہر تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے جو ازلی ہے ابدی اور غیر فانی ہے۔یہ قائم بالذات ہے۔اس کا خالق کوئی نہیں ہے۔وہ کائنات کا خالق ہے اور کائنات اس کی مظہر ہے۔

۸۸۔ ڈاکٹر محمد علی اثر، دکنی غزل کی نشوونما، ص ۴۱۸

۸۹۔ نکات الشعرا، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، ص ۱۰۱

□□□

منقبت: معنوی اور موضوعاتی جہات

ڈاکٹر ریاض مجید

ABSTRACT: Dr. Riaz Majid's article focuses on the semantic and thematic dimensions of MANQABAT. Initially, he discusses the meanings and scope of praise poetry, followed by an exploration of the subjects that thrive within it and the relationship of this literary form with religious figures. The article also targets the poetic attitudes that emerge towards religious personalities in Hinduism. In the conclusion, he illustrates the thematic richness and spiritual depth of MANQABAT through various examples, showcasing its extensive significance and profound meaning.

منقبت عربی زبان کے مادہ 'نقب' سے ہے بمعنی 'کھودنا'۔ اصطلاحی معنوں میں منقبت تعریف، توصیف اور مدح وثنا کے مفہوم میں ہے۔ بزرگانِ دین، اولیاء اللہ کی مدح کے اشعار کے منقبت کہتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی تعریف۔ توصیفِ صحابہؓ۔ خصوصاً اہل بیت اور صحابہؓ کی تعریف کے ساتھ ملائکہ اور رسولانِ سلف کی صفت وثنا اور محامد کو بھی منقبت کہتے ہیں۔ شعری اصطلاح میں منقبت کی صنف صحابہ کرامؓ کی توصیف اور بزرگانِ دین واولیاء اللہ کے اشعار سے متعلق ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف یعنی نعت کے لیے بھی منقبت کا استعمال ملتا ہے۔ لغت نامہ دہخدا میں منقبت کے لغوی معنی 'ہنر وستودگی وکارہائے نیک' کے ہیں۔ ''آنچہ موجب ستائش ومباہات باشد'' (جو ستائش اور فخر کا باعث ہو) منقبت کی جمع مناقب ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں یہ لفظ کئی صدیوں سے مستعمل ہے۔ یہ مثالیں دیکھیے:

بہ ذکرِ منقبت اُو زبان کلکِ تر است
از آن سبب دھن کلک عنبر آگین است (ابوالفرج رونی)

———————

وگرنہ منقبتِ آفتاب معلوم است
چہ حاجت است بہ مشاطہ روی زیبا را (سعدی)

منقبت از جان و دل کا بنِ یمیں می گویدش
ہست اظہارِ عبودیت نہ انشائے ثنا (ابن یمین)

اردو لغت (جلد ۱۸) مطبوعہ اردو لغت بورڈ کراچی نے منقبت کی تعریف کے ساتھ کچھ اردو شاعری کی مثالیں بھی دی ہیں۔

اول سوں یو رتبے بھریا منقبت
مجھے کیا یہ طاقت کروں میں صفت (محی الدین نامہ)

منقبت اوس کے فرزنداں کی سب
فضلی کرتا بیاں بصدق و ادب (کربل کتھا)

پڑھ منقبت یہ شاہ کی جس سے نجات ہو
وہ شاہ جس کے ایک گدا کو ہے یہ کمال (میر تقی میر)

منقبت کے لفظ سے منقبت خواں، منقبت نگار، منقبتی اور منقبت گوئی کے کئی مرکبات بنے ہیں۔

ہماری شاعری میں ذوقِ مدیح کو عام طور پر چار اقسام میں لکھا، دیکھا اور جانچا جاتا ہے۔ یہ اقسام کئی صدیوں کے شعری تجربے کے بعد اب چار جداگانہ اصنافِ شاعری کے نام سے معروف ہیں۔ حمد، نعت، منقبت، قصیدہ۔ حمد شاعری کی وہ قسم ہے جو اللہ تعالیٰ کی تعریف، مدح اور ستائش کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نعت پیغمبرِ اسلام حضور اکرم سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت اور اوصاف کے بیان کے لیے۔ منقبت اہلِ بیتؓ، اصحابِ رسولؓ، اولیائے کرام، مشائخ عظام اور دوسری مذہبی شخصیات کے لیے۔ سابقہ پیغمبرانِ اسلام اور ملائکہ کی تعریف میں کی گئی شاعری بھی منقبت کے ذیل میں شمار ہوتی ہے۔ قصیدہ سلاطین، بادشاہوں سیاسی اور دوسری معروف شخصیات کی مدح میں لکھے جانے والے اشعار کو کہتے ہیں (شخصیات کے علاوہ قصیدے کی دوسری کئی اقسام بھی ہے اوصافی، اخلاقی، مزاحیہ اور ہجو یہ موضوعات بھی اِس میں شامل ہیں) واضح رہے کہ حمد، نعت، منقبت کے الفاظ کو مذکورہ بالا اقسام کی تعریف کے علاوہ لغوی مفہوم میں بھی کہیں کہیں استعمال کیا گیا ہے جیسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کے لیے علامہ اقبالؒ نے نعت کی جگہ حمد کا لفظ استعمال کیا ہے وہ اپنے فارسی کلام 'حرفِ چند با

اُمّتِ عربیہ‘(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق) میں کہتے ہیں:

حمد بے حد مر رسولِ پاک را
آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را (خواجہ عطارؒ بہ ادنیٰ تغیر)

(کلیاتِ اقبال فارسی، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص۸۳۶)

(علامہ اقبال نے اپنے پورے فارسی کلام میں حمد کا لفظ صرف ایک بار اِسی جگہ پر استعمال کیا ہے۔) اسی طرح نعت کا لفظ صحابہ کی تعریف یعنی منقبت کے لیے بھی استعمال ہُوا ہے جیسے امیر معزی (م ۵۴۲ھ) نے اللہ تعالیٰ کی تعریف یعنی حمد کے مفہوم میں نعت کا لفظ یوں برتا ہے۔

نہ اندر ذاتِ او تالیف و ترکیب
نہ اندر نعتِ او اعراض و جوہر

اسی طرح میر احسن بیگ تبریزی نے اِس شعر میں منقبت علیؓ کے لیے نعت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

بہ نعتش بکن صد زباں خامہ ام
بہ مُہرِ نبوت رسد نامہ ام

سیّد ضیا الدین دہشیری کی کتاب ''نعتِ حضرت رسول اکرم در شعر فارسی'' کے دیباچے میں اُن کی ایک اور کتاب 'نعت امیر المومنین در شعر فارسی' کا ذکر ملتا ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ 'منقبت' کے مفہوم میں نعت کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔

علی خاں کی مثنوی ''قصیدہ زیتون و محمد حنیف'' میں بھی لفظ نعت، صحابہ کرامؓ کی منقبت کی جگہ عنوان میں استعمال ہُوا ہے۔علی خاں اپنے منظوم قصہ کے آغاز میں حمد اور نعت کے بعد صحابہ کرامؓ کی منقبت سے پہلے عنوان یوں درج کرتے ہیں۔''در نعت اصحاب کبار رضی اللہ عنھم (اردو کی قدیم منظوم داستانیں: مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی، جلد اول، ص۳۷۶) پنجابی زبان میں حافظ شمس الدین (م ۱۹۰۲) کی 'نعتِ موسیٰ' کے نام سے ایک نظم کا ذکر ملتا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات اور توصیف و منقبت کا بیان ہے۔(راوی دیاں چھلّاں: مرتب نصیر ملکی، ص ۱۱۳، مطبوعہ گورنمنٹ جالک لاہور) اب تک کی گفتگو کا خلاصہ ہے کہ حمد، نعت اور منقبت کے الفاظ ہمارے کلاسیکی شعری ادب میں کسی تخصیص کے بغیر وصف کے مفہوم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔

عربی سے فارسی اور پھر فارسی سے اردو شعر و ادب کی موجودہ صورت تک آتے آتے اب یہ الفاظ (وصف، مدح اور تعریف) کی عمومیت سے نکل کر مخصوص ادبی و شعری اصطلاحات کے لغات میں اپنے مخصوص معنوں میں مستعمل ہو چکے ہیں یعنی 'حمد' خدا تعالیٰ کی تعریف کے لیے، 'نعت' رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی تعریف کے لیے اور 'منقبت' اہلِ بیتؓ، صحابہ کرامؓ اور مذہبی شخصیات کی تعریف کے لیے۔

اہلِ بیتِ اطہار، صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظّام پر لکھی گئی منظومات کی کئی شکلیں ہیں یہ شکلیں موضوع اور افکار کے سبب اتنی جداگانہ نوعیت کی ہیں کہ انہیں منقبت کے ذیلی عنوانات کے تحت ہیئت اور موضوعات زیرِ جائزہ لایا جاسکتا ہے مثلاً اردو کی صنف مرثیہ کا ایک بڑا حصہ جن محترم شخصیات اور اکابرینِ دین سے متعلق ہے اُن پر لکھی گئی منظومات کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کیا جائے تو اِن مناقب میں مرثیہ، سلام، نوحہ، بین کئی ذیلی موضوعات ملتے ہیں بعض کی ہیئتیں مختلف ہیں مثلاً مثلث، مربع، مسدس، دوہا وغیرہ۔ مرثیہ کی صنف کے کئی ایسے حصے ہیں جو جداگانہ اصناف کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں ان میں سلام کا ذکر خصوصیت سے کیا جاسکتا ہے۔ جو مرثیہ کا حصہ بھی ہے اور مناقب کا بھی اسے ایک جداگانہ صنف کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اسی طرح اولیائے کرام کے مناقب میں شجرہ شریف، عُرس شریف، مقبرہ نامہ شریف، چادر شریف اور گھڑولی کی منظومات فکری وفنی طور پر منقبت ہوتے ہوئے الگ الگ ذیلی اصناف کا درجہ پا چکی ہیں ان منقبت پاروں کی نشاندہی درج ذیل ہے۔

(ا) شجرہ شریف

شجرہ عربی میں نسب نامہ کو بھی کہتے ہیں بقول لغت نامہ دہخدا ''نسب نامہ'' آنچہ مشایخان اسامی پیران خودنوشتہ بہ ترتیب بہ موید مید ہند (ص ۱۱۰۵) یعنی بزرگ اور پیرِ سلسلہ اپنے مشائخ کے بارے میں ترتیب دیتے ہیں۔

کس نیست درجہاں کہ بہ گوہر ز آدمی است
ورہست گو بیا شجرہ بر جہاں بخواں (خاقانی)

شجرہ نامہ کو اکیلے لفظ شجرہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ پہلے نشاندہی کی گئی ہے اِسے نسب نامہ بھی کہتے ہیں۔ یہیں سے لفظ شجرۃ النسب ہے یہ وہ نظم ہوتی ہے جس میں کسی خاندان کے جدّ اعلیٰ سے بقیہ اولاد کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مختلف سلاسل کے جدا جدا شجروں کے علاوہ شجروں پر باقاعدہ کتابیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شجروں کے حوالے سے قاموس الکتب اُردو جلد اول مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۱ء میں صفحہ نمبر ۵۳۷ پر درجِ ذیل کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

- اسامہ حدیث ونسب نامہ رسول اکرمؐ قلمی حوالہ
- اجداد النبی: ظفر احسن
- نسب نامہ رسول اللہ صلعم: عبدالحی مدراسی مولوی، مطبوعہ مظہر العجائب مدراس
- نسب نامہ رسول مقبول: کریم بخش نول کشور لکھنو، ۱۸۸۰ء

O فتح القوی فی نسب النبی: محمد ہاشم مخدوم، عباسی کتب خانہ کراچی

برِّصغیر پاک و ہند میں مختلف سلاسل اور درباروں میں شجرے نظم کی صورت میں ملتے ہیں یہ نظم کی ایک قسم ہے جو غزل کی ہیئت میں ہوتی ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تصوّف کا سلسلہ کن کن شخصیات سے ہوتا ہُوا صاحبِ مزار تک پہنچا؟ شجرہ شریف میں اِس کا ذکر کیا جاتا ہے مختلف سلاسل اور اُن کی شاخوں کے اپنے اپنے شجرے ہیں۔ شجرہ عموماً تیس چالیس اشعار پر مشتمل ہوتا ہے جس کی ردیف 'کے واسطے' ہوتی ہے دعا کے وسیلے کے انسلاک اور فیض و برکت کے حصول کے لیے اِس میں تمام گزشتہ اکابرینِ سلسلہ کے مقام و مرتبہ، بزرگانِ سلف کی حکمت، دانائی، فیوض و برکات، علم، سخاوت اور دوسری صفات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ 'شجرہ شریف' کو صاحبِ مزار کے عرس پر خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے خاص ایّام اور تقریباتِ سلسلہ میں مل کر لحن سے پڑھا جاتا ہے نمایاں پڑھنے والے کو شجرہ خواں کہا جاتا ہے۔ ہر مزار کے اپنے اپنے شجرے ہیں مثلاً قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، اویسیہ وغیرہ وغیرہ صوفیاء کے سلاسل کی شاخ در شاخ اور سلسلہ در سلسلہ سینکڑوں قسمیں ہیں J.Spencer Trimingham نے اپنی کتاب The Sufi Orders in Islam (مطبوعہ ۱۹۷۱ء) میں ایسے بیسوں سلاسل کا ذکر کیا ہے جو برّصغیر پاک و ہند میں نسبتاً نامانوس اور کم معروف ہے۔ مثلاً مولویہ، شاذلیہ وغیرہ ان سب کے اپنے اپنے شجرے ہیں۔

(۲) عُرس شریف

ان نظموں کا موضوع ہی عرس ہوتا ہے صاحبِ مزار کے عرس کے احوال پر مبنی اذکار کے بیان میں عام طور پر اُن کی ولادت کے مہینے کا ذکر ہوتا ہے۔ غزل کی ہیئت میں لکھے گئے ایسے مناقب کی ردیف میں 'عرس' کا لفظ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً

ع 'ہم منائیں گے عرس داتا کا'

ع 'سیدِ ہجویر کا ہے عرس آج'

ع 'خواجہ اجمیر کے ہے عرس کا دن آ گیا'

(۳) مزار شریف

اسی طرح صاحبِ سلسلہ کے مزار پر نظم لکھی جاتی ہے جس میں مزار کی تجلیات اور فیوض و برکات کا ذکر ہوتا ہے۔

(۴) چادر شریف

جب سال بعد عرس کے موقع پر مزار پر نئی چادر چڑھائی جاتی ہے تو اکابرین اور وابستگانِ سلسلہ اہتمام کے ساتھ چادر کو مختلف کونوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ مزار کی طرف آتے ہیں اور خاص نظمیں پڑھتے ہیں جو چادر کے متعلق ہوتی ہیں ایسی نظموں کو چادر شریف کہا جاتا ہے۔

ع 'بنا کے لائے ہیں چادر کو نُور کرنوں سے'

ع 'شاہ کے دربار کی چادر شریف'

ع 'عقیدت سے پریمی لائے ہیں دربار کی چادر'

(۵) سلام شریف

بعض سلاسل میں صاحبِ مزار کے لیے سلام بھی پڑھا جاتا ہے جس میں سلسلہ کے لوگ اپنے بزرگ کے ساتھ اظہارِ عقیدت کرتے ہیں۔ سلسلہ بہ سلسلہ ایسے مناقب کے سینکڑوں مطبوعہ کتابچے بھی معروف درباروں پر مل جاتے ہیں۔

اگر اُردو شاعری میں مناقب سے متعلق اِن نظموں کو جمع کیا جائے تو اُن کی تعداد ہزاروں میں بنتی ہیں اِس کا زیادہ حصہ اگرچہ رسمی ہے لیکن بعد سلاسل کے شاعروں نے منقبت میں اعلیٰ درجے کی ایسی شاعری بھی کی ہے جو ادبیاتِ عالیہ کے درجے پر پورا اُترتی ہے۔

منقبت کا لفظ جیسے کہ پہلے نشاندہی کی گئی ہے مذہب سے وابستہ شخصیات سے خاص ہے یہاں مذہب سے مراد دینِ اسلام ہے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسرے مذاہب کی اہم شخصیات اور برگزیدہ ہستیوں کے شخصی اوصاف اور کردار و فیضان کے بارے میں لکھی ہوئی منظومات بھی مناقب میں شمار ہوسکتی ہیں؟ مثلاً علامہ اقبال کی نظمیں سوامی رام تیرتھ (بانگِ درا) رام (بانگِ درا) نانک (بانگِ درا) وغیرہ یا اُردو شاعری میں گوتم بدھ، کرشن مہاراج یا غیر مسلم ہندی صنمیات سے متعلق کی گئی شاعری میں ہندومت کی نمایاں مذہبی شخصیات کے بارے میں جو مدحیہ اشعار مل جاتے ہیں وہ منقبت نہیں کہلائیں گے ایسے اشعار اور منظومات مدحیہ شاعری یا قصائد کے ذیل میں آئیں گے۔

برّصغیر کی اردو شاعری میں کہیں کہیں ایسے اشعار اور نظمیں مل جاتے ہیں جو دیگر مذاہب کی شخصیات کے بارے میں ہیں۔ انسان دوستی اور دوسرے مذاہب کے احترام کے حوالے سے کئی اُردو شاعروں نے ہندو اور سکھ مذاہب کی شخصیات کے بارے میں منظومِ اظہارِ عقیدت پیش کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے تو اتنی نظمیں لکھی ہیں کہ اُن پر ایک جداگانہ مقالہ تحریر ہوسکتا ہے۔ مثلاً اُن کی درج ذیل نظمیں دیکھیے:

(۱)جنم کنھیا جی(۲) بالپن بانسری بجیا(۳) بانسری(۴) لہو و لعب کنھیا(۵)شادی کنھیّا(۶)رسم کتھا)۷(ہر کی تعریف میں(۸)بلدیو جی کا میلا(۹)مدح نانک شاہ گرو(۱۰)درگا جی کے درشن(۱۱)تعریف بھیرون کی(۱۲)کنھیا جی کی راس۔

یہ نظمیں ہندی آثار وصنمیات ، مذہبی شخصیات اور ہندوانہ تہواروں کے حوالے سے بہت اہم اور طویل ہیں جو مذہبی عقیدت سے لکھی گئی ہیں (بعض نظموں کا پہلا پہلا بند اس مضمون کے ساتھ ضمیمے میں دیا جا رہا ہے)ہندومت سے وابستہ افراد ان سے مذہبی کیف اٹھاتے ہیں کہ ایسی نظمیں اُن کی مذہبی جذبات اورعقیدت کی عکاس ہیں۔لیکن یہ منقبت نگاری کی تعریف اور دائرے میں نہیں آتیں جس کی ہم پہلے نشاندہی کر چکے ہیں۔ بلاشبہ دوسرے مذاہب کی شخصیات کی بھی اُن مذاہب کو ماننے والوں نے نظمیں لکھی ہیں جوعقیدت اوراحترام سے عبارت ہیں انہیں منقبت کے علاوہ مذہبی شاعری Religious poetry کے ذیل میں رکھا جاتا ہے۔

واضح رہے مذہبی مدحیہ نظموں کا انداز کم وبیش ایک سا ہوتا ہے اِن میں مذہبی شخصیات سے عقیدت کا اظہار، اُن کے شخصی اوصاف، اخلاق اور کارناموں کا بیان ہوتا ہے۔اُردو میں غیر اسلامی مذاہب پر ہونے والی شاعری پر بھی اسلامی اسالیبِ شعر کے یہ اثرات نمایاں ہیں مثلاً ’’ثنائے بہا‘‘ (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) ڈاکٹر صابر آفاقی کی پوری کتاب اُن کے مذہبی رہنما علی محمد باب (بہائی مذہب کے بانی) پر ہے مگر ان شعر پاروں کا فکری وفنی پیرایہ نعت نما ہے۔انھوں نے قرۃ العین طاہرہ اور’سوانح علی محمد باب‘ پر بھی کتابیں لکھی اسی طرح اردو کے بعض شاعروں نے دوسرے مذاہب کی شخصیات پر بھی سینکڑوں نظمیں اردو شاعری میں ملتی ہیں۔مثلاً یہ چند کتابیں دیکھیے:

’’المزامیر نظم‘‘ مشن اسٹیم پریس، لدھیانہ، 1915 / سبد اورغزلین : اے بی نیوٹن پادری، مشن اسٹیم پریس، لدھیانہ، ۱۹۲۰ /لڑکوں کا گیت مالا: لکھنو، ۱۸۷۲ء/مجموعہ غزلیات ،مشن پریس الہٰ آباد، ۱۹۴۶ء/ پریم ساگر (منظوم) فرحت شنکر دیال، مطبع ثمر ہند، ۱۲۸۰ھ/گیا مہاتم (منظوم)ادمان پت/ بھاگوت (منظوم) رام چندر داس، انتظامی پریس کانپور، ۱۹۱۱ء/شیو سیسر نام(منظوم) شنکر دیال ۱۲۹۱ھ/سمت نرائن کتھا (منظوم)لکھنو ۱۸۸۶ء/ رامائن نظم کالکا پرشاد،نول کشور/ سندھیا مترجم (منظوم) کیول کشن ، دھرم پرچارک پریس، جالندھر، ۱۹۰۲ء/ نئے گیت گاؤ (کیسٹ) میں ’مذہبی نظمیں‘ کے عنوان سے عیسائیوں کے مذہبی گیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔مگر یہ شاعری مناقب کے عنوان کے تحت زیرِ جائزہ نہیں آتی۔

ضمیمہ

۱) جنم کنھیا جی

ہیں ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اُس منڈل میں ہر من بھیتر سُکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات کتھا کی بھولے ہیں جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند منڈیلی باجت ہیں نت بھون اُجالا ہوتا ہے

یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اِس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم (۳۵۶)

۲) بالپن بانسری بجیا

یارو سنو یہ مدھ کے لٹیّا کا بالپن
اور مدھ پوری نگر کے بسیّا کا بالپن
موہن سروپ کرت کریّا کا بالپن
بن کے گوال گووَں چریّا کا بالپن
ایسا تھا بانسری کے بجیّا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنھیّا کا بالپن (۳۶۲)

۳) بانسری

جب مُرلی دھرنے مُرلی کو اپنی ادھر دھری
کیا کیا پریم میت بھری اِس میں دُھن بھری
لی اُس میں رادھے نام کی ہر دم بھری کھری
لہرائی دُھن جو اُس کی ادھر اور اُدھر دری
سب سننے والے کہہ اُٹھے ’’جے جے ہری ہری‘‘
ایسی بجائی کشن کنھیّا نے بانسری (۳۶۹)

۴) لہو ولعب کنھیّا

تعریف کروں میں اب کیا کیا اُس مرلی دھر بجیّا کی
نِت سیوا کنج پھریّا کی اور بُن بَن گیو چریّا کی

گوپال بہاری بنواری دکھ بھرنا مہر کریّا کی
گردھاریِ سندر شیام برن اور پنڈر جوگی جیّا کی (۳۷۱)

۵) شادی کنھیّا

جہاں میں جس وقت کشن جی کی اوستا سدھ بدھ کی یارو آئی
سنبھالا ہوش اور ہوئے سیانے وہ بالپن کی ادا جلائی
ہوا قدر اُن کا کچھ اس طرح سے کہ مرجس کی فدا کہائی
نکالیں طرزیں پھر اور ہی کچھ بدن کی سج دھج نئی بنائی
ہوئی خوشیِ نند کے جو من میں ہیں بہت ہوئی خوش جسودا مائی (۳۷۳)

۶) دسم کتھا

اے دوستو یہ حال سنو دھیان رکھ ذرا
اور ہر طرف سے دھیان کے تیئں ٹک ادھر کو لا
جو چاہے اس کا واسطہ سب کے تیئں بھلا
کہتا ہوں میں یہ اگلے زمانے کا ماجرا
ہے نام اِس بیان کا یارو دسم کتھا (۳۷۵)

۷) ہر کی تعریف میں

مَیں کیا کیا وصف کہوں اس شام برن اوتاری کی
سب کشن کنھیا مرلی دھر من موہن کنج بہاری کی
گوپال، منوہر، سانولیا، گھنشام اٹل بنواری کی
نند لال دلارے سُندر جھمپ برج چند مکٹ جھلکاری کی
گر دھوم لٹیّا ودھ ماکھن رنچھورنوں گردھاری کی
بن کنج پھر یار اس رچن سکھدائی کانھ مراری کی
ہر آن دکھائے روپ نئے ہر لیلا نیاری نیاری کی
پت لاج رکھیّا دکھ بھنجن ہر بھگتی بھگتا دھاری کی
نت ہر بھج ہر بھج ری بابا جو ہر سے دھیان لگاتے ہیں
جو ہر کی آسا رکھتے ہیں ہر اُن کی آس بچاتے ہیں (۳۸۳)

۸)بلدیو جی کا میلا

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے
ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے چنبیلی بیلا ہے
بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہر قصباتی اور گنویلا ہے
زر اشرفی ہے پیسا دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے
بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے (۳۹۳)

۹)مدح نانک شاہ گرو

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یون روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف وکرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا زریاہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس ونوا ارداس کر دا اور ہر دم بولو داہ گرو (۴۰۱)

۱۰)تعریف بھیرون کی

دیکھا ہے جب سے مَیں نے تیرا جمال بھیرون
رکھتا ہوں تب سے دل میں تیرا خیال بھیرون
دنرات ہے یہ میرا تجھ سے سوال بھیرون
اب درد وغم سے آکر مجھ کو سنبھال بھیرون
تیری سرن گئی ہے کر تو نہال بھیرون
اے پرتپال دیوت مدہ مست کان بھیرون (۴۰۵)

۱۱) کنھیا جی کی راس

کیا آج رات فرحت و عشرت اساس ہے
ہر گل بدن کا رنگین و زرّیں لباس ہے
محبوب دلبروں کا ہجوم آس پاس ہے
بزم طرب ہے عیش ہے پھولوں کی باس ہے
ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے(۴۲۶)

۱۲) درگا جی کے درشن کا ایک مصرع دیکھیے:

ع تعریف کروں میں کیا کیا کچھ درگا جی کے درشن کی (۴۰۴)

□□□

صبحِ روزِ اَزَل سے نِرالا تِرا خَطِّ تَقدِیر ہے
تیری آغوش میں نورِ ربِّ دوعالم جَلَّ جَلَالُہٗ کی تنویر ہے
روزِ اَوّل سے جس کو خدا جَلَّ جَلَالُہٗ نے چُنا، بہرِ نورِ خدا
پیکرِ آمنہؓ عِزّ و تمکین کی ایسی تصویر ہے
اذنِ ربِّ جہاں سے ہے مُختارِ کُل ,تیرا نورِ نظر
سارا عالم حقیقت میں اُمِّ نبیؐ تیری جاگیر ہے
عَمَّۃُ المرتضیٰ ، جَدَّۃُ الفاطمہ، اُمِّ خیرُ الوریٰ
خَلق میں یہ فَقَط سیدہ آمنہؓ تیری توقیر ہے

(پیرزادہ محمد ندیم اختر ندیم حنفی القادری)

منقبت کی متنی وسعتیں اور زاویے

ڈاکٹر عزیز احسن

ABSTRACT: The article "The Textual Expanses and Perspective of Excellence" explores the definition and various types of devotional expressions used to pay tribute to leaders, poets, scientists, artists, and others, as well as to offer homage to religious figures. It presents examples of both types of expressions-tribute and homage-along with religious criteria for honoring the Companions of the Holy Prophet Muhammad (S.A.W) and the saints of the Muslim Ummah. The matter of distinction between biographies and hagiographies is also discussed. Additionally, the Urdu word Manqabat has been translated as "Excellence" .

منقبت نگاری دراصل کسی شخصیت کے حسنِ صوری اور جمالِ معنوی یعنی حُسنِ سیرت کی طرف بنظرِ عقیدت دیکھنے کا عمل ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود جمیل ہو کر جمال کو پسند فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیۡلٌ یُّحِبُّ الۡجَمَالO

''اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے''(۱)

اس کے ساتھ ہی انسان کو پسندیدہ اخلاق کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اِس ضمن میں **تَخَلَّقُوا بِاَخۡلَاقِ اللّٰہِ**......اللہ تعالیٰ کے اخلاق کی پیروی کی جاوے، بھی کہا جاتا ہے۔(۲)

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آدم کو صورتِ رحمٰن پر بنایا گیا ہے۔ '**ان اللہ خلق آدم علی صورۃ الرحمٰن**' (بے شک اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو صورتِ رحمٰن پر پیدا فرمایا ہے۔(۳)

مزید برآں اللہ نے اپنے بندوں کو الوہی رنگ میں رنگ جانے (دینِ فطرت میں ڈھل جانے)

کی ہدایت بھی کی ہے...... ''صِبْغَةَ اللهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً'' (البقرۃ ۲، آیت ۱۳۸) [ہمارے اوپر] اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے بہتر کون رنگ [دینے والا] ہے.......... تقدیرِ کلام یوں سمجھی گئی ہے...... صِبْغَةَ اللهِ صِبْغَةَ [بیضاوی] کانہ قیل صبغنا اللہ صبغہ [ابو سعود] یعنی ہمیں اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور اللہ کے رنگ سے مراد اس کے دینِ فطری یعنی اسلام سے ہے'' (۴)

جمال کے درجے

پروفیسر میاں محمد شریف لکھتے ہیں:

''وحدت اور حرکت کے علاوہ انسانی فکر اور معاشرتی زندگی کے تین خاص پہلو ہیں۔ عقل، جذبہ اور ارادہ۔ مجمل طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقلی پہلو سے مراد علم اور حکمت ہے۔ وحدت اور قدرت کی طرح حق و حکمت بھی ایک صفتِ ربّانی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ایک نصب العین اور بنیادی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ علم و حکمت کی طرح جمال بھی ایک ربّانی صفت ہے اور اس وجہ سے انسان کے لیے بنیادی قدر ہے۔ جس طرح عقل کا نصب العین حق و راستی ہے اسی طرح ہماری زندگی کے جذباتی اور حسی پہلوؤں کا نصب العین ''حُسن'' ہے۔ حُسن کا جلوہ صرف مادی اشیاء ہی میں نہیں بل کہ اس سے زیادہ روحانی صفات میں ہے۔ حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت مل جاتے ہیں تو اُن سے ایک عظیم الشان شخصیت نمودار ہوتی ہے'' (۵)

معلوم ہوا، زندگی کے جذباتی اور حسی پہلوؤں کا نصب العین ''حُسن'' ہے۔ کیوں کہ حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت کے تال میل سے عظیم الشان شخصیت کی نمود ہوتی ہے۔

شاعری، احساسات کی تجسیم کا تخلیقی عمل ہے۔ احساسات میں جذباتِ عقیدت کی آمیزش، کسی حسین شئے یا حسین انسان کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت ہی حُسن سے متأثر ہونے والی بنائی ہے۔ کائنات کے مشہود مناظر میں حُسن ہے اور انسانی فطرت میں ''خیر'' بھی حُسن ہے۔ عالمِ مشہود کو دیکھ کر انسان کے دل میں جذباتِ تحسین پیدا ہوتے ہیں تو ان کے خالق کے لیے ''حمد'' کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ انسانی معاشروں کو انسانی اوصاف میں حُسن کی تلاش ہوتی ہے کیوں کہ اچھے اوصاف ہی ایک اچھا معاشرہ تشکیل دینے کا سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عاقل، صاحبِ ہوش، صحیح الفطرت انسان ہمیشہ ''خیر طلب'' ہوتا ہے اور انسانوں میں جہاں بھی جمالِ خیر نظر آتا ہے وہ

اس سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی استعداد کی حد تک اس کی تحسین کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''سیرت کا حسن دنیا کے تمام دوسرے حسن سے افضل ہے'' (۶)

حُسن کی تحسین کا یہ جذبہ جب شاعری میں ڈھلتا ہے تو مذہبی ادب میں وہ ''حمد''، ''نعت'' اور ''منقبت'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشروں میں خیر پھیلانے کے لیے نظامِ نبوت قائم فرمایا اور انسانی خوبیوں کی اعلیٰ ترین مثال پیش کرنے والے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرما کر ''جمالِ خیر'' کا مثالیہ (Model) ، دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ پھر نبوت کا سلسلہ مختتم فرمایا تو ، امتِ مسلمہ کو''خیرِ امت'' قرار دے کر، قیامت تک اسے اعمالِ حسنہ کا جمال دکھانے کے لیے''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا فریضہ سونپ دیا۔ اس طرح معاشرے کو دینی اقدار سے روشناس کروانے اور اعلیٰ اقدار کی نگہداشت کرنے والے تمام طبقات لائقِ ستائش ہو گئے۔ جب کسی کی سیرت میں دینی اقدار کا جمال ظاہر ہوتا ہے تو اس شخصیت کی ستائش کا جذبہ،عقیدت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ''منقبت'' ایسے ہی اظہاریئے کو کہتے ہیں۔

''منقبت'' کی تعریف

مَنْقَبَۃٌ .... مادہ ......ن ق ب ......النَّقَبَۃ۔ پہاڑی راستہ، دو گھروں کے درمیان کا تنگ راستہ ۔دیوار۔اچھا کام ۔قابلیت ۔خوبی۔[جمع]مَنَاقِبُ . . . مَنَاقِبُ الْاِنْسَانِ......انسان کے عمدہ خصائل اور ستودہ اخلاق (۷)

منْقَبَت ْ(فت م، سک ن، فت ق، ب) امث ......تعریف وتوصیف، مدح وثنا؛ مراد: بزرگانِ دین، اولیاء اللہ کی مدح کے اشعار......شبلی نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ لفظ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کے لیے بھی لکھا ہے...... ''یمن کے ایک بادشاہ کی طرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی منقبت میں پورا قصیدہ منسوب کیا گیا ہے۔ (۸)

کتب احادیث کے مترجمین نے مناقب کے لیے انگریزی مترادف کے طور پر لفظ "Excellences" لکھا ہے۔

منقبت نگاری کے مختلف زاویئے

عام شخصیات کی ستائش

دنیاوی زندگی میں جس شخص نے بھی معاشرے کو کسی خیر سے آشنا کیا یا کسی خاص شعبہء حیات

میں کوئی کارنامہ انجام دیا، کوئی مفید فلسفہ دیا، سائنسی میدان میں کسی نئی دریافت سے انسانیت کو فائدہ پہنچایا، یا شعر و ادب کے قابلِ ذکر نمونے چھوڑے، وہ شخص بلا لحاظِ مذہب، بنی نوعِ انسان کے لیے قابلِ ذکر ہو گیا۔ ایسے عام انسانوں کے کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے تذکرے یعنی Biographical تحریریں لکھی جاتی ہیں۔ اس قسم کے تذکرے دنیا کی ہر زبان میں لکھے جاتے رہے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ عام انسانوں میں اعلیٰ سیرت کے نمونے پیش کرنے والوں کے تذکار بھی خراجِ تحسین (Tribute) کا موجب بنتے آئے ہیں۔

عام انسانوں کی سیرت اور ان کے کارناموں کے لحاظ سے نثری تحریریں (Biographical Writings) بے شمار لکھی جاتی رہی ہیں۔

''خراجِ تحسین'' (Tribute)

Tribute کے معنی ہیں: نذر، کسی شخص یا واقعہ کی یاد میں کہی گئی اچھی باتیں یا کیے گئے کام۔(۹)

The word "tribute" has several meanings depending on the context:A Show of Respect or Admiration – Something done, said, or given to honor someone or something.Example: "The award was a tribute to his hard work."A Payment or Gift – Historically, a payment made by one nation or ruler to another as a sign of dependence or submission. Example: "The ancient kingdom paid tribute to the emperor. Acknowledgement in words or action of gratitude, admiration or respect. (10)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ستائش فرمائی ہے

سنتِ الٰہیہ یہ رہی ہے کہ جس شخص نے بھی انسانی زندگی میں بہتری لانے کی غرض سے کچھ حکیمانہ نِکات پیش کیے ہیں یا کسی نوع کی خیر خواہی کا ثبوت دیا ہے، اس کا ستائشی ذکر قرآنِ کریم میں فرما دیا گیا ہے۔ مثلاً لقمان حکیم جو ایک سیاہ فام غلام تھے، لیکن حکمت و دانائی سے لبریز گفتگو فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کیں، قرآنِ کریم میں محفوظ کر دی گئیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے جس حکمت کا مظاہرہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اس حکمت و دانائی کے حوالے سے صاف فرما دیا ''ہم نے لقمان کو دانائی بخشی''۔(۱۱)

اسی حکمت کے تحت انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ بیٹے ''اللہ کا کسی کو شریک نہ کرنا۔ بیشک شرک بڑا ظلم ہے۔(۱۲)

قرآنِ کریم میں ایک پوری سورۃ کا عنوان ہی ''الکھف'' ہے، جس میں ان مقدس ہستیوں کی تحسین کی گئی ہے جنھوں نے ایک بت پرست جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہتے ہوئے کھل کر ''توحید'' کا اعلان کیا اور پھر غار میں پناہ لی ۔ اصحابِ کھف کا یہ ذکر بھی ان کے مناقب (Excellences) کے ذیل میں آتا ہے۔۔(۱۳)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کا ذکر کیا ہے جس نے ایک قوم کے لیے، یاجوج ماجوج کے فتنوں سے محفوظ رہنے کی غرض سے، فولادی دیوار تعمیر کروادی تھی۔ یہ ذوالقرنین بھی کوئی نبی نہیں بل کہ اللہ کا کوئی شکرگزار بندہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے بادشاہی عطا کی تھی۔ ذوالقرنین کا یہ قول بھی اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا............[ذوالقرنین نے]''کہا یہ [بھی] میرے پروردگار کی ایک رحمت ہی ہے''(۱۴)

چیونٹی لائق ذکر ٹھہری

اللہ تعالیٰ نے تو ایک چیونٹی کی اس بھلائی کا بھی ذکر فرمادیا جو اُس نے دوسری چیونٹیوں کے ساتھ برتی، بل کہ ایک پوری سورۃ کا نام ہی ''النمل'' رکھ دیا............قَالَتْ نَمْلَةٌ ''يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْن(۱۵) (ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں روند نہ ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو)(۱۶)

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ خیر اور بھلائی کے جذبے سے سرشار کسی بھی مخلوق کے کسی فعل کو وزن و وقار عطا فرماتا ہے، انسان تو پھر بھی اشرف المخلوقات ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جس شخص نے چشم زدن میں تختِ سبا پہنچا دیا تھا اللہ تعالیٰ نے سورۃ النمل کی آیت ۴۰ میں اس کا ذکر بھی فرمایا ''قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ'' مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ'' (النمل ۲۷، آیت ۴۰) (ایک شخص جس کے پاس کتاب کا ایک علم تھا، اس نے کہا میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے اسے (ملک سبا کا تخت) لائے دیتا ہوں۔(۱۷)

اب ذرا ''ستائشی''، Tributary لوازمہ (Matter) ملاحظہ فرمائیے:

منقبت یا ستائشی لوازمہ، منثور (Prosaical) بھی ہوسکتا ہے اور منظوم (Poetical) بھی۔ اس لیے پہلے ذرا منثور ستائشی لوازمے کا تعارف کروادیا جائے:

۴۵ تا ۵۰ عیسوی کے درمیان، یونان میں پیدا ہونے والا پلوٹارک (Plutarch)، ایک ایسا ہی مصنف تھا جس نے نوجوانوں کی سیرت سازی کی غرض سے ''مشاہیرِ یونان و رومہ'' کے نام سے کتاب

لکھی۔ بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے پلوٹارک کی کتاب کی جلد اول کے اردو ترجمے کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہا:

''بعض کا خیال ہے کہ صرف مذہبی تعلیم ہی سے اخلاق درست ہو سکتے ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ اخلاق کی کتابیں پڑھانے اور وعظ و پند کے ذریعے سے اخلاق سکھا سکتے ہیں۔لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلا طریقہ حکم وفرمان پر مبنی ہے اور بہت طبائع اسے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور اس لیے اکثر محروم رہ جاتی ہیں۔ اور دوسرا طریقہ بے مزہ اور روکھا پھیکا ہے۔ خصوصاً نوجونوں کی طبیعتیں اس سے بھاگتی ہیں اور واعظوں کے وعظ اور ناصحوں کی نصیحتیں رائیگاں جاتی ہیں۔ ایک تیسری تدبیر اصلاحِ اخلاق کی'' صحبت '' ہے۔ بے شک یہ ایک کارگر اور مؤثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے کامل نمونے کہاں نصیب ہوتے ہیں............اب صرف ایک ہی طریقہ باقی ہے جو مؤثر بھی ہے، دل کش بھی ہے اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرتا ہے اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے حالات پڑھنے کے لیے دیئے جائیں، جنھوں نے دنیا میں ایسے بڑے بڑے کام کیے جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ بشرطیکہ ان کا لکھنے والا اس گُر سے واقف ہو............ پلوٹارک کو انسانی سیرت اور باطن کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا زندہ تصویریں ہمارے سامنے موجود ہیں اور تھوڑی سی دیر کے لیے ہم خود اپنے اردگرد کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔''(۱۸)

دنیا بھر کی زبانوں میں ایسی بے شمار کتب لکھی گئی ہیں جن میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارنامہ انجام دینے والوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

مائکل ایچ ہارٹ (Michael H.Hart)

مائکل ایچ ہارٹ نے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق نابغوں کا تذکرہ لکھا جسے ہم Biographical Narrative یا' ستائشی'' (Tributary) تحریریں بھی کہہ سکتے ہیں۔لیکن عجیب بات کہ اس نے اپنے تذکرے میں مقدس ہستیوں کے لیے خراجِ عقیدت (Homage) بھی پیش کیا ہے جن میں:

پہلا نمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ہے......تیسرے نمبر پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں..........چوتھے نمبر پر بدھا......اور ۵۲ [باون] نمبر پر حضرت عمر ابنِ خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو پہلا نمبر دینے کا جواز وہ اس طرح پیش کرتا ہے:

"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels." (19)

''دنیا کی سب سے زیادہ با اثر شخصیات کے تذکرے میں محمد (ﷺ) کو پہلا نمبر دینے پر قارئین کو تعجب ہوگا اور کچھ دوسرے لوگوں کی طرف سے سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ (محمد ﷺ) تاریخِ عالم میں واحد ہستی ہیں جنھیں مذہبی اور دنیاوی سطح پر یکساں کامیابی ملی''

ایسا ہی نوٹ مائکل ایچ ہارٹ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر میں دینا پڑا:

"It may occasion some surprise that 'Umar ....a figure virtually unknown in the West ....has been ranked higher than such famous men as Charlemagne and Julius Caesar. However, the conquests made by the Arabs under 'Umar', taking into account both their size and their duration, are substantially more important than those of either Caesar or Charlemagne." (20)

''عمرؓ جو مغرب میں غیر معروف ہیں ان کو چارلیمان اور جولیس سیزر پر ترجیح دینے پر بھی تعجب کیا جاسکتا ہے۔ تاہم عمرؓ کے عہد میں عربوں کی فتوحات کے دائرے کی وسعت اور پائداری زیادہ اہم ہیں بہ نسبت سیزر اور چارلیمان کے''۔

جان کیننگ (John Canning) نے بھی سو مشاہیر کا تذکرہ لکھا ہے، جس میں [۱] سائنس دانوں اور موجدوں [۲] لکھاریوں اور شعراء [۳] رہنماؤں اور مصلحین [۴] فنکاروں اور موسیقاروں [۵] عظیم خواتین [۶] دریافت کنندگان اور متلاشیانِ حقائق [۷] سپاہیوں اور سیاست دانوں کا تذکرہ کیا ہے۔

جان کیننگ (John Canning) نے حضورِ اکرم ﷺ کا نام رہنماؤں اور مصلحین کے ذیل میں رکھا ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا تذکرہ بہت حد تک مبنی بر صداقت کیا ہے، مثلاً، وہ لکھتا ہے:

"Allahu Akbar! La Ilaha Ill' Allah! Mohammad Ur-Rasul Ullah!" God excelleth in greatness! There is no God but the one true God! Mohammad is the Messenger of God".
The cry from the minarets echoes down the centuries. In these words for thirteen hundred years the glory and greatness of God has been extolled throughout the East. In these words the heavenly reminder has been proclaimed, and a continual respite sounded amidst the daily hubbub of human affairs"(21)

ترجمہ: ''اللہُ اکبر! لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ''......اللہ عظیم ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ میناروں سے بلند ہونے والی یہ صدا صدیوں سے گونج رہی ہے۔ ان الفاظ میں تمام مشرق میں، اللہ کی عظمت و بزرگی اور بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے آسمانی یاددہانی کا اعلان کیا جاتا ہے اور انسانوں کو دنیاوی معاملات کی روزمرہ کی ہلچل اور افراتفری سے منہ موڑ کے، مسلسل سکون کی طرف آنے کی صدادی جاتی ہے''۔

جان کیننگ کے اس بیان کو اظہارِ عقیدت (Homage) کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لکھاری نے بھی تاریخ اسلام سے صرف کمال عطاترک کو ''خراجِ تحسین'' (Tribute) پیش کیا ہے:

"He [Kemal Ataturk] alone was strong enough to save Turkey from extinction both during and after the First World War. He alone braved the might of the Allies and outwitted them by his cunning. He alone had the genius to rebuild his shattered country on new and enduring foundation.....He died in November, 1938. History will record him as a ruthless dictator, but also as the greatest figure in modern Turkish history, a man second to none in love of his country, a general and diplomat of genius, and, above all, as the savior of a land that had fallen into ruin. The new Turkey is his monument."(22)

ترجمہ: ''وہ [کمال عطاترک] اکیلا اس قدر مضبوط تھا کہ اس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹنے سے بچالیا۔ وہ اکیلا ہی اتحادیوں کی طاقت سے ٹکرایا اور اپنی چالاکی سے انھیں مات دی۔ وہ تنِ تنہا اس صلاحیت کا مالک تھا کہ اس نے اپنی تباہ حال قوم کو نئے انداز اور پائیدار بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا............وہ نومبر ۱۹۳۸ء میں فوت ہوا۔ تاریخ اسے ایک بے رحم آمر کے طور پر یاد کرے گی لیکن ساتھ ہی جدید ترکی کی تاریخ کی عظیم شخصیت بھی اُسی کی ذات کو تسلیم کرے گی۔ ایک

ایسا انسان جو حبِ وطن کے ضمن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ایک جنرل، ایک نابغہ سیاست کار اور سب سے بڑھ کے ایک تباہ ہونے والے علاقے کو بچانے والا واحد انسان۔ نیا ترکی اسی کی نشانی ہے''۔

دنیاوی بادشاہوں میں جس نے بھی انسانی خدمت اور عاجزی کی مثالیں قائم کیں اس کا تذکرہ بڑے احترام سے کیا گیا۔ اموی خاندان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ہمیشہ رحمۃ اللہ علیہ کہا اور لکھا گیا۔ مغلیہ سلطنت کے سربرآراؤں میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ایران کے غیر مسلم بادشاہ نوشیرواں، ہندوستان کے جہانگیر اور ترکی کے سلطان مراد کے عدل کے چرچے بھی خوب ہوتے رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی فارسی مثنوی ''رُموزِ بیخودی'' میں دولتِ عثمانیہ کے سلطان، ''مراد'' کی عدل پسندی کی تعریف کی ہے۔ ''تذکرہ نگاری'' کی اقسام میں، عام انسانوں کی تعریف کرنے کا عمل خراجِ تحسین (Tribute) کے ذیل میں آتا ہے۔

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت کبھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نور نہیں کر سکی ہے جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم مانے گئے ہیں............ہم میں ایسے اکابر گزرے ہیں، آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے، جن کے ہاتھ میں موت کی حیثیت کھلونے کی رہی ہے اور رہے گی۔ بڑا انسان اپنی شکست میں زندہ رہتا ہے''(۲۳)

تحسینی (Tributary) نظموں کے نمونے

محمد بن احمد عاجز(گیارھویں صدی ھجری اور سترھویں صدی عیسوی)نے سلطان محمد عادل شاہ کو خراجِ تحسین (Tribute) پیش کیا ہے:

تو سلطاں محمد سو عادل ہے شاہ | تو حاکم ہے اسلام کا دیں پناہ
توں خوش خلق ہے انبیا اتقیا | اسم با مسمّا دیا تجہ دیا
بزرگی سلیماں کوں حاتم تھی تھا | سخاوت منے ختمِ حاتم تھی تھا
سخاوت منے مصطفیٰ خاں تمام | شجاعت منے رُندلا سا غلام
عدل داد میں ہے تو ثانی عمر | دنیاں میں کہاوے نہ کوئی تجہ بغر
ہے تعریف کرنے میں عاجز زباں | یو عاجز زباں تھی نہوسی بیاں (۲۴)

غالب کی وفات پر مولانا حالی نے مرثیہ لکھ کر اُسے خراجِ تحسین (Tribute) ہ پیش کیا:

ایک رشن دماغ تھا نہ رہا　　شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب　　کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم　　لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے　　ہے ادب شرط ، منہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت　　خاک کو آسماں سے کیا نسبت

یہ مرثیہ سوزِ غم کی تصویر تو ہے ہی، قصیدے کی سی شان بھی رکھتا ہے۔ غالب کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔(۲۵)

اِسی طرح الطاف حسین حالی نے ایک طبیب حکیم محمود خان دہلوی کا مرثیہ لکھتے ہوئے ان کے اوصافِ جلیلہ کا تذکرہ کیا اور ان اوصاف کی تحسین کی:

جمع ہوں محمود خاں کے، ذات میں ان کی کمال　　ہے یہ سب ممکن، مگر محمود خاں ملنا محال
ہو رہا تھا جبکہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں　　کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں
ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کنواں　　بال سے باریک تر تھی راہ ان کے درمیاں
مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ　　عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ
مجرموں کے حرم پر دیوار و در تھے سب گواہ　　پر نہ تھا کوئی شفیع ان کا کہ جو تھے بے گناہ
ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُس نے کی　　اہلِ انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی
(۲۶)

حالی نے سید احمد خاں کی مدح بھی لکھی تھی جو نا تمام رہی:

سر سبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں　　فتوؤں سے قوم کی گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا　　یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
وار اس پہ قوم کے ہیں، وہ قوم کی سِپَر ہے　　قوم اس سے بد گماں ہے وہ قوم پر فدا ہے
ہمدرد قِوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا　　یہ درد اس کو جد کی میراث سے ملا ہے
تعلیم کی تمھاری بنیاد اس نے ڈالی　　ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ　　سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے (۲۷)

مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۰۷ء میں سر سید مرحوم کو خراجِ تحسین (Tribute) پیش کرتے ہوئے لکھا:

بیاں کس طرح ہو اے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو　　ہمارے عاشقِ دلدادہ تم ہو دلربا تم ہو
تمھارے جذبۂ دل کا اثر اب تک نمایاں ہے　　فدا ہے تم پہ کالج ، کیوں کہ کالج پر فدا تم ہو

جنھیں احساس ہے قومی محبت کا وہی جانیں نہیں معلوم جس کو، کیا کہیں اس سے سوا تم ہو
حسین ابنِ علی کا تم سکھاتے ہو سبق ہم کو کہ کالج کے محرم میں بھی یادِ کربلا تم ہو
یداللہ چوم کر جب تک تم آنکھوں سے لگاتے ہو تو ہم ہرگز نہ مانیں گے کہ اب بے دست و پا تم ہو
(۲۸)

علامہ شبلی نعمانی نے عدلِ جہانگیری کو خراجِ تحسین (Tribute) پیش کرتے ہوئے لکھا:

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آنکلا گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن
مفتیٔ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام 'خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن'
وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص قتل کا حکم جو رُک جائے تو ہے مستحسن (۲۹)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۶ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اُسے جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حُبِّ وطن کچھ کیف پیدا کرسکے دَور میں یونہی اگر یہ ساغرو مینا رہا
علتِ دیریں سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں گوشِ شنوا ہے، نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا
ہر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا (۳۰)

فیض احمد فیض نے علامہ اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا:

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر آیا اور اپنی دھن میں غزلخواں گزر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے اور اس کی لَے سے سینکڑوں لذّت شناس ہیں
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تُند و تیز اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز (۳۱)

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی پہلی برسی کے موقع پر، حسن حمیدی نے انھیں خراجِ تحسین (Tribute) پیش کیا:

تری عظمت کے گلاب..........کون رکھ سکتا ہے شعلوں کے بگولوں کے
حساب..........تیری عظمت کے گلاب..........مقتلِ صبحِ بہاراں میں بہ صد

نکہت و رنگ ....حسن برساتے ہوئے اب بھی گزرجاتے
ہیں..........تیرے اشکوں کے چراغ..........دامنِ دشت میں گزری ہوئی
راتوں کے سراغ..........تیرے اشکوں کے چراغ..........شمعِ احساس کو
بیدار گہہِ طوفاں میں ....رسم و آئینِ شبِ تاربتا جاتے
ہیں..........تیری محبوب زباں..........جیسے اک جنس ہو، آماجگہِ
سودوزیاں..........تیری محبوب زباں..........آج بھی سینۂ ظلمات میں سہمی
ہوئی لَو......(۳۲)

یہ اور ایسے بے شمار شعری نقوش ہیں جو تاریخِ ادب میں محفوظ ہیں۔ یہ شاعری کا وہ ستائشی (Tributary) نمونہ ہے جس میں عام انسانوں کو ان کے کارناموں اور حُسنِ کارکردگی کی بنا پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ منقبت نگاری کی ایک عام صورت یہ بھی ہے لیکن اسے منقبت نگاری نہیں بل کہ ستائشی اظہاریہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ ستائشی اظہاریہ بے بنیاد ہو۔ اس کی بنیاد تو خود رب تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں عام لوگوں کی ستائش فرما کے، اہلِ قلم کے لیے راہ ہموار کردی ہے، جس کے کچھ حوالے ہم پیش کر آئے ہیں۔

منقبت (Excellence)

منقبت ،صرف ایسی ہستیوں کے لیے لکھی جاتی ہے جو کسی نہ کسی طور عملاً مذہب سے جڑی ہوئی ہوں۔ اس لیے اس نوعیت کی شاعری میں اولیت اس منظوم خراجِ عقیدت (Homage) کو حاصل ہے جو نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اصحاب رضوان اللہ علیہم ، اُمہات المؤمنینؓ اور اصطلاحی ''اہلِ بیت''ؓ کی مدح سرائی میں ہو۔

ان مقدس ہستیوں کی منقبت کی بنیاد [۱] قرآن کی متعلقہ آیات ۔[۲] مستند احادیث ۔[۳] آثارِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور [۴] مستند تاریخی ماخذات پر رکھنی ضروری ہے۔

قرآنِ کریم کی چند آیات کے تراجم

۱۔ ''اور جب اُن [منافقوں] سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ [صحابؓ] ایمان لے آئے تم بھی ایمان لے آؤ، تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بیوقوف ایمان لے آئے ہیں، اُسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟ سن لو کہ یہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے'' (۳۳)

یہاں صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ایمان ہی معیاری قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ ’’اور ان سے کہہ دو کہ عمل کیے جاؤ۔ خدا اور اس کا رسول اور مومن، سب تمھارے عملوں کو دیکھ لیں گے‘‘۔(۳۴)

یہاں منافقوں کے اعمال کی نگرانی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم کو شامل کیا جا رہا ہے، کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ساتھ، وہ بھی، منافقوں کے اعمال کی جانچ میں شریک ہوں گے۔

۳۔ ’’اور جو شخص سیدھا رستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں [صحابہ کرامؓ] کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اُسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور قیامت کے دن جہنم میں داخل کریں گے‘‘(۳۵)

یہاں مومنوں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم کا راستہ اختیار نہ کرنے پر جہنم کی وعید ہے۔

۴۔ ’’بے شک تمھارا دوست [رفیق] تو اللہ اور اس کا رسول ہی ہے اور وہ ایمان والے ہیں [جن کی توجہ ہمیشہ اللہ اور رسول کی طرف رہتی ہے] جو نماز کے پابند ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا کے سامنے [ہر حال میں] عاجزی سے جھکتے ہیں۔(۳۶)

یہاں نومسلموں سے کہا جا رہا ہے کہ تمھارے دوست اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم بھی ہیں۔

۵۔ ’’اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو دوست رکھے [تو یہ اللہ کی جماعت میں داخل ہو گیا] سو اللہ والوں کی جماعت ہی غالب رہے گی‘‘(۳۷)

یہاں اللہ تعالیٰ کی جماعت میں داخلے کے لیے، صحابہ کرامؓ سے دوستی [یعنی ان سے الفت] رکھنا بھی ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔

۶۔ ’’آپ ان لوگوں کو جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ایسا نہ پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، خواہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے خاندان ہی کے لوگ کیوں ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے۔(۳۸)

یہاں صاف بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے دلوں میں ایمان ثبت فرما دیا ہے۔

۷۔ ’’اور [اے رسول!] جب آپ کے پاس ہماری آیتوں کو ماننے والے [صحابہ] آئیں تو [ان سے] کہہ دیجیے، تم پر سلام ہو، تمھارے پروردگار نے اپنے آپ پر [تمھارے لیے] رحمت لازم کر رکھی ہے۔(۳۹)

یہاں صحابہ کرامؓ کو سلامتی کا پیغام دینے کی تاکید ہے نیز یہ خبر بھی دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے آپ پر ان کے لیے ''رحمت'' لازم کر لی ہے۔

۸۔ ''مومنوں [صحابہؓ] میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جس بات کا عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا۔ پھر بعض نے تو اپنی ذمہ داری کو [مکمل طور پر] پورا کر دکھایا [یہ جاں بحق ہوئے، اور ایمان پر قربان ہو گئے] اور بعض وہ ہیں جو [شہادت کے] منتظر ہیں اور [اپنے عہد و پیمان میں] ذرا نہیں بدلے(۴۰)

اس آیتِ کریمہ میں صحابہ کرامؓ کی انتہائی درجہ تحسین فرمائی جارہی ہے۔

۹۔ [صلح حدیبیہ کے موقع پر] ''جب کفار نے اپنے دلوں میں ضد اور ضد بھی جہالت کی ضد کو جگہ دی [وہ اسی پر اڑے تھے کہ ان کی شرائط کو قبول کیا جائے، حضورؐ قبول فرما رہے تھے، لیکن جاں نثار صحابہؓ ان شرائط سے خوش نہ تھے، لیکن صبر اور تحمل اور فرماں برداری کا نمونہ بنے ہوئے تھے] تو اللہ نے [ان کے ادبِ بیت اللہ اور اطاعتِ رسولؐ کو پسند فرمایا اور] اپنے رسولؐ اور مومنوں [صحابہ کرامؓ کے قلوب] پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو [ایک محتاط اور] پرہیز گاری کی بات پر قائم رکھا [وہ جہالت کے مقابلے میں حوصلہ اور تحمل سے کام لیتے رہے اور اللہ کی وحدانیت، رسول کی اطاعت کو اپنے ہر جذبہ و جوش پر مقدم سمجھتے رہے] اور وہی اس [اندازِ اتباع کے زیادہ مستحق اور [تحمل اور بردباری] کے اہل تھے۔ [انھیں کو اللہ نے حضورؐ کی رفاقت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یہی صحابہ بننے کے حق دار تھے] اور اللہ ہر چیز سے خبر دار ہے [وہ سب کی صلاحیتوں سے واقف، ان کی کیفیات، سے آگاہ ہے](۴۱)

اس آیتِ کریمہ میں بھی صحابہ کرام کی شان، اخلاصِ عمل اور جاں نثاری کے جذبے کی تحسین ہے۔

۱۰۔ ''یقینا اللہ مومنوں [صحابہ کرامؓ] سے خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے آپؐ سے [جہاد کے لیے] بیعت کرتے تھے، پس اللہ نے [وہ صدق و خلوص] جو ان کے دلوں میں تھا جان لیا پھر [اگر صلح حدیبیہ کے شرائط کی وجہ سے ان پر گرانی تھی تو وہ بھی اللہ نے دور فرمادی اور] ان [کے دلوں] پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو [حدیبیہ سے آنے کے بعد ہی خیبر کی] جلد ہی فتح انعام فرمائی''۔(۴۲)

۱۱۔ ''بلاشبہ جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے اپنی آواز پست رکھتے ہیں [اور دبی آواز میں بولتے ہیں] وہی لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقویٰ [بزرگی اور پاکیزگی] کے لیے آزمالیا [اور منتخب کر لیا ہے] ان کے لیے [اللہ کی طرف سے] بخشش اور عظیم اجر ہے''۔(۴۳)۔

''(جانِ عالم) محمد، اللہ کے رسول ہیں اور (وہ سعادت مند) جو آپ کے ساتھی ہیں، کفار کے

مقابلے میں بہادر اور طاقتور ہیں، آپس میں بڑے رحم دل ہیں، تو دیکھتا ہے انھیں کبھی رکوع کرتے، کبھی سجدہ کرتے ہوئے، طلب گار ہیں اللہ کے فضل اور رضا کے، ان کے (ایمان وعبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے، یہ ان کے اوصاف تورات میں مذکور ہیں۔ نیز ان کی صفات انجیل میں بھی مرقوم ہیں (یہ صحابہ) ایک کھیت کی مانند ہیں جس نے نکالا اپنا پٹھا پھر تقویت دی اس کو پھر وہ مضبوط ہوگیا پھر سیدھا کھڑا ہوگیا، تنے پر اس کا جوبن خوش کررہا ہے بونے والوں کو تاکہ آتشِ غیظ میں جلتے رہیں انھیں دیکھ کر کفار، اللہ نے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے مغفرت کا اور اجرِ عظیم کا''۔(۴۴)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے فضائل میں احادیث

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا''اللہ تعالیٰ نے میرا انتخاب کیا اور میرے لیے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا انتخاب کیا پھر ان میں سے بعض کو میرے لیے وزراء، بعض کو سسرال، بعض کو انصار بنایا۔ جو ان کو گالیاں دیں اُن پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایسے لوگوں سے فدیہ، بدلہ قبول نہ فرمائے گا۔(۴۵)

اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف''نور'' کی تشبیہ کے ذریعے کروایا ہے (ترجمہ: اللہ کی ہستی آسمان و زمین کی روشنی [نور] ہے، القرآن: ۲۴:۳۵) اور اپنے نبی علیہ السلام کو بھی''نور'' فرمایا ہے......ترجمہ: بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا [محمد رسول اللہ] اور روشن کتاب...(۴۶)

اسی طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھی، نوریں تلازمے کے ذریعے متعارف کروایا ہے۔......میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں جس کی پیروی کروگے، ہدایت یاب ہوگے۔ نجوم کی تشبیہ بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قرآنی سند کی روشنی میں اختیار فرمائی ہے۔ سورۂ النحل کی آیت ۱۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا''وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ''o (اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ پاتے ہیں)(۴۷)۔

قرآن وحدیث میں ملنے والے نوریں تلازمات سے مترشح ہے، کہ اللہ، اس کے انبیاء کرام علیہم السلام اور انبیاء کے سچے پیروکاروں کی رہنمائی میں ہی بنی نوعِ انسان، ظلمت سے نور کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ اس کے برعکس، شیطان ان تمام نوریں سوتوں سے انسانوں کو دور رکھنا چاہتا ہے۔ جو لوگ شیطان کے پیروکار بن جاتے ہیں وہ گمراہی کے قعرِ مذلت میں گرجاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی کوئی بھی آیت ایسی نہیں ہے جس میں جاری صورتِ حال (Current

(situation) کا حوالہ،صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے [بین السطور] ذکر کے بغیر ہو۔ایسا اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد،تنفیذِ دین اور تدوینِ و ترتیبِ کتاب اللہ کا کام اسی مقدس جماعت سے لینا تھا۔

قرآنِ وحدیث کے مستند حوالوں کی موجودگی میں صحابہ کرامؓ کی منقبت کے لیے تخیلاتی فضائل بیان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی منقبت نگاری میں اپنے تعصّبات اور تخیلات کی بنیاد پر افسانہ طرازی(Fictional Narrative) کا اسلوب،لائقِ تحسین ہونے کے بجائے لائقِ نفرین ہوسکتا ہے۔کسی بھی صحابیؓ کے لیے اظہارِ عقیدت،مبالغہ آرائی کے دائرے سے باہر رہنا ضروری ہے، کیوں کہ:

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

(وجودِ انسانی کا ہر مرتبہ ایک حکم رکھتا ہے اس لیے فرقِ مراتب رکھنا ضروری ہے۔مراتب کے ذکر میں مبالغہ کفر تک پہنچا سکتا ہے)

دھیان رہے کہ ہر صحابی کی عظمت اور فضیلت،رسول اللہ ﷺ کی متابعت میں ہے،اس کے سوا کچھ نہیں سرؔوسہارنپوری نے کیا خوب کہا ہے:

بوبکرؓ و عمرؓ، حیدرؓ و عثماںؓ ترے خادم
اے بعدِ خدا محترم و ارفع و اعلیٰ

عقیدت کی اساس

اسلامی تہذیب میں عظیم شخصیات کی نمود کا انحصار ''کامل اتباعِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم'' پر ہے۔کیوں کہ قرآنِ کریم نے نبیء کریم ﷺ کی ذات ہی کو حصر کے ساتھ،حُسنِ سیرت کا انتہائی بلند نمونہ قرار دے کر لائقِ اتباع بتایا ہے۔

''[مومنو!] بے شک تمھارے لیے رسول اللہ [ﷺ کی زندگی] میں بہترین نمونہ ہے [اتباع و پیروی] کا بہترین طریقہ یہیں سے ملتا ہے، البتہ اس نمونے سے فیض حاصل کرنے کے لیے قلبِ مومن چاہیے، یہ نمونہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے ملنے اور یومِ آخرت کے آنے کی امید رکھتا ہے اور اللہ کی یاد کثرت سے کرتا ہے''۔(۴۸)

اس حکم کو مزید محکم بنانے کی غرض سے ایک جگہ فرمایا گیا:

''جس نے رسول کا حکم مانا اس نے اللہ ہی کا حکم مانا[کتاب وسنت لازم و ملزوم ہیں، احکامِ الٰہی کو صحیح طور پر جاننے کے لیے قول وفعل دونوں کا جاننا ضروری ہے اور [اس اعلان کے بعد بھی] جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا[وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے آپ سے ان کی باز پرس نہ ہوگی)۔(۴۹)

خراجِ عقیدت(Homage)

مقدس ہستیوں کے تذکار''خراجِ عقیدت'' کہلاتے ہیں۔خراجِ عقیدت کو انگریزی میں Homage کہتے ہیں۔جس کے معنی ہیں:احترام،تعظیم، اطاعت،عقیدت،خراجِ عقیدت،آداب، تکریم،عہدِ اطاعت،اظہارِعقیدت،اظہارِاطاعت،بندگی،فرمانبرداری،تسلیم، حلفِ وفاداری،عزت،عقیدت کے اظہار کا عمل۔(۵۰)

"Homage" means great respect, honor, or admiration shown towards someone or something. It can be expressed through actions, words, or artistic tributes."

عربی، فارسی اور اردو میں خراجِ عقیدت پر مشتمل نثری تحریروں کو''منقبت'' کا نام دیا جاتا ہے جس کے لیے انگریزی میں Hagiography کا لفظ رائج ہے۔منقبت نگاری کے ذیل میں انبیاء کرام علیہم السلام،صدیقین،شہداء اور صالحین کے اذکار آتے ہیں۔اسلامی ادب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم،اہلِ بیتِ مقدم[ازواجِ مطاہرات]اور اہلِ بیتِ مؤخر[حضرت علی،حضرت فاطمہ،حضرت حسن اور حضرت حسین رضوان اللہ علیہم] نیز اولیائے کرام کو''خراجِ عقیدت'' (Homage) پیش کیا جاتا ہے۔کتبِ احادیث میں''مناقب'' کا انگریزی ترجمہ "Excellence" کیا جاتا ہے۔جیسے بخاری شریف میں لفظ "Excellences"''مناقب'' کے لیے لایا گیا ہے۔(۵۱)

منثور مناقب کے تذکرےHagiographies

نیم تاریخی تذکرے بہت لکھے گئے جن میں بعض بہت زیادہ مشہور ہوئے۔یہ ایسے تذکرے ہوتے ہیں جن میں اپنے ممدوح کی شان میں منثور مناقب کالوازمہ (Matter) ہوتا ہے۔انگریزی لفظ "Hagiography" ایسے ہی تذکرے کو کہتے ہیں جس میں اپنے ممدوح کے محاسن کا تذکرہ عقیدت و احترام کے جذبے سے کیا جائے۔ادبی اصطلاحات کی انگریزی لغت (Oxford Dictionary of

(Literary Terms) میں لکھا ہے:

"The term [hagiography] is now often applied to modern biographies that treat their subjects reverentially, as if they were saints."

''یہ اصطلاح [ہاجیوگرافی] اب اکثر جدید سوانحِ حیات کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں اپنے موضوع (Subjects) یا ممدوحین کو عقیدت مندی سے پیش کیا جاتا ہے...... جیسے کہ وہ ولی یا بزرگ ہوں''۔ ایسے چند تذکرے عربی، فارسی اور اردو میں لکھے گئے ہیں یا عربی فارسی سے اردو میں ترجمہ کی صورت میں شایع کیے گئے ہیں، مثلاً

☆ علامہ محمد بن سعد [کاتب الواقدی] کی تصنیف ''الطبقات الکبیر المعروف بہ طبقاتِ ابنِ سعد''...... جس میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکرِ جمیل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب رضوان اللہ علیہم کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد کے ۱۱۶۰ صفحات ہیں اور دوسری جلد ۱۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

☆ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کی کتاب ''اِزَالۃُ الخِفَاء''، جس میں مقامِ خلافت، خلفائے راشدینؓ کے فضائل و مناقب بتفصیل درج ہیں۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے کل صفحات ۲۳۳۶ ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی کتب ایسی ہیں جن میں نبی علیہ السلام کے اصحاب رضوان اللہ علیہم کے ذکر کے ساتھ ساتھ اخیارِ امت کا بھی ذکر ملتا ہے، جو ''خراجِ عقیدت'' (Homage) کا نمونہ ہے۔ مثلاً

☆ شہزادہ داراشکوہ کی کتاب ''سفینۃ الاولیاء، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک ذکر کے ساتھ خلفائے راشدین، حضرت حسن سے امام مہدی رضی اللہ عنہ تک خانوادۂ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا ذکر ہے، فقہا کرام کا ذکر ہے، سلسلہء قادریہ، سلسلۂ شریفہ خواجگان، چشتیہ، کرویہ، سہروردیہ، متفرقہ، ازواجِ مطہرات و بناتِ طاہراتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم و ذکرِ نساءالعارفات ہے۔

☆ محمود احمد غضنفر کی کتاب، حیاتِ صحابہ رضی اللہ عنہما کے درخشاں پہلو، جس میں جلیل القدر صحابہ کرام کے حالاتِ زندگی بڑی عقیدت و احترام سے، بہت مستند حوالوں کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔

☆ فقیر سید وحید الدین کی کتاب ''محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور محسنین رضی اللہ تعالیٰ عنھم''، لائن آرٹ پریس [کراچی] لیمیٹڈ، کراچی، نقشِ ہشتم، اگست ۱۹۷۰ء، میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیھم کے فضائل کا بیان ہے۔

☆ طالب ہاشمی کی ''تذکارِ صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنھن''، سینکڑوں صحابیات کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا گیا ہے۔
☆ طالب ہاشمی کی کتاب ''شمعِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تیس پروانے رضی اللہ عنہم'' بھی منثور مناقب کا نمونہ پیش کرتی ہے۔
☆ ریحانہ تبسم فاضلی کی کتاب ''حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گھرانہ [بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم]''، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادیوں کے مستند کوائف کے ساتھ بڑی عقیدت و احترام سے لکھی گئی ہے۔
☆ حافظ فضل الرَّحیم کی کتاب، ''خلفائے راشدین رضی اللہ عنھم''، بھی منثور مناقب کی عمدہ مثال ہے۔
☆ مولانا محمد نافع کی کتاب ''رُحَمَآ ءُ بَیۡنَھُم'' کی متعدد جلدیں ہیں جن میں صحابہ کرام کی آپس کی محبتوں کا ذکر کر کے مصنف نے اس مذموم پراپیگنڈے کو ملیا میٹ کر دیا ہے جو دشمنانِ دینِ اسلام کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے۔
☆ مولانا یوسف کاندھلوی کی ''حیاۃ الصحابہ اردو'' کی متعدد جلدیں ہیں، جن میں بیشمار اصحاب رضی اللہ عنہم کا تذکرہ مناقبِ منثور کا درجہ رکھتا ہے۔
☆ ڈاکٹر طٰہٰ حسین رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ'' بھی ایسی ہی نثری مناقبتی کتاب ہے۔
☆ عمران حسین چوہدری، چیئرمین سُنی فاؤنڈیشن، برطانیہ، کی مرتبہ کتاب ''سیدِ ناصدِّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ'' بھی منقبتی نثر کی بہترین مثال ہے۔
☆ مفتی محمد غلام سرور قادری کی کتاب ''افضلیتِ سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ''، سنی فاؤنڈیشن، برطانیہ، مئی ۲۰۱۲ء۔
☆ مفتی علی احمد سندیلوی کی کتاب ''مقامِ سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ''، سنی فاؤنڈیشن، برطانیہ، مئی ۲۰۱۲ء
☆ محمد حسین ھیکل کی کتاب ''حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ''، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۴ء
☆ مولانا محمد نافع کی کتاب ''بناتِ اربعہ''، تخلیقات، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء
☆ ڈاکٹر علی محمد محمد الصَّلابی کی کتاب ''سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ''، مترجم: شمیم احمد خلیل السّلفی، عبدالمعین بن عبدالوھاب مدنی، الفرقان ٹرسٹ، ریاض، سعودی عرب، س۔ن
☆ علامہ اختر فتح پوری کی کتاب ''الصَّوَعِق المحرَّ قہ'' میں صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ مؤخر (یعنی دعا کے ذریعے اہلِ بیت میں شمار کیے جانے والی مقدس ہستیوں) کا ذکر ہے۔ واضح رہے کہ اہلِ بیتِ

مقدم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ازواجِ مطہرات ہیں کیوں کہ قرآنِ کریم میں صرف انھیں ہی ''اہلِ بیت'' فرمایا گیا ہے۔سورۂ ھود ۱۱، آیت ۷۳ ......اورسورۃ الاحزاب ۳۳ کی آیت ۳۳ میں صرف بیویوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

☆ عبدالغنی شیدآ (خطیب) کی کتاب ''اصحابِ رضی اللہ عنہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ......قرآن کی نظر میں'' اسی نوعیت کی تصنیف ہے۔

☆ انیس زکریا کی کتاب ''امیر معاویہ''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۱ء

☆ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کی کتاب ''سرالشھادتین''، اردو ترجمہ سید شاکر القادری، شاہِ ھمدان انٹرنیشنل ٹرسٹ، مظفر آباد، آزاد کشمیر، اشاعتِ دوم: جنوری ۲۰۱۳ء

☆ حکیم محمود احمد ظفر کی کتاب ''سیدنا حسین بن علیؓ''، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۴ء

منقبت کا شعری پیکر

شعری منقبت کا پسندیدہ نمونہ

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیھم السلام اور صالحین کی تعریف فرمائی ہے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی، مختلف مواقع پر اپنے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی تعریف فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ اسلامی معاشرے میں مناقب نگاری کی بنیاد بھی خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ڈلوائی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت ابوبکرؓ کی شان میں کچھ لوگوں کی باتوں کا جب علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

> ''اے لوگو! میری ذات پر مال و جان کے اعتبار سے ابوبکر سے بڑھ کر کسی کا احسان نہیں، جب تم سب نے مجھے جھٹلایا تو ابوبکر نے میری تصدیق کی، اگر میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا خلیل بناتا یعنی اللہ کے علاوہ کسی کو اپنے دل میں خصوصی جگہ دیتا تو ابوبکر اس قابل تھے کہ میں انھیں اپنا خلیل بناتا''......اس خطبے کے بعد نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت حسّان بن ثابت کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''اے حسّان! وہ اشعار سناؤ جو تم نے میرے اور ابوبکر کے بارے میں کہے ہیں''

اس پر حضرت حسّانؓ نے درجِ ذیل اشعار سنائے:

اذا تذکّرتَ شجواًمن اخی ثِقَةٍ فاذکُرْ اخاکَ ابَا بَکرٍ بما فَعَلا

التَّالَى الثَّانىَ المَحمُودَ شَيمَتَهُ — وَاوَّلَ النَّاس طُرّاً صَدّقَ الرّسلا
وَثَانِیَ اثْنَیْنِ فِی الْغَارِ المنیفِ وَقَد — طَافَ العدُوّ بِهٖ اِذْ صَعّ دَا الْجَبَلا
وَكَانَ حِبّ رسول الله قد عَلِموا — مِنَ الْبَرِیّةِ لَمْ یَعْدِلْ بِهٖ رَجُلَا
خَیرُ الْبرِیّةِ اتْقاها وَاَرْافُها — بَعَدَ النّبِیّ وَاوفَها حَمَلا
عَاشَ حَمِیْدًا لِاَمْرِ اللّٰہ مُتّبِعًا — بِھَدْیِ صَاحِبِهِ الْمَاضِیْ وَمَا انْتَقَلَا

ترجمہ: جب تم کسی با اعتماد اور دل سے محبت کرنے والے شخص کے غم کو یاد کرنا چاہو تو تم اپنے بھائی ابوبکرؓ اور ان کے کارناموں کو یاد کرو۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد دوسرا مرتبہ انہی کا ہے۔ ان کے اخلاق قابلِ تعریف ہیں اور وہ لوگوں میں سب سے پہلے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ دشمن نے پہاڑ پر چڑھ کر جس غار کا چکر لگایا تھا اس میں پناہ لینے والے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ دوسرے ابوبکر صدیقؓ ہی تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے محبوب ہیں اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ مخلوق میں کوئی ان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ساری مخلوق میں سب سے زیادہ متقی، پاکباز، وعدے کو پورا کرنے والے اور امانت داری کرنے والے ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ انھوں نے قابلِ تعریف زندگی گزاری، ہمیشہ اللہ کے حکم اور اپنے ساتھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کی اتباع کی اور اس سے کبھی روگردانی نہ کی''......حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ اشعار سنے تو تین مرتبہ فرمایا: ''صدقت یا حسّان! دعوالی صاحبی''......اے حسّان! تم نے بالکل سچ کہا، میرے ساتھی کو بلاؤ''۔ (۵۲)

اسلامی ادب میں منقبت نگاری کا یہ پہلا نمونہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پسندیدگی کی سند حاصل ہوئی اور یوں، اخیار کی تحسین اور ان سے عقیدت کے اظہار کی روش عام ہوئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت حسّانؓ نے بعد ازاں مختلف اصحابؓ کی منقبت میں اشعار کہے، مثلاً، ایک منقبت میں حضرت حسّانؓ نے کفار کے مقابلے میں جماعتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے فضائل اور کارناموں کا ذکر صغیۂ جمع ''ہم'' کہہ کر کیا ہے:

اللّٰہ اَکْرَ مَنَا بِنَصْرِ نَبِیّهٖ — وَبِنَا اَقَامَ دَعَائِمَ الْاِسْلَامِ

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ اعزاز بخشا کہ اس نے اپنے نبی کی نصرت کا کام ہم سے لے لیا اور اللہ نے اپنے فضل سے ہمیں توفیق عطا فرمائی کہ اسلام کے ستون ہمارے ذریعے بلند ہوئے''۔

وَبِنَا اَعَزّ نَبِیّهٗ وَكِتَابَهٗ — وَاَعَزّنَا بِا لضّرْبِ وَالْاَقْدَامِ

''اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے اپنے نبی اور ان کی کتاب کو زمانے میں معزز بنایا اور ہمیں ہماری ثابت قدمی اور جراءت کی بنا پر عزت بخشی''۔

فِی کُلِّ مُعْتَرَکٍ تُطِیْرُ سُیُوفُنَا فِیْهِ الْجَمَا جَمَ عَنْ فِرَاخِ الْهَامِ

ہر جنگ میں ہماری تلواریں اُڑتی ہوئی جاتی ہیں اور دشمن کی کھوپڑیوں کو مار گراتی ہیں۔

یَنْتَابُنَا جِبْرِیْلُ فِی ابْیَا تِنَا بِفَرَائِضِ الْاِسْلَامِ وَالْاِحْکَامِ

''حضرت جبریلؑ ہمیں اسلام کے احکام اور فرائض سکھاتے ہیں''۔

یَتْلُو عَلَیْنَا النُّوْرَ فِیْهَا مُحْکَمًا قِسْماً لَعَمْرُکَ لَیْسَ کَالْاَقْسَامِ

''اور ہمارے لیے قرآن مجید کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔ یہ قرآن عام کلاموں کی طرح نہیں بل کہ اس کی شان بہت بلند ہے''۔

فَتَکُوْنُ اَوَّلَ مُستحِلِّ حَلَالِهِ وَمُحَرِّمٍ لِلّٰهِ کُلَّ حَرَامِ

''ہم ہی وہ پہلے لوگ ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی، اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حلال جانا اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو حرام''۔

نَحْنُ الْخِیَارُ منَ الْبرِیَّةِ کُلِّهَا وَنِظَامُهَا وَزِمَامُ کُلِّ زِمَامِ

''ہم ساری مخلوق میں سب سے بہتر اور بہادر لوگ ہیں''۔

الْحائِضُو غَمَرَاتِ کُلِّ منِیَّةٍ وَالضَّامِنُوْنَ حَوَادِثَ الاَیَّامِ

''ہم ایسی جگہوں پر کود پڑتے ہیں جہاں موت نے اپنی بانہیں پھیلا رکھی ہوں اور زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنے کی ہم میں بھرپور سکت موجود ہے''۔

وَالْمبرِمُوْنَ قَوَ الْاُمُوْرِ بِعَزْمِهِمْ وَالنَّا قِصُوْنَ مَرَائِرَ الْاَقْوَامِ

''ہم عزم وارادے کی طاقت رکھتے ہیں اور ظلم کی مضبوط رسیوں کو توڑنا جانتے ہیں''۔(۵۳)

حضرت حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے یہ رجزیہ اشعار دراصل تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی منقبت پر مشتمل ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر رِثائی اشعار میں اُن کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کرکے، حضرت حسّانؓ نے منقبت نگاری کا حق ادا کر دیا:

وَفَجَّعَنَا فِیْرُوْزُ لَا دَرُّهٗ بِاَبْیَضَ یَتْلُو الْمُحْکَمتِ مُنِیْبِ

''فیروز نامی غلام برباد ہوجائے اس نے ایک ایسی ہستی کی شہادت سے ہمیں غمگین کردیا جو ظاہری و باطنی عیوب سے پاک، قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں رجوع کرنے والے تھے''۔

رَؤوفٍ عَلٰی الْاَدْنَی غلیظ علی العِدا   اَخِی ثِقَةٍ فِی النَّا ئِبَاتِ غَیْرِ نَجِیْبِ

''کمزوروں کے لیے نرم اور دشمنوں کے مقابلے میں سخت تھے، مشکل وقت میں ایک با اعتماد ساتھی اور اعلیٰ خاندان والے تھے''۔

مَتیٰ مَا یَقُلْ لَا یَکْذِبِ الْقُوْل فِعْلُہٗ   سَرِیْعٍ اِلی الخَیْرَاتِ غَیْرِقَطُوْبِ

''جو بات کرتے اسے پورا بھی کرتے اور نیک کام میں جلدی کرنے والے تھے، آپؓ کبھی کسی معاملے میں ترش روئی سے کام نہ لیتے تھے''۔(۵۴)

حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر بن عوام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح بھی کی ہے:

اقامَ علی عهدا لنّبِیّ و هَدْیه   حَوَارِیُّہٗ والقَوْلُ با لفِعلِ یُعْدَلُ

اقامَ علی منهاجِهِ وَطَرِیقِهِ   یُوَالی وَلیّ الحقّ اعدَلُ

هُوَ الفارِسُ المشهورُ والبطلُ الذی   یَصُولُ اذا ما کانِ یَوْمٌ مَحجَّلُ

اذا کشَفَتْ عن ساقِها الحرْبُ حشَّها   باَ بْیض ساقٍ الی المَوتِ یُرْقَلُ

وَاِنّ امْراً کانَتْ صَفِیّةُ اُمّہٗ   ومَنْ اسَدٌ فی بیتِها لمُرَفَّلُ

لَہٗ من رَسُولِ اللہ ِ قُرْبَی قَرِیْبۃٌ   ومن نُصرَةِ الاسلامِ مَجْدٌ مُؤ ثَّلُ

فکمْ کُرْبَةٍ ذَبّ الزُّبَیْرُ بِسیْفِهِ   عن المصطفیٰ و اللہُ یُعْطِی فَیُجزِلُ

فما مِثْلُہٗ فِیْهِم وَلا کانَ قَبلَہٗ   وَلیْسَ یَکُوْنُ الدَّهرَ مَا دامَ یَذْبُلُ

ثناؤ کَ خَیْرٌ مِنْ فَعالِ مَعاشِرٍ   وَفِعْلُکَ یا ابْنَ الهاشِمیّةِ افضَلُ

''نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حواری حضرت زبیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریقے اور تعلیمات پر پوری طرح قائم رہے۔ کسی بھی شخص کی بات کا اس کے فعل سے پتہ چلتا ہے۔ حضرت زبیرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنتوں اور احکامات کی مکمل پیروی کی اور انھوں نے حق کے ولی کا ساتھ دیا۔ وہ مشہور شہ سوار ہیں اور ایسے بہادر ہیں جو جنگ کے دن خوب حملے کرتا ہے۔ جب لڑائی اپنے زوروں پر ہوتی ہے تو وہ اپنی سفید تلوار کے ذریعے موت کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ وہ صاحب زادے ہیں جن کی والدہ کا نام صفیہؓ ہے۔ یہ وہ خاتون ہیں جن کے گھر میں اس شیر نے تربیت پائی ہے۔ ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قریبی رشتہ داری ہے یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ اسلام کی نصرت ابتداء ہی سے ان کا شعار رہی ہے۔ کتنے ہی مواقع ایسے آئے کہ حضرت زبیرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پریشانی کو دور کیا اور اللہ تعالیٰ اجر دینے والا ہے۔ اور اس جیسا اجر کون دے سکتا ہے۔ جب تک نجد کا ''یذبل'' نامی پہاڑ باقی ہے اس وقت تک لوگوں میں حضرت زبیرؓ جیسا شخص پیدا نہیں ہوسکتا۔ اے ابنِ ہاشمیہ! تیرا فعل بہت افضل ہے

اور تیری تعریف کرنا ایک بہترین کام ہے''۔(۵۵)

فارسی اور اردو کے شعری سرمائے میں مناقب

سنائی غزنوی (المتوفی ۵۲۵ھ مطابق:۱۱۳۱ء) نے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی منقبت میں اشعار کہے:

هر کجا او شرابِ دین پالود   پسرِ بوقحافہؓ قحفش بود
جان ِاو باتنش بہ علیّین   تنِ اُو با تنش رفیق و قرین
روزو شب سال و ماه در همه کار   ثانی اثنین اِذْ هُمَا فی الْغَار
بوده خود با رسول پیش از پیک   صدقِ صدیق ؓ را سلام علیک(۵۶)

☆ جہاں کہیں بھی دین کی شراب [روحانی علم وفیض] کا جام تقسیم ہوا......ابوقُحافہ کے بیٹے نے اسے مکمل طور پر حاصل کیا

☆ اُنؓ کی روح ان کے جسم کے ساتھ علیین میں ہے......جب کہ ان کا جسم [اس دنیا میں] اُن کے ساتھیوں (حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عمرؓ] کے ساتھ ہے۔

☆ دن ہو یا رات، سال ہو یا مہینہ، ہر کام میں وہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے، غار میں بھی رسول کے دوسرے ساتھی تھے۔

☆ آپؓ خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آنے سے قبل بھی اُنؐ کے ساتھ تھے......اے صدیقِ صادقؓ! آپؓ پر سلام ہو!

جمال الدین محمد اصفہانی المعروف عبدالرَّزّاق کہتا ہے:

دشمنِ اولادِ اُو هستند اولادِ زِنا
مبغضِ اصحابِ اُوؐ هستند اصحابِ شِمال
باد از یزدان درودی هم بقدرِ قدرِ اُو
برر وانِ اوی و بر یارانؓ و بر اصحاب و آل (۵۷)

☆ اولادِ زِنا اُس (نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد کے دشمن ہیں......اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحابؓ کے دشمن جہنمی ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن (نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقام ومرتبے کے مطابق درود ہو!......اُنؐ کی روح پر، اُنؐ کے دوستوں پر، اُن کے اصحابؓ پر اور اُن کی آلؓ پر۔

ابوالقاسم حسن بن شرف طوسی، فردوسیؔ (المتوفی ۴۱۱ھ مطابق: ۱۰۲۰ء) ''شاہنامۂ فردوسی'' میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم
کی منقبت، اس طرح کہی ہے:

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل ووحی		خدا وندِ اَمُر و خداوندِ نہی
کہ خورشید باد از رسولانِ مہ		نتابید بر کس زِ بوبکرؓ بہِ
عمرؓ کرد اسلام را آشکار		بیاد است گیتی چو باغِ بہار
پس از ہر دو آں بود عثمانؓ گزیں		خداوندِ شرم و خداوندِ دیں
چہارم علیؓ بود جفتِ بتول		کہ اورا بخوبی ستاید رسولؐ
نبیؐ آفتاب و صحابہؓ چو ماہ		بہم نسبتے یک دگر راست راہ

☆ وہ کیا فرمارہے ہیں، جو وحی وتنزیل کے مالک ہیں...... جو حکم دینے والے اور منع کرنے والے خداوند ہیں۔
☆ کہ رسولوں کے چاند کے بعد، سورج، حضرت ابوبکرؓ سے افضل کسی انسان پر نہیں چمکا۔
☆ حضرت عمرؓ نے اسلام کو آشکار کیا...... دنیا کو وہؓ بہار کے مانند یاد ہیں۔
☆ پھران دونوں کے بعد حضرت عثمانؓ منتخب ہوئے...... جو حیا کے پیکر اور دین کے مالک تھے۔
☆ چوتھے حضرت علیؓ تھے، جو سیدہ فاطمہ زہرہؓ کے شوہر تھے...... جن کی خوبیاں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔
☆ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آفتاب ہیں اور صحابہ کرامؓ چاند کے مانند ہیں...... اِن کی آپس کی نسبت راہِ راست کی ہے۔(۵۸)

غالب نے سوائے حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم کے کسی صحابی کی کوئی منقبت نہیں لکھی، لیکن اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رضوان اللہ علیہم کے ساتھ ساتھ چند بزرگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو منقبت کی تعریف پر پورا اترتا ہے، مثلاً

خانہ زادِ نبی و آلِ نبی		نکند با صحابہ بی ادبی
(نبیؐ وآلِ نبیؐ کے غلام صحابہ کرام کے ساتھ بے ادبی نہیں کرتے)

زانکہ ابنان امین و داد گراند		با نبی هم نشین و هم سفر اند
(کیوں کہ وہ امین اور انصاف کرنے والے تھے اور نبیؐ کے ہم نشین اور ہم سفر رہے تھے)

کیشِ بیگانگی رها کرده		بر نبی مال و جان فدا کرده
(انھوں نے بیگانگی کا راستہ چھوڑ دیا تھا اور نبیؐ پر اپنے مال وجان نچھاور کر دیے تھے)

بولائی نبی و عترتِ او یافتہ ملک دین بدولتِ او
(نبیؐ اور اُن کی عترت کی محبت کے باعث انھوں نے دین کی بادشاہت حاصل کی تھی)

بد سگالِ صحابہ بی دین است در خورِ صد ھزار نفرین است
(صحابہ کا دشمن، بے دین ہے۔ ایسا شخص ہزاروں لعنتوں کا سزاوار ہے)

کارِ اصحاب بین و بد مشمر حال ایشان چو حال خود مشمر
(صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھ اور ان کے بارے میں بُرا نہ سوچ۔ ان کے حال کو اپنے حال جیسا نہ سمجھ)

گر ترا صرفۂ نکو کاریست حُبِّ ایشان طراز دینداریست
(اگر تو نیکی کا خواہاں ہے تو جان لے کہ ان کی محبت ہی دین کی زینت ہے)

فکر بِغضِ صحابہ سودائیست خاطرِ کفر را سویدائیست
(صحابہ کرامؓ سے بغض رکھنا پاگل پن ہے۔ یہ گویا کفر کے دل کی سیاہی ہے)

رفض ما خولیای خام آرد صیدِ دیوانگی بدام آرد
(رفض [صحابہ کرامؓ سے دشمنی] خام خیالی اور دماغی بیماری ہے۔ یہ دیوانگی کے جال میں پھنسا دیتی ہے)

با تو گویم اگر یقین داری کاں بزرگان ز روی دینداری
(اگر تجھے یقین ہو تو سن! کہ وہ بزرگ، دینداری کی خاطر ہی)

خیر خواہِ رسول و آل ویند عاشقِ جلوۂ جمال ویند
(سب رسولؐ اور آلِ رسول کے خیر خواہ تھے۔ وہ سب جمالِ مصطفیؐ کے عاشق تھے)

دوستان را شمردۂ دشمن؟ در خورِ سرزنش توی یا من؟
(تو نے دوستوں کو دشمن سمجھ لیا؟......اب ذرا خود سوچ کہ لائقِ ملامت تو ہے کہ میں؟)

انچہ اندیشۂ نہانئ تست ھمہ از روی بد گمانئ تست
(تیری وہ پوشیدہ فکر بدگمانی پر مبنی ہے)

کارِ دین مشکل است، آسان نیست بد گمانی طریقِ ایمان نیست
(دین کا معاملہ مشکل ہے، آسان نہیں ہے۔ بدگمانی ایمان کا راستہ نہیں ہے)

بیش ازیں آنچنا کہ ما گفتم حرفی از راز برملا گفتم (۵۹)
(اس سے بڑھ کے جو کچھ میں نے کہا، وہ ایک راز ہے جو برملا کہہ دیا)

تاج و تیغ و نگین خود از ما بود دولتِ ملک و دین خود از ما بود
(ہم ہی تاج، تلوار اور نگین کے مالک تھے۔ ہم ہی ملک و دین کی دولت کے حامل تھے)

آن نیرزد بغصہ گر این ماند ملک اگر رفت گو بروں دین ماند
(اگر دنیا ہاتھ سے نکل بھی جائے تو پروانہیں۔ملک جائے تو جانے دو، بس دین سلامت رہے)
اندریں روزگار گر شب و روز ما نداریم طالعِ فیروز
(اگر اس زمانے میں ہم دن رات، اپنی قسمت میں کامیابی نہیں پاتے)
لاجرم رفت و ھر چہ خواست سرود ناروا گفت خود، نہ راست سرود
(تو کوئی بات نہیں، جو چاہا کہہ دیا۔خود ناحق کہا، سچ نہ کہا)
بر چنین کس ھزار نفرین باد ! لعنت از حق، زِ خلق آمین باد!
(ایسے شخص پر ہزار لعنتیں ہوں۔اللہ کی طرف سے لعنت ہو، مخلوق کی طرف سے آمین کی صدا بلند ہو)

منقبت نگاری کی اردو روایت

اردو کے ابتدائی نمونوں میں جہاں حمد و نعت کے شعری نقوش ملتے ہیں، وہیں منظوم مناقب کے شواہد بھی پائے جاتے ہیں۔ملک الشعراء ے ہند، ملا نصرتی (المتوفی ۱۰۹۵ھ) اردو کے ان شعراء میں ہیں جن کا کلام صاف زبان میں ہے۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعے میں ''حمد''، ''مناجات'' اور ''نعت '' کے بعد حضرت بندہ نوازؒ کی منقبت شامل کی ہے:

زباں دھوکے پُھل نیر سوں مکھ میں لاؤں یو سید محمد حسینی کا ناؤں
جتے عاشقاں میں اچھے سرفراز جئے جگ کا مخدوم بندہ نواز
تصرف تجی مخزنِ عین کا پرویا ہے توں آس دارین کا
کیا پل میں فیروز شہ کوں تباہ گھڑی مینچہ سلطان احمد کوں شاہ
جو کوئی تجھ محبت کے ماتے اہیں وہ دنیا میں وہ دین پاتے اہیں
دکن کی عجب بختور خاک ہے کہ جس بیچ تجھ خواب گہ پاک ہے (۶۰)

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء نے ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں ''مثنوی سحر البیان'' لکھی تھی ۔اس کی ابتداء حمد ،نعت ،حضرت علیؓ کی منقبت اور ''تعریف اصحاب پاک رضوان اللہ علیہم اجمعین'' کے زیرِ عنوان چند اشعار مناقبِ اصحابؓ کے لکھے ہیں:

سلام اُن پہ جو اُسؐ کے اصحابؓ ہیں وہ اصحاب کیسے کہ احباب ہیں
خدا نے انھوں کو کہا مومنیں وہ ہیں زینتِ آسمان و زمیں
خدا ان سے راضی ،رسولؐ اُنؓ سے خوش علیؓ اُنؓ سے راضی بتولؓ اُنؓ سے خوش
ہوئی فرض اُن کی ہمیں دوستی کہ ہیں دل سے وہ جاں نثارِ نبیؐ(۶۱)

میر حسن کی مثنوی میں حضرت علیؓ کی منقبت میں تشیُّع تو واضح ہے جس کے باعث ان کے اشعار شرک فی التوحید اور شرک فی النبوت سے جا ملے ہیں۔ لیکن اصحابِؓ رسول ﷺ کی منقبت میں جو اشعار ہیں، ان سے میر حسن راسخ العقیدہ سنی نظر آتے ہیں۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ کی کلیات میں حمد کے بعد نعت ہے، جس کے مطلع میں ''اصحابی کالنجوم'' والی حدیث کا تلمیحی اشارہ موجود ہے:

دلا دریائے رحمت قطرہ ہے آبِ محمدؐ کا　　جو چاہے پاک ہو پیرو ہو اصحابِ محمدؐ کا (۶۲)

مرزا سودا کے اس شعر میں فیضیؔ کے شعر کی تجدید متن (Intertexaulity) صاف دیکھی جا سکتی ہے:

صد شکر کہ ما پیروِ اصحابِ رسولیم　　در شرع دگر راہنما را نشناسیم

لیکن حضرت علیؓ کی منقبت میں سودا نے بھی بہت زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔

میر و غالب کے ہاں بھی حضرت علیؓ کے مناقب ملتے ہیں لیکن ان میں بھی متنی بے اعتدالیوں کے باعث حضرت علیؓ کی ذات کو نصیریوں کی طرح ''خدا'' کا درجہ دید یا گیا ہے۔

عجیب بات کہ جتنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مناقب کہے گئے ہیں ان میں کسی شاعر نے بھی ایسی بے اعتدالی کا مظاہرہ نہیں کیا جیسی بے اعتدالی حضرت علیؓ کے مناقب میں روا رکھی گئی۔ حال آں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو فرمایا کہ تجھ میں ایک مشابہت عیسیٰ سے ہے، کہ یہود نے ان کو دشمن رکھا یہاں تک کہ ان کی ماں پر تہمت لگائی اور نصاریٰ نے ان سے محبت رکھی یہاں تک کہ اتارا ان کو اس مرتبے پر جو ان کے لیے ثابت نہیں ہے۔ پھر علیؓ نے کہا میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوں گے، ایک محبت رکھنے والا حد سے زیادہ میری تعریف کرے گا جو مجھ میں نہیں۔ دوسرا میرا دشمن کہ اس کی دشمنی کی وجہ ہو ہلاکت کی، کہ وہ مجھ پر بہتان لگائے گا۔ روایت کیا اس کو احمد نے'' (۶۳)

فی الحال میرا یہ موضوع نہیں ہے ورنہ میں شرک فی الالوہیت اور شرک فی النبوت کے معتد بہ نمونے پیش کر سکتا ہوں۔

دراصل صحابہ کرام رضوان اللہِ اجمعین کے مناقب تو احادیث کی روشنی میں لکھے جاتے ہیں (یا لکھے جانے چاہئیں)۔ اس لیے اُنؓ کے مناقب میں شاعر اپنی عقیدت کا بیان کرتے ہوئے ان حضرات کے مراتب کا ذکر کر سکتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم کی عظمت کا بیان مستند احادیث کی روشنی میں بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ لیکن برا ہو عبداللہ ابنِ سبا کا جس نے اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی غرض سے حضرت علی رضی

اللہ عنہ کے گرد حلقہ کیا۔ دنیا میں جہاں بھی اقتدار کی روایت تھی اس میں موروثی نظام رائج تھا اور خود غرض ٹولے کو یہ معلوم تھا کہ حضور ﷺ سے قرابت کے باعث اقتدار صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مل سکتا ہے۔ اس لیے ان سے جھوٹی محبت کا اظہار کر کے ان کی قربت حاصل ہونے کا ڈھونگ رچایا، حالاں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو ایسے لوگوں کی تعریف کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ آپؓ کی تعریف تو خود حضور ﷺ کی احادیث میں موجود ہے۔ بلاشبہ آپؓ اولیائے کرام کے پیشوا ہیں اور آپؓ سے محبت رکھنا حدیث غدیرِ خم کے لحاظ سے ضروری ہے۔ ابنِ ماجہ جلد اول میں صفحہ نمبر ۶۳ پر حدیث ہے جس کا متن [اردو ترجمہ] یہ ہے:

''حج سے واپسی پر ایک جگہ آپ ﷺ نے حکم فرمایا ''نماز کی طرف آؤ، جبکہ وہ جمع کرنے والی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا۔ فرمایا: کیا میں مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ سب نے عرض کی: کیوں نہیں، آپ ﷺ حق رکھتے ہیں۔ فرمایا: یہ اُس کا ہے جس کا میں محبوب ہوں۔ اے اللہ! اس سے محبت کر، جو اس سے محبت کرے، اے اللہ! اس سے دشمنی رکھ جو اس سے دشمنی رکھے''۔ (۶۴)

سعادت یار خان رنگینؔ (پیدائش ۱۱۷۰ھ، وفات: ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء) کی مثنوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے مناقب ہیں:

اے گلشنِ دوجہاں کے خالق　　اے والی وانس وجاں کے رازق
وہ شخص جو تھا رسول تیرا　　اس باغ میں تھا وہ پھول تیرا
تھا گل کی وہ آب وتاب سے خوب　　تھا اس کا عرق گلاب سے خوب
اک باغ وہ حق کی سیر کا تھا　　دخل اس میں ذرا نہ غیر کا تھا
اور اس کے جو چار تھے وہ اصحاب　　سو اس کے تھے یار اور احباب
یا اس میں چہار سرو تھے چار　　یا چار تھے نہر چار وہ یار (۶۵)

امیر مینائی کی مثنوی ''ابرِ کرم'' میں، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے، ایک حکایت درج ہے جس میں کسی صحابیؓ رسول ﷺ کا برزخی احوال لکھا ہے، گویا یہ ایک منقبت ہے:

ابوایُّوب شیخِ پاک باطن　　یہ کہتے ہیں کہ میں بیٹھا تھا اک دن
سنو عبرت کے قابل حال تازہ　　کہ گزرا ایک فاسق کا جنازہ
اُدھر سے پھیر کر منہ میں ہٹ آیا　　کہ مجھ پر پڑ نہ جائے اس کا سایا
نماز اُس کی کوئی مجھ سے نہ پڑھوائے　　مجھے ہمراہ تا مرقد نہ لے جائے

اسی شب کو کیا جب خواب میں نے | تو دیکھا اک چمن شاداب میں نے
اُسی فاسق کو محوِ خواب پایا | مجھے دیکھا تو میرے پاس آیا
کہا میں نے بتا کیا تجھ پہ گزری | کہہ، اے مردِ خدا کیا تجھ پہ گزری
یہ گلشن کس طرح سے تونے پایا | ثمر یہ کس عمل کا ہاتھ آیا
کہا اس نے کہ اے شیخِ زمانہ | سناؤں کیا تمھیں اپنا فسانہ
خلاصہ سب کا اتنا ہے کہ اُس نے | مجھے بخشا فقط اپنے کرم سے
بظاہر ہاتھ آیا یہ بہانہ | کہ تم نے جو مجھے بدکار جانا
ہٹ آئے دیکھ کر مردے کو میرے | جنازے کی طرف سے منہ کو پھیرے
یہ نفرت اُس کی رحمت کو نہ بھائی | روش تیری پسند اُس کا نہ آئی
ہوا فی الفور حکمِ عفوِ تقصیر | نہ دی اعمالِ بد کی مجھ کو تعزیر
ہوا صادر یہ میرے نام فرماں | ابو ایُّوب سے کہنا کہ ناداں
اگر گنجینۂ رحمت کی کنجی | ترے ہی قبضۂ قدرت میں ہوتی
تو کرتا تو جہاں کو داخلِ نار | نہ ہوتا جنّتی کوئی گنہ گار (٦٦)

مولانا احمد رضا خانؒ بریلوی المتوفیٰ ۱۳۴۰ھ مطابق: ۱۹۲۱ء نے نعتیہ کلام لکھنے والے متخصص شعراء میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ آپؒ نے ایک معرکہ آرا سلام لکھا جس میں درجہ بدرجہ اصحابِ کرام رضوان اللہ علیہم اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنھن کے مناقب لکھے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اُن کے آگے وہ حمزہؓ کی جانبازیاں | شیرِ غرّانِ سطوت پہ لاکھوں سلام
اُس بتولِ جگر پارۂ مصطفیٰ | حجلہ آرائے عفّت پہ لاکھوں سلام
وہ حسن مجتبیٰؓ سید الاسخیا | راکبِ دوشِ عزت پہ لاکھوں سلام
اُس شہیدِ بلا شاہِ گلگوں قبا | بیکسِ دشتِ غربت پہ لاکھوں سلام
اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق | بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام
سیّما پہلی ماں کہفِ امن و اماں | حق گزارِ رفاقت پہ لاکھوں سلام
بنتِ صدیقؓ آرامِ جانِ نبیؐ! | اُس حریمِ براءت پہ لاکھوں سلام
یعنی ہے سورۂ نور جن کی گواہ | اُن کی پُرنور صورت پہ لاکھوں سلام
جاں نثارانِ بدر و اُحد پر درود | حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام
وہ دسوں جن کو جنت کا مژدہ ملا | اُس مبارک جماعت پہ لاکھوں سلام

خاص اس سابق ِ سیرِ قربِ خدا اُوحدِ کاملیت پہ لاکھوں سلام
سایہء مصطفیٰؐ مایۂ اصطفا عزونازِ خلافت پہ لاکھوں سلام
یعنی اس افضل الخلق بعد الرسل ثانی اثنینِ ہجرت پہ لاکھوں سلام
وہ عمرؓ جس کے اعدا پہ شیدا سقر اُس خدادوست حضرت پہ لاکھوں سلام
زاہدِ مسجدِ احمدی پر درود دولتِ جیشِ عسرت پہ لاکھوں سلام
دُرِّ منثور قرآن کی سلک بھی زوجِ دونورِ عفت پہ لاکھوں سلام
یعنی عثمان صاحب قمیصِ ھدیٰ! حلّہ پوشِ شہادت پہ لاکھوں سلام
مرتضٰی ؓ شیرِ حق اشجع الاشجعین ساقیء شیروشربت پہ لاکھوں سلام
اولیں دافعِ اہلِ رفض و خروج چارمی رکنِ ملّت پہ لاکھوں سلام
ماحیِ رفض وتفضیل ونصب وخروج حامیء دین وسنت پہ لاکھوں سلام
مومنیں پیشِ فتح و پسِ فتح سب اہلِ خیر و عدالت پہ لاکھوں سلام
شافعی ، مالک ، احمد، امامِ حنیف چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام
غوثِ اعظم امام التقیٰ والنُّقیٰ
جلوہٴ شانِ قدرت پہ لاکھوں سلام (۶۷)

مولانا احمد رضا خانؒ بریلوی نے اپنے سلام میں، صحابہ کرامؓ اور صحابیات وامہات المؤمنینؓ کے حقیقی اوصافِ حمیدہ کے ذکرِجمیل سے، شعری متن مزین کیا ہے۔

اولیائے کرامؒ کے مناقب

حضرت داتا گنج بخش علی بن عثمان الہجویریؒ نے حضرت زین العابدینؓ کی وہ منقبت نقل کی ہے جوفرزدقؔ نے لکھی تھی۔ بلاشبہ وہ منقبت، صداقت پر مبنی فضیلت کے بیانیے کی عکاس ہے۔اس کے چند اشعار بھی یہاں نقل کیے جاتے ہیں تا کہ منقبت نگاری کا درست ، راست اور لائقِ تقلید منہج نمایاں ہو سکے:

شیخِ ہجویر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ [خلیفہء وقت] ہشام بن عبدالملک نے طوافِ کعبہ کے بعد حجرِ اسود چومنا چاہا تو لوگوں کے ہجوم میں اسے موقع نہیں ملا۔لیکن اسی وقت حضرت زین العابدینؓ تشریف لائے تو لوگ، ان کے احترام میں حجرِ اسود سے الگ ہوئے تا کہ وہ بآسانی اسے چوم سکیں۔اس پر ہشام کے ہمراہ شامیوں نے دریافت کیا تو ہشام نے تجاہلِ عارفانہ سے ان کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔وہیں

فرزدقؔ موجود تھا جس نے فی البدیہہ قصیدہ کہا:

هٰذا الَّذِی تعرف البَطحَا وَطأتَه
وَالبَیتُ یَعرِفُه وَالحِلُّ وَالحَرَم

یہ وہ شخص ہے جس کے نشانِ قدم کو اہلِ حرم پہچانتے ہیں۔ خانۂ کعبہ اور حل وحرم اسے پہچانتے ہیں۔

هٰذا اِبنُ خَیرِ العِبَادِ کُلِّهِم
هٰذَا التَّقِیُ النَّقِیُ الطَّاهِرُ العَلَمُ

یہ خدا کے بندوں میں سے بہترین بندے کا فرزند ہے۔ سب سے زیادہ متقی، پاک وصاف اور بے داغ نشان والا۔

مَن جَدَّه دَانَ فَضلُ الاَنبِیَا ءِ لَه
وَفَضلُ اُمَّتِهٖ وَ اَنَت لَهُ الاُمَم

ان کے نانا تمام نبیوں سے افضل اور ان کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اور تو بھی ان کی امت کا ایک فرد ہے۔

فَلَیسَ قَولُكَ مَن هٰذَا بِضَائِرِهٖ
العَرَبُ یَعرُفُ مَن اَنکَرتَ وَالعَجَم

اے ہشام! تیرا انکار کرنا انھیں کوئی نقصان نہیں پہچا سکتا۔ انھیں تو عرب وعجم سب پہچانتے ہیں۔(۶۸)

داتا صاحب نے اس قصیدے کے ۲۴، اشعار نقل فرمائے ہیں۔ ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ جو کچھ متن (Text) بُنا گیا ہے حقیقت پر مبنی ہے۔ اس قصیدے کے ہر شعر پر قاری کہہ اٹھتا ہے کہ ''سچ کہا''......ایسے ہی متون (Texts) سے منقبت نگاری سیکھی جا سکتی ہے۔

غالب نے اولیائے کرام کی حقیقت پر گفتگو کی ہے:

نورِ حقست احمدؐ و لمعانِ نور از نبی در اولیا دارد ظہور

(احمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حق کا نور اور نور کی کرن ہیں۔ ان کی نبوت کے نور کا ظہور اولیائے امت میں ہوتا ہے)

از نبی و از ولی خواہی مدد تا نہ پنداری کہ ناجائز بود

(اگر نبی اور ولی سے مدد مانگو تو یہ نہ سمجھو کہ یہ ناجائز ہے)

ہر کہ او را نورِ حق نیرو فزاست ھر چہ از وی خواستی ھم از خداست

(جس کسی کو بھی نورِ حق قوت بخشتا ہے، اُس سے اگر کچھ مانگا جائے تو وہ درحقیقت خدا سے ہی مانگنا ہے)

چوں اعانت خواھی از یزدانِ پاک ''یا معین الدین'' اگر گوئی چہ باک؟

(جب تو پاک پروردگار سے مدد کا طلب گار ہے، تو یا معین الدین کہنے میں کیا حرج ہے؟)

ابلہاں را زانکہ دانش نارساست گفتگو ھا بر سرِ حرفِ نداست
(نادان لوگوں تک چوں کہ عقل وفہم کی روشنی نہیں پہنچی ، اس لیے وہ حرفِ ندا[''یا'' کہنے کو] بحث کا موضوع بناتے ہیں)

مولوِی معنوی عبدالعزیز وان رفیع الدین دانشمند نیز
(مولوی معنوی عبدالعزیز اور رفیع الدین کہ وہ بھی دانشمند ہیں)

شاہ عبدالقادرِ دانش سگال کاین دو تن را بود در گوھر ھمال
(شاہ عبدالقادر جو کہ دانائی میں ممتاز تھے، یہی دونوں علم ومعرفت میں جواہر کے مانند تھے)

بردنِ نامِ نبی و اولیا خود روا گفتند با حرفِ ندا
(نبی اور اولیا کا نام لے کر انھیں پکارنا انھوں نے خود جائز کہا ہے)

وان دگر فرزانۂ قدسی سرشت رھنمای مسلکِ پیرانِ چشت
(اور وہ دوسرا فرزانہ جو پاکیزہ فطرت کا حامل تھا۔ جو سلسلۂ طریقت، چشتیہ مسلک کا راہبر تھا)

آنکہ شیخِ وقت و خضرِ راہ بود نام والایش کلیم اللہ بود
(جو وقت کا شیخ اور وقت کا خضر تھا۔ جس کا بلند نام کلیم اللہ تھا)

گفت : استمداد از پیران رواست ھر چہ پیرِ راہ گوید آن رواست
(اس نے کہا کہ پیرانِ طریقت سے مدد مانگنا جائز ہے......اور جو کچھ راہِ طریقت کا پیر کہے وہ جائز ہے)

کی غلط گوید چنین روشن ضمیر خردہ بر قولِ کلیم اللہ مگیر
(ایسا روشن ضمیر بھلا غلط کیسے کہہ سکتا ہے؟......حضرت کلیم اللہؒ کے قول پر اعتراض مت کرو)

ھمچنین شیخ المشائخ فخرِ دین آفتابِ عالمِ علم و یقین
(اسی طرح شیخ المشائخ ،فخر دین، جو علم ویقین کی دنیا کے آفتاب تھے)

ھمبرین ھنجار و آئین بودہ است شیخِ ما حق گوی وحق بین بودہ است
(انھوں نے بھی اسی طریقے اور دستور کو اپنایا۔ ہمارے [وہ] شیخ ہمیشہ حق گو اور حق بین تھے)

تا نہ پنداری ز پیران خواستیم حاجتِ خود را ز یزدان خواستیم
([ان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ] تو یہ نہ سمجھے کہ ہم نے پیروں سے سوال کیا، ہم نے تو حاجت روائی، صرف خدا سے چاہی ہے)

لیک در پوزش بدرگاہِ رفیع ما ھمی آریم پیران را شفیع
(بل کہ ہم بارگاہِ الٰہی میں معافی کے لیے بزرگوں کو وسیلہ بناتے ہیں)

اینچنین پوزش روا نبود چرا؟ بحث با عارف خطا نبود چرا؟
(اس طرح کی عفوطلبی کیسے جائز نہ ہو۔[اس ضمن] میں عارف سے بحث کرنا کیوں غلط نہ ہو؟)
ور سخن در مولد پیغمبر ست بزمگاہِ دلکش و جان پرورست
(اور اگر بات میلادِ نبی کی ہے، تو یہ ایک دلکش اور روح پرور محفل ہے)
خود حدیث از سرورِ دین میرود میرود وانگہ بآئین میرود
(اس محفل میں خود دین کے سردار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات ہوتی ہے۔ اور پھر [ہر بات] شریعت کے مطابق چلتی ہے)
سعیِ ما مشکور و نقدِ ما روا چیست آن کان را شماری ناروا
(ہماری کوشش مقبول ہے اور ہمارا اندرانہ جائز ہے۔ پھر تم کیوں اسے ناجائز شمار کرتے ہو؟)
نکہت موئی مبارک جانفزاست با رگِ جانش ھمی پیوند ھاست
(نبی علیہ السلام کے موئے مبارک کی خوشبو، جان کو تقویت دینے والی ہے۔ اس کا تعلق رگِ جاں سے ہے)
بر تن نیکو تر از جان رستہ است لاجرم از آب حیوان رستہ است
(یہ موئے مبارک [حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے] جسمِ اطہر پر اُگا ہے۔ لہٰذا یہ آبِ بقا سے سیراب ہے)
ھر کرا دل ھست و ایمان نیز ھم چون نورزد عشق با ''نقشِ قدم''
(جو کوئی دل رکھتا ہے اور ساتھ ایمان بھی رکھتا ہے۔ وہ کیوں [حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے] نقشِ قدم سے عشق نہ کرے؟)
در رہِ دین تا قدم بنہادہ اند عشقبازان را نشانہا دادہ اند
(جب سے راہِ دین پر قدم رکھا گیا ہے۔ عاشقوں کو نشانیاں عطا کی گئی ہیں)
برد از خویشم دو صد فرھنگ رشک می برم زین نقش پا بر سنگ رشک
(میں اپنے آپ سے دو سو فرہنگوں [لفظوں کی قید سے آزاد] سے سوا، رشک کرتا ہوں۔ میں اُس نقشِ پا کی وجہ سے پتھر پر بھی رشک کرتا ہوں)
نقشِ پائی کاینچنین افتادہ است اھلِ دل را دلنشین افتادہ است
(جو نقشِ پا، دلوں پر پڑا ہے، اہلِ دل نے اسے اپنے دلوں میں بسا لیا ہے)
کی نشیند در دلِ آن بدگہر کش دلی از سنگ باشد سخت تر
(ایسے بدنصیب کے دل میں [وہ نقشِ پا کیسے] بیٹھ سکتا ہے۔ جس کا دل پتھر سے بھی بڑھ کر سخت ہو!)
بوی پیراھن بمصر آرد صبا دیدۂ یعقوبؑ زو یابد جلا
(جس طرح ہوا نے مصر سے [یوسف علیہ السلام کے] پیراہن کی خوشبو پہنچائی......اور حضرت یعقوب

علیہ السلام کی آنکھیں اس سے روشن ہوگئیں)

بر ردا و پیرھن کز مصطفیٰؐ است جان نیفشاندن زِ اُمت کی رواست؟

(اسی طرح نبیؐ کی چادر اور مبارک لباس ہے......جس پر جان نچھاور نہ کرنا امت کے لیے کیوں کر روا ہوسکتا ہے؟)

ایکہ بردی بہرہ از خوانِ نبی بردۂ از یاد احسانِ نبیؐ

(اے وہ شخص! جب تو نے نبی علیہ السلام کے خوانِ کرم سے فیض پایا ہے......کیا تو آپ ﷺ کے احسان کو بھول گیا؟)

اصلِ ایمانست طرزِ خاصِ ما خالصاً للہ بود اخلاصِ ما

(ہمارا خاص طریقہ، اصل ایمان ہے اور ہمارا اخلاص خالصتاً اللہ کے لیے ہے)

عرس و این شمع و چراغ افرختن عود در مجمر بر آتش سوختن

(عرس منانا، چراغ جلانا، آگ پر عود جلانا)

جمع گشتن د ر یکی ایوان ھمی پنج آیت خواندن از قرآن ھمی

(پھر ایک جگہ جمع ہو کے، قرآن کی پانچ آیات پڑھ لینا)

نان بنان خواھند گان دادن دگر مردہ را رحمت فرستادن دگر

(فقیروں کو بھی کھانا کھلا دینا اور مرحومین کے لیے دعائے ''رحمت'' کرنا)

گر پی ترویحِ روحِ اولیا ست در حقیقت آنہم از بہرِ خداست

(اگر یہ سب کچھ اولیا کرام کی روح کی تسکین کے لیے ہے......تو درحقیقت، یہ بھی خدا کی خاطر ہی ہے)

اولیا را گر گرامی داشتیم نزپئ رومی و شامی داشتیم

(اگر ہم اولیا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں......تو یہ کسی خطے اور قوم سے مخصوص نہیں ہے [بل کہ صرف اللہ کے لیے ہے])

آن ولی در یادِ حق مستغرقست عین حق گر نیست خود محوِ حقست

(وہ ولی، جو یادِ الٰہی میں محو ہے......وہ حق کا مظہر یا عین اگر نہیں بھی ہے تو فنا فی اللہ! تو ہے)

حق بود پیدا نہاں دیگر چہ ماند؟ چون ولی رفت از میان دیگر چہ ماند؟

(جب حق ظاہر ہے تو پوشیدہ کیا رہ گیا؟......ولی ہی جب درمیان میں نہ رہا تو پھر باقی کیا بچا؟)

خیز تا حدِ ادب داری نگاہ بی ادب را بر دم تیغست راہ

(آؤ! ادب کی حد کا خیال رکھیں، کیوں کہ بے ادب کا راستہ تلوار کی دھار پر ہے)

یا ولی آویختی دیوانہ یا بر آتش ریختی پروانہ
(یا تو تو ولی سے وابستہ ہوکر دیوانہ بن جا، یا پھر پروانے کی طرح آگ میں جل جا)

نیستی عارف کہ گویم خود مباش بد مبین و بد مگوی و بد مباش!
(اگر تو عارف نہیں ہے تو خاموش رہ، برا مت دیکھ، برا مت بول اور برا مت بن)

بد شمردی رهروانِ پیش را؟ رهروِ چالاک گفتی خویش را؟
(اگر تو پہلے کے مسافرانِ راہِ طریقت کو بُرا کہتا ہے......اور خود کو ہوشیار مسافر سمجھتا ہے)

گر سفر اینست منزلگہ کجاست؟ ''لا الہٰ'' گفتی ''الا اللہ'' کجاست
(اگر تیرا سفر یہی ہے تو بتا کہ منزل کہاں ہے؟......تو لا الہٰ کہتا ہے، الا اللہ کہاں ہے [تو نفی کرتا ہے، اثبات کہاں ہے])

هست رسمِ خاص در هر مرزبوم خود چہ میخواهی ز نفی این رسوم
(ہر قوم و ملک کا اپنا طریقہ اور رسم ہوتی ہے...... تجھے ان رسموں کی نفی کرنے کی حاجت کیوں پیش آئی؟)

نفی رسمِ کفر ما هم می کنیم داد با دانش فراهم می کنیم
(ہم تو خود کفر کی رسموں کی نفی اور علم و دانش کی حمایت کرتے ہیں)

نفی کفر آئینِ اربابِ صفاست نفیِ فیض ای تیرہ دل! رسمِ کجاست؟
(صاحبِ صفا لوگوں کا اصول ہے کہ وہ کفر کا رد کرتے ہیں......لیکن اے سیاہ دل رکھنے والے شخص! فیض کا انکار کرنے کی رسم کہاں سے آئی؟)

نفی رسم و رہ هوا را می کشد نفی فیضست اینکہ ما را می کشد
(راہ و رسم کی نفی سے ہوسنا کی پیدا ہوتی ہے۔فیض کی نفی یہ ہے کہ ہم خود ختم ہو جائیں)

ای گرفتارِ خم و پیچ ِ خیال! نفی بی اثبات نبود جز ضلال!
(اے پیچیدہ خیالات اور مغالطوں میں گرفتار شخص! بغیر اثبات کے، نفی سوائے گمراہی کے کچھ نہیں)

ور تو گوئی ''میکنم اثباتِ حق'' از چہ روئی منکرِ آیاتِ حق؟
(اور اگر تو کہتا ہے کہ میں حق کا اثبات کرتا ہوں، تو پھر کس منہ سے آیات کا انکار کرتا ہے؟)

دانم از انکار انکار آوری پیچشی در زلفِ گفتار آوری
(میں جانتا ہوں کہ تو انکار پر انکار کرے گا اور اپنی گفتگو کو پیچ و خم دے گا!)

منکرِ اثبات گوئی نیستم من حریفِ این دو روئی نیستم
(لیکن میں اثبات کا منکر نہیں ہوں......میں دو رخے پن کا شکار نہیں ہوں)

اولیا خاصانِ شاھی نیستند یعنی آیاتِ الٰہی نیستند

(کیا اولیا اللہ، خاصانِ الٰہی نہیں ہوتے؟......یعنی کیا وہ آیاتِ الٰہی نہیں ہوتے؟)

معجزاتِ انبیا آیاتِ کیست؟ وین صفتہا را ظہور از ذاتِ کیست؟

(انبیا علیہم السلام کے معجزات کس کی نشانیاں ہیں؟......اور یہ صفات کس ذات کے ظہور سے ظاہر ہوئی ہیں؟) (۲۹)

مثنوی ''بیان نموداری شانِ نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتوِ نور الانوار حضرت الوھیت است'' میں غالب نے اپنا عقیدہ بیان کرتے ہوئے منہاجِ سلف کی طرف اشارے کیے ہیں اور بتایا ہے کہ شعور کے ساتھ ''فاعلِ حقیقی'' ذاتِ بحت کو سمجھتے ہوئے اولیا کی طرف رجوع کرنا شرک نہیں ہے۔ اس مثنوی میں جتنے اولیائے کرام کے اسمائے گرامی آئے ہیں وہ سب کے سب امتِ مسلمہ کی برگزیدہ ہستیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے غالب کے ان اشعار کو منقبت کے ذیل میں رکھا ہے۔

منقبت نگاری کی روایت کا یہ احوال اس بات کا غماز ہے کہ ہر عہد میں امتِ مسلمہ نے اپنے مشاہیر کو خراجِ تحسین (Tribute) اور مقدس ہستیوں کو خراجِ عقیدت (Homage) پیش کیا ہے۔

اردو میں مشاہیر کے تذکرے (Biographies) اور مقدس ہستیوں کی مناقب پر لکھی گئی تحریروں (Hagiographies) اور منظوم خراجِ تحسین (Tribute) اور خراجِ عقیدت (Homage) کے لوازمے (Matter) کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے صرف چند بنیادی نکات ہی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مآخذ و منابع:

۱۔ صحیح مسلم، جلد اوّل، ص ۱۵۰، حدیث ۱۸۱...... باب [تکبر کے حرام ہونے کے بیان میں]، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

۲۔ شاہ سید محمد ذوقیؒ، سرِ دلبراں، محفلِ ذوقیہ، نارتھ کراچی، طباعت پنجم، ۱۴۱۸ھ، ص ۵۲

۳۔ شیخ اکبر محیؒ الدین ابنِ عربیؒ، فتوحاتِ مکیّہ، جلد اول، علی برادران تاجران کتب، فیصل آباد، دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ۲۳۶

۴۔ تفسیرِ ماجدی، تاج کمپنی، لاہور، ص ۵۳

۵۔ پروفیسر میاں محمد شریف، مقالاتِ شریف، بزمِ اقبال، لاہور، نومبر ۱۸۸۴ء، ص ۱۵۵

۶۔ کلیاتِ جگر مرادآبادی، مقدمہ: رشید احمد صدیقی، اشعیب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۴۱

۷۔ المنجد

۸۔ بحوالہ اردولغت، اردولغت بورڈ

۹۔ قومی انگریزی لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۸ء

۱۰۔ Penguin English Dictionary

۱۱۔ لقمان ۳۱، آیت ۱۲

۱۲۔ آیت ۱۲ سورۂ لقمان ۳۱

۱۳۔ سورۃ الکھف ۱۸، کے دوسرے اور تیسرے رکوع یعنی آیت ۱۳ سے ۲۲ تک اصحابِ کھف کا قصہ ہے

۱۴۔ آیت ۹۸، سورۃ الکھف ۱۸

۱۵۔ آیت ۱۸، سورۃ النمل ۲۷

۱۶۔ عبدالماجد دریابادی، تفسیرِ ماجدی، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور

۱۷۔ ترجمہ: نورالمبین، ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی شہید۔

۱۸۔ حکیم پلوٹارک، مشاہیرِ یونان و رومہ، مترجمہ مولوی سید ھاشمی فرید آبادی، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۵۔

19- Michael H.Hart, The 100 A Ranking of the Most Influential Persons in History, Citadel Press, U.S., page 3

20- Michael Hart, The 100 A Ranking of the Most Influential Persons in History, Citadel Press, U.S., page 265(20)

21- John Canning, 100 Great Lives, Rupa & Co, New Delhi, 1994,Page290(21)

22- 100 Great Lives, P/737. 745(22)

۲۳۔ رشید احمد صدیقی، تری یاد کا عالم، مشمولہ: کلیاتِ جگر، شعیب پبلشرز، کراچی، مارچ ۲۰۱۶ء، ص ۳۷

۲۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اوّل، مجلسِ ترقیِ اَدَب، لاہور، طباعتِ ہفتم، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۸

۲۵۔ الطاف حسین حالی، کلیاتِ حالی، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، بُک کارنر، جہلم، ۲۰۱۶ء، ص ۵۱۵

۲۶۔ کلیاتِ حالی، ص ۵۲۶

۲۷۔ کلیاتِ حالی، ص ۴۱۳

۲۸۔ مولانا محمد علی جوہر، دیوانِ جوہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۶۳

۲۹۔ کلیاتِ شبلی، مرتبہ: علامہ سید سلیمان ندویؒ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۸۶

۳۰۔ مسٹر محمد علی جینا، قائدِ اعظم محمد علی جناح......مشمولہ: حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، س۔ن۔ ص ۹۰

۳۱۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ھائے وفا، نقشِ فریادی، مکتبۂ کارواں، لاہور، س۔ن۔ ص ۸۶

۳۲۔ حسن حمیدی، کلیاتِ حسن حمیدی ''ریزہ ریزہ ہو یہ زنجیرِ گراں''، مرتب: سید توقیر حسن، حمیدیہ اکیڈمی، کراچی، جون ۲۰۱۱ء، ص ۶۴۲
۳۳۔ البقرہ ۲، آیت ۱۴۳ (مولانا فتح محمد جالندھری
۳۴۔ التوبہ ۹، آیت ۱۰۵ (مولانا فتح محمد جالندھری
۳۵۔ النساء ۴، آیت ۱۱۵ (مولانا فتح محمد جالندھری
۳۶۔ المآئدہ ۵، آیت ۵۵ (ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی
۳۷۔ المآئدہ ۵، آیت ۵۶ (ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی)
۳۸۔ المجادلۃ ۵۸، آیت ۲۲ (ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی
۳۹۔ الانعام ۶، آیت ۵۴ (ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی)
۴۰۔ الاحزاب ۳۳، آیت ۲۳ (ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی)
۴۱۔ الفتح ۴۸، آیت ۲۶ (فیوض القرآن، ڈاکٹر، سید حامد حسن بلگرامی)
۴۲۔ الفتح ۴۸، آیت ۱۸ (فیوض القرآن، ڈاکٹر، سید حامد حسن بلگرامی)
۴۳۔ الحجرات ۴۹، آیت ۳ (فیوض القرآن، ڈاکٹر، سید حامد حسن بلگرامی)
۴۴۔ سورۃ الفتح ۴۸، آیت ۲۹ ... (ترجمہ: محمد کرم شاہ الازہریؒ)
۴۵۔ طبرانی حاکم نے عویم بن ساعدہ سے نقل کیا...... (کنز العمال، جلد ششم، ص ۲۵۵، حدیث ۳۲۴۶۳)
۴۶۔ ۵:۱۵، ترجمہ کنز الایمان
۴۷۔ سورۂ النحل کی آیت ۱۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ''وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ'' o (اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ پاتے ہیں)
۴۸۔ الاحزاب ۳۳، آیت ۲۱، فیوض القرآن، ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی، ص ۹۸۰
۴۹۔ النساء ۴، آیت ۸۰، فیوض القرآن، جلد ۱ ص ۱۹۸
۵۰۔ قومی انگریزی لُغت، ادارہ فروغِ قومی زبان، پاکستان
۵۱۔ بخاری شریف، جلد ۳، ص ۲۴۶، انگریزی ترجمہ، مترجم: پروفیسر عرفان قادری، فرید بک اسٹال، اردو بازار، لاہور، جون ۲۰۱۳ء
۵۲۔ دیوانِ حضرت حسّان بن ثابت انصاری، تحقیق و ترجمہ: مولانا محمد اویس سرور، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن۔ ص 386
۵۳۔ دیوانِ حضرت حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ، تحقیق و ترجمہ: مولانا محمد اویس سرور، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن، ص 33

۵۴۔ دیوانِ حسّانؓ، ص ۱۰۴
۵۵۔ دیوانِ حسّانؓ، ص438
۵۶۔ نعتِ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم درشعرِ فارسی.....گردآوردہ، سید ضیاء الدین دھشری، ص ۱۰۲
۵۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۵۸۔ مشمولہ: ارمغانِ نعت، مرتبہ: شفیق بریلوی، نفیس اکیڈمی، طبع چہارم، ص ۵۷، س۔ن
۵۹۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، کلیاتِ غالب فارسی [حصہ اول]، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طباعتِ دوم: ۲۰۱۱ء، ص ۴۱۶
۶۰۔ ملانصرتی، ''نصرتی''، مؤلفہ: ڈاکٹر عبدالحق، کل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی، اشاعتِ ثانی ۱۹۶۱ء، ص ۳۴
۶۱۔ میر حسن دھلوی، مثنوی سحر البیان، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص ۲۲
۶۲۔ مرزا محمد رفیع سودآ، کلیاتِ سودآ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲
۶۳۔ مشکٰوۃ شریف، جلد سوم: حدیث نمبر ۱۵۸۴، ص ۲۴۱
۶۴۔ ابنِ ماجہ، جلد اول، ص ۶۳، حدیث ۱۱۲
۶۵۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی، طبع ثانی: ۱۹۸۷ء، ص ۳۷۳
۶۶۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، دبستانِ لکھنؤ، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ص ۶۵۲
۶۷۔ احمد رضا خاںؒ بریلوی، حدائقِ بخشش، [شرح الکلامِ رضاؒ]، مشتاق بک کارنر، لاہور، س۔ن
۶۸۔ حضرت داتا گنج بخش علی بن عثمان الہجویری، کشف المحجوب، زاویہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۵
۶۹۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، کلیاتِ غالب فارسی [حصہ اول]، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، طباعتِ دوم: ۲۰۱۱ء، ص ۳۰۱

□□□

اصحابؓ ہیں یوں شاہِ رسولاں کے اردگرد
جیسے ستارے ماہِ درخشاں کے اردگرد
حسنینؓ یوں حضورؐ کے آغوش و دوش پر
اعراب جیسے آیۂ قرآں کے اردگرد

(صبیح رحمانی)

منقبت نویسی: سماجی تناظر اور اثرات

ڈاکٹر طارق ہاشمی

ABSTRACT: Finding and describing the character, virtues and qualities of a person is called Manqabat and if seen in the context of speech, the systematic description of these qualities will be called Manqabat. But this word is especially used in the poems written in praise of Hazrat Ali. Of course, the praise of companions of holly prophet and other religious personalities also falls in the same category.

Manqabat has been declared as a poetry genre and its popularity is also continuously increasing in some religious circles and it is very rare that the Manqabat writer has been limited to praise. He express his faith in a veiled manner and challenges and mocks another class under the veil of praise. There is something that is perfect faith for the Creator, but it is not worthy of recognition for any other person or class.

There has been an increase in religious sensitivity in our society in the last few years and Manqabat writing is a process which is the reason for the increase in said sensitivity or it should be said that Manqabat writing is being promoted as a result of the increase in religious sensitivity.

اردو شاعری میں بعض مضامینِ شعر ایسے بھی ہیں جو بعد ازاں صنف کی حیثیت اختیار کر گئے لیکن اس سے بڑھ کر دلچسپ و عجیب امر یہ ہے کہ محققین نے مضامینِ سخن کے صنفِ سخن بن جانے کے نہ تو زمانی تعین کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ، نہ ہی ایسا کوئی سوال قائم کیا کہ شعر و ادب میں ان کی صنفی حیثیت کی کس حد تک گنجائش ہے اور اس کے سماجی اثرات کیا مرتب ہوں گے؟

ایسے ہی ایک مضمونِ سخن منقبت نویسی بھی ہے جسے رقم کرنے کے لیے شعرا کوئی مخصوص ہیئت

اختیار نہیں کرتے بلکہ کسی بھی ساخت میں اپنے توصیفی مضامین ادا کرتے ہیں۔قصیدہ چونکہ ایسی صنف رہی ہے جو مدح کی صورت میں کسی کی تعریف وتوصیف کے لیے خاص تھی تو ہمیں ایسے قصیدوں کی تعداد بھی بہ کثرت نظر آتی ہے،جن کا موضوع کسی بزرگ مذہبی ہستی کی توصیف تھا۔ فارسی شاعری اور اردو کی کلاسیکی شاعری کی روایت میں منقبت کا موضوع جزوی طور پر بعض دیگر اصناف خصوصاً مثنوی میں بھی ملتا ہے۔

فی زمانہ منقبت کو نہ صرف ایک شعری صنف قرار دے دیا گیا ہے بلکہ بعض مذہبی حلقوں میں اس کی مقبولیت میں اضافہ بھی تسلسل سے ہورہا ہے۔منقبت کیا ہے اور اس میں پیش کیے جانے والے متن کا کیا موضوع یا موضوعات ہوتے ہیں؟ اس بارے میں اہلِ نظر نے کوئی جامع رائے دینے سے گریز کیا ہے۔میر کی منقبت نویسی پر ایک طویل مضمون رقم کرتے ہوئے محمد طفیل احمد مصباحی لکھتے ہیں :

> ''شروع میں منقبت نگاری صرف خاندانِ نبوت کے افراد یعنی اہلِ بیت وآئمۂ اہل بیت اور بالخصوص حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش تک محدود تھی، لیکن بعد میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور اہلِ بیتِ اطہار کے علاوہ جملہ اولیائے کاملین ومشائخِ عظام کی تعریف وثنا کو''منقبت''کہا جانے لگا۔''(1)

مذکورہ رائے میں ایسے کسی واضح زمانی تعین کی کوشش نہیں کی گئی،جس سے یہ معلوم ہو کہ منقبت کے موضوع میں وسعت کب آئی ؟ یہ وسعت پہلے کن وجوہ کی بنیاد پر نہیں تھی اور جب اس میں وسعت آ گئی تو اس کے دائرہ سخن میں کون کون سی ہستیاں آئیں؟''جملہ اولیائے کاملین ومشائخِ عظام'' سے ظاہر ہے کہ ہر وہ ہستی جو سماج میں مذہبی طور پر معتبر قرار پائی ہے،منقبت کا موضوع بن سکتی ہے۔

شاعری کے تخلیقی عمل میں شاعر کا کسی ہستی سے متاثر ہونا اور اسے اپنی تخلیق کا موضوع بنانا فطری امر ہے اور اس کی عالمی سطح پر ایک روایت بھی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ منقبت بھی ایسی ہی تخلیق ہوتی ہے۔لیکن اردو میں منقبت نگاری کی روایت ملاحظہ کریں تو معاملہ اس قدر سادہ نہیں کہ کوئی شاعر کسی ہستی سے متاثر ہوا ہو اور اس نے ایک منظوم مدح نامہ رقم کردیا ہو۔ذیل میں میر کی ایک منقبت کا بند ملاحظہ ہو:

منقبت خوانی سے میری سب ہیں سُن اِس سوا مجھ میں نہیں ہے کوئی گُن
ساتھ سُر کے ہے''علی گوئی''کی دُھن مدّعی اِس کان یا اُس کان سُن
حیدری ہوں ، حیدری ہوں ، حیدری

اس بند میں''علی گوئی''کی ترکیب بلکہ وضعِ اصطلاح،تعلّی کا اظہار کرتے ہوئے سامعین کے سُن ہونے کا ذکر،سامعین کو کُلی یا اُن میں سے کسی کو جزوی طور پر مدعی کہ کر طنزیہ پیرائے میں پکارنا اور آخر

میں تکرار کے ساتھ حیدری ہونے کا اعلان، یہ سب عناصر ظاہر کررہے ہیں کہ شاعر کا مقصد محض توصیفِ علی یا خود کو مداحِ علی قرار دینا نہیں بلکہ اس کے شعور و لاشعور میں کچھ اور بھی چل رہا ہے۔

یہ اسلوب ظاہر کررہا ہے کہ تخلیق کار ایک خاص طرح کا اندازِ فکر اور طرزِ احساس رکھتا ہے نیز وہ اپنے مسلکی مخالفین کا ٹھٹھا اڑاتے ہوئے انھیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اسے اپنے مسلک پر فخر ہے۔

اردو میں منقبت نگاری کی روایت کو دیکھیں تو ایسا بہت کم ہوا ہے کہ منقبت نگار محض مدح و توصیف تک محدود رہا ہو۔ وہ اپنے مسلک اور عقیدے کا برملا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ مدح کے پردے میں ایک دوسرے طبقے کو للکارتا اور طنز کا نشانہ بھی بناتا ہے۔ شاعر کا یہ کام کبھی واضح تو کبھی اشارے کنائے میں ہوتا ہے لیکن وہ جس شخصیت کو موضوع بناتا ہے، اس کے مخالف یا طبقہ مخالف کو کسی نہ کسی طرح طنز کا ہدف بنائے بغیر رہتا نہیں۔

منقبت نویس اگر ایسا نہیں بھی کرتا تو اس کے پیش کیے گئے خیالات کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ضرور ہوتا ہے جو تخلیق کار کے نزدیک تو ایمانِ کامل ہوتا ہے لیکن کسی دوسرے فرد یا طبقے کے لیے لائقِ تسلیم ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں عبدالعزیز خالد کا یہ شعر:

اے پیکرِ صداقت و اے صاحبِ نظر!
بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر!

اس شعر کے مضمون میں ممکن ہے کہ ایک طبقے کو کسی نوع کا مبالغہ محسوس نہ ہو لیکن کسی دوسرے طبقے کے نزدیک یہ شعر خلافِ حقیقت ہوسکتا ہے۔

اسی طرح حسنی سید کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں مبالغے کا اظہار ایک ایسی خوش گمانی کی بنیاد پر کیا گیا ہے جو محض برائے تخلیقِ منقبت ہے:

علی حسنین کے چہروں سے چہرہ ملتا جلتا ہے
مرے داتا نبی سے تیرا نقشہ ملتا جلتا ہے

منقبت میں مبالغے سے کیا کیا مسائل پیدا ہوئے ہیں، اس موضوع پر ایک الگ مضمون درکار ہے لیکن سرِ دست اقبال کی نظم "التجائے مسافر" (بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی، دہلی) کا ایک بند ملاحظہ ہو:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا بڑی جناب تری، فیضِ عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں روشن نظامِ مہر کی صورت، نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

اس بند میں پیش کیے گئے مضامین کی حد مضامینِ نعت کو مَس کر رہی ہے اور آخری مصرعے میں ممدوح کے مقام کی رفعت جس پیرائے میں بیان کی گئی ہے، وہ محض مبالغہ ہی نہیں، بہت حد تک لائقِ گرفت بھی ہے۔ اب اگر اقبال ایسا محتاط سخن ور بھی منقبت رقم کرتے ہوئے مبالغے کی اس حد کو چھو سکتا ہے تو کسی اور شاعر سے دامنِ احتیاط تھامے رکھنے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کی ایک منقبت سے بھی کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھ پر بھی اک نظر شہِ والائے کربلا کوثر کے انتظار میں ہوں کب سے تشنہ کام
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا جوہر! مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز

شعر کا تخلیقی عمل اپنے اندر عالمگیریت رکھتا ہے۔ ہر مکاں اور ہر زماں شعرا نے اپنے جذبات متنوع پیرایوں میں بیان کیے ہیں۔ عالمی سطح پر مختلف زبانوں اور سماجوں میں شاعری کا تخلیقی عمل اسالیب اور اصناف میں ایک دوسرے مختلف ہونے کے باوجود ایک اشتراک کا عمل بھی رکھتا ہے۔ اس اشتراک میں یہ امر بہ طورِ خاص لائقِ ذکر ہے کہ شعرا نے اپنے ذاتی اور سماجی احساسات رقم کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب سے جڑے طرزِ احساس کو بھی اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے۔

مذہبی طرزِ احساس سے وابستہ ادبی متون کو دیکھا جائے تو شعرا نے مقدس ہستیوں کے لیے تخلیقات رقم کی ہیں۔ ان تخلیقات کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ شعرا نے کن ہستیوں کے لیے اپنے جذباتِ محبت منظوم کیے ہیں۔ مذکورہ تحمیدی عالمی روایت کو مناقب کی روشنی میں دیکھتے ہوئے سید شبیہ الحسن نے ایک نقطہ یہ بیان کیا ہے:

> ''آپ عالمی ادب کا مطالعہ کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں حق و صداقت کی علم بردار شخصیتوں کے لیے ہمیشہ تحسینی کلمات ہی ملتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہر قوم اپنے مذہبی معتقدات کو اہمیت دیتی ہے اور اعتقادات کی مضبوطی صرف نظریات ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے کچھ نفوس بھی درکار ہوتے ہیں۔''(2)

عالمی ادب سے اگر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مراد وہ ادب ہے جس کا تعلق صرف مسلم روایت سے ہے تو شعرا نے اپنے ہر طرح اور ہر سطح کے دینی ممدوحین کے لیے نظمیں ضرور رقم کی ہیں لیکن عالمی سطح پر اگر دیگر مذاہب کی روایت کو دیکھیں تو وہ ہستی کہ جس کے وہ پیروکار ہیں، ان کے لیے تو تحمیدی تخلیقات ضرور رقم کی گئی ہیں، لیکن اپنے نبی کے علاوہ اور خصوصاً نبی کے بعد کسی ہستی کے لیے کوئی حرفِ تحسین رقم کرنے کی روایت کم یا بالکل ہی نظر نہیں آتی۔

سماجی سطح پر بھی مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے معتقدین کے لیے ان کے نبی کی ہستی ہی اتنی معظم ومکرم ہوتی ہے کہ بعدِ نبی کسی فرد کی تحسین تو کجا اس کا ذکر بھی کچھ خاص اہتمام سے نہیں کیا جاتا۔

تقابلِ ادیان کے سلسلے میں ایک نہایت اہم اور حساس نکتہ جس پر ہماری مذہبی دانش نے شاید غور نہیں کیا کہ مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والے اپنے نبی کے بعد کسی ہستی کو بہ طور ایک مقدس ہستی کے کم ہی تسلیم کرتے ہیں۔ یہودی حضرتِ موسیٰ اور مسیحی حضرتِ عیسیٰ کے بعد اپنی مذہبی تاریخ میں کسی بھی فرد کو کوئی ایسا مقدس مقام نہیں دیتے کہ ان کی تعلیمات پر کتب رقم کی جائیں یا ان کی ہستی پر توصیفی ادب تخلیق کیا جائے۔ تاریخ میں بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ وہ اس کے ذکر یا مذہبی خدمات کا اس حد تک ذکر کریں کہ وہ ان کے لیے ایک مقدس ہستی کا درجہ اختیار کر جائے۔

دیگر مذاہب کے معتقدین کے برعکس اہلِ اسلام نے فقہ، مسلک اور سلسلے کے تحت مختلف مدوں اور درجوں میں مقدس ہستیوں کی ایک طویل بلکہ لامتناہی فہرست تیار کی ہوئی ہے جن میں سے بعض ان کے لیے لائقِ تقلید بھی ہیں۔

یہاں کسی فرد یا طبقے کے عقیدے پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں لیکن اس تلخ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اہلِ اسلام جس ایک عقیدے کی حساس حد تک تحفظ کی بات کرتے ہیں، سماجی اور عملی سطح پر اتنا ہی دامنِ احتیاط ہاتھ سے جانے دیا ہے اور نبی کے بعد کئی ایک ہستیوں کو لائقِ تقلید درجے عطا کر دیے ہیں، حتیٰ کہ مذہب کے بعض معاملات کے شارحین کو بھی شارعین کا مقام دے دیا ہے۔ اب اس امر کا کیا کیا جائے کہ مذکورہ افراد وطبقات نے نبوت کے بعد اس سے مماثل کئی ایک اصطلاحات وضع کر کے انھیں نبوت کا تسلسل قرار دے دیا ہے۔ یہ ایسا سانحہ ہے جو شاید کسی اور مذہب میں نہیں ہوا اور اگر کہیں ماضی میں ہوا بھی تو اب ماضی ہی کا قصہ پارینہ ہے۔

دیگر الہامی مذاہب کے برعکس یہ حادثہ شاید صرف مسلمانوں کے ساتھ رونما ہوا ہے کہ ان پر نظریے سے زیادہ تاریخ کا بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ انھیں شرع ودین سے زیادہ واقعات اور شخصیات سے لگاؤ ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اہلِ اسلام نے تاریخ سے غیر ضروری دلچسپی ظاہر کی ہے۔ ایسی دلچسپی جو اُن کے مذہبی اعتقادات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی ویسے تو آغاز ہی سے نظر آتی ہے لیکن تاریخ نویسی کی بعض سماجی ضرورتوں کے تحت برصغیر کے مسلمانوں میں یہ نوآبادیاتی عہد میں پیدا ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔ فی زمانہ جس قدر کتبِ سیرت رقم کی گئی ہیں، ایک محتاط اندازے کے مطابق دیگر مذہبی ہستیوں کے بارے میں بھی ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں لکھی گئیں۔

نبی کے بعد کی شخصیات کی اہمیت اور تاریخ کے بعض واقعات سے غیر ضروری دلچسپی نے جہاں

سماجی سطح پر تقسیم اور فرقہ واریت کے راستے کھولے ہیں، وہاں منقبت نویسی کے عمل نے ان راستوں پر گامزن ہونے کا شعری سطح پر جذبہ و جوش فراہم کیا ہے۔ مذہب و مسلک کے نام پہ جو سماجی انتشار اور فرقہ پرستی کو فروغ مل رہا ہے اور منقبت نگار اس کا شعری اثبات کس طرح کر رہے ہیں، اس کے لیے ڈاکٹر ریاض مجید کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

''اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے کئی تخلیقی فنکار اور منقبت نگار اس افراط و تفریط کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں؟ مسلکی گروہ بندیوں اور فروعی اختلافات کے سبب ہمارے ذاکروں، مولویوں اور علمائے کرام میں ایسا عدم توازن ان دنوں بڑھتا جا رہا ہے۔ دین کی روح کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ مذہبی معاملات و عقائد میں (فروعی اختلافات کے باوجود) دین آپسی محبت، اخوت، بھائی چارے اور ایک دوسرے کو قریب لانے کا سبب بنتا ہے ایک دوسرے سے دوری اور باہمی نزاع کا سبب نہیں بنتا، اہلِ بیت اطہار اور صحابہ کرام حضور کے بھی امتیوں کے لیے برگزیدہ اور محترم شخصیات ہیں۔ نہ جانے بعض علماء و ذاکرانِ کرام مسلکی اختلافات کو ازلی دشمنی بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہے؟''(3)

برصغیر کے اسلامی سماج میں شخصیات کی عکس بندی اور واقعات کی نقشہ کشی جس پیرائے میں کی جاتی ہے، اس کی نتیجے میں تقسیم ایک فطری عمل ہے اور یہی وہ صورت ہے جو منقبت کے شعری عمل میں نظر آتی ہے۔ منقبت نویسی کے سلسلے میں منظر عارفی کی خدمات تخلیق کی سطح پر بھی ہیں اور تحقیق و ترتیب کے حوالے سے بھی۔ وہ منقبت کے معاصر منظر نامے کے تناظر میں بعض اخلاقیات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

'' اپنے ممدوح کے متعلق ایسی شاعری نہ کی جائے جس سے دوسرے صاحبانِ عز و شرف کا رد ہو یا ان کی توہین و تنقیص ثابت ہو جائے۔ ہمارے یہاں یہ رویہ بھی کثرت سے موجود ہے۔ میں نے دیکھا ہے بہت شعرا نے اگر حمد کہی ہے تو ایسے اشعار کہیں ہیں کہ حبیبِ خدا خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تک پر توہین اور تنقیص ثابت ہوگئی ہے۔ اگر نعت کہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی شان بھی تنقیص کا نشانہ بن گئی ہے۔ ایک بزرگ کی منقبت میں دوسرے بزرگوں کی عظمت و بزرگی کا جنازہ اٹھا دیا گیا ہے۔ اس قسم کے رویے اپنے مدوح کے ساتھ محبت و عقیدت نہیں بلکہ ظلم کو ثابت کرتے ہیں۔''(4)

اسی طرح مناقبِ خلفائے راشدین کے ایک مجموعۂ انتخاب کے دیباچے میں وہ بہ طور محقق و مرتب اپنی مشکل یوں بیان کرتے ہیں:

''میں نے اس کتاب میں مناقب کا انتخاب ایک کڑے معیار کے تحت کیا ہے۔ جو شعر میری سمجھ میں نہیں آئے، حذف کر دیے۔ اس بات کی بھی کوشش کی کہ حتی الامکان وہی شعر منتخب کروں جو روایت اور درایت کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہوں۔''(5)

روایت اور درایت کی کسوٹی کیا ہے؟ اس کا تعین ہمارے مذہبی ماحول میں کوئی ایک فرد نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں ہر طبقہ فکر نے اپنے اپنے معیارات تشکیل دیے ہوئے ہیں اور ہر طبقہ دوسرے کے معیار کو مشکل ہی سے تسلیم کرتا ہے۔

منقبت نویسی کے حوالے سے یہ روایت بطور جواز اکثر بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے خود حضرتِ حسان کو جنابِ ابوبکر صدیقؓ کے لیے مدحیہ اشعار کا فرمایا اور وہ اشعار خود بھی سماعت فرمائے۔

اس روایت سے انکار نہ بھی کیا جائے تو کتنے ایسے امور ہیں جو آپ کے عہد میں جائز اور مروّج تھے اور ہم فی زمانہ ان کی پیروی کر رہے ہوں۔ کیا عصری تقاضوں کے باعث وہ موقوف نہیں ہو گئے؟

اردو میں منقبت نویسی کی قدیم روایت قصائد کی صورت میں مکمل اور بعض اصناف کے جزو کے طور پر رہی ہے لیکن موضوعاتی نظم کی صورت میں اس کی جدید روایت کو دیکھیں تو یہ کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ قدیم اور جدید میں زمانی تقسیم کے علاوہ موضوع کا فرق یا وسعت بھی نمایاں ہے۔ قدیم روایت میں زیادہ تر موضوع اہلِ بیت اور بہ طورِ خاص حضرت علیؓ رہے ہیں جبکہ جدید روایت میں خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کے علاوہ ''جملہ اولیائے کاملین و مشائخِ عظام'' بھی شامل ہیں۔

منقبت نویسی کی جدید روایت میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ محض تخلیقی سطح پر جاری نہیں بلکہ مشاعروں کا انعقاد بھی ہونے لگا ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ موضوع کی یہ وسعت اور مشاعروں کا انعقاد فطری سے کہیں زیادہ شعوری ہے لیکن چونکہ ایسی کوئی روایت پہلے موجود نہیں تھی تو یہ شعوری عمل بھی سست روی کا شکار رہا۔ ''مناقب خلفائے راشدین اور شعرائے کراچی'' کے دیباچے میں منظر عارفی رقم طراز ہیں:

''جس طرح شہدائے کربلا اور اصحابِ اہلِ بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مناقب نگاری کے حوالے سے شعرا میں ایک تحریک موجود رہی اور موجود ہے، خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کے حوالے سے نظر نہیں آتی۔ اگرچہ چالیس پچاس سال پہلے اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ خلفائے راشدین کی

مناقب کے حوالے سے طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوئے۔ لیکن اُکا دُکا اور وہ بھی زیادہ تر خانقاہوں کے مشاعروں تک محدود رہے۔ ان مشاعروں کی رپورٹیں بھی شائع ہوئیں۔ جن میں مناقب کی اشاعت کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا گیا لیکن ایک یا زیادہ سے زیادہ دو تین شعر ہی شائع کیے گئے۔ عام مشاعروں یا شعری نشستوں کے طرز پر خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کی شان میں منقبتی مشاعرے تسلسل سے تو کیا، کبھی منعقد بھی نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مناقب خلفائے راشدین صحابہ کرام کی تخلیقی قوت اس سے زیادہ نہیں ہو سکی، جس کا یہ شعبہ متقاضی ہے۔ اردو شعرا نے عقیدتاً مناقب خلفائے راشدین کہیں لیکن کثیر تعداد میں شعرا کے ہاں ان کی تعداد ایک ایک ہی تک محدود رہی۔"(6)

منقبت نویسی کی مذکورہ سست روی گزشتہ دہائی سے ختم ہو چکی ہے۔ منقبت کے مجموعوں اور انتخابات کی اشاعت کا تسلسل بھی نمایاں ہے اور منقبت کے مشاعروں کے انعقاد میں تسلسل نظر آنے لگا ہے۔ نہ صرف مشاعرے بلکہ منقبت کی مجالس بھی تزک و احتشام سے منعقد ہونے لگی ہیں۔ اس تیزی کا سماجی سبب تلاش کیا جائے تو اس تحرک میں سماج کے اس خاص طبقے کا کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے ماضی میں ناموسِ صحابہ کو ایک تحریک کی شکل دی۔ اس تحریک نے پہلے پہل قوت اور شدت کا مظاہرہ کیا لیکن فی زمانہ سماج میں اپنے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے شعر و سخن کا راستہ بھی اختیار کر لیا ہے۔

منقبت نویسی کی مذکورہ جدید روایت ایک لحاظ سے اس قدیم روایت کا ایک متوازی دھارا ہے جو صرف اہلِ بیت تک محدود تھا۔ بہ اَلفاظ دیگر جدید روایت میں قدیم روایت کے مروج بیانیے کے ساتھ ساتھ متبادل بیانیے کو بھی اظہار کا موقع ملنے لگا ہے۔ جدید منقبت نویسی کے تحت مروج اور متبادل بیانیوں کی معرکہ آرائی کی صورت میں شعرا کے کیا کیا موضوعات اختیار کیے جا رہے ہیں اور ان موضوعات کے تناظر میں سماج پر کس نوع کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ ان کے حوالے سے اقبال کے ان لفظوں میں خبر داری کا عنصر ہی پیدا کیا جا سکتا ہے کہ:

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہُشیار باش
اے گرفتارِ ابُوبکرؓ و علیؓ ہُشیار باش

منقبت نویسی کی جانب رغبت اپنی جگہ لیکن ایک نکتہ جسے ہماری مذہبی دانش نے بہت نظر انداز کیا کہ یہ بدعت صرف اسلامی تاریخ میں وقوع پذیر ہوئی ہے کہ نبی کے بعد کی ہستیوں کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس اجتماعی سہو کا ازالہ شاید ممکن نہیں کہ یہ ایسا مغالطہ ہے جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے اور اسے دور کرنے

کا دھیان تو کیا، اسے محسوس ہی نہیں کیا گیا۔ کسی نے اپنے سامنے یہ سوال ہی نہیں رکھا کہ دیگر مذاہب کے معتقدین اپنے نبی کے متعلقین، ابتدائی پیروکاروں، ان کے دین کے اشاعت کاروں اور مبلغین ومشائخ کو اتنا محترم کیوں نہیں خیال کرتے کہ ان کی تحسین میں اس تواتر سے کتب رقم کریں یا تحسینی نظمیں لکھیں؟

دیگر الہامی مذاہب کے معتقدین کے لیے ہمارے خیالات جو بھی ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ ایک نبی کے پیروکار ہیں، دنیا بھر میں ان کی ایک کثیر تعداد ہے، ان کے مذہبی اعتقادات ہیں، عبادت گاہیں اور عبادات ہیں اور ان کی تمام تر مذہبی کاوشوں کا مرکز ومحور ان کے پیمبر ہیں۔ بعض مصلحین نے سماجی سطح پر اصلاحات ضرور کی ہیں لیکن ان مذاہب کے پیروکاروں کے لیے محترم ومکرم ہستی صرف ان کے پیمبر ہیں۔ وہ اپنی مذہبی تحسینات میں کسی مصلح، مفکر ومبلغ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس سلسلے میں چند استثنائی مثالیں تو شاید مل جائیں لیکن کوئی جامع روایت دستیاب نہیں۔

یہ حادثہ شاید صرف مسلم تاریخ میں ہوا ہے کہ کسی بھی فرد نے مذہب کے لیے کچھ خدمات انجام دیں تو ان کے پیروکار بھی پیدا ہو گئے، ان پیروکاروں کا ایک گروہ بھی بن گیا اور اس گروہ نے بعد ازاں اپنے مخدومِ دینی کے لیے کتب اور شاعری کی صورت تحسینات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

منقبت نویسی کا سب سے حساس پہلو شخصیت پرستی کا عنصر ہے۔ شخصیت پرستی کے سلسلے میں یہ پہلو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے سلاسل ہوں یا فقہی مسالک، ان کی وجہِ تسمیہ یا تو کوئی شخصیت ہوتی ہے یا کوئی مخصوص خطہ۔ اور یہ افسوس ناک امر ہے کہ اس شخصیت اور خطے کو اپنے نام کے ساتھ بہ طور لاحقہ لگا کر اپنی مستقل نسبت بھی ظاہر کی جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں وہ جملہ افراد جنھیں کسی بھی وجہ سے تقدس کا درجہ نصیب ہو گیا، ہماری منقبت نویسی کا موضوع بن گئے اور منقبت نویسوں نے تقدیس کا درجہ پانے والی ہستیوں کے بارے میں جس نوع کی شاعری کی ہے، اس میں اپنے ممدوح کو کس طرح یاد کیا گیا ہے، اس کے طرزِ تحسین کی چند امثال مضمون کے آغاز میں پیش کی جا چکی ہیں۔

ہمارے سماج میں گزشتہ چند برسوں میں مسلکی حساسیت میں اضافہ ہوا ہے اور منقبت نویسی ایسا عمل ہے جو مذکورہ حساسیت میں اضافے کا سبب ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ مسلکی حساسیت میں اضافے کے نتیجے میں منقبت نویسی کو فروغ مل رہا ہے۔ مسلکی حساسیت کے باعث کن سماجی مسائل نے جنم لیا اور معاشرتی انتشار کا کیسا بحران پیدا ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ ایسے میں شعر کے تخلیقی عمل کے ذریعے اس حساسیت کو سماج کی نفسیات کا مستقل حصہ بنانا کوئی مثبت قدم ہرگز نہ ہوگا۔

شاعری کے مقاصد کیا ہیں؟ یہاں اس بحث کا محل ہے نہ گنجائش، لیکن یہ ضرور طے ہے کہ شاعر کو

سماج کی عام فکر اور طرزِ عمل سے کچھ ہٹ کے سوچنا ہوتا ہے۔ تخلیق کار معاشرے میں تبدیلی کا خواہاں رہتا ہے۔ ایسے میں جبکہ معاشرے میں مذہبی شدت پسندی میں اضافے کے باعث مسلکی حساسیت انتشار پیدا کر رہی ہے، اہلِ قلم کو اس صورتِ حال کا فہم حاصل کرتے ہوئے سماج میں مرکز جوئی کے عمل کی طرف وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

اس تقاضائے عصر کی تکمیل کے لیے منقبت نویسی سے رغبت رکھنے والے سخن کاروں کو اپنے باطن سے بہت سے سوالات کرنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ صدیوں سے اذہان کو جن فکری جہتوں کی طرف مائل کیا گیا ہے، ان سے پلٹنے کے لیے ایک عظیم اجتہادی ہمت و حوصلہ بھی درکار ہے۔

اس حقیقت کا ادراک بہ ہر حال ضروری ہے کہ اختلافات کے دشت میں سفر کرتے کرتے ہم بہت دور نکل آئے ہیں اور اب یک جہتی و یکسوئی کے راستے پر گامزن ہونا ناگزیر ہے اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ہم کثرتِ ممدوحین سے گریز کرتے ہوئے صرف اس ایک ذات کی مدح خوانی کریں جو ہماری وحدت کا مرکزی نشان ہے۔ جس نے اپنی سیرت سے شیر و شکر ہونے کا درس بھی دیا اور اس کے اصول بھی باور کرائے۔ یہ اصول ہم فراموش کر چکے ہیں لیکن اگر ایک صف تشکیل دے کر ہم یہ ترانہ سرمدی پڑھیں تو ہماری یادداشت واپس بھی آسکتی ہے:

یا صاحب الجمال و یا سیّدالبشر　　من وجھک المنیر لقد نورالقمر
لا یمکن الثنا و کما کان حقہ　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حوالہ جات:

1۔ http//:www.mushahidrazvi.com/2020/01/meer-taqi-meer-ki-manqabat-nigari.html

2۔ https//:salamurdu.com/urdu-manqabat.html

3۔ ڈاکٹر ریاض مجید۔ دیباچہ "اجمعین" از جہانداد منظر القادری، نایاب پبلی کیشنز، لاہور، 2024، ص15

4۔ منظر عارفی۔ "حنبل" ناشر مصنف از خود، 2019، ص5

5۔ منظر عارفی۔ "مناقبِ خلفائے راشدین اور شعرائے کراچی"، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، 2019، ص11

6۔ ایضاً، ص10

□□□

کلاسیکی اردو غزلوں میں منقبتی عناصر

ڈاکٹر شبیر احمد قادری

ABSTRACT: The main theme of the ghazal is the expression of beauty and love, with a focus on conveying the emotions of the heart. In early ghazals, themes such as love, the lover, the beloved, and the rival appear frequently. Over time, the genre evolved to include elements of moral advice, Sufism, and philosophy, and poets also began to incorporate praise of religious figures into ghazals. The article titled "Elements of Manqabat in Classical Urdu Ghazals" examines the presence of Manqabat in the works of key poets, from Quli Qutb Shah, a prominent figure of the early Urdu period, to Dagh Dehlvi, the last major poet of the nineteenth century. The author adopts a research-based approach rather than a critical one, and while the article is average in terms of content and presentation, it includes brief biographies of the poets, the titles of their poetry collections, and relevant examples of Manqabat poetry.

نعت گوئی کے ضمن میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اس کی آبیاری اور نشو و نما کے لیے زیادہ تر ارضِ غزل ہی راس آئی اور اسی میں پھل پھول کر وہ تناور اور چھتنار شجر بنی۔ شجرِ سایہ دار، پر بہار، جس کی چھاؤں میں عقیدت مندوں کو راحت ملتی ہے اور اُلفتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چراغ کی لو کو تیز کرنے کی سعی ثواب خیز کرتے ہیں۔ غزل اپنے گوناگوں اوصاف و کمالات کی بنا پر شعرا کی خاص توجہ کا مرکز قرار پائی۔ اس کی پرداخت فارسی زبان کے زیرِ اثر ضرور ہوئی، تاہم یہ اردو زبان کے مجموعی مزاج سے بھی حیران کن حد تک مانوس ہے۔ فارسی سے درآمدہ الفاظ و تراکیب و مرکبات کے ساتھ ساتھ تشبیہی، استعاراتی اور علامتی عناصرِ شعری بھی اس نے وہیں سے لیے۔ فارسی زبان، اردو والوں کے لیے کسی بھی دور میں اجنبی نہیں رہی۔ آج کی غزل کے رنگ اور بھی شوخ ہو گئے ہیں۔ جمالیاتی، رومانی، نفسیاتی، مارکسی، سماجی ثقافتی، سائنسی اثرات زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی (۹اگست ۱۹۲۷ء اعظم گڑھ- یکم جون ۱۹۷۸ءعلی گڑھ) نے غزل کو اپنے زمانے کی رُوح سے ہم آہنگ قرار دیا، جس کی بنا پر وہ ''ایک نوع کی تازگی رکھتی ہے، مگر اپنے زمانے کے حصار میں اس قدر محصور نہ ہو کہ آنے والا کل اسے پرانی بنا دے۔ کلاسیکی غزل سے اس کی وابستگی کسی نہ کسی حد تک ضروری ہے۔ اس کا باطن اس دائمی اور آفاقی روح سے ہم آہنگ ہو، جو شاعری کو دیر پا اور مستقل حیثیت کا حامل بناتا ہے، تو نئی غزل کی حیثیت سے بھی وہ معتبر سمجھی جائے گی۔'' (۱) آج کی شاعری میں روایت اور جدت دونوں رنگ ملتے ہیں۔ نہ اسے عہدِ ماضی کا ہو بہو عکس قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ جدت کی حدت اسے مکمل طور پر پگھلا سکتی ہے۔ اچھی شاعری حُسنِ توازن ہی سے ظہور کرتی ہے۔ اس تناظر میں سید عابد علی عابد (۱۲دسمبر ۱۹۰۶ء-۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء، پشاور) کی یہ رائے صد فی صد درست ہے کہ ''غزل میں آہنگِ احساس اور آہنگِ سماعی کا جو ایک لطیف ربط قائم ہوجاتا ہے، اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ بحر، قافیہ اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں کی جوہری انفرادیت اور تاثیر میں اضافہ ہوجاتا ہے اور انہیں سن کر تحت شعور کی بھولی بھالی بسری یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔'' (۲) یعنی بحر، قافیہ اور ردیف اظہار کی راہ میں روڑے اٹکانے کے بجائے لفظوں اور تراکیب کی معاونت سے مصرعوں کے درمیان ایک معنوی ربط پیدا کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ بحر، قافیہ اور ردیف عروسِ غزل کا زیور ہیں۔ مستزاد یہ کہ کہیں تشبیہ، کہیں استعارہ، کہیں رمز، کہیں کنایہ، کہیں معاملہ بندی ہے اور کہیں اظہارِ غم، کہیں انتہاؤں کو چھوتی ہوئی سنجیدگی ہے اور کہیں شوخی اور طنز کے نشتر، کہیں سرمستی اور لے کاری ہے اور کہیں موضوعات کی رنگا رنگی، کہیں سیاست کے رنگ اپنی چھب دکھاتے ہیں اور کہیں سماجی زاویے اس انداز سے ابھرتے ہیں کہ رشک آتا ہے۔ کہیں تہذیبی امور کی پذیرائی ہے اور ثقافت کی خوشبو مشامِ ذوق کو مسحور کر دیتی ہے۔ شاعر بلاغت اور فصاحت کی لطافتوں سے بھی خوب آگاہ ہوتا ہے اور علامت کے تنوع سے قاری حیرتوں میں گم ہوجاتا ہے۔ یعنی شاعر کو سیدھے سبھاؤ بات کرنا خوش نہیں آتا۔ ایک رکھ رکھاؤ ہے جسے وہ حاصل شعر گردانتا ہے۔ غزل کی مقبولیت کا بڑا سبب اس کی نئی مضامین و موضوعات کو قبول کرنے کا خوش کن روش ہے جو بالعموم دوسری اصناف میں بھی ہیں، مگر کم کم۔ غزل ان سب سے بڑھ کر ہے، مختلف ہے۔ غزل نے شروع ہی سے ولی دکنی کی یہ رائے پلے باندھ لی:

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن (۳)

ڈاکٹر نثار ترابی ایسے انسانی جذبات کو غزل کا موضوع قرار دیتے ہیں جو داخلی طور پر ایک فرد کے ہیں، لیکن ان میں ابدی سچائیاں پنہاں ہیں۔ موصوف کے مطابق: ''غزل میں جب کوئی فرد اپنے کسی

ذاتی اور انفرادی تجربے یا مشاہدے کو بیان کرتا ہے تو وہ انفرادی اور ذاتی ہو کر بھی ایک طرح کے اجتماعی تجربے یا مشاہدے کے احساس سے مملو ہو جاتا ہے۔ جب شاعر خارجی حالات و واقعات سے براہِ راست متاثر ہو کر انھیں اپنے وجدان، خیال، احساس اور کیفیت سے آمیخت کر کے اپنے اندازِ بیاں میں سموتا ہے تو وہ کسی خیال کے عمل کو محض معروضی انداز میں بیان کرتا ہے۔ غزل روایت، تہذیب اور ایک زندہ معاشرے کے تسلسل کا نام ہے اور اسی تسلسل نے اسے آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس کی ہمارے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور فکر و فلسفہ کے ساتھ فطری مناسبت ہے۔ اس لیے کہ یہ خود انھی عناصر سے وجود پذیر ہوئی ہے۔'' (۴) غزل کی اساس محبت ہے اور یہ محبت کئی رنگوں اور کئی چہروں کے ساتھ سطحِ قرطاس کو آراستہ کرتی ہے۔ کہیں شادیانے ہیں تو کہیں آہِ شرر افشاں، کہیں طلوعِ صبح ہے تو کہیں شبِ یلدا اور شبِ دیجور کی حکمرانی، شاعر کہیں آزادہ روی سے نہال ہے تو کہیں محبوسِ قفس ہونے پر اداسی کی پرچھائیاں اسے بے چین کر رہی ہیں، مضمونِ تازہ قالبِ معنی میں ڈھل گیا تو خوش، انقباضِ فکر کا معاملہ ہو تو ناخوش، کہیں رخش گیر پر سوار ہے تو کہیں پیکانِ تیر پر گاہ خوش اور گاہ غمزدہ، فصلِ بہار میں لہلہاتے پھولوں کو دیکھ کر جھوم اٹھتا ہے اور خزاں دیدہ گلوں کو دیکھ کر نشترِ خارِ الم دل میں چبھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں چہرہ کشائی کے لیے بے تاب ہے اور کہیں خدنگِ نگہ سے زخمی، یہ اور اس نوع کی اَن گنت متضاد و متحارب زاویے ہیں جو غزل کو غزل کا حقیقی روپ دینے پر مستعد دکھائی دیتے ہیں۔

غزل کا مرکزی موضوع رومان ہے اور اس ضمن میں شعرا نے مضامینِ نو کے وہ انبار لگائے ہیں کہ خرمنِ نقد کے خوشہ چیں انگشت بدنداں ہیں۔ مزرعِ قرطاس میں وہ بیج بوئے ہیں جو شجرِ سایہ دار بن کر آرامِ جاں کے ساتھ نئے موضوعات سجھانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ دوسری جانب تقویتِ ایماں کا سامان بھی ہوتا رہا ہے، کہیں کم کہیں زیادہ۔ اس ذیل میں حمدِ باری تعالیٰ اور نعت بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد اہلِ بیت پنجتن پاک، خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ، صحابہ کرام اور شہدائے کربلا کے حضور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ مثنویوں، قصیدوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور بہت سی دیگر اصناف اور ہئیتوں میں مدح نگاری کے قابلِ ہزار رشک گلستان سجائے گئے۔ اس کے ساتھ غزلوں میں بھی حمد و نعت کے ساتھ مناقب کی دنیا آباد ہے۔ مکمل غزلیں بھی اس کارِ خیر کے لیے وقف کی گئیں، تاہم ایسی غزلوں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے جن میں ایک یا دو شعر مدح و منقبت کے شامل ہیں۔ اس مضمون میں صرف کلاسیکی غزل کے منتخب شعرا کے ہاں گل ہائے مناقب پیش کرنے کے قرینوں پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔ فی نفسہٖ یہ موضوع اس وجہ سے بسیط ہے کہ اس پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ منقبت کے ان اشعار ہیں بالخصوص اور اُردو غزل میں بالخصوص نئے الفاظ، تراکیب، مرکبات، تشبیہات، استعارات، تلمیحات

کا بیش قیمت اضافہ ہوا کہ دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیض یافتہ جس صحابی کی شان بیان کی گئی، اس کے نام اور اوصاف و کمالات خانۂ ادب میں نئی مہک لے کر آئے۔ نہ صرف شاعر کا وقار بلند ہوا، بلکہ مجموعی طور پر شعر و ادب کو بھی اعتبار اور اعتماد ملا۔ مثال کے طور پر واقعۂ کربلا اور شہدا کے بیان سے نثر اور شاعری میں سیکڑوں نئے الفاظ داخل ہوئے جن کا مخزونہ لغات، فرہنگیں اور دوائر ہیں اور دواوین اور کلیات بھی۔ مستزاد یہ کہ دشمنانِ صحابہ کے نام تک استحصال اور کینہ و خصومت کی علامت بن گئے۔ گویا منقبت مدح و ستائش کے ساتھ ساتھ عدو کی ہجو و مذمت کا نشان بھی ہے۔ حق کی حمایت اور باطل کے استرداد کا وسیلہ بھی ہے۔ اور یہی حقیقتِ نفس الامری ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ہے:

یا یہا الذین امنو تقو اللہ و کونو مع الصادقین (۵)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''

شعرا نے منقبتی اشعار میں سچوں کی تعریف اور ستائش کر کے گویا اسی حکمِ الٰہی کی تعمیل کی سبیل نکالی ہے۔ کلاسیکی عہد کے متقدمین ہوں، متوسطین یا امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی کے عہد کے متاخرین شعرا، انھوں نے غزلوں میں مدحِ صحابہ کے کئی مثالی نمونے سطحِ قرطاس کی زینت بنائے۔ اپنے عقیدے اور عقیدت کی فروانی کی مثالیں اور شاعرانہ مبالغے کی حکمرانی کے نمونے بھی دواوین اور کلیات کے اوراق پر ثبت ہیں۔ سو یہ کوشش کی گئی ہے کہ حد درجہ مبالغے پر مبنی اشعار سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نسبتاً معتدل اشعار ہی اس مضمون میں شامل کیے جائیں۔

ابتدائی عہد کے اُردو شعرا میں محمد قلی قطب شاہ (۱۴ اپریل ۱۵۶۵ء گولکنڈہ - ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء حیدرآباد) کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی دور کے پانچویں بادشاہ (۵ جون ۱۵۸۰ء تا ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء) تھے۔ انھوں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے حمد، نعت کے ساتھ صحابہ کرام اور اہلِ بیت کی شان میں مناقب لکھیں۔ قصیدے، مثنویاں، مرثیے بھی لکھے۔ ان کی شاعری میں عربی، فارسی کے ساتھ ہندی زبان کے الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں میں دیگر موضوعات کے ساتھ منقبت پر مبنی اشعار بھی ملتے ہیں:

دو عالم کے دوارے کھلتے ہیں عیش کی خاطر ۔۔۔ جے کوئی نبی نام سوں دل رام دوئے گا
جے دل میں محبت علی و آل علی نا ہا اسے خون جگر داروئے ناکام دوئے گا
نہ کھا غم توں زمانے کو ترا کام خدا سوں ہر اک پستی منے تج کوں بلند نام دوئے گا (۶)

نبی صدقے قطب شاہ دو جگت میں
علی کا مہر تج سر درۃ التاج (۷)

بسا سو برس لک قطبؔ زماں اس جگ میں جینے تئیں
ازل دن تھے دیئے لکھ کر دیا تھا پنجتن تعویذ (۸)

محمد ہور علی کا نام لے کر قطبؔ شاہ جیتا
سو پنچپل کے دو جوبن گڑ وہ تس اوپر کے بھی تن تعویذ (۹)

یہ پوری غزل مدح و منقبت پر مبنی ہے:

دو جگ منے کنج کوں اہے کرتار معاذ — بندا ہوں اسی کا وہی برٹھار معاذ
امت ہوں محمد کا کروں شکر خدا — توں ہے منجے جم احمد مختار معاذ
پایا ہوں ملک کوٹ انن پیار تھے میں — منج کوں ہے سدا حیدر کرار معاذ
پنجتن کا منجے داس کیا پیار تھے حق — پنجتن ہیں ازل تھے منجے ہر بار معاذ
اللہ، محمد، علی ہور بارہ امام — یوسب اہیں قطباؔ کے سو آپار معاذ (۱۰)

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے مطابق: ''دکن میں مرثیہ نگاری کو سازگار ماحول ملا تھا۔ سلطنت قطب شاہیہ کا بانی سلطان قلی (۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ) مذہباً شیعہ تھا۔ جب محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ تا ۹۲۴ھ) نے اس کو ۹۰۱ھ میں تلنگانہ کا ''طرف دار'' بنایا تو اس نے ایرانی علما کی رہبری میں گولکنڈے میں تعزیہ داری کی بنیاد ڈالی۔ گولکنڈے کا پانچواں حکمران محمد قلی قطب شاہ راسخ العقیدہ شیعہ تھا۔ اگر محمد قلی دس مہینے مہ جبینوں کے جھرمٹ میں گزار دیتا اور شغلِ مے و مینا میں مصروف رہتا تھا تو دو مہینے پارسائی میں بسر کرتا اور غمِ حسینؑ میں سوگوار رہتا۔ محمد قلی کے کلیات میں پانچ مرثیے موجود ہیں۔ یہ مرثیے اہلِ بیت کرام سے شاعر کی والہانہ عقیدت کے غماز ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے چار مرثیے غزل کے فارم میں ہیں اور ایک مثنوی کے روپ میں۔ حبِ اہلِ بیت اور غمِ حسین جو محمد قلی کے لیے حاصلِ ایمان تھا، شعر گوئی کا محرک کیسے نہ بنتا؟'' (۱۱)

ولی دکنی (۱۶۶۷ء اورنگ آباد - ۱۳۱/اکتوبر ۱۷۰۷ء احمد آباد) کو اردو شاعری کے اہم بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ (۵ اپریل ۱۹۰۶ء ہزارہ - ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء لاہور) ولیؔ دکنی کو جمال دوست اور اسلوب پرست شاعر قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ''ان کے پیشِ نظر حسن کا وہ جلوۂ عام ہے جو ہر پیکرِ مجاز میں موجود ہے، مگر ان کا ذوق ہرجائی اور ہمہ جائی ہے۔ انھوں نے حسن اور اس کے

متعلقات کو فطرت اور کائنات کی حسین وجمیل اشیا کے حسن و جمال کے مرقع میں اس طرح سجایا ہے کہ اس شیش محل میں حسنِ محبوب کی چمک دوبالا ہوگئی ہے۔''(۱۲)

ولی دکنی کا نشاطیہ آہنگ قاری کو بہت متاثر کرتا ہے۔تعلّی کا یہ شاعرانہ رنگ ان پر خوب پھبتا ہے:

شہرت ہوئی جب سے ترے شعر کی ولی
مشتاق تجھ سخن کا عرب تا عجم ہوا(۱۳)

منقبتی اشعار ملاحظہ ہوں:

ولی تجھ کو رکھیں گے شیرِ مرداں اپنی مجلس میں
رہے گر سگ ہوکر دائم نبیؐ کے آستانے کا(۱۴)

نہیں وہ آب، غیر از آبِ خنجر
شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے(۱۵)

قبلۂ اہلِ صفا شمشیر ہے ہادیِ مشکل کشا شمشیر ہے
کیوں نہ دشمن کے کرے سینے میں جا ناخنِ شیرِ خدا شمشیر ہے
ہے کلیدِ فتح بابِ مدعا ناخنِ مشکل کشا شمشیر ہے(۱۶)

ہر چند اے ولی ہوں میں غرقِ بحرِ عصیاں
مجکوں شفیعِ محشر حضرت کی آل بس ہے(۱۷)

سراج اورنگ آبادی (۱۱مارچ ۱۷۱۲ء اورنگ آباد-۱۶اپریل ۱۷۶۴ء اورنگ آباد) کی کلیات میں مستقل نعتیں ملتی ہیں، سوائے ایک نعتیہ مثنوی کے، وہ نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔سراج اپنے شعروں کو نغمۂ داؤدی قرار دیتے ہیں۔وہ اس بات پر خوش ہیں کہ انھیں بروزِ حشر کوئی خوف نہ ہوگا کہ وہاں بھی حضور علیہ السلام اپنی رحمت اور شفاعت سے سرفراز کریں گے۔ایک نعت کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بندہ ہوں دل سیں تیرا ہر آن یا محمدؐ تجھ نام پر ہوا ہوں قربان یا محمدؐ
تجھ ذات کے صفت میں لولاک حق نے بولا ہے چشمِ دو جہاں کا تو جان یا محمدؐ(۱۸)

سراج اورنگ آبادی کی غزل میں اہلِ بیتِ اطہار، پنجتن پاک اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں اشعار موجود ہیں۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پایا ہوں پنجتن کی محبت سیں پنج گنج
قربان ہوں سراجؔ محمد کی آل پر(۱۹)

نہ ہوئے جامِ کوثر سیں محروم وو
علی ولی جس کا والی ہوا(۲۰)

ورد کر اے سراج نامِ علی
یاد رکھ عشقِ حیدری کی طرح(۲۱)

طلب کی راہ میں سختی جو پیش آوے تجھے سالک
خیالاتِ جہاں کوں فتح کر زیر و زبر کرناں
چڑھا کر آستینِ شوق کس کر دامنِ ہمت
محمد اور علی کے نام کوں تیغ و سپر کرناں(۲۲)

سراج چہار صحابہ کو دین کی آبرو کہتے ہیں:

دین کی آبرو یہی ہے سراجؔ
چار یاروں میں سرخرو رہناں(۲۳)

انعام اللہ خان یقین (۱۷۲۷ء دہلی - ۱۷۵۵ء دہلی) والد گرامی کا نام اظہر الدین تھا۔ شیخ عبدالاحد نقشبندی کے پوتے اور نواب حمیدالدین خان کے نواسے تھے۔ صاف گوئی کی حامل غزلیں قاری کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ اسلوب سادہ اور شائستہ ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں (۱۳ مارچ ۱۶۹۹ء مالوا - ۶ جنوری ۱۷۸۱ء دہلی) کے شاگرد تھے۔ اپنے استادِ سخن کے لیے بہت ارفع جذبات رکھتے تھے۔ دیوان میں کئی شعروں میں اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

مجھ سے پتھر کو کیا ہے جوں نگیں حرف آشنا
کون پہچانے یقیںؔ بن حضرتِ مظہرؒ کی قدر(۲۴)

یقیںؔ کا دیوان مرزا فرحت اللہ بیگ (یکم ستمبر ۱۸۸۳ء دہلی - ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء حیدرآباد، دکن) نے ترتیب دیا، ان کے مقدمے کے ساتھ ''دیوانِ یقیںؔ'' پہلی بار مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب سے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا گیا۔ صفحات ۱۶۳ ہیں۔ یقیںؔ نے ایہام گوئی کی مخالفت بھی کی۔ ''دیوان یقین'' میں شامل پہلی

غزل نعت ومنقبت اور ستائش کا عمدہ نمونہ ہے۔اس میں پنجتن پاک اور دیگر صحابہ کرام کے لیے محبت کے پھول پیش کیے گئے ہیں:

کون کرسکتا ہے اُس خلاّقِ اکبر کی ثنا ــــ نارسا ہے شان میں جس کے پیمبرؐ کی ثنا
سر برآ اس منھ سے ہوسکتی ہے کب نعتِ رسولؐ ــــ یا ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر کی ثنا
یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے، جو کیجیے ــــ حضرتِ زہرا کی اور شبیر و شبر کی ثنا(۲۵)

شاکر ناجی (۱۶۹۰ء دہلی - ۱۷۴۴ء) کا اصل نام محمد شاکر تھا۔شاکر ناجی کا شمار نمایاں ایہام گوؤں میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں کوئی مربوط ارفع نظریہ نہیں ملتا،شاعری کوانھوں نے اپنے عہد کے بعض شعرا کی پیروی میں تفریحِ طبع کا سامان جانا اور اسی میں وہ خوش بھی رہے۔افتخار بیگم صدیقی نے درست لکھا ہے کہ ''ان کی شاعری اپنے دور کے مذاق اور مزاج سے اس قدرمل جل گئی ہے کہ دونوں کو الگ الگ پہچاننا دشوار ہے۔ وہ عہدِ محمد شاہی کی پوری عکاس اور اس کی اقدارو روایات کی آئینہ دار ہے۔''(۲۶) شاکر ناجی،نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے در دولت سے وابستہ رہے۔انھوں نے شاعری میں شاہ مبارک آبرو(۱۶۸۳ء گوالیار- ۱۷۳۳ء دہلی) سے فیض اٹھایا۔ناجی کی تعلّی کا انداز بھی پُر لطف اور معنی خیز ہے:

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس
بات میری باِ ایہام ہے(۲۷)

قدرت اللہ شوق نے ناجی کو سپاہی پیشہ اور دیوانِ ضخیم (۲۸) کا حامل شاعر بتایا ہے۔شاکر ناجی نے مدحِ صحابہ کے ساتھ ساتھ خواجہ بختیار کاکیؒ اور حضرت بابا فریدالدینؒ شکر گنج کے لیے بھی ستائشی و تحسینی کلام لکھا ہے۔حضرت علی وشہدائے کربلا کی شان میں کہے گئے اشعار ملاحظہ ہوں:

نشہ مُل لے کے ناجیؔ کیوں نہ ہووے خاکسار
ساقیِ کوثر ہے جس کا حشر کے دن بوتراب(۲۹)

ناجی زبسکہ خونِ شہیداں ہے دردناک
اٹھتا ہے کربلا سیتی ہر دم غبار سرخ(۳۰)

محبت سیں علی کی دیکھ ناجیؔ
ہوا ہے دل مِرا اب حیدرآباد(۳۱)

شہید کربلا کی جا قدم بوسی کروں ناجی
جو دسویں شب محرم کی قضا سیں میں سفر پاؤں (۳۲)

علی کا نام لے مردوں کو میدان میں اتارے ہے
جسے دے فتح تیرے ہاتھ شمشیرِ ولایت ہے (۳۳)

کیوں ہراساں ہو مصیبت بیچ مرد
صفدرِ مشکل کشا شمشیر ہے (۳۴)

شیخ ظہورالدین حاتم (۱۱۱۱ھ دہلی - ۱۱۹۷ء شاہجان آباد) والد کا نام شیخ فتح دین تھا۔ ایہام گو کی حیثیت سے معروف تھے، تاہم بعدازاں اس طرزِ شاعری سے نہ صرف خود تائب ہوئے بلکہ اس کی مخالفت بھی کی۔ اپنے دیوان پر نظرثانی کرتے ہوئے ''دیوان زادہ'' نام رکھا۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ پروفیسر عبدالحق کی رائے میں: حاتم فلسفی تھے اور نہ مفکر، ان تصورات کو فلسفیانہ فکر ونظر کا نتیجہ نہیں قرار دے سکتے۔ وہ ایک باشعور احساس اور غور وفکر رکھنے والے ایک عام انسان تھے۔ ان کے غور وفکر اور سوچ بچار میں یہ افکار ان کے نکتہ ہائے کی نظر کی بالیدگی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ جو شاعری کے ابتدائی دور کی فکری تصویریں بناتے ہیں۔'' (۳۵) خود ستائشی کا یہ انداز ملاحظہ ہوں:

مبارک عشق کی کشور کی تجھ کو سلطنت حاتم
جنوں ہے خان ساماں جس کا اور دیواں سودا ہے (۳۶)

مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ء دہلی - ۱۷۸۱ء لکھنؤ) سمیت بہت سے نامور شعرا نے انھی سے کسب فیض کیا۔ غزلوں کے ساتھ مثنویاں، رباعیات، ساقی نامہ، شہر آشوب اور دیگر اصناف اور ہیئتوں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ پاکستان سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (۱۵ راگست ۱۹۲۴ء، گورداسپور - ۱۳ جون ۲۰۰۷ء، لاہور) اور بھارت سے پروفیسر عبدالحق (۲۴ راپریل ۱۹۳۹ء مچھلی شہر، ضلع جون پور) نے ان کا دیوان ترتیب دیا اور مقدمہ کے بعد حواشی قلم بند کیے۔ یہ اشعار حاتم کے عقیدے اور شعری مسلک کی وضاحت کرتے ہیں:

دل کے آزار کا نہ دو فتویٰ
مذہبوں میں مت اختلاف کرو (۳۷)

نہ میں سنی نہ شیعہ نے کافر
ایک لعن یزید کرتا ہوں (۳۸)

ایہام گوئی سے گریز اور صاف گوئی کی تلاش کے ذیل میں ان کا یہ شعر پیش خدمت ہے:

ان دنوں سب کو ہوا ہے صاف گوئی کا تلاش
نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا (۳۹)

''دیوان زادہ'' حاتم کی ایہام گوئی سے تائب ہونے کی بہت عمدہ مثال ہے۔ تاہم کہیں کہیں ایہام کے اشعار مل جاتے ہیں۔ انھوں نے رباعی، مخمس، مثنوی، فردیات، شہر آشوب میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے باوصف غزل گوئی ہی ان کا نشان افتخار ٹھہری۔ مرتب ''دیوان زادہ'' نے غزلوں کو زمانے کے چلن کے برعکس ردیف کے بجائے زمانی پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (۱۵ اگست ۱۹۲۴ء بٹالہ- ۱۳ جون ۲۰۰۷ء لاہور) کے مطابق: ''خارجی ماحول سے شاہ حاتم کے ازبس لگاؤ کی وجہ سے ان کی غزل کے موضوعات متنوع اور اسلوب دلکش کیفیات کا حامل ہے۔ حُسن کی توصیف ہو یا مظاہرِ فطرت کا بیان، معاملاتِ محبت ہوں یا مجلسی ماحول کی مرقع کشی، وہ ایک آدھ شعر پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان کی اکثر غزلیات اس اعتبار سے قطعہ نما ہوجاتی ہیں یا ان میں سے ایک ایک دو دو قطعہ بند ٹکڑے آجاتے ہیں۔'' (۴۰) حاتم کی غزلوں میں کئی مقامات پر حمدیہ و نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔ چند منقبتی شعر ملاحظہ ہوں:

زمینِ طرحی در ۱۱۵۶ھ کا شعر:

شاہِ مرداں کی شجاعت میں یقیں سے حاتم
حملۂ حیدری اور دیکھ لے خیبر نامہ (۴۱)

زمینِ طرحی در ۱۱۵۹ھ:

حاتم تری جناب میں لایا ہے التجا
نامے پر اس کے عفو کی ہو یا علی قلم (۴۲)

زمینِ ولی در ۱۱۶۱ھ:

باغبانوں سے جو پوچھا کہ یہ کیا باعث ہے
کہا رو کر کہ یہ ماتم ہے حسین و حسنی (۴۳)

حاتم! توقع چھوڑ کر عالم میں تا شاہ و گدا
اگر لگا حیدر کے در کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو (۴۴)

اے حاتم یاد کر حالِ شہیداں
شفق سے جوں جب کہ ہوتا ہے گگن سرخ (۴۵)

حاتم تری جناب میں لایا ہے التجا
نامے پر اس کے عفو کی ہو یا علی قلم (۴۶)

حاتم کیا حق نے دو عالم میں سربلند
بادل علی کے جب سے لگے ہیں قدم سے ہم (۴۷)

حاتم ہے دل سے بندہ ترا یا علی ولی
تیرا ہی نام اس کی زباں پر ہے جوں نصیر (۴۹)

زمینِ طرحی در ۱۱۶۲ھ:

حاتم ہے دل سے بندہ ترا یا علی ولی
تیرا ہی نام اس کی زباں پر ہے جوں نصیر (۵۰)

زمینِ طرحی در ۱۱۶۷ھ:

سگِ شیرِ خدا ہے تو حاتم
خارجی تیرے آگے بلّی ہے (۵۱)

زمینِ طرحی در ۱۱۷۱ھ:

رو تو حاتم حسینؑ کے غم میں
اور رونا تو رانڈ رونا ہے (۵۲)

زمینِ طرحی در:

حاتم اس بحرِ مروّت کی علی دیوے مراد
جس کا اس وقت ہوا عبید الاحسان (۵۳)

زمینِ طرحی در ۱۱۷۲ھ:

خدا تجھ کو رکھے گا سرخ رو مردوں کے میداں میں
کہ تو مشہور اے حاتم غلامِ شاہِ مرداں ہے (۵۴)

مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ء دہلی-۱۷۸۱ء لکھنؤ) کے والد گرامی کا اسم گرامی مرزا محمد شفیع تھا۔ شیخ ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء دہلی-۱۷۹۱ء دہلی) سے شاعری میں کسب فیض کیا۔ دہلی چھوڑ کر پہلے فرخ آباد (نواب احمد بخش خان بنگش کے در دولت) پھر فیض آباد (نواب شجاع الدولہ کے ہاں) بعد ازاں لکھنؤ پہنچے۔ عبدالباری آسی (۱۸۹۳ء میرٹھ-۱۹۴۶ء لکھنؤ) کی رائے میں: ''سودا کے دیوانِ ریختہ میں جذباتِ عشق کی ایسی ایسی مکمل تصویریں پائی جاتی ہیں جو بڑے خردہ بین مصور کے یہاں بھی نہیں ملتیں۔ جنھیں دیکھتے ہی دل پر حزن و ملال کی بجلیاں گر جاتی ہیں اور زبان سے بے ساختہ اف اف کی صدا نکلنے لگتی ہے۔ اثر و تاثر ان کے کلام میں اتنا ہی ہے جتنا میر تقی میرؔ اور میر دردؔ کے یہاں ہے۔ ہاں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ میر صاحب حزن و یاس کے جذبات کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھتے اور سوداؔ کو رفعتِ مضامین اور شوکتِ الفاظ، ندرتِ بیان، معنی آفرینی کی طرف سے بھی اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا کہ جذبات کی طرف۔'' (۵۵)

تو نے وہ سوداؔ زبانِ ریختہ ایجاد کی
پڑھ کے اک عالم اٹھاتا ہے ترے اشعار فیض (۵۶)

سودا نے ایہام گوئی کی گرم بازاری کے عالم میں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنے عہد کی زبان کو اور بھی صاف شفاف بنایا:

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں (۵۷)

غزلوں میں شامل منقبتی اشعار ملاحظہ ہوں:

کیمیا خاکِ درِ شاہِ نجف ہے سوداؔ
حق تعالیٰ کرے اس طرح کی اکسیر نصیب (۵۸)

ہیں جو والی مرے بارہ دو جہاں میں سوداؔ
خاکِ در ان کی سمجھتا ہوں میں زر سے بہتر (۵۹)

سوداؔ کا دو جہاں میں یا مرتضیٰ علی
اب کون ہے بتا تو خریدار تجھ بغیر (۶۰)

حلِ مشکل کس سے ہو سودا کی شاہا تجھ بغیر
کھول دے مشکل کشا عقدے مِری مشکل کے کُل (۶۱)

علی کا نقشِ قدم ڈھونڈتا ہے یوں سوداؔ
پھرے ہے بادِ سحر جوں سراغ میں گُل کے (۶۲)

میر سوز (۱۷۲۱ء دہلی - ۱۷۹۸ء لکھنؤ) کے والد گرامی کا اسم گرامی میر ضیاء الدین تھا۔ دہلی میں ابتری کے باعث پہلے فرخ آباد پھر فیض آباد سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ آصف الدولہ کے انتقال کے بعد مرشد آباد کی راہ لی۔ پھر واپس لکھنؤ آ گئے۔ شاعری کے ساتھ دیگر فنون میں بھی ماہر کا درجہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (۱۹۲۹ء دہلی - ۲۰۰۳ء دہلی) کی رائے میں: ''میر سوز اس بزمِ ادب کے ایک رکن تھے جس میں میر تقی میرؔ، سوداؔ اور دردؔ جیسے باکمال رونق افروز تھے۔ میر تقی کی جذبات نگاری، سوداؔ کا زورِ تخیل اور دردؔ کا عارفانہ انداز ہماری شاعری کی آبرو ہیں۔ سوزؔ کے کلام میں یہ چیز تو پیدا نہ ہو سکی البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اسلوب کی سادگی، زبان کی صحت و صفائی کے ساتھ ملتے ہیں جن کی بنا پر وہ اپنے رفقائے کار کے ساتھ بزمِ شعر میں بیٹھے ہوئے اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔'' (۶۳) ''دیوانِ سوزؔ'' (کلیاتِ سوز) کو کئی اصحاب علم وفضل نے ترتیب دیا۔ مقدمے لکھے اور ان کے افکار کی گرہ کشائی کی۔ میر سوزؔ کے احوالِ حیات کا جائزہ لیا۔ اور معاصر شعرا بالخصوص اردو شاعری میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین کی قابلِ قدر مساعی کیں۔ سوز نے غزلوں کے ساتھ دیگر اصناف اور ہیئتوں میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ ان کی غزلوں میں شاملِ منتخب منقبتی شعر ملاحظہ ہوں:

مناقب مرتضیٰ مشکل کشا کا مجھ سے گر ہوتا		تو مذہب پر نصیری کے علی اللہ میں لکھتا
اگر میں مرثیہ حسنین کا کہتا تو کیا کہتا		بسوزِ سینۂ زہراؑ فقط ایک آہ میں لکھتا (۶۴)

دِلا دریائے رحمت قطرہ ہے آبِ محمدؐ کا		جو چاہے پاک ہو پیرو ہوا صحابِ محمدؐ کا
محمد علم کا گھر ہے علی اس کا ہے دروازہ		غلام اس کا ہو جو وہ کلب ہے بابِ محمدؐ کا (۶۵)

یہ زباں قابل نہیں جو نام اس کا لے سکے		مصطفیٰ سے پوچھیے اس کے برادر کی ثنا
باوجود اس قرب کے روح الامیں ہے، مدح گو		ہے زباں پر اس کی دائم اس کے قنبر کی ثنا

سوز تو کیا کہہ سکے گا کہ گئے حضرت حسین گردنِ مذبوح سے اللہ اکبر کی ثنا(۶۶)

نام تیرا مرتضیٰ اور لقب مشکل کشا ہے پڑی مشکل اسے آساں کرائے عالی جناب
سوزؔ کی یہ آرزو پوری کرو یا شاہِ دیںؑ بعد اس کے کربلا کا کیجیے اس کو تراب
سوزؔ گر تُو قبر میں آسودگی چاہے تو پڑھ یا علی یا ایلیا یا بوالحسن یا بوتراب(۶۷)

ہوا ہے سوزؔ اب تیرے مقابل
تو کر مولیٰ علی کو اپنے اب یاد(۶۸)

یا علی پہنچا ہے تیرے در تلک یہ سوزؔ آج
پھیرنا محروم ہے اس آستانے سے بعید(۶۹)

سات اور پانچ سوچ لے دل میں
جان مولیٰ علی کو ہو تو نصیر(۷۰)

شہیدِ عشق کے مسجود یا امام حسین امید واروں کے مقصود یا امام حسینؓ
نہیں ہوا کوئی تم سا شہید یا شاہد تمھی ہو شاہد و مشہود یا امام حسینؓ
زبانِ سوزؔ کہاں اور تمھاری مدح کہاں تمھی ہو حامد و محمود یا امام حسینؓ
غریب سوزؔ تمھارا بہت پریشاں ہے
اسے نواز بھی دو زُود یا امام حسینؓ(۷۱)

نہیں زباں میں لیا نامِ غیر، حق ہے گواہ
سوائے نامِ محمد کے یا علیؓ اللہ(۷۲)

کوئی مشکل نہیں رہنے کی مشکل
محبت ہے اگر مشکل کشا کی(۷۳)

شادی و عیش و طرب ہووے زمانے کو نصیب
سوزؔ کو ماتمِ شبیر مبارک ہووے(۷۴)

میرتقی میرؔ (فروری ۲۳ ۱۷ء آگرہ - ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء لکھنؤ) والدگرامی کا نام علی متقی (عبداللہ) تھا۔ چچا میرامان اللہ نے سرپرستی کی۔ ان کی وفات کے بعد سراج الدین خاں آرزوؔ (۸۸-۱۶۸۷ء ۶۲ فروری ۵۶ ۱۷ء) جو میر کے رشتے میں ماموں تھے، نے ان کی تربیت کا فرض ادا کیا۔ انھوں نے چھے دیوان یادگار چھوڑے۔ جنھیں ''کلیاتِ میرؔ'' کے نام سے کئی اربابِ فکروفن نے جمع کر کے ان پر مقدمے لکھے۔ میر نے مثنویاں، رباعیاں، قصائد، مراثی، سلام، واسوخت، قطعات اور فرد بھی لکھے۔ اردو شعرا کا تذکرہ نکات الشعرا (فارسی زبان) ''فیض میر'' (فارسی نثری حکایات) ''دیوانِ فارسی''، ''ذکرِ میر'' (فارسی میں خودنوشت)۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غزلیات میر کے رومانوی زاویے کے ساتھ رنگِ تصوف کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے اس پہلو کی جانب بھی اشارہ کیا ہے: ''انھوں نے اپنے زمانے کی افراتفری اور انتشار کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے جس تباہی اور بربادی کے مناظر گزرے ہیں، ان کا اثر ان کے مزاج پر بہت گہرا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے زمانے کی زبوں حالی پر آنسو بہائے ہیں۔ اس پر شدید رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔'' (۷۵) میرتقی میرؔ کی غزلوں میں تعلّی کے رنگوں میں جو نظافت اور لطافت پائی جاتی ہے، وہ بجائے خود بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ رنگ ان پر پھبتا بھی ہے:

سخن کے ملک کا میں مستقل امیر ہوں میرؔ
ہزار مدعی بھی مجھ کو دہ دلا نہ کریں (۷۶)

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا (۷۷)

غزلیاتِ میر میں شامل چند منقبتی اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سگِ کو میر میں اس شیرِ حق کا ہوں کہ جس کو سب
نبی کا خویش بھائی حیدرِ کرّار کہتے ہیں (۷۸)

''کلیاتِ میر'' جلد دوم میں شامل منقبتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو معتقد نہیں ہے علیؑ کے کمال کا — ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا
عزت علی کی قدر علی کی بہت ہے دور — مورد ہے ذوالجلال کے عزّ و جلال کا
پایا علی کو جا کے محمد نے اس جگہ — جس جا نہ تھا لگاؤ گمان و خیال کا
رکھنا قدم پہ اس کے قدم کب ملک سے ہو — مخلوق آدمی نہ ہوا ایسی چال کا

شخصیت ایسی کس کی تھی ختمِ رسل کے بعد تھا مشورت شریک، حقِ لایزال کا
فکرِ نجات میرؔ کو کیا، مدح خواں ہے وہ اولاد کا علی کی محمد کی آل کا(۷۹)

میر اس دل گرفتہ کے یہاں تو ملی نہ داد
عقدہ یہ لے کے جاؤں گا مشکل کشا کے پاس (۸۰)

کب ملے میر ملک داروں سے
وہ گدائے شہِ ولایتؑ ہے (۸۱)

میر کے یہ اشعار کلیات کی تیسری جلد سے ہیں:

کب اقتدا ہو مجھ سے کسو کی سوائے میرؔ
بندہ ہوں دل سے میں اسی سیّد امامؑ کا(۸۲)

میر حسن (۱۷۲۷ء دہلی - ۱۷۸۶ء لکھنؤ) میر حسن کا اصل نام میر غلام حسن تھا۔ مثنوی ''سحرالبیان'' کی بدولت شہرت اور بقائے دوام کی مسند پر جلوہ افروز ہیں۔ والد گرامی قدر میر غلام حسین ضاحکؔ (۱۷۱۷ء دہلی - تاریخ وفات معلوم نہیں ہے، فیض آباد) بھی شاعر تھے۔ میر حسن اُردو غزل کے بھی با کمال شاعر تھے ''مثنوی سحرالبیان'' ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج کے مطبع سے شائع ہوئی۔

''دیوان حسن'' کے خاتمۃ الطبع کے مطابق ''دیوانِ میر حسن'' کی پہلی طباعت رائے بہادر منشی پراگ نراین کی علم دوستی و فیض گستری کی بدولت دسمبر ۱۹۱۲ء مطابق ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ء ہجری مطبع منشی نول کشور لکھنؤ کے تحت شائع ہوا۔ مصحح مطبع محمد منیر منیر نے خاتمۃ الطبع میں میر حسن اور ماقبل شعرا کی زبان اور طرزِ ادا پر کے بارے میں بتایا ہے: ''یہ امر مسلم ہے کہ زبانِ اردو کے شعرائے متقدمین حُسن کے دلکش اثرات اور عشق کے موٴثر جذبات جس سادگی سے نہایت دلفریب پیرایہ میں ادا کر گئے ہیں، وہ آج کل کے شعرا کو نصیب نہیں۔ اور یہی بات تھی جس نے میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کا لقب دیا، ورنہ میر کی زبان اور آج کل کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جن حضرات متقدمین نے اردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچایا ہے اور زبانِ اردو کے باغ میں اپنی لگاتار جاں فشانیوں سے آبشاری کر کے گلکاریاں کی ہیں، ان میں سے ایک جلیل القدر مسلم الثبوت استادِ فن ماہرِ رموزِ سخن جناب میر غلام حسن صاحب حسن مصنف دیوانِ ہذا ہیں۔ جن کے نام کی شہرت محتاجِ بیان نہیں۔ آپ کی مثنوی بدرِ منیر لاجواب ہونے میں اپنی آپ ہی نظیر تسلیم ہو چکی ہے۔ آپ کا دیوان آج تک پردۂ خفا میں تھا۔ صرف دو چار شعر بعض بعض تذکروں میں نظر آجاتے تھے اور ناظرین کو آپ کے کلام کا مشتاق بناتے تھے۔''

(۸۳)''دیوانِ میرحسن'' کی غزلوں میں موجود اشعارِ مناقب یہ ہیں:

میں دوست دارِ پنجتن و اہلِ بیت ہوں بندہ ہوں جاں نثار ہوں بارہ امام کا
ہوتی ہے جن کو بندگی ان کی جناب میں ان کو مقام ملتا ہے دارالسلام کا
سیراب مجھ کو کیجیے محشر میں یا علی امیدوار رہتا ہوں کوثر کے جام کا

گر ہو قبول یہ غزلِ نعت و منقبت
شہرا جہاں میں تب ہو حسنؔ کے کلام کا(۸۴)

شاہ مبارک آبرو (۱۶۸۳ء گوالیار- ۱۷۳۳ء لکھنؤ) آبرو کا اصل نام نجم الدین تھا۔ محمد غوث گوالیاری (۱۵۰۰ء گوالیار- ۱۵۶۲ء گوالیار) کے پوتے تھے۔

ڈاکٹر محمد حسن (وفات: ۲۴/اپریل ۲۰۱۰ء دہلی) نے ''دیوانِ آبرو'' ترتیب دیا۔ ان کی رائے میں: ''آبرو شمالی ہند میں اردو کے پہلے شاعروں میں ہیں۔ ان کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اولین یادگاروں میں سے ہے۔ فائزؔ کا جو کلام اب تک دستیاب ہوا ہے، وہ ۱۱۴۳ ہجری میں نظرِ ثانی کے بعد مرتب ہوا۔ آبرو کا انتقال ۱۱۴۶ ہجری میں ہوا اور ان کا دیوان اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقعِ دہلی ہے۔ یہ تاریخی یادگار ادبی اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔''(۸۵)

ڈاکٹر محمد حسن، مسعود حسن رضوی کے مرتبہ ''دیوانِ فائز دہلوی'' کے دیباچے میں اس دعوے کی تردید کرتے ہیں کہ فائزؔ دہلوی کو اردو شعرا میں تقدُّم حاصل ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے داخلی شواہد پیش کیے ہیں۔ آبرو کے دیوان میں غزلوں سمیت واسوخت، ترجیع ہند، مثنوی درموعظہ آرائش معشوق، مرثیہ کے بعد متفرفات کے زیرِ عنوان مستزاد، تضمین، مخمس، ترجیع بند اور مثنوی شامل ہے۔ آبرو حافظؔ شیرازی کے کلام کے معتقد ہیں۔ اس ضمن میں وہ ایک مقطع میں کہتے ہیں:

آبرو شعر کے کمال میں ہے
معتقد حافظِ شرازی کا (۸۶)

آبرو کی غزلوں میں مدحِ اہلِ بیت کے حامل اشعار کے ساتھ ساتھ عام غزلوں میں کربلائی الفاظ و تراکیب موجود ہیں:

دو مصرع بھواں کے خال پر ظالم جو بیٹھا ہے
ملی ہے آج شامی کو حکومت اہلِ بیت اوپر(۸۷)

مکمل غزلوں میں مدح کے قرینے ملتے ہیں:

علی سے ہم نیں جانا دین و ایماں اور پیغمبر
پیغمبر علم کا گھر ہے پے اس گھر کا علی ہے در (۸۸)

جا کر کہو اس طفل سے احوال اس مظلوم کے
واسطے بارہ امام اور چار دِہ معصوم کے (۸۹)

غزلوں میں موجود مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں، اس ضمن میں ایک مکمل غزل پنجتن پاک کے ذکر اذکار سے مملو ہے، غزل ملاحظہ ہو:

دونوں جہاں میں کافی ہیں ہم کوں یہ پنجتن — محمد اور علی، فاطمہ، حسینؓ و حسنؓ
نظر سو مہر کی جس کوں نبی نیں نستارا — دل اس کا جلوۂ دیدار کا ہوا درپن
علی ہے شیرِ خدا جن نیں ذوالفقار سے کاٹ — جنگل کوں کفر کے سب دین کر دیا گلشن
محبت اور غلامی ہے فاطمہ کی فرض — کہ جس کے نام میں دوزخ کی سرد ہوا گن
حسنؓ حسینؓ ہیں دو آفتاب اور مہتاب — کہ عرش فرش جھلک سیں جنھوں کے ہے روشن
اسی کوں روزِ قیامت کے ہوئے گا دیدار — جو ان کی خاکِ قدم کوں کرلے گا کحلِ نین
اسی کوں حشر میں ہے آبرؔو اسی کوں نجات — کہ جس کے ہاتھ میں ہو اہلِ بیت کا دامن (۹۰)

شاہ نجف کے نام کوں لوں آبرؔو سیں سیکھ — ہادی کہو امام کہو رہنما کہو (۹۱)

عبدالوہاب یکرو (دہلی) شاہ مبارک آبرو (۱۶۸۳ء گوالیار- ۱۷۳۳ء لکھنؤ) سے تلمذ حاصل تھا، جس پر یکرو اظہارِ تفاخر بھی کرتے ہیں۔ یکرؔو کے دور کے شاعروں کا اشہبِ طبع بقول ڈاکٹر شمیم احمد مرتبِ دیوانِ یکرؔو: ''غزل کے میدان سے بہت کم آگے بڑھتا تھا، جو تھا غزل پر ریجھا ہوا تھا۔ یکرو کے ذخیرۂ غزل پر نظر ڈالی جائے تو وہ کیا بلحاظِ مضامین و موضوعات اور کیا بلحاظِ زبان اور اسلوبِ بیان، اپنے دور کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ یکرو کی غزلوں کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ یکرو کے زمانے میں کم از کم شمالی ہندوستان میں اردو غزل ابتدائی اور سیال حالت میں تھی اور اس کی تشکیل ہو رہی تھی۔'' (۹۲) ڈاکٹر شمیم احمد نے مقدمے کے آخری اوراق کو ''فہرستِ الفاظ مستعملہ قدیم''، ''فہرست اعلام''، ''فہرست بلاد و اماکن''، ''فہرست مآخذ'' سے آراستہ کیا ہے۔ مکمل کتاب ۲۵۶ صفحات پر مبنی ہے۔ یکرو نے غزل کے ساتھ دیگر اصناف اور ہیئتوں میں بھی طبع آزمائی کی۔ اپنے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مت سبک جان شعر یکرو کے — ہر یکِ مصراع سروِ موزوں ہے (۹۳)

اپنے استادِ سخن شاہ مبارک آبرو کی قدردانی کا انداز ملاحظہ ہو:

ہے فیضِ آبرو سیں میری نظر بلند اب — کیونکے نہ ہووے یکرو مجھ فکر کو رسائی (۹۴)

منقبت کے دو غزلیہ اشعار پیش خدمت ہیں:

مجھے کہتے ہیں یکرو سب محباں   کہ بندہ جاں سیں ہوں حضرت علیؑ کا (۹۵)

مرے دل میں جبھی یادِ محمدؐ اور علی آوے
جو نعمت مانگوں میں حق سِیں مرے گھر سب چلی آوے (۹۶)

مرزا جعفر علی حسرت (۱۷۳۴ء دہلی - ۱۷۹۲ء لکھنؤ) کی کلیات ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (۲۱ اگست ۱۹۱۱ء اودھ - ۲۸ نومبر ۲۰۰۰ء لکھنؤ) نے ترتیب دی ہے۔ حسرت نے قصیدے، واسوخت، مخمسات، ترکیب بند، ترجیع بند، ساقی نامہ، مثنوی، رباعیات کے ساتھ غزلیں بھی کہیں۔ قصیدوں میں حمد و نعت و مدحِ علی و حسنین، مدحِ نجف اشرف، مدحِ امام علی موسیٰ رضا اور مدحِ امام مہدی کے ساتھ معاصر عہد کے نوابوں کی ستائش کے عناصر بھی موجود ہیں۔ تیس بندوں پر مبنی مسدس کی ہیئت میں مرثیہ شاعر کے علم و فضل کا نشان بھی ہے۔ مرزا جعفر علی حسرت کا شمار عہدِ میر و سودا کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تعلّی کے مضامین بکثرت ملتے ہیں:

قائمؔ و سوداؔ، دردؔ و یقیںؔ، میرؔ ان کی غزل ہے خوب و لے
تو نے حسرتؔ اپنی غزل میں سچ کہ بڑا ہی کام کیا (۹۷)

ہمارے شعر کو صائب تئیں سنا حسرتؔ   کہ قافیوں کی وہ سن کر نشست ہو محظوظ (۹۸)

مرزا حسرت رومانی غزلیں کہتے ہوئے بھی کربلائی الفاظ اور تراکیب برتتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لاکھوں ہی بے کس اس میں تڑپے ہیں خاک و خوں میں
کوچہ ہے تیرا ظالم یا دشتِ کربلا ہے (۹۹)

کرے ہے شہید اب تو حسرتؔ کو کر   تجھے اس شہِ کربلاؑ کی قسم (۱۰۰)

جو سید خوب رُو مجھ کو نظر آتا ہے اے یارو   محمدؐ پر اور ان کی آل پر صلوات کہتا ہوں (۱۰۱)

''کلیات حسرت'' کے مرتب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ) حسرت کی غزل کے مزاج کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ان کی غزلوں میں تمام تر بس عشقیہ مضامین ہی ہیں۔ یعنی انھوں نے سختی سے اس اصول کی پابندی کی ہے کہ غزل میں صرف تغزل ہی ہونا چاہیے، لیکن کہیں کہیں

درویشی یا تصوف کے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں، اگر چہ ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔'' (۱۰۲) اس تناظر میں جب ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں منقبت کے اشعار بھی ناپید ہیں۔ یہ اور بات کہ انھوں نے کربلائی اور عزائی الفاظ کو جزوِغزل بنایا ہے۔ ان کی پہلی غزل کا آغاز حمد و نعت اور منقبت سے ہوتا ہے:

کیا حمد کہوں تیری مجھے کچھ نہیں یارا — یا مَنْ خَلَقَ الْخَلْقَ وَ لَیلاً وَّ نَہَارًا
سبحاں تری ذات کہ احمد سے نبی نے — قَدْ سَبَّحَ تَسْبَیْحَكَ سِرّاً وَّ جَھَارًا
وہ جائے ہے تیری کہ نبی اور علی بن — ہرگز نہیں اس جا پہ فرشتہ کا گزارا
وہ ساقیِ کوثر کے پیمبرؐ کا وصی ہے — من شاربہ الکاس فقد مار سکارا (۱۰۳)

مرزا اشرف علی خاں فغاں (۱۷۲۵ء شاہجہان آباد - ۱۷۷۲ء عظیم آباد) والد گرامی کا اسم گرامی مرزا علی خان نکتہ تھا۔ علی قلی خاں کے سامنے زانوے تلمند طے کیا۔ بعض اہلِ قلم نے انھیں قزلباش خاں امیدؔ (۱۶۷۸ء - ۱۷۴۶ء) کا شاگرد بتایا ہے۔ دیوان میں رباعیوں، مخمس، ہجو کے ساتھ فارسی کلام بھی شامل ہے۔ مرتب سید مصباح الدین عبدالرحمن (۱۹۱۱ء - ۱۹۸۷ء لکھنؤ) کے مطابق: ''فغاں کا اصلی شاعرانہ کمال اُن کی غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ فغاںؔ کا موجودہ دیوان تو ایہام گویوں کے خلاف سراسر جہاد ہے۔ کسی کی تقلید میں شعر کہنا وہ اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے۔ وہ خود کہہ گئے ہیں:

کیوں کریں غیر کے مضمون کو فغاںؔ ہم موزوں — تازگی ہووے سخن میں یہ کمال اپنا ہے'' (۱۰۴)

سرور الہدیٰ (پ: ۱۹۷۱ء، دہلی) نے بھی ''دیوانِ اشرف علی خاں فغاںؔ'' ترتیب دیا ہے، جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۲۹۴ ہیں۔ فغاںؔ نے دیگر شعری اصناف میں زیادہ مناقب لکھیں۔ غزلوں میں یہ شعر موجود ہے:

لے جائیو تو خاک فغاںؔ کی وہاں صبا
مشہد ہے جس طرف کو میرے بوتراب کا (۱۰۵)

شاہ عالم ثانی (۲۵ جون ۱۷۲۸ء دہلی - ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء دہلی) ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ اس کا عہد حکومت ۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء سے لے کر اس کی وفات ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء تک رہا۔ اس کا پیدائشی نام عبداللہ جلال الدین ابومظفر الدین محمد علی گوہر شاہ عالم ثانی تھا۔ اس کے والد گرامی کا نام محی الملک الملت شاہ جہان (پ: ۱۷۱۱ء) تھا، جو ۱۰ دسمبر ۱۷۵۹ء سے لے کر ۱۰/اکتوبر ۱۷۶۰ء تک تخت نشین رہا۔ اکبر شاہ ثانی (پ: ۲۲/اپریل ۱۷۶۰ء مکند پور، ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء دہلی) شاہ عالم ثانی کا بیٹا اور بہادر شاہ ظفر (پ: ۲۴/اکتوبر ۱۷۷۵ء

دہلی، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء یانگو یانگون) اس کا پوتا تھا۔ فرخ سیر (۲۰ر اگست ۱۶۸۵ء اورنگ آباد - ۲۹ر اپریل ۱۷۱۹ء دہلی) کے بعد عالم شاہ ثانی دوسرا مغل شہنشاہ تھا، جسے اندھا کیا گیا۔ روہیلہ سردار غلام قادر روہیلہ (م ۱۷۸۸ء) نے ۱۰ر اگست ۱۷۸۸ء کو خنجر سے شاہِ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دیں۔ شاہ عالم ثانی پختہ فکر ادیب اور شاعر تھا۔ آفتاب تخلص اختیار کیا۔ ''عجائب القصص'' ان کا ادبی شاہکار ہے۔ ۶۱۵ صفحات کو محیط اس نثری داستان کو راحت افزا بخاری نے ترتیب دیا۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے (۵ر اپریل ۱۹۰۶ء - ۱۹۸۶ء لاہور) لکھا اور مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور کی جانب سے ناظم مجلس سید امتیاز علی تاج (۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۰ء لاہور - ۱۹ر اپریل ۱۹۷۰ء لاہور) نے پہلی جنوری ۱۹۶۵ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔ اس داستان کے آغاز میں رب کریم جل شانہ اور سید المرسلین ﷺ کی مدح، حضرت چار یار کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم، منقبتِ آئمہ معصومین یعنی دوازدہ امام و چہاردہ معصوم کہ دوازدہ بروج سپہر ہدایت و مہ چہاردھم ملک شرف وعزت اند رضی اللہ تعالیٰ عنہم و استدعا لے مطالب از جناب قاضی الحاجات، اور اس کے بعد منقبتِ دستگیر صغیر و کبیر عارف بے نظیر حضرت پیر دستگیر ملک ولایت راست ملک عالی مقدار از خاک پالیش کحل اولی الابصار، اور اس کے بعد شجرہ بھی ترتیب دیا ہے۔ یہ سب کچھ اردو نثر کے ساتھ ساتھ اردو فارسی اشعار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب کا ایک اور اہم ادبی کارنامہ ''نادرات شاہی'' ہے۔ یہ ان کی اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اسے امتیاز علی خاں عرشی (۸ دسمبر ۱۹۰۴ء - ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء رام پور) نے تیب دیا۔ اور ہندوستان پریس، رام پور کے جانب سے ۱۹۴۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا گیا۔ یہ نسخہ انھیں کتاب خانہ رام پور سے ملا۔ سرورق پر درج عبارت کے مطابق: ''ابوامظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی بادشاہ ہندوستان کے اردو، فارسی اور ہندی کلام کا مجموعہ جو بادشاہ کے حکم سے ۱۲۱۲ھ - ۱۷۹۷ھ میں مرتب کیا گیا۔ حسب الحکم اعلیٰ حضرت فرمانروائے رام پور دام اقبالہم و ملکہم۔'' یہ مجموعہ کتاب خانہ عالیہ ریاست رام پور کا سلسلہ اشاعت پر ۵ ہے۔ ''نادرات شاہی'' کو اردو کے ساتھ دیوناگری رسم خط میں ایک ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ شاعر خود بھی ہندی جانتا تھا اردو کلام کے سلسلے میں مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ء دہلی - ۱۷۸۱ء لکھنؤ) سے مشورہ کرتے اور فارسی شاعری مرزا محمد فاخر مکین (۱۸۱۴ء لکھنؤ) کو دکھاتے تھے۔ امتیاز علی خاں عرشی کے مطابق: ''ان کے شعروں کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں پیچیدار خیالات، مشکل فقرے یا لفظ اور دوراز کار تشبیہیں نہیں ملتیں۔ ان کی شاعری جذبات کی شاعری ہے۔ جو کچھ دل پر گزرتی ہے، خوشی ہو یا رنج، آرام ہو یا تکلیف، اسے سادہ طریقے سے بیان کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں شان وشکوہ کم مگر اثر زیادہ ہے۔ ممکن نہیں کہ آپ ان کے شعر پڑھیں اور پڑھ کر

ان کی خوشی یا رنج کے ساتھی نہ بن جائیں۔‘‘(۱۰۶) ’’نادرات شاہی‘‘ کی فہرست کے مطابق شاہ عالم ثانی آفتاب نے غزل ریختہ، سیٹھنے، استت پیراں، مبارک باد جشن نو روز، غزل و بیت فارسی، ہوری، کبت و دوھرا، مہدی غوث الاعظم، کبت و دوھرا نایکا بھید اور ترانے لکھے۔ اس مجموعے میں شامل اردو غزلوں میں مناقب کے اشعار موجود ہیں۔ کئی مکمل غزلیں مناقب کا درجہ رکھتی ہیں۔ منقبتیں ملاحظہ ہوں:

کرتا ہے ہر مہم کو تو، عالی جناب فتح　　یا مرتضیٰ علی، تو مجھے دے شتاب فتح!
میں بندۂ خاکی تجھ سے یہ کرتا ہوں التماس　　’کر میرے مشکلات کو، یا بوتراب، فتح!‘
مشکل کشائی خلق ترا نام پاک ہے　　تو نے کیا ہے قلعہ خیبر کا باب فتح
دنیا و دیں میں کُل مہمات کو مرے　　تو کر، اے رہنمائے طریقِ صواب فتح
پکڑا ہے تیرا ہاتھ شہِ ذوالفقار نے　　چاہ اس سے ہر مہم میں تو، اے آفتاب! فتح (۱۰۷)

شاہ عالم ثانی آفتاب کی ۷۴ ریختہ اردو (غزلوں) کے بعد دوھرا، کبت اور ہندی غزلوں اور شعروں میں بھی مناقب ملتی ہیں۔ خاص طور پر خواجہ معین الدین چشتی، حضرت قطب الدین کی مدح کی گئی ہے۔ دو مکمل غزلیں خواجہ معین الدین چشتی کی شان میں ہیں۔ شیخ عبدالقادر کے حوالے سے بہت سی منقبتیہ غزلیں اور اشعار ملتے ہیں۔ درج بالا مناقب کے شروع میں شاعر نے دیگر کلام کے مانند راگوں کے نام لکھے ہیں۔ اس سے شاعر کی علم موسیقی سے ربط ضبط کا بھی علم ہوتا ہے۔

قلندر بخش جرأت (۱۷۴۷ء دہلی - ۱۸۰۹ء دہلی) والد کا نام حافظ ارمان تھا جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور نادر شاہی فوج کے ہاتھوں مزاحمت کرنے پر قتل ہوئے۔ جرأت نے مرزا جعفر علی حسرت سے فیض حاصل کیا۔ وہ نواب محبت خان محبت اور شہزادہ سلیمان شکوہ (۱۵ مارچ ۱۶۳۵ء - مئی ۱۶۶۲ء گوالیار) کے در دولت سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی کے مطابق: ’’اُن کے کلیات میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں تنہائی، عدم تحفظ کا احساس، بے سروسامانی کا غم مرکزی خیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو آسانی سے اور بغیر کسی اُلجھاؤ کے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔‘‘(۱۰۸)

ڈاکٹر نورالحسن نقوی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اقتدا حسن نے بھی ’’کلیاتِ جرأت‘‘ کی تدوین کی ہے۔

اس کے سوا میں کس کی غلامی میں پھر رہوں　　جرأت کسی کی ذات بھی مولا علی سی ہے (۱۰۹)

پس از فنا ہے یہی آرزو کہ جرأت کی　　ملے بہ خاکِ نجف شاہ بوالحسن مٹی (۱۱۰)

انشاء اللہ خان انشا (دسمبر ۱۷۵۲ء مرشد آباد - ۱۸۱۷ء لکھنؤ کے والد گرامی میر ماشاء اللہ خان

مصدر بھی شاعر تھے۔ انشا شاعر ہونے کے ساتھ صاحبِ طرز نثرنویس میں بھی تھے۔ درج ذیل تصانیف ادب کا خزینہ ہیں۔''دریائے لطافت'' (فارسی)،''لطائف السعادت'' (لطائف)،''ترکی روزنامچہ'' (روزمرہ واقعات کا مجموعہ)،''سلک گوہر'' (بے نقط کہانی) کلیاتِ اُردو، دیوانِ فارسی''رانی کیتکی اور کنور اودے بھان'' (نثری قصہ، ہندی، عربی، فارسی الفاظ سے تہی) ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتوں نے''کلیاتِ انشا'' کے مقدمہ میں نام ونسب، سلف اور خلف کے ذیلی عنوان کے تحت انشا کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:''انشا تخلص حکیم میر انشاء اللہ خاں ابن مخیر الدولہ حکیم الحکما میر ماشاء اللہ خان مصدر تخلص، ابن شاہ نور اللہ جعفری الحسینی النجفی'' (۱۱۱) انشا و مصحفی کے شعری معرکے تاریخِ ادب کا حصہ ہیں۔ اس معرکے کی وجہ سے ایک طرف شاعری میں مختلف انداز سامنے آیا اور دوسری جانب زبان کے اخلاقی معیارات بھی داغ دار ہوئے۔ انشاء اللہ خان کا کل کلام''کلیات انشا'' کے نام سے خلیل الرحمن داؤدی (۲ مارچ ۱۹۲۳ء میرٹھ - ۲۶ جنوری ۲۰۰۲ء لاہور) نے ترتیب دیا جسے مجلسِ ترقی ادب، لاہور کی جانب سے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا۔ انشاء اللہ خان انشا نے بسلسلۂ شاعری اپنے والد میر ماشاء اللہ مصدر ہی سے مشورہ کیا۔ غزلوں میں شامل منقبت کے اشعار:

جو شخص طالب حسین کا ہو، تصدق اس کے نہ کس طرح ہوں
غلام فدوی ہوں جی سے انشاؔ، شہید میدان کربلا کا (۱۱۲)

ہے زمانہ یہ برا، اپنے غلام انشا کا آپ رکھ لیجیے یا حضرت زہرا پردہ (۱۱۳)

حسنؓ حُسینؓ کی خاطر بخش دیوے گا گناہ گاروں کو قصرِ زمرد و یاقوت (۱۱۴)

یہ سوزِ سینۂ خیر النسا شفیعۂ خلق ملائک آتے ہیں جس کے پئے طواف ضریح
مجھے آئمۂ اثنا عشر کے واسطے بخش جنھوں کو جملہ خلائق پہ تونے دی ترجیح
علی بالخصوص برائے حسین ابنِ علیؓ کہ تیری راہ رضا میں ہوا قتیل و ذبیح
شفا تصدیق بیمارِ کربلا ہو مجھے سحابِ لطف کو کر حکم تا کرے ترشیح
مفرح اپنے شفا خانۂ عنایت سے شتاب بھیج کہ انشا کو جلد ہو تفریح (۱۱۵)

نظر کر علی کو قرینِ محمد ہوا نورِ حق ہم نشینِ محمد

علی سے جن اشخاص نے بغض رکھا انھوں نے کیا قصدِ کینِ محمد
انھیں بارہوں برج سے میر انشا ہوئی زیب چرخِ برینِ محمد (۱۱۶)

انشا کا دل بنایا مہرِ علی سے حق نے لازم ہے اس کو کہنا یہ ہے علی کی مسجد (۱۱۷)

شرر یوں ابھر آئے داغِ جگر پر سنہری ہو نادِ علی جوں سپر پر (۱۱۸)

ہے کون جز آئمۂ اثنا عشر بخلق انشا امورِ دیں میں کرے جن کا اتباع (۱۱۹)

تو بھی حیدر کی ثنا کر نہ سکیں کچھ گوہوں بارہوں برج یہ اور آٹھ مہر بیسوں ایک
اس کے بِن اذن یہ نو امر چہ و پانچ حواس کب ہوا راستہ ملزوم بشر بیسوں ایک (۱۲۰)

من بعد مرگ ہے یہ وصیت تجھے نسیم لاتا بجا کہ چین ہو مجھ بے قرار کو
لے جائیو برائے زیارت نجف تلک رکھیو نہ خاکِ ہند میں اس خاکسار کو
یا کربلا میں روضۂ اقدس کے سامنے دیجو فشار اس مری مشتِ غبار کو (۱۲۱)

ورد ہو مشکل کشا کے نام کا انشا جسے
کیوں بھلا دونوں جہان کی اس کی حل مشکل نہ ہو (۱۲۲)

انشاؔ حسین کے جو غلاموں میں ہووے شخص
پیش آوے ہم سے کیوں نہ وہ خلق حسن کے ساتھ (۱۲۳)

اے نقش بند ''کُنْ فَیَکُوْن'' ایک کھینچ دے بندے کے دل پہ حیدرِ کرارؓ کی شبیہ (۱۲۴)

مقصود جو دولت ہو تجھے دونوں جہان کی انشاؔ تو بھی آن دامانِ علیؓ لے (۱۲۵)

دلِ شاد رکھ انشا متفکر نہ ہو ہرگز عقدے ترے حل حضرتِ شبیر کریں گے (۱۲۶)

مشکل کشا کی سوگند کھا نہ جھوٹی واقف تو کیا ہے حضرت مشکل کشا علیؓ سے (۱۲۷)

غلام ہمدانی مصحفیؔ (۱۷۵۱ء امروہہ۔ ۱۸۲۴ء لکھنؤ) کا شمار لکھنؤ دبستان کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ نور الحسن نقوی نے ان کا سال پیدائش ۱۱۶۱ھ، ۱۱۶۲ھ کے قریب بتایا ہے۔ شاعری کے آٹھ دیوان ہیں۔ اردو فارسی کے تذکرہ نویس کی حیثیت سے انھیں اہم مقام حاصل ہے۔ اپنے مقام ومرتبہ سے خود بھی آگاہ تھے۔ یہ شعر اس کا عکاس ہے۔

اے مصحفی! اُستادِ فنِ ریختہ گوئی تجھ سا کوئی، عالم کو میں چھانا، نہیں ملتا (۱۲۸)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

یا علیؓ مصحفی پھر جائے بھلا کس کے پاس اس کی مشکل تئیں تم بھی اگر حل نہ کرو (۱۲۹)

خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۷۸ء فیض آباد- ۱۸۴۶ء لکھنؤ) کے والد گرامی کا نام علی بخش تھا۔ آتش کا سال وفات کہیں ۱۸۴۷ء اور کہیں ۱۸۴۸ء بتایا گیا ہے۔ آتش کا دیوان دو جلدوں میں مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (یکم اگست ۱۹۲۳ء لکھنؤ - ۲۳ اگست ۱۹۸۷ء لاہور) ترتیب دیا۔ وہ ایک مقبول شاعر تھے سو دیگر اربابِ تحقیق نے بھی یہ فریضہ خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ ''کلیات آتش'' کی صورت میں بھی ان کا کل کلام دستیاب ہے۔ آتش کا دیوان پہلی بار ان کے سنِ حیات ۱۸۴۵ء میں لکھنؤ سے چھپا تھا۔ غلام ہمدانی مصحفی (۱۷۴۸ء اکبر پور- ۱۸۲۴ء لکھنؤ) سے اصلاحِ سخن لی۔ آتش کے بہت سے شعر زبانِ زدِ خاص وعام ہیں۔ شاعری کے ذیل میں ان کا یہ شعر خاص اہمیت رکھتا ہے:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا (۱۳۰)

اس تناظر میں شعرِ آتش بھی مرصع سازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کا احساس خود کو آتش کو بھی ہے:

فکرِ رنگیں نے بنایا باغ، دیواں کو مرے برگِ گل صفحہ، رگِ گل نقشِ مسطر ہو گیا (۱۳۱)

غزلوں میں شامل منقبت کے شعر ملاحظہ ہوں:

بندۂ شاہِ نجف آتشِ دل خستہ ہے یا الٰہی! اسے اب مرقدِ مولا دکھلا (۱۳۲)

آتش کی التجا ہے یہی تم سے یا علی! صدمہ نہ ہو فشارِ لحد کے عذاب کا (۱۳۳)

قربِ حق حاصل ہے اس کو مردِ عارف ہے وہی　　یا علی پیرو جو تجھ سے پیشوا کا ہوگیا
وقتِ مشکل میں کہا جس وقت، یا مشکل کشا!　　سہل چھٹکارا گرفتارِ بلا کا ہو گیا (۱۳۴)

خاک بھی ہوں تو ہوں میں خاکِ دراس کا آتش　　جس کے تھے دوشِ پیمبر کے سزاوار قدم (۱۳۵)

جلد دوم میں شامل اشعارِ مناقب ملاحظہ ہوں:

شمشیرِ خارجی نہیں ہونے کی کارگر　　حُبِ علی کی کافی ہے آتش سپر مجھے (۱۳۶)

ساغرِ صافِ مئے حُبِّ علی مشرب ہے
مردِ مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے (۱۳۷)

دشمن جو ہو حسین علیہ السلام کا　　آتش نہ کم سمجھ اُسے ابنِ زیاد سے (۱۳۸)

شاہ نصیر دہلوی (۱۷۵۶ء دہلی - ۲۳ نومبر ۱۸۳۷ء حیدرآباد، دکن) دہلی کے استاد شعرا میں شامل تھے۔ اصل نام محمد نصیرالدین ناصر تھا۔ میاں کلّو کے نام بھی یاد کیے جاتے تھے۔ والد گرامی قدر کا نام شاہ غریب اللہ تھا جو مخدوم شاہ عالم رحمتہ اللہ کے شاگرد تھے۔ کلیات شاہ نصیر کے مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی (۱۶ جولائی ۱۹۲۵ء مظفرنگر - ۲۰ فروری ۲۰۱۳ء دہلی) نے انھیں قادری، چشتی، نقشبندی سلسلوں سے وابستہ قرار دیا ہے۔ روشن پور دہلی میں ان کا مدفن ہے۔ والد کی وفات کے بعد شاہ نصیر سجادہ نشیں ہوئے۔ شاہ نصیر نے شاہ محمدی مائل (وفات ۱۷۸۷ء) سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مطابق: ''شاہ نصیر کی شاعری کا جذباتی یا احتساسی پہلو بہت کمزور ہے۔ اس میں جگر کاوی کی جگہ ایک ذہنی کاوش ملتی ہے۔ ان کے معجزۂ فن کی نمود خونِ جگر سے نہیں ہوتی، نیرنگیِ فکر سے ہوتی ہے۔ اس میں مشاقی و مشاقگی کو زیادہ دخل ہے اور دردِ مبتلا حال کو بہت کم۔ مگر اس کیف و کم کو ہم صرف نصیر کی شاعری اور شعور سے وابستہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا تعلق اردو شاعری کی نہج ارتقا سے ہے، جس پر شاہ حاتم سے لے کر داغ تک ہم اردو کے اساتذۂ سخن کو مسلسل آگے بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ شاہ نصیر اس میں ایک کلیدی شخصیت ہیں۔'' (۱۳۹) دعویِ سخن وری کا رنگ ملاحظہ ہو:

تم ہو تیر انداز میدانِ سخن میں اے نصیر!
کس سے آتا ہے بھلا تجھ بن لگانا تیر کا (۱۴۰)

''کلیاتِ شاہ نصیر'' چار ضخیم جلدوں میں دستیاب ہے۔ جن میں غزلوں کے ساتھ ساتھ قصیدہ گوئی، رباعی نویسی اور قطعہ نگاری سمیت کئی اصناف اور ہئیتوں میں طبع آزمائی کے نمونے ملتے ہیں۔ شاہ نصیر کی غزلوں میں مناقب کے نمونے ملاحظہ ہوں:

عینِ علمِ حق نظر آیا اسے عینِ علی — صورتِ آئینہ جس نے چشمِ دل کو واکیا
دستِ قدرت ہے مری نظروں میں ذاتِ پنج تن — بے سبب اللہ نے ان کو نہیں یک جا کیا
شش جہت کی کس سے ہو رونق بجز بارہ امام — آپ حق نے سب کو مالک دین و دنیا کا کیا
شمعِ ایوانِ خدا ہیں چار دِہ معصوم پاک — جن سے ان چودہ طبق کو روشن اور اُجلا کیا
زاہدا! ان میں نہ کیوں ہو جلوۂ نورِ خدا — خود نمائی کے لیے اس نے انھیں پیدا کیا
سینہ کوبی، دل خراشی، گریہ و آہ و فغاں — ہم نے عشقِ پنج تن میں دیکھا کیا کیا کیا
چار یارِ باصفا حق کی کتابیں چار ہیں — آپ جن کو منشیِ تقدیر نے انشا کیا
یعنی بوبکر و عمر، عثمان و حیدر بالیقیں — جن کو چار ارکانِ دینِ پاک ہے مولیٰ کیا
صورتِ اربع عناصر تھا بہم چاروں میں ربط — رُبعِ مسکوں میں انھوں نے دِین کو اِحیا کیا
پنج انگشتِ ید اللہ ہیں جناب پنج تن — وصف ان کا کاتبِ قدرت نے جو اِملا کیا
صفحۂ قرطاس نور افشاں یدِ بیضا بنا — یک قلم خامے کو انگشتِ یدِ بیضا کیا
زیبِ دیواں کیوں نہ ہو ہر بیت اس کی اے نصیرؔ — اس غزل کو شانِ اہل بیت میں انشا کیا(۱۴۱)

سرخ رُو محشر کو اٹھے گا وہی جس نے نصیرؔ — مائل اپنا دل بہ عشقِ آلِ پیغمبر کیا(۱۴۲)

دلا! اگر تجھے آلِ نبی سے الفت ہے — تو ان کے غم میں نہ آنسو کو اب ذرا ٹھیرا
یہ آبلہ جو ہے اے یار میرے سینے میں — اسے تو تعزیہ اور اس کو کربلا ٹھیرا (۱۴۳)

یا بوتراب! کیجیے اس وقت دستگیری — بے ڈھب یہ کچھ غریقِ بحرِ گناہ بیٹھا(۱۴۴)

غم شبیرؑ سے رکھتی ہے رخِ زرد بسنت — کیونکہ مجرے نہ کرے بادلِ پُردرد بسنت
دیکھ کر باغِ نبوت کے خزاں دیدہ گل — روتی شبنم ہے تو بھرتی ہے دمِ سرد بسنت
مرقدِ شاہِ شہیداں پہ چڑھاتی ہے یہاں — باغِ فردوس سے لا لا کے گلِ وَرد بسنت

کربلا کے سرِ میداں نہ ہو کیوں خاک بسر اہلِ بیتِ نبوی دیکھ کے بے پرد بسنت
نشترِ خارِ الم سے چمنِ گیتی میں کرتی صد چاک ہے دل ہائے زن ومرد بسنت
لالہ ہے داغ بہ دل آلِؑ نبی کے غم میں تن کو اپنے نہ رکھے کیونکہ پُر از گرد بسنت
کرتی ہے عابدِ بیمار کا احوال رقم لے کے نرگس کی قلم، دل کی بنا فرد بسنت
تختہ نرد چمنِ دہر میں ششدر ہو نہ کیوں سر شہیدوں کے لیے دیکھ کے جوں نرد بسنت
مُو پریشانی زینب پہ نظر کرائے وائے نخل ماتم شدو روئے (بہ) نجف کرد بسنت
سینۂ کینہ دروں پر ہے نکالے ناخن ماہِ نو دیکھ محرم کا جہاں گرد بسنت (۱۴۵)

اکبر و اصغر، امامِ قاسم ابنِ حسن
دیں کے یہ اہلِ مدینہ میں دو شمع و یک چراغ (۱۴۶)

حیراں برنگِ غنچۂ تصویر ہوں نصیرؔ
کھولیں گے میری حضرتِ مشکل کشا گرہ (۱۴۷)

کوفیوں کا بھی ہے مسلم پہ کھلا آہ فریب
آئے بیعت کے لیے تھے بہ دغا باندھ کے ہاتھ (۱۴۸)

غمِ حسینؑ میں دن رات دیکھتا ہوں دِلا بہاتے اپنی میں چشم پر آب کو پانی (۱۴۹)

نصیرؔ آلِؑ نبی کے عشق میں ظاہر ہو مژگاں پر
یہاں ہم چشمیِ دُرِّ نجف کی میرے آنسو نے (۱۵۰)

شیخ محمد ابراہیم ذوق (۲۲/اگست ۱۷۹۰ء دہلی- ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء دہلی) نے جہاں اپنے قصیدوں سے بادشاہوں اور ادبی رعایا کو متاثر کیا، وہاں غزل کے گلستان میں بھی رنگ رنگ پھول کھلائے۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شاعرانہ شان وشکوہ کے ساتھ شاہی دربار تک پہنچے تو شاہِ وقت بہادر شاہ ظفر نے ان سے اصلاحِ سخن لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے استاد کو ملک الشعر خاقانیٔ ہند کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ذوق کا کل کلام ''کلیاتِ ذوقؔ'' کی صورت میں سامنے آچکا

ہے۔ جو قصیدوں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ کئی اور اصناف اور ہیئتوں کے کمالات سے مالا مال ہے۔ ان کی دوسو سینتیس غزلیں دستیاب ہیں۔ ان غزلوں کی ابتدا وہ ھواللہ اکبر، وبہ نستعین، ھوالعلی، یاعلی مدد، ھوالعلی الاعلیٰ سے کرتے ہیں، غزلوں میں منقبتی مضمون پر یہ شعر موجود ہیں:

حُبِ حُسینؓ ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حُر
تھا کوچۂ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا (۱۵۱)

ذوق حیراں ہے بہت فکرِ کشادِ کار میں یا علیؓ مشکل کشا یہ وقت ہے امداد کا (۱۵۲)

شاہ تراب علی کاکوروی (۱۷۶۸ء کاکوری اتر پردیش - ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کاکوری اتر پردیش) والد گرامی شاہ کاظم قلندر (۱۷۴۵ء-۱۸۰۶ء کاکوری) کلیاتِ شاہ تراب علی کے ساتھ ''مجاہدات الاولیا'' اور ''امرت رس'' بھی ان کا یادگار ادبی سرمایہ ہے۔ مولانا نجم الدین علی خان بہادر کے حضور بسلسلۂ شاعری زانوئے تلمذ طے کیا۔ اردو کے ساتھ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی۔ کلیاتِ اشعار فارسی ڈاکٹر حافظ شبیب انور علوی کاکوروی نے ترتیب دی جس میں غزلیں اور دیگر کلام شامل ہے۔ اردو دیوان مطبع منشی نول کشور کانپور کے زیر اہتمام ۱۸۹۲ء شائع کیا گیا:

سر یہ کا قرآن پہونچے یا علی یا بو تراب ذوالفقار اپنی علم کر کے ذرا دُلدل اٹھا (۱۵۳)

تجھ پر اے ترابؔ علی کا کرم نت ہے پشتی پہ ہے ہمیشہ تری شاہِ مجتبیٰ (۱۵۴)

میں تو صدقے ہوں جان و دل سے تراب حیدر شہوار دلدل پر (۱۵۵)

ہجر میں مشکل میری آسان کر یا بوتراب ہے یہی تجھ سے علی مشکل کشا میری غرض (۱۵۶)

مرزا اسداللہ خاں غالب (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء آگرہ - ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء دہلی) عبداللہ بیگ کے لختِ جگر تھے۔ شاعری اور نثر میں جو کچھ لکھا، امر ہو گیا اور ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ثابت ہوا۔ محمد موسیٰ کلیم (پرنسپل گورنمنٹ کالج، نوشہرہ مصنف ''مقامِ غالب'' ۱۹۶۵ء) مصنف کی رائے میں: ''غالب کی غزل کئی لحاظ سے صنفِ غزل کی معراج ہے۔ اس لیے کہ غالب نے فکر انساں کی عظمتوں کو چھوا ہے بلکہ اس لیے کہ غالب نے تینوں سطحوں (جسمانی، ذہنی اور روحانی) پر کھڑے ہو کر رخِ حیات کی نقاب کشائی کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں حافظ کے جمال اور رومی کے جلال دونوں کو یکجا کر دیے ہیں۔ اس

عظیم کامیابی کا راز یہ ہے کہ غالب نہ تو تخیل کی سحر کاریوں میں کھوتے ہیں اور نہ ان پر مر مٹتے ہیں۔ ان کے ہاں خرد اور تخیل کا ایسا موزوں امتزاج ہے کہ اس سے بڑھ کر کہیں نظر نہیں آتا اور یہی دراصل ان کے فن کی سب سے بڑی اساس ہے۔" (۱۵۷) یہ دعویٰ انھیں زیبا ہے:

اسے اسد آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے (۱۵۸)

غزلیاتِ غالب میں شامل یہ شعر ملاحظہ ہوں:

یا علی! یک نگاہ سوئے اسد میں غریب اور تو غریب نواز (۱۵۹)

نورِ حیدر سے ہے اس کی روشنی ورنہ یہ خورشید یک دستِ سوال (۱۶۰)

غالب ہے رتبہ فہمِ تصور سے کچھ پرے
ہے عجزِ بندگی جو علی کو خدا کہوں (۱۶۱)

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ یا علی مدد ٹوٹے گر آئینہ اسد سبحہ کو خوں بہا سمجھ (۱۶۲)

امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبیؐ ہے (۱۶۳)

ہو جہاں اورنگ آرا جانشین مصطفیٰ
واں اسد تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے (۱۶۴)

اسدؔ! جہاں کہ علی برسر نوازش ہو کشادِ عقدۂ دشوار کارِ آساں ہے (۱۶۵)

اسد گر نامِ والائے علی تعویذِ بازو ہے غریقِ بحرِ خوں تمثال در آئینہ رہتا ہے (۱۶۶)

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ یا علی وقتِ عنایت اور دمِ تائید ہے (۱۶۷)

بہادر شاہ ظفر (۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء دہلی - ۷ نومبر ۱۸۶۲ء، رنگوں، برما) ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر غازی ثانی کے نام سے ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو مغل سلطنت پر براجمان ہوئے اور

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء تک فرمانروا رہے۔ وہ اپنے والد اکبر شاہ ثانی، ابوناصر معین الدین محمد (۲۲/اپریل ۱۷۶۰ء مکندپور - ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء دہلی) کے جانشین تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے معزولی کے بعد زندگی کے آخری ایام برما کے شہر رنگون (۱۶۸) میں گزارے۔ اسی شہر میں ان کا مدفن ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی یہ رائے صدفی درست ہے: ''بہادر شاہ ظفر کے ساتھ صرف ایک سلطنت ہی نہیں ایک تہذیبی روایت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ایک ایسی روایت جسے مغلوں نے اپنے دورِعروج میں پروان چڑھایا تھا۔ جس نے یہاں کی تہذیب کو آب و رنگ بخشا۔ اس کے خدوخال میں تیکھا پن پیدا کیا۔ اسے وسعت اور کشادگی عطا کی۔ لطافت اور نزاکت بخشی۔ یہ ایسی تہذیب تھی جس میں جلال بھی تھا اور جمال بھی۔'' (۱۶۹) شاعری میں شیخ محمد ابراہیم ذوق (۲۲/اگست ۱۷۹۰ء، دہلی۔ ۱۸۵۴ء دہلی) سے اکتسابِ فن شعر کیا۔ ان کی وفات کے بعد مرزا اسداللہ خان غالب (۱۷۹۷ء آگرہ - ۱۸۶۹ء دہلی) استادِ شاہ مقرر کیے گئے۔''غزلیاتِ ظفر'' میں شامل یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

چار یاروں سے نبیؐ کے ہے عداوت جس کو
سر پہ ہم مارتے ہیں اوس کی ظفر لاتیں چار (۱۷۰)

وہ مسلماں ہیں ظفرؔ صاحبِ ایماں کہ جنھیں
نہ صحابہ سے ہو بغض اور نہ شبیر سے لاگ (۱۷۱)

اے ظفرؔ جو ہیں سلامی حضرتِ شبیر کے
دو جہاں میں ہے بڑھاتا اون کی عزت کو سلام (۱۷۲)

وزیر علی صبا (۱۷۹۳ء لکھنؤ - ۱۳ جون ۱۸۵۵ء لکھنؤ) خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۷۸ء فیض آباد- ۱۸۴۶ء لکھنؤ) کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان ''غنچۂ آرزو'' یادگار ہے۔ ایک مکمل غزل شانِ علی المرتضیٰؓ میں کہی:

شریعت ہے شرطِ محبت علی کی
مسلماں پہ واجب ہے طاعت علیؓ کی
مَلک ہیں فلک پر رعیت علی کی
کنیزیں ہیں حورانِ جنت علیؓ کی
ہے اعدا سے ایمن جماعت علی کی
پناہِ خدا ہے حمایت علیؓ کی
محمد کو معلوم ہے اوس کا رتبہ
خدا جانتا ہے حقیقت علیؓ کی
زمانے کا مالک شہِ اولیا ہے
ہر اقلیم میں ہے ولایت علیؓ کی
سمجھ عین تقدیر تدبیر اوس کی
مشیت ہے خالق کی حکمت علیؓ کی

یہ ہے منزلت اوس کی اللہ اکبر حرم میں ہوئی ہے ولادت علیؓ کی
معانی میں کچھ بھی نہیں ہے تفاوت جداگو نبی سے ہے صورت علیؓ کی
کریں کس طرح ہم نہ مستانہ نعرے پیے ہیں شراب محبت علیؓ کی
فضائل ہیں وردِ زباں بُلبلوں کو گلوں میں ہے بوئے محبت علیؓ کی
محمد نے معراج میں اوس کو دیکھا عجب ذات ہے فی الحقیقت علیؓ کی(۱۷۳)

اسیرؔ، سید مظفر علی (۱۸۰۰ء امیٹھی، اتر پردیش - یکم فروری ۱۸۸۲ء لکھنؤ) میدانِ سخن میں غلام ہمدانی مصحفی (۱۵۷۱ء امروہہ - ۱۸۲۴ء لکھنؤ) سے اکتسابِ فیض کیا۔ اردو شاعری چھے دیوان اور فارسی کا ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔ پہلے واجد علی شاہ (۳۰ جولائی ۱۸۲۲ء لکھنؤ - یکم ستمبر ۱۸۸۷ء مٹیا برج، کلکتہ) اور بعدازاں رؤسائے رام پور اور نواب یوسف علی خاں (۵ مارچ ۱۸۱٦ء رام پور - ۲۱/اپریل ۱۸٦۵ء رام پور) اور نواب کلب خاں (۱۸۳۲ء رام پور - ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء رام پور) کے درباروں سے وابستہ رہے۔ میر دردؔ (۱۷۲۱ء دہلی - ۱۷۸۵ء دہلی) اور اُن کی شاعری کے والہ و شیدا تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

جب تک نصیب فرصتِ جاناں رہی اسیرؔ دیواں مطالعہ میں رہا میر دردؔ کا(۱۷۴)

غزلوں میں شامل منقبتی شعر ملاحظہ ہوں:

خاکِ شفا اوسی کی ہوئی خاک اے اسیرؔ جا کر جو ساکنِ درِ شبیرؓ ہو گیا(۱۷۵)

جنت میں قصرِ لعل و زمرد ملی اسیر اس وجہ سے کہ عشق حسینؓ وحسنؓ رہا(۱۷٦)

نہیں مومن علی و مصطفی کو جو جدا سمجھے
اسیرؔ ایماں سے باہر ہے دوبیں ہونا موحّد کا (۱۷۷)

اسیرؔ اون کو جو روئے پائے جنت عجب رتبہ ہے شاہِ کربلا کا
بہت سی صورتیں ہیں مغفرت کی بُکا کے ساتھ ہے اب کے اتبا کے(۱۷۸)

اسیرؔ بندہ ہے تم یا علیؓ ہو دستِ خدا نگاہِ خلق سے گرتا ہے یہ خبر لینا(۱۷۹)

جانتا ہے اوس کو جو ہے رہروِ راہِ خدا   ہے علی آباد دروازہ محمد پور کا(۱۸۰)

گرتے ہوئے ہم اسیرؔ سنبھلے   کیا نام ہے مرتضیٰ علیؓ کا(۱۸۱)

سید تجمل حسین تجمل رئیس ضلع فیض آباد و گونڈہ و ڈپٹی کلکٹر ضلع نواب گنج بارہ بنکی تھے۔ شعر وسخن کے حوالے سے انھوں نے مرحمت الدولہ بہار الملک سید غضنفر علی خان صاحب بہادر صولت جنگ المتخلص بہ حکیمؔ کے حضور زانوے تلمّذ تہ کیا۔ وہ تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خان صاحب بہادر، بہادر جنگ المتخلص بہ اسیرؔ کے خلفِ اکبر تھے۔ تجمل کا دیوان (سرورق پر دیوانِ اوّل لکھا ہے) ''مرغوبِ جہاں'' کے نام سے مطبع نامی منشی نول کشور کے تحت شائع ہوا۔ (دیوان کا یہ تاریخی نام ہے جون ۱۸۹۰ء، شوال ۱۳۰۷ ہجری نبوی)۔ تقریظ مرزا محمد تقی علی صاحب بہادر متخلص بہ ثریا (خلفِ اصغر شہزادہ مرزا سلیمان قدر بہادر) نے لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے: ''کہاں ہیں عاشقانِ شاہدِ سخن و معشوقانِ عاشق تن کہ یہ مژدۂ تازہ شنیدنی ہے بلکہ اک بہارستانِ نظارت آگیں دیدنی ہے۔ یہ دیوان کہ ایک قلم پرستان کا نقشا ہے۔ کثرتِ مضامین ہیں کہ پریوں کا جمگھٹا ہے۔ ہر ورق اس کا غیرتِ ورقِ گل اور ہر سطر مرغول رشک طرہ سنبل۔ مصاریع اشعار خطوطِ فاصل جداول سے مجنوں وارو دریدہ گریباں اور لیلائے معانی سیہ محمل لفظ میں بصد کرشمہ و ناز پنہاں، شوخیِ بیاں فرزانہ کو دیوانہ بناتی ہے۔ عروسِ فکر نکھری ہوئی اپنا جوبن دکھاتی ہے۔''(۱۸۲) غزلیہ مناقب اور اشعار پیش ہیں:

دلیلِ زورِ دستِ مرتضیٰ ہے حال خیبر کا   نہ بھولے گا کبھی روح القدس کو صدمہ شہپر کا
زمیں سے لامکاں تک نورِ رُخ پھیلا جو حیدر کا   فلک پر پھر گیا منہ شرم سے خورشیدِ انور کا
علی سے تا بہ مہدی رہنماے خلق بارہ ہیں   وصی ہر ایک اِن میں سے بلا شک ہے، پیمبر کا

غلامِ مرتضیٰ ہے کیا ڈرے عصیاں کی کثرت سے
بھروسا ہے تجمل کو شفیعِ روزِ محشر کا(۱۸۳)

ہوں میں دل سے غلام حیدر کا   ورد ہر دم ہے نام حیدر کا
عقدۂ مشکلات حل کرنا   ہے ازل سے یہ کام حیدر کا
طور بھی اِک ہے جلوہ گاہِ علیؓ   عرش بھی اک مقام حیدر کا
قدسیوں کے لیے عبادت ہے   تذکرہ صبح و شام حیدر کا
دو جہاں میں ہے کس کا یہ پایہ   عرشِ اعظم ہے بام حیدر کا

بندگی کبریا کی صبح و مسا کام ہے یہ دوام حیدر کا
پیشوا اُس کو جانتے ہیں ہم جو ہے پیرو امام حیدر کا
شک نہیں ہے کہ کلامِ حق لاریب کلمہ اور کلام حیدر کا
آتے تھے دیکھنے فلک سے ملک جنگ میں اہتمام حیدر کا
کعبہ میں جب بتوں نے پائی شکست کس جگہ تھا مقام حیدر کا
صورتِ مہر و ماہ روشن ہے خلق پر خلقِ عام حیدر کا
ایک سے دو کیا تھا اژدر کو اِس سے حیدر ہے نام حیدر کا
کیوں خزف ہوں نہ واں کے دُرِّ نجف کہ نجف ہے مقام حیدر کا
خانۂ عافیت نہ کیوں ہو لحد نقش ہے دل پہ نام حیدر کا
سب پہ روشن ہے رجعتِ خورشید آسمان ہے غلام احمد کا
طے کروں گا پُلِ صراط کو میں لوں گا جس وقت نام حیدر کا
کیوں تجمل کو خوفِ محشر ہو مدح خواں ہے مدام حیدر کا
یہ تجملؔ کی ہے دعا یا رب جلد دِکھلا مقام حیدر کا(۱۸۴)

تجملؔ کو یہی وردِ زبان ہے نجف پہونچوں بھروسا ہے جہان کا(۱۸۵)

شیخ بوبکرؓ و عمرؓ حضرت عثمانؓ و علیؓ نصبۂ دین ہوا ان کی بدولت مضبوط(۱۸۶)

سید میر مہدی حسین مجروحؔ (۱۸۳۳ء دہلی- ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء دہلی) ان کے والد میر حسین فگار بھی شاعر تھے۔ جو میر نظام الدین ممنون (۱۷۶۲ء دہلی- ۱۸۴۴ء دہلی، ولد میر قمر الدین منت) کے شاگرد تھے۔ صابرؔ دہلوی (۱۸۰۸ء دہلی - ۱۸۸۲ء) نے فگار کو ''سلالۂ دُودمانِ سیادت، خلاصہ خاندانِ شرافت'' (۱۸۷) قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد فیروز کی رائے میں: ''حلاوت اور سلاست اپنے اسلوب کی بندش اور زبان و بیان کے اعتبار سے مجروح کا کلام اردو کے آخری کلاسکی دور کا ترجمان ہے۔ اس لیے آخری کلاسکی دور کی شعری روایت اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے مجروح کا مطالعہ ضروری ہے۔'' (۱۸۸) مجروح کی غزلوں میں موجود یہ اشعار دیکھیے، بعض غزلیں مکمل مناقب کا درجہ رکھتی ہیں:

یہ دل شائق ہے اس کے روئے روشن کی زیارت کا
کہ جو ہے مہرِ انور بارھویں برجِ امامت کا

امام مہدیِ ہادی، سرورِ سینۂ زہرا
دل و جانِ نبی، نورِ بصر شاہِ ولایت کا
جہاں کو تنگ کر رکھا ہے اہلِ کفر و بدعت نے
دکھا ان کو نمونہ شاہِ مرداں کی شجاعت کا
پڑے یہ غلغلہ جب ذوالفقارِ حیدری چمکے
کہ حق ظاہر ہوا اب کوچ ہے، اہلِ ضلالت کا
اٹھا دے گا عمل عالم سے سب کشور ستانوں کا
ولایت گیر ہے وہ لختِ دل شاہِ ولایت کا(۱۸۹)

یا علی نائبِ خدا ہو تم — کیوں نہ بندوں کے پیشوا ہو تم
منعکس اس میں ہے رضائے خدا — آئینہ دارِ هَلْ آتیٰ ہو تم
مصطفیٰ کے خلیفۂ برحق — حسبِ فرمانِ اِنَّمَا ہو تم
کیوں نہ مرحب سے ہو نبرد آرا — برشِ تیغِ لافتیٰ ہو تم
واہ رے فضل، دورِ آخر میں — اوّلِ جملہ اوصیا ہو تم
روح کی طرح چشمِ عالم میں — نہیں ظاہر پہ جابجا ہو تم
جن کا ثانی نہیں جہاں میں وہ — یا تو خیر الوریٰ ہیں یا ہو تم
باوجود اختیارِ کلی کے — سالکِ مسلکِ رضا ہو تم
کس کا اِدراک جُز پیمبر کے — کون سمجھے تمھیں کہ کیا ہو تم
دشمنوں کے نہ کیونکہ ہوں دم بند — حصنِ خیبر کے درکشا ہو تم
جائے معصوم کا احق معصوم — نائبِ سید الوریٰ ہو تم
یوں تو اللہ نے کیے سب خلق — ان میں پر اصلِ مدعا ہو تم
بستہ خاطر رکھو ناں یا مولا — اک جہاں کے گرہ کشا ہو تم
دَم یہاں کون مار سکتا ہے — نفسِ پیغمبرِ خدا ہو تم
صابر و شاکر و حلیم و کریم — مرکز ان سب کے مرتضیٰ، ہو تم
اپنے مجروحؔ کو ضلالت سے — رہ پہ لاؤ کہ رہنما ہو تم(۱۹۰)

فخر ہے اُن کی غلامی کا مجھے اے مجروحؔ جن کوسب اہلِ جہاں آلِ عبا کہتے ہیں (۱۹۱)

نہیں مجروحؔ شاہی کی تمنا غلامِ حیدرِ کرّار ہوں میں (۱۹۲)

آقا علی، مطاع علی، مقتدا علی مولا علیؓ، امام علیؓ، پیشوا علیؓ
چاکِ خرامِ عرصہ گہِ لافتیٰ علی سلطان اولیا، شہِ خیبر کشا علیؓ
اللہ رے نامِ مرتضوی کا علوئے قدر اعلیٰ کے اِسم پاک سے مشتق ہوا علیؓ
طوفانِ حادثات سے اے دِل نہ فکر کر اس بحرِ غم سے پار ہو اب کہہ کہ 'یاعلیؓ'
کیا فکر اس کو دشمنِ روبہ خصال کا آقا ہو جس کا شیرِ خدا مرتضیٰ علیؓ
کیا پوچھتے ہو اس دلِ الفت پسند کا مقصد علیؓ، مرام علیؓ، مدعا علیؓ
ہوتا ہے جب مصیبتِ عظمیٰ کا سامنا بے اختیار منہ سے نکلتا ہے 'یاعلیؓ'
سر تاجِ اولیا اسے کیوں کر نہ جانیے؟ تھا بحرِ معرفت کا دُرِ بے بہا علیؓ
ظاہر میں ہے وہ پیکرِ خاکی میں جلوہ گر باطن میں پر نہیں ہے خدا سے جدا علیؓ
جو دوشِ پاکِ مصطفوی پر ہوا سوار دنیا میں کون ہے وہ بجز مرتضیٰ علیؓ
قسام خلد و نار نہ کیوں کر وہ ہو کہ ہے مختارِ کار خانہ ربّ عُلا علیؓ
ظاہر ہو دینِ حق کہ ہوا کفر ناپدید پنہاں ہو جلد شرک کہ پیدا ہوا علیؓ
اس دشتِ گنج ریز سے کیا بخششیں ہوئیں ہے منبعِ عطا و سحابِ سخا علیؓ
دیں میں گناہ گار کا وہ ضامنِ نجات دنیا میں بستہ کار کا حاجت روا علیؓ
ہے بزم میں وہ مظہرِ الطافِ کردگار اور رَزم میں ہے مظہرِ قہرِ خدا علیؓ
مجروحؔ خستہ جاں کی شب و روز ہے دعا سینے میں دَم ہو اور زَباں پر ہو یا علی (۱۹۳)

گوہر تاجِ اِنَّمَا ہے علیؓ جوہرِ تیغِ لافتیٰ ہے علیؓ
مالکِ کارخانۂ تقدیر یا تو خیر الوریٰ یا ہے علیؓ
وصل وہ حق میں اور حق اس میں خانماں سوزِ ماسوا ہے علیؓ
کب گزرتی ہے بے یہاں گزرے در علومِ رسولؐ کا ہے علیؓ
جہلا گر بھٹک رہے ہیں تو کیا حق شناسوں کا پیشوا ہے علیؓ

اہلِ دنیا نے خود پرستی کی   یہ نہ سمجھا کوئی کہ کیا ہے علیؓ
ہے یہاں تابِ دَم زَدَن کس کو   نفسِ پیغمبرِ خدا ہے علیؓ
شیر سے دی نجات سلماں کو   کیوں نہ ہو، ضیغمِ خدا ہے علیؓ
آلِ احمد کا جو سفینہ ہے   اس سفینے کا ناخدا ہے علیؓ
غیر کا یاں گزار ہو کیوں کر   اپنے دل میں سما رہا ہے علیؓ
ہے وہ مقصد برارِ ہر دو جہاں   راست بازوں کا مُدعا ہے علیؓ
کارِ بستہ کا غم نہ کر مجروحؔ   تیرا مشکل کشا سدا ہے علیؓ(۱۹۴)

نجف میں رہے، کربلا میں رہے   مقاماتِ حاجت روا میں رہے
رہا سر پہ سایہ درِ شاہؐ کا   نصیبے سے ظلِّ ہما میں رہے
بلا سے جو دنیا کی چاہے نجات   وہ سب چھوڑ کر کربلا میں رہے
یہاں ہر جگہ ہے تجلیِ طور   شب و روز نور و ضیا میں رہے
جہاں ہے ہر اِک نونہالِ نبی   ہم اس گلشنِ جاں فزا میں رہے
کبھی خیمہ گہ میں، کبھی صحن ہیں   کبھی گنبدِ عرش سا میں رہے
ہوئی ان کی قبروں سے قربت مجھے   سدا جو کہ قربِ خدا میں رہے
دعا ہے کہ مجروحؔ مسکیں سدا   امانِ شہِ لافتیٰ میں رہے(۱۹۵)

صفیرؔ بلگرامی (۷اپریل ۱۸۳۴ء-۱۲مئی ۱۸۹۰ء) ان کا اصل نام فرزند احمد تھا۔ دیوان کے سرورق پر یہ عبارت رقم ہے: ''دیوانِ فصاحت عنوان جناب سید فرزند احمد صغیر بلگرامی شاگرد شیخ امان علی سحر و مرزا سلامت علی دبیر و اسد اللہ خان غالب دہلوی''۔ 'خمخانہ' ان کے دیوان کا تاریخی نام (۱۲۹۶ھ) ہے۔ اس میں مختلف مشاعروں میں پڑھی جانے والی اردو غزلوں کو دیوان کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ صفیرؔ نعت بھی کہتے تھے۔ غزلوں سے منقبت کے یہ شعر دیکھیے:

صفیرؔ اپنے عقیدے میں ہے یہ پہچان ایماں کی   علی کو یاد کرتے ہیں اگر درپیش مشکل ہو(۱۹۶)

روؤں گا فوجِ حسینی کے جو ماتم میں صفیر   ایک اک مرتبہ نکلیں گے بہتّر آنسو(۱۹۷)

آنکھوں میں رہیں صفیرؔ آنسو دل میں غمِ پنجتن ہمیشہ (۱۹۸)

اُمید صفیرؔ ایک جہاں کی ہے بر آتی کس پہ شہِ مرداں کی عنایت نہیں ہوتی (۱۹۹)

خُدایا ہے صفیرؔ امید رکھتا مجھے بخشائیں احمدؐ کے نواسے (۲۰۰)

تعشقؔ لکھنوی، سید مرزا عرف سید صاحب (۱۱مارچ ۱۸۲۳ءلکھنؤ - ۱۲/اپریل ۱۸۹۲ءلکھنؤ) سید محمد مرزا اُنس لکھنوی کے بیٹے اور امام بخش ناسخ (۱۰/اپریل ۱۷۷۲ءفیض آباد-۱۶/اگست ۱۸۳۸ء لکھنؤ) کے شاگرد تھے۔ (۲۰۱)تعشق نے رباعی، قصیدہ، سلام نگاری کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی غزلوں میں حمد و نعت کے ساتھ ساتھ منقبت کے اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ 'براہینِ غم' مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی پہلی جلد ۱۹۲۷ء میں چھپی۔ 'افکارِ تعشق' کے نام سے مہذبؔ لکھنوی (۱۹۰۷ء- ۴نومبر ۱۹۸۵ءلکھنؤ) نے مرثیے ترتیب دیے۔ یہ پہلی جلد لکھنؤ سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ 'گلدستۂ تعشق' اردو غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی اشاعت کا اہتمام مطبع علوی، لکھنؤ کی جانب سے ۱۸۷۴ء میں کیا گیا۔ ۴۴ صفحات پر مبنی غزلوں کا مختصر دیوان ۱۹۰۹ء میں مدیر 'معیار' لکھنؤ کی مساعی سے منظرِ عام پر آیا۔ اضافوں کے بعد 'گلزارِ تعشق المعروف دیوانِ حضرت تعشقؔ' کے نام سے صادق پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۸ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے 'تعشق لکھنوی: حیات، شخصیت، فن اور کلام)' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی رباعیات، سلام، قصائد اور مرثیوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔''

'گلدستۂ تعشق' سے مناقب پر مبنی اشعار ملاحظہ ہوں: (۲۰۱)

جس کو ہے آلِ نبی سے دشمنی وہ تعشقؔ ناری و مردود ہے (۲۰۲)

تعشقؔ اپنی دشواری سے تجھ کو دغدغہ کیا ہے
علی مشکل کشا ہیں، کچھ نہیں تشویش مشکل سے (۲۰۳)

فشارِ گور تعشقؔ جو یاد کرتا ہوں بلا کی جان پہ یا بوتراب بنتی ہے (۲۰۴)

بوقتِ بے کسی کوئی نہیں یاور تعشقؔ کا مدد کو 'یاعلیؑ' کافی تمھاری ذات والا ہے (۲۰۵)

جلال و رعب یہ تھا یک قلم اولٹی صفِ اَعدا
سرِ میداں علی کی جب چلی تیغِ دو دَم سیدھی (۲۰۶)

اندیشہ نہیں کثرتِ اعدا سے تعشق والله کہ مولیٰ تری امداد کریں گے (۲۰۷)

بہرِ امداد پہونچتے ہیں وہیں شیرِ خدا اس تعشق پہ اگر آتی ہے مشکل کوئی (۲۰۸)

اے تعشقؔ ہوں غلامِ مرتضیٰ بعد فنا
لوں میں خدمت کو خدا سے حور و غلماں تو سہی (۲۰۹)

مصیبت ٹل گئی بے شبہ اوس کی حل ہوئی مشکل تعشقؔ جس کے منہ سے 'یا علیِ مرتضیٰ' نکلا (۲۱۰)

یا علیؓ مشکل کشا مشکل کشائی کیجیے یہ تعشؔ آپ سے خواہاں ہے اب امداد کا (۲۱۱)

رہی جب تک زباں قابو میں کام اتنا کیا اوس نے
تعشق سے نہ شغل وردِ نامِ پنجتن چھوٹا (۲۱۲)

یارب بوقتِ مرگ شہادت نصیب ہو مداح ہوں ازل سے شہِ ذوالفقار کا (۲۱۳)

نثار دل سے ہیں ہم تعشق پڑی ہے مشکل جو آکے آئی
ہوئی ہے عقدہ کشائی فوراً کہ ہے لیا نام اگر علیؓ کا (۲۱۴)

رہے گا اے تعشق حشر میں تو تشنہ لب کیونکر امام الاوصیا بھر بھر کے دیں گے جام کوثر کا (۲۱۵)

داخلہ گلشنِ جنت میں ہو یا رب پسِ مرگ   ہے تعشق شہِ والا کے عزا داروں میں (۲۱۶)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں تعشق لکھنوی کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

خبر لو یا علی جلد آ کے دم ہونٹوں پہ آیا ہے
نصیری کے خدا ہو، تم نے مردوں کو جِلایا ہے (۲۱۷)

تیغِ الم سے دل جو تعشق دونیم ہے   دیتے ہیں ہم دوہائی شہِ ذوالفقار کی (۲۱۸)

تعشق لیا جس نے نامِ علیؓ   وہیں اوس کی حاجت روا ہو گئی (۲۱۹)

درد مشکل یہ ہم پاس دوا رکھتے ہیں   دل میں ہاں عشقِ شہِ عقدہ کشا رکھتے ہیں (۲۲۰)

اے تعشق گھر بنانا ہے اگر فردوس میں   عشق کوئی غیرِ عشقِ بوتراب اچھا نہیں (۲۲۱)

بعض اشعار میں شاعر نے حضرت امام حسینؓ سے بھی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

تعشق وہ زباں ہے جس سے لفظِ 'یا علیؓ' نکلے   وہ دل ہے جس میں جوشِ الفتِ شبیر پیدا ہو (۲۲۲)

ہے تمنائے زیارت اس تعشق کو بہت   اے خُدا جلد اب دکھا تو روضۂ شبیر کو (۲۲۳)

محشر میں تعشق کو بجز دامنِ دولت   پروا نہیں یا حضرتِ شبیر کسی کی (۲۲۴)

پائے گا جنت یہ مضمون خطِ تقدیر ہے   اے تعشق تو غلامِ حضرتِ شبیر ہے
کیوں نہ کہے اپنی آنکھوں پر اوٹھا کر ہر بشر   کحلِ چشم حور عین خاکِ درِ شبیر ہے
آفتابِ چرخ میں اتنی کہاں ہے آب و تاب   جو چمک پر روضۂ شبیر کی تنویر ہے
حل کرو مشکل کو یا مشکل کشا بہرِ حسینؓ   ہے تعشق کو تردّد فکر دامن گیر ہے (۲۲۵)

جس نے نگاہِ بد سے تعشق پہ کی نظر   گردوں پہ اوس کے تیغ شہِ لافتیٰ چلی (۲۲۶)

محمد فصیح اللہ وفاؔ کے اردو کلام کے مجموعے "غنچہ مراد عرف دیوانِ وفا" نغمہ ہزار عرف دیوانِ وفا

(۱۹۱۱ء) کے نام سے دستیاب ہے۔ اشاعت کا اہتمام مفتی محمد یوسف فرنگی محلی لکھنوی مالک یوسفی پریس لکھنؤ نے پہلی بار اپریل ۱۹۱۱ء/ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ میں کیا۔ سرورق پر ہمشیرزادہ مصنف مولوی حافظ برکت اللہ فرنگی محلی مالک مطبع انصاری لکھنوی، جنھوں نے ''دیوانِ وفا'' کی جمع آوری کا کام کیا، نے وفا کو فصیح اللسان سرآمد شعرائے جہان کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ''غنچہ مراد'' دیوانِ وفا کا تاریخی نام ہے، جس کے نیچے ۱۳۰۳ھ درج ہے۔ دیوان غزلوں کی ہیئت میں ہے اور اختتامی اوراق پر معاصر شعرا نے وفا کی شعرگوئی کے ذیل میں نظموں اور قطعاتِ تاریخ کی صورت میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ خود وفؔا نے بھی بہت سے قطعاتِ تاریخِ وفات لکھے ہیں۔ ''دیوانِ وفا'' میں اپنی ایک غزل کے شعر میں مصحفی سے خوشہ چینی کا اعتراف کیا ہے:

نہ کیوں شہرت مری ہر ملک میں ہو وفؔا میں خوشہ چیں ہوں مصحفؔی کا (۲۲۷)

وفؔا کے دیوان میں ایک سے زیادہ حمدیں اور نعتیں ملتی ہیں۔ کئی غزلوں میں حمدیہ و نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ غزل کے مقطعے میں آل و اصحاب مصطفیٰ علیہ السلام سے محبت کا یوں اظہار کیا ہے:

وفا اللہ کی درگاہ میں اپنی دعا یہ ہے
رہے دل میں محبت آل و اصحابِ پیمبر کی (۲۲۸)

امداد علی بحؔر (۱۸۱۰ء لکھنؤ - ۱۸۷۸ء لکھنؤ) شاعری میں امام بخش ناسخ سے اکتسابِ فیض حاصل کیا۔ کچھ عرصہ بعد نواب کلب علی خان کے دربار رام پور سے وابستہ رہے۔ ان کی اردو شاعری کا دیوان 'ریاض البحر' مطبع مصطفائی لکھنؤ کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اردو قواعد کے حوالے سے ایک کتاب 'بحر البیان' بھی منظرِ عام پر آئی۔ بحر کی غزلوں میں حمد، نعتیں اور مناقب موجود ہیں۔ ڈاکٹر نور الحسن (ریڈر شعبہ اردو، ایس۔آر۔اے۔ پی کالج، باراچکیا، مشرقی چمپارن، بہار) نے 'امداد علی بحرؔ: حیات اور کارنامے' کے زیرِ عنوان پی ایچ ڈی اردو کا مقالہ لکھا۔ موصوف کے مطابق امداد علی بحؔر کا انتقال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ ڈاکٹر نور الحسن کے مطابق: ''بحر نے اخلاق و تصوف پر مبنی اشعار کثرت سے کہے ہیں اور اس طرح کے خشک مضمون کو اپنی جودتِ طبع سے ندرت بخشی۔''(۲۲۹) ان کی غزلوں سے منقبت کے اشعار ملاحظہ ہوں:

خداوندِ ولائے آل سے غفلت نہ ہو دل کو
زبان و لب نہ بھولیں مرتے دم تک کلمہ محمد کا
مرے ماں باپ ہوں مغفور یارب تیری رحمت سے
میری اولاد ہو ممدوح صدقہ آلِ احمد کا

کیا ہے چاردہ معصوم کو ہر حال میں حامی
ادا ہو بحرؔ سے کیا شکر اس احسانِ بے حد کا(۲۳۰)

اُڑتا ہے جب غبار درِ بُو تراب کا ہوتا ہے سُرمہ چشمِ مہ و آفتاب کا
کیا موج ذوالفقار میں عالم ہے آب کا ہر خود آہنی کو ہے رتبہ حباب کا
اک فقرہ لافتیٰ بھی ہے اوس کے خطاب کا قبضہ ہے دستِ پاک میں سیفِ شباب کا
کیا ہی بہار پر ہیں ریاحینِ مرتضیٰؓ ایسا بہشت میں نہیں تختہ گلاب کا
مقصد دارین حاصل ہے تعشق ہے اگر بادشاہ لافتیٰ کا سید لولاک کا(۲۳۱)

تسلیمؔ لکھنوی (۱۸۱۹ء فیض آباد- ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء لکھنؤ) لکھنوی شعرا ہی نہیں، اردو کے بڑے شعرا میں تسلیم لکھنوی کو قدر و منزلت حاصل ہے۔ شاعری میں تسلیم نے میرزا محمد اصغر علی خان نسیم (۱۷۹۹ء دہلی) کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اپنے کلام میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اور اپنی شاعری کو انھی کا فیض جانتے ہیں۔ حسرت موہانی (۴/اکتوبر ۱۸۷۵ء موہان، اتر پردیش- ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء لکھنؤ) اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء گورکھ پور- ۱۹۳۶ء گونڈہ، اتر پردیش) اور جگر مرادآبادی (۱۶ اپریل ۱۸۹۰ء مرادآباد- ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء گونڈہ) ایسے ممتاز شعرا تسلیم لکھنوی کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ تسلیم لکھنوی کی کلیات کا تاریخی نام 'نظمِ ارجمند' (۱۲۸۸ھ) ہے۔ اور مطبع نول کشور لکھنؤ کے تحت شائع ہوئی۔ ''نظم دل افروز'' (۱۹۰۳ء لکھنؤ) اور ''دفترِ خیال'' (۱۹۱۰ء مطبع سعیدی رام پور) ان کے دواوین ہیں۔ مزید تخلیقات سے بھی شعر و ادب کا دامن مالا مال کیا۔ دو شعر ملاحظہ ہوں، ایک میں اُستاد محترم نسیم دہلوی کو خراجِ محبت پیش کیا ہے اور دوسرے شعر میں اپنی فکرِ رسا کی خود تعریف کی ہے کہ انھیں زمانے کی رائے کی پروا نہیں ہے:

مرا جو نالۂ موزوں ہے تسلیم تصدق ہے نسیمِ دہلوی کا(۲۳۲)

بلا سے گر نہ سمجھے پایۂ فکرِ رسا جاہل مرا سکہ ہے اے تسلیم طبعِ اہلِ جوہر پر(۲۳۳)

فضل امام (۱۹۴۰ء الہ آباد- ۲۰۲۰ء لکھنؤ) کے مطابق: ''تسلیم، دبستان لکھنؤ اور رام پور کے ماحولِ شاعری سے براہِ راست متعلق رہے ہیں اور یہاں کے فن شاعری کو نئے تجربات و نظریات سے مالا مال بھی کیا۔ ان دونوں مراکز پر انھوں نے زندگی کے گراں قدر اور اہم حصے گزارے ہیں۔ اس لیے تسلیم کی شاعری نہ صرف لکھنؤ اور دہلی دبستانوں بلکہ رام پور کے قیام پر ایک سہ رنگی آمیزش کی سج دھج

پیش کرتی ہے۔‘‘(۲۳۴)غزلوں میں موجود منقبتی شعر پیش ہیں:

تسلیمؔ زاہدوں کو مبارک غرورِ زُہد مجھ کو تو آسرا ہے محمد کے آل کا(۲۳۵)

یہ تمنا ہے کہ مر کر حورِ جنت سے سنوں شکر ہے تسلیمؔ خاکِ پائے حیدر ہو گیا(۲۳۶)

کھاتے پیتے یاد کرنا چاہیے تسلیمؔ روز بھوک پیغمبر کی آلِ ساقیِ کوثر کی پیاس(۲۳۷)

چل نجف کو ہند سے تسلیمؔ روشن کر مدام
داغِ دل سے روضۂ پُرنورِ حیدرؓ میں چراغ(۲۳۸)

تو ہی بتلا جز نبی و جز علی تسلیمؔ میں شافعِ روزِ جزا مشکل کشا کس کو کہوں(۲۳۹)

اے خدا تسلیمؔ کو خاکِ رہِ سبطین کر کیا کرے گا لے کے فردوسِ معلّٰی آپ سے(۲۴۰)

اب تو جوشِ آرزو تسلیمؔ کہتا ہے یہی روضۂ شاہِ نجف اللہ دِکھلائے مجھے(۲۴۱)

غمِ خانۂ زمانہ میں تسلیمؔ روز و شب عشرت نہ چاہیے غمِ شبیر چاہیے(۲۴۲)

امیرؔ مینائی (۲۱فروری ۱۸۲۸ء لکھنؤ - ۱۳راکتوبر ۱۹۰۰ء حیدرآباد، دکن) اصل نام امیر احمد والد گرامی کا نام مولوی کرم محمد تھا۔ لکھنؤ کے بزرگ شاہ مینا (شیخ محمد بن قطب معروف بہ مخدوم شاہ مینا لکھنوی وفات ۱۶ مئی ۱۴۷۹ء، مدفن لکھنؤ) کے فیضِ نسبت سے مینائی جزوِ نام بنایا۔ ’’مراۃ الغیب‘‘ (طبع اوّل ۱۸۹۲ء) ان کا دیوان ہے۔ غزلوں کے بعد اس دیوان کے آخری حصے میں تخمیس، رباعیات، قطعات تاریخ، ترجیع بند، ترکیب بند بھی شامل ہیں۔ شمیم انہونوی مرتبِ ’مراۃ الغیب‘ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

’’امیر مینائی مرحوم اپنی قوتِ شاعری کی بدولت ہر رنگ میں بہتر سے بہتر شعر نکال سکتے تھے۔ ان کے دواوین پڑھیے، وہ ایسے گلدستے معلوم ہوں گے جنھیں گلستانِ اُردو کے ہر چمن کے پھول آپ کو نظر آئیں گے۔ رنگ کے اعتبار سے بھی اور بُو کے لحاظ سے بھی یعنی ولی سے لے کر اپنے معاصرین کے عہد تک جس تک جس قسم کی شاعری عہد بہ عہد مقبول رہی ہے، یا جس نوعیت کے اساتذہ مشہور و معروف

رہے ہیں۔امیر مینائی نے ہر دور کے ممتاز شاعر کے پہلو بہ پہلو پرواز کرنے کی کوشش کی ہے۔شاعرانہ قوت اور صلاحیت کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔‘‘(۲۴۳) ’صنم خانہ عشق‘ امیر مینائی کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے اور یہ نام علم الاعداد (۱۳۰۶ء) کی روشنی میں رکھا گیا۔پہلی بار مولوی محمود احمد انور مینائی نے بالاہتمام ۱۹۳۳ھ میں امیر المطابع حیدرآباد سے شائع کرایا۔سرورق پر استادِ نواب خلد آشیاں والیِ ریاست رام پور کے الفاظ لکھے ہیں۔امیر کی غزلوں میں شامل منقبتی اشعار ملاحظہ ہوں:

امیرِ خستہ جاں آفت میں ہے یا حیدر
کرو امداد اس کی وقت ہے مشکل کشائی (۲۴۴)

الفت امیر آلِ محمدؐ سے فرض ہے مشکل ہے بے سفینہ ارادہ عبور کا (۲۴۵)

ہو یقیں ہو رجعتِ خورشید سے جلدی سحر
حکمِ حیدر ہی صدائے پاسبانِ کوئے دوست (۲۴۶)

اے امیر احمد مرسل کے جو ہیں چار وزیر چار یاری ہوں مجھے ہیں یہ برابر چاروں (۲۴۷)

کیا اثر نام علیؓ میں ہے کہ لیتے ہیں امیرؔ کام بگڑے ہوئے جتنے ہیں سنور جاتے ہیں (۲۴۸)

حریم لطف و عطا میں شمیمِ خلقِ نبی دمِ وغا کفِ حیدر میں ذوالفقار ہوں میں (۲۴۹)

امیر مینائی غزلوں کے دوسرے مجموعے ’’صنم خانۂ عشق‘‘ میں منقبتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا کے نور ہیں سبطینِ احمد کہاں یہ نور پائیں چاند سورج (۲۵۰)

دولتِ عقبیٰ اگر چاہے امیرؔ دستِ دل سے دامنِ شبیر کھینچ (۲۵۱)

رولے اپنے حال پر جاتی جوانی میں امیر
رات تھوڑی رہ گئی ہے نالۂ شب گیر کھینچ (۲۵۲)

امیرؔ اپنا دلِ پُرداغ سوئے کربلا لے چل یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل (۲۵۳)

داغؔ دہلوی (۲۵ مئی ۱۸۳۱ء دہلی - ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء حیدرآباد، دکن) انھیں فصیح الملک، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ دربار دہلی، رام پور اور حیدرآباد دکن کے درباروں سے منسلک رہے۔ استاد محمد ابراہیم ذوق (۱۷۹۰ء دہلی - ۱۸۵۴ء دہلی) کے حضور زانوئے تلمذتہ کیا۔ 'یادگارِ داغ' میں استادِ سخن کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

یہ بہارِ داغؔ ہے گلزارِ ابراہیمؔ کی
ذوقؔ کہتے ہیں جسے ہے فیض اس استاد کا (۲۵۴)

داغؔ کو طویل تر غزلیں کہنے کا لپکا ہے۔ طوالت کے باوصف شعر خوب نکالتے اور اربابِ ذوق سے داد پاتے ہیں۔ ان کے متعدد اشعار اور غزلیں شائقینِ شعر کو ازبر ہیں۔ ''گلزارِ داغ''، ''آفتاب داغ''، ''مہتاب داغ''، ''یادگارِ داغ'' اور مثنوی ''فریادِ داغ'' ان سے یادگار رہے۔ ''کلیاتِ میر'' اور ''کلیاتِ مصحفیؔ'' کے مانند کلیاتِ داغؔ بھی ضخیم و جسیم کلیات ہے، غزلوں میں منقبتی اشعار ملاحظہ ہیں:

اے داغؔ کیوں نہ مجھ کو شفاعت کی ہو امید میں ہوں محب حسینؓ کا دشمن یزید کا (۲۵۵)

مری مشکل ہوئی اے داغؔ آساں تصدق اپنے میں مشکل کشا کے (۲۵۶)

'مہتابِ داغ' سے منقبت کے اشعار پیشِ خدمت ہیں:

یہ داغ ہے صحابۂ عظام کا مطیع یہ داغ جانثار ہے آلِ رسول کا (۲۵۷)

داغ کیا خوب صرصرِ عصیاں خاکِ پائے ابو ترابؓ ہوں میں (۲۵۸)

'یادگارِ داغ' میں شامل اظہارِ عقیدت کا انداز ملاحظہ ہو:

نہ گھبرا عقدۂ دشوار سے اے داغ تو ہرگز
قسم مشکل کشا کی یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے! (۲۵۹)

قلی قطب شاہ سے لے کر میرزا داغ دہلوی تک اُردو غزلوں میں منقبتی اشعار کا یہ مطالعہ یقیناً نامکمل ہے۔ اس میں بہت سے ممتاز شعرا کے نام شامل نہیں اور متعدد گم نام اور کم نام شعرا کے نام اور اُن کا کلام موجود ہے۔ اس کا بڑا سبب مضمون کی تحدید ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ کئی شعرا ایسے ہیں جن کے ہاں دیگر اصناف اور ہیئتوں میں تو مناقب موجود ہیں مگر غزلوں میں اس کی مثالیں موجود نہیں ہیں، جو ہیں انھیں از روئے احتیاط اس مطالعے کا حصہ بنانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اس مطالعے سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ خالص رومانی پیرائے میں کہی جانے والی غزلوں میں بھی شاعر ثنائے الٰہی، مدحِ مصطفیٰ اور ستائشِ صحابہ سے غافل نہیں رہا۔ یعنی ایک پہلو غزل کا رومانی ہے اور دوسرا رُوحانی، انھی دو عناصر سے اُردو غزل ممتاز اور معتبر ہے۔ وقت اور ضرورت کے تحت شاعروں نے دیگر موضوعات سے بھی غزل پیمانے کو بھر دیا جس سے اس کی تاثیر میں اضافہ ہو گیا اور بعض دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں ایک نمائندہ صنف قرار پائی۔ اس صنف نے شاعر کے ذاتی احساسات کے ساتھ ساتھ انبوہ کے جذبات و محسوسات کو بھی خود میں سمو لیا۔ غزل کا رُوحانی زاویہ دینی تعلیمات اور مقامی اثرات کی بدولت متصوّفانہ جہتوں کو سامنے لے کر آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی صحبتوں اور محبتوں سے فیض یاب ہونے والے صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیتؓ کی شان بیان کرنے اور ان بزرگوں سے اپنی عقیدتوں کے اظہار کے لیے شعرا نے مختلف النوع قرینے اپنائے۔ صحابہ سے محبت کو رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے محبت کے مماثل سمجھا گیا۔ کلاسیکی عہد کی غزلوں میں منقبتی اشعار کی اپنی ہی جمالیات ہے جسے مصرع بہ مصرع صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اہلِ بیت کرام، پنجتن پاک اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، کربلائی و عزائی کرداروں اور اِصطلاحات حُسین، عباس، زینب، مسلم بن عقیل، قاسم، علی اکبر، علی اصغر، حُر، زین العابدین، شہر بانو، صغریٰ، سکینہ، یزید، شمر، ابنِ زیاد، حرمل، عاشور، پیاس، پانی، تیر، تلوار، گھوڑا، علَم، فرات، اسیری، مسافرت، سجدہ، لشکر، مشکیزہ، غم، دشت، خیمہ، قافلہ، لاشہ، ردا، ریت، چراغ، کربلا، کوفہ، شام، دمشق، رَے، عراق۔ جو فی الاصل مرثیہ نگاری کا مایہ ہیں۔ کلاسیکی اُردو غزل میں پورے شد و مد سے تو انھیں نہیں برتا گیا تاہم چند کردار اور اصطلاحات ضرور موجود ہیں۔ کلاسیکی اُردو غزل نگاروں کے رثائی عناصر کم ہیں تاہم وفورِ عقیدت میں وہ کسی سے ہٹے بھی نہیں ہیں۔ کلاسیکی عہد ہو یا مابعد ادوار غزل میں منقبتی عناصر کی تسلسل کے ساتھ موجودگی اور پیشکش کے جداگانہ اسلوب نے اسے اور بھی صیقل کر دیا ہے۔ موضوعات میں وسعت اور فکریات میں وقعت پیدا کر دی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ خلیل الرحمن اعظمی، مضامینِ نو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۷۹

۲۔ عابد علی عابد، سیّد، اصولِ انتقادِ ادبیات، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اوّل، ۱۹۶۰ء، ص ۲۳۶

۳۔ ولی دکنی، کلیاتِ ولی، مرتب: نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی، ص ۱۸۴

۴۔ نثار ترابی، ڈاکٹر، ابتدائیہ: اُردو غزل کے عصری رویے، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اوّل، ۲۰۲۴ء، ص ۱۲

۵۔ قرآن مجید، سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۱۹

۶۔ قلی قطب شاہ، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، مرتب: ڈاکٹر سیّدہ جعفر، نئی دہلی: ترقیِ اُردو بیورو، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء، ص ۴۷۵

۷۔ ایضاً، ص ۵۳۰　　۸۔ ایضاً، ص ۵۵۲　　۹۔ ایضاً، ص ۵۵۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۵۵

اِثناعشری پیروکاروں کے نزدیک درج ذیل بارہ امام ماموَر من اللہ ہیں۔

۱۔حضرت علی المرتضیٰؓ　　۲۔حضرت امام حسنؓ　　۳۔حضرت امام حسینؓ

۴۔حضرت زین العابدینؒ　　۵۔حضرت امام باقرؒ　　۶۔حضرت امام جعفر صادق

۷۔حضرت امام موسیٰ کاظمؒ　　۸۔حضرت امام علی رضاؒ　　۹۔حضرت امام جواد تقیؒ

۱۰۔حضرت امام ہادی نقیؒ　　۱۱۔حضرت امام حسن عسکریؒ　　۱۲۔اِمام مہدی

۱۱۔ سیّدہ جعفر، ڈاکٹر، پیش لفظ، کلیات محمد قلی قطب شاہ، ص ۲۰۰

۱۲۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، طبع چہارم، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۔۱۵

۱۳۔ ولی دکنی، کلیاتِ ولی، مرتب: نورالحسن ہاشمی، لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، طبع اوّل، ۱۹۸۹ء، ص ۸۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۵　　۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۸　　۱۶۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۸۵

۱۸۔ سراج اورنگ آبادی، کلیاتِ سراج، مرتب: عبدالقادر سروری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، باردوم ۱۹۹۸ء، ص ۳۹۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۰۶　　۲۰۔ ایضاً، ص ۳۲۲　　۲۱۔ ایضاً، ص ۳۸۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۹۷　　۲۳۔ ایضاً، ص ۵۱۳

۲۴۔ یقین، انعام اللہ خان، دیوانِ یقین، مرتب: مرزا فرحت اللہ بیگ، علی گڑھ: مطبع مسلم یونیورسٹی، طبع اوّل، س۔ن، ص ۱۵

مظہر کے بارے میں میر تقی میر لکھتے ہیں:

مرزا جانِ جاں، مظہر تخلص، مرد یست مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب ِکمال، شہرۂ عالم، بے نظیر، معزز، مکرم اصلش از اکبر آباد است، پدرِ اُو مرزا جان نام داشت۔ از فرط شفقت (پدری) مرزا جانِ جاں می گفت۔ ازیں سبب ہمیں اسم موسوم است۔۔۔''

۲۵۔ یقین، انعام اللہ خاں، دیوانِ یقین، ص ایک

۲۶۔ افتخار بیگم صدیقی، مقدمہ: دیوانِ شاکر ناجی، مرتب: افتخار بیگم صدیقی، نئی دہلی: انجمن ترقیِ اُردو (ہند)، ۱۹۸۹ء، ص ۲۲

۲۷۔ شاکر ناجی، دیوانِ شاکر ناجی، ص ۳۲۶

۲۸۔ شوق، قدرت اللہ، تذکرہ طبقات الشعراء، مرتب: نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۳۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۸۰ ۳۰۔ ایضاً، ص ۳۱۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶۸ ۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳۵ ۳۴۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۳۵۔ عبدالحق، پروفیسر مقدمہ، دیوانِ حاتم، مرتب: پروفیسر عبدالحق، نئی دہلی: ۲۰۰۸ء، ص ۸۱

۳۶۔ حاتم، ظہورالدین، دیوان زادہ، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۳ ۳۸۔ ایضاً، ص ۲۳۴ ۳۹۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۴۰۔ غلام حسین ذوالفقار، مقدمہ: دیوان زادہ، ص ۲۴

۴۱۔ حاتم، شیخ ظہورالدین، دیوان زادہ، ص ۷۱

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۰ ۴۳۔ ایضاً، ص ۹۳ ۴۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۵ ۴۶۔ ایضاً، ص ۷۱ ۴۷۔ ایضاً، ص ۸۰

۴۸۔ ایضاً، ص ۸۸ ۴۹۔ ایضاً، ص ۹۶ ۵۰۔ ایضاً، ص ۹۶

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴ ۵۲۔ ایضاً، ص ۱۴۹ ۵۳۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۵۵۔ آسی، عبدالباری، مقدمہ: کلیاتِ سودا، جلد اوّل، لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، ۱۹۳۲ء، ص ۱۰

۵۶۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، جلد اوّل، ص ۷۷

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۱۰ ۵۸۔ ایضاً، ص ۴۲ ۵۹۔ ایضاً، ص ۶۴

۶۰۔ ایضاً، ص ۶۶ ۶۱۔ ایضاً، ص ۹۴ ۶۲۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۶۳۔ ظہیر احمد صدیقی، سوز اور ان کی شاعری، ابتدائیہ، مشمولہ: دیوانِ سوز، ۱۹۶۳ء، ص ۴۴

۶۴۔ میر سوز، کلیاتِ سوز، مرتب: ڈاکٹر سیّد علی حیدر نیر، پٹنہ: ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، ۱۹۷۷ء، ص ایک نصیری فرقے کا بانی کا نام محمد بن نصیر البصری المنیری ہے۔ دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مطابق: ''نصیری گیارہویں امام حسن العسکری کا ایک مداح اور رفیق کار تھا۔ نصیری حضرت علیؓ کی ربوبیت کے قائل ہیں جو بادلوں میں سکونت پذیر ہیں۔ بادل کو دیکھ کر وہ حضرت علیؓ پر سلام بھیجتے ہیں۔ ان کے

نزدیک بجلی کی گرج حضرت علیؓ کی آواز اور اس کی چمک حضرت علیؓ کی مسکراہٹ ہے۔ اس لیے وہ بادلوں کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ خلفائے ثلاثہ پر وہ سب وشتم کرتے ہیں۔ ان کی بعض شاخوں کا خیال ہے کہ امام حسینؓ شہید نہیں ہوئے، بلکہ کہیں غائب ہوئے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دین اسلام کی تکمیل حضرت علیؓ کی ولایت سے مشروط ہے؛ اہلِ بیت ہی محرم اسرار شریعت ہیں۔۔۔''

(اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد نمبر ۲۲، لاہور: دانش گاہِ پنجاب، طبع اوّل ۱۹۸۹ء، ص ۳۴۱، دائرہ میں شامل مفصل و مدلل مضمون شیخ نذیر حسین اور Louis Massignon کا لکھا ہوا ہے۔)

۶۵۔ ایضاً، ص ایک
۶۶۔ ایضاً، ص ۲
۶۷۔ ایضاً، ص ۴۷
۶۸۔ ایضاً، ص ۸۶
۶۹۔ ایضاً، ص ۸۶
۷۰۔ ایضاً، ص ۹۰
۷۱۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۷۲۔ ایضاً، ص ۲۱۴
۷۳۔ ایضاً، ص ۲۲۳
۷۴۔ ایضاً، ص ۲۷۰
۷۵۔ عبادت بریلوی، مقدمہ، کلیاتِ میر، مرتب: عبادت بریلوی، کراچی: اُردو دُنیا، ۱۹۵۸ء، ص ۶۷
۷۶۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد سوم، مرتب: کلب علی خان فائق، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، طبع دوم، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۳
۷۷۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد چہارم، حوالہ مذکورہ بالا، ص ۲۴۷
۷۸۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اوّل، مرتب: آسی الدنی، لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۳
۷۹۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد دوم، حوالہ مذکورہ بالا، ص ۲۱۱۱
۸۰۔ ایضاً، ص ۲۷۴
۸۱۔ ایضاً، ص ۳۵۷
۸۲۔ میر تقی میر، کلیاتِ سوم، ص ۴۰
۸۳۔ خاتمۃ الطبع، دیوانِ میر حسن، لکھنؤ: منشی نول کشور، س۔ن، ص ۱۴۴
۸۴۔ میر حسن، دیوانِ میر حسن، ص ۳
۸۵۔ محمد حسن، تعارف، دیوانِ آبرو، مرتب: ڈاکٹر محمد حسن، نئی دہلی: ترقیِ اُردو بیورو، طبع اوّل، ۲۰۰۰ء، ص ۸
۸۶۔ آبرو، شاہ مبارک، دیوانِ آبرو، ص ۹۰
۸۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶
۸۸۔ ایضاً، ص ۱۵۲
۸۹۔ ایضاً، ص ۲۸۴
۹۰۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔۱۹۵
۹۱۔ ایضاً، ص ۲۱۸
۹۲۔ شمیم احمد، ڈاکٹر، مرتب: دیوانِ یکرو، مظفر پور: ادارۂ اُردو، ۱۹۷۸ء، ص ۳۸۔۳۹
۹۳۔ یکرو، عبدالوہاب، دیوانِ یکرو، ص ۹۲

۹۴۔ ایضاً،ص ۲۷ ۹۵۔ ایضاً،ص ۴ ۹۶۔ ایضاً،ص ۹۵

۹۷۔ حسرت،جعفر علی،مرزا،کلیاتِ حسرت،مرتب:ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی،لکھنؤ:ادارۂ فروغِ اُردو،۱۹۶۶ء،ص ۳

۹۸۔ ایضاً،ص ۲۱۷ ۹۹۔ ایضاً،ص ۳۲۸ ۱۰۰۔ ایضاً،ص ۵۰۲

۱۰۱۔ ایضاً،ص ۵۱۰

۱۰۲۔ نورالحسن ہاشمی،ڈاکٹر،پیش لفظ،کلیاتِ حسرت،حوالہ مذکورہ بالا،ص م

۱۰۳۔ حسرت،جعفر علی مرزا،حوالہ مذکورہ بالا،ص ۱۱۳

۱۰۴۔ صباح الدین عبدالرحمن،سیّد،مرتب: دیوانِ فغاں،شاعر:اشرف علی فغاں،کراچی: انجمن ترقیِ اُردو،طبع اوّل،۱۹۵۰ء،ص ۲۵۔۲۶

۱۰۵۔ فغاں،اشرف علی خان،دیوانِ فغاں،ص ۸۹

۱۰۶۔ عرشی، امتیاز علی خاں، مقدمہ: نادرات شاہی، شاعر: شاہ عالم ثانی، مرتب: امتیاز علی خاں عرشی، رام پور: کتابخانہ رام پور،طبع اوّل، ۱۹۴۴ء،ص ۴۱

۱۰۷۔ شاہ عالم ثانی،نادراتِ شاہی،ص ۲۹

۱۰۸۔ نورالحسن نقوی،ڈاکٹر،مرتب:کلیاتِ جرأت،علی گڑھ:مسلم یونیورسٹی،۱۹۷۱ء،ص ۱۹۔۲۰

۱۰۹۔ جرأت، کلیاتِ جرأت، جلد اوّل، دیوانِ غزلیات، مرتب:ڈاکٹر اقتدا حسن، نیپلز، اطالیہ: اِستی توتو اونیورستیاریواورینتالے،۱۹۷۰ء،ص ۵۱۲

۱۱۰۔ ایضاً،ص ۵۶۲

۱۱۱۔ آمنہ خاتون،ڈاکٹر،مقدمہ:کلیاتِ انشا،مرتب:خلیل الرحمن داؤدی،لاہور:مجلس ترقیِ ادب،طبع اوّل، ۱۹۶۹ء،ص ۲۳

۱۱۲۔ انشا،کلیاتِ انشا،ص ۱۱

۱۱۳۔ ایضاً،ص ۹۱ ۱۱۴۔ ایضاً،ص ۹۲ ۱۱۵۔ ایضاً،ص ۱۲۱۔۱۲۲
خلیل الرحمن داؤدی نے حاشیہ میں بتایا ہے کہ یہ یونانی دواؤں کے نام ہیں۔

۱۱۶۔ ایضاً،ص ۱۳۰۔۱۳۱ ۱۱۷۔ ایضاً،ص ۱۳۲ ۱۱۸۔ ایضاً،ص ۱۵۹

۱۱۹۔ ایضاً،ص ۱۹۳ ۱۲۰۔ ایضاً،ص ۲۰۸ ۱۲۱۔ ایضاً،ص ۲۹۲

۱۲۲۔ ایضاً،ص ۳۰۹ ۱۲۳۔ ایضاً،ص ۳۲۴ ۱۲۴۔ ایضاً،ص ۳۲۷

۱۲۵۔ ایضاً،ص ۳۴۰ ۱۲۶۔ ایضاً،ص ۳۷۵ ۱۲۷۔ ایضاً،ص ۳۹۹

۱۲۸۔ مصحفی، غلام ہمدانی، کلیاتِ مصحفی، دیوان سوم،مرتب: نورالحسن نقوی، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۷۱ء،ص ۴۵

۱۲۹۔ مصحفی، غلام ہمدانی، کلیاتِ مصحفی، دیوان اوّل، ص ۳۴۴
۱۳۰۔ آتش، خواجہ حیدر علی، کلیاتِ آتش، جلد اوّل، مرتب: سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، طبع اوّل، ۱۹۷۵ء، ص ۲۶۶
۱۳۱۔ ایضاً، ص ۲۳۰ ۱۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱ ۱۳۳۔ ایضاً، ص ۱۵۳
۱۳۴۔ ایضاً، ص ۲۴۷۔۲۴۸ ۱۳۵۔ ایضاً، ص ۲۸۰ ۱۳۶۔ آتش، کلیاتِ آتش، جلد دوم، حوالہ مذکورہ بالا، ص ۱۳۱
۱۳۷۔ ایضاً، ص ۲۱۵ ۱۳۸۔ ایضاً، ص ۲۳۴
۱۳۹۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، مقدمہ: کلیاتِ شاہ نصیر، جلد اوّل، مرتبین: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، طبع اوّل، ۱۹۷۱ء، ص ۷۷
۱۴۰۔ شاہ نصیر، کلیاتِ شاہ نصیر، ص ۱۹۴
۱۴۱۔ شاہ نصیر، کلیاتِ شاہ نصیر، جلد اوّل، مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص ۱۴۵۔۱۴۶
۱۴۲۔ ایضاً، ص ۱۷۵ ۱۴۳۔ ایضاً، ص ۲۸۷ ۱۴۴۔ ایضاً، ص ۳۳۸ ۱۴۵۔ ایضاً
۱۴۶۔ شاہ نصیر، کلیاتِ شاہ نصیر، جلد دوم، مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۸
۱۴۷۔ ایضاً، ص ۴۳۲ ۱۴۸۔ ایضاً، ص ۴۵۲
۱۴۹۔ شاہ نصیر، کلیاتِ شاہ نصیر، جلد سوم، ص ۱۰۵۴
۱۵۰۔ ایضاً، ص ۱۸۶
۱۵۱۔ ذوق، شیخ محمد ابراہیم، کلیاتِ ذوق، مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۶
۱۵۲۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۱۵۳۔ شاہ تراب علی کاکوروی، دیوانِ تراگب، کان پور: مطبع منشی نول کشور، طبع اوّل، ۱۸۹۲ء، ص ۲۰
۱۵۴۔ ایضاً، ص ۲۸ ۱۵۵۔ ایضاً، ص ۸۸ ۱۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۱۵۷۔ محمد موسیٰ کلیم، مرزا اسد اللہ غالب، مقالہ، مشولہ: تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، اُردو ادب، جلد سوم، مدیر عمومی: خواجہ محمد زکریا، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع دوم، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۶۔۱۵۷
۱۵۸۔ غالب، اسد اللہ، دیوانِ غالب، نسخہ حمیدیہ، مرتب: پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، طبع دوم، ۱۹۹۲ء، ص ۲۴۱
۱۵۹۔ ایضاً، ص ۱۱۴ ۱۶۰۔ ایضاً، ص ۱۳۳
پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق اس شعر کا مصرع اولیٰ یوں بدلا ہے:
نور سے تیرے ہے اس کی روشنی

۱۶۱۔ ایضاً،ص ۱۴۴

حضرت علی المرتضیٰ کو خدا کہنے کی یہ سوچ نصیریوں سے ملتی جلتی ہے۔

۱۶۲۔ ایضاً،ص ۱۷۸ ۱۶۳۔ ایضاً،ص ۱۹۵ ۱۶۴۔ ایضاً،ص ۱۹۲

۱۶۵۔ ایضاً،ص ۲۳۴ ۱۶۶۔ ایضاً،ص ۲۳۶ ۱۶۷۔ ایضاً،ص ۲۴۲

۱۶۸۔ رنگون (Rangoon) کا نیا نام یانگون (Yangon) ہے اور برما کا نیا نام میانمار (Myanmar) دریائے ایراوتی کے کنارے آباد رنگون شہر برما کا دارالحکومت اور اہم کاروباری مرکز تھا۔ یہاں بدھ مت، ہندومت، اسلام اور عیسائیت کے پیروکار آباد ہیں۔

۱۶۹۔ ابواللیث صدیقی، پیش لفظ: دیوانِ ظفر، نئی دہلی: اعجاز پبلشنگ ہاؤس، طبع اوّل، س۔ن، ص ۷

۱۷۰۔ ظفر، بہادر شاہ، کلیاتِ بہادر شاہ ظفر، لکھنؤ: منشی نول کشور، ۱۸۸۷ء، ص ۴۷

۱۷۱۔ ایضاً،ص ۶۵ ۱۷۲۔ ایضاً،ص ۷۰

۱۷۳۔ صبا، وزیر علی، غنچۂ آرزو، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۳۔۱۴۴

۱۷۴۔ اسیر، سیّد مظفر علی، دیوانِ اسیر، لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، طبع اوّل، ۱۸۷۰ء، ص ۱۵

۱۷۵۔ ایضاً،ص ۱۷ ۱۷۶۔ ایضاً،ص ۲۹ ۱۷۷۔ ایضاً،ص ۳۰

۱۷۸۔ ایضاً،ص ۵۳ ۱۷۹۔ ایضاً،ص ۵۸ ۱۸۰۔ ایضاً،ص ۱۷

۱۸۱۔ ایضاً،ص ۸۸

۱۸۲۔ محمد تقی علی، مرزا، تقریظ: مرغوبِ جہاں، شاعر: سیّد تجمل حسین تجمل، لکھنؤ: طبع منشی نولکشور، ۱۸۹۰ء، ص ۲

۱۸۳۔ تجمل، تجمل حسین، سیّد، مرغوب جہاں، ص ۱۵

۱۸۴۔ ایضاً،ص ۱۲ تا ۱۸ ۱۸۵۔ ایضاً،ص ۳۱ ۱۸۶۔ ایضاً،ص ۴۷

۱۸۷۔ صابر دہلوی، قادر بخش، مرزا، تذکرہ گلستانِ سخن، جلد اوّل، لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۹۲

۱۸۸۔ محمد فیروز، ڈاکٹر، میر مہدی مجروح، حیات اور تصانیف، دہلی: زیڈ۔اے آفسیٹ پرنٹرز، طبع اوّل، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۷

۱۸۹۔ مجروح، میر مہدی حسین، مظہر معانی، دیوانِ مجروح، مرتب: ریاض احمد، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، طبع اوّل، ۱۹۷۸ء، ص ۱۷

۱۹۰۔ ایضاً،ص ۱۶۱۔۱۶۲ ۱۹۱۔ ایضاً،ص ۱۶۷ ۱۹۲۔ ایضاً،ص ۲۳۱

۱۹۳۔ ایضاً،ص ۲۷۰۔۲۷۱ ۱۹۴۔ ایضاً،ص ۲۷۱۔۲۷۲ ۱۹۵۔ ایضاً،ص ۲۷۳

۱۹۶۔ صفیر بلگرامی، خمخانہ الملقب دیوان صفیر بلگرامی، لکھنؤ: مطبع کارنامہ، ۱۲۹۶ھ، ص ۹۲

۱۹۷۔ ایضاً،ص ۹۳ ۱۹۸۔ ایضاً،ص ۱۰۳ ۱۹۹۔ ایضاً،ص ۱۳۱
۲۰۰۔ ایضاً،ص ۱۵۲
۲۰۱۔ تعشق لکھنوی نے نواب احمد حسن المعروف باچھی متخلص بہ جوش (مجموعہ کلام: ''چمنستانِ جوش''، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء) کی شاگردی پہ ناز کیا ہے۔ دوغزلوں کے ساتھ دیوان کے آخری حصے میں استادِ گرامی کی طرف قطعہ تاریخ طبع دیوان ہٰذا سے پہلے یہ عبارت لکھی ہے: قطعہ تاریخ طبع دیوان ہٰذا چکیدہ کلک در رسلک المعی زماں نو وعی دوراں اوستاد بندہ جناب نواب احمد حسن خان صاحب بہادر دام اقابلہ المعروف باچھی صاحب متخلص بہ جوش شاعر بےنظیر سلمہ' القدیر خلف الصدق نواب محمد مقیم خان مرحوم بن نواب محبت خان صاحب بہادر مغفور نور اللہ مرقدہ ولد حافظ الملک نواب حافظ رحمت خان صاحب بہادر مبرور والی سابق روہلکھینڈ طاب اللہ ثراہ وجعل الجنتہ مثواہ۔'' (ص ۱۹۶) اُستادِ گرامی کی شان میں غزلوں کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

تعشق کی دعا ہے اے خدا صدقہ محمد کا
رہے اقبال یاور حشر تک احمد حسن خان کا (ص ۵)

جوش کا شاگرد ہوں میں شاعر نامی ہوں
میرے آگے شاعری بیکار ہے مانک پور میں (ص ۷۷)

۲۰۲۔ ایضاً،ص ۱۳۷ ۲۰۳۔ ایضاً،ص ۱۴۰ ۲۰۴۔ ایضاً،ص ۱۴۰
۲۰۵۔ ایضاً،ص ۱۴۱ ۲۰۶۔ ایضاً،ص ۱۴۲ ۲۰۷۔ ایضاً،ص ۱۴۹
۲۰۸۔ ایضاً،ص ۱۶۰ ۲۰۹۔ ایضاً،ص ۱۶۵
۲۱۰۔ تعشق لکھنوی، گلدستہ تعشق، لکھنؤ: مطبع علوی محمد علی بخش خاں، ۱۸۷۴ء، ص ۵
۲۱۱۔ ایضاً،ص ۹ ۲۱۲۔ ایضاً،ص ۱۲ ۲۱۳۔ ایضاً،ص ۱۴
۲۱۴۔ ایضاً،ص ۲۹ ۲۱۵۔ ایضاً ۲۱۶۔ ایضاً،ص ۸۴
۲۱۷۔ ایضاً،ص ۱۱۸ ۲۱۸۔ ایضاً،ص ۱۲۰ ۲۱۹۔ ایضاً،ص ۱۲۶
۲۲۰۔ ایضاً،ص ۸۶ ۲۲۱۔ ایضاً،ص ۹۴۔۹۵ ۲۲۲۔ ایضاً،ص ۱۰۵
۲۲۳۔ ایضاً،ص ۱۰۷ ۲۲۴۔ ایضاً،ص ۱۲۸ ۲۲۵۔ ایضاً،ص ۱۵۴
۲۲۶۔ ایضاً،ص ۱۶۰
۲۲۷۔ وفا، محمد فصیح اللہ، غنچۂ مراد عرف دیوانِ وفا، لکھنؤ: یوسفی پریس، ۱۹۱۱ء، ص ۲۱
۲۲۸۔ ایضاً،ص ۱۰۱

۲۲۹۔ نورالحسن، ڈاکٹر، امداد علی بحر---- حیات اور کارنامے، بہار، س۔ن، ص ۱۶۶
۲۳۰۔ بحر، امداد علی، ریاض البحر، لکھنؤ: مطبع مصطفائی، ۱۲۸۳ھ، ص ۳
۲۳۱۔ ایضاً، ص ۳۔۴
۲۳۲۔ تسلیم لکھنوی، دیوان امیر اللہ تسلیم، لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، ص ۴۲
۲۳۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶
۲۳۴۔ فضل امام، مقدمہ: انتخاب غزلیاتِ امیر اللہ تسلیم، لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱
۲۳۵۔ ایضاً، ص ۵۱   ۲۳۶۔ ایضاً، ص ۸۴   ۲۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳۲
۲۳۸۔ ایضاً، ص ۱۴۵   ۲۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶۵   ۲۴۰۔ ایضاً، ص ۱۸۴
۲۴۱۔ ایضاً، ص ۱۸۴   ۲۴۲۔ ایضاً، ص ۱۹۵
۲۴۳۔ شمیم انہونوی، مرتب: مراۃ الغیب، دیباچہ، لکھنؤ: مکتبہ کلیاں، س۔ن، ص ۶
۲۴۴۔ امیر مینائی، مراۃ الغیب، مرتب: شمیم انہونوی، ص ۷۴
۲۴۵۔ ایضاً، ص ۷۴   ۲۴۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱   ۲۴۷۔ ایضاً، ص ۱۹۶
۲۴۸۔ ایضاً، ص ۲۱۸   ۲۴۹۔ ایضاً، ص ۲۲۱   ۲۵۰۔ امیر مینائی، صنم خانۂ عشق،
حیدر آباد، دکن: امیر المطابع، ۱۳۳۲ھ، ص ۶۹
۲۵۱۔ ایضاً، ص ۷۰   ۲۵۲۔ ایضاً، ص ۷۱   ۲۵۳۔ ایضاً، ص ۱۱۵
۲۵۴۔ داغ دہلوی، کلیاتِ داغ (یادگارِ داغ)، دہلی: کتابی دُنیا، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴
۲۵۵۔ ایضاً، ص ۲۷   ۲۵۶۔ ایضاً، ص ۲۴۳   ۲۵۷۔ ایضاً، مہتاب داغ، ص ۳
۲۵۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱   ۲۵۹۔ ایضاً، یادگارِ داغ، ص ۹۶

ممکن نہیں اندازۂ فیضانِ خدیجہ رضی اللہ عنہا
اسلام ہے منت کشِ احسانِ خدیجہ رضی اللہ عنہا
ہے سرخئ افسانۂ آزادئ نسواں
وہ آرزوے عقد، وہ اعلانِ خدیجہ رضی اللہ عنہا

(وفا کانپوری)

منقبت کی فکری و فنی رسومیات، اصولی تناظر اور دائرہ کار

غلام مصطفیٰ دائم

ABSTRACT: This comprehensive article endeavors to explore a significant subject. It adopts a narrative approach to establish the rituals and rules of "Manqabat" through the textual reservoir of a trilingual tradition, thereby enabling contemporary writers to grasp both the overt and subtle virtues and nuances of "Manqabat" composition. The article strives to encapsulate critical discussions concerning "Manqabat," systematically organizing them into overarching themes complemented by supplementary and subordinate headings. By providing an extensive overview of its subject, this article presents a cohesive framework for understanding the tradition of "Manqabat." Through this discourse, not only are the stylistic methods of "Manqabat" elucidated within the tradition, but the principles and rules governing them are also extracted.

ذہنی معتقدات میں فرد کی اساسیت ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس ضمن میں اس کے نفسی اور فطری اصولوں کی کارفرمائی بھی فرد کو اساس بنا کر رُو بہ اطلاق ہوتی ہے۔ یہاں شروع ہی سے یہ سوال جنم لیتا ہے کہ فرد کی یہ اساسیت اس کا تہذیبی عمل تخلیق کرنے میں کس حد تک مفیدِ کار ہے؟ اور ضمنی تہذیبی اشاریات کی تفہیم و تقسیم میں فرد کا ایک حقیقتِ ظاہرہ کی بنیاد پر کیا خاص ایسا کردار ہے جسے اگر منہا کر دیا جائے تو تہذیب کے تمام انسانی تلازمے کالعدم ہو جائیں۔ اس کا جواب ذرا تفصیلی ہے، لیکن سب سے پہلے انسان کو اس کی حقیقتِ لازمہ کی جہت سے سمجھنے کی کوشش کریں گے تاکہ منقبت کی شعریات کی تشکیل میں معاونت فراہم ہو سکے۔

انسان خدا کے بعد اس علمی و نظری کائنات کا سب سے بڑا موضوع ہے جس پر فلسفے اور تاریخ نے اگرچہ کثیر مواد فراہم کر بھی دیا ہے، لیکن فلسفے نے انسان کو معمہ بنا دیا اور تاریخ نے اسے علت العلل کی

حیثیت دے کر قلم اٹھا لیا۔لیکن انسان کی تہذیبی معنویت سے ہنوز کسی بھی نوع کی پردہ کشائی کا سلسلہ جنباں نہیں ہوا۔اس مسئلے کو ذرا کھولیں تو ہمارے پاس چند اہم نکات حاصل ہوتے ہیں جن کی روشنی میں ہم انسان کی یہ مطلوبہ معنویت حاصل کر کے اس کے دیگر معتقدات کو اس سے متعلق کر کے اس کے عمل کی فطری ساخت اور علم وعرفان کی عقلی و الہامی بناوٹ کے ضروری اشتراکات سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

انسان کی فردی حیثیت الگ جبکہ اس کی اجتماعی کلیت چیزے دیگر ہے۔ پہلے ہم انسانی فردی جہت اور اس کے متعلقہ علائم کا ایک مختصر جائزہ لیں گے، اس کے بعد اس کی اجتماعی کلیت کے اسرار و رموز سے واقفیت پائیں گے، تاکہ اس تسلسل میں ہم بالخصوص مذہبی شخصیات کے لیے کہی جانے والی مدحیہ شاعری کے علمی وفکری منطقے کو از سرِ نو کسی معروف اور قابلِ قبول سانچے میں ڈھالیں تاکہ منقبت نویسوں کے لیے ایک راہ کھل جائے جس کی روشنی میں شخصی وغیر شخصی مناقب کو انسان کی مذکورہ بالا دونوں جہتوں کی دریافت کا ایک آلہ بنایا جاسکے اور شعروادب میں فکری ثروت مندی نمود پکڑے۔

انسان کی فردی وکلی جہت کے تناظرات متنوع ہیں:

۱۔شعورواحساس کا مالک ہونا	۴۔وجودی جواز بہ اعتبارِ علمی وعقلی کلیت
۲۔شخصی وکائناتی مناسبتوں کا انسلاک	۵۔بین الناس امورِ منفعہ کے اخلاقی حوالے
۳۔صفتِ ”عبدیت“ اور انسان کا تعلق	۶۔فطری سچائیوں کا مجسم منطقی اظہاریہ

بعض فلاسفہ کے ہاں انسان ایک حقیقتِ ظاہرہ نہیں بلکہ وجودِ موہومہ ہے۔ پورے تصوف کی عمارت اس نکتے پر کھڑی ہے کہ انسان کی ذات بنفسہٖ کچھ وجود نہیں رکھتی بلکہ اس کا انجام فنا ہے حتیٰ کہ اس کا اظہار اور اکتشاف بھی ایک سلسلۂ عدم کی کڑی ہے۔علمِ تصوف کے یہ تناظرات بجا، کیوں کہ تصوف بھی آخر انسان کی Arrangement of Priorities ہی کا نام ہے۔(۱) لیکن اگر انسان، جو کہ اس کائناتی حقیقت کا ایک اہم اور مقصدی وجود ہے، اس کا وجود بالکل موہوم اور معدوم سمجھا جائے تو پھر اس کے اعمال وافعال کا تسلسل نتائج کی صورت میں ایک دوسرے جہان کا متقاضی کیوں کر ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان ایک ایسی حقیقت ہے جس کا وجود فطرت اور پورے نظمِ وجود کے لیے ایک بدیہی امر کی حیثیت رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے اعمال وافکار بے کار یا کالعدم نہیں ہیں بلکہ ان پر مترتب ہونے والے مکافات کے اجرا کے لیے جنت اور دوزخ کا ایک ابدی اور دائمی جہان تخلیق کیا گیا ہے۔

شخصی تناظرات کے سلسلے میں پہلا مسئلہ جوازِ انسان کا ہے۔لیکن یہ جواز ایک جہت سے تو قرآن سے ثابت ہے کہ ”اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ“(۲) لیکن فقط عبادت تو ملائکہ انسانوں سے بہتر اور زیادہ یکسوئی

کے ساتھ کرتے ہیں، تو پھر انسان کے لیے یہ عبادت ایک جہت ہوگی، اس کی بقیہ جہات کیا ہوں گی؟ یہ قابلِ غور ہے۔

دراصل ہدایت ایک سلسلہ ہے اور اس کے کچھ مرکزی اور ضمنی نمائندے ہوتے ہیں۔ دین بہ حیثیت "اسلام" کے ضمنی اعتبارات میں فرد بہ حیثیت اُمتی بھی ہدایت کے نظام کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ایک نمائندہ ہے۔ قرآنی فیصلہ ہے کہ: "کنتم خیر اُمة اخرجت .... "(۳) اس پس منظر میں ہمارے نزدیک انسان کی بہ طور اُمتِ مسلمہ جواز کی ایک اور جہت برآمد ہوتی ہے اور وہ جہت نظامِ ہدایت کو جاری رکھنے والے گروہ اور نقیب کی سی ہے جس کے بغیر انسان کے فکری و وجودی جواز کی اکثر حالتیں معطل بلکہ غیر ضروری ہو جاتی ہیں۔ یہ حالتیں کیا ہیں؟ یہ حالتیں وجودی بھی ہیں اور شعوری بھی۔ وجودی سطح پر اس کا عبادت پر کاربند رہنا کافی نہیں اور شعوری سطح پر اس کا محض ایمان کی اساس پر باقی ہونا ناکافی ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ انسان کی جوازی حالتوں کی وہ شقیں جان لی جائیں جن کی بنیاد پر ایمان بالغیب مفید اور قیام بالعبادت امرِ حَسَن ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی بھی نبی کی امت کا فرد جو اس کے زمانۂ نبوت یا مکانِ نبوت میں موجود ہو، اس نبی کی تعلیمات اور پورے نظامِ شریعت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ مذہب محض روحانیات سے متعلق حقائق کا نام نہیں ہے، بلکہ مذہب ایک وجودی اور ثابت شدہ امر ہے جو انسان کے خارج اور باطن کے لیے پورے اعتقادی اور فعلی تناظرات کو متحقق کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر اس کے مبدا و معاد کے فیصلے محفوظ کرتا ہے۔ اس کی بنیاد پر فلسفۂ خیر و شر کی دریافت عمل میں آتی ہے۔ لیکن خیر سے یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

جس طرح مذہب ایک وجودی امر ہے، اسی طرح انسانی احساسات کی بعض حالتیں؛ مثلاً ادراک، تعقل، جذبہ، ہدایت، اہتزاز اور تنفر وغیرہ بھی وجودی حالتیں ہیں۔ ادراک Observation کی فیکلٹی ہے۔ تعقل Receiver ہے جس کا حاصل شدہ مواد شے سے نسبتِ تعلق کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح اہتزاز اور باقی حالتیں بھی حاسۂ وجود کی مضبوط اور متحرک جہتیں یا حالتیں ہیں۔ ایک فرد اپنے تمام تر وجودی جواز کے ساتھ تبھی منظرِ عام پر آ سکتا ہے جب تک وہ ان تمام حالتوں کے مکمل یا جزوی اطلاق کے ساتھ خود نسبتِ وجود رکھتا ہو ورنہ انسان کا جواز کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ البتہ قرآن مجید سے مستفاد ہے کہ انسان میں دیگر مخلوقات پر فضیلت کا باعث عقل اور علم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ زمین میں اپنا خلیفہ بنانے کا ذکر فرماتا ہے۔ مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ فرشتوں کے ہوتے ہوئے انسان کو خلیفہ بنانے کا جواز اس میں عقل و فہم کی بے پناہ صلاحیتیں اور علم و دانش کی جولانیاں ہیں جو اسے

مسجودِ ملائکہ بناتی ہیں۔اس کے علاوہ انسان کے خلقی جواز کی باقی حکمتوں کو وہی حکیمِ مطلق جانتا ہے۔(۴)

علم و دانش کی انسانی صورت اور عقل و منطق کا مجسم پیکر نفس کی عیاریوں میں پھنس کر بے مہار بھٹک نہ جائے، اس لیے اس پر مذہب کی لگام رکھی۔ مذہب جبر نہیں، ہدایت کی اساس پر منزلِ مقصود تک رسائی کی پیش گوئی ہے۔ مذہب کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عقل و خرد کے بے حد وسیع مگر محدود صحرا کو تشکیک و تذبذب سے انکارِ محض تک نہ پہنچائے، بلکہ اسے نفسِ مطمئنہ بنا کر اس کے خدائی مطلوبہ مقام (۵) تک پہنچا دے۔ خدا کے ایسے بندگانِ خاص جو مذہبی ہدایت سے مستفید ہو کر حق کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ عند اللہ مقبول و بامراد ہوتے ہیں۔ دنیا میں بھی مختلف تناظرات سے مدح و ستائش کے حق دار ٹھہرتے ہیں اور آخرت میں بھی خدا کے فضل و کرم کے مستحق ہوتے ہیں۔ شاعری میں "منقبت" کا لفظ ایسے ہی رہنما صفت افرادِ اُمت کی مدح کے لیے ہے جن کے مادی اور روحانی وجود کا ہر تناظر خدا کی الہامی ہدایت اور مذہبی روشنی سے کسبِ نور کا مبارک عمل طے کرتا ہے۔

معلوم انسانی روایت میں شخصیات کے تذکار و مناقب کے حوالے سے عموماً عظیم مذہبی یا تاریخ کی مصلح (Reformer) شخصیات ہی کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ اسلامی روایت میں منقبت کی شخصیات میں حضرات صحابہ کرام، اولیاے عظام اور علماے اُمت وغیرہ شامل ہیں۔ ان شخصیات کے علاوہ اشیا کی مناقب کا رجحان بالخصوص ان اشیا کی فطری اور تخلیقی ساخت پر گفتگو کے حوالے سے کوئی باضابطہ فکری ارتقا یا تسلسل ہماری علمی ثروت کے ذخیرے میں نہیں ملتا۔ البتہ شاعری اور بالخصوص قصائد کی تشابیب میں مناظرِ فطرت اور مقاماتِ خاصہ کی مدح اور ان کا کسی نہ کسی خاص واقعے سے منسوب ہونے کی وجہ سے ذکر کرنا جاہلی قصیدوں ہی نہیں بعد کے قصائد میں بھی بکثرت مل جاتا ہے۔

منقبت کی فکری و فنی رسومیات، اصولی و روایتی تناظرات اور دائرہ کار کے حوالے سے سطورِ آئندہ میں مفصل معروضات چند مباحث کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔

مبحثِ اوّل: منقبت کا معنیٰ و مفہوم

"سابقہ انبیا و مرسلین، صحابہ کرام بالخصوص خلفاے راشدہ، اہلِ بیتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اولیاے عظام اور مذہبی عقیدے کی بنیاد پر دیگر اسلامی ہیروؤں اور مذہبی شعائر کی مدح میں منظوم کلام کہنا جو کسی صنفی ہیئت کا پابند نہ ہو، منقبت کہلاتا ہے۔"

اس وضع کردہ اصطلاحی تعریف کی حدود و قیود کا بیان ضروری ہے تا کہ اصطلاح اجزاے ضروریہ کی جامع اور دخولِ غیر سے مانع ہو۔

راقم الحروف کی موضوعہ اصطلاح میں "سابقہ انبیا و مرسلین" کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح کو اس

تعریف سے خارج کر دیا، کیوں کہ آپ ﷺ کی مدح نعت کہلاتی ہے۔"صحابہ کرام" اور"اہلِ بیت" سے وہ لوگ نکل گئے جو آپ ﷺ کے دور ہی میں تھے لیکن اسلام کی دولت اور دیدارِ مصطفیٰ ﷺ سے سرفراز ہو کر صحابی کے مقام کو نہ پا سکے۔"اولیاے کرام" سے غیر اولیا، مثلاً سیاسی یا سماجی رہنما نکل گئے جن کا بنیادی حوالہ اسلام کے مذہبی ہیرو کا نہ تھا۔"مذہبی عقیدہ" کہہ کر باقی حوالوں سے منہا کرنا مقصود ہے کیوں کہ ایک سیاسی یا محض تاریخی شخصیت کی مدح منقبت نہیں کہلاتی۔"مذہبی شعائر" سے اسلام کی مذہبی علامات مراد لے کر غیر مذہبی علامتوں کو خارج کر دیا۔ کیوں کہ فطرت نویسی میں غیر مذہبی چیزوں کی مدح کسی مذہبی عقیدے کی اساس پر نہیں ہوتی لہٰذا ہماری تعریف سے خارج رہے گی۔"منظوم کلام" سے نثری تعریف نکل گئی جو اصطلاحی معنیٰ میں منقبت نہیں کہلا سکتی۔"پابند نہ ہونا" سے اشارہ اس جانب ہے کہ منقبت موضوعِ شعر ہے نہ کہ ہیئتِ صنفِ شعر۔

منقبت کی ممدوح شخصیات میں، جیسا کہ تعریف میں گزرا، بالعموم حضرات صحابہ کرام اور بالخصوص خلفائے راشدین، خاندانِ رسول، اولیائے امت، اور مذہبی شعائر شامل ہیں۔ چونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت النبی علیھم السلام کے لیے"مناقب" کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے جبکہ سابقہ انبیائے کرام اور مذہبی مقدسات و علامات کی مدح کے لیے"مناقب" کا لفظ معروف نہیں، اس لیے ذیل میں صرف ان دو پہلوؤں پر چند باتیں عرض کر کے آگے بڑھیں گے۔

سابقہ انبیاے کرام کی منقبت

انبیائے گزشتہ کا احترام، پاسِ ناموس اور ان کی تعلیمات کو سراسر ہدایت کا سرچشمہ جاننا عین اسلامی عقیدے کا مقتضا ہے۔ جیسے نبی مکرم ﷺ کا احترام اُمت پر فرض ہے یونہی سابقہ نبیوں کی نبوت کا اقرار اور احترام بھی لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توہینِ رسالت کے بارے میں قتل کا شرعی حکم صرف رسالت مآب ﷺ سے متعلق نہیں بلکہ تمام سابقہ انبیائے کرام کی توہین کے لیے بھی یہی سزا ہے۔(۶)

سابقہ انبیاے کرام کا ذکر ہماری مذہبی و غیر مذہبی شاعری میں مختلف پہلوؤں سے آیا ہے۔ با قاعدہ مدح کے وسیع زاویوں کے ساتھ اقبال کی شاعری میں ایسے نظائر ملتے ہیں جنھیں منقبت یا مدح کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔(۷) ایک شعر تو مشہور ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشاے لبِ بام ابھی

فارسی شعری روایت میں بھی با قاعدہ مدح کے عنوان سے تو نہیں، البتہ بین السطور جزوی انسلاک

کی غرض سے سابقہ انبیائے کرام کا ذکر شعری قرینے کے ساتھ آیا ہے۔ عطارؔ کی مثنوی "پند نامہ" میں حمدِ باری تعالیٰ کے ضمن میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ تقریباً سبھی معروف انبیائے کرام کا ذکر محض نام سے نہیں بلکہ ان کے معجزات، کمالات اور ان کی خدا سے عابدانہ وابستگی کی جہت سے آیا ہے۔

رومیؔ کا ایک شعر مجرداً دیکھیں اس میں ایک لطیف پہلو سے سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کی منقبت ہے:

بود آدم دیدۂ نورِ قدیم
موئے در دیدہ بود کوہِ عظیم

یعنی آدم علیہ السلام نورِ قدیم کی آنکھ تھے۔ اور آنکھ میں اگر ایک بال بھی گر جائے تو آنکھ کی نزاکت اس کو برداشت نہیں کر سکتی، بلکہ وہ ہلکا سا بال پہاڑ سے بھی بوجھل محسوس ہونے لگتا ہے۔

آنکھ میں بال پڑنے سے اشارہ حضرت آدم علیہ السلام کی نافرمانی ہے۔ لیکن قرآن ہی کے مطابق «فَنَسِیَ وَ لَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا» (۸) یعنی ان سے درخت کے قریب جانے کی حرکت بھول سے ہوئی، اس کا عزم وارادہ ہرگز نہ تھا۔ جب تک عزم وارادہ مفقود ہو اس فعل کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔

عبدالقادر بیدلؔ نے ایک شعر میں معنیٰ آفرینی کے اصول پر حضرت یوسف علیہ السلام کی مدح کا قصد کیا ہے:

عصمتِ حسنِ یوسفی زد چاک
پردۂ طاقتِ زلیخا را

زلیخا ملکہ تھی اور اس بنا پر ہر کسی کو زیر کر لینے والی قوت کی مالک گردانی جاتی تھی۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کی پاک دامنی کے باعث زیر کرنے میں ناکام رہی اور یوں اس کی طاقت کا پردہ چاک ہو گیا۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی پارسائی نے اس کی طاقت کا بھرم کھول دیا۔ "پردہ چاک ہونا یا کرنا" راز فاش ہونے یا کرنے کے معانی میں عام ہے۔ شعر میں بیدلؔ نے دامنِ یوسف علیہ السلام کے چاک ہونے کو فی الواقعی زلیخا کی طاقت کے پردے کا چاک ہونا ثابت کرتے ہوئے جس طرح "چاک" کے کلمہ کو مشہور تلمیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استعمال کیا ہے، وہ ان کی غیر معمولی طباعی اور لسانی تشکیلات میں بے پناہ درک کی دلیل ہے۔

فارسی میں ناصر خسرو نے ایک شعر غزلیہ کہا ہے لیکن اس میں یوسف علیہ السلام کی مدح کا پہلو بہت نمایاں ہے:

به من تازه شد پژمریده سخن
چو ز افسونِ یوسف زلیخایِ زال

یعنی میرے توسط سے سخنِ پژمردہ تازہ ہو گیا جس طرح بوڑھی زلیخا حضرتِ یوسف علیہ السلام کے معجزے سے۔ بنیادی پہلو معنیٰ تازہ کا اظہار ہے تاہم تشبیہ میں مدح کا پہلو بخوبی نکل آیا۔

انبیائے سابقہ کی ضمنی مدح کے مستخرجہ نتائج اس نکتے پر منتج ہوتے ہیں کہ ان کا ذکرِ خیر کبھی قصداً منشائے شاعر میں، گاہے متنی ابعاد سے اور کہیں دیگر لطیف پہلوؤں میں سے نکلتا آیا ہے۔ یہ یقین ہونا چاہیے کہ ان کے معجزات، شخصی فضائل، عند اللہ مرتبۂ عبدیت اور مجموعی طور پر انسانیت کے رہنما اور مطاع (۹) کی حیثیت سے ان کا تذکارِ خیر کرنا باعثِ برکت بھی ہے اور کارِ ثواب بھی۔ فی زمانہ اگر کوئی مستقل انبیائے گزشتہ کی منقبت لکھے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ عینِ ثواب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہماری محدود معلومات کے مطابق دو کتب مستقلاً انبیائے کرام کی منقبت میں لکھی گئی ہیں۔

(الف) "آدم تا رحمتِ عالم: انوار عزمیؔ"

(ب) "منظوم تذکرۂ انبیاء کرام: گہر اعظمی"

انوار عزمیؔ بڑی پتے کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ممکن ہے کچھ لوگوں کا یہ خیال ہو کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے بعد اب اس بات کی کہاں گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ کسی دوسرے نبی کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ اگر ان کے اس خیال کو درست بھی مان لیا جائے (جو یقیناً درست نہیں ہے) تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ ماؤ اور لینن کے حضور گل ہائے عقیدت پیش کر سکتے ہیں، مسولینی اور ہٹلر کی تعریف و توصیف کر سکتے ہیں، اسٹالن اور جارج واشنگٹن کو نجات دہندہ قرار دے سکتے ہیں، کارل مارکس اور نپولین کی مدح سرائی کر سکتے ہیں وہ انبیائے کرام کو ہدیۂ عقیدت پیش کیوں نہیں کر سکتے۔" (۱۰)

مخمورؔ دہلوی شاگرد بیخودؔ دہلوی نے باقاعدہ "نعت و منقبت" کے عنوان (۱۱) سے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی منقبت "مقامِ خلیل" لکھی ہے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آج سے ستر اسّی سال قبل تک سابقہ انبیائے کرام کی مدح کو منقبت ہی کے عنوان سے درج کیا جاتا رہا ہے۔ دستیاب متون سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ باضابطہ طور پر اقبالؔ کے ہاں بطورِ تلمیح کئی انبیاے عظام کی مدح سرائی ملتی ہے۔ صرف اردو کلیات ہی میں سو سے زائد اشعار ایسے ہیں، فارسی کلیات کا تو شمار نہیں۔

مخمورؔ کی اس محولہ بالا شعری منقبت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وابستہ اکثر واقعات کا ذکر آ

گیا ہے۔ متخیلہ فضائل بھی ہیں لیکن تاریخ کی کمک سے شاعر نے اپنے مزعومہ مدائح کو ثابت بھی کیا ہے۔

اعتقادی اور تاریخی مبحث میں شعرِ ذیل کا دوسرا مصرع خاص دلچسپی کا حامل ہے:

درست دستِ مبارک سے کی بِنائے حرم
نہ ہوتے آپؐ تو ہوتی نہ دین کی تکمیل

غالباً اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ بنی خزرج کے ایک آدمی ابو عامر نے نبیِ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اور ترکِ دنیا کر کے راہب بن گیا تھا۔ اس کی پارسائی کی بڑی شہرت ہوئی اور یثرب کے اکثر باشندے اس کے معتقد ہو گئے۔ جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اسے محسوس ہوا کہ اب لوگوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹتی جا رہی ہے اور اس کے ارادت منداب اسے چھوڑ کر شمعِ رسالت کے پروانے بنتے جا رہے ہیں۔ اپنی پیری کا چراغ بجھتا دیکھ کر وہ سیخ پا ہو گیا۔ حضور مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے بھی دعوتِ اسلام دی۔ اس نے پوچھا آپ کون سا دین لے کر آئے ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا دینِ ابراہیمی۔" (۱۲)

مذکورہ روایت طویل ہے لیکن مخمورؔ کے شعر کا تاریخی تناظر سمجھنے کے لیے اتنا حصہ کافی ہے۔

شعائرِ اسلام کی منقبت

اسلام کے مجموعی نظام میں شعائر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مساجد، شہور، ایام، مواضع وغیرہ ہر طرح کے مذہبی شعائر کا احترام اور تحفظ ضروری ہے۔ شعائر سے مراد اعلامِ الٰہی، یعنی وہ چیزیں جن کے ادب و احترام کے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ احکام مقرر کر دیے ہیں۔ ان احکام و آداب کی خلاف ورزی اُن شعائر کی بے حرمتی کرنا ہے۔ (۱۳) ان شعائر کے احترام میں شعری اظہار کرنا منقبت ہی کہلائے گا، کیوں کہ ان کی مدح کا بنیادی حوالہ مذہبی علامت کے طور پر ہے۔ مکہ مکرمہ، مسجدِ نبوی، جنت البقیع، مسجدِ اقصیٰ، غارِ حرا، غارِ ثور، قرآن و حدیث، علومِ اسلامیہ وغیرہم سب اسلامی شعائر کی اہم مثالیں ہیں۔ صرف تین شعر درج کرتا ہوں۔ عصرِ تازہ کے ایک شاعر سید شاکر القادری نے جنت البقیع کی منقبت میں لکھا کہ:

بقیع کو میں فلک ناز کس لیے نہ کہوں
ردائے خاک میں تارے کئی جڑے ہوئے ہیں

غارِ حرا اور کوہِ طور کے تقابل میں سعید شارق کا یہ شعر کتنا تازہ ہے:

کہنے لگا یہ غارِ حرا کوہِ طور سے
ملنے کا اشتیاق تو ہوگا حضور سے

دلّو رام کوثری نے جنت البقیع کی مدح میں زبردست منقبت (۱۴) کہی ہے۔اس کے پہلے دو بند نہایت شاہکار ہیں:

کیا جنت البقیع کی شانِ رفیع ہے برجِ فلک ہر ایک مزارِ بقیع ہے
چھپ جائے عرش جس میں وہ دامن وسیع ہے بارہ مہینے سیرِ بہارِ ربیع ہے
خلدِ نہم جہاں میں یہی ارضِ پاک ہے
کحل البصر یہیں کی زمانے میں خاک ہے

مدفون جو یہاں ہے وہ غم سے ہے رستگار دوزخ کا کچھ عذاب نہ مرقد کا ہے فشار
برزخ کا ہے زمانہ یہاں موسمِ بہار جنت کے نور کا ہے اسی خاک پر قرار
اس سے دکان دور ہے دنیائے زشت کی
سرحد ملی ہوئی ہے اسی سے بہشت کی

علامہ محمد اقبالؔ مدینہ منوّرہ کی افضیلت اور وجہِ فضیلت کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

مبحثِ دوم: منقبت کے فکری تناظرات

اسبابِ مدح کے نفسیاتی اور سماجی حوالوں کے ساتھ کچھ اعتقادی اور علمی تناظرات بھی ہوتے ہیں جو منقبت نگار کو اس کے ممدوح سے نسبتِ تعلق عطا کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل چند عناوین کے تحت مطلوب ہے۔

تعظیمی بیانیہ

مدح کی نفسیات کا گہرائی سے جائزہ لیں تو ہم پر اس کے اسباب میں مختلف طرح کے رویّے منکشف ہوں گے۔ مدحیہ قصائد جو بادشاہوں اور ریاستی والیوں کی مزعومہ شان میں لکھے گئے، وہ ظاہر ہے کہ حبّ جاہ اور مالی و منصبی منفعت کی طلب کی تکمیل کے پیشِ نظر پیش کیے گئے۔ لیکن منقبت میں چونکہ بنیادی نکتہ مذہبی عقیدہ ہوتا ہے جو مادح اور ممدوح کے مابین قلبی اور روحانی تعلق کی اساس بنتا ہے، اس لیے یہاں وہ دنیاوی شوکت و منصب اور مالی منافع کی طمع نہیں رہتی۔ یہاں پر رابعہ بصریؒ کا ایک شعر یاد آتا ہے جو اگرچہ حمد میں ہے لیکن وہ ممدوح سے محبت کی نفسیات میں ہماری رہنمائی ایک نئے جذبے کی طرف کرتا ہے۔

أحبك حبّين حبّ الهوى
وحبًا لأنك اهل لذاكا

یعنی میں تجھ سے دوہری محبت کرتی ہوں۔ ایک تو یہ کہ تو میرا محبوب ہے۔ دوسرا یہ کہ تو اس قابل ہے کہ تجھ سے محبت کی جائے۔

منقبت میں ممدوح کی ذات کی یہی عظمت کہ وہ محبت کے قابل ہے، اسے ممدوح بناتی ہے۔ یہ قابلیت ظاہر ہے کہ روحانی اور اخلاقی تناظر میں مذہبی اعتقاد کی بنا پر زیادہ مستحکم اور قابلِ قبول بن جاتی ہے۔ منقبت میں تعظیمی بیانیہ کلیدی رجحان ہے، اس کا اظہار ہمیں مختلف مناقب میں ملتا ہے۔ تاہم جدید منقبت نویسوں کو تعظیمی بیانیے کی تشکیل میں معتدل اعتقادی رویہ روا رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں چند اہم ضوابط ملحوظ رکھے جانے کے لائق ہیں:

(۱) ممدوح شخصیت یا اسلامی شعائر کی تعظیم کا رویہ نفسیاتی استدلال کی روشنی میں ہونا چاہیے تا کہ مدح کوئی مصنوعی ڈھانچہ نہ معلوم ہو بلکہ روحانی جذبے کی مجسم صورت گری تعظیم کا ایک اہم سبب قرار پائے۔

(۲) شخصی فضائل میں مذہبی کمک ضروری ہے۔ تعظیمی بیانیے میں باہمی تعلق کے کلیدی اور ضمنی اعتبارات بھی اہم ہیں لیکن معروضی انداز بہرحال مادح کے جذبۂ احترام کو ایک مفروضہ نہیں رہنے دیتا بلکہ خارج کی ایک سچائی کا روپ بخشتا ہے۔

(۳) ممدوح کا انسانی سماج کے کلی تناظر میں کیا مقام ہے، اور اس سے تعظیمی بیانیے کو کیا کمک فراہم ہوتی ہے؟ خاص طور پر جب انسانی سماج میں مذہبی امتیازات کو یکسر ختم کر کے ایک انسانی وحدت تشکیل دی جائے، تب ممدوح شخصیت کی تعظیم کا اصول کیا ہونا چاہیے؟ اس کا اظہار اہم ہی نہیں، منقبت نویسی کی ضرورت بھی ہے۔

(۴) ممدوح سے مجرد تعظیمی اظہار بے فائدہ ہے، جب تک اس کے ثمرات نہ بیان کیے جائیں۔ منقبت نویسی میں اس بارآوری کا حقیقی جذبے سے متعلق ہونا ضروری ہے تا کہ بادشاہوں کے قصیدوں میں پائی جانے والی مالی و مادی منفعت کی طمع کا التباس نہ رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعظیمی بیانیے کی تشکیل میں خود متکلم کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں؟ اس کا اثر متن پر نہیں پڑتا۔ متن کا اپنی تشکیل میں اس متعلقہ بیانیے کی روشنی میں مترشح ہونا اہم ہے۔ کیوں کہ ادبی متن اکثر حالتوں میں ماتن کا منشا نہیں بلکہ عمل ہوتا ہے۔

اخلاقی وسماجی تشخص کا تذکار

یہ ضرور ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی سماجی وحدت کی اکائی ہوتا ہے اور اس کے اخلاقی اور معاشرتی سروکار سے باہر رہ کر اس کا وجود بے معنیٰ ہی نہیں غیر ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ ہر انسان متعلقہ سماج میں حسبِ مراتب اپنی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک پیغمبر کی سماج ہی نہیں، پورے تہذیبی وجود کے لیے ایک مرتکز نقطے کی حیثیت ہوتی ہے۔ پیغمبر کے اولین حواری/اصحاب باقی اُمت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ نبوی تعلیمات کے نہ صرف پہلے مخاطب ہوتے ہیں بلکہ متعلقہ شرع کے کامل اور قابلِ تقلید نمونے بھی ہوتے ہیں جو اس شریعت کے تمام موجود و مابعد مخاطبین کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح مابعد اُمت کے وہ افراد جو اس مذہبی روایت پر کاربند رہ کر بہ لحاظِ مذہبی فعال باقیوں پر عظمت و بزرگی میں فوقیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ سبھی افراد ظاہر ہے اپنے سماج یا تہذیب کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کے فضائل و کمالات کا پہلا مصرف ان کا اپنا سماجی معاشرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذاتی یا کسبی سوانح میں انھیں متعلقہ معاشرتی تلازمے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ منقبت نویسی کے سلسلے میں اس مذکورہ اصول کی چند متفرع صورتیں بنتی ہیں جن کا ذیل میں اجمالاً تذکار کیا جاتا ہے:

(۱) ممدوح فرد جس تاریخی دورانیے کا حیات اندوز ہو، اس کی مدح میں بمع دیگر کمالات کے اس سے وابستہ تاریخی حقائق کی صداقت کا لحاظ رکھنا بہت لازم ہے۔ کیوں کہ مفروضہ کمال بہرحال بے تاثر اور عارضی ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ کو فاتحِ پولینڈ کہہ دیا جائے تو یہ مجرد اظہارِ عظمت میں تو مدح بن سکتی ہے لیکن تاریخی صداقت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں معتبر ذرائع کو ملحوظ رکھنا لابدیٰ امر ہے۔ القصہ! ممدوح کی سیرت وسوانح کے تحقیق شدہ پہلوؤں کو منقبت کا موضوع بنایا جانا چاہیے۔

(۲) ممدوح کی ذات کو مدح میں محض گوشہ نشین بنا کر نہیں پیش کرنا چاہیے۔ یوں بھی اسلامی تناظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (۱۵) جب تک ممدوح کی متعلقہ سماجی معاشرے میں اثر پذیری کا بیان، اس کی مادی و روحانی خدمات کا ذکر، اور اعترافات کا تذکار نہ ہو تب تک منقبت کا کوئی حقیقی پیرایہ تخلیق نہیں ہو سکتا۔

(۳) ممدوح کے معاشرتی رویوں کا ابلاغ و تبلیغ بہت ضروری ہے۔ ممدوح کی کوئی عادت اگر کسی کے لیے کشش کا باعث نہ بنے تو اُس کا ممدوح سے تعلق جعلی اور بے پروائی پر مبنی ہے۔ مدح کا

اصول ہی یہ ہے کہ ممدوح کی ذات کے معائب بھی محاسن معلوم ہوتے ہیں، چہ جائیکہ اصلاً محاسن ہی کو معرضِ توصیف نہ لایا جائے۔

(۴) سماجی تناظر میں ممدوح کی مزعومہ یا واقعی کارناموں کا توازن بھی بہت ضروری ہے۔مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو مزعومہ مدح میں فاتحِ خیبر کہہ دیا جائے تو یہ عدمِ توازن ہوگا۔

(۵) اخلاقی نظریے کا پرچار ضروری ہے تاکہ ممدوح مجرد بُت نہ بنا رہے معاشرے کا جیتا جاگتا انسان معلوم ہو۔ اس کے معتقدات اور نظریات سے آگاہی حاصل ہو اور اس کا کُل علمی اور اخلاقی منشور ہمارے حیطۂ شعور میں آئے۔

(۶) اخلاقی نظریے کی بنیاد پر ممدوح کے نجی پہلوؤں میں نمایاں رومانویت کی گنجائش نہیں ہے۔لیکن حیا باختہ تصورات سے ہٹ کر کوئی قرینہ نکل سکے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ مثال کے طور پر نعت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مردانہ قوت کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً ایک غیر معروف شاعر اطہرؔ بریلوی کا یہ شعر دیکھیے۔

ان کی مثل اک آدمی؟ کیوں کر بھلا انصاف ہو؟
قوتِ مردی میں جو چالیس پر سبقت کریں

یہ مضمون مذموم تو نہیں، البتہ پیرایۂ بیان کی جو طہارت اور سلیقہ ضروری تھا، اس سے یہ شعر تہی دامن ہے۔

اظہارِ تشکر و عجز

عظیم انسانوں کے ساتھ جب تک تشکر اور عاجزی کا جذبہ نہ وابستہ رکھا جائے خود اپنا وجود کمتر اور چھوٹا رہتا ہے۔ عظیم لوگوں کی عظمت کا اعتراف کرنا بجائے خود عظمت ہے۔ کارلائل نے کتنی عمدہ بات کہی تھی کہ:

"No sadder proof can be given by a man of his own littleness than disbelief in great men" (16)

کارلائل کے مطابق اگر آپ ان خوبیوں کی تعریف نہیں کر سکتے جو انسان کو عظیم بناتی ہیں، تو اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ آپ خود ان خصوصیات میں سے کسی ایک کے بھی مالک ہوں۔ بہرحال! منقبت کی فکری ساخت میں ممدوح سے تعلقِ عجز و تشکر بجالانا اہم تقاضا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل اہم صورتیں ممکنہ طور پر قابلِ عمل ہیں:

(۱) احساسِ تشکر میں جذبے کا مولک پن (Originality) نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اظہار کے اسلوب اور لفظیات کے مناسب استعمال سے بھی ممکن ہے اور متکلم کے داخلی آفاق میں سچے جذبے کی نمود سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ مولک پن متکلم کے عندیے میں ہونا چاہیے یا نہیں، ایک ادبی متن اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ یہاں جذبہ، احساس، معنیٰ اور لہجہ وہی ہوتا ہے جو متن کے اندر لفظوں کے جال میں موجود ہو۔ لفظ ہی حزنیہ احساس کا خالق ہے اور وہی مزاح کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ایک چیز بہت اہم ہے جس سے مطلوبہ احساس یا جذبہ اپنے مولک پن کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر شعر میں حزن وغم کا کیف بھرنا ہو تو شعر کے بنیادی اور کلیدی الفاظ کے ساتھ حزنیہ تلازمے قائم کیے جائیں، یونہی جس کیفیت کا شعر کہنا ہو اس میں باہمی تلازمے اور متعلقہ جذبے کی کلیدی لفظیات کا استعمال بنیادی حربہ ہے۔ البتہ یہاں یہ ملحوظ ضرور رہے کہ کسی بھی جذبے کے لیے کوئی خاص لفظیات نہیں بلکہ لفظ کے استعمال اور معنوی امکانات پہ منحصر ہے کہ وہ مطلوبہ لہجہ برآمد کر سکتے ہیں یا نہیں۔

(۲) آفاقی تناظرات (Universal Perspectives) کی روشنی میں تشکر ہونا چاہیے۔ مثلاً یہ تشکر مدح کے باب میں بے معنیٰ ہے کہ "میں آپ کا شکر اس وجہ سے بجا لا رہا ہوں کہ آپ نے مجھے پانی پلایا" کیوں کہ پانی پلانے کا عمل ایک فرد سے ایک فرد تک محدود ہے، لیکن اگر یوں ہو کہ "فقہی مباحث کو آسان الفاظ میں مدون کرنے پر اُمت آپ کی شکر گزار ہے" تو یہ واقعی مدح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مؤخر الثانی فعل پورے انسانی معاشرے یا تہذیب کے لیے سرانجام دیا گیا اور یہی آفاقی تناظر منقبت نویسی میں مطلوب ہے۔

(۳) مادح اور ممدوح کے باہمی تعلق کی سوانح میں افادی پہلوؤں کا تذکرہ بھی اس باب میں اہم ہے تبھی تشکر کا جذبہ حقیقی رنگ پکڑتا ہے۔ اسے حسن عسکری کے بقول "بہی کھاتا" کہیے یا کچھ اور، لیکن نعت اور منقبت کے باب میں بہرحال اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) اظہارِ تشکر میں ممدوح کا "انسان" ہونا راجح ہونا چاہیے۔ یعنی مبالغہ آرائی میں ممدوح کا انسانی پَن مجروح نہ ہو، تاکہ اس کی مجموعی اثر پذیری اور عظمت کا حقیقی معنوں میں ادراک اور نمونے کا اکتساب ہو سکے۔

(۵) تشکر محض بیانیے تک محدود نہ ہو بلکہ اس سے خود اکتسابی رویے کی تشکیل کی جائے اور اس میں بھی عملی رویے پر برانگیختہ کرنے (Call to Action) کا مضمون ہو۔

روحانی میراث کی اہمیت

روحانی میراث سے مراد ممدوح شخصیت کی زندگی، تعلیمات اور اقدار کا دیر پا اثر ہے جو اس کے اصولوں، مثالوں اور اثر و رسوخ کو گھیرے ہوئے ہو، اور جو اس کی متعلقہ سماجی تہذیب اور آنے والی نسلوں پر مستقل نشان چھوڑے۔ خالص دینی تعبیر میں روحانی میراث عظیم مذہبی ذواتِ کے وہ غیبی اور روحانی فیوض و برکات ہیں جو اعتقادی اور علمی بنیادوں میں یقین اور اطمینان کی دولت بخشتے ہیں۔ منقبت میں اس روحانی میراث کا تذکار مندرجہ ذیل اصولوں کی روشنی ہونا چاہیے:

(۱) ممکنہ طور پر روحانی حکایت میں تجربے کی ہم آمیزی کا بیان ہونا ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ متکلم کا تجربہ ہو، تاہم یہ "انسانی تجربہ" ضرور ہونا چاہیے۔ جذبہ کا روحانی پہلو تجربی بیان کے بغیر ایک معمولی اور ماورائی قسم کا وہم لگتا ہے جس کی کوئی حقیقت و وقعت نہ ہو۔ تجربی بیان احساس کو جنم دیتا ہے اور احساس شعور میں چیز (Object) کے وجود کو واقعی بناتا ہے۔

(۲) روحانیت ایک آفاقی سچائی ہے اس لیے ممدوح کی مدح میں یہ آفاقی پَن جھلکنا ضروی ہے۔ ایک معاصر ہندو پنڈت اچاریہ پرمود کرشنا کا مصرع یاد آتا ہے:

"علیؓ جتنے تمھارے ہیں، علیؓ اتنے ہمارے ہیں"

یعنی روحانیت کا تناظر بین الثقافی (Cross-cultural) ہونا چاہیے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ دنیا بھر میں روحانی عقائد اور طریقوں کے تنوع کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ روحانیت ثقافتی، سماجی، اور تاریخی عوامل سے تشکیل پاتی ہے، اور یہ کوشش کرتی ہے کہ ثقافتوں میں روحانی تجربات اور طریقوں میں مشترکات اور فرق کو سمجھا جائے، متنوع ثقافتوں کی منفرد روحانی روایات اور عقائد کی تعریف سمیت بین الثقافتی مکالمے اور افہام و تفہیم کا فروغ عمل میں آئے۔ نیز مختلف روحانی روایات کے درمیان باہمی احترام اور افزودگی کو پرچک دی جائے۔ ایک بین الثقافتی نقطہ نظر کو اپنا کر ہم روحانیت کی پیچیدہ اور کثیر جہتی نوعیت اور انسانی تجربے میں اس کے کردار کی گہری سمجھ حاصل کر سکتے ہیں۔

(۳) متنی تشکیل میں روحانی میراث کے ذکر میں معروضیت امرِ لابدیٔ ہے۔ معروضیت چیز کو قابلِ قبول بناتی ہے اور اختلاف کی وسیع گنجائش بھی محفوظ رکھتی ہے۔

(۴) روح چونکہ امرِ ربی ہے۔ (۱۱۷) اس لیے منقبت نویسی میں روحانی پہلوؤں کی دریافت میں الوہی مراتب کا التباس نہیں ہونا چاہیے۔

(۵) روحانی ورثے کو مذہبی تناظر کے سائے میں رکھا جائے، ورنہ روحانیت کی غیر مذہبی تعبیرات بھی بہت سی ہیں اور کئی تو بہت مضر ہیں۔ لیکن خیر سے یہ ایک الگ موضوع ہے، اور اس سلسلے میں محمد عالمگیر کی کتاب "The Misinterpretation of Tasawwuf" کا مطالعہ ناگزیر ہے جس میں ماضی قریب کے ان صوفیا کی فکر کا جو دیگر مذاہب سے اسلام کی جانب آئے، جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ صوفیا مطابقت پذیر خیالات کے حامل تھے۔ بظاہر اسلام قبول کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے سابقہ عقائد سے مکمل کنارہ کشی نہیں کی تھی، بل کہ عقائدِ اسلامیہ کے ساتھ اس کی آمیزش کی بظاہر شعوری کوششیں کیں۔ ان جدید صوفیا کے حوالے سے یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ فری مے سن لاجز سے وابستہ رہے ہیں۔ اس وابستگی کے بعد ان کی عقائدِ اسلامی میں مختلف ادیان کی آمیزش کی سعی کو ہم عیسائیت میں سینٹ پال اور اسلام میں ابن سبا کی کاوشوں کے تناظر میں دیکھنے میں حق بجانب ہیں۔

عقیدتِ محض کا تذکار

ممدوح سے نسبت کا فعلی تناظر زندہ حالت میں نہ بھی ہو تو محض اظہارِ عقیدت کا ادبی اظہار بھی منقبت کے ذیل میں آتا ہے۔ غیر مسلم شعرا کے ہاں اسلامی مذہبی کرداروں کی منقبت کو اگرچہ ڈاکٹر احسن زیدی نے رسمی منقبت میں شمار کیا ہے (۱۸) اور بادی النظر میں یہ تقسیم مناسب بھی ہے، تاہم اسے ادبی تناظر میں دیکھا جائے تو متنی اظہار کے کئی بہتر اسالیب ہمیں ہندو شعرا کے ہاں بھی ملتے ہیں۔

منقبت بہ حیثیت شعری فن پارہ عقیدے کے مضمون/معنی سمیت ایک لفظی اظہار بھی ہے۔ ایک ہندو شاعر کے ہاں اظہار میں جمالیت اور وہ بھی معنوی (مذہبی) ادراک کی بہترین سطحوں میں ملفوف، دیکھنا ہو تو دلّو رام کوثرؔی کی مناقب دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر کوثرؔی کا یہ بلیغ شعر جو سیدنا عمر فاروقؓ کی منقبت میں ہے، دیکھیے:

تیری رائیں عکسِ وحیِ کبریا ہوتی رہیں
تجھ کو کرتے تھے نبیؐ اکثر قضایا میں حکم (۱۹)

خوبی اس ترکیب "عکسِ وحیِ کبریا" میں ہے۔ عکس اصل کا تابع اور مابعد وجود پذیر ہوتا ہے، اس سے یہ شبہ زائل کرنا مقصود ہے کہ معاذ اللہ تقدیری فیصلہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آتا تھا۔ تقدیر کو کسی نبی کی ذاتی رائے کے تابع ماننا بھی مناسب نہیں، چہ جائیکہ اُمتی کی تجویز کو وحی پر وجودی یا زمانی فوقیت دی جائے۔ شعر کی فنی خوبیاں بہت ہیں۔ نبی اور کبریا کا تقابلی ربط، رائیں اور قضایا کی نسبت، وحی

اور حکم میں رعایتِ معنوی اور" ہوتی رہیں" سے اشارہ ہے کہ موافقات کی تعداد ایک سے زائد ہے۔(۲۰)

ایک غیر مسلم شاعر کا اسلامی نفسیات اور مذہبی باریکی سے آشنا ہو کر منقبت کا شعر کہنا معمولی بات نہیں ہے۔ جبکہ اردو منقبت نویسوں کے ہاں اس مضمون کا کوئی پتا نہیں۔ ایک دو نوجوان شعرا کے ہاں اس کی جھلک دکھائی دی ہے لیکن وہ اتنی غیر شاعرانہ ہے کہ اس کا مذکورہ شعر سے کوئی جوڑ نہیں بنتا، چہ جائیکہ تقابل؟ تاہم فارسی میں اس مضمون کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً عطار کی مثنویوں؛ مصیبت نامہ، خسرو نامہ، منطق الطیر، اسرار نامہ اور الٰہی نامہ میں اس مضمون کے شعر معنیٰ آفرین ثروت مندی کے ساتھ موجود ہیں۔

مبحثِ سوم: رسومیاتِ متن سازی

معنیٰ کے اظہار میں متنی وسیلہ بنیادی کلید ہے جو معنیٰ کو باطن سے نکال کر خارج کے ماحول میں فعّال حیثیت دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے معنیٰ کے تدریجی، احساساتی، تاریخی اور مذہبی مدارج اور احوال کسی لفظی متن کے ذریعے اپنے وجود کی ساخت کو معنیٰ خیز بناتے ہیں، لیکن جب ادبی اور تہذیبی مفاہیم کے اظہار کے لیے لفظ و متن کا گارا مٹی درکار ہو تو اس کے تقاضے بھی متنوع ہو جاتے ہیں، کیوں کہ ادبی مفاہیم امکانات سے بھرے اور معانی کی درجہ بندی میں تہ در تہ گندھے ہوئے ہوتے ہیں۔

منقبت ایک ادبی اظہارِ تحسین ہے جو کسی صنفی ہیئت کی پابند نہیں ہے۔ فارسی اور اردو کی شعری روایت میں منقبت قصیدے اور غزل دونوں کی ہیئت میں لکھی گئی۔ مثنویوں کے ابتدائیوں میں حمد و نعت کے بعد مناقب کا ایک رجحان رہا ہے جس میں علی الخصوص خلیفۂ راشد سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل و خصائل کو شعری قرینوں میں بیان کیا جاتا رہا۔ ذیل میں کلاسیکی متون میں منقبت کے ذخیرے کی روشنی میں متنی تشکیل کے اصول و ضوابط کو تحریر کیا جاتا ہے جسے بطریقِ حکایت، نہ کہ بطریقِ انشا بیان کرنے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

ادبی فن پارے کا اظہار خونِ جگر کی نمود کا نام ہے۔ تخلیقی ہنرمندی کے خارجی محاسن میں ان فنی آلات کا نہایت کلیدی کردار ہے جنھیں معروف انداز میں ہم تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز اور علامت جیسی اصطلاحات سے جانتے ہیں۔ ان ادبی آلات (Literary Tools) کا متن میں لباس کی طرح حصہ ہے۔ اظہار کا اسلوب، تنوع، معانی کے اطلاقات اور دائرۂ کار سمیت منقبت کی ذیل میں ممدوح کے فضائلِ معنوی کے ابعاد کا منطقی پیرایہ انھی فنی آلات کی بدولت با معنیٰ بنتا ہے۔ مثال کے طور پر تشبیہ میں مشبہ بہ کی ذات یا صفت یہ طے کرے گی کہ مشبہ کی مدح کا تناظر کس درجہ کا ہوگا یا ہونا چاہیے۔ عام

طور پر چونکہ صفاتِ مشترکہ کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ اور استعارے بھی مشترک ہوتے ہیں تاہم ان کا اطلاقی پہلو شخصی مناسبت سے بدلتا رہتا ہے، لیکن منقبت کی شعری روایت میں چند مثالیں ہمارے مشاہدے میں آئی ہیں جن میں مادح نے ممدوح کے لیے جو کلمات یا تشبیہات و استعارات استعمال کیے ہیں وہ پہلے سے اس ممدوح سے برتر ذات/ شے کے لیے مستعمل ہو چکے ہیں۔ مثلاً نعت میں حمد کا التباس، منقبت میں نعت کا التباس یا غیر صحابی کی مدح میں صحابی کی منقبت کا التباس پیدا ہونا۔ ظاہر ہے کہ یہ بعض پہلوؤں سے مذموم ہے۔ تاہم یہ التباس کئی جگہ ماتن کی لغزش سے پیدا ہوتا ہے اور کئی مقامات پر قاری کی فہم میں خود ساختہ اصولِ قرائت کی وجہ سے یا کم علمی کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے جو بعد از غور و فکر دور ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ''عین المعارف'' کے مقدمے سے ایک دلچسپ چیز ملاحظہ ہو۔ سید شاہد علی سبز پوش نے حضرت شاہ آسی کے دیوان ''عَین المعارف'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

ایک مرتبہ جب شاہ صاحب (۲۱) لکھنؤ تشریف لے گئے تو ناسخؔ سے اجازت مانگی کہ اگر آپ فرمائیں تو حضرت آتشؔ سے بھی مل آؤں۔ ناسخ نے اجازت دی اور یہ الفاظ فرمائے: ''دیکھو! وہ بڈھا کامل الفن ہے، اس کے کسی شعر پر اعتراض مت کرنا۔'' چنانچہ شاہ صاحب حضرت آتشؔ مرحوم کے پاس تشریف لے گئے۔ رسمِ تعارف کے بعد شاہ صاحب نے غزل سنانے کی فرمائش کی۔ آتشؔ نے یہ مطلع پڑھا:

حسن سے قدرت خدا کی، رُو نظر آیا مجھے
ریشِ پیغمبر ترا گیسُو نظر آیا مجھے

شاہ صاحب نے لاحول پڑھا۔ آتشؔ خاموش ہو گئے۔ پھر کوئی شعر نہیں سنایا۔ جب واپس آئے تو ناسخؔ سے قصہ سنایا۔ ناسخؔ نے کہا: ''میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بڈھا کامل الفن ہے، اس پر اعتراض مت کرنا''۔

حضرت فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے آتشؔ کے شعر کو معشوقانِ مجازی کی تعریف میں سمجھا۔ اس وجہ سے ریشِ پیغمبر کی تشبیہ پر برافروختہ ہو گئے۔ حالانکہ آتشؔ نے امام حسین علیہ السلام کی منقبت میں فرمایا ہے۔ اور ریشِ پیغمبر سے ان کے گیسو کو تشبیہ دی۔ بلاغت کے قاعدے سے مشبہ سے مشبہ بہٖ افضل ہے۔ اس لیے ریشِ پیغمبر کی فضیلت امام حسین علیہ السلام کے گیسو پر باقی رہی۔ شعر اپنی جگہ بے مثل ہے۔ (۲۲)

ان ادبی آلات کے علاوہ دیگر درجنوں ادبی محاسن مثلاً صنائع بدائع، امیجری/ پیکر تراشی، تکرار وغیرہ ادبی فن پارے کو مزین و مسجع کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ صنائع سے لفظوں کے مابین نئی نئی مناسبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ امیجری تصور کو احساس اور تجربے کے مراحل سے دو چار کرتی ہے۔ تکرار سے کلام میں تاکید، مناسبت، رعایت اور تدریج کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ عموماً تکرار سے کیفیت،

کیفیت نہیں تو تاکید ضرور حاصل ہو جاتی ہے، لیکن بڑا شاعر الفاظ کی ترتیب ایسی بناتا ہے کہ معنیٰ کی تہوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ تکرار کئی مرتبہ لف ونشر کے لیے بھی ہوتا ہے، مثال کے طور پر فاضل لکھنوی نے حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی مدح میں کہا:

زہرا کے نورِ عین ہیں آلِ شہِ کونین ہیں
حضرت حسن ابنِ علی، حضرت حسن ابنِ علی

مصرعِ ثانی میں بظاہر تکرار معلوم ہوتی ہے لیکن اسے مصرعِ اول کے دونوں حصوں کے مبدل منہ کا بدل سمجھیں تو شعری بلاغت کا حسن نکھرتا ہوا محسوس ہوگا۔

حضرت سیّدنا امام حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادتوں کو بالترتیب سری اور جہری کے نام سے موسوم کر کے سب سے پہلے شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے شانِ عظمت کو بیان کیا ہے۔ یعنی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہوئی جبکہ مظہران کے دونوں نواسے بنے۔ (۲۳)

فاضل لکھنوی کا شعر ہے کہ:

جہری شہادت کا مزہ شبیر نے حاصل کیا
سری شہادت تم نے لی حضرت حسن ابنِ علی

اس اصولی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ منقبت نویس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے ادبی متن کو ادبی آلات کے بھرپور تخلیقی استعمال کے ساتھ پیش کرے۔ اس سلسلے میں چونکہ بنیادی حوالہ مذہبی ہی رہتا ہے، اس لیے غیر اسلامی یا غیر مذہبی استعاروں کا غیر تخلیقی استعمال مدح میں تشبیہ یا استعارے کی اطلاقی جہتوں کو متاثر کر کے کوئی غیر متوازن بیانیہ پیدا کر سکتا ہے۔

ادبی متن تخلیقی وفور سے جتنا لبریز ہو، اس کے اندر معنی کی متلاطم موجیں جوشاں سمندر کی طرح ہوتی ہیں۔ اظہار کے اسالیب زبان و بیان کی اختیاری ہنرمندی متعین کرتی ہے۔ جدید ادبی نظریے میں متن کے لیے کثیر پرتی (Multi-layered) ہونا حسن ہے۔ عموماً مذہبی سیاق رکھنے والے متون میں معنیٰ آفرینی کے امکانات نہیں پیدا کیے گئے۔ یہ ضرور ہے کہ لفظ مذہبی حوالے کے ساتھ برتا جائے تو اس میں معنوی حتمیت اور محدود دائرۂ اطلاق پیدا ہوتا ہے جو معنیٰ آفرینی کے لیے سازگار نہیں ہے تاہم ایسا نہیں کہ مذہبی اصناف کے تخلیقی اظہار میں معنیٰ کی کثرت ناممکن ہے۔ بڑی نعتیہ اور منقبتی شاعری سے سیکڑوں ایسی مثالیں ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں جو زبان و بیان میں تخلیقیت، کثیر المعنویت اور ابہامِ مرادی کی بنا پر شعر کے امکانات سے بھرپور ہیں۔

کلاسیکی منقبت نویسی کی روایت میں تخلیقی متن سازی کے اصول باضابطہ مدوّن نہیں تھے تاہم ان

کے شعری حافظے میں جو بڑی اور معیاری شاعری کی رسومات تھیں، ان کا نہایت اعلیٰ اظہار ان کے شعری ورثے میں ملتا ہے۔ فارسی کی پوری روایت میں منقبت کے لیے قصیدے کی صنف کے متقاضی پُرشکوہ اور عالی معنویت سے لبریز مدح کے مختلف پیرایوں کی تخلیق کی گئی۔ اس کے تتبع میں اردو میں منقبت نویسی کو قصیدے اور بعد ازاں غزل کی ہیئت میں جس لسانی اور فکری عُلُوّ سے برتا گیا، اس کی مثالیں ہمیں افسوس کے ساتھ جدید منقبت میں دکھائی نہیں دیتیں۔ اس کے اسباب پر گفتگو کرنے کا یہاں محل نہیں ہے البتہ جدید منقبت نویسوں کو کلاسیک متون کی سنجیدہ قرأت اور زبان و بیان کی لطافتوں اور باریکیوں سے آگاہی حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بڑی اور معیاری شاعری زبان کے معیاری استعمال سے روگردانی کر کے نہیں کی جا سکتی۔ بڑا شاعر ہمیشہ بڑا زبان دان ہوتا ہے۔ لسانی تلازمے، معنوی میلانات، بین المتن انسلاکات اور لفظی رعایات کا خلاقانہ استعمال جدید منقبت میں مفقود نہیں تو نہایت کم ضرور ہے۔ اردو کے اساتذہ اور فارسی کے عرفانی شعرا سے استفادہ جدید منقبت نویسی میں زبان و بیان اور فکری رفعت کے لیے فرضِ عین کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر زبان دانی کے تقاضے متنوع ہیں۔ منقبت نویس شاعر کے عملِ تخلیق میں تمام تر لسانی امکانات (صرفی ونحوی احوال، اشتقاقی حوالہ، ضلع جگت، تلازمہ بندی) اور موسیقیت (روانی) کے امتزاجی عناصر کا فعال حالت میں (In working position) ہونا از حد ضروری ہے۔ بڑی شاعری کا جنم اسی سے ہوتا ہے۔ برصغیر کے خصوصی تناظر میں یہ وصف چند ایک شعرا کی منقبتی شاعری میں ملتا ہے، جبکہ فارسی میں مولانا رومؔ اور عطارؔ وغیرہ کے ہاں اس کی بڑی صورتیں موجود ہیں۔

مبحثِ چہارم: منقبت کی موضوعی اغراض

منقبت کے متنی ابعاد جن اغراض اور موضوعاتی پرتوں کو اپنی تحویل میں لیتے ہیں ان کے متعدد حوالے ہیں۔ تاہم ذیل میں صرف ان کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی حیثیت بہت بنیادی اور کلیدی ہے، کیونکہ ان مرکزی پہلوؤں کے ضمن میں بالواسطہ ان کا ذکر بھی آ جائے گا جو فی الوقت ذیلی عناوین میں مندرج نہ ہوں گے۔

استغاثہ، استعانت اور استمداد

تینوں الفاظ قریباً ہم معنیٰ ہیں۔ کسی روحانی و مذہبی شخصیت کی مدح کے طرز پر اس سے مادی یا روحانی حوالے سے اعانت کی درخواست کرنا منقبت کا عام شعری مضمون ہے۔ یہ اعتقادی مباحث مختلف مسالک کے تناظر میں مختلف فیہ ہیں کہ اللہ کے علاوہ استمداد جائز ہے یا نہیں، اولیائے کرام سے

استعانت کا کیا شرعی حکم ہے؟ وغیرہ! تاہم ہماری روایت میں یہ ریت روایت موجود ہے جس کی بہت عمدہ مثالیں آئندہ سطور میں درج کی جائیں گی۔ استمداد و استغاثہ دراصل اس باطنی خلا کی دادخواہی کا نتیجہ ہے جس میں انسان اپنے روحانی یا مذہبی اکمال کے سفر میں تنہا رہ جائے۔ اس وقت وہ آواز لگاتا ہے اپنے ممدوح کو، ذہن میں ممدوح کی ذات کو متصور مان کر اس سے براہِ راست استعانت کرتا ہے۔ دراصل اس میں کوئی مادی حوالہ شاید مفید کار نہ ہو، لیکن روحانی جہتوں سے خدا کے بندگانِ نیک اس استغاثے پر بتوفیقہٖ تعالیٰ لبیک ضرور کہتے ہوں گے۔ عقیدے کے تناظر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مناقب میں استعانت و استمداد کی بہترین مثالیں عربی و فارسی و اردو، تینوں مشرقی زبانوں میں موجود ہیں جن سے فکری اور ادبی فیض لے کر جدید منقبت کی چلتی ہوئی روایت میں راہ کشائی کا عمل طے پا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ حضرت کا شعر شانِ مولا علی علیہ السلام میں:

اے طلیق الوجہِ فی یومٍ عبوسٍ قمطریر
یا بھیجَ القلبِ فی یومِ الاسیٰ، امداد کن

یعنی اے اداسی اور سختی والے دن میں آزاد چہرے اور خوش دل والے! مایوسی کے روز تو میری مدد فرمانا۔

استغاثہ تو واضح ہی ہے لیکن کچھ لطیف پہلو بھی ہیں۔ "طلیق الوجہ" کی رعایت سے "یوم عبوس" کہا۔ "عبوس" کہتے ہیں بگڑے ہوئے چہرے والے کو اور "طلیق" بمعنیٰ خندہ اور ہشاش چہرہ، "عبوس" کو دن کی صفت بنایا تو معنیٰ ہوا: وہ دن جو اپنی اصل ہیئت سے بگڑ جائے اور جس میں مصائب و آلام کا خدشہ ہو۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں "بھیج" کی رعایت سے "الاسیٰ" کہا۔ "بھیج" کہتے ہیں دل کی وہ کیفیت جس میں وہ کھلا ہوا، مطمئن اور مسرت آگیں ہو، جبکہ الاسیٰ سے مراد دل کی تنگی، گھٹن اور مایوسی کی کیفیت ہے۔ ان تضادات کے ذکر میں باریکی یہ ہے کہ خارج اور باطن میں جتنی زیادہ سیاہی ہوگی، روشنی کی قدر اور ضرورت بھی اُتنی ہی ہوگی۔ عظمت کا یہ معیار ہے کہ جب ہر ہر سُو گمراہی اور ظلمت کا ڈیرا ہو تب عظیم شخصیات معرضِ وجود میں آیا کرتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اسی منقبت میں استمداد کے دیگر بہت سے نایاب اور کمیاب پہلو بھی برتتے ہیں۔ الغرض! بے پناہ معنیٰ آفریں، فکر انگیز اور اعتقادی اصابت کی منقبت ہے۔

میرؔ نے منقبتِ مولا علی رضی اللہ عنہ میں استغاثہ یوں پیش کیا ہے:

اے مرے سرمایۂ دنیا و عقبیٰ لطف کر
اے مرے مولا، مرے صاحب، ادھر بھی کر نظر

مطلع بھرتی کا ہے لیکن اس میں دو پہلو نکتے کے ہیں۔ پہلا یہ کہ استغاثے میں "لطف کرنا" کی معنویت بہت نادر ہے۔ ایک فارسی مثل ہے کہ "لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش" (۲۴) یعنی "لطف" کا لفظ اپنے اور پرائے سبھی کے لیے عمومی رحم و کرم کے معنوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایسی صفتِ حسنہ ہے جس سے اپنا تو اپنا، پرایا بھی سعادت مندی کے جذبے سے غلامی کر لینے پر مصر ہو جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ لفظ کتنا برمحل ہے، اس کا اندازہ ان کی سیرت میں ان کی شانِ حلم سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں عطارؔ کا شعر یاد آتا ہے جو انھوں نے "منطق الطیر" میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں کہا:

خواجۂ حق، پیشوائے راستین
کوہِ حلم و بحرِ علم و قطبِ دین

"کوہِ حلم" کا اشارہ ان کے عمومی الطاف و کرم کی جانب ہے۔ یہی سبب ہے کہ میرؔ کے یہاں "لطف" کا سوال کیا گیا ہے۔

میرؔ کے مطلع میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مصرعِ اول میں "سرمایہ" سے ایک اشکال یہ پیدا ہوا کہ "سرمایہ" کسی غیر انسانی چیز سے استعارہ ہو سکتا ہے اور اس سے استعانت چہ معنیٰ دارد؟ اس کا جواب دوسرے مصرعے میں رکھ دیا کہ "مولا" اور "صاحب" کے الفاظ میں وہ آقائی شان موجود ہے جو انسانی وصف تو ہے ہی، استعانت کے لیے بھی بہترین مخاطب ہے۔ میرؔ کی یہی عظمت ہے کہ وہ بھرتی کے شعر میں بھی کوئی نکتہ اور حیرت انگیز ندرت پیدا کر دیتے ہیں۔

بالواسطہ نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

منقبت بہ اعتبارِ موضوع وہ ساختۂ مدح ہے جس کا عُلوی ربط نعت سے ہے۔ اس میں بالواسطہ ممدوح شخصیت کے اسبابِ عظمت میں مذہبِ اسلام سے لازمی وابستگی، دینِ متین کے مظاہر میں اس کی خدمات کے ساتھ مرکزی سطح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ذہنی و قلبی تعلق کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے۔ اس سطح پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح کے پہلو بھی نکل آتے ہیں۔ یوں بھی اُمتِ مسلمہ کے کسی بھی فرد کی مذہبی اور دینی حوالوں سے مدح کا منتہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت پر ہوگا، کیوں کہ شخصی فضائل و خصائل کو "حُسن" اور "قبولیت" کا معیار تبھی حاصل ہوتا ہے جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع کے ساتھ ہو۔ وہ کیسا اُمتی ہے جس کے اخلاقی اکتسابات اور مذہبی کمالات میں اُس ذات کی عظمت و رفعت کی جھلک نہ متجلی ہو جس کے ہونے سے اِس کا ہونا بامعنیٰ قرار پاتا ہے۔

منقبت سے بالواسطہ نعت اور نعت سے حمد کی جانب ایک مربوط ارتقا کی بہترین مثال حضرت ام

سلمہ رضی اللہ عنہا کے وہ اشعار ہیں جنھیں وہ خاتونِ جنت سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے نکاح کے وقت ان کی مدح میں کہتی ہیں:

سِرنَ بعَون اللہ جاراتی وشکرنه فی کل حالات
واذکرن ما أنعم رب العلیٰ من کشف مکروہ و آفات
فَقَد هدانا بعد کفر و قد أنعشنا رَبُّ السماواتِ
سرن مع خیر نساء الوَری تفدی بعمات وخالات
یا بنت من فضله ذو العلی بالوحی منه والرسالات (۲۵)

ان شعروں میں روئے سخن تو شہزادیِ کونین سلام اللہ علیہا کی جانب ہے لیکن اُن کی منقبت سمیت، اپنے والہانہ شوق، اور حمد ونعت کا بھی بہترین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اُس کی عظمت کیا ہوگی جس کے والد رسولِ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہوں۔

میر انیسؔ کے مرثیوں میں ہر دوسری سطر میں کربلائی کرداروں کی منقبت نعت سے ہم رشتہ رہتی ہے۔(۲۶)

عزتؔ بخاری کا مشہور نعتیہ شعر دراصل دو بزرگانِ ولایت کی مدح کا مُشعِر بھی ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرشِ نازک تر
نفَس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

بادی النظر میں یہ شعر بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں حضوری کے آداب سے متعلق ہے لیکن لفظِ "آید" سے ایک لطیف پہلو منقبت کا بھی نکلتا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ نبیِ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں ان بزرگان کی رسائی ہو چکی ہے یا ہوتی رہتی ہے۔ غیرِ صحابی کے لیے اس معنوی یافت کا اثبات/ اظہارِ منقبت کا نہایت عمدہ پیرایہ لیے ہوئے ہے۔

ناسخؔ کا ایک اوج گیر شعر بہت لطیف طریق پر منقبت سے نعت تک علوی سفر میں دکھائی دیتا ہے:

گر نہ ہوتا سرخ رُو اشکِ غمِ شبیر سے
حشر میں کس منہ سے ناسخؔ میں شفاعت مانگتا

شفاعت رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خاص الخاص شان ہے۔(۲۷) اور بروزِ حشر انھی کے وسیلے سے دیگر کو یہ اجازت مرحمت کی جائے گی۔ شعر میں "شفاعت" سے اگر امام حسین رضی اللہ عنہ کی سفارش مراد ہو یا رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت، ہر دو پہلو سے یہ منقبت تا نعت شعر ہے۔

یہ ممکن ہے کہ مناقب کی اغراض میں بالواسطہ نعت شاعر کے متنی منشا یا عمل میں نہ رہی ہو، تاہم اس

کی باطنی/معنوی ساخت میں ضرور دراندازہوجاتی ہے۔اور یہ بدیہی ہے، کیوں کہ فضائلِ انسانی کی ہر داستان کا حرفِ آخر نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔حسنِ اخلاق کے سبھی کمالات میں اکمل، جمالِ معنوی کے تمام زاویوں میں اجمل اور شرف وفضیلت کے مجموعی حوالوں میں اشرف صرف و صرف ذاتِ رسول ؐ ہی ہے۔ پروانے کی ستائش میں چراغ، اور بلبل کی توصیف میں پھول کی مدح خود بخود آجاتی ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

اقبالؔ کا یہ شہرہ آفاق نعت ومنقبت کا امتزاجی مضمون سنائیؔ کے اس شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے:

شمعِ دیں بُود مصطفیٰ جانش
جانِ بوبکر بُود پروانش

اس مضمون اور بالخصوص سنائیؔ کے شعر کے سیکڑوں فکری، فنی اور بلاغی محاسن ہیں جن کا اگرچہ مفصل ذکر کرنا یہاں بےمحل ہے، تاہم تین اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) شمع جل رہی ہوتو پروانہ اپنے وجود کی نفی کر کے اس میں کود جاتا ہے۔ یونہی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اس قدر فنا ہو چکے ہیں کہ انھوں نے اپنے وجود کی نفی کر کے ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا ہونے کی سعادت پالی۔

(۲) جیسے شمع پر پروانہ خود کو نچھاور کرنے میں وقت نہیں لگاتا، یونہی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایمان بالرسالت میں لمحہ نہیں لگایا اور نبوت کی تصدیق کر کے اولین پروانگانِ شمعِ رسالت میں سرِ فہرست ٹھہرے۔

(۳) لفظِ ”جان“ کلی وجود سے عبارت ہے۔اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ حضرت ابوبکر کا کل وجود (Total Presence) شرعِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آئینہ دار ہے اور تمام تر فیضانِ نبوی کا جامع اور نمونۂ کامل ہے۔ روئے ارض پر اگر دینِ محمدی کا مجسم کردار دیکھنا ہو جو ظاہر و باطن سے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عکسِ کامل ہو تو وہ ذاتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔

جماعتِ صادقین سے ہمرشتہ ہونا

ایمان اور اخلاص کے خمیر میں گندھی شخصیات کے لیے قرآن مجید نے ”صادقین“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تفسیرِ خازن میں سورۃ التوبہ کی آیت: ۱۱۹ کے تحت ”صادقین“ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ بہرحال! بنیادی خاصہ ایمان اور اخلاص کی یکجائی کا

ہے۔ منقبت نویس ممدوح کی مدح میں عظمت و بزرگی کے علاوہ جماعتِ صادقین سے اپنی وابستگی کے مضامین بھی برتتا ہے۔ یہ منقبت کا ایک خاص رجحان ہے کیوں کہ اس میں شخصی فضائل و مدائح کی اساس محض بیانِ عظمت پر نہیں اٹھائی جاتی بلکہ قلبی و فعلی طور پر ممدوح سے ہمرشتہ ہونے کا احساس اوراظہار بھی منقبت کی تشکیل میں کھپ جاتا ہے۔ منقبت کی کلاسیکی روایت میں اس پہلو سے متعدد حوالے ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومیؔ کا معروف شعر ہے:

یک زمانہ صحبتِ با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صادقین/اولیائے عظام سے وابستگی کی اس قدر اہمیت ہے کہ مولا روم کی مثنوی اس تاکید سے بھری ہوئی ہے کہ تنہا زندگی کا سفر مہلک ہے اوراس ہلاکت سے بچاؤ کے لیے کسی رہنما کی ضرورت اشد تر ہے۔ مثلاً انھی کے یہ دوشعر مزید یاد آرہے ہیں جن میں سے پہلا عطارؔ اور دوسرا مولانا کا ہے:

پیر باید راہ را تنہا مرَو — از سر عمیا دریں دریا مرَو
ہر کہ تنہا ناد را ایں رہ برید — ہم بعونِ ہمتِ پیراں رسید

یہ اشعار جہاں مجرد ضرورتِ بیعت کی طرف مشیر ہیں، وہیں گروہِ اولیا کی مدح سرائی بھی ہے کہ ہدایت وسلوک کی راہ میں ان کی اتباع واجب اور منزلِ مقصود کی ضامن ہے۔

منقبتِ مولا علی رضی اللہ عنہ میں ناسخؔ کا شعر ہے:

ناسخؔ کا ادعا ہے یہی روزِ باز پُرس
میں ہوں غلام شاہِ رسُل کے غلام کا

استاد ناسخؔ نے لفظِ ”ادعا“ استعمال کیا، اس میں دو نکتے توجہ طلب ہیں۔ ”ادعا“ فخر وغرور کو بھی کہتے ہیں اور حقّ ملکیت کا دعویٰ کرنا بھی مراد ہے۔ غلام اپنے آقا سے حقّ خدمت کا طلب گار رہتا ہی ہے اور آقا عظمت وشان والا ہو تو اس کی غلامی میں بھی افتخار کا احساس درآتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں سے شعر کی معنویت سمجھیں تو جماعتِ صادقین سے ہمرشتہ ہونے کی امنگ بھرپور سرشاری کے ساتھ ہمارے قلب سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

تحفظِ اعتقاد علی السبیل التذکرہ

جس طرح جان کی حفاظت ضروری ہے، یونہی ایمان واعتقاد پر حزم واحتیاط بھی امرِ واجبی ہے۔ کیوں کہ بدون اس کے مسلم امہ کے مذہبی اور اجتماعی تشخص کا بامعنیٰ ہونا غیر اہم ہی نہیں، کارِ عبث قرار

پائے گا۔ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے فرامینِ عالیہ کی تبلیغ وترویج کا حکم ارشاد فرمایا تاکہ یہ سلسلہ ہر دور میں جنباں رہے اور مذہبِ حق کی کلی اعتقادی ساخت میں کجی و کمزوری نہ واقع ہو۔ قرآن مجید میں جو بار بار تذکیر کا ذکر ہے، اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان کسی بھی حوالے سے شترِ بے مہار نہیں ہے۔ عقیدہ، عمل، روایت، فکر اور دائرہ کار میں وہ مکمل طور پر ایک لڑی سے منسلک ہے جس کا نام مذہب ہے۔ دنیا کی ہر تہذیب میں مذہب اور مذہبی نمائندوں کا کردار کلیدی رہا ہے۔ کیوں کہ نفسی اور فطرتی، ہر دو تناظرات میں وہ کردار پوری قوم/ اُمت کے لیے حق کے نقیب اور پرچارک ہوتے ہیں۔ ان کی علمی، فکری، فعلی اور امکانی حدود کا تذکرہ بھی ہمارے اعتقاد، عمل اور فکر کو لگا دینے کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں تذکیر کا پہلو انسانی نفسیات کے مرکزی پیرائے میں گندھ کر آیا ہے تاکہ امرِ مذکور مخاطب انسان یا قوم کے باطن و خارج میں فطری طور پر اپنا تاثر چھوڑے اور وہ یوں خود کو بے لگام سمجھنے کی غلطی ہر گز نہ کرے۔

اسلام کی دینی روایت میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت کی عمدگی کا قرآن میں بار بار تذکرہ آیا ہے۔ ان کی حیات کا ہر ہر گوشہ ہمارے واسطے قابلِ عمل نمونہ پیش کرتا ہے۔ ان کی زندگیوں اور باہمی معاملات میں بظاہر کئی مناقشے، اختلافات اور تضادات دکھائی دیں گے لیکن نظریے اور فکر میں وہ سب ایسے ہیں جیسے بہت سے ستارے بکھرے ہوئے ہوں لیکن وہ آسمان کے حصار سے باہر نہیں جاتے۔ صحابہ کرام کی ظاہری حیات میں بشری تقاضوں کے تئیں کچھ مبہم تناظرات ضرور جنم لیتے ہیں لیکن خود انھی کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے وہ تضادات رفو ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرام کی شخصیات کے بارے میں اسی قسم کی متعصّبانہ ذہنیت کے بھونڈے اشکالات کو عقلی استدلال کی قوت سے رد کرتے ہوئے شیخ فریدالدین عطارؔ نے خلفاے راشدین کی مناقب کے بعد باقاعدہ ایک عنوان ”در بیانِ رفعِ تعصب جانبِ خلفاے راشدین از دلِ راستی گزین“ کے تحت اپنا فریضہ ادا کیا ہے۔ اہمیت کے پیشِ نظر اس کے اہم اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

”اے مخاطب! تو خواہ مخواہ تعصب میں پھنسا ہوا ہے۔ کسی کے ساتھ بغض اور کسی کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ اگر تو عقل مند اور باتونی ہونے کی ڈینگیں مارتا ہو تو پھر خلفائے راشدین میں تعصب کیوں کرتا ہو؟ خلافت میں کہیں بھی طرف داری سے کام نہیں لیا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر طرف داری کا الزام کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اگر ان ہر دو پیشواؤں میں طرف داری ہوتی تو پھر وہ اپنے صاحب زادوں کو اپنا ولی عہد بناتے اور اگر انھوں نے کسی حق دار کا حق چھینا ہوتا تو دوسرے صحابہ کرام پر واجب تھا کہ وہ انھیں روکتے۔ اگر صحابہ کرام نے انھیں ایسا کرنے

سے نہیں روکا تو پھر تم یا تو سب کی تکذیب کرو یا سب کو برحق مان لو۔ اگر تم تمام صحابہ کرام کی تکذیب کرو گے تو تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دل سے قبول نہیں کیا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرا ہر صحابی ایک روشن ستارہ ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میرا زمانہ تمام زمانوں سے بہتر زمانہ ہے۔ نبی کریم نے یہ بھی فرمایا کہ میرے اصحاب بہترین لوگ ہیں یہ سب میرے قُربیٰ ہیں اور دوست ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن کے بارے میں یہ فرمادیا ہے کہ "یہ بہترین لوگ ہیں" اگر اب تم ان کو بُرا کہو گے تو تمھیں صاحبِ نظر کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اگر صحابہ کرام علیہم الرضوان کے اقدامات صحیح نہیں ہیں تو پھر قرآن کریم کو ایک جگہ پر جمع کرنے کا کام بھی غلط ماننا پڑے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو کام بھی کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کو متنبہ کیا تھا کہ اگر اونٹ کے زانو کو باندھنے والی رسی بھی نہ دو گے تو میں تم سے جہاد کروں گا۔ ایسی شخصیت پر خیانت کے الزام کو سراسر غلط سمجھو۔ اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کسی ناجائز طرف داری یا کجی کا شبہ بھی ہوتا تو وہ اپنے خطبے میں یہ کیوں فرماتے کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے سے ہٹ کر کوئی حکم دوں تو تم مجھے قتل کر دینا؟ اسی طرح اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں اگر کچھ تعصب یا خرابی ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کو اَسّی دُرّوں کی سزا شراب کے جرم میں دے کر نہ مارتے۔ اے ناقدر شناس جاہل! تم اپنی سرداری پر ان کی خلافت کو قیاس نہ کرو۔ اگر تمھاری گردن میں ایسی خلافت ڈالی جاتی تو تم بجائے خوشی کے اس کے غم میں ہی آتش بہ جگر ہو کر جل مرتے۔ خلافت بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کوئی شخص خلافت کا بوجھ اپنے ذمہ لیتا تو وہ سینکڑوں مصیبتوں کی آماجگاہ بن جاتا۔ عہدۂ خلافت کو جس طرح انھوں نے بطریق احسن نبھایا یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔" (۲۸)

فارسی میں بالخصوص اور اردو میں بالعموم شعراے منقبت کو یہ احساس بہرحال میسر رہا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی محض رسمی مدح نہیں بلکہ اس کے تذکار سے اپنے اعتقاد کو حرارت و توانائی بخش رہے ہیں۔ اس احساس کے چند اہم نظائر ملاحظہ ہوں۔ استاد ابراہیم ذوقؔ نے صحابہ کی مدح میں زبردست شعر کہا کہ:

دکھائی مجھ کو راہِ شرع اصحابِ پیمبر نے
چراغِ راہ ہے اکرام اصحابِ کرم میرا

"راہ دکھانا" ہدایت کی ضمانت ہے۔ "راہ دکھانا" اس شعر میں "اراءۃ الطریق" (۲۹) کے معنوں میں ہے۔ کیوں کہ صحابہ کا راستہ منزلِ ہدایت تک پہنچانے والا ضرور ہے لیکن منزلِ مقصود تک یقینی رسائی صرف خدا ہی بخشتا ہے۔ ذوقؔ نے جملہ اصحاب سے اس تعلق کی سوانح میں اپنے اعتقاد و عمل کی اصابت کا عندیہ بھی پیش کیا ہے۔ اور یہی باریک پہلو اس شعر کی خوبی ہے۔ معاصر منقبت نویسی اس نوع کی

لطیف معنیٰ خیزی سے افسوس ناک حد تک محروم ہے۔

مرزا غالبؔ کی مشہور منقبت ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں ہے۔اس کا ایک شعر ہے:

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دِیں

جان، دل اور دین انسان کے قیمتی سرمائے ہیں۔کل اثاثۂ حیات جس ممدوح کے قدموں میں نثار کیے جانے کے لیے ہو، وہ ممدوح محض متکلم کی مدح کا مفعول نہیں ہوسکتا، اس سے ضرور تعلقِ خاطر اور اعتقادی انسلاک متحقق ہوگا۔ یہ منقبت کے مقاصد واغراض میں ایک اہم غرض بھی ہے اور شعرِ غالبؔ میں اس کا بہترین اظہار ہوا ہے۔

معروف چشتی بزرگ حضرت میر سید عبد الواحد بلگرامی حضرات خلفاے اربعہ میں بالترتیب فضیلت اور شیخین کی افضلیت پر تین شعروں میں یوں اپنا اعتقاد ظاہر کرتے ہیں:

محبت با این ہر طہارت نکو زِ تفضیلِ شیخین کارت نکو
محبت بہر چار گر استوار ولے فضلِ شیخین مفرط شمار
ورت فضلِ شیخین در دل کم است بنائی تو در رفض مستحکم است

اشعار درج کرنے کے بعد شیخ بلگرامی لکھتے ہیں کہ:

"اجماعِ اصحاب وتابعین وتبع تابعین وسائرِ علمای امت ہم برین عقیدہ واقع شدہ است واین اجماع در کتبِ متقدمان ومتاخران مذکور وشائع است" (۳۰)

یعنی جملہ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور تمام علمائے امت کا اسی پر اجماع ہے اور یہی اجماع اگلوں اور پچھلوں کی کتب میں مکتوب شائع شدہ ہے۔

اسی ترتیب کا اپنے اعتقاد کے تئیں اظہار شیخ سعدیؔ نے یوں کیا ہے:

نخستیں ابو بکر پیرِ مرید عمر پنجہ بر پیچ دیوِ مرید
خرد مند عثمانِ شب زندہ دار چہارم علی شاہِ دلدل سوار

"نخستیں" اور "چہارم" کے الفاظ ترتیبِ نزولی کا پتا دیتے ہیں۔

شیخین کی افضلیت اجماعی مسئلہ ہے۔اس کا تعلق شاعری سے زیادہ اعتقادیات سے ہے، تاہم منقبت میں اس عقیدے کا اظہار بہت سے شعرا نے کیا ہے۔صحابہ کرام کی باہمی مناقب اس سلسلے میں اہمیت کی حامل ہیں۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شیخین کی اقتدا کرنے کا خصوصیت سے حکم کیا ہے۔ چونکہ

یہ عقیدہ بین المسالک مختلف سروکار رکھتا ہے اور سُنی شیعہ تفریق کے تناظر میں ہر مسلک کے شعرا اپنے مزعومہ رجحانات کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلیفۂ بلافصل ہونے کا عقیدہ فارسی گو تقریباً تمام شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ اردو میں معاصر منقبت نویسی شیخ بلگرامی سے ہم زبان ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں ادبی اظہار کے متنوع اسالیب پیدا ہو رہے ہیں جو ظاہر ہے کہ مستحسن ہے۔

عملی فیضان کے اکتساب پر تشکرانہ

فیضان خدا کی عنایت کی کسی بھی صورت کو کہتے ہیں اور جب غیرِ خدا کی طرف اس کی نسبت ہو تو بے غرض اور بے عوض عطا سے اسے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تصوف میں اس کی دیگر تعریفات بھی کی جاتی ہیں۔ (۳۱) بہر حال، عرف میں اس کا اطلاق حضرات صحابہ کرام، مذہبی آئمہ اور تصوف کے بزرگان کی اس عنایت پر ہوتا ہے جو وہ اپنے وابستگان پر روحانی اور ایمانی حوالے سے کرتے ہیں۔ خدا سے اپنے دست گرفتوں کا تعلق مضبوط بناتے ہیں اور اس منزل میں وہ یقینی راستہ بن کر عرفانِ الٰہی جیسے عظیم مطلوب تک رسائی بخشتے ہیں۔ بالخصوص اولیاے کرام کی بات کریں تو دنیا میں محاسنِ دینِ اسلام کی امین یہی ذواتِ مبارکہ ہوئی ہیں جن کی وجہ سے گلشنِ حیات کا ہر غنچۂ عرفان ومحبت کی خوشبو سمیٹے ہوئے ابدی بہاروں کی نقابت کا فریضہ سرانجام دیتا رہا ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے دنیا کی اقبال مندی میں اولیاے کرام کو سبب قرار دیا ہے۔ (۳۲) اور بلاشبہ ہم جب چہار سُو نفرتوں کے صحیفے آگ اور خون کی آبیاری کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اولیاے کرام کی محبت آمیز تعلیمات اور بھائی چارے کے منہج کی از حد ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

فیض بمعنیٰ اثر و ترتُّب افراد سے خاص نہیں ہے، بلکہ افعال و اوصاف کا فیض بھی ہوتا ہے۔ ایک ہندو شاعر برج ناتھ مخمورؔ کا شعر ہے کہ:

شبیرؑ ترے فیضِ شہادت نے بتایا
دنیا پہ نہیں دل پہ حکومت ہے بڑی چیز

امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا فیض اپنے معنوی رسوخ میں دلوں تک رسائی پا چکا ہے۔

منقبت کی شعری روایت میں شعرا کے ہاں رسمی و مقصدی ہر دو طرح کی مناقب میں عملی فیضان کے اکتساب پر تشکرانہ ملتا ہے۔ مثلاً بیدمؔ وارثی کے اس شعر میں "نثار ہونا" شکرانے کے طور پر ہی ہے:

کیوں نہ ہوں کونین کی آزادیاں اس پر نثار
ہے دلِ بیدمؔ اسیرِ دامِ گیسوئے علیؓ

فنی حوالے سے یہ منقبت کا اچھا شعر ہے۔ لفظی انسلاکات، معنوی تلازمات اور بین المصارع مناسبات کا ایک جال بچھا ہوا ہے جو معاصر منقبت نگاری میں مفقود ہی نہیں شاید مزعومہ طور پر غیر مفید بھی ہے۔
سیّد کرامت علی شہیدیؔ کا شعر ہے:

بہت دشوار تھا دیوار کیوں کر پھاندتی امت
اگر وہ در نہ ہوتا مصطفیٰ کی شہرِ عرفاں کا

شعر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے متعلق مشہور تلمیح "انا مدینۃ العلم۔۔۔" کا مضمون ہے۔ علم انسان کا بنیادی مسئلہ ہے اور شعر میں اس کی تکمیل ہو جانے کا سبک شکرانہ ادا کیا گیا ہے۔ شاعر کے معتقدے کی ترتیب و تہذیب میں اس شکرانے کا تاثر بہت بدیہی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں تفصیل سے منقبت کی موضوعی جہات و اغراض سے بطریقِ حکایت موضوعات اور مقاصد کا استخراج کیا گیا۔ فارسی اور اردو کے کلاسیکی اساتذہ کے ہاں منقبت کے فکری دائرہ کار کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ منقبت نے کثیر موضوعی مواد تو فراہم کر دیا ہے لیکن اکثر تناظرات رسمی ہونے کی وجہ سے خالص غزل کے شعرا کے ہاں مناقب کا وہ علمی اور تاریخی پس منظر فوت ہو گیا ہے جس سے تقدیسی ادب سے وابستہ شعرائے منقبت کما حقہ آشنا ہیں۔

مبحثِ پنجم: منقبت کے چند مسائل

چونکہ ہمارے مضمون کی بنیاد کلاسیکی منقبت نویسی پر ہے۔ اس لیے مضمون کے آخر میں اردو اور فارسی کے ذخیرۂ مناقب کا ایک عبوری جائزہ اس نیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے اکثری اور عمومی مزاج کی کیفیت سے آگاہی حاصل کی جا سکے۔ اساتذۂ فن کے نزدیک متن کے لفظی اور معنوی ارتباط، فکری صلابت، اور علمی رویوں کی فراوانی کی وجہ سے مناقب کا ورثۂ شعری بہت مضبوط اور پختہ رہا ہے۔ تاہم چند ایسے مسائل بھی ہیں جو منقبت کی شعری روایت کو درپیش رہے۔ ان کا حسب ذیل تجزیہ کیا جاتا ہے۔

فکری و فنی اتار چڑھاؤ

پوری شعری روایت میں منقبت فکر و فن کی ثروت مندی سے لبریز رہی ہے۔ فارسی کے اساتذۂ فن ہی نہیں، معمولی شعرا کے ہاں بھی وہ فکری جولانیاں موجود ہیں جو بعد ازاں اردو کے اساتذہ کے دواوین میں آ کر قرار پذیر ہوئیں۔ ممدوح کی سیرت کے مستحسن پہلوؤں کا شاعرانہ اظہار، اس کی علمی و روحانی روایت سے اخذ و استفادے کا فعلی اور منطقی پیرایۂ بیان اور ممدوح کی عظمت کے تخلیقی اسباب کی دریافت وغیرہ جیسے معرکۃ الآرا امور سے منقبت کی کلاسکی روایت معمور ہے مگر فکری ارتقا کے بجائے روز

افزوں تنزلی آتی گئی اور ماضی قریب میں نہ صرف فکری سطح پر بلکہ فنی اور رسمی جہت سے بھی تخلیقِ مناقب میں تساہل برتا گیا۔ تحسینِ ذات کے آداب اور اس کے اظہار کے تخلیقی قرینے بالکل مفقود ہو گئے یا کم از کم محدود رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جو عُلوِّ معنی قدیم مناقب میں ملتا ہے وہ جدید میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پہ ایک تلمیح پر دو مختلف شعرا کے اشعار اور ان میں کلاسیک اور جدت کا فرق ملاحظہ ہو کہ ایک علمی اور منطقی پہلو کو مشتمل ہے اور دوسرا جمالیاتی اور تصوراتی۔ فارسی کے مسلم الثبوت اور عرفانی روایت کے سرخیل خواجہ فریدالدین عطارؔ کی مثنوی ”منطق الطیر“ کا ایک شعر ہے کہ:

چون تو کر دی ثانی اثنینش قبول
ثانی اثنین او بوَد بعد از رسول

اس تلمیح کو دوسرے پیرائے میں بسملؔ ابوالعلائی نے باندھا ہے:

اِذھما فِی الغَار کہہ کر حق نے ظاہر کر دیا
ہے اسے منظور کتنی دلبری صدیق کی

”اِذھما فِی الغَار“ سے دلبری اور ثانی اثنین سے نیابتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دونوں پہلوں پر غور کیا جائے تو جو کفایتِ لفظی، اجمال، منطقی استدلال اور نکتہ رسی عطارؔ کے شعر میں موجود ہے وہ بسملؔ کے شعر میں نہیں ہے۔ اسی طرح بڑے اور چھوٹے شاعر کا فرق دیکھنا ہو تو سنائی غزنوی کے اس بند کے آگے نامیؔ کا شعر رکھ کر دیکھیں۔ حکیم سنائی غزنوی نے خلفائے اربعہ کو بالترتیب مغز، دل، دیدہ اور جان سے تشبیہ دی ہے اور چاروں کی وجہِ شبہ بھی ذکر کر کے ایک تخلیقی اور منطقی استدلال بھی فراہم کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

و آن چھاری کہ پیش خوان بودند　　مغز و دل دیدگان و جان بودند
مغز را صدق دادہ، دل را عدل　　دیدہ را شرم دادہ، جان را بذل

اب غلام دستگیر نامیؔ لاہوری کا شعر دیکھیں:

ابوبکرؓ و عمرؓ، عثماںؓ، علیؓ کو
نہ کیوں تشبیہ دوں میں چار قُل سے

انھوں نے مطلقاً تشبیہ کا ذکر تو کیا مگر وجہِ شبہ کی طرف اشارہ کیا نہ کوئی قرینہ برتا، کہ اس تشبیہ کو کوئی واقعی یا امکانی جواز مل سکے۔ اب یہ قاری کی افتادِ طبع پر ہے کہ چاروں اصحاب کے لیے چاروں قُل کے مضامین کے کن پہلوؤں کو منطبق کرنا ہے یا شاعر کی طرح محض عدد کی تشبیہ پر اکتفا کرنا ہے۔

خلفائے راشدہ کا ذکر کمیاب

منقبت کے کلاسیکی ورثے میں چونکہ حضرات اہلِ بیت اور اولیائے امت کی مدح کے لیے لفظِ "منقبت" مستعمل تھا، اسی لیے اصحابِ ثلاثہ کی مناقب کا وہ تناسب نہیں ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسنین کریمین رضی اللہ عنہما اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کا ہے۔ تاہم امتِ مسلمہ کے علما شاعروں کے ہاں خلفائے ثلاثہ کی مناقب کا ذکر منضبط اور باقاعدہ روایت کی صورت میں ملتا ہے۔ مثلاً مولانا رومیؒ، شیخ فریدالدین عطارؒ، حکیم سنائیؒ، شاہ نیازؒ چشتی، مولانا قدسیؒ، نظامیؒ گنجوی، مرزا مظہرؒ جانِ جاناں، مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے علاوہ اردو میں مولانا احمد رضاؒ خان، شبلیؒ نعمانی، حکیم مومنؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا ظفرؒ علی خان، مولانا اقبالؒ سہیل، ماہرؒ القادری اور چوہدری دلورام کوثریؒ۔ یہ نام کسی تاریخی ترتیب کے بغیر محض حافظے کی بنیاد پر درج کیے ہیں۔ ان شعرا کے ہاں خلفائے ثلاثہ سمیت دیگر کی مناقب کا حصہ اپنے اپنے اختیاری تناسب کے ساتھ موجود ہے۔ کئی شعرا نے باقاعدہ عناوین کے تحت مناقب لکھیں اور کئی نے نعت کے تسلسل میں مناقب کو بھی سمیٹ لیا۔ بہر دو صورتوں میں ۱۹۷۰ء سے قبل کی منقبت نویسی میں خلفائے ثلاثہ کا ذکر مابعد دور کی بہ نسبت نصف یا اس سے بھی کم ہے۔ اس کی ظاہر ہے کہ کچھ اعتقادی اور علمی وجوہات ہیں مگر یہاں انھیں ذکر کرنے کا محل نہیں ہے۔

مبالغے/تعلیل میں شخصی التباس

شاعرانہ مبالغے یا تعلیل کی کچھ سطحیں ہیں جن کی روشنی میں فکری ارتکاز اور ابعاد کو ہم آمیز کر کے کچھ نتائج نکالے جا سکتے ہیں تا کہ شعر کا معنوی اطلاق اور خیالی کینوس اپنی وسعتوں یا تنگ دامانیوں کے ساتھ ہمارے حیطۂ ادراک میں آ جائے۔

(الف) بنیادی سطح یہ ہے کہ شعر میں امرِ موضوعہ کی فرضی علت کسی دوسرے امرِ واقعی سے ملتبس نہ ہو۔ منقبت میں یہ پہلو بلاشبہ محمود اور مستحسن ہے۔ مثلاً ایک عارف شاعر لطیف اللہ نیشاپوری کا شعر ہے:

طوافِ خانۂ کعبہ ازان شد بر ہمہ واجب
کہ آنجا در وجود آمد علی ابنِ ابی طالب

طوافِ کعبہ کی اصل علت حکمِ الٰہی ہے لیکن شاعرانہ حسنِ تعلیل نے ایک بات پیدا کر دی۔ چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مولودِ کعبہ ہونے کی نسبت بھی ملحوظ رہے تو حسنِ تعلیل کو بہترین جواز فراہم ہو جاتا ہے۔

یونہی ایک اہم مسئلہ تعریفی اوصاف کے اتصاف کا بھی ہے، کہ بعض اشعار (۳۳) غیر نعتیہ عنوانی تحدید میں بھی نعتیہ ہونے کی غمازی کرتے ہیں، اسی طرح بیشتر تراکیب و الفاظ اپنی پوری بناوٹ اور

معنویت میں نعتیہ ہوتے ہیں، اگرچہ تخلیق کار کے عندیے میں وہ غزل یا منقبت کا شعر ہوسکتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں چونکہ نعت اور منقبت میں ارتکازی پہلو مدح ہے اور ظاہر ہے کہ رسولِ مکرم ﷺ کی مدح اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح کے معنوی اعتبارات میں عند الشاعر زمین و فرق کا آسمان ہے۔ لہٰذا لفظی تراکیب و الفاظ کے معنوی ابعاد کو ممدوح کے مرتبے کے مطابق پھیلاؤ کی اجازت دی جاسکے گی۔

مثال کے طور پر ناسخ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں کہا:

ہے وجودِ مرتضیٰ سے زیست موجودات کی
پیکرِ کونین میں مانندِ جاں پیدا ہوا

بادی النظر میں یہ شعر نعتیہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شان تو آپ ﷺ کی ہے کہ انھیں موجودات کے وجود پر سبب بنایا جائے۔ لیکن ذرا باریکی میں جائیں تو اس شعر سے چار قرینے ایسے نکلتے ہیں جن سے اس شعر کے غیر نعتیہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۔ موجودات کی زیست "وجودِ مرتضیٰ" سے ہے۔ موجودات پہلے سے ہیں لیکن زیست (تحرّک، ولولہ، حوصلہ) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے باعث ہے۔

۲۔ "کونین" کا پیکر پہلے سے موجود ہے۔ لہاذا سبب پر مسبب مقدم نہیں ہوسکتا۔

۳۔ "مانندِ جاں" سے اس جانب اشارہ ہے کہ مولا علی رضی اللہ عنہ جان کی مانند ہیں، جان نہیں ہیں۔ جان تو رسولِ مکرم ﷺ ہیں اور یہ اُن کی مانند ہیں۔ مانند ہونے کی معنویت عیاں ہی ہے۔

۴۔ "کونین" سے صرف دو عالموں کی طرف اشارہ ہے جبکہ رسولِ محتشم ﷺ عالمین (جمع کا اطلاق دو سے زائد پر ہوتا ہے) کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

ان چاروں قرائن کی کھوج نہ کی جاتی اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ منقبت کا شعر ہے۔ ورنہ پہلی نظر میں اسمِ مرتضیٰ نکال لیا جائے تو نعتیہ شعر ہے۔ نعت سے منقبت کی جزوی یکسانیت جو اسے نعتیہ بنانے پر آمادہ ہے، اس کی بہتر تاویل کرنا ضروری ہے۔

ماہر القادری نے ایک انٹرویو میں جوشؔ کی نظم "طلوعِ فکر" (۳۴) کے اس مصرعے "کوٹھے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات" کا حوالہ دیتے ہوئے اسے لفظی بے حرمتی کی مثال گردانا ہے۔ یہ نظم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے۔ ماہرؔ القادری نے بند کے صرف ایک مصرعے کا مجرد حوالہ دے کر آدابِ منقبت کی حرمت پر سوال اٹھایا ہے۔ یہ رویہ بعض وجوہ سے درست نہیں۔ اول یہ کہ "تھرکنا" حیات کا فعل ہے جس کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے، حیات مشبہ ہے جسے محض تشبیہ کی بنیاد پر اس انبساط انگیز حالت سے بھرپور پیکر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کوٹھے کا لفظ حیات کے غیر مرئی بدن کا تصور دلاتا ہے جس میں

انسانی جنسیت (Sexuality) یا شہوانی ہیجان مفقود ہی نہیں، لفظ کی معنوی تشکیل سے بھی اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ اس لیے منقبت کی اس نظم کے پورے سیاقی منظر میں مصرعِ مذکور کی کھپت کے عملی اطلاق کے بعد پورے بند کی روانی سے قرائت کریں تو اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ جوشؔ کی نظم قصیدے کے آہنگ میں ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو مصرعِ مذکور اس کی تشبیب کے آخری حصے سے ماخوذ ہے۔ تشبیب کا تعریفی متن سے موضوع کی سطح پر غیر متعلق ہونا بالکل روایتی سی بات ہے اس پر اتنا چیں بہ جبیں ہونا کیا معنی؟ "قصیدہ بانت سعاد" سے بڑھ کر کیا مثال دی جاسکتی ہے؟

(ب) اور اگر التباس در آئے تو وہ شعر اپنی معنوی جمالیت سے اتر جائے گا۔ مثال کے طور پر نبی ہونا سید الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے وصفِ ذاتی ہے۔ (۳۵) لیکن اگر نبوت کا التباس کسی ترکیب یا لفظ میں در آئے جس سے بالذات نبوت کا شائبہ پیدا ہو تو وہ منقبت کے پیرائے میں اہانت اور کفریہ ارتکاب ہوگا جس کی کوئی تاویل نہیں کی جائے گی۔ حسنِ تعلیل کی بنیادی شرط یہی ہے کہ امرِ موضوعہ امرِ واقعی سے ملتبس نہ ہو۔ مثلاً تعشقؔ لکھنوی کا ایک شعر جنابِ مولائے کائنات کی منقبت میں دیکھیے:

عجب تھیں صحبتِ معراج میں اسرار کی باتیں
اِدھر احمدؐ، اُدھر گویا علی ابنِ ابی طالب

"صحبتِ معراج" کی ترکیب، جیسا کہ ظاہر ہی ہے کہ اس سے شبِ معراج کی اُس انتہائی منزل میں عابد و معبود کی باہمی گفتگو مراد ہے۔ یہاں "علی" کے لغوی معنیٰ سے رعایت کا فائدہ تو اٹھایا لیکن "ابنِ ابی طالب" کہہ کر منقبت کی بجائے ذم کا پہلو نکال لیا۔ یہ التباسِ صریح ہے۔ اس کی تاویل اگرچہ ان الفاظ میں گھڑی جاسکتی ہے کہ "گویا" محض تشبیہ کے واسطے ہے، اسے امرِ واقعی کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن اس تاویل میں یہ خرابی ہے کہ مشبہ بہ میں رتبۃً یا شہرۃً وجہِ شبہ کا قوی ہونا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے۔ لہٰذا تاویل باطل اور شعر مدح کے مقام پر ذم کے پہلو لیے ہوئے ہے۔ بے جواز رعایت اور لفظی مناسبت کا نقصان اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے؟

اسی منقبت کا ایک اور شعر بھی عجب بدمزہ ہے۔ شاعرانہ پہلو سے بات بنانے کی کوشش کی لیکن معنوی ترفع کی بجائے تقابل میں مفہوم کہیں کا کہیں جا پہنچا۔ شعر ہے کہ:

بزرگوں سے جو افضل ہو اسے فرزند کہتے ہیں
ہے فخرِ آدم و حوّا علی ابنِ ابی طالب

"افضل" اسمِ تفضیل ہے جس میں فی نفسہٖ فضیلت کی بجائے تقابل میں فضیلت کا علو بیان کیا جاتا ہے۔ نیز شعر میں "جو افضل ہو" کا ٹکڑا قانونی لہجے میں شرط عائد کر رہا ہے جو عمومی مفہوم میں ہے۔ یہ علی

الخصوص ہوتا تو بھی مذموم تھا، کیوں کہ بہرحال سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی اور اہلِ بیت سے ہیں، لیکن علی سبیل العموم سابقہ انبیاے کرام سے ان کی افضلیت کا کوئی اعتقادی بیانیہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منقبت شعری صنف سہی، مگر بیانیے کی ساخت میں مذہبی موضوع ہے۔ اسی لیے نعت کی طرح یہاں بھی اعتقادی جذبے کو بے لگام نہیں چھوڑا جا سکتا۔ (۳۶)

چونکہ مسلکی تناظرات میں اسلام کی مذہبی شخصیات کی حیثیت مختلف اعتقادی بیانیوں کی نذر ہوتی رہتی ہے۔ اہلِ تشیع کی پوری شعری روایت میں ہمیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ یہی نہیں دیگر خلفاے ثلاثہ کی مناقب بھی اس مسلک میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یونہی دیگر مسالک میں اہلِ بیت کی اہم ترین شخصیات اور آئمۂ آلِ عبا پر کوئی ڈھنگ کا شعر ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

خیر! یہ تاریخ کے مباحث ہیں۔ ان مسائل کے اسباب پر گفتگو فی الحال ہمارا موضوع نہیں ہے۔ تاہم منقبت نویسی کے معاصر منظرنامے میں یہ توازن بھرپور انداز میں نظر آتا ہے کہ خلفاے راشدین اور اہلِ بیت کی مناقب بدستور جزوی فرق کے ساتھ لکھی جا رہی ہیں۔ ایک معاصر شاعر عبدالقادر شکیمۃ کا شعر ہے:

له شهد القُرَانُ بصدق رأيٍ　　وكان لدينا حصناً حصينَا

یہاں شاعر نے ''شَهِدَ'' کا لفظ رکھ کر وحیِ الٰہی کی سبقت اور برتری قائم رکھی اور مدحِ عمر رضی اللہ عنہ کا پہلو آسانی سے نکال لیا۔ دوسرے مصرعے میں اس سے ایک خوب صورت استدلال بھی کر لیا کہ صحابہ کرام کا اجتہادی یا رائے ناپختہ نہیں ہوسکتی بلکہ وہ عینِ فطرت اور الوہی مزاج کی مظہر بن جاتی ہے۔

غیر منطقی استدلال

منقبت کی شعری روایت میں مسائل کے ضمن میں ایک چیز نہایت بنیادی ہے اور وہ ہے فضائل کے بیان میں غیر منطقی استدلال۔ عالمگیر صفات سے متصف کر کے بعض بہت ضمنی مذہبی افراد کو بلند آہنگ القابات اور بھاری بھرکم وظائف سے دوچار کیا جاتا ہے جس کا ان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ مذہبی حوالہ مختصر ہو یا پھیلا ہوا، وہ اپنے اندر اعتبار اور اہمیت رکھتا ہے لیکن منطقی استدلال کے بغیر ایک عام امتی انسان کو دنیا و آخرت کی نجات کا ذریعۂ واحد بنا کر اس کی مدح کا مبالغہ آمیز پیرایہ تخلیق کرنا کہاں کا انصاف ہے! اس سلسلے میں راہبانہ زندگی بسر کرنے والے بیبیوں ''بزرگوں'' کی مناقب کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی عظیم مذہبی شخصیت کی مدح کا آغاز اس حقیقت سے کیا جانا ضروری ہے

کہ ایسی شخصیات کی عظمت کا بنیادی سبب وہ اثرات ہیں جو ان کے افعال اور تعلیمات نے انسانی زندگیوں پر مرتب کیے ہیں۔ منطقی استدلال کا تقاضا ہے کہ ہم ان کی شخصیت کو ان کے کردار، ان کی اخلاقی بلندی اور ان کے ذریعے پھیلائے گئے مثبت اثرات کی روشنی میں پرکھیں۔ اگر ہم ان کے کردار کا جائزہ لیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ہر پہلو انسانیت کے لیے ایک نمونہ تھا۔ ان کے افعال اور تعلیمات میں نہ صرف روحانی بلندی نمایاں ہے بلکہ وہ ایک ایسی عملی رہنمائی فراہم کرتے ہیں جو تمام انسانوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ منطقی طور پر، ایک ایسی شخصیت جو نہ صرف اپنے وقت میں بلکہ صدیوں تک لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائے رکھے، وہ اپنے قول و فعل میں بلند ترین معیار پر کھڑی ہوتی ہے۔
اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس شخصیت کی عظمت کا راز ان کی تعلیمات کی عالمگیریت اور ان کے عمل کی بے مثال صداقت میں ہے۔ مزید برآں، اگر ہم ان کی تعلیمات کا تجزیہ کریں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہ تعلیمات کسی مخصوص قوم یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ ان کا دائرہ کار پوری انسانیت کو محیط ہے۔ ان کی تعلیمات میں ایسے اصول موجود ہیں جو انصاف، مساوات، اور محبت کو فروغ دیتے ہیں اور یہ اصول کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کا اظہار نہ صرف مذہبی دائرے میں ہوتا ہے بلکہ اخلاقیات، سماجیات، اور فلسفے کے میدان میں بھی ان کا اثر نمایاں ہے۔
یہ منطقی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی شخصیت جس کی تعلیمات ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے قابلِ قبول ہوں، وہ صرف ایک محدود دائرے کا مذہبی رہنما نہیں بلکہ ایک عالمگیر رہبر ہیں۔ ان کی مدح درحقیقت ان اصولوں اور اقدار کی مدح ہے جن کی بنیاد پر وہ اپنی زندگی بسر کرتے رہے اور جنھیں انھوں نے دنیا میں عام کیا۔

حوالہ جات

(۱) پروفیسر احمد رفیق اختر، مجموعہ، حصہ: "اسلام اور عصرِ حاضر"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، جلد سوم، صفحہ ۴۴

(۲) القرآن الکریم، سورۃ الذاریات، آیت ۵۶

(۳) القرآن الکریم، سورۃ آل عمران، آیت ۱۱۰

(۴) القرآن الکریم، سورۃ البقرۃ، آیت ۳۰

(۵) سورۃ الفجر کی آیت ۲۷ کی تفسیر میں علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ: "گھبراہٹ اور اضطراب کے بعد جو سکون ملتا ہے اسے "اطمینان" کہتے ہیں اور نفس کو سکون تب میسر آتا ہے جب وہ یقین، معرفت اور شہود کی اعلیٰ منزل پر فائز ہو جائے اور یہ مقام ذکرِ الٰہی کی کثرت اور دوام سے حاصل ہوتا ہے۔ الَا بِذِکرِ اللہِ

تطمئن القلوبُ۔ جب انسان اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو پھر اسے ”تمکین“ سے نوازا جاتا ہے۔اس کے بعد اسے رد ہونے کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔“

(۶) جیسا کہ امالی الامام طوسیؒ میں ہے کہ: ”مَن سَبَّ نَبیّا مِنَ الأنبیاءِ فاقتُلُوهُ، ومَن سَبَّ وَصِیّا فقد سَبَّ نبیّا۔“ الامالی، شیخ الطائفة أبي جعفر محمد بن الحسن الطوسی، دار الثقافة، قم، ۱۴۱۴ھ، الرقم: ۲۰/ ۶۹۷، صفحہ ۳۶۵

(۷) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے زیب النساء سرویا نے ڈاکٹر وحید عشرت کی نگرانی میں بہ عنوان ” کلامِ اقبال میں انبیائے کرام کا تذکرہ: تحقیقی وتوضیحی مطالعہ“ ایم فل کا مقالہ لکھا ہے۔

(۸) القرآن الکریم، سورۃ طٰہٰ، آیت ۱۱۵

(۹) قرآن میں تمام انبیاے کرام کو ”مطاع“ کہا گیا ہے۔(سورۃ النساء، آیت ۶۴) مطاع کا معنیٰ جس کی اطاعت کی جائے، وہ جو رہنمائی کرنے والا ہو۔اگر چہ حضور ختمی مرتبت آقاے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نبی بیان کردہ شرعی احکام پر عمل کرنا منسوخ ہے، تاہم ان سے محبت واحترام کا رشتہ روا رکھنا نہ صرف ایمانی تقاضا ہے بلکہ رضاے الٰہی کا ذریعہ بھی ہے۔

(۱۰) بحوالہ: آدمؑ تا رحمتِ عالمؐ، خالد پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲

(۱۱) کلیاتِ مخمورؔ دہلوی، جے کے آفسٹ پرنٹر، نئی دلّی، ۱۹۸۶، صفحہ ۲۰۶

(۱۲) قرآن مجید میں کئی مقامات پر دینِ ابراہیم اور ملتِ ابراہیم کا ذکر آیا ہے۔مثلاً سورۃ البقرۃ ۱۳۰، سورۃ النحل ۱۲۳، سورۃ الحج ۷۸، سورۃ الانعام ۱۶۱، سورۃ آل عمران ۹۵ اور سورۃ النساء ۱۲۵

(۱۳) تفسیرِ ماجدی، سورۃ المائدہ، زیرِ آیت ۲، صفحہ ۲۶۹، حاشیہ نمبر ۶

(۱۴) ہندو کی نعت اور منقبت، مرتب: خواجہ حسن نظامی، محبوب المطابع، دہلی، ۱۹۲۴ء، صفحہ ۲۲

(۱۵) عام طور پر رہبانیت کی تردید میں ایک مقولہ ”لا رهبانية في الإسلام“ انھی الفاظ کے ساتھ حدیث کے طور پر مشہور ہے لیکن یہ الفاظ حدیث نہیں ملتے، لیکن اس کا معنیٰ حدیث سے ثابت ہے۔غالباً حافظؔ شیرازی نے دنیاوی معشوقوں کے پیشِ نظر کہا ہے:

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رخان کنجی گرفت و یادِ خدارا بہانہ ساخت

یعنی زاہدِ خشک جو لوگوں کی نظروں میں تو گوشہ نشین ہو گیا ہے لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ اسے پری رخوں کے جمال کی تاب ہی نہیں تھی۔حافظؔ کے اس شعر میں ” پری رخاں“ کو اگر مقتضائے حیات کے مختلف مظاہر سے مستعار سمجھا جائے تو یہ اس رہبانیت کا معنیٰ دیتا ہے جو اسلام میں جائز نہیں ہے۔

(16) Thomas Carlyle, On Heroes - Hero Worship And The Heroic in History, Lecture 1, NewYork, 1905, p# 13

(۱۷) القرآن الکریم، سورۃ الاسراء، آیت ۸۵

(۱۸) اردو میں منقبت نگاری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۲۹

(۱۹) ہندو کی نعت اور منقبت، مرتب: خواجہ حسن نظامی، محبوب المطابع، دہلی، ۱۹۲۴ء، صفحہ ۱۸ (کتاب کے پہلے صفحے پر مولانا خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں: "جناب چودھری دلورام صاحب کوثریؔ ساکن نانڈری ضلع حصار پنجاب کا نعتیہ کلام رسالہ صوفی اور اکثر رسائل و اخبارات میں چھپا کرتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی شان میں بھی انھوں نے بہت سے منظوم مناقب لکھے ہیں۔ وہ بہت بے تعصب ہندو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی محبت ہے۔" دلچسپ بات یہ ہے کہ خود دلورام کوثری نے اپنی اس قسم کی شاعری کو "توشۂ آخرت" سے تعبیر کیا ہے۔)

(۲۰) علامہ سیوطی علیہ الرحمہ کے بقول ۲۲ مقامات ایسے ہیں جہاں نزولِ وحی سے قبل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے وحی سے موافق ہوئی ہے۔ ان موافقات کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے رسالے "قطف الثمر فی موافقاتِ عمرؓ" بصورتِ اشعار جمع کر دیا ہے اور علامہ بدر الدین الحسنی المغربی نے "فتح الوھاب فی موافقات سیدنا عمر بن الخطابؓ" کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔

(۲۱) شاہ غلام اعظم افضل الٰہ آبادی انیسویں صدی کے مشہور صوفی اور جیّد شاعر تھے۔ ان کے ساتھ دو اہم نسبتیں اور ہیں۔ وہ ناسخ کے ارشد تلمیذ اور شاہ عبدالعلیم آسی کے استاد تھے۔

(۲۲) عین المعارف، مقدمہ، مطبع گولڈن گرافکس، کراچی، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۶۲

(۲۳) سرّ الشہادتین، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، نول کشور لکھنؤ، ۱۸۸۶ء/ ۱۳۰۳ھ، صفحہ ۵

(۲۴) یہ سعدیؔ شیرازی کا شعر ہے۔ مصرعِ اول یوں ہے: "بندۂ حلقہ بگوش ارنوازی برود" بحوالہ: کلیاتِ سعدیؔ، تصحیح محمد علی فروغی، چاپ خانۂ بروختیم، تہران، ۱۳۲۰ھ، صفحہ ۲۱

(۲۵) فاطمۃ الزھراءؑ في دیوان الشعر العربي، مؤسسۃ البعثۃ، بیروت، طبعِ اول ۱۹۹۷ء، صفحہ ۲۹

(۲۶) حیات عامر حسینی نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ: "میں ہمیشہ مرثیہ کو جس کا تعلق ان پاک نفوس سے ہے، نعت کا ہی حصہ سمجھتا ہوں، اس سے الگ نہیں۔ کیوں کہ ان پاک نفوس کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور آپ کی تعلیم سے الگ کوئی وجود نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا، ایسا خیال کرنا بھی ایک منطقی تناقض اور حقیقت سے بین انکار ہے۔" بحوالہ: نعت، مرثیہ اور عرفان، زیب پبلی کیشنز، علی گڑھ، ۲۰۱۶ء، صفحہ ۱۷

(۲۷) شفاعت کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاص ہونا احادیث سے ثابت ہے۔ علماے کرام نے وہ شفاعت جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاص ہوگی اسے شفاعتِ عظمیٰ اور عمومی کو شفاعتِ عامہ سے موسوم کیا ہے۔

(۲۸) مترجم حکیم مطیع الرحمان نقشبندی، حکایاتِ فرید الدین عطارؔ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۵۶-۵۹

(۲۹) اہلِ لغت کے نزدیک ہدایت کے دو معانی ہیں۔ جمہور اشاعرہ کے نزدیک اس کا معنیٰ "اراءۃ الطریق" ہے، یعنی صرف راستہ دکھانا، نہ کہ منزل تک پہنچانا۔ اور معتزلہ کے نزدیک معنیٰ "ایصال الی المطلوب" ہے، یعنی مطلوب ومقصود تک رسائی بخشنا۔ بحوالہ: جامع العلوم فی اصطلاحات الفنون، قاضی عبد النبی بن عبدالرسول احمد نگری، دارالکتب العلمیہ ، بیروت، ۲۰۰۰ء، جلد چہارم، صفحہ ۱۳۱

(۳۰) سبع سنابل، مکتبہ قادریہ (عکسی اشاعت مطبوعہ نظامی)، ۱۴۰۴ھ، صفحہ ۱۰

(۳۱) دکتر سیّد جعفر سجادی لکھتے ہیں: "فیض در اصطلاح القاءِ چیزی در دل از طریقِ الهام که به کسب حاصلات شود. نیز فعلِ فاعلی را که فعلش بلاعوض و همیشگی و بی غرض باشد فیض گویند. از این جهت حق را مبداءِ فیاض خوانند که فیضش علی الدوام بر موجودات وارد میشود؛ و چیزها به واسطها فیض تجلی رحمانی۔" بحوالہ: فرہنگِ اصطلاحات وتعریفاتِ عرفانی، کتاب خانہ ملی ایران، ۱۳۰۷ھ، صفحہ ۶۳۰

(۳۲) خواجہ صاحب کے الفاظ یوں ہیں کہ: "اقبالِ دنیا از آنها است (یعنی از وجودِ اہل اللہ)" بحوالہ: جواہر الفرائد، انتخاب از فوائد الفؤاد، مرتب: مولانا ڈاکٹر غلام محمد، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، صفحہ ۳۸

(۳۳) مثال کے طور پر غالبؔ کا مشہور شعر (زباں پہ بارِ خدایا یہ۔۔۔) جو تجمل حسین خان کی مدح میں ہے، لیکن اس کی متنی ساخت اور معنوی ترفع، ہر دو مُصر ہیں کہ اسے نعتیہ درجے سے کم پر نہ رکھا جائے۔ کئی ناقدین نے اس کی تصریح کی ہے۔ ابوالخیر کشفی ایسے مستند نعت کے ناقد کا کہنا ہے کہ "بے چارے تجمل حسین خاں اس شعر کا مصداق کب ہو سکتے تھے، اسی لیے ہمارے اجتماعی ذوقِ شعری نے اس شعر کو خراجِ تحسین کا وسیلہ اور ذریعہ بنا کر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ عالیہ میں پہنچا دیا۔ اور اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے گا کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے، خود اس پر اس کے مکمل معانی منکشف نہیں ہوتے۔" (غزل میں نعت کی جلوہ گری، مشمولہ: نعت رنگ، مارچ ۲۰۰۰ء، شمارہ ۹، صفحہ ۱۵) اس شعر کے نعتیہ ہونے کا ایک لطیف قرینہ اور بھی ہے کہ جب ہم "محمد" کہتے ہیں، تو میم پر ہمارے ہونٹ باہم مل جاتے ہیں اور گویا ایک بوسے کی سی شکل بن جاتی ہے۔ یہی غالبؔ کے شعر سے مستفاد ہے کہ اسمِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا بابرکت اسم ہے کہ اسے ادا کرتے وقت خود بخود ہونٹوں سے بوسہ جاری ہو جاتا ہے۔

(۳۴) نظم: طلوعِ فکر، جوش ملیح آبادی، احباب پبلشر، لکھنؤ، سن ندارد، صفحہ ۱۷

(۳۵) مولانا قاسم نانوتوی لکھتے ہیں کہ: "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موصوف بوصفِ نبوت بالذات ہیں۔ اور سوا آپ کے اور نبی موصوف بوصفِ نبوت بالعرض۔ اوروں کی نبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا فیض پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کسی کا فیض نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلسلۂ نبوت مختتم ہو جاتا ہے۔" بحوالہ: تحذیر الناس، دار الاشاعت، کراچی، سن ندارد، صفحہ ٦

(۳۶) نعت میں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان کے آبائے کرام (انبیا و غیرِ انبیا) سے افضل کہنے کے دلائل و قرائن موجود ہیں جیسا کہ ابن الرومی نے اسماعیل بن بلبل کی مدح میں دوسرا مصرع، جو مشبہ بہٖ پر مشتمل ہے، نعتیہ کہا ہے:

وکم أب قد علا بابنٍ ذُرا شرف　　کما علا برسولِ اللہ عدنانُ

یعنی کتنے ہی باپ بیٹے کی وجہ سے عزت و شرافت کی چوٹی پر پہنچ گئے، جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وجہ سے عدنان کو بلندی حاصل ہوئی۔

□□□

آپؓ عالی نسب ، پارسا ، با صَفا
اِنتخابِ خداوندِ جود و سخا
مہ جبیں ، دل نشیں ، خوش ادا ، خوش لقا
آپؓ اشرافِ عالَم کے ہیں پیشوا
آپ عبداللہؓ ہیں والدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

آپؓ سخیوں کے داتا ہیں، شاہوں کے شاہ
آپؓ ذی قدر ، ذِی جاہ ، عالَم پناہ
آپؓ کی عظمتوں پر زمانے گواہ
آپؓ کی رِفعتیں ہیں بیاں سے وَرا
آپ عبداللہؓ ہیں والدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ہاشمی بوستاں کے گُلِ سَرسَبد
ناز پرور ، حسیں ، پاک دل ، سروقد
جانِ اہلِ کمال و جمال و خرد
صاحبِ منزلت ، بے خطر ، بے رِیا
آپ عبداللہؓ ہیں والدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(افضال احمد انور)

مدح ومناقب کی روش

واجدؔ امیر

ABSTRACT: Wajid Ameer is an intelligent, thought-provoking, and profound poet in the contemporary poetic landscape. This article addresses the secretive organizations that promote sectarian bias under the guise of MANQABAT, as well as the openly declared figures who spread religious hatred. He boldly expresses the issues created by sectarian poets who exploit praise poetry for their agendas. However, this article not only highlights these issues but also offers solutions and provides a list of poets who maintain quality and integrity in their work during these troubled times. The second part of the article consists of a brief selection of outstanding praise verses.

وصالِ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کے بعد خلفاؓ نے جس عمدگی سے نظامِ سلطنت چلایا اور جس کے خاتمے کے بعد جو ملوکیت نے ہمارے سارے نظامِ حکومت کو تاراج کیا اور ذاتی پسند و ناپسند کے لیے مذہب کی دھجیاں اُڑائی گئیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بادشاہ، خلفا، سلطان صرف اور صرف خواہشِ اقتدار کے غلام رہے۔

مسلمانوں کا علمی اثاثہ اور اس کی ترویج و پرداخت اتنا بڑا کام تھا کہ اہلِ علم نسل درنسل اسی کو سمیٹنے میں لگے رہے۔ بلا شبہ اہلِ علم نے قرآن فہمی، علم الحدیث، فقہ، فلسفہ اور دوسرے علوم کی طرف اس درجہ توجہ دی کہ صدیاں انہیں کی تدوین و تزئین میں گزر گئیں، علما مساجد اور کتابوں سے باہر نکلے ہی نہیں۔ قال اللہ و قال رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) پڑھتے پڑھاتے زمانے گزر گئے اور یہ روش اب بھی ویسے کی ویسی ہے۔ صوفیا اپنی خانقاہوں میں اندرونی کش مکش سے برسرِ پیکار رہے۔ عوام الناس کے پاس صرف اِدھر سے اُدھر لڑھکنیاں کھانے کو اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اوپر سے اپنے اپنے

فرقوں، اپنے اپنے مسلکوں کی حقانیت جتانے کے لیے مناظراتی میدان موجود تھے جنھیں وقت کے حاکم خود ہلاشیری دیتے رہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ آخری وحی آنے اور رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد دین مکمل ہو چکا تھا اور اس میں کسی بھی قسم کی کمی بیشی دنیا و آخرت میں نقصان کا باعث تھی اور ہے، اس کے بعد تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یہ سفر صدیوں پر محیط ہے جس میں بہت کچھ ناپسندیدہ بھی ہے اور ناقابلِ برداشت بھی۔ کچھ لوگ نیکی میں بھی بد دیانتی ڈھونڈ لیتے ہیں اور کچھ کو شر میں بھی خیر کا پہلو پوشیدہ دِکھائی دیتا ہے۔ یاد رکھیے تاریخ نہ کسی نے اپنی مرضی سے مرتب کی ہوتی ہے نہ یہ عقائد کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ اس کے نتائج برے بھی ہو سکتے ہیں اور بھلے بھی، مگر بہت سے لوگ اسے اپنی مرضی کا دیکھنا چاہتے ہیں سو، جب ایسا نہیں ہو پاتا تو اس ناکامی کا ملبہ ان شخصیات پر ڈال دیتے ہیں جو اپنی نیک نیتی سے مذہب وملت کی بھلائی کے لیے اپنا حصہ ڈال کے دنیا سے چلے گئے ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ ان کے طریقۂ کار سے شدید اختلاف رکھتا ہے اور اس میں کوئی مثبت پہلو دیکھتا ہی نہیں جب کہ دوسرا طبقہ اس میں سوائے خوبی کے کوئی خرابی دیکھتا ہی نہیں۔ یہی ہمارے مختلف گروہوں کا المیہ ہے۔

ان سب سے الگ شعرا اپنے اپنے زمانوں کی وہ شاعری کر رہے تھے جو ہجر و وصال اور لذتِ مئے ناب کی تعریفوں سے بھری تھی۔ ان میں وہ شعرا جو صوفیا اور اہلِ علم کی ارادت میں تھے اُنھوں نے نعت بھی کہی، توصیفِ پیمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) بھی کی، بزرگ شخصیات کی تعریف وتوصیف بھی کی اور اصلاح کا بھی ڈول ڈالا۔ البتہ اہلِ شریعت کی سخت گیری اور خشک مزاجی نے بہت سے لوگوں کے اندر سے تمام حسنِ لطافت کو مار ڈالا۔ یہی محتاط پسندی کی یہ روش آج تک جاری وساری ہے۔ ذرا سی لفظی لغزش پر چونک جانے والے آج تک کسی نئی بات کو قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔ یہ محتاط پسندی ایک درجے میں واجب بھی ہے کہ اس دریا کے بند میں سوراخ کر کے داخل ہونے والے موجبِ سیلاب بنتے ہیں جو کسی سے نہیں رکتا اور اگر یقین نہ آئے تو مسلکی بے راہ روی کے شکار فرقوں کی بوالعجبیاں دیکھ لیں اُن کے اپنے اہلِ علم سر پیٹ رہے ہیں کہ رات کو جو نئی مذہبی اختراع ایجاد ہوتی ہے صبح تک اس میں کئی گنا نئے اضافے کر لیے جاتے ہیں۔ دین مکمل ہو چکا تھا، جو فیصلے ہونا مقرر تھے ہو چکے تھے، جو من جانب اللہ تھے جس سے سرمو انحراف ممکن نہ تھا، پھر بھی اہلِ ہنر نے کہیں کہیں گنجائش نکال لی اور نعت میں ایسے ایسے نقش و نگار بنائے اور بنا رہے ہیں کہ نعت موضوعاتی صنف ہونے کے باوجود اپنی شیریں بیانی اور گداز کی وجہ سے اہلِ ادب کی سرتاج بن گئی۔

ہمارے علما کے بہت بڑے طبقے نے ردِ بدعت میں وہ محتاط رویہ اختیار کیا کہ اہلِ فن و ہنر کی

زبانیں گنگ ہوگئیں۔ بلا وجہ کی روک ٹوک اور پابندیوں نے شعروسخن سے ملائمیت وشیریں سخنی چھین لی۔ اگر چہ فنی طور پر پختہ گوئی کو رواج حاصل ہوا، لیکن شاعری سے شعری رسیلہ پن رخصت ہوگیا۔ بڑے بڑے علم کے بحرِ بےکراں کے پاس سوائے لفظوں کے گورکھ دھندے کے کچھ باقی نہ بچا۔ شعری حسیّت کا سارا لطف ان بے رہ رو اور بھٹکے ہوئے شعرا کے حصے میں آ گیا جن کے پاس مذہبی شیوخ کی نرم گرم مخالفت کی گھنڈی ہاتھ آ گئی تھی جسے کبھی لطیف اور کبھی کثیف طنزیہ نشتروں کے کچوکے لگا کے داد وصول کی جاتی رہی:

زاہد نہ کہہ بری کہ یہ دیوانے آدمی ہیں
تجھ سے اُلجھ پڑیں گے یہ مستانے آدمی ہیں

عوام الناس پہلے ہی زاہدِ خشک کی بے جا مداخلت سے عاجز تھے، اُنھیں نیا شغل ہاتھ آ گیا۔ اس پر مذہبی رہنما اور قانونی نمایندہ حکومت کا پروردہ بھی تھا سو، یہ ناپسندیدگی دوچند ہوگئی۔ اگرچہ مغلیہ سلطنت کے زوال نے اس کا رخ موڑ دیا تھا، لیکن اس کی نوعیت اب دوسری ہوگئی۔ یہ اس کٹ حُجتی اور نئی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی نئی اختراعات، سائنسی ترقی، علوم وفنون کی بہتات اور نئی نئی ایجادات سے اغماز برتنے کی روش تھی جسے مذہبی طبقے نے بہ یک جنبشِ لب وقلم رد کر دیا اور اس کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

اُردو شاعری کے منظرنامے میں ایام کی مناسبت سے مختلف مواقع پر جو مشاعراتی ہنگامہ برپا ہوتا رہا ہے اُس نے بہت سے سخن وروں کو اِس طرف راغب کیا، خاص مواقع کی مناسبت سے ہر کسی کی بیاض میں مطلوبہ مال موجود ہوتا ہے جسے تمام سخن ور وقتاً فوقتاً جھاڑ پونچھ کر نکالتے اور موقع کی مناسبت سے سنا کر داد وصول کرتے ہیں۔ جن تخلیق کاروں کا تخلیقی وفور سوا تھا اُنھوں نے اپنے نعتیہ مجموعے بنا لیے۔ کچھ نے خود کو غزل کی زلفِ گرہ گیر سے آزاد کرا لیا اور مستقل نعت سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ نظم کے ہو کے رہ گئے، کچھ نے سلام، مرثیہ، نوحہ، سوز، کو اپنی زندگی کا محور بنا لیا۔ کہیں کہیں اصحابِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کی مدح سرائی بھی دِکھائی دیتی ہے۔ یوں یہ لوگ اپنے مسالک کی ترویج میں مگن ہو گئے۔ نعتیہ مجموعوں کے بعد سلام کے مجموعے بھی منظرِ عام پر دِکھائی دینے لگے۔ مسلکی چھاپ کے باوجود مختلف النوع عقیدے رکھنے والوں نے محض عقیدت کی بنا پر اتنے عمدہ کلام لکھے جنھیں مسلکی تعصب چھو کر بھی نہیں گزرا۔ یہ تمام کا تمام ادبی اور فنی پختگی سے عبارت وہ خراجِ تحسین تھا جو محتاط رویوں کی راہ متعین کرتا تھا۔ اس میں تمام اہلِ ہنر کو شامل کر سکتے ہیں۔ شاذ ہی کوئی ایسا اہلِ سخن ہوگا جس نے کربلا اور اس سانحے پر لکھا نہ ہو، اور اپنا حصہ نہ ڈالا ہو بلکہ بہت سے ایسے اہلِ کمال بھی تھے جنھوں نے کربلا کو بہ طور استعارہ استعمال کیا اور غزل میں کیا اور اس مہارت سے کیا کہ اسے سخن میں نئے باب کا

اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

البتہ ایک ایسا کونا ہمیشہ سے خالی رہا جسے کسی مذہبی مجدد نے بھرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اقبال نے حالاں کہ اس کی طرف ہر طرح توجہ دلائی، اپنے مختلف اشعار اور نظموں میں جگہ جگہ اس کی اہمیت جتائی، ان نفوسِ قدسیہ کی خدمات یاد دلائیں، ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی، حالاں کہ حالی، اقبال اور دوسرے زعما اُن کی قربانیوں اور اُن کے مرتبے و مقام سے واقف تھے۔ یہ تھا اصحابِؓ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کی توصیف تھی۔

یہیں سے اس منطقہ سے شناسائی ہوئی جس میں مقدس شخصیات کے لیے نیا راستہ ملا۔ یوں پورے طمطراق سے مناقبِ صحابہؓ واُمہات المومنینؓ واہلِ بیتؓ کی داغ بیل ڈالی اور پورے پاکستان میں مناقب کے مشاعروں کا رواج پڑ گیا۔

مذہبی شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا ہے کہ اس میں فنی سقم بہت ہوتے ہیں۔ اندھی عقیدت تمام فنی رموز کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے۔ اس پر خواہشِ داد و تحسین مروّجہ اُصول و قواعد سے روگردانی پر مجبور کرتے ہیں، واجبی علم اور کم تر مشقِ سخن اس پر قلم کے منہ زور گھوڑے کو بگٹٹ دوڑایا جاتا ہے۔ شخصیات الوہیت کے دبیز پردوں میں چھپتی چلی جاتی ہیں۔ صدیوں کا جھوٹ پر جھوٹ ایسے زبان زدِ عام مصرعے کہلوا دیتا ہے جو مقدس آیات سے بھی زیادہ مقبول ہو جاتے ہیں اور لوگوں کے عقائد کا رخ موڑ دیتے ہیں اور نئے عقائد کا تعین کرتے ہیں۔ ہمارے اِرد گرد ایسی شاعری کے انبار لگے ہیں جنھیں زبان زدِ عام ہوئے زمانے بیت گئے۔ گانے والوں نے اُنھیں اس قدر گایا کہ اذہان میں رچ بس گئے۔ ان کی مخالفت سنجیدہ طبقے نے کی بھی تو درخورِ اعتنا نہ گردانا گیا۔ کچھ نے اگر کی بھی تو زیرِ لب اور بہ بانگِ دہل کی بھی تو نقار خانے میں طوطی کی آواز بن گئی۔ ہمارا عہد شخصیات کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کے معاملے میں ہزاروں سال کی بدعقیدگی کا سرخیل ہے۔ جتنا میڈیا سب کی پہنچ تک آ گیا ہے اتنا ہی لایعنی، بے وزن، غیر معیاری، بازاری، غیر ادبی اور شرم ناک جملے، مصرعے، شعر، مدح سرائی، مناقب اور نعت کے نام پر رواج پا گئے ہیں۔ ان کی مخالفت بھی نہیں ہو رہی۔ ان کے متعلق محتاط رویے کو نہایت ہتک آمیز سلوک کا سامنا ہے بلکہ اس پر اعتراض کرنے والے کو منکرِ رسالت، منکرِ شخصیات اور بدعقیدہ جیسے الزامات کی زد پر رکھا جاتا اور طعن و تشنیع کو مستحق گردانا جاتا ہے۔ شخصیات کے متعلق محتاط روی پر سنگین الزامات عاید کیے جاتے ہیں۔ رکیق حملے کیے جاتے ہیں۔ ناپسند کیا جاتا ہے۔

رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کے ساتھ منسلک اصحابؓ واہلِ بیتؓ محض مذہبی شخصیات نہ تھیں وہ پوری دنیا کے لیے رول ماڈل تھیں۔ اُنہوں نے تاریخِ انسانی کا رخ موڑ دیا۔ تاریخ

کے صفحات ان کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ مغربی مستشرقین بھی ان کے کارناموں کے معترف دِکھائی دیتے ہیں، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ مسلسل ان کی کردار کشی میں تاحال مصروف ہے، حالاں کہ ان کی تاریخی حیثیت اور انسانی وفطری شخصیت پر ہر طرح سے چھان بین کی گئی، یہ بھی حقیت ہے کہ امت کا اجماع اس پر ہے کہ انبیا کے علاوہ کوئی بھی معصوم نہیں یعنی غلطی کا احتمال ہے انسانی لغزشوں اور کوتاہیوں سے شاذ ہی کوئی مبرّا ہو پھر بھی یہ یقین رہتا ہے رسالت مآب کی نگاہِ انتخاب معاذ اللہ ایسی نہ تھی کے تمام کے تمام یا بیشتر اصحاب معیار سے سوئی کے برابر کم نظر آتے مگر یہ شخصیات گفتار و کردار میں ہر کسوٹی پر کھرے نکلے۔ ایک دھیلے کی مالی بدعنوانی یا بے قاعدگی برائے الزام بھی نہ سامنے آئی۔

وقتاً فوقتاً ان شخصیات پر مختلف ادوار میں تحقیق کی گئی اور معمولی سا کوئی داغ بھی ان کے دامن پر نہ دِکھائی دیا۔

کچھ کچھ نامعقول لوگ ان شخصیات پر کیچڑ اُچھالنے میں مصروف رہے بلکہ اُن کے وہ دریدہ دہن رہبر پیش پیش رہے جنھیں مجمع کو من گھڑت قصے سنا کے پیسے کھرے کرنے تھے۔ دن بہ دن، سال بہ سال اسی میں مصروف طبقہ بہت سال سے خفیہ اور اب کھلم کھلا ان متبرک ہستیوں پر کیچڑ اُچھال رہا ہے۔

اس تفرقے میں شدت مارشلائی ادوار میں آئی۔ ہر دو اطراف سے نہ صرف اسلحہ بردار گروپ بن گئے بلکہ با قاعدہ جنگ کا اعلان ہوگیا۔ ہر دو اطراف سے خون ریزی شروع ہوگئی۔ قتل و غارت گری اور دھماکے ہوئے۔ ٹارگٹ کلنگ ہوئی اور وہ سب کچھ ہوا جس کی نہ مذہب اجازت دیتا ہے نہ قانون۔ ہر دو اطراف کے متحارب گروہ جانے کن کن لوگوں کے ایجنڈے کی تکمیل کر رہے تھے اور آج تک کر رہے ہیں، مگر اس جنگ و جدال اور شدت پسندی نے بہت سے جائز کام بھی مشکوک کر دیے جیسے اصحابؓ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کی تعریف و توصیف، جسے شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور اس کے ڈانڈے ان دہشت گرد تنظیموں سے ملائے جانے لگے جو پابندی لگنے کے بعد زیرِ زمین چلی گئی تھیں۔ ان تنظیموں نے اصل میں ان لوگوں کے لیے کام مشکل کر دیا جو نیک نیتی سے ان مقدس ہستیوں کے متعلق ادبی کام کرنا چاہتے تھے جنھیں شر پسند افراد نے معطون کیا تھا، مگر ایسا نہ ہوسکا بلکہ اصحابِؓ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کا نام لینا بھی ایک مخصوص گروپ سے چسپاں کر دیا گیا۔

ایسی صورتِ حال میں جب کچھ جگہوں اور اداروں نے منقبتی مشاعروں کا آغاز کیا تو ملک کے طول و عرض میں بہت سے اہلِ قلم نے اپنے اپنے علاقوں میں اس کا خیر مقدم کیا اور ان میں شمولیت کی۔ یہ شمولیت کسی لالچ، طمع، یا کسی طبقۂ فکر کو انگیخت کرنے کے لیے نہ تھی بلکہ اپنی اپنی محبتوں کے نذرانے

تھے جو اِن مقدس ہستیوں کی شان میں لکھے اور پڑھے گئے اور دیانت دارانہ ان ہستیوں کا دفاع مقصود تھا جن پر رقیق حملے ہو رہے تھے، یہ بھی سچ ہے کہ کئی جگہ ان سادہ لوح قلم کاروں کو اپنے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرنے کی سعی کی گئی، مگر یہ ناکام ہوگئی۔ کچھ ایسی تاریخی شخصیات کو بھی ساتھ ہی نتھی کر دیا گیا جن کے متعلق سنجیدہ طبقہ خاموشی کو ترجیح دینا پسند کرتا ہے، لہٰذا یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ویسے تو اصحابِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کی کردار کشی کوئی نئی بات نہیں ہے، مگر موجودہ دور میں اس میں تیزی آئی، اس کے عوامل کچھ مقامی ہیں، کچھ بین الاقوامی۔ حالاں کہ اس رویے پر بہت سے معتدل مزاج افراد نے اس روش پر ناگواری کا اظہار کیا زیادہ تر نے خموشی میں ہی عافیت جانی، مگر کچھ اہلِ سخن نے قلمی دیانت داری کا ثبوت دیا اور ان معزز شخصیات کی تعریف و توصیف میں قلم اُٹھایا اور اپنا فرض ادا کیا۔ اس راہ میں سب سے بڑا سنگِ میل علامہ محمد اقبال تھے، ان تمام اہلِ ہنر کا مقصد ہرگز کسی فرقے، کسی خاص طبقے کا رد نہ تھا بلکہ صرف اور صرف اپنا حقِ محبت و مودت ادا کرنا تھا، مگر پھر بھی اسے تشکیک کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس پر بہت اعتراضات اُٹھائے گئے حالاں کہ یہ خالصاً ان شخصیات کے کارناموں سے روشناس کروانے کی ادنیٰ سی کاوش تھی۔ کہیں کہیں لہجہ تلخ اگر ہوا تو کسی شرم ناک اور تکلیف دہ الزام یا افترا کے جواب میں ہوا، وہ بھی کسی ناموزوں اور دریدہ دہن مقرر کی بدزبانی سے کبیدہ خاطر ہو کے ہوا۔

اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اُمت میں اختلاف موجود ہے اور بہت سے لوگوں کا رزق ہی اس اختلاف کو ہوا دینے سے منسلک ہے سو، وہ اپنی روزی روٹی کے لیے ہر ممکن اقدام کو تیار رہتے ہیں۔ اُنھیں مکمل آشیر باد بھی ملتی ہے۔ ان لوگوں سے جو اپنے علاوہ سب کو گمراہ سمجھتے ہیں یا مذہبی تفاخر کا شکار ہیں۔ اُنھیں صرف اور صرف اپنے عقیدے، مسلک، اپنی سوچ کی ترویج اور پرداخت کی فکر رہتی ہے اور دوسروں پر زبردستی خیالات ٹھونسنے کی پڑی رہتی ہے۔ انتہا پسندانہ اسی رویے نے بہت سی خرابیاں پیدا کی ہیں۔

خود ہی سوچیے کہ اسلام کی متبرک و مقدس ہستیوں پر ہرزہ سرائی، بہتان بازی، تبرا، اور ایسی دوسری واہیات اور منفی سرگرمیوں کی بہتات میں مناقب لکھنا اور اُنھیں مجمعِ عام میں پڑھنا کیا ایک ہی سطح پر گردانے جائیں گے، جب کہ مؤخر الذکر میں کسی قسم کی گستاخی کا شائبہ تک نہ ہو یا دریدہ دہن مجہول لوگوں کی اگر کبھی مذمت بھی کی جائے تو اس میں کیا امر مانع ہے۔ ان مناقب میں جہاں جہاں اور جس جس جگہ موقع ملا ان شخصیات کو شامل کیا گیا ہے جو لائقِ احترام ہیں اور یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ شعری وفور میں اپنی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ان منقبتی اشعار میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی بزرگ شاعر کی خواہش پر

خاص مواقع پر کہے گئے تھے، لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ زمین وآسمان کے قلابے نہیں ملائے گئے پھر بھی اس انتخاب میں اگر کوئی سہو ہوا ہے تو اس کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ ہیں۔

آخر میں کچھ اشعار جو مختلف شعرائے کرام کے ہیں حوالے کے طور پہ پیش ہیں تا کہ مناقب کی روش پہ روشنی دالی جاسکے؛

یارب جھلک دکھادے مجھے اُس شہید کی
جس نے لہو پہن کے محرم میں عید کی (اقبال ساجد)

اے دشتِ کربلا تری کھدر زمین پر
پیاسا تڑپ کے سو گیا ریشم حُسین کا (صادق جمیل)

تین دن چشمِ ابو بکر کی قسمت میں رہی
ایسی لذت جو روایات میں مذکور نہیں

یا علی ورد کیا،نفس پہ غالب آیا
اسم کی قوّتِ تسخیر عیاں ہو کے رہی

کربلا انسان کے سینے میں یوں رکھ دی گئی ہے
اِک منٹ میں دل دھڑکتا ہے بہتر مرتبہ (مسعوداختر)

نسلِ صدیق ہو ں اور پہرہ ٔ سادات پہ ہوں
ہر زمانے میں مجھے سانپ ڈسا کرتے ہیں (ابوالحسن خاور)

وہ پہلی سامعہ پہلی وحی کی دُنیا میں
اکیلی آپ تھی اُمت خدیجۃ الکبرا

تصدیق کون کرتا ہےخوشبو کی پھول سے
صدیق نے دلیل نہ مانگی رسول سے

جو کہہ دیا رسول نے تم بھی وہی کہو
مولا علی کہا ہے تو مولا علی کہو

اب عُمر جیسا کوئی کیا ہوگا
کون فاروق دوسرا ہوگا

جب نبی کی دُعا نے گھیرا اُسے
وہ تو حیران ہو گیا ہوگا (واجدامیر)

راحتیں تیرے ہی نعلین کے صدقے میں ملیں
مشکلوں کو تِرے داماد نے ٹالا ہُوا ہے

میری اولاد بھی ہے چاکرِ اولادِ نبی
میرے اجداد نے بھی نوکری سرکاری کی

بو بکر و عُمر ، حیدر و عثانِ محمد، مردانِ محمد
اسلام کے ہیں مکتبِ اول کے علم دار، اے مونس وغم خوار (طاہرمحمودطاہر)

نبی کی ذات کو اب بھی کوئی کانٹا نہ چُبھ جائے
نبی کے پاس سویا ہے بدن صدیقِ اکبر کا

بجھ سکتے ہیں پھر کیسے چراغانِ خلافت
جب حضرتِ صدیق ہیں سلطانِ خلافت (سلطان محمود)

گنوا دیا تھا جو یوسف کے بھائیوں نے کبھی
اُس اعتماد کو عباس نے بحال کیا (شوکت رضا شوکت)

تطہیر سے نکھری ہوئی تطہیر کی جَے ہو
زہرا کا دھنے واد ہو شبیر کی جَے ہو (نادرصدیقی)

ہیں چھوٹے قدَ کی بلندی سے نسبتیں ایسی
بہت سے لوگ جُھکے ہیں برابری کے لیے (کاظم حسین کاظم)

اُس نے آرام سے تالاب میں کنکر پھینکا
پھر کہا: ایسے علی نے دَرِ خیبر پھینکا (احمد شہریار)

اے مشتِ خاک معرفتِ بوُ تُراب رکھ
یہ زَر اگر نہیں تو ابوذر بھی کچھ نہیں (سلمان حیدر)

یہ احترام بھی یارانِ مصطفیٰ سے ملا
غُلام اُونٹ پہ بیٹھا ہے اور عُمر پیدل (محمود ہاشمی)

جو دیں نبی نے دیا تھا حُسین تک آیا
جو دین ہم کو ملا ہے وہ اب حُسین کا ہے

لکھا تھا خط میں جو دریائے نیل جان گیا
وہ جس کا حکم لرزتا پہاڑ مان گیا

اہلِ عرب نے میرے نبی کا کہا سُنا
بوبکر ہے وہ جس پہ صداقت تمام شُد (صغیر احمد صغیر)

درِ زہرا کا ہو جتنا بھی ادَب تھوڑا ہے
بہرِ تعظیم یہاں ہر کوئی ڈھب تھوڑا ہے (شکیل نقش بندی)

جس جس کی زباں ذکرِ ابوبکر سے تر ہے
اس اس پہ شہنشاہِ دو عالم کی نظر ہے

کیسے کسی ظالم کا تبرّا تجھے پہنچے
جب گردِ لحد گشتِ درود آٹھوں پہر ہے

درِ عمر پہ جبینوں کو آن رکھتے ہیں
تبھی طیورِ تخیل اڑان بھرتے ہیں

یہ خوابِ حضرتِ فاروق کا نتیجہ ہے
جو مسجدوں میں مؤذن اذان دیتے ہیں

اُس ذات پہ نشتر زنی ؟ توبہ ارے توبہ
دامادِ پیمبر ہے ، وہ ہم زلفِ علی ہے

تکتے ہیں فقیر آج بھی تیرا درِ دولت
ہر ایک صدی تیری سخاوت کی صدی ہے

جب کر دیا حضور نے اونچا علی کا ہاتھ
پھر ہر کسی نے تھامنا چاہا علی کا ہاتھ

اللہ کی صفات کے مظہر ہیں یہ تمام
چہرہ، نظر، قدم، لب و سینہ، علی کا ہاتھ
(حافظ محمد ابوبکر تبسم)

رحلِ زانو پہ ترے مصحفِ ناطق ہے کھلا
کیوں سکینہ نہ ترے دل پہ ہو نازاں صدیق

باطل کو پھونک دوں گا معظم میں پھونک سے
سینے میں میرے آتشِ الفت عُمر کی ہے

تمھارے چہرے کو تکنا بھی ہے ثواب علی
تمھاری دید ولایت کا ہے نصاب علی
(معظم سدا معظم)

جان اپنی ہتھیلی پہ ہے شانوں پہ نبی ہیں — تاحشر ترا ہم پہ یہ قرضہ ہے ابو بکر
اپنے پھولوں کو اور مہکائیں — نام رکھ کر بنامِ آلِ رسول
(ظہیر مفتی)

ثانی اثنین ترے ذکر کا سرنامہ ہے — یعنی قُرآن نے خود دی ہے شہادت تیری
ادب کی ذیل میں یہ اہتمام واجب ہے — بہ ذکرِ آل پیمبر سلام واجب ہے
(جُنید نسیم سیٹھی)

وہ سُنی ہوں علی کو فخر سے مولا سمجھتا ہو
مزید اس پر کہ میں مولا کا ہر معنی سمجھتا ہوں (فائق تُرابی)

نظر آنے لگے چاروں طرف آثار جلوت کے
کبھی جو میں نے خلوت میں پکارا حضرتِ صدیق

از طُفیلِ مکینِ کرب و بلا
آسماں ہے زمینِ کرب و بلا
اے فلک ایڑیاں اُٹھا کر دیکھ
رفعتِ زائرینِ کرب و بلا (حسنین مظہری)

یہ تو صدیق کی سُنت کی عمل داری ہے
ورنہ جبریل کہاں ٹاٹ سجا کر آتا
رشک کرتے ہیں فرشتے بھی ابو بکر پہ آج
اُس نے سرکار کو شانوں پہ اُٹھا رکھا ہے (حماد زیف)

شکر اللہ کا ہے سایۂ توقیر میں ہیں
یہ جو ہم لوگ سبھی خیمۂ شبیر میں ہیں (محی الدین قادری)

صحابہ، اہلِ کسا سب تھے معترف لیکن
ہے اُن کا ذکر ابھی تک اُدھار اُمت پر (عثمان غنی)

اور بہت سے اشعار جو تھوڑی سی کوشش سے جمع ہو سکتے تھے یا جو ہم تک نہیں پہنچے مگر شعری فضا کا حسن ہیں۔ تقدیسی ادَب اُن سے جگمگا رہا ہے اور یونہی مہکتا رہے گا ان شا اللہ۔

□□□

وہ کہ معراج کی تصدیق سے صدیقؓ ہوا
تا ابد زندہ و پائندہ صداقت اُس کی
(جلیل عالی)

اردو ادب میں منقبت نگاری کی اصطلاح اور اس کی ہیئتیں

پروفیسر سیّد ضمیر حیدر

ABSTRACT: This study offers a comprehensive exploration of MANQABAT—devotional poetry in praise of the Prophet Muhammad's family and the infallible Imams—within the diverse structural forms of Urdu literature, including Masnavi, Qasida, Rubai, Ghazal, Haiku, and others. Drawing on a wide array of poetic examples, Dr. Syed Zamir Haider demonstrates that manqabat has not only permeated every major poetic genre but has also sustained its intellectual, aesthetic, and spiritual depth over more than two centuries. While the article abstains from critical theorization or analytical discourse, its extensive cataloguing of poetic instances compellingly affirms MANQABAT's enduring presence and adaptability across literary forms. In doing so, it subtly argues that this genre, far from being confined to any single style or period, represents a vital and persistent thread in the fabric of Urdu literary tradition over the past 200 years.

جس طرح تقدیسی ادب میں حمد و نعت کے لیے کوئی مخصوص ہیت نہیں، اسی طرح سے منقبت لکھنے کے لیے بھی کوئی خاص ہیت مقرر نہیں اور نہ ہی شاعری کا خاص موضوع مقرر ہے۔ غالب کی ایک غزل پڑھتے ہوئے یہ شعر سامنے آتا ہے۔

مشکیں غلافِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے

کیا خوب صورت مضمون اور نکتہ ہے۔ غزل کی تعریف میں بتایا جاتا ہے کہ ہرنی کی ناف سے جب

مشک کی خوشبو پھوٹنے لگتی ہے تو وہ اس خوشبو کی تلاش میں اپنے ہی گرد چکر کاٹنے لگتی ہے، خود سے غافل پا کر جنگلی جانور یا بھیڑیے اس پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، تو وہ خود کو ان درندوں میں گھرا پا کر ایک دردناک چیخ مار کر بھاگتی ہے، اسی دردناک چیخ کو غزل کہتے ہیں۔

اب غالبؔ مقامِ پیدائشِ علی علیہ السلام کو نظر میں رکھتے ہوئے تمثیل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح ہرن خوشبو کی تلاش میں اپنے گرد چکر کاٹتی ہے، اسی طرح حاجی خانہ کعبہ کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور خدا کو تلاش کر رہے ہیں۔

جنگِ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے کہ کل میں علَم اس کو دوں گا جو مرد ہوگا۔ غزل کا ایک مطع یوں ہے:

دھمکی میں مرگیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

ایک اور غزل منقبت میں

کل کے لیے کر آج نہ خشت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثرؑ کے باب میں

اس غزل کے مقطعے نے جہاں بہت شہرت پائی، وہیں غالب پر مشرک ہونے کا فتویٰ لگا۔ مقطع یہ ہے:

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

دیوانِ غالب میں مناقبِ جناب امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام بشکلِ قصائد موجود ہیں۔ اردو ادبیات کے اولین ادوار پر نظر ڈالیں تو ہمیں دکنی دور میں منقبت یا تو رباعی کی ہیت یا مثنوی کی شکل میں ملتی ہیں، مثلاً ملاوجہی کی تصنیف کردہ مثنوی قطبِ مشتری میں 151 اشعار منقبت میں درج ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

توں جگ کا پیارا توں جگ کا ادھار　　خدا کا توں ہمدم نبیؑ کا توں یار
عجب اژدہا ہے ترا ذوالفقار　　کہ یکدم سوں جالیا ہے سالم کفار
بڑا توں ہے ترے سب یو کام　　خلافت ہوئی ختم تجھ پر تمام
علی کا محب نیں جکوی سچ تو جان
حرامی پنے کا وہی ہے نشان

پہلے صاحبِ دیوان شاعر **قلی قطب شاہ** کے کلیات میں چھے مناقب ہیں۔ پہلی منقبت کا مطلع:

آدھار دے آدھا راب تج بن نہیں کوئی یا علی
مجھکوں سنبھالنہا راب تجھ بن نہیں کوئی یا علی

ان مناقب کے ساتھ، مدحِ بی بی فاطمہ صلوات اللہ علیہا درج ہے۔ معلوم ہوا، کہ قدیم شعرا، حمد خدائے بزرگ و برتر کے لیے، نعت رحمت للعالمین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اور منقبت کی اصطلاح صرف اور صرف حضرت علی علیہ السلام سے مخصوص کی تھی، بقیہ خانوادۂ رسالت کے لیے **درمدح** استعمال ہوتا تھا، ملاحظہ فرمائیں:

دَرمدحِ بی بی فاطمہ صلوۃ اللہ علیہا غیر مردف مطلع، منتخب شعر اور مقطع:

ازل تھے بی بی فاطمہ بھاگ ساجے   کہ جلوے دمامے عرش میانے باجے
اچائے عرش چوکی بی بی تائی   کہ حضرت بی بی ہیں بیبیاں سیس تاج
قطب شاہ نبی داس تن پن تھے ہے
توں او ناتوں کے دھاک تھے دندے بھاجے

قلی قطب شاہ نے منقبت میں رباعیات بھی کہی ہیں، ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

مروی جو پوچھے گا تو علی تھے جا پوچھ
اسرار چھپے سینجلی تھے جا پوچھ
گر پیاسا محبت کا اے تو قطبا
او چشمہ کوں توں علی ولی تھے جا پوچھ

نواب صدرالدین محمد خان فائز دہلوی جنھیں شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے، ان کے دیوان میں موجود مثنوی سے ''درمدح شاہ ولات علیہ الصلوٰۃ والسلام'' سے منتخب اشعار:

شاہِ ولایت اسد اللہ علی   اس سے ہے اسلام سراسر جلی
دینِ نبیؐ کا اس سے ہوا جلوہ گر   اس کی جسے مہر نہیں قَدْ کَفَر
ہے بہ خلافت وصیِ مرتضی   بابِ حسین و حسن مجتبی
لحمک لحمی ہے اسی شان میں   دوستی اس کی نبیؐ کی جان میں
بھائی پیمبر کا ہے زوجِ بتول   صاحبِ میر وفترِ اہلِ قبول
قاتلِ کفار نہیں جز علی   سرورِ عالم کا جہاں میں وصی
توڑ کر صف کفر کی صفدر ہوا   چیر کر اژدر کے تیں حیدر ہوا
علم اسے علمِ نبی کا تمام   بابِ مدینہ کہا خیر الانام

جس نے پیا منھ کا نبی کے لعاب علم کا وہ کیوں نہ ہوئے جگ میں باب
اور نہیں دہر میں مشکل کشا کام کرے سب علی مرتضیٰ
باغ محبوب خدا وو ریحانتین اس کے دو فرزند حسن اور حسین
شبر و شبیر نبی کے عزیز جن سے کیا اہل حسد نے ستیز
حضرت زہرا تھیں بضع الرسول اس کے منافق ہیں سبی دیو وغول
خیر النسا جس پر نہیں مہر باں لعن کرے اس کو خدائے جہاں
سر الٰہی سے ہے واقف علی رتبے میں ہم پلّہ ہے وو با نبی
واقف آیات کلام خدا کون ہے جز حیدر مشکل کشا
خسرو آفاق ہے وو بوالحسن معتقد اس کے سبھی ہیں مرد وزن
جو نہیں دنیا میں علی کا غلام دوزخ سوزاں میں ہے اس کا مقام
مہر علی کے ہے جسے دل کے بیچ خوف سے محشر کے اسے غم نہ ہیچ
میر عرب شاہ عجم ہے علی ہے بی خلیفہ وہ بہ نص جلی
اس کو نبی نے جو دیے ذوالفقار کفر کو معدوم کیا اس نے مار
محرم اسرار رسول خدا کوئی نا تھا جز علی مرتضیٰ
مجھ کو ہے وو عرض یہی یا علی کہ آیا ہوں اب مانگنے تیری گلی
فائز بیدل کو سرافراز کر صحت جاوید سوں ممتاز کر

دیوانِ اشرف علی فغاں میں شامل قصائد، درمنقبتِ امیر المومنین علیہ السلام (38)، اشعارِ قصیدہ دَرمدحِ حضرت اِمام علی موسیٰ رضا علیہ التحیہ والثنا اس قصیدے کے آخر میں 5 اشعار درمنقبتِ حضرت علیؑ بن ابی طالب درج ہیں۔ درمدحِ علیؑ موسیٰ رضا علیہ السلام (69 اشعار) چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ازل سے ہے دل آزار یہ استدعا کبھی نہ فکرِ فنا ہو کبھی نہ فکرِ بقا
وہ کون شاہِ خراسان امیر ابنِ امیر امامِ ضامنِ ثامن شفیعِ روزِ جزا
یہی ہے عرض فغاں کی اگر قبول پڑے تری جناب مقدس میں یا امام رضا
کسی کے در کو نا جھانکوں نصیب ہو میرے تجھ ہی سے فائدہ دین وحاصل دنیا
شتاب ہو مرے مولا مرادِ دل حاصل خدا نخواستہ جنبش میں آوے دستِ دعا

علی عادل شاہ کی کلیات شاہی میں قصیدہ نمبر 2 قصیدہ درمنقبتِ حضرت امیر المومنینؑ اور نمبر 3،

قصیدہ درمنقبت دوازدہ امامؑ درج ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اول علی المرتضیٰ، جس نانوں ہے شیرِ خدا ساجے صفت اوس لا فتح جب تیغ لے دلدل چڑھے
دوجا حسن المجتبیٰ سردار ہے ثقلین کا جس سور کی خدمت بدل ہت جوڑ کر حوراں کھڑے
تیجا حسینِ مقتدا مقبول ہے کرتار کا مردود ہیں دو جگ منے اس ذات سوں جو کوئی لڑے
کمل امام چارمی سو پیر زین العابدین ہوئے ہدایت خلق کوں منبر اُپر جب وو چڑے
باقر امام پنجمیں سو بحر و بر ہے دین کا جس کوں کرے تعلیم جب کس چیز میں وو نا اڑے
جعفر امام ششمی استاد ہے ہر علم کا جتنے معلم دین کے اس تے ہوئے سارے بڑے
کاظم امام ہفتمی تس ذات کی تاثیر تھے ہوئے زمیں سب زر گہر جس دھرت پر سایا پڑے
ہشتم علی موسیٰ رضا جس کی کرامت سوں سدا یک پل مینے پاوے شفا مشکل مرض جے پڑے
نہم امام متقی تس نانوں ہے جگ میں تقی جس کوپ کی یک دشٹ سوں جیتے شقی سارے ڈرے
دہم نقی ہین کہ داں کرتار کے ہر رمز کا تس کی محبت جن دھرے اس کوں ادھک عزت چڑے
ہے یاز دہم عسکری تس کوں ساوے سروری جسے کفر میں سردار تھے تس دھاک تے سب گر پڑے
مہدی اچھے صاحب زماں سو ہے امام بارھواں سارے جہاں کے لوگ سب تس نانوں کا خطبہ پڑھے

چاروں پہر، دن رات مل بت چت لگا یک دہیان سوں
شاہی ورد کر عشق سوں یو منقبت دائم پڑے

شاہی نے ایک مثنوی خیبر نامہ کے عنوان پر 72 اشعار پر مشتمل قلم بند کی ہے، آخری دس اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اتھے سات قلعے انھوں میں قموس جسے شاہ مرداں لیے آ خصوص
یہودی جتے تھے ہوئے سر نگوں غنیمت لگی ہات حد سوں فزوں
فتح کر قلع کوں شہنشاہ سور پھرے لے کے لشکر پیمبر حضور
پیمبر خبر سن کہ خوش حال دل ہوئے تو انگے آ علی شہ سوں مل
بڑی مرحمت کہ کہیے یوں رسول ہوا ہے تیرا کام حق کن قبول
خبر اس فتح کی ہوئی جو مبیں دو عالم نے تج پر کیا آفریں
جگت میں نہیں تج سار کا توں شاہ غضنفر بڑے بھار کا
جتے پیر پیراں میں تو وہور ہے تیرا ہور نبی کا ج یک نور ہے
نبی کے پچھے سب میں تج ہے شرف وو شاہ رسولان، تو شاہ نجف

تیرا یادن رات شاہی کا کاج　　تیرے فیض سوں ہے اسے تخت و تاج

☆ **شیخ ظہورالدین شاہ حاتم** کے دیوان زادہ میں ایک **مخمس** در وصف مرشداں 1139ھ درج ہے۔ کل بارہ بند ہیں۔ ذیل میں منتخب بند ملاحظہ فرمائیں۔

یا امامِ جہاں و مہترِ دیں　　زیر تیرے قدم کے خلدِ بریں
ماہ و خورشید و آسمان و زمین　　سب کہیں ہیں یہی بہ صدق و یقیں
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

کچھ زباں سے تیرے ہوا نہ نزول　　غیر قال اللہ و قال رسول
تم ہو دونوں جہان کے مقبول　　دل سے کہتی ہے ہر کلی ہر پھول
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

شک نہیں آلِ مصطفیٰ ہو تم　　خاص فرزندِ مرتضیٰ ہو تم
حق سے کب ایک دم جدا ہو تم　　مری کشتی کے ناخدا ہو تم
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

تم میں خوئے حسین و خلق حسن　　ہے یہاں آفتاب سے روشن
شاہ زین العباد کے تن من　　اور باقر کے تم ہو نور نین
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

تم تو صادق کے دل کا ہو پیوند　　موسیٰ کاظم کی ہو نگہ میں پسند
علی موسیٰ رضا کے ہو فرزند　　ہر طرف سے یہی ہے بانگ بلند
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

سیّدہ پاک و جسم و جانِ تقی　　عین معصوم و ہم خیالِ نقی
سیرتِ عسکری عیاں ہے سبھی　　تم میں سب ہیں خوارقِ مہدی
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

تم محمدؐ کے ہو چرن بردار　　میں چرن پر ترے ہوا ہوں نثار
کیوں نہ پاؤں جہاں میں عز و وقار　　کہ میرے تم ہو وارث و سردار
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

حاتم اب تک تھا ناقص و جاہل　　تم کو پایا ہے مرشدِ کامل
تجھ غلامی میں حق کیا حاصلِ　　یا سخی شاہ بادل باذل
یا محمد امیں کمیں نہ غمیں

☆ **میرزا مظہر جانِ جاناں** کے کلام میں صرف ایک شعر منقبت میں ملا:

علی کے نانو کی تسبیح ورد کر مانگا
ہزار شکر کے دانا امام پایا ہے

☆ **شاکرناجی** کے دیوان میں موجود پہلے مرثیہ کے ابتدائی دو شعر در مدحِ حضرت امام حسینؑ میں ہیں۔

گل ہے تو، باغِ رسالت کے چمن کا یا حسین
شمعِ روشن مصطفیٰ کی انجمن کا یا حسین
خاتمِ ختمِ ولایت کا تو ہے دُرِّ نجف
لعل ہے تو حضرتِ زہراؑ کے من کا یا حسین

☆ **میر عبدالحی تاباں:** دیوانِ تاباں میں ایک مخمس سات بندوں پر مشتمل ترکیب بند میں ہے۔ پہلا بند ملاحظہ فرمائیں:

رات دن رہتا ہوں میں اندوہِ غم میں مبتلا　　چرخ سے ہرگز نہیں ہوتی مری حاجت روا
بلکہ اس کے ہات سے نالاں ہی رہتا ہوں سدا　　تم شتابی حل کرو عقدہ مِرا مشکل کشا
یا علی یا حیدرِ کرار یا مشکل کشا

☆ **شوق لکھنوی:** حکیم تصدق حسین خاں نواب مرزا شوق نے اپنی مثنویات میں مناقبِ حضرت علیؑ نظم کیے ہیں، ان کی تصنیف کردہ مثنوی فریبِ عشق سے چند اشعار:

بعدِ احمد علی کے لکھ اوصاف　　نہ روکی تیغ جس جی روز مصاف
آبرو دونوں نے برابر دی　　تیغ حق نے نبیؐ نے دُختر دی
دھوم اس تیغ کی ہے عرش تلک　　ضربِ حیدر سے کانپتے ہیں ملک
جب کیا فتح قلعۂ خیبر　　تھی یہی ذو الفقار زیبِ کمر
ماسوا اس کے کیا یہ اوج ہے کم　　دوشِ احمد پہ تھے علیؑ کے قدم

☆ **ولی دکنی:** ولی دکنی کی کلیات میں بھی قصیدہ در منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ 33 اشعار اس کے بعد جو قصیدہ ہے، وہ ہے 'در مدحِ بیت الحرام' منقبتی قصیدہ سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہوں چرخ کا نیرنگ　　ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ
ہو دست گیر مجھے یا علی ولی اللہ　　کہ اس فلک نے کیا ہے کمال مجھ کوں تنگ
وہ شیرِ حق کہ جہاں میں وہ ناصرِ دِیں ہے　　کہ جس صدا سوں ہیں وحشی جنگل کے مست و تنگ
خدا کے حکم سوں ہر پہلواں پہ ہو غالب　　گر آستانے پہ آ اس کے سر گھسے جیوں سنگ

خدا نے اس کوں دیا مرکب ایک دُلدل نام — گیا دریا کوں جو یک پل میں لاکھ بار النگ
بجائے سرمہ اگر خاک اس قدم کی لے — نین میں دل سٹیں تیز رو جگت کے ترنگ
شکستہ دل کوں مرے وبچھ مومیائی ہے — کہ نام پاک ہے اس کا مدام صیقل زنگ
اسی کی آل پہ نت ہے ولی بلا گرداں — کیا چراغ یہ اس کے مدام جی کوں پتنگ

☆ **داؤدؔ اورنگ آبادی** (متوفی 1168ھ) جو اپنی تعلیٰ میں میں شعر کہتے ہیں:

علی کی قسم ہے سن شعر تیرا
کہے عالم ولی ثانی یہ ہی ہے

منقبتِ علی کرم اللہ وجہہ کی یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں:

ہم وصفِ علی میں جینا یاری دیکھے — آرائیش کثرت میں جدا ئی دیکھے
دیکھا دیکھا جدا نہ دیکھا واللہ — در پردہ ہم بندے کی خدائی دیکھے

☆ **سراجؔ اورنگ آبادی** (1127-1177ھ) کی کلیات میں، مناجات کے عنوان پر ابتدائی اشعار درج کرر ہا ہوں، جس میں چہاردہ معصومین علیہم السلام سے توسل کر کے وہ بارگاہِ خدا میں یوں ملتجی ہیں:

یا الٰہی حشر میرا ہو پیغمبر کے سات — اور بتول فاطمہ اور حیدر وصفدر کے سات
دُشمنوں نے زہرِ قاتل میں کیے جسکوں شہید — وہ امامِ دِیں حسن ابنِ شہِ خیبر کے سات
نورِ چشمِ مصطفیٰ و مرتضیٰ و فاطمہ — وہ حسینِ تشنہ لب سردارِ دِیں پرور کے سات
جو رہا ہفتاد و تن پیچ بانی یادگار — شاہ دیں زین العابدیں جانِ علی اکبر کے سات
عاصیوں کے حال پر ہے رحم کر جس کوں نظر — زبدۂ آفاق یعنی حضرت باقر کے سات
مرجعِ ہر چار مذہب مصدرِ آیاتِ دیں — صادقِ قولِ حقیقت حضرتِ جعفر کے سات
حق و باطل کو کیا جس نے جدا جیوں روز وشب — حضرت موسیٰ کاظم حامیِ محشر کے سات
نورِ قندیلِ خراساں آفتابِ ہشتمیں — وہ علی موسیٰ رضا شاہِ مہ و اختر کے سات
گوہرِ درجِ سیادت ماہِ برجِ مکرمت — وہ تقی روح مجسم انوار و اطہر کے سات
جس کے چہرے پر نمایاں ہے جمالِ احمدی — شاہِ دیں حضرت نقی آئینۂ انور کے سات
عرش جس کے بیٹھنے کا فرش ہے کرسی ہے تخت — خسروِ عالی مراتب حضرتِ عسکر کے سات
قائم آلِ محمد خاتمِ اثنا عشر — ہادیِ دیں مہدیِ آخر زماں سرور کے سات

مخمس کا ایک بند (در مدح پنجتن)

عشق ہے عشق کی تصویر محمد آیا ۔۔۔ عشق ہے عشق کہ حیدر کی صفت دکھلایا
عشق ہے عشق کہ خود فاطمہ کہلایا ۔۔۔ عشق ہے عشق کہ حسنین کی صورت پایا
عشق ہے عشق کہ خود واقفِ عرفان ہوا

کلیات سراج میں درنعت حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عنوان ہے۔ درصفتِ چار یار/ یعنی یہاں بھی منقبت کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی۔

☆ **میر حسن:** میر حسن دہلوی اپنی تصنیف کردہ مثنویات سے مشہور ہیں' گلزار ارم' حمد و مناجات اور نعت کے بعد سرخی ہے 'منقبتِ کرار غیر فرار (لا فتی الا علی لا سیف الا ذو الفقار)'۔ صرف تین اشعار:

علی اس کا وصی شیر دلاور ۔۔۔ اکھاڑا جس نے ایک حملہ میں خیبر
محمد بن نہیں کوئی اس کا ثانی ۔۔۔ یہی اک بات ہے باقی کہانی
نبی کی آل کا جو ہو رہے، ہے ۔۔۔ خدا بندا اسے اپنا کہے ہے

مثنوی در وصف قصر جواہر سے 'در منقبتِ شمعِ حرم کبریا بمصدق انا مدینۃ العلم و علی بابہا'
مثنوی کے اس حصہ میں میر حسن دہلوی اپنی عقیدت کا برملا اظہار کر رہے ہیں پہلا شعر:

در اس کا ہے وہ جو علی ولی
وہ شیر خدا اور وصی نبی

چند اشعار کے بعد اپنی آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کی تصدیق میں، سعدی شیرازی، کے اشعار شامل کیے ہیں:

تصدق ہوں میں بر سرِ اہلِ بیت ۔۔۔ میں دل سے ہوں خاک درِ اہلِ بیت
اسی در کا ہوں ازل سے فقیر ۔۔۔ ہے ایماں مرا قولِ سعدی پیر
'خدایا بحق بنی فاطمہ ۔۔۔ کہ بر قولِ ایماں کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول ۔۔۔ من دست و دامانِ آلِ رسول'

میر حسن دہلوی کی مشہور زمانہ مثنوی 'سحر البیان' منقبت امیر المومنینؑ میں اٹھارہ اشعار موجود ہیں۔

☆ **میر غلام حسین** (میر حسن دہلوی کے والد بزرگوار) ادبی دنیا میں میر ضاحک کے تخلص سے جانے جاتے، ان کے تصنیف کردہ قصیدہ در مدحِ جناب امیرؑ سے چند اشعار، ان اشعار میں میر ضاحک نے 'غلام' تخلص کیا ہے۔

سلام تم کو مسلم ہے یا امیر کبیر امیر کل امیر و وصی روز غدیر
خدا کے علم کے دیوان کا مخمس ایک محمد و علی و فاطمہ شبر و شبیر
خدا نے خسرو ہر دو جہاں رسول کیا اسی رسول کے دونوں جہاں میں تم ہو وزیر
تمھاری تیغ کی برش کا بیاں بولوں کیا کوہ، دوپارہ چھری سے مثل شہپیر
خدا کے علم کے عالم ہو یا علی علام علوم دین کے مصحف کی ہو بحق تفسیر
سلام کرتا ہے جبریل تم کو جھک جھک کر امین وحی خدا مصطفیٰ کے خویش و مشیر
کرے ہے عرض شہا تجھ جناب میں یہ غلام حسین کا ہے تیرے عبد یہ حقیر و فقیر

☆ **الٰہی بخش معروف** کے دیوان سے ایک غزل:

اگر منظور ہے پینا مئے وحدت کے ساغر کا لیا کر نام ہر دم حضرتِ ساقیِ کوثر کا
تری مے کی تمنا میں بنا دل ورنہ اے ساقی جسے کہتے ہیں شیشہ وہ بھی اک ٹکڑا ہے پتھر کا
کبھی گر خاک تیرے نقشِ پا کی دل سے وہ ملتا تو شکلِ آئنہ دل صاف ہو جاتا سکندر کا
تری دوری سے ہم جس آتشِ سوزاں میں جلتے ہیں جو دیکھے دور سے تو آب ہو زہرہ سمندر کا
علم کا اس کے اے معروفؔ سر پر میرے سایہ ہے نہیں ہے ایک ذرّہ غم بھی مجھے خورشیدِ محشر کا

☆ **میر تقی میر:** کلیاتِ میر، مرتب ڈاکٹر عبارت بریلوی، میں منقبت حضرت علیؑ، قصائد، مخمس اور غزل کی صورت میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک غزل میں ایک قطعہ جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا میں ہے۔

تھی گفتگو ہے باغِ فدک جڑ فساد کی جانے ہے جس کو علم ہے دیں کے اصول کا
دعویٰ جو حق شناس کا رکھے ہے اس قدر پھر جان بوجھ کر ہے تلف حق بتول کا

ایک قصیدہ امام حسینؑ کی مدح میں بھی میر تقی میر کی کلیات میں موجود ہے۔ مکمل غزل منقبت میں ملاحظہ فرمائیں۔

جو معتقد نہیں ہے علیؑ کے کمال کا ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا
عزت علی کی قدر علی کی بہت ہے دور مورد ہے ذو الجلال کے عزّ و جلال کا
پایا علی کو جا کے محمدؐ نے جس جگہ جس جانا تھا لگاؤ گمان و خیال کا
رکھنا قدم پہ اس کے قدم کب ملک سے ہو مخلوق آدمی نہ ہوا ایسی چال کا
شخصیت ایسی کس کی تھی ختمِ رسلؐ کے بعد تھا مشورت شریک، حق لایزال کا
توڑا بتوں کو دوشِ نبیؐ پر قدم کو رکھ چھوڑا نہ نام کعبہ میں کفر و ضلال کا

فکرِ نجات میر کو کیا مدح خواں ہے وہ اولاد کا علی کی محمد کی آل کا

☆ **محمد رفیع سودا:** کلیات سودآ، جلد اول میں جو قصائد ہیں، آپ صرف ان کی سرخیاں ملاحظہ فرمائیں:

قصیدہ درنعت ومنقبت حضرت امیر المومنین اسداللہ الغالب علی ابن ابی طالب

قصیدہ درمنقبت شیر بیشہ شجاعت، میر میدان سخاوت حیدر کرار صاحب ذوالفقار

قصیدہ درمنقبت حضرت امیر المومنین اسداللہ الغالب ابن ابی طالب

قصیدہ درمنقبت امیر المومنین امام المتقین علی ابن ابی طالب صلوٰۃ اللہ علیہ

قصیدہ درمنقبت گل گلزار انماء، نور دیدرسول خدا سروسینہ علی مرتضیٰ اباعبداللہ الحسین صلوٰۃ اللہ علیہ

قصیدہ درمنقبت قرۃ العیون الحسنین اعنی حضرت امام کاظمین صلوٰۃ اللہ علیہ

قصیدہ درمدح قرۃ العین رسول زمان حضرت امام ضامن علی موسیٰ رضا شاہ خراسان

قصیدہ حضرت امام ثامن ضامن علی موسیٰ رضا شاہ خراسان صلوٰۃ اللہ علیہ

قصیدہ درمنقبت فخر دودمان نبوی خلاصہ خاندان مرتضوی امام حسن عسکری صلوات اللہ علیہ

قصیدہ درمنقبت خلیفۃ الرحمن، امام مہدی الہادی آخرزمان صلوٰۃ اللہ علیہ

محمد رفیع سودا نے دیگر آئمہ اثنا عشر کی مدح کو منقبت حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ لکھا ہے، وہ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

مجھ کو چند نہیں شیعہ و سنی سے کام پر یہ سمجھتا ہوں کہ دور میں تھے بارہ امام
ان سوا ہو کوئی ہے وہ امام تسبیح اس تلک جائے سے موقوف ہو اللہ کا نام

(کلیات سودا جلد اول صفحہ نمبر 450)

کلیاتِ سودآ، جلد دوم، مثنوی کے باب میں نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد 'در مناقبِ حصرت امیر المومنین حیدر کرار' میں 28 اشعار ہیں۔

☆ **قائم چاند پوری:** کلیاتِ قائم چاند پوری میں دوسرا قصیدہ 'درمنقبت جناب مرتضوی' میں 150 اشعار میں سے چند اشعار:

میں کیا کیا تھا ترا اے سپہر کج رفتار کہ یہاں تلک تو ہوا میرے در پئے آزار
ہے چرخ کون کہ جس سے طلب کرے امداد وہ شخص ہوئے جو مداحِ حیدرِ کرار
وہ شاہ جس کے غلاموں سے اک دانا شخص اس آسمان کو جو دے پنجہ غضب سے فشار
خوشا وہ دستِ کرم جس کے روبرو دم جود گدا کا ہوئے جو طالع کی یاوری سے گزر
جو مانگے دانۂ ارزاں تو خرمن اس کو ملے جو چاہے ایک تو سو دے، جو سو کہے تو ہزار

بس اب خموش ہو قائم کہ غیر عرض دعا ہے اس مقام پہ اظہار حال کیا درکار

☆ **نظیر اکبرابادی** کی وجہِ شہرت نظم گوئی ہے۔ ان کی تمام مشہور نظمیں مخمس کے پیکر میں ڈھلی ہیں۔

کلیاتِ نظیر اکبرآبادی کے صفحہ نمبر 385 سے منقبت کا آغاز ہوتا ہے، پہلا بند یہ ہے:

علی کی یاد میں رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں علی کا وصف کچھ کہنا سعادت اس کو کہتے ہیں
علی کی مدح کا پڑھنا کرامت اس کو کہتے ہیں علی کے نام کا لینا حلاوت اس کو کہتے ہیں
علی کے حب میں مرجانا شہادت اس کو کہتے ہیں (7 بند)

حضرت علی کا معجزہ (مخمس 29 بند)
خیبر کی لڑائی (مخمس 25 بند)
مناقب شیر خدا (مخمس 6 بند)
زور بازو علی (مخمس 5 بند)

'مدحِ پنجتن' کی سرخی ہے، (16 بند) مگر یہ بھی منقبت میں ہے، صرف تین بند مطلع ہے:

کروں کیا وصف میں، ان کا الم ناک کہ جن کی شان میں آیا ہے لولاک
پھرا جو عرش اور کرسی پہ چالاک کہاں وہ اور کہاں میرا یہ ادراک
چہ نسبت خاک را با عالم پاک

محمد اور علی یاقوت احمر در بحر خدا خاتون اطہر
زمرد لعل ہیں شبیر و شبر جواہر خانۂ قدرت کے اندر
یہی پانچوں گوہر ہیں پنجتن پاک

علی کی دوستی میں جو مرے گا اسی کو باغ جنت کا ملے گا
علی کے بغض میں جو جان دے گا وہ ملعون دوزخ میں جلے گا
کہ جیسے آگ پر جلتا ہے خاشاک

رہوں یاں جب تلک رکھ میری عزت مروں تو کچھ نہ ہو مجھ کو اذیت
پھر آوے جس گھڑی روز قیامت نظیر اپنے کی واں بھی رکھیو عزت
خداوندا بحق پنجتن پاک

مدح پنجتن پاک ترجیع بند میں ہے، اول وآخر چھے بند ہیں، دو بند ملاحظہ ہوں:

ہے دل میں میرے یاد جو بارہ امام کی اور آرزو ہے ساقی کوثر کے جام کی
یہ بیت مجھ کو وِرد ہے ہر صبح و شام کی تسبیح ہزار دانہ ہے اور ان کے نام کی
سمرن مجھے بھلی ہے یہ پنجتن کے نام کی

اے دوستو عجب ہے بنا پنجتن کا نام | جن کے طفیل اتنے بر آتے ہیں سب کے کام
جو ہیں سو ہیں یہی ختم الخیر والسلام | اور میں جو ہوں نظیر تو کہتا ہوں صبح شام

سمرن مجھے بھلی ہے یہ پنجتن کے نام کی

☆ **خواجہ حیدر علی آتش:** کلیاتِ حیدر علی آتش، جلد اول کی دو غزلیں منقبت میں ہیں۔

عاشقِ شیدا علیِ مرتضیٰ کا ہو گیا | دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا
قربِ حق حاصل ہے اس کو مردِ عارف ہے وہی | یا علی پیرو جو تجھ سے پیشوا کا ہو گیا
ساختہ پرداختہ تیری ہے ساری کائنات | حکم حضرت سے وجود ارض و سما کا ہو گیا
وقت مشکل میں کہا جس وقت یا مشکل کشا | سہل چھٹکارا گرفتارِ بلا کا ہو گیا
کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مرے مولا | کعبہ پیدائش سے تیری گھر خدا کا ہوگیا

مومن کا مددگار ہے شاہِ نجف اے دل | حامی ہے تیرا شیرِ خدا لَاتَخَفْ اے دل
بت توڑنے کو دوشِ نبی پر وہ چڑھا ہے | کعبہ کو تولّد سے ہے اس کے شرف اے دل
بے فاصلہ ہے احمدِ مرسل کا خلیفہ | دنیا کے طلب گار کریں حق تلف اے دل
معصوم ہے عیبوں سے زمانے کے بری ہے | وہ لالۂ بے داغ و مہِ بے کلف اے دل
خاکِ نجف اکسیر ہے مومن کی نظر میں | شفاف ہے الماس سے دُرِّ نجف اے دل
آئینۂ تحقیق کا رہتا ہے مشاہد | حق اس کی طرف ہے، وہ جس کی طرف اے دل
لاریب اماموں میں سرآمد وہ ولی ہے | سمجھے نہ مقدم یہ جماعت کی صف اے دل
مدح اسد اللہ میں تقریر نہ ہو بند | دریا کی طرح تا کہ نہ آ جائے کف اے دل
دشمن ہو جو ایسے کا کہے رکھتا ہے آتش | شیطان کے نطفہ سے ہے وہ ناخلف اے دل

☆ **شیخ امام بخش ناسخ:** دیوان ناسخ حصہ اول کی پہلی غزل ہی منقبت حضرت علیؑ میں ہے، مطلع اور چند اشعار:

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؑ کا | روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا
بیعت خدا سے مجھ کو ہے بے واسطہ نصیب | دستِ خدا ہے نام مرے دستگیر کا
ایثار دیکھنا کہ عیاں ھَلْ اَتٰی میں ہے | مسکیں کے بعد ذکرِ یتیم و اسیر کا
پوچھا جو حال تختِ سلیماں سے ایک نے | بولا کہ زینہ ہے یہ علی کے سریر کا
کیوں کر قسیم نار و جناں ہو نہ مرتضیٰ | نائب ہے وہ جناب بشیر و نذیر کا

یا رب حصارِ امن میں رکھیو مجھ مدام مداح ہوں ازل سے شہ قلع گیر کا
ناسخ کا ادعا ہے یہی روز باز پرس میں ہوں غلام شاہِ رسل کے وزیر کا

کلیاتِ ناسخ حصہ دوم کے آخر میں تقریباً 700 اشعار پر مشتمل مثنویِ ناسخ درج ہے اور یہ ولادت باسعادت حضرت علیؑ کے احوال پر مشتمل ہے۔

☆ **انشا اللہ خان انشا:** کلیات سیّد انشا اللہ خان مرحوم در مطبعِ دہلی اردو اخبار 1855 کے پہلے صفحہ پر 'نعت و منقبت' سے چند اشعار:

مولائے جہاں رہبر عشاق محمدؐ
سب عقدہ مشکل میری کھولنے والا

(ق)

امید مجھے ساقیِ کوثر سے ہے جس کے مے جامِ تولا سے مرا نشہ دوبالا
قنبر کو کریں حکم کے جلدی سے خبر لے انشا ہے غلاموں میں مرے اس کو چھڑا لا
زنہار نہ پہنچے کہیں آسیب قیامت اولادِ نبی کے اسے سائے میں بلا لا

☆ **میر مظفر حسین ضمیر** کی بھی ایک مثنوی بنام 'مظہر العجائب' تقریباً 5000 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر تحریر ہے 'بسمہ تعالیٰ، اس مثنوی میں معجزات عجائب وتمثیلات غرائب نظم کیے گئے ہیں۔ اور قصۂ جنگ تبوک اور قصہ القمہ اور مقابلہ با امیر المومنین کرنا اور اعجاز ظاہر ہونا اور ایمان لانا اس کا اور نگ جنگ عشام بدکردار جناب حیدر کرار اور عجائب ایسے ہیں کہ جس کے دیکھنے سے دیدہ دل مومنیں منور ہونگے، لکھنؤ مطبوعہ اثنا عشر 1113 ھجری'۔

☆ **مرزا سلامت علی دبیر:** مرزا دبیر نے بھی اپنے استاد میر ضمیر کی طرح خاصی تعداد میں مثنویات بھی کہیں، جن میں سب سے طویل مثنوی 'احسن القصص' تین ہزار تین سو چودہ اشعار پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے "حال ولادت با سعادت حضرت صدیقہ فاطمہ زہرا صلی اللہ علیہا" بیان کیا ہے۔ ابتدائی چند اشعار:

زمیں پہ کھڑی ہیں صفیں حور کی زمانے میں آمد ہے کس نور کی
نثار اس تجلی پہ جبریل ہے درِ عرشِ اعظم کی قندیل ہے
تجلی ہے اس فخرِ جمہور کی جسے حق نے بھیجی دعا نور کی
تولد کا ان کے عجب روز ہے کہ اس روز کے بعد نوروز ہے
نہ ہوگا ثنا کا کبھی خاتمہ کہو شیعو صلِ علیٰ فاطمہ
اُدھر مرتضا کی خلافت کی عید اِدھر فاطمہ کی ولادت کی عید

بہت تفصیل سے مدح جناب سیّدہ زہرا صلوات اللہ علیہا ہے۔ پھر ’حالِ ولادت باسعادت حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہٗ تفصیل کے ساتھ ہے، جس میں عیدِ غدیر اور عیدِ نوروز اور عیدِ مباہلہ کا بیان ہے۔ پھر ’تہنیت ولادت باسعادت امام دوم حضرت امام حسن علیہ السلام روحی فداہٗ چند اشعار:

خصوصاً عیاں حسنِ قدرت ہے آج جنابِ حسن کی ولادت ہے آج
شبِ نیمۂ ماہِ پروردگار ہوا ماہِ برجِ شرف آشکار
ولادت کا یہ فیض بیشک ہوا کہ یہ ماہ ماہِ مبارک ہوا
یہ رونق کی صورت ہے کس ماہ میں یہ قرآن آیا ہے اس ماہ میں
جناب حسن کا تولد ہے آج امام زمان کا تولد ہے آج
بلافصل یہ ہیں علی کے وصی علی جس طرح جانشینِ نبی
امامِ اُمم بعد خیبر شکن حسن ہیں حسن ہیں حسن ہیں حسن

بہت سے اشعار میں وصفِ امام حسن علیہ السلام نظم ہوئے ہیں، پھر ’بہ تہنیت ولادت باسعادت امام سوم حضرت خامس آل علیہ التحیۃ واثنا روحی فداہٗ چند اشعار:

پیمبر کے گھر عیش وعشرت ہے آج امامِ سوم کی ولادت ہے آج
وہ خوش ہیں نہایت جناب رسول کہ شاخِ تمنا میں آیا ہے پھول
لکھا ہے ہوئے خلق جس دم حسین منور ہوئے نور سے مشرقین
ہر اک نے نبیؐ سے مکرر کہا مبارک ہو یہ لال یا مصطفیٰ

اسی طرح مسلسل نو اماموں کی ولادت، اوصاف اور معجزات نظم ہوئے ہیں۔

☆ **شاہ نصیر:** کلیاتِ شاہ نصیر میں ایک قصیدہ مسدس کی ہیئت میں موجود ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ابتدائی چار مصرعے اردو میں اور بیت فارسی زبان میں ہے۔ منتخب بند اور سرخی ملاحظہ ہو۔

’قصیدہ در منقبت جناب امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ‘

وہ تیرا رتبۂ عالی ہے یا امیرِ امم
کہ تو نے دوش پہ رکھا ہے مصطفیٰ کے قدم
بنا ہے گردۂ تصویر سے ترے آدم
بصورتِ تو کسے را نہ آفرید خدا
ترا کشید و دست از قلم کشید خدا

جہاں ہو یا اسد اللہ! عقل کل حیراں وہاں ہو کیا تیرے اوصاف کا بشر سے بیاں
جو دور بین حقیقت سے دیکھتا ہوں یہاں تو یہ زبان پہ لاتا ہوں یا شاہ کون و مکاں

خطِ کلام کلیم و رخت کلام اللہ
چہ خط چہ رخ چہ جبیں لا الہ الا اللہ

تو آفتابِ حقیقت ہے یا علی بے شک ازل سے ہے متجلی سما سے تا بہ سمک
کہے ہے خلق بہ بانگِ بلند کیا اب تک پڑھے ہے نیر گردوں یہی بہ بامِ فلک

کسے کہ جز خمِ ابرویت اے وصیِ رسول
کند نما ز بمحرابِ کعبہ نیست قبول

کھلا ہے کس پہ یہ پردہ جز احمد مختار خدا ہے شاہدِ معنیِ پردۂ اسرار
جنابِ پاک تری ہے وہ حیدرِ کرّار کہ آپ صانعِ قدرت کہے ہے لیل و نہار

شہے کہ خلقتِ مولا علی اسد در برِ او
نہادہ تاجِ خلافت رسول بر سرِ او

☆ **شیخ ابراہیم ذوق:** دیوانِ ذوق میں شامل دور باعیات پنجتن پاک کی مدح میں۔

اعلیٰ جو علی کی ہے امامت کا مقام
رکھتے ہیں خبر اس کی یہاں خاص و عام
جو لوگ صف اول میثاق میں تھے
پوچھے کوئی ان سے کہ وہ کیسا تھا مقام

سبطینِ نبی یعنی حسن اور حسین
زہرا و علی کے دونوں وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لیے
اے ذوق لگا آنکھوں سے ان کی نعلین

☆ **سعادت یار خان رنگین:** مثنوی ’دل پذیر در منقبتِ اسد اللہ الغالب امام المشارق والمغاب حضرت علی ابن ابی طالب صلوات اللہ علیہ‘ میں 21 اشعار ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہے علی وہ جسے شہِ لولاک کہا کرتے تھے شیرِ ایزدِ پاک
ہے علی وہ کوئی کہ جس کو خدا جانتا ہی نہیں نبیؐ سے جدا

ہے علی باب اور نبی ہے گھر گھر ہوئے بند گر نہ ہووے در
جو نبیؐ سے اسے جدا سمجھے سمجھے وہ اس سے اور خدا سمجھے
پھر علیؑ سے لگا کے تا مہدیؑ سب کو ہر ایک نے بتا رِہ دی
دین کا جو حصار ہے قائم اس کے بارہ وہ برج ہیں سالم
یا الٰہی طفیل ان سب کے مجھ کو اب راہِ نیک دِکھلا دے

☆ **بہادرشاہ ظفر:** کی کلیات میں ایک مسدس ترجیع بند میں ہے کہ جس میں عربی کا شعر بیت میں دہرایا گیا ہے۔کل پانچ بند ہیں،ایک منتخب بند ملاحظہ فرمائیں۔

ہے یا جنابِ پنجتن وصف آپ کا قرآن میں لولاک اور تطہیر ہے آیا تمھاری شان میں
دافع بلا کا تم سوا آتا نہیں ہے دھیان میں یہ میرا وردِ برزباں ہے جان جب تک جان میں
لی خمسته اطفی بها حرا الوباء الحاطمه المصطفیٰ والمرتضی وابناهما والفاطمه

☆ **واجد علی شاہ:** اودھ کے آخری تاجدار جنھوں نے مثنویوں،قصائد کے علاوہ اپنے تصنیف کردہ مرثیوں میں بھی مناقب نظم کیے ہیں۔مثلاً ایک مرثیہ ’درشانِ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام‘ ایک سو چوبیس بند، جسے ابتدائی چار بندوں میں حصرت علی علیہ السلام کے 16 نام نظم کیے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

امیر المومنین شاہِ مکرم نام مولا ہے مگر توریت میں اسم مبارک اور لکھا ہے
کہ لفظ ایلیا، دیکھا اسی صورت سے پایا ہے جو انجیل فرنگی میں ہے اس کو ویسا جانا ہے
کہ ارماشنطیا، اسم معلّٰی نجم روش ہے جو ہے پھر دوسری انجیل، الجا اس میں آیا ہے

کتاب انگلیوں میں ذوالعلام علی دیکھا رخ ژند مجوسان، میں’ملیلا‘ نام تھا پایا
تو پھر جاما سب، نامی میں یہی تھا عبدالاحد جانا صحف میں بھی خلیل اللہ کے، اسلام پہچانا
جو لفظ بت شکن زردشت کے صفحہ میں پایا ہے مہ آباد عجم میں دین خدیو اس شہ کو لکھا ہے

کتاب سرگلوش جو دیکھا اس میں لوفا تھا پایا جہاندار اس میں پھر ہمراہ لوقا سامع دانا
کتاب ہندوان میں بھی خدادوست اور توانا تھا کہیں فیروز کعبہ جلد زرتشی میں تھا اکجا
کتاب وید ہندو میں نظارہ اہل دیں میں بھی فسورہ حیدر وضیغم لکھا ہے سامع ناجی

دساتیرفرس میں ہے شہنشہ نام خوش شہ کا امام المتقین حضرت علی اور بوتراب آیا

کلام اللہ میں صال مع ح المومنین دیکھا خدائے پاک نے ناموں کو ان کے نور گردانا
عجب حسن شہامت ہے کہ صدقے اک زمانہ ہے ازل سے تا ابد دونوں جہاں میں یہ فسانہ ہے

'درحال حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا' ایک بند مدح میں دیکھیے:

تاجِ سرِ نسائے جہاں گوہرِ رسول اکلیلِ فرقِ مریم و حوّا جگر ملول
نامِ علی ہے نامِ خدا افسرِ بتول گلزارِ باغِ سرورِ والاؐ کی ہیں وہ پھول
مثلِ صدف دعا کے لیے لب کشادہ ہیں
اُمّ الامام اُمِ نبی سے زیادہ ہیں

درحالِ امام حسنؑ سے دو بند:

پندرھویں ماہِ پاک کی جس دم ہوئی عیاں ہجرت کا سال تیسرا یا دوسرا تھا ہاں
برجِ حمل سے مہر ہوا اشرفِ جہاں عالم پہ نور و ضو سے ہوا ماہ کا گماں
عربی زباں میں نام تھا شبر امام کا
حضرت حسن زبان زدِ خاص و عام تھا
اپنی زباں چسائی تھی حضرت رسول نے محنت سے ان کو پالا تھا زوجِ بتول نے
فرع بنی جمائی رخِ خوش اصول نے نام ان کا وردِ لب کیا جس ملول نے
فوراً نجات پائی جہاں بھر کے رنج سے
یاں ان کی دل میں اچھی ہے نو لاکھ گنج سے
سبقت نہ کی رسولؐ نے رکھنے میں نام کے اور والدین چپ رہے حضرت امام کے
آئے جو پاس خسروِ خیر الانام کے جبریلؑ بھی تھے آگے رسولِ انام کے
فرمانِ حق دیا کہ یہ شبر ہیں یا نبی
ہارون کے پسر سے بھی بہتر ہیں یا نبی

☆ واجد علی شاہ کے درباری شاعر **آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی قلق لکھنوی** کی تصنیف کردہ ایک سو بیالس بند کی مسدس 'اعجازِ رقم' کے نام سے اپریل 1887 کو مطبع نامی لکھنؤ سے شائع ہوئی، جس میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح ہے۔ بند نمبر 74 سے جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا اور حسنین کریمین علیھم السلام کی مدح ہے۔ ملاحظہ فرمائیں منتخب بند:

بیٹی خدا نے آپ کو دی وہ ذی احترام بڑھ کر ہے جن کا مریم و حوّا سے بھی مقام
فخر النسائے عالم و مخدومۂ انام شوہر امام، باپ پیمبر، پسر اِمام

انسان نقدِ دین اسی در سے پاتے ہیں
بے اذن ان کے گھر میں ملک تک نہ جاتے ہیں

اللہ نے دیا تھا بڑا ان کو اختیار بلقیس کو کہاں یہ میسر تھا اقتدار
تھا رابعہ کو جن کی کنیزی پہ افتخار اور آسیہ سراپاے عصمت کی پردہ دار
کیا کیا لکھوں میں منزلت و شانِ فاطمہ
ربِّ قدیر خود ہے ثنا خوانِ فاطمہ

فرمائے جس کو بِضعَۃُ مِنّی رسول پاکؐ کیوں کر نہ ہوئے کحلِ بصر اس کے گھر کی خاک
یہ عشق تھا کہ ہجرِ پدر میں وہ سینہ چاک رو رو کے چھٹے مہینے میں آخر ہوئی ہلاک
فاقوں میں کی بسر مگر اُف تک کبھی نہ کی طاعت
میں خالق دوجہاں کی کمی نہ کی

خاتونِ جنت آپ کا کیوں کر نہ ہو خطاب جائیں گے خادم آپ کے جنت میں بے حساب
شمعِ حریم عفت وعصمت تھیں وہ جناب چشمِ فلک نے دیکھا نہ دامن، یہ تھا حجاب
صوم و صلوٰۃ وِرد یہ تھے زیور آپ کے
حوریں نمازیں پڑھتی تھیں دامن پہ آپ کے

کیا پوچھتے ہو مرتبۂ اشرفُ النسا محشر میں جا کے آپ کا اعزاز دیکھنا
آئے گی جب کہ خالقِ اکبر کی یہ ندا اے اہل حشر آنکھیں کرو بند اک ذرا
آمد میانِ حشر ہے بنتِ رسول کی
آ پہنچی ہے قریب سواری بتول کی

بیٹے حسن حسین سے حق نے کیے عطا مہر سمائے اوج سعادت جو ایک تھا
تو نیر سپہرِ کرامت تھا دوسرا راہِ خدا میں دونوں نے جاں اپنی کی فدا
وہ بے گناہ زہرِ دغا سے ہوا شہید
یہ کربلا میں تیغِ جفا سے ہوا شہید

وہ نیّرین برجِ ولایت قمر رکاب قطبین آسمان امامت فلک جناب
بحرینِ جود نور دہ چشم آفتاب سبطین مصطفیٰ جگر و جانِ بوتراب
گہوارہ آپ جن کا جھلاتے تھے جبرئیل
گودی میں اپنی پہروں کھلاتے تھے جبرئیل

بند نمبر ایک سو آٹھ سے منقبتِ حضرت علی علیہ السلام میں نظم ہوئے ہیں۔ چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

جانِ رسول، ناصرِ دیں، شیرِ کردگار خیبر شکن، وزیرِ نبی، شاہِ ذوالفقار
ماحی مدح معرکہ آرائے کار زار حاجت روائے خلق ید اللہ کرم شعار
خورشید چترِ زَر تھا تو گردوں سریر تھا
دیوان مکرمت کا عطارد دبیر تھا

موسیِ کوہِ حلم و رضا معدن شرف شرح بیان مخبر صادق شہ نجف
بحر کمال گوہر دریائے نہ صدف سردار دین افسر فوج چہار صف
آئینہ دل کا صاف مصفا غبار سے
لبریز سینہ معرفت کردگار سے

جرات میں بے عدیل عدالت میں بے نظیر غیرت میں بے مثال سخاوت میں بے نظیر
ہمت میں لاجواب شجاعت میں بے نظیر خلق و حیا میں فرد متانت میں بے نظیر
وہ ذات تھی غضنفر صحرائے معرفت
حاصل تھی آشنائی دریائے معرفت

وصف علی جناب پیمبر سے پوچھیے الفت کا حال مالک اشتر سے پوچھیے
جرأت کو روح مرحب و عنتر سے پوچھیے طفلی کا زور کلہ اژدر سے پوچھیے
یہ وہ ہے جس نے کافروں کا زور ڈھایا ہے
یہ وہ ہے جس نے نام بتوں کا مٹایا ہے

کیا کیا لکھوں میں مدح بجائے ابوتراب خیرالوریٰ کے دل میں ہے جائے ابوتراب
اللہ کی رضا ہے رضائے ابو تراب قربان مصطفیٰ کے ہوں فدائے ابو تراب
سمجھو جدا علی کو نہ ذات حضور سے
پیدا کیا ہے حق نے انہیں ایک نور سے

☆ **شیخ گوہر علی مشیر لکھنوی** کی مثنوی ریاض عشق سے درمنقبت حیدر کرار:

مع شیر خدا علی ولی مرتبہ ہے ہر اک پہ ان کا جلی
نہ ہوا ہے نہ ہوگا اب پیدا بلکہ کچھ بندے جانتے ہیں خدا
شیر حق زوج فاطمہ زہرا اپنا ہم نام کبریا نے کہا
تیغ اللہ نے عطا کی ہے اور بیٹی رسول نے دی ہے
قاسم رزق جانشین رسول طاعت کبریا میں ہیں مشغول

ہوئے مقتول مرحب و عنتر زندہ مردے بھی کر دیئے اکثر
گھر میں اللہ کے ہوئے پیدا ہے ید اللہ بھی لقب ان کا
دودھ اس وقت مرتضیٰ نے پیا جب لعاب دہن نبی نے دیا
ہو درود ان کی آل پاک پر ہر آن از محمد و تا امام زماں
یا علی بہر خالق یکتا پئے روح رسول اے مولا
بہر خیر النسا پئے حسنین پئے سجاد مالک کونین
بہر ارواح باقر و سجاد پئے موسیٰ کاظم اطہر
واسطہ ہے شہ خراساں کا جو ہے سلطان دیں امام رضا
بہر حضرت نقی امام انام پئے روح تقی امام انام
واسطہ عسکری کا اے ذی جاہ صدقہ میری کا دو جہان کے شاہ
بہر ارواح چہاردہ معصوم بہر انصار سیّد مظلوم
بہر عباس و قاسم و اکبر بہر عون و محمد و اصغر
بہر ارواح دختران بتول ام کلثوم و زینب مقبول
منتظر ہیں تمام اہل یقین جلد ہووئے ظہور مہدی دیں

☆ **مومن خان مومن:** ذوق اور غالب کے ہم عصر مومن خان مومن، جن کی کلیات، مرتبہ عبادت بریلوی، میں شامل قصائد کی ترتیب بمعہ سرخی یوں ہے۔

قصیدہ/حمد باری تعالیٰ

قصیدہ/نعت سرور کائنات

درتعریف حضرت عمر رضی اللہ عنہ

درتعریف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

درمنقبت حضرت علی علیہ السلام

مطلع اول، اور مطلع دوم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہلا دیا عدو کو لہو میں بسان تیغ میری زباں کے آگے چلے کیا زبانِ تیغ
آئی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار لے جاؤ منکروں کے لیے ارمغانِ تیغ
شیرِ خدا علی کی شجاعت سے جس کی ہے سر پنجۂ اسد پہ زنخ زن بتانِ تیغ
کیا بات تیرے پنجۂ آہن فشار کی ورد زباں ہے غلغلہ الامان تیغ

وہ دستِ زور مظہر سہ پنجۂ خدا | وہ تیغ باعث شرف دو دمان تیغ
گرم دعائے شاہ ہو مومن کہ کب سے ہے | آمین سرا زبان اجابت فشان تیغ

کلیاتِ مومن مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ دسمبر 1930 بار ششم کے صفحہ 33 پر 71 اشعار کا قصیدہ در مدح حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر موجود ہے۔ اس سے پہلے مندرجہ بالا قصیدہ کی سرخی ملاحظہ فرمائیں:

’تیزئی زبان کلک گوہر شار، برہان ساطع حقیقت امامت خداوند ذوالفقار‘

امام حسن رضی اللہ عنہ (علیہ السلام) کے قصیدہ سے چند اشعار:

چاہنا خلق کو صہبا و صنم سے محروم | ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم
افضل الناس حسن ابن علی سبط نبی | سیّد و سرور و مولا و مطاع مخدوم
مظہر شان الٰہی ہے یہاں تک کہ حکیم | متزلزل ہے دم بحث وجواب اور لزوم
علم اعجاز اسے معجزہ علم اسے | جس میں اندیشہ ہو عاجز وہ سب اس کو معلوم
سائلوں کو وہ جو دیتا ہے طلب سے پہلے | فرط بخشش سے نہ مجمع رہے کوچے میں نہ دھوم
شبہ کیا عصمت لخت جگر احمد میں | جب مسلم ہو کہ معصوم ہے جزو معصوم
وہ تیرا پایا ہے اے شاہ جوانان بہشت | کہ ہوئی حرمت پیری کی تمنا محروم
مومن آہنگ دعا ختم سخن کا ہے یہ وقت | آپ تو آپ ہیں دانائے قوانین و رسوم

غالب کی منقبت نگاری سے بات کا آغاز ہوا، پھر اردو ادبیات میں منقبت نگاری کی ابتدا ماضی کے معروف شعرا کے دواوین اور کلیات کی ورق گردانی میں ملنے والی منقبتیں اور ہیتوں کو دریافت کرتے ہوئے دوبارہ عہدِ غالب تک پہنچے۔

اس عہد تک، مثنوی، رباعی، قصیدہ، نظم، غزل سلام اور مرثیہ، عروج تک پہنچ گئے تھے، خصوصاً مرثیہ نگار شعرا نے ادبیاتِ اردو میں قدم جما لیے۔ چھنولال دلگیر، میر ضمیر، میر خلیق کے بعد مرزا دبیر، میر انیس، میر عشق، ماہر لکھنوی، سیّد فضل علی وقار، ظہیر دہلوی، شمیم امروہوی، فارغ سیتا پوری، ملا خان بھائی افسر، تمکین امروہوی، بزم آفندی، ناظر حسین ناظر، بہار حسین، فراست زید پوری، آغا شاعر دہلوی، اولاد حسین سجاد، حامد جون پوری، محب محمود آباد، آل رضا، خبیر لکھنوی، گوپی ناتھ امن، محسن زید پوری، دیوی روپ کماری، صفدر علی حسرتی، عزم جون پوری، ممتاز مانوی، نیر بارہ بنکی، جمیل مظہری، سیّد محمد جعفری، زیبا ردھولوی، مہذب لکھنوی، صبا اکبرابادی، جنھوں نے 72 مرثیے تصنیف کیے۔ تقریباً ہر مرثیے میں منقبت نظم ہوئی، نسیم امروہوی، بدر الہ آبادی، جو قصیدہ گو بھی تھے اور محافل مقاصدہ کے روح رواں بھی، کرار جون پوری، منظور رائے پوری، تابش دہلوی، احسن داناپوری، یاور اعظمی (جو قصیدہ گو شاعر بھی تھے) جمیل

نقوی، ظریف جبل پوری، ظہور حیدر جارچوی شاہد نقوی جنھوں نے قصیدہ گوئی میں اجتہاد کیا، مگر علامہ طالب جوہری اور دیگر کلاسکی قصیدہ گو شعرا کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر یاور عباس، ڈاکٹر صفدر حسین، خلش پیر اصحابی، اثر جلیلی، امید فاضلی، ساقی امروہوی، آغا سکندر مہدی، قیصر بارہوی مصطفیٰ جون پوری، نشاط واسطی، اسیر فیض آبادی، عابد حشری، وحید الحسن ہاشمی، ساحر لکھنوی جنھیں پروفیسر کرار حسین مرحوم نے کلاسیکی قصیدہ گوئی کا آخری اور واحد قصیدہ گو قرار دیا، ان کا مجموعۂ قصائد 'صحیفۂ مدحت' بہت اہم مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے ایک تحقیقی مقالہ 'قصیدہ: عربی سے اردو تک ایک اجمالی مطالعہ' درج کیا ہے۔ جس میں انھوں نے قصیدہ کی تعریف، زبان، اجزائے ترکیبی اور تعداد اشعار کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ صاحبِ منتخب اللغات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ 'کم از کم قصیدہ تین اشعار پر مشتمل ہوتا ہے۔' ساحر لکھنوی مرحوم نے تجرباتی طور پر تین قصائد، جن میں دو قصیدے حضرت ابوالفضل العباس کی مدح میں اور ایک جشن عید غدیر کے حوالے سے سپرد قلم کیا۔ دلچسپی کے لیے ایک قصیدہ در مدح علمدار وفا ابوالفضل العباس علیہ السّلام پیش کر رہا ہوں، جس میں مصرعِ طرح بھی شامل ہے۔

جب بہار آئی چمن میں لے کے پیغام وفا — بن گیا ہر غنچۂ تر کھل کے اک جامِ وفا
اک گلِ عباس نے مجھ سے کہا ساحر لکھو — اس کی مدحت ہوگیا ہے جس پہ اتمامِ وفا
میں نے یہ لکھا زمانہ جب تھا ناکامِ وفا — 'حضرت عباس سے زندہ ہوا نامِ وفا'

اس مقالے میں سودا، ذوق، غالب، مومن، ابومحمد سحر، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، محشر لکھنوی، امیر مینائی، جلال، ثابت، رند، کامل، شاد، نظم طباطبائی، منیر شکوہ آبادی، انشا، ماہر، فاخر، آرزو، آشفتہ، ثاقب، تمنا، حکیم محمد قاسم (صاحب عالم) ذکی، منظر، صدر اجتیادی، مولانا اولاد حسین شاعر، فضل نقوی، سالک، مانی جائسی، قیس زنگی پوری، مہدی نظمی، نجم آفندی، محسن کاکوروی، فراست زید پوری، شاد زید پوری جیسے قصیدہ گو شعرا کے قصائد کا جائزہ لیتے ہوئے یہ مقالہ سپردِ قلم کیا۔ نعت گو شعرا کی بھی ایک طویل فہرست ہے، جن کے دواوین، کلیات اور مجموعوں میں مناقبِ چہاردہ معصومین علیہم السّلام درج ہیں، خصوصاً صوفی بزرگ شاعر بیدم شاہ وارثی، جن کے یہ دو شعر بہت مشہور ہیں:

بیدمؔ یہی تو پانچ ہیں مقصودِ کائنات — خیر النسا، حسین و حسن، مصطفیٰ، علی
شگفتہ گلشنِ زہرا کا ہر گلِ تر ہے — کسی میں رنگِ علی کسی میں بوئے رسولؐ

☆ **پیر مہر علی شاہ اور پیر نصیر الدین** گولڑہ شریف سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نصیر الدین گولڑہ شریف کے تصنیف کردہ مرثیے سے منقبتِ امام حسین علیہ السّلام ملاحظہ فرمائیں:

جو مصطفی کا نور تھا زہرا کا چین تھا — اس باخدا کا نام گرامی حسین تھا

ناموس لوح، تاج امامت، چراغ دیں نور ازل، فروغ ابد، مطلع یقیں
تنویر عرش، حسن فلک، زینت زمیں باطل ستیز حق نگر و صدق آفریں
مصباح لطف، صبح کرم، عزت وجود رمز نماز سر وفا، سطوت سجود
جان کرم، نگاہ حرم، قبلہ امن میر حیات، مہربقا، قاسم نعم
سامان رشد، شاہد حق، احسن الشیم قندیل فیض، شمع سخن، خسرو قلم
دست علی، حسام حسن، نور مشرقین تصدیق اعتبار زمیں و زماں حسین

اب بھی بہت سے مرثیہ نگار باقی ہیں، جنھوں نے مرثیوں میں مناقبِ پنجتن پاک اور چہاردہ معصومین علیہم السلام نظم کیے ہیں۔ اردو نظم گوئی میں نظیرا کبرآبادی کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی سے علامہ اقبال تک، غرض جس شاعر کے دیوان یا کلیات کی ورق گردانی کریں، مناقب کی ایک کہکشاں ملے گی۔ علامہ اقبالؒ کی محمد وآل محمد سے عشقیہ شاعری پر راقم الحروف کی نظروں میں تین کتابیں ہیں۔ پہلی سیّد احسن عمرانی کی کتاب 'اقبال در مدح محمد وآل محمد' 1977 لاہور، دوسری پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی کی کتاب 'علامہ اقبال بارگاہِ پنجتن میں' 1991 کراچی، اور مولانا سیّد تلمیذ حسن رضوی کی کتاب 'اقبال بارگاہِ عصمت وطہارت میں' 2018 نیوجرسی امریکہ میں شائع ہوئی۔

افتخار عارف صاحب اکثر علامہ اقبال کے وہ اشعار جو مولائے کائنات سے ان کی محبت وعقیدت کا مظہر ہیں، اپنی پاٹ دار آواز میں پیش کرتے ہیں۔ 1992 سہ روزہ جشنِ مولودِ کعبہ، غالب اکیڈمی دہلی میں منعقد ہوا، جس میں مولانا کوثر نیازی، حمایت علی شاعر بھی شریک تھے۔ اس جشن میں اپنی نظم سے پہلے درج ذیل اشعار پیش کیے۔

ہوں مرید خاندان خفتۂ خاکِ نجف موج طوفاں آپ لے جائے گی ساحل پر مجھے
دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغ عشق اہلِ بیت ڈھونڈھتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدرؓ مجھے
ولی بھی رند بھی شاعر بھی کیا نہیں اقبال کوئی حساب ہے کمبخت کے کمالوں کا
سنا ہے صورتِ سینا نجف میں بھی اے دل کوئی مقام ہے غش کھا کے گرنے والوں کا
جہاں سے پلتی تھی اقبال روح قنبر کی مجھے بھی ملتی ہے روزی اسی خزینے سے
ہمیشہ وردِ زباں ہے علی کا نام اقبال کہ پیاس روح کی بجھتی ہے اس نگینے سے

تقدیسی ادب کے شعرا کے علاوہ بیسویں صدی کے انقلابی شعرا کے کلیات بھی عشقِ محمد وآلِ محمد سے خالی نہیں۔ مثلاً ترقی پسند مصنفین اور انقلابی فکر کے شاعر کیفی اعظمی کی نظم 'در مدحِ امام حسینؑ' مثلث کی ہیئت میں چند منتخب بند ملاحظہ فرمائیں۔

حسین فاتح لیل ونہار بن کے رہا
حسین زیست کا اک شہکار بن کے رہا
حسین آئنۂ کردگار بن کے رہا

ہزار اس کے ستانے پہ تل گئی دنیا
ہزار اس کے مٹانے پر تل گئی دنیا
ضمیرِ دہر میں وہ یادگار بن کے رہا

چراغ سامنے اس کے کسی کا جل نہ سکا
کوئی بھی اس کے ارادوں کا رخ بدل نہ سکا
مزاج جبر میں وہ اختیار بن نہ سکا

بجھا سکیں نہ کبھی آندھیاں چراغ اس کا
جھلس سکی نہ ہوائے سموم باغ اس کا
خزاں کے دور میں بھی وہ بہار بن کے رہا

جہاں میں لاکھ سلاطینِ ذی حشم آئے
لیے ہوئے دہل و افسر و علم آئے
مگر دلوں کا کوئی شہر یار بن نہ سکا
حسین ہی ہے جمال حیات وشان حیات
حسین ہی کا لہو بہر کاروان حیات
چراغِ نور سر رہِ گزار بن کے رہا

وہ پھول جو کہ کھلا تھا جبینِ آدم میں
وہ پھول جس کی مہک ہے دماغِ عالم میں
مرے گلے کا بھی عظمی وہ ہار بن کے رہا

کراچی کی رضویہ سوسائٹی میں چودہ سوسالہ جشن مرتضوی 10 فروری 1985 کو منعقد ہوا، جس کی صدارت صدرِ پاکستان اسکندر مرزا نے کی۔ اس جشن میں حیدرآباد دکن کے شاعر شہید یار جنگ کو مدعو کیا

گیا تھا۔ انھوں نے صدرِ پاکستان، عراق وایران کے جید علما، راجہ صاحب محمود آباد اور علامہ رشید ترابی کی موجودگی میں ایک مخمس نصیریوں کے عقیدہ کو مدنظر رکھ کر پیش کیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

کسی کے قول کا کیا اعتبار کہنے دو تمھارے دل میں یہ کیسا غبار کہنے دو
تڑپ رہا ہے دلِ بے قرار کہنے دو کسی کے دل پہ تمھیں اختیار کہنے دو
علی کو کہتے ہیں پروردگار کہنے دو

ہمیں بتاؤ تو آخر یہ ماجرا کیا ہے اسے خبر نہیں بندہ ہے کیا خدا کیا ہے
بگڑ رہے ہو جو تم، تم کو یہ ہوا کیا ہے تمھارے دوست کی تعریف ہے، برا کیا ہے
علی کو کہتے ہیں پروردگار کہنے دو

سنا نہیں ہے کسی نے یہ قیس سے پوچھا کہ مستحقِ خلافت تھا کون کچھ تو بتا
پکارا عاشقِ شوریدہ سر 'مری لیلیٰ' تمھارا عشق تو مجنوں سے بھی گیا گزرا
علی کو کہتے ہیں پروردگار کہنے دو

اسی جشن میں جوشؔ ملیح آبادی نے اپنا معرکۃ الآرا مسدس 'طلوعِ فکر' 110 بند پیش کیا تھا۔ جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ مثلاً:

گھومی کلیدِ فضل، کھلا قفل فیض عام ناگاہ آسمان پہ گونجا علی کا نام
گردش میں آئے نعرۂ صلِّ علی کے جام پڑھتے ہوئے درود بڑھے انبیا تمام
کعبہ کے گرد ایک کرن گھومنے لگی
روحِ محمد عربی جھومنے لگی

گل ہوگیا زمین پہ اوہام کا چراغ تشکیک سے یقین کو حاصل ہوا فراغ
جھوما نسیمِ عقل سے نوعِ بشر کا باغ اترا دماغ دل میں تو دل بن گیا دماغ
اوجِ خرد پہ صبح کی سرخی عیاں ہوئی
یہ آئے تو حریمِ نظر میں اذاں ہوئی

سلمائے روزگار کو زرّیں قبا ملی انسانیت کو دولتِ صد ارتقا ملی
ہنستی ہوئی قدر کے گلے سے قضا ملی آغوش میں رسول کو اپنے دعا ملی
جیسے ہی نصف نور ملا نصف نور سے
اپنے کو کردگار نے دیکھا غرور سے

جوشؔ ملیح آبادی کی تصنیف کردہ منقبت ان کے مجموعہ 'سموم وصبا' میں شائع ہوئی تھی، عنوان اور پہلا بند ملاحظہ فرمائیں۔

عنوان: "میں حیدری ہوں، حیدری"

ہاں میں ہوں میر زندگی، دارائے ملک شاعری
غلطیدہ چرخِ دین پر میرا سحاب کافری
میری حریمِ طبع میں رقصاں بتانِ آزری
لیکن بہ ایں عزّ و شرف دل ہے رہینِ قنبری
میں حیدری ہوں، حیدری
میں حیدری ہوں، حیدری

☆ **نسیم امروہوی**، جنھوں نے ساری زندگی یا تو لغت نویسی، تدریسی کتب وتراجم میں گزاری، یا ذکرِ محمد وآلِ محمد میں۔ اسی لیے وہ اپنا قلمی نام یوں لکھتے ہیں 'شاعرِ آلِ محمد نسیم امروہوی'۔ مراثیِ نسیم جلد سوم، چہاردہ معصومین کے چودہ مرثیوں پر مشتمل ہے۔ یوں ہر معصوم کی منقبت بھی ان مرثیوں میں شامل ہے۔ نسیم امروہوی عالم دین اور بعض اہم عربی کتابوں کے شارح اور ترجمہ نگار بھی۔ اور اپنے دادا فرزدقِ ہند حضرت شمیم امروہوی کے جانشین بھی تھے۔ 1930ء کو جب وہ لکھنؤ آئے، تو خطیبِ اعظم مولانا سیّد سبط حسن نے ایک مرثیہ لکھنے کی فرمائش (امتحان کے طور پر) کی کہ فضائلِ علی ابن ابی طالب قرآن واحادیث مبارکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں تصنیف فرمائیں۔ انھوں نے وہ مرثیہ 83 بند میں مکمل کیا، جس میں 114 حدیثوں اور اکیس قرآنی آیتوں سے فضائل علی علیہ السّلام نظم کیے۔ یہ مرثیہ مراثیِ نسیم جلد اول اور اب جلد پنجم میں شائع ہوا۔ جلد سوم سے منقبتِ امام حسین علیہ السّلام ملاحظہ ہو، جس میں قرآن مجید اور امام حسین علیہ السّلام کا موازنہ نظم ہوا ہے۔ کل بند 71، ابتدائی بند ملاحظہ فرمائیں۔

جامع آیات قرآن و شہادت ہیں حسین مجمع اخلاص و شکرو صبرو ہمت ہیں حسین
شارح اجمال ایثار وصداقت ہیں حسین کربلا پر جو ہوئی نازل وہ آیت ہیں حسین
مصحف و شبیر ایک آغاز کا انجام ہیں
اس کا قول ان کا عمل جب مل گے اسلام ہیں

وہ نبی کے دل کی قوت یہ نبی کے دل کا چین وہ نبی کی چشم بینا یہ نبی کے نور عین
مشرق اسلام وہ ہے یہ امام مشرقین ایک ہی جلوے کے دورخ ہیں قرآن اور حسین
فرق اتنا ہے وہ جادہ ہے یہ خصر راہ ہیں
اس میں تاویلیں ہیں یہ محکم کتاب اللہ ہیں

شانہ دست عمل قر آن ہے گیسو حسین وہ ہے بازو دین کا اور قوت بازو حسین
جنت اسلام کا وہ پھول ہے خوشبو حسین وہ مشیت کا ہے تیور جنبش ابرو حسن
رمز فہمی کو مذاق دیدہ ور بھی چاہئے
اس کے نظارے کو ان کی سی نظر بھی چاہیے

وہ ہے تنزیل ازل، یہ ہیں امام لم یزل اس میں شامل فاتحہ، یہ فاتح باب عمل
وہ ہے مجمل یہ مفصل وہ ہے عقدہ اور یہ حل وہ بدل ان کا یہ اس کے اور دونوں بے بدل
وہ اصول حکمرانی حاکم شرعی حسین
آیت الکرسی ہے اس میں، صاحب کرسی حسین

دہر کی سورت ہے اس میں، دہر کے رہبر حسین اس میں جو یٰسین اس یٰسین کے دلبر حسین
ہے وہاں طٰہٰ یہاں طاہر و اطہر حسین سورۂ کوثر ہے اس میں ضامنِ کوثر حسین
دین کی وہ جان ہے، یہ دین کا ایمان ہیں
اس میں الرحمن ہے، یہ علم ا لقرآن ہیں

حامل **وَالشَّفۡعِ** وہ ہے شافع امت حسین اس میں ہے **وَالنَّجۡمِ**، نجم طالع ملت حسین
وَالۡقَمَرِ اس میں تو ماہ منزل عصمت حسین اس میں ہے **اِنَّا فَتَحۡنَا** فتح کی صورت حسین
اس میں ہے **وَالشَّمۡسِ** جس **وَالشَّمۡسِ** کی ضوآفتاب
یہ ہیں مطلع ایک خود اور پشت پر نو آفتاب

☆ **دلورام کوثری** نے بھی ایک مرثیہ بعنوان 'قرآن اور حسین علیہ السّلام' تصنیف کیا۔کل بند 77، ابتدائی بند منقبت میں ملاحظہ ہوں۔

قرآن اور حسین برابر ہیں شان میں دونوں کا رتبہ ایک ہے دونوں جہان میں
کیا وصف ان کا ہو کہ ہے لکنت زبان میں پیہم ندا یہ غیب سے آتی ہے کان میں
قرآں کلام پاک ہے شبیر نور ہے
دونوں جہاں میں دونوں کا یکساں ظہور ہے

ہادی ہے ایک، ایک ہدایت کی ہے کتاب سرور ہے ایک، ایک فضیلت کی ہے کتاب
ہے ایک امام، ایک رسالت کی ہے کتاب حضرت کا یہ نواسہ وہ حضرت کی ہے کتاب
ان دونوں پر تمام فضائل تمام ہیں
دونوں یہ بوسہ گاہ رسول انام ہیں

شبیر بے مثال ہے قرآں ہے لا جواب　　اک ان میں منتخب ہے تو اک ان میں انتخاب
ہیں خانہ خدا میں رسول فلک جناب　　اس زانوں پر حسین ہیں اس زانو پر کتاب
قرآں ہے اس بغل میں حسین اس بغل میں ہیں
دونوں شریک آپ کے علم وعمل میں ہیں
قرآں کے مرتبے کو ترقی ہے گر مدام　　نامِ حسین بڑھتا ہے دنیا میں صبح و شام
قرآن حق نما ہے اگر آخر کلام　　نسل حسین پر بھی امامت ہوئی تمام
پیدا ہوئے امام اماموں سے اس طرح
قرآن نقل کرتے ہیں قرآں سے جس طرح

☆ **دیوی روپ کنوار کماری** کے تصنیف کردہ مرثیے سے منقبت جناب زہرا صلوات اللہ علیہا ملاحظہ فرمائیں۔ 93 بند، ابتدائی چند بند:

زینت حجلۂ عفت ہیں جناب زہرا　　رونق کشور عصمت ہیں جناب زہرا
خلق میں حق کی ودیعت ہیں جناب زہرا　　پرتوِ مہر نبوت ہیں جناب زہرا
باپ کی طرح سے یکتائے زمانہ یہ ہوئیں
مختصر یہ ہے کہ دنیا میں یگانہ یہ ہوئیں
مظہر نور رسالت ہیں جناب زہرا　　گل جو احمد ہیں تو نکہت ہیں جناب زہرا
والی ملک شریعت ہیں جناب زہرا　　منبع عفت و عصمت ہیں جناب زہرا
مصحف پاک میں دیکھے کوئی قصہ ان کا
مہر کا خلد میں ہے پانچواں حصہ ان کا
زینت پہلوئے محبوب خدا ہیں زہرا　　مثل حیدر کے مُعینُ الضُّعَفا ہیں زہرا
درد عصیاں کے مریضوں کی دوا ہیں زہرا　　کیا کہوں دخترِ احمد کو کہ، کیا ہیں زہرا
جس سے خوشبو ہے جہاں وہ گل سادات دیئے
ان کو بھگوان نے دو گوہرِ نایاب دیئے
عرش و کرسی میں ہے تنویر جناب زہرا　　حق کی تصویر ہے تصویر جناب زہرا
کسے روشن نہیں توقیر جناب زہرا　　حَبَّذَا اختر تقدیر جناب زہرا
گیارہ معصومہ کی ماں شاہِ زماں آپ ہوئیں
حد یہ ہے خلق میں خاتونِ جناں آپ ہوئیں

دامن عفو ہے دامان جناب زہرا　　خلق ہے بندۂ احسان جناب زہرا
واہ کیا شان ہے قربان جناب زہرا　　حق کا فرمان ہے فرمان جناب زہرا
عین بھگوان کی رحمت ہے کرم زہرا کا
جب تلک دم ہے بھروں گی یونہی دَم زہرا کا

☆ **استاد قمر جلالوی:** اسی دور کے ایک ممتاز غزل گو، استاد قمر جلالوی جنھوں نے قطعہ، رباعی، مناقب معصومین نظم کیے ہیں۔ انھوں نے ایک مرثیہ کے چہرے میں مدح امام حسن علیہ السلام وولادتِ باسعادت تصنیف کی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

حَسَن کا گلشن عالم میں جب ظہور ہوا　　ہر ایک برگ شجر آشنائے نور ہوا
روش روش پہ تجلّی کا وہ وفور ہوا　　کہ جیسے باغ میں روشن چراغِ طور ہوا
بہار سے در و دیوار کی یہ حالت ہے
کہ جیسے فاطمہ زہرا کے گھر میں جنت ہے

رخ ایسا لا نہ سکے آفتاب جس کی نظیر　　وہ آنکھیں جیسے کے لبریز جام خم غدیر
بھونیں کھنچی ہوئی جیسے کہ ذوالفقار امیر　　جہاں میں شہر امامت کی دوسری تعمیر
جو تھی رسول میں خوشبو وہی پسینے کی
سند ہے فاطمہ زہرا کے دودھ پینے کی

دیا ریاضت خیر الوریٰ کا حق نے یہ پھل　　کہ نکلی شاخِ امامت میں دوسری کونپل
ہے باغبانِ حقیقی کا خاص ردِّعمل　　کہ جس کی قدرت کامل کا ہو سکے نہ بدَل
نظر نمو کی طرف جب وہ موڑ دیتا ہے
شگوفہ سینۂ گیتی کو توڑ دیتا ہے

نظر کے سامنے ایک اور آ گیا بوٹا　　خوشی میں غنچہ صفت مسکرائے شیرِ خدا
نبی نے گود میں لے کر یہ کی خدا سے دعا　　ہرا بھرا رہے یا رب نہال زہراؑ کا
ترا کرم ہے جو دل کی کلی کھلائی ہے
چمن میں پہلے پہل یہ بہار آئی ہے

ہیں مثل شاخ ثمر دار سجدے میں زہرا　　زبانِ حضرتِ جبریلؑ پر ہے صلِّ علیٰ
ہے باغ باغ مسرت سے دل پیمبر کا　　پسر خدا نے دیا ہے علی کو سبز قبا
پتہ یہیں سے نظامِ چمن کا چلتا ہے
شجر میں پہلے پہل سبز پھل نکلتا ہے

رکھی ہے سبزے پہ اللہ نے بنائے بہار		پسند اہل گلستاں کو کیوں نہ آئے بہار
بیان کرتے ہیں گلشن میں آشنائے بہار		یہ رنگ وہ ہے کہ ہے جس سے ابتدائے بہار
شروع موسم گل کی جو بات چلتی ہے
گیاہ سبز زمین چمن اگلتی ہے

یہ رنگ وہ ہے جو ہے دل سے مرتضیٰ کو پسند		جناب فاطمہ مقبول کبریا کو پسند
امین وحی خدا وند دوسرا کو پسند		بس انتہا ہے کہ یہ رنگ مصطفیٰ کو پسند
ثبوت حسن محبت نہیں تو پھر کیا ہے
نشان فوج نبی کا ہرا پھریرا ہے

ہر ایک کرتا ہے تعریف اس پھریرے کی		نشانی لشکر اسلام کی رہے گئی یہی
جہاں بھی جاکے لڑیں گے علی بحکم نبی		نظر زمانے کی ہر معرکہ میں دیکھے گی
نشان سبز لئے اس طرح جہاد میں ہیں
علی کے ساتھ حسن جس طرح جہاد میں ہیں

وقار سب پہ ہو اس رنگ کا نہ کیوں روشن		نظر کے سامنے ہے الفت رسول زمن
نبی کی قبر پہ گنبد ہے سبز سایہ فگن		کہ جیسے نانا کے سینے پہ جلوہ گر ہیں حسن
لحد میں بھی ہے محبت اسی قرینے سے
لگا رکھا ہے پیمبر نے اپنے سینے سے

☆ **شوکت تھانوی:** جن کی بنیادی پہچان مزاحیہ نثر نگاری وشاعری ہے، مگر ان کے قلمی آثار میں بہت ہی منفرد نوعیت کا جدید مرثیہ بھی ہے۔ 'شہادت عظمیٰ' سے چند بند ملاحظہ ہوں۔

منزل شناس جن کی قیادت وہی حسین
وہ سرخرو ہے جن کی شہادت وہی حسین
نازاں تھی جن پہ جن کی امامت وہی حسین
آئینۂ جمال رسالت وہی حسین

وہ گلستان فاطمہ زہرا کا سرخ پھول		خوشبو سے جس کی جھومتے رہتے تھے خود رسول
معصوم عمر کھیل کے دن اور یہ شعور		نادانیوں کے دور میں نادانیوں سے دور
اس کم سنی میں اور یہ قرآن کا شعور		نانا بھی دیکھتے تھے نواسے پہ اپنا نور
کہتے تھے کسب نور کرو نور عین سے		میرا حسین مجھ سے ہے میں ہوں حسین سے

کہتے تھے خود رسول کہ بیٹھا ہوں قبلہ رو مجھ سا مرے حسین کو پاؤ گے ہوبہو
عادات میں کہیں سے نہیں فرق مو بہ مو دیکھو مرے حسین میں میری ہر ایک خو
میں خود کو دیکھتا ہوں تو ہوں سربسر حسین آئینہ درمیاں ہے ادھر میں ادھر حسین
بچپن کی جیسے میری ہی تصویر ہیں حسین یہ واقعہ ہے میری ہی تنویر ہیں حسین
میرے ہر ایک خواب کی تعبیر ہیں حسین قرآن میرے لب پہ ہے تفسیر ہیں حسین
پیغامبر ہوں میں مِرا پیغام ہیں حسین انساں کی شکل میں مِرا اسلام ہیں حسین
تبلیغ جیتی جاگتی اسلام کی حسین تردید منہ سے بولتی اوہام کی حسین
تصویر من و عن مرے الہام کی حسین دراصل آبرو ہیں مرے نام کی حسین
خالق کا مدعا ہے جو انسان دیکھ تو جو چاہتا ہوں میں وہ مسلمان دیکھ تو

☆ **صبا اکبرابادی:** غزل کے ایک اور شاعر صبا اکبرابادی، جنھوں نے کہا:

عاشقان آل محمد ہیں اے صبا
زندہ رہیں گے نام ہمارے فنا کے بعد

ملاحظہ ہوں ان کے تصنیف کردہ مرثیے 'ترقی' سے منقبت مولا علی علیہ السّلام کے چند بند دیکھیے:

میں کس طرح علی کے فضائل بیاں کروں ذرہ ہوں کیسے حوصلۂ آسماں کروں
یہ نام پاک وہ ہے جسے حرز جاں کروں جبریل ساتھ دیں تو انھیں ہم زباں کروں
دیکھا جو اپنا حسن رقم وجد کر گیا
لکھا علی کا نام قلم وجد کر گیا

نفس رسول نازش ارض و سما علی بازو رسول پاک کے دست خدا علی
مولائے کائنات، خدا آشنا علی ہر قلب کی مراد علی مدعا علی
جس کے قدم پہنچ گئے باب قبول پر
معراج ہوگئی جسے دوش رسول پر

مولود کعبہ، شاہ نجف، اولیں امام خیبر کشا، زعیم عرب، حامیِ عوام
جبریل کے پروں پہ لکھا ہے علی کا نام ان پر سلام ان کے کمالات پر سلام
جوہر اس آئینہ کے بہت منجلی ہوئے
معراج کے گواہ خدا و علی ہوئے

حاصل ہے ان کے نام کو اعلیٰ سے اشتقاق ان کے ورود کا تھا محمد کو اشتیاق
ان کے ہر اک عمل سے رسالت کو اتفاق دلدل انھیں زمیں پہ ملا ثانیٔ براق
رکھا لحاظ طبعِ جلالت شعار کا
تحفہ ملا خدا سے انھیں ذوالفقار کا
وہ ذوالفقار جس کی برش مرگ دشمناں وہ ذوالفقار جس نے دیے لاکھ امتحاں
بدر و احد میں خیبر و خندق میں ضوفشاں وہ ذوالفقار جس سے اجل مانگتی اماں
نکلی فروغ جلوۂ وحدت کے واسطے
چمکی نماز حق کی حمایت کے واسطے

☆ **تابش دہلوی** نے نثر کے ساتھ نظم میں، غزلیات کے ساتھ نعتیں اور مرثیہ بعنوان 'آگ' تصنیف فرمایا۔ چند بند منقبت امام علی علیہ السّلام میں ملاحظہ فرمائیں:

ہے بعدِ نعت مدحتِ حیدر زباں پر قربان ہو رہی ہے فصاحت زبان پر
صدقے مہ و نجوم ہیں لفظوں کی شان پر کیوں کر دماغ فکر نہ ہو آسمان پر
ذکر اس کا ہے جو سالکِ راہِ صواب ہے
جس کا علی ہے نام، لقب بوتراب ہے
وہ بوتراب جس کو نبی کا ولی کہیں وہ بوتراب جس کو نبی کا وصی کہیں
وہ بوتراب جس کو نبی کا سبھی کہیں وہ بوتراب سب جسے مولا علی کہیں
ہر حال میں محافظِ دینِ حنیف ہے
احزاب ہو کہ بدر، نبی کا حلیف ہے
کوئی نہیں ہے بیشۂ حق میں علی سا شیر دستِ قوی سے جس کے دبیرِ فلک بھی زیر
جانباز، جاں فروش، دلاور، جری، دلیر دیں پر حریص، دولتِ دنیا سے چشم سیر
ملنے کے باوجود نہ دنیا قبول کی
اس کی متاع صرف محبت رسول کی
دشمن وہ شر کا بھی ہے عدوئے فساد بھی مشکل کشا بھی ہے وہ دلوں کی مراد بھی
مبدا بھی آشکار ہے اس پر معاد بھی اس کا عمل جہاد بھی ہے اجتہاد بھی
رکھے نہ کیوں جہاد پہ ایمان کی طرح
نازل ہوئی ہے تیغ بھی قرآن کی طرح

خوش طبع ،خوش مزاج، خوش اطوار،خوش سیر　　دست قوی میں زور ید اللہ سر بسر
قبضے میں ذو الفقار سی شمشیر معتبر　　شوہر ہے فاطمہ کا تو حسنین کا پدر
کس ایک ذات کو یہ جہاں میں شرف ملا
بیٹے کو کربلا ملی، خود کو نجف ملا

جدید مرثیہ نگار شعرا نے خانوادۂ رسالت کے اہم افراد واصحابہ رضوان اللہ علیہ کو بھی موضوع قرار دے کر مرثیے کہے، جن میں ان کی مدح بھی کی۔ مثلاً سیّد ظہور حیدر رضوی جار چوی نے حضرت ہاشم، فاطمہ بنت اسد، میثم تمار، حضرت ابو ذر غفاری کا مرثیہ کہا، جو ان کے مجموعہ کلام 'نذر منتظر' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

☆ **قیصر بارہوی:** پنجاب پاکستان کے معرف مرثیہ نگار شاعر جو اپنے کلام کو لحن سے پیش کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت ابو طالب علیہ السّلام، جنھیں پہلا نعت گو شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے، ان کی تاریخ ساز شخصیت کو سامنے رکھ کر بعنوان 'مدحِ ابو طالب' مرثیہ کہا۔ 74 بند، منتخب بند ملاحظہ فرمائیں۔

گونجی سر بطحا یہ نوائے ابو طالب　　تبلیغ محمد ہے صدائے ابو طالب
وحدت کی کہانی ہے برائے ابو طالب　　اسلام کا پر چم ہے لوائے ابو طالب
میدان کی ہر بات نگہبان سے ہوگی
اب جنگ اگر ہوگی تو عمران سے ہوگی

جناب بی بی آمنہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت و کردار پر مرثیہ بعنوان 'آیاتِ آمنہ' کے 78 بند سے منتخب بند:

اب سامنے ہے عصمت و عظمت پہ وہ دلیل
جھومیں گے فرط لطف سے ہر فکر کے عقیل
اب مدح آمنہ میں ہے وہ نکتۂ جمیل
دامن میں ہیں تمام فضیلت لیے ہوئے
زیرِ قدم رسولؐ کی جنت لیے ہوئے

اسی طرح مادرِ گرامی حضرت علی علیہ السّلام کی شخصیت کو موضوع بنا کر مرثیہ تصنیف کیا۔ 78 بند میں سے چند منتخب بند ملاحظہ کیجیے:

بنت اسد اک شخصیت، اک پیکر تسلیم　　یہ منزلت تکریم پہ صحت گر تسلیم
اب ان کے فضائل میں کرے گا کوئی ترمیم　　حد یہ ہے کہ تعظیم کریں معنی تعظیم
یہ بھی صفت آمنہ فخر دو جہاں ہیں
قرآں کی قسم بولتے قرآن کی ماں ہیں

جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کی کنیز جناب فضہ رضی اللہ عنہ کے حال میں مرثیہ بعنوان 'صبحِ مودّت' 74 بند میں سے چند منتخب بند ملاحظہ فرمائیں۔

فضہ حق آشنائے صداقت نواز ہے حسن وفا سے تا بہ ابد سرفراز ہے
دنیائے اتباع میں تاریخ ساز ہے گویا اذاں بلال ہے فضہ نماز ہے
سرمایۂ بلال محبت رسول کی
فضہ کی سرگزشت کہانی بتول کی

اور سردارِ ملائک حضرت جبرائیل علیہ السّلام کو موضوع بنا کر مرثیہ کہا 'شاہد محضر' کے عنوان سے، جس کا مطلع یہ ہے:

دنیا میں نیا باب سخن کھول رہا ہوں
حیراں ہوں خزانے وہ گہر رول رہا ہوں
جبریل سمجھتے ہیں جہاں بول رہا ہوں
سدرہ کے نگینے صدف دل پہ سجے ہیں
تخییل کو سرخاب کے پر آج لگے ہیں

جبریل ہیں تخلیق میں وہ رمز مشیت سینے سے لگائے جسے آدم کی فضیلت
کچھ وقت سے پوچھو تو کہاں وقت کی نوبت تزئین کتب ہے لب صادق سے وضاحت
تقدیر کے ہمراز مقدر کے دھنی ہیں
آدم سے جو پہلے ہیں یہ وہ پنج تنی ہیں

کیسے کہوں پابند سن وسال ہیں جبریل سرّ احدیت ہے یہ آئینۂ تشکیل
تشریح سخن میں کوئی تشبیہ نہ تمثیل میں سوچ رہا تھا کہ پکارے لب تخئیل
خلقت میں جو پائے تھے وہ انوار عیاں ہیں
ہر دور کہے گا یہ جواں تھے یہ جواں ہیں

☆ **اسیر فیض آبادی** نے جناب سلیمان فارسی کے حال کا مرثیہ 'روح مودت' کہا۔ 70 بندوں میں سے صرف تین بند ملاحظہ ہوں:

رفتہ رفتہ اس قدر پر نور ان کا دل ہوا منااھل البیت کا تاج شرف حاصل ہوا
آل ذرہ مہر کی ضو سے مہِ کامل ہوا راستوں میں جو بھٹکتا تھا وہ خود منزل ہوا
کر لیا یوں جذب اپنا عکس اصلِ نور نے
طور کو اپنا لیا تھا جیسے برق طور نے

ہر فضیلت ان کو دربارِ پیمبر سے ملی دولت صدق و یقیں تعلیم حیدر سے ملی
قوت فکروعمل شبیر و شبر سے ملی طاعت حق کی طلب زہرا کے گھر بھر سے ملی
نور نے سینچا ہے جس کو وہ شجر سلمان ہے
ان کی دانائی کا سایہ سائیہ قرآن ہے
زہد وتقویٰ کی نبی سے روشنی پاتے رہے فیض حیدر سے زکوٰۃِ آگہی پاتے رہے
آل کے در سے متاع حق رسی پاتے رہے اور اپنے رب سے داد بندگی پاتے رہے
عصمتیں یوں تربیت کرتی ہیں اک انسان کی
اک گواہ معتبر ہے منزلت سلمان کی

حضرت ابوذر غفاری کے لیے ’کربلائے ربذہ‘ عنوان بنا کر تصنیف کیا، درج ذیل متفرق بند ملاحظہ ہوں۔

وہ ابو ذر جسے ایماں کا منارہ کہیے فلک جرات بے باک کا تارہ کہیے
جس کی رفتار کو سچائی کا دھارا کہیے جس کو تہذیب صداقت کا ادارہ کہیے
مکرِ ابلیس جسے راہ سے بھٹکا نہ سکا
جس کے دامن پہ کبھی داغِ رِیا آ نہ سکا
ایسا مومن کہ ثنا جس کی کرے حق کا رسول در حیدر پہ سلامی رہا جس کا معمول
جس نے یوں وضع کیے عشق ومحبت کے اصول اپنے رخسار پہ ملتا تھا در آل کی دھول
ان کی تقلید کو خالق کی اطاعت سمجھا
پائے حسنین کے بوسوں کو عبادت سمجھا
ان کے اخلاص کی یوں کی ہے نبی نے توثیق لوگ اپنائے اطاعت میں ابو ذر کا طریق
کس کو حاصل ہوئی یوں قول وعمل کی توفیق کہ انھیں مخبرِ صادق نے کہا ہے صدیق
کوئی اعزاز نبی نے یونہی کب بخشا ہے
جیسا پایا ہے جسے ویسا لقب بخشا ہے
قربت رحمت عالم کی سعادت پائی در زہرا پہ جبیں سائی کی عزت پائی
ناز برداری حسنین کی دولت پائی جیتے جی آپ نے جنت کی بشارت پائی
خلق میں اتنا کسے حسن مقدر سے ملا
اور کیا چاہیے سب کچھ تو پیمبر سے ملا

یہ وہ ہیں جن کے لیے فخر دو عالم نے کہا　　حق نے جو چاہا جسے رتبۂ عالی سمجھا
نہ زمیں نے نہ کہیں چشم فلک نے دیکھا　　ایک بھی سطح صداقت پہ ابو ذر جیسا
کیا کسی اور کو حاصل ہے یہ رتبہ کہیے
اب قائل نہ ہو کوئی تو اسے کیا کہیے

☆ **فرحت دہلوی:** حکیم نصیر حسین نقوی البخاری کی تصنیف کردہ ابوزر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

اے ابو ذر اے غفاری آشنائے معرفت　　تو نے سمجھائے رموز ارتقائے معرفت
زیب تن کی اس طرح تو نے قبائے معرفت　　ہر بن منہ سے ٹپکتی تھی ضیائے معرفت
وقف خود کو کر دیا حق و صداقت کے لیے
بن گیا ناسور جسمِ آمریت کے لیے

یاد ہے ربذہ سے آنا تیرا پیش مصطفیٰ　　مجمع کفار میں اعلان توحید خدا
خانہ کعبہ میں تجھ پر سختی اہل جفا　　مرضیِ حق کے لیے وہ ضبط تیرا مرحبا!
جس کو تیری ذات میں ہوفکر وہ زندیق ہے
تو بقول حضرت خیر الوریٰ 'صدیق' ہے

اے مصدق شام کے بازار ہیں اس کے گواہ　　اے معارف کتنی پر تاثیر تھی تیری نگاہ
اے مفکر ہل گئی بنیاد قصرہ عزہ وجاہ　　اے محقق بن گیا ناسور تیرا انتباہ
تو نے مزدوروں کو حق گفتار کا حق دے دیا
تیری اس تحریک نے پیکار کا حق دے دیا

اے مدبر تو ہے بیشک ناصر دین خدا　　تو ہے محبوب جناب مرتضیٰ و مصطفیٰ
حق مدحت تیرا فرحت کر سکے گا کیا ادا　　اے مجاہد اے شہید راہ مولا مرحبا
درد میں ڈوبی ہوئی فکر پریشاں کا سلام
اے سپاہی تجھ پہ ہر ملت کے انساں کا سلام

مرثیے کے ساتھ ساتھ رباعی اور قطعات گو شعرا کے مجموعہ بھی مناقب سے خالی نہیں۔

☆ **اثر ترابی:** اثر ترابی نے ایک مرثیہ بعنوانِ عظمت کردار (۲۲۵ بند) تصنیف کیا۔جس میں میثم تمار کی مکمل منظوم تاریخ نظم کی ہے۔مطلع ثانی سے منتخب بند ملاحظہ فرمائیں:

یکتائے جہاں مومن ذیشان ہیں میثم　　اقدار الانساں کے نگہبان ہیں میثم
عترت پہ فدا عامل قرآن ہیں میثم　　کہتے ہیں علی راسخ الایمان ہیں میثم

میثم بخدا عشق و مودت کا نشاں ہیں　　دل دادۂ تعلیم رسول دو جہاں ہیں
قرآن کی آیات سدا ورد زباں ہیں　　اصنام شکن لہجے میں آواز اذاں ہیں

میثم کا سراپا ہے مودت کا جریدہ　　آئینے کی مانند ہے صاف ان کا عقیدہ
اک ذات میں سارے ہی اوصاف حمیدہ　　ہے لب پہ سدا نثر میں مولا کا قصیدہ

☆ **عزیز لکھنوی:** مولانا مرزا محمد ہادی رسوا، کا مجموعہ ’صحیفہ ولا‘ سے چند رباعیات وقطعات۔

چلا ظلمت کدہ میں ماہ بن کر
میان خالق شاہنشاہ بن کر
دہن دیوار کعبہ کو ملا ہے
علی نکلے ہیں ذکر اللہ بن کر

ساقی سے کہو لے کے شرابِ کہن آئے
تا جوش میں یہ محفل اہل سخن آئے
تسبیح نہیں رشتۂ انفاسِ خلائق
دنیا کو مبارک ہو! امام حسن آئے

رونق فزائے خلق ہوا تیسرا امام
سردار جملہ اہل جہاں سیّد الانام
قائم ہوا نظام آئمہ کا سلسلہ
تسبیح فاطمہ میں پرویا گیا امام

☆ **عبدالغفور نساخ:** اردو رباعیات کا اولین دیوان (ترانہ خامہ) درمنقت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

مومن نہیں ہرگز جو ہیں اعدائے علی　　مومن ہیں وہی جو ہیں احبائے علی
حضرت نے کہا ہے جو علی، مولاہ　　نساخ کو دل سے ہے تولائے علی

درمنقبت امامین ہمامین حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما:

حسنین ہیں سیّد جوانان بہشت حسنین ہیں ریحان گلستان بہشت
زیبا ہے اگر ان کو کہوں جان بہشت نساخ ہیں وہ شمسۂ ایوان بہشت

☆ **امجد حیدرآبادی** کی کلیات میں مدح علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

سب پر اسد اللہ کی ہیبت چھائی
کفار عرب نے ہر جگہ زک پائی
خیبر کی ہی جنگ پر نہیں کچھ موقوف
خندق کی لڑائی میں بھی منہ کی کھائی

☆ **شاہد نقوی** کی تصنیف کردہ چند رباعیات:

پیمانۂ غم چھلک رہا ہے لوگو!
قرآن سوے عرش تک رہا ہے لوگو
دروازۂ شہرِ علم ہوتا ہے شکستہ
منبر سے لہو ٹپک رہا ہے لوگو!

مولودِ حرم قاتل اژدر نہ بنا
مولیٰ نہ بنا نفس پیمبر نہ بنا
حیدر بخدا خدا نہیں ہیں لیکن
انسان خدا بن گیا حیدر نہ بنا

جناب زہرا صلوات اللہ علیہا کی مدح میں رباعی:

کردار انسانیت میں روح پیغام
خود بنتِ نبی شوہر و فرزند امام
زہرا کا وجود شرح اتمام نعم
زہرا کے بغیر نامکمل اسلام

عصمت کا بیاں ہے داستان زہرا
قرآن کی تفسیر زبان زہرا
یہ طنز لطیف ہے تحصیلِ حیا
ماحول جدید میں بیان زہرا

☆ **نورلدھیانوی** کے مجموعہ کلام 'نغمۂ نور' کے صفحہ نمبر 305 پر 'فکر بلند' کے عنوان پر ایک انتخاب 'قندیلِ نور' سے دیا گیا ہے، جس میں بہت سی رباعیات وقطعات درج ہیں، جن میں سے چند پیش خدمت ہیں:

مداح محمد ہوں قسمت کا دھنی ہوں
اور شیفتۂ آل رسول مدنی ہوں
اے نور میں پرنور ہوں بس نور علی سے
پنجاب کا پنجابی ہوں اور پنج تنی ہوں

خود ہے خدائے پاک ثنا خوان پنج تن
آنکھیں جو ہیں تو دیکھ ذرہ شان پنج تن
آ میں پتے کی بات بتاؤں بغور سن
مشکل پڑے تو تھام لے دامان پنج تن

نظر حقیقت شناس پائی تو کیا کہیں کس ادا سے دیکھا
ہر ایک ذرے میں جلوہ فرما محمد مصطفی کو دیکھا
قسم خدا کی خدا نبی سے نبی علی سے جدا نہیں ہے
علی کو دیکھا نبی کو دیکھا نبی کو دیکھا خدا کو دیکھا

کروں توصیف کن الفاظ سے آقائے قنبر کی
نرالی شان دیکھی اللہ اللہ زورِ حیدر کی
ہلایا اور اکھاڑا پھر اٹھایا تول کر پھینکا
حقیقت کھول کر رکھ دی علی نے باب خیبر کی

نورِ احمد سے پر انوار جناب زہرا
یاد گار شہ ابرار جناب زہرا
مومنو! صاف ہے ارشاد رسول عربی
خلد کی وارث ومختار جناب زہرا

☆ **حسین بھائی نظر:** جن کے یہ چار مصرعے بے انتہائی مشہور ہیں، جنھیں قوالوں اور دنیا بھر کے سوز خواں حضرات نے اپنے اپنے انداز سے پیش کیا کرتے ہیں۔

کب کسی بے نوا سے کہتا ہوں
کل کے حاجت روا سے کہتا ہوں
دور ہو جا نظر سے اے مشکل
ورنہ مشکل کشا سے کہتا ہوں

☆ **صادقین امروہوی:** جنھیں دنیا خطاطی ومصوری کا بے تاج بادشاہ تسلیم کرتی ہے۔ وہیں انھیں رباعی کہنے پر کامل عبور تھا۔ انھوں نے ایک مرثیہ رباعی کی بحر میں کہا اور ہندوستان جا کر اپنی جائے پیدائش امروہہ میں منعقدہ ایک مجلس میں پیش کیا۔ مسلسل بند مدحت امام حسین علیہ السّلام میں ملاحظہ ہوں۔

ہر چیز کا مو قلم سے رشتہ کھینچا
اس کا اگر چہرا تو کسی کا مکھڑا
کاغذ پہ تو ہوں نام سبھی کے لکھتا
پر خونِ جگر سے لوح دل پر کس کا؟

میں نام حسین ابن علی لکھتا ہوں
لکھتا ہوں تو لکھتا ہی چلا جاتا ہوں
کتنا حسیں کتنا ہے پیارا یہ نام
ظلمت میں ہے نور کا منارا یہ نام

حرفوں میں لیے خون کا دھارا یہ نام
ہے خاص مشیت کا اشارا یہ نام
اللہ کا اس شان کا بندا ہے حسین
الواح ابد پہ کیا؟ کندہ ہے حسین

یہ نام حسین بھی وحی ہے گویا
اس نام کا کردار بہت ہے اعلیٰ
اعلیٰ سے بھی اعلیٰ ہے بہت ہے بالا
یہ اسم گرامی ہے خدا نے رکھا

الہام کی یوں جان ہے نام نامی
دل والوں کا ایمان ہے نام نامی
ہر حرف میں نقش ازلی ہے لاریب
تحریر شدہ ابن ولی ہے لاریب

الواح ابد ہے جو جلی ہے لاریب
وہ نام حسین ابن علی ہے لاریب
عالم کے شہیدوں کے ہے سردار کا نام
تاریخ میں سب سے بڑے خودار کا نام

☆ **رئیس امروہوی** کے مجموعے انامن الحسین سے انتخاب:

اوصاف ید اللہ بھلا کیا سمجھیں
سب لوگ انھیں حق کے سوا کیا سمجھیں
پردے میں نہیں کچھ شبِ معراج کی رات
سمجھیں جو نصیری نہ خدا! کیا سمجھیں

نفس حق نفس مصطفیٰ بھی ہیں
یہ علی بھی ہیں ایلیا بھی ہیں
مدح خواں ہیں نصیری و مسلم
آپ بندے بھی ہیں خدا بھی ہیں

شان حیدر خانہ کعبہ کی شوکت کھل گئی
آپ کا اعجاز اور اس کی کرامت کھل گئی
بیت کعبہ نے دکھائی صورت شق القمر
کھل گئی دیوار یا کعبہ کی قسمت کھل گئی

☆ **محسن نقوی:** ایک طویل و معروف نظم مدح امام حسین علیہ السّلام میں صرف ایک جزو:

نہ پوچھ میرا حسین کیا ہے؟
جہان عزم وفا کا پیکر
خرد کا مرکز، جنوں کا محور

جمال زہرا، جلال حیدر
ضمیر انساں، نصیر داور
زمیں کا دل، آسماں کا یاور
دیار صبر و رضا کا دلبر
کمال ایثار کا پیمبر
شعور امن وسکوں کا پیکر
جبین انسانیت کا جھومر
عرب کا سہرا، عجم کا زیور
حسین تصویر انبیا ہے
نہ پوچھ میرا حسین کیا ہے؟

☆ **حسن رضوی:** ڈاکٹر حسن رضوی کے مجموعہ میں ایک منقبت در مدح حضرت امام موسیٰؑ کاظم علیہ السّلام صنعت مستزاد میں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اے باب الحوائج مرے سلطانِ زمانہ
بگڑی کو بنانا
ہم آپ سے اے شاہ زمن دور بہت ہیں
مجبور بہت ہیں
بس ایک تمنا ہے ہمیں پاس بلانا
قدموں میں بٹھانا
ہو کاش مقدر میں کبھی روضے پہ جانا
دکھ درد سنانا
یہ سبط نبی جعفر صادق کے ولی ہیں
فرزند علی ہیں
ہم لوگ پریشاں، سکوں دیجیے مولا
کچھ کیجیے مولا
اس گھر سے نہیں بڑھ کے کوئی اور گھرانہ
دنیا سے یگانہ

خالی مری جھولی میں بھی کچھ پھول گرنا

منگتا ہوں پرانا

قیام پاکستان کے بعد کراچی میں پہلی مرتبہ جشن مرتضوی 1949 کو آرام باغ میں منعقد ہوا1963 کے بعد یہ جشن علامہ رشید ترابی کی خواہش پر 1964 کو نشتر پارک منتقل ہوگیا۔50 سال مکمل ہونے پر ایک یادگاری گلدستہ 1999 کو محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن کراچی سے شائع ہوا۔اس میں گلدستہ میں جہاں گزشتہ 49 سال کے مقررین کی تقاریر اور تصویری جھلکیاں شائع ہوئیں، وہیں پر منتخب مناقب مرتضوی شائع ہوئے، جن میں جگن ناتھ آزاد اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے کلام شامل ہیں۔مہندر سنگھ بیدی کا تصنیف کردہ ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں-

جو پرتو تنویرِ قیام ازلی تھے
جو ابر کرم شیر خدائے ازلی تھے
جو لوح شجاعت پہ سحر حرف جلی تھے
حقا کہ علی تھے وہ علی تھے وہ علی تھے

راقم الحروف کی معلومات کے مطابق،کم ازکم دو کتابیں مرتب ہوئیں مناقب کی ایک معروف ادیب وخطیب علامہ ضمیر اختر جعفری کی کتاب 'عشقِ علی اور شعرائے اردو' اور دوسری سیّد اشتیاق حسین نقوی کی 'صحیفۂ مناقب' (مولا علی کی شان میں مناقب وقصائد کا روح پرور دلفریب مجموعہ بہ زبان اردو فارسی اور عربی) شامل ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ صرف اردو زبان میں ہی مناقب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو جمع کیا جائے ،تو ڈاکٹر ہلال نقوی کی درج ذیل رباعی کی تصدیق ادب کے قارئین اور محققین حضرات ضرور کریں گے:

ہر ظرف ہر اک حرف کی سیری ہو جائے
الفاظ کا انجام بخیری ہو جائے
یہ حال رہا منقبتوں کا جو ہلالؔ
ممکن ہے کہ اردو بھی نصیری ہو جائے

راقم الحروف نے مشاہدہ کیا کہ منقبت کی اصطلاح قدیم شعرا سے لےکر آج تک کے شعرا مجموعوں میں صرف حضرت علی علیہ السّلام کے لیے استعمال کی گئی۔ مجھے کوئی اس بات پر اصرار نہیں، کیونکہ اب منقبت کی اصطلاح چہاردہ معصومین علیہم السّلام کے علاوہ دیگر بزرگان دین کے لیے استعمال ہوتی ہے،لیکن آخر میں 'کلیات اعظم چشتی' مطبع حافظ جمیل پرنٹنگ پریس لاہور 2005۔دیکھتے چلیں صفحہ نمبر

58 منقبت علی المرتضی رضی اللہ عنہ، صفحہ نمبر 59 منقبت اہل بیت، صفحہ 60 منقبت علی المرتضی کرم اللہ وجہہ، صفحہ 61 امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، صفحہ 62 محبوب سبحانی غوث اعظم جیلانی، صفحہ 63 مدحت سلطان الہند غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہم، صفحہ 65 مدحت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ۔

مناقب سانیٹ، ہائیکو اور دیگر اصناف میں بھی لکھی گئی ہیں۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر نعیم نقوی کی کتاب 'سخن تمام روشنی' سانٹ ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اور دوسرے جناب فراست رضوی ہیں، نیر اسدی مرحوم نے مکمل ایک مجموعہ جناب ابوالفضل العباس کی مدح میں اور دوسرا مکمل مجموعہ 'فاتح قرطاس وقلم' امام حسن کی مدح میں اردو ادب کو دیا۔ گجرانوالہ پنجاب پاکستان کے شاعر امجد حمید محسن جنھوں نے ایک مکمل دیوان منقبت خاتون جنت سیّدہ النساء عالمین حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا 'چمن زارِ مودت' اور سیّد الشباب اہل جنہ امام حسن علیہ السّلام 'مدحت سردار جنت' مرتب کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں خانوادہ آئمہ طاہرین کے ہر فرد کے لیے بڑی تعداد میں مناقب مختلف ہیئتوں میں تخلیق پا رہے ہیں، جن کا آغاز بیسویں صدی کے اختتام سے پہلے شروع ہوا۔ ان میں جناب زینب سلام اللہ علیہا، جناب ام کلثوم سلام اللہ علیہا، جناب سکینہ بنت الحسین علیہ السّلام، جناب علی اکبر ابن الحسین علیہ السّلام، جناب قاسم ابن الحسن علیہ السّلام، شہزادہ علی اصغر ابن الحسین علیہ سلام، جناب ابوالفضل العباس علیہ سلام، امام زین العابدین علیہ السّلام، امام محمد باقر علیہ السّلام امام جعفر صادق علیہ السّلام، امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام، امام علی رضا علیہ السّلام اور ان کی ہمشیرہ معصومہ قم کی مناقب بڑی بڑی محفلوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ اسی طرح شام، کاظمین، کربلا اور نجف کے روضوں پر مخصوص تاریخوں میں ہندوستان پاکستان و دیگر ممالک کے اردو زبان کے شاعر اور منقبت خواں حضرات شریک ہوتے ہیں اور نئے کلام پیش کیے جاتے ہیں۔

نوٹ: گرامی مرتبت سیّد صبیح الدین رحمانی کا حکم تھا کہ مناقب چہاردہ معصومین علیہم السّلام کی مثالیں میں مرثیہ نگار شعرا کو شامل کریں، تمام کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون میں پھر بھی راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ کلاسکی اور جدید شعرا کے کلام سے مثالیں آپ تک پیش کر سکوں۔

□□□

چراغِ اہلِ جنّت کی بشارت پائی ہے جس نے
بفرمانِ علیؓ حیدر، عمرؓ فاروقِ اعظم ہیں

(رشید وارثی)

منقبت کا جدید تناظر، ایک تحلیلی جائزہ

غلام مصطفیٰ دائم

ABSTRACT: This article offers an analytical overview of modern Urdu MANQABAT, focusing on its deep connection with evolving religious thought and spiritual devotion. It highlights how contemporary MANQABAT reflects nuanced expressions of faith and examines the historical and intellectual contexts shaping the genre. Divided into three sections, the article first explores the intellectual evolution of MANQABAT, including key thematic and philosophical foundations. The second section discusses the concept of MANQABAT through diverse poetic examples, showing how poets have reinterpreted it over time. The final section analyzes current styles and themes, addressing the complexities in recent works. Overall, the article affirms MANQABAT's continued literary and cultural significance.

ایک ادبی فن پارہ کسی ممدوح کی مذہبی جہات کے استدلال کے ساتھ اس کی عظمت کے اظہار میں ہو تو وہ متن منقبت کا حامل ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ متکلم کا ممدوح مجموعی طور پر مسلم تہذیب کا ممدوح بننے کا اہل ہے کہ نہیں۔ منقبت میں ادبی متن ہی بنیادی شہادت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اندر کسی مذہبی فرد کی تحسین کا معنیٰ فعال رکھتا ہے یا نہیں۔ کیوں کہ شاعری متکلم کا منشا نہیں بلکہ عمل ہوتا ہے اور متکلم اپنے متن کی باطنی اندوخت میں جلوہ آرا معانی تک بعض اوقات نہیں پہنچ پاتا، جبکہ متن اس معنیٰ کو اپنی ملکیت میں ضرور رکھتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ خالص غزل کے شاعر کے ہاں ایسا شعر مل جائے جو اپنی فوری تاثیر میں حمد یا نعت کا شعر محسوس ہو، صرف یہی نہیں بلکہ اپنی مکمل ساخت میں وہ شعر حمدیہ یا نعتیہ ہونے پر شاہد بن جائے، تو اس میں بنیادی نکتہ یہی ہے کہ ممدوح کی تعیین یا اطلاق میں متن کا کردار ہی کلیدی ہوگا۔

منقبت کی کلاسیکی روایت میں چونکہ ممدوح کا دینی تشخص ہر ایک پر ظاہر تھا، یہی وجہ ہے کہ وہاں مدح میں تاثیر اور فوری اطلاق کا رویّہ پیدا ہوتا تھا۔ آج کا عہد جو اخلاقی اقدار سے تہی دامن ہے، ایسے میں متعدد صاحبانِ منبر و محراب اور وارثانِ جبہ و دستار اپنے اپنے دامِ تزویر میں انسانوں کو باندھ کر خود ساختہ عظمت کا لبادہ پہنے مذہبی رہنمائی کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ ایک طلسمی تقدس طاری کر کے عوام کی آنکھوں میں اپنے ظاہری و باطنی عیوب تک رسائی اور ادراک کو سخت گناہ قرار دے دیا ہے۔ ایسے میں غفلت شعار شاعروں کی زبانیں "تسبیحِ درود زَدَہ" کی طرح اپنا اصلی رنگ چھوڑ چکی ہیں۔ سچائی کی عادت نہ ہو تو کذب بیانی میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ آج کے مذہبی سیاق و سباق رکھنے والے عہد میں یہ بحث غالباً غیر ضروری سی معلوم ہو کہ کون منقبت کا اہل ہے اور کون نہیں! کیوں کہ ادبی متون کی قرائت شاعر کے عندیے سے کنارہ کشی اختیار کر چکی ہے۔ اصل دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ متن کی قوتِ جذب کتنی اور اس کا دائرۂ اطلاق کتنا وسیع ہے!

منقبتی شاعری میں ممدوح کوئی بھی ہو، متن میں کارفرما انسانی عظمت کے اشارات اور ممدوح سے متکلم کے ذاتی تعلق کی اساس پر پیدا ہونے والے معانی کا استخراج ہی جدید دور میں شعرفہمی کا مختار اسلوب ہے۔ ہاں! اس سے انکار نہیں کہ متکلم کی جہت سے ممدوح کی ذات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ عین ممکن ہے کہ ایک ادبی متن میں متعین ممدوح سے متعلق عظمت، روحانیت یا تاثیر کا کوئی پہلو برآمد نہ ہو لیکن متکلم کی جہت سے وہ ممدوح عظمت و سربلندی کا استعارہ ہو، اور جہان بھر کی روحانیت اسی کے دامنِ کرم سے وابستہ ہونے پر حاصل ہو۔ چونکہ انسان کے اندر مذہبی حوالے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی آستانے کا خود ساختہ پیر ہو یا کسی مدرسے میں چند سال گزارنے کے بعد منبر پر بیٹھ کر تقریریں کرنے کی اہلیت پا گیا ہو، بلکہ مذہبی حوالے سے مراد یہ ہے کہ وہ مذہب کی عائد کردہ پابندیوں کو پابندی جانے، دائرۂ شریعت سے قدم باہر نہ رکھے، دینی اور اخلاقی اقدار کا حامل ہو اور اپنی تعلیمات/عمل کے ذریعے روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر لوگوں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں لا رہا ہو۔ اسی لیے فی الاصل ادبی صنف منقبت کو اس کے اکثر ابعاد کے ساتھ ایک مستقل موضوعی شناخت کا حامل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جدید منقبت میں ممدوح کو معروضی رکھا جائے اور متن کی ساخت، باطنی اندوخت اور متکلم کے عندیے میں کارفرما روحانی اثرات کو متن سے مترشح کیا جائے۔ کیا اس پر یہ دلیل کافی نہیں کہ تجمل حسین خان کی مدح میں غالبؔ کا شعر متکلم کے عندیے سے نکل کر نعتِ نبی ﷺ کی شرف یابی کے لیے بارگاہِ رسالت مآب میں سرخرو ہو گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعر کا مزاجِ معنوی، ظاہری ساخت اور لفظوں کی گہری نسبتیں یہ سب مل کر معنیٰ کی تشکیل کرتی ہیں۔ اس میں شاعر

کے منشا کی وہی اہمیت ہے جو سورج کی موجودگی میں چراغ کی ہوسکتی ہے۔

اعتراف عظمت کی روایت بہت قدیم ہے، لیکن با قاعدہ منقبت نویسی اردو میں اٹھارویں صدی سے شروع ہوئی اور انیسویں صدی میں مجموعہ ہائے مناقب لکھے اور شائع کیے گئے۔ میری محدود معلومات کے مطابق اردو زبان میں پہلا مجموعۂ منقبت ۱۲۷۰ ہجری بمطابق ۱۸۵۲ عیسوی میں مکتبہ حیدری (بمبئی) نے شائع کیا۔ اس کے شاعر مولانا نجم الدین تھے۔ یوں انیسویں صدی کے نصف سے تا حال پونے دوسو سال میں مناقب کے بیسیوں مجموعے شائع ہوئے جو علی الاختصاص منقبت پر ہی مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ نعتیہ مجموعوں اور مختلف رسائل و جرائد میں منقبت کا سفر اب تک فنی اور موضوعی ہر دو جہتوں سے بہت آگے تک آ گیا ہے۔ فارسی سے قطع نظر صرف اردو منقبت نویسی کے موضوعاتی ارتقا کا ایک اجمالی بیان ضروری معلوم ہوتا ہے تا کہ نئے رجحانات سے آشنائی ممکن الحصول ہو سکے۔ پہلا معلوم مجموعۂ منقبت حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل اور بعد کے ادوار میں بھی صرف حضرت علی المرتضی رضی اللہ تعالی عنہ اور دیگر حضرات اہل بیت کی مناقب لکھی گئیں۔ اولیائے امت میں تا حال سب سے زیادہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو منقبت کا موضوع بنایا گیا۔

برصغیر کے منطقے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا کی کوششوں سے دین کا جامد وجود علمی اور جدید ابحاث کے باعث متحرک ہوا اور تقریبا پورے اسلامی ڈھانچے کے اصول و فروع کو از سرِ نو سمجھنے اور معاصر علمی ضرورتوں سے باہم متلازم کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اسی سفر میں اسلامی تاریخ اور اس کے نمائندہ اکابرین و اسلاف کی زندگیوں سے روشناسی کا ایک بھرپور رویہ ظہور پذیر ہوا، جس کی بدولت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علما و اولیاے امت کے سوانح اور فضائل و معارف کا نثر و شعر میں اظہار ہونے لگا۔ اس پر برصغیر کی تاریخ شاہد ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قران کے بعد کا علمی منظر نامہ بہت جلد ارتقا کے سفر پر روانہ ہوا۔ منقبت میں حضرات خلفائے راشدین اور دیگر اسلامی کرداروں کی مدح نویسی کا آغاز اگرچہ با قاعدہ طور پر بہت بعد میں ہوا، لیکن پندرہویں صدی کے آغاز میں ہی اس کے ابتدائی نقوش پیدا ہو چکے تھے، جبکہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں حمد و نعت کے بعد خلفائے راشدین کی مدح میں تین شعر کہے گئے۔

پندرھویں تا انیسویں، ان پانچ صدیوں میں منقبت نے نہایت ہلکی رفتار سے سفر کیا، لیکن ہیئت اور اسالیب، نیز موضوعات میں ارتقا ہوتا گیا۔ بیسویں صدی میں منقبت باضابطہ طور پر نعتیہ دواوین میں آنے لگی۔ الگ سے منقبت کے مجموعے شائع ہوئے۔ بیسویں صدی عیسوی کا پہلا مجموعۂ منقبت "فتوح

الآخرۃ" ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ہفت بند منقبت شمشاد لکھنوی کے تلمیذ عبدالرزاق بے کس جبل پوری کی نگاشتہ ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ "جناب امیر علیہ السلام" کی مناقب پر مشتمل یہ مجموعہ فنی خوبیوں کی معراج ہے۔ موضوعاتی تنوع، لفظوں کے مابین نسبتوں کی نادرہ کاری، مستحسن مبالغے اور دیگر فضائل و کرامات سے لبریز یہ مختصر مجموعہ صنفِ منقبت میں خاصے کی چیز ہے۔

حضرات خلفائے راشدین کی مناقب بیسویں صدی میں مل جاتی ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ حسام الدین فاضلؔ نے چاروں خلفائے راشدین پر الگ الگ تذکرے لکھے اور ان میں جابجا مناقب بھی کہیں۔ ان کے زمانے میں دلورام کوثری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بیت المقدس کی مناقب تحریر کیں۔ صدی کے نصف میں "محامد الخلفاء، یعنی مناقبِ خلفائے راشدین" کے نام سے حافظ اخلاق احمد صدیقی نے نظم و نثر میں خلفائے راشدین کے فضائل مرتب کیے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے اشعارِ منقبت سے کتاب کا آغاز کیا گیا اور کتاب کے اندر مختلف شعرا کے کلام ہائے مناقب سے انتخاب کر کے متعلقہ مقامات پر چسپاں کیا گیا۔ یوں یہ صدی کثرتِ تعداد میں ماقبل ادوار سے آگے بڑھتی ہوئی تا حال اس مقام پر آ پہنچی ہے کہ سینکڑوں مجموعے مناقب کے لکھے جا چکے ہیں، اور نعت و منقبت کے مشترکہ مجموعے اس پر مستزاد۔ اس تمام دور میں موضوع کے لحاظ سے جو ارتقا ہمارے مشاہدے میں آیا ہے وہ پچھلے تین صدیوں کے مجموعی ذخیرۂ مناقب کی روشنی میں حسبِ ذیل گراف کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔



ہر صدی میں کُل پانچ ستون ہیں۔ بائیں جانب سے ان ستونوں سے بالترتیب وہ پانچ اُمور مراد ہیں جو گراف کی جبین پر تحریر ہیں۔ بائیں جانب عمودی اعداد کُل فیصدی اعشاریے کو ظاہر کر رہے ہیں جبکہ ستونوں کے اوپر اعداد حاصل فیصدی کے طور پر ہیں۔

فکری ابعاد اور موضوعاتی تنوع کا گراف چڑھتا گیا، لیکن ممدوح کی سیرت اور واقعی احوال سے شعری میزان میں نشیب وفراز آتا رہا، اور عصرِ جدید/ اکیسویں صدی میں اب مزعومہ فضائل پر سارا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ مناقب سے سیرت کا عنصر کم سے کم ہوتا جا رہا ہے، اس کی چند وجوہات ہیں۔ مثلاً بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار، تصوراتی تشکیل کی رجحان کاری، مادی منزلوں کی طرف میلان، مذہب بیزاری کی عمومی لہر، معنوی اقدار کے بدلتے ہوئے مفاہیم اور نئی ثقافتی شناخت وغیرہ۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے منقبت میں ممدوح کی سیرت کے انقلابی اور ہمہ گیر پہلوؤں کا ایک تصوراتی بیان تو در آیا ہے، لیکن حقیقی زندگی کے انسانی پن کی روشنی میں پیدا ہونے والے شخصی فضائل کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی۔ ایسا نہیں کہ ممدوح کی سیرت کے واقعی پہلو کا نہ ہونا منقبت کے لیے کوئی بہت بڑا عیب ہے، بلکہ اس کی بعض مثبت جہتیں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر عصری مسائل کی عکاسی میں ممدوح کی فکری میراث کا لوازمہ شامل کر کے بڑے معنی پیدا کرنا ممکن الحصول ہو گیا ہے۔ نیز سوانحی قسم کے مضامین سے قطع نظر تخلیقی اظہار کی بدولت ممدوح کی ذات کو خیر کی علامت بنانا دائرۂ امکان میں آ گیا ہے۔ عہدِ جدید کی منقبت نے یہی کام ایک معمولی تناسب کے ساتھ کیا ہے۔ منقبت کا وہ سفر جو اردو زبان کی ابتدا سے اب تک اس کے ہمرکاب رہا، معاصر منظرنامے پر اس میں متنوع تغیرات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اختصار کے ساتھ مابعد سطور میں معاصر اور ماقبلِ معاصر منقبت کے اکثری ذخیرے کی روشنی میں منقبت کی شعریات، فکری ابعاد اور دیگر مسائل ومباحث کو حیطۂ تحریر میں لایا جائے گا۔

انسان سمیت اس کائنات میں ہر چیز کو خدائے تعالی نے اسبابِ مدح سے لبریز تخلیق کیا ہے۔ حسن کی تحسین اور اس کے اظہار کا جذبہ انسان میں ودیعت فرمایا گیا۔ خود خدائے تعالی اس وصف سے متصف ہے کہ وہ اپنی اس متوازن اور تحت الاصول چلنے والی کائنات کے حسنِ معنوی و ظاہری کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ”اِنَّ اللّٰہَ جَمِیۡلٌ وَ یُحِبُّ الۡجَمَالَ“ کا یہی مفہوم ہے۔

انسان کے اندر اسبابِ فضیلت کی فہرست طویل ہے اور اس کے تناظرات بھی مختلف ہیں، تاہم اس کا مذہبی حوالہ نہ صرف انسانوں کی دنیا میں اسے قابلِ شرف بناتا ہے بلکہ خود خدا تعالی کے ہاں بھی اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مذہبی حوالے سے مراد یہ ہے کہ مذہب کے عائد کردہ اصولوں اور حدود کے اندر رہنے والا انسان ہی عند اللہ پسندیدہ ہے اور وہی صاحبِ فضل واکرام ہے۔ منقبت کی تعریف ہی مذہبی بنیاد پر کسی انسان یا غیر انسان شے کی تعریف کرنا ہے۔ مذہب انسان کی ضرورت ہی نہیں اس کی تہذیبی اور اخلاقی تزئین کے واسطے ایک متعین اصول بھی ہے، جس سے روگردانی کر کے ظاہری بنیادوں پر ایک متوازن اور خوب صورت دکھائی دینے والی تہذیبی ساخت اپنے باطن میں سخت ترین بگاڑ کا شکار

رہتی ہے۔ ادبیات میں منقبت محض برتر ذات یا شے کی مدح مذہبی تناظر یا نسبت کی بنیاد پر کرنا ہے، تاہم کلاسیک منقبت نویسی کی پوری شعری روایت میں حضرات اہلِ بیت النبی/ خاندانِ رسول کی مدح ہی کے لیے منقبت کا لفظ بولا یا استعمال کیا جاتا رہا۔ چونکہ ہمارا موضوع جدید منقبت نویسی ہے، اس لیے ہم "منقبت" سے مراد صرف خاندانِ رسول کی مدح نہیں لیں گے بلکہ عصرِ جدید میں منقبت کا جو دائرہ کار ہے، اس کی روشنی میں اپنی معروضات پیش کریں گے۔

شخصی اختصاصات کا اقرار اور ان کی عظمتوں کا اعتراف کسی بھی تخلیق کار کا حسنِ ظرف ہوتا ہے۔ تہذیب کے نمائندوں کی حیثیت سے انبیا، اولیا اور علما نے ہر دور میں اپنے کردار وافعال سے معاشرے اور سماج میں فکری تربیت کے خد و خال وضع کیے ہیں۔ ان کی ان گوناگوں جہتوں کی تحسین (Appreciation) کرنا بجائے خود حسن افزا عمل ہے۔

شعری صنف "منقبت" شخصی عقیدت کی آئینہ داری پہ منتج ہوتی ہے۔ اس کی اساس شخصی خوبیوں سے اٹھتی ہوئی ممدوح کے ذاتی وکسبی فضائل کے بیان پر منتج ہوتی ہے۔ اس میں کسی عظیم فرد کے خصائل و شمائل کا بیان عقیدت اور دانش کے حسین توافق سے ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ سادہ قلبی جذبات کی ترجمانی کا بیان ہوتا ہے، لیکن باقاعدہ شعری صنف ہونے کی وجہ سے اس کی شعریات اور فن سے آگہی بھی لازمی ہے۔ اسے محض جذبات کہہ کر فن کی کمزوری کو روا نہیں رکھا جا سکتا، بلکہ فنی پہلوؤں کو مضبوط ترین آلہ فراہم کرنا بھی لازمی ہے۔ اور اس میں یہ جہت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ منقبت میں موصوف کردار کسی نہ کسی جغرافیائی سطح کا نمائندہ یا متعلقہ تہذیب کا کارندہ ہونے کی حیثیت سے بعض معتقدات کا حامل ہوتا ہے۔ ان معتقدات کی فکری وثقافتی درجہ بندی کرتے ہوئے معاشرے کی اخلاقی قدر میں اس مشخص کردار کی معنویت کا کیا زائچہ بنتا ہے؟ اس کی دریافت بمع اظہار منقبت نگار شاعر کا فریضہ ہے۔ اور اسی اصول پر منقبت کی تخلیق وتفہیم ہو سکتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بالخصوص اور گزشتہ چار دہائیوں میں بالعموم اردو منقبت نے ارتقائی منازل طے کی ہے۔ اس مجموعی عہد کے نظام شعر گوئی کا جائزہ لیں تو ہمارے مشاہدے میں آتا ہے کہ اردو منقبت میں فکری ابعاد اور ادبی اسالیب سمیت شعر کی تخلیقی ساخت، موضوعات اور ادبی تکنیکوں نے ہمہ نوع صورتیں اختیار کی ہیں اور آغاز ہی سے مناقب پر باقاعدہ مجموعوں کی اشاعت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی تاریخ اور اسلافِ امت کے مطالعے کے زیرِ اثر ان کی مدح و منقبت کا رجحان زیادہ ہوا ہے۔ جدید اردو غزل کی ہم رکابی میں جہاں نعت نے اپنی رفتار برابر رکھی، وہیں منقبت کا سفر بھی رواں رہا۔ جدید منقبت میں لفظِ "جدید" سے ہمارا اشارہ اس اجتماعی شعور کے نتیجے

میں پیدا ہونے والی منقبتی شاعری کی جانب ہے جو اسلامی تاریخ کے ازسرِ نو مطالعے اور اسلاف سے اپنے تعلق کے اجتماعی احیا کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ قیامِ پاکستان کے بعد زیادہ نمایاں ہوا۔ جہاں اسلامی ادب اور دیگر چیزیں آئیں، وہیں منقبت نے بھی اپنی صنفی شناخت کے انفراد کے ساتھ اپنے راستے نکالے اور ان پر جگہ جگہ مختلف فکری سرائیں بنانا شروع کیں۔

جدید منقبت کا نظامِ شعر گوئی بہت بلیغ اور اعتقادی صلابت پر منتج ہے۔ ہیئت کے فرق کے ساتھ مختلف شعرا کے ہاں منقبت کا فکری لوازمہ اپنے متنوع زایچے کے ساتھ موجود ہے۔ اس نظامِ شعر گوئی کو تین ذیلی عنوانات کے تحت دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جدید منقبت کا تصورِ مدح
معاصر منقبت کا اسلوبی منہاج
جدید منقبت کا فکری منظرنامہ

جدید منقبت کا تصورِ مدح

منقبت کے روایتی تصور میں اولاً صرف حضرات اہلِ بیت النبی ہی کی مدح منقبت کے عنوان تلے کی جاتی تھی، تاہم بعد ازاں دیگر صحابہ، خلفائے راشدین اور اولیاے عظام کی عظمت وشان کا شعری اظہار مناقب کی ثروت مندی میں اضافہ کرنے لگا۔ لیکن جدید عہد میں منقبت کا تصور اپنے موضوع اور ممدوح دونوں اعتبار سے وسیع ہو چکا ہے۔ ہر وہ شخص جس کی مدح مذہبی حوالے کی بنیاد پر کی جائے وہ منقبت کہلاتی ہے۔ بلکہ راقم الحروف کے نزدیک غیر انسان چیزوں کی مدح بھی اگر مذہبی حوالے کی اساس پر ہو تو وہ بھی منقبت کہلائے گی۔ جدید منقبت کا تصورِ مدح یہ ہے کہ مذہبی بنیادوں پر کسی کی مدح کا شعری اظہار جس میں اس کے شخصی (انفرادی) اور عمومی (اجتماعی) محاسن کا ذکر ہو، نیز ممدوح کی تہذیبِ ذات کی اکثر نسبتوں کا انکشاف بایں طور ہو کہ وہ پورے نظامِ حیات کے لیے اپنے محاسن کی بنیاد پر ایک قالب بن جائے اور مکمل تہذیبی اکائی کی صورت گری کرے۔ اس معنی میں کمال جعفری کا برمحل شعر ہے کہ:

پھر ہے سرگرم ہر اک سمت یزیدی لشکر
اس لیے پھر یہ زمانہ ہے طلب گارِ حسین

"حسین" اس شعر میں کسی فردِ واحد کا نام نہیں، بلکہ یہ علامت ہے یزیدیت کے خلاف حق کی آواز بن کر ڈٹ جانے کی۔ ایک اصول بن گیا کہ جب بھی تہذیبِ انسانی پر حق و باطل کے ٹکراؤ کی صورت میں کوئی غیر معمولی انقلاب درپیش ہو تو حسینی کردار کو ادا کیے بغیر اس کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ حسین

ایک تہذیبی قالب ہے جو ہر زمانے میں حق کی صورت سازی کرتا ہے۔عصرِ جدید چونکہ اقدار اور حق شعاری کی فطری کشش سے محرومی پر منتج ہو چکا ہے، اس لیے جدید منقبت اس حرمان نصیبی کے احساس میں ڈوب کر اقدار کی پاسداری کی آواز بن چکی ہے اور حق میں پھر سے وہ دلکشی پیدا کرنے کی امنگ لیے ہوئے ہے جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

منقبت کے آخری آٹھ عشروں میں دو طرح کے نمایاں رجحانات کا واضح اور متوازی سفر رہا۔ فضیلت کا عمومی اظہار اور عظمت کا خصوصی اظہار۔ اول میں باوجود اجتماعی فضا قائم کرنے کے، ایک قسم کی تنزّلی (Peak-to-Through) کا گراف مسلسل چڑھتا رہا ہے۔ اس میں ممدوح کے اختصاصی فضائل نہ ہونے کی وجہ سے اس کی مرکزیت تک فنا ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ کی مناقب میں ان کا بابِ شہرِ علم ہونا، دامادِ رسولؐ ہونا، خلیفۂ راشد ہونا، عشرہ مبشرہ میں سے ہونا اور فاتحِ خیبر ہونا منہا کر دیا جائے تو، اگرچہ اس کے علاوہ بھی ان کے فضائل ہیں، لیکن جن اصولوں کی اساس پر ان کا محوری کردار قائم تھا، وہی نہ رہیں تو اس ممدوح کا مدحیہ پہلو مزعومہ پن کے ساتھ بے دلیل ہو جائے گا اور یوں اس سے متعلق انسانوں کا کوئی بڑا تعلق نہ بن سکے گا۔ کیوں کہ عمومی اوصاف کا حامل ایک عام سا انسان بھی ہو تو وہ لائقِ تحسین ٹھہرتا ہے، جبکہ صحابہ کرامؓ تو اعلیٰ ترین درجے پر مکارمِ اخلاق کا نمونہ تھے۔ اور یوں بھی اخلاقی تناظرات میں لائقِ مدح اوصاف میں جتنے بھی عمومی اوصاف ہیں، ان سے متصف ہونا علی العموم انسانی رویہ ہے، اس میں صرف مسلمان خاص نہیں ہیں۔ حیا، خندہ روئی، سخاوت، صلہ رحمی وغیرہ۔ مناقب میں ممدوح کو باحیا کہنا، غنی سے ملقب کرنا، صفتِ رحم و کرم سے متصف کرنا وغیرہ، یہ تخلیقی مدح نہیں کہلائے گی۔ یہ رویہ جدید منقبت میں عام ہے۔ جس کثرت سے مجموعہ ہائے مناقب چھپ رہے ہیں، ایسی عمومی وصف کاری کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ بہت کم شعرا کے ہاں مدح کے تخلیقی پیرائے ملتے ہیں۔ مدح کے تخلیقی پن کا معنی مزعومہ مدح نہیں ہے، بلکہ وہ مدح ہے جس سے ممدوح حقیقی طور پر متصف ہو۔ پھر اس میں مزید گوشے نکالنا اور مدح اور ممدوح کے مابین وہ عینی نسبت قائم کر لینا کہ وصف علامت بن جائے یا ممدوح وصف کا استعارہ قرار پائے۔ یہ تخلیقی عمل اپنے عمدہ قرینوں کے ساتھ جدید منقبت میں اقبال، حفیظ تائب، عاصی کرنالی، سید نصیر شاہ، انصار الہ آبادی، سرور بجنوری، حافظ لدھیانوی اور حافظ مظہر الدین وغیرہ کے ہاں موجود ہے۔ کئی غیر معروف یا قلیل سرمایۂ منقبت کے حامل شعرا کو بھی اس ذیل میں شامل رکھا جا سکتا ہے، جن کے حوالے مضمون میں موجود ہیں۔

دوسرا رجحان یہ رہا کہ ممدوح کے شخصی مدائح میں کلیدی حوالوں کے تذکار سے اس کی انفرادیت اور مرکزی نسبت کی آگہی حاصل ہوئی اور اس نسبت سے تعلق کی ضروری جہتیں قائم ہوئیں۔ مثلاً

حضرت عثمانؓ کا خاندان بنوامیہ ہے، لیکن دوہرے دامادِ رسولؐ ہونا ان کا وہ شرف ہے جوان کے علاوہ کسی بھی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں۔ بلکہ تین مرتبہ جنت کی خوش خبری پانے والے صحابی بھی ہیں۔ان کی اس فضیلت کا فیضان ہمیں نبی اکرمؐ سے ان کے قرب اورنسبت کے حیا کا پتہ دیتا ہے۔ ان سے متعلق حیا کا بیانیہ اس فضیلت سے مزید دوآتشہ ہوجاتا ہے کہ نبیؐ کا داماد عام لوگوں سے زیادہ حیا دار ہوگا،اورواقعتاً ایسا ہی ہے۔

ان دونوں رجحانات نے اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔لیکن کئی شعرانے باوجودرسمی پن کے، اپنی درّاکی کے باعث کسی فکری یا فنی انفرادیت کی غمازی کرتی ہوئی منقبت کہی۔ یہاں کھوٹے سکّے بھی خوب چلے۔شایداس لیے کہ ان کی روشنی میں اختصاصی پہلوؤں کے حامل رجحانات کی تعیینِ قدر کا عمل طے ہوسکے۔ذیل میں چند اہم فنی باریکیوں کے حامل اشعار پیش ہیں جومنقبت کی جدید فکریات میں کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے۔

انجم نیازی کا نام تقدیسی ادب کی فضا میں نامانوس نہیں ہے۔انھوں نے صحابہ کی مدح سرائی میں اپنا فن وقف کردیا۔حضرت مصعب بن عمیرؓ کی منقبت میں ان کا شعر ہے کہ:

آپ قرباں ہو گئے خیر البشرؐ کے نام پر
اک ستارہ جل بجھا اجلی سحر کے نام پر

اعلائے کلمۃ الحق کے لیے ہزاروں صحابہ کرام نے شہادت کا جام نوش کیا، انھی میں ایک سیدنا مصعب بن عمیرؓ بھی ہیں۔ بین الاصحاب شہادت کی عمومی فضیلت کے اس بیان میں چندفنی خوبیاں بھی ہیں۔''جل بجھنا'' لکھنؤ کا فصیح محاورہ ہے۔تاہم اس کے بعض معانی ایسے ہیں جوزیرِنظر شعر میں مرادنہیں لیے جاسکتے۔جل کر خاک ہوجانا، رنجیدہ خاطر ہونا، کوئلہ ہوجانا، سوختہ ہونا وغیرہ۔ تاہم مصرعِ اول ہمارے لیے اس محاورے کی معنویت کاتعین کرتا ہے۔ لگے بندھے محاوراتی معانی کی تصریف اگر بے جواز ہوتوعیب ہے، ورنہ قادرالکلامی۔مصرعِ اول میں'' قرباں ہونا'' میں جوخودنثاری ہے، وہ'' جل بجھنا'' کے معنیِ مذموم کوختم کردیتی ہے۔اب اس محاورے کا مطلب یہ ہوا کہ اک ستارہ اجلی سحر کی عظمت کے اعتراف میں اپنے وجود کی نفی کرگیا۔یہ نفی کرنا بندگی اورغلامی کی وجہ سے ہے، نہ کہ غیراہم اورغیرضروری ہونے کے باعث۔انجم نیازی جیسے منقبت کے کثیرگوشاعر کے ہاں ایسی باریکیاں سرِراہ مل جاتی ہیں۔

منقبت میں ممدوح کی عظمتِ آفاقی کا بیان کثرت سے آیا ہے، تاہم کہیں بے جواز مبالغے کی بھینٹ چڑھ گیا، اورگاہے بے تاثیر ہوکراپنی اٹھان ہی میں ڈھے پڑا۔لیکن کمالؔ کے مندرجۂ ذیل شعر میں شہزادیِ کونین کی عظمت کا عالم گیراظہاراس پیرایۂ بیان سے ہوا ہے کہ نہ مبالغہ آرائی ہوئی، نہ تاثیر کا

تناسب گرا۔کمالؔ امروہوی نقوی نے سیدہ فاطمہ زہراؓ کی مدح میں کہا:

انھی کے دم سے قائم ہے جہانِ عالمِ نسواں
زمانے میں شرف عورت کا زہراؓ کی بدولت ہے

سیدۂ کائنات کی وہ عظمتیں جو انھیں ان کے والد اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانِ اقدس سے عطا ہوئیں، وہ اس کی غماز ہیں کہ عورت کا افتخار ماں اور بیوی ہونے میں تو ہے ہی، بیٹی ہونے میں ان سے بڑھ کر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جس طرح بیٹی کا اِکرام کیا اور امت کو اس کی تعلیم فرمائی، اس سے قبل انسانی تاریخ میں اٹھنے والی کوئی بھی تہذیب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نعیم میرٹھی نے امام حسین علیہ السلام کی منقبت میں کہا:

رہتا ہے جو حسین کے غم کی پناہ میں
ٹھہرا ہے معتبر وہ خوشی کی نگاہ میں

"غم کی پناہ میں رہنا" اور "خوشی کی نگاہ میں معتبر ہو جانا" غمِ حسین میں مبتلا ہونے کے سبب سے ایسا قولِ محال (Paradox) ہے جو اپنی تہذیبی سچائی کی بدولت آفاقی معنویت کا حامل ہے۔غمِ حسین وہ نسبتِ تعلق ہے جو ہر لحظہ بندۂ عاشق کو اپنے ممدوح سے تعلق کی نئی نئی جہتوں میں فعال اور زندہ رکھتی ہے۔ممدوح کی عظمت کا اعتراف اسے جب تک محبوبِ تمام نہ بنالے، تعلق کا تکملہ نہیں حاصل ہوسکتا۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی بقائے تہذیب کا وہ المیہ (Tragedy) ہے جو اپنے انجامِ خوش آثار پر منتج ہو کر المیہ نہیں رہتا بلکہ انبساطیہ بن جاتا ہے۔کیوں کہ دائمی بقا کی جستجو میں تمہیداً ایثار و وفا کی اساس فراہم کرنا ہر بڑے انقلاب کے لیے لابدی امر ہے۔غمِ حسین علیہ السلام کا مکمل احساس یہی ہے کہ بندۂ مؤمن خودسپردگی سے رضائے الٰہی میں باریاب ہو جائے۔یہ باریابی خوشی کا باعث تو ہوگی ہی، اعتبارِ حیات کی کمک مہیا کرنے میں کلیدی کردار کی ساخت بھی اسی سے تشکیل دی جائے گی۔منقبت میں ایسا محال بیانیہ (Paradoxical Narrative) تبھی ممکن الحصول ہے جب غمِ حسین علیہ السلام کی کلیت کا احصا پورے وجود وشعور کے لیے اندوختۂ معنی بنالیا جائے۔غمِ حسین علیہ السلام کا منہاجِ معرفت جب تک دل گرفتگی کا باعث نہ بنے، یہ غم اپنی لغوی معنویت سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔مثلاً ضیاءؔ حسین پوری نے بات بنانا چاہی مگر بن نہ سکی:

محو دل سے ابتلائے کربلا ہوتا نہیں
یہ غمِ شبیر تو ہم سے جدا ہوتا نہیں

نعیمؔ میرٹھی کے شعر میں غم کی نسبت سے قوافی میں آواز کی اٹھتی ہوئی شکستگی غم کے تصور میں گھلاوٹ

کی آمیز کر رہی ہے۔ نعیمؔ کا یہی افتخارِ فن ہے کہ وہ کیفیت کو آواز سے ظاہر کر لیتے ہیں۔ تقدیسی شاعری کی تنقید میں آواز کی اہمیت پر تا حال سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ بعض شاعروں کی شعری آواز بانگِ اسرافیل ہوتی ہے جو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور کچھ کی آواز میں ریت کی سرسراہٹ کا سا مدھم شور ہوتا ہے۔ شاعری میں آواز اتنی اہم ہے کہ یہ معنی میں اضافہ کرتی اور کیفیت جاری کرتی ہے۔ اور یہ کیفیت ایسی شے ہے جو اردو غزل میں میرؔ کے بعد اب تک کسی کی گرفت میں نہیں آسکی۔

سرورؔ بجنوری نے درمدحِ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہا کہ:

چھوڑا نہ کبھی ساتھ رسولِ عربیؐ کا
شاہد ہے مرے قول پہ ہجرت کی رفاقت

اس شعر میں باریکی یہ ہے کہ ہجرت سے بڑھ کر کوئی مقامِ حقِ دوستی نبھانے کا نہیں ہوتا۔ سیدنا صدیق اکبرؓ کو اس موقع پر خود رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے منتخب کیا اور ان کے تعلق بالنبی کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔

ہجرتِ مدینہ کی اساس پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی مناقب کا مضمون تقریباً سبھوں نے باندھا ہے۔ کہیں مجرد، گاہ تقابلی صورت میں۔ مجرد اظہارِ عظمت میں مضمون پیدا کرنا سہل ہے، تاہم تقابل میں ہجرت کے موضوع پر سید یوسفؔ بخاری دہلوی یہ شعر قابلِ دید ہے:

شبِ ہجرت میں سوئے سیدِ عالمؐ کے بستر پر
علیؓ کی اس شجاعت کا بیاں صدیقِ اکبرؓ ہیں

اس شعر کے دو معانی ہیں۔ مذموم معنی یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ شبِ ہجرت میں جو رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ رہے۔ اس رفاقت نے سیدنا علی المرتضیٰ کی شجاعت کو اعتبار بخشا ہے۔ اگر یہ رفاقت نہ ہوتی اور رسول محتشم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تنہا سفرِ ہجرت پہ رخت بردوش ہوتے تو شاید سیدنا علیؓ کی شجاعت معرضِ سوال بنتی۔ لیکن رفاقتِ صدیقؓ نے اس شجاعت کا بھرم رکھ لیا۔ دوسرا اور محمود معنی یہ ہے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہ امانتوں کی حفاظت سمیت، اگلی صبح ہجرت کے ارادے سے سونا شجاعت کا منتہا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس شجاعت کا بیان صدیق اکبرؓ اس طرح ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ سفر کرنا اور امانتوں کی حفاظت کے لیے کاشانۂ نبی میں قیام کرنا دونوں امور جاں نثاری کے متقاضی تھے، تاہم بسترِ رسول پہ رات گزارنا بڑی قربانی تھی جو سفرِ ہجرت میں معیتِ صدیقؓ کے باعث سیدنا علیؓ کے حصے میں آئی۔ تقابل میں یہ عجیب وغریب شعر بیک وقت دونوں اصحاب کی مدح میں ہے۔

اسی پس منظر میں منیر سیفی کا یہ شعر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے:

ایک آیت سو رہی تھی اس کے بستر پر منیرؔ
اور جاری تھا مدینے کو سفر قرآن کا

تقابل کی جمالیات میں کوثرؔ نیازی کا یہ شعر بلا استثنا معیار ساز ہے:

فاروقؓ یہ کہتے ہیں: وہ آقا ہیں ہمارے
دیکھے تو کوئی اوج بلالِ حبشیؓ کا

نیز سرشار صدیقی کا یہ شعر بھی اس ذیل میں عمدہ ہے:

وہ شہرِ علمؓ، فصیلِ یقیں میں ہے آباد
حصارِ بازوے صدیقؓ ہے کہ شہر پناہ

صحابہ کرام کی عظمتِ شعری کا اکتشاف مخزنِ حدیث کی خوشہ چینی کے بغیر ممکن نہیں۔ کیوں کہ صحابہ کرام کے اولین مدح سرا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ یونہی صحابہ کرام کا باہمی تعلق بھی اسی منہاج (یعنی رحمآء بینھم) پر تھا۔ یہ مدح تحسین اور طمانیتِ قلب فراہم کرنے کے لیے تھی، تاکہ صحابہ دین پر اپنی استقامت پر شکرانۂ خدا بجا لائیں اور اپنی دینی حیثیت کے ادراک کو اپنی سابقہ حالت کے متقابل رکھ کر بندگیِ خدا سے شرف یاب ہوں۔ حضرت بلال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول صحیح بخاری، رقم الحدیث ۳۷۵٤ کے تحت یوں مندرج ہے: أَبُو بَكْرٍ سَيِّدُنَا وَأَعْتَقَ سَيِّدَنَا يَعْنِي بِلَالًا ”حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہماری سردار ہیں، جنھوں نے ہمارے سردار یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کیا۔“

یہی روایت کوثرؔ نیازی کے پیشِ نظر رہی ہے۔ کتبِ حدیث میں فضائلِ صحابہ کے ابواب سے استفادہ اور ان عظمتوں کا شعری اظہار جو اصحاب کو حاصل تھیں، منقبت کا خاص مطلوب ہے۔ مثلاً بابر حسین بابرؔ نے ذخیرۂ حدیث سے استفادہ کرتے ہوئے ایک روایت کو ضمناً یوں اظہار میں لایا ہے:

نبیؐ کی پاک زوجہ اُمِّ سلمہؓ سے یہ مروی ہے
لقب بنتِ محمدؐ کو ملا خاتونِ جنت کا

فنی خوبیوں کے تسلسل میں منظرؔ عارفی کے دو شعر خصوصیت کے ساتھ ملاحظہ کریں۔ پہلا شعر حضرت عبداللہ، والدِ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں ہے:

آپ کا نام کوئی لکھ دے کفن پر جو مرے
حشر تک پیار کرے گورِ غریباں مجھ سے

عارفی کے شعر میں ممدوح کے نام سے رعایت لی گئی ہے۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدِ گرامی سیدنا عبداللہ کی منقبت میں یہ شعر بظاہر سادہ مگر اندرون میں باریک ہے۔ اس کے دو پہلو نہایت لطیف ہیں اور غالباً ماتن کے ہاں یہی پیشِ نظر رہے ہوں۔ اول یہ کہ بطورِ لباس کفن مُردے کا حصار ہوتا ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ دوم، اس پر "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ لکھ دینا یہ شہادت ہے کہ مرنے والا مقامِ بندگی پر فائز تھا۔ جس شخص کے لیے خدا کا بندہ ہونے کی شہادت اس کا حصار بن جائے، اسے قبر متبرک اور خوش آیند مہمان ہی سمجھے گی۔ نیک بندگانِ خدا کے استقبال میں قبر کی خوش افزا گفتگو کتبِ احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے۔

مدحِ حضرت آمنہ، والدۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں انھی کا شعر ہے:

تصور اس طرح ان کا دماغ و دل پہ چھاتا ہے
فضاؤں پر بہاریں جیسے، جیسے گیت شیون پر

یہ شعر صنعتِ تحویل الحال سے مزین ہے۔ لفظِ "آمنہ" کے معنوی اشتقاق سے استفادہ کر کے مضمون بنایا گیا ہے۔ بہاریں خزاؤں کے تعاقب میں آتی ہیں اور خزاں رسیدگی کو ڈھانپ لیتی ہیں، یونہی گیت شیون پر آ کر اس کا سابقہ اثر زائل کر دیتے ہیں اور ایک تازہ انبساط سے دامنِ دل بھر دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہ کا نام دماغ و دل پر چھاتا ہے۔ چھا کر کیا کرتا ہے؟ یہ قاری کے فہم پر رکھا کہ وہ اسمِ ممدوح کی رعایت تک باریاب ہو سکے گا یا نہیں۔ کیوں کہ لفظِ "آمنہ" کا معنی ایمان والی، امن والی اور امانت والی ہے۔ یہ تینوں اچھے اوصاف اپنے متقابل برے اوصاف پر آ کر ان پر چھا کر انھیں بے نام ونشان کر دیتے ہیں۔ مولانا نعیم الدین مرادآبادی کا شعر یاد آیا:

آمنہ کے تین معنیٰ بالیقیں بالامانت، امن وایماں آمنہ

عارفی کی اکثر مناقب میں ایسی ہی لطافتیں اور نکتہ در نکتہ باریکیاں موجود ہیں جو ان کی فنی بالیدگی، فکری گہرائی اور اظہار کی گیرائی پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک شعر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی منقبت میں قابلِ غور ہے:

مرحبا! محبوبِ ربؐ کو ہوگا وہ کتنا عزیز
آپؓ جس مؤمن کے ذہن و دل میں مہماں ہوگئیں

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شان میں منظر عارفی کا یہ شعر امہات المؤمنین سے عقیدت واحترام کے فروغ میں اچھا شعر ہے۔ یہاں بھی عارفی کا خاص رجحان، یعنی "باریک بینی" کارفرما ہے۔ عموماً جدید مذہبی شاعری میں بیانِ عقیدت تو ہوتا ہے لیکن وہ اس فنی گہرائی سے اکثر تہی دامن ہوتی ہے جو

ایک شعر کو ادبی پیمانے پر پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ تاہم عارفی کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ نہ صرف تفہیمِ شعر کا آدرش رکھتے ہیں بلکہ شعر کہنے میں وہ باریکیاں لاتے ہیں جو عصری منظر نامے کے لیے ناگزیر حیثیت کی حامل ہیں۔ مندرجۂ بالا شعر میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ذہن و دل کا مہمان بنانے، یعنی ان سے عقیدت و احترام کا تعلق قائم کرنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ دل احترام کا مصدر ہے جو عظمت کی نئی نئی شکلیں پیدا کرتا ہے، جبکہ ذہن اس مزعومہ احساس کو استدلال فراہم کرتا ہے۔ جو عقیدت استدلال حاصل کر لے، وہ لازوال بن جاتی ہے۔ ازواج النبی کو ماں سمجھنا اور اس پر ذہنی استدلال قائم کرنا منقبت کا بہت تازہ مضمون ہے۔ لفظِ "مہماں" کثیر الجہت ہے، اور اس کے تمام معانی اس شعر میں مراد لیے جا سکتے ہیں۔ لفظ کو معنی کی تشکیل میں لچک دار بنا دینا بجائے خود ایک خوبی ہے، اس پر مستزاد لفظِ مؤمن کا اشارہ آیتِ قرآنی کے اس حصے "و ازواجه امهاتهم" کی جانب ہونا تقدیسی آفاق روشن کرتا ہوا عمدہ شعر ہے۔

اس منقبت کا ایک اور شعر قابلِ ذکر ہے۔

آل و اولادِ نبی کی آپ اساسِ اولیں
خاندانِ مصطفیٰ کا آپ عنواں ہو گئیں

"اساس" اور "عنوان" دونوں الفاظ کا مدلول اور وجہِ دلالت تو واضح ہی ہے، البتہ ایک تاریخی نکتہ اس شعر میں مضمر ہے جس کا انکشاف ضروری ہے۔ آل و اولادِ نبی کا عنوان ہونے میں یہ معنی ہے کہ حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام اولاد سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔ حضور کی آل ان کی بیٹیوں سے چلی، اور تینوں بیٹیاں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بطنِ طاہر سے ہیں۔ یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام نواسوں نواسیوں کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا واحد نانی ہیں۔ اس اعتبار سے شعر تاریخی سچائی کا حامل بھی ہے اور عقیدت آفرینی کی مثال بھی۔ عارفی نے اپنا مزاجِ لطافت یہاں بھی فراموش نہیں کیا۔

مدحِ امام حسن مجتبیٰ میں منظر عارفی ہی کا شعر ہے کہ:

ان کے افکار، ان کی سیرت حرزِ جاں کر لیجیے
اور زمانے کے لیے بانگِ درا ہو جائیے

"حرزِ جاں" سے مراد "تعویذی کہ برای حفظِ روح از صدماتِ ارواحِ پلید و دیوان می بستند" یعنی وہ تعویذ جو پریشانیوں سے روح کی حفاظت کے واسطے باندھا جاتا ہے۔ شعر کا معنی یہ ہوا کہ امام حسن علیہ السلام کی سیرت و افکار کا تعویذ بنا لیا جائے تو زمانے کے لیے بانگِ درا بن جانے کی اہلیت پیدا ہو

جاتی ہے۔امام حسن علیہ السلام کی سیرت کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے کہ وہ مدبر، زیرک اور معاملہ فہم تھے۔ حالات کے تقاضوں کی پیش بینی آپ کا طرۂ امتیاز رہا۔تاریخی واقعات کی روشنی میں ان کی سیرت میں بانگِ درا کا کردار بن جانے کی عظمت ایک نمونہ ہے جسے مابعد امت کوحرزِ جاں بنانا چاہیے۔یہ تو بدیہی ہے کہ حالات کے تقاضوں کے مطابق مدبرانہ فیصلوں کا عمل فعال ہوتو آلام و مصائب کی دھول سے دامنِ فکر ونظر غبار آلود نہیں ہوسکتا۔مسعود سعد سلمان کے ایک قصیدے کا شعر یاد آتا ہے:

مدح ہایِ تو حرزِ جان سازم

در بیابان و بیشہ و کودر

ممدوح کی سیرت،عظمت،فکر اور مدح کا عمل مادِح کے لیے سکون بخش اور اطمینان آفرین ہوتا ہے۔منظر عارفی کے شعر میں مسعود سعد کے مضمون ہی کو گہرائی اور انفراد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مدحِ پنجتن میں شہاب صفدر کا شعر ہے:

عاصیوں کو مثلِ حُر دوزخ کے منھ سے چھین کر

خلد کا مہماں بناتی ہے ولائے پنجتن

مصرعِ اول استدلال ہے مصرعِ ثانی کے دعوے کا۔اہلِ بیت کی محبت جنت کی ضامن ہے۔

خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے اپنی کتاب ”زبدۃ المقامات“ (زبدۃ المقامات کا سنِ تصنیف ۱۰۴۰ھ ہے۔ یہ کتاب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے خلفا کے تذکار پر مشتمل ہے۔) میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ،میرے والد محترم کی زبان پر اکثر یہ جملہ رہتا تھا:

”محبتِ اہلِ بیتِ حضرت خاتمیت علیہ و علیہم الصلوات والتحیۃ

درحرزِ ایمان وحسنِ خاتمہ مدخلِ عظیم است.“

حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ میں نے بوقتِ نزع والد محترم کو ان کی بات یاد دلائی،تو انھوں نے فرحت و انبساط سے کہا:

”الحمد للہ والمنۃ کہ سرشارِ آن محبتم وغرقِ آن دریای نعمت.“

محبتِ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتمہ بالایمان کی ضمانت فراہم کرتی ہے اور یہ اعتقاد امت میں ہمیشہ سے رائج رہا ہے۔شہاب نے اسی اعتقاد کو ایک دلیل بھی فراہم کردی اور شعریت میں بھی جھول نہیں آیا۔

منور بدایونی کا آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منقبت میں ایک شعر ہے:

خدا نے چادرِ تطہیر بھیجی ہے شہانے میں

ٹکی ہے بیل جس میں نامِ آلِ مصطفائی کی

بیل، پھل پھول کا مخزن ہوتی ہے۔ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی نسل جاری ہونا، شعر کے پس منظر میں کس قدر باریک معنیٰ پیدا کرتا ہے۔ خدا نے رسول اللہ ﷺ کو "الکوثر" عطا فرمایا۔ "الکوثر" کی تفسیر کئی مفسرین کے نزدیک اولادِ کثیر ہے۔ آپ ﷺ "الکوثر" کا مخزن ہیں اور آپ کی اولاد اس کا مظہر۔ اس باریک معنیٰ کے علاوہ بھی شعر کا ایک بنیادی معنی ہے جو ظاہر ہی ہے۔

منوّر بدایونی کے یہاں آدھ درجن مناقب ملتی ہیں۔ استادانہ رنگ اور فنی پختگی تو ہے ہی، ممدوح کی نسبت کا حیا اور فکری ڈھانچے میں اس کی تشکیل کاری کا فن بھی ان کے ہاں خوب نکھر کر سامنے آیا ہے۔ کلیات میں پہلی منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح اور اس کے دینی ثمرات کے گرد حیطہ انداز ہے۔ ان کے ہاں مزعومہ مدح کا تناسب بھی خاصا ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین کے نزدیک اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، بشرطیکہ شعرا اسے خود نسبتی حوالے کے ساتھ لائیں۔ اور جن کے ہاں اس کے بغیر مزعومہ مدح ملے وہ تاریخی شہادت کے بغیر بے اصل ہو جائے گی، اور نتیجتاً شعر مدح کے لیے کذب کا سہارا لے گا۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک مزعومہ مدح میں کوئی حرج نہیں ہے۔ منقبت یا مدح میں غلو حُسن ہے۔ اگرچہ غلو کے جواز کی شرائط ہیں، لیکن علی الاطلاق اس کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ مبالغہ شعر کا بنیادی اسلوب ہے۔ منوّر کے ہاں انتہائی حد تک مبالغے تو نہیں ہیں، تاہم مدح کے مفروضہ و مزعومہ مضامین بہتیرے ہیں۔

سید قمر زیدی نے سیدنا امام حسن علیہ السلام کی مدح میں کہا کہ:

اے شاملِ اصحابِ کساء، نائبِ حیدر
تو جامعِ اوصافِ فقیہانِ زمن ہے

"اوصافِ فقیہانِ زمن" بہت جامع ترکیب ہے۔ اس سے مراد دانش کا انتہائی اطلاق، تحمل، درّاکی، معاملہ فہمی، عصری ہم آہنگی اور فکری صلابت میں تنوع اور وسعتِ نظر ہے۔ اس شعر سے امام حسن علیہ السلام کی زندگی کے کئی گوشوں پر شاعر کا عندیہ معلوم پڑتا ہے۔ القصہ معانی سے لبریز شعر ہے۔ قمر زیدی ہی کا ایک اور شعر ہے:

مقصد کی بڑائی کو سمجھنا ہے ضروری
بے کار لٹانے کے لیے گھر نہیں ہوتا

منقبت میں ممدوح کا دینی معیار بہر حال قابلِ ترجیح ہونا چاہیے۔ ممدوح کو دین سے عظمت ملی ہے نہ کہ دین کو ممدوح سے۔ یہ حوالہ اس لیے اتنا ضروری ہے کہ اب جدید منقبت ہی میں نہیں، کلاسیک میں بھی ایسا توازن معدوم ہے۔ منقبت نویس پورے دینی بیانیے (Discourse) کو اپنے ممدوح کے

لیے قابلِ فخر بنانے کی بجائے، ممدوح کو دین کے لیے لائقِ عزت گردانتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ منقبت کے تمام ممدوحین دینی حوالے کے بغیر بے معنی ہیں۔ خود ان کا وجود لائقِ مدح تبھی ہوگا جب وہ اپنی دینی تہذیب کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ حیف! خود مذہبی نمائندوں کے ہاں یہ عدمِ توازن از حد موجود ہے، ایسے میں ایک ٹیکسٹائل انجینئر کا اتنی عمدگی سے اس توازن کو برقرار رکھنا اور ممدوح کو اس کے لیے لائقِ تعریف معیار سے باندھ کر اس کی مدح کرنا نہایت عمدہ ہے۔

جس طرح ممدوح کے لیے اس کا دینی امر اس کے افتخار کی صورت میں پیش کرنا چاہیے، یونہی ممدوح کو ذاتِ رسول ﷺ سے غیر متعلق بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بہت خوش افزا بات ہے کہ جدید منقبت میں رسولِ محتشم ﷺ کا حوالہ ضروری حد تک موجود ہے۔ طالب علی عیشیؔ کا شعر ہے کہ:

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح! تیری مہربانی

جس طرح مخلوق کی تعریف دراصل اس کے خالق کی مدح ہوتی ہے، یونہی مذہبی حوالے کے ساتھ لائقِ مدح قرار پانے والا ہر کردار اسی باعث قابلِ تحسین ہوتا ہے کہ وہ شارعِ دین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا وفادار اور ان کی شریعت کی اتباع اور فرمان برداری میں ہے۔ منقبت میں ممدوح کی عظمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے تعلق کے ذیل میں دیکھنا اور اس کا اظہار کرنا دراصل "نعت در منقبت" ہی ہے۔ خوشبو کی ثنا گری حقیقت میں پھول کی مداحی ہی ہوتی ہے، جو اس کا مخزن ہوتا ہے۔

امت میں وہ لوگ جو دینی حوالے سے قابلِ مدح گردانے گئے ہیں، وہ انھی اصولوں اور اوصاف کی بنا پر ہوئے ہیں جن کی کامل، منضبط، ہمہ نوع اور ہمہ آفاق اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات وصفات سے مترشح ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونۂ سیرت سے انحراف کر کے عظمت کجا؟ مسلمانی تک معرضِ تشکیک میں آجاتی ہے۔ فضائل کا کوئی بھی حوالہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منہا کر کے بامعنی نہیں بن سکتا۔ انسان اور خدا کے درمیان واحد برزخ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جس طرح رسول اللہ کی جہتِ عبدیت کو برطرف کر کے انھیں تمام تر قضا و قدر کا مالک تصور کرنا اور خشیتِ الٰہی سے بے باک ہو جانا، نامسلمانی ہے، یونہی رسولِ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دریوزہ گری کا اعزاز جبین پر سجائے بغیر بارگاہِ ایزدی میں سجدوں کی بہتات بھی لایعنی اور باطل ہے۔ منقبت کے ذیل میں کہا جائے تو دینی اور مذہبی تشخص رکھنے والی معتبر اور مکرم شخصیات کی مدح کرنا دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اوصاف کی تحسین کاری ہے جن کو اختیار کرنے والا مدح و

تعریف کے لائق ٹھہرتا ہے۔ منقبت کی روایت میں یہ فکری زاویہ ہمیشہ ملحوظ رہا ہے کہ منقبت نویس نے اپنے ممدوح کو اوصافِ نبوی سے متلازم کر کے اس کی تعریف کا پیرایہ تخلیق کیا ہے۔ جدید اور معاصر منقبت بھی اس مبارک روش پر چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

منقبت میں بالواسطہ نعت یا نعت ومنقبت کی یکجائی عصرِ جدید کی منقبت کا خاص مزاج ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر انسان کا مذہبی حوالہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر بے معنی ہے اور منقبت نگاروں نے اس کا بخوبی اہتمام کیا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متلازم کر کے پیش کریں۔ چند شعر خصوصیت سے لائقِ مطالعہ ہیں۔

شبنم رومانی نے ایک عقلی استدلال فراہم کرتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت کو یوں مبرہن کیا ہے:

شہرِ علم پہ مرنے والو! تم کو اس کا علم بھی ہے؟
ہر شہری نے پہلے اس کے دروازے کو پار کیا

امام زین العابدین کی منقبت میں علامہ ثاقب علوی نے یوں اظہارِ محبت کیا ہے:

چمک رہی تھی جبیں تیری نورِ نبوی سے
نہ دیکھ پائے وہ شب زاد، حضرتِ سجّادؓ

اس شعر میں "جبیں چمکنا" سجود کے باعث ہے اور اسی رعایت کو ردیف میں استعمال کیا۔ سجدوں کی کثرت کا تعلق رات سے ہے اور اس تعلق سے "شب زاد" اور "شب" کی رعایت سے "نور" کہا۔ الغرض الفاظ کے باہمی انسلاکات کے اس فن کی کلاسیک سے خوشہ چینی خوش آئند ہے۔

سید صبیح الدین صبیحؔ کا نعت ومنقبت کا مرکب شعر ہے کہ:

خدا کے نور سے معمور ہے جو شخصیت
اس آفتاب کی خاص اک ضیا امام حسنؓ

ضیا اپنے ماخذ کے بغیر کچھ نہیں۔ اس ابدی وازلی نسبت کا متوازن اور اچھا اظہار ہے۔

مولوی اظہر الحق بدایونی کا یہ شعر بھی اسی ذیل میں نمایاں مقام پر قابلِ تحسین ہے۔

تم ظلّ جمالِ شاہِ امم، آیاتِ کتابِ حسنِ قدم
کشافِ نصوصِ قرآنی، یا عبدالقادر جیلانیؒ

یونس حسرتؔ امرتسری کا شعر ہے:

حدیثِ مرسلِ یزداں حسین ابنِ علیؓ
مثیلِ آیۂ قرآں، حسین ابنِ علیؓ

حسرتؔ نے سیدنا حسین علیہ السلام کی منقبت میں اگرچہ ایک برتی ہوئی تشبیہ کہی، لیکن مصرعِ اول میں جواز پیدا کرلیا۔ امام حسینؓ کو "حدیث" کہنا اُنھیں "مثیلِ آیۂ قرآنی" کہنے کے بعد، بایں انداز کھلتا ہے کہ کردارِ حسینی کو قرآن و حدیث کے عملی منہاج کے مطابق سمجھنا چاہیے۔ جس طرح اُن کا کوئی فعل قرآن سے متضاد نہیں ہوسکتا، یونہی ان کا ہر فعل فرمانِ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تائید وتوثیق کے بغیر نہیں ہوگا۔

برگؔ یوسفی نے سیدنا ذوالنورین حضرت عثمانؓ کی مدح میں یہ شعر کہا کہ:

فرشتے آپؓ کی شرم و حیا کی قسمیں کھائیں
نبیؐ کی سیرتِ اقدس کے ترجماں، عثماںؓ

"قسم کھانا" محاورے کا اطلاق ایسا برمحل بیٹھا کہ ممدوح اگر کوئی اور ہوتا تو یہ مبالغہ محسوس ہوتا، لیکن سیدنا عثمانؓ کی حیا داری کی قسمیں فرشتے ہی نہیں، ساری مخلوق کھائے تو بجا ہے۔ بہت جاذبِ دل اور پُرتاثیر شعر کہا ہے۔

انجمؔ نیازی اگرچہ بسیار گوئی کی وجہ سے مضامین میں عمومی پَن پیدا کر لیتے ہیں، لیکن جہاں مضمون اٹھتا ہوا معلوم ہو، وہاں نہیں چوکتے اور تخلیقی جواز کے ساتھ شعر کہہ دیتے ہیں۔ ان کا یہ شعر نہایت پُر جمال ہے:

ترے اصحاب سے مجھ کو محبت کیوں نہ ہو آقا
کسے اونچے، گھنے، ٹھنڈے شجر اچھے نہیں لگتے

لوازماتِ فطرت سے محبت کو استدلال فراہم کرنا انجمؔ نیازی کا ایک خاص اور منفرد اسلوب ہے۔

معاصر منقبت کا اسلوبی منہاج

اظہار کے جملہ امکانی عناصر کا ادبی متن میں تحلیل ہونا اس کا اسلوب تشکیل دیتا ہے۔ اگر اظہار الفاظ کی ادبی تنظیم سے وجود پذیر ہو تو ادب ہے، ورنہ محض لفظوں کا بھٹیار خانہ۔ ادبی تنظیم سے مراد فنی آلات کے استعمال سے ادبی اظہار کو بامعنی بنانا۔ منقبت کے اسالیب میں صنائع، ایجاز، بلاغت، تشبیہ، استعارہ، امیجری اور لفظوں کا مجازی استعمال ہے۔ جبکہ ادبی اظہار میں شعریت، جمالیت، تاثیر، معنی آفرینی، زبان دانی، معنی و آواز کی ہم آہنگی اور شعری قرینہ نہ ہو تو وہ ایک عقیدت نامہ تو ہے، صنفِ منقبت کا کوئی عمدہ اظہار نہیں ہوگا۔ معاصر منقبت کے اسلوب کا ایک اجمالی جائزہ حسب ذیل ہے۔

ادبی متن میں ایجاز کی اہمیت مسلمہ ہے۔ شعر فکری میراث کی تمام داستانِ شعور کا ایجاز ہوتا ہے۔ اس سے بلاغتِ صوری ومعنوی ہم آمیز ہو تو اعلیٰ تخلیقی نمونہ جنم لیتا ہے۔ ایجاز، حسنِ تشبیہ اور امیجری سے معمور حفیظ تائب کا یہ شعر دیکھیے جو فرزندانِ رسولِ محتشم کی مدح میں ہے۔

شیر خواری ہی میں رخصت ہو گئے ابنائے پاک
خلد میں گویا یہ اہلِ بیت کی تقدیم تھی

رسول اللہ ﷺ کے ان بیٹوں کی مناقب جو شیر خواری کی عمر ہی میں انتقال فرما گئے، منقبت نویسی کے جدید منظر نامے پر یہ مضمون آیا ہے۔ لیکن جس صفائی، رعایت اور معنی آفرینی کے ساتھ حفیظ تائبؔ نے شعر کہا ہے، اس کی اب تک دوسری مثال نہیں ملتی۔ معاصر شاعر بیدارؔ منظر القادری نے رسول اکرم ﷺ کے تینوں بیٹوں، حضرت قاسم، حضرت عبداللہ اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہم کی مناقب لکھی ہیں۔ لیکن کہاں وہ تینوں مناقب کے انتیس شعر اور کہاں یہ تائبؔ کا شعرِ واحد۔ مضمون بنانا ہی دراصل مرصع سازی ہے۔ مضمون آفرینی تو عامیوں کے لیے بھی ممکن ہے، لیکن بڑا شاعر مضمون ساز ہوتا ہے، اور یہ شاعر کا اعجاز ہے کہ وہ مانوس معنوی جوہر کو مضمون کے نامانوس لیکن پرکشش لبادے میں اظہار دے۔ تائبؔ کے مندرجۂ بالا شعر میں "تقدیم" کلیدی لفظ ہے۔ اس سے مراد وہ شے جو اپنے مقصود سے قبل اُس کے وجود پر دلالت کرے۔ شعر کا معنی یہ ہوا کہ ابنائے پاکِ رسولِ محتشم ﷺ جنت میں حضور کی تمام آل و اولاد کے لیے فضا بنانے کے لیے مقدمۃ الجیش کی صورت اپنی سلطنتِ جنان میں قدومِ ناز رکھ چکے ہیں تاکہ دو عالم کے مکین یہ جان لیں کہ جنت صرف آل و اولادِ رسول ﷺ کی سرداری کے ساتھ "عالمِ جنت" بن سکتی ہے ورنہ جنت ایک بے دید گلشن کی طرح ہے جس میں بوئے گُل کو نازِ بوئیدگی حاصل نہ ہو، شرابِ طہور کی بہتی ندیوں کا کوئی پُرشوق تشنہ نہ ہو۔ ابنائے پاکِ نبی ﷺ کی مدح میں یہ شعر شاید اول و آخر ہے۔ اس کے بعد ایسا بڑا شعر کہنا محال ہے۔

سطورِ بالا میں جہاندادمنظر القادری کا ذکر ہوا۔ فکری توازن اور ادبی چاشنی کی ہم رکابی میں ان کا مجموعۂ مناقب "اجمعین" فنی حسن کا جمیل نمونہ ہے۔ تراکیب کا کلاسیکی شکوہ، الفاظ ومحاورات کا برمحل ورود، ممدوح کے متلازم فضائل کے اظہار سمیت مدح کے بہترین اسالیب کی آورد منظر کی مناقب کا طرۂ امتیاز ہے۔ مزعومہ مدح میں ان کا سمندِ فکر دھیمی رفتار چلتا ہے، البتہ شعر میں ممدوح کے سامنے اظہارِ عجز کی شدت بعض اوقات ممدوح کو غیر انسانی شبیہ میں پیش کر دیتی ہے۔ یہ چیز قابلِ غور ہے کہ ممدوح کا انسانی ہونا کس حد تک ضروری ہے اور مدح کے ایسے کون سے اسالیب ہیں جو اسے انسان کے لبادے میں بھی صاحبِ عظمت ثابت کر سکیں تاکہ عظمت و افتخار کا جوہر ہماری گرفت میں آسکے؟ تاہم منظر کی مناقب میں جو چیز متاثر کن ہے وہ یہ ہے کہ ممدوح کے غیر معروف فضائل کا اکتشاف و اظہار، یعنی کتبِ تاریخ و سیرت میں ثابت شدہ فضائل جو فی زمانہ مذہبی اذہان سے بھی دور ہیں، ان تک رسائی اور ان کا ادبی اظہار منقبت کی فکری ثروت مندی پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے ہاں خاص چیز یہ بھی ہے کہ یہ مزعومہ مدح

کومحققہ فضیلت کی کمک ضرور فراہم کرتے ہیں۔یعنی مزعومہ فضیلت کا محققہ فضیلت پر استدلال کرنا یہ کام بہت اہم اور لطیف ہے اور منظرؔ نے اس کی بہت سی بنیادی شکلیں فراہم کر دی ہیں۔

سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت میں صدیقؔ مارہروی کا یہ شعر دیکھیے۔

میسر گر نہ ہوتی اس کو تیری آستاں بوسی
نہ اِتراتی ہوئی پھرتی صبا محبوبِ سُلطانی

"صبا کا اترانا" کتنی عمدہ تصویر ہے۔ ماتن نے متحرک تصویر ہی نہیں بنائی، اس میں جو طنّازی رکھ دی، وہ بے مثل ہے۔"اترانا" یوں تو اخلاقی تناظر میں عیب ہے، لیکن یہ "اترانا" ایسا ہے کہ اگر اسے منہا کر دیا جائے تو ممدوح کی مدح ختم ہو جائے۔ یہ "اترانا" اس نسبتِ عینی کے سبب سے ہے جو صبا کو آستانۂ ممدوح کے ساتھ حاصل ہے۔ یہ "اترانا" ممدوح کے لیے اظہارِ عظمت ہے تبھی محمود ہے، ورنہ نفسی اور مجرد فضیلت کا حصول مقصود ہو تو "اترانا" بے معنی ہو جائے گا۔ کیوں کہ یہ اخلاقی عیب ہے اور عیب کو عظمت کی اساس بنانا معنی سے خالی بات ہے۔ یہاں صبا کے لیے اترانا اپنی عظمت کی تشہیر نہیں بلکہ ممدوح کی عظمت کی تشہیرِ شان ہے۔نہایت پُر جمال شعر ہے۔

حسنِ اجمال میں واقعات کی استدلالی منطق کو شیخ الحدید شفیقؔ نے نہایت فنکاری سے دو لفظوں میں کہہ دیا۔

بچوں کو لے کے کوئی گیا کارزار میں؟
کس نے کہا کہ جنگ تھی نیت حسین کی

یہ شعر سیدنا امام حسین علیہ السلام کی مدح میں ہے۔ یہ دو مصرعی شعری تخلیق ہی نہیں، پورے تاریخی منطقے کے لیے ایک ایسی وجودی قوت رکھنے کا استدلال ہے جس کی تردید نہیں ہو سکتی۔

حسنِ ایجاز کی چند مزید مثالیں پیش ہیں جن میں ماہر القادری، روشن علی عشرتؔ، ولی الدین ولیؔ، شاہ عبدالعلیم الہ آبادی اور اخترؔ چنیوٹی کے اشعار ہیں جو بالترتیب حضرت خالد بن ولید، سیدہ خدیجہ الکبریٰ، سیدنا امام حسین اور حضرات خلفاے راشدین کی منقبت میں ہیں۔

تو نے تنہا کفر کی فوجوں میں ہلچل ڈال دی　　تیرا جوشِ عزم تھا بیگانۂ خوف و خطر
دیباچۂ وفا ہے تو اے مادرِ بتولؓ　　اسلام سرخرو ترے خونِ جگر سے ہے
بزّ ابراہیمؑ ، بقرِ موسیٰؑ ، شترِ مصطفیٰ　　ارتقائے اوجِ انسانی کی ہیں منزل حسینؓ
ہوگی صحت، پڑھ کے دم کر لو مریضانِ قلوب　　چار قُل کی طرح اسمائے کبارِ چاریار

لفظوں کو علامت بنانا تہذیب شعر میں فکری وحدت کاری کی تشکیل کرتا ہے۔ پاکستانی عہد کی

منقبت میں یہ اختصاص ہے کہ وہ دینی اساس پر شعر کے ممدوح کو علامت بنا کر اپنے حاسۂ شعور سے اظہار میں لاتا ہے۔ لفظ جب علامت بننے کی امنگ سے سرشار ہو تو اس میں معنی کے ابعاد اور تاثیر کی کیفیت از خود اپنا وجود پیدا کر لیتی ہے۔ اس کی مثال میں ادیبؔ رائے پوری کا یہ شعر، جو خواجہ یکپاسیؒ چشتی کی منقبت میں ہے، ملاحظہ کیجیے۔

ادیبؔ الفاظ جتنے ڈھونڈ کر لایا مناقب میں
وہ پہلے ہی سے نکلے حاشیہ بردارِ یکپاسیؒ

ممدوح کو انسانی تہذیب کے ایک مستقل نمائندے کے طور پر پیش کرنا منقبت کا بڑا مضمون ہے۔ الفاظ و معانی تہذیبی مظاہر کا مظہر ہوتے ہیں جن سے بنیادی تعارف مترشح ہوتا ہے۔ ادیبؔ رائے پوری کے اس شعر میں لفظ کا قبل از ارادۂ مدح خصوصی اطلاق ممدوح کی ذات پر ہونا انسانی بلندی اور عظمت کا غماز ہے۔ کیوں کہ معنی ہمیشہ لفظ سے بڑا ہوتا ہے اور لفظ تابع ہوتا ہے معنی کے۔ معنی تصور سے باہر کچھ نہیں ہے اور تصور کی آفاقیت ذہن طے نہیں کرتا بلکہ اسے دریافت کرتا ہے۔ لاشعور بھی معنی کا مسکن ہے لیکن وہ ہماری گرفت میں نہیں ہے۔ تو اس جہت سے ممدوح کو معنی کی ساخت بنا دینا منقبت کا ایک بڑا اور تازہ مضمون ہے۔ ادیبؔ رائے پوری کے یہاں مناقب کا ایک مناسب حصہ ملتا ہے، تاہم ان کی مناقب میں سلام کے عناصر زیادہ ہیں۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

”منقبت اور سلام کے درمیان بھی امتیازی فصیلیں کھڑی ہیں۔ منقبت اور سلام میں موضوعاتی فرق ہے۔ منقبت کی اساس شخصی خوبیوں سے اٹھتی ہوئی ممدوح کے ذاتی و کسبی فضائل کے بیان پر منتج ہوتی ہے۔ اس میں ”سلام“ کی طرح اوصاف وعوامل کا اجرا شخصیت سے آفاقی یا کلی تناظرات کی طرف نہیں ہوتا۔ منقبت کی بہترین مثال میر حسن کی مثنوی سحر البیان میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے۔ اسے بنیاد بنا کر منقبت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ منقبت ایسی ادبی صنفِ سخن ہے جس میں مشخص انسانی کردار کے اوصافِ لازمہ اور خواصِ مستعار کو اس سے متعلق کر کے اس کی بڑائی کا بیانیہ تخلیق کیا جائے اور وہی جوہرِ خصلت شاعر کی فکری تعمیر کا عنصر بنے جو اس کردار سے کسی نہ کسی طرح ذہنی، عملی یا منطقی طور پر وابستہ ہو اور نقلاً یا مشاہدے سے ثابت ہو۔ اس کے برعکس سلام میں شخصی لوازمات ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ان اصولوں اور ضابطوں کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے جن کے تحت موضوعِ مشخص کردار رو بہ عمل ہو اور وہ اپنے کردار کے نفسیاتی اور تشکیلی عناصر میں ان سے مستغنی نہ رہ سکے۔ مسائلِ حیات و نظام ہائے فکر کے بنیادی ساختیے سلام کا موضوع اس جہت سے بنتے ہیں کہ مرکزی کردار ”امام

حسین علیہ السلام“ سے ان اوصاف کے لازمی یا نسبتی تعلق کو ذہنی فیکلٹی میں رکھنا مطلوب حالت میں رہتا ہے۔ المختصر! سلام محض کربلائی موضوع کے گرد حصار بند نہیں رہتا بلکہ اس میں متنوع موضوعات در آتے ہیں۔“ (مضمون: کربلائی کرداروں کی تہذیبی معنویت اور دلاور علی آزرؔ کی سلام گوئی کے امتیازی خطوط، حصہ اول، مشمولہ: ماہنامہ ”ضیائے حرم“، اسلام آباد، اپریل مئی، ۲۰۲۳، صفحہ ۶۹)

ادیبؔ صاحب نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح میں کہا کہ:

جہالت کے اندھیروں سے نکل کر نور میں آئے
قرابت وہ ملی دو نور والے آپ کہلائے

ادیبؔ کا یہ شعر عام مضمون پر مشتمل ہے، تاہم مصرعِ اول نے تازگی پیدا کر دی ہے۔ ”دو نور والے“ میں تعلیل یہ پیدا کی کہ اول تو اسلام قبول کیا، دوسرا دامادیِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ دونوں عظمتیں اپنی اصل میں نور ہیں۔ لہٰذا آپ کو ”دو نور والے“ کہا گیا۔ اسے حسنِ تعلیل کہتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ اعتراض نکل سکتا ہے کہ عظمت کی یہ دونوں سطحیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے دامادوں کو بھی حاصل ہیں، پھر اس تعلیل میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح کا کیا معنی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ”دو نور“ کا لفظ وسیع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو شہزادیوں سے نکاح، دو ہجرتیں، دو کنیتیں، دو سخاوتیں (قبل از اسلام و بعد از اسلام) اور دیگر وجوہات بھی ہیں۔ ان معانی میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی عظمت کا انفرادی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ شعر لطیف اور باریک ہے۔

الفاظ و معانی کی تہذیب میں ممدوح کی عظمتِ آفاقی کا بیان قدرے کمزور مگر اچھے انداز میں اویس ازہرؔ مدنی کے اس شعر میں آیا ہے، جو امام زین العابدینؓ کی مدح میں ہے:

ہم ایسے ہی نہیں کہتے مناقب ان کی ازہرؔ
مقام ان کا ہے کیا، حرف و معانی جانتے ہیں

یہ تو طے ہے کہ ممدوح سے تعلقِ حُبی میں عاشق کا تصورِ جمال محبوب کے حُسن سے ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ ممدوح سے اظہارِ عقیدت لاشعوری جبر کے تحت نہ ہو تو شعور کی ساختہ پرداختہ مدح سرائی میں توازن باقی نہ رہے۔ ازہرؔ کے مندرجہ بالا شعر میں حرف و معانی وہ نہیں جو کلام کا حصہ بن جائیں، بلکہ وہ مراد ہیں جو ابھی احاطۂ نطق میں نہیں آئے، اور ان کے معانی لاشعور میں تو زندہ ہیں، شعور کی سلطنت میں انھیں ابھی باریابی نصیب نہیں ہوئی۔ کیوں کہ ”جاننا“ جب مطلق ہو تو اسے لاشعور کی مملکت کی طرح لامحدود ہی سمجھا جائے گا۔ منقبت میں بہت تازہ اور عمدہ مضمون ہے۔ تاہم مصرعِ اول کمزور ہو گیا۔ یعنی بات پوری کہہ دی، آدھی اشارے سے، نصف کلام سے۔ لیکن مطلوب روانی کو نشیب میں اتار دیا۔

بناتِ رسول کی مدح میں حفیظ تائب کا یہ شعر بھی اسی ذیل میں اختصاصی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ان میں رواں تھا حضرتِ خیر الوریٰ کا خون
فطرت تھی راز دان بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

خون اور فطرت کا تعلق بہت گہرا ہے۔ اس شعر میں نعت اور منقبت دونوں کا تناسب برابر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خون فطرت کی روح تھا اور ان کی بنات میں یہی فطرت اپنے حقیقی جوہر کے ساتھ رواں تھی۔ فطرت کیا ہے؟ فطرت تقدیر کی وہ قوت ہے وہ انسان کے لیے مافوق الفطرت جبر (Supernatural Coercion) کا معنیٰ بدل دے اور اس کا وجودِ علمی وشعوری اپنی مرکزی ساخت کو جبرِ محض سے محفوظ بنا لے۔ انسان فطرت کی اس قوت کو تب حاصل کر سکتا ہے جب وہ الوہی آئین کا مجسم نمونہ بن جائے اور شرعِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کامل آئینہ دار۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

افتخار عارف کی نظم "ھَل جزآء الاحسان إلا الاحسان" کا ایک ٹکڑا بھی اسی معنویت میں ہے:

عجب اک سلسلہ ہے
خدیجہ، فاطمہ، زینب
وفا کے باب میں، صدق وصفا کے باب میں، صبر ورضا کے باب میں
کیسا منور راستہ ہے
خدیجہ، فاطمہ، زینب
طلوعِ حرفِ "اِقرَأ" سے صدائے استغاثہ تک
حرا سے کربلا تک
مشیت نے جو اک خطّ جلی کھینچا ہوا ہے
اُسی کا نور ہے جو دل بہ دل منزل بہ منزل ہر طرف پھیلا ہوا ہے
رسالت کی گواہی ہو، ولایت کی گواہی ہو، امامت کی گواہی ہو
جو یہ کہہ دیں وہی میزانِ حق میں مستند مانا گیا ہے
خدیجہ، فاطمہ، زینب

رضا اور تقدیر ہم زاویہ ہو جائیں تو انسان کا مؤمن ہونا بامعنیٰ ہو جاتا ہے اور وہ کائناتی جبرِ محض سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔

تائبؔ کے محولۂ بالا شعر میں غالباً "خون" ہی کی رعایت پیشِ نظر تھی، لیکن مضمون ایسا بنا کہ شاید و

باید! عظمتِ بناتِ رسول ﷺ کے قدموں میں شاعر نے ساری متاعِ فن رکھ کر مدح کا اعتبار پا لیا ہے۔ آل و اصحابِ رسول کی مدح میں تائبؔ کا فن فکری ولولے کے ساتھ اپنی چمک سے سامانِ خیرگی مہیا کرتا ہے۔ ایک انفراد جو بہت کم منقبت نویسوں کے ہاں ملتا ہے، وہ ہے ممدوح کا اختصاص۔ نو وارد شاعر تراکیب اور تشبیہات کی مالا بنا کر القابات کا بازار لگا دے گا، لیکن بڑا شاعر ہمیشہ مدح کے فطری اسلوب میں تازہ اور گہرے مضمون کی جستجو میں رہتا ہے۔ تائب کے علاوہ یہ خاصیت لالہ صحرائی، عبد العزیز خالد اور عاصی کرنالی کے ہاں اپنے اصلی پن کے ساتھ موجود ہے۔ ان شعرا کی مناقب سے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ مدح کے باب میں تازہ مضمون نکالنا شخصیت کے انفراد کی بنا پر ممکن الحصول ہے، لیکن ان کے تقابل میں دیکھیں تو کسی مضمون کو اس کی تمام تر امکانی صورتوں کے ساتھ پیش کرنا ابھی منقبت کے اختیاری مزاج میں نہیں آیا۔ معاصر منقبتی شاعری میں جو معیار تائبؔ اور لالہ صحرائی کا ہے، وہ خود فراموشی کی اساس پر ہے۔ یعنی ان کے ہاں استغاثے کی کثرت اور اظہارِ محبت کا وفور بیشک نہ ہو، تاہم ممدوح کی ذات کو اس کے اوصاف کی بنا پر حقیقی محبوب بنانے کی انگیخت فراہم کرنے کا ہنر ازحد موجود ہے جس کی کوئی قدیم و جدید مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

حفیظ تائبؔ کے ہاں صحابہ و اہلِ بیت کی مدائح کے بعد حضرات اولیاے امت کے مناقب بھی بکثرت ملتے ہیں۔ ان کے ہاں صوفیائے سلاسل کی مناقب میں اُن کی تعلیمات، شجرہ ہاے سلاسل، بنیادی ضوابط اور اہم ترین کلیدی حوالوں کا تذکار بایں انداز ملتا ہے کہ کسی ایک بزرگ کی چند شعری منقبت میں ان کے پورے نظامِ حیات اور سلسلۂ تصوف کے مبادیات سے روشناسی حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً سید ہجویر، شیخ عبد القادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ بہاؤ الدین زکریا، خواجہ بہاؤ الدین نقشبند، مجدد الف ثانی وغیرہ کی مناقب اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

جدید، بالاختصاص معاصر منقبت میں سادگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ سادگی لفظوں کے تخلیقی استعمال سے پہلو تہی کر کے عوامی مزاج کی عکاسی کا نام نہیں ہے، سادگی سے مراد یہ ہے کہ معنیٰ کا پورا جھرمٹ یوں واضح اور صاف (Crystallize) ہو جائے کہ متن کی تشکیلی ساخت میں ابہام یا اہمال کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ معاصر منقبت میں معنی کی یہ سادگی اور مطلق پَن (Absoluteness) ازحد موجود ہے۔ نصیرؔ ترابی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھنا، آئینۂ صغریٰ و کبریٰ دیکھنا
دین کا مصدر نبیؐ اور دین سر تا سر علیؓ

یہ شعر علم المنطق کے اصول پر مترشح ہے۔ قیاسِ اقترانی حملی ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ

مصرعِ ثانی کے دوٹکڑے کریں تو پہلا ٹکڑیٰ صغریٰ جبکہ دوسرا کبریٰ کہلائے گا۔علم المنطق میں صغریٰ و کبریٰ کواس طرح ترکیب دیا جاتا ہے کہ کوئی تیسرا مقدمہ نتیجے کے طور پر ثابت ہو۔ان دونوں ٹکڑوں کے حدِ اوسط یعنی لفظِ مشترک کو نکال کر باقی حصے آپس میں ملائے جائیں تو جو حاصل ہوگا وہی نتیجہ کہلائے گا۔

اب ملاحظہ ہو کہ مصرعِ ثانی میں دو مقدمات ہیں:

(۱) دین کا مصدر نبی ہیں (۲) دین سر تا سر علی ہیں

دونوں مقدمات میں لفظِ "دین" مشترک ہے، اسے نکال دیں تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ:

نبی (جو کہ دین کا مصدر ہیں) دراصل علی ہیں (جو سراسر دین ہیں)

معنی یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مظہرِ کامل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جہتِ روحانی، علمی اور امامت وغیرہ کے پہلے وارث حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔معنیٰ سے چھلکتا ہوا شعر ہے۔منقبت کوئی کہے تو یوں کہے۔

مخصوص علوم یا مذہبی اصطلاحات کا استعمال اگرچہ کلاسیک منقبت کا عام مزاج ہے، تاہم جدید منظرنامے کی منقبت میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔انیس وارثی، محسن نقوی اور ہلال صدیقی کا ایک ایک شعر سطورِ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو بالترتیب حضرت سید علی ہجویریؒ، سیدہ زینب بنتِ علی اور سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی مدح میں ہے۔

نَحنُ اَقرَب کے معانی آپؒ سے ظاہر ہوئی
آپؒ ہیں حق الیقیں، حق کی زباں، سلطانِ ہندؒ

عجب مسیحا مزاج خاتون تھی کہ لفظوں کے کیمیا سے
حسینیت کو بھی سانس لینا سکھا گئی ہے علی کی بیٹی

پھونک دی تو نے جوانوں کے دلوں میں روحِ دیں
تیرے رشحاتِ قلم الحاد کا ہیں سدِّ باب

مندرجہ بالا شعروں کا استفادۂ علمی بخوبی واضح ہے۔علوم و مصطلحات کی کثرت بوجھل ہوتی ہے، تاہم کسی رعایتِ لفظی کے ساتھ ہو تو خوبی ہے۔شعرِ اول میں قرآنی آیت سے تلمیح ہے، لیکن یہ آیت کا حصہ قربِ تمام کی علامتی اصطلاح بھی ہے۔دوسرے شعر میں کیمیا اور حسینیت، جبکہ تیسرے شعر میں الحاد سماجی اور مذہبی مصطلحات ہیں۔

لاغرؔ صدیقی امروہوی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں کہا:

آپ عکسِ صاحبِ لولاکؐ ہیں
دل کی ہر لغزش سے گویا پاک ہیں

اس شعر میں لفظِ "عکس" میں یہ باریکی ہے کہ، چونکہ عکس اصل کے تابع اور مابعد ہوتا ہے، نیز اصل کا کم و کیف عکس میں بھی در آتا ہے۔لیکن عکس ہمیشہ عکس اور اصل ہمیشہ اصل ہی رہتا ہے۔لفظِ "عکس" میں بعض تلمیحات کو بھی ضم کر دیا ہے۔فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں، علی کی مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کی موسیٰ سے۔لاغر نے ان تلامیح کو بھی پیشِ نظر رکھا لیکن بات بدل کر کہی۔دل کی لغزش سے پاک ہونے میں یہ معنویت یہ ہے کہ عکس کہنے میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ عکس تو ظاہر کا ہوتا ہے، لیکن یہ عکس اتنا بامعنی اور مکمل ہے کہ باطن بھی یونہی لغزش سے پاک ہے جیسا اصل کا باطن ہے۔احادیث سے اس نوع کے بدیع استدلال کی جدید منقبت کے علمی حوالوں میں بعض مثالیں مل جاتی ہیں، تاہم اکثریت اس انفراد سے تہی دست ہے۔

شاعری میں اعلیٰ ادبی معیاری زبان دانی کے بغیر اظہار کی لازمی سطحیں نہ صرف تخلیقی ماندگی کا شکار رہتی ہیں بلکہ معنی کی افزائش کا عمل فروغ دینے والے انحصاری عناصر جو متن کی داخلی فضا بناتے ہیں، وہی بے آبرو ہو کر معنی کی تکمیل سے قبل ہی معطل ہو جاتے ہیں۔اچھی زبان دانی (Verbal Proficiency) سے شعر کا جمالیاتی جذب بڑھتا ہے۔معیاری زبان شاعر کے ثقافتی سیاق وسباق کی نمائندگی بھی کرتی ہے، جس سے تخلیق میں بین النصوصیت (Intertextuality) کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔اس تناظر میں، شاعر کی زبان کا چناؤ اس کی ثقافتی شناخت، تاریخ اور معاشرتی ابلاغ کی عکاسی کرتا ہے، جو شعر میں گہرائی اور تنوع پیدا کرتا ہے۔اس تناظر میں تین شعر خصوصیت سے لائقِ مطالعہ ہیں۔

حلیم حاذقؔ نے سرکار مسولیؒ کی مدح میں کہا کہ:

ایمان کھرا ہے یا کھوٹا، کیا دام لگے گا طیبہ میں
میزانِ مسولی میں اس کی پہلے پیمائش ہوتی ہے

اس شعر میں دو باریکیاں ہیں۔پہلی یہ کہ محشر میں نہیں بلکہ طیبہ میں دام لگنے کی بات ہو رہی ہے۔اشارہ وسیلے کی جانب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو منہا کر کے امت کا کوئی فرد چاہے کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو، اس کی کاملیت کا معیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی علی الاختصاص مرکزیت کے بعد لائقِ اعتنا ٹھہرے گا۔دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ایمان کے کھرا کھوٹا ہونے کا معیار جو شخصیت ہوگی، وہ پورے انسانی نظامِ حیات کے لیے اہم ہوگی۔کیوں کہ ایمان کی اساس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات ہے، اور ان کی امت میں جو تعلق بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سبھی نسبتوں سے بہرہ یاب ہونے کا ذوق یا میلان رکھے گا، وہ پہلے سرکار مسولیؒ کے ہاں پیمائش کروائے گا۔یہ پیمائش حتمی نہیں ہوگی، کیوں کہ ابھی دام لگنا باقی ہے، لیکن دام لگنے کے لیے جو قابلیت درکار ہے وہ امت کے اولیائے کرام کے ہاں سے حاصل ہوگی۔یہ مضمون منقبت کے ایک بڑے آفاق کا احاطہ کرتا ہے۔حلیم حاذق کی مناقب میں باریک بینی اور ندرت کی جستجو ملتی ہے۔وہ اپنے

عہد کے باطن میں جنم لینے والے روحانی بحران کے حل کو اولیائے امت سے سنجیدہ اور پختہ تعلق کے اِحیا میں مضمر سمجھتے ہیں۔ ان کی مناقب کے فکری ابعاد متنوع ہیں، تاہم فنی چابک دستی اور لطیف بیانی کی ہمرکابی میں جذبے اور تاثیر کا وفور بھی برابر تناسب رکھتا ہے۔

سیدنا علی المرتضیٰ کی مدح میں نثار بیانوی کا شعر ہے کہ:

حقیقت کا ہے بحرِ معرفت زخّارِ بے ساحل
مگر مرضی تمھاری ہے کنارا خواجۂ قنبرؓ

ممدوح سے تعلق کا منہاج اگر خودسپردگی ہو تو اسے بندگی کہتے ہیں۔ بندگی یہاں عبادت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس اعتماد علی الکفایہ سے عبارت ہے جو متکلم کو اپنے ممدوح پر ہو اور وہ اسی کی اساس پر اس سے اپنے باطنی رشتے کی پختگی کو اظہار میں لا رہا ہو۔ نثار کے اس شعر میں متکلم نے دریائے معرفت کے بے ساحل زخّار کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مرضی پر منحصر کیا ہے کہ وہ چاہیں تو کنارا ہو، ورنہ اس کا کنارا اصل میں ہے ہی نہیں۔ شعر میں سمندر کو ان کے وسیع علم کا استعارہ بنایا ہے۔ ایک باریک رعایتِ لفظی یہ بھی ہے کہ حضرت قنبر حبشی غلام تھے، اور سمندر جب بہت گہرا ہو جائے تو اس کا پانی سیاہ معلوم ہوتا ہے۔ ساحل اور کنارا کی رعایت سامنے کی چیز ہے۔ باطنی وظاہری انسلاکات سے بھرپور شعر ہے۔

طاہر ناصر علی نے ثانیِ زہرہ سیدہ زینب بنتِ علیؓ کی منقبت میں کہا:

جہادِ صبر کیا شانِ استقامت سے
نہیں ہے تجھ سا کوئی دِیں کا پاسباں زینب

"جہادِ صبر" کی ترکیب بہت بامعنی ہے۔ یہ ایک اہم روحانی اور نفسیاتی جہاد ہے جو انسانی تجربات میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ انسان اپنی داخلی کمزوریوں، نفسیاتی حد بندیوں اور خارجی دباؤ کا مقابلہ کس طرح کرے گا، یہ صبر کی داخلی ساخت میں پنپنے والی قوت طے کرتی ہے۔ "جہادِ صبر" نہ صرف انفسی شعورِ ذات کا ذریعہ ہے بلکہ اجتماعی و آفاقی اصولوں کو انسانی فطرت سے باہم متلازم کرنے کا عندیہ بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہ شاعر کی زبان دانی کا عمدہ نمونہ ہے کہ ایک سادہ ترکیب میں معانی کی گنگا بہا دی۔

فنی آلاتِ شعر میں تشبیہ کی قدر کلیدی ہے، کیوں کہ یہ متنِ موضوع میں احساساتی گونج (Emotional Resonance) پیدا کر کے تصوّریت کو مجسمۂ عینی یا تجربی بنانے کا عمل طے کرتی ہے۔ تشبیہ کا استعمال نہ صرف معنوی سطح پر، بلکہ جذباتی اور نفسیاتی سطح پر بھی ایک عمیق اثر مرتب کرتا ہے، جس سے متن کے تاثیری پھیلاؤ میں وسعت آتی ہے۔ اس کے ذریعے معنیِ وحدت کی تکمیل ہوتی ہے، کیوں

کہ یہ متن کے باطنی انسلاکات میں جھانکنے کی امنگ پیدا کرتی ہے، تا کہ معنیٰ کی معروضیت یا اطلاقیت کا احساس زندہ رہے۔ تشبیہ کے بغیر ایک ادبی متن کی تشکیل کا تصور محال ہے، کیوں کہ ادبی متن کی ساخت اپنے فنی آلۂ اظہار کی کمک کے بغیر بے معنی ہی نہیں، بے جواز بھی ہو جاتی ہے۔ تشبیہ دراصل الفاظ کے درمیان ایک پل کی مانند ہے جو قاری کو متن کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے، اور اس کے تجربات اور خیالات کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ یہ اس بات کی یقین دہانی کراتی ہے کہ صرف الفاظ کو نہیں، بلکہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے احساسات کو بھی سمجھا جائے، جو تخلیق کے عمل کو ایک نئی روشنی عطا کرتے ہیں۔ تشبیہ کی اسی اہمیت کا اظہار مناقب کی روایت اور جدید منقبت میں ملتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

ساحرؔ لکھنوی نے امام حسن علیہ السلام کی منقبت میں کہا کہ:

ادھر نگاہِ نبیؐ میں حسَن، ادھر قرآں
ہے ایک زانو پہ آئینہ ایک پر تصویر

چہرے کی صفحۂ مصحف سے تشبیہ معروف ہے، لیکن مصرعِ ثانی کے پیکر نے معرکہ مار دیا۔ امام حسن علیہ السلام کو آئینۂ قرآن کی تصویر کہنا بہت بدیع ہے۔ یہ ایک مکمل منظر کو متحرک تصویر میں یوں پیش کر دیا کہ نگاہِ مصطفیٰ ناظر، مصحفِ قرآن منظر اور امام حسن کا چہرۂ منور دیدۂ چشم انداز کے لیے مرکزِ نگاہ ہے۔ چہرۂ امام حسَن کے لیے یہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے۔

ساجدؔ مہروی نے سید مخدوم صابر پاکؒ کی منقبت میں کہا ہے کہ:

تجھے اے شاخِ گولر! سونگھتے ہی دردِ سر جائے
تری چہکار چوبِ صندلی سے ملتی جلتی ہے

حکایت ہے کہ سید مخدوم صابرؒ بارہ سال تک کلیر میں گولر کی شاخ پکڑ کر عالمِ تحیر میں جلوۂ مظاہرِ الٰہی میں کھڑے رہے مگر پائے عزیمت میں جنبش تک نہ آئی۔ یہیں ان کا مزار ہے۔ یہ گولر کا درخت آج بھی آپ کے مزار کے احاطے میں موجود ہے اور لوگ بطور تبرک اس گولر کے پتے لے جاتے ہیں۔ شعر میں یہی تلمیح برتی گئی ہے، تاہم مصرعِ ثانی میں لفظِ "چہکار" کو "چوبِ صندلی" سے جو تشبیہ دی گئی ہے، یہ محلِّ نظر ہے۔ کیوں کہ چہکار میں آواز کا قرینہ ہے جبکہ صندل کی لکڑی خوشبو کا کام دیتی ہے۔ امکانِ غالب ہے کہ ماتن کے نزدیک چہکار میں بُوئے نفَس کا قرینہ پیشِ نظر رہا ہو جس سے چوبِ صندلی کی مہک آتی ہے۔ یہ پیچیدہ تشبیہ ہے البتہ فصیح شعرا ایسا نہیں کہا کرتے۔

مرزا حفیظ اوجؔ نے در مدحِ شہدائے کربلا کہا کہ:

اک دشتِ بے کسی میں بہتّر ہوئے طلوع
جتنے مہ و نجوم تھے چرخِ رضا کے تھے

شعر میں ایک گہرے فلسفیانہ اور تاریخی تناظر کی عکاسی کی گئی ہے۔"دشتِ بے کسی" کی اصطلاح ایک وجودی خلا (Existential Void) کی جانب اشارہ کرتی ہے، جہاں انسانی تجربات کی کثرت کے باوجود احساسِ تنہائی اور پردیسی پَن غالب ہے۔اس ویرانے میں"بہتّر" کےطلوع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ شہدائے کربلا کی شہادت نے ایک تبدیلی کی بیداری (Transformative Awakening) کوجنم دیا، جو نہ صرف ان کی قربانیوں کی یاد دلاتا ہے بلکہ ان کے اصولوں کی روشنی میں انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے۔"مہ ونجوم" کی تشبیہ یہاں نہایت اہم ہے، کیونکہ یہ شہیدوں کی عظمت اوران کی روحانی بلندی کو کائناتی اہمیت عطا کرتی ہے، جو ایک الٰہی نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔"چرخِ رضا" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک اعلیٰ مقصد کے تحت ہوا، جہاں ہر واقعہ ایک وسیع تر تقدیری کہانی کا حصہ ہے۔ان تمام عناصر کا مجموعہ ایک طاقتور بیانیہ تخلیق کرتا ہے جو کربلا کی جنگ کو محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور نظریاتی تبدیلی کے طور پر پیش کرتا ہے، جو آج بھی انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ شعر دراصل ایک عمیق عکاسی ہے، جو انسانی جدوجہد، ایثار اور استقامت کی علامت ہے، جوشجاعانہ قربانی (Heroic Sacrifice) کے تصور کو بھی فروغ دیتا ہے۔اسی فروغ کا عملی منہاج ادیبؔ رائے پوری کے اس شعر سے بھی مترشح ہے:

لذتِ سوزشِ بلالؓ، شوقِ شہادتِ حسینؑ
جس نے لیا یونہی لیا اپنا خطاب ریت پر

یہ شعر ریت کی مدح ہے یا حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی منقبت ہے، اس سے قطع نظر اس کا ایک باطن میں مضمر معنی ہے، اسے کریدنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ریت استعارہ ہے قربانی سے، کیوں کہ اس میں مستعار منہ شہدائے کربلا کی جاں سپردگی کو بنایا گیا ہے۔ یہ انسان کے عابد ہونے کی انتہائی علامت ہے کہ وہ جاں نثاری پر منتج ہو۔منقبت میں انسان کا انسان اور عابد ہونا اس طرح اظہار میں لانا کہ وہ اپنی ان دونوں حیثیتوں میں ممتاز مقام پر فائز دکھائی دے اور عظمت کی میراث کو پالے، یہ دراصل اس الہامی تعلیم کا مطلوب ہے جو اسلام میں"جہاد" کے انفسی اصولوں کا استخراج کرتی ہے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے بھی اور سیدنا امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنا عابد ہونا اپنی قربانی اور ایثار مندی سے ثابت کیا۔ ریت دونوں میں مشترک ہے،لیکن ایک کا جغرافیہ بڑا ہے ایک کا چھوٹا، تاہم استعارہ دونوں کے لیے یکساں ہے۔ ادیبؔ رائے پوری کا یہ شعر بظاہر غیر محسوس

مدح ہے لیکن اپنے ضمن میں بیانِ عظمت کا بہت بلند اظہار لیے ہوئے ہے۔

ادبی اور شعری زبان میں محاورے کی اہمیت کئی جہتوں سے بہت بنیادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلاغت کے ماہرین اسے علم البیان میں شمار کرتے ہیں نہ کہ بدیع ومعانی میں، کیوں کہ یہ زبان کی تخلیقی قوت کو بڑھانے ساتھ معنویت کی گہرائی بھی فراہم کرتا ہے۔ محاورے، بہ اعتبارِ تشبیہی زبان انسانی تجربات اور جذبات کی پیچیدگی کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کرتے ہیں، جس سے مخاطب کے ساتھ ایک جذباتی تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، محاورے ثقافتی پس منظر کی عکاسی بھی کرتے ہیں، جو کسی بھی ادب کو اساس فراہم کرتا ہے۔ یہ الفاظ نہ صرف مخصوص ثقافتی پس منظر کو بیان کرتے ہیں بلکہ بین المتن انسلاکات کے ذریعے مختلف متون کے مابین تعلقات بھی قائم کرتے ہیں۔ اس طرح، محاورے ادبی متن کو ایک تہہ دار معنویت (Layered Meaning) فراہم کرتے ہیں۔ محاورے زبان کی وجودیت کی عکاسی کرتے ہیں، جہاں وہ انسانی تجربات کی پیچیدگیوں کو سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ یہ علامتی نمائندگی کی صورت میں انسانی حقیقتوں کو سمجھنے میں مددگار ہوتے ہیں، جو کہ ادبی تخلیق کی کائنات کو مزید وسعت دیتے ہیں۔

محاورہ ادراکی ڈھانچے کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جو معانی کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔ الفاظ کی سطح پر قائل کرنے کی طاقت رکھنے کے ساتھ، متنی ساخت کی استدلالی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس طرح، محاورے نہ صرف ادبی زبان کو خوب صورت بناتے ہیں بلکہ اس کی معنویت کو بھی تنوع بخشتے ہیں۔ محاورے کی یہ متعدد جہتیں نہ صرف ادبی تخلیق کی معقولیت میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ انسانی وجود کی پیچیدگیوں کو بھی اجاگر کرتی ہیں، جس سے قاری کی ذہنی آبیاری ہوتی ہے۔ یہ عناصر مل کر ایک ایسی مشعلِ راہ فراہم کرتے ہیں، جو تخلیق کار اور قاری کے درمیان ایک عمیق گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، جہاں الفاظ کی قوت اور معانی کی گہرائی کی دریافت ممکن ہوتی ہے۔

ناصر زیدی نے درمدحِ سیدنا امام حسین علیہ السلام ایک بھرپور آزاد نظم کہی ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا دیکھیے۔

ستم کی تاریخ سے عیاں ہے
یزیدیت پر حسینیت ہی رہی ہے غالب
سوادِ زنداں ہو، کربلا ہو
ستم کہیں سے بھی بولتا ہو
شکست اس کے نصیب میں ہے
جو راہ حق میں شہید ہوگا،

وہی ہے فاتح، وہی ہے فاتح

چوتھی سطر میں ایک نادر محاورہ باندھا گیا ہے۔"ستم بولنا" بھی محاورہ ہے اور صرف "بولنا" بمعنی ظاہر ہونا بھی محاورہ ہے۔"ستم بولنا" بالکل نیا محاورہ ہے جو کلاسیک لغات میں نہیں ملتا۔آصفیہ، نور، مہذب اور دیگر مطوّل لغات میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ نئے عہد نے اپنے محاورے اور روزمرے خود اپنی تہذیبی ثقافت سے پیدا کیے ہیں۔زبان روزمرے کی ہو یا محاوراتی، بیان کو طاقت اور ابلاغ بخشتی ہے۔"ستم بولنا" کا معنی یہ ہوا کہ ظلم اپنی پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہو جائے۔"بولنا" انتہائے ظہور کے لیے محاورہ ہے، اور"ستم بولنا" انتہائے ستم کا تصویر گر۔ یہ ستم بہرحال ہے کہ جدید غزل نے محاورے کی بجائے استعارے کو اپنا لیا ہے، کیوں کہ بقولِ حسن عسکری:

"استعارہ اگر بقول ارسطو شاعری کی جان ہے تو محاورے اور روزمرے ایک مقام پر پہنچ کر خود شاعری بن جاتے ہیں۔ نیز محاوروں میں اجتماعی زندگی کی تصویریں، سماج کے تصورات اور معتقدات، انسان، فطرت اور کائنات کے متعلق سماج کا رویہ، یہ سب باتیں چھلکتی ہیں۔محاورے صرف خوب صورت فقرے نہیں، یہ تو اجتماعی تجربے کے ٹکڑے ہیں جن میں سماج کی پوری شخصیت بستی ہے۔محاورہ استعمال کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انفرادی تجربے کو اجتماعی تجربے کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔محاورہ فرد کو معاشرے میں گھلا دیتا ہے۔تخصیص میں تعمیم اور تعمیم میں تخصیص پیدا کرتا ہے۔"

(مضمون: محاورہ کا مسئلہ، مشمولہ: مجموعہ/ مضامینِ محمد حسن عسکری، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2015، صفحہ ۲۸۸)

عسکری صاحب سے اتفاق کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔محاورے صرف زبان اور مزاج کے راز دان ہی نہیں ہوتے بلکہ پوری تہذیبی ساخت کے تجربی اور بیانی اصولوں کا مخزن بھی ہوتے ہیں۔

اس محاورے"ستم بولنا" سے قطع نظر، نظم کا یہ پورا ٹکڑا ایک علامتی تشکیل کا ساخت کنندہ بھی ہے۔ کیوں کہ کربلا کا واقعہ حسینیت اور یزیدیت کی علامتوں کے ذریعے انسانی وجود کی پیچیدہ نوعیت کو اجاگر کرتا ہے، جہاں حسینیت حق، انصاف اور اخلاقی عظمت کی تجسیم ہے، اور یزیدیت استبداد، ظلم اور اخلاقی زوال کا مظہر۔ یہ دو متضاد فلسفے انسانی تہذیب میں دائمی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ ظلم کے خلاف مزاحمت کرنا نہ صرف فرد کی ذمہ داری ہے بلکہ اجتماعی بیداری کی ضرورت بھی۔حسینیت کی آفاقی معنویت ہمیں ہر دور میں حق کی خاطر جدوجہد کرنے کی ترغیب دیتی ہے، جبکہ یزیدیت کی تنبیہ ہمیں اس بات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ خاموشی بھی ظلم کا ایک حصہ ہے۔ یہ علامتیں فلسفیانہ طور پر ہمیں یہ سوالات پیش کرتی ہیں کہ کیا ہم اپنے اصولوں کی بقا کی خاطر جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہیں؟ کیا ہم انصاف کے لیے کھڑا ہونے کی ضرورت کو محسوس کرتے یا سمجھتے ہیں؟ اسی طرح

کربلا کی یہ علامتیں انسانی وجود کے بنیادی سوالات کی عکاسی بھی کرتی ہیں اور ہمیں اس بات کی رہنمائی مہیا کرتی ہیں کہ ہمیں ہمیشہ حق و انصاف کی راہ پر گامزن رہنا چاہیے۔

تقدیسی ادب کی منقبتی شاعری میں محسن نقوی کے ہاں محاورات کی کثرت ملتی ہے۔ مدحِ سیدہ زینب بنتِ علی سلام اللہ علیہا میں ایک بند دیکھیے کہ:

ہر چند اس کے باغ کی ہر شاخ جھڑ گئی　　لیکن مثالِ برق ہواؤں سے لڑ گئی
بھائی کے ساتھ ساتھ اصولوں پہ اَڑ گئی　　زینب ضمیرِ سنگ میں آئینے جڑ گئی
بھائی سے یوں بہن نے تڑپ کر علَم لیا　　آخر یزیدیت کو فتح کر کے دم لیا

"ہواؤں سے لڑنا"، "آئینے جڑنا" اور "دَم لینا" معروف محاورے ہیں، لیکن ان کا حسن یہاں مزید نکھر گیا ہے جب یہ استبداد کے خلاف بننے والے پیکر کی ذات میں ڈھل کر اس کے اوصافِ لازمہ بن چکے ہیں۔ محاورات کے علاوہ محسنؔ کے ان شعروں کا رزمیہ آہنگ اور آواز کا اٹھاؤ بھی قابلِ دید ہے۔

ادبی متن کے طرزِ اظہار میں روزمرہ، تصویر میں روح کی طرح ہے۔ روزمرہ معنیٰ کی ساخت کو مخاطب ذہن میں یوں تحلیل کر دیتا ہے کہ محسوس شے تجربے سے بڑھ کر معروضِ معلوم بن جائے۔ سرِ دست مولوی امیر الدین شوخؔ کا ایک شعر پیشِ نظر ہے جو ایک بزرگ عبد الکریم شاہؒ کی مدح میں ہے۔ اس شعر کے مصرعِ ثانی کا معنیٰ اس کے روزمرے میں پنہاں ہے۔ شاعر کہتا ہے:

ایک تیرے منھ سے قُم کی آس ہے
ورنہ یہ مُردہ تو زندہ ہو چکا

"زندہ ہو چکا" کا اثباتِ فعل طنزیہ ہے۔ طنز کا ایک اسلوب اثبات بغرضِ نفی بھی ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ "میری بیماری میں نیم حکیم علاج کرے گا؟ تب تو میں صحت یاب ہو چکا۔" مراد یہ کہ اب میرا ٹھیک ہونا محال۔ دیکھیے کہ شوخؔ کے مندرجۂ بالا شعر میں یہ روزمرہ کتنے طرفہ محل میں وارد ہوا ہے اور معنی میں جو شدت اتر آئی، اس کا حسن مستزاد ہے۔ یونہی اس روزمرے میں قولِ محال کا لطف بھی لیا جا سکتا ہے۔

قولِ محال میں اقبال نشترؔ کا یہ شعر، جو حضرت وارث علی شاہؒ کی منقبت میں ہے، بھی قابلِ دید ہے۔

ہم آنکھ کھول کے تعبیرِ خواب دیکھیں گے
ابھی اثر ہے نگاہوں میں خوابِ وارثؒ کا

جدید منقبت کا فکری منظر نامہ

فکری ابعاد کے خصوصی تناظر میں معاصر اور ماقبلِ معاصر منظر نامے کی تشخیص بھی ضروری ہے، کیونکہ ادب میں عصرِ حاضر کی اہمیت اس باعث دوچند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ اثرات اور خارجی

رویوں سے تعلق کو کس اعتبار سے قبول کرتا ہے۔ منقبت کا عصری منظر نامہ پیش کرنے میں میرا ماخذ دو طرح سے ہے۔ پہلا ماخذ وہ کتب ہیں جو معاصر یا ماقبلِ معاصر منقبت کا ایک مجموعی مزاج پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر منظر عارفی نے بالخصوص کراچی کے شعرا کی منقبتی شاعری کی جمع بندی اور انتخاب میں تین کتب مرتب کیں۔

(۱) خلفائے راشدینؓ اور شعرائے کراچی

(۲) مناقب امام حسینؓ اور شعرائے کراچی

(۳) حدیقۃ المناقب، سیدہ فاطمہ الزہراؓ اور حضرت علیؓ کی مناقب اور شعرائے کراچی

ان تین کتب کو ماقبلِ معاصر میں شمار کیا جانا چاہیے، کیونکہ ان میں قیامِ پاکستان کے بعد سے اکیسویں صدی کے آغاز تک کے شعرا کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جبکہ اکیسویں صدی کے معاصر منظر نامے کی عکس بندی علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی نے کی۔ انھوں نے خلفاے راشدین اور شہزادیِ کونین سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے مناقب کو الگ الگ کتب میں انتخاب کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان محترم شخصیات پر آنلائن مشاعروں کا اہتمام کیا اور معاصر لکھنے والوں کے کلام کو حسبِ مقدار جمع کر دیا۔ اس انتخاب کا معیار کیا ہے، یہ ایک تفصیل طلب سوال ہے۔ یہاں ان کی محنت اور جان کوشی کی داد دینا بنتی ہے کہ چند کتب میں پورے معاصر بیانیے کو ایک گلدستے کی طرح پیش کر دینا اتنا آسان نہ تھا۔ انھوں نے درج ذیل کتب مرتب کیں۔

(۱) مناقبِ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(۲) مناقبِ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

(۳) مناقبِ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ

(۴) مناقبِ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

(۵) انتخابِ مناقبِ سیدۃ النساء سلام اللہ علیہا

(۶) مناقبِ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ

(۷) انتخابِ مناقب سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

(۸) فیضِ ہجویر رحمۃ اللہ علیہ

ہم دیکھتے ہیں کہ صرف شعراے کرام ہی نہیں، شاعرات نے بھی اس گلشنِ عظمت کی عطر بیزیوں سے اپنے مشام ہاے جاں کو عنبر بار کیا ہے۔ تسنیم عابدی نے ایک بھرپور کتاب بعنوان "منقبتی اور رثائی ادب اور اردو شاعرات" تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک تذکرہ ہے، تاہم تاریخی ترتیب پر ہے۔

قبلِ تقسیمِ ہند سے ۲۰۲۳ء تک ہندوستانی اور پاکستانی، نیز دیگر ممالک میں مقیم اردو شاعرات کے سلام ومناقب کا یہ حیرت انگیز انتخاب سعیِ پیہم کی داد کا مستحق تو ہے، معاً اس میں مصنفہ کا جوہر اس طرح کھل کر سامنے آیا ہے کہ انھوں نے انتخابِ کلام میں نہایت مہارت کا اظہار کیا ہے۔ اس کی ورق گردانی سے یہ تاثر زائل ہوتا ہے ہوا محسوس ہوتا ہے کہ شاعرات کا فن کمزور یا ان کے ہاں شعریت کی کمی ہے۔ یہ کتاب شاہد و عادل ہے کہ کئی شاعرات کا منقبتی کلام اپنی تمام تر فکری وفنی ثروت مندی کے ساتھ موجود ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کا یہ جملہ بجا طور پر اس پر صادق آتا ہے کہ ”اسے کہتے ہیں تحقیق وتدوین میں لازوال نقش چھوڑ دینے کا ادبی کارنامہ“

ان کے علاوہ بھی منقبت کے انتخاب ہو سکتے ہیں جن سے راقم الحروف آگاہ نہیں ہے۔ تاہم شعری مجموعوں کی صورت میں دستیاب مواد کا جائزہ اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔

چونکہ متذکرہ والا تینوں انتخاب کار شخصیات شعر وادب سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے شاعری کی پرکھ اور مزاج شناسی کے ہنر سے بھی ثروت مند ہیں۔ لیکن مجموعی شعور میں ادبی متن کی پرکھ کا جو معیار ہے، ممکن ہے کہ وہ انفرادی ذہن کے لیے نمونہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس جمع بندی میں کہیں کہیں مقدار سمندِ معیار کی راکب نظر آئی ہے۔ اگر ادوار میں منقسم کر کے دیکھیں تو ڈاکٹر منظر عارفی کا انتخاب ماقبلِ معاصر، تسنیم عابدی کا تذکرہ پہلا باب چھوڑ کر بقیہ اکثر ماقبلِ معاصر اور بعض حصہ معاصر، جبکہ علامہ عارف جاوید نقشبندی کا انتخاب تقریباً تمام معاصر منظر نامے کی عکاسی پیش کرتا ہے۔ جس وفور سے معاصر منقبت نویس صفحات سیاہ کر رہے ہیں اور لفظوں کی مالائیں بنا رہے ہیں، اتنا ہی متنی لوازمہ داخلی منطق، تاثیر، اثر پذیری، فنی چابک دستی اور ممدوح کے فضائلِ حقیقی و تخلیقی کے اظہار سے تہی دامن ہوتا جا رہا ہے۔ چونکہ منقبت کا ممدوح مذہبی حوالے کی بنیاد پر قابلِ مدح قرار پاتا ہے، اس لیے اس کا تمام امتِ مسلمہ کے واسطے ممدوح ہونا بدیہی ہے۔ لیکن معاصر منقبت کا شعری اظہار تخلیقی اپج سے اس قدر خالی ہے کہ امت کا مجموعی ممدوح بھی شاعر کی پیش کردہ منقبت کے آئینے میں پرکشش یا قلبی تعلق قائم کرنے کی کمک فراہم نہیں کرتا۔ یہ ممدوح کا نقص نہیں، ممدوح کی پیش کردہ تصویر کا عیب ہے۔ یعنی یہ کہ کلکِ منظر کش اس میں دلفریبی ورعنائی کا سامان نہیں پیدا کر پائی۔ چہ جائیکہ امت کا مجموعی رویہ اس ممدوح سے اپنے تعلق یا نسبت کا اکتشاف واحیا کرے۔

ہر تخلیقی عمل کے پس منظر میں ایک منضبط تصور کارفرما ہوتا ہے جو اس عمل کے جواز، اسلوب اور پیش منظر کے امکانات کا تعین کرتا ہے۔

حق اور اس کے نمائندوں سے تعلق کی ہمہ نوع تجدید اور احیا، نیز ممدوح سے باہم ہم نسبتی ہی

جدید منقبت کا اختصاص ہے۔اس کی متعدد ضمنی شکلیں ہیں۔مثال کے طور پر:

(۱) ممدوح سے نسبت کا یک جہتی حوالہ جسے منقبت نویس صرف اپنی ذات سے متلازم کرے۔

(۲) ممدوح کا ہمہ جہتی کردار جس میں وہ ایک تہذیب کا نمائندہ شخص ہو اور حق کا علامتی ڈھانچہ اس کی ذات سے بامعنی اور زندہ ہو اس کی مثال بلاشبہ صرف حضرات صحابہ کرام اور اہل بیت النبی ہیں۔

(۳) ممدوح شے کا مذہبی حوالہ اس کے اختصاصی پہلو کے ساتھ ہو یا عمومی جہت سے، اسے بھی حق کا ایک منفرد یا ذیلی کردار بنا کر پیش کیا جائے۔

مدح کیا ہے؟ اور اس کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کی روشنی میں مادح اور ممدوح کے مابین نسبتوں کا انکشاف کن اصولوں پر ہوتا ہے؟ اس کا جواب ہمیں معاصر منقبت کے چند اہم شعری رجحانات سے حاصل ہوگا۔ مدح انکشافِ عظمت ہی نہیں، اعترافِ عظمت بھی ہے۔ دونوں میں مذہبی وحدت جاری رہتی ہے، تاکہ مادح کا اذعان اور تجربہ دونوں انفسی اور آفاقی حقائق کو جذب کر کے ان سے ایک مطلق امر کا عرفان حاصل کرلیں۔انفس کا تجربی کشفیہ آفاق کے دائرۂ حقیقت سے بہرحال کمتر وسیع ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ منقبت کا ممدوح انفرادی فاعل کے صیغۂ مدح کا مفعول بنے یا اجتماعی سطح پر ممدوح قرار پائے، ظاہر ہے کہ یہ اس کی ذاتی اور وصفی نسبتوں کے عرفان کا کم وکیف ہوگا، جو مادِح کی جہت سے متعارف ہوگا۔ مدح صنفِ منقبت کے لیے روح کا درجہ رکھتی ہے، کیونکہ منقبت کہتے ہی مذہبی حوالے سے تحسین کرنے کو ہیں۔ اور یہ حوالۂ مذہبی منقبت کو دیگر مدحیہ احساسات سے بالکل ممتاز رکھتا ہے۔ کیونکہ دینی مفہوم کے اعتبار سے فرد اپنی انفرادی کلیت میں جس اعتقاد یا تہذیبی امر کا نمائندہ یا پرچارک ہوتا ہے، مادِح دراصل انھی کو قابلِ قبول اور پرکشش بنانے کا عمل اختیار کر رہا ہوتا ہے۔لیکن اگر ایک صوفی کی منقبت سے قاری کے دل میں خدا کے عرفان اور خشیت کا احساس نہ مترشح ہو تو یہ منقبت اپنی معنوی تکمیل کے سفر میں ناکام ٹھہرے گی اور اپنے تاثیری پھیلاؤ میں سکڑی ہوئی ہوگی۔تو جس کا پھیلاؤ ہی اس کے سکڑے ہوئے وجود سے ظاہر ہو، وہ نہ صرف بے سمت ہے بلکہ مہمل اور لایعنی بھی ہے۔ اور اس حدیث "مِن حسن اسلام المرء ترکه لایعنیه" کے مطابق اگر منقبت احساسِ عظمت تو پیدا کرتی ہے، لیکن ممدوح کے ہم نسبتی اوصاف میں کشش اور جاذبیت کی دریافت نہیں کر پاتی، تو منقبت نویس کا عمل اور ممدوح کا فکری جغرافیہ دونوں محلّ تشکیک میں آجائیں گے۔اس سلسلے میں اگرچہ اکثر اسباب ہمارے اختیار کردہ ہیں، لیکن بعض وجوہ سماجی اور جغرافیائی بھی ہیں۔ تاہم برصغیر کا منطقہ ہی نہیں، اس وقت عالمِ اسلام کی تمام تر مرکزی قیادت اپنا کاسہ اٹھائے مغربی اقدار کی بھیک کی جستجو میں زلہ خواری پہ آمادہ ہو چکی ہے، اس کی اثر اندازی میں منقبت میں وہ حسنِ قبول جو اس کا جوہرِ

اخلاقی ہے، اب نہ صرف بالعموم مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بن پا رہا بلکہ ادنیٰ درجے کا تعارف بھی پیدا نہیں کر رہا۔ مجھے یہ کہنے میں افسوس تو ہے، لیکن باک نہیں کہ خدا کے مرگ کا اعلان جب خدا ہی کی سلطنت کے کار پردازان کی جانب سے عملی طور پر کر دیا جائے تو شکایت کس سے کی جائے گی اور شکایت سننے والا کون ہوگا؟ ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ فکری یلغار کی زد میں باسانی آ جانے کے بعد سارا ملبہ مغربی تہذیب پر دھر دیتے ہیں اور خود معصوم بن کر اس سے لاتعلقی کے مجبوری احساس کے اظہار میں لگ کر اپنی ہی نوحہ خوانی کے عمل کو مذہبی فریضے کی طرح ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی بھی تہذیب کے سنجیدہ دماغ میں اس قسم کی شعبدہ بازی جب جنم لے لے تو یہ اس کی موت کا اعلان ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے فنا کی دلیل بھی بن جاتی ہے۔ اس واسطے ضروری ہے کہ منقبت کے خصوصی تناظر میں ہمارا فعلی تجربہ اخلاق اور اخلاص کے اصولوں پر ہونا چاہیے، تاکہ شے سے نسبت کے روحانی ابعاد میں ہمارا عمل یا اظہار معنی یاب ہو سکے اور ہم اپنی تہذیبی قدروں کی حفاظت کا احساس اور فعال ارادہ اپنے اندر متحرک طور پر اجاگر کر سکیں۔

معاصر منقبت محض شخص پرستی کی آوازہ کاری ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ شخصیت کی جوہر شناسی سے نہ صرف لاتعلق ہے بلکہ اس شرم ناک عمل پر راضی رہنے کا احساس اور شوق بھی پال رہی ہے، اور یہ بہت خطرناک ہے۔ اگر اس کو جلد یا بدیر اپنی رستگاری کا خیال نہ پیدا ہو سکا تو مستقبل میں منقبت کا فکری پہلو نہ صرف مذہبی بیانیے سے منہا ہو جائے گا بلکہ اس محرومی پر قانع رہنے کی لت پر راضی رہنے کی مذموم بدعقیدگی بھی ہماری بقا پر سوالیہ نشان بن کر نمایاں ہو جائے گی۔ اس لیے منقبت کے سنجیدہ ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاصر منقبت کو ایک فکری پس منظر میں دیکھے، تاکہ نظریے کے افتراق وتشتت کی سماجی ومسلکی تفہیم کا حصول ممکن ہو سکے۔

برصغیر کا منطقہ اپنی کئی ہزار سالہ تاریخ میں متنوع تہذیبوں اور مختلف مذاہب کے ہمہ گیر تسلط میں رہا ہے۔ فکر کی تشکیل میں تہذیبی قدر اور مذہبی عقیدہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ منقبت کے ہر رجحان میں ان دونوں عناصر کا اثر ضرور ثبت ہوا ہے۔ بالخصوص مغل شاہی عہد میں اور پھر پوری مذہبی شدت و صلابت کے ساتھ دورِ جدید میں اس اثر اندازی نے اپنی نمو تیزی سے فعّال کی ہے۔

معاصر بیانیۂ منقبت اصابتِ اعتقادی کے مفصل اذعان کی شکل میں پروان چڑھ رہا ہے۔ اس میں تہذیبی قدر فہمی کا التباس ضرور ہے لیکن ابھی وہ نوزائیدہ ہے۔ اعتقاد میں اصابت کو بھی کائناتی حقیقتوں سے ہم آمیز کیا جا سکتا ہے، اور اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً عارف عبدالمتین نے سیدنا امام حسین علیہ السلام کی مدح میں ایک آزاد نظم کہی۔ اس کا یہ ٹکڑا اہم ہے:

آدمیت کے گلستاں کو ترے خوں سے ملا کتنی ہی پوشیدہ بہاروں کا سراغ
کھل اُٹھے اس میں محبت کے گل ولالہ کہیں،
اور چٹکے کہیں ایثار و وفا کے غنچے،
سچ کہیں سرو وسمن بن کے نمودار ہوا
حق کہیں سنبل وریحاں سے ہم آثار ہوا
ابنِ آدم کو نئے سر سے کسی جنتِ گم گشتہ کا دیدار ہوا

اس ٹکڑے کی اصطلاحات میں "آدمیت"، "سچ" اور "حق" کا استعمال ممدوح کو انفرادی تشخص میں دیکھ کر نہیں کیا گیا، بلکہ ممدوح یہاں دینی تہذیب کا کُل ہے جو پورے نظامِ وجود کو اپنی ذات سے ہم آمیز کر کے اس میں معنی داخل کر رہا ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے جو تہذیبی انقلاب برپا کر کے دکھا دیا، اس کی اس ٹکڑے سے زیادہ واضح تصویر اور کیا ہو سکتی ہے؟ یونہی حسن عسکری کاظمی کی ایک منقبتی آزاد نظم کا یہ ٹکڑا بھی اسی معنویت کا حامل ہے جہاں وہ امام حسین علیہ السلام کو مشخص کردار کی بجائے پورے وجودی کُل کی علامت میں دیکھتے ہیں:

وہ نقشِ عظمت
سجا کے جس کو لہو سے اُس نے ہمیشگی کا فروغ بخشا
یہ ایسا نقشِ وفا ہے جس سے
جہاں میں اہلِ نظر نے جب بھی
شعورِ ہستی کی بھیک مانگی
تو اس کے تازہ لہو کی بوندیں
اندھیری شب میں
چمکتے جگنو کا روپ بھر کر
حروف بن کر
کتابِ صحرا کے ہر ورق پر بکھر گئی ہیں

ایک تیسری تصویر بھی لائقِ دید ہے جو سیدنا علیؓ کی ذات کو مظاہر کے تضادِ لازمی میں ایک دھما کا خیزیت (Explosiveness) کے ساتھ انقلاب برپا کرنے کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ کشور ناہید کی آزاد نظم سے یہ ٹکڑا دیکھیے:

یہ ہم نے دیکھا
کہ تم نے پایا حیات وبعدِ حیات وہ رتبۂ شہادت
کہ نبضِ ہستی
فضا کی دہلیز سے لپٹ کر
بقائے غم کو ترس رہی ہے
تمھارے دم سے امامِ عالی
گلاب کے معجزے بھی صحرا میں ہم نے دیکھے

پیش کردہ سبھی آزادنظمیہ مناقب میں خیالات کا منضبط بہاؤ (Systematic Flow) موجود ہے جو فکری توسّع اور ہمہ گیریت کا لفظی ومعنوی اظہار بھی ہے اور ابلاغ کی قوت سے بھرپور بیانیہ بھی۔ اس ذیل میں سرشارؔ صدیقی کی آزادنظمیہ مناقب کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو میرے نزدیک جدید تقدیسی ادب کی فکری وفنی رسومیات کی حتمی تکمیل کی مسلسل جستجو میں متحرک تصویر کا سا احساس پیدا کرتی ہیں۔ یہ معاصر منقبت کی خوبی ہے کہ یہاں ممدوح کرداروں کی تجسیم ان کے ظاہری سانچوں میں نہیں ہوتی بلکہ ان کی اثر پذیری کے نظام کے برپا کردہ خطوط کی روشنی میں ہوتی ہے اور منقبت کا یہی فکری منہاج مستحسن ہے۔

چند غزلیہ مناقب کے اچھے شعروں کا بلاتبصرہ انتخاب بھی پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ان میں مضمر فکری پہلوؤں کا حتمی اور منطقی ربط (Persuasive Link) ہماری گرفت میں آسکے۔ ذیل میں پیش کردہ اشعار بالترتیب سید نصیرؔ گیلانی، عاصیؔ کرنالی، سید صبیحؔ رحمانی، جوہرؔ چاندوڑی، غلام محمد قاصرؔ، غافلؔ اجمیری، احمد جاویدؔ، سید قمر زیدی، سید اخترؔ چشت، شہبازؔ نقوی، نصرتؔ زیدی، مجید کھام گھانوی، کاظم زیدی تہن پوری، لالہ صحرائی، غلام یحییٰ انجم، سید شاکر القادری، اور کوثرؔ الہ آبادی کے ہیں، جو بالترتیب سیدنا عمر فاروقؓ، سیدنا مولا علیؓ، سیدنا امام حسنؓ، سیدہ فاطمہ الزہراؓ، سیدنا علی اصغرؓ، حاجی نجم الدینؒ خلیفۂ شاہ سلیمان تونسویؒ، حضرت مولا علیؓ، سیدنا امام زین العابدینؓ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، سیدنا امام حسنؓ، امام جعفر صادقؒ، حضرت مولا علیؓ، سیدنا عباس علمدارؓ، سیدہ خدیجہ الکبریٰؓ، سیدنا امام حسینؓ، شہدائے کربلاؓ، سیدنا مولا علیؓ کے ہیں۔

وہ جس کی بات تعمیری، وہ جس کی ذات تسخیری   حقیقت بن کے ابھری خواجگی فاروقِ اعظمؓ کی

تشبیہ کا امکاں ہی نہیں مدحِ علیؓ میں   یہ مدح مکمل ہے، علی کیا ہے؟ ”علی“ ہے

خدا کے نور سے معمور ہے جو شخصیت　　اس آفتاب کی خاص اک ضیا امام حسنؓ

سید الکونین کی چشم و چراغ　　آپؓ نے سینچا لہو سے دِیں کا باغ

تو کہ پہلے وار ہی میں سرخرو پایا گیا　　روسیاہوں کے دلوں میں رہ گئے ارمانِ جنگ

آل تری اولاد بھی تیری غرقِ عشقِ رُسُل ہے سب
سب ہی اپنے وقت کے سلطاں خواجہ حاجی نجم الدین

بغیر حُبّ علیؓ، دعویِ ولاے نبی　　ہے جھوٹی پیاس کا غوغا، سراب کی آواز

یزیدیت کو گماں تھا شاید کہ اب نہ کوئی وفا کرے گا
تمھارے سجدوں نے لاج رکھ لی، غرور ہوتم عبادتوں کا

قدسی فدا اے روحِ حسینی، یزداں کا جلوہ عینی و غیبی
چشمِ نبی ہو دستِ معینی، صدقے ہے تم پر حق الیقینی

کبھی نگاہِ مؤرخ نہ پڑ سکی جن پر　　تری حیات کے ایسے بھی زاویے دیکھوں

تیری دانائی سے مستحکم شریعت کی اساس　　تو نے بتلایا کہ باطل ہے شریعت میں قیاس

اسی گلاب سے مہکا ہے باغِ مصطفوی　　اسی گلاب کو صد نازشِ چمن کہیے

فخر یوں دیکھ کے عباس کو کرتے تھے علی　　آئنہ دیکھ کے جس طرح کوئی ناز کرے

الٰہی! سانچہ جو ہے اُسوۂ خدیجہؓ کا　　ڈھلیں اُسی میں خواتینِ ملتِ بیضا

دنیا پڑھے گی حشر تلک تجھ کو اے حسین!　　تو داستانِ حق کی اک ایسی کتاب ہے

بھڑک رہی ہے مرے خوں میں آتشِ انکار　　مری سرشت میں کربل سے یہ شرر آیا

وہ علیؓ حسن میں جو وجہِ خدا عینِ خدا　　وہ علیؓ تھا جو کمالات میں کامل اکمل

دامنِ مضمون میں اتنی وسعت نہیں کہ جدید و معاصر منظرنامے کا مکمل جائزہ پیش کیا جائے، ایک

مجموعی فضا کی تفہیم کے لیے ضروری لوازمہ سمیٹ لیا گیا ہے۔ البتہ چند منقبت نویسوں کا اجمالاً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عزیزالدین خاکیؔ نے صحابہ اور اولیاے کرام پر ڈیڑھ سو کے لگ بھگ مناقب کہیں۔ فنی اعتبار سے سادہ اسلوب، اظہار کی سلاست اور روانی اور فکری لحاظ سے ممدوح سے تعلق کے اکثر حوالے (مدح، اظہارِ عجز، استغاثہ، حصولِ برکت، مزعومہ فضائل وغیرہ) اپنی تاب ناکی کے ساتھ موجود ہیں۔ عبدالغنی تائبؔ کے ہاں ممدوح کے معروف فضائل، جو زبان زدِ عام ہیں، سے ہٹ کر کچھ نظر نہیں آیا، تاہم اسلوب کی انفرادیت ہی ان کی مناقب کا جواز ہے۔ شمائلہ صدف کے ہاں علمی وقار اور ادبی رنگ کے مظاہر موجود ہیں۔ بلاغت کا حسن اور فصاحت کا جمال بھی از حد جلوہ افروز ہے۔ عام طور پر یہ تصور ہے کہ شاعرات کے ہاں اعجازِ فن کی نمود نہیں ہوتی، یہ تصور یہاں باطل ہوتا نظر آتا ہے۔ سرشار صدیقی کے ہاں آزاد نظمیہ مناقب ہیں۔ ایک نیا انداز اور ممدوح کے انفرادی اختصاص وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ یوں ہی جاذب قریشی کے ہاں دو آزاد نظمیہ مناقب ہیں۔ اسلوب کے انفراد کے ساتھ ممدوح کے باطنی اور غیر معروف پہلوؤں کا تذکرہ اور خود سے ہم نسبتی کا حوالہ بہت خوب صورت انداز میں کیا گیا ہے۔ سید قاسم جلال نے اپنی تہذیب کی خوشبو کو منقبت نویسی میں تحلیل کر کے دکھایا ہے۔ ان کی مناقب میں عمومی مضامین ہی ہیں، لیکن اسلوب کے انفراد اور لہجے کی متانت نے شعروں کو بازاری پَن سے محفوظ کر لیا ہے۔ تابشؔ دہلوی کے ہاں علمی شکوہ اور فنی لیاقت کا خطیر اظہار موجود ہے۔ انھوں نے حضرات صحابہ کرام کی منقبت اس طرح کی ہے کہ خلفائے راشدین کی ذوات اور اوصاف کو نعت میں متشکل کر دیا۔ چار مصرعے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

تیری سچائی کا پرتو سینۂ بوبکرؓ میں ۔۔۔ فکر کا مظہر تری فاروقؓ کی دانش وری
تیرے جُود و لطف کا آئینہ عثمانِ غنیؓ ۔۔۔ تیری صولت کا مرقع جوشِ ضربِ حیدریؓ

جوہرؔ چاندوڑی کی مناقب میں فنی زیرکی اور ایک قسم کا گھلا ملا جذبۂ تعلق موجود ہے جو ان کے ممدوح کو اپنا محبوب بنانے کی پرکشش انگیخت سے دوچار کرتا ہے۔ یہی تو تاثیر کی جمالیت ہے کہ انفرادی اظہارِ محبت اجتماعی تعلق کی کفایت کا وظیفہ پا لے۔ صدیقؔ فتح پوری کے ہاں رزمیہ آہنگ ہے جو صحابہ کرامؓ کی جلالتِ شان کی عکاسی میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ یہ نکتہ یقیناً ان کے پیشِ نظر ہے کہ محبوب کا جمال نیاز اور جلال بندگی کو جنم دیتا ہے۔ نعیم میرٹھی نے اہلِ بیت کی مدح میں جو شعر کہے، وہ ان کی اعتقادی تربیت اور فکری صلابت پر دلالت کرنے سمیت، فنی جہت سے مضمون میں تازہ اور نادر پہلو نکالنے پر منتج ہوتے ہیں۔ قاضی لئیق محویؔ کی شعری بساط میں منقبت کی ریزہ کاری کا عمل انھیں افتخارِ فن

کی دولت سے بہرہ یاب کرتا ہے۔ صحابہ کرام کی مدح میں ان کا رہوارِ قلم ہمیشہ محبت کی منزل کو تکتا اور ان سے نسبتِ تعلق کے اِحیا کی لگن سے سرشار رہتا ہے۔ نصرت زیدی، شہباز نقوی، سید اختر چشت، منظر بڑدودی، جامی وارثی، غلام محمد قاصر، بشیر امروہوی اور بشیر صرفی وغیرہ کی متنی میراث شرعی میزان پر بھی پورا پورا اُتلتی ہے اور شعری رمز کاری میں بھی دیر پا نقوش ثبت کرتی ہوئی اپنے اپنے ممدوحین سے اعتقادی نسبت کو اظہار دیتی ہے۔ نیز انجم اجمیری، بسمل آغائی، ہاشم بدایونی، احمد حسین عرقی، زریں چغتائی، لطافت علی ہما، نجم الحسن کاظمی اور صاحب حیدرآبادی کی مناقب المیاتی عناصر سے بنائے عظمت کی دریافت کرتی ہوئی ممدوح کے کائناتی ربط کے انکشاف پر منتج ہوتی ہیں۔ رزم ردولوی، نجم آفندی، منظر ایوبی، نسیم سحر، صبا تابش، بشیر احمد بشر، سرور میواتی، تقی دہلوی، ریاض حسن انور، منظر علی منظر، رحمان کیانی، پاشا رحمان، عشرت قادری، ضامن حسنی، انوار عزمی، ثاقب صابری، شاغل ادیب، سید خادم رسول عینی، اشرف رضا قادری، سید ابو معاویہ گیلانی، حمید ویشالوی وغیرہ، سیکڑوں کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے امت کے عظیم کرداروں کو مدح سرائی کا موضوع بنایا ہے۔ یوں تو مناقب نویسوں کی ایک طویل قطار ہے، لیکن یہاں میں نے صرف وہی اسماے گرامی درج کیے ہیں جن کی منقبتی شاعری کے مطالعے سے مجھے منقبت کے جدید منظرنامے کی مجموعی فضا دریافت کرنے میں سہولت میسر آئی۔

یہ عہدِ موجود اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ پورے شعری منظرنامے پر کم وکیف کے فرق کے ساتھ، سبھی دبستانوں کی منقبت اظہار و فروغ پا رہی ہے۔ یہ چیز انسانوں کے مابین اس خلا کو ختم کرنے کے ذرائع مہیا کر سکتی ہے جو ہمارے مغربی آقاؤں نے ہم پر مسلط کیا ہوا ہے۔

جدید منقبت کے بعض مسائل

خدا کی اس ہمہ نوع کائنات میں متنوع طرز ہاے فکر رکھنے والے انسان اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت کے ساتھ جب کسی تخلیقی تجربے سے گزرتے ہیں تو ان کا یہ تجربہ انفرادی فکریت کی اثر اندازی کی وجہ سے اپنے تاثر، عمر اور ساخت میں مختلف ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔ اگرچہ ہر انسان اپنے جذبۂ جمال کی ساخت خود تشکیل دیتا ہے اور اسی کی فعال ماتحتی میں اپنے شعور کا میزان ترتیب دیتا ہے، تاکہ شے سے تعلق کا نسبتی حوالہ اس کے لیے بامعنی ہو سکے، لیکن عین ممکن بلکہ ضروری ہے کہ طبائع کے اس اختلاف کا اثر معروض شے پر بھی پڑے جو انسانوں کے لیے اہم یا متعلق ہوسکتی ہے۔ منقبت کے ذیل میں اس اختلافِ اظہار کی معنویت معرضِ سوال بن جاتی ہے جب مجموعی تہذیب کا کوئی نمائندہ کسی زمانی جغرافیے میں اپنی اصلی یا عرفی حیثیت کی شناخت سے محروم کر دیا جائے۔ مثال کے طور پہ ایک ہی تہذیب کے دو متضاد الفکر افراد میں سے ایک یزید کو ملعون قرار دیتا ہے، جبکہ دوسرا اسے امیر المؤمنین

کے روپ میں "رضی اللہ عنہ" کے تاج سے سرفراز کر کے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک گروہ بعض اصحابِ رسول کے حوالے سے محتاط رویہ اختیار رکھتا ہے، جبکہ دوسرا ان کے لیے کوئی گنجائش روا نہیں سمجھتا اور اپنے مزعومہ قانون کو ان پر لاگو کر کے انھیں کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ منقبت میں یہ رویّہ معاصر مشاعراتی فضا کے تناظر میں تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور اس پر مستزاد دونوں جانب افراط وتفریط بھی ہے۔

ابھی یہ طوفان نہیں تھمتا کہ التباسِ عظمت کی شاخِ ترش اپنی جڑیں نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ التباسِ عظمت یہ ہے کہ متنِ شعر کا اسلوب و معنی ممدوحینِ عظیم، مثلاً پیغمبران علیہم السلام پر علی الاطلاق و علی الاختصاص صادق آئے، لیکن متکلم کے عندیے میں وہ شعر کسی اُمتی فرد کے فضائل میں ہو۔ ظاہر ہے کہ فضیلت کے تقدیری مدارج کا لحاظ ہمارے تہذیبی ذریعۂ اخذ واظہار میں ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ توازن ہی قائم نہیں رہے گا جو الوہی منطق میں موجود ہے۔ معاصر ہی نہیں، کلاسیک منقبت میں بھی اس کی مثالیں بہت ہیں۔ محمودیؔ تونسوی کا شعر ہے:

ذاتِ عمران کو کیا فیض سراپا دیکھا
جن کو سرکارِ رسالتؐ کا بھی داتا دیکھا

یہ شعر ابو طالب غفرلہ اللہ کی مدح میں ہے۔ مصرعِ ثانی میں جو بے توازن فضیلت کو دور از فہم استدلال فراہم کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بجائے مدح کے مذموم معنی کی طرف مُشیر ہے۔

التباسِ عظمت کے بعد جو چیز منقبت میں سب سے زیادہ منفی اثرات کی حامل ہے، وہ ممدوح کی عبدیت کو خود اسی کی شانِ بے نیازی بنا کر منہا کر دینا ہے۔ یہ خطرناک ترین مرحلہ ہے کہ جو چیز، یعنی بندگی ممدوح کے لیے واحد وسیلۂ عظمت رہی ہے، اسی کو منہا کر کے اس کی تعریف کا پیرایہ تخلیق کیا جائے۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ "نصیریوں کا خدا" والا مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔ تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار سے شناسا ہر آدمی بخوبی علم رکھتا ہوگا کہ تیسری صدی ہجری میں نصیریہ فرقے نے جنم لیا۔ منجملہ دیگر عقائد کے ان کا ایک عقیدہ سیدنا علیؓ کی الوہیت کا بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ الحسین بن حمدان الخصیبی نے اپنی کتاب "الرسالۃ الرستباشیۃ" میں مذکورہ الوہیت کو ثابت کرنے کے نہایت بھونڈے استدلالات کیے ہیں، جنھیں قرآن وسنت کا معمولی درک رکھنے والا ذہن بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کے دلائل کا بھانڈا پھوٹتا ہوا دیکھنے کے لیے امام ابنِ تیمیہ کا یہ رسالہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ "النصر طغاۃ سوریۃ او العلویون کما سمّاھم الفرنسیون" یہ رسالہ شیخ الاسلامؒ نے علامہ شہاب الدین احمد بن محمد مری الشافعیؒ کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا۔

بہرکیف! معاصر منقبت نگاری میں تشیع کی جانب سے نصیریت کے اس مذموم عقیدے کی تبلیغ کا عمل تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے۔ اگرچہ میرے پیشِ نظر چند اشعار میں عقیدۂ نصیریت کی براہِ راست تائید نہیں ملتی، لیکن کئی ایسے قرائن خود اشعار کے متون کے اندر موجود ہیں جن سے پس پردہ تائید کا اظہار ملتا ہے۔ یہ ایک سچے مسلمان کے لیے نہایت خطرناک بات ہے کہ وہ خدا کی الوہیت پر قطعی ایمان کے بعد، ایسا اعتقاد رکھے جو نصیریت سے مستفاد یا تائید میں ہو۔

اس سلسلے میں چند شعر سرِ دست حاضر ہیں۔ ان سے اندازہ لگانا سہل ہوگا کہ "نصیریت کا خدا" کہہ کر اگرچہ بظاہر اس عقیدے کو انھی کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے، لیکن متنِ شعری میں جو التباسات اور قرائن ہیں، وہ خود متکلم کے عندیے کو اس عقیدے سے باہم متلازم دکھاتے ہیں۔ ذیل میں مندرجہ اشعار بالترتیب ان شعرا کے ہیں۔ سید موج نقوی، شیخ یاسر سرور میر نجفی، سید نسیم کاظمی، سیدہ رباب عابدی، سید مجاہد رضوی، سید عامر کاظمی، فخر عباس رضوی، سید حسنین عابدی، سالک لکھنوی۔

جبیں کو چاہیے نقشِ تصورِ معبود — نصیریوں کا خدا ہو تو کوئی بات بنے
اے منافق! میں نصیری کو بُرا کیسے کہوں — میرے دل میں بھی نصیری کا خدا رہتا ہے
نصیریوں کا خدا خاک پر کرے سجدے — وہ بوتراب ہے، یہ اس کی خاکساری ہے
خدا کا چہرہ ہے، نفسِ نبی، ہمارا امام — نصیریوں کا خدا، شیر خوار کعبے کا
کبھی جلا دے کسی کو، کبھی دعا مانگے — نصیریوں کا خدا اہلبیت میں دو کے ہے
عکسِ رسول، چہرۂ مشکل کشا حسن — یعنی نصیریوں کا ہے دوجا خدا حسن
کلام کرتے ہیں جب بھی کبھی ابو طالب — نصیریوں کا خدا سر جھکا کے سنتا ہے
نصیریوں کا خدا حق کا ولی لگتا ہے — قسم خدا کی، خدا پکا علی لگتا ہے
یہ کہتے جاتے ہیں جبریل بھی پسِ تابوت — نصیریوں کا خدا ہے، امام میرا ہے

منقبت میں مسلکِ مقابل پر تبرّا بازی کا رجحان اگرچہ نیا نہیں، لیکن چونکہ پاکستانی کے منطقے میں بالعموم اصحابِ رسول اور بالخصوص خلفائے راشدین کی شعری و نثری مناقب کا سلسلہ تشیع کے تقابل میں جنباں ہوا۔ مسلکی اختلافات کے باعث شیعہ حضرات بعض صحابہ کے لیے کوئی اور حیثیت سمجھتے ہیں، اہلِ تسنن کے نزدیک ان کی عظمت کا الگ اعتقاد ہے۔ اسی متضاد اعتقادیت کے پیش منظر میں ایشیا کے اکثر جغرافیائی منطقے منقبت میں تبرّا کاری کے پرچارک ہیں۔ کتابی ذخیرے کی بجائے مشاعروں کی فضا میں یہ عنصر بہت واضح ہے۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں انجم نیازی صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور اس کے اسباب پوچھنا چاہے تو ان کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ تشیع نے جو صحابہ کرام

کے خلاف زہر آلود زبان اور افعالِ شنیعہ اختیار کیے ہیں، ان کی تردید میں کی جانے والی منقبتی شاعری میں ایسی سخت زبان یا لہجے کا آ جانا بدیہی ہے۔ انجم نیازی صاحب کے اس جواب سے اطمینان کے باوجود راقم کی ذاتی رائے یہ ہے کہ منقبت کوئی دفاعی مورچہ قائم کرنے کا کام نہیں، بلکہ یہ اپنی جہت سے ممدوح کے فضائل کا بیان اور اس کی خوشبو کو بکھیرنا ہے۔

ہمارے یہاں اس تقابلانہ فضا کا بالالتزام اہتمام وفاؔ کانپوری کے ہاں نہایت کثرت سے موجود ہے۔ ان کی مناقبِ اہلِ بیت میں حضرت علیؓ بمقابل امیرِ شام اور امام حسنؓ بمقابل امیرِ شام کا اختلافی مسئلہ نہ صرف بہتیرا آیا ہے بلکہ اس میں امیرِ شام پر نہایت گہرے طنز اور دھتکار جیسی نفسیات کو جنم دینے والے مصرعے بھی ہیں۔ اگرچہ ہمارے یہاں تاریخ نے جھوٹ اور سچ کو بری طرح ہم آمیز کر کے پیش کیا ہے، اس کے باوجود تاریخی حوالے کو بنیاد بنا کر اس طرح کی طنزیہ فکریات کا اِحیا منقبت کی فکری طہارت اور مدحیہ نزاہت میں معرضِ سوال بنتا ہے۔ متقابل بیانیے سے بھی بڑھ کر بعض متنازع چیزیں ملتی ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

کارِ پیغمبری عبث ٹھہرے
گر محمدؐ نہ دیں پیامِ غدیر

یعنی پیغمبر علیہ السلام کا اصل الاصول کام پیامِ غدیر ہی تھا، اس کے علاوہ کارِ پیغمبری کیا ہے؟ عبث ہے۔ معاذ اللہ!

مدحِ اُمتی میں ذمِ نبیؐ سے بڑھ کر بھی کوئی بدنصیبی کی بات ہوسکتی ہے؟ مدح میں ایسا غلو جو ادبی حُسن بننے کی بجائے دینی اور آئینی ساخت کی خود ساختہ تشکیلِ نو کرنا چاہے، اس کے جواز پر سوال قائم ہوتا ہے۔ وفاؔ کے ہاں ایسے اشعار درجنوں ہیں۔ تاہم ایسا نہیں کہ وفاؔ کے ہاں منقبت کے عمدہ اشعار نہ ہوں، بلکہ ''موجۂ رنگ ونور'' کی بیسیوں مناقب نہایت شاہکار اور فکری ثروت سے مالا مال ہیں۔ مثلاً ''وفا'' ردیف پر حضرت عباس علمدارؓ کی منقبت ادبی، فکری، فنی اور مدحیہ تمام پہلوؤں سے عمدہ ہے۔ لفظی رعایات، ضلع جگت اور بین المصرعین تلازمہ بندی کا حسن بھی بخوب اجاگر ہوتا ہے۔ چونکہ نوحہ گوئی وفاؔ کا خاص میدان ہے، اس لیے جہاں منقبت میں جذبے اور احساس کی گھلاوٹ ہو تو وہاں فکرِ غم آلود ہو کر ممدوح سے متعلق احساسِ عظمت کو ذہن میں لا کر اس کے نہ ہونے کی محرومی پر نوحہ کرواتی ہے۔ منقبت نگاری میں احساس اور جذبے کی یہ سچائی خال خال ہی ملتی ہے۔

جدید تقدیسی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سوال ہمیشہ میرے پیشِ نظر رہا ہے کہ یہ تاثیر سے عاری کیوں ہے؟ منقبت میں یہ سوال مزید گہرائی کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے کہ جو ہستیاں

دینِ اسلام کی عالمی تبلیغ میں اپنے تمام تر وجودی پَن کے ساتھ صَرف ہوئیں اور ایک عہد نے ان کے زیرِ نگیں رہ کر خدا کی بندگی کا قرینہ پایا، کیا وجہ ہے کہ جب انھی ہستیوں کی مدح کا کوئی جدید متنی اظہار معرضِ تخلیق میں آتا ہے، تو ان متون کی روشنی میں وہ شخصیات اپنی فطری کشش سے دور کسی گھڑے ہوئے کردار کی طرح بے ترتیب اور نامانوس سی معلوم ہوتی ہیں اور دل ان کی جانب کسی قسم کا کھنچاؤ یا جذب محسوس نہیں کرتا۔

میرے گہرے غور وفکر کے نتیجے میں جو وجوہات میری سمجھ میں آئی ہیں، یہاں ان کی جانب چند اشارے کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ منقبتی شاعری میں عدمِ تاثیر کی پہلی وجہ جذبۂ محبت کی بے سمت معنویت ہے۔ کیوں کہ محبت کا جذبہ اگر اخلاص اور واقعیت سے معنی اندوز نہ ہوتو یہ محض ایک سطحی احساس بن جاتا ہے۔ ایسی محبت جس میں کوئی مقصد یا سمت نہ ہو، ممدوح کی عظمت کی شناخت میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ جذبۂ تعلق جب حقیقی روحانی تجربے سے تہی دست ہوتو اس کی تاثیر فنا ہوجاتی ہے۔ محبت کا جذبہ اگر خلوص کی کمک پر ہوتو ایک طاقت ور احساس ہے جو انسان کو بلند روحانی تجربات فراہم کرسکتا ہے۔ تاہم، اگر یہ جذبہ کسی مقصد یا سمت سے برگشتہ ہوتو اس کی گہرائی کمزور ہوجاتی ہے۔

دوسری وجہ مسلکی تناظرات میں اختلاف ہے۔ مختلف مسالک میں مقدس شخصیات کی تعبیرات کی بنیاد مختلف نظریات، روایات اور تاریخی پس منظر پر ہوتی ہے۔ یہ اختلافات ان کی مدح میں پیچیدگی پیدا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ایک عالم گیر پیغام کی بجائے مختلف تناظر میں متضاد معانی برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے شاعری میں کلی وحدت کا خلا ابھرتا ہے۔ مثلاً ایک مسلک میں کسی شخصیت کو نجات دہندہ سمجھا جا سکتا ہے، جبکہ دوسری میں اسے محض نیک انسان، جس کی وجہ سے اس کی عظمت کی مختلف تشریحات سامنے آتی ہیں۔ یہ اختلافات مدح میں ایک پیچیدگی پیدا کرتے ہیں، جہاں ایک ہی شخصیت کی مختلف تشریحات ہوتی ہیں، جو شاعری کی تاثیر کو متاثر کرتی ہیں۔

تیسرا سبب تحسین شناسی کا دکھاوا ہے۔ جب مدح اخلاص سے عاری ہوکر محض ظاہر داری بن جائے تو اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ حقیقی تحسین میں دل کی گہرائیوں سے احساسات کی عکاسی ہوتی ہے، جبکہ سطحی تحسین میں وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو مقدس ہستیوں کی شان کے مطابق ہو۔ یہ تحسین کی روح کی کمی کا عکاس ہے۔ تحسین کا عمل صرف لفظی آفریں خوانی تک محدود ہو جاتا ہے جب وہ دل کی گہرائیوں سے نہ نکلے۔ مثال کے طور پر، ایک شاعر کسی شخصیت کی عظمت کا ذکر تو کرتا ہے، مگر اس کے پیچھے حقیقی احساس یا تجربہ موجود نہیں ہوتا۔ نتیجتاً یہ سطحی تحسین بغیر کسی گہرے اثر کے صرف الفاظ کی مالا بن کر رہ جاتی ہے۔

چوتھی وجہ جوہرِ عظمت کی عدم معرفت ہے۔ اگر شاعر اپنی ممدوح شخصیات کے جوہرِ عظمت کو سمجھنے میں ناکام رہتا ہے تو اس مدح میں وہ گہرائی اور اثر نہیں رہتا۔ یہ عدمِ معرفت ان کی روحانی قوت اور اثر پذیری کے فعال نظام کو مشکوک کر دیتی ہے، جس سے وہ شخصیتیں بے رنگ محسوس ہوتی ہیں۔

پانچواں سبب روحانی تجربے کا فقدان ہے۔ روحانی تجربہ ایک شاعر کے لیے ضروری ہے تا کہ وہ مذہبی شخصیات کی حقیقت کو سمجھ سکے۔ اگر یہ تجربہ موجود نہ ہو تو شاعری میں وہ سچائی اور احساس نہیں آتا جو ان ہستیوں کی عظمت کو اجاگر کر سکے۔ یہ فقدان شاعر کو ان کی مدح میں حقیقی اثر اندازی سے مانع ہوتا ہے۔ روحانی تجربے کی اہمیت کسی بھی تخلیقی عمل میں بنیادی ہوتی ہے۔ یہ تجربہ شاعر کو ایک پختہ بصیرت فراہم کرتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنی تخلیقات میں حقیقی احساسات کو شامل کر سکتا ہے۔ اگر یہ تجربہ موجود نہیں تو شاعری میں وہ سچائی اور اثر نہیں آتا جو ان ہستیوں کی عظمت کو آشکار کرنے کے لیے لازمی ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال نے اپنے پورے نظامِ شعری میں روحانی تجربات کی بنیاد پر اسلامی فلسفے کی عکاسی کی، جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں ایک خاص اثر پیدا ہوا جس نے بانگِ اسرافیل کا کام کیا۔ اس کے برعکس ہمارا جدید شعری منظر نامہ باوجود انقلاب اور ردعمل کا دعوی رکھے، بے اثر و بے تاثیر ہے۔

آخری سبب تذکارِ عظمت میں اعتدال سے گریز ہے۔ مذہبی شخصیات کی منقبت میں لکھی گئی تعریفی شاعری میں اعتدال اور زیادتی سے اجتناب ضروری ہے تا کہ نظم کو حد سے زیادہ چاپلوسیت زدَہ، یا بت خانہ بننے سے روکا جا سکے۔ حد سے زیادہ تعریف ساکھ اور صداقت کے نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور ممدوح کی تحسین کے مطلوبہ مقصد کو ضرر پہنچا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ حدّ اعتدال سے بڑھی ہوئی تعریف ممدوح کی ایک غیر حقیقی اور نا قابلِ حصول تصویر پیش کرتی ہے، جو خود مادِح کی ذات میں بے تعلق یا مایوسی کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔ اگر منقبتی شاعری میں اعتدال کا خیال نہ رکھا جائے تو اس کے کئی منفی نتائج نکل سکتے ہیں۔ بے جواز غلو آفرینی ایک فرقے جیسا ماحول پیدا کر سکتی ہے، جہاں ہیرو کو ایک غیر حقیقی اور نا قابلِ حصول طلسمی پرندے کی صورت میں متشکل کر دیا جائے۔ ایسا رویہ خود متکلم کو تنقیدی نقطۂ نظر اور فہم سے محروم کرنے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اس کے برعکس، معتدل اور متوازن تحسین آمیز شاعری زیادہ دیر پا اور بامعنی اثر مترتب کر سکتی ہے۔

ممدوح کی مدح میں اس کی فکر کی تشہیر ایک اہم عمل ہے جو فی الاصل شاعر کی تخلیقی صلاحیت ہی کا اظہار نہیں، بلکہ ممدوح کی عظمت کا ایک ضروری پہلو اجاگر کرنا بھی ہے۔ اس میں متکلم ممدوح کی خوبیوں اور کارناموں کے ساتھ ساتھ اس کے نظریات، افکار اور فلسفے کو بھی معرضِ اظہار میں لاتا ہے۔ شاعر

ممدوح کی اخلاقی اور روحانی بلندیوں کو بیان کرتے ہوئے اس کی فکر کی اہمیت کو بھی واضح کرتا ہے، جس سے قلوب کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف ممدوح کی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ اس کی فکر کو بھی معاشرتی سطح پر متعارف کراتا ہے، جس سے لوگ اس کی تعلیمات اور نظریات کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اسی طرح، یہ شاعری ممدوح کی فکر کی بنیاد پر ایک مثبت اور تعمیری گفتگو کا آغاز کرتی ہے، جو کہ معاشرتی تبدیلی، اخلاقی ترقی، اور روحانی آگاہی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اس کی اہمیت اس بنا پر بھی ہے کہ یہ معاشرتی اور ثقافتی مسائل پر غور و فکر کو فروغ دیتی ہے، اور لوگوں میں ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کے لیے احترام پیدا کرتی ہے۔

القصہ! منقبت کے خصوصی مطالعے میں میرے "کیوں" کا جواب تو موجود ہے، لیکن "کب تک" کا جواب نہیں ہے۔ تاہم، میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ جدید تقدیسی شاعری کو عقیدے کے ناقابلِ فہم اور پراسرار پہلوؤں تک پہنچ جانے والی "بے عکس پرچھائی" کی تجسیم کاری سے عبارت نہیں ہونا چاہیے، تبھی وہ اثر انگیزی کی صفت سے متصف ہو سکے گی۔

کتابیات

1. اجمعین، جہان داد منظر القادری، نایاب پبلی کیشنز، لاہور، جنوری، ۲۰۲۴
2. اظہارِ عقیدت، صدیق فتح پوری، حسان پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۷
3. الوارث، ماہنامہ، کراچی، جلد ۱۸، شمارہ ۳، نومبر، ۱۹۸۳
4. الوارث، ماہنامہ، کراچی، جلد ۲۱، شمارہ ۳، اپریل، ۱۹۸۵
5. الوارث، ماہنامہ، کراچی، جلد ۲۸، شمارہ ۲، جون، ۱۹۹۲
6. انتخابِ مناقبِ حضرت سیدنا امام زین العابدین، مرتب: علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی، نعت مرکز، لاہور، ۱۴۴۵ھ
7. آبجوئے کرم، شمائلہ صدف، دبستانِ نوابیہ عزیزیہ پبلی کیشنز، ستمبر، ۲۰۲۰
8. آستانہ، ماہنامہ، دہلی، اگست، ۱۹۵۱
9. برکات النعت، غافل اجمیری، مشہور آفسٹ پریس، کراچی، ۱۹۹۶
10. پیامِ عمل، ثنائے زہرا نمبر، ماہنامہ، لاہور، جلد ۵۶، شمارہ ۸، ۹، ۱۰، اگست ستمبر اکتوبر، ۲۰۱۶
11. تخلیق البیاض، قاضی محمد لئیق محوی، افریشیا پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۸۶
12. تخلیقاتِ شاعر لکھنوی، مرتب: ایاز پاشا، جہانِ حمد و نعت، کراچی، ۲۰۲۳
13. ترتیل، سید اختر چشت نظامی، مشہور آفسٹ پریس، کراچی، سن ندارد

14. التعریفات، امام عبدالقاہر الجرجانی، دارالریان للتراث، قاہرہ، ۱۴۰۳ھ

15. ثانی اثنین، مناقبِ سیدنا صدیق اکبر، مرتبین: اشفاق احمد غوری، مقصود علی شاہ، نعت آشنا پبلی کیشنز، ملتان، ۲۰۲۰

16. جواہرِ سخن (انتخاب) مرتب: مولوی محمد کیفی چڑیا کوٹی، جلد دوم، ہندوستانی اکیڈمی، صوبہ متحدہ الہ آباد، ۱۹۳۵

17. چراغِ ثنا، حافظ عبدالجلیل، نعت آشنا پبلی کیشنز، ملتان، ۲۰۲۴

18. حدیقۂ مناقب درشان علی المرتضیٰ و فاطمہ زہرا اور شعرائے کراچی، دبستانِ انصار، کراچی، فروری، ۲۰۲۱

19. حرا کی خوشبو، انجم نیازی، نعت ریسرچ سینٹر، جنوری، ۲۰۲۱

20. حرفِ تابندہ، نعیم میرٹھی، ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۹۴

21. حرفِ قدس، نصرت زیدی، عکاس پبلشر، اسلام آباد، ۲۰۰۷

22. حریفِ سنگ، ہلال صدیقی، مشہور آفسٹ پریس، کراچی، باراول ۱۹۷۷

23. حسینی ضیغم، کاظم زیدی، دیگر تفصیلات ندارد

24. خلفائے راشدین (منظوم) گوہر اعظمی، جہانِ حمد پبلی کیشنز، دسمبر، ۲۰۲۴

25. خودآرائی، مولوی امیر الدین شوخ، نفیس اکیڈمی، کراچی، سن ندارد

26. خیراتِ خلد، عبدالغنی تائب، المدینہ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳

27. دامنِ یوسف، سید یوسف بخاری دہلوی، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۳

28. دریافت، کتابی سلسلہ، اسلوب پبلشرز، کراچی، جولائی، ۱۹۸۲

29. دیوانِ سالک، مفتی احمد یار خان نعیمی، مجلس المدینۃ العلمیۃ، کراچی، ۱۳۲۵ھ

30. ذکرِ منیر، مرزا حفیظ اوج، اوج پبلی کیشنز، لاہور، جنوری، ۲۰۱۰

31. زبدۃ المقامات، خواجہ محمد ہاشم کشمی، قلمی نسخہ، راقم الحروف کے پیشِ نظر فارسی مخطوطہ ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کا اصل متن شائع ہوا یا نہیں، تاہم اس کا اردو ترجمہ ملک فضل الدین ککے زئی نے کیا ہے، جو منشی نول کشور پرنٹنگ ورکس لاہور سے اشاعت پذیر ہوا۔

32. زرِ گل، کوثر نیازی، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۳

33. زرنگار، کتابی سلسلہ، شمارہ ۱۵، ۱۶، جولائی ۲۰۱۵ تا جون ۲۰۱۶

34. سرِ شاخِ یقین، غلام محمد قاصر، پاسبانِ حمد و نعت، کراچی، اگست، ۲۰۲۱

35. سلطانِ دو جہاں، منظر عارفی، رنگِ ادب پبلشرز، کراچی، اکتوبر، ۲۰۲۱

36. شاخِ طوبیٰ، روشن علی عشرت، دبستانِ آرزو، لاہور، ۱۹۹۷

37. شام وسحر، ماہنامہ، لاہور، اکتوبر، ۱۹۸۳

38. شفاعت، سید قمر زیدی، روحانی آرٹ پریس، ملتان، ۱۹۹۱

39. شہرِ علم کے دروازے پر، افتخار عارف، بک کارنر، جہلم، ۲۰۰۶
40. صحیفۂ مدحت، ساحر لکھنوی، آثار و افکار اکادمی، کراچی، ۱۹۹۷
41. صریرِ خامہ، ولی الدین ولی، ابنِ حسن آفسٹ پریس، کراچی، ۱۹۸۰
42. ضیائے حرم، ماہنامہ، اسلام آباد، اپریل مئی، ۲۰۲۳
43. عزیز کلیر، ماہنامہ، سیرت النبی و عرس نمبر، کراچی، شمارہ ۱۸ اور ۱۹، جلد ۲، نومبر دسمبر، ۱۹۸۴
44. عزیز کلیر، ماہنامہ، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۵، اکتوبر، ۱۹۸۳
45. عزیز کلیر، ماہنامہ، کراچی، جلد ۳، شمارہ ۷، اگست، ۱۹۸۵
46. فیض الاسلام، ماہنامہ، راولپنڈی، جون، ۲۰۰۱
47. کائناتِ حفیظ تائب، مرتب: محمد نعمان تائب، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ستمبر، ۲۰۱۷
48. کرنیں ایک ہی مشعل کی، انجم نیازی، دار الامین، لاہور، ۲۰۱۹
49. کلامِ بشیر صرفی، مرتب: شفیق انجم، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰
50. کلامِ صدیق، صدیق حسن صدیق مارہروی، زبیر پبلشر، کراچی، ۱۹۹۲
51. کلیاتِ شاہ انصار الہ آبادی، مرتب: پیرزادہ سید خالد حسن رضوی امروہوی، جہانِ حمد و نعت پبلی کیشنز، کراچی، جون، ۲۰۱۴
52. کلیاتِ صبیح رحمانی، مرتب: ڈاکٹر شہزاد احمد، دار السلام، لاہور، جون، ۲۰۱۹
53. کلیاتِ عزیز احسن، مرتب: صبیح رحمانی، نعت ریسرچ سینٹر، مئی، ۲۰۰۵
54. کلیاتِ عزیز خاکی، مرتب: ڈاکٹر شہزاد احمد، تنظیمِ استحکام نعت، جولائی، ۲۰۱۶
55. کلیاتِ منور، منور بدایونی، رنگِ ادب پبلشرز، جنوری، ۲۰۱۷
56. گردابِ تمنا، ضیاء حسین پوری، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، اپریل ۱۹۸۷
57. گلدستۂ افکار، شیخ الحدید شفیع، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۹
58. لاریب، نصیر ترابی، پیراماؤنٹ بکس، کراچی، ۲۰۱۷
59. مثال، منیر سیفی، مکتبہ جدید پریس، لاہور، جنوری، ۲۰۰۲
60. محامدِ سید المرسلین، شاہ محمد عبد العلیم الہ آبادی، زاہد پریس، حیدر آباد سندھ، ۱۳۷۴ھ
61. مدحتِ خیر البشر، سید قاسم جلال، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۲۲
62. مشکی یا عبیری، کوثر الہ آبادی، ایجوکیشنل پریس، کراچی، سن ندارد
63. مقصودِ کائنات، ادیب رائے پوری، مدحت پبلشرز، کراچی، جنوری، ۲۰۱۱
64. مناقبِ امام حسین اور شعرائے کراچی، مرتب: ڈاکٹر منظر عارفی، نعت ریسرچ سینٹر، اپریل، ۲۰۱۷

65. مناقبِ خلفائے راشدین اور شعرائے کراچی، مرتب: ڈاکٹر منظر عارفی، نعت ریسرچ سینٹر، مئی، ۲۰۱۹
66. مناقبِ سیدنا ابوبکر صدیق، مرتب: علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی، نعت مرکز، لاہور، ۱۴۴۰ھ
67. مناقبِ سیدنا امام حسن مجتبیٰ، مرتب: علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی، نعت مرکز، لاہور، ۱۴۴۲ھ
68. مناقبِ سیدنا عثمان غنی، مرتب: علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی، نعت مرکز، لاہور، ۱۴۴۰ھ
69. مناقبِ سیدنا علی المرتضیٰ، مرتب: علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی، نعت مرکز، لاہور، ۱۴۴۰ھ
70. مناقبِ سیدنا عمر فاروق، مرتب: علامہ محمد عارف جاوید نقشبندی، نعت مرکز، لاہور، ۱۴۴۰ھ
71. منقبتی ورثائی ادب اور اردو شاعرات، تسنیم عابدی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۲۴
72. موجۂ رنگ ونور، وفا کانپوری، ورثہ پبلی کیشنز، ۲۰۲۲
73. میثاق، سرشار صدیقی، حرا فاؤنڈیشن، کراچی، مئی، ۲۰۰۲
74. میزانِ حق، شبنم رومانی، ادارۂ فکر و دانش، کراچی، ۱۹۹۳
75. نذرانۂ عقیدت در بارگاہِ امام کربلا، مرتب: ناصر زیدی، ناشر علی برادرز، لاہور، ۱۹۷۹
76. نسبتیں، ڈاکٹر خورشید رضوی، مرتب: ارسلان احمد ارسل، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، مئی، ۲۰۱۵
77. نعت کے جدید رنگ، جاذب قریشی، بھوپال انٹرنیشنل فورم، کراچی، سن ندارد
78. نعت ومنقبت کے پھول، کمال جعفری، اے بی ایس پریس، حوض قاضی، دہلی، ۲۰۰۸

□□□

اہلِ ایماں پر ہے واجب احترامِ عائشہؓ
مصطفیٰؐ کے دل سے پوچھیں وہ مقامِ عائشہؓ
جگمگائی ان کی عظمت لمعۂ قرآن میں
آیتوں پر آیتیں در احتشامِ عائشہؓ
مثلِ مریمؑ، کی برأت ان کی بھی رحمٰن نے
تا ابد قرآن میں چمکے گا نامِ عائشہؓ
منفرد، یکتا تھیں علمِ فقہ میں تفسیر میں
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیض کا مظہر کلامِ عائشہؓ

(ظفر اقبال نوری)

مناقب کی اہمیت و تمثیل قرآنِ مجید و احادیث کی روشنی میں

منظر عارفی

ABSTRACT: This article explores how the praise and virtues of God's righteous servants—particularly the Companions (SAHABA) and the Ahl al-Bayt—are presented in the Qur'an and Hadith literature, in terms of both subject matter and stylistic approach. At the outset, the article offers a brief discussion on the term "manqabat", including an analysis of its meanings and usages. It then elaborates, in the light of the Qur'an and Hadith, on the praise (MANQABAT) of the righteous, including the Companions and the Ahl al-Bayt. The article illustrates the tone and style adopted when the Qur'an and the Prophet himself extol a personality. The panegyrics of earlier Prophets mentioned in the Qur'an are also discussed as part of the subject. Overall, this is a work of compilation; it cannot be classified as a critical or analytical study.

حمد، نعت، منقبت اوّلین ایک ہی معنیٰ میں شمار کیے گئے ہیں تاہم اب ''حمد'' رب تعالیٰ عزوجل کی حمد وثنا کے لیے، ''نعت'' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مدح وثنا کے لیے اور ''منقبت'' عام لوگوں سے ورا، اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بلند مرتبہ شخصیات کی خوبیاں اور فضائل کے بیان کے لیے مخصوص ہو چکی ہیں اس میں اختلاف ہے کہ منقبت حیات اور وفات یافتہ دونوں قسم کی شخصیات کی شان میں ہوتی ہیں یا صرف وفات یافتہ شخصیات کی شان میں۔ لیکن میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ''منقبت'' وفات یافتہ شخصیات کی شان ہی میں ہوتی ہیں، حیات شخصیات کو ہدیۂ تبریک پیش کیا جاتا ہے۔ اُن کی تحسین لکھی جاتی ہے۔ ہم ایک بچے کی سالگرہ لکھیں اور اس کو نام دیں کہ ہم نے اس بچے کی منقبت لکھی ہے تو اس کا کیا اثر پڑے گا۔ بحر حال بہت ساری چیزوں کی طرح اس چیز کو بھی سمجھنا یا سمجھانا اور خصوصاً شعرا کو ''کارے دارد'' ہے۔ آج کل ایک ''طائفہ'' منقبت کو (خصوصاً مناقبِ اہلِ بیتِ کرام کو) ''سلام

’’ کہنے پر مصر ہے، نہ صرف مصر ہے بلکہ تن من دھن سے اس پر کوششوں سے اپنی ’’اُپج‘‘ منوا چکا ہے۔ خیر یہ اُس کا مسئلہ ہے وہ جو چاہے کرے۔ حیرت یہ ہوتی ہے کہ باقی شعرا بھی اسی رنگ میں اپنے آپ کو رنگ چکے ہیں۔ حالانکہ ’’سلام‘‘ تو وہ فارم ہے جس میں لفظ ’’سلام‘‘ لازمی آئے ورنہ سلام کیا۔ لیکن اگر یہ شرط مانے بغیر منقبت کو سلام ہی کہنا اور کہلوانا ہے تو اس میں منقبت کی کیا تخصیص، ہر غزل، نظم، بلکہ شاعری کے ہر فارم کو ’’سلام‘‘ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی قباحت اور اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

منقبت کا جزوِ اعظم ’’مدح‘‘ ہے یعنی تعریف۔ تعریف میں دو ہی چیزیں آتی ہے۔ اوّل ممدوح کے بارے میں اپنے ’’جذبات‘‘ کا اظہار کرنا، اور یہی منقبت کا بنیادی اور ضروری مقصد ہے۔ دوم ممدوح کے اوصاف وفضائل کا بیان۔ اپنے ممدوح کے بارے میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، لایعنی قسم کی باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ ایسی باتیں نہ لکھیں جائیں جو عقل کو بھی تسلیم نہ ہوں۔ ایسے قلابے نہ ملائے جائیں جن کا دفاع ناممکن ہو، اور اپنے ممدوح کی ایسی مدح نہ کی جائے جس سے دوسری ذات وشخصیات کی عزت وعظمت، فضیلت ومنزلت کا رد ہوتا ہو، یا اس کی تنقیص ہوتی ہو، یا اس کے مراتب پر آنچ آئے۔ میں نے بہت کلام دیکھے ہیں، اور بہت سنجیدہ اور سینئر شعرا کے کلام دیکھے ہیں کہ انھوں نے بعض دفعہ حمد کہی تو اس طرح کہی جس سے رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک پر آنچ آرہی ہے۔ نعت کہی تو اس طرح کہی اس سے ذاتِ باری تعالیٰ کی شان پر حرف آرہا ہے۔ اکثر وبیشتر مناقب کا تو حال ہی عجیب ہے، ایک شخصیت کی منقبت میں اللہ، رسول، اور دوسرے تمام بزرگانِ دین کا ایسا رد ہوا ہے کہ الامان والحفیظ۔ اس کو منقبت نگاری کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن ایسا ہو رہا ہے اور ماننے کو کوئی تیار نہیں۔

اسی طرح ممدوح کے اوصاف وفضائل بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محض اپنی رائے سے نہ لکھے جائیں۔ پہلے باقاعدہ ممدوح کی سیرت، اُس کے کارناموں کا مطالعہ کیا جائے اور پھر ان موضوعات کو منقبت میں پرو یا جائے۔ ہمارے زمانے میں لکھی ہوئی مناقب میں اس کا کوئی ذرّہ بھر شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ایسے کلام کتابوں میں چھپے ہوئے ہیں جن میں کسی کے اوصاف وفضائل کسی اور کی منقبت بنا دیے گئے ہیں۔ یہ ظلم ہے، اور ظلم تو ظلم ہی ہوتا ہے۔

منقبت صرف مدح خوانی کا فارم ہے، محض اپنے مذہب ومسلک کی ترجمانی، یا تبلیغ اس کے شانوں پر سخت بار ہے، یہ منقبت سے الگ چیز ہے۔ جس نے یہی کچھ لکھنا ہے وہ منقبت پر رحم فرمائے اور علاحدہ سے اس کا اہتمام کرے، اپنے مذہب ومسلک سے متعلق فقہ کی پوری پوری کتب منظوم کر دے کوئی بات نہیں، یہ گفتگو ہے عام شعرا سے، جید علما شعرا اِس میں شامل نہیں، اور اس لیے شامل نہیں

کہ یہ عام سے شعرا نہیں، جید عالمِ دین ہیں،ان کے اشعار دین کی تفہیم وشرح میں ماخذ بنتے ہیں۔ یہ تو دین ہے لُغت میں چند ثقہ شعرا کے علاوہ کسی کے اشعار دلیل نہیں بن سکے۔ حمد ونعت کی طرح منقبت بھی چاہتی ہے کہ اپنے اوّل سے آخر تک منقبت رہے۔ٹیکنی کلر منظوم نہ بن جائے جس کا ایک شعر مشرق کا ہوتا ہے تو ایک شعر مغرب کا،اس قسم کے کلام کمال نہیں ہوتے بلکہ شاعر کی عجز بیانی پر دلیل ہوتے ہیں۔

حمد،نعت،منقبت،وغیرہ لکھنے کے لیے نظم کا فارم اگر چہ مخصوص ہے مگر یہ کوئی شرط نہیں،حمد،نعت، مناقب نثر میں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ بلکہ ایسے لکھنے والے جن کو شاعری پر مضبوط دسترس نہیں۔شاعری کی بجائے اگر وہ نثر میں لکھیں تو زیادہ اچھی چیز پیش کر سکتے ہیں۔اس سے ان کی عزت بھی بنی رہے گی اور ایک قابلِ قدر چیز بھی سامنے آئے گی۔آخر نثر بھی تو ادب کی ایک بڑی شاخ ہے۔اس سے صرفِ نظر تو نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ حمد ونعت ومناقب ہی کیوں ہر چیز میں اس کو ملحوظ رکھا جائے۔آپ نے بچے کی سالگرہ کہنی ہے،حاجیوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔رخصتی کہنی ہے۔سہرا کہنا ہے۔کسی افسر کی ''حاشیہ برداری'' کے لیے اس کے بارے میں اپنے جذبات لکھنے ہیں تو نثر میں شاعری سے زیادہ بہتر لکھے جاسکتے ہیں۔شاعری تو ادب کا سب سے مشکل ترین شعبہ ہے۔نثر آسان ترین ہے۔شاعری میں شاعری کے فن کی وجہ سے بہت سی چیزیں خصوصاً عجیب عجیب سے ناموں کو مصرعوں میں منظوم کرنا پچکر (Pichkur) نکال دیتا ہے۔جبکہ نثر میں ایسا کچھ نہیں۔لیکن جو شاعری پر واقعی دسترس رکھتے ہیں، جو شاعری کے ہاتھ میں نہیں بلکہ شاعری ان کے ہاتھ میں کھلونا ہے، وہ شاعری ہی میں لکھیں وہ اس کا حق ادا کریں گے۔ بہرکیف :

''اوصاف بیانی''اور''کسی شخصیت کے بارے میں اپنے سچے جذبات کا اظہار''اللہ اور اللہ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نزدیک بھی محبوب ترین عمل ہے۔ یہی حقیقی منقبت نگاری ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اپنے رسولوں نبیوں کے مناقب بیان فرمائے ہیں۔جن میں ان کے اوصاف وفضائل کا بھی ذکر ہے اور رب تعالیٰ کے وہ کلمات بھی ہیں جو اُس نے اُن کے بارے میں ارشاد فرمائے۔ بلاشبہ یہ کلامِ الٰہی ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم مناقب بھی ہیں۔اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے بہت سے صحابہ وصحابیات کے مناقب بیان فرمائے ہیں،دونوں طریقوں سے، یعنی اُن کے اوصاف وفضائل بھی بیان فرمائے ہیں اور ان کے بارے میں اپنی رائے،اپنے جذبات کا بھی اظہار بھی فرمایا ہے۔ اللہ ورسول کے بیان فرمائے ہوئے مناقب اعلیٰ واولیٰ بالا وبالا ہیں ان کی کوئی مثال نہیں،اور ہم منقبت نگاروں کے لیے حصولِ تعلیم کا مکتب بلکہ کہہ لیجیے کہ نصاب بھی ہیں اور مشعلِ راہ بھی ہیں۔ میں یہاں بتوفیقِ الٰہی چند مثالیں اس کی قرآنِ مجید سے پیش کروں گا، پھر چند مثالیں

احادیثِ رسول سے بھی پیش کروں گا۔انبیا وصالحین کی باتیں سُنا پڑھنا اور لکھنا بھی عبادت ہے،سو اس عبادت سے کیوں پہلو تہی کی جائے۔کیوں اس کے برکات حاصل نہ کیے جائیں۔مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''مدینۂ منورہ میں ایک سبزی فروش (صاحب) یوں آواز لگاتے تھے''اے برکاتِ النبی (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) میرے پاس آ،یہیں سما جا،پھر یہاں سے واپس نہ جا''۔جب میں نے یہ جملہ پڑھا تو اِس کی لذّت محسوس کی،میرا دل جھوم گیا،کاش یہ پُرلذّت جملہ ہمیشہ میرا بھی وظیفہ بنا رہے۔''

قرآنِ مجید سے میں جو مثالیں پیش کر رہا ہوں ان میں آیات کا صرف ترجمہ پیش کروں گا،اور اتنا ہی حصہ پیش کروں گا جس کا تعلق منقبت سے ہے۔سورہ کا نام اور آیت نمبر کا التزام کیا گیا ہے،ترجمہ حضرت پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کے''جمال القرآن''سے لیا ہے،اسی طرح احادیثِ مبارکہ سے بھی حدیثِ شریف کے صرف اسی حصّے کا ترجمہ پیش کروں گا جس کا تعلق منقبت سے ہے اس حوالے سے میرا ماخذ،''مرأت شرحِ مشکوٰۃ''ترجمہ از مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کی جلد نمبر ۸ رہے۔صفحات نمبر موجود ہیں،حدیث کے راوی کا نام نہیں بھی دیا جا رہا ضرورتاً انڈر بریکٹ جو لفظ،الفاظ یا جملے ہیں وہ میرے ہیں۔(بہت احتیاط کرنی پڑتی ہے اللہ تعالیٰ اس احتیاط پر قائم رکھے،غلطی کو معاف فرمائے)

قرآنِ مجید سے مناقب

حضرت آدم علیہ السلام کے مناقب

''بے شک ہم نے تمھیں پیدا کیا پھر (خاص) شکل وصورت بنائی تمھاری پھر حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو''۔(الاعراف آیت ۱۱)

''اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اُس درخت کے قریب نہ جائیں) سو وہ بھول گئے،اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) آدم کا کوئی قصد''۔(طٰہٰ،آیت ۱۱۵)

''پھر (اپنے قرب کے لیے) چن لیا انھیں اپنے رب نے اور (عفو ورحمت سے) توجہ فرمائی اُن پر اور ہدایت بخشی''۔(طٰہٰ،آیت ۱۲۲)

حضرت نوح علیہ السلام کے مناقب

''اور نوح کو ہدایت دی تھی اِن سے (یعنی ابراہیم علیہ السلام سے) پہلے اور اِن کی اولاد میں سے داؤد،اور سلیمان،اور ایوب،اور یوسف،اور موسیٰ،اور ہارون کو (راہِ راست) دکھائی''۔(ایضاً)

''نوح پر سلام ہو تمام جہانوں میں...... بے شک! وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے''۔ (الصفٰت ۔آیت ۷۹ تا ۸۱)

''جب اُنھوں نے (ہمیں) پکارا پیش از یں تو ہم نے قبول فرمایا اُن کی دُعا کو اور بچایا اُنھیں، اور اُن کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے، اور ہم نے حمایت کی اُس قوم کے مقابلے میں جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا''۔ (الانبیاء، آیت ۷۶ تا ۷۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مناقب

''جب آزمایا ابراہیم کو اُن کے رب نے چند باتوں سے تو وہ اُنھیں پورے طور پر بجا لائے''۔ (البقرہ، آیت ۱۲۴)

''کون روگردانی کر سکتا ہے دینِ ابراہیم سے بجز اُس کے جس نے احمق بنالیا ہو اپنے آپ کو''۔ (البقرہ، آیت ۱۳۰)

''بے شک! ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلا شبہ وہ قیامت کے دن نیکو کاروں میں ہوں گے''۔ (البقرہ، آیت ۱۳۰)

''اور یاد کرو! جب فرمایا اُس کو اُس کے رب نے (اے ابراہیم) گردن جھکا دو، عرض کی، میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے''۔ (البقرہ، آیت ۱۳۱)

''ابراہیم جو باطل سے منہ موڑنے والے اور حق پسند تھے اور نہیں تھے شرک کرنے والوں سے''۔ (البقرہ، آیت ۱۳۵)

''نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی، بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔ بے شک! نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنھوں نے اُن کی پیروی کی''۔ (آلِ عمران، آیت ۶۸)

''مرحمت فرما دی گئی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب وحکمت اور عنایت فرما دی گئی ہے انھیں عظیم الشان سلطنت''۔ (النساء، آیت ۵۴)

''اور بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل''۔ (النساء، آیت ۱۲۵)

'ہم نے عطا فرمائے انھیں (یعنی ابراہیم علیہ السلام کو) اسحاق اور یعقوب، ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی''۔ (الانعام، آیت ۸۵)

''بے شک ابراہیم بڑے ہی نرم دل اور بُردبار تھے''۔ (التوبہ، آیت ۱۴)

''بلاشبہ ابراہیم ایک کامل مرد تھے،اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے،یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے،اور وہ (بالکل)مشرکوں میں سے نہ تھے،وہ ہرلحہ شکر گزار تھے اللہ تعالیٰ کی (پیہم)نعمتوں کے لیے،اللہ تعالیٰ نے انھیں چن لیا،اور انھیں ہدایت فرمائی سیدھے راستے کی طرف،اور ہم نے مرحمت فرمائی انھیں دنیا میں بھی (ہرطرح کی) بھلائی اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے''۔(النحل،آیت ۱۲۰ تا ۱۲۲)

''وہ بڑے راست باز(یعنی سچے) تھے''۔(مریم۔آیت ۴۱)

''ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا فرمائے،اور سب کو ہم نے نبی بنایا،اور ہم نے عطا کیں اِنھیں اپنی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں)اور ہم نے اِن کے لیے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کردی''۔(مریم۔آیت ۴۹ تا ۵۰)

''اور یقیناہم نے مرحمت فرمائی ابراہیم کواُن کی دانائی،اس سے پہلے ہم اِن کوخوب جانتے تھے'' (الانبیاء،آیت ۵۱)

''انھوں نے (یعنی فرعونیوں نے)تو ابراہیم کو گزند(نقصان) پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے اُن کو ناکام بنادیا،اور ہم نے نجات دی آپ کو اور لوط(علیہ السلام)کو۔اُس سرزمین کی طرف (ہجرت کا حکم دیا) جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا،تمام جہان والوں کے لیے،اور ہم نے عطا فرمایا اُنھیں اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیساپوتا)اور سب کو ہم نے صالح بنایا،اور ہم نے بنا دیا انھیں پیشوا (لوگوں کے لیے)وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے،اور ہم نے وحی بھیجی اُن کی طرف کہ وہ نیک کام کریں،اورنماز ادا کریں،اورزکوٰۃ دیا کریں،اوروہ سب ہمارے اطاعت گزار تھے''۔(الانبیاء،آیت ۷۰ تا ۷۳)

''اور ہم نے عطا فرمایا آپ کواسحاق (جیسا فرزند)اور یعقوب (جیسا پوتا)،اور ہم نے رکھ دی اُن کی اولاد میں نبوت اور کتاب،اور ہم نے دیا اِن کو اِن کی (جان نثاری) کا اجر اِس دنیا میں اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین (کے زمرے) میں ہوں گے''۔(العنکبوت،آیت ۲۷)

''اور ہم نے چھوڑا اُن کا ذکرِ خیر،آنے والوں میں سلام ہوابراہیم پر۔بے شک! وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھےاور ہم بشارت دی آپ کواسحاق کی (کہ)وہ نبی ہوں گے(زمرۂ)صالحین میں سے ،اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس۔(یعنی ابراہیم علیہ السلام) پر''۔(الصٰفٰت،آیت ۱۰۸ تا ۱۱۲)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی منقبت

''بے شک!وہ وعدے کے سچّے تھے۔اور رسول (اور) نبی تھے،اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے اورزکوٰۃ ادا کرنے کا،اوراپنے رب کی نزدیک بڑے پسندیدہ

تھے‘‘۔(مریم، آیت ۵۴ تا ۵۵)

حضرت اسحاق علیہ السلام کی منقبت

’’اور ہم نے برکتیں نازل کی اُس (یعنی ابراہیم) پر اور اسحاق پر‘‘۔(الصّٰفٰت، آیت ۱۱۳)

حضرتِ لوط علیہ السلام کے مناقب

’’اور لوط کو ہم نے حکومت اور علم عطا فرمایا، اور نجات دی اُنھیں اُس گاؤں سے جس کے باشندے بہت رذیل کام کیا کرتے تھے......اور ہم نے اُنھیں داخل اُنھیں کر لیا اپنے (حریمِ) رحمت میں، بے شک! وہ نیکوکاروں میں سے تھے‘‘۔(الانبیاء، آیت ۷۴ تا ۷۵)

’’جھٹلایا قومِ لوط نے اپنے رسولوں کو جب کہا اُن سے اُن کے بھائی لوط نے کیا تم (قہرِ الٰہی) سے نہیں ڈرتے، بے شک! میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں، پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو اور میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ، میرا معاوضہ تو اُس کے ذمے ہے جو رب العالمین ہے، کیا تم بدفعلی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے، اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمھارے لیے تمھارے رب نے تمھاری بیویاں، بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو‘‘۔(الشعراء، آیت ۱۶۰ تا ۱۶۶)

’’اور جب آئے فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس تو بڑے غمزدہ ہوئے اُن کی آمد سے، اور دل تنگ ہوئے، اور (انھیں) دیکھ کر فرشتوں نے کہا خوف زدہ نہ ہوں اور نہ رنجیدہ خاطر، ہم نجات دینے والے ہیں آپ کو اور آپ کے کنبے کو سوائے آپ کی بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے‘‘۔ (العنکبوت، آیت ۳۳)

’’اور بے شک! لوط (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں ہیں۔(یاد کرو) جب بچا لیا ہم نے اُنھیں اور اُن کے سارے اہلِ خانہ کو، بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی، پھر ہم نے برباد کر دیا دوسرے لوگوں کو......‘‘۔(الصّٰفٰت۔آیت ۱۳۳ تا ۱۲۶)

حضرت شعیب علیہ السلام کے مناقب

’’اور جب آ پہنچا ہمارا حکم (یعنی عذاب) تو ہم نے بچا لیا شعیب کو اور اُنھیں جو ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ، اپنی خاص رحمت سے‘‘۔(ھود، آیت ۹۴)

’’اور اہلِ مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی (یعنی ہود علیہ السلام کے بھائی) شعیب کو بھیجا

آپ نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمھارا کوئی خدا اُس کے بغیر، اور نہ کمی کیا کرو ناپ تول میں، میں دیکھتا ہوں تمھیں کہ تم خوش حال ہو، اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر اُس دن کا عذاب نہ آجائے جو ہر چیز کو گھیرنے والا ہے، اور اے میری قوم! پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ، اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو اُن کی چیزیں، اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے، جو بچ رہے اللہ تعالیٰ کے دیے سے سے وہی بہتر ہے تمھارے لیے اگر تم ایمان دار ہو، اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان''۔(ھود، آیت ۸۴ تا ۸٦)

''جب فرمایا انھیں شعیب (علیہ السلام) نے کیا تم (قہرِ الٰہی سے) نہیں ڈرتے، بے شک! میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں، پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو، اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اِس پر کوئی اجر، میرا اجر تو اُس کے ذمے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے، پورا کیا کرو ناپ، اور نہ ہو جاؤ کم ناپنے والوں سے، اور وزن کیا کرو صحیح ترازو سے، اور نہ کم دیا کرو لوگوں کو اُن کی چیزیں، اور نہ پھرا کرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے، اور ڈرو اُس سے جس نے پیدا فرمایا تمھیں اور (تم سے) پہلی مخلوق کو''۔(الشعراء، آیت ۱۷٦ تا ۱۸۳)

حضرت داؤد علیہ السلام کے منقبت

''پس انھوں نے (یعنی داؤد علیہ السلام نے) شکست دی جالوت کے لشکر کو، اللہ کے اذن سے، اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو، اور عطا فرمائی داؤد کو اللہ نے حکومت اور دانائی، اور سکھا دیا اس کو جو چاہا''۔(البقرہ ۲۵۱)

''اور ہم عطا فرمائی داؤد کو زبور''۔(بنی اسرائیل، آیت ۵۵)

''اور ہم نے فرماں بردار بنایا داؤد (علیہ السلام) کا پہاڑوں اور پرندوں کو وہ سب اُن کے ساتھ مل کر تسبیح کیا کرتے اور (یہ شان) ہم دینے والے تھے، اور ہم نے سکھایا اُنھیں زرہ بنانے کا ہنر......''۔ (الانبیاء، آیت ۷۹ تا ۸۰)

''(ہمارا بندہ داؤد) بڑا طاقت ور تھا، وہ (ہماری طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا، ہم نے فرماں بردار بنا دیا تھا پہاڑوں کو، وہ اُن کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے۔ عشاء اور اشراق کے وقت اور پرندوں کو بھی وہ بھی تسبیح کے وقت جمع ہو جاتے۔ سب اُن کے فرماں بردار تھے۔ اور ہم نے مستحکم کر دیا ان کی حکومت کو، اور ہم نے بخشی اُنھیں دانائی، اور فیصلہ کُن بات کرنے کا ملکہ''۔

(ص، آیت ۱۷ تا ۲۰)

''بے شک! اُن کے لیے ہمارے ہاں بڑا قرب ہے اور خوب صورت انجام ہے۔ اے داؤد!

ہم نے مقرر کیا آپ کو (اپنا) نائب زمین میں‘‘۔(ص۔آیت ۲۵)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مناقب

’’اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کے لیے تند و تیز ہوا کو فرماں بردار بنا دیا چلتی تھی وہ ہوا اُن کے حکم سے، اُس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنا دیا تھا، اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے، اور ہم نے مسخّر کر دیے شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرتے اور اُن کے لیے کیا کرتے تھے اور طرح طرح کے اور کام، اور ہم ہی اُن کے نگہبان تھے‘‘۔(الانبیاء، آیت ۸۱ تا ۸۲)

’’اور جانشین بنے سلیمان داؤد کے، اور فرمایا اے لوگو! ہمیں سکھائی گئی ہے پرندوں کی بولی، اور ہمیں عطا کی گئیں ہیں ہر قسم کی چیزیں۔بے شک! یہی وہ نمایاں بزرگی ہے (جو ہمیں مرحمت ہوئی)‘‘۔(النمل، آیت ۱۶)

’’اور فراہم کیے سلیمان کے لیے لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سے پس وہ نظم وضبط کے پابند ہیں‘‘۔(النمل۔آیت ۱۷)

’’اور ہم نے عطا فرمایا داؤد کو سلیمان (جیسا فرزند) بڑی خوبیوں والا بندہ، بہت رجوع کرنے والا، جب پیش کیے گئے آپ پر سہ پہر کو تین پاؤں پر کھڑے ہونے والے تیز رفتار گھوڑے تو آپ نے کہا مجھے اُن گھوڑوں کی محبت پسند آئی ہے، اپنے رب کی یاد کے لیے (پھر انھیں چلانے کا حکم دیا) یہاں تک کہ (وہ) چھپ گئے پردے کے پیچھے۔(حکم دیا) واپس لاؤ اُنھیں میرے پاس۔تو ہاتھ پھیرنے لگے اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر......ہم نے ہوا کو آپ کو فرمان بردار بنا دیا، چلتی تھی آپ کے حسبِ حکم آرام سے، جدھر آپ چاہتے۔اور سب دیو بھی ماتحت کر دیے کوئی معمار اور کوئی غوطہ خور، اور اِن کے علاوہ (جو سرکش تھے) باندھ دیے گئے زنجیروں میں‘‘۔(ص۔آیت ۳۰ تا ۳۸)

’’بے شک! اُنھیں ہمارے ہاں بڑا قرب حاصل ہے، اور خوبصورت انجام‘‘۔(ص۔آیت ۴۰)

حضرت داؤد وسلیمان علیہم السلام کے مناقب

’’جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اُس میں ایک قوم کی بکریاں، اور ہم اُن کے فیصلے کا مشاہدہ کر رہے تھے، سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان کو اور اُن سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم‘‘۔(الانبیاء، آیت ۷۸ تا ۷۹)

’’اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا داؤد اور سلیمان (علیہم السلام) کو علم، اور اُنہوں نے کہا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے برگزیدہ کیا ہمیں اپنے بہت سے مؤمن بندوں پر‘‘۔(النمل، آیت ۱۵)

حضرت ہود علیہ السلام کی منقبت

''جھٹلایا عاد نے (اپنے) رسولوں کو جب فرمایا اُن سے اُن کے بھائی ہود (علیہ السلام) نے، کیا تم (خدا سے) نہیں ڈرتے۔ بے شک! میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں، پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (خدمت) کا کوئی صلہ، میرا اجر تو اس پر ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ کیا تم تعمیر کرتے ہو ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بے فائدہ، اور اِنھیں اپنی رہائش کے لیے بناتے ہو مضبوط محلّات اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے، اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو بڑے ظلم سے ...... گرفت کرتے ہو پس (اب تو اللہ سے ڈرو، اور میری اطاعت کرو، اور ڈرو اُس ذات سے جس نے مدد کی تمھاری اُن چیزوں سے جن کو تم جانتے ہو، (یعنی) اُس نے مدد فرمائی ہے تمھاری مویشیوں اور فرزندوں سے، اور باغات اور چشموں سے، میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آ جائے''۔ (الشعراء۔ آیت ۱۲۴ تا ۱۳۴)

حضرت صالح علیہ السلام کی منقبت

''جھٹلایا قومِ ثمود نے رسولوں کو جب کہا اُنھیں اُن کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے کیا تم (قہرِ الٰہی سے) نہیں ڈرتے، میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں، سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو، اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اِس پر کوئی معاوضہ، میرا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمے ہے۔ کیا تمھیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش وطرب) میں جس میں تم ہو یہاں امن سے، اُن باغات میں اور چشموں میں اور (شاداب) کھیتوں میں، اور کھجور کے درختوں میں، جن کے شگوفے بڑے نرم ونازک ہیں، اور تراشتے رہو گے پہاڑوں میں گھر ماہر (سنگ تراش) بنتے ہوئے۔ پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اتباع کرو، اور نہ پیروی کرو حد سے بڑھنے والوں کے حکم کی، جو فساد برپا کرتے رہتے ہیں زمین میں اور اصلاح (کی کوشش) نہیں کرتے''۔ (الشعراء، آیت ۱۴۱ تا ۱۵۲)

حضرت الیاس علیہ السلام کی منقبت

''اور بے شک! الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں، (یاد کرو) جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم ڈرتے نہیں، کیا تم عبادت کرتے ہو بعل کی اور چھوڑے ہوئے ہو احسن الخالقین (یعنی) اللہ کو جو تمھارا بھی پروردگار ہے اور تمھارے پہلے باپ دادوں کا بھی پروردگار ہے، پھر اُنھوں نے (یعنی قومِ الیاس نے) آپ کو جھٹلایا پس یقیناً اُنھیں (پکڑ کر) حاضر کیا جائے گا بجز اللہ کے

اُن بندوں کے جو مخلص ہیں، اور ہم نے چھوڑا اُن کے ذکرِ خیر کو پیچھے آنے والوں میں، سلام ہو الیاس پر...... بے شک! وہ ہمارے نیک بندوں میں سے ہیں''۔(الصّٰفٰت۔ آیت ۱۲۳ تا ۱۳۲)

حضرت یونس علیہ السلام کے مناقب

''پس کیوں نہ ایسا ہوا (کہ عذابِ الٰہی آ جانے کے بعد) کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اُسے اُس کا ایمان (کسی کے ساتھ ایسا نہ ہوا) بجز قومِ یونس کے، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا اُن سے رسوائی کا عذاب، دُنیاوی زندگی میں ہم نے لطف اندوز ہونے دیا اُنھیں ایک مدّت تک''۔(یونس، آیت ۹۷ تا ۹۸)

بے شک! یونس بھی (ہمارے) رسولوں میں سے ہیں۔ جب وہ بھاگ گئے تھے بھری ہوئی کشتی کی طرف (سوار ہونے کے لیے) پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوئے، اور دھکیلے ہوؤں میں سے ہو گئے، پس نگل لیا اُنھیں حوت (مچھلی) نے درآں حالانکہ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ پس اگر وہ اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں سے نہ ہوتے تو پڑے رہتے مچھلی کے پیٹ میں، قیامت کے دن تک، پھر ہم نے ڈال دیا اُنھیں کھلے میدان میں، اس حال میں کہ وہ بیمار تھے، اور (ان کی حفاظت کے لیے) ہم نے اُگا دی اُن پر کدو کی بیل، اور ہم نے بھیجا تھا اُنھیں ایک لاکھ یا اِس سے زیادہ لوگوں کی طرف''۔(الصّٰفٰت۔ آیت ۱۳۹ تا ۱۴۷)

حضرت ذوالنون علیہ السلام کی منقبت

''اور یاد کرو ذوالنون کو جب وہ چل دیے غضب ناک ہو کر اور یہ خیال کیا کہ ہم اُن پر کوئی گرفت نہیں کریں گے پھر انھوں نے پکارا (تہ در تہ) اندھیروں سے کہ کوئی معبود نہیں تیرے سوا، پاک ہے تو بے شک! میں ہی قصور واروں میں سے ہوں۔ پس ہم نے اُن کی پکار کو قبول کر لیا اور نجات بخش دی انھیں غم (واندوہ) سے اور یونہی ہم نجات دیا کرتے ہیں مؤمنوں کو''۔(الانبیاء۔ آیت ۸۷)

حضرت ادریس علیہ السلام کی منقبت

''بے شک! وہ بڑے راست باز (یعنی سچّے) تھے (اور) نبی تھے، اور ہم نے بلند کیا تھا اُنھیں بڑے اونچے مقام تک''۔(مریم، آیت ۵۶ تا ۵۷)

حضرت ایوب علیہ السلام کے مناقب

''جب پکارا اُنھوں نے اپنے رب کو کہ مجھے پہنچی ہے سخت تکلیف اور تو ارحم الراحمین ہے (میرے

حالِ زار پر بھی رحم فرما) تو ہم نے قبول فرمائی اُن کی فریاد، اور ہم نے دور فرما دی جو تکلیف اُنھیں پہنچ رہی تھی، اور ہم نے عطا کیے اُنھیں اُن کے گھر والے، نیز اتنے اور اُن کے ساتھ اپنی رحمتِ خاص سے''۔(الانبیاء آیت ۸۳ تا ۸۴)

''ہم نے عطا فرمایا اُنھیں اُن کا اہلِ وعیال اور اِن کی مانند اور''۔(ص۔آیت ۴۳)

''بے شک! ہم نے پایا اُنھیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ، ہر وقت ہماری طرف متوجہ (رہنے والا)''۔(ص۔آیت ۴۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مناقب

''کلام فرمایا اللہ (تعالیٰ) نے موسیٰ سے خاص کلام''۔(النساء، آیت ۱۶۴)

''بے شک! وہ (اللہ کے چنے ہوئے) تھے اور رسول و نبی تھے، اور ہم نے پکارا اُنھیں طور کی دائیں جانب سے اور ہم نے اُنھیں قریب کیا راز کی باتیں کرنے کے لیے اور ہم نے بخشا اُنھیں اپنی خاص رحمت سے اُن کا بھائی ہارون (علیہ السلام) جو نبی تھا''۔(مریم، آیت ۵۱ تا ۵۳)

''اور یقینا ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہم السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیز گاروں کے لیے''۔(الانبیاء، آیت ۴۸)

''اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) کو (نورِ) ہدایت''۔(المؤمن۔آیت ۵۳)

''اور ہم نے احسان فرمایا موسیٰ و ہارون (علیہم السلام) پر، اور ہم نے بچا لیا اِن دونوں کو اور اُن کی قوم کو، بڑے غم و اندوہ سے، اور ہم نے اُن کی مدد فرمائی پس ہو گئے وہی غلبہ پانے والے، اور ہم نے بخشی اِن دونوں کو ایسی کتاب جو نہایت واضح ہے، اور ہم نے ہدایت دی انھیں سیدھے راستے کی، اور ہم نے چھوڑا اِن کے ذکرِ خیر کو پیچھے آنے والوں میں۔سلامتی ہو موسیٰ و ہارون پر۔بے شک! وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں''۔(الصّٰفّٰت، آیت ۱۱۴ تا ۱۲۲)

حضرت زکریا علیہ السلام کے مناقب

اور ہم نے ہدایت دی زکریا اور یحییٰ، اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے''۔(ایضاً، آیت ۸۶)

''(اے حبیبِ لبیب صلی اللہ علیہ والہ وسلم) یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا، جو اُس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی، جب اُس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے (انھوں نے عرض کی) اے میرے رب! میری حالت یہ ہے کہ کمزور اور بوسیدہ ہوگئی ہیں میری ہڈیاں، اور بالکل سفید ہو گیا ہے

(میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے، اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو، اے میرے رب، اور میں نامراد رہا ہوں، اور میں ڈرتا ہوں (اپنے بے دین) رشتے داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کر دیں) اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخش دے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث جو وارث بنے یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان کا اور بنا دے اُسے، اے میرے رب! پسندیدہ (سیرت والا)''۔(مریم، آیت ۲ تا ۶)

ہم نے اُن کی دُعا کو قبول فرمالیا، اور اُنھیں یحییٰ (جیسا فرزند) عطا فرمایا، اور ہم نے تندرست کر دیا اُن کی خاطر اُن کی اہلیہ کو بے شک! وہ بہت سبک رو تھے نیکیاں کرنے میں، اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی اُمید اور خوف سے، اور وہ ہمارے سامنے بڑا عجز و نیاز کرتے تھے''۔(الانبیاء۔آیت ۸۹ تا ۹۰)

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مناقب

''اے زکریا! ہم مژدہ دیتے ہیں تمھیں ایک بچّے (کی ولادت) کا اُس کا نام یحییٰ ہوگا ہم نے نہیں بنایا اُس کا کوئی ہم نام اُس سے پہلے''۔(مریم، آیت ۷)

اے یحییٰ! پکڑ لو اِس کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرما دی اُن کو دانائی جب کہ وہ بچے تھے۔ نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے، اور نفس کی پاکیزگی، اور وہ بڑے پرہیزگار تھے، اور خدمت گزار تھے اپنے والدین کے، اور وہ جابر (اور) سرکش نہ تھے، اور سلامتی ہو اُن پر جس روز وہ پیدا ہوئے، اور جس روز انتقال کریں گے، اور جس روز اُنھیں اُٹھایا جائے گا''۔(مریم، آیت ۷ تا ۱۵)

حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے مناقب

''اے مریم! بے شک، اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمھیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمھیں اور پسند کیا ہے تمھیں سارے جہان کی عورتوں سے''۔(آلِ عمران، آیت ۴۲)

''اور یاد کرو اُس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو پس ہم نے پھونک دیا اُس میں اپنی روح سے اور ہم نے بنا دیا اُسے اور اُس کے بیٹے کو (اپنی قدرت کی) نشانی سارے جہان والوں کے لیے''۔(الانبیاء، آیت ۹۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناقب

''عیسیٰ ابن مریم معزز ہوگا دنیا اور آخرت میں اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی، اور نیکوکاروں میں سے ہوگا''۔(آلِ عمران، آیت ۴۵ تا ۴۶)

''اور کوئی ایسا نہیں ہوگا اہلِ کتاب سے مگر وہ ضرور ایمان لائے گا مسیح پر ان کی موت (وفات) سے پہلے اور قیامت کے دن وہ ہوں گے اِن پر گواہ''۔(النساء آیت ۱۵۹)

''بے شک، مسیح عیسیٰ پسرِ مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اُس کا کلمہ، جسے اللہ نے پہنچایا تھا مریم کی طرف اور ایک روح تھی اُس کی طرف سے''۔(النساء، آیت ۱۷۱)

''اے عیسیٰ ابنِ مریم! یاد کرو میرا انعام اپنے پر، اور اپنی والدہ پر، جب میں نے مدد فرمائی تمھاری روح القدس سے، باتیں کرتے تھے تم لوگوں سے (جب کہ) تم ابھی پنگھوڑے (جھولے) میں تھے، اور جب پکی عمر کو پہنچے، اور جب سکھائی میں نے تمھیں کتاب وحکمت اور توریت وانجیل، اور جب بناتے تھے تم کیچڑ سے پرندے کی سی صورت میرے اذن سے، پھر پھونک مارتے تھے اس میں تو وہ (مٹی کا بے جان پتلا) بن جاتا تھا پرندہ، میرے اذن سے۔ اور (جب) تم تندرست کر دیا کرتے تھے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے اذن سے، اور جب تم (زندہ کر کے) نکالا کرتے تھے مردوں کو میرے اذن سے، اور جب میں نے روک دیا تھا بنی اسرائیل کو تم سے، جب تم آئے تھے اُن کے پاس روشن نشانیاں لے کر تو کہا جنھوں نے کفر کیا تھا ان سے یہ سب (معجزے) نہیں ہیں مگر کھلا ہوا جادو، اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ ایمان لاؤ میرے ساتھ، اور میرے رسول کے ساتھ، انھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور (اے مولا) تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔

اور جب پوچھے گا اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابنِ مریم سے، کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ بنا لو مجھے اور میری ماں کو دو خدا اللہ کے سوا۔ وہ عرض کریں گے پاک ہے تو ہر شرک سے کیا مجال تھی میری کہ میں کہوں ایسی بات جس کا نہیں ہے مجھے کوئی حق، اگر میں نے کی ہوتی ایسی تو تو ضرور جانتا اس کو۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے۔ بے شک تو ہی جاننے والا ہے تمام غیبوں کا۔ نہیں کہا میں نے مگر وہی کچھ جس کا تو نے حکم دیا مجھے کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی پروردگار ہے،، اور تھا میں اُن لوگوں پر گواہ جب تک میں رہا اِن میں۔ پھر جب تو نے مجھے اُٹھا لیا تو تو ہی نگران تھا اِن پر، اور تو ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ اگر تو عذاب دے اِنھیں تو وہ بندے ہیں تیرے، اور اگر تو بخش دے اِن کو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے''۔(المائدہ، آیت ۱۱۶ تا ۱۱۸)

''اور ہم نے بنا دیا مریم کے فرزند اور اُس کی ماں (مریم) کو اپنی قدرت کی نشانی اور اِنھیں بسایا ایک بلند مقام پر جو رہائش کے قابل تھا، اور جہاں چشمے جاری تھے''۔(المؤمنون، آیت ۵۰)

بعض رسولوں کے مناقب

(اے حبیب لبیب) بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف، جیسے وحی بھیجی ہم نے نوح کی طرف، اور اُن نبیوں کی طرف جونوح کے بعد آئے، اور (جیسے) ہم نے وحی بھیجی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اوراُن کے بیٹوں، اورعیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اورسلیمان کی طرف، اور ہم نے عطافرمائی داؤدکوزبور، اور (جیسے وحی بھیجی) دوسرے رسولوں پرجن کا حال بیان کردیا ہے ہم نے آپ سے، اورآپ سے پہلے اُن رسولوں پربھی جن کا ذکر ہم نے اب تک آپ سے نہیں کیا''۔

(النساء۔آیت ۱۶۳ تا ۱۶۴)

''اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) یہ سب صابروں کے گروہ سے تھے، اور ہم نے داخل فرمایا اِنھیں اپنی رحمتِ خاص میں، یقیناوہ نیک بندوں میں سے تھے'' (الانبیاء، آیت ۸۵ تا ۸۶)

''اور (ہدایت دی) اسماعیل، اوریسع، اور یونس، اورلوط کواوران سب کوہم فضیلت دی سارے جہان والوں پراور ہدایت دی ان کے کچھ باپ دادوں اوران کی اولاد اوران کے بھائیوں کواورہم نے چن لیاان (سب) کواور ہدایت دی ان (سب) کوراہِ راست کی''۔ (ایضاً، آیت ۸۷ تا ۸۸)

''بے شک! اللہ تعالیٰ نے چن لیا آدم اورنوح، اورابراہیم کے گھرانے کو، اورعمران کے گھرانے کو، سارے جہان والوں پر یہ ایک نسل ہے، بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں''۔ (آلِ عمران، آیت ۳۳)

''ہمارے مقبول بندے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب ...... بڑی قوتوں والے، اورروشن دل تھے ہم نے مختص کیا تھا انھیں ایک خاص چیز سے، اور وہ دارِ آخرت کی یاد تھی۔اور یہ (حضرات) ہمارے نزدیک چنے ہوئے بہت بہترین لوگ ہیں''۔ (ص۔آیت ۴۵ تا ۴۷)

اسماعیل، یسع اور ذوالکفل یہ سب بہترین لوگوں میں سے ہیں''۔ (ص۔آیت ۴۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیان فرمائے ہوئے چندمناقبِ صحابہ

صحابہ کرام علیہم الرضوان کے مناقب

''میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو کیونکہ اگر تم میں کا کوئی اُحد (پہاڑ) بھرسونا خیرات کرے تو اُن کے ایک مُدکو نہ پہنچے نہ آدھے کو''۔ (مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۳۴)

''میری اُمّت میں بہترین میرا گروہ ہے''۔ (مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۳۹)

''میرے صحابہ کی عزت کرو کیونکہ وہ بہترین ہیں''۔ (مشکوٰۃ، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۰)

''اُس مسلمان کو آگ نہ چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والوں کو دیکھا''۔

(ترمذی، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۱)

''میرے صحابہ کی مثال میری اُمّت میں کھانے میں نمک کی سی ہے، کہ کھانا بغیر نمک کے درست نہیں ہوتا''۔(شرح، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۳)

''میرا کوئی صحابی کسی زمین (یعنی بستی) میں وفات نہیں پاتا مگر وہ قیامت کے دن اُن (بستی والوں) کا پیش رو اور اُن کا نور ہوگا''۔(ترمذی، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۳)

''جب تم اُن کو دیکھو جو میرے صحابہ کو بُرا کہتے ہیں تو کہو کہ تمھارے شر پر اللہ کی پھٹکار''۔ (ترمذی، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۴)

''میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے''۔(رزین، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۵)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مناقب

''سارے انسانوں میں مجھ پر بڑا احسان کرنے والے، اپنی صحبت، اپنی محبت و مال میں (وہ) ابوبکر ہیں''۔(مشکوٰۃ، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۶)

''اگر میں کسی کو ولی و دوست بناتا تو میں ابوبکر کو دوست بناتا''۔(مشکوٰۃ، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۴۶)

''اگر میں کسی کو ولی و دوست بناتا تو ابوبکر کو دوست بناتا لیکن وہ میرے بھائی اور میرے ساتھی ہیں، اور اللہ نے تمھارے صاحب (یعنی مجھ) کو دوست بنایا ہے''۔(مسلم، ثم مرأت، جلد ہشتم، ص ۳۴۸)

''ہم پر کسی کا احسان نہیں مگر ہم نے اُس کا بدلہ کر دیا، سوائے ابوبکر کے، کہ ہم پر اُن کا احسان ہے کہ اللہ اُنھیں اِس کا بدلہ قیامت کے دن دے گا، مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہ دیا جتنا ابوبکر کے مال نے نفع دیا، اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر کو دوست بناتا، خیال رکھو! تمھارے صاحب (یعنی میں) اللہ کے دوست ہیں''۔(مشکوٰۃ، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۵۲)

(حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا) ''تم میرے غار کے ساتھی ہو اور حوضِ کوثر پر میرے ساتھی''۔(ترمذی، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۵۴)

''جس قوم میں ابوبکر ہوں اُسے یہ لائق نہیں کہ اُس کی امامت ابوبکر کے سوا کوئی اور کرے''۔ (ترمذی، غریب، ثم مرأت جلد ہشتم، ص ۳۵۴)

''(ابوبکر) تم آگ سے اللہ کی طرف سے آزاد شدہ ہو''۔(اس دن سے آپ کا نام عتیق رکھا

گیا)(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۵۶)

’’ابوبکر! تم وہ شخص ہو جو میری اُمّت میں سب سے پہلے جنت میں جائے گا‘‘۔(ابوداؤد، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۵۷)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب

’’تم سے پہلی اُمتوں میں الہام والے لوگ (یعنی اولیاء اللہ) تھے تو اگر میری اُمّت میں کوئی ہو تو وہ عمر ہیں‘‘۔(مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۰)

’’اے ابنِ خطاب! مجھے اُس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے شیطان تم سے نہیں ملتا کہ راستے میں چلتا ہو، مگر وہ تمھاری راہ کے سوا دوسری راہ چلتا ہے‘‘(مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۰)

’’اللہ تعالیٰ نے جنابِ عمر کی زبان اور دل پر حق جاری فرمایا‘‘۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۶)

’’اللہ تعالیٰ نے جنابِ عمر کی زبان پر حق رکھ دیا جس سے وہ بولتے ہیں‘‘۔(ابوداؤد، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۶)

’’اللہ تعالیٰ نے جنابِ عمر کی زبان پر سکینہ (دلوں کا چین یا ایک فرشتے کا نام سکینہ ہے) بولتا ہے‘‘۔(بیہقی شعب الایمان، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۷)

’’الٰہی! اسلام کو عزت دے ابوجہل ابنِ ہشام سے یا عمر ابنِ خطاب کے ذریعے‘‘۔

(تو جنابِ عمر نے سویرا کیا نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں صبح ہی حاضر ہوئے (اور) اسلام قبول کرلیا، پھر مسجد میں ظاہر ظہور نماز پڑھی گئی)(احمد، بیہقی، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۷)

’’کسی شخص پر سورج نہیں چمکا جو جنابِ عمر سے بہتر ہو‘‘(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۸)

’’اگر میرے بعد نبی ہوتا تو جنابِ عمر ابنِ خطاب ہوتے‘‘۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص ۳۶۹)

’’میں جن و انس کے شیطانوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ عمر (کے آنے) سے بھاگ گئے‘‘۔(ترمذی، ثمِ مرأت، جلد ہشتم ،ص ۳۷۳)

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے مشترکہ مناقب

’’جنتی لوگ علیّین والوں کو دیکھیں اور دکھائیں گے جیسے تم کنارۂ آسمان میں چمک دار تارے کو دیکھتے ہو، اور ابوبکر و عمر اِن ہی میں سے ہیں، یہ دونوں بہت اچھے ہیں‘‘۔(شرحِ سنہ، ثمِ مرأت، جلد ہشتم ،ص ۳۸۴)

’’ابوبکر و عمر ادھیڑوں (یعنی ادھیڑ عمر والوں) کے اگلے پچھلوں کے سردار ہیں، سوائے نبیوں اور

رسولوں اور مرسلین کے''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۸۵)

''میں نہیں جانتا کہ تم میں میری بقا (یعنی زندگی) کتنی ہے، تو میرے بعد والوں کی پیروی کرو (یعنی) ابوبکر و عمر کی''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۸۵)

''نہیں ہے کوئی نبی مگر اِس طرح کہ اُس کے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہوتے ہیں اور دو وزیر زمین والوں میں سے، مگر ہمارے آسمانی وزیر جبریل و میکائیل (علیہم السلام) ہیں اور ہمارے زمین والوں میں سے دو وزیر ابوبکر و عمر ہیں''۔ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۷۳)

''آسمان کے تاروں کے برابر نیکیاں حضرت عمر کی ہیں اور حضرت عمر کی ساری نیکیاں ابوبکر کی نیکیوں میں سے ایک نیکی کی طرح ہے''۔(رزین، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۹۷)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مناقب

'میں اُس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۹۳)

''ہر نبی کا کوئی ساتھی ہوتا ہے، جنت میں میرے ساتھی عثمان ہیں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۳۹۳)

حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم کے مناقب

''(اے علی) تم مجھ سے اِس درجے میں ہو جو ہارون کو موسیٰ (علیہم السلام) سے تھا بجز اِس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۳)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا)''مجھ سے محبت نہ کرے گا مگر مؤمن، اور مجھ سے بغض نہ رکھے گا مگر منافق''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۳)

''تم مجھ سے قریب ہو میں تم سے''۔(مشکوٰۃ، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۶)

''علی مجھ سے ہیں میں علی سے ہوں اور ہر مؤمن ہر مؤمن کا ولی ہے''۔(احمد و ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۷)

''جس کا میں مولا ہوں علی اُس کے مولا ہیں''۔(احمد، ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۷)

''علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں، اور میری طرف سے پیغام نہ دے گا (کوئی) مگر میں یا علی''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۸)

''(اے علی) تم دین و دنیا میں میرے بھائی ہو''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۱۸)

''میں علم کا گھر ہوں اور علی اُس کا دروازہ ہیں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۰)

(حضرت علی کے کان میں سرگوشی کی، پھر لوگوں سے فرمایا)''میں نے اِن سے سرگوشی نہیں کی لیکن اللہ تعالیٰ نے سرگوشی کی''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۱)

''اے علی! میرے اور تمھارے سوا کسی کو جائز نہیں کہ اِس مسجد سے جنبی ہو کر گزرے''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۱)

''منافق علی سے محبت نہیں کرتا اور مومن ان سے بغض نہیں رکھتا''۔(احمد، ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۳)

''جس نے علی کو بُرا کہا اُس نے مجھے بُرا کہا''۔(احمد، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۳)

''(اے علی!) تم میں حضرت عیسیٰ کی مثال ہے۔جن سے یہود سے بغض رکھا حتیٰ کہ اِن کی ماں کو تہمت لگائی، اور اِن سے عیسائیوں نے محبت کی حتیٰ کہ انھیں اُس درجے میں پہنچا دیا جو اُن کا نہ تھا......''۔(احمد، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۳)

''میں مؤمنوں سے اُن کی جان سے زیادہ قریب ہوں، میں ہر مسلمان کا ولی ہوں اُس کی جان سے زیادہ۔الٰہی! جس کا میں مولیٰ ہوں اُس کے علی مولیٰ ہیں۔الٰہی! جو اِن سے محبت کرے تو اُس سے محبت کر، اور جو اِن سے دشمنی کرے تو اُس کا دشمن رہ''۔(احمد، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۲۵)

حضراتِ عشرۂ مبشرہ کے مناقب

(حضرت زبیر ابنِ عوام رضی اللہ عنہ سے فرمایا)''ہر نبی کے مخلص دوست ہوتے ہیں اور میرے مخلص دوست زبیر ہیں''۔(مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۱)

(حضرت زبیر ابنِ عوام رضی اللہ عنہ سے فرمایا)''تم پر میرے ماں باپ فدا''۔(مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۲)

(اُحد کے دن حضرت سعد ابنِ وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا)''اے سعد! تیر مارو، تم پر میرے ماں باپ فدا''۔(مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۲)

''ہر اُمّت کا کوئی امین ہوتا ہے اور اِس اُمّت کے امین ابو عبیدہ ابنِ جراح (رضی اللہ عنہ) ہیں''۔(مسلم و بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۳)

''ابوبکر جنتی ہیں، اور عمر جنتی ہیں، اور عثمان جنتی ہیں، اور علی جنتی ہیں، اور سعد ابنِ وقاص جنتی ہیں، اور سعید ابنِ زید جنتی ہیں، اور ابو عبیدہ ابنِ جراح جنتی ہیں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۶)

''میری اُمّت میں میری اُمّت پر سب سے رحیم و کریم ابوبکر ہیں اور اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ سخت عمر ہیں، اور سب میں سچے جہاد والے عثمان ہیں، اور زیادہ علم و فرائض داں زید ابنِ ثابت (یعنی سعید ابنِ زید ابنِ ثابت)، سب میں بڑے قاری اُبی بن کعب ہیں۔ حرام و حلال کو بہت جاننے والے معاذ ابنِ جبل ہیں، ہر اُمّت میں ایک امین ہوتا ہے اِس اُمّت کے امین ابوعبیدہ ابنِ جراح ہیں''۔ (احمد، ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۷)

''سب سے بڑے کر فیصلہ فرما (یعنی فیصلہ کرنے والے) علی ہیں''۔

احد کے دن ایک مرحلے پر حضرت طلحہؓ سے فرمایا ''طلحہ نے جنت واجب کر لی''۔ (ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۳۹)

''ایک بار طلحہ ابنِ عبید اللہ کی جانب دیکھ کر لوگوں سے ارشاد فرمایا: جو اُس شہید کو دیکھنا چاہے جو روئے زمین پر چل رہا ہے وہ طلحہ ابنِ عبید اللہ کو دیکھے''۔ (ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۴۰)

''طلحہ اور زبیر جنت میں میرے پڑوسی ہیں''۔ (ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۴۰)

''(حضرت سعد ابنِ وقاص رضی اللہ عنہ بارے میں فرمایا) الٰہی! سعد جب بھی تجھ سے دعا کریں تو قبول فرما''۔ (ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۴۱)

''(ایک بار حضرت سعد ابنِ وقاص رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو فرمایا) یہ ہیں میرے ماموں! کوئی شخص مجھے اپنا ایسا ماموں دکھائے''۔ (ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۴۱)

''(میرے بعد) اگر تم ابوبکر کو امیر بناؤ تو تم اُنھیں امین، دنیا سے بے رغبت، آخرت میں رغبت والا پاؤ گے...... اور اگر تم عمر کو امیر بناؤ تو اُنھیں قوت والا پاؤ گے کہ وہ اللہ کے بارے میں کسی ملامتی (ملامت کرنے والے) کی ملامت سے نہیں ڈرتے ......اور اگر تم علی کو امیر بناؤ گے، (اور) میں نہیں سمجھتا کہ ہم ایسا کرو گے، تو تم اُنھیں ہدایت یافتہ پاؤ گے، جو تمھیں سیدھے راستے پر چلائیں گے''۔ (احمد، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۴۷)

(نوٹ: یہاں صاحبِ اشعۃ اللمعات نے فرمایا حضورِ انور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے یا تو جنابِ عثمان کا ذکر ہی نہیں فرمایا یا راوی نے اختصار کر دیا، یا اُس سے نسیان (بھول) ہوگئی)

'اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحمت کرے انھوں نے اپنی بیٹی کا مجھ سے نکاح کیا، اور مجھے ہجرت گاہ تک پہنچایا، اور غار میں میرے ساتھ رہے، اور بلال کو اپنے مال سے آزاد کیا...... اللہ تعالیٰ عمر پر رحمت کرے کہ وہ حق بات کہتے ہیں اگرچہ کڑوی ہو، اُنھیں حق نے ایسا کر دیا کہ اُن کا کوئی دوست نہیں...... اللہ تعالیٰ عثمان پر رحمت کرے کہ اُن سے فرشتے غیرت کرتے ہیں...... اللہ تعالیٰ علی پر رحمت کرے، الٰہی!

علی کے ساتھ حق کو گردش دے ،جدھر وہ گردش کریں ''۔(ترمذی،غریب،، ثمِ مرأت جلد ہشتم،ص۴۴۸)

نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے گھر والوں کے چند مناقب

''(آیت ''ندع ابنائنا وابنائکم '' کی تعمیل میں)حضرت علی ، فاطمہ حسن حسین کو بلایا اور فرمایا! الٰہی ! میرے گھر والے یہ ہیں''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۵۰)

'اپنے فرزند ابرہیم کی وفات پر فرمایا)''جنت میں اِس کے لیے ایک دائی ہے''۔ (بخاری ، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۵۲)

''فاطمہ میرا ٹکرا ہے جس نے اِنھیں ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا......(اگلی روایت میں ہے)جو چیز اِنھیں پریشان کرے مجھے پریشان کرتی ہے ،اور جو چیز اِنھیں تکلیف دے وہ مجھے ستاتی ہے''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۵۶)

دومرتبہ ارشاد فرمایا''میں تم کو اپنے اہلِ بیت کے متعلق ڈراتا ہوں''۔

''جس نے اِن کی اتباع کی وہ ہدایت پر رہا،جس نے اِنھیں چھوڑ دیا وہ گمراہی پر ہوا''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۵۷)

(امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا) الٰہی ! میں اِس سے محبت کرتا ہوں تو (بھی)اِس سے محبت کر''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۵۹)

(ایک اور روایت میں)الٰہی ! میں اِس سے محبت کرتا ہوں تو تو بھی اِس سے محبت کر اور جو اِس سے محبت کرے اُس محبت کر''۔(مسلم بخاری،، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۶۰)

(ایک اور روایت میں ہے)میرا یہ بیٹا سید ہے......شاید اللہ تعالیٰ اِس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعت میں صلح کرادے''۔(بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۶۰)

(حسنین کریمین کے بارے میں فرمایا)''یہ دونوں دنیا میں میرے پھول ہیں''۔ (بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۶۲)

(حضرت زید ابنِ حارثہ شہیدِ غزوۂ موتہ کے بارے میں فرمایا)''وہ مجھے لوگوں سے زیادہ پیارے تھے''۔......(ان کے فرزند اسامہ بن زید کے بارے میں فرمایا)''یہ بھی اُن کے بعد مجھے لوگوں میں پیارے ہیں''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۴۶۵)

(ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے)''میں تم کو اِن (دونوں) کے متعلق وصیّت کرتا ہوں کہ وہ

تمھارے صالحین میں سے ہیں''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۶۵)

(جنابِ علی، فاطمہ، حسن، وحسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا) جو اِن سے لڑے میں اُن سے لڑنے والا ہوں، جو اِن سے صلح کرے میں اُن سے صلح جو ہوں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۶۷)

(اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کے بارے میں فرمایا)''اُس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کسی کے دل میں ایمان داخل نہ ہوگا حتیٰ کہ وہ اللہ رسول کے لیے تم لوگوں سے محبت کرے''۔(پھر فرمایا)''اے لوگو! جس نے میرے چچا کو ستایا اُس نے مجھے ستایا، کیونکہ آدمی کا چچا اُس کے باپ کی مثل ہے''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۰)

(ایک اور روایت میں ہے فرمایا)''عباس مجھ سے ہیں اور میں عباس سے ہوں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۱)

اُمُّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی منقبت

''اُس زمانے (یعنی اپنے زمانے) کی بہترین بی بی مریم بنتِ عمران (والدہ عیسیٰ علیہ السلام) ہیں اور اِس (یعنی اب آخرت تک) کی بہترین بی بی خدیجہ بنتِ خویلد ہیں''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۹۵)

(ایک دن حضور نے حضرت عباس سے فرمایا پیر کے دن سویرے اپنے فرزند کے ساتھ میرے پاس آئیں تاکہ میں آپ کو دعا دوں۔ وہ اپنے فرزند کے ساتھ پہنچے تو انھیں اپنے کمبل میں لیا اور دُعا فرمائی)''الٰہی! عباس اور اِن کے بیٹے کی ظاہری و باطنی بخشش کر، جو گناہ نہ چھوڑے اور اِن کی حفاظت فرما اِن کی اولاد میں''۔(ترمذی، غریب، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۱)

زرین میں یہ اضافہ ہے''الٰہی! اِن کی اولاد میں خلافت مقرر فرما''(زرین، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۲)

''میں نے جعفر (ابنِ علی طالب) کو فرشتوں کے ساتھ جنت میں اُڑتے دیکھا''۔(ترمذی، غریب، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۵)

''حسن اور حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۴)

''میرے دونوں بیٹے (یعنی حسن وحسین) میری بیٹی کے بیٹے ہیں......الخ''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۶)

''حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں اللہ تعالیٰ اُس سے محبت کرے جو حسین سے محبت کرے، حسین اسباط میں سے ایک سبط ہیں''۔ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۷۹)

''فاطمہ جنتی بی بیوں کی سردار ہیں اور حسن و حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں''۔(ترمذی، غریب ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۸۱)

''حضرت اسامہ ابنِ زید کے بارے میں فرمایا جب کہ وہ بچّے تھے) اے عائشہ! اس سے محبت کرو کیونکہ میں اِس سے محبت کرتا ہوں''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۸۵)

(حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا) اے عائشہ! یہ حضرت جبریل ہیں تم کو سلام کہتے ہیں''۔ (مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۹۷)

''اے عائشہ! تم مجھے تین رات خواب میں دکھائی گئیں تھیں، تمھیں فرشتہ ریشمی ٹکڑے میں لاتا تھا، مجھ سے کہتا تھا یہ آپ کی بیوی ہیں، میں نے تمھارے رُخ سے کپڑا ہٹایا تو تم تھیں، میں نے کہا اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو اسے جاری (پورا) فرمادے گا''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۹۸)

(ایک بار حضرت امِ سلمہ سے فرمایا)''مجھے عائشہ کے بارے میں تکلیف نہ دو کیونکہ سوائے عائشہ کے کوئی بیوی نہیں جن کے بستر میں میں ہوں اور وحی آئے''۔(......، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۰۰)

(ایک بار حضور نے حضرتِ فاطمہ کو بلایا اور اُن سے حضرت عائشہ کے بارے میں پوچھا) اے بچّی! جس سے میں محبت کرتا ہوں اُس سے تم محبت نہیں کرتیں''۔ بولیں ہاں۔ فرمایا تو اُن سے محبت کرو''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۰۱)

''تمھارے جہاں والی عورتوں میں جناب مریم بنتِ عمران، خدیجہ بنتِ خویلد، فاطمہ بنتِ محمد، اور آسیہ فرعون کی بیوی کافی ہیں''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۰۱)

(ایک بار جنابِ صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا)''تم نبی (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام) کی بیٹی ہو، تمھارے چچا (یعنی حضرت ہارون علیہ السلام) نبی ہیں اور تم نبی (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی بیوی ہو''۔(ترمذی، نسائی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۰۳)

(ایک بار ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ان کے بھائی عبداللہ ابنِ عمر کے بارے میں فرمایا)''تمھارے بھائی نیک آدمی ہیں'' یا فرمایا''عبداللہ نیک آدمی ہیں''۔(مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۰۶)

''عمار ابنِ یاسر جنتی ہیں اللہ نے (انھیں) اپنے نبی کی زبان سے شیطان سے امان دی ہے، اور حضرت حذیفہ، حضور کے وہ راز دار، جن رازوں کو اُن کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔(بخاری، ثمِ مرأت جلد

ہشتم،ص۵۰۹)

''مجھے جنت دکھائی گئی تو میں ابوطلحہٰ کی بیوی کو(اُمِ سُلیم)وہاں دیکھا''۔(،ثمِ مرأت جلد ہشتم ، ص۵۰۱)

''قرآن چار اشخاص سے سیکھو،عبد اللہ ابنِ مسعود،ابو حذیفہ کے مولیٰ سالم،ابی ابنِ کعب،اور معاذ ابنِ جبل''۔(مسلم، بخاری،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۰۸)

''میں نے بلال کی آہٹ اپنے سامنے سنی''۔(مسلم،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۱۰)

''اللہ تعالیٰ نے سعد، ابنِ مسعود، ہذیل کے ایک صاحب (نام نہیں لیا) بلال ، اور دو شخص اور (شارح کے نزدیک یہ خباب اور عمار) ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ، ترجمہ''اور آپ اُنھیں نہ نکالیں جو شام سویرے اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی کی رضا چاہتے ہیں''۔(مسلم،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۱۱)

(حضرت ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا) اے ابوموسیٰ !تم کو داؤد علیہ السلام کی سی خوش آوازی عطا ہوئی ہے''۔(مسلم، بخاری،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۱۲)

''سعد ابنِ معاذ کی موت سے عرش ہل گیا'' یا فرمایا''رحمان کا عرش سعد ابنِ معاذ کی موت سے ہل گیا''۔(مسلم، بخاری،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۱۴)

(حضور کی خدمت میں''حریر'' کا جوڑا پیش کیا گیا،صحابی نے اُسے چھوا اور اس کی نرمی پر تعجب کرنے لگےتو ارشاد فرمایا)''تم اس کی نرمی پر تعجب کرتے ہو؟ سعد ابنِ معاذ کے جنت میں رومال اس سے اچھے اور اس سے زیادہ نرم ہیں''۔(مسلم، بخاری،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۱۵)

''عبداللہ ابنِ سلام زمین پر چلتے پھرتے جنت والوں میں سے ہیں''۔(مسلم،ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص۵۱۶)

(عبد اللہ ابنِ سلام کو اُن کے ایک خواب کی تعبیر یوں ارشاد فرائی)''تم مرتے دم تک اسلام پر رہوگے''۔(مسلم، بخاری،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۱۹)

(ثابت ابنِ قیس ابنِ شماس انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا)''وہ تو جنت والوں میں سے ہیں''۔(مسلم،ثمِ مرأت جلد ہشتم ،ص۵۲۱)

(ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر اپنا دستِ مبارک رکھ کر ارشاد فرمایا)''اگر ایمان ثریا تارے کے پاس ہوتا تو اِن میں سے بعض لوگ اُسے پا لیتے''۔(بخاری،ثمِ مرأت، جلد ہشتم ،ص۵۱۶)

(حضرت سلیمان فارسی، حضرت صہیب اور حضرت بلال کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا) ''اے ابوبکر! شاید تم نے اِن حضرات کو ناراض کر دیا، اگر تم نے اِن کو ناراض کر دیا تو تم نے اپنے رب کو ناراض کر دیا''۔ (مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۲۲)

''ایمان کی نشانی انصار سے محبت ہے، اور منافقت کی نشانی انصار سے بغض ہے''۔ (مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۲۳)

''انصار سے محبت نہ کرے گا مگر مؤمن، اور اِن سے عداوت نہ کرے گا مگر منافق، تو جس نے اِن سے محبت کی اللہ اُس سے محبت کرے، جس نے اِن سے بغض رکھا اللہ اُس سے ناراض ہو''۔ (مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۲۴)

ایک مرحلے پر انصار سے ارشاد فرمایا: ''کیا تم اِس سے راضی نہیں کہ لوگ (مجھ سے) مال لے کر جائیں، اور تم رسول اللہ کو لے کر اپنے گھر واپس آؤ''۔ (مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۲۵)

(ایک بار انصارِ مدینہ کے بارے میں وصیت فرمائی) ''یہ لوگ میرے خاص مشیر اور میرے خاص ہیں، یہ لوگ حق ادا کر چکے جو اِن پر تھا، اور وہ حق باقی رہ گیا جو اِن کا ہے تو اِن کے نیکوں سے قبول کرو، اور اِن کے بزرگوں سے درگزر کرو''۔ (بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۳۱)

''انصار کے گھروں میں بہترین گھرانا بنونجار ہیں، پھر بنی عبد الاشہل، پھر بنی حارث ابنِ خزرج، پھر بنی ساعدہ، اور انصار کے سارے گھرانوں میں خیر ہے''۔ (مسلم)

''انشاء اللہ ایسا کوئی شخص جس نے درخت کے نیچے بیعت کی، شجرہ والوں میں سے وہ دوزخ میں نہ جائے گا''۔ (مسلم،، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۳۸)

(حدیبیہ میں ایک ہزار چار سو صحابہ سے ارشاد فرمایا) ''آج تم سارے زمین والوں سے بہتر ہو'' (مسلم، بخاری، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۰)

''اُن لوگوں کی پیروی کرو جو میرے بعد میرے صحابہ ہیں، (یعنی) ابوبکر و عمر کی، اور جنابِ عمار (ابنِ یاسر) کا طریقہ اختیار کرو، اور اُمِ عبد کے بیٹے (یعنی حضرت عبد اللہ ابنِ مسعود) کا عہد و پیمان مضبوطی سے پکڑو''۔ (ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۲)

''جو چیز ابنِ مسعود دیں اُس کی تصدیق کرو، بجائے اِس کے کہ اُمِ عبد کے بیٹے (یعنی عبد اللہ ابنِ مسعود) کا عہد مضبوط تھامو''۔ (ایضاً)

''اگر میں کسی کو بغیر مشورہ امیر بناتا تو لوگوں پر اُمِ عبد کے بیٹے (یعنی عبد اللہ ابنِ مسعود) کو بناتا'' (ترمذی، ابنِ ماجہ، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۲)

''ابوبکر اچھے آدمی ہیں، عمر اچھے آدمی ہیں، ابوعبیدہ ابنِ جراح اچھے شخص ہیں، اُسید ابنِ حضیر اچھے شخص ہیں، ثابت ابنِ قیس ابنِ شماس اچھے شخص ہیں، معاذ ابنِ جبل اچھے شخص ہیں، معاذ ابنِ عمرو ابنِ جموح اچھے شخص ہیں''۔(ترمذی، غریب، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۴)

''جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے، علی، عمار اور سلمان''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۵)

''سعد ابنِ معاذ کا جنازہ فرشتے اٹھائے ہوئے تھے''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۷)

''آسمان نے کسی ایسے پر سایہ نہ کیا اور نہ زمین نے ایسے کو اپنے اوپر اٹھایا جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۷)

(ایک اور روایت میں ہے، کہ)''اور زیادہ وفادار ہو، وہ عیسیٰ ابنِ مریم کے مشابہ ہیں، (یعنی ترکِ دنیا میں)۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۴۸)

''محمد ابنِ مسلمہ کو کوئی فتنہ نقصان نہ دے گا''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۰)

(حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دعا فرمائی''(الٰہی! انھیں ہدایت دینے والا، ہدایت یافتہ بنا، اور اِن سے ہدایت دے''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۱)

''لوگ تو اسلام لائے مگر عمرو ابنِ عاص ایمان لائے''۔(ترمذی، غریب، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۱)

''جابر کے والد شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کیا اور اُن سے منہ در منہ کلام کیا (ایسا کبھی کسی کے ساتھ نہیں کیا) اور فرمایا، مجھ سے تمنا کر میں تجھے دوں گا۔ انھوں نے عرض کیا، مجھے زندہ کر ،تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں قتل کیا جاؤں۔ پروردگار نے فرمایا، ہمارا قانون جاری ہو چکا ہے، کہ وفات یافتہ (دنیا میں) لوٹائے نہ جائیں گے''۔(ترمذی، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۲)

''براء ابنِ مالک اُن میں سے ہیں جو پریشان بال، غبار میں اٹے ہوئے، پرانے کپڑے والے جن کی پیروی نہ کی جائے، لیکن اگر وہ اللہ پر قسم کھا لیں تو اللہ پوری کر دے''۔(ترمذی، بیہقی دلائل النبوۃ، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۴)

''حاطب ابنِ ابی بلتعہ بدر اور حدیبیہ میں حاضر ہوئے وہ دوزخ میں نہیں جائیں گے''۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۶)

''جو عمار (ابنِ یاسر) سے دشمنی کرے خدا اُس سے دشمنی کرے، اور جو عمار سے بغض رکھے خدا اُس سے ناراض ہو''۔(......، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۵۹)

خالد (ابنِ ولید) اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں اور اپنے کنبے کے بہترین جوان ہیں''۔(احمد، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۶۰)

’’مجھے اللہ تعالیٰ نے چار شخصوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے وہ بھی اِن سے محبت کرتا ہے، علی، ابوذر، مقداد اور سلمان‘‘۔(ترمذی، حسن، غریب ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۵۶۱)

’’تابعین میں بہترین وہ صاحب ہیں جنھیں اویس کہا جاتا ہے‘‘۔(مسلم، ثمِ مرأت، جلد ہشتم، ص ۵۷۹)

قرآن کی منقبت بہ زبانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہدایت اور نور ہے، تم اللہ کی کتاب لو اِسے مضبوطی سے پکڑو......ایک روایت میں ہے ’’اللہ کی کتاب اللہ کی رسّی ہے‘‘۔(مسلم، ثمِ مرأت جلد ہشتم، ص ۴۵۶)

قرآن اور اہلِ بیت کی منقبت بہ زبانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

’’اللہ کی کتاب جو آسمان سے زمین تک دراز رسّی ہے اور میری عترت، یعنی میرے اہلِ بیت، یہ دونوں جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ میرے پاس حوض پر آجائیں، تو غور کرو! تم اِن دونوں سے میرے بعد کیا معاملہ کرتے ہو‘‘۔(ترمذی، ثمِ مرأت، جلد ہشتم، ص ۴۶۸)

□□□

خَم سدا اُن کے حضور اہلِ عقیدت کی جبیں
از روئے قرآن ہیں جو اُمّہات المومنیں
جن کی سعیِ خیر پر دیں کی بِنا ہے استوار
جن سے استغنا کا محکم ہے تصوّر بالیقیں
وہ نفوسِ قدسیہ، تسلیم پیکر ہستیاں
جن سے ہر گھر تک ہے پہنچی دانشِ دنیا و دیں
اُن کے فرمودات ہیں روشن چراغوں کی مثال
سرورِ کونین کے علم و ہنر کی خوشہ چیں
اُن کی دیں پرورده طرزِ زیست کو لاکھوں سلام
مرحبا صد مرحبا و آفریں صد آفریں

(ریاض مجید)

سرائیکی شاعری میں منقبت نگاری: اجمالی جائزہ

خورشید ربانی

ABSTRACT: The given article provides an overview of the genre of Manqabat in Saraiki literature. The author has divided the Manqabat genre into three notable periods and introduces the representative poets of each era, while also highlighting the contemporary poets' ideas and techniques related to Manqabat. Since the poetic examples in Saraiki are also included, which will be unfamiliar to the Urdu-speaking audience, the author has also provided the translations of these poems. Through this article, we will gain insight into the prominent trends of Manqabat in Saraiki language and the different aspects of the article's structure. Through this discussion, readers gain valuable insight into the dominant trends of Manqabat poetry in Saraiki, as well as the diverse stylistic approaches employed in its composition. The essay serves as a gateway to exploring the rich tradition of Saraiki devotional poetry, offering both historical context and artistic analysis.

سرائیکی شعروادب میں نعت،سلام اورمرثیہ کی طرح ،منقبت نگاری کی روایت بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود سرائیکی شاعری۔کلاسیکی شعرا کے دواوین کا آغاز ہی حمد ونعت اور مناقب سے ہوتا ہے۔سرائیکی شاعری کی پہلی دستیاب کتاب حضرت ملاں کا ''نورنامہ'' بھی ایک طویل نظم پر مشتمل ہے،جو غالباً پانچویں صدی ہجری یعنی بارہویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی۔اسی دور میں مذہبی شاعری کا آغاز ہوا اور اول اول جو کتابیں لکھی گئیں ،ان میں معراج نامے ،نورنامے،تولدنامے،درودنامے،حلیہ مبارک،وصال نامے،مولود،نعت،قصیدہ اوردوسری نظمیں سامنے

آتی ہیں۔ ان کتب میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے اسلامی احکامات کی حامل شاعری ملتی ہے اور اہل بیت کرامؑ، اصحابِ رسول اور اولیا کی شان میں مناقب بھی۔ سرائیکی شاعری کو اگر تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلے دور میں (۱۱۰۷ تا ۱۶۷۹) حضرت ملاں، حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی، پیر صدرالدین، اسماعیل پیر، پیر شاہ شمس سبزواری، حضرت فرید الدین گنج شکر، پیارا شہید، حضرت سلطان باہو، حضرت سچل سرمست، پیارے لال، سیّد زمان شیرازی اور بیدل سندھی کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔

دوسرے دور (۱۶۷۹ تا ۱۸۵۷) میں صوفیانہ شاعری کو فروغ ملا۔ اس دور کے شعرا میں علی حیدر ملتانی، چراغ اعوان، صدیق لالی، مولوی لطف علی، احمد یار تونسوی، حاجی نور محمد شیر گڑھی، روحل فقیر، صوفی مراد فقیر، فقیر بخش گولو، عبدالحکیم اچوی، نواب ولی محمد لغاری، حضرت پیر پگاڑو، صدیق فقیر، حافظ محمد جمال، خلیفہ نبی بخش، عثمان فقیر سانگی، فقیر محمد یار، منشی غلام حسن گامن، امیر حیدر، بیدل فقیر، غلام حیدر شاہ، غلام حسین، مولوی اللہ بخش فدوی، ذوالفقار شیرازی، نور امالی، شاہ نواز خان خادم، نواب اکبر شائق، محمود مولائی، غلام فقیر، مشتاق رضا، عاشق حسین شیرازی، محمد دین فدوی، عظیم خان عظیم، سکندر خان مسکین، غلام رسول بسمل پہاڑپوری، خوشی رام، عباس شاہ، محمد ابراہیم، ملک نور محمد اور دیگر کے نام شامل ہیں۔

سرائیکی شاعری کے تیسرے دور (۱۸۵۷ تا حال) میں خواجہ غلام فرید، خرم بہاول پوری، محمد یار فریدی، نور محمد کہتر، کمتر، جانباز جتوئی، فیض محمد دلچسپ، احمد خان طارق، اقبال سوکڑی، عزیز شاہد، عبداللہ یزدانی، نصیر سرمد، الطاف صفدر، امید ملتانی، قیس فریدی، شاکر شجاع آبادی، رفعت عباس، سعید اختر سیال، ڈاکٹر حمید الفت ملغانی، ڈاکٹر گل عباس اعوان، طاہر شیرازی، صفدر کربلائی، تابش کاظمی، ابرار عقیل، جاوید بخاری، مخمور قلندری، جمشید ناصر اور دیگر کئی شعرا شامل ہیں۔

سرائیکی مناقب نگاری کا جائزہ لیا جائے تو اس کے آثار کلاسیکی عہد سے لے کر آج تک تواتر کے ساتھ سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ سرائیکی کے تمام شعرا تک رسائی اور ان کے کلام کا جائزہ لینا ایک مشکل کام ہے کہ منقبت نگاری کی روایت پر کوئی جامع کام تا حال سامنے نہیں اور اگر آیا بھی ہے تو میرے علم میں نہیں۔ اس ضمن میں سرائیکی کی جتنی کتابیں دیکھ سکا ہوں، ان میں موجود، مناقب کے نمونے یہاں درج کر دیتا ہوں تا کہ سرائیکی منقبت نگاری کی روایت اور ارتقا کا اندازہ ہو سکے۔ حضرت سلطان باہوؒ نے پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کی شان میں متعدد ابیات لکھے ہیں:

بغداد شہر دی کیا نشانی اُچیاں لمیاں چیراں ہو
تن من میرا پرزے پرزے جیوں درزی دیاں لیراں ہو
اینہاں لیراں دی گل کفنی پا کے رَلساں سنگ فقیراں ہو
بغداد شہر دے ٹکڑے منگساں باہو تے کرساں میراں میراں ہو

ترجمہ: بغداد شہر کی کیا نشانی ہے، وہاں فقر کے پر پیچ راستے ہیں، جن پر چلتے چلتے سیدنا غوث اعظمؒ کے ہجر وفراق میں دل اور جسم زخمی ہو چکے ہیں۔ دن رات آپؒ کے ہجر وفراق میں دل بے قرار اور تڑپتا رہتا ہے۔ جسم اور روح درزی کے کٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑوں مصداق پرزے پرزے ہے۔ محبت وفراق میں دل وجان کے ان ٹکڑوں کا کفن پہن کر میں بغداد شہر کے فقرا کے ساتھ مل جاؤں گا اور شہر یار بغداد کی گلیوں میں وصال یار کی بھیک مانگوں گا۔ اور ایسی حالت میں امداد کے لیے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو پکاروں گا۔ ا؎

سن فریاد پیراں دے پیرا، میں آکھ سناواں کینوں ہو
تیرے جیہاں مینوں ہور نہ کوئی، میں جیہاں لکھ تینوں ہو
پھول نہ کاغذ بدیاں والے، درتوں دھک نہ مینوں ہو
میں وچ ایڈ گناہ نہ ہوندے باہو، توں بخشیند و کینوں ہو

ترجمہ: یا پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ! میری التجا ذرا غور سے سنیے، آپؒ کے علاوہ اور کون ہے جس سے میں یہ عرض کروں۔ میرے جیسے تو لاکھوں آپ کے در کے بھکاری ہیں لیکن آپ جیسا فیض رساں تو زمانے میں کوئی نہیں ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ آپ میرے گناہوں، غلطیوں اور خطاؤں پر توجہ نہ کریں اور نہ ہی مجھے اپنے در سے دھتکاریں۔ میں آپ کا در چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ اگر میرے دامن میں گناہوں کا بوجھ نہ ہوتا تو آپ جیسا کریم اور حلیم کیوں اور کسے بخشواتا اور کیوں خطاؤں سے درگزر فرماتا۔ یہ میرے گناہ ہی ہیں جس کی وجہ سے آپ کی صفت حلیم وکریم حرکت میں آئی ہے۔ ۲؎

سچل سرمست کے سرائیکی دیوان سے یہ منقبت دیکھیے جو انھوں نے اپنے دادا جان محمدؒ کے لیے لکھی تھی۔

ڈاڈا جان محمد حافظ درازیں دیرا — دست تہیں دے اصلوں آہا سارا مقصد میرا
ہادی مہدی مرشد میڈا قادریہ ہے کامل — عارف عبد الحق ہر دم نال مریداں شامل
مہدی شاہ مربی میڈا رہبر راہ ڈسیندا — حق محقق مست مئے دی بے شک او بخشیندا
شاہ عبید اللہ اساڈا خواجہ پیراں پیراں — آل نبیؐ اولاد علیؓ ہے حضرت میراں میراں
نام جس دا غوث الاعظم مرشد کل والیاں واں — قدم مبارک ہو یا تحقق گردن سبھ سرتا جاتاں
کوئی اور نہ سمجھدا میکوں آپے آہا ظاہر — اللہ نور السموات والارض اوئی منظر ناظر

ولقد کرمنا بنی آدم سچو ہر دم حاضر

ترجمہ: میرے دادا بزرگ حضرت جان محمد حافظ کا ڈیرہ دراز شریف میں ہے۔ ان کے دستِ شفقت وہدایت سے میری دستگیری ہوئی۔ وہ میرے ہادی بھی ہیں، مہدی بھی اور مرشد بھی، سلسلہ قادریہ

کے کامل بزرگ ہیں۔عارف عبدالحق بھی اپنے مریدوں کے ساتھ شامل ہیں،مہدی شاہ میرے رہبر و رہنما ہیں، مجھے راہ دکھائی ہے۔وہ تحقیق کا حق ادا کرتے ہیں، مئے کی مستی دیتے ہیں اور درگزر کرنے والے ہیں۔شاہ عبیداللہ ہمارے خواجہ ہیں،وہ پیروں کے پیر ہیں۔وہ نبی کریمؐ کی آل اور حضرت علیؓ کی اولاد سے ہیں۔ان کا نام غوث الاعظم ہے اور وہ کل اولیا کے مرشد ہیں۔ان کے قدم مبارک حکمرانوں اور فرمان رواوں کی گردنوں پر ہیں۔ان کے بغیر مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا۔اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عزت و بزرگی عطا فرمائی ہے اور سچل سرمست ہر دم حاضر ہے۔[۳۳]

خواجہ غلام فریدؒ نے یوں تو کئی اصحاب رسولؐ اور اولیائے کرامؒ کا تذکرہ اپنے کلام میں کیا ہے تاہم خواجہ نور محمد مہارویؒ کی شان میں ان کی ایک کافی بہت مقبول ہے:

ساڈا دوست دلیں دا
نور محمد خواجہؒ
ڈھولا یار چہیندا
نور محمد خواجہؒ
ساڈے سارے شرم بھرم دا
ہے تیڈڑے گل وچ لاجا
عرب وی تیڈی عجم وی تیڈی
سندھ پنجاب دا رجا
زمن زمیں وچ وجدا گجدا
فیض تیڈے دا واجا
دلبر جانی، یوسفِ ثانی
موہن مکھ ڈکھلا جا
نوشہ شہر مہار دا بنڑا
سِکدی کو گل لا جا
نین فرید دے درشن پیاسے
آجا نہ ترسا جا[۳۴]

ترجمہ: اے خواجہ نور محمد! آپ میرے دلی دوست اور محبوب ہیں، مجھے معاشرے میں عزت واحترام کے لیے آپ کا آسرا ہے۔اے سندھ اور پنجاب کے راجے،عرب و عجم بھی آپ کے ہیں۔اس

دنیا میں ہر طرف آپ کی محبت وشفقت کے چرچے ہیں۔اے میرے محبوب! اے یوسفِ ثانی، مجھے اپنی من موہنی صورت دکھا اور شرف ملاقات سے بہرہ مند فرما۔اے مہار شہر کے دولہا! مجھ دیدار کی حسرت میں تڑپنے والے کو سینے سے لگا لے، فرید کی آنکھیں، تیری دید کی پیاسی ہیں، ان کو نہ تڑپا نہ ترسا۔

فقیر بخت علی بخت کے دیوان میں شان سادات، شان پنجتن پاکؓ، ولادت امام حسنؓ، کرامات غوث الثقلین اور نذرانہ عقیدت بحضور حضرت حاجنؒ سمیت کئی مناقب درج ہیں۔ ولادت امام حسنؑ پر ان کی منقبت دیکھیے:

ڈینہہ جمعہ تے وقت فجر دے لعل علی دا جایا — جانون نال اوں لعل مٹھے دریا رحمت اچھلایا
گون وگون کھلی گل کاری کرم کریم وسایا — حوریں جوڑ بہشتوں سہرے گردوں حلقہ پایا
جبرائیل امیں کوں رب سائیں دا یہ خاص بنایا — خود عربی لجپال محمد گھن جھولی وچ پایا
سر صدقہ اوں بنرے دا کیا مالک پاک ونڈایا — ملک تمام غلام بنے گھت دام امام پھنسایا
عوض مبارک بادی دے در جنت دا کھلوایا — غرق تھیاں بیڑیاں کوں وی اوں دیہل کندی رب لایا
چکڑ بھریاں تھی چکڑیوں فارغ نوری ویس وٹایا — آس پجی ادراسیاں دی مقصود پلے گھن پایا
کئی دردوں آزاد تھیاں ناشاد ہجر مکلایا — مان بھریئے متوالے سید بار امت دا پایا

بخت علی کیا خوف کریجے، رہبر رب ڈیوایا ؎[5]

ترجمہ: جمعہ کے دن بہ وقت سحر حضرت علی المرتضیٰؓ کے ہاں ان کے بیٹے (حضرت امام حسنؓ) کی پیدائش ہوئی۔ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی امام حسنؓ نے رحمت کا دریا رواں کر دیا۔اس کریم کے فضل و کرم سے دنیا کے باغ میں سوسو رنگ کے پھول کھل اٹھے۔جنت کی حوریں بہشت سے سہرے لے کر آ گئیں۔اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو ان کا خاص خادم مقرر کر دیا۔حضور نبی کریمؐ نے اپنے نواسے کو گود میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے حضور رسول کریمؐ کے اس شہزادے کی پیدائش پر ان کے سر کا صدقہ دیا اور تمام فرشتوں کو ان کی غلامی میں دے دیا۔مبارک باد دینے والوں کے لیے جنت کا دروازہ کھول دیا گیا۔اللہ تعالیٰ نے ڈوبی ہوئیں کشتیاں، واپس موڑ دیں اور جو کیچڑ میں کیچڑ ہوئے پڑے تھے، انھیں نورانی لباس عطا کر دیا۔التجا گزاروں کی امیدیں پوری ہوئیں اور انھیں اپنا مقصود مل گیا۔کئی لوگوں کی تکالیف ختم ہو گئیں اور فراق کا درد سہنے والے شاد و آباد ہو گئے۔بخت علی اب مجھے کیا خوف ہو کہ رب کی طرف سے ملنے والے اس رہبر اور اس متوالے سید نے امت کا بوجھ اٹھا لیا ہے۔

ملک آڈھا خان، سیال شریف کے پیر سید قمر الدین سیالویؒ کی محبت میں یوں منقبت گزار ہیں:

اج قائد آباد دے بھاگ جاگے، اتھے سوہنا پیر سیال آیا
مڑ لج ناموس رسالت دی اج رکھن سوہنا لجپال آیا

اے نوازش پیر پٹھان دی اے شمع روشن دین ایمان دی اے
متاں جانڑیں صرف سیال آیا سیال تاں حق دے نال آیا
اس دور دے طور بدل گئے ہن، تے مسئلے جا ہ جاہ ہل گئے ہن
اٹھے فتنے شان رسالت وچ او فتنے کرن پامال آیا
جیہڑا ایہ پیراں دا پیر آیا نہ کرن صرف تقریر آیا
کئی قسمت والے تر ویسن اے ونڈن ایہو جیا مال آیا
اے رنگ خواجہ سلیمان دے ہن، اُس ولیاں سے سلطان دے ہن
ایہ کشوت مرشد کامل دی ،بنڑ خواجہ قمر کمال آیا
جیہڑے نبیاں ولیاں پیرداں دے، ہن منکر کل تطہیراں دے
او روندے نجدنوں منہ کر کے ،شودے نجدیاں کانڑ زوال آیا
اے علم دے خاص سمندر ہن، رموز حقیقت اندر ہن
اے ایویں رسمی پیر نہیں آ تک لے صاحب کمال آیا
اے مرد مجاہد غازی اے، ایں تے رب رسول وی راضی ہے
کیتی زندگی وقف اسلام لئی ساری عمر نہ غیر خیال آیا
آڈھا کیوں نہ میں اج ناز کراں، بھانویں جتنی خواہش دراز کراں
اج چمن امیدنوں رنگ لگ گئے جدوں سامنے صاحب کمال آیا ؁

ترجمہ: آج قائد آباد شہر کا مقدر جاگ اٹھا ہے کیونکہ یہاں پیر سیال حضرت قمرالدین سیالویؒ تشریف لائے ہیں۔ پیر سیال یہاں ناموس رسالت کے تحفظ کے لیے آئے ہیں۔ یہ پیر پٹھان (خواجہ سلیمان تونسویؒ) کی مہربانی ہے کہ یہاں دین و ایمان کی شمع روشن ہے۔ پیر سیال یہاں اکیلے نہیں آئے بلکہ حق کا پیغام ساتھ لائے ہیں۔ آج کل زمانے کے اطوار بدلے ہوئے ہیں، ہر جگہ فروعی اور مسلکی اختلاف پھیلے ہوئے ہیں، شان رسالت میں گستاخیاں ہو رہی ہیں، یہ جو پیروں کے پیر یہاں آئے ہیں ،وہ صرف تقریریں کرنے نہیں بلکہ یہاں پھیلے ہوئے فتنوں کی سرکوبی کے لیے آئے ہیں۔ پیر سیال یہاں آج ایسا مال تقسیم کرنے آئے ہیں کہ لینے والوں کی قسمت چمک اٹھے گی۔ یہ سارے رنگ اولیا کے سلطان خواجہ سلیمان تونسویؒ کے ہیں۔ یہ مرشد کامل کی کرامت ہے کہ پیر قمرالدین سیالویؒ یہاں آئے ہیں۔ جو لوگ نبیوں، ولیوں اور پیروں اور پاک شخصیات کے منکر ہیں، وہ زوال آمادہ ہیں اور اب نجد کی جانب منہ کر کے روتے پھرتے ہیں۔ پیران تونسہ شریف رسمی پیر نہیں بلکہ اصحاب کمال اور بحر علم و

حقیقت کے شناور ہیں۔ یہ وہ مجاہد اور غازی ہیں جن سے اللہ و رسولؐ راضی ہیں۔انھوں نے اسلام کے لیے زندگی وقف کردی۔ ماسوا اللہ ،ان کے دل میں غیر کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا۔آڈھا خان اپنے نصیب پر ناز اور خواہشوں کو دراز کیوں نہ کرے کہ آج اس کے سامنے اس کا پیر موجود ہے اور اس کا گلزارِ امید جوبن پر ہے۔

محمد یار خان بلبل ،سرائیکی کے ایک اہم شاعر رہے ہیں۔ان کے ہاں بھی مناقب کے کئی عمدہ نمونے موجود ہیں۔خواجگان کوٹ مٹھن کی شان میں لکھی ان کی منقبت کا ایک بند ملاحظہ ہو:

کوٹ مٹھن دے پیرا ساڈے بند دلیندے　　بخشے رب قدیر ساکوں نور اکھیندے
اعلیٰ شان شہاں دا چھوٹے منہ نہ ماندا　　پیڑیں دی ٹر بھیڑ وچ کیا آکھ سگیندے
ہک روضے دے اندر ست اقطاب برابر　　آپت وچ کھنڈ کھیر، منکر کافر تھیندے
اکمل پیر مکمل شیخ محمد عاقل　　قاضی کل تقدیر اتھا سچ الیندے
وہ محبوب خدا دا، سخیاں دا استادا　　حاتم دامن گیر ڈیکھ خدا بخشیندے ۷

ترجمہ: کوٹ مٹھن کے پیر، ہمارے دل میں رہتے ہیں کہ یہ آنکھوں کے نور ہمیں اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں۔ان کے درِ پاک ومقدس پر سیکڑوں تاجدار جبیں سائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔خواجگانِ اعلیٰ شان کی تعریف وتوصیف، مجھ تہی دامن کے بس کی بات نہیں۔ جو روضۂ انوار میں مقیم ہے،اس قطب سے محبت کرنے والے آپس میں باہم شیر وشکر رہتے ہیں اور ان کی شان کے انکاری کافر ہوکر مرتے ہیں۔شیخ محمد عاقل بھی اکمل اور کامل پیر ہیں، سچی بات یہی ہے کہ وہ بخت سنوارنے والے ہیں۔وہ خدا کے محبوب اور سخیوں کے استاد ہیں، اللہ حاتم کے دامن کو دیکھ عطا کی بارش کرتا ہے۔

اقبال سوکڑی،خواجہ غلام فریدؒ کی خدمت میں یوں عقیدت گزار رہیں:

ولکھ ڈاتا لکھ پال لکھیناں جند تے جان فریدا　　دیوان تیڈے دے ہک ہک حرف توں میں قربان فریدا
کر نیک سبب آلب ڈے ونج ایہو کر حسان فریدا　　تیڈا نوکر تھی اقبال رُلے ہے بہوں ارمان فریدا

میں ہاں محض آوارہ شاعر توں ذی شان فریدا　　میں کوجھا کملا بردا تیڈا توں سلطان فریدا
ہک بھر ڈے کل بحرین دا شاہا کر کجھ دان فریدا　　تیڈے ہوندئیں ہوئیں اقبال پیاسی ہے گزران فریدا

توں خالق تخلیق عجب دا صاحب دیوان فریدا　　میں رنگا نہیں جاہل کاہل کوئی انسان فریدا
دل دردی دی نگری ہے ہن بہوں ویران فریدا　　کر نظر مہر اقبال کوں بخش انداز بیان فریدا ۸

ترجمہ:اے لکھ داتا پکارے اور لکھے جانے والے فرید،آپؒ میری جان ہیں۔آپ کے دیوانِ شعر کے ایک ایک حرف پر میری جان قربان ہے۔مجھ پر یہ احسان کریں کہ مجھے شعر گوئی کی نعمت سے سرفراز فرمائیں۔اقبال آپ کا غلام ہے،اگر یہ بھی بے یارو مددگار ہو جائے تو افسوس کی بات ہوگی۔میں ایک آوارہ سا شاعر ہوں اور آپ اعلی شان والے ہیں۔میں بے عقل وشعور اور آپ سلطانِ علم و حکمت۔اے بحرِ علم کے شناور، مجھے بھی کچھ دان کریں۔آپ کے ہوتے ہوئے اقبال پیاسا ہے۔آپ صاحب کمال اور صاحب دیوان تخلیق کار ہیں، مجھ جیسا جاہل و کاہل کوئی نہیں۔میرا دل درد کی نگری ہے اور بہت ویران ہے۔آپ مہر وشفقت کی نظر کریں اور مجھے بات کرنے (شعر کہنے) کا ڈھنگ عطا کردیں۔

عزیز شاہد،خواجہ غلام فرید کو اس انداز سے یاد کرتے ہیں:

اَہدن پیر فریدن کولوں
آیا ہک مہینوال نماناں
آکھیس!
سیاں!کلھی مینھ اے کھیر نی ڈیندی
اَہدن آکھیس!
لوک ملن دے سانگے سکدن
توں نی ملدی؟
اَہدن مینھ مل پئی ہئی
جے مل پوندا پیر فریدن
اتنا پچھدے
نکھڑیے کیویں ملسن ۹

ترجمہ: کہا جاتا ہے کہ پیر فریدؒ کے پاس ایک ماہی وال آیا اور کہنے لگا،سائیں!میری بھینس دودھ نہیں دیتی۔سائیں نے بھینس سے کہا،لوگ وصال کو ترستے ہیں اور تو دودھ نہیں دیتی۔کہا جاتا ہے کہ بھینس نے دودھ دینا شروع کردیا۔اگر مجھے پیر فرید مل جاتے تو میں ان سے اتنی بات پوچھ لیتا کہ فراق کا درد اٹھانے والوں کو وصال کیسے نصیب ہوگا۔

قاسم جلال،ایک اردو شاعر کے طور پر معروف ہیں لیکن انھوں نے سرائیکی میں بھی شاعری کی ہے۔ان کی ایک منقبت ملاحظہ جو انھوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں کہی ہے۔

ہے صدیق اکبر دا رتبہ نرالا   جیندا آپ حبدار ہے کملی والاؐ
جیندا چندر وانگوں ہے کردار روشن   ریہا عمر بھر جیندا بے داغ دامن
ہا ایمان اوندا محبت نبی دی   ایہو اوندی معراج ہئی زندگی دی
کیتس نال سہنے دے مکے توں ہجرت   نبھائس نبی نال غار اچ وی سنگت

بنیا بانہہ بیلی نبی مصطفیؐ دا   سنیہا زمانے کو ڈتس وفا دا
خلیفہ ہا ہمدرد ہا پر او سب دا   لباں تے دعا دل دے وچ خوف رب دا ۱۰؎

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیقؓ کا رتبہ نرالا ہے، کیوں کہ ان سے سرکار رسالت مآبؐ کو محبت ہے۔ ان کا کردار چاند کی طرح روشن اور ان کا دامن بے داغ رہا۔ ان کی معراجِ زندگی یہی تھی کہ نبی کریمؐ سے محبت ان کا ایمان تھا۔ انھوں نے حضورؐ کے ساتھ مکہ سے ہجرت کی اور غارِ ثور میں بھی ساتھ رہے۔ وہ نبی کریمؐ کے وفادار ساتھی تھے اور دنیا کو وفاداری کو سبق دے گئے۔ وہ خلیفہ بنے اور سب کے ہمدرد رہے، ان کے لبوں پر دعا تھی اور دل میں خدا کا خوف۔

اللہ بخش یاد، شیخ بہاؤالحق ملتانیؒ کے حضور یوں عقیدت گزار ہوتے ہیں:

تہاڈا فیض لاثانی بہاؤالدین ملتانی   اسانجو پیر وڈشانی بہاؤالدین ملتانی
سوا لکھ پیر دی نگری ، ہے روضہ معتبر تیڈا   قطب کامل ولی سوہنا سخی لاجپال در تیڈا

تہاڈی اج توں نئیں صدیاں توں ہے اے خلق دیوانی
تہاڈے در تے لہندیاں ہن بہاراں اجرکاں پاتے
دھمالاں آن پیندن حاضری دے سہرے گاگا تے
اسانجو غوث دل جانی اسانجو غوث دل جانی
تہاڈے درتوں بھرتے جھولیاں ویند ازمانہ ہے
نرالا سہروردی سلسلے دا آستانہ ہے
منیندے غوث ہو جگ تے تہاڈی قائم سلطانی ۱۱؎

ترجمہ: اے شیخ بہاؤالدین ملتانی، آپ کا فیض بے مثال ہے، آپ اعلیٰ شان والے اور ہمارے پیر ہیں۔ آپ کا روضہ سوا لاکھ پیروں کے شہر میں معتبر ہے۔ آپ کامل ولی اور قطب ہیں، آپ کا در لجپال ہے۔ یہ مخلوق آج کی نہیں صدیوں سے آپ کی دیوانی ہے۔ بہاریں، سج سنور کر آپ کے در پر حاضر ہوتی

ہیں، دھمالیں ڈالتی اور سہرے گاتی ہیں۔آپ ہمارے پیر اور غوث ہیں۔زمانہ آپ کے در پر مرادیں پاتا ہے، یہ سہروردی سلسلے کا نرالا آستانہ ہے۔ہم آپ کو غوث مانتے ہیں، آپ کی بادشاہی قائم رہے۔

حمید الفت ملغانی کا نذرانۂ عقیدت بہ حضور اصحاب رسولؐ بہ عنوان ''دسئیںؐ دے سنگتی'' (حضورؐ کے ساتھی)

میڈی خاطر
سب راہبر ہن
سارے میڈے پیر
میں کو جھا بےعملا کیویں
شان انہاں دی ڈساں
پاک پیغمبرؐ جنہاں کوں فرمایا
تاریں وانگ ۱۲؎

ترجمہ: میرے لیے سب راہبر اور پیر ہیں۔میں ایک بےعمل اور کم علم، کس طرح ان کی شان بیان کروں، جنھیں حضور رسول کریمؐ نے ستاروں جیسا کہا۔

راشد ڈیروی کا حضرت علی المرتضیٰؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا نذرانۂ عقیدت دیکھیے:

پھلیں دی خوشبو دا ناں علیؑ ہے فضا دا نعرہ علیؑ علیؑ ہے
ہوا دے جھونکے درود پڑھدن دعا دا نعرہ علیؑ علیؑ ہے
قطب قلندریں دی صف دے اندر وِلا دا نعرہ علیؑ علیؑ ہے
نبیؐ دا نعرہ علیؑ علیؑ ہے خدا نعرہ علیؑ علیؑ ہے
علیؑ عظیم اے عظیم تر ہے ایہ گالھ واضح ڈسا ڈتی سی
علیؑ دی عظمت دے کان مولا کائنات کعبے جھکا ڈتی سی

علیؑ تاں پینگھے دے ستیں ہوئیں اژدہاویں کوں چیر ڈیندے
علیؑ تاں اکھیاں دے اندھیاں کو نور ڈیندے ضمیر ڈیندے
علیؑ زمانے دا اوسخی ہے پلا جو دشمن کو کھیر ڈیندے
علیؑ دا لنگر تاں بے بہا ہے عمیق ڈیندے کثیر ڈیندے
علیؑ دے در دے موالیاں کو نعمتیں دی کئی تھڑ کینی
علیؑ تاں اپنی مثال آپ ہے علیؑ دی ہستی دا جوڑ کینی ۱۳؎

ترجمہ: پھولوں کی خوشبو کا نام علیؑ ہے، فضا بھی نعرہ علیؑ سے گونج رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے درود پڑھتے ہیں اور دعائیں علیؑ علیؑ کا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ قطب اور قلندروں میں ولا کا نعرہ بھی علیؑ علیؑ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو کعبے میں سجدہ گزار بنا کر یہ بات واضح کر دی کہ علیؑ عظیم سے عظیم تر ہیں۔ علیؑ جھولے میں سوتے ہوئے بھی اژدہا کو مار سکتا ہے، علیؑ بے بصارتوں کو بصارت اور روشن ضمیری عطا کرتا ہے۔ علیؑ ایسا سخی ہے جو دشمن کو بھی عزت دیتا ہے، علیؑ جود و سخا کے خزانے رکھتا ہے،، وہ بے بہا دینے والا ہے۔ علیؑ کے غلاموں کے لیے نعمتوں کی کمی نہیں، علیؑ بے مثال ہے، انؑ کا ثانی کوئی بھی نہیں۔

ابن کلیم، ایک باکمال مصور اور خطاط کے طور معروف رہے۔ ان کی ایک منقبت بہ شان خواجہ نظام الدین تونسویؒ ملاحظہ ہو، جس میں ہندی ردیف نے لطف دوبالا کر دیا ہے۔

میڈے خواجہ نظام الدین پیا — میڈا دین ایمان یقین پیا
ہووے غم دا دور اندھارا ہن — کرو من وچ سئیں اجیارا ہن
میڈی جانب تھیوے اشارا ہن — ہوون کامل دنیا دین پیا
میڈے خواجہ نظام الدین پیا — جیکوں ڈیکھ کے خلق پئی تھیوے دنگ
میکوں رنگ اپنے اچ ڈیو چا رنگ — ڈینہہ حشر تہاڈا ہووے سنگ
ایہا عرض کریندے کمین پیا — میڈے خواجہ نظام الدین پیا ۱۴؎

ترجمہ: میرے محبوب خواجہ نظام الدینؒ، آپ میرا دین و ایمان ہیں۔ اب یہ غم اندھیرے ختم کر دیں، میرے دل کو روشن کریں۔ آپ ایک اشارا کر دیں تو میری دنیا و دین مکمل ہو۔ اے میرے محبوب خواجہ نظام الدین! مخلوق آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہے۔ آپ مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیں۔ حشر کے دن آپ کا ساتھ نصیب ہو، یہی اس کم نصیب کی درخواست ہے۔

نصیر سرمد، سرائیکی کے اہم شاعر تھے، ان کی ایک منقبت بہت معروف ہوئی لیکن میرا اندازہ ہے کہ کتابوں سمیت کسی جگہ شائع نہیں ہو سکی تاہم یہ لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہے۔ اسے نوجوان شاعر اور نصیر سرمد کے شاگرد عنایت اللہ عنایت کے شکریے کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں۔ یہ منقبت امام حسینؑ کی شان میں ہے، ملاحظہ کیجیے:

عادتاں سارے نبی والن میڈے شبیرؑ وچ — فرق نقطے دا وی نئیں قرآن تے تفسیر وچ
جیرے جیرے راز اترن آیت تطہیر وچ — رب نے سارے گھول چھوڑن فاطمہؑ دے کھیر وچ
ہک پیغمبر ہک ولی ہک طاہرہ ڈو اوندے لال — حرف وی قدرت نے گنڑ کے پنج رکھن تطہیر وچ
گل جیڑے ویلے ھا چمدا مصطفیٰؐ شبیرؑ دا — فاطمہؑ لک لک کے روندی ہئی چنی دی لیر وچ ۱۵؎

ترجمہ: میرے شبیر(امام حسینؑ) میں ساری عادتیں نبی کریمؐ والی ہیں جیسے قرآن اور اس کی تفسیر میں فرق نہیں ہے۔آیتِ تطہیر میں جوبھی راز بیان ہوئے ہیں،اللہ تعالیٰ نے وہ سب خاتون جنت سیدہ فاطمہ الزہرہؑ کے شیر میں شامل کر دیے۔ایک پیغمبر،ایک ولی،ایک طاہرہ اور دو ان کے شہزادے،یعنی پنجتن پاک،قدرت نے لفظِ تطہیر کے لیے بھی پانچ حرف چنے۔حضور اکرمؐ جب اپنے نواسے امام حسینؑ کے رخسار چومتے تھے،اس وقت سیدہ الزہرہؑ اپنے دوپٹے میں چھپ چھپ کر روتی تھیں۔

جاوید بخاری،سرائیکی شعر و ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔سید جلال الدین سرخ بخاری کے لیے ان کی منقبت ''ٹھر'' (بزرگ) ملاحظہ کیجیے:

توں اُچ دا والی
میں ہک موالی
تھورے ہے تیڈے
تاں بے امیک ہن
ہئی ہکا نیک لا
میں تیڈی جتی ہاں
نجف دو ویندوں
توں میکوں پیریں پا ۱۶؎

ترجمہ: آپؒ اُچ شریف کے تاجدار ہیں اور میں فقیر۔مجھ پر آپ کے احسان بے شمار ہیں لیکن ایک مہربانی اور کردیں۔میں آپ کا جوتا ہوں،جب آپ نجفِ اشرف جائیں تو مجھے پہن لیں۔

مذکورہ بالا مناقب میں سیرت و کردار کے ساتھ عقیدت کا اظہار مشترک عنصر ہے تاہم فنی سطح پر متنوع خوبیاں سامنے آتی ہیں۔اس مختصر سے جائزہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ سرائیکی میں منقبت نگاری کی روایت قدیم بھی ہے اور توانا بھی تاہم اس حوالے سے باقاعدہ کوئی کام شاید نہیں کیا جا سکا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ محققین اور ناقدین اس طرف توجہ دیں اور جامعات کی سطح پر بھی تحقیق ہو تاکہ منقبت نگاری کی روایت و ارتقا کی مختلف جہتیں سامنے آسکیں اور سرائیکی شاعری کی اس صنف میں بھی نئے باب رقم ہوں۔

حوالہ جات:

۱۔ ابیات باہو (کامل)،ترتیب و تشریح،حضرت سلطان محمد نجیب الرحمن،لاہور:سلطان الفقر پبلیکیشنز،۲۰۱۵ء،ص ۱۳۵

۲۔ ایضاً،ص ۲۳۰

۳۔ دیوان فرید،مرتب،قیس فریدی،ملتان: جھوک پبلشرز، ۱۹۹۳ء،ص ۲۴

۴۔ سچل سرمست، دیوان سرائیکی، لاہور: پاکستان فاؤنڈیشن، ۱۹۷۸ء،ص ۲۵۶، ۲۴۸

۵۔ فقیر بخت علی بخت، دیوان بخت، لاہور: اویسیہ پبلشرز، ۱۴۰۱ھ،ص ۱۶۴

۶۔ آڈھا خان، ملک، رموزعشق،نطقال گجیال، ۲۰۱۰ء،ص ۴۴، ۴۵

۷۔ محمد یار خان بلبل، انوار فریدی، بہاول پور: انجمن محمد یہ فریدیہ،س ن،ص ۲۳۲

۸۔ اقبال سوکڑی، سانجھی سرت سنبھال (کلیات)، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء،ص ۱۴۵

۹۔ عزیز شاہد، درشن، ڈیرہ غازی خان: ناصر پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء،ص ۱۵۲

۱۰۔ قاسم جلال، پھلاں دی سیج، بہاول پور: ادارہ تعمیر فکر، ۱۹۹۲ء،ص ۴۵

۱۱۔ اللہ بخش یاد، میڈا مٹھا وطن، ملتان: الکتاب گرافکس، ۲۰۰۴ء،ص ۲۳، ۲۴

۱۲۔ حمید الفت ملغانی، ڈاکٹر، سک سوجھل، ملتان؛ سنجوک پبلیکیشنز، ۱۹۹۵ء،ص ۲۱

۱۳۔ راشد ڈیروی، عقیدت دے رنگ، ڈیرہ غازی خان: راشد ادبی سنگت، ۲۰۲۳ء،ص ۱۵۴، ۱۵۵

۱۴۔ ابن کلیم، سچا رنگ تصوف والا، ملتان: دفتر جماعت چشتیہ نظامیہ، حسن پروانہ روڈ، س ن،ص ۳۷

۱۵۔ نصیر سرمد، یادداشت خزانہ عنایت اللہ عنایت، ڈیرہ اسماعیل خان، واٹس ایپ میسج، بتاریخ ۱۰ ر جنوری ۲۰۲۵

۱۶۔ جاوید بخاری، اتم دروہی، کراچی: رنگ ادب پبلیکشنز، ۲۰۲۲ء،ص ۱۰۰

□□□

مبارک تذکرہ پیرائیِ اصحابِؓ پیغمبرؐ
کہ قرآنِ مبیں میں اُن کا خود مداح ہے داور
یہی وہ نجمِ تابندہ تھے ملّت کا سفینے کے
جو عرفانِ حوادث میں رہے ثابت قدم یکساں
یہی ہیں ہاں یہی ہیں ملّتِ اسلام کے رہبر

(رئیس امروہوی)

اُردو نعت میں منقبتی عناصر

ڈاکٹر احسان اللہ طاہر

ABSTRACT: This essay critically explores the poetic portrayal of individuals associated with the Holy Prophet ﷺ, emphasizing their revered status within the tradition of na'at poetry. It sheds light on how poets across eras have expressed admiration for the Prophet's companions, family, and devoted followers. While not exhaustive, the essay offers a balanced and thoughtful perspective, arguing that a sincere bond with the Prophet ﷺ itself signifies spiritual greatness. Through selective poetic references and a composed narrative style, the work successfully highlights an often-overlooked dimension of devotional literature.

اردو ادب میں منقبت نگاری کی روایت کی بنیاد نعت نگاری کے ساتھ ہی شروع ہوئی۔ تقدیسی ادب کی ابتدائی کتب میں حمد و نعت کے ساتھ صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیتؑ کی منقبت نگاری کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو نعت گو تھے انھوں نے سیرتِ رسولِ کریم کا دل کی آنکھوں سے مطالعہ کیا ہوا تھا۔ وہ باعمل لوگ تھے، اسی لیے ان کو ایسے لوگوں سے بھی شدید محبت تھی جو سیرت رسول کریم ﷺ امیں ڈھلے ہوئے تھے۔ جن کی نظروں میں ہر وقت اپنے کریم آقا کی سیرت کے روشن پہلو ہر وقت کھلی کتاب کی طرح تھے اور وہ ان پر عمل پیرا ہو کر دنیا کے رہبر بنے۔ صحابہ کرام کی سچائی کے بارے ان کے ایمان اور قول و فعل کی مضبوطی اور سچے پن کے حوالے سے خدائے وحدہٗ لاشریک نے خود گواہی دی ہے۔

کریم آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ہجرت فرمائی تو مدینہ جا کر آپ ﷺ نے انصار اور

مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔ وہ منظر آج بھی دنیا یاد کرتی ہے کہ اس سے پہلے یا بعد میں دنیا نے اور کہیں ایسا منظر نہیں دیکھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنی آدھی دولت، کاروبار اور گھر دے رہا ہے، یہاں تک کہ اپنی بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر اپنے مواخاتی بھائی سے شادی کروانے کی بھی خواہش نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے رکھی گئی۔ اصل میں یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زندگی بھر ساتھ دیا۔ آپ کے ساتھ وفاداری کی۔ آپ کی ہر بات پر لبیک یا رسول اللہ کہا۔ آپ کا ہر حکم بجا لاتے۔ کیوں کہ وہ **اطیعواللّٰہ و اطیعوالرسول** کے صحیح معنوں کو سمجھتے تھے اور جانتے تھے۔ اور جیسے جیسے ان کے دلوں میں ایمان بڑھتا گیا، وہ اپنے اس عقیدے میں راسخ ہوتے گئے۔ انھی میں کئی ایسے تھے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔ جن کو تاریخ عشرہ مبشرہ کے نام سے بھی یاد کرتی ہے۔

وہ دس صحابہ کرام جن کو آپ نے زندگی میں جنت کی بشارت دی۔ اگر ان کو قرآنی آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ مکمل دین رکھنے والے لوگ تھے۔ روشنی کا مینار تھے۔ قرآنِ پاک کے بعد احادیث کی کتابوں میں بھی ایسے لوگوں کا تواتر کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ احادیث کی کتابوں میں خلفائے راشدین کے مناقب، شیخین کے مناقب، مناقب العشرہ اور اہلِ بیت کے مناقب ایسے صحابہ کرام کے لیے الگ سے ابواب باندھے گئے ہیں۔

جب ہم نعتیہ قصیدے کے حوالے سے عربی قصائد کی طرف دیکھتے ہیں تو امام شرف الدین بوصیریؒ [التوفی ۶۹۶ ہجری] نے اپنی نعت میں آپؐ کے صحابہ کرام کا ذکر کیسے کیا ہے، دیکھیں:

" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ پر ہماری جانیں قربان ہوں جنھوں نے آپ کی رحلت کے بعد ہماری رہنمائی اور سرپرستی کی ذمہ داری سنبھالی اور آپ کے بعد دینی امور میں نیابتِ نبوت کی ذمہ داری بھی خوب نبھائی۔ ان میں ہر صاحب اپنی مُفَوَّضَہ ذمہ داری کا پوری طرح اہل تھا۔"

اسی طرح آپؒ خلفائے راشدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثُمَّ الرِّضَا عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّ عَنْ عُمَرَ
وَّ عَنْ عَلِیٍّ وَّ عَن عُثْمَانَ ذِی الْکَرَمِ

''پھر راضی ہو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے اور حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ سے کہ وہ صاحبِ کرم ہیں''۔

عربی کے بعد فارسی قصائد میں بھی صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیتِ اطہارؑ کے حوالے سے بہت سے اشعار دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اردو نعت میں منقبت نگاری کے حوالے سے دیکھیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی

نعت لکھتے ہوئے آپؐ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہوتے حوالوں کا ذکر بھی نظر آنے لگتا ہے اور ایسا ہونا فطری بھی ہے اور ضروری بھی۔ کیونکہ انھی لوگوں کے ذکر سے ہم سیرتِ حضورؐ پر عمل پیرا ہونے والوں کو ملنے والے صلے سے آشنا ہوتے ہیں۔

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے ہیں جو نہ انبیا ہیں نہ شہدا۔ قیامت کے دن انبیائے کرام علیہم السلام اور شہدا انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مقام دیکھ کر ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں وہ کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ ایسے لوگ ہیں جن کی باہمی محبت صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر ہوتی ہے، نہ کہ رشتہ داری اور مال لین دین کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ان کے چہرے نور سے مزین ہوں گے اور وہ نور کے ٹیلوں پر ہوں گے۔ انھیں کوئی خوف نہیں ہوگا جب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ انھیں کوئی غم نہیں ہوگا جب لوگ غم زدہ ہوں گے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [یونس،10:62]

"خبردار! بیشک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ وغمگین ہوں گے۔"

اگر اس حدیث کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور اس کو اپنے سماجی و معاشرتی تناظر میں رکھ کر اپنے سماجی ڈھانچے کو پرکھا جائے تو ہمیں اپنے اندر بہت سی برائیاں اور خوبیاں نظر آنے لگیں گی۔ اسلام جو کہ انسانوں کو صرف محبت، پیار، امن، سلوک، رواداری، بھائی چارہ، سچائی، امانت داری اور اپنائیت سکھلاتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ایسے اخلاق اپنانے والوں کو جہاں زندگی میں امن اور سکون، طمانیت اور خوشحالی عطا کرتا ہے، وہاں اس زندگی کے بعد آخرت میں بھی انھیں اجر و ثواب کا یقین دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو سب سے زیادہ اخلاق ہی سکھائے ہیں۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تو آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھنے والے سے استفسار فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ یہی وجہ ہے کہ نعتِ رسول لکھنے والے شعرا ہر بار اپنی نعت میں سیرتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہی بات کرتے ہیں۔ احادیث اور اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھنے اور اس کو روح میں اتار کر نعت لکھنے کی بات کرتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ نعت گوئی کے مقام پر پہنچتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں ہی نیک، متقی اور پارسا لوگوں کی نشانیاں بیان کردی تھیں۔

ایسے قدسی صفات انسانوں کا ذکر دلوں میں جذبۂ حق کو ابھارتا ہے۔ ایسے نیک اور صالح کردار رکھنے والوں کی یاد اپنے خیالات، سوچ، کردار اور ضمیر کو ایک نئی روح بخشتی ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے

اپنے عمل، ایثار و قربانی اور بے مثل دیانت سے دینِ حق کو زندگی بخشی۔ جن کی نظروں میں صرف سیرتِ رسول وصلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شمع تھی اور وہ اسی شمعِ بزمِ ہدایت کے پرستار تھے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ:

سماں 'الفُقْرَ و فَخْرِی' کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رُوئے زیبا را"
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

مولانا ظفر علی خان بھی سلف صالحین کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ مسلمان کہاں اگلے زمانے والے — گردنیں قیصر و کسریٰ کی جھکانے والے
امتیاز ابیض و اسود کا مٹانے والے — سبق انساں کو اخوت کا پڑھانے والے
بادشاہی میں فقیری کا چلن رکھتے ہیں — دوش پہ بار امانت کا اٹھانے والے
نہ دبے ہیں کبھی باطل سے نہ دب سکتے ہیں — گردن اللہ کے رستے میں کٹانے والے

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جانثار ساتھیوں کو یاد کرتے ہیں۔ اپنی تحریر نعت میں ان کو یاد رکھتے ہیں۔ ان کی قربانیوں اور ان کے عشق کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے کردار اور عمل کو، عشق اور استقامت کو معیار بناتے ہیں۔ کیونکہ وہ صحابہ کرام صرف امتِ مسلمہ کے ہی نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے محسن ہیں۔ کیونکہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دیے ہوئے قانون کو عملی حوالے سے اس دنیا میں لاگو کر کے بتا دیا کہ دنیا کی ساری ترقی، امن اور خوشحالی کا راز اس میں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کو لاگو کیا جائے۔ صحابہ کرامؓ نے ساری دنیا میں امن کا پیغام پھیلا کر یہ بتا دیا کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہہ دیا ہے وہی ہوگا اور ہو کر رہے گا۔ جیسا کہ سید اعجاز حسین عاجزؔ کہتے ہیں:

مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا
جب کہا، جیسا کہا، ویسا ہوا

یہی وجہ ہے کہ آج بھی انبیاء علیہم السلام کے بعد اس روئے زمین پر اگر دنیا والوں نے ابھی تک بہتر و اعلیٰ اور برتر و صالح مخلوق دیکھی ہے تو وہ اصحابِ رسول کریم تھے جن کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فکری پرورش فرمائی تھی۔ جو آپ کے دامنِ رحمت سے وابستہ تھے، جن کی زندگی میں، ہر عمل میں سیرتِ رسول

جھلکتی تھی۔ جو اسلام قبول کرنے سے پہلے شہزادوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے مگر آپ کے سائبانِ کرم میں آنے کے بعد فقر و استغنا کی ایسی مثال بنے کہ دنیا آج بھی ان کی نظیر ڈھونڈنے سے قاصر ہے۔ شجاعت و بہادری سے راہِ حق میں ایسے جوہر دکھائے کہ فرشتے ان کی جاں نثاری پہ قربان ہونے کو ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترے۔

نعتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھتے ہوئے ایسے پاک نفوس کا ذکر کرنا اور ایسے لوگوں کو یاد رکھنا جنھوں نے رسولِ کریم کی سیرت کو اپنا کر ایک زمانے کو فکری حوالے سے روشن کیا اور اپنے دور کے لوگوں کو ذکر اللہ کرنے اور سیرتِ رسول کے گوشوں کو سمجھانے کے لیے وقف کیا۔ قرآنِ پاک کی معرفت اپنے قول اور عمل سے سکھائی ایسے لوگوں کا ذکر بھی ثواب ہے اور یقینا کراماً کاتبین حکمِ الٰہی سے اسے نیکیوں میں شمار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے سیرتِ رسول پر عمل پیرا ہو کر ملنے والے صلے، لوگوں کی حق کی طرف رہنمائی کرنے کے ثمرات کا ذکر اور ایسے مینارۂ نور لوگوں کے کرداروں کو پڑھنے اور سمجھنے کا ذوق نسلِ نو میں جوش اور جذبہ ابھارتا ہے۔ ذیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری نعت میں صحابہ کرامؓ کا ذکر کن حوالوں سے کیا جاتا ہے۔

اصحابؓ ہیں رسولؐ کے اتنا خیال رکھ
جھگڑا نبیڑ دوستا ہر اک سے پیار کر (قوسین کی حدیں، ص: 70)

اصحابؓ ہیں رسولؐ کے اتنا خیال رکھ
جھگڑا نبیڑ دوستا ہر اک سے پیار کر (قوسین کی حدیں، ص: 70)

نظر آئے گی سیرتِ مصطفی
کسی بھی صحابی کی سیرت کو دیکھ
صحابہ ستارے ہیں فرمان ہے
تو آسیؔ صحابہ کی عظمت کو دیکھ (ذکرِ رسالت مآب، ص: 149)

کیا مقدر کے دھنی تھے سبھی اصحابؓ اُن کے
ٹکٹکی باندھ کے تکتے تھے جو اکثر عارض (مشکوٰۃ، ص: 87)

خدا راضی صحابہؓ پر، صحابہؓ اپنے خالق پر
صلہ پایا صحابہؓ نے شہِ والا کی خدمت کی (بہارِ نعت، ص: 47)

مرے صحابہؓ ہدایت کے سب ستارے ہیں
حدیثِ نبویؐ یہ عظمت نشاں دکھائی دے (بہارِنعت،ص:65)

مقدر ہے صحابہؓ کا کہ وہ رہتے تھے خدمت میں
کہ تکتے زندگی گزری کھِلا چہرہ شہِ دیںؐ کا (لمعاتِ مدحت،ص:90)

نبیؐ کے جاں نثاروں کے برابر بھی نہیں کوئی
شفق اتری افق پر صبح کے آثار سے پہلے (تاجِ مدینہ ص:128)

ان کے اصحابؓ سربسر تنویر
ان کی اولاد ہیں حسینؓ و حسنؓ (وجدانِ حرم،ص:93)

اپنی اک اک سانس کردی ہے فدائے مصطفیٰ
بے مثالی کی مثال آقا کے چاروں یارؓ ہیں (سحابِ نور،ص:269)

آپؐ کی سیرت کے سب انوار ہیں
آپؐ کے اصحابؓ کی یہ صورتیں (خیراتِ مدحت،ص:132)

فضیلت مصطفیٰ کو دی ہے اک اللہ نے یوں بھی
صحابیؓ جو بھی بخشا ہے بڑا جاں باز بخشا ہے (علیم ناصری،نعتوں کا انتخاب،ص:113)

وہ چبوترہ جو اصحابِ صفہؓ کی تھی جائے پناہ
آج بھی آلِ صفہ کی ہے جائے اماں مدینے میں (محمد انیس انصاری،مدحت،ص:233)

کیوں صحابہؓ پا گئے اعلیٰ مقام و مرتبہ
اک اشارے پر وہ ہو جاتے تھے قربانِ رسول (بہاروں پر بہار آئی،ص:57)

نعتِ رسولِ کریم درود وسلام کی صورت میں ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر کی صورت میں، آپؐ سے رابطے میں رہنے کی ایک مضبوط دلیل ہے۔ آپ کا ذکر دلوں کو سرور بخشتا ہے۔ آپ سے پیار کرنے والوں کا ذکر اور وہ لوگ جن لوگوں نے آپ سے پیار کیا، ان کا ذکر بھی اور جن لوگوں سے آپ نے پیار کیا، ان کا ذکر بھی قارئین کو اور ذاکرین کو دینِ حق پہ استقامت عطا کرتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ذکر ہمیں تاریخ کے ان گوشوں میں لے جاتا ہے جو مشکل ترین حالات میں زندہ رہنا سکھاتے ہیں۔ ہجرتِ رسول کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر

مسلسل سننے میں آتا ہے۔اس طرح صحابہ کرامؓ ہر معاملے میں آپ کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔جنگِ بدر ہو یا جنگِ احد، جنگِ خندق ہو یا کوئی اور جنگ، ختمِ نبوت کا واقعہ ہو یا آپ کے بعد کی جنگیں، ان صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ہر جگہ اپنے کردار سے ثابت کیا کہ آپ نیابتِ نبوت کے اصل حق دار تھے۔

ہمارے نعت گو شعرا نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا ذکر نام لے لے کر کیا ہے اور ان کے خلیفہ بننے کے کردار کے حوالے سے بھی ثابت کیا ہے کہ اس وقت کے صحابہ کرامؓ کا انتخاب کتنا پیارا تھا کہ انھوں نے آپ جیسے لوگوں کو منتخب کیا۔

صداقت کا مطلب سمجھنا ہے گر ابوبکرؓ کی پھر صداقت کو دیکھ
اگر دیکھنا ہے جو انصاف کو تو آ پھر عمرؓ کی عدالت کو دیکھ
غنی اس سے بڑھ کر جہاں میں نہیں تو عثمانؓ کی ہر سخاوت کو دیکھ
ہے جس کی دلیری سے رن کانپتا علیؓ کی مکمل شجاعت کو دیکھ

(ذکرِ رسالت ماب،ص:148)

اصحابؓ کی خلافتیں ترتیب وار ہیں
صدیقؓ جان نشین ہے پہلا حضورؐ کا (آبِ رحمت،ص:344)

ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا وہ عثمانؓ و علیؓ آقا
تری نسبت سے ہر کوئی زمانے بھر پہ چھایا ہے (لمعاتِ مدحت،ص:92)

پاس صدیقؓ بھی عمرؓ بھی ہیں
اور یہ قربت وفا سے ملتی ہے
عقدِ عثمانؓ میں دو نورِ نبیؐ
ایسی نسبت حیا سے ملتی ہے
جب بھی نصرت محال ہو جائے
دستِ شیرِ خداؓ سے ملتی ہے (عروجِ سخن،ص:236)

غنیؓ و حیدرؓ و صدیقؓ ہوں کہ پیارے عمرؓ
مری نظر میں برابر ہیں آشنائے رسولؐ (تسبیحِ نعت،ص:214)

صدیقؓ ہوں فاروقؓ ہوں عثماںؓ ہوں علیؓ ہوں
پروانہ ہر اک شمعِ رسالت پہ فدا ہے (وجدانِ حرم،ص:109)

جان و دل سے ہو گئے بوبکرؓ آقاؐ پر نثار
دولتِ فاروقؓ، عثمانؓ و علیؓ کیا چیز ہے (سحابِ نور،ص:73)

بوبکرؓ و عمرؓ نورِ محمدؐ سے ہیں روشن
عثمانِؓ غنی حیدرِؓ کرار ضیا بار (آبِ رحمت،ص:562)

عشقِ بوبکرؓ و عمرؓ ایثارِ عثمانؓ و علیؓ
آؤ مل جل کر بنائیں عاشقی کی انجمن (طاہر سلطانی، مفیض،ص:112)

ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا کہ عثمانؓ و علیؓ ہوں
اسی بزمِ شعور و شوق کے شہکار سارے (جلیل عالی، رنگ ادب،ص:417)

چار یاروں کی شانِ جلی ہے بھلی
ہیں یہ صدیقؓ فاروقؓ عثماںؓ علیؓ
شاہدِ عدل ہیں یہ ترے جانشیں
تجھ سا کوئی نہیں تجھ سا کوئی نہیں
(حضرت نفیس الحسینی، نعتوں کا انتخاب،ص:20)

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں
(مولانا ظفر علی خاں، نعتوں کا انتخاب،ص:105)

ادھر فاروقؓ جیسا عادل و ذی فہم و ذی عزت
ادھر صدیقؓ جیسا ہمدم و ہم راز بخشا ہے
شجاعت میں دیا ہے حیدرِؓ کرار سا نامی
سخاوت میں ادھر عثمانؓ سا دم ساز بخشا ہے (علیم ناصری، نعتوں کا انتخاب،ص:113)

دیکھیے صدیقؓ و فاروقؓ و علیؓ عثمانؓ کو
باغِ دیں میں طوبیٰ سے بالا نہالِ مصطفیٰ (شوق و نیاز،ص:57)

صدیقؓ عمرؓ عثمانؓ حیدرؓ کیسے دلکش
یہ پھول ترے باغ کے مہکائے ہوئے ہیں (بہاروں پر بہار آئی، ص:190)

ساتھ تھا صدیقِؓ اکبر جاں نثار
اس رفاقت سے بڑھا اس کا وقار
جاں نثاری کا صلہ اس کو ملا
اس سفر میں ہر قدم پر ساتھ تھا (نعتیہ مثنویاں، ص:24)

نبی کے ساتھ غارِ ثور میں صدیقِؓ اکبر تھے
یہ قربت ہے نہایت پُر وفا مکے مدینے کی (رنگِ ادب، نعت نمبر، ص:65)

آنکھیں نہ ہوں تو خاک نظر آئے آفتاب
صدیقؓ جانتے ہیں صداقت حضورؐ کی
(احسان دانش، نعتوں کا انتخاب، ص:22)

رات ہجرت کی تھی صدیقؓ کے معراج کی رات
دوش پر جب وہ پیمبرؐ کو اٹھا کر نکلے
(سلیمان ندوی، نعتوں کا انتخاب، ص:140)

کوئی چہرہ نہیں فاروقِ اعظمؓ کی طرح روشن
کئی چہرے ہیں آقا! سامنے جھوٹی قیادت کے (تاجِ مدینہ، ص:61)

قتل کرنے کوئی نکلے تو وہ فاروقؓ بنے
ہے درِ شاہِ دو عالم کی روایت اپنی (واجد امیر، مدحت، ص:60)

کوئی پوچھے ذرا حضرت عمرؓ سے
نگاہوں کا جگر کے پار ہونا (محمد حنیف نازش، مدحت، ص:217)

دانست میں عمرؓ کی ہے وہ قابلِ جحیم
سمجھے مرے حضورؐ کا جو فیصلہ غلط (مشکوٰۃ، ص:172)

ہجرت کی رات بھی تو عجب رات تھی اویسؔ
صدیق ایک رات ہی میں بن گیا چراغ (متاع، ص:72)

صدیقؓ ہوا ثانی اثنین ترے ساتھ
اے اوّلِ اثنین تری شان الگ ہے (سنہرے بادل،ص:61)

نعتِ رسول مقبول ﷺ میں ذکرِ صحابۂ رسول کرتے ہوئے استغاثہ کی کئی نئی صورتیں بھی بنی ہیں۔ان جیسے اخلاص اور وفا کی ربِّ اکبر سے دعائیں بھی دِلوں میں ایک نورانی کیفیت کو پھیلاتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے ذکر کے بعد اس مقدس گھرانے کا ذکر آتا ہے جو اہلِ بیت ہیں۔جن کا خانوادۂ رسول سے تعلق ہے۔جن کے حوالے سے روایت ہے کہ میں تم سے دین پھیلانے کا صلہ نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے اہلِ بیت سے پیار کرو۔

اہلِ بیتِ اطہار علیہ السلام کی محبت ومودت ہر دور کے اولیا وعلما وائمہ کے احوال کا حصہ رہی ہے اور انھوں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جید امامِ فقہ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

يَا آلَ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ حُبُّكُمْ
فَرْضٌ مِّنَ اللهِ فِي الْقُرْآنِ اَنْزَلَهُ

”اے اہلِ بیتِ رسول! تمھاری محبت اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرض کر دی ہے اور اس کا حکم قرآن میں نازل ہوا ہے۔“

يَكْفِيْكُمْ مِنْ عَظِيْمِ الْفَخْرِ اَنَّكُمْ
مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلَاةَ لَهُ

”اے اہل بیت تمھاری عظمت اور تمہاری شان اور تمہاری مکانت کی بلندی کے لیے اتنی دلیل کافی ہے کہ جو تم پر درود نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا سے فرمایا:
”میں نے تمھاری شادی اس شخص سے کی ہے جو علم وحلم میں سب سے افضل ہے اور اسلام قبول کرنے والوں میں سب سے اول ہے۔“

خاتونِ جنت حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو مخاطب فرماتے ہوئے ان کی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے شادی کے حوالے سے نبی کریم ﷺ نے ایک اور جگہ فرمایا کہ:
”میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل شخص سے تمھارا نکاح کیا ہے۔“

نبی کریم ﷺ کے دورِ حیات میں حضرت علیؓ نے کئی اہم مناصب پر اپنے فرائض بہ احسن انجام دیے۔یمن میں نبی کریم ﷺ کو ایک معاملہ فہم، تدبر وفراست سے معاملات کو انجام دینے والے شخص کی ضرورت پڑی تو آپؐ نے حضرت علیؓ کا انتخاب کیا۔اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر

مقامِ غدیر پر آپؐ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

مَن کنتُ مولاہ فعلیٌ مَولاہ
جس کا میں مولا اس کا علی مولا

حضرت علیؓ نے ہر خلیفہ کے دور میں کلیدی اور اہم انتظامی مناصب پر کام کیا اور ہر دور کے لوگ آپؓ کی عزت دامادِ رسول اور برادرِ مصطفیٰ ہونے کی نیت سے بھی کیا کرتے تھے۔

میں نبی ہوں جس کا اس کے مولا ہیں علی
پا گئے محضر علی المرتضیٰ شیر خدا (محمد اقبال نجمی)

اہل بیت میں خاص طور پہ پنج تن پاک کے حوالے سے جو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں اور چادرِ تطہیر کے حوالے سے جو لوگ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہیں، ان میں حضرت امام حسنؓ کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ میں تم سے زیادہ اس امت کا خیر خواہ ہوں۔ اور کیا تم نہیں چاہتے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت میں اتفاق ہو؟ میں اپنے کسی ذاتی مقصد اور تشہیر کے لیے تم لوگوں کا خون بہانا نہیں چاہتا اور میں اس امر پر راضی ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ کے فرمان کو پورا کروں اور امت کو انتشار سے بچاؤں۔"

آپؓ کی منقبت لکھتے ہوئے شعرا نے جو ضمائر آپؓ کے لیے استعمال کیے ہیں ان سے بھی مودّت و محبت کی خوشبو آتی ہے۔ جیسے شبیہِ رحمتِ دارین، راکبِ دوشِ محمد، مطلعِ امن و اماں، قاطعِ حون، قائم اللیل، صائم الدہر، پیکرِ خلق و مروت، صدرِ اربابِ وفا، سرور و سالارِ گروہِ اتقیا، پاس دارِ شرع و دیں، نورِ نگاہِ فاطمہ، مشعلِ راہِ ہدایت، روحِ امن و وقار، مظہرِ مرتضیٰ، وغیرہ۔

راکبِ دوشِ نبی پروردۂ آغوشِ حق
رحمتِ عالمؐ کی جانب ہی رہے مائل حسنؓ (عبدالغنی تائب)

کربلا کے حوالے سے حق شناس لوگوں کی منقبت نگاری اردو ادب میں، خاص طور پہ اردو نعت میں دکھائی دیتی ہے۔ ذکرِ حسینؓ، سیرتِ کردارِ حسینؓ کے ذکر کے ساتھ کربلا کا ذکر لازم ہے۔ یوں کہیے کہ کربلا کا ذکر ہی ذکرِ حسینؓ ہے۔ حق کا ذکر ہی حسینؓ کا ذکر ہے۔ دین اور دینی اقدار کی سربلندی اور ان کی بقا و ارتقا کو ایک نیا نام دینے کا استعارہ ہی حسینؓ ہے۔ تو پھر کربلا کی فکری تفہیم کے لیے چراغ اور روشنی کو استعارہ بنا کر شعرا نے جو منقبت نگاری کی ہے اس میں رنگا رنگی اور جرأت و بہادری، عزم اور دلیری کی داستان ہے۔ اسی روشنی اور نور کے استعارے میں حسینؓ کے کردار اور کربلا والوں کے کردار

کی بات کی گئی ہے۔ آج بھی اسی خون سے زمانوں کے چراغ روشن ہیں اور شمر یزیدی نسلوں کی ملامت کا دھواں سمیٹے ہوئے ہے۔ طائف سے کربلا تک بہنے والے خون نے ہی آج حق نگر کو آباد کیا ہوا ہے۔

غمِ حسین کا سینے میں داغ لیتا جا
ہے راستے میں اندھیرا چراغ لیتا جا (کوثر حجازی)

سیرتِ حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا کے لوگوں کو، اہلِ حق کو فنا و بقا کے معنی و مفہوم سے آگاہی دی۔ جیت اور ہار کے معیارات طے کر کے سمجھائے۔ حق اور صداقت کے لیے لڑنے کا طریقہ سکھایا۔ دینی اقدار کی بقا اور ان کے احیا کے لیے جان قربان کرنا سکھایا۔ یوں جب ہم کربلا کی بات کرتے ہیں تو ہم اہلِ حق کی بات کرتے ہیں، جن میں بڑے بڑے کردار جیسے حضرت عباس علم دارؓ، حضرت حرؓ، امام زین العابدینؓ اور امامِ عالی مقام رضی اللہ عنہ کے خاندان کی خواتین کا ذکر آتا ہے، جنھوں نے حق وصداقت کے لیے اور اللہ کی رضا کے لیے سب تکلیفوں کو برداشت کیا۔ ایسے لوگوں کی منقبت ہمارے شعرا نے نعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھتے ہوئے جس والہانہ انداز میں کی ہے، اس کی چند ایک مثالیں دیکھیے:

یہ فاطمہؓ، علیؓ، وہ حسنؓ اور حسینؓ ہیں
کس شان کے ہیں پھول محمدؐ کے باغ میں (مہرِ جہاں فروز، ص:196)

ہجرت کی شبِ تار میں جز حیدرِ کرارؓ
سرکارؐ کے بستر پہ سلائے نہیں جاتے (آبِ رحمت، ص:373)

بابِ حیدرؓ سے ہو کے گر جائیں
علمِ احمدؐ سے آگہی ہوگی (لمعاتِ مدحت، ص:190)

حسینؓ آپ کے دامن سے چن رہا ہوں چراغ
یہ اس لیے کہ مرے گھر میں گھپ اندھیرا ہے (ریاضِ حمد ونعت، ص:61)

علیؓ ہوں، فاطمہؓ ہوں یا ہوں ان کی آنکھ کے تارے
یہ تازہ پھول ہیں، زیبِ گلستانِ محمدؐ ہیں
(تلاوتِ نعت، ص:177)

فاطمہؓ ہوں کہ علیؓ ہوں کہ حسنؓ اور حسینؓ
کتنی اچھی ہے ترے برگ و ثمر کی خوشبو (سحابِ نور، ص:253)

پھر عطا ہو جائے ہم کو جرأتِ خیبر شکن
مانگتے ہیں منتشر قطرے سمندر کا جلال (سلطان صبروانی، مفیض، نعت نمبر، ص: 586)

دِل میں حسنینؓ کی اُلفت کو لیے جا پہنچا
درِ فردوس پہ روکا نہ کسی نے مجھ کو (ناصر زیدی، مفیض نعت نمبر، ص: 596)

نامِ شاہانِ جہاں مِٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشانِ پنج تن رہ جائے گا
(مولانا کافی مرادآبادی، نعتوں کا انتخاب، ص: 227)

ذہنوں میں آپ منظرِ خیبر تو لایئے
خود ہی لبوں پہ آئے گی خیبر شکن کی بات (احسان حیدر، مدحت: 243)

خیر ہو سرکارؐ کے اصحابؓ کی اور آلؓ کی
آپ کی عترت سے بھی قلبی مودّت چاہیے (تجلیاتِ سراجِ منیر، ص: 78)

آلؓ و اصحابؓ سے الفت رکھو
میرے آقاؐ سے وفا ہے یہ بھی (مشکوٰۃ، ص: 138)

آپؐ کے اصحابؓ سا اخلاص ہو مجھ کو عطا
آپؐ کی عترت سے بھی قلبی مودّت چاہیے (تجلیاتِ سراجِ منیر، ص: 78)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیویوں کو قرآن نے امہات المومنین کہہ کر ان کو اہلِ بیت میں شامل کیا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چادرِ تطہیر میں آنے والوں کو اپنے اہلِ بیت اس لیے کہا تھا کہ کل کو لوگ صرف امہات المومنین کو بھی اہلِ بیت میں شمار نہ کریں۔ مومنوں کی پہلی ماں یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کا ہر لمحہ خیال رکھا اور آپؐ کی نسل یعنی اہلِ بیت کی اولاد بھی مومنوں کی اسی ماں سے چلی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ذکر بھی قرآنِ پاک میں واقعۂ افک کے حوالے سے ہے۔ ہماری نعت میں اس حوالے سے کئی اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ذکر بالخصوص ملتا ہے۔

آبِ زم زم سے با وضو ہو کر
حجرۂ عائشہ کو دیکھیں گے (انور صابری، نعتوں کا انتخاب، ص: 96)

اوصاف کریں کیا اس کے بیاں یہ میرا قلم یہ میری زباں
فرمایا ہے سچ صدیقہؓ نے خلق اس کا ہے قرآنِ مبیں
(سید امین گیلانی، نعتوں کا انتخاب، ص: 21)

جہاں رہتے ہیں آقا ہاں یقیناً باغِ جنت ہے
وہ بی بی عائشہؓ کے حجرۂ اطہر میں رہتے ہیں
(سید امین گیلانی، نعتوں کا انتخاب، ص: 139)

وہ جس میں بوئے حضرت عائشہؓ ہو
مجھے ایسی کوئی پوشاک دے دے (نورین طلعت عروبہ، مدحت، ص: 63)

ریاض مجید نے حافظ عبدالجلیل کی نعتیہ کتاب "لمعاتِ مدحت"، پہ تبصرہ کرتے ہوئے صفحہ نمبر 19 پہ لکھا ہے کہ: "صحابہ کرامؓ کا تذکار ہماری نعت کا ایک نمایاں موضوع رہا ہے۔ حافظ جلیل کی نعت میں کہیں کہیں صحابہؓ کا ذکر ایک ایسے قرینے سے آیا ہے جس میں خصوصاً خلفائے راشدینؓ کی نمایاں خصوصیات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ حافظ صاحب نے صحابہ کرامؓ کے ذکر میں ایک التزام بھی برقرار رکھا ہے اور ان کے فضائل کے تخصیصی پہلو بھی ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اس طرح اہلِ بیتؑ اور آلِ اطہار کا ذکر بھی لمعاتِ مدحت میں مدحت ہے۔"

کسی بھی بڑے سنجیدہ، دانشور اور شریعت کے علم کو سمجھنے والے نعت گو شاعر کی نعت دیکھیں تو اس میں صحابہ کرامؓ کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا گیا ہوتا ہے جو کہ اصل میں دامنِ رسول ﷺ سے وابستگی کا ذکر ہے۔ پیر فضل گجراتی کا ایک پنجابی شعر دیکھیں:

دنیا دے رہبر بن نکلے اعرابی نخلستاناں دے
کتھے دیاں کتھے لے گئیاں آقا دیاں بندہ پروریاں
(پیر فضل گجراتی)

چند ایسے صحابہ کرام کی مناقب دیکھیے، جو تعلق بالرسول ﷺ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں:

نہیں ہے دارا و جمشید سے کوئی نسبت
ہمارا بوذرؓ و سلمانؓ سے تعلق ہے (گوہر طیب، ص: 165)

گدازِ سوزِ الفت بوذرؓ و سلماںؓ سے لیتا ہوں
بلاغت کا سبق مولا علیؓ کے ہاں سے لیتا ہوں (سجاد حسین ساجد، فروغِ نعت، ص: 60)

بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ سے یہ سیکھا ہے
حیات فانی ہے لیکن دوام آپؐ سے ہے (سید نصرت بخاری، فروغِ نعت، ص:44)

نوازیں فقرِ بوذرؓ سے مجھے بھی
فقیری کی میں دولت چاہتا ہوں (سید نصرت بخاری، فروغِ نعت، ص:44)

مخمور جس شراب سے تھے بوذرؓ و بلالؓ
مجھ کو اُسی شراب کا پیمانہ چاہیے (ماہر القادری، مفیض، نعت نمبر، ص:283)

سیدی کہہ کے بلاتے تھے صحابہؓ ان کو
زیرِ دامانِ نبیؐ شانِ بلالیؓ دیکھی (پروفیسر اکرم رضا، مفیض، نعت نمبر، ص:455)

ملتی نہیں مثال کوئی اُن کے فقر کی
مولا علیؓ کی، بوذرؓ و سلمانؓ کی قسم (سید امین گیلانی، نعتوں کا انتخاب، ص:178)

جس نے نعلینِ نبیؐ کا تاج سر پر رکھ لیا
وہ بلالؓ و قرنؓ و سلمانؓ و ابوذرؓ ہو گیا (تنویرِ نعت، ذکاء اللہ اثرؔ، ص:80)

جب مؤذن نے دی اذان کبھی
یاد آئے مجھے بلالؓ، حضور! (زیارت، ص:58)

آہٹ بتا رہی ہے یہ کفشِ بلالؓ کی
جس کی بنی حضورؐ سے افلاک سے بنی (عروجِ سخن، ص:70)

کس نے مزدوروں غریبوں کا کیا رتبہ بلند
کس کے فیضِ عام سے حبشی غلام آقا بنا
(حکیم محمد شریف خان منتظر، نعتوں کا انتخاب، ص:31)

وہ شمعیں تا ابد کرتی رہیں گی نور افشانی
تعلق پا چکی ہیں جو مدینے کے شبستاں سے (اللہ کی سنت، ص:102)

خلدِ بریں کی تجھ کو تمنا ہے تو حیات
حمزہؓ کی طرح راہِ شہادت میں ڈال دے (تسبیحِ نعت، ص:325)

بے نواؤں کو وہ جب ذوقِ نوا دیتے ہیں
قنبرؓ و بوذرؓ و سلمانؓ بنا دیتے ہیں (تنویرِ نعت، غلام محمد ذکی، ص:34)

وہ عمارؓ و یاسرؓ، انسؓ، دحیہؓ کلبی
وہ عرشِ بریں تیرا در جانتے ہیں (محمد جانِ محبوبی، ص:68)

شیرِ خدا علیؓ کوئی فاروقؓ سا جری
خالدؓ سا سیف زن کوئی حمزہؓ دکھائی دے (محمد جانِ محبوبی، ص:56)

بلالؓ سا مجھے اندازِ زندگی ہو نصیب
نبیؐ کے عشق میں ہر اِک ستم کا طالب ہوں (حدیثِ شوق، ص212)

کلمۂ حق پکار کے خبابؓ کی طرح چشمِ جہاں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے
عبداللہؓ بن سلام کے ایمان کی طرح دِل اپنا مصطفی کی شریعت میں ڈال دے
عشقِ عمیرؓ مجھ کو بھی بخشو کہ جو مجھے بے خوف راہِ رُشد و ہدایت میں ڈال دے
(تسبیحِ نعت، ص:324)

مجھے بھی عشق میں کر حضرت خبیبؓ کی طرح
مجھے بھی شاہِ عرب! خلعتِ رضا سے نواز (تسبیحِ نعت، ص:162)

بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ و مصعبؓ و حمزہؓ جو مصطفی پہ مٹا وہ نشانِ رحمت ہے
انسؓ، معاذؓ، معوذؓ، اسامہؓ، زیدؓ، عمارؓ ہر ایک ان میں گلِ گلستانِ رحمت ہے
اویسؓ و خالدؓ و طلحہؓ، ابو عبیدہؓ، صہیبؓ یہ اک قبیلۂ وارفتگانِ رحمت ہے
(محمد فخر الحق نوری، نعت رنگ ۳۱، ص:706)

اک بار آ کے روٹھ گیا تھا جہان سے
پھر اس زمیں پہ کوئی ابوذرؓ نہیں ملا (انجم نیازی، نعتوں کا انتخاب، ص:123)

غلام ان کے منفرد ہیں ساری کائنات میں
یہ دیکھیے اویسؓ ہیں، صہیبؓ ہیں، بلالؓ ہیں
(حکیم سرو سہارنپوری، نعتوں کا انتخاب، ص:227)

ہندوستان میں نعتِ رسولِ مقبول ﷺ سے جہاد کرنے والے، نعتِ رسول ﷺ کو لوگوں کے دِلوں کی دھڑکن بنانے والے مولانا احمد رضا خاں بریلوی عشقِ رسالت میں ایک مخصوص مقام رکھتے تھے۔ اسی حوالے سے انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ انھوں نے اس نظریے اور عقیدے کو بڑے یقین کے ساتھ باور کرایا کہ خاتم النبیین ﷺ سے والہانہ عقیدت اور محبت ہی اسلام کی حقیقی روح ہے۔

اس حوالے سے عہد حاضر کے نعت شعرا نے ان لوگوں کے مناقب بھی کہے ہیں۔

حسانؔ و کعبؔ، تائبؔ و بو طالبؔ و نصیرؔ
کچھ بانیانِ نعت ہیں کچھ پاسبانِ نعت (مشکوٰۃ، ص: 162)

سعدیؔ و رضاؔ جامیؔ رومیؔ و حسنؔ، تائبؔ
بوصیریؒ و کعبؓ اور ہے حسانِؓ محمد کا (گوہرِ طیب، ص: 44)

حسانؓ ایک فرد نہیں، ایک سوچ ہے
مدحت سرا ہے جو بھی وہ حسانِ نعت ہے
تلقین خود حضورؐ نے سعدیؔ کو جو کیا
وہ مصرعِ درود ہی سلطانِ نعت ہے (مشکوٰۃ، ص: 62)

اے شہرِ غزل آ ترے دامن کو سجا دوں
بوصیری کے میں زندہ قصیدے کی زمیں ہوں (تاجِ مدینہ، ص: 78)

کیسے خیالِ حسنِ نبیؐ میں نہ وہ رہے
حسانؓ جس کے فکر و نظر کا امام ہے (حسن الکلام فی مدحِ خیرالانام، ص: 63)

میری نعتوں میں بھی ڈھل جائے وہ پیکر کا جمال
اُمِ معبدؓ نے لکھا جیسے سراپا تیرا
میرے کشکولِ ثنا میں کوئی نغمہ اُترے
جیسا حسانؓ نے لکھا ہے قصیدہ تیرا
(ارشد محمود ناشادؔ، نعت رنگ، ص: 207)

کعبؔ و حسانؔ و رضاؔ، سعدیؔ و جامیؔ، اقبالؔ
کتنی عزت کے سحرؔ! اہل یہ شاعر ہوں گے (حسنین سحرؔ، مدحت، ص: 58)

سب ہیں تمھارے خوانِ کرم کے ہی ریزہ چیں
شبلیؒ ہو، بایزیدؒ ہو یا شیخِ جامؒ ہو (نذر صابری، مفیض نعت نمبر، ص: 601)

یہ گنج بخشؒ و فریدؒ و معینؒ و صابرؒ و غوثؒ
سبھی کو اسوۂ کامل ہے زندگی ان کی (گوہرِ طیب، ص: 121)

یہ حبیبِ کبریا کے عشق کی تفسیر ہیں
ہوں معین الدینؒ یا گنج شکر بابا فریدؒ (آبِ رحمت، ص: 462)

عمر بھر جو بھی شریعت کے تری تابع رہا
وہ معین الدینؒ، فرید الدینؒ و صابرؒ ہو گیا (تنویرِ نعت، محمد اظہر صابری، ص: 77)

اُردو نعت میں منقبتی عناصر کے حوالے سے اگر اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر مطالعہ کیا جائے تو ہر پہلو ایک بھرپور مقالے کا متقاضی ہے۔ اس مضمون میں مفصل تو نہیں، قدرے تفصیل سے اور کہیں مختصراً بات کی گئی ہے۔ اگر امہات المومنین کے حوالے سے منقبتی عناصر کو دیکھا جائے تو ایک مکمل مقالے کی ضرورت ہے۔

صحابہ کرامؓ، اہل بیت، نعت گویانِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شہیدانِ ناموسِ رسالت، اولیائے کرام، مشائخِ عظام کا نعت میں ذکر آنا ایک فطری عمل ہے۔ کیوں کہ ان لوگوں نے ہی دنیا والوں کو بارگاہِ رسالت میں بولنے کے انداز سکھائے ہیں۔ اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر جہاں خود کامیاب ٹھہرے ہیں، وہاں دنیا والوں کو کامیابی کے معیار بھی سکھائے ہیں۔ حق اور باطل کے فرق کو دکھایا ہے۔ راہِ حق میں جان قربان کرنے کا جذبہ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نعت گو شعرا نعتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھتے ہوئے اپنے نبی کے دامنِ کرم سے جڑے ہوئے لوگوں کو بھی یاد کرتے ہیں جس سے ایک تو نسلِ نو کو دربارِ رسالت سے وابستہ رہ کر زیست کرنے والوں کی زندگی میں ملنے والے ثمرات کا پتہ چلتا ہے دوسرا ان کا وہ حوالہ بنتا ہے کہ:

میں فقط خاک مگر آپ سے نسبت میری
ایک رشتہ مری اوقات بدل دیتا ہے
(محمد انور رانا)

ایسے لوگوں کا ذکر کہیں استعارہ بن کر تو کبھی تلمیحی انداز میں، کبھی صحابہ کرامؓ سے جڑی ہوئی کسی بات کا کنایتہً ذکر تو کبھی کسی واقعے کا جزوی حوالے سے اشارہ، یوں شعر میں ایک تخلیقی رنگ بھی نظر آنے

لگتا ہے اور شاعر کی وسعتِ نظر بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔نعتِ رسولِ مقبول ﷺ میں یہ پہلو کوئی نیا نہیں ہے بلکہ مدح وثنا کے حوالے سے جانثارانِ مصطفی کا ذکر اور شہیدانِ ختمِ نبوت کا ذکر منقبتی حوالے سے نعت کے آغاز سے ہی ہونے لگا تھا۔اب اس کا ذکر اور اس پہلو میں وسعت آتی نظر آنے لگی ہے جس سے نئی نئی تراکیب بھی بن رہی ہیں اور عقیدے کے حوالے سے بڑا خوشبودار منظر بن رہا ہے۔ ہمارے نعت گوشعرا کی یہی فکری کامیابی ہے۔انھوں نے اپنی نعت میں صحابہ کرامؓ، اہلِ بیت، اولیائے کرام اور مشائخ عظام اور نعت گویانِ رسول کو ایک نئے پہلو سے زندہ کیا ہے اور نسلِ نو کو بدعقیدگی کا شکار نہیں ہونے دیا۔

□□□

جو دل کا نور ہے اس خواب پر کروڑوں سلام
سب اہل بیت، سب اصحاب پر کروڑوں سلام

کتابِ عشقِ محمد ﷺ ہے اسوۂ صدیقؓ
اور اس کتاب کے ہر باب پر کروڑوں سلام

عمرؓ عطائے الٰہی عمرؓ دعائے نبیؐ
شہیدِ منبر و محراب پر کروڑوں سلام

کتابِ حق ہے گواہِ شہادتِ عثمانؓ
شہید ِ صفحہ ء زرتاب پر کروڑوں سلام

فقط علیؓ ہے، اگر ہے کوئی نظیرِ علیؓ
سلام ہستیٔ نایاب پر کروڑوں سلام

ہے روز آل محمد ﷺ پہ پنج وقتہ درود
نماز کے ادب آداب پر کروڑوں سلام

مزاجِ صلحِ امامِ حسنؓ پہ جان فدا
دیارِ دل! ترے مہتاب پر کروڑوں سلام

ہے کس کی ایسی حکومت بجز امام حسینؓ
سو ان کی جنگ ِ ظفریاب پہ کروڑوں سلام

(سعود عثمانی)

اُردو دوہوں میں مناقب کی روایت

ڈاکٹر رانا خالد محمود

ABSTRACT: Urdu poetry is enriched with genres, Qasida, Masnavi, Ghazal, Nazm, Rubaiaat, Kitaat, Tarvenee, Salasi and Hyco along with Dohaa's are significant identity in Urdu poetry. Before partition of subcontinent Indo Pak Dohay were popular with Hindi words but renowned Urdu Doha writer Jameeluddin Ali changed the style of sayings of Doha's into Aali Chaal. in Doha love and beauty are the main topics but Hamdiya and Natiya trend also found in Doha writers. In this dissertation we will take a review of Manqibi Doha. Although Manaqibii Dohaa's are low in quantity but are enrich in comprehensiveness. In future trends of Munaqobee Dohaa's will be increased keeping in view spiritual spirits of poets.

اُردو اور ہندی ادب میں دوہے کی صنف قدیم اصناف میں شمار ہوتی ہے۔ دوہوں کے مطالعے سے قدیم ثقافت وتہذیب کے در وا ہوتے ہیں۔ دوہوں میں بیان کیے گئے مضامین محنتِ شاقہ اور خونِ جگر کا رنگ نظر آتا ہے۔ دوہے کا ایک ایک چرن انسانی زندگی کا ترجمان ہے۔

اُردو شاعری کے تانے بانے قصیدے سے ملتے ہیں۔ قصیدہ ممدوح اور مدّاح کا جذباتی معاملہ ہے، ابتدا میں قصیدے میں پُرشکوہ، بلند اور نایاب و نادر لفظیات کا سہارا لیا جاتا تھا۔ قصیدے، مثنوی، اودھی اور بالآخر اُردو میں بھی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے ۔ دوہے کی صنف کا اوّلین نشان پراکرتوں کے زوال کے زمانے میں ملتا ہے۔ دراصل دوہے کی صنف برصغیر میں مذہب، تصوف اور انسانی موضوعات کے مستعمل ہونے سے وجود میں آئی۔ اس میں سب سے بڑا دخل مذہبی مشائخ کا ہے جس میں غیر مسلم اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

دنیائے شاعری میں دوہا مختصر ترین صنف ہے۔ دوہے کو دوہا، دوہرا، ہندی کی نظم کی بیت لکھا گیا ہے(۱) دوہا یا دوہرا۔ ہ۔اسم مذکر۔ جوڑا۔ بیت۔

فرد دو مصرعوں کا ہندی شعر(۲)

دوہا ایک ہندی نظم جس میں چار چرن ہوتے ہیں(۳)

دوہے کے چار چرن:

دوہے کا ہر ایک مصرع دو چرنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے چرن میں ۱۳ ماترائیں پھر وسرام (ٹھہراؤ۔ وقفہ) اگلے چرن میں ۱۱ ماترائیں۔ دوہے کے اس وزن کے مطابق دونوں مصرعوں میں ۴۸ ماترائیں ہوتی ہیں۔

دوہے میں احتیاط

ہر سم اور وشم کے درمیان وقفہ لازمی ہے

سم کے حرف آخر کا، وشم کے حرف اوّل سے ادغام نہیں ہونا چاہیے

دوہے کے اقسام میں

دوہا چھند ہندی بحر

سرسی چھند اردو بحر (عالی چال)

عصر موجود میں لکھے جانے والے دوہوں کی اقسام

حمدیہ دوہے، نعتیہ دوہے، شخصیاتی دوہے، اردو دوہے، دوہا غزل، دوہا گیت، دوہا نظم، دوہا ترائیلہ، دوہا سانیٹ، دومعریٰ مثلث، دوہا مثلث، دوہا قطعات، دوہا دوبیتی، دوہا ہائیکو، مردف دوہے، معریٰ دوہے۔

حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی دوہوں میں قادر الکلامی کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ ماضی میں حمد و نعت، سلام و منقبت کو کسی صنفِ ادب میں شمار نہیں کیا جاتا تھا مگر بیسویں صدی میں تقدیسی ادب کا میدان تیز رفتاری سے ادبی افق پر جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ عصرِ موجود میں تقدیسی ادب کو بلند و بالا مقام حاصل ہو چکا ہے۔ حمد و نعت کے ساتھ منقبتی دوہے بھی منظرِ عام پر آرہے ہیں اور یہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

''دیر آید درست آید'' حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی دوہے یقیناً شعرا کے لیے عاقبت سنوارنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

منقبتی دوہوں میں موضوع کی یکسانیت و انفرادیت کا انداز قدرے مشکل ہے مگر ثنا گوئی کچھ نہ کچھ رنگ ضرور لائے گی۔ منقبتی دوہوں میں بھی بہت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے جس طرح نبی کریم نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت میں الوہیت اور عبدیت کو بہر حال ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ دوہا نگاری میں بھی احتیاط صنفِ دوہا کو استحکام بخشنے میں معاون ثابت ہوگی کہ دوہے کی تکنیک ہیئتی نظام، ماتراؤں کی

پابندی، وشرام یا وقفہ کی پابندی لازمی ہے برعظیم پاک و ہند میں دوہا گوئی کی مستند تاریخ سینکڑوں سالوں پر محیط ہے حضرت امیر خسرو نے ۲۷۵ھ میں دوہا کہا تھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھوں دیس (۴)

اسی تسلسل میں کبیر داس، تلسی داس، عبدالرحیم خان خاناں میرا بائی جی نے خوب دوہے کہے۔ حمدیہ، نعتیہ اور ہندی ثقافت کے اعتبار سے ان کے رام، اوتار یا کسی دیوی کے حوالے سے دوہوں کی سرزمین بڑی زرخیز ہے البتہ منقبتی دوہے خال خال ملتے ہیں۔

منقبتی دوہوں سے مراد وہ دوہے ہیں جن میں صحابہ کرامؓ اولیائے عظامؒ اور بزرگان دین سے عقیدت اوران کے اوصاف بیان کیے جائیں نیز کسی اسلامی مشاہیر کی تعریف بھی اسی ضمن میں شامل کی جائے گی۔

ڈاکٹر سعید ہارون طاہر نے بہت سے یادگار دوہے کہے ہیں جن میں مذہبی رنگ جھلکتا ہے مگر ذیل کا دوہا گوکہ منقبتی شمار نہیں ہوسکتا مگر اس دوہے میں ڈاکٹر سعید ہارون طاہر کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے

جگ میں لاکھ زلیخا دیکھیں یوسف تھا بس ایک
اب تو سارے نام کے یوسف، کسو کہیں ہم نیک (۵)

بزرگان دین کی عقیدت میں کہے گئے منقبتی دوہے اپنی مثال آپ ہیں ان دوہوں میں برعظیم میں بزرگان دین سے والہانہ محبت اور عقیدت کی عمدہ مثال سامنے آتی ہیں امین الدین وارثی کا ایک دوہا ملاحظہ ہو:

کاہ کہوں کچھ بن نہیں آوت سنو گریب نواج
دن دیال ہرو دکھ سنکٹ لاج پنی مہاراج (۶)

برکت اللہ پیمی جو کہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کے بانی تھے ان کے پریم پرکاش میں ذیل کا منقبتی دوہا اپنی معنویت کے اعتبار سے جامعیت کا حامل ہے

ابی بکرؓ اور عمرؓ پُن عثمانؓ علیؓ بکھان
ست نیتی اور لاج آتی، بِدّیا بوجھ سجان (۷)

محمد علی صدیقی (فراغ روہوی) بھی ایک دوہا لکھاری ہیں جنھوں نے حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی دوہے لکھے ہیں ان کے منقبتی دوہوں میں مشائخ عظام سے گہری عقیدت ملتی ہے۔

آپ خدا کے ہیں ولی اجمیری سرکار
ہمیں وسیلہ آپ کا بے شک ہے درکار
ولیوں کے دربار میں سب کے بنے ہیں کام
روشن ہوتے ہیں وہاں بے ناموں کے نام

کام جو کر پاتے نہیں راجا اور امیر
کر دیتے ہیں کام وہ صوفی، سنت، فقیر (۸)

عبداللہ ساحر شیوی نے دوہے کو کن کے عنوان سے دوہے لکھے ہیں۔ نیروبی، کینیا، پاکستان پھر نیروبی بعد میں برطانیہ میں مقیم رہے۔ آپ نے حمد یہ نعتیہ دوہے اچھے انداز میں لکھے آپ کی کتاب دوہے کو کن کے میں دو منقبتی دوہے دریافت ہوئے ملاحظہ کیجیے۔

علیؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور ابو بکرؓ یہ چار
میرے آقاؐ نے کہا ان کو اپنا یار (۹)
حسن ؓ، حسینؓ اور فاطمہؓ تینوں نورِ عین
تارے آپؐ کی آنکھ کے، آپؐ کے دل کا چین (۱۰)

خالد دانش کا شمار کراچی کے اہم قلم کاروں میں ہوتا ہے ان کا شغف ادبِ اطفال بھی ہے ان کا ایک منقبتی دوہا تاریخی پس منظر میں۔

شہر محمدؐ علم کا در نام علیؓ
تو سیوک بن جائے، تو ہوئے ہو جون بھلی (۱۱)

رفیع الدین رازؔ اردو شاعری کے عالمی شہرت یافتہ شاعر ہیں آپ نے کثیر شعری سرمایہ تخلیق کیا ہے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہندی ادب اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے ایک منقبتی دوہا۔

دونوں ہی تاریخ کے ہیں مردِ میدان
جے جے ارجن کی کہیں، کہیں علیؓ کی شان (۱۲)

جمیل الدین عالی اردو دوہے کے بانی ہیں۔ انہوں نے عالی چال (سرسی چھند) میں دوہے نگاری کی ریت ڈالی اور کامیاب رہے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''عالی کے دوہے تقلیدی نہیں، اپنی فضا کی پیداوار ہیں۔ ان میں ایک افسردہ سی شہزادگی کی بو باس بھی ہے اور قلندروں، جوگیوں کی ترنگ بھی۔ مگر کرشن بھگتوں کے مانند پریم دھرم اس کا اصلی روپ ہے'' (۱۳)

عالی جی کے سندھ دھرتی کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور پنجابی/سرائیکی زبان کے مشہور صوفی شاعر بابا بلھے شاہ کے لیے لکھے دو منقبتی دوہے:

شاہ لطیف تمہارے در پر کیا کیا سُر لہرائیں
عالی جیسے من میلے بھی کندن ہو کر جائیں (۱۴)

بلھے شاہ کے دوہڑے میری روح میں اترے جائیں
پھر مری کو یتا بن کر باہر روشنیاں پھیلائیں(۱۵)

محسن اعظم ملیح آبادی نے دوہا چھند میں ہزاروں دوہے کہے ہیں اور دوہا نگاری کا ایک بڑا نام ہے وہ اردو اور ہندی زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے ان کا عمدہ کام یہ ہے کہ دوہا آرام میں پانچ ہزار دوہے شامل کیے ہیں۔مشکل الفاظ کے معانی حواشی میں دینے سے قارئین کو دوہے سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے بمشکل ایک دوہاہ ایسا میسر آیا جس میں منقبتی رجحان جھلکتا ہے۔

ایک گِنِیکا[۱] ہے جگت[۲]، جس کو یہ پَرچائے[۳]
اس کا ہر دَے[۴] پھر کبھی، اَور، دِشا نا[۵] جائے(۱۶)

ڈاکٹر ثروت رضوی آج کل امریکہ میں مقیم ہیں انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستہ رہیں پی آئی اے میں ملازمت کی، اردو میں پی ایچ ڈی کی ہے۔اردو شاعری کی اصناف پر گرفت رکھتی ہیں خاص طور پر تقدیسی ادب پر گہری نظر ہے آپ نے دوہے بھی کہے ہیں دوہا جل میں ان کے دوہوں کا مجموعہ ہے رثائی ادب میں بھی عمدہ کام ہے آپ کے منقبتی دوہے معنویت ومقصدیت کے حامل ہیں۔

حق حیدر کا نعرہ

مکّی مدنی سیّدی آقاؐ کا ہے یہی فرمان
علیؓ کو مولا مان لے مورکھ مجھ کو مولا جان(۱۷)

ہر مشکل میں لیا ہے میں نے تورا نام ضرور
نادِ علی کا ورد کرے ہے گھور دلدّر دور(۱۸)

خسرو مرشد

تورے نام کی جوگن بن کر لے لوں میں بن باس
خسرو مرشد بجھ نہ پائے مورے من کی پیاس (۱۹)

منقبت کو اردو شاعری یا سخن دانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خوبیوں کو منظوم بیان کرنے کے ہیں مگر اس صنف میں صحابہ کرام، آئمہ کرام اور صوفیائے عظام کی تعریف بھی منقبت میں شمار ہوتی ہے۔

۱ؔ طوائف زن / فاحشہ ۲ؔ دنیا ۳ؔ مائل کرنا ۴ؔ دل ۵ؔ طرف

منقبتی دوہے عقیدت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں وارفتگی سرشاری کا عنصر نمایاں ہوتا ہے خلفائے راشدین، صحابہ کرام، آئمہ کرام اور صوفیائے عظام کی محبت اور موّدت کے مہکتے ہوئے پھول اکابر شعراء اور عصر موجود کے شعراء نے منقبتی دوہوں پر کم توجہ دی ہے۔ امید ہے کہ شعراء اس پر توجہ دیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ نوراللغات، جلد سوم، نورالحسن نیر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۵، ص ۱۴۱

۲۔ دہلوی سید احمد، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۷، ص ۲۸۷

۳۔ ہندی اردو لغت، راجہ جیسور راؤ صغر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳۔ ص ۲۰۰۷

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۸ طبع ہفتم ص ۲۹

۵۔ طاہر سعید ہارون، ڈاکٹر، منِ موج، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱، ص ۱۲۶

۶۔ وارثی، امین الدین، یتیم کہانی، وارث جانی مطبع احمد یہ حیدرآباد دکن، ۱۳۳۰ھ، ص ۱۴۱

۷۔ سیّد برکت اللہ، پیمی، پریم پرکاش، تدوین چھچھی دھر، فرانگ برادرز، دہلی، ۱۹۴۳، ص ۲

۸۔ روہوی فراغ، دوہا درپن، ریختہ پی ڈی ایف، ۲۰۱۵، ص۔ شمارہ نہیں لکھا۔

۹۔ شیوی ساحر، دوہے کوکن کے، ادبی دنیا پبلی کیشنز، شاستری نگر جے پور انڈیا۔ ۲۰۰۵۔ ص۔ ۱۵۴

۱۰۔ ایضاً۔ ص: ۱۵۴

۱۱۔ دانش خالد، اے خدائے حُسن وعشق (دوہے) آس پبلی کیشنز کراچی۔ س۔ ندارد۔ ص ۱۸

۱۲۔ راز، رفیع الدین، دوہا پھلواری، مشمولہ کلیات۔ آبشار سخن۔ رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی ۔۲۰۱۸۔ ص: ۷۸۵

۱۳۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، مضمون دل والے کی بھاشا، مشمولہ، دوہے، جمیل الدین عالی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی (کوپرا) مال روڈ، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۷۴۔

۱۴۔ ایضاً ص ۱۳۰۔ ۱۵۔ ایضاً ص: ۱۵۳

۱۶۔ محسن اعظم، محسن ملیح آبادی، دوہا آرام (کلیات) جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸۔ ص ۵۱

۱۷۔ رضوی ثروت، ڈاکٹر، دوہا جل، جونا گڑھ پبلی کیشنز کراچی ۔ ۲۰۰۷۔ ص ۵۱

۱۸۔ ایضاً ص ۱۹۵۵۔ ایضاً ص ۱۴۸

□□□

انجم نیازی ـــــــ ایک تحریک ساز منقبت نگار[1]

ڈاکٹر ریاض مجید

ABSTRACT: This article highlights the homage-paying poetry of Anjum Niazi, which focuses on the virtues and excellence of the Companions of the Holy Prophet Muhammad (PBUH), his wives, and the martyrs of Islam. The author provides a biographical sketch of Anjum Niazi and presents examples of his poetic works, including both general poetry in the form of ghazals and devotional poetry dedicated to revered Islamic figures. The article emphasizes that Anjum Niazi is uniquely distinguished as the only poet to have authored 70 books devoted to paying tribute to esteemed personalities of the Islamic Ummah, 47 of which have been published to date. These works underscore the significance of various prominent figures in Islamic history. The author aptly describes Anjum Niazi as a motivational poet whose work reflects the poetic expression of virtue and excellence in honoring sacred personalities within the Islamic world.

گزشتہ صدی کے آخری رُبع میں نعتِ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فروغ کے ساتھ مذہبی شاعری کی دوسری اصناف حمد، منقبت، سلام وغیرہ کو بھی ایک نئی جہت ملی۔ اِن عشروں میں مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے اِن اصنافِ شاعری میں وسعت پذیری کا ایک ایسا رُخ سامنے آیا جو اردو کے شعری ادب کی تاریخ میں پہلے نہیں آیا تھا۔ اگرچہ حمد اور منقبت کا سراغ آغازِ اردو ہی سے ملنا شروع ہو جاتا ہے مگر اِن کی حیثیت اُس زمانے تک دوسری اصناف کے مقابلے میں ثانوی رہی ـــ زیادہ تر روایتی اور رسمی انداز میں مثنویوں اور دواوین کے آغاز میں کچھ حمدیہ اور منقبتی اشعار شامل کر دیئے جاتے ۔ اِن اصناف کی جداگانہ شعری حیثیت اور اِن کا صنفی اعتبار اور وقار انیسویں صدی کے آخری عشروں میں قائم ہونا شروع ہُوا وہ بھی کم کم ـــ دبے پاؤں اِن اصناف نے ادبی صف میں اپنی جگہ بنائی ۔

پرانے تذکرے اور گزشتہ اَدوار کی ادبی تاریخیں اِن اصناف کے خصوصی ذکر سے خالی ہیں مرثیہ البتہ پوری توانائی سے شعری ادب کے ہر دَور اور دبستان میں مذہبی عقیدت و احترام کے ساتھ تخلیق ہوتا رہا ۱۸۵۷ء سے قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) تک مذہبی اصناف شاعری نے تاریخ ادب میں اپنی با قاعدہ جگہ بنالی اور لکھنے والوں نے ادبی معیارات کے ساتھ ادھر توجہ دینا شروع کی اور حمد،نعت،منقبت اور سلام وغیرہ کا وافر ذخیرہ سامنے آ گیا۔

اِس زمانے میں اِن اصناف کے بارے میں تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی گاہ گاہے سامنے آنا شروع ہوئے یوں ان اصناف کے جداگانہ صنفی خدوخال اور زیادہ نمایاں ہوئے اہلِ بیتؓ اور صحابہ کرامؓ کے مناقب بھی تخلیقی شاعروں کے افکار کا حصہ بنے اور مختلف مذہبی، سماجی اور تہذیبی ضروریات کے سبب منقبت نویسی کا چلن بھی عام ہو گیا۔عشرہ بہ عشرہ شاعروں نے ان اصناف میں گراں قدر اضافے کئے اور اب اکیسویں صدی کے پہلے ربع میں فکری وفنی ہر لحاظ سے مذہبی شاعری کی اصناف با قاعدہ شعری مطالعات کا حصہ بن گئی ہیں پہلے اِن کا مِلا جُلا ذکر مذہبی شاعری کے ذیل میں ہوتا تھا وقت کے ساتھ اِن اصناف کی جداگانہ شعری حیثیات اتنی نمایاں ہو گئی ہیں کہ اب انہیں الگ الگ صنف کے طور پر عوامی حلقوں اور جامعات میں زیرِ جائزہ لایا جاتا ہے۔

منقبت کی صنف پر گزشتہ سالوں میں سب سے زیادہ تخلیقات جِن شاعروں نے کیں اِن میں انجم نیازی کا نام اور کام بہت نمایاں ہے۔انہوں نے مناقب کے ستر(۷۰) سے زیادہ مجموعے لکھے ۔مَیں اردو شاعری کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں ۔مَیں نے گزشتہ پون صدی میں چھپنے والے منقبتی مجموعوں میں اتنی تعداد میں ایسے مؤثر مجموعے کسی اور شاعر کے حوالے سے نہ دیکھے نہ سنے جو فکری و فنی طور پر ایسا معیار اور تنوّع رکھتے ہوں جیسا انجم نیازی کی شاعری میں ملتا ہے۔(انہیں دنوں فیصل آباد سے ہمارے ایک اور دوست مسعود چشتی نے مناقب کے چھ سے زائد مجموعے تخلیق کئے اور حال ہی میں امجد حمید محسن کی کتاب 'چمن زارِ مودّت' شائع ہوئی جو خاتونِ جنت سیّدہ زہرؓا کے مناقب پر دیوان کی صورت میں ہے یہ خبریں اُردو مناقب کی معاصر تاریخ میں خوش آئند ہیں۔)

انجم نیازی کا مختصر سوانحی خاکہ یوں ہے:

نام: شیر خان نیازی ولدیت سلطان سکندر خان نیازی۔ پیدائش: ۱۰ر نومبر ۱۹۴۱ء، گاؤں روکھڑی ضلع میانوالی۔تعلیم: ایم اے اُردو۔ پیشہ سرکاری ملازمت: اسسٹنٹ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ (ریٹائرڈ) انہوں نے شاعری کا آغاز ۱۹۷۴ء میں بھکّر میں سیّدنا ابوبکر صدیقؓ پر منقبت لکھ کر کیا۔اس کے ساتھ جدید رنگ میں غزلیں بھی لکھیں جو ادبی حلقوں میں اُن کے اوّلین تعارف کا ذریعہ بنیں۔ یہ

گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے کی بات ہے جب رسائل اور مشاعروں میں انجم نیازی کا کلام پڑھنے اور سننے کو ملتا اور قارئین اور سامعین سے داد وصول کرتا اُن کی غزلوں میں اُس زمانے کی غزل کے فکری اور فنّی سارے محاسن موجود ہیں۔ اُن کی چند غزلیں دیکھئے:

ہر اک لمحہ مجھے ٹھہرا ہُوا محسوس ہوتا ہے مجھے سارا جہاں اک رتجگا محسوس ہوتا ہے
مری پلکوں پہ شبنم گر رہی ہے نیند کی لیکن مجھے ہر ایک سایہ جاگتا محسوس ہوتا ہے

چل رہا تھا کب سے گردِ کارواں اوڑھے ہوئے سو گیا تھک کر زمیں پر آسماں اوڑھے ہوئے
آدمی لگتا ہیں سایوں کی طرح اس شہر میں شہر کا ہو شہر جیسے اک دھواں اوڑھے ہوئے

ہر گھڑی لگتا ہے سر پر آسماں گرتا ہُوا کون روکے گا زمیں پر یہ مکاں گرتا ہُوا
دیکھتے ہی دیکھتے جانے کہاں گم ہو گیا اک پرندہ سا پسِ دیوار جاں گرتا ہُوا

جو کہنا چاہتا ہوں وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا مَیں دریا کی طرح الٹی طرف کو بہہ نہیں سکتا
یہاں ہر لفظ جھوٹا ہے یہاں ہر بات بے معنی مَیں اس دنیا سے دل کی بات انجم کہہ نہیں سکتا

مجھے تو اپنے خوابوں کی جزیروں میں اترنے دے
مسافر ہوں مجھے رنگوں کی دنیا سے گزرنے دے

مری آنکھوں میں خوابوں کے ابھی آثار باقی ہیں
مسافر جا چکے ہیں اُن کے پہرے دار باقی ہیں
ابھی جنگل کی خوشبو سے مرا رشتہ نہیں ٹوٹا
مرے جیسے ابھی کچھ پیڑ سایہ دار باقی ہیں
ابھی کچھ فاصلے رہتے ہیں تنہائی میں طے کرنے
ابھی کچھ دھڑکنیں دل کی پسِ دیوار باقی ہیں

بے صدا گھر میں کوئی حرفِ صدا ملتا نہیں ایک بھی سایہ یہاں چلتا ہُوا ملتا نہیں
مَیں بچھڑ جاتا ہوں کتنی بار اپنی ذات سے مجھ کو اپنا ہی سراپا بارہا ملتا نہیں

جاگتی پلکوں پہ خوابوں کے نشاں ٹھہرے ہوئے میری آنکھوں میں ہیں کیا کیا آسماں ٹھہرے ہوئے
آگے رستہ ہے نہ پیچھے اُن کے جانے کے لیے لوگ ہیں اِس دَور میں جانے کہاں ٹھہرے ہوئے

آگے رستہ ہے نہ پیچھے اُن کے جانے کے لیے
لوگ ہیں اِس دَور میں جانے کہاں ٹھہرے ہوئے

کبھی آدھا کبھی سارا بشر باقی نہیں رہتا چھتیں کمزور ہوں جس کی وہ گھر باقی نہیں رہتا
سبھی خدشات ہوتے ہیں بھنور میں کود جانے تک پھر اس کے بعد مر جانے کا ڈر باقی نہیں رہتا

انجم نیازی کی غزل کا مجموعہ ''آخری لمحہ'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہُوا۔ اسی دوران میں انجم نیازی مذہبی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے انہوں نے حمدیں اور نعتیں بھی لکھیں اِن اصناف میں بھی اُن کے مجموعے بھی شائع ہوئے مگر ان کا زیادہ رجحان منقبت صحابہ کی طرف رہا جیسا کہ پہلے نشاندہی کی جا چکی ہے بھکّر میں ہی انہوں نے سیّدنا ابوبکر صدیقؓ پر پہلی منقبت لکھی وہاں اُن کی کوششوں سے منقبت نگاری کی تحریک کا آغاز کیا۔ بھکّر، سرگودھا، جھنگ اور مختلف اضلاع کے شعراء کو منقبت نگاری پر آمادہ کیا، بھکر میں پروفیسر بشیر احمد بشیرؔ، سرگودھا میں پرویز بزمی، رشک ترابی، نصرت چوہدری، پرویز شاہ پوری، صوفی فقیر محمد، ظہیرالدین ظہیر، ممتاز عارف، پروفیسر ریاض احمد شاد اور راغب شکیب کے ساتھ مل کر منقبت نگاری کی فضا پیدا کی اور خود بھی بہت اچھے مناقب لکھے اور مشاعروں میں پڑھے۔ اِس کے بعد بسلسلہ ملازمت وہ شیخوپورہ اور پھر جھنگ آ گئے وہاں انہیں بہت اچھا ماحول ملا۔ مثلاً ریاض رام، بیدل پانی پتی، احمد تنویر، ظفر سعید، اصغر عباس، حکمت ادیب، عبدالستار نجم، محمد نواز ایمن، اختر بھٹی اور کئی دوسرے شاعر منقبت نگاری میں اُن کے رفیقِ کار بنے۔ بقول انجم نیازی اس عشرے میں: ''جس طرح لکھنو کسی زمانے میں مرثیے کا گھر بن گیا تھا اسی طرح جھنگ منقبت نگاری کا مرکز بن کا اُبھرا۔''

راقم نے بھی اپنی باقاعدہ منقبت نگاری کا آغاز جھنگ میں برادرم انجم نیازی کی معیت میں کیا فیصل آباد سے مَیں، انور محمود خالد، کوثر علی اور کئی دوسرے شاعران منقبتی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ بلاشبہ اُس زمانے میں منقبت نگاری کی ایک باقاعدہ تحریک انجم نیازی کی کوششوں سے شروع ہوئی۔

انجم نیازی کی منقبت نگاری کا سفر ۱۹۷۴ء سے اب تک مسلسل جاری ہے انہوں نے کم و بیش ستر (۷۰) مجموعے تخلیق کئے ہیں ان میں درج ذیل سنتالیس (۴۷) مجموعے کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ اُن کے اسماء درجِ ذیل ہیں:

(۱) پہلا صحابیؓ (یہ پوری کتاب سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی مناقب پر ہے) (۲) مرادِ مصطفیؐ (یہ

کتاب حضرت عمر فاروقؓ کے مناقب پر ہے)(۳) ذوالنورین (یہ کتاب حضرت عثمان غنیؓ کے مناقب پر ہے) (۴) علی شیرِ خدا (یہ کتاب حضرت علیؓ کے مناقب پر ہے) خلفائے راشدین کے مناقب کی کتابوں کے بعد اُن کی دوسری کتابیں عشرہ مبشرہؓ ، اُمہات المومنینؓ ،مختلف صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیتِ اطہارؓ پر ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مجموعے ایک ایک شخصیت پر علاحدہ علاحدہ منقبتوں پر مشتمل ہیں۔اُن مجموعوں کے اسماء یوں ہیں:

(۵) سعید بن ابی وقاصؓ (۶) ابوعبیدہ بن جراحؓ (۷) عبدالرحمن بن عوفؓ (۸) محافظِ رسول طلحہؓ (۹) زبیر بن العوامؓ (۱۰) سعید بن زیدؓ (۱۱) ابوموسیٰ عشریؓ (۱۲) بلالؓ (۱۳) ابوھریرہؓ (۱۴) سیدنا عباسؓ بن عبدالمطلب (۱۵) عبداللہؓ بن عباس (۱۶) خالدؓ بن ولید (۱۷) عبداللہ بن مسعودؓ (۱۸) عبداللہ بن زبیرؓ (۱۹) عبداللہ بن عمرؓ (۲۰) ابوالعاصؓ (۲۱) ابوایوب انصاریؓ (۲۲) ابوسفیانؓ (۲۳) امیر معاویہؓ (۲۴) عمر بن العاصؓ (۲۵) اسامہ بن زیدؓ (۲۶) حسن بن علیؓ (۲۷) حسین بن علیؓ (۲۸) حمزہ بن عبدالمطلبؓ (۲۹) کرنیں ایک مشعل کی (جلد اوّل) (۳۰) کرنیں ایک مشعل کی (جلد دوم) (۳۱) خدیجۃُ الکبریٰؓ (۳۲) صدیقۂ کونینؓ (۳۳) صدیقۂ کائناتؓ (۳۴) امّ المومنین حفصہؓ (۳۵) امّ المومنین سودہؓ (۳۶) امّ المومنین جویریہؓ (۳۷) امّ المومنین زینب بنت جحشؓ (۳۸) امّ المومنین زینب بنت خزیمہؓ (۳۹) امّ المومنین جویریہؓ (۴۰) امّ المومنین اُمّ سلمہؓ (۴۱) امّ المومنین اُمّ حبیبہؓ (۴۲) ماریہ قبطیہؓ (۴۳) سیّدہ فاطمہؓ بنتِ خطاب (۴۴) سیّدہ اولی بنتِؓ عبدالمطلب (۴۵) سیّدہ صفیہؓ بنتِ عبدالمطلب (۴۶) سیّدہ اسماءؓ بنتِ ابوبکر (۴۷) صحابیاتؓ طیبات جلد اوّل (۴۸) صحابیاتِؓ طیبات (جلد دوم) (۴۹) صحابیاتِؓ طیبات (جلد سوم) (۵۰) صحابیاتِؓ طیبات (جلد چہارم) (۵۱) یارانِ رسولؐ (جلد اوّل) (۵۲) یارانِ رسولؐ (جلد دوم)

انجم نیازی نے گفتگو میں مجھے بتایا کہ اِن (اوپر درج کی گئی کتابوں) کے علاوہ اُن کے کم وبیش ۱۸ منقبتی مسودہ جات چھپائی کے لیے تیار ہیں۔"اللہ نے چاہا تو وہ سب میری زندگی ہی میں چھپ جائیں گے۔مناقب نگاری کی تحریک اللہ کے کرم سے پشاور سے کراچی تک پہنچ گئی ہے۔"انجم نیازی دعا گو اور پُرامید ہیں کہ اِس تحریک میں شامل لوگوں پر اللہ کا کرم ہوتا رہے اور دعا ہے کہ مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ صحابہ کی محبت پیدا فرمائے کیونکہ ابھی تک وہ شوق اور ذوق پیدا نہیں ہُوا جو ہونا چاہیے۔

انجم نیازی کا منقبتی سرمایہ کئی تنقیدی و تحقیقی مقالوں کا موضوع ہے اس تعارفی مضمون میں ان کے فکری وفنی پہلوؤں اور خصوصیات کلام کی صرف نشاندہی ہوسکتی ہے واضح ہو کہ:

۱) انجم کی منقبت کا قریب قریب تمام سرمایہ غزل کی صنف میں تخلیق ہُوا انھوں نے ہر منقبت

کے لئے ایک الگ زمینِ شعر تراشی۔ موضوع کی تکرار کے سبب ان کی ہر منقبت غزلِ مسلسل کا سا رنگ ڈھنگ رکھتی ہے۔

۲) جدید غزل کے علائم و رموز اُن کے مناقب میں تخلیقی شائستگی کے ساتھ موجود ہیں اُن کے فن میں آورد کی بجائے آمد کی فضا موجود رہتی ہے اُن کے ہاں موضوعِ منقبت کے ساتھ ان کی دلی وابستگی کا احساس نمایاں ہے ایک ہی موضوع (شخصیت) پر لکھتے ہوئے انہوں نے مضامین میں نادرہ کاری اور تازہ بیانی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳) اُن کے مناقب میں فنّی محاسن (غزل کے علائم و رموز، تشبیہ استعارہ، محاکات، علامات وغیرہ) کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔

۴) اُن کے مناقب میں استعمال ہونے والی شعری زمینوں نے مناقب کی فنّی فضا اور تخلیقی ماحول کو بھی شائستہ مزاج رکھا ہے اوزان و بحور خوش آہنگی اور حُسنِ تراکیب ساتھ الفاظ کا در و بست اور انتخاب مناقب لائق ہے جو ان کی منقبت دوستی کے فطری رجحان کا مظہر ہے۔

۵) فکری تنوع انجم نیازی کا رنگ خاص ہے ان کے اشعار کی تخلیقی فضا میں ایسی تکرار نہیں جو قاری کو بوجھل اور ناگوار محسوس ہو ایک ہی موضوع (شخصیت) پر لکھتے ہوئے انہوں نے اپنے رنگ خاص (تنوع پسندی اور جدّت طرازی) سے نئے نئے مضامین تلاشے ہیں اور تازہ بہ تازہ پیرایہ ادا میں انہیں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

۶) فکری طور پر انجم نیازی کی منقبت کے مضامین قرآن کریم، احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ وسیر کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ ان ماخذات سے ساتھ انجم کے گہرے ربط نے انہیں اہلِ بیتؑ اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں سینکڑوں تازہ بہ تازہ مضامین فراہم کئے ہیں۔

۷) موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے انجم نیازی کا لب و لہجہ پُر احترام ہوتا ہے اُن کے ہاں 'توّلا' کا اظہار کسی دوسری شخصیت کے 'تبرّا' کے ردّ عمل کے طور پر نہیں اُن کے پورے کلام میں کہیں اس امر کا شائبہ تک نہیں گزرتا کہ وہ کسی کی تعریف کرتے ہوئے کسی اور کی تخفیف کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ معاصر منقبت نگاری میں بعض غیر متوازن شاعروں نے اہلِ بیتؑ اور صحابہ کرامؓ کے بارے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے اس احترام کا خیال نہیں رکھّا جو اِس صنف کی اساس ہے یعنی سب کا احترام۔

ان خصوصیات کے سبب انجم نیازی کی منقبت نگاری پُرتاثیر ہے، پڑھنے والے پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے اور اسے محظوظ کرتی ہے۔ نادرہ کاری اور تنوع کے باعث انجم نیازی کا فن قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ اُن کی مختلف مناقب کے کچھ شعر دیکھئے:

گلستانِ رسالت کے ہیں سارے پھول ہی اعلیٰ
گلستانِ رسالت کے ہیں سارے ہی ثمر اچھے (ابوبکرؓ وعمرؓ اچھے)

ثانی الاثنین کی آیت ہے تیری شان میں
تیرا منکر اور دُشمن ، دُشمنِ اُمّ الکتاب (سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

یہ دُنیا اُن سے اب تک اکتسابِ فیض کرتی ہے
کتابِ نُور میں لکھے ہوئے ہیں مشورے اُس کے (عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اِس قدر چہرے پہ رہتا تھا شجاعت کا جلال
دیکھ کر رستے میں تجھ کو دُور ہٹ جاتی تھی موت (سیّدنا علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

زمیں پر لیٹتا جب فوج کا سالار خیمے میں
سمٹ آتی تھی ساری خُلد کی مہکار خیمے میں (سیّدنا ابوعبید بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اُسی کو سونپی جائے گی قیادت سب جوانوں کی
وہی روزِ قیامت ہوگا اِس بارات کے آگے (سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ہاں اُحد کے پاس اِک باغِ جناں موجود ہے
جس میں اک شاہیں صفت زندہ وہاں موجود ہے (عمِ رسول سیّدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

عہدِ عمرؓ میں جب ہوئی بارش کی احتیاج
انجم دُعا کے واسطے لایا گیا اُسے (سیّدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

صحرا کی تیز دُھوپ کے منظر بھی رو پڑے
اتنا ستم ہوا کہ ستمگر بھی رو پڑے (سیّدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

تھکے تھکے سے بدن پر غُبار کتنا تھا
مگر وہ مردِ خدا باوقار کتنا تھا (سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

خدا خوفی میں گم نیلے سمندر کی طرح خاموش
شبِ مہتاب کے پُر نور منظر کی طرح خاموش (سیّدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

تیری چوکھٹ چومتا ہے احتراماً آفتاب
تیرے گھر میں آ کے ٹھہرا دو جہانوں کا رسولؐ (سیّدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

جہاں سے رحمتوں کی بارشیں ہوتیں زمانے پر
وہی کوچہ محبت کا ، وہ گھر پہچان لیتا تھا (سیّدنا عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

مِصر میں زندہ ہے تیرے نام کی خوشبو ابھی
نیل کے دونوں کِناروں پر کھڑا ہے تُو ابھی (سیّدنا عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

وہ کم سن تھے مگر فولاد کی دیوار جیسے تھے
وہ لڑنے میں اکیلے لشکرِ جرار جیسے تھے (سیّدنا معاذ اور سیّدنا معوّذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

درِ خیرالبشرؐ پر وہ بشرؓ تاخیر سے آیا
بہاروں سے گلے ملنے شجر تاخیر سے آیا (سیّدنا ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

بحیثیت مجموعی انجم نیازی کی منقبت نگاری انہیں ایک جدید منقبت نگار کے طور پر ہمارے سامنے لاتی ہے۔اللہ تعالیٰ اُن کی سعیِ تخلیق کو منقبت (اور دوسری مذہبی اصناف) سے منسلک رکھے ان کے فن اور عمر میں برکت دے انہوں نے اپنی ایک ذات میں جو ایک ادارے کا کام کیا ہے اللہ اسے قبول کرے اور اس کے فیضان اور اثرات سے ہمارے نئے شاعر منقبت آمادہ ہوں (آمین)

□□□

محبتوں کی حسیں داستان، کیا کہنے
حسنؓ حسینؓ تِرے پاسبان، کیا کہنے
نبیؐ کی خاص عنایت سے تُو ہے ذوالنورین
تِرے نصیب کی اونچی اُڑان، کیا کہنے

(محمد مسعود اختر)

جہاں میں منفرد انسان تھے ابو طالبؓ
گواہ خانہ کعبہ کے ہیں در و دیوار
نہ بت پرستی کبھی کی نہ زرپرست رہے
تمام عمر محمدؐ کے سرپرست رہے
(روشن علی عشرت)

کثرت کے مقابل ہوئے بدری ہیرے
آقاؐ کی محبت میں دیا تن من وار
ایمان میں کامل ہوئے بدری ہیرے
اسلام کا حاصل ہوئے بدری ہیرے
(رشد محمود ڈوگر)

وہ عمِ احمدؐ امیر حمزہؓ دلوں کی دنیا کا حکمراں تھا
اُبھرتے سورج کا تاج پہنے سحر کی مسند پہ جلوہ گر تھا
نبیؐ کی حرمت کا تھا محافظ، خدا کے دیں کا وہ پاسباں تھا
بلندیاں جس کے پاؤں چومیں زمیں کا ایسا وہ آسماں تھا
(محمد طاہر صدیقی)

ورثے میں عطا اس کو ہوئی الفت سلمانؓ
لقمانِ اُمم اور نقیبِ شہِ عالم
لکھتا ہے قلم شوق سے یوں سیرت سلمانؓ
جز آپ کے ہے کس کا شرف حضرت سلمانؓ
(جہانداد منظر القادری)

ناموس شہِ دیں کے نگہدار ہیں عباسؓ
بیدار ہیں لشکر کے علم دار ہیں عباسؓ
ہر گام پہ آقاؐ کے وفادار ہیں عباسؓ
مولاؑ پہ فدا ہونے کو تیار ہیں عباسؓ
(سیّدہ پروین زینب سروری)

حیدرؓ کا لال، فاطمہؓ کا لاڈلا حسنؓ
عِلم و عمل میں وارثِ مولائے کائنات
سبطِ رسولؐ عقدہ کُشا رہنما حسنؓ
سیرت میں ورثہ دارِ رسولِؐ خدا حسن
(سیّد خالد حسن رضوی)

حسینیت سے جو اپنا شعور پا کے چلے
زمینِ خُلد ہے اب اُن کا فرشِ پا انداز
سفیر بن کے وہ تہذیبِ مصطفٰےؐ کے چلے
جو بے نوائی میں صحرا سے نینوا کے چلے
(تابش دہلوی)

خدا کے ہاتھ کی تحریر بن گئیں زینبؓ
کسی کتاب نے جلوہ کیا سرِ نیزہ
خطیبِ منبر تقدیر بن گئیں زینبؓ
پھر اُس کتاب کی تفسیر بن گئیں زینبؓ
(عارف امام)

ہیں نبیؐ تیرے معلّم مرے موسیٰ کاظمؒ
علم و عرفان کے منثور جواہر کو ملا
اولیا ہیں متعلّم مرے موسیٰ کاظمؒ
آپ کی شکل میں ناظم مرے موسیٰ کاظمؒ
(محمد معظم سدا معظم مدنی)

فکر و فن

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

عمرؓ تفریقِ بین الکفر و دیں کا اوّلیں مظہر
جنہیں تاریخِ عالم نے بھی مانا عدل کا پیکر
رواں ہو جائے دریا جب اسے خط میں عمرؓ لکھ دیں
کہ ہم غیروں کی منت کیوں کریں اللہ کے ہو کر
عمرؓ جس راہ سے گزرے وہاں سے ہٹ گیا شیطاں
مسلسل رعبِ فاروقی میں ہے ابلیس کا لشکر

(عزیز احسن)

میر تقی میرؔ کی منقبت نگاری

محمد طفیل احمد مصباحی

ABSTRACT: Mir Taqi Mir, often hailed as 'Khuda-e-Sukhan' is widely known for his mastery in ghazal, yet his contribution to religious poetry, especially manqabat, remains an important but underexplored facet of his work. This paper by Muhammad Tufail Ahmad Misbahi critically examines approximately fifteen to twenty devotional poems in Mir's Kulliyat, dedicated to sacred figures like Hazrat Ali (RA) and Imam Hussain (RA). Though limited in number, these compositions span hundreds of verses and reflect a rich blend of poetic craftsmanship, mystical sensibility, and emotional depth. Utilizing classical forms such as qasida, musaddas, and mukhammas, Mir's manqabat articulate profound spiritual devotion shaped by his Sufi inclinations and inclusive worldview. The study emphasizes that a deeper investigation into this genre within Mir's oeuvre could offer valuable insights into the intersection of classical Urdu poetics and Islamic devotional expression.

میر تقی میر صوفیانہ مسلک و مشرب کے حامل ایک مذہبی انسان تھے۔ ان کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا اور دل میں اللہ و رسول کی محبت جاں گزیں تھی۔ صحابۂ کرام، اہلِ بیتِ عظام، بزرگانِ دین و اولیائے کاملین سے انھیں بے پناہ عقیدت و الفت تھی۔ خصوصیت کے ساتھ دامادِ پیغمبر، فاتحِ خیبر حضرت علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ کے وہ سچے عاشق تھے۔ میر نے جس والہانہ انداز سے مولیٰ علی کی شان میں منقبت تحریر کی ہے، وہ ان کی غایتِ عقیدت اور جذبِ صادق کا واضح ثبوت ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے میرؔ کو شیعہ مذہب کا پیروکار بتایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ غالی شیعہ تھے اور نہ کٹّر سنی، بلکہ وسیع المشرب، صلحِ کل اور اولیائے کرام کے عقیدت مند تھے۔ ہاں! ان کی منقبت کے بعض اشعار ایمان سوز اور شیعیت

کے ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں حد درجہ مبالغہ، بلکہ غلو اور اغراق کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے والد محمد علی، شیخ کلیم اللہ اکبرآبادی کے مرید تھے۔ خود میر شروع سے اللہ والوں کی صحبت و رفاقت میں روز و شب گذارا کرتے اور ان کے آستانوں پر حاضری کو باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ تصوّف ان کی خمیر میں شامل تھا۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ وسیع المشرب، صلح کل اور فقیر دوست تھے۔ ان کو ابتدا سے آخر تک جب وہ اجمیر (خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمہ کے مزار کی) کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، اولیائے کرام سے عقیدت رہی ہے۔ ان کی شیعیت اور صوفیت میں تضاد نہیں، لطیف ہم آہنگی ہے۔ یہ ربط ان کی ابتدائی تربیت اور فطری دردمندی نے پیدا کی ہے، جس کی وجہ سے ان کا کوئی فطرہ عقیدہ تنگ دائرے میں محدود نہ ہو سکا۔ (میر تقی میر: حیات اور شاعری، ص: ۷۱، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی)

بہر کیف! میر کا عقیدہ جو بھی ہو، اہلِ بیت اطہار سے کمالِ عشق و عقیدت، اکابر پرستی، اولیائے کرام سے نیازمندی اور ان کی منقبت نگاری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ منقبت نگاری جو اولیائے کرام و بزگانِ دین کی تعریف و توصیف سے عبارت ہے، عشقِ حقیقی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ اللہ عز و جل، نبی کریم ﷺ اور اولیائے کرام سے جتنی زیادہ عقیدت و محبت ہوتی ہے، منقبت نگاری کا جذبہ اسی قدر پروان چڑھتا ہے۔ شروع میں منقبت نگاری صرف خاندانِ نبوت کے افراد یعنی اہلِ بیت و آئمۂ اہل بیت اور بالخصوص حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش تک محدود تھی، لیکن بعد میں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور اہلِ بیتِ اطہار کے علاوہ جملہ اولیائے کاملین و مشائخِ عظام کی تعریف و ثنا کو منقبت کہا جانے لگا۔ میرؔ نے جہاں غزل میں دنیاوی عشق کے راگ الاپے ہیں، وہیں نعت و منقبت کی شکل میں عشقِ حقیقی کے سرمدی نغمات گنگنائے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ خود کہتے ہیں کہ منقبت خوانی کے علاوہ میرے اندر اور کوئی گُن یا خوبی نہیں ہے۔

منقبت خوانی سے میری سب ہیں سُن اس سوا مجھ میں نہیں ہے کوئی گُن
ساتھ سر کے ہے علی گوئی کی دُھن مدّعی اس کان یا اس کان سُن

حیدری ہوں، حیدری ہوں، حیدری

ڈاکٹر عبد الباری آسی کے بقول: میر صاحب نے مخمّس و مسدس اور ترکیب بند کی صنف کو اپنے مذہبی معتقدات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ایک ہفت بند، ایک ترجیع بند، دس مخمّس اور تین مسدس میں صرف منقبت کہی ہے اور ایک مسدس میں نعت پاک لکھی ہے۔

(مقدمہ کلیاتِ میر، ص: ۳۸)

میرؔ کا اصل میدان غزل گوئی ومثنوی نگاری ہے۔اقلیمِ غزل کے وہ اولوالعزم شہنشاہ تھے،جس کی قلمرو میں غزل کے سارے ممکنہ اجزا اور تابناک پہلو افواج کی مانند صف باندھے کھڑے نظر آتے ہیں۔غزلیں تو غالب، مومن، ذوق، جگر، اصغر، ساحراور فیض وغیرہ نے بھی کہیں،لیکن میر سا اندازِ بیان، انفرادی اسلوب اور شاہانہ طمطراق کسی کو میسر نہ ہوسکی۔صنفِ قصیدہ میں بھی انھیں کمال حاصل تھا،لیکن سوداؔ ومومنؔ اس معاملے میں ان سے آگے ہیں۔قصیدہ کے معنوی ابعاد میں نعت ومنقبت بھی شامل و داخل ہیں۔قلی قطب شاہ اور سودا کی طرح میر نے بھی منقبت نگاری میں اپنے نادر افکار وخیالات کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں، جس میں معانی کی تہہ داری، جوش و ولولہ، جذبات کا والہانہ پن، ربودگی و شیفتگی، لسانی بانکپن اور فکر وفن کی چاشنی موجود ہے۔کلیاتِ میرؔ میں میر نے نعت ومنقبت کا ایک مستقل باب ہی باندھا ہے اور مسدس کی شکل میں ایک نعتیہ کلام پیش کرنے کے بعد امیر المومنین، دامادِ مصطفیٰ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شان میں منقبت کے تقریباً ساڑھے چار سو اشعار اور سید الشہدا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی توصیف میں باوَن اشعار کہے ہیں۔ دو بیتی اشعار کے علاوہ مسدس اور مخمس منقبتی کلام کی ایک کثیر تعداد کلیات میں موجود ہے،جس کی مجموعی تعداد ایک ہزار اشعار تک پہنچتی ہے۔(تفصیلی معلومات کے لیے کلیاتِ میر،ص ۷۲۲۔۷۵۶،مطبوعہ:منشی نول کشور،لکھنؤ کا مطالعہ کریں۔)

میر کا دور اختلاف وانتشار، فتنہ وفساد اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ دیگر ابنائے زمانہ کے ساتھ میر بھی مشکلات ومصائب کی چکی میں پس رہے تھے، ایسے ہوش ربا وقت میں وہ اپنے آقا ومولیٰ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درد وکرب میں ڈوب کر اور سراپا التجا بن کر اس طرح استغاثہ وفریاد کرتے ہیں:

جرم کی ہو شرمگینی یا رسولؐ — اور خاطر کی حزینی یا رسولؐ
کھینچوں ہوں نقصانِ دینی یا رسولؐ — تیری رحمت ہے یقینی یا رسولؐ
رحمت للعالمینی یا رسولؐ — ہم شفیع المذنبینی یا رسولؐ
لطف تیرا عام ہے کر مرحمت — ہے کرم سے تیرے چشمِ مکرمت
مجرم، عاجز ہوں کر ٹک تقویت — تو ہے حاکم تجھ سے ہے یہ مسئلے
رحمت للعالمینی یا رسولؐ — ہم شفیع المذنبینی یا رسولؐ

حمد،نعت اور منقبت کسی بھی ہیئت میں کہی جاسکتی ہے،اس میں ہیئت کی تخصیص نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو میں حمد اور نعت و منقبت کبھی غزل و قصیدہ کے فارم میں اور کبھی مثنوی وغیرہ کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔قصیدہ ہیئت کے اعتبار سے غزل سے ملتی جلتی صنف ہے،جس میں بحر

شروع سے اخیر تک ایک ہی ہوتی ہے۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ مگر قصیدے میں ردیف لازمی نہیں ہے۔ قصیدے کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تمہیدیہ اور دوسرا خطابیہ۔ وہ قصیدہ جس میں ممدوح کی تعریف سے پہلے تمہید کے طور پر تشبیب اور گریز ہو، وہ تمہیدیہ قصیدہ کہلاتا ہے۔ اور قصیدہ خطابیہ اس قصیدہ کو کہتے ہیں جس میں تشبیب اور گریز نہیں ہوتے بلکہ قصیدے کا آغاز براہِ راست ممدوح کی تعریف سے ہوتا ہے۔ قصیدے کو مضمون کے اعتبار سے چار حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مدحیہ، ہجویہ، وعظیہ اور بیانیہ۔ قصیدے کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات درمیان میں بھی مطلعِ ثانی و مطلعِ ثالث لائے جاتے ہیں۔ میر تقی میر کی منقبت نگاری، قصیدہ کی ہیئت میں ہے اور اس میں قصیدہ کے اجزا و عناصر مثلاً: تشبیب، گریز، مدح، خاتمہ و دعا، پُرشکوہ الفاظ، جوشیلا اندازِ بیان، خیالات کی بلندی، خوبیِ تشبیہ، لطفِ استعارہ، مطلع کی تکرار وغیرہ موجود ہیں۔ کلیاتِ میر میں ص: ۲۲۷ سے قصیدۂ منقبت (منقبتی قصیدہ) شروع ہوتا ہے اور ص: ۵۶۷ پر ختم ہوتا ہے۔ کل ۳۵ / صفحات پر مشتمل میر کی یہ منقبت، اردو منقبت نگاری کی تاریخ میں بڑی اہمیت و معنویت اور سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد اردو شاعری میں اس صنف کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔

قصیدہ در منقبتِ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

حضرت علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ کی منقبت شروع کرنے سے قبل قصیدے کے اسلوب کے مطابق میر تشبیب کے اشعار لاتے ہیں اور اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مطلعِ اوّل میں نو اشعار، مطلعِ ثانی میں سولہ، مطلعِ ثالث میں بیس اور مطلعِ رابع میں پندرہ اشعار بڑی سلاست و روانی اور صفائی و برجستگی کے ساتھ کہہ ڈالتے ہیں، جنہیں پڑھنے کے بعد الفاظ و معانی کا ایک جہاں نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔ ملاحظہ کریں :

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروزِ حمل — رنگِ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل
وقت وہ ہے کہ زبس شوق سے چشمِ بلبل — خوبیِ دلکشِ گل دیکھنے کو ہو احول
جوشِ گل یہ ہے جہاں تک ہے کرے کام نظر — لالہ و نرگس و گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطفِ روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبہے میں ہوں — سبزہ غلطاں ہے لبِ جُو پہ کہ خوابِ مخمل
سیر کر تازگی و خرّمی و شادابی! — خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کونپل

(کلیاتِ میر، ص: ۲۲۷)

مطلعِ اول سے مطلعِ ثانی تک (جو ۲۴ / اشعار پر مشتمل ہے) تشبیب کا سلسلہ چلتا ہے اور اس کے بعد 'گریز' اور 'مدح' کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے:

اے کہ اک تو ہی ہوا عالمِ اسرارِ ازل — اے کہ سوجان سے عاشق ہے ترا حُسنِ عمل
تیری وہ ذاتِ مقدّس ہے کہ لیتے ہوئے نام — منہ سے ناخواستہ بھی صلِّ علیٰ جائے نکل
دور از بسکہ کھنچا عرش سے رتبہ تیرا — حرف تیرا ہے، ترے شیعوں کو وحیِ مُنزَل
فرش ہونا ترے زائر کا سعادت تھی ولے — کیا کرے چادرِ مہتاب کہ تھی مستعمل
تو سراپا ہے خرد، عالمِ اسرارِ الہ! — مانتے جس کو گئے دہر کے کامل، اکمل
آخر اب آ کے ترے درس میں نکتہ یہ کھلا — ناقصِ محض چلا جائے تھا عقلِ اوّل
جی میں گذرے بھی تو نکلے ہے ترے درس کے پیچ — معنیِ تازہ سے بدلا ہوا لفظِ مہمل
رفعِ بدعت پہ جب آوے تری طبعِ اقدس — کیا عجب شعلۂ آواز سے جل جا نرسل
لقمۂ ظلم نہیں بچتا عدالت میں تری — باز نگلی ہوئی چڑیا کے تئیں دے ہے اُگل
حالتِ نزع میں گر نام زباں پر ہو ترا — یک رمق جان، حیاتِ ابدی سے ہو بدل

(ایضاً؛ص: ۲۳-۷)

بہتّر اشعار (۷۲) پر مشتمل یہ پہلا منقبتی قصیدہ تشبیب و گریز اور مدح کے بعد مندرجہ ذیل دعا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

آبلے جیسے ستارے ہیں مرے قلب کے پیچ — بسکہ اس چرخِ سیہ رو سے رہا ہوں میں جل
آج تجھ نیّرِ اعظم کی خلافت کا ہے روز — داد دے میری کہ دیکھوں میں اسے مستاصل
صاف ہو زنگِ دلِ میر کہ احباب میں ہے — واسطے تیرے مخالف کی ہیں تیغیں صیقل

۵۳ / اشعار پر مشتمل دوسرے منقبتی قصیدہ میں تین مطلع اور پانچ قطعات ہیں۔ بخوفِ طوالت تشبیب و گریز کے اشعار سے صرف نظر ہوئے ہم صرف مدحیہ اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پہلے کی طرح یہ قصیدہ بھی حسنِ الفاظ و معانی اور فتادگی و ربودگی کی ایک بہترین مثال ہے۔

لائق تری صفت کے صفت میری ہے محال — آشفتہ طبع، شاعرِ خستہ کی کیا مجال
وہ تو درِ مدینۂ علمِ علیم ہے! — جس شخص کو نہ آوے الف، بے، تے، دال، ذال
آوے ترے جنابِ مقدّس میں ایک دم — کرتے ہیں واں تو وقف سبھی طرز کے مقال
لیتے ہیں تیرے در سے گدا پوست تختِ فقر — پاتے ہیں تیرے در سے شہا مکنت و جلال

جب تک جیوں میں دل میں مرے آرزو ہے یہ ہوں سر سے تیرے زائرِ درگہہ کا پائمال
پھر بعدِ مرگ حوض پہ کوثر کے یا علی جاگہ مری ہو حشر کی تیری صفِ نعال
جب تک جیے گا محوِ ثنا ہی رہے گا میر ہے تیری منقبت سے بہت اس کو اشتغال

تیسرا قصیدۂ منقبت ۴۲ / اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں بھی حسبِ سابق تین مطلعے اور درمیان میں تین چار چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ بڑے شاہانہ ادبی کرّ وفر کے ساتھ قصیدے کا آغاز ہوتا ہے۔ میر صاحب تشبیب میں اپنا شاعرانہ جوہر و ساحرانہ طرزِ بیان دکھانے کے بعد مدحِ مولیٰ علیؑ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں :

اے طبع اتنی ہرزہ درائی جرس کی طرز اس گفتگو کا فائدہ، کہہ حاصلِ کلام
یعنی امیرِ شاہِ نجف کی صفت پر آ وہ شاہ جس پہ سارے کمالات ہیں تمام
شاہا ترے گدا کا ہے مشہور احتشام شاہانِ سرفراز ہیں سب اس کے پائے نام
اے بعدِ فوتِ ختمِ رسل، صاحب اہتمام اے آخریں امام و سزاوارِ احترام
تو ہے کہ تجھ کو ذاتِ خدا سے ہے ربطِ خاص تو ہے کہ ساری خلق پہ تیرا ہے فیضِ عام
تو ہے کہ تیرے مہر کے سائے میں روزِ حشر محفوظ آفتابِ قیامت سے ہوں انام!
(کلیاتِ میر،ص:۷۲۹)

قصیدہ در مدحِ امام حسین رضی اللہ عنہ

کلیاتِ میر میں چوتھا قصیدۂ منقبت سید الشہدا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی مدح وثنا میں ہے، جو ۵۲ / اشعار پر مشتمل ہے۔میر صاحب نے اس منقبت میں امام عالی مقام کی شایانِ شان توصیف، ان کی ہمت وشجاعت، دردناک شہادت، نیز ان کی خاکِ درکو کحلِ جواہر الابصار اور روضۂ پاک سے نکلنے والی شعاؤں کو شبِ تاریک کے لیے موجبِ ذلت گردانا ہے۔

امام ہر دو جہاں جس کے آستانے کی خاک رکھے ہے رتبۂ کحلِ جواہر الابصار
زہے وہ روضہ جہاں دیدۂ ملک ہیں فرش قدم کو رکھتے ہوئے ان پہ آتے ہیں زوّار
شعاع روضے کے قبے کی ہوگی عالم گیر پھرے گا سایۂ شب اب جہاں میں ہوتا خوار

پانچویں اور چھٹی منقبت مسدّس کی شکل میں ہے، جو بارہ سے پندرہ اشعار کو محیط ہے۔مسدّس چھ مصرعوں کے ایک بند پر مشتمل شاعری کو کہتے ہیں۔اس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔ پانچواں اور چھٹا مصرع ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔طویل اور مسلسل منظومات کے لیے اردو شاعری میں اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔خواجہ الطاف حسین حالی کی

مسدس حالی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ پانچویں منقبت اگر چہ زبان و بیان کے لحاظ سے شاعری کا عمدہ نمونہ ہے، لیکن اس بند کا چھٹا مصرع شرعی نقطۂ نظر سے سخت قابلِ گرفت اور معاذ اللہ ایمان سوز ہے۔ الامان و الحفیظ۔ چھٹی منقبت کے چند اشعار سپردِ قرطاس ہیں :

کیا لکھے اعجاز تیرے خامۂ جادو نگار	تو وہی ہے ایک لیکن نام تیرے ہیں ہزار
وقت جب ہوتا ہے تنگ اے قدرتِ پروردگار	نام لے لے کر ترے کہتا ہے ہر اک یوں پکار
یا علی، یا ایلیا، یا بوالحسن، یا بوتراب	حلّ مشکل سرورِ دیں، شافعِ یوم الحساب
حاجتِ اہلِ جہاں تجھ سے ہے وابستہ مدام	سہل ہیں یاں مشکلیں، آسان ہیں دشوار کام
عارف و عامی سبھوں کا ہے وظیفہ تیرا نام	زیرِ لب ہر اک کے رہتا ہے یہی ہر صبح و شام
یا علی، یا ایلیا، یا بوالحسن، یا بوتراب	حلِّ مشکل، سرورِ دیں، شافعِ یوم الحساب

(کلیاتِ میر، ص: ۷۳۶)

نوٹ: 'سرورِ دیں' اور 'شافعِ یوم الحساب' یہ دونوں لقب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں۔ لیکن میر صاحب نے حضرت علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال کیا ہے، جو شرعاً ماخوذ و غیر محمود ہے۔

حضرت مولیٰ علی کی شان میں ساتویں منقبت، مخمّس (پانچ مصرعوں پر مشتمل) کے انداز میں ہے اور ۱۹ / بندوں (تقریباً ستاون اشعار) پر مشتمل ہے۔ یہ منقبت عشق و عقیدت سے لبریز اور زبان و بیان کے لحاظ سے شہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

ہادی علی، رفیق علی، رہنما علی	یاور علی، ممد علی، آشنا علی
مرشد علی، کفیل علی، پیشوا علی	مقصد علی، مراد علی، مدّعا علی
جو کچھ کہو سو اپنے تو ہاں مرتضیٰ علی	نورِ یقیں علی سے ہمیں اقتباس ہے
ایمان کی علی کی ولا پر اساس ہے	یوم التّناد میں بھی علی ہی کی آس ہے
بیگاہ و گاہ "نادِ علیؑ" اپنے پاس ہے	قبلہ علی، امام علی، مقتدا علی
اپنی بساط تو ہے علی ہے، وہی علیم	کس طور جیتے رہتے جو ہوتا نہ وہ کریم
دیکھیں ہیں اس کی اُور جو ہوتے ہیں ہم سقیم	یاں کا وہی ہے شافی و کافی وہی حکیم

عارض ہو، کوئی درد، ہمیں ہے دوا علی

(ایضاً، ص: ۷۳۸)

میر کی منقبت نگاری (جو قصیدہ کی شکل و ہیئت میں ہے) میں قصیدۂ تمہیدیہ و قصیدۂ خطابیہ دونوں

کے نمونے موجود ہیں۔ بعض مناقب تشبیہ و گریز کے مراحل سے گزرنے کے بعد مدح و ثنا کے سانچے میں ڈھلی ہے اور بعض مناقب میں میر نے خطابیہ انداز اپناتے ہوئے براہِ راست اپنے ممدوح کی تعریف سے کلام کی ابتدا کی ہے اور رنج و کرب میں ڈوب کر حضرت مولیٰ علی مشکل کشا رضی اللہ عنہ مدد مانگی ہے۔ ساتویں منقبت کے علاوہ مندرجہ ذیل منقبت بھی 'قصیدہ خطابیہ' کی مثال ہے۔

یا علی شاہِ اولیا ہے تو   محرمِ رازِ 'اِنَّما' ہے تو
زورِ بازوئے مصطفیٰ ہے تو   مظہرِ قدرتِ خدا ہے تو
علم کس کو ہے یہ کہ کیا ہے تو   اس زمانے میں آہ دکھ ہے عظیم
ہے مری جان پر عذابِ الیم   مستحقِ کرم ہوں میں، تو کریم
ملتفت ہو بہت ہے حال سقیم   میرے ہر درد کی دوا ہے تو
میر کو کب تلک یہ رنج و غم   اپنے اندوہ گیں کو کر خرم
منبسط ہے ترا سحابِ کرم   یعنی سائے میں ہے ترے عالم
سارے عالم میں چھا رہا ہے تو

(ایضاً، ص: ۷۴۴)

قدر کو میری بہت ہے برتری   کب مری خورشید سے ہو ہمسری
حکمِ بُز رکھّے ہے یاں شیرِ نری   کر مخالف سوچ کر ٹک اژدری
حیدری ہوں، حیدری ہوں حیدری   منقبت خوانی سے میری سب ہیں سُن
اس سوا مجھ میں نہیں ہے کوئی گُن   ساتھ سر کے ہے 'علی گوئی' کی دُھن
مدّعی اس کان یا اس کان سُن   حیدری ہوں، حیدری ہوں، حیدری
ہے ولائے اہلِ بیت اپنا شعار   جانے ہے اس کے تئیں سارا دیار
زیرِ لب کہتا ہوں میں پر اب کی بار   تو سنے جب میں کہوں سب میں پکار
حیدری ہوں، حیدری ہوں، حیدری

ان مناقب کے علاوہ متعدد منقبتیں مخمس، مسدس، ترجیع بند، ہفت بند، مخمس ترجیع بند، مسدس ترجیع بند اور سلام کی شکل میں کلیاتِ میر میں موجود ہیں۔ عروض کی اصطلاح میں ترجیع بند کہتے ہیں: شاعر کا چند ایسے بند، جو بحر میں موافق اور قافیے میں مختلف ہوں، اس طرح نظم کرنا کہ ایک ہی بیت ہر بند کے آخر میں آئے اور ہر بند کے آخری شعر کے مضمون سے موافقت رکھے۔

مندرجہ ذیل شان دار منقبت میر کی فلک پیما فکر کا نادر مرقع ہے۔

السّلام اے دینِ حق کے حاکمِ مسند نشیں   السّلام اے راز دار و داورِ جاں آفریں!

یہ شرافت، یہ سیادت، یہ تقدّس، یہ کمال
یہ تبحر، یہ ترفّع، یہ تفوّق ہے کہیں
تو ولی ہے، تو جلی ہے، تو علی ہے، تو ہے وہ
جس سے بالا تر تصور کیجیے تو کچھ نہیں
کیا تعقل، کیا تحمل، کیا تبحر، کیا وقار
طفلِ مکتب درس گہ کا تیرے عقلِ اوّلیں
سیدِ بر حق، شریف النفس، فخرِ روز گار
باعثِ عز و سپہر و موجبِ وقرِ زمیں
پیشوائے پیشوایاں، سجدہ گاہِ موموناں
زینتِ بطحا و یثرب، رونقِ اسلام و دیں
مقصدِ دل آشنایاں، مدعائے عاشقاں
آرزوئے اہلِ عرفاں، مطلبِ اہلِ یقیں
مظہرِ صدہا عجائب، مصدرِ لطف و کرم
زیبِ منبر، جانشینِ رحمۃ للعالمیں
وارثِ دیں، عارف و عادل، شفیعِ روزِ حشر
حافظِ ناموسِ دیں و حامیِ شرعِ متیں

(کلیاتِ میر،ص:۵۶۷)

میر تقی میر کی منقبت نگاری کا سب سے اہم اور قابلِ ذکر پہلو خلوص وعقیدت، جذبات کی شدت، والہانہ انداز، مصوری اور پیکر تراشی ہے، جس میں زبان کا حسن بھی ہے اور بیان کی عمدگی بھی۔ فنی رچاؤ بھی ہے اور فن کی چاشنی بھی۔ منقبت نگاری، ان کی تہہ دار شخصیت اور نمایاں فکر وفن کا ایک تابناک پہلو ہے، جسے کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف نے فنی لحاظ سے صنفِ منقبت کو قابلِ قدر اور جمالیاتی رخ سے ہمکنار کرنے کے لیے اسے مختلف شعری اسلوب میں ڈھالنے کی سعیِ مشکور کی ہے اور اس میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی منقبت کی مجموعی تعداد پندرہ یا اس سے متجاوز ہے، جو ایک ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ جن شعرا نے کسی خاص صنف میں ایک ہزار یا اس سے زائد اشعار موزوں کیے ہوں، اس جہت سے ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ غزل گوئی کے ساتھ میر کی منقبت نگاری کا تذکرہ بھی کی جائے اور اس کی ادبی وفنی قدر و قیمت متعین کی جائے۔

□□□

کیوں شرف کی ہو کوئی بھی حد سیّدہؓ
آپ کے سب سے اعلیٰ ہیں جدّ سیّدہؓ
ہوں درود آپ پر، ساری اولاد پر
بے حساب و شمار و عدد سیّدہؓ
والدِ محترم ہیں حبیبِ خدا
اور شوہر خدا کے اسد سیّدہؓ
مبتلائے غمِ زیست کی ہے صدا
المدد سیّدہؓ المدد سیّدہ
پلڑا عاجز کا محشر میں بھاری ہوا
آپ سے مل گئی جب رسد سیّدہ

(سیّد اعجاز حسین عاجز)

اقبال درحضورِ خلفائے راشدین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

ڈاکٹر نوید احمد گل/ مائلہ بتول

ABSTRACT: In this article, Persian and Urdu poetry of Allama Iqbal (1877ad-1938ad), the wisdom beacon of 20th century, in praise of the Khulafa-i-Rashiddeen is analyzed. In Iqbal's poetry panegyric (Manqabat) does not appear in its traditional form, but Iqbal wants to see the attributes of Khulafa-i-Rashiddeen in Muslims of today. In this way, Iqbal enlarges the poetic possibilities and boundaries of this genre. This study analyses "Manqabat Nigari" of Allama Iqbal about our five Khulafa-i-Rashiddeen thematically and stylistically.

"منقبت مذہبی شاعری کی (موضوع کے لحاظ سے) اصطلاح ہے۔منقبت اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں مذہبی عقیدے کی بنا پر کسی اسلامی ہیرو کی تعریف وتوصیف کی جائے۔عموماً اصحاب رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور آلِ رسول سلام اللہ علیہم کی مدح میں منقبتیں لکھی گئیں۔منقبت کے لیے کوئی خاص ترکیبی سانچا (ہیئت) مخصوص نہیں۔مسدس، غزل، مثنوی کسی بھی شکل میں منقبت لکھی جا سکتی ہے۔"(انور جمال،''ادبی اصطلاحات''،ص 181)

علامہ اقبال کے اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کی شان میں کہے گئے اشعار پر بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام کتابوں ("علامہ اقبال اور اہلِ بیت" از تفاخر گوندل) اور مضامین کی صورت میں منظر عام پر آ چکا ہے مگر علامہ اقبال کی خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بارگاہ میں منقبت نگاری پر اب تک کوئی مضمون بآسانی مستحضر نہیں ہے۔پیش نظر مضمون "اقبال درحضورِ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم" میں علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلیات کو بنیادی ماخذ قرار دیتے ہوئے یہاں علامہ کی خلفائے راشدین کی بارگاہ میں شاعرانہ حاضری کو یکجا کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔فارسی کلام کا اردو ترجمہ (از میاں عبدالرشید، روز نامہ نوائے وقت میں نورِ بصیرت والے) بھی پیش کیا گیا ہے نیز ہر شعر

کے فنی نکات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلے اردو کلام کے حوالے سے علامہ اقبال کی خلفائے راشدین کی شان میں منقبت نگاری پر بات کی جاتی ہے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (634ء-573ء)

غزوہ تبوک (۹ھ) کے موقع پر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر کا تمام سامان لا کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیتے ہیں تو اس موقع کی عکاسی کے لیے علامہ یہ کہتے ہیں حضرتِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لاتے ہیں:

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا — جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت — ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
مِلکِ یمین و درہم و دینار و رَخت وجنس — اسپ ِ قمر سُم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضور چاہیے فکرِ عیال بھی — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس — صِدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

(اقبال،''کلیاتِ اقبال (اردو)''، (پاکستان، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء بارِ ہفتم) ص۲۳۶-۲۳۷۔ نوٹ: شاملِ مضمون اُردو کلام اسی ایک کتاب سے لیا گیا ہے لہٰذا آئندہ صرف صفحہ نمبر درج کیا جائے گا۔)

یہاں حضرت صدیق اکبر کو علامہ نے رفیقِ نبوت، بنائے عشق ومحبت، رازدارِ عشق ومحبت، مردِ وفا سرشت جیسے القابات دیے ہیں جو بجائے خود استعارہ بھی ہیں۔ ان اشعار میں صنعتِ مراعات النظیر کا التزام کیا گیا ہے اور واقعہ کی وجہ سے تلمیح بھی شامل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (644ء583ء)

علامہ غزوۂ تبوک کے واقعے کا ذکر کرتے ہیں جب فاروقِ اعظم نے اپنے گھر کا آدھا سامان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور کہتے ہیں:

ایک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا — دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمر اٹھے — اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرضکہ مال رسولِؐ امیں کے پاس — اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ — مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق و ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
(ص۲۳۶)

فنی نکتہ نظر سے ان اشعار میں اضافتِ استعاری ہے، رنگِ تلمیح ہے اور علامتی اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔

مولا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم (۶۰۱ء-۶۶۱ء)

خلیفۂ چہارم حضر مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شان میں علامہ اقبال یوں منقبت پیش کرتے ہیں کہ اقبال کی منقبت میں مجموعی رنگ غالب نظر آتا ہے ایک شعر میں ایک سے زائد ہستیوں کے مناقب بیان کیے گئے ہیں اور بعض اشعار میں اقبال کی منقبت، دعا اور استغاثہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس طرح اقبال منقبت نگاری کی حدود میں مزید اضافے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

میں علامہ نے اپنے اردو کلام میں حضرتِ علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی شان کوئی مسلسل اور روایتی منقبت نہیں کہی، جا بجا ہے مگر جدا جدا ہے مثلاً:

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسدُ اللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری (ص۲۸۰)

یوں وہ ہر دور کی مرحبی اور عنتری کے خلاف فطرتِ اسد اللّٰہی کی فعالیت کا تذکرہ کرتے ہیں جو در حقیقت مولا علیکرم اللہ وجہہ الکریم ہی کی شان کا بالواسطہ بیان ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کی یہ دو بیتیاں بھی ملاحظہ ہوں:

جمالِ عشق و مستی نَے نوازی جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی (ص۴۰۸)

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق (ص۴۱۲)

ان اشعار میں مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو عشق کا مظہرِ کامل قرار دیا گیا ہے غزوہ خیبر میں مولائے کائنات کرم اللہ وجہہ الکریم کی حربی کامیابی مسلّم ہے مگر ان کا یہ کارنامہ عشقِ الٰہی کی جانثاری کی زندہ مثال ہے۔ ان اشعار میں علامہ عشق کو مختلف جگہوں اور شخصیات سے بالترتیب تمثیل و تجسیم دیتے ہیں نیز استعارے بھی موجود ہیں اور تلمیحات بھی مستعمل ہیں۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر
(ص۳۴۹)

اس دوبیتی میں دعائیہ منقبت پیش کی گئی ہے۔ یہاں ''مرکزِ مہر وفا''، ''نانِ جویں'' اور بالخصوص ''بازوئے حیدر'' قابلِ غور تراکیب ہیں کیوں کہ ان میں بیک وقت تلمیح و استعارہ کے ساتھ ساتھ مجازِ مرسل بھی اپنے کمال پر ہے۔ اسی خیال کو ایک اور جگہ علامہ نے یوں بیان کیا ہے:

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؓ (ص۲۸۰)

اس کے علاوہ علامہ کے پورے اردو کلام میں مولا علی کرم اللہ وجہ الکریم کی سیرتِ مبارکہ کے حوالے جابجا دکھائی دیتے ہیں اور علامہ اکثر ان کرم اللہ وجہ الکریم سے اپنی نسبت جوڑتے نظر آتے ہیں، یہ بھی ایک قسم کا رنگِ منقبت ہی ہے:

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین وطن اس زمانے میں کوئی حیدرِؓ کرار بھی ہے؟
(ص۳۹۲)

یا عقل کی روباہی یا عشق یداللٰہی یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ
(ص۳۹۴)

یا عقل کی روباہی یا عشق یداللٰہی یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ
(ص۳۹۴)

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی ترے نصیب فلاطوں کی تیزئ ادراک
(ص۶۳۵)

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی بازو ہے قوی جس کا ، وہ عشقِ یداللٰہی
(ص۶۸۶)

ان تمام اشعار میں ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان سب میں سیرتِ مولا علی کرم اللہ وجہ الکریم کو بطور حوالہ اور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں واقعات کے تذکرے سے جہاں صنعتِ تلمیح در آتی ہے وہیں استعاراتی تراکیب کا التزام بھی اقبال کا خاصا قرار دیا جاسکتا ہے۔

خلیفۂ سوم حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں ایسا کوئی باقاعدہ شعری نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا جسے باقاعدہ منقبت کے زمرے میں شمار کیا جا سکے۔ بہرحال "جوابِ شکوہ" کے اس ایک مصرع کی ایک ترکیب میں ((حیدری فقر ہے نَے دولتِ

عثمانیؓ ہے))(ایضاً،ص ۲۳۲) میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر موجود ہے جبکہ خلیفۂ پنجم حضرت امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کے متعلق اردو کلام میں کوئی شعر نہیں مل سکا۔

البتہ علامہ کے اردو اور فارسی کلام میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں ایک سے زائد صحابہؓ کی شانِ اقدس بیک وقت بیان ہوئی ہے مثلاً:

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے   دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے (ص ۴۵۲)

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے   وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ ابوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
(ص ۳۰۱)

علاوہ ازیں تطبیق المطالب سے کام لیا جائے تو ''جوابِ شکوہ'' ہی میں ایک بند ایسا بھی موجود ہے جس سے چہار خلفائے راشدین کی شان اخذ ہوتی ہے:

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک   شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
عدل اس کا تھا قوی لوثِ مراعات سے پاک   تھا شجاعت میں وہ اک ہستیٔ فوق الادراک
خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود   خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود
(ص ۲۳۲)

اس بند میں بالترتیب چہاروں اصحاب کی صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس قبیل کے اشعار میں خالص اسلامی تاریخ پر مشتمل تلمیحیں شامل ہیں جن کی تفہیم کے لیے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نہیں بلکہ سیرتِ صحابہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطالعہ کی بھی اشد ضرورت ہے۔''زورِ حیدر''، ''فقرِ بوذر''، ''صدقِ سلمانی''، ''دلِ مرتضیٰ'' اور ''سوزِ صدیق'' کا تڑپنے پھڑکنے کے ساتھ ذکر کرنا، سب کا سب دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے کیوں کہ ان بظاہر سادہ سی نظر آنے والی تراکیب میں مذکورہ اصحاب کی سیرتِ مبارکہ کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح فارسی حصہ میں بھی ایسے اشعار شامل ہیں:

سروری در دینِ ما خدمت گری است
عدلِ فاروقیؓ و فقرِ حیدریؓ است

(اقبال، ''کلیاتِ اقبال (فارسی)''، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن)،ص ۱۹۰۔نوٹ: اس مضمون میں شامل فارسی کلام اسی کتاب سے لیا گیا ہے لہٰذا آئندہ صرف صفحہ نمبر دیا جائے گا۔)

(ہمارے دین میں پادشاہی خدمت گری ہے، یہ فاروقی عدل اور حیدری فقر سے عبارت ہے۔)

(میاں عبدالرشید، ''ترجمہ کلیاتِ اقبال (فارسی)''، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۹۹۔ نوٹ: فارسی کلام کا اردو ترجمہ اسی کتاب سے منقول ہے لہٰذا آئندہ صرف صفحہ نمبر دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔)

علامہ اس شعر میں دو خلفائے راشدین کی شان بیان فرما رہے ہیں۔ کسی بھی ریاست کی بادشاہت یا خلافت کا معنی درحقیقت اس کے عوام کی خدمت ہوتا ہے اور حضرتِ عمرِ فاروقؓ کا دورِ عدل وانصاف کی مثال بےنظیر ہے اور مولائے کائناتؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایسا فقر اختیار کیا کہ گھر کی حالت پہلے جیسی ہی رکھی یتیموں کی کفالت فرمائی، بیت المال کا مال فقط عوام ہی پر خرچ ہوا۔

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرہ ٔ عشقِ نبی از حق طلب (ص ۱۹۰)

(اللہ تعالیٰ سے حضرت صدیقؓ اور حضرت علیؓ کا سوز طلب کر، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق کا ذرہ مانگ۔) (اسی عشق سے یہ سوز وساز حاصل ہوگا) (ص ۳۹۹)

جس طرح خلفائے راشدین اپنی حیاتِ ظاہری میں ساتھ ساتھ تھے اسی طرح اقبال کے کلامِ جاوید میں بھی ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال چوں کہ تعریفِ محض کو ناپسند کرتے ہیں اور تبلیغ طنز آمیز سے بھی گریز کرتے ہیں اس وجہ سے وہ کسی ہستی کو اسوہ قرار دے کر اس کی تقلید کی تلقین کرتے ہیں اور شبستانِ حیات کی ظلمت کو دور کرنے کے لیے خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سیرت سے تنویر دریوزہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہاں سے اقبال کے فارسی کلام کے حوالے سے بات کی جاتی ہے جہاں ان کی منقبت نگاری زیادہ شرف یافتہ نظر آتی ہے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (634ء-573ء)

اقبال کا انداز روایتی منقبت نگاری والا نہیں ہے۔ کسی شخصیت کو دوسرے انسانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ کے طور پر پیش کرنا بھی اس کی تعریف ہی کا ایک انداز ہے۔ اقبال شیوۂ صدیقی کو موجودہ مسلمانوں کے لیے عملی اور کامل نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے کلامِ فارسی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں کہے گئے اشعار کا ترجمہ اور جائزہ پیش خدمت ہے:

ای کہ در زندانِ غم باشی اسیر
این سبق صدیقؓ را صَدیقؓ کرد
از نبیؐ تعلیمِ ''لَا تَحزَن'' بگیر
سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد (۹۵)

(اے وہ شخص جو غم کے قید خانے میں اسیر ہے جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد ''لاتحزن''، غم نہ کھا (9:40) سے سبق حاصل کر۔ اس سبق نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صدیق بنا دیا اور وہ حق الیقین

کی مے سے سرمست ہو گئے۔)(ص 217)

یہاں علامہ اقبال صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آیہ''لاتحزن'' کا مصداق قرار دیتے ہیں جنھوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے براہ راست عملی تعلیم پائی کہ شدت غم کی کیفیت میں بھی ''لاتحزن'' کا مصداق کیسے بنا جاتا ہے؟ ''اسیرِ زندانِ غم'' اضافتِ استعاری ہے۔ لاتحزن حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف تلمیح ہے دوسرے شعر کے مصرعِ اولی میں تجنیس مستعمل ہے۔حرفِ''ق'' کی تکرار بھی اچھا صوتی تاثر قائم کررہی ہے۔ اقبال، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ایک اور جگہ اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

من شبی صدیقؓ را دیدم بخواب
گل ز خاکِ راہِ او چیدم بخواب (ص۱۵۶)

(میں نے ایک رات سیدنا صدیقِ اکبرؓ کو خواب میں دیکھا اور ان کے راستے کی خاک سے پھول چنے)۔(ص ۳۴۱)(''از خاکِ راہ گُل چیدن'' کا محاورہ مبالغہ میں لپٹی نمناک عقیدتوں کا پتا دیتا ہے۔)

آن اَمَنَّ النَّاس بر مولای ما
آن کلیمِ اوّلِ سینای ما (ص۱۵۶)

(وہ جن کے احسانات ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر سب لوگوں سے زیادہ تھے وہ جو ہمارے طورِ سینا (اسلام کا نورِ ہدایت) کے پہلے کلیم تھے۔(ص ۳۴۱) (اقبال نے یہاں شہرِ مدینہ کو وادیِ سینا اور حضرتِ صدیقِ اکبرؓ کو کلیمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قرار دے کر صنعتِ تلمیح اور استعارے کا حق ادا کردیا ہے۔)

ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر (ص۱۵۶)

(ان کی ہمت و کوشش نے ملت کی کھیتی کے لیے ابر کا کام کیا، وہ جو اسلام، غارِ ثور اور غزوۂ بدر اور اب قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ دوسرے ہیں۔(ص ۳۴۱)(قرآنی تلمیح، تشبیہ اور اضافتِ تشبیہی کے ساتھ ساتھ''رائے'' صامت کی تکرار نے موضوع کو بڑا پُر وقار بنا دیا ہے۔)

گفتمش ای خاصۂ خاصانِ عشق
عشقِ تو سر مطلعِ دیوانِ عشق (ص۱۵۶)

(میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا، اے جنابِ صدیقِ اکبرؓ، اے خاصۂ خاصانِ عشق، آپ کا عشق تو ہمارے لیے دیوانِ عشق کا مطلع ہے۔(ص ۳۴۱)(یہاں جنابِ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ اپنے شایانِ شان استعاروں میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔)

پختہ از دستت اساسِ کارِ ما
چارہ ی فرما پئی آزارِ ما   (ص۱۵۶)

(ہمارے کارِعشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بنیاد آپ کے ہاتھوں سے پختہ ہوئی لہٰذا ہمارے دکھ کا کوئی علاج تجویز فرمایئے۔(ص۳۴۱)(مجازِ مرسل اور استعارہ نے استغاثہ کو بڑا دردمندانہ بنا دیا ہے۔)

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر   (ص101)

(اگر تو میری بات کی تحقیق کرے اور اگر تو سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھ سے دیکھے۔)(ص ۲۲۹)(مجازِ مرسل کے رنگ میں صلائے عام ہے۔)

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ   (ص101)

(تو نبی اکرم قلب وجگر کی قوت بن جاتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب بن جاتے ہیں۔)(ص ۲۲۹)(حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ صرف مرجعِ دعا بلکہ مرکزِ دوا بھی ہیں، یہ استعارہ بالواسطہ کا ایک جدید انداز ہے۔)

قلبِ مومن را کتابش قوت است
حکمتش حبل الوریدِ ملت است   (ص101)

(حضور پر نازل شدہ کتاب قلبِ مومن کے لیے قوت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکیمانہ اقوال ملت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔)(ص۲۲۹)(صنعتِ تلمیح اور استعارہ کا رنگ بڑا واضح ہے۔)

دامنش از دست دادن مردن است
چون گل از بادِ خزاں افسردن است   (ص101)

(حضور کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا موت ہے یہ ایسے ہے جیسے پھول بادِ خزاں سے مرجھا جائے۔)(ص۲۲۹)(تشبیہ واستعارہ ہے، چھ بار ''دالِ'' مفتوح کی تکرار شعر کا وقار ہے۔)

زندگی قوم از دمِ او یافت است
این سحر از آفتابش تافت است   (ص101)

(ملت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دم سے زندگی پائی ہے، ملت کی صبح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آفتاب سے روشن ہے۔)(ص۲۲۹)(''سِرَاجًا مُّنِیْرًا'' کی بالواسطہ تلمیح کے ساتھ استعارہ موجود ہے۔)

فرد از حق ملت از وی زندہ است
از شعاعِ مہرِ او تابندہ است (ص101)

(فرد اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق سے قائم ہے۔اور ملت حضور کے ساتھ تعلق سے زندہ ہے اور آپ کے آفتاب کی شعاع سے چمک رہی ہے۔)(ص۲۲۹)(استعارہ ہے۔)

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما (ص۱۰۲)

(رسالت ہی سے ہم، ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا ہوئے ہیں۔) (ص۲۳۱)(کلمہ 'ہم' کی تکرار نے شعر کو خوشنوا بنا دیا ہے۔

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چون وحدت شود، ملت شود (ص۱۰۲)

(ایک ہی مقصود رکھنے والوں کی کثرت وحدت بن جاتی ہے اور جب وحدت پختہ ہو تو وہ ملت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔)(ص۲۳۱)(صنعتِ تضاد اور تکرارِ کلماتِ ہم آہنگ عجب سماں پیدا کر رہے ہیں۔)

زندہ ہر کثرت بہ بند وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است (ص۱۰۲)

(ہر کثرت وحدت کے بندھن سے زندہ ہے مسلمانوں کی وحدت کا دار و مدار دینِ فطرت (اسلام) پر ہے۔)(ص۲۳۱)(صنعتِ تضاد اور کلماتِ ہم آہنگ کا بڑا خوبصورت رنگ نظر آتا ہے۔)

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہِ حق مشعلی افروختیم (ص۱۰۲)

(یہ دینِ فطرت ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی راہ میں (اپنے لیے ایک) مشعل روشن کی ہے۔)(ص۲۳۱)(استعارہ ہے۔)

این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجا نیم از احسانِ اوست (ص۱۰۲)

(دینِ فطرت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بحرِ بے پایان کا موتی ہے ہم جو یک جان ہیں تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان ہے۔)(ص۲۳۱)(صنعتِ مراعات النظیر اور استعارہ اپنا اپنا رنگ جما رہے ہیں۔)

تا نہ این وحدت ز دستِ ما رَوَد
ہستیٔ ما با ابد ہمدم شَوَد (ص۱۰۲)

(جب تک ہماری یہ وحدت قائم ہے ہمارا وجود ابد سے ہمکنار رہے۔) (ص ۲۳۱) (تکرار کلماتِ ہم آہنگ اورالفِ سامت بڑی پُر لطف ہے۔)

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد (ص۱۰۲)

(اللہ تعالیٰ نے شریعت ہم پرختم کر دی ہے جیسے رسولِ پاکؐ پر رسالت ختم کر دی ہے۔) (ص ۲۳۱) (صنعتِ تلمیح ہے۔)

رونق از ما محفلِ ایّام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را (ص۱۰۲)

(محفلِ ایام (دنیا) کی رونق ہماری وجہ سے ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آخری رسول ہیں اور ہم آخری ملت۔) (ص۲۳۱) (استعارہ ہے اور صنعتِ تلمیح ہے۔)

خدمت ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخرین جامی کہ داشت (ص۱۰۲)

(اب اللہ تعالیٰ نے ساقی گری کی خدمت ہم پر چھوڑ دی ہے۔ اپنا آخری جام (ہدایت) ہمیں عطا فرما دیا۔) (ص۲۳۱) (ساقی گری استعارۂ خدمت امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔)

لَا نبیَّ بعدی ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفٰیؐ است (ص۱۰۲)

(حضور کے بعد کسی اور نبی کا نہ آنا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اس سے ناموسِ دینِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تحفظ ہے۔) (ص۲۳۱) (صنعتِ تلمیح اور استعارہ ہے۔)

قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو (ص۱۰۲)

(یہی چیز ملت کے لیے سرمایۂ قوت اور وحدتِ ملت کے بھید کی حفاظت کرنے والی ہے۔) (ص ۲۳۱) (استعارہ ہے اور ''ت'' صامت کا رنگ واضح ہے۔)

اگرچہ مندرجہ بالا اشعار کا سطحی مرجع ومخاطب ایک عام انسان مسلمان دکھائی پڑتا ہے مگر اقبال مسلمان کو جن صفات سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں وہ ذاتِ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خاصا ہیں۔ ایسی منقبت کسی ہستی کی ذات وصفات کی توصیف بھی ہوتی ہے اور عصرِ رواں کے تقاضوں پر بھی پورا اترتی ہے نیز تنازعات کا حل بھی سکھاتی ہے اور اس طرح ہر دور میں جدید کہلاتی ہے۔ دیدۂ صدیق کی ترکیب

سے عموم کو خصوص قرار دیا گیا ہے اور یہ اپنی طرز کا ایک شاعرانہ تعلّی بھی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (583ء 644ء)

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں بھی علامہ اقبال کی منقبت کا انداز بھی روایتی رنگِ منقبت سے جدا ہے:

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ
الحذر از منتِ غیر الحذر (ص23)

(حضرت عمرؓ کی طرح (اپنا گرا ہوا کوڑا اٹھانے کے لیے) خود اونٹ سے نیچے اتر دوسروں کا احسان اٹھانے سے بچ اور ضرور بچ۔) (ص71)

تلمیح میں اشارہ کیا گیا ہے" جب بحالت سواری اشتر جناب فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تو اسے زمین پر سے اٹھانے کے لیے اپ خود اونٹ سے اترے اور اس معمولی کام کے لیے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا۔" (اقبال، ''کلیاتِ اقبال (فارسی)''، ص23)

سبحۂ اقلِل من الدنیا شمار
از تعِش حُرّاً شوی سرمایہ دار (ص۱۵۸)

(دنیا سے" بہت قلیل ہے" کی تسبیح پھیر تا کہ تو" آزادانہ زندگی" کا سرمایہ پائے۔) (ص 1345) (حضرت عمر فاروقؓ کے فرمان ''اقلل من الدنیا تعش حراً'' کی طرف تلمیح ہے۔)

تا توانی کیمیا شو گِل مشو
در جہان منعم شو و سائل مشو (ص۱۵۸)

(جہاں تک ہو سکے کیمیا بن، مٹی نہ بن۔ دنیا میں غنا اختیار کر سائل نہ بن۔) (ص 1345) (منعم و سائل اور کیمیا (سونا) اور گِل (مٹی) میں صنعتِ تضاد ہے۔)

ای نخیلِ دشتِ تو با لندہ تر
بر نخیزد از تو فاروقی دگر؟ (ص۶۸۵)

(تیرے صحرا کی کھجوریں اور بلند ہوں۔ کیا تیرے اندر سے کوئی اور فاروقؓ پیدا نہیں ہو سکتا۔) (ص۱۳۶۱)

ان اشعار میں علامہ اقبال خاکِ بطحا سے ایک اور عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ منقبت کا انوکھا قرینہ ہے کہ فقط اقبال ہی کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ جس میں اقبال خاکِ بطحا

اورصحرائے عرب کی نخیل کومزید ترقی کی دعا دیتے ہوئے مصرعِ ثانی میں سوال (Rhetoric Question) کرتے ہیں کہ کیا اس میں پھر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا انسان نشو ونما نہیں پا سکتا کہ عصرِ رواں کو ایک بار پھر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ضرورت ہے اے خاکِ یثرب تیرے اعجاز کو کیا ہوا؟

عصرِ خودرا بنگرا ے صاحب نظر
در بدن باز آفرین روحِ عمرؓ (ص ۸۳۷)

(اے صاحبِ نظر اپنے دور کو سمجھ اور اپنے بدن کے اندر دوبارہ حضرت فاروقِ اعظم کی روح پیدا کر۔)(ص ۱۶۵۱)

اقبال منقبتِ محض نہیں کہتے اور تقلیدِ محض سے بھی دامن کشاں گزرتے ہیں۔ وہ تمثیل سے کام لیتے ہیں، پھر تقلید کی تلقین کرتے ہیں اور یہ رنگ اقبال نے پیرِ رومی رحمتہ اللہ علیہ سے دریوزہ کیا ہے۔ زمانۂ حاضر کو ایک بار پھر اسی صاحبِ نظر کی ضرورت ہے جس کا نورِ بصیرت فاروقی الاصل ہو۔

ز افرنگی صنم بیگانہ تر شو
کہ پیمانش نمی ارزد بیک جو (ص ۹۴۴)

(فرنگی بت سے لاتعلق ہو جا اس کے پیالۂ دانش کی قیمت تو ایک جو کے برابر بھی نہیں۔)(ص ۱۸۶۱)(استعارہ ہے۔)

نگاہی وام کن از چشمِ فاروق
قدم بے باک نِہ در عالمِ نو (ص ۹۴۴)

(فاروق اعظمؓ کی چشمِ مستِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک شعاعِ نگاہ قرض لے اور ایک نئے جہان میں بے باکی سے قدم رکھ۔)(ص ۱۸۶۱)

یہ منقبتِ تلقینی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی اور ڈاکٹر طاہر حمید تنولی کے مطابق یہ منقبت کا جدید رنگ ہے۔ یہ چھوٹی بحر کا ایک شعر صنعتِ مراعات النظیر نافیہ کی بڑی مثال ہے۔ رنگِ خواجۂ شیراز غالب ہے مگر ساتھ ہی دوسرے شعر میں چشمِ فاروق، نگاہی اور وام سے اقبال نے اپنے کلام کو اسلامی کر دیا ہے۔ گویا یہاں سبکِ شیراز یہ اسلامیہ اقبالیہ کے سارے ذائقے مل جاتے ہیں۔ مجازِ مرسل اور تجرید بھی اپنے پورے کمال پر ہے۔

حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم (۶۰۱ء-۶۶۱ء)

خلیفۂ چہارم مولائے کائنات علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں سے خوشہ چینی کرتے ہوئے جابجا ان کے اسوہ کو قابلِ تقلید قرار دیتے ہوئے اقبال نے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ تمام خلفائے راشدین میں سے اقبال نے سب سے زیادہ مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہی کا ذکر کیا ہے اور بلاواسطہ طور پر مدح سرائی کر کے باقاعدہ منقبت نگاری کی ہے۔

مسلم اول شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایمان علیؓ (ص ۴۷)

(سب سے پہلے ایمان قبول کرنے والے بہادروں کے سردار سیدنا علی مرتضیٰؓ ہیں، اور وہی عشق کے لیے ایماں کا سرمایہ ہیں۔) (ص ۱۲۱) (صنعتِ تلمیح اور استعارہ ہے۔)

از رخِ او فال پیغمبرؐ گرفت
ملتِ حق از شکوہش فر گرفت (ص ۴۷)

(جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؓ کے چہرہ سے فال لیتے تھے، ان کی شان ہی سے ملتِ اسلامیہ کو عزت ملی ہے۔)(ص ۱۲۱)

قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش (ص ۴۷)

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں دینِ مبیں کی قوت قرار دیا ہے اور ان کے خاندان سے کائنات کو قانون نصیب ہوا ہے۔(ص ۱۲۱)

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق یدُ اللہ خواند در امّ الکتاب (ص ۴۷)

(اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں بوتراب کا لقب دیا، اللہ نے قرآن پاک میں انھیں ید اللہ کہا ہے۔(بیعتِ رضوان کے موقع پر صحابہ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اللہ نے فرمایا کہ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے)۔(ص ۱۲۱) (شعر تلمیحاتِ اسلامی سے مزین ہے۔)

ہر کہ دانای رموزِ زندگیست
سرِّ اسمای علی داند کہ چیست (ص ۴۷)

(جو شخص زندگی کے اسرار جانتا ہے، اسے معلوم ہے کہ حضرت علی کے اسماء کا راز کیا ہے۔) (ص ۱۲۱) (استعارہ موجود ہے۔)

شیرِ حق این خاک را تسخیر کرد
این گلِ تاریک را اِکسیر کرد　　(ص۴۸)

(شیر خدا سیدنا علیؓ نے اس خاک کو مسخر کرلیا اور (بدن کی) تاریک مٹی کو اکسیر بنا لیا۔)(ص ۱۲۳)(تشبیہ، استعارہ اور مجاز مرسل کے ساتھ ساتھ صنعتِ تضاد اور تلمیح بھی ہے۔)

مرتضی کز تیغِ اوحق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است　　(ص۴۸)

(مرتضی جن کی تلوار سے سچائی دنیا میں روشن ہوئی، انھوں نے بدن کی ولایت پر فتح پانے کے باعث بوتراب کا لقب پایا۔)(ص ۱۲۳)(صنعتِ تلمیح اور استعارہ ہے۔)

مرد، کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خود داری است　　(ص۴۸)

(کراری خود داری ہے اور خودداری ہی سے مرد کے گوہر (اصلیت) کی آبرو ہے۔) (ص ۱۲۳)(استعارہ اور تلمیح ہے۔)

ر کہ در آفاق گردد بو تراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب　　(ص۴۸)

(کائنات میں جو بھی بوتراب بن جاتا ہے، وہ آفتاب کو مغرب سے واپس لے آتا ہے۔)(ص ۱۲۳)(عموم سے خصوص کی طرف آتے ہیں مگر خصوص کی فوقیت قایم رہتی ہے لہٰذا تلمیح بن جاتی ہے۔)

ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست
چون نگیں بر خاتمِ دولت نشست　　(ص۴۸)

(جو شخص بھی بدن کے گھوڑے پر زین کس لیتا ہے وہ سلطنت کی انگوٹھی میں نگینے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔)(ص ۱۲۳)(تشبیہ و استعارہ ہے۔)

زیرِ پاش اینجا شکوہِ خیبر است
دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است　　(ص۴۸)

(اس دنیا میں فتح خیبر کی شان وشکوہ اس کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور آخرت میں اس کا ہاتھ آبِ کوثر تقسیم کرتا ہے۔)(ص ۱۲۳)(صنعتِ تلمیح، صنعتِ تضاد اور اضافتِ استعاری ہے۔)

از خود آگاہی ید اللٰہی کند
از ید اللٰہی شہنشاہی کند　　(ص۴۸)

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۲۹

(سورۃ الفتح ۴۸، آیت ۲۹)

(اس کی ذات شہرِ علوم کا دروازہ ہو جاتی ہے، حجاز، چین اور روم سب اس کے زیرِ فرمان ہو گئے ہیں۔(ص ۱۲۳)(صنعتِ تلمیح اور مجازِ مرسل ہے۔)

حکمران باید شدن بر خاکِ خویش
تا مئے روشن خوری از تاکِ خویش (ص ۴۸)

(حضرتِ علیؓ کی طرح تجھے بھی اپنے بدن کی خاک پر حکمران ہونا چاہیے تا کہ تو اپنے انگور سے مئے ناب پی سکے۔(ص ۱۲۳)(مجازِ مرسل اور اضافتِ استعاری ہے۔)

مذکورہ اشعار میں علامہ اقبال مولائے کائنات کرم اللہ وجہ الکریم کی صفتِ بوترابی کا ذکر فرما رہے ہیں کہ جس نے اپنے خاکی وجود کو جیت لیا، اصل مردانگی یہی ہے اور یہی بادشاہی ہے۔ دنیا میں بہت سے بادشاہ گزرے ہیں کہ سات برِ اعظموں کو اپنی اقلیم میں لیے بیٹھے ہیں مگر وہ اپنے نفس کے غلام ہیں، مگر بوترابی ایسی بادشاہی ہے جس میں نفس رضائے الٰہی کا طلب گار رہتا ہے، اپنی خواہشات کا غلام نہیں!

پھر علامہ بارگاہِ مرتضوی میں یوں حاضری پیش کرتے ہیں کہ مولائے کائنات کرم اللہ وجہ الکریم کی ذات وہ ذاتِ والا صفات ہے جو دنیا میں فاتحِ خیبر ہے اور آخرت میں قسیمِ کوثر ہے۔ شیرِ خدا مولائے کائنات علیہ السلام کی ذات شہرِ علوم کا دروازہ ہے۔ یہ اس حدیث کی طرف تلمیح ہے جہاں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو شہرِ علم اور مولا علی کرم اللہ وجہ الکریم کو اس شہر کا دروازہ قرار دیا تھا » انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا «۔ کسی شہر میں داخل ہونے کا جائز راستہ دروازہ سے داخل ہونا ہوتا ہے اور شہرِ علم کا دروازہ ہے بھی ایک! لہٰذا ہر طرح کے علمِ محمود تک پہنچنے کے کے لیے کہ جس کا منبع ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ مولائے کائنات کرم اللہ وجہ الکریم کا توسط لازم ہے۔ آپ کرم اللہ وجہ الکریم کی ذات اس حدیثِ قُدسی کا مصداق دکھائی دیتی ہے جس میں اللہ اپنے مومن بندے کی آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جانے کا وعدہ کرتا ہے۔ حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہ الکریم کا چہرہ "وجہُ اللہ" اور ہاتھ "ید اللّٰہی" کا مصداق ہیں۔ علامہ معجزۂ رجعتِ خورشید کی طرف تلمیح کرتے ہیں جس میں مولائے کائنات کرم اللہ وجہ الکریم نے اللہ کے حکم سے غروب شدہ سورج کو واپس پلٹایا تھا تا کہ نمازِ عصر قضا نہ ہو۔ علامہ اقبال اپنی منقبت کو آفاقی سطح پر لے جاتے ہیں اور ان کے مطابق اگر آج بھی کوئی بوتراب ہو جائے تو سورج کو

واپس پلٹانا ناممکنات میں سے نہیں رہتا۔

ر کہ در آفاق گردد بو تراب

باز گرداند ز مغرب آفتاب (ص۴۸)

(کائنات میں جو بھی بوتراب بن جاتا ہے، وہ آفتاب کو مغرب سے پلٹا لیتا ہے۔) (ص ۱۲۳)

چوں علی در ساز با نانِ شعیر

گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر (ص۱۵۸)

(سیّدنا علی المرتضی کی طرح جو کی روٹی پر گزارہ کر اور مرحب کی گردن توڑ اور خیبر فتح کر۔) (ص ۳۴۵) (صنعتِ تلمیح اور تشبیہ ہے۔)

ان اشعار میں بھی علامہ اپنی منقبت کو بالواسطہ پیش کرتے ہیں جس کا مقصود مسلمان کو صفاتِ حیدری سے متصف کرنا ہے۔ خلق میں خوفِ فسادِ اخذِ مطالب سے اقبال کو یہ کہنا پڑا:

ہزار خیبر و صد گونہ اژدر است اینجا

نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند! (ص۳۴۵)

(یہاں ہزاروں خیبر اور سیکڑوں اژدر (ہتھیار) ہیں، جو کی روٹی کھانے والا ہر شخص اندازِ حیدری نہیں جانتا۔) (ص۶۹۹)

یہ منقبت کا جدید اور عجیب قرینہ ہے کہ عظمتِ رفتہ پر فخر اور عصرِ رواں پر تاسف بیک وقت دکھائی دے رہا ہے۔ عہدِ حاضر میں سیکڑوں خیبر ہیں کہ کسی حیدر کی راہ تکتے ہیں مگر مسلمانوں میں اب ایسا کوئی نہیں۔ ظاہری اور مادی صفات اپنا لینے سے کسی کی ہستی کا فیض اور نسبت عطا نہیں ہوتی! ہر جو کی روٹی کھانے والا حیدر نہیں ہوتا بلکہ صفاتِ حیدری سے معمور ہونے کے لیے سرکارِ دوعالم ﷺ کی نگاہِ کرم چاہیے ہوتی ہے۔ روٹی چاہے جو کی ہو یا گندم کی یا وہ بھی نہ ہو، اقلیمِ تن فتح ہو جاتا ہے اور خیبر بھی! (تلمیح واستعارہ مستعمل ہیں۔)

گہے باحق درآمیزد، گہے باحق درآویزد

زمانی حیدری کردہ، زمانی خیبری کردہ (ص۴۲۴)

(کبھی میرا یہ دل حق کے ساتھ موافقت کرتا ہے اور کبھی حق کی خاطر مخالفت کرتا ہے کبھی حیدری انداز اختیار کرتا ہے اور کبھی خیبری۔) (ص۸۶۱)

اقبال کی اس غزل میں قولِ محال کی بہتات ہے۔ اس شعر میں اقبال کا مرجع اس کا دل ہے کہ جب صفاتِ الٰہیہ کے ساتھ مل کر یکجان ہوتا ہے تو کردارِ حیدری کی شکل اختیار کرتا ہے اور جب خود سچائی

کے ساتھ جلوہ فرما ہوتا ہے تو جلالِ حیدری یعنی خیبری کا مظہر بن جاتا ہے۔ محاکات، صنعتِ تلمیح اور تکرارِ کلمات ہے۔ حق، زمانی، گہی، کردہ، تکرارِ کلماتِ ہم آہنگ (آمیزد، آویزد)، رائے مصوت اور یائے صامت کی تکرار نے شعر کو بڑا حسین آہنگ دے دیا ہے۔)

امیرِ قافلہ سخت کوش و پیہم کوش

کہ در قبیلۂ ما حیدری ز کراری است (ص ۴۶۸)

(تو امیرِ قافلہ ہے تجھے چاہیے کہ سخت کوشش کرے اور پیہم کوشش کرے۔ کیونکہ ہمارے قبیلے میں حیدری، کراری سے وابستہ ہے۔) (کراری بار بار حملہ کرنے والا) (ص ۷۹۴) (رائے مصوت اور یائے صامت کی تکرار بڑی بھلی محسوس ہوتی ہے۔)

نسبت کو باعثِ فخر سمجھنا بھی اور اس کا بار بار ذکر کرنا بھی تعریف ہی کا رنگ ہے اس میں علامہ امتِ مسلمہ کو زیرِ بحث لاتے ہیں کہ ہم نے تو مولائے کائناتؑ کو اپنا سالارِ کارواں بنا رکھا ہے اور امیرِ قافلہ سخت کوش ہے جہدِ مسلسل اس کا ایمان ہے اور ہماری جماعت یعنی امتِ مسلمہ کو حیدرِ کرار سے نسبت ہے۔

بہرِ نرخی کہ ایں کالا بگیری سود مندافتد

بزورِ بازوئے حیدر بدہ ادراکِ رازی را (ص ۴۹۶)

(یہ سامان (جہاد کا شوق) تُو جس قیمت پر بھی خرید لے نفع آور ہے، (بے شک) ادراکِ رازی کو قوتِ حیدری کے عوض دے دے۔ (ص ۱۰۰۳) (رائے مصوت اور یائے صامت کا ایک خوبصورت آہنگ ہے۔)

کور را بینندہ از دیدار کن

بولہب را حیدرِ کرار کن (ص ۲۶۳)

(اندھے (علم) کو دیدارِ الٰہی سے بصیر بنا دے اور اس طرح بولہب کو حیدرِ کرار میں بدل دے۔ (ص ۱۳۲۱) (تلمیح اور 'ر' مصوت کی تکرار ہے۔)

اندرو ہر ابتدا را انتہا است

حیدر از نیروئے از خیبر کشا است (ص ۸۵۸)

(ہر ابتدا کی انتہا اس کے اندر ہوتی ہے حیدر کرار اسی کی بدولت فاتح خیبر ہوئے۔) (ص ۱۶۹۱) (صنعتِ تضاد ہے، الفِ مصوت اور یائے صامت کی تکرار بڑی خوش نوا ہے۔)

می شناسی معنئ کرار چیست

ایں مقامی از مقاماتِ علیؑ است (ص ۸۷۸)

(کیا تو سمجھتا ہے کہ کرار کے معنی کیا ہیں؟ یہ حضرت علیؓ کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔)(ص ۱۷۳۱)(''کرار'' کو علامت قرار دیا گیا ہے یہ محض ایک حالت اور لقب نہیں بلکہ یہ علویت کا ایک درجہ ہے۔ یائے صامت کی تکرار بڑی بھلی ہے۔)

تا ز کراری نصیبی داشتند

(ص ۸۷۸)

(جب تک ان کے اندر کراری باقی رہی انھوں نے جہاں میں اور انداز کا جھنڈا گاڑا۔)(ص ۱۷۳۱)(صنعتِ تلمیح ہے۔)

مسلمِ ہندی چرا میداں گذاشت؟

ہمتِ او بوئے کراری نداشت (ص ۸۷۸)

(ہندی مسلمان کیوں میدان چھوڑ گیا؟ اس لیے کہ اس کی ہمت کراری کی خوبی نہ رکھتی تھی۔)(ص ۱۷۳۱)(تلمیح اور اضافتِ استعاری ہے۔)

کراری کو مولائے کائنات سے نسبت ہے اور ہندوستان کا مسلمان زوال کا شکار ہے کیونکہ اس نے مولائے کائنات کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ جب تک ہم شیوہ حیدری کو اپنائے ہوئے تھے تو ہندوستانی مسلمان پوری دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔

گلستانی ز خاکِ من بر انگیز

اگر شایاں نیم تیغِ علیؑ را

نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز

نگاہی دہ جو شمشیرِ علیؑ تیز (ص ۹۳۸)

(میری خاک سے گلستان پیدا فرمایئے۔خون لالہ میں میری آنکھ کی نمی بھی ملا دیجیے۔ اگر میں تیغِ علی کی (شان کے) شایان نہیں تو مجھے ایسی نگاہ عطا فرما دیجیے جو تیغِ علی کی مانند تیز ہو۔)(ص ۱۸۴۹)(''نگاہ'' روحانی فیض کا استعارہ ہے۔)

پادشاہ و کلبۂ ایوانِ او

یک حسام و یک زرہ سامانِ او (ص ۷۵۲)

(وہ بادشاہ تھے مگر حجرہ ان کا محل تھا اور ان کا سارا سامان ایک تلوار اور ایک زرہ پر مشتمل تھا۔)(ص ۳۳۳)(صنعتِ مراعات النظیر ہے۔)

حضرتِ حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام (۶۷۰ء-۶۲۵ء)

اس کے بعد علامہ اقبال پانچویں خلیفۂ راشد حضرت امام حسن علیہ السلام کی جناب میں سلام پیش کرتے ہیں کہ جن کی خلافت، خلافتِ راشدہ سے بلا فصل ہے۔ جنھوں نے شریعتِ محمدیہ کی پامالی اور ناموسِ حیدری پر سمجھوتا نہ کیا اور دنیوی بادشاہت کو ٹھوکر ماردی:

آن یکی شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیر الامم (ص ۱۵۲)

(آپ سیدنا حسن شبستانِ حرم کی شمع ہیں اور جنھوں نے خیر الامم (امت مسلمہ) کے اتحاد کی حفاظت فرمائی۔ (ص ۳۳۳)

تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں (ص ۱۵۲)

(انھوں نے حکومت کو ٹھکرا دیا تا کہ امت مسلمہ کے اندر سے خانہ جنگی اور دشمنی کی آگ ختم ہو جائے۔ (ص ۳۳۳)

آپ وہ شمع ہیں جس نے شبستانِ حرم کو روشن کر رکھا ہے۔ فتنہ وکینہ سے امت کو بچایا اور مسلمانوں میں موجود داخلی انتشار ختم کرنے کے لیے تخت و تاج، اہلِ ہوس کو دے کر مسلمانوں اور اسلام کو بچا لیا۔ اسلامی تاریخ میں یہ اعجاز بھی فقط امام حسن علیہ السلام کو حاصل ہے کہ جس کی صلح نے دشمن کو شکست دے دی۔ یہاں صنعتِ تلمیح، شایانِ شان القاب اور استعاروں کے جھرمٹ بڑے بلیغ نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری میں مناقب کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ وہ بلا واسطہ غیر روایتی منقبت کو پسند نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک واسطہ کے ساتھ منقبت کو ترجیح ہے۔ اقبال یہ واسطہ کبھی رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس، کبھی ان کی آلِ اطہر علیہم السلام، کبھی مسلمِ عصرِ حاضر اور کبھی دعا کو واسطہ بنا کر دستِ طلب دراز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن خلیفۂ سوم حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے ذکرِ پاک سے اردو اور فارسی دونوں کلام شرف یاب نظر نہیں آتے، جبکہ فقط کلامِ فارسی میں خلیفۂ پنجم حضرت امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں صرف دو اشعار دستیاب ہوئے ہیں اور وہ بھی ذیلی اور ضمنی طور پر در آئے ہیں۔

البتہ مجموعی طور پر اقبال کی یہ منقبت نگاری اردو اور فارسی ادب کا نور و نکہت سے معمور ایک ایسا منفرد سرمایۂ جمال ہے جو فکری لحاظ سے نہایت پختہ اور فنی لحاظ سے بے مثال ہے۔

کتابیات

۱۔ انور جمال، ''ادبی اصطلاحات''، راولپنڈی: فرحان رضا پرنٹرز، ۲۰۱۲ء

۲۔ اقبال، ''کلیاتِ اقبال (اردو)''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء

۳۔ اقبال، ''کلیاتِ اقبال (فارسی)''، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن

۴۔ میاں عبدالرشید، ''ترجمہ کلیاتِ اقبال (فارسی)''، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۲ء۔ جلد اول

۵۔ میاں عبدالرشید، ''ترجمہ کلیاتِ اقبال (فارسی)''، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۲ء۔ جلد دوم

□□□

کیسے بیاں ہو شان بناتِؓ رسولؐ کی
قدرت تھی ہم زبان بناتِؓ رسولؐ کی
چاروں کی چاروں لائقِ صد احترام ہیں
مثلِ فلک ہے آن بناتِؓ رسولؐ کی
تھیں مادرِ عظیم خدیجہؓ کی یادگار
نیکی تھی آن بان بناتِؓ رسولؐ کی
اُن میں رواں تھا حضرتِ خیرالوریٰؐ کا خون
فطرت تھی راز دان بناتِؓ رسولؐ کی
کم کم لبوں پہ آتا رہا حرفِ مدّعا
چپ ہوتی ترجمان بناتِؓ رسولؐ کی
نیچی نگاہ کر کے جھکا کر سرِ نیاز
کہتے ہیں داستان بناتِؓ رسولؐ کی
تائبؔ جو ہے رضائے پیمبرؐ کی آرزو
توقیر دل سے مان بناتِؓ رسولؐ کی

(حفیظ تائبؔ)

اقبال سہیلؔ کی منقبت نگاری

ڈاکٹر منور انجم

ABSTRACT: IQBAL SOHAIL is a distinguished poet in the realm of religious poetry, noted for his unique identity and a strong artistic and intellectual foundation rooted in traditional themes. This essay critically examines his eulogistic poetry, particularly his verses dedicated to the Rightly Guided Caliphs, showcasing his eloquence and ability to convey profound thoughts gracefully. Suhail's mastery in presenting the components of MANQABAT sets him apart from his contemporaries. The essay incorporates numerous poetic examples while maintaining coherence and discipline, emphasizing the intellectual dimensions of Suhail's work and offering insights into its thematic depth. It briefly touches on technical aspects, making them accessible to those familiar with poetic nuances. Ultimately, the essay demonstrates Suhail's responsible engagement with historical traditions in his poetry, frequently integrating Hadith references, which not only enrich his scholarly pursuits but also reflect his broad intellectual engagement.

اردو میں نعتیہ شاعری فارسی نعت گوئی کے زیرِ اثر داخل ہوئی۔ جنوبی ہند کے قدیم شعرا میں حضرت سید محمد حسینی (جو عام طور سے خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے نام سے مشہور ہیں) کے یہاں حمد و نعت کا تذکرہ ملتا ہے۔ بعد ازاں سلطان محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ کے علاوہ غواصی، بلاقی، طبعی، ولی، فراقی، نامی، اور نصرتی وغیرہ کے یہاں نعتیہ شاعری کا اچھا خاصا ذخیرہ ملتا ہے۔ ان شعرا نے مثنوی و قصائد کی ہیئت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق و کردار، عادات و اطوار اور خاص طور پر واقعۂ معراج کو بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے۔

شمالی ہند کے متقدمین و متوسطین شعرا میں سودا، میر، انشا، ذوق، غالب، مومن، ظفر، میر حسن، نظیر اور داغ وغیرہ نے بھی عمدہ نعتیں کہی ہیں جو زیادہ تر قصائد کی ہیئت میں ہیں۔ البتہ مولوی غلام امام شہیدؒ نے اپنے نعتیہ کلام کو مخمس، مسدس، ترجیع بند اور ترکیب بند کی شکل میں پیش کیا ہے۔ متاخرین کے عہد میں حالی، اکبر، شاد، اصغر، امیر، آسی، رضا علی خاں، ظفر علی خان، اقبال، جوش، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، روش صدیقی، حسرت موہانی، حمید صدیقی، محسن کاکوروی، بیدم شاہ وارثی اور اقبال سہیل کو نعتیہ و منقبتی شاعری کے میدان میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں تک اقبال سہیل کی نعت گوئی کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

> "دورِ حسانؓ سے لے کر عہدِ جدید تک طبقۂ اولیٰ کے نعت گو شعرا کا جو یہ تاریخی سلسلہ ہے، سہیل اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہیں۔ اقبال کے بعد موجودہ زمانے میں سہیل ہی وہ ذی مرتبت شاعر ہیں، جنھوں نے اپنے پیش رو شعرا کی لافانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کی نعتیہ شاعری کے افق کو وسیع تر کیا اور فکر و فن کے اعتبار سے اسے نیا انداز و آہنگ بخشا۔ خاقانی کی طرح انھیں بھی فن نعت سے فطری مناسبت تھی۔" (1)

اقبال سہیل کو نہ صرف نعت گوئی سے فطری مناسبت تھی بلکہ منقبت نگاری کے میدان میں بھی انھیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اور بقول سید سلیمان ندوی:

> "یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ رسالت مآب ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے گہری عقیدت اور سچی محبت ان کی (سہیل کی) شاعری کے جسم کی روحِ رواں ہے۔" (2)

سچ پوچھے تو حُبِّ رسول کا یہ فطری جذبہ سہیل کو اپنے خاندان کے دینی و مذہبی ماحول اور خاص طور پر اپنے والد بزرگوار، جو عربی و فارسی کا اعلیٰ مذاق رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے، سے وراثت میں ملا تھا۔ اس طرح عظمتِ نبوت کا ادراک سہیل کو عہدِ طفلی میں پورے طور پر ہو چکا تھا جس کی توثیق حسبِ ذیل واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔

اس وقت سہیل کی عمر بقول افتخار اعظمی، دس سال سے بھی کم تھی۔ رات خاموش تھی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نیلگوں آسمان پر جلوہ گر تھا، اور اپنی نورانی کرنوں سے روئے زمین کو منور کر رہا تھا۔ سہیل اپنے والد ماجد کے پاس خاموش بیٹھے ہوئے اس روحانی ماحول و فضا میں مناظرِ قدرت کے حسین نظاروں میں کھوئے ہوئے تھے کہ والد کی زبانِ مبارک سے اچانک یہ مصرع نکل گیا:

تَرَحَّم عَلیٰ حَالِیَا یَا اِلٰہی!

والد کی زبان سے ابھی یہ مصرع نکلا ہی تھا کہ سہیل نے نہایت برجستگی اور بے ساختگی سے فوراً یہ

دوسرا مصرع کہہ کر شعر مکمل کر دیا:

طفیلِ جنابِ رسالت پناہی

اسی طرح جب سہیل کی عمر تقریباً ۱۲ سال کی تھی، تو انھوں نے یہ نعتیہ شعر بھی کہا جو اپنے اندر بڑی جامعیت اور گہری معنویت رکھتا ہے۔

عندلیبِ گلشنِ فردوس ہستم حامدآ
مدح خوانی نبیؐ کا راست و طوبیٰ جائے من (3)

یہی وجہ ہے کہ عہدِ طفلی سے لے کر عالمِ ضعیفی تک سہیل کی زندگی عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبے سے سرشار و سرمست نظر آتی ہیں۔ اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی عقیدت کا یہی جذبہ ان کی نعتیہ شاعری کو معراجِ کمال تک پہنچا دیتا ہے، جہاں تک دوسرے نعت گو شعرا کی رسائی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سی نظر آتی ہے۔

سہیل کی نعتیہ شاعری کی طرح ان کی منقبتی شاعری بھی نہایت اہم اور قابلِ قدر ہے۔ انھیں خلفائے راشدین اور اہلِ بیت سے بے پناہ عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و مرتبت کو جاننے پہچاننے کے لیے صحابہ کی خاکِ پا ہونا ناگزیر تصور کرتے ہیں:

جو صحابہ کا خاکِ پا نہ ہوا
مرتبہ دانِ مصطفیٰ نہ ہوا

علاوہ ازیں سہیل کی نگاہ میں یہ حدیثِ قدسی بھی تھی جس میں یہ ارشاد ہوتا ہے:

اصحابی کالنجوم فبایہم اقتدیتم اهتدیتم (4)

’’میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔‘‘

خلفائے راشدین، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور دینِ اسلام کے محافظ تھے۔ ان کا کام خدا اور رسول کی پیروی اور ان کے مطابق حکومت کا انتظام و انصرام اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر کرنا تھا۔ سہیل نے ان کے عقائد و افکار کو اپنی منقبتوں میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سہیل نے اپنے اکثر نعتیہ قصائد میں التزاماً منقبت کو بھی شامل کیا ہے۔ چنانچہ ”موجِ کوثر“ کے آخری حصے میں انھوں نے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت حمزہ، حضرت عباس، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابوعبیدہ، حضرت زید، حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت سلمان رضی اللہ عنہم کے علاوہ تمام بناتِ نبی اور زوجاتِ نبی کے مناقب انتہائی جوشِ عقیدت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ مثال

کے طور پر حسبِ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خلفا چرخِ ہدیٰ کے انجم رضی اللہ تعالیٰ عنہم
آپ جہاں کے ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
سیدنا صدیق اکبر، پہلے مصدق، پہلے مبشر
امتِ مرحومہ میں ارحم صلی اللہ علیہ وسلم
جن کے پاؤں کا ہے یہ پایہ، آبِ دہنِ مولا نے لگایا
وہ محبوبِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
ہیبتِ ایماں کا یہ اثر ہے، زلزلہ افگن نامِ عمر ہے
گردنِ باطل آج بھی ہے خم صلی اللہ علیہ وسلم
بزم منور کی امکاں کی، سطح برابر کی اِنساں کی
دیں کی بِنا کر دی مستحکم صلی اللہ علیہ وسلم
سایۂ قد صدیق مکرم، صیدِ نظر فاروقِ معظم
رازِ نبوت کے دو محرم صلی اللہ علیہ وسلم
وہ جو فدائے حکمِ نبی ہیں، سیدنا عثمان غنی ہیں
نور کی دو موجوں کے سنگم صلی اللہ علیہ وسلم
اور وہ چوتھے رکنِ خلافت طرۂ تاجِ مجدِ شرافت
پیکرِ رافت، جُودِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
نیرِ ساطع صہرِ پیمبر، حجتِ قاطع، فاتحِ خیبر
وہ میدانِ وفا کے ضیغم صلی اللہ علیہ وسلم
ختم رسالت شاہِ زمن پر ختم خلافت ذاتِ حَسن پر
دونوں مصحفِ حق کے خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
اور وہ سرورِ سب شہدا کے، حمزہؓ فدائی راہِ خدا کے
مشہدِ بدر کے صدرِ مفخم صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت عباس ان کے بھائی شمعِ نبوت کے شیدائی
یہ بھی رسول پاک کے ہیں عَم صلی اللہ علیہ وسلم
سعد و سعید و زبیر و طلحہ، ابنِ عوف اور ابو عبیدہ
گل کدۂ دِیں جن سے خرّم صلی اللہ علیہ وسلم
اور جو چار بناتِ نبی ہیں اور جو سب زوجاتِ نبی ہیں
ان کی طہارت آیۂ محکم صلی اللہ علیہ وسلم
زید و بلال و صہیب و سلماں، سب رفقا انصار اور اعواں
رحمتِ باری سب پر پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

سہیل کی ایک نظم "رحیقِ مختوم" ہے جس میں انھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ فاروق کی منقبت بیان کی ہے۔ اس نظم میں عہدِ خلافت کے اسلامی تصورات کی روح سمٹ کر آ گئی ہے۔ یہ نظم سہیل نے بحیثیت صدرِ مشاعرہ، آل انڈیا مشاعرۂ مدحِ صحابہ، لکھنو منعقدہ: ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء میں کہا تھا۔ اس وجد آفریں نظم کے چند اشعار بطورِ مثال ملاحظہ ہوں:

جو مدحِ اصحابِ پاک میں ہم ترانہ سنجِ نوا رہے ہیں
نہ پوچھیے بے خودی کا عالم کہ ہم زبانِ خدا رہے ہیں
یہ جتنے اصحابِ مصطفیٰ تھے سب اہلِ ایماں کے مقتدیٰ تھے
یہی وہ سرچشمۂ ہدیٰ تھے کہ جن سے سب فیض پا رہے ہیں
خصوصیت سے جو سابقیں تھے حضور انور کے جانشیں تھے
یہ چار ارکانِ قصرِ دیں تھے مراتب ان کے سوا رہے ہیں

پھر ان میں صدیق سب پہ فائق فروغِ حق مراۃ الحقائق
نبی کے بعد افضل الخلائق میانِ ارض و سما رہے ہیں
علیؓ بہ حکمِ شہِ رسالت نبی کے بستر پہ محوِ راحت
بس ایک صدیقؓ روزِ ہجرت رفیقِ کہف الوریٰ رہے ہیں
وہ غار کا ہولناک منظر وہ سنگِ خارا بجائے بستر
خوشا وہ زانوئے پاک جس پر حضورؐ تکیہ لگا رہے ہیں

حضرت عمر فاروقؓ کی منقبت میں سہیل نے دوسرا مطلع کتنی خوب صورتی سے کہہ دیا ہے۔ یہاں پر بطور خاص ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت قابلِ ملاحظہ ہے۔

تحیت و شکر کے ترانے ملائکہ آج گا رہے ہیں — درِ رسالت پہ سر جھکائے جناب فاروق آ رہے ہیں
رسولؐ کی آرزو بر آئی، حرم کی تقدیر جاگ اٹھی — حرم اِدھر وجد کر رہا ہے حضورؐ اُدھر مسکرا رہے ہیں
یہ فیض ہے مقدمِ عمر کا، کہ در کھلا ہے خدا کے گھر کا — نماز کعبے میں ہو رہی ہے، فرشتے خوشیاں منا رہے ہیں
عمر کی آمد کا غلغلہ ہے تو قصرِ کسریٰ میں زلزلہ ہے — عجم کے والی لرز رہے ہیں حرم کے بُت لڑکھڑا رہے ہیں
نہ تیر و پیکاں نہ تیغ و خنجر، نہ ساز و ساماں نہ لاؤ لشکر — خدا کی رحمت ہے سایہ گستر ملائکہ پر بچھا رہے ہیں

سہیلؔ نے حضرت عمرؓ کے فقرِ ظاہر اور شکوہِ باطن کا نقشہ ان اشعار میں کھینچا ہے:

فضائیں گونجی ہیں مرحبا سے چلے ہیں فاروق اس ادا سے
جو ذرّے اٹھتے ہیں گردِ پا سے نجوم پر مسکرا رہے ہیں
کسے میسر کہاں یہ ممکن یہ فقرِ ظاہر شکوہِ باطن
غلام اشتر سوار لیکن پیادہ پا آپ جا رہے ہیں

اور یہ اشعار بھی جنابِ شیخینؓ کی عظمت و جلالت کا بھرپور احساس دلاتے ہیں:

خدا کے بندے خدا نہیں تھے کسی کے مشکل کشا نہیں تھے
مگر وہ اسرارِ علم و دیں کے ضرور مشکل کشا رہے ہیں
کوئی دکھا دے جلال ایسا، کوئی بتا دے مثال ایسی
ہزاروں جنگ آزما ہوئے ہیں ہزاروں کشور کشا رہے ہیں
ملا ہے ان کو وہ قلبِ روشن، نثار خود جس پر برقِ ایمن
جنابِ شیخینؓ زندگی بھر رفیقِ شمس الضحیٰؐ رہے ہیں
مزار اقدس کے دائیں بائیں، حضور کی لیتے ہیں بلائیں
نہ اس جہاں میں جدا رہیں گے نہ اس جہاں میں جدا رہے ہیں

سہیلؔ رِندوں سے کہہ دو آئیں قلوب کی تشنگی بجھائیں
رحیقِ مختوم منقبت کی گلابیاں ہم لنڈھا رہے ہیں

متذکرہ بالا مشاعرۂ مدحِ صحابہ میں امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی صاحب کی فرمائش پر سہیلؔ نے مدحِ صحابہ کے موضوع پر ایک اور نظم بعنوان ''آبِ حیات'' فی البدیہہ کہی تھی۔ اس نظم کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

مداحِ صحابہ کے لب پر صدیقِ امیں کا نام آیا
آوازۂ صلِّ علیٰ اٹھے تکریم و ادب کا مقام آیا

جو وحی سنی صَدَّقْتَ کہا جو حکم ہوا تعمیل ہوا
جاں خدمتِ دیں پر وقف رہی اور مال خدا کے کام کیا

تھی جتنی بضاعت دنیا کی، سب نذرِ رضائے مولیٰ کی
وہ شانِ جلالت پیدا کی خود ان کو خدا کا سلام آیا

اس شان کا مظہر مل نہ سکا، صدیق کا ہمسر مل نہ سکا
گردش میں اگر چہ صدیوں تک یہ گنبدِ نیلی فام آیا

مسرور نہ کیوں ہو شاہِ عربؐ حاضر ہے وہ خود تھی جس کی طلب
آ ہوئے حرم فاروقؓ بھی اب نخچیر اسیرِ دام آیا

وہ ملہمِ حق، وہ نورِ ہدیٰ، جو رائے عمر وہ حکمِ خدا
خود مہبطِ وحی ہیں جس پہ فدا، وہ جلوہ گہِ الہام آیا

وہ محرمِ سرِّ لم یزلی، وہ صہرِ نبی وہ ختنِ علیؓ
بازوے رسالت جس سے قوی وہ فاتحِ روم وشام آیا

اور پھر نظم کے آخر میں سہیلؔ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی شانِ جلالت اور فقر وقناعت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

اس شانِ کرامت پر حیراں تھی فوجِ مجاہد فارس میں
جب نور کی برقی لہروں پر طیبہ سے عمرؓ کا پیام آیا

اے قدس نشینو! شاد ہو کیوں یہ ناقہ سوار امیر نہیں
پیوند لگا کرتا پہنے فاتح تو پیادہ خرام آیا

مؤخرالذکر شعر میں سہیلؔ نے جنگِ قادسیہ (ایران) کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں مسلمانوں کی فتح یابی کی خوش خبری دینے کے لیے امیر العسکر حضرت سعد بن وقاصؓ نے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں ایک شتر سوار قاصد کو روانہ کیا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے اس منظر کی تصویر کشی ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''حضرت عمرؓ کا یہ حال تھا کہ جس دن سے قادسیہ کا معرکہ شروع ہوا تھا، ہر روز آفتاب نکلتے مدینے سے نکل جاتے اور قاصد کی راہ دیکھتے۔ ایک دن معمول کے موافق نکلے، ادھر سے ایک شتر سوار آ رہا تھا، بڑھ کر پوچھا کہ کدھر سے آتے ہو؟ وہ سعد کا قاصد تھا اور مژدۂ فتح لے کر آیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ سعد کا قاصد ہے تو اس سے حالات پوچھنا شروع کیے۔ اس نے کہا، خدا نے مسلمانوں کو کامیاب کیا۔ حضرت عمرؓ رکاب کے برابر دوڑتے جاتے تھے اور حالات پوچھتے جاتے تھے۔ شتر سوار شہر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ

جو شخص سامنے آتا ہے، ان کو امیر المومنین کے لقب سے پکارتا ہے۔ ڈر سے کانپ اٹھا اور کہا کہ حضرت آپ نے مجھ کو اپنا نام کیوں نہ بتایا کہ میں اس گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا۔ فرمایا: نہیں کچھ حرج نہیں، تم سلسلۂ کلام کو نہ توڑو۔ چنانچہ اسی طرح اس کے رکاب کے ساتھ گھر تک آئے۔ مدینہ پہنچ کر مجمعِ عام میں فتح کی خوش خبری سنائی اور ایک نہایت پر اثر تقریر کی جس کا اخیر فقرہ یہ تھا: مسلمانو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ میں خود خدا کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح تمھارا کام کروں کہ تم چین سے گھروں میں سوؤ، تو میری سعادت ہے اور اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو میری بدبختی ہے۔ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں لیکن قول سے نہیں بلکہ عمل سے۔‘‘(5)

عام طور پر منقبت میں سہیلؔ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کا بالترتیب ذکر کیا ہے اور ہر ایک کے وہی فضائل و کمالات بیان کیے ہیں جو صحیح حدیث اور مستند روایات سے ثابت ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنی ایک نظم ’’درمنقبت خلفائے راشدین‘‘ میں خلفائے اربعہ کے اوصافِ حمیدہ کی تصویر کشی بڑی برجستگی اور نہایت دلکش پیرائے میں کی ہے۔ نظم کی غنائیت اور ترنم ریزی دل و دماغ پر سحر انگیزی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ترجیع بند نظم کے کچھ منتخب بند ملاحظہ ہوں:

جہاں میں جو آئینہ دارِ نبی ہیں حقیقت میں وہ چار یارِ نبی ہیں
رفیقِ نبی، غم گسارِ نبی ہیں فدائے نبی، جاں نثارِ نبی ہیں
بڑا ان کا رتبہ ہے اللہ اکبر ابو بکر و فاروق عثمان وحیدر

اور اس کے بعد سہیلؔ بزمِ رسالت کے خلفائے اربعہ کے مراتب و مقامات کے ساتھ ساتھ ان کے فضائل و کمالات کا تجزیہ نہایت خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں:

ابو بکرؓ وہ انتخابِ رسالت وہ فاروقؓ تعبیرِ خوابِ رسالت
وہ عثماںؓ غنی فیض یابِ رسالت علیؓ جرعہ خوارِ شرابِ رسالت
یہ چاروں ہیں احسان و ایماں کے پیکر
ابوبکر و فاروق و عثمان و حیدر

یہ معراجِ ایماں کے ہیں چار زینے یہ چاروں ہیں تاجِ شرف کے نگینے
مجلّٰی ہیں انوار سے ان کے سینے سنوارا ہے ان کو جمالِ نبیؐ نے

مربی، مصفا، مقدس، مطہر
ابو بکر و فاروق و عثمان و حیدر

خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت و مرتبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ رسولِ خدا کے سب سے پہلے رفیق اور نبوت کے سب سے پہلے مصدق و مبشر تھے۔ چنانچہ سہیلؔ نے اپنی نظم، مدحتِ صدیق میں ان کی عظمت و مدحت پر نہایت اخلاص و عقیدت سے روشنی ڈالی ہے اور بعض مقامات پر تلمیحاتِ احادیث سے بھی اپنے اشعار کو مزین کیا ہے۔ علاوہ ازیں مدحتِ صدیق کے دیگر اشعار میں سہیلؔ فرماتے ہیں کہ:

حیات ہی میں انھیں مل گیا رضا کا پیام
اب اس سے بڑھ کے ہو کیا نقشِ عظمتِ صدیق
کہ غار ثور سے لے تا بہ خلوتِ اَسرا
انیسِ احمدِ مرسلؐ بھی طلعتِ صدیق

مذکورہ بالا اشعار بھی احادیث کا ترجمہ ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے رسولِ خدا سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ تم غار میں میرے ساتھ تھے اور حوضِ کوثر پر بھی میرے ساتھ رہو گے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت اور ان کا عدل و انصاف اسلامی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ عظیم الشان شخصیت ہے جسے پانے کے لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خداوند ایزدی کی بارگاہ میں دعائیں مانگی تھیں۔ خاص طور پر علم و فضل کے اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ جیسا کہ حسبِ ذیل حدیث سے اندازہ ہوتا ہے:

عن ابن عمر، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: بينا انا نائم اتيت بقدح لبن، فشربت منه حتى إني لأرى الري يخرج من اظفاري، ثم اعطيت فضلي، يعني عمر، قالوا: فما اوّلته يا رسول الله، قال: العلم (6)

''حضرت ابن عمر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، میں سو رہا تھا، مجھے ایک پیالہ دودھ کا دیا گیا۔ میں نے پیا، یہاں تک کہ سیرابی کو میں نے دیکھا کہ میرے ناخنوں سے نکلنے لگی۔ پھر میں نے اپنا بچا ہوا عمرؓ ابن خطاب کو دے دیا۔ لوگوں نے کہا، یا رسول اللہ! آپؐ نے اس خواب کی تعبیر کیا نکالی؟

آپ نے فرمایا: علم۔''

سہیلؔ نے بھی اسی حدیث کے پس منظر میں ایک منظوم قطعہ منقبتِ عمرؓ کے عنوان سے کہا ہے اور اس میں تخیل اور حقیقت کو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ دل و دماغ کو ایک طرح کا جمالیاتی انبساط اور روحانی کیف حاصل ہوتا ہے۔ منقبتِ عمرؓ کے سلسلے میں یہ چند اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:

جن سے پائی دلِ روشن کی متاعِ نایاب — ایک ہے اس کے لیے عالمِ بیداری و خواب
حق کے نغمے دلِ ملہم میں تڑپ جاتے ہیں — چھیڑتا ہے رگِ جاں جب ملکوتی مضراب
یوں ہوا کرتے ہیں رُوَیا میں حقائق مضمر — جس طرح نور کی موجیں ہوں تہِ چادرِ آب
اعتبارات میں یوں ہوتے ہیں اسرار نہاں — مینھ کی بوند سموئے رہے جس طرح سحاب
صلحا تک پہ یہ فیضانِ ازل ہوتا ہے — کہیے کیا رتبۂ رُوَیائے شہِ عرش جناب
ہے صحیحین میں یہ ابنِ عمرؓ سے مروی — ایک دن سیّدِ کونینؐ نے دیکھا یہ خواب
کہ ہوا عالمِ انوار سے فیضانِ کرم — غیب سے اک قدحِ شیر ہوا نذرِ جناب
اولاً خود اسے سرکارؐ نے یوں نوش کیا — کہ طراوت سے ہوا ناخنِ پا تک سیراب
بچ رہا تھا جو پیالے میں پس از شربِ حضور — کر دیا آپ نے بذلِ عمرؓ بن الخطاب
بارک اللہ جسے فضلِ پیمبر مل جائے — کیوں نہ پھر فضل و شرف کا اسے محضر مل جائے

احادیثِ نبوی میں جس طرح حضرت عمرؓ کی مختلف خصوصیات و دینی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے، اسی طرح ان کے مکاشفات و کرامات سے متعلق بھی بہت سے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک روز حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ نے خواب دیکھا کہ فجر کی نماز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیچھے پڑھی اور آپ خود محراب سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ ایک عورت ایک طبق چھوہاروں کا لائی اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے رکھ دیا۔ آپؐ نے ایک چھوہارا اس میں سے لے کر میرے منھ میں رکھ دیا اور پھر دوسرا چھوہارا اٹھا کر میرے منھ میں دیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور دل میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت کا سرور تھا اور زبان پر ان چھوہاروں کی حلاوت باقی تھی۔ اس کے بعد میں وضو کر کے مسجد گیا اور حضرت عمرؓ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی اور وہ بالکل اسی طرح محراب سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ارادہ کیا کہ اپنا خواب بیان کروں، لیکن قبل اس کے میں کچھ بولوں، ایک نازک اندام لڑکی آئی اور اس کے ہاتھ میں ایک طبق چھوہاروں کا تھا۔ وہ مسجد کے دروازہ پر کھڑی ہوگئی اور وہ طبق حضرت عمرؓ کے سامنے لا کر رکھا گیا۔ انھوں نے اسی طرح دو چھوہارے یکے بعد دیگرے میرے منہ میں رکھے اور باقی دوسرے صحابہ کرام کو تقسیم کر دیئے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مجھے اور دیں تو فرمایا کہ اے بھائی! اگر رسولِ

خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رات کو تمھیں اس سے زیادہ دیے ہوتے تو میں زیادہ دیتا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوا کہ جو خواب میں نے رات کو دیکھا تھا وہ سب ان کو حضرت عمر کو کیونکر معلوم تھا؟ تو فرمایا: اے علی! مومن نورِ ایمان سے دیکھ لیتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! آپ سچ فرماتے ہیں، میں نے ایسا ہی خواب دیکھا تھا اور آپ کے ہاتھ سے بھی چھوہاروں کی وہی لذت پائی، جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے ملی تھی۔(7)

اسی واقعہ سے متعلق سہیلؔ کی ایک شاہکار نظم بہ عنوان "رؤیائے بوتراب" بڑی شہرت و مقبولیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں سہیل کے اندازِ بیان کی دلکشی اور فن کارانہ بصیرت کی کارفرمائی بطور خاص قابلِ ملاحظہ ہے۔ نظم کا آغاز اس انداز سے ہوتا ہے:

تاریخِ روزگار کا وہ تاب ناک دور — دست عمرؓ میں جب کہ خلافت کی تھی زمام
جب دینِ حق کا نیرِ اقبال تھا بلند — جب اوج پر تھا ملتِ بیضا کا احتشام
ہر صبح صبحِ عید کے مانند دل کشا — ہر شام مثلِ شامِ طرب عنبریں مشام
قصرِ کیاں پر رایتِ اسلام تھا بلند — زیرِ نگیں تھے مصر و فلسطین و رُوم و شام
اس بے نظیر عہدِ سعادت میں ایک شب — بھیگے تھے جب کہ رات کے گیسوئے مشک فام
گلیوں میں محوِ گشت خلافت مآب تھے — اور بستروں پہ چین سے سوئے تھے خاص و عام
سرکار بو تراب کی بھی لگ گئی تھی آنکھ — ازبسکہ تا بہ دیر نوافل میں تھا قیام
دیکھا کہ وقتِ فجر جماعت میں ہیں شریک — اور خود جنابِ سیدِ کونینؐ ہیں امام
محرابِ مسجدِ نبوی میں لگا کے ٹیک — بعد از نماز بیٹھ گئے سید الکرامؐ
آنکھیں ہوئیں جمالِ رسالت سے مستنیر — دل نے کہا لقد طَلَعَ البدرُ فی الظلام

حضرت علیؓ کی آنکھیں عالمِ خواب میں جمالِ رسالت سے روشن ہوگئیں اور ان کے دل کو یہ محسوس ہوا کہ گویا اندھیری رات میں اچانک چودھویں کا چاند جگمگانے لگا ہے، اسی اثنا میں:

ناگاہ اک کنیز چھوہاروں کی ٹوکری — لائی برائے پیش کشِ سرورِ انام
ان میں سے دو رُطب جو انھیں بھی عطا ہوئے — کام و دہن تھے فیضِ عذوبت سے شاد کام
جب خواب میں یہ دولتِ بیدار مل گئی — اٹھے جنابِ شیرِ خدا فائز المرام
دیکھا سپیدۂ سحری تو، رواں ہوئے — مسجد کی سمت شوقِ جماعت میں تیز گام
کی حضرتِ عمر نے امامت اور اس کے بعد — بیٹھے اسی طرح سے **كَمَا كَانَ في المنام**
چاہا علیؓ نے، عرض کریں ماجرائے خواب — اتنے میں اک صبیۂ کمسن، سبک خرام

آئی اور آ کے ایک چھوہاروں کی ٹوکری
کی نذرِ بارگاہ خلافت پس از سلام
ان میں سے دو جناب علی کو عطا ہوئے
پھر مسکرا کے یوں ہوئے فاروق ہم کلام
سرکار نے بھی دو ہی دیے تھے رطب تمھیں
اس حد سے کس طرح متجاوز ہو یہ غلام
حیراں ہوئے یہ سن کے جنابِ ابو تراب
اور کیوں نہ ہوں کہ ہے بھی تحیر کا یہ مقام
جلوے وہی نگاہِ بصیرت وہی مگر
پھر بھی تو ہے تفاوتِ بیداری و منام
سرکار بو تراب نے پھر ماجرائے خواب
آغاز سے بیان کیا تا بہ اختتام
یہ خواب اک حقیقتِ دینی کا درس ہے
یعنی رسولؐ اور عمرؓ میں ہے شبہِ تام
بعد از رسولِ پاک جو ہوتا کوئی نبی!
ہوتے عمرؓ ہی، اس میں نہیں ہے کوئی کلام

سہیلؔ کے قصائد و مناقب میں تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ الفاظ کی شان و شوکت، تراکیب کی بلند آہنگی، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور واقعہ نگاری کی مثالیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر احادیث کے منظوم تراجم میں انھوں نے جس فنکارانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں بڑی مشکل سے ملے گی۔ اس سلسلے میں ان کا ایک قطعۂ منظوم در ترجمۂ حدیث بہ عنوان عظمتِ خلفائے ثلاثہ حسبِ ذیل حدیث کے پس منظر میں کہا گیا ہے:

عن قتادة، ان انسا رضی الله عنه حدثهم، قال: صعد النبی صلی الله علیه وسلم احدا ومعه ابوبکر وعمر وعثمان فرجف، وقال: اسکن احد اظنه ضربه برجله، فلیس علیك إلا نبی وصدیق وشهیدان۔(8)

”حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن اُحد پہاڑ پر چڑھے اور آپ کے ساتھ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم تھے۔ پہاڑ ہلنے لگا تو آپؐ نے اپنے پاؤں سے اس کو اشارہ کیا کہ اے احد! ٹھہر جا۔ تیرے اوپر ایک نبی ہے، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔“

نظم مذکورہ کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

ایک دن کوہِ احد کے واسطے تھا یومِ عید
ہو گیا اس کا تفوق طُور پر بھی جب مزید
یعنی اس پر اتفاقاً جلوہ فرما ہو گئے
سیدِ عالم، امینِ وحیِ قرآنِ مجید
دو وزیرانِ رسالت یعنی بوبکرؓ و عمرؓ
جن کی عظمت پر ہے شاہد نطقِ فرقانِ حمید
تیسرے عثماں غنیؓ وہ چشمۂ جود و کرم
لی تھی میں نے بئرِ رومہ کے عوض جنت خرید
تھے یہ اصحابِ ثلاثہ بھی جلو میں ہم رکاب
ہو رہے تھے فیضِ انوارِ نبیؐ سے مستفید
کانپ اٹھا اس مقدمِ اجلال سے کوہِ احد
وانچناں لرزید کز صرصر بلرزد شاخِ بید

دیکھ کر یہ حال فرمایا رسولِ پاکؐ نے
اے احد! تجھ کو مبارک ہو یہ تاریخِ سعید
لرزہ بر اندام کیوں ہے آج تو، تیرے لیے
روزِ تمکین و شرف ہے، یومِ تبریک و نشید
کر رہے ہیں تجھ کو آج اپنے قدم سے سرفراز
اک پیمبرؐ، ایک صدیق اور باقی دو شہید
ہیں انھیں کے واسطے تو نعمتیں اسلام کی
ہے انھیں کی منقبت تو باغِ رضواں کی کلید
خود سیہ نامہ سہی لیکن انھیں کا ہے غلام
پھر سہیلِ زار کیوں ہو مغفرت سے نااُمید

سہیلؔ کی نعت و منقبت کا ماخذ اسلامی تاریخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بے معنی مبالغہ آرائی اور غیر ضروری مضمون آفرینی نہیں ملتی، جو سوداؔ اور انشاؔ وغیرہ کے قصائد میں نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں سہیل کا وہ منقبتی قصیدہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جو قصیدہ بہ تقریبِ عیدِ میلادِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عنوان سے معنون ہے۔ اس منقبتی قصیدے میں سہیلؔ نے احادیثِ نبوی اور اسلامی تاریخ کو مدِنظر رکھتے ہوئے حضرت علیؓ کے عزم و استقلال، ان کی انسان دوستی و خدا ترسی، ان کی حق پرستی و باطل شکنی، ان کی عبادت و ریاضت، ان کی قناعت پسندی، ان کی حق گوئی و بے باکی اور میدانِ کارزار میں ان کی حیرت انگیز شجاعت و دلیری وغیرہ کو نہایت صداقت آمیزی سے پیش کیا ہے۔ قصیدۂ مذکورہ کے حسبِ ذیل اشعار میں ممدوح کی شخصیت و سیرت کے ساتھ ان کی عظمت و جلالت کا نقشہ کتنے پر شکوہ اور خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کانپ اٹھا گردوں، زمیں میں زلزلہ پیدا ہوا
جب ازل میں یہ دلِ درد آشنا پیدا ہوا
حاملِ بارِ امانت یہ طلسمِ آب و گِل
لے کے فطرت سے غضب کا حوصلہ پیدا ہوا
گردنیں جن و ملک کی اس کے آگے جھک گئیں
زد گیا جس کو نسب کا ادعا پیدا ہوا
شجرۂ ممنوعہ کہیے یا اسے اسرارِ کون
کس کو اس تک دسترس کا حوصلہ پیدا ہوا
ہمتِ گستاخ نے توڑا ادھر عہدِ ادب
اس طرف فطرت سے شورِ حبّذا پیدا ہوا
آدمِ جنت نشیں آیا بسیطِ خاک پر
رازِ ہستی کے لیے عقدہ کشا پیدا ہوا
دل تڑپ اٹھا جہاں وارستگیِ شوق میں
بس وہیں اِک پیکرِ ناز و ادا پیدا ہوا
سر فروشِ عشق کا جس خاک پر ٹپکا لہو
اک ہجومِ لالہ و گل جابجا پیدا ہوا
مٹ کے راہِ عشق میں پائی حیاتِ سرمدی
پیکرِ خاکی بھی کیا معجز نما پیدا ہوا
فلسفی کیا اور کہاں تک اس کی پروازِ نگاہ
تا افق پہنچی نظر، اور منتہا پیدا ہوا
منتہا خود جرم ہے اہلِ محبت کے لیے
جس جگہ پہنچے کچھ اس سے ماورا پیدا ہوا
وہ تبحر جس سے حل ہو جائے رازِ کائنات
وہ تموج جس سے ہستی کا پتا پیدا ہوا

کعبہ کیا، وہ قبلۂ وحدت پرستانِ جہاں　　جس کے دامن میں شہِ خیبر کشا پیدا ہوا
غرۂ ماہِ رجب کا آج ہے یوم الکمال　　وہ مکمل شانِ استخلاف کا پیدا ہوا
سرخیِ خونِ شہادت جس کے عارض پر نثار　　جو ازل سے لالہ ساں، رنگیں قبا پیدا ہوا
چاندنی چھٹکی زمانے میں اُجالا ہو گیا　　دینِ کامل کا مہِ اوجِ علا پیدا ہوا
باغِ عرفاں میں نہ کیوں آئے بہارِ جاوداں　　وہ چمن بندِ ریاضِ اتقا پیدا ہوا

قصیدے کی تشبیب میں یہاں پر موسم بہار کی جلوہ آرائی اور جوشِ بہار کی معجز نمائی بطورِ خاص قابل ملاحظہ ہے۔

پھر خیابانِ جہاں میں آ گئی فصلِ بہار　　پھر چمن میں طائروں کا چہچہا پیدا ہوا
فیض سے پوشش نمو کے لہلائیں کھیتیاں　　پھر بسنت آئی، دلوں میں ولولہ پیدا ہوا
سبز وہ کھیتوں کے پتے، زرد وہ سرسوں کے پھول　　دشت میں بھی منظرِ بستاں سرا پیدا ہوا
کوئلیں کوکیں، ہوئیں آموں کی شاخیں گل فروش　　گل کھلے، بلبل کو پھر جوشِ نوا پیدا ہوا

اور صرف دو اشعار میں کتنی خوب صورتی سے گریز کی منزل سے گزر کر مدح کے میدان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

چاندنی لائی ہے کس کے خیر مقدم کی خبر　　مرحبا کا غل سمک سے تا سما پیدا ہوا
شادیانے گا رہے ہیں طائرانِ نغمہ سنج　　عیدِ میلادِ علیؓ کا غلغلہ پیدا ہوا

ایک دوسرا قصیدہ بہ عنوان قصیدہ تقریب ابن ابی طالبؓ بھی بڑی اہمیت و مقبولیت رکھتا ہے۔ قصیدے کی تمہید میں فلسفیانہ سنجیدگی، اور متصوفانہ متانت کی کارفرمائی مشامِ جاں کو معطر و معنبر کر دیتی ہے۔ یہاں پر زیرِ بحث قصیدے کے کچھ منتخب اشعار اہلِ ذوق کے ذہن و دل کی تسکین کا باعث ہو سکتے ہیں:

بلائیں لیں قیامتیں نہ کیوں ہر ایک گام کی　　مرے جنوں نے سیکھ لی، روش ترے خرام کی
جنونِ عشق کی قسم نہیں ملک سے شان کم　　ترے شہیدِ عشق کی ترے اسیرِ دام کی
چلا ہے شوق بے خبر جنوں میں جانیے کدھر　　نہ کوئی منزلِ سفر نہ قید کچھ مقام کی
جراحتِ دل و جگر نہیں رہینِ چارہ گر　　نہ سعی اندمال کی نہ حاجت التیام کی
بس اک خمارِ آرزو بس اک جنونِ جستجو　　نہ پاؤں سر کا ہوش ہے، نہ فکر ننگ و نام کی
ہم اس جہاں میں ہیں جہاں زیاں ہے خود غمِ زیاں　　نہ کام ہوش کا یہاں، نہ کوئی بات کام کی
ترے نثار بے خودی! مٹا فریبِ آگہی　　پیامِ ہوش بن گئی صدا شکستِ جام کی
کھلا طلسمِ رنگ بو، اٹھا حجاب ما و تو　　جنوں نے راہ کھول دی حقائقِ انام کی

ملیں نظر کو وسعتیں عیاں ہوئیں حقیقتیں سپہر بے مدار کی، جہانِ بے نظام کی
حجاب کیا، ظہور کیا، بقدرِ ظرف ہے عطا کہیں ادا جمال کی کہیں صدا کلام کی
پہنچ کسی کی طور تک کسی کی بزمِ نور تک کہیں ادا جمال کی کہیں صدا کلام کی
وہ کون؟ ماہ و مشتری غبار جس کی راہ کے فلک پہ مہرِ خاوری شبیہ جس کے جام کی

قصیدے کے آخر میں سہیلؔ امیر المومنین حضرت علی سے برجستہ مخاطب ہوکر ان کی بارگاہ میں نذرانۂ محبت انتہائی خلوص وعقیدت سے پیش کرتے ہیں۔

صفیِ مصطفی ہو تم، علیِ مرتضیٰ ہو تم سمیِ کبریا ہو تم، قسم تمھارے نام کی
طفیلِ بوتراب ہو، تو کیوں نہ کامیاب ہو دعا کشود کار کی غرض حصولِ کام کی
سہیلؔ تجھ کو مرحبا لکھی وہ نظمِ بے بہا فضا میں گونج اُٹھی صدا، تحیت و سلام کی
خدا نے ذوالفقار دی، نبی نے پارۂ جگر قبول ہو یہ نذر بھی سہیلِ مستہام کی

سہیلؔ جب منقبت نگاری کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان میں جوشِ عقیدت کا دریا امنڈ آتا ہے اور اپنے اس اخلاص وعقیدت اور جذبۂ ایمانی کے اظہار کے لیے اپنی قادرالکلامی اور فنی مہارت کو نہایت دلکش ودل نشیں انداز میں بڑا کارلاتے ہیں۔ حضرت علی کی ولادت کے سلسلے میں سہیلؔ کا تیسرا قصیدہ بہ عنوان قصیدہ برتقریب عید میلادِ اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالبؓ ہے۔ اس قصیدے کے آغاز میں بطورِ تشبیب وتمہید سہیلؔ کے حسبِ ذیل اشعار قابل ذکر ہیں، جو نہ صرف قصیدۂ مذکورہ کی دلکشی میں ایک خوشگوار اضافہ کرتے ہیں بلکہ سہیل کی فنکارانہ عظمت کا ثبوت بن جاتے ہیں:

بنت اسد، اُمّ علی ہے آج مہمانِ حرم اب عالمِ ملکوت سے کچھ کم نہیں شانِ حرم
پھیلی ضیائے علم و دیں، روشن ہوئی شمعِ یقیں ہے مطلعِ ماہِ مبیں، چاکِ گریبانِ حرم
حسن اب نئے انداز سے اٹھا ہے خوابِ ناز سے نکلا حجابِ راز سے، مہرِ درخشانِ حرم
یہ بام و دَر کی روشنی، چھٹکی ہوئی یہ چاندنی اہلِ بصیرت! دیدنی ہے آج سامانِ حرم
ہے عیدِ میلادِ علی، ہنسنے لگی دل کی کلی پھیلی گلوں میں کھلبلی نکلے اب ارمانِ حرم
وہ سرورِ عالی نسب، وہ حیدر و صفدر لقب وہ نیرِ برجِ عرب، وہ گوہرِ کانِ حرم
پیدا ہوا خود اس کے گھر، دی جان جس کے نام پر مولد ہے شایانِ علی، مولود شایانِ حرم

تشبیب کے بعد قصیدہ کے دوسرے مطلع سے حضرت علی کی سیرت نگاری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سہیلؔ کی شاعری پر عرفی، خاقانی، اور قاآنی کا رنگ نمایاں طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ وہی تشبیہات واستعارات وہی برجستگی و بے ساختگی، وہی خوبصورت تراکیبِ الفاظ، اور وہی زورِ بیان

دل و دماغ میں سرور انگیزی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں:

وہ قدِ دلجوئے علی، سروِ خیابانِ حرم
وہ طاقِ ابروئے علی، محرابِ ایوانِ حرم
بحرِ سخا، ابرِ کرم، فخرِ ملل، صدرِ امم
وہ جس کا جدّ محترم، معمارِ بنیانِ حرم
وہ صاحبِ مجد و شرف، گوہر بہ لب، عمّاں بکف
ماہِ عرب، شاہِ نجف، لعلِ بدخشانِ حرم
وہ جس کے پرتو سے خزف بن جاتے ہیں دُرّ نجف
جس کی بدولت ہر طرف جاری ہے فیضانِ حرم
جس کے عمل سے مفتخر، تنزیلِ ھَلْ مِنْ مُّدَّکِرْ
جس نے سنواری آ کے پھر زلفِ پریشانِ حرم
تکمیل جس پر منحصر، توحید جس سے مقتدر
مدت سے جس کے منتظر تھے کاخ و ایوانِ حرم
سردفترِ اربابِ دیں، سرمستِ صہبائے یقیں
سررشتۂ حبل المتین، سرخیلِ اعیانِ حرم
وہ جس کا حسنِ نازنیں، آرائشِ دنیا و دیں
وہ جن کی تابندہ جبیں، شمعِ شبستانِ حرم
وہ قدوۂ انصارِ دیں، وہ خازنِ اسرارِ دیں
وہ حارسِ گل زارِ دیں وہ حافظِ شانِ حرم
وہ صیدِ گیسوئے نبی، پروانۂ رُوئے نبیؐ
وہ زورِ بازوئے نبی، شیرِ نیستانِ حرم
وہ مرکزِ ادوارِ حق، وہ مہبطِ انوارِ حق
وہ نقطۂ پرکارِ حق، وہ موجِ عمّانِ حرم
وہ زیبِ آغوشِ نبی، وہ زینتِ دوشِ نبی
یارِ وفا کوشِ نبی، سروِ خرامانِ حرم
تحریرِ عنوانِ یقیں، تفسیرِ قرآنِ مبیں
تصویرِ فیضانِ امین، طفلِ دبستانِ حرم
جو شارحِ الہام ہے جو معنیٔ اسلام ہے
جس کا مبارک نام ہے طغرائے عنوانِ حرم
وہ موضح الاحکام ہے، جو مبطل الاوہام ہے
جو اول الاسلام ہے، مابینِ شُبانِ حرم
دارائے انہارِ جناں، دانائے اسرارِ نہاں
آقائے ابرارِ جہاں، مولائے سلطانِ حرم
مرحب فگن، خیبر کشا، باطل شکن، تیغِ خدا
خضرِ زمن، شمعِ ہدیٰ، جانِ جہاں، جانِ حرم
دہ آیتِ علم و ہنر، وہ رایتِ فتح و ظفر
وہ غایتِ اہلِ نظر، وہ صدرِ ایوانِ حرم

دیگر خلفائے کرام کی طرح حضرت علیؓ کے فضائل و کمالات سے متعلق بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ترمذی شریف کی ایک حدیث یہ ہے کہ:

عن عمران بن حصین ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: إن علیا منی وانا منه وهو ولی کل مؤمن بعدی. (9)

''حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ علی میرے ہیں اور میں ان کا ہوں، اور وہ تمام مومنوں کے ولی ہیں۔''

سہیلؔ نے سیّد الشہدا حضرت امام حسین کی منقبت میں بھی ایک نظم بہ عنوان منقبتِ حسین کہی

ہے۔ منقبتی قصیدہ دراصل جمالِ فن اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بڑی اہمیت اور مقبولیت رکھتی ہے۔ اس قصیدے میں سہیلؔ کے کمالِ سخن وری اور ان کی عظمتِ فکر کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ منقبت کی تمہید میں ان کے اندازِ بیان کا فلسفیانہ رنگ خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہے۔

اے کہ فنائے ذات، حل تیرے طلسمِ راز کا
زخمِ جگر دریچہ ہے، تیرے حریمِ ناز کا

اے ہمہ جلوۂ جمال! دی تھی اگر نظر ہمیں
پھر یہ حجاب کس لیے دام گہِ مجاز کا

المدد اے جنونِ شوق! دے مجھے درسِ بےخودی
صفحۂ دل سے محو ہو نقش تو امتیاز کا

میں بھی حریف بن سکوں، دُردکشانِ دَرد کا
میں بھی شریک ہو سکوں، خلوتیانِ راز کا

حجلۂ رازِ قدس تک قصد ہے ترک تاز کا
حوصلہ حد سے بڑھ چلا عشقِ کرشمہ ساز کا

دورِ سپہر ایک گام، چشمۂ مہر عکسِ جام
بادیہ گردِ شوق کا، بادہ کشِ نیاز کا

رہروِ منزلِ طلب، دیکھیے کامراں ہو کب؟
حشر ہے گامِ اولیں، اس سفرِ دراز کا

جذبِ نظر کی کیا خطا، دستِ جنوں کا جرم کیا؟
آپ بے قرار تھا، پردہ حریمِ ناز کا

سوختگی ہے پیش کش، بارگہِ جلال کی
طور ادا شناس تھا، برقِ نظر گداز کا

مشہدِ حق میں ہر طرف، اہلِ جنوں ہیں سر بکف
دیکھیں ملے کسے شرف خلعتِ امتیاز کا

دیتے ہیں اپنے ہاتھ سے، جامِ حیاتِ سرمدی
پوچھتے کیا ہو مرتبہ، بسملِ تیغِ ناز کا

ساقی! بے دریغ بخش، صدقہ نگاہِ ناز کا
مجھ کو بھی ایک جام دے مصطبۂ حجاز کا

آج سے مے کشوں کی عید جمع ہیں تشنگانِ دید
کاش ادھر بھی رخ پھرے چشمِ فسوں طراز کا

کون و مکاں ہیں غرقِ نور، شعلہ فشاں ہے برقِ طور
آج جہاں میں ہے ظہور کس کے شہیدِ ناز کا

منقبت کے مطلعِ ثانی سے حضرت امام حسین کے یومِ ولادت کا آغاز ہوتا ہے اور اسی ضمن میں ان کی سیرت و کردار کو بھی بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یومِ ولادت آج ہے، سیدِ پاک باز کا
غیر سے باغِ دہر کو حکم ہے احتراز کا

نوکِ سناں پہ جس نے دی دعوتِ دینِ سرمدی
آج قدوم ہے اسی سیدِ سرفراز کا

کانپ رہا ہے آسماں، صورتِ پیرِ ناتواں
بل بے نہیبِ جانستاں، بازوے تیغِ ناز کا

طرہ ہے مہر آسماں، جس کے کلاہِ ناز کا
سایہ ہے طوبیِ جناں، جس کے قدِ دراز کا

جس کی ادائے دلربا مظہرِ شانِ کبریا
وہ گلِ ارغواں قبا، گل کدۂ مجاز کا

جس کا کمال ایک شان، خلقِ رسولِ پاک کا
جس کا جمال اِک ظلال، قدرتِ کارساز کا

سروِ ریاضِ بوتراب، موردِ سید الشباب
یعنی وہ ایک آفتاب، مطلعِ عز و ناز کا

حاصلِ خرمنِ بتول، گوہرِ دامنِ رسولؐ کون! وہ سید الفحول، مملکتِ مجاز کا
تشنۂ دشتِ کربلا، کشتۂ خنجرِ رضا بندۂ بندگی ادا، ایزدِ بے نیاز کا
لب وہ شہیدِ ذکرِ حق، لالۂ طور کے ورق دل وہ خزینہ نور کا، سینہ سفینہ راز کا
ناصیہ وقفِ آستاں، سر تہِ تیغِ امتحاں شان یہ ہے سجود کی، رنگ یہ ہے نماز کا
جس کے غلاموں کی وِلا، خط رضائے مصطفےٰ مغفرتِ ابد صلہ، جس کے ثنا طراز کا
تجھ کو سہیلؔ مرحبا، عزِّ قبول مل گیا حشر میں اوج دیکھنا، پیشِ کشِ نیاز کا

ان تمام نعتوں اور منقبتوں کے علاوہ سہیلؔ عہد خلافت کے دیگر آئمہ وصحابہ کرام سے متعلق واقعات کو بھی نظم کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نعتوں کے علاوہ حضرات شیخین، جناب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی منقبت میں علاحدہ نظمیں بھی ہیں جو مذہبی اور فنی ہر حیثیت سے معیاری ہیں۔ حضرت ذالنورینؓ کی شہادت پر ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ عہد خلافت کے اور واقعات بالخصوص جو حضرت خالد، حضرت امیر معاویہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدۃ ابن الجراح سے متعلق ہوں اگر ان میں سے کوئی واقعہ منتخب کر کے لکھ بھیجیں تو ان کو بھی نظم کر دوں۔" (10)

خط کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سہیلؔ کو منقبتی شاعری سے کتنی گہری دل چسپی تھی۔ شعر گوئی پر انھیں کس درجہ قدرت حاصل تھی اور کسی واقعے کو نظم کے سانچے میں ڈھال دینا ان کے لیے کتنا آسان تھا۔

بہر حال! ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سہیلؔ کی نعتیہ و منقبتی شاعری میں عظمتِ رسالت کا گہرا شعور اور صحابہ کرام کے مقام و مراتب کا مکمل احساس موجود ہے۔ اور ان کا یہی وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی بنا پر وہ نعت و منقبت کی بزمِ شرف میں حالی اور اقبال کے ہم نشین بن جاتے ہیں۔ اور ان کا کلام دورِ جدید کے نعت گو اور منقبت نگار شعرا کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ تابشِ سہیل، مرتبہ: افتخار اعظمی، نامی پریس لکھنؤ، اکتوبر 1958ء، صفحہ: 21
2۔ کلیاتِ سہیل، مرتب: عارف رفیع، بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی، اپریل 1988ء، صفحہ: 8
3۔ اقبال سہیل کا نام بچپن میں ابد انظر حامد تھا۔ بعض لوگ اکھین صاحب کے نام سے بھی خطاب کرتے تھے۔

4۔ مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب، رقم الحدیث 6018

5۔ الفاروق، حصہ اول، شبلی نعمانی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، بار اول، صفحہ:114

6۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب التعبیر، باب اللبن، رقم الحدیث:7006

7۔ سیرتِ خلفائے راشدین، مولانا عبدالشکور لکھنوی، خواجہ پریس، دہلی، 1974ء، صفحہ:158

8۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب مناقب عثمان بن عفان أبي عمرو القرشي رضي اللہ عنہ، رقم الحدیث:2697

9۔ سلسلۃ احادیث صحیحۃ، المناقب والمثالب، باب فضائل علی، رقم الحدیث:3276

10۔ مکتوب بنام مولانا اسلم جیراج پوری، مندرجہ: ارمغانِ حرم، اقبال سہیل، نامی پریس لکھنؤ، 1960ء، صفحہ: ح ط

□□□

حدّ ادب بغیر نہ شائستگی بغیر
عارف ہے تو کلام نہ کر آگہی بغیر

بزم غزل میں تجھ پہ روا کج کلاہیاں
بزم ولا میں پاؤں نہ دھر عاجزی بغیر

القاب کی طلب، نہ کسی مرتبے کی چاہ
مولاؑ کا ذکر کیجیو پیشہ وری بغیر

رکھیو مزاجِ مدح کو پنجہ کشی سے دور
مضموں سے داد کھینچیو رسّہ کشی بغیر

قامت حدیثِ نور کے فیتے سے ناپیو
قدّ علیؑ نہ دیکھیو دوشِ نبیؐ بغیر

اے چشمِ برطرف! یہ سراپا علیؑ کا ہے
کُھلتا نہیں ہے غیب سے وابستگی بغیر

کچھ یوں بھی کھلکھلاتی ہے دیوار ہر برس
کعبہ اداس لگتا ہے اِس کی ہنسی بغیر

ایسے سخن پہ ملتی نہیں آسماں سے داد
ترکیب ہو عظیم کی جس میں علیؑ بغیر

تاریخ تو بتا کہ محمدؐ کبھی لڑے؟
دستِ خدا بغیر کفِ حیدری بغیر

کیا تیغ کا بیان ہو لا سیف کے بِنا
کیا تذکرہ ہو مرد کا اِلاّ علیؑ بغیر

(عارف امام)

مولانا حسن رضا خان کی منقبت نگاری

پروفیسر نوید احمد گل/محمد عاصم مجید

ABSTRACT: Moulana Hassan Reza Khan Barelvi was the Younger brother of Imam Ahmad Reza Khan Barelvi. He was also a great religious scholar and Sufi but at the same time he was the most underrated classical poet. He left considerable literary assert including five poetry books that have been published together as a "Kulliyat-e-Hassan". This study aims to provide a thorough insight on the "Manq'bat Nigari" of Maulana Hassan, and also to evaluate them on latest critical design including quantitative and qualitative methods of literary research. Readers will go through form the analysis of Manaqib of Four Khaliphs (Ridwan-u-Allah Alihum-ul-ajmaen), Ahl e Bait e Athar (Alihum-us-Salam) and Sufi Sants (Ghuos e Azam, Ghareeb Nawaz, Badee-ud-Deen, Achay Miyan Rahmat-ul-Allah Alihum ajmaen).

عربی لفظ ''منقبت'' (مادہ، ن ق ب) کے لغوی معنی تعریف وتوصیف کے ہیں (فیروز اللغات، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۰۷)۔ صحابہ کرامؓ، اہلِ بیت اطہارؓ اور اولیاء عظامؒ کے متعلق کسی بھی ہیئت میں کہے گئے اشعار منقبت کہلاتے ہیں یہ صنفِ معنوی، قصیدہ کی طرح ہیئت واجزا یا دنیوی صلہ کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اس کا محرک خالص جذبۂ عشق اور مقصود نجاتِ اخروی ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے منقبت میں مدح خوانی، سیرت نگاری، اظہارِ عقیدت اور نسبت وتوسل کا حوالہ دے کر استغاثہ واستمداد کو شامل کیا جاتا ہے۔منقبت کی بنیاد سراسر مذہبی عقیدہ پر ہوتی ہے اور شاعر کا وجدان خود مخصوص کیفیت اور موضوع کے لحاظ سے مناسب پیرایۂ اظہار منتخب کرتا ہے۔

اردو ادب میں منقبت نگاری کی روایت کے تانے بانے دکنی شعرا سے جا ملتے ہیں۔ دراصل آغازِ دیوان، منظوم داستان یا مثنوی میں حمد ونعت کے بعد منقبت نگاری حفظِ مراتب کا قرینہ بن چکی تھی۔ یوں

تمام اہم شعرا نے کسی نہ کسی ہیئت اور صنف میں منقبت نگاری ضرور کی اور یوں اردو ادب میں منقبت نگاری کی ایک شاندار روایت قائم ہوئی۔منقبت نگاری کے سلسلہ میں اب تک کئی اہم تحقیقی وتنقیدی کام بھی ہو چکے ہیں لیکن اس حوالے سے مولانا حسن بریلوی کی منقبت نگاری سے ابھی تک ارباب نقد ونظر نے انصاف نہیں کیا اور جو کام ہوئے ہیں اکثر میں ان کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو سرسری مثلاً پروفیسر احسن زیدی کے مقالہ ''اردو میں منقبت نگاری'' میں بھی ان کا ذکر نہیں ہے نیز ''چند شعرائے بریلی'' از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ میں انھیں محض غزل گو اور نعت گو شاعر بتایا گیا ہے اور مثنوی نگاری کے ارتقا کا تذکرہ کرتے ہوئے ضمناً ان کی منقبت نگاری کا بھی ذکر آ گیا (ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ، ''چند شعرائے بریلی''، ص ۱۵۴) جبکہ محترمہ گلشن آرا کے ایم فل کے مقالہ بعنوان ''مولانا حسن بریلوی کی ادبی خدمات'' میں انھوں نے ''ذوقِ نعت'' میں شامل چند مناقب کا ذکر کرتے ہوئے صرف منقبتِ غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اشعار کو نمونہ کلام کے طور پر پیش کیا ہے۔(گلشن آرا، ''مولانا حسن بریلوی کی ادبی خدمات''، ص۵۹-۶۰) مزید برآں ''سنی دنیا، مولانا حسنؒ بریلوی نمبر'' (شمارہ؛ اگست ۱۹۹۴ء) میں مولانا شبنم کمالی کا ایک مضمون بعنوان ''حضرت حسن بریلوی اور مناقبِ صحابہ واولیاء'' تو شامل ہے لیکن اس مضمون کا اسلوب وانداز شروع سے آخر تک ایک مخصوص رنگِ مسجد ومکتب میں ڈوبا ہوا ہے۔اس مضمون میں اس دیرینہ کوتاہی کی تلافی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا محمد حسنؒ رضا خان بریلوی)۱۳۲۶ھ-۱۲۷۶ھ، دہلی)، مولانا نقی علی خانؒ (۱۲۹۷ھ-۱۲۴۶ھ) کے فرزندِ ارجمند اور مولانا احمد رضا خانؒ (۱۳۴۰ء-۱۲۷۲ء) کے برادرِ اصغر تھے۔وہ اعلیٰ پایہ عالمِ دین اور شاعر تھے جنھوں نے خاطر خواہ ادبی اثاثہ چھوڑا۔ان کی تصانیف میں متفرق کتب اور رسائل ("تزک مرتضوی"، "دینِ حسن"، "آئینہ قیامت"، "بے موقع فریاد کا مہذب جواب"، "نگارستانِ لطافت"، "در ذکر میلاد شریف" وغیرہ) شامل ہیں۔علاوہ ازیں وہ ماہنامہ ''بہارِ بے خزاں'' اور ہفتہ وار اردو اخبار ''روز افزوں'' بھی جاری کرتے رہے۔نعت گوئی میں مولانا احمد رضا خان ہی سے اصلاح لی جبکہ غزل میں داغ دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ان کی اہم شعری مجموعہ ہائے کلام یہ ہیں:

دیوانِ نعت "ذوقِ نعت" (۱۳۲۶ھ)
مثنوی در تذکرہ غوثِ اعظم ''وسائلِ بخشش'' (۱۳۰۹ھ)
مثنوی در ردِ حریفاں ''صمصامِ حسن بردابرِ فتن'' (۱۳۱۸ھ، دابر بمعنیٰ جڑ)
کلام مجاز پر مشتمل اردو دیوان "ثمرِ فصاحت" (۱۳۱۹ھ)
فارسی دیوان ''قندِ پارسی'' (س۔ن)

ان کتب کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ ان کے نام تاریخی ہیں اور حروفِ ابجد کے ترقیمی حساب سے مستخرج ہیں۔ یہ مجموعے ''کلیات حسن'' (مرتبہ: محمد ثاقب رضا قادری؛ محمد افروز قادری، لاہور، اکبر بک سیلرز، ۲۰۱۲ء، صفحات ۷۸۸-۱) کی صورت میں یکجا ہو چکے ہیں (اور چوں کہ اشعار کے حوالے سے پیشِ نظر تحقیق کا بنیادی ماخذ یہی کلیات ہے اور تکرار سے بچنے کے لیے مکمل حوالہ دانستہ نہیں دیا گیا)۔ حفظِ مراتب کے لحاظ سے بات کی جائے تو اس کلیات میں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مناقب، اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کی مناقب، منقبتِ امامِ اعظم رضی اللہ تعالی عنہ، مناقبِ غوث پاک رضی اللہ عنہ، منقبتِ خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ، مناقبِ بدیع الدین رحمتہ اللہ علیہ اور منقبتِ اچھے میاں رحمتہ اللہ علیہ موجود ہیں۔

کلیات حسن بریلوی میں ''سات ہزار نوسو (۷۹۰۰)'' اشعار موجود ہیں؛ ذوقِ نعت: ۲۳۰۴، وسائلِ بخشش: ۸۸۰، صمصامِ حسن: ۳۳۰، قند پارسی: ۲۶۷، ثمرِ فصاحت: ۳۴۸۸، قطعات و متفرق اشعار: ۶۳۱۔ اس مکمل کلام میں سے کل ''پانچ سو اٹھائیس (۵۲۸)'' اشعار مندرجہ بالا شخصیات کی مناقب پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ترتیب وار ان تمام شخصیت کے حوالے سے مولانا حسن بریلوی کی منقبت نگاری کا موضوعاتی، عروضی اور جمالیاتی تجزیہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ (۱۳ھ)

مولانا حسن بریلوی کے کل کلام میں شانِ صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ میں تیرہ (۱۳) اشعار پر مشتمل غزلیہ ہیئت اور اسلوب کی حامل ''منقبتِ خلیفۂ اول'' کے عنوان سے ایک خوبصورت منقبت موجود ہے جس میں صدیقِ اکبر کی مدح، ان کی فضیلت، توسل، ردِ دشمناں، بارگاہِ نبوی ﷺ میں افضلیّت اور سیرتِ مبارکہ کے اکثر واقعات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

بیاں ہو کس زباں سے مرتبہ صدیق اکبرؓ کا
ہے یارِ غار محبوبِ خدا صدیقِ اکبرؓ کا (ایضاً، ص۶۶)

گدا صدیق اکبر کا خدا سے فضل پاتا ہے
خدا کے فضل سے میں ہوں گدا صدیق اکبرؓ کا (ایضاً)

ضعیفی میں یہ قوت ہے ضعیفوں کو قوی کر دیں
سہارا لیں ضعیف و اقویا صدیق اکبرؓ کا (ایضاً)

صفا وہ کچھ ملی خاک سرِ کوئے پیمبر ﷺ سے
مصطفیٰ آئنہ ہے نقشِ پا صدیقِ اکبرؓ کا (ایضاً، ص۶۷)

کثرتِ ذکرِ محبوب کا شعری قرینہ یہی ہے کہ اس کا نام ردیف میں لایا جائے تاکہ بار بار اسی کا ذکر ہو لہٰذا اس منقبت میں بھی ''صدیقِ اکبرؓ'' سے قلبی تعلق کا ثبوت دیتے ہوئے ردیف میں ان کا نام لایا گیا ہے۔ عروضی لحاظ سے اس منقبت میں ''بحرِ ہزج مثمن سالم'' (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) مستعمل ہے۔ اپنے مخصوص اور صنائع بدائع سے بھر پور اسلوب میں حسن بریلویؒ نے یہاں تکرارِ لفظی، تضاد، اور مراۃ النظیر وغیرہ جیسی صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ مزید برآں خوبصورت فارسی تراکیب کا بھی برمحل اہتمام کیا گیا ہے جو اشعار کی خوبی اور لطافت میں تو اضافہ کرتی ہی ہیں لیکن نہ روانی متاثر کرتی ہیں اور نہ آج کے سنجیدہ قاری پر بھی گراں گزرتی ہیں۔

حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲۴ھ)

حسن بریلوی نے منقبتِ صدیق اکبر کے بعد ''منقبتِ خلیفۂ دوم'' پیش کی ہے یہ گیارہ (۱۱) اشعار پر مشتمل منقبت شانِ فاروقِ اعظمؓ کے حوالے سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے کیوں کہ اس میں ان کی سیرتِ مبارکہ کے حوالہ دیتے ہوئے ان کے ساتھ کچھ ایسی خصوصیات بھی منسوب کی گئی ہیں جو عموماً کم کم سننے میں آتی ہیں مثلاً ان کے جود و کرم کا تذکرہ کر کے ان کی بارگاہ میں نہایت متغزلانہ انداز میں استغاثہ پیش کیا گیا ہے:

نہیں خوش بخت محتاجانِ عالم میں کوئی ہم سا
ملا تقدیر سے حاجت روا فاروقِ اعظمؓ سا (ایضاً، ص ۶۸)
ترے جود و کرم کا کوئی اندازہ کرے کیوں کر
ترا اک اک گدا فیض و سخاوت میں ہے حاتم سا (ایضاً)
خدارا مہر کن اے ذرہ پرور مہرِ نورانی
سیہ بختی سے ہے روزِ سیہ میرا شبِ غم سا (ایضاً)

اس کے علاوہ منکرینِ خلافت و شانِ فاروقِ اعظم کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ بحرِ ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) جیسے مترنم آہنگ کا استعمال کرتے ہوئے، تکرار و تضاد، رعایتِ لفظی اور تراکیب سازی میں ندرت پیدا کرنا اس منقبت کے اہم فنی لوازمات ہیں۔ علاوہ ازیں اس منقبت کا مقطع فارسی زبان میں ہے جو اس کو دوسری منقبتوں سے ممتاز کرتا ہے:

حسن در عالمِ پستی سرِ رفعت اگر داری
بیا فرقِ ارادت بر درِ فاروقِ اعظمؓ سا (ایضاً، ص ۶۹)

(حسن اگر پستی کے عالم میں تُو سربلندی کا خواہاں ہے تو آ کر فاروقِ اعظمؓ کے در پر اپنا ماتھا رگڑ۔)

پوری غزل میں ردیف ''سا'' اردو زبان کے حوالے سے حرفِ تشبیہ ہی تھا لیکن مقطع میں ''سا'' فارسی مصدر سے مشتق ہے۔ یوں ردیف ''سا'' کو جس خوبصورتی کے ساتھ بین اللسانی تناظر میں نبھایا گیا ہے عموماً اس کی مثال کم ہی ملتی ہے اور اس طرح یہاں خوبی در خوبی کا سماں پیدا ہو گیا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۳۵ھ)

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں بھی مولانا حسن بریلوی نے تیرہ (۱۳) اشعار پر مشتمل ایک منقبت بعنوان ''منقبتِ خلیفۂ سوم'' لکھی ہے۔ اس منقبت کی ردیف میں بھی منقبتِ صدیقِ اکبر کی طرح صاحبِ منقبت کا نام موجود ہے اور اس کے چار مطلعے ہیں۔ موضوعاتی لحاظ سے ہماری روایتی غزل کی چھاپ اس منقبت پر واضح طور پر نظر آتی ہے۔ حضرتِ عثمانِ غنیؓ سے والہانہ وابستگی کا اظہار، ان کی حسن ظاہر کے ساتھ ساتھ لطافتِ باطنی کی مدح، ان کی جود و سخاوت کا بیان اور توسل و استغاثہ وغیرہ اس منقبت کے اہم موضوعات ہیں:

اللہ سے کیا پیار ہے عثمانِؓ غنی کا
محبوبِ خدا یار ہے عثمانِ غنیؓ کا (ایضاً، ص ۷۰)

جس آئنہ میں نورِ الٰہی نظر آئے
وہ آئنہ رخسار ہے عثمانِ غنیؓ کا (ایضاً)

سرکار سے پائیں گے مرادوں پہ مرادیں
دربار یہ دُر بار ہے عثمانِ غنیؓ کا (ایضاً، ص ۷۱)

آزاد ، گرفتارِ بلائے دو جہاں ہے
آزاد گرفتار ہے عثمانِ غنیؓ کا (ایضاً)

بیمار ہے جس کو نہیں آزارِ محبت
اچھا ہے جو بیمار ہے عثمانِ غنیؓ کا (ایضاً)

اسلوب اور لفظیات کے اعتبار سے بھی اس منقبت میں خاص صوفیانہ رنگِ تغزل جھلکتا ہے۔ فنی نکتۂ نظر سے یہ منقبت چاروں خلفا کی شان میں لکھی جانے والی مناقب میں زیادہ رفعت کی حامل ہے کیوں کہ اس میں ''بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف'' (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن) بروئے کار لاتے ہوئے صنائع بدائع کا بھرپور التزام کیا گیا ہے اور رعایتِ لفظی سے لے تضاد، تکرار، مقابلہ، مبالغہ اور تجنیس جیسی صنعتوں کو بروئے کار لا کر مولانا حسن بریلوی نے فنِ شاعری پر اپنی مہارت کا منھ بولتا ثبوت پیش کیا ہے۔

حضرتِ علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم (۴۰ھ)

مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شان میں بارہ (۱۲) اشعار پر مشتمل ''منقبتِ خلیفۂ چہارم'' اپنی نوعیت کی منفرد منقبت ہے جس میں مولانا حسن بریلوی اپنے داخلی انتشار کی غمازی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی وِلائے مرتضوی سے ڈھارس بندھائی بھی کرتے نظر آتے ہے۔ اس کا آغاز ہی منقبتِ مولا علی رضی اللہ تعالی عنہ کے عمومی انداز میں ہونے کے بجائے جذبۂ حب الوطنی اور جذبۂ عشق میں کشمکش کی کمال منظرکشی سے ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ نجف کی عظمت کا اعتراف اور چرچا بھی ہے:

اے حبِّ وطن ساتھ نہ یوں سوئے نجف جا
ہم اور طرف جاتے ہیں تو اور طرف جا (ایضاً، ص ۲۷)
اے کلفتِ غم بندۂ مولا سے نہ رکھ کام
بے فائدہ ہوتی ہے تری عمر تلف جا (ایضاً)
اے طلعتِ شہ آ تجھے مولیٰ کا قسم آ
اے ظلمتِ دل جا تجھے، اُس رُخ کا حلف جا (ایضاً)

اس منقبت میں بھی ''بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف'' (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن) مستعمل ہے اور یہ محاسن کے اعتبار سے بھی صنعتوں سے بھرپور ہے تکرار، تضاد، مبالغہ، مقابلہ اور لف و نشر وغیرہُم نیز تراکیب سازی کی ندرت کے حوالے سے بھی یہ منقبت اہم ہے۔

اہلِ بیتِ اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین

کلامِ حسن میں اہلِ بیت اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین کی شان میں عنوان کے ساتھ باقاعدہ کوئی منقبت نہیں لیکن ''ذکرِ شہادت'' (ص ۸۶) کے آغاز میں چند تمہیدی اشعار ہیں جن کو مجموعی طور پر منقبتِ اہلِ بیت کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ''ثمرِ فصاحت'' اور متفرق اشعار میں بھی کچھ اشعار مناقبِ اہل بیت میں شامل ہیں۔ ان اشعار میں اہلِ بیتِ اطہار کی شان بیان کرتے ہوئے مختلف حوالوں سے ان کی افضلیت کا اقرار کیا گیا ہے۔ فنی حوالے سے تو ان اشعار میں زیادہ صنائع بدائع کا استعمال نہیں ہوا البتہ یہ اسلوب اور الفاظ کے چناؤ کے اعتبار سے بہترین اشعار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ عروضی لحاظ سے یہ اشعار ''بحرِ رمل مثمن سالم محذوف'' (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں کہے گئے ہیں۔

باغ، جنت کے ہیں بہرِ مدح خوانِ اہلِ بیتؓ
تم کو مژدہ نار کا اے دشمنانِ اہلِ بیتؓ (ایضاً، ص ۸۶)

ان کی پاکی کا خدائے پاک کرتا ہے بیاں
آیہ تطہیر سے ظاہر ہے شانِ اہلِ بیتؓ (ایضاً)
رزم کا میداں بنا ہے جلوہ گاہِ حسن و عشق
کربلا میں ہو رہا ہے امتحانِ اہلِ بیتؓ (ایضاً)

اس کے علاوہ ''ثمرِ فصاحت'' (اردو غزلیات) کی پہلی غزل میں بھی حمد اور رنگِ نسبت موجود ہے جس میں شانِ سبطین اور اہلِ بیت کے متعلق بھی ''مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف'' (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) جیسی مترنم بحر میں کہے گئے اشعار شامل ہیں:

سبطین، بادشاہِ جوانانِ خلد ہیں
ظلِ ہمائے قدس ہے سایہ گلیم کا (ایضاً، ص ۳۹۵)

باقیات اور متفرق کلام میں بھی بحرِ رمل مسدس محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں کہا گیا ایک خوبصورت شعر شانِ اہلِ بیت میں ہے جو بظاہر مبالغہ آرائی دکھائی دیتا ہے لیکن غور کرنے پر صاحب قلب و نظر پر حقیقت بن کر عیاں ہو جاتا ہے:

کیا بیاں ہو عز و شانِ اہلِ بیت
کبریا ہے مدح خوانِ اہلِ بیت (ایضاً، ص ۷۳۳)

مجموعی طور شان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اہلِ بیت اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین میں جو مناقب لکھی گئی ہیں ان میں ما سوائے چند ایک، تمام اشعار ہی فکری پاکیزگی و رفعت اور فنی پختگی کے حامل نظر آتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۵۰ھ)

امامِ اعظم حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں صرف چار اشعار متفرق قطعات و اشعار میں سے ملتے ہیں۔ یہ نامکمل منقبت مولانا کی باقیات میں سے معلوم ہوتی ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے ان اشعار میں امامِ اعظم کی مدح سرائی کرتے ہوئے ان کی روحانی اور علمی فضیلت کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کی سیرتِ مبارکہ سے معروف واقعہ بھی نقل کیا ہے اور تحقیقِ دین کے سلسلہ میں رہنمائے کامل گردانا ہے:

شمس العظما امامِ اعظمؒ
بدر الفقہا امامِ اعظمؒ (ایضاً، ص ۷۳۵)

مقبولِ جنابِ مصطفائی
محبوبِ خدا امام اعظمؓ (ایضاً)
چالیس برس نہ سوئے شب بھر
تاج العرفا امام اعظمؓ (ایضاً)
گمراہ ہوں کس طرح مقلد
ہیں راہ نما امام اعظمؓ (ایضاً)

عروضی لحاظ سے بھی یہ اشعار مشکل تصور کی جانے والی چھوٹی بحر ''ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف'' (مفعول مفاعلن فعولن) میں کہے گئے ہیں۔ مزید برآں لسانی طور پر بھی یہ اشعار بھرپور تنوع کے حامل ہیں اور ان میں بیک وقت خالص عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی تراکیب کا لطف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۵۶۱ھ)

مولانا حسن بریلوی قادری تھے اور جیسا کہ محب بہر طور ذکرِ محبوب میں مستغرق رہنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح یہ غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کی محبت ہی کا رنگ ہے کہ صرف مناقبِ غوث ہی میں نہیں بلکہ دوسری ہستیوں کی مناقب میں بھی غوث پاکؓ کا ذکر کسی نہ کسی نسبت سے ضرور در آتا ہے۔ کلامِ حسن میں تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ مناقب غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں ہیں۔ اس ضمن میں مناقب، استغاثہ، رباعیات اور مثنوی کی ہیئت میں سیرت و احوالِ غوث اعظم پر مشتمل ایک مکمل منظوم رسالہ ''وسائل بخشش'' شامل ہے۔

''استغاثہ بجنابِ غوثیت'' کے عنوان سے پندرہ (۱۵) اشعار ''یا غوث'' کی ردیف میں کہے گئے ہیں اور حضورِ بغداد سے استمداد طلب کی گئی ہے۔ ان اشعار میں بھی اکثر استعارے اور مضامین کلاسیکل غزل سے ماخوذ ہیں۔ اس کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی تکرار و تضاد اور خوبصورت ترکیب کی آئینہ بندی سے حسن بریلوی کے کل کلام میں شاید ہی کوئی تخلیق خالی ہو۔ ''بحرِ ہزج مسدس محذوف'' (مفاعیلن مفاعیلن فعولن) میں کہی گئی اس منقبت میں بھی انھوں نے تضاد و تکرار کی معراج کو چھوا ہے۔

پڑے مجھ پر نہ کچھ افتاد یا غوثؓ
مدد پر ہو تری امداد یا غوثؓ (ایضاً، ص ۹۳)
نہ بھولوں بھول کر بھی یاد تیری
نہ یاد آئے کسی کی یاد یا غوثؓ (ایضاً)

رہوں آزادِ قیدِ عشق کب تک
کرو اس قید سے آزاد یا غوثؓ (ایضاً)

ایک اورمنقبت بعنوان ''منقبت حضورغوث اعظمؓ'' میں مدحیہ انداز میں حضورغوث الوریٰ رضی اللہ تعالی عنہ کی عظمت وفضیلت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔فنی لحاظ سے بھی اس منقبت کے اشعارطویل مگرتوانا تراکیب کے حامل ہیں ''یا غوث'' ردیف،قوافی وردیف میں یائے اضافت اور چھوٹی بحر ''ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف'' (مفعول مفاعلن فعولن) میں اختصار اپنانے کی غرض سے تراکیب کا سہارا لیا گیا ہے جواس مکمل منقبت کو فارسیت کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔

اللہ برائے غوثِ اعظمؓ
دے مجھ کو وِلائے غوثِ اعظمؓ (ایضاً،ص ۱۴۰)
تارِ نفسِ ملائکہ ہے
ہر تارِ قبائے غوثِ اعظمؓ (ایضاً)
سب کھول دے عقد ہائے مشکل
اے ناخنِ پائے غوثِ اعظمؓ (ایضاً)

علاوہ ازیں شانِ غوث اعظمؓ میں ایک اورمنقبت بہ صورتِ استغاثہ ''اسیروں کے مشکل کشا غوثِ اعظمؓ'' ہے جو''۳۶'' اشعار پر مشتمل ہے۔اس منقبت کا بنیادی موضوع استغاثہ واستمداد ہی ہے۔''بحرِ متقارب مثمن سالم'' (فعولن فعولن فعولن فعولن) جیسی مترنم بحر میں موزوں کی گئی یہ منقبت محاسنِ شعری کے ساتھ ساتھ لسانی تنوع کے لحاظ سے بھی منفرد ہے، کیوں کہ اردو کے علاوہ اس میں ''۶'' اشعار فارسی میں اور''۳'' اشعار اقدیم ہندوی یا بوجھ پوری زبان میں بھی ہیں۔

ترے ہاتھ میں ہاتھ میں نے دیا ہے
ترے ہاتھ ہے لاج یا غوثِ اعظمؓ (ایضاً،ص ۱۴۱)
کمر بست بر خونِ من نفسِ قاتل
اغثنی برائے خدا غوثِ اعظم (ایضاً)
بپت میں کٹی موری سگری عمریا
کرو مو پہ اپنی دیا غوثِ اعظم (ایضاً)

باقیات کلام میں بھی منقبتِ غوث پاکؓ کے حوالے سے بحرِ ہزج مثمن سالم میں موزوں یہ ۳۔ اشعار موجود ہیں جو واضح طور پر رنگِ تغزل سے مملواور جوشِ عقیدت سے سرشار نظر پڑتے ہیں:

معاذ اللہ اس دل کو عذابِ حشر کا غم ہو
کہ جس کا حامی و یاور جنابِ اعظم ہو (ایضاً،ص۷۳۷)
لبِ جاں بخش نے دی جان تازہ دین و ایماں کو
محی الدیں نہ کیوں کر پھر تمھارا اسمِ اعظم ہو (ایضاً)
جِلا دیتے ہو مردوں کو دلِ مردہ جِلا دیجے
تم اس امت میں شاہا یادگارِ ابنِ مریم ہو (ایضاً)

اس کے علاوہ ''وسائلِ بخشش'' کا تو بنیادی موضوع ہی حضور غوث الوریٰ رضی اللہ تعالی عنہ کی سیرتِ مبارکہ ہے جس کی وجہ سے یہ مکمل مجموعہ ہی منقبت کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے متعلق کلیاتِ حسن کے دیباچہ میں لکھا گیا ہے کہ یہ کتاب دراصل شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی رضی اللہ تعالی عنہ کی مناقب پر مشتمل ایک گنجینۂ بے بہا ہے جس میں نظم کا سہارا لے کر مولانا نے معتبر و مستند حوالوں سے پیرِ پیران کے کوائف و احوال بیان کیے ہیں اور قدم بہ قدم ان سے وقوع پذیر ہونے والی معروف کرامتوں کا خوبصورت پیرائے میں نذرانہ پیش کیا ہے۔ زبان اتنی رواں اور شگفتہ ہے کہ نثرِ فصیح کا مزا دیتی ہے۔ اس کتاب میں مولانا کا استغاثانی رنگ بہت گہرا ہے جو سیدنا غوثِ اعظمؓ کے ساتھ مولانا کے قلبی کھنچاؤ اور جذباتی لگاؤ کی غمازی کرتا ہے۔ اخیر میں دو تاریخی قصیدے ''نغمۂ روح'' اور ''نظمِ معطر'' (۱۳۰۹ھ) بھی شامل ہیں۔ (ایضاً،ص۹)

اس مجموعہ میں درج ذیل موضوعات پر منظوم کلام موجود ہے: ''ولادتِ حضور غوث اعظمؓ، سیدی غوث اعظم کا ایامِ شیرگی میں روزہ رکھنا، حضور غوث پاک کا ایامِ طفلی میں کھیل کی طرف رغبت کرنا اور ہاتف کی ندا، حضور غوث پاک کو اپنی ولایت کا علم کب ہوا؟، حضور غوث پاک سے دایہ کا سوال، حضور غوث پاک سے بیل کا کلام کرنا، حضور غوث پاک کا مرید کون؟، مانگ من مانتی من مانگی مرادیں لے گا، اللہ برائے غوث اعظم، حسین بن منصور حلاج کی امداد کی بابت، مجلس وعظ میں بارش ہونا اور حضور کی نگاہ سے بادل کا چھٹ جانا، حضور غوث پاک کے دیدار کی برکت سے عذاب قبر جاتا رہا، اسیروں کے مشکل کشا غوث اعظم، نغمۂ روح اور نظم معطر'' (ص ۲۵۰)۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا کیجے بیان دستگیری
ہے جوش پہ شانِ دستگیری (ایضاً،ص۲۵۶)
گرتے ہوؤں کو کہیں سنبھالا
ڈوبے ہوؤں کو کہیں نکالا (ایضاً)

سب داغ الم مٹا دیے ہیں
بیٹھے ہوئے دل اٹھا دیے ہیں (ایضاً)

یہ مثنوی آغاز سے اختتام تک فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ فن مثنوی نگاری کے تمام تر لوازم سے بھرپور نظر آتی ہے۔اس میں قصہ پن بھی ہے جو بیانِ سیرتِ غوثِ پاک رضی اللہ تعالی عنہ کے وقت صاف جھلکتا ہے لیکن یہ داستان گوئی اور قصہ پن محض تخیلاتی واقعات اورعقیدت مندانہ کرامات ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ تحفۃ القادریہ جیسی کتب کے حوالوں سے مزین مستند و منظوم مرقعِ سیرت کی صورت نمودار ہوتا ہے۔قصہ گوئی اور منظر نگاری کی حسین مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:

فرماتے ہیں شیخ عبد الرزاق
فرخندہ سیَر ستودہ اَخلاق (ایضاً،ص۲۶۹)

پوچھا یہ جناب سے کسی نے
کب خود کو ولی حضور سمجھے؟ (ایضاً)

فرمایا کہ دس برس کے تھے ہم
جاتے تھے جو پڑھنے کے لیے ہم (ایضاً)

پہنچانے کے واسطے فرشتے
مکتب کو ہمارے ساتھ جاتے (ایضاً)

جب مدرسہ تک پہنچتے تھے ہم
لڑکوں سے یہ کہتے تھے وہ اس دم (ایضاً)

محبوبِ خدا کے بیٹھنے کو
اطفال جگہ فراخ کر دو (ایضاً)

اس کے علاوہ شیخ عبد القادر کے زمانہ طالبِ علمی میں سفرِ بغداد پر روانہ ہونے اور راستے میں قافلہ کو ڈاکوؤں کے لوٹ لینے کی حکایت بھی اس مثنوی میں موجود ہے جو حسن بریلوی کو بطور ایک اعلیٰ مثنوی نگار ثابت کرتی ہے۔اس میں منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، کے ساتھ ساتھ اسلوب کی سلاست و روانی جیسے تمام عناصر موجود ہیں لیکن بہر حال یہ حسن بریلوی کی خصوصیت ہے کہ وہ زبان اتنی عامیانہ اور سادہ نہیں ہونے دیتے کہ اس میں خوبصورت تراکیب اور استعاروں کا فقدان نظر آنے لگے۔

دینار وہ اُمِّ مشفقہ نے
جامہ میں سیے بغل کے نیچے (ایضاً،ص۲۷۴)

پھر عہد لیا کہ راستی کو
ہر حال میں اپنے ساتھ رکھو (ایضاً)
پھر بہرِ سفر ملی اجازت
باہر آئیں برائے رخصت (ایضاً)
ارشاد ہوا برائے یزداں
کرتی ہوں میں تجھ سے قطع اے جاں (ایضاً)
اب تیری یہ پیاری پیاری صورت
آئے گی نظر نہ تا قیامت (ایضاً)
جیلاں سے چلا وہ شاہِ ذی جاہ
اک چھوٹے سے قافلے کے ہمراہ (ایضاً)

یہ مثنوی منقبت نگاری کے میدان میں ایک منفرد نوعیت کا اضافہ ہے جو منقبت کے عمومی رنگ کے ساتھ ساتھ مثنوی کی مخصوص فضا اور لوازمِ فن کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ نے بھی اس ضمن میں کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ یہ مولانا حسن بریلوی کی قابلِ ذکر مثنوی جس میں نعتیہ اشعار کے علاوہ مناقب بھی ہیں۔ اس مثنوی کا انداز مثنوی کی فضا کے مطابق غزل سے اور خاص طور پر داغؔ اسکول کی غزل سے بالکل مختلف ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ اعلیٰ درجہ کی مثنوی ہے۔ (ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیبؔ، ''چند شعرائے بریلی''، لکھنؤ: مرکزِ ادب اردو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۵۴)
عروضی لحاظ سے بھی یہ مثنوی کے مخصوص آٹھ اوزان میں سے سب سے کم مستعمل اور دشوار تصور کیے جانے والے وزن ''مفعول مفاعلن فعولن'' (بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف) میں لکھی گئی ہے اور کمال در کمال یہ کہ اس بحر کے مزاج کو سمجھتے ہوئے سبک تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے جن سے روانی بھی بڑھتی رہی اور اسلوب بھی بوجھل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ایک استمداد یہ نظم ''نغمۂ روح'' اٹھائیس (۲۸) بند پر محیط یہ مسدس ہیئت کی حامل سب سے طویل تخلیق ہے جو مجموعی طور پر چوراسی (۸۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ یوں تو یہ نظم اردو میں ہے لیکن ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے:

روئے رحمت بر متاب اے کامِ جاں از روئے من
حرمتِ روحِ پیمبر یک نظر کن سوئے من (ایضاً، ص ۲۹۴-۲۹۹)

(اے میری جاں میری طرف سے روئے رحمت نہ پھیر، تجھے روحِ پیمبر کی حرمت (کا واسطہ) میری طرف ایک نظر کر!۔)

اس نظم میں حضور غوث اعظم کو حسین اور نادر القابات سے پکارا گیا ہے ''اخترِ برجِ سخاوت''، ''گوہرِ درجِ عطا''،''حرمتِ روحِ پیمبر''، ''شاہِ اقلیمِ ولایت''،(ایضاً،ص ۲۹۴) '' آفتابِ حق نما''،(ایضاً،ص ۲۹۵) ،رشحۂ نیسانِ جودِ کردگار''اور''سحابِ رحمتِ حق''، (ایضاً،ص ۲۹۶) جیسی تراکیب صرف القاب ہی نہیں بے مثال استعارے بھی ہیں۔ موضوعاتی لحاظ سے یہ نظم حضورِ غوثِ اعظم کی بارگاہ میں حال زار بیان کرنے ، اقارب و اعدا کے ستم اور آلامِ زمانہ کی شکایتیں کر کے استغاثہ و استمداد طلب کرنا ہی ہے لیکن اسلوب کی لطافت اور استعاروں کی ندرت کے ساتھ یوں مدعا دراز کیا گیا ہے کہ ہرگز بوجھل محسوس نہیں ہوتا:

رات دن ہے درپئے قلبِ حزیں نفسِ رجیز   برسرِ پرخاش ہے مجھ سے عدوئے بے تمیز
حلِ مشکل آپ کے آگے نہیں دشوار چیز   مبتلا ہے سو بلاؤں میں مری جانِ عزیز

روئے رحمت برمتاب اے کامِ جاں از روئے من
حرمتِ روحِ پیمبر یک نظر کن سوئے من

(ایضاً،ص۲۹۶)

یہ نظم ایک مناسب آغاز ، نکتۂ عروج اور اختتام کی تخلیقی تکون کی حامل نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ فصاحت و بلاغت اور عقیدت کے والہانہ اظہار کے ساتھ ساتھ محاسنِ شعری سے بھی مملو ہے اسی نکتہ کی تائید شبنم کمالی نے بھی کی ہے۔(ماہنامہ سنی دنیا،ص ۱۹۰)

وسائل بخشش ہی میں فارسی رباعیات پر مشتمل ''نظمِ معطر'' (۱۳۰۹ھ، تاریخی نام) بھی شامل ہے جس میں بہ ترتیب ردیف (از الف تا ی) کل ۶۳۔ رباعیاں ''عبدالقادر'' ردیف کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے پہلی ۶ رباعیات میں خواہ ردیف ''عبدالقادر'' ہی ہے لیکن ان میں ربِ تعالیٰ کو مخاطب کیا گیا ہے اور مختلف انداز سے حمد وثنا کرتے ہوئے غوث پاکؓ کو قضائے حاجات اور اخروی نجات کا وسیلہ ٹھیرایا گیا ہے۔ پہلی رباعی بعنوان ''حمد'' عربی میں ہے:

حمداً یا مفضل عبدالقادر یا ذا الافضال
یا منعم یا مجمل عبد القادر انت المتعال
مولاے بما منت بالجود علی من دون سوال
امنن واجب سائل عبد القادر جدہٖ بالآمال

(ایضاً،ص ۳۰۰)

(اے عبد القادر کو فضل بخشنے والے ذی فضل تری حمد ہے! اے عبد القادر کو انعام و اجمال عطا

فرمانے والے تیری بڑی شان ہے! مولا تو نے ہمیشہ بغیر سوال کے جود و کرم فرمایا ہے لہٰذا عبدالقادر کے سوالی کی مرادیں برلا اور اس کو اپنی سایہ امان میں رکھ!۔)

یوں ''صلوٰۃ''، ''تمہید'' کے بعد ردیف کی ترتیب سے رباعیوں کو عنوان دیا گیا ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے ان رباعیات میں استغاثہ بھی ہے، سیرتِ غوث پاکؒ سے واقعات کا بیان ہے، ان کی دینی و علمی فضیلتوں کا بیان ہے، ان کی روحانی رفعتوں کا ذکر ہے، ان کے وعظ، ان کی مجالس، ان کی درگاہ، ان کی گلی، ان کی رہ گزر، ان کا حسن و جمال، جلال و کمال، الغرض ہر چیز کا عاشقانہ اور فدایانہ تذکرہ ان رباعیات میں موجود ہے۔ انتخاب ناممکن ہے بہرحال دو رباعیاں بطور نمونہ پیش ہیں:

صدیقؓ صفت حلیم عبد القادر　　فاروقؓ نمط حکیم عبد القادر

مانند غنیؓ کریم عبد القادر　　در رنگِ علیؓ علیم عبدالقادر

(ایضاً، ص ۳۱۷)

(صدیقِ اکبر جیسے بردبار عبدالقادر ہیں، فاروقِ اعظم جیسے حکمت والے عبدالقادر ہیں، عثمان غنیؓ جیسے کریم عبدالقادر ہیں، (اور) مولا علی کے رنگ میں عبدالقادر بے مثال علم والے ہیں۔)

بے جان و بجانم شہِ عبد القادرؒ　　کس جز تو ندانم شہِ عبد القادرؒ

بد بودم و بد کردم و بر نیکی تو　　نیک ست گمانم شہِ عبد القادرؒ

(ایضاً، ص ۳۲۰)

(اے شاہ عبدالقادرؒ! میں بے جان و بے جا ہوں اور آپ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا، میں (بلا شبہ) برا ہوں اور آپ کی نیکی (کرم) کے بدلے میں میں نے برا ہی کیا ہے (لیکن) میری نیت نیک ہے (اور میں آپ سے نیکی ہی کا گمان رکھتا ہوں)۔)

فنی نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو سات (۷) رباعیاں مستزاد ہیں، دو (۲) رباعیاں مکمل طور پر عربی زبان میں ہیں جبکہ اکثر رباعیوں میں عربی تراکیب، مصرعے اور شعر بھی ملتے ہیں۔ عروضی لحاظ سے بھی یہ رباعیات نہایت اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ ان میں دونوں ''اخرم'' اور ''اخرب'' شجروں سے مستخرج تمام معروف اوزان مستعمل دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ ''مفعول مفاعلن مفاعیلن فع'' اور ''مفعول مفاعیل مفاعیلن فع'' زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی کلام حسن بریلوی میں منقبت نگاری کے سلسلہ میں حضورِ غوث پاکؒ کی مناقب نہ صرف تعداد کے لحاظ سے بلکہ فکر و فن کے حوالے سے بھی متنوع اور منفرد ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (۶۳۳ھ)

کلامِ حسن بریلوی میں سلطان الہند حضرت معین چشتی کی شان میں صرف ایک مکمل منقبت موجود ہے جسے ''منقبتِ حضرت خواجہ غریب نواز'' کا عنوان دیا گیا ہے، اس منقبت میں کل ''۱۹'' اشعار ہیں اور یہ ''ذوقِ نعت'' میں شامل ہے۔ اس منقبت کی واضح خصوصیت یہی ہے کہ اس میں ''بحرِ رمل مثمن مخبون (محذوف)'' اور امام احمد رضا کے مشہورِ زمانہ کلام ''واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا'' کی زمین استعمال کی گئی ہے اور چہار غزلہ کی صورت میں پہلے دو حمدیں، پھر ایک نعت اور پھر یہ منقبت کہی گئی ہے۔ متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے نعت کے مقطع میں اس کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

اے حسن منقبتِ خواجۂ اجمیر سنا
طبع پُر جوش ہے رکتا نہیں خامہ تیرا (ایضاً، ص۳۱)

اس منقبت کا آغاز خواجہ کے جود وسخا کے ذکر سے ہوتا ہے اور پھر ان کی سیرتِ مطہرہ سے ہوتے ہوئے ان کے کمالات اور رفعتوں کا تغزل سے بھرپور بیان کیا گیا ہے اور:

خواجۂ ہند وہ دربار ہے اعلیٰ تیرا
کبھی محروم نہیں مانگنے والا تیرا (ایضاً، ص۳۲)

گلشنِ ہند ہے شاداب کلیجے ٹھنڈے
واہ اے ابرِ کرم زور برسنا تیرا (ایضاً)

ہے تری ذات عجب بحرِ حقیقت پیارے
کسی تیراک نے پایا نہ کنارا تیرا (ایضاً)

یہ بات قابلِ غور نکتہ ہے کہ ذوقِ نعت میں سب سے پہلے نظر آنے والی منقبت یہی ہے اور اسی میں موجود پانچ (۵) اشعار میں غوث پاک رضی اللہ تعالی عنہ کا بھرپور تذکرہ آجانا اس امر کی دلیل ہے کہ حسن بریلوی کے دل و دماغ کی دنیا پر حُبِّ غوث رضی اللہ تعالی عنہ کا بسیرا ہے:

جب سے تو نے قدمِ غوث لیا ہے سر پر
اولیا سر پہ قدم لیتے ہیں شاہا تیرا (ایضاً، ص۳۳)

تجھ کو بغداد سے حاصل ہوئی وہ شانِ رفیع
دنگ رہ جاتے ہیں سب دیکھ کے رتبہ تیرا (ایضاً)

اس منقبت میں خواجہ غریب نواز کے ساتھ ساتھ شانِ غوث اعظمؒ کا پہلو بھی برآمد ہوتا ہے۔ فنی طور پر اس پوری منقبت میں صوفیانہ غزل کا رنگ آہنگ، اسلوب اور استعارے دکھائی دیتے ہیں۔ تکرار، مراۃ النظیر، تضاد جیسی صنعتوں کا باقاعدہ اہتمام اس منقبت کو فکری وفنی لحاظ سے ممتاز کرتا ہے۔

حضرت شاہ بدیع الدین مدار رحمۃ اللہ علیہ (۸۳۸ھ)

حضرت شاہ بدیع الدین (۸۳۸ھ) صوفی بزرگ، حضرت بایزید بسطامی (۲۶۱ھ) کے شاگرد اور سند ولایت حاصل کرنے والے ولی کامل تھے جو سلسلہ مداریہ کے بانی بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ حسن بریلوی کے ہاں ان کی شان میں با قاعدہ دو مناقب موجود ہیں۔ ایک اردو اور دوسری فارسی میں۔ اردو منقبت مسدس نظم کی ہیئت میں ہے جبکہ ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے:

مدار چشمِ عنایت زمن دریغ مدار
نگاہِ لطف و کرم از حسنؔ دریغ مدار (ایضاً، ص ۶۹)

(اے مدارؒ! مجھ سے چشمِ عنایت مت پھیریو، نگاہِ لطف و کرم حسنؔ سے مت پھیریو۔)

اس نظم میں بھی شیخ کی بارگاہ میں حال زار بیان کرتے ہوئے استغاثہ پیش کر کے استمداد طلبی کی گئی ہے لیکن اس قرینے سے کہ ہر قاری اپنے جملہ داخلی احوال کے ساتھ خود کو اس استغاثہ میں مشغول محسوس کرنے لگتا ہے۔ مثلاً ایک بند ملاحظہ ہو:

ہوا ہے خنجرِ افکار سے جگر گھائل — نفس نفس ہے عیاں دم شمارِ بسمل
مجھے ہو مرحمت اب داروئے جراحتِ دل — نہ خالی ہاتھ پھرے آستاں سے یہ سائل
مدار چشمِ عنایت زمن دریغ مدار
نگاہِ لطف و کرم از حسنؔ دریغ مدار (ایضاً، ص ۲۱۴)

فنی حوالے سے یہ نظم خوبصورت تراکیب اور استعاروں کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ صنعت تکرار و تضاد کے علاوہ مبالغہ سے بھی مملو ہے۔ عروضی لحاظ سے ''مفاعلن فَعِلاتن مفاعلن فعلن'' (بحرِ مجتث مثمن مخبون محذوف) کے وزن پر پورا اُترتی ہے۔ اس کے علاوہ ''قندِ پارسی'' میں بھی ''در منقبتِ حضرت شاہ بدیع الدین مدار قدس سرہٗ'' کے عنوان سے پندرہ (۱۵) اشعار شامل ہیں اس کے علاوہ تین استغاثہ کے بھی اشعار انھی کے متعلق ہیں (ص ۳۲۹-۳۵۹)۔ اس منقبت میں خالص فارسی روایتی غزل کا رنگ آہنگ اپنا کر شاہ بدیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کی آمدِ پاک پر جشن کا سا منظر کھینچا گیا ہے، ان کے اوصاف کا چرچا کیا گیا ہے اور ان کے روحانی تصرفات کا ذکر کر کے ان کی ذاتِ بابرکات کو اپنے اور اپنے جیسے دیوانوں کے لیے گنجینۂ رحمت قرار دیا گیا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:

طوطیا زمزمہ کن رفت الم ہائے شبی
صبح آئینہ دمیدست ز شرقِ حَلَبی (ایضاً، ص ۳۵۸)

(اے خوش الحان پرندوں خوشی کے گیت گاؤ کہ رات کے غم چلے گئے اور صبحِ روشن حلب سے طلوع ہو چکی ہے۔)

مژدہ اے مردہ زمیں رفت دمِ تشنہ لبی
آمد ابرِ حلبی در پسِ برقِ عربی (ایضاً)

(اے مردہ زمیں مبارک! کہ تیری تشنہ لبی جانے کو ہے اور عربی گرج چمک کے ساتھ ساتھ حلبی ابرِ رحمت بھی برسنے کو آیا ہے۔)

ظاہرِ طاہرِ تو راہِ متیں ماہِ مبیں
باطنِ فاخرِ تو سرِّ خفی رمزِ خبی (ایضاً،ص۳۵۹)

(تیرا پاک ظاہر سیدھا راستہ اے روشن چاند اور تیرا بے مثل باطن ایک پوشیدہ راز ہی ہے۔)

ہمہ خوئے حَسَنی خلق حسینی داری
چاک شد سینہ زغم بہرِ شہیداں مددے (ایضاً)

(اے سیرت میں حسنؓ اور صورت وشخصیت میں حسینؓ جیسے، میرا سینہ غم سے چاک ہوا چاہتا ہے شہدائے کربلا کے واسطے میری امداد فرمایئے۔)

حضرت آلِ احمد المعروف بہ اچھے میاں (۱۲۳۵ھ)

اچھے میاں (۱۲۳۵ھ) کا اصل نام سید آل احمدا اور ابوالفضل کنیت تھی۔ مولانا حسن بریلوی کے علاوہ امام احمد رضاؒ بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ منقبتِ حضور اچھے میاں میں حسن بریلوی نے چھوٹی بحر (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ بحر رمل مسدس محذوف) کا التزام کرکے ''اچھے میاں'' ردیف اختیار کی ہے۔

سن لو میری التجا اچھے میاں
میں تصدق میں فدا اچھے میاں (ایضاً،ص ۱۵۴)

اس برے کو آپ اچھا کیجیے
آپ اچھے میں بُرا اچھے میاں (ایضاً)

ایسے اچھے کا برا ہوں میں بُرا
جن کو اچھوں نے کہا اچھے میاں (ایضاً)

مجھ برے کے کیسے اچھے ہیں نصیب
میں بُرا ہوں آپ کا اچھے میاں (ایضاً)

اس منقبت میں شعر نمبر ۱۴۔تا ۲۵ تک یک مصرعی قید کو نبھاتے ہوئے ''ہے مدد کا وقت یا اچھے میاں'' ہی پر گرہیں لگائی گئی ہیں اور قبر وحشر اور پل صراط تک کے معاملات میں استغاثہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اپنے برادرِ مکرم امام احمد رضا خاںؒ اور باقی خویش اقارب کے لیے دعا کی گئی اور غوث پاکؒ کا وسیلہ بھی دیا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے اس سادہ اسلوب منقبت میں صنائع شعری کے ساتھ ساتھ الفاظ

کے برمحل ومناسب استعمال اور ''اچھا، برا'' کے تضاد وتکرار نے کلام میں کشش پیدا کردی ہے۔

منقبت نگاری میں اکثر بڑے بڑے شعرا بھی عقیدت اور فکر کو ہی فن پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں لیکن مولانا حسن بریلوی کی منقبت نگاری فکر اور فن دونوں کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے کیوں کہ اس میں نہ ادب وفکر پر سمجھوتا کیا گیا اور نہ فن کے تقاضے فراموش ہونے پائے۔ ان کی منقبت جہاں صدق و صفا، عقیدت اور محبت سے سرشار نظر آتی ہیں وہیں مخصوص اسلوب، منفرد لب و لہجے اور صنائع شعری سے لبریز ہونے کی وجہ سے فن کی بلندیوں کو بھی چھوتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر چند ان کے ہاں کہیں کہیں آمد کے ساتھ ساتھ رنگِ آورد بھی جھلکتا ہے لیکن یہ بھی کمال غور وفکر کے بعد مرتب کیے جانے والی شاعری کا خاصا گردانا گیا ہے۔ مولانا حسن بریلوی نے منقبت نگاری کے سلسلے میں چند مخصوص ہیئتوں ہی پر اکتفا کیا ہے اور غزل ومثنوی کے علاوہ صرف مسدس نظم کو اپنایا ہے۔ عروضی لحاظ سے بھی اردو شاعری میں مستعمل، معروف ومترنم بحور ہی کا انتخاب کیا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی مولانا حسن بریلوی کی منقبت نگاری نہ صرف منقبت پر مشتمل ادب بلکہ فنِ شاعری کے سلسلے میں بھی قابلِ قدر اضافہ ہے۔

کتابیات

۱۔ حسن بریلوی، مولانا، ''کلیاتِ حسن''، لاہور: اکبر بک سیلرز، ۲۰۱۲ء۔

۲۔ گلشن آرا، "مولانا حسن بریلوی کی ادبی خدمات" (مقالہ برائے ایم فل اردو)، نئی دلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء۔

۳۔ شبنم کمالی، مولانا، ''حضرت حسن بریلوی اور مناقبِ صحابہ و اولیاء''، مشمولہ مجلہ ''سنی دنیا، مولانا حسنؒ بریلوی نمبر''، بریلی شریف، شمارہ: اگست ۱۹۹۴ء۔

۴۔ لطیف حسین ادیب، سید، "چند شعرائے بریلی"، لکھنؤ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۷۶ء۔

۵۔ ادارہ، ''فیروز اللغات (رنگین ایڈیشن)''، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۱۷ء۔

□□□

حیدرؓ کی رسولِ ذوالمننؐ کی تعریف
زہراؓ کی حسینؓ کی حسنؓ کی تعریف
اللہ نے پانچ انگلیاں دی ہیں مجھے
لکھتا رہوں اِن سے پنجتنؓ کی تعریف

(شاہ انصار الٰہ آبادی)

غلام قادر گرامی کی رباعیات میں مناقب

گوہر اقبال

ABSTRACT: This article explores the elements of MANQABAT in the poetry of Ghulam Qadir Garami, particularly in his Quatrain. Ghulam Qadir Garami was a renowned Persian poet in the Indian subcontinent, celebrated for his profound and intricate expressions of spirituality. He composed numerous poetic works that resonate with readers even today. This article focuses on his collection of Quatrain, examining the themes of MANQABAT, intellectual style, and artistic excellence present in his poetry. Through this analysis, we gain a comprehensive understanding of the character of Ghulam Qadir Garami's praise poetry, which reflects both his personal devotion and the broader cultural context of his time.

غلام قادر گرامی (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۷ء) برصغیر پاک و ہند میں کلاسیکی فارسی شاعری کے نمایندہ شعرا میں سے ہیں۔ وہ ۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے مشہور شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بچپن ہی میں گلستان، بوستان اور سکندر نامہ جیسی فارسی کی اہم کتابیں خلیفہ ابراہیم سے پڑھ رکھی تھیں۔ ابتدائی تعلیم چودہ برس کی عمر میں مکمل کرنے کے بعد منشی فاضل کا امتحان اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور، پاکستان سے پاس کیا۔ وکالت کی ڈگری بھی حاصل کی۔(۱) امرتسر، لدھیانہ اور کپورتھلہ بھارت کے مختلف مدارس میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دکن میں گزرا۔ میر محبوب علی خان فرماں روائے حیدرآباد دکن کے دربار میں شاعرِ خاص ہوئے بعد میں ''ملک الشعرا'' کا خطاب بھی ملا۔(۲) وہ ۱۹۱۶ء۔۱۹۱۷ء حیدرآباد دکن سے ہوشیار پور چلے گیے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں ہوشیار پور، ہندوستان میں وفات پائی۔ ان کے شاگردوں میں قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء) اور برصغیر پاک و ہند کے شاعر

عزیز الدین عظامی (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۵۷ء) شامل ہیں۔(۳)

تصانیفِ گرامی

غلام قادر گرامی برصغیر پاک و ہند کے استاد شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ان کی تصانیف میں ایک دیوان اور مجموعۂ رباعیات شامل ہیں۔

دیوان

دیوان گرامی،تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں مثنویات،خمریات،مناقب،قطعات، مراثی،قصائد اور غزلیات شامل ہیں۔اس کا بیشتر حصہ غزلیات کا ہے۔مثنویاں زیادہ تر نامکمل ہیں۔دیوان میں ایک ترجیع بند، دو مسدس اور ایک ساقی نامہ شامل ہے۔گرامی نے مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی (۱۲۰۷ء۔ ۱۲۷۳ء)اور غنیمت کنجاہی (۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۸ء) کی پیروی میں مختصر مثنوی بھی لکھی ہے۔(۴)

مجموعۂ رباعیات

رباعیات گرامی ان کا دوسرا فارسی شعری مجموعہ ہے۔اس میں تقریباً ۳۲۰ رباعیات شامل ہیں جو تصوف و عرفان، مناقب،فلسفہ اور اخلاقیات جیسے اہم موضوعات پر مبنی ہیں۔بیشتر رباعیات ابوسعید ابو الخیر(۹۶۷ء۔۱۰۴۹ء) اور مولانا جامی(۱۴۱۴ء۔ ۱۴۹۲ء) کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔(۵) یہ رباعیات انھوں نے عمر کے آخری حصے میں لکھیں جب ان کا فکر و فن اوج کمال پر تھا۔اس لحاظ سے ان کی اہمیت نمایاں ہے۔

ان کے مجموعۂ رباعیات میں مناقب کا اس قدر وفور ہے کہ یہ مجموعی طور پر مناقب نامہ نظر آتا ہے۔ حمد،نعت، مدح اہلِ بیتِ اطہار اور بزرگانِ دین میں شیخ عبدالقادر جیلانی، معین الدین چشتی اجمیری، بختیار کاکی،ابوالحسن خرقانی، علی ہجویری،امامِ ربانی مجدد الف ثانی، بوعلی قلندر،فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیا،سلیمان تونسوی،شاہ عنایت اور بابا بلھے شاہ کے مناقب ہیں۔

علامہ اقبال،مولانا گرامی کے نوجوان ہم عصر تھے۔ گرامی جب بھی لاہور آتے علامہ کے ہاں کئی کئی دن قیام کرتے۔اقبال ان سے شعری اصلاح بھی لیتے تھے۔ اقبال نے حضرت امامِ حسین کی مدح میں جب یہ مصرع لکھا:

زندہ حق از قوتِ شبیری است

ترجمہ:حق زورِ شبیری ہی سے زندہ جاوید ہے۔

تو ان سے دوسرا مصرع بن نہ پایا،گرامی نے دوسرا مصرع یوں بہم پہنچایا

باطل آخر داغِ حسرت میری است (6)

ترجمہ: باطل کا انجام تو حسرت کا داغ لیے مرجانا ہے۔

ان کی نعت گوئی لائقِ ستایش ہے۔ انھوں نے رباعی جیسی مختصر صنف میں جس استادانہ مہارت سے کام لیا وہ کلاسیکی شعرا کا خاصہ ہے۔ تراکیب کی ایجاد میں انھیں مجتہدانہ رسوخ حاصل ہے۔ ان کی نعتیہ رباعیات ملاحظہ کیجیے:

خاور چکد از شبم بہ این تیرہ شبی　　　کوثر چکد از لبم بہ این تشنہ لبی
ای دوست ادب کہ درحریمِ دلِ ماست　　　شاہنشہِ انبیا رسولِ عربی ست (7)

ترجمہ: اس تیرہ شبی کے باوجود میری رات سے سورج ٹپکتا ہے، اس تشنگی کے باوجود میرے ہونٹوں سے کوثر ٹپکتی ہے، اے دوست، ادب! کیوں کہ ہمارے حریمِ دل میں انبیا کے سردار رسولِ عربی موجود ہیں۔

شکستگی اور بے چارگی کے باوجود طمانیت ومسرت ہے اور احساسِ تفاخر بھی اور کیوں نہ ہو کہ ایک عاشقِ رسول کے لیے اس کی کُل کائنات رسولِ کریم ہی ہیں اور وہ انھی سے امیدِ شفاعت رکھتے ہیں اور اپنے کلام میں جابہ جا اس کا اظہار کرتے ہیں:

آن ختمِ رُسل ، شاہِ عرب ، ماہِ عجم　　　آن موجِ نخست است ز دریای قِدم
در تابشِ آفتابِ محشر چہ غم است　　　دستِ من و دامانِ رسولِ اکرم (8)

ترجمہ: وہ رسولوں کے خاتم، عرب کے بادشاہ اور عجم کے چاند، وہ ازل کے سمندر کی پہلی موج ہیں، محشر کے سورج کی گرمی میں کیا غم ہے، میرا ہاتھ ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن اطہر ہے۔

ایک اور جگہ وہ محشر کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنی نجات کا راستہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

ما توبہ کنیم و از گناہ برگردیم　　　آزاد ز ہر خانۂ محشر گردیم
گر شعلہ زند تشنگی ما در حشر　　　ما گرد سرِ ساقی کوثر گردیم (9)

ترجمہ: ہم توبہ کریں اور ہر گناہ سے پھر جائیں، محشر کے ہر فتنے سے آزاد ہو جائیں، اگر ہماری پیاس حشر میں بھڑکتی ہے تو ہم ساقی کوثر کے گرد چکر لگائیں۔

برصغیر پاک وہند میں گرامی ان استاد شعرا میں سے ہیں جنھوں نے کلاسیکی فارسی کی دم توڑتی روایت کو اپنے عہد میں زندہ رکھا۔ ان کے کلام میں اکابر فارسی شعرا کی جھلک نمایاں ہیں۔ نظیری نیشاپوری سے اخذ معانی بھی ان کے ہاں ملتا ہے۔ ذیل میں دی گئی رباعی دیکھیے:

در صبحِ الست درسِ ما حق طلبی ست　　　بر ما نگہِ دوست سبب بی سببی ست

بر حکمِ وفا تخت شہنشاہی ما فقر است کہ آن فخرِ رسولِ عربی ست (10)

ترجمہ: ہمارا درس صبحِ الست میں خدا طلبی ہے، ہم پر دوست کی نظرِ کرم ہے اور بغیر کسی سبب کے ہے، وفا کے حکم پر ہماری شہنشاہی کا تخت وہ فقر ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فخر کیا۔(الفقر وفخری)۔

''سبب بی سببی'' کی ترکیب انھوں نے نظیری سے اخذ کی ہے۔ایک اور رباعی میں بھی اس دلکش ترکیب کا استعمال ملتا ہے:

ما را در سینہ داغِ ماہِ عرب است بر ما نظرش بی سببی ہا سبب است
رمزی ست نگفتنی بگویم ای دوست میم است کہ پردہ دارِ عینِ عرب است (11)

ترجمہ: ہمارے سینے میں عرب کے چاند کا داغ ہے، ہم پر ان کی نگاہِ کرم بغیر کسی سبب کے ہے، اے دوست! نہ کہنے والا راز کہوں؟ میم عرب کے عین کا پردہ دار ہے۔

ان کی ایک رباعی جو بہت مقبول ہوئی اور برصغیر کے شعرا نے اسی کی پیروی میں کئی رباعیاں بھی کہہ رکھی ہیں۔

فاران دگر است و کوہِ سینا دگر است موسیٰ دگر و مثیل موسیٰ دگر است
در موسیٰ و مصطفیٰ چہ رمز است غریب ساحل دگر است ،عینِ دریا دگر است (12)

ترجمہ: فاران کچھ اور ہی ہے جب کہ کوہِ سینا کچھ اور، موسیٰ اور ہیں اور مثیلِ موسیٰ کچھ اور، حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کیا ہی عجیب رمز ہے، ساحل کچھ اور ہے جب کہ سمندر کچھ اور ہی چیز ہے۔

''دگر است'' کی ردیف میں ایک قطعہ بھی ہے:

گویم ز مسیحا و محمد سخنے ثانی دگر است نقشِ اول دگر است
نسبت در ماہ و مہر من می دانم کامل دگر است فرد اکمل دگر است (13)

ترجمہ: میں حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کرتا ہوں، نقشِ ثانی کچھ اور ہیں اور نقشِ اول اور، چاند اور سورج میں نسبت میں جانتا ہوں، کامل اور ہے اور کامل ترین کچھ اور ہی۔

ان کی بیشتر رباعیات میں دینی تلمیحات موجود ہیں۔ الہامی کتاب انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ''فارقلیط'' ہے۔حضرت عیسیٰؑ نے رسولِ کریم کی اس دنیا میں آمد کی خوش خبری دی تھی۔ گرامی لکھتے ہیں:

ای ختمِ رسل جانِ جہان فارقلیط خوانند ترا بر آسمان فارقلیط
می گفت مسیح در بشاراتِ جلیل من می روم، آید بہ جہان فارقلیط (14)

ترجمہ: اے انبیا کے خاتم جہان کی جان فارقلیط، آسمان پر آپ کو فارقلیط کہا جاتا ہے، بڑی خوش خبریوں میں حضرت مسیح کہتے تھے: میں جا رہا ہوں، اب جہان میں فارقلیط آئیں گے۔

محمدِ عربی ختمِ انبیا جلیل خلیل راست مثال و کلیم راست مثیل
تبارک اللہ امامِ رسل پیمبر ما ست کہ خواند فارقلیط اش مسیح در انجیل (15)

ترجمہ: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو جلیل القدر انبیا کے خاتم ہیں، حضرت ابراہیم کی مثال ہیں اور حضرت موسیٰ کے مثیل، رسولوں کے امام ہمارے پیغمبر ہیں، اللہ تجھے برکت دے کہ مسیح نے انجیل میں انھیں ''فارقلیط'' کہا ہے۔

دیارِ حبیب سے دوری انھیں مضطرب رکھتی ہیں، ان کے دیوان میں بھی ایسے اشعار کا ایک ذخیرہ موجود ہے وہ بار بار اس کا مناسب اظہار بھی کرتے ہیں کہ ان کا جسم ظلمتِ ہند میں جب کہ روح، خاکِ حجاز میں ہے۔ وہ زندگی میں تو اس مقدس سرزمین میں حاضر نہ ہو سکے۔ ان کی ایک رباعی ہے جس میں وہاں کا خیالی سفر بیان کیا گیا ہے۔

مہجور و بلاکش و غریب آمدہ ام از دولتِ وصل بی نصیب آمدہ ام
از ہند رسیدہ ام بہ خاکِ یثرب از بتکدہ در شہرِ حبیب آمدہ ام (16)

ترجمہ: تنہا مصیبتوں میں گھرا اور اجنبی آیا ہوں، وصل کی دولت سے بے نصیب آیا ہوں، ہندوستان سے خاکِ یثرب پہنچا ہوں، بُت کدے سے دوست کے شہر میں آیا ہوں۔

طریقت کے بہت سے سلسلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شروع ہوتے ہیں۔ آپ کا علم، حلم اور شجاعت بے مثال ہے۔ گرامی نے حضرت علی کی مدح میں جو رباعیاں کہہ رکھی ہیں ان میں عاشقانہ سرمستی اور جوش و شوریدگی بہت واضح ہے۔

حرفی ز علی بگو، امیرم این ست پیدا و نہفتہ در ضمیرم این ست
آن دستِ خدا ست دست گیری بکند دستم گیرد کہ دست گیرم این ست (17)

ترجمہ: حضرت علی کا مبارک ذکر کیجیے کہ وہی میرے بادشاہ ہیں، میرے دل میں ظاہر و مخفی وہی ہیں، وہ تو، یداللہ ہیں اور دستگیری کو پہنچتے ہیں، انھوں نے میرا ہاتھ تھاما، میرے دستگیر وہی ہیں۔

ایک جگہ میرِ خیبر شکن کو یوں خراجِ محبت پیش کرتے ہیں:

رفتم ز جہان ولی ولی می گویم بُردم ایمان جلی جلی می گویم
من حلقہ بگوشِ میرِ خیبر شکنم جان می دہم و علی علی می گویم (18)

ترجمہ: میں ''ولی ولی'' کہتا دنیا سے جاتا ہوں، میں یہ بات واضح کہتا ہوں کہ میں ایمان سلامت

لے گیا، میں امیرِ خیبر شکن کا عقیدت مند ہوں، میں علی علی کہتے ہوئے جان دیتا ہوں۔

حضرت فاطمہ اور حضرت علی کے لختِ جگر حضرت امام حسین کی مدح میں ایک رباعی ملتی ہے:

دامن بہ کمر بر زن و راہی برگیر برگیر سر از خوابِ قیامت تعبیر

گر زندگی آرزو ست ای راہ نورد بر خاکِ درِ حضرتِ شبیر بمیر (19)

ترجمہ: کمر بستہ ہو کر راستے پر چلو اور خوابِ قیامت کی تعبیر حاصل کر لو، اے رہ نورد! اگر تمھیں زندگی کی آرزو ہے تو حضرت شبیر کے دروازے کی خاک پر جان قربان کر دو۔

امام ہشتم، حضرت امام رضا کی مدح میں ایک رباعی ملتی ہے:

ما رہرو راہِ مصطفیٰ آمدہ ایم پابوسِ نگاہِ مرتضیٰ آمدہ ایم

ما و سرِ مدحتِ امامِ ہشتم ما بندۂ حضرتِ رضا آمدہ ایم (20)

ترجمہ: ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کے مسافر ہیں، نگاہِ مرتضیٰ کے پابوس بھی، ہمارا شوق آٹھویں امام کی مدح سرائی ہے کیوں کہ ہم حضرت امامِ رضا کے غلام ہیں۔

اولیائے امت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، محبوب سبحانی کو یوں خراجِ محبت پیش کرتے ہیں:

فرزندِ نبی فاطمہ را نورالعین لختِ جگرِ شہنشہِ بدر و حنین

دل ہا پابوس قطبِ ربانی را سلطان الاولیا غوث الثقلین (21)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے حضرت فاطمہ کی آنکھوں کے نور، بدر و حنین کے بادشاہ کے لختِ جگر، دل قطبِ ربانی غوث الثقلین کی پابوسی کرتا ہے جو اولیا کے سلطان ہیں۔

سر بر خطِ غوثِ اعظم آمد جانم کز نیم نگاہ زندہ کرد جانم

ای ساقیِ میخانۂ اسرار ازل یک قطرہ دہ از خُم کدۂ جیلانم (22)

ترجمہ: میری جان غوثِ اعظم پر قربان کہ جنھوں نے اپنی ایک نگاہ سے میری روح کو زندہ کر دیا، اے اسرارِ ازل کے مے کدے کے ساقی مجھے خُم کدۂ جیلان سے ایک قطرہ ہی عطا کر دے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی دینی خدمات کے پیشِ نظر انھیں یوں نذرانہ محبت پیش کرتے ہیں:

خلیلِ کعبۂ شرع محمد عربی مسیحِ امتِ احمد امام ربانی

مجددش بہ فلک خواند جوہرِ اول ستارہ گفت کہ فاروقِ اعظمِ ثانی (23)

ترجمہ: محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کعبہ شرع کے خلیل، اور آپ کی امت کے مسیح حضرت امام ربانی ہی ہیں، جوہرِ اول نے آسمان پر انھیں مجدد کے نام سے پکارا، جب کہ ستاروں نے انھیں فاروقِ اعظم ثانی کے نام سے یاد کیا۔

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہء چشتیہ کے بانی حضرت معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔مولانا گرامی کوخواجہ اجمیر سے والہانہ عقیدت تھی جس کا اظہار وہ اپنی رباعیات میں کرتے ہیں:

فلک کز سربلندی می زند کوس — معین الدین چشتی را زمین بوس

ز مارِ نفسِ امارہ چہ باکم — معین در باغِ عرفان است طاؤس (24)

ترجمہ: آسمان جوسربلندی کے نقارے بجاتا ہے،معین الدین چشتی کا زمیں بوس ہے، مجھے نفسِ امارہ کے سانپ سے کیا خوف،خواجہ معین باغِ عرفان کے مور ہیں۔

بربستم چشم و یک جہان در نظرم — پرواز بہ اوجِ عرش و بی بال و پرم

معنی نگہان مرا گرامی نشناخت — کرد است نگاہِ پیرِ سنجر دگرم (25)

ترجمہ: میں نے آنکھیں بند کرلیں اورایک جہان میری نگاہ میں ہے، بہ ظاہرتو بے مایہ ہوں لیکن میری پروازعرش کی بلندیوں پر ہے،گرامی مجھے دیدہ وروں نے نہ پہچانا، پیرِسنجر کی نگاہِ کیمیااثر نے مجھے کچھ اور ہی بنادیا۔

حضرت ابوالحسن خرقانی کی مدح میں لکھتے ہیں:

ہادی زمانہ، عارفِ سبحانی — قطب الاقطاب بوالحسن خرقانی

ہر ذرہ اش آفتاب و ہر قطرہ محیط — اللہ اللہ تصرفِ روحانی (26)

ترجمہ: وہ زمانے کونیک راہ دکھانے والے عارفِ سبحانی ،قطبوں کے قطب ابوالحسن خرقانی ہیں، ان کا ہر ذرّہ سورج اور ہرقطرہ سمندر ہے،ان کی روحانی پہنچ کا کیا کہنا۔

گرامی ،حضرت علی بن عثمان ہجویری کو بیشتر مقامات پرخراج عقیدت پیش کرتے ہیں ، وہ انھیں نائبِ رسولِ عربی کہتے ہیں اوران کی فیض بخشی کا ذکرخیر کرتے ہیں:

درحضرتِ شیخ عرضِ ما بی ادبی ست — آن شیخ کہ نائبِ رسولِ عربی ست

ما از درِ گنج بخش محروم رویم — درقاعدۂ کرم بسا بوالعجبی ست (27)

ترجمہ: وہ شیخ جو رسولِ عربی کے نائب ہیں ، ان کے حضور ہماری التجا بے ادبی ہے، ہم علی بن عثمان ہجویری کے در سے محروم جائیں، یہ سخاوت کے قاعدے میں بہت عجیب بات ہے۔

حضرت فریدالدین گنجِ شکرکی مدح میں لکھی گئی ذیل کی رباعی بارگاہِ فرید میں مقبول ٹھہری، رباعی کے حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ جب گرامی نے یہ رباعی کہی تو بابا صاحب خواب میں تشریف لائے اور بہت خوش تھے:

درشہر گرامی ست کہ معنی نظر است — در پنجۂ مرگ سخت بی بال و پَر است

در تلخی نزع حکم آمد بہ اجل		بگذار کہ این مریدِ گنجِ شکراست (28)

ترجمہ: پورے شہر میں گرامی ہی ہے جو اہلِ نظر ہے، وہ موت کے سخت پنجے میں بے سروسامان ہے،نزع کی تلخی میں موت کو پیغام آیا کہ اسے چھوڑ کہ یہ گنجِ شکر کا مرید ہے۔

حوالہ جات

(1) رضوی، سبط حسن، فارسی گویان پاکستان، اسلام آباد: مرکزی تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۷۴ء، ص ۶۳-۶۴

(2) احمد،ظہورالدین، پاکستان میں فارسی ادب، لاہور:ادارہ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی ۱۹۹۰ء، ج ۵،ص ۱۱۰

(3) زکریا، خواجہ محمد، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، گرامی (مقالہ) لاہور: ادارہ تحقیقات پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ج ۵،ص ۴۹۵

(4) ایضاً،ص ۴۹۵

(5) مزدک انوشہ، دانشنامہ ادب فارسی درشبہ قارہ ،تہران : سازمان و چاپ و انتشارات وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی ج ۴ بخش سوم،ص ۲۱۰۱

(6) احمد،ظہورالدین، پاکستان میں فارسی ادب،ص ۱۱۵

(7) گرامی، غلام قادر، رباعیات، 5

(8) ایضاً،ص ۷

(9) ایضاً،ص ۲۳		(10) ایضاً،ص ۹		(11) ایضاً،ص ۱۲

(12) ایضاً،ص ۱۵		(13) ایضاً،ص ۱۷		(14) ایضاً،ص ۱۶

(15) ایضاً،ص ۶		(16) ایضاً،ص ۲۲		(17) ایضاً،ص ۲۵۰

(18) ایضاً،ص ۲۵۱		(19) ایضاً،ص ۲۴۱		(20) ایضاً،ص ۲۵۶

(21) ایضاً،ص ۲۶۹		(22) ایضاً،ص ۲۷۹		(23) ایضاً،ص ۲۸۱

(24) ایضاً،ص ۲۴۴		(25) ایضاً،ص ۲۶۸		(26) ایضاً،ص ۲۸۰

(27) ایضاً،ص ۲۷۰		(28) ایضاً،ص ۲۷۶

□□□

بیدمؔ وارثی کی منقبت نگاری

رانا عارف علی

ABSTRACT: Beydam Warsi was an important poet of twentieth century. He was a practical (Sufi). His poetry is scented with his spiritual experiments and feelings. He has expressed his insight/mystic feelings through his verses. He left considerable literary asset including four poetry books that have been published together as a "Kulliyat-e-Beydam Warsi". Unfortunatily, in literary world, he could not have that fame and place which he deserved. Majority of his poetry is in the form of Ghazals. His ghazals are the real reflection of his innerself. Alongwith Hamd and Naat he wrote Manqbat of Ahal-e-Bait and many religious figures such as Sheikh Abdul Qadir Jeelani and other prominent Chishti saints. He gave a new taste and shade to his Manqbat. Through this study we aim to have a thorough insight on the Manqbat Nigari of Beydam Warsi.

صحابہ وصحابیاتؓ ،اولیا کرام اور بزرگانِ دین کے اوصاف بیان کرنے کوشعری اصطلاح میں منقبت کہتے ہیں۔

جامع اللغات میں منقبت کا مفہوم کچھ یوں درج ہے: ''تعریف،توصیف،صفت،ثنا (خصوصاً اہل بیتؑ اور صحابہؓ کی)۔'' [۱] جب کہ بحر الفصاحت میں منقبت کے بارے میں لکھا ہے کہ اہلِ بیت اور آئمہ اہل بیت کی شان میں جو کلام لکھا گیا، وہ منقبت کہلاتا ہے۔

شمیم احمد منقبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایسے اشعار جن میں صحابۂ رسولؓ علی الخصوص حضرت علیؓ یا آئمہ کرام یا

صوفیا کی تعریف کی گئی ہو، منقبت کہلاتے ہیں۔'' ۲؎

اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مطابق ملتِ اسلامی کے مشہور و معروف بزرگانِ دین، آئمہ مذاہب اور طریقوں کے بانیوں یا اولیا کے کراماتی قسم کے اوصاف و کمالات کے بیان کو منقبت کہتے ہیں۔

منقبت کے اشعار کسی بھی نظم یا مثنوی کے حصے کے طور پر یا الگ سے مکمل نظم کی صورت میں یا قصیدے کی شکل میں لکھے جا سکتے ہیں لیکن یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قصیدہ اور منقبت موضوع اور اسلوب ہر دو اعتبار سے جداگانہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ قصیدے میں اجزائے قصیدہ (تشبیب، گریز، مدح، عرضِ مدعا اور دُعا) کا التزام کیا جاتا ہے۔ جبکہ منقبت میں ایسی کوئی پابندی نہیں اور نہ ہی منقبت میں ہجو کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

بعض دوسری مذہبی اصنافِ سخن کی طرح منقبت نگاری کا آغاز بھی عربی زبان و ادب سے ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عہد میں جہاں حمد و نعت نگاری کو فروغ حاصل ہوا وہیں منقبت نگاری کا بھی آغاز ہو گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی، پروفیسر احسن زیدی کے مقالہ پی ایچ ڈی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''مناقب کا نقطۂ آغاز حضرت حسان بن ثابتؓ کے وہ اشعار ہیں جو انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدح میں لکھے جبکہ فرزدق کا میمیہ بھی اس ذیل میں قابلِ توجہ ہے۔ جو اس نے امام زین العابدینؒ کی مدح میں تصنیف کیا۔'' ۳؎

فارسی میں بھی متعدد شعرا نے اصحابِ کبارؓ اور اہل بیتؑ کے مناقب اور فضائل بیان کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

فردوسی کے ''شاہنامہ'' کی جلد اول اور ممتاز صوفی شاعر عطار کی شہرہ آفاق عرفانی مثنوی ''منطق الطیر'' میں خلفائے راشدینؓ اور ان کے نمایاں اوصاف کا ذکر ملتا ہے۔ عرضی کا رائیہ، فیضیؔ کا میمیہ ۔۔۔ یادگار ہیں۔

دیگر اصنافِ شاعری کی طرح منقبت کے معیار کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے بھی کچھ ضابطے موجود ہیں۔ عمدہ اور اعلیٰ پائے کی منقبت کے لیے ضروری ہے کہ اس میں غلو اور مبالغہ آرائی موجود نہ ہو۔ اس حوالہ سے طالب الہاشمی کی رائے ہے:

''ایک ایسی نظم جس کو صحیح معنوں میں ایک اچھی منقبت کہا جا سکے، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں غلو سے کام نہ لیا گیا ہو اور نہ اس کو فرضی باتوں کا سہارا لے کر ''بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے'' کا مصداق بنایا گیا ہو۔'' ۴؎

یہ امر بھی نہایت ضروری ہے کہ منقبت نگار کسی بھی مذہبی شخصیت کی مدح سرائی کرتے ہوئے حفظِ مراتب کا خصوصی خیال رکھے۔ عبدیت، رسالت اور الوہیت کے مقام و مرتبہ کے فرق کو سمجھتا ہو۔

اردو میں اولین منقبت نگاری کا شرف نظامی دکنی کو حاصل ہے۔ ان کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اردو زبان کی پہلی مکمل تصنیف کہلاتی ہے۔ فارسی مثنوی نگاری کے تتبع میں اس مثنوی کا آغاز بھی حمدیہ اشعار سے ہوتا ہے پھر نعت اور بعد میں خلفائے راشدین کی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے۔

سودا کے قصاید (مثلاً باب الجنت)، غالب کی ''منقبتِ حیدری'' (ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار) اور (دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں)، مومن کے منقبتی قصائد، انیس کے منقبتی سراپے اور اقبال، جوش، اقبال سہیل، عبدالعزیز خالد اور حفیظ تائب کے مناقب اردو منقبت نگاری کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

بیدم شاہ وارثی باعمل صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے جہاں نعتیہ اور صوفیانہ شاعری میں اپنے کمالات دکھائے وہیں مناقب نگاری کی طرف بھی خصوصی التفات اور توجہ کی۔ سلسلہ وارثیہ کے بانی اور روحِ رواں حضرت وارث پاکؒ کی ذات بیدم کی منقبت نگاری کا خاص موضوع رہی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اہلِ بیت اطہار خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ساتھ شیخ عبدالقادر جیلانی اور کبار اولیائے چشت کی مناقب بھی اسی عقیدت اور جاں سپاری کے جذبہ سے لکھیں۔

	شخصیت	نمبر شمار	دیوان	ص نمبر کلیات	ابیات در منقبت	ہیئت
1-	حضرت علیؓ	1-	کرشمہ وارثی	219	08	(سلام)☆
	"	2-	کرشمہ وارثی	219	05	غزل
		3-	گلدستہ وارثی	466	07	غزل
		4-	گلدستہ وارثی	466	07	غزل
		5-	ارمغانِ بیدم	322	105	غزل
		6-	ارمغانِ بیدم	323	05	غزل
		7-	ارمغانِ بیدم	323	05	غزل
		8-	مصحف بیدم	98	07	غزل
		9-	مصحف بیدم	98	05	غزل

-2	حضرت امام حسینؓ	-1	کرشمہ وارثی	220	09	غزل
	"	-2	ارمغانِ بیدم	323	08	غزل
-3	سیّد عبدالقادر جیلانیؒ	-1	کرشمہ وارثی	220	05	(سلام)☆
		-2	کرشمہ وارثی	220	15	غزل
		-3	کرشمہ وارثی	221	07	غزل
		-4	کرشمہ وارثی	221	05	غزل
		-5	گلدستہ وارثی	467	07	غزل
		-6	گلدستہ وارثی	467	07	غزل
		-7	ارمغانِ بیدم	324	07	غزل
		-8	ارمغانِ بیدم	324	05	غزل
		-9	ارمغانِ بیدم	324	05	غزل
		-10	ارمغانِ بیدم	325	05	غزل
		-11	ارمغانِ بیدم	325	05	غزل
		-12	مصحفِ بیدم	99	07	غزل
		-13	مصحفِ بیدم	99	07	غزل
		-14	مصحفِ بیدم	99	05	غزل
-4	خواجہ معین الدینؒ	-1	کرشمہ وارثی	222	05	(سلام)☆
		-2	کرشمہ وارثی	222	05	غزل
		-3	کرشمہ وارثی	222	05	غزل
		-4	گلدستہ وارثی	468	05	غزل
		-5	گلدستہ وارثی	468	06	غزل
		-6	گلدستہ وارثی	468	07	غزل
		-7	ارمغانِ بیدم	325	10	غزل
		-8	مصحفِ بیدم	100	10	غزل
		-9	مصحفِ بیدم	100	05	غزل

5-	قطب الدین بختیار کاکیؒ	1-	گلدستہ وارثی	469	07	غزل
6-	فرید الدین گنج شکرؒ	1-	گلدستہ وارثی	469	07	غزل
7-	مخدوم علاؤالدین صابرؒ	1-	گلدستہ وارثی	470	07	غزل
		2-	مصحفِ بیدم	102	07	غزل
		3-	مصحفِ بیدم	102	07	غزل
		4-	مصحفِ بیدم	102	08	غزل
8-	نظام الدین اولیاؒ	1-	گلدستہ وارثی	470	08	غزل
		2-	مصحفِ بیدم	101	05	غزل
9-	امیر ابوالعلا احراری	1-	ارمغانِ بیدم	326	19	غزل
		2-	مصحفِ بیدم	104	05	غزل
10-	شیخ احمد عبدالحق ددولوی	1-	مصحفِ بیدم	103	05	غزل
11-	شیخ عبدالمنعم کنزالمعرفت	1-	گلدستہ وارثی (فارسی)	471	05	غزل
		2-	مصحفِ بیدم	104	13	غزل
12-	حضرت وارث علی	1-	کرشمہ وارثی	264	05	غزل
		2-	کرشمہ وارثی	262	05	غزل
		3-	کرشمہ وارثی	257	05	غزل
		4-	کرشمہ وارثی	249	05	غزل
		5-	کرشمہ وارثی	226	11	غزل
		6-	کرشمہ وارثی	228	05	غزل
		7-	کرشمہ وارثی	229	05	غزل
		8-	کرشمہ وارثی	233	05	غزل
		9-	کرشمہ وارثی	233	05	غزل
		10-	کرشمہ وارثی	235	07	غزل
		11-	کرشمہ وارثی	238	05	غزل

		-12	کرشمہ وارثی	242	05	غزل
		-13	کرشمہ وارثی	249	05	غزل
		-14	گلدستہ وارثی	471	08	غزل
		-15	گلدستہ وارثی	471	07	غزل
		-16	گلدستہ وارثی	471	05	غزل
		-17	گلدستہ وارثی	483	05	غزل
		-18	گلدستہ وارثی	496	05	غزل
		-19	گلدستہ وارثی	496	09	غزل
		-20	ارمغانِ بیدم	327	11	غزل
		-21	ارمغانِ بیدم	327	05	غزل
		-22	ارمغانِ بیدم	327	07	غزل
		-23	ارمغانِ بیدم	359	05	غزل
		-24	مصحفِ بیدم	105	05	غزل
		-25	مصحفِ بیدم	106	07	غزل
		-26	مصحفِ بیدم	106	05	غزل
		-27	مصحفِ بیدم	107	05	غزل
		-28	مصحفِ بیدم	107	05	غزل
		-29	مصحفِ بیدم	107	05	غزل
		-30	مصحفِ بیدم	107	07	غزل
		-31	مصحفِ بیدم	108	05	غزل
		-32	مصحفِ بیدم	108	07	غزل
		-33	مصحفِ بیدم	109	05	غزل
		-34	مصحفِ بیدم	109	05	غزل
		-35	مصحفِ بیدم	109	07	غزل

		-36	مصحفِ بیدم	145	07	غزل
		-37	مصحفِ بیدم	152	07	غزل

بیدم شاہ وارثی کے دستیاب کلام کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں اڑتالیس کے قریب مناقب مختلف مذہبی شخصیات کی موجود ہیں۔ حضرت وارث پاکؒ کی تیس سے زائد مناقب اس کے علاوہ ہیں۔ یوں ان کے مناقب میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ بیدم جس بھی عظیم ہستی کی منقبت کہتے ہیں اس کے اوصافِ حمیدہ اور خصائل چیدہ کو ضرور مدنظر رکھتے ہیں۔

فاتح خیبر، سیدنا علی المرتضیٰ، شیر خدا تھے۔ درویشی، فقیری اور تصوف کے زیادہ تر سلسلے بارگاہِ مرتضوی یعنی حضرت علیؓ کی بارگاہ سے فیضیاب ہو کر سلسلہ محمدیہؐ کے قلزم معرفت تک پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدمؔ جیسے صوفی شاعر کا قلم اس عظیم ہستی کے اوصاف اور خصائل بیان کیے بغیر نہ رہ سکا۔

بیدم وارثی کے کلام میں حضرت علی المرتضیٰؓ کی شان میں نو مختلف مناقب ملتی ہیں جن میں سے دو ان کے مجموعہ کلام کرشمہ وارثی، دو گلدستہ وارثی، تین ارمغانِ بیدم اور دو مصحفِ بیدم میں موجود ہیں۔

''گلدستہ وارثی'' میں حضرت علیؓ کی مدح میں بیدم کی وہ مشہور اور شہرہ آفاق منقبت شامل ہے جس کا مقطع آج بھی زبان زد عام ہے۔ فرطِ عقیدت میں ڈوبی اس منقبت کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

دستِ الہ کیوں نہ ہوں شیرِ خدا علی
مقصودِ ہل آتی ہیں شہِ لافتا علی
بندہ ہوں میں انھی کا ، انھی کا غلام ہوں
مولا مرے امام مرے پیشوا علی
بیدم یہی تو پانچ ہیں مقصودِ کائنات
خیر النساؑ ، حسینؑ و حسنؑ ، مصطفیؐ ، علیؑ ۵؎

''جگر پارہ المعروف بہ ارمغانِ بیدم'' میں حضرت علیؑ کی مدح میں تین مناقب شامل ہیں۔

تم شاہ ولایت ہو امیر دوسرا ہو
مولا ہو مرے قومِ نصیری کے خدا ہو
شادابئ گلزارِ دو عالم ہے تمھیں سے
تم پر تو آئینہ لولاک لما ہو
ہاں راکبِ دوشِ نبویؐ کون ہے تم ہو
تم حیدر کرار ہو ، تم شیرِ خدا ہو ٦؎

شادابیٔ گلزارِ دو عالم، پرتو آئینہ لولاک لما اور راکبِ دوشِ نبویؐ جیسی عمدہ تراکیب وضع کرنا کچھ بیدمؔ کا ہی خاصا ہے۔

''مصحفِ بیدم'' میں موجود پہلی منقبت میں بیدمؔ نے حضرت علیؓ کے اوصاف کا کمال مہارت سے احاطہ کیا اور انھیں خیبر کشا، بابِ علوم، صفدرِ امام دیں اور قیصر و خاقانِ اولیا جیسے القابات سے مخاطب کیا ہے۔

روحِ روانِ مصطفوی جانِ اولیا
مولا علی بہارِ گلستانِ اولیا
مشکل کشا و قوتِ بازوئے مصطفیٰ
خیبر کشا و شیر نیستانِ اولیا
بابِ علوم ، حیدر و صفدرِ امام دیں
شاہ و امیر و قیصر و خاقانِ اولیا
کحل البصر ہے خاکِ قدم بو تراب کی
نقشِ قدم ہے قبلۂ ایمانِ اولیا ۷؎

نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ کی بے مثال قربانی حق و باطل کے معرکہ کی لازوال داستان ہے۔ بیدمؔ کے کلام میں واقعہ کربلا اور امام حسینؓ کی قربانی کے متعلق اکثر اشعار ملتے ہیں۔ تاہم حضرت امام حسین کی مدح و تعریف میں علاحدہ سے بھی دو مناقب موجود ہیں۔

ولادتِ امام حسین، امت مسلمہ کے لیے کس قدر خوش بختی کی علامت تھی اس کا ذکر بیدمؔ ''ارمغانِ بیدم'' میں کچھ یوں کرتے ہیں:

ہوا ہے اور نہ ہو گا تم سا شاہِ بحر و بر پیدا
جو تم کو دیکھنا چاہے کرے پہلے نظر پیدا
مبارک ہو ہوئے ہم گمرہوں کے راہبر پیدا
امیرِ عرش و کرسی، تاجدارِ بحروبر پیدا
بنے گا جو شمار دانہ تسبیحِ امامت میں
ہوا نخلِ ابو طالب سے وہ تازہ ثمر پیدا
زمینِ کربلا بیدمؔ بسی ہے جس کے پھولوں سے
ہوا ہے باغِ نبیؐ میں وہ نہالِ بار ور پیدا ۸؎

نخلِ ابوطالب، برجِ اسد اللہ اور نہالِ باروَر جیسی نادر تشبیہات و استعارات اس کلام کی خوبی ہے۔

''کرشمہ وارثی'' میں موجود غزلیہ منقبت میں بیدمؔ نے واقعہ کربلا کے اہم واقعات اور اہلِ بیتؑ کے مصائب کو کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔

یہ تو اکثر دہنِ شاہِ زمن سے نکلا
کام امت کا حسینؑ اور حسنؑ سے نکلا
جب حسین ابنِ علی اپنے وطن سے نکلا
نقدِ جاں کے لیے سب روتے تھے تن سے نکلا
گو میں بیمار ہوں پر ساتھ چلوں گی بابا
وقتِ رخصت یہی صغرا کے دہن سے نکلا
شب کو شادی ہوئی قاسم کی سحر قتل ہوئے
کوئی ارمان نہ دولہا کا دولہن سے نکلا
دخترِ شاہ پہ ہیہات تھی کیا ظلم و ستم
دستِ نازک ہوا زخمی جو رسن سے نکلا
رو کے فرمانے لگے بخششِ امت کی دُعا
ہاتھ عابدؑ کا جو کوفہ میں رَسن سے نکلا
مرے بابا مرے اصغرؑ کو دکھا دو للّٰہ
دم سکینہؑ کا اسی رنج و محن سے نکلا

ظلم پر ظلم ہی کرتے رہے ظالم لیکن
شکوۂ ظلم نہ زینبؑ کے دہن سے نکلا ۹؎

محض نو اشعار پر مشتمل اس غزلیہ منقبت میں مرثیہ کی ساری منظر نگاری، جذبات نگاری اور رقت انگیزی سمٹ آئی ہے۔ یہ ایجاز و اختصار کا عمدہ نمونہ اور بیدمؔ کے کمالِ فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

محبوبِ سبحانی، قطبِ ربانی، غوث الاعظم، محی الدین سید عبدالقادر جیلانیؒ، ہر سلسلے اور ہر دور کے اولیائے کرام کی راہ نمائی کا مرکز و محور رہے ہیں۔ بیدمؔ نے آپ کی شان میں لگ بھگ چودہ مناقب لکھی ہیں۔

''کرشمہ وارثی'' میں حضرت غوثِ الاعظمؒ کی عظمت کو بیدمؔ یوں سلام پیش کرتے ہیں:

یاد آتی ہے مجھے جس دم ادائے غوث پاک
چونک اٹھتا ہوں کہہ کر شب کو ہائے غوث پاک

دل فدا اور آنکھ ہے محوِ لقائے غوث پاک
کوئی شیدا ہے کوئی ہے مبتلائے غوثِ پاک ۱۰؎

''ارمغانِ بیدمؔ'' کی ایک منقبت میں حضرت غوث پاکؒ کے اوصاف، بیدم کی زبانی سنیے:

گلبنِ باغ نبیؐ ، سرورِ ریاض حیدری
غوثِ اعظم ، قطب عالم ، مالکِ بحر و بری
سید و سلطان ، فقیر و خواجہ، مخدوم و غریب
بادشاہِ دوجہاں مسند نشین برتری
ظلِّ ذاتِ لم یزل آئینۂ حسنِ ازل
مظہر شانِ خدا ، عکسِ رخِ پیغمبری
بن گیا بغداد بھی بیدمؔ تجلی گاہِ طور
شانِ عبدیت میں جب قادر نے کی جلوہ گری ۱۱؎

استغاثہ اور استمدادیہ کی عمدہ مثال ملاحظہ ہو:

جان پر بن گئی اب آیئے شیئاً للّٰہ
مشکل آساں مری فرمایئے شیئاً للّٰہ
کشتیاں ڈوبی ہوئی آپ نے تیرائی ہیں
مری امداد بھی فرمایئے شیئاً للّٰہ ۱۲؎

سرزمین ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کا بیج بونے والے، سلطان الہند، ولی الہند اور غریب نواز کہلانے والے حضرت معین الدین اجمیریؒ ہیں۔ چشتیہ سلسلہ اور اس کی مختلف شاخوں مثلاً نظامیہ، صابریہ کے نام لیوا پاک و ہند میں کثرت سے موجود ہیں۔ بیدمؔ نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی مدح و تعریف میں نو مناقب لکھیں۔ جن میں سے تین ان کے مجموعہ کلام کرشمہ وارثی، تین گلدستہ وارثی، ایک ارمغانِ بیدم اور دو مناقب مصحفِ بیدم کی زینت ہیں۔

محبوب کا ذکر بار بار قلم اور سخن کی زینت ہے اس کے لیے اکثر شعرا محبوب کے القابات کو کمال عقیدت سے اپنے کلام میں ردیف کے طور پر نبھاتے ہیں۔ ذکرِ محبوب کو کثرت سے کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ شعری قرینہ ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی سے اپنی محبت اور شیفتگی کا اظہار بیدمؔ یوں کرتے ہیں:

مرے دل کو لگی ہے تمھاری لگن یا خواجہ معین الدین چشتی
کہلاتا ہوں آپ کا شاہِ زمن یا خواجہ معین الدین چشتی ۱۳؎

''گلدستہ وارثی'' کی ایک منقبت میں مقامِ معین الدین چشتی کا احوال ملاحظہ ہو:

گلدستہ باغِ رسالت ہو ، سلطانِ الہند غریب نواز
تم رونقِ بزم ولایت ہو ، سلطان الہند غریب نواز
کشاف معانی پنہانی ، مہدی طریقِ خدا وانی
زینتِ دہ قصرِ ہدایت ہو ، سلطانِ الہند غریب نواز ۱۴؎

''مصحفِ بیدم'' کی پہلی منقبت میں غزلیہ رنگ جھلکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خواجہ تری خاکِ آستانہ
ہے طرۂ تاج خسروانہ
اُن کی ہی نظر کا ہوں نشانہ
دل لے کے جو ہو گئے روانہ
اے خواجہ معین الدین چشتی
اے ہادی و مرشدِ یگانہ ۱۵؎

ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا زیادہ تر قیام اجمیر میں ہی رہا۔ دہلی میں اس سلسلے کی ترویج واشاعت کا سہرا آپ کے مرید خاص حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے سر ہے۔ حضرت بختیار کاکیؒ سماع کے بہت شوقین تھے۔ آپ کی طبیعت میں حد درجہ استغراق وانجذاب پایا جاتا تھا۔

بیدم وارثی نے اپنے مجموعہ کلام ''گلدستہ وارثی'' میں ایک منقبت حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی شان میں بھی لکھی ہے۔ جوشِ عقیدت اور جذبۂ جاں سپاری سے لکھی اس منقبت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زمانہ مبتلا ہے قطب دیں سلطانِ چشتی کا
خدائی کا خدا ہے قطب دیں سلطان چشتی کا
بشر کیسے مَلَک اس سر زمیں پر سجدہ کرتے ہیں
جہاں روضہ بنا ہے قطب دیں سلطان چشتی کا
ذرا ہٹ جاؤ اپنا مدعا کہنے دو بیدم کو
کہ یہ بھی دل جلا ہے قطبِ دیں سلطانِ چشتی کا ۱۶؎

حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے۔ پاکپتن شریف کا خطہ آج بھی بے شمار لوگوں کے لیے مرجع خلائق اور مرکز انوار وتجلیات ہے۔

''گلدستہ وارثی'' میں حضرت فرید الدین گنج شکر کے مناقب و اوصاف بیدمؔ کی زبانی سنیے:

مظہر کبریا فرید الدین
مصدرِ اولیا فرید الدین
معدنِ لطف و منبعِ احسان
کانِ جود و سخا فرید الدین
خواجہ خواجگان گنج شکر
میرے گلگوں قبا فرید الدین ۱۷؎

حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر، شیخ کبیر بابا فرید الدین گنج شکر کے حقیقی بھانجے اور مرید تھے۔ چشتی سلسلہ کی ذیلی شاخ سلسلہ صابریہ کا آغاز آپ ہی سے ہوا۔ آپ اکثر نیم مجذوبانہ اور استغراق کی حالت میں رہتے تھے۔ آپ کا مزار ضلع سہارن پور سے تیس کوس کے فاصلے پر کلیر شریف میں ہے۔ آپ کی مدح میں بیدمؔ وارثی نے چار مناقب لکھی ہیں جن میں سے ایک گلدستہ وارثی اور تین مصحفِ بیدم میں شامل ہیں۔ ''گلدستہ وارثی المعروف بہ نذرِ غریب نواز'' میں شامل عمدہ تراکیب اور صنعت تضاد و مراۃ النظیر سے آراستہ منقبت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دُرِ بحرِ حقیقت ، نیر برجِ خدا دانی
علی احمد علاؤ الدین صابر پیرِ لاثانی

گلِ بستانِ محبوبی، سراپا مجمعٔ خوبی
شمیمِ عطرِ توحیدی، گلِ بستانِ تفریدی
بباطنِ الٰہی صورت، بظاہر شکلِ انسانی
مرادِ عاشقِ بیدل زہے محبوبِ سبحانی
وہی کلیر کہ جس کو دشتِ ہو کہتا تھا اِک عالم
بنا تیری بدولت غیرتِ گلزارِ رضوانی
مری آنکھوں کی پُتلی آئینہ خانے میں حیراں ہیں
تجھی کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اے تصویرِ نورانی ۱۸؎

''مصحفِ بیدم'' میں حضرت صابر کلیریؒ کے روضۂ پرانوار کی مدح سرائی بیدمؔ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بہارِ باغِ جنت ہے بہارِ روضۂ صابر
جوارِ عرشِ اعلیٰ ہے جوارِ روضۂ صابر
یہاں بے پردہ اللہ و نبی کی دید ہوتی ہے
ہمیں مکہ مدینہ ہے دیارِ روضۂ صابر ۱۹؎

بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ایک اور مرید خاص اور چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے موسس سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ ہیں۔ آپ بلاشبہ اولیائے چشت کی بزم کے باکمال نگیں ہیں۔

بیدمؔ وارثی بھی آپ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیے بغیر نہ رہ سکے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ سے اپنی والہانہ محبت و شیفتگی اور وارفتگی کا اظہار آپ کی مناقب لکھ کر کیا۔ کلامِ بیدمؔ میں حضرت نظام الدین اولیا کی مدح میں تین مختلف مناقب ملتی ہیں۔ جن میں سے ایک ''گلدستہ وارثی'' اور دو ''مصحفِ بیدم'' کی زینت ہیں۔ ''گلدستہ وارثی'' کی ایک منقبت ملاحظہ ہو:

نظام الدین محبوبِ الٰہی جانِ محبوبی
فرید الدین کے پیارے تم پہ صدقے شانِ محبوبی
امیرِ مُلکِ خوبی ، افسر و خاقانِ محبوبی
خدیوِ مہ جبیناں، خسروِ خوبانِ محبوبی
عرب کے چاند نے آ کر کیا عنوانِ محبوبی
نظام الدین ٹھہرے مقطعِ دیوانِ محبوبی
مہ تابانِ خوبی، مصورِ حُسن و دل آرائی
سراپا معدنِ مہر و محبت کانِ محبوبی
تمان ہے کہ دل ان پیاری نظروں کا نشانہ ہو
ادھر بھی اے میرے شہباز اِک پیکانِ محبوبی
یہاں بیدم وہاں لوح و قلم مدحت سرا تیرے
خدا کا عرشِ اعلیٰ ہے تیرا ایوانِ محبوبی ۲۰؎

رعایتِ لفظی، نادر تراکیب، صنعت مراعاۃ النظیر اور اچھوتے استعارات کی مثالیں اس ایک منقبت میں مجتمع ہوگئی ہیں۔

امیر ابوالعلاؒ احراری اکبرآبادی کی مدح میں بھی بیدمؔ نے دو مناقب لکھی ہیں۔ ''ارمغانِ بیدم'' میں بیدمؔ وارثی کچھ یوں مدح سرا ہیں:

ہفت آسماں ہیں فرش تعالِ ابو العلا
اللہ رے اوج و جاہ و جلالِ ابو العلا
لائی صبا نویدِ وصالِ ابو العلا
کیا گل کھلا رہا ہے خیالِ ابوالعلا ۲۱؎

مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ کی شان، بیدمؔ ''مصحفِ بیدم'' میں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

اے میرے دریا دل ساقی ، میرِ میخانہ عبدالحقؒ
اپنے میخواروں کا صدقہ بھر دے پیمانہ عبدالحقؒ
مہر ذرہ پرورتم ہو ہر دل میں ضیا گسترتم ہو
تم شمعِ بزمِ پیمبرؐ ہوعالم پروانہ عبدالحقؒ ۲۲؎

مخدوم شاہ عبدالمنعم کنز المعرفت قادری شاہ ولایت دیوہ شریف کی تعریف وتوصیف میں بھی بیدمؔ نے دومناقب لکھیں۔

''گلدستہ وارثی'' میں فارسی زبان میں استمدادیہ کی انتہائی خوب صورت مثال ملاحظہ ہو:

حامی دینِ نبیؐ شمع ہدایت مددے
گلبنِ باغِ علیؓ شاہِ ولایت مددے

المدد یا شاہِ منعم بطفیل حسنینؓ
از رہ خاصۂ خاصانِ طریقت مددے
آمدم بزورِ توتشنہ دیدارِ جمال
ابر رحمت مددے بحرِ کرامت مددے ۱۲۳؎

''مصحفِ بیدم'' میں ان کے انوار واسرار کچھ یوں بیان ہوئے ہیں:

ہو مبارک تمھیں اے بادہ کشانِ منعم
مے پیو کھل گئی لو آج دُکانِ منعم
یاں کا ہر ذرہ ہے گنجینۂ انوارِ خدا
بقعہ نور ہے واللہ مکانِ منعم ۲۴؎

حضرت حافظ و حاجی وارث علیؒ سلسلہ وارثیہ کے بانی اور بیدم کے مرشد ہیں۔ آپؒ کے بارے میں بیدم کا کہنا ہے۔

مجھے دے کے دم تو نے بیدم بنایا
تری شانِ والا کے قربان وارثؒ

حضرت وارث پاکؒ دیوہ شریف (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں دیوہ شریف میں ہی آپ کا مزار پرانوار و تجلیات ہے۔

بیدم کی تمام تر شاعری کا محرک اور مرکز ومحوران کے مرشد حاجی وارث پاکؒ کی ذاتِ بابرکات رہی۔ حمد ونعت سے لے کر غزل، اور پوربی بھاشا کے کلام تک ہر صنف میں بیدم کے مرشد کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ منقبت نگاری کے میدان میں جہاں انھوں نے کبار صحابہؓ اور اولیائے چشت کے مناقب انتہائی عقیدت و احترام سے بیان کیے وہیں اپنے مرشد حضرت وارث پاکؒ کے فضائل وشمائل اور مناقب جلیلہ بیان کرنے میں خصوصی دلچسپی اور التفات کا مظاہرہ کیا۔ اس حقیقت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ بیدم کے دستیاب کلام میں تیس سے زائد سلام اور مناقب ایسے ہیں جن میں بیدم نے باقاعدہ حضرت وارث پاکؒ کے اسم گرامی یا القابات کو بطور ردیف نبھایا ہے۔ پینتیس کے لگ بھگ ان مناقب میں سے تیرہ کرشمہ وارثی، چھے گلدستہ وارثی، چار ارمغانِ بیدم اور دس سے زائد مصحفِ بیدم میں شامل ہیں۔ غزلیات میں جابجا وارث پاکؒ کی مدح میں اشعار ان کے علاوہ ہیں۔

''گلدستہ وارثی''میں اپنے مرشد کے اعلیٰ حسب نسب کا بیدمؔ یوں اعلان کرتے ہیں:

بہارِ باغِ زہرا، یادگارِ مرتضیٰ وارث
سرور سینۂ حسنین، جانِ مصطفیؐ وارث
شہِ اقلیم عرفاں، تاجدارِ اولیا ، وارث
دُرِ دریائے رحمت، نیّر برج سخا وارث ۲۵؎

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

مرحبا اے گلِ گلزارِ رسولِ عربی
سارے عالم میں ہے روشن تری عالی نسبی
جانِ حسنین و سرورِ دلِ زہرا وارث
نورِ چشم علی و سبطِ رسولِ عربی ۲۶؎

''مصحفِ بیدم'' میں حضرت وارث پاکؒ کے سراپا کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

بلائے جاں ہے حُسنِ روئے وارث
قیامت قامتِ دل جوئے وارث
قیودِ کیش و ملت سے ہیں آزاد
اسیرِ حلقۂ گیسوئے وارث
ہے روزِ دیدارِ وارث عید کا دن
ہلالِ عید ہے ابروئے وارث ۲۷؎

مرشد سے اپنی انتہائی محبت وعقیدت کا اظہار کچھ اس ادا سے کرتے ہیں:

فدا ہے ہے جان تو دل مبتلائے وارث ہے
غرض کہ مجھ میں جو کچھ ہے برائے وارث ہے
وہ دل ہے دل جو ہے آئینہ دارِ حُسن و جمال
وہی ہے آنکھ جو محوِ لقائے وارث ہے
زمینِ دیوہ کے آنکھوں سے ذرّے چُنتا ہوں
کہ دردِ دل کی دوا خاکِ پائے وارث ہے
نہ اتقا نہ ریاضت نہ زہد ہے نہ ورع
متاعِ بیدمؔ خستہ، عطائے وارث ہے ۲۸؎

اسی محبت، عقیدت اور جاں سپاری کے ایک اور جذبہ کا اظہار ملاحظہ ہو:

مٹے ہم راہِ وارث میں محبت ہو تو ایسی ہو
نہ فکر تن نہ خوف جاں جو چاہت ہو تو ایسی ہو
کسی کروٹ کسی پہلو نہ آئے چین بیدم کو
ترقی تیری اے دردِ محبت ہو تو ایسی ہو ۲۹؎

جاں سپاری کا ایسا ہی ایک نظارا ''ارمغانِ بیدم'' سے پیشِ خدمت ہے:

جان ہے فدائے وارث دل مبتلائے وارث
روزِ ازل سے آنکھیں محو لقائے وارث

عالم کی تاج داری سمجھیں کہ آج پالی
سر دیکھ لیں جو اپنا ہم زیرِ پائے وارث ۳۰؎

بیدمؔ اپنے مرشد کو راہِ تصوف کا ہادی اور خضر تو سمجھتے ہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام دنیاوی آزمائشوں اور مشکلات سے نجات اور چھٹکارا پانے کے لیے بھی اپنے مرشد کی نظر کرم کے محتاج ہیں۔ حضرت وارث پاکؒ کی مناقب میں بیدمؔ اکثر دعائیہ اور التجائیہ انداز بھی اپناتے ہیں۔ مرشد کے حسب نسب، مقام و مرتبہ، شمائل و فضائل اور اپنی عقیدت بیان کرنے کے بعد بیدمؔ ان کے حضور فریاد کرنا نہیں بھولتے۔ ''ارمغانِ بیدم'' کی ایک منقبت کا یہ دعائیہ اور التجائیہ انداز ملاحظہ ہو:

مجھے پا کر ضعیف و ناتواں سب کی بن آئی ہے
دلِ حسرت زدہ پر لشکرِ غم کی چڑھائی ہے
پھنسا ہوں سخت مشکل میں دمِ مشکل کشائی ہے
علی مرتضیٰ کے لاڈلے وارث دوہائی ہے ۳۱؎

''مصحفِ بیدم''، میں مرشد کے حضور یوں گڑگڑاتے ہیں:

مرے دل کا دل جان کی جان وارث
مری زندگانی کا سامان وارث
بنائی ہے بگڑی ہوئی تم نے سب کی
مری مشکلیں بھی ہوں آسان وارث

دمِ نزع تو آ کے صورت دکھا دے
کوئی دم کا بیدمؔ ہے مہمان وارث ۳۲؎

''مصحف بیدم''، میں ہی ایک اور جگہ فریاد کرتے ہیں:

تری سرکار ہے عالی مرے وارث مرے والی
نہ رکھ دامن مرا خالی مرے وارث مرے والی
مری تسکینِ خاطر کو تصور ہی میں آجاؤ
میں تنہا ، رات ہے کالی ، مرے وارث مرے والی ۳۳؎

''مصحفِ بیدم''، میں ہی فارسی زبان میں اپنے مرشد سے اپنی عقیدت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

بحالِ خستہ و گم کردہ راہے
نگاہے خسروِ خوباں نگاہے
سجودِ آرزو شام و بگاہے
بسوئے آستانے کج کلاہے
برائے تشنہ کامانِ محبت
درِ تو ما من و امید گاہے
قدم از روضہ بیروں نہ خدارا
ہزاراں دیدۂ دل فرشِ راہے
بہر دم خوبیِ حسنش فزوں باد
الٰہی تا فروغِ مہر و ماہے
بیا در حلقۂ پیرِ خرابات
برو از خواجگی و خانقاہے
شہنشاہِ زمانہ ہست بیدمؔ
گدائے وارثِ عالم پناہے ۳۴؎

بیدم وارثی کے ایسے ہی کلام بارے قدیر احمد وارثی رائے زنی کرتے ہیں:

''پیر و مرشد سرکار وارث پاک کی توجہ مبذول کرانے کے لیے آپ نے بھی اپنے جذبات کو شعر کا جامہ پہنایا اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ آج صوفی شاعروں کے سرتاج نظر آتے ہیں۔'' ۳۵؎

مختصر یہ کہ بیدمؔ کا قلم ہمیشہ عقیدتِ اولیائے کرام سے مہکتا رہتا ہے اور یہ مہک لازوال ہے۔ بیدمؔ نے جتنی بھی مناقب لکھیں ان میں حسنِ عقیدت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی التزام کیا ہے کہ قاری کو اپنے مذہبی اور روحانی پیشواؤں سے یک گونہ محبت ہو۔ بیدمؔ کی منقبت میں گہرائی فکر بھی ہے اور وسعت خیال بھی۔ بیدمؔ وارثی کی منقبت نگاری صدق وصفا اور عقیدت و جاں سپاری سے لبریز ہے، غزلیہ رنگ، منفرد اسلوب، عاجزانہ لب ولہجہ اور صنائع بدائع کے دلفریب استعمال نے فنی مقام و مرتبہ بھی متعین کر دیا ہے۔

حواشی

۱۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات، جلد دوم، لاہور، اردو سائنس بورڈ، طبع دوم، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۸۳

۲۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۶

۳۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، دیباچہ بعنوان: ''سلکِ مناقب'' در ''مناقب'' از حفیظ تائب، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶

۴۔ طالب الہاشمی، پیش لفظ بعنوان: ''تقدیم'' در ''مناقب از حفیظ تائب''، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳

۵۔ بیدم وارثی، کلیاتِ بیدم وارثی مرتبہ: راشد عزیز وارثی، جہلم، بک کارنر، ۲۰۱۷ء، ص ۴۶۶

۶۔ ایضاً۔ ص ۳۲۲ ۷۔ ایضاً۔ ص ۹۸ ۸۔ ایضاً۔ ص ۳۲۳

۹۔ ایضاً۔ ص ۲۲۰ ۱۰۔ ایضاً۔ ص ۲۲۰ ۱۱۔ ایضاً۔ ص ۳۲۴

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۹۹ ۱۳۔ ایضاً۔ ص ۲۲۲ ۱۴۔ ایضاً۔ ص ۴۶۸

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۱۰۰ ۱۶۔ ایضاً۔ ص ۴۶۹ ۱۷۔ ایضاً۔ ص ۴۶۹

۱۸۔ ایضاً۔ ص ۴۷۰ ۱۹۔ ایضاً۔ ص ۱۰۲ ۲۰۔ ایضاً۔ ص ۴۷۰

۲۱۔ ایضاً۔ ص ۳۲۶ ۲۲۔ ایضاً۔ ص ۱۰۳ ۲۳۔ ایضاً۔ ص ۴۷۱

۲۴۔ ایضاً۔ ص ۱۰۴ ۲۵۔ ایضاً۔ ص ۴۷۱ ۲۶۔ ایضاً۔ ص ۴۹۶

۲۷۔ ایضاً۔ ص ۱۰۶ ۲۸۔ ایضاً۔ ص ۱۰۸ ۲۹۔ ایضاً۔ ص ۲۵۷

۳۰۔ ایضاً۔ ص ۳۲۷ ۳۱۔ ایضاً۔ ص ۲۳۷ ۳۲۔ ایضاً۔ ص ۱۰۷

۳۳۔ ایضاً۔ ص ۱۰۹ ۳۴۔ ایضاً۔ ص ۱۵۲

۳۵۔ قدیر احمد، وارثی، پیش لفظ در ''حدیثِ معرفت''، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۴

□□□

منقبت کی روایت اور حفیظ تائب

ڈاکٹر تحسین فراقی

ABSTRACT: In this article, Dr. Tehseen Firaqi meticulously explores the tradition, evolution, and fundamental trends of Manqabat. He not only addresses the intellectual and artistic dimensions of Manqabat's merits but also highlights the conceptual errors prevalent among poets who engage in this form of writing. The article is structured into two distinct parts. The first part offers an in-depth analysis of the tradition of Manqabat in both Persian and Urdu, encompassing major trends, intellectual contexts, and doctrinal dimensions. In contrast, the second part is dedicated specifically to a study of Hafeez Taib's contributions to Manqabat writing, focusing on the exploration of its literary qualities. This latter section serves as a catalyst for the insights presented in the first part. Rich with valuable observations and critical assessments, the article provides a comprehensive examination of the tradition of Manqabat and its evolution over time, revealing the complexities and nuances that characterize this poetic form. Through his analysis, Dr. Firaqi invites readers to appreciate not only the aesthetic appeal of Manqabat but also the underlying philosophical and theological implications embedded within it.

Keywords: Manqabat, Poetry, Tradition, Hafeez Taib

جس طرح یاقوت پتھروں میں سے نہیں، اسی طرح آدمیوں کے جمِ غفیر میں کچھ سعید روحیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی ہوتے ہوئے بھی اُس سے بہ مراتب بلند ہوتی ہیں اور اعلیٰ شرفِ انسانی سے متصف۔ ملتِ اسلامیہ کے انھی عظیم انسانوں کے فضائل واوصاف اور کمالات وکرامات کے بیان کا

نام مناقب ہے۔جس طرح یاقوت کے اندر سورج کی صدیوں کی انوار پاشی کے نتیجے میں نورانیت پیدا ہوجاتی ہے اور نورانیت کے یہ مظاہر سرخ، زرد، کبود اور سفید کے چار رنگوں کا روپ دھار لیتے ہیں، اسی طرح فضلِ ربانی اور ریاضتِ ذاتی کے نتیجے میں اعلیٰ درجے کے انسانوں کا بھی متنوع ظہور ہوتا رہتا ہے۔ایک ہی نوع کے اندر رنگوں کی یہ کثرت خود آیاتِ الٰہی میں سے ہے۔ یاقوتِ سرخ ہی کو لیجیے، یہ معمولی فرق کے ساتھ مزید سات رنگوں پر بٹا ہوا ہے۔ کہیں یہ یاقوتِ رمّانی ہے، کہیں یاقوتِ ارغوانی، کہیں یاقوتِ وردی ہے، کہیں یاقوت لحمی، کہیں یاقوت خمری ہے، کہیں یاقوتِ جگری وغیرہ۔قرآن حکیم میں اُن نفوسِ قدسیہ میں سے بعض کو انبیا، بعض کو صدیقین، بعض کو شہدا اور بعض کو صالحین کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔مسلم ادبیات میں اُن مبارک افراد کا ذکر نظم ونثر دونوں میں ملتا ہے۔مگر زیرِ نظر تحریر میں صرف نظم کی بعض مثالوں سے اعتنا کیا گیا ہے اور وہ بھی فارسی اور اُردو کی حد تک۔

منقبت نویسی کی روایت

روایت ہے اور جیسا کہ مرحوم پروفیسر احسن زیدی نے لکھا ہے مناقب کا نقطۂ آغاز حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار ہیں جو اُنھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مدح میں لکھے۔فرزدق کا میمیہ بھی اس ذیل میں قابلِ توجہ ہے جو اُس نے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی مدح میں تصنیف کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی منقبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بہ نفسِ نفیس حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زبان سے سنی اور فرمایا: ”صدقتَ یا حسّانُ!“۔

فارسی میں متعدد شعرا نے مناقبِ اصحاب کبار اور فضائلِ اہل بیت تصنیف کیے۔فردوسی، سنائی، عطار، ناصر خسرو، عراقی، رومی، خسرو، سعدی، حافظ، جامی، قاآنی، عرفی، فیضی، نظیری، غنیمت کنجاہی، بیدل، دلشاد پسروری، خواجہ بختیار کاکی، شیخ علی حزیں، غالب، خواجہ مستان کابلی، گرامی، اقبال، حافظ افضل فقیر، صاحبزادہ نصیر الدین اور متعدد دوسرے شعرا نے اپنے رشحاتِ شعری سے مناقب وفضائل کی سرزمین کی آب یاری کی۔ان میں سے چند شعرا کے شعری اقتباسات یا ان کے مفاہیم کا اندراج بے محل نہ ہوگا۔ یہ مناقب خلفاے راشدین کے علاوہ آئمہ اطہار، اولیاے کبار اور صوفیانِ صافی کے ذکر پر مبنی ہیں۔

فردوسی کے شاہنامے کی جلد اول میں خلفائے راشدین کا ذکر عقیدت ومحبت کے پیرایے میں ملتا ہے۔ پہلے تین خلفا کا ذکر ایک ایک شعر میں ہے اور خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ پر متعدد شعر لکھے گئے ہیں:

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل و وحی — خداوندِ امر و خداوندِ نہی
کہ خورشید بعد از رسولانِ مہ — نتابید بر کس زِ بوبکر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار — بیا راست گیتی چو باغِ بہار

پس از ہر دواں بود عثماں گزیں خداوندِ شرم و خداوندِ دِیں
چہارم علی بود جفتِ بتول کہ او را بہ خوبی ستاید رسول
کہ من شہرِ علم و علیم درست درست این سخن قولِ پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن رازِ اوست تو گوئی دو گوشم بر آوازِ اوست
علی را چنین دان و دیگر ہمیں کزیشان قوی شد بہر گونہ دیں

(شاہنامہ، مرتبہ: محمد دبیر سیاقی، جلد اول، صفحہ:٦)

ممتاز صوفی شاعر عطار نے اپنی شہرہ آفاق عرفانی مثنوی منطق الطیر میں خلفاے راشدین کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے نمایاں اور امتیازی اوصاف کی جانب بھی اشارے کیے ہیں۔ اُنھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صدرِ دیں، صدیق اکبر، قطبِ حق، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواجۂ شرع، ظل حق، شمع دین، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بحرِ تقویٰ و حیا، کانِ وفا اور خداوندِ دونورِ برحق جیسے عمدہ القابات سے یاد کیا ہے۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انھوں نے کانِ علم، بحرِ حلم، قطبِ دیں، ساقیِ کوثر اور مفتیِ مطلق لکھا ہے۔ صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مناقب پر مبنی چند شعر ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ اُن کی شخصیت کے نمایاں ترین فضائل کو کس خوبی سے آئینہ کیا ہے:

خواجۂ اول کہ اول یارِ اوست ثانی اثنین اذ ہما فی الغارِ اوست
صدرِ دیں، صدیقِ اکبر، قطبِ حق در ہمہ چیز از ہمہ بُردہ سبَق!
سر فرو بردی مہ شب تا بہ روز نیم شب ہوی بر آوردی بہ سوز
ہوی او تا چیں بہ رفتی مشک بار مشک کردی خونِ آہوئے تتار

(منطق الطیر [احمد خوش نویس عماد]،ص ۳۰،۳۱)

نیم شب کی جس "ہوی بہ سوز" کا ذکر عطار نے کیا ہے، اُس کی جانب اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے:

دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے

سنائیؔ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں جو نونیہ لکھا، اس میں انھیں شمعِ دیں، امیر المومنین اور ابوالحسن (کنیتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ) لکھنے کے بعد اُن کی بے مثل شجاعت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان جیسا جلال و جمال اور کمال و مرتبہ اور کسی کے حصے میں نہ آیا۔ اسی طرح سعدیؔ نے اپنے ہمزیہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اوصاف کی نشان دہی کی ہے۔

یوں تو فارسی اور اردو کے متعدد شعرا نے مناقبِ خلفائے راشدین سے اعتنا کیا ہے، مگر ان میں خاصی بڑی تعداد ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے زیادہ تر مناقبِ اہلِ بیت، خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو

اپنے شعری کمالات کی جولاں گاہ بنایا۔ اس ضمن میں جن شعرا نے حضرت علیؓ یا امام حسینؓ کے بڑے پُرزور مناقب لکھے، اُن میں عرفیؔ کا رائیہ، فیضیؔ کا میمیہ، بیدلؔ کا ترکیب بند، شیخ علی حزیںؔ کی ''منقبت بہ حضور حضرت علیؓ'' غالب کا دالیہ ونونیہ اور اقبال کے متعدد شعر خصوصیت سے لائقِ توجہ ٹھہرتے ہیں۔

عرفی یوں تو غزل کا بھی باکمال شاعر ہے، مگر اُس کی قدرتِ کلام اور زورِ بیان کا صحیح اندازہ اُس کے قصاید سے ہوتا ہے۔ ان قصاید نے اُردو کے ممتاز قصیدہ نگاروں کو بے حد متاثر کیا۔ اس ضمن میں سوداؔ جیسے نامور قصیدہ نگار کی تاثر پذیری سامنے کی چیز ہے۔ عرفیؔ نے حضرت علیؓ کی مدح میں متعدد قصیدے لکھے، جن میں ایک سو چوراسی اشعار کا ایک قصیدہ رائیہ بھی ہے جس کا مطلع (اور مطلع کا پُرزور بناؤ) آج بھی فارسی جاننے والوں کی زبانوں پر جاری رہتا ہے۔ اس قصیدے کی حالیہ تشبیب کی اثر آفرینی اور مدح میں جزالتِ الفاظ اور زورِ بیان، بندش کی چستی اور مضامین کی تازگی سب داد کے لائق ہیں۔ مطلع یہ ہے:

جہاں بہ گشتم و دردا بہ ہیچ شہر و دیار
نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

لیکن اس بات کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ بدقسمتی سے فارسی اور اُردو قصاید کی کثیر تعداد ممدوحین کی زندہ جیتی جاگتی اور حقائق پر مبنی تصویر کشی سے عاری نظر آتی ہے۔ بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کے قصاید کا مقصد تو چونکہ زیادہ تر جلبِ منفعت اور اپنے زورِ بیان کی دھاک بٹھانا ہوتا تھا، اس لیے وہاں حد درجہ مبالغہ اور تعلّی کے مضامین سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے، مگر اکابرِ امت کی مدح میں بھی اگر شوکتِ بیان کی نمایش اور فخریہ کا عنصر ہی غالب نظر آئے، تو نتیجتاً ممدوح کے ساتھ قاری کا کوئی گہرا فکری یا روحانی تعلق پیدا ہونا محالات میں سے ہے۔ عرفیؔ کے مذکورہ قصیدے میں بھی ایسی ہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ بہرحال اس قصیدے کے جو چند شعر (تشبیب کو چھوڑ کر) متاثر کرتے ہیں، یہ ہیں:

بہ کاوشِ مژہ از گور تا نجف بہ روَم
اگر بہ ہند ہلاکم کنی و گر بہ تتار (خطاب بہ خرد)

شہِ سریرِ ولایت علیِ عالی قدر — محیطِ عالمِ دانش، جہانِ علم و وقار
غبارِ صحنِ سرائے تو اوجِ ہفت اورنگ — شکنجِ زلفِ سخائے تو موجِ دریا بار
محیط بر کفِ جُودِ تو کرد موجِ فدا — سپہر بر سرِ جاہِ تو کرد اوجِ شمار!
غبارِ خشمِ تو آرایشِ کلاہِ خزاں — شعارِ لطفِ تو افزایشِ جمالِ بہار
(قصائدِ عرفؔی، مطبع منشی نولکشور، ص: ۱۸، ۱۹)

لیکن قصیدے کے آخر میں حد سے بڑھے ہوئے تعلّی آمیز اشعار نے اس قصیدے کی مجموعی تاثیر کو مجروح کیا ہے۔

منقبتِ حضرت علیؓ کے ضمن میں فیضیؔ جیسے جامع الکمالات کا قصیدہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس قصیدے میں کمال درجے کی سرمستی اور زورِ بیان ہے۔ یہ زیادہ تر تو نعتِ حضورِ اکرم ﷺ پر مشتمل ہے، مگر آخر کے چند اشعار میں حضرت علیؓ سے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ فیضیؔ اس امر پر خدا کا شکر گزار ہے کہ اسے پیرویِ اصحاب رسول کی توفیق حاصل ہے۔ ان اشعار میں صنائع کا فن کارانہ استعمال بھی پیش نظر رہے:

صد شکر کہ ما پیروِ اصحابِ رسولیم　　در شرعِ دگر راہ نما را نہ شناسیم
در قافلۂ دیں کہ شود بدرقۂ ما　　گر پیش روِ صدق و صفا را نہ شناسیم
بر گردنِ ما طوقِ وبالِ ابدی باد　　گر سلسلۂ شیرِ خدا را نہ شناسیم
با مشعلِ خورشید اگر گرم بہ گردیم　　بے نورِ علی راہِ علا را نہ شناسیم
از کحلِ یقیں دیدۂ ما گر بہ کشایند　　بے خاک کفش کشف غطا را نہ شناسیم

کلیاتِ فیضیؔ، بحوالۂ ارمغان عقیدت [مرتبہ مقبول بیگ بدخشانی وعبدالغنی] ص:۶۸،۶۹)

بیدلؔ نے حضرت علیؓ کی شان میں متعدد منقبتیں لکھیں، جن میں اُن کا شینیہ اور ایک ترکیب بند (اُس کی ردیف بھی شین ہے) معروف ہیں۔ اُن کے شینیہ کی طرح اُس ترکیب بند کا زورِ کلام بھی دیدنی ہے۔ اس ترکیب بند میں بیدلؔ نے حضرت علیؓ کو شہِ ولایت دیں اور آفتابِ اوجِ یقیں کے القاب سے یاد کیا ہے۔ اور عقلِ کل کو اُن کی بارگاہ کا نقیب قرار دیا ہے۔ میرا احساس ہے کہ عرفیؔ کی طرح بیدلؔ نے بھی اظہارِ عقیدت میں خاصے مبالغے سے کام لیا ہے اور حدود کا کما حقہ خیال نہیں رکھا۔ ذیل کے شعر میرے موقف کی تصدیق کریں گے:

اگر نہ جامِ ہدایت بدستِ او می بود　　جہاں زِ مستیِ غفلت نہ داشت بہرۂ ہوش
وگرنہ آتشِ ظلم آبِ تیغ او می کشت　　ز دیگِ دہر بر افتادی ایں سیہ سرپوش

شیخ علی حزیںؔ کی کلیات میں کئی نعتوں کے بعد آئمہ کے متعدد مناقب بھی ملتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی شان میں مناقب کی تعداد پندرہ تک پہنچتی ہے۔ یہ مناقب حزیںؔ کے زورِ کلام اور غیر معمولی عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایک قصیدہ رائیہ میں تو خود کو نصیری صفت (کلیات حزیں ص ۱۹۳) تک لکھ ڈالا ہے اور پھر اپنے داغِ غلامی پر ناز کرتے ہوئے کہا ہے:

از غروری کہ سرم داغِ غلامی دارد
پای از ناز نہم بر سرِ خورشید منیر　　(کلیات حزیںؔ، ص ۱۹۳)

حضرت علیؓ کی مدح میں جو قصیدہ ردیف ی میں لکھا ہے، اُس کے چند شعر مع مطلع ملاحظہ ہوں، جن میں اُن کے تقویٰ، ان کی فصاحتِ کلامی اور حکمت آموزی کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

نظر کن در سوادِ صفحہ ام تا گلستاں بینی ۔۔۔ گزر کن دفترم را تا بہارِ بے خزاں بینی
سرِ مردانِ عالم شہ سوارِ لافتیٰ یعنی ۔۔۔ علیِ مرتضیٰ کز وی دل و جاں کامراں بینی
ز زہر آلودہ تیغِ معصیت ایمن بود جانت ۔۔۔ چہ بر بازویِ ایماں حُبِ او حرزِ اماں بینی
کنی گر گوشِ دل محوِ کلامِ معجز آیاتش ۔۔۔ ہزاراں گنجِ معنی زیرِ ہر حرفی نہاں بینی
بہ عشق از التہابِ آتشِ دل عاجزم عاجز ۔۔۔ اگر کمتر لبم را در ثنا رطب اللساں بینی
ورق در دستِ من بال و پرِ پروانہ می گردد ۔۔۔ قلم را در بنانم شمع ساں آتش بہ جاں بینی
بہ محشر چشم آں دارم کہ خیلِ جاں شماراں را ۔۔۔ کنی گر گوشۂ چشمی مرا ہم درمیاں بینی

(کلیاتِ حزیںؔ،ص:۱۹۵)

غالب کہ اسد اللہ بھی تھے اور اسد اللہی بھی، اُن سے بعید تھا کہ وہ اپنی شاعری کو مناقبِ اہلِ بیت سے محروم رکھتے۔ چنانچہ ان کی اردو اور فارسی شاعری میں کئی جگہ حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کے اذکار و مناقب ملتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کے مناقب میں اُن کے قصاید دالیہ اور نونیہ معروف ہیں۔ دالیہ پر تو آگے چل کر گفتگو ہوگی، سرِ دست اُن کے نونیہ کے ضمن میں چند باتیں کہنا ضروری ہیں۔ اول یہ کہ نونیہ کی تشبیب حالیہ ہے۔ شاعر نے بڑے موثر پیرایے میں اپنی ذات کے حوالے سے "گریستن" کے مختلف قرینے اُبھارے ہیں اور پھر بڑی خوبی سے گریز کیا ہے۔ گریز و مدح کے چند درد آمیز اور اشک آگیں شعر ملاحظہ ہوں۔ غالبؔ کا موقف ہے کہ شہادت حسینؓ کا غم آفاقی ہے:

رشک آیدم بہ ابر کہ در حد وسعِ اوست ۔۔۔ بر خاکِ کربلایِ معلا گریستن
اے آں کہ در حرم حجر الاسود از غمت ۔۔۔ دارد بہ خوں نہاں چو سویدا گریستن
رضواں بہ آبیاریِ گلشن نہ می رود ۔۔۔ وامانده در گریستن و وا گریستن
چوں رزقِ غیب دردِ تُرا عام کردہ اند ۔۔۔ سرمی زند زِ مومن و ترسا گریستن
گویند قدسیاں کہ ورق را نگاہ دار ۔۔۔ از تو گہر فشاندن و از ما گریستن

(قصاید و مثنویاتِ فارسی [مرتبہ مہرؔ] ص:۹۱-۹۳)

اس سب کے باوجود غالب کو اعتراف ہے:

من خود خجل کہ حقِ ستایش ادا نہ شد

جہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اقبال کی محبت کا تعلق ہے، تو یہ رشتہ

اتنا مضبوط و محکم اور عقیدت اساس ہے کہ اس پر کوئی دورائے نہیں۔ اقبال نے درست کہا تھا کہ:

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

اقبال نے اسرارِ خودی میں "در شرح اسرارِ اسمائے علیؓ" اور رموزِ بےخودی میں "در معنیِ حریتِ اسلامیہ اور سرِ حادثۂ کربلا" اور سیدۃ النساءؓ پر شعر لکھ کر اہلِ بیت سے شیفتگی اور غیر معمولی عقیدت کا یہ اظہار اسرارِ خودی سے زبورِ عجم تک ایک مسلسل لڑی کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ عشق کی اس ناقابلِ فراموش دستاویز سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ریگِ عراقِ منتظر کشتِ حجازِ تشنہ کام
خونِ حسینِ باز دِہ کوفہ و شامِ خویش را (زبورِ عجم، ص:۱۱)

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم
چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ھا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد (رموزِ بےخودی، ص:۱۱۰)

قلندر میل تقریری نہ دارد
بجز ایں نکتہ تفسیری نہ دارد
ازاں کشتِ خرابی حاصلی نیست
کہ آب از خونِ شبیری نہ دارد (ارمغانِ حجاز، ص:۱۴۶)

محبت و مودت اور عقیدت و شیفتگی کا یہ سلسلہ اُردو کلامِ اقبال میں بھی جا بہ جا پھیلا ملتا ہے اور گویا ہمارے حافظے کا حصہ اور ہمارے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ اقبال نے اہلِ بیت کے علاوہ دیگر اکابر ملت، مثلاً حضرت بلالؓ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ ہجویریؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ پر بھی ناقابلِ فراموش شعر کہے ہیں۔

منقبت نگاری کے ضمن میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ حفظِ مراتب سے کہیں بھی صرفِ نظر نہ کیا

جائے۔حافظ افضل فقیر نے "فیضِ نسبت" کے مقدمے میں اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح نعت گو پر لازم ہے کہ پیرایۂ اظہار حدودِ نعت سے نکل کر دائرۂ حمدِ باری تعالیٰ میں داخل نہ ہو جائے، اس طرح منقبت نگار پر بھی یہ احتیاط لازم ہے کہ اہلِ ولایت کی شان میں جو مضامین و خیالات منظوم ہوں، نعت میں ان کا ادغام نہ ہو سکے۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بعض فارسی اور اُردو شعرا کے یہاں حفظِ مراتب کا احساس بہت کمزور یا قلیل نظر آتا ہے۔بلکہ صورتِ حال یہ ہے کہ

ع بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگاتے ہیں کیا کیا!

فارسی سے صرف دو مثالیں کفایت کریں گی۔ایک تو انیسویں صدی کے صوفی شاعر مستان شاہ کابلی کی اور ایک مولانا گرامی کی۔دل چسپ بات یہ ہے کہ گرامی کو مستان شاہ کابلی سے بے حد عقیدت تھی۔اُنھوں نے مستان شاہ کو اپنا مرشد قرار دیا ہے۔پہلے مستان شاہ کے دو شعر بہ سلسلۂ منقبتِ علی المرتضیٰؓ دیکھیے:

اے بادشاہِ انس وجاں مستاں سلامت می کند
وے مایۂ ایمانِ جاں مستاں سلامت می کند
اے شاہِ برجِ لافتیٰ ، وے ماہ برج اِنَّمَا
شمس الہدیٰ، بدر الدجیٰ ، مستاں سلامت می کند (ارمغانِ عقیدت،ص:۱۶۲)

اب گرامیؔ کے یہ شعر دیکھیے۔عبدیت کے ڈانڈے الوہیت سے ملتے نظر آتے ہیں:

علی اللّٰہم رمزِ علی از من چہ می پرسی علی در ہر مکان استی علی در لامکان استی
علی اول علی آخر علی ظاہر علی باطن نہاں اندر عیاں استی، عیاں اندر نہاں استی
گرم کافر نخوانی واجبِ ممکن نما خوانم کہ ذاتش پردہ دارِ کارگاہِ کن فکاں استی

واضح ہو کہ مندرجہ بالا اشعار کلیات گرامی (ناشر پیکیجز لمیٹڈ لاہور) میں شامل نہیں۔میں نے شعر العجم فی الہند (اکرام الحق) سے نقل کیے ہیں۔گرامیؔ کے مندرجہ بالا اشعار سوداؔ کے ان شعروں کی یاد دلاتے ہیں جو اُس نے میر تقی میر کے ایسے ہی اشعار پر شدید گرفت کرتے ہوئے کہے تھے۔میر نے شہادتِ امام حسینؓ پر اپنے ایک سلام میں جب امام حسینؓ کو "ہو الاول ہو الآخر کے مالک" اور "ہو الظاہر ہو الباطن کے والی" کہہ کے مخاطب کیا تو سودا نے اس پر ایراد کرتے ہوئے لکھا تھا:

کیا ھو الاول و ھو الآخر کیا ھو الباطن و ھو الظاہر
حق کی جانب پھرے ہے اُن کی ضمیر اس سوا جس پہ کہیے ہے تکفیر
کیا یہ خاطر میں آپ کی آیا اُس کا مالک حسینؓ ٹھہرایا

(مشمولہ:مختصر تاریخ مرثیہ گوئی،حامد حسن قادری)

مستان شاہ کابلی کے اشعار میں بادشاہِ انس وجاں اور شمس الہدیٰ، بدر الدجیٰ کی تراکیب محلّ نظر ہیں۔ کہ شمس الضحیٰ اور بدر الدجیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات خوش لقا اور سیرت اطہر کے لیے استعارے ہیں جو متعدد نعت گو شعرا نے اپنے فارسی اور اُردو کلام میں برتتے ہیں۔ صرف فیضیؔ اور احمد رضا خاں بریلوی کے ذیل کے شعر بطور دلیل پیش کیے جاتے ہیں:

جاوید بسوزیم زِ خورشید قیامت
گر پرتوِ آں شمسِ ضحیٰ را نہ شناسیم
تاریک شود ہر دو جہاں در نظرِ ما
گر طلعتِ آں بدرِ دُجیٰ را نہ شناسیم　　(فیضی)

کعبے کے بدر الدجیٰ، تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پر کروڑوں درود　　(احمد رضا خان بریلوی)

فارسی میں صحابہ کرام، آئمہ اطہار اور اولیاے کبار کے دیگر منقبت نگاروں میں سعدی، عراقی، خسرو، جامی، قاآنی، غنیمت کنجاہی، حافظ افضل فقیر اور صاحب زادہ نصیر الدین کے نام بھی قابلِ توجہ ہیں۔ مگر طوالت کے خوف سے ان کے کلام سے سوائے ایک دو کے، زیادہ مثالیں پیش کرنا ممکن نہیں۔ سعدی کے اشعار جن کا آغاز "اے یارِ غار سید وصدیق نامور" سے ہوتا ہے، کے ضمن میں اجمالاً پہلے ذکر آ چکا، عراقیؔ کے منقبتی قصاید میں بہاء الدین زکریاؒ پر اس کے اشعار لائقِ داد ہیں۔ ان اشعار میں کمال درجے کی سرمستی اور سرجوشیدگی پائی جاتی ہے۔ خسرو نے نظام الدین اولیاؒ کی مدح میں غیر معمولی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انھیں شیخ امم، قطبِ حقیقت نظام اور ولایت میں سلطاں پناہ قرار دیا ہے۔ پھر اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ان کی تقلید کی داد دی ہے اور اپنی عقیدت کا غیر معمولی اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

خواجہ نظام است و نظامی منم

(تفصیل کے لیے دیکھیے؛ خمسۂ امیر خسرو دہلوی، مرتبہ: امیر احمد اشرفی، ص: ۲۳-۲۵)

جامیؔ نے بہاء الدین نقشبندؒ کی مدح میں عقیدت اور محبت کے پھول کھلائے ہیں۔ قاآنی کا امام ہشتم کی مدح میں لکھا گیا قصیدہ اپنی تازگی، روانی اور زبان و بیان پر اُس کے حاکمانہ عبور کی گواہی دیتا ہے۔ (بگردوں تیرہ ابری بامداداں پر شداز دریا......الخ) غنیمتؔ کنجاہی نے اپنی مثنوی "نیرنگِ عشق" میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی عظمتوں کو آئینہ کیا ہے۔ انھیں گرامی گوہرِ اولادِ حیدر کہا ہے۔ دینِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا

ستون، اجابت کو اُن کی دعا کی پرورش یافتہ اور اپنی امان و پناہ قرار دیا ہے۔ اور اپنی اس شدید آرزو کا اظہار کیا ہے جب اُسے بغداد جانے اور ان کے مرقد مبارک کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا۔ حافظ افضل فقیر کو زبان و بیان پر جو غیر معمولی دسترس تھی، وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ اپنے پہلے نعتیہ مجموعے ''جانِ جہاں'' میں اُنھوں نے سیدنا صدیق اکبر صدیقؓ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی جو فارسی میں منقبتیں لکھی ہیں، وہ اُن کے زورِ کلام، والہانہ پن اور برشتگی کی زندہ برہان ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ ہی کی مدح میں ایک سے زیادہ منقبتیں لکھی ہیں اور اُن کی سیرت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے۔ پھر اُمت کی بدحالی کا ذکر کر کے استمداد کیا ہے۔ ان اشعار کے ایک ایک لفظ سے فقیر کی دردمندی عیاں ہے۔ حضرت علیؓ کی شان میں ان کی ذیل کی رباعی اپنا جواب آپ ہے:

دانندۂ حکمت و کتاب است علی پیغمبرِ شہرِ علم و باب است علی
اے خاک بہ انتسابِ فرزندی ناز در موجوداتِ بوتراب است علی

حضرت علیؓ کے مناقب کے ضمن میں صاحب زادہ نصیر الدین کی مدح (سر حلقۂ آئمۂ خیر الامم، سلام......الخ) بھی دامنِ دل کھینچتی ہے۔ اُن کے تخلیق کردہ مناقب پر حافظ افضل فقیر کا دیباچہ بہ عنوان فیضِ نسبت (صاحب زادہ نصیر الدین کے مجموعے کا نام بھی یہی ہے۔) معانی کی کئی نئی جہتیں واضح کرتا ہے۔

جہاں تک اُردو میں منقبت نگاری کا تعلق ہے تو اُس کا احاطہ قطعاً ممکن نہیں۔ اس موضوع پر سید احسن زیدی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ایک حد تک کفایت کرتا ہے۔ اُردو مناقب نگاروں نے عقیدت و ارادت کے لاتعداد خوش منظر اور دل آویز چمن کھلائے ہیں جن کی خوشبو دیر تک مشامِ جاں کو مہکاتی اور تازگی بخشتی رہتی ہے۔ اُن لاتعداد مناقب نگاروں کے کاموں کا تو کیا، ناموں کا بھی کاملاً احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ نظامی دکنی، ولی، سودا، میر، قائم، میر حسن، مصحفی، جوشش، غالب، مومن، بہادر شاہ ظفر، داغ، منیر شکوہ آبادی، اقبال، انیس، جوش، حسرت، جمیل مظہری، صبا اکبر آبادی، اقبال سہیل، عبد العزیز خالد، سرو سہارن پوری، حافظ افضل فقیر، ریاض مجید، انجم نیازی، حافظ لدھیانوی اور حفظ تائب کتنے ہی نام ہیں جو اردو مناقب نگاروں کی صف میں ایک مستقل حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مناقب نگاروں نے عربی اور فارسی منقبت نگاری سے (خصوصاً فارسی سے) بھی خوب فیض حاصل کیا ہے مگر اکثر نے اس بیان میں اپنی انفرادیت کی جوت جگائی ہے۔ ان سب شعرا کی مناقب نگاری کے جائزے کے لیے طویل دفتر درکار ہے۔ اس لیے ان میں سے محض چند شعرا ہی کا اجمالی جائزہ ممکن ہے۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق اُردو میں منقبت نگاری کا تقدم نظامی دکنی کو حاصل ہے جس کی مثنوی

کدم راؤ پدم راؤ اردو زبان کی پہلی مکمل تصنیف کہی جاسکتی ہے۔اس مثنوی میں فارسی کی مثنوی نگاری کی روایت کے مطابق آغاز حمد یہ اشعار سے ہوا ہے۔ پھر نعت اور ازاں بعد خلفاے راشدین کا ذکر آتا ہے۔ نظامی کی شاعری پر کھڑی، پنجابی، راجستھانی، گجری، مرہٹی اور متعدد دوسری بولیوں کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس مثنوی کا عمدہ لسانی مطالعہ مثنوی کے فاضل مرتب جناب جمیل جالبی صاحب نے فراہم کیا ہے۔مناقب کے چند شعر دیکھیے:

نبی یار تھے یار تے جھار جھار
بچارن نبی کام کرتے بچار
رتن چار تھے لے گئے چار جن
رتن بیچتیں جم رہے جیو کہن
ابابکر ساچا، عمر کا نیاؤ
کہ عثماں بھنڈاری، علی کھڑگ راؤ (مثنوی کدم راؤ پدم راؤ،ص:۱۷)

مطلب یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار یار تھے جن میں ابوبکرؓ ساچا (صدیق) کی صداقت، حضرت عمرؓ کا نیاز (انصاف)، حضرت عثمانؓ کا بھنڈاری (غنی) ہونا اور حضرت علیؓ کا کھڑگ راؤ (تلوار کا دھنی) ہونا معلوم ومعروف ہے۔

اردو کے اس تمام ذخیرۂ مناقب سے سودا کے قصاید (مثلاً باب الجنت)، غالب کی منقبتِ حیدری (سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار) اور فی المنقبت (دہر جز جلوۂ یکتاِ معشوق نہیں)، مومن کے منقبتی قصائد، منیر شکوہ آبادی کے مناقب، انیس کے منقبتی سراپے اور بیسویں صدی کے شعر میں اقبال، جوش، اقبال سہیل اور عبدالعزیز خالد کے مناقب تاریخِ ادب اردو کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔خصوصاً سودا، مومن، جوش، اقبال سہیل اور عبدالعزیز خالد کا زورِکلام اردو ادب میں ایک مستقل حوالے کی چیز ہے۔ بدقسمتی سے منقبت نگار شعرا میں جس شاعر کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا وہ اقبال سہیل ہیں، جن کی ارمغانِ حرم میرے نزدیک ان کے عشقِ رسول اور عقیدتِ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک لافانی دستاویز ہے۔ زبان اور بیان پر اقبال سہیل کو جو غیر معمولی دسترس تھی، اُس کا ابھی تک کھل کر اعتراف نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں اُن کے کلام میں جو ایک مفکرانہ شان اور فلسفیانہ رنگ پایا جاتا ہے، وہ بھی ابھی تک محرومِ التفات ہے۔ مناقبِ اصحابِ اربعہ کے ضمن میں اُنھوں نے ان خلفا کی سیرت کے نہایت دل پذیر نقشے بڑے والہانہ پن سے کھینچے ہیں۔ ایسے اشعار کی تعداد اتنی ہے کہ اس مختصر تحریر میں اُن کا اندراج ممکن نہیں۔ صرف چند شعر دیکھیے:

سیّدنا صدیق اکبر پہلے مصدق، پہلے مبشر
امتِ مرحومہ میں ارحم، صلی اللہ علیہ وسلم
مٹ گئے جو متنبی اُٹھے، بجھ گئے جو بولہبی اُٹھے
سب کی بساطیں کر دیں برہم صلی اللہ علیہ وسلم (ارمغان حرم، ص:۱۵۹)

وہ منبعِ حرارتِ ایماں وہ نورِ حق
فاروق، یعنی مہرِ درخشانِ کائنات
جس کا جلال فتحِ مہمات کی کلید
جس کی نگاہ جنبشِ مژگانِ کائنات
وہ جس کا عدل مشعلِ اربابِ سلطنت
وہ جس کا عہد وجہِ چراغانِ کائنات (ایضاً، ص:۱۹۱)

فقر میں بھی ہمتِ شاہانہ تھی جس کی کنیز
وہ شرف بخشِ سریرِ بوریا پیدا ہوا
آبشارِ نورِ باطن، افتخارِ آب و گل
نازِ پروردِ جنابِ مصطفیٰ پیدا ہوا
تم کو سیرابی مبارک تشنہ کامانِ ازل
ابرِ رحمت، بحرِ مواجِ عطا پیدا ہوا
قہرمانِ کشورِ دیں، فاتحِ باطل شکن
حیدرِ کرار، شاہِ لا فتیٰ پیدا ہوا
موردِ من کنتُ مولا، آفتابِ موجِ حق
خسروِ مسند نشینِ اِنّما پیدا ہوا
خازنِ علمِ لدنی، حاملِ اسرارِ وحی
کنزِ عرفاں، مشعلِ راہِ ہدیٰ پیدا ہوا (ایضاً، ص:۲۰۱۔۲۰۲)

یہ جتنے اصحابِ مصطفیٰ تھے سب اہلِ ایماں کے مقتدا تھے
یہی وہ سرچشمۂ ہدیٰ تھے کہ جن سے سب فیض پا رہے ہیں
(ایضاً، ص:۲۲۹)

انھی فیض پانے والوں میں ایک خوش قسمت اور سربرآوردہ ادبی شخصیت جناب حفیظ تائب کی ہے، جو جدید اُردو نعت گوئی میں ممتاز ترین حیثیت کے حامل ہیں اور جن کے مناقب کا پیشِ نظر مجموعہ (مناقب، القمر انٹر پرائزز، ۱۹۹۹ء) آج کی اس گفتگو کا محرک ہے۔

حفیظ تائبؔ کی منقبت نگاری

حفیظ تائب اُردو اور پنجابی کے نمایاں ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں غزل اور نعت گوئی کا سلسلہ کچھ عرصہ دوش بدوش چلا۔ پھر وہ نعت ہی کے لیے وقف ہو گئے۔ اُردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب سے اُن کی فیض اندوزی قابلِ داد ہے۔ وہ اُردو اور پنجابی کے نعتیہ ادب کی پہچان ہیں۔ نعت کے دوش بہ دوش وہ مدحِ صحابہ وسیر و مناقبِ اہل بیت اور عرفا و صوفیا کے فضائل کی جانب بھی متوجہ رہے ہیں اور اس کا نتیجہ مناقب و فضائل کا زیرِ نظر مجموعہ ہے، جس میں چالیس سے اوپر منظومات شامل ہیں۔ ان منظومات میں اُمہات المومنین، بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فرزندانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، سیدنا امیر حمزہؓ، حضرت امام حسن علیؓ، حضرت امام حسینؓ، امام اعظم ابوحنیفہؒ، شیخ علی ہجویریؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، بابا شیخ فرید گنج شکرؒ، حضرت امیر خسروؒ، خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ، حضرت خواجہ باقی باللہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور سلطان باھوؒ جیسے اصحاب و اکابرِ امت شامل ہیں۔

اس مجموعے کی جو نمایاں ترین خصوصیت سب سے پہلے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ تائب صاحب کا احساسِ توازن اور شعورِ احتیاط ہے۔ نعت و منقبت نگاری میں افراط و تفریط کا اندیشہ رہتا ہے۔ نعت کی طرح منقبت نگاری کے تقاضے بھی کٹھن اور کڑے ہیں۔ تائب صاحب نے اس ضمن میں تاریخ و سیرت کے مستند واقعات اور حقائق کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ اُمہات المومنین ہوں یا خلفاے راشدین، شہداے کرام ہوں یا صالحینِ امت، حفیظ تائب نے ہمیشہ تاریخ و سیرتِ صحابہ اور مستند سوانحِ صوفیا کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ چناں چہ زیرِ نظر مجموعے میں حفظِ مراتب کا غیر معمولی اہتمام نظر آتا ہے اور افراط و تفریط کی وہ افسوس ناک صورت کہیں نظر نہیں آتی جس کی کچھ مثالیں پچھلے اوراق میں دی جا چکی ہیں۔

اس مجموعے میں حمد و نعت کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات، پھر بناتِ صادقات، پھر خلفاے راشدین، پھر درجہ بہ درجہ دیگر اصحاب و اکابرِ ملت کا تذکرہ ہے۔ اس درجہ بندی سے بھی حفیظ تائب کی خوئے احتیاط آشکار ہوتی ہے۔ رومیؔ نے فرمایا تھا:

گفت پیغمبر کہ اصحابی نجوم مقتبس شو زود چوں یابی نجوم

"اصحابی نجوم" سے اشارہ اس معروف حدیث کی طرف ہے:

"اصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم"

یعنی میرے صحابہ کرام ستاروں کی مانند ہیں، اُن میں جس کی بھی تم اقتدا کرو، ہدایت پر رہو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ صحبتِ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیض یافتہ یہ اصحابِ کبار آسمانِ ملتِ اسلامی کے ماہ و نجوم ہیں۔ افرادِ ملت اُن کے نور کی رہنمائی میں اپنی سمتِ سفر متعین کرتے اور کر سکتے ہیں۔ ازواجِ مطہرات کی سلامت روی اور ملکوتیت، غم خواری اور فیاضی، بناتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی پاکیزگی وعفت شعاری، خلفاے راشدین کا اخلاص و انصاف، فیاضی و دریا دلی، شجاعت وحکمت گویا ایک لفظ میں کہنا چاہیں تو تمسک بالقرآن اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے لگاؤ تاریخِ اسلام کے روشن ابواب کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر قرآن حکیم میں "ثانی اثنین" اور "صاحب" کے اسما و القابِ سامی کے طور پر آیا ہے۔ تاریخِ اسلام اُن کے بعض عہد ساز کارناموں پر شاہدِ ناطق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا ساڑھے دس برس کا زمانہ خلافتِ اسلام کے لیے بڑا بابرکت ثابت ہوا۔ قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں انھی کے تدبر کے نتیجے میں اسلام کے زیرِ نگیں آئیں۔ انھی کے عہد میں عراق، شام، فلسطین ومصر اور ایران و مدائن فتح ہوئے۔ ان ساری فتوحات میں بقول شاہ معین الدین ندوی، ظلم و جور کا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں خراسان، بلخ، ماوراالنہر، آذر بائیجان اور طرابلس کتنے ہی علاقے تھے جو اسلام کے زیرِ نگیں آئے، بلکہ آپ ہی کے مبارک زمانے میں بحری بیڑا تیار ہوا۔ قرآن حکیم کا مستند متن اکناف و اطرافِ عالم میں عام ہوا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کا بیش تر زمانہ اگرچہ زیادہ پرسکون نہ تھا، مگر بایں ہمہ اس مردِ حق نے حکمت و دانش اور معارف و بصائر کا ایسا ذخیرہ چھوڑا، جس کی تازگی اور آفاقیت کبھی کم اور مدھم نہ ہو سکے گی۔ انھی اور دیگر اصحابِ کرام سے صوفیا وعرفا نے اپنے چراغِ معرفت جلائے اور برکات و اقدارِ عالیہ کا نُور ظہور دنیا کے گوشے گوشے میں ہوا۔ حضرت علیؓ کے نورِ بصر نے حریت وآزادی کے محضر پر اپنے مقدس لہو سے مہرِ صداقت ثبت کی اور کچھ اس شان سے کہ:

موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

جناب حفیظ تائب نے ان اصحابِ عظام کا ذکر اپنی شاعری میں عقیدت و احتیاط کے متوازن پیرائے میں کیا ہے۔ اسلوبِ بیان میں سادگی اور لطافت دست در دست ہم قدم ہیں۔

ادب میں ایک نازک سوال اُٹھتا رہا ہے کہ کیا تاریخ شاعری بن سکتی ہے۔ سوال اہم ہے، کیوں کہ شاعری تاریخ بن جاتی ہے مگر تاریخ بالعموم شاعری نہیں بن پاتی۔ حفیظ تائب کے سامنے ایک کٹھن

مرحلہ تھا کہ شخصی و تاریخی حقیقتوں کو شعر کے پیکر میں کیسے ڈھالا جائے۔ یہاں اُن کی مہارتِ شعری کام آئی ہے اور وہ متعدد مقامات سے اس طرح گزرے ہیں کہ شاعری کے تقاضے مجروح نہیں ہوئے۔ بندش کی چستی، تشبیہ کی سادگی مگر تہ داری، تغزل کی حلاوت اور بیان کی سلاست تا کہ امت کے افراد کی تربیت آسانی سے ممکن ہو، یہ سب عناصر حفیظ تائبؔ کے ان مناقب کو قابلِ قدر بناتے ہیں۔

پیشِ نظر مجموعے کا ایک اور وصف جو دامن کشِ دل ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں شاعر کی وسعتِ نظر کے مظاہر جا بہ جا ملتے ہیں۔ صوفیا و عرفا کی جتنی بڑی تعداد عقیدت و محبت کا ہالہ کیسے زیرِ نظر مجموعے میں نظر آتی ہے، میرے ناقص علم کی حد تک مناقب کے کسی اور مجموعے میں نہیں ملتی۔ تائبؔ ایک سچے مسلمان کی طرح اس عقیدے کے حامل ہیں کہ طریقت کے سارے سلاسل کے رستے مختلف سہی، منزل ایک ہے۔ یعنی خدا شناسی و خدا رسی۔ فانی زِ خویش اور باقی بہ حق ہونے کے لیے طریق کے بظاہر مختلف تجویز کردہ نسخے اصلاً ایک مقصد کے تابع ہیں۔ یعنی بندے کی صحتِ روحانی۔ چنانچہ وہ سلسلہ شاذلیہ ہو یا سہروردیہ، چشتیہ ہو یا نقشبندیہ، اویسیہ ہو یا قادریہ، سب کا مقصودِ نظر، سوائے ذاتِ حق تک رسائی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی افزائی کے اور کچھ نہیں۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از نورِ حق گلزار کن

یا یہ کہ:

ما طائر قدسیم، نوا را نہ شناسیم
مرغِ ملکوتیم، ہوا را نہ شناسیم

بے محل نہ ہوگا اگر ذیل میں ان مناقب میں سے چند شعر قارئین کی نذر کیے جائیں:

لختِ جگرِ سرورِ دیںؐ سیدۂ پاک — وہ جس کی حیا روشنیِ خانۂ حیدرؓ
شہ بانوے فردوسِ بریں سیدۂ پاک — وہ شمعِ حرم، پردہ نشیں سیدۂ پاک

صدیق وہ نگاہ پیمبرؐ کا انتخاب — جس کو نصیب شانِ حضوری ہے تا ابد
ملحوظ اتباعِ رسولِ کریمؐ تھا — منظور کوئی شے تھی تو خوشنودیِ صمد
شیرِ خدا نے اُس کو کہا اشجعِ اُناس — کیا اس سے بڑھ کے اُس کی شجاعت کی ہو سند
ملت پھر اضطرابِ مسلسل میں ہے اسیر — یا رب! بہ حقِ حضرتِ صدیق، المدد!

حضرت علیؓ کی شان میں تائبؔ نے متعدد مناقب رقم کیے ہیں۔ ایک منقبت کا مطلع ہے:

مظہرِ شان و شکوہِ مصطفیؐ مولی علیؓ
ضیغمِ حق، بوتراب و مرتضیٰ مولی علیؓ

نو اشعار پر مشتمل یہ منقبت اپنے مضامین اور ردیف کے باعث قاری کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہتی۔ تائبؔ صاحب نے اس ردیف کا انتخاب اُس معروف حدیث سے کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ شخص جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کا دوست ہے۔ اے اللہ جو علیؓ کو دوست بنائے اُس کا دوست بن اور جو اس کے ساتھ عداوت پیدا کرے اُس کا دشمن بن جا۔"

حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ (مسند احمد، جامع صغیر)

ہر غیر متعصب مسلمان کی طرح تائبؔ کو اہلِ بیتِ کرام سے بڑی عقیدت ہے۔ چناں چہ انھوں نے امام الشہدا امام حسینؓ کی شان میں متعدد نظمیں کہی ہیں، ان نظموں میں تائبؔ کا زورِ کلام دیدنی ہے:

چرچا ہے جہاں میں تری تسلیم و رضا کا ۔۔۔ زیبا ہے لقب تجھ کو امام الشہدا کا
نازِ بشریت ہے ترا سجدۂ آخر ۔۔۔ رخ پھیر دیا جس نے زمانے کی ہوا کا
ہر عہد میں خوشبو ہے تری موجِ نفس کی ۔۔۔ ہر عصر میں جادو ہے ترے رنگِ قبا کا

یہاں تائبؔ کی اس منقبت کا ذکر ضروری ہے جو اُنھوں نے غالب کی زمین میں لکھی ہے۔ خود غالب نے یہ قصیدہ عرفی کی زمین میں لکھا تھا۔ عرفی کے قصیدے کا مطلع ہے:

زِ ہر گلے کہ ہوائی دلم نقاب کشاد
فلک بہ گلشنِ حسرت نوشت و رفت بباد

غالبؔ نے شان امام حسینؓ کے بیان میں مندرجہ بالا زمین میں ۱۱۲ اشعار کی منقبت تصنیف کی، جس کا مطلع یہ ہے:

مگر مرا دلِ کافر بود شبِ میلاد
کہ ظلمتش دہد از گورِ اہلِ عصیاں یاد

اس قصیدے کی زمین میں جو منقبت تائبؔ نے کہی، وہ صرف نو اشعار پر مشتمل ہے، مگر اس مختصر منقبت میں تازہ کاری کا جو لحن مرتب ہوا ہے وہ بڑا مسرت خیز اور لائقِ داد ہے۔ لیکن پہلے غالب کی مذکورہ منقبت کا اجمالی ذکر ضروری ہے۔ غالب کے قصیدے کی تشبیب حالیہ ہے اور اُس میں اُنھوں نے اپنی سیاہ طالعی کو نو بہ نو پیرایوں میں آئینہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں شداد کا سا نصیب لے کر عدم سے اس عالمِ عدم آثار میں آیا۔ حالات نے میرا دل لہو کر دیا اور میری آنکھیں خوں بار ہیں۔ قضا نے میری

قسمت کا زائچہ بنانے کے لیے دلِ دردمند کے دھوئیں سے سیاہی مستعار لی۔ چند شعر دیکھیے:

چگونہ چوں دگراں زیستن تواں بہ مراد   تو و خدا کہ دریں کشمکش کہ من باشم
خرد زِ فتنہ چراغیست بر دریچہ باد   رواں ز غصہ سفالی است در گزر گہِ سنگ
ز سوزِ داغِ دروں سینہ کورۂ حداد   ز جوشِ خونِ جگر دیدہ کوزۂ صباغ
گہی بہ ماتمِ دانش گہی بہ حسرتِ داد   کبود پوشم و قرطاس پیرہن سازم
حسین ابن علی آبروی دانش و داد   بیا کہ دادہ نویدِ نکوُ فرجام

پھر امام حسینؓ کی تعریف میں کہتے ہیں کہ وہ ایسے امام تھے جنھوں نے خدا طلبی میں عبادت گزاروں کی آبرو بڑھا دی۔ اُس شہیدِ سعید کی حبلِ ورید نے جلاد کے خنجر سے تشنہ لبی کا خراج لیا۔ حسین سید الشہداء اور سید السجاد تھے:

زِ نقش پای تو محراب سازیِ اقطاب
ز گردِ راہِ تو سجادہ بافیِ اوتاد

(قصائد و مثنویاتِ فارسی، مرتبہ مہرؔ، ص: ۷۳)

حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کا زورِ کلام ایک چڑھتا دریا ہے لیکن چڑھتے دریا دل تسخیر نہیں کر سکتے۔ اس منقبت میں گداز کا عنصر کم ہے۔ قصیدے کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے:

ولایت ار ہمہ درد است من بداں دل شاد   غمت اگر ہمہ مرگ است من بداں زندہ
خرابہ را بہ ھوای ھمی کنم آباد   امید را بہ دعای ھمی دہم تسکین
کجاست غالبِ آوارہ بر زبانت باد!   کہ چوں بہ حشر غلامانِ خویش بشماری

(ایضاً، ص: ۸۴)

غالبؔ کے متعدد دیگر قصیدوں کی طرح اس قصیدے کو پڑھ کر حالی کے قول کی صداقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شان دار اور عالی رتبہ ہوتی ہے۔

حفیظ تائبؔ کی غالبؔ کی اسی زمین میں لکھی گئی منقبت کا اُن کے قصیدے سے تقابل ویسے تو بے محل ہے اس لیے کہ تائبؔ نے اس زمین میں صرف نو شعر کہے ہیں اور قصیدے کی ہیئت کی درجہ بہ درجہ پیروی نہیں کی۔ مگر تائبؔ کی یہ منقبت اس اعتبار سے ضرور قابلِ تعریف ہے کہ اس میں اُنھوں نے تازہ تراکیب کا جو بوقلموں چمن مزین کیا ہے، اُس کی مثال غالب کے مذکورہ قصیدے میں بہت کم ملتی ہے۔ حسین رضی اللہ عنہ کے لیے رحمت زاد، صبا مژدہ، امیر معاد، گلاب نہاد اور سپہرِ وقار جیسی تراکیب سے شاعر کی جدت طرازِ طبیعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جس طرح نعت میں تائبؔ کا قصیدہ آیۂ نورِ لا فانی

ہے۔اسی طرح منقبت کے ذخیرے میں اُن کی یہ تخلیق بھی نہایت بلند پایہ رکھتی ہے:

حسین ابن علی ماہِ مطلع ارشاد حق آشنا و شہادت مآب و رحمت زاد
حسین مشہدِ تسلیم کا جلال و جمال چمن طراز و صبا مژدہ و بہار ایجاد
حسین حریت آموز و زندگی افروز امامِ عصر، سفیرِ بقا، امیرِ معاد
حسین ابنِ علی سرو خو، سپہر وقار حسین ابنِ علی ماہ رو، گلاب نہاد
وہ جس کی یاد ہے روحِ جہاد و جانِ ثبات وہ جس کے ذکر سے وابستہ ذہن و دل کی کشاد

شعر کیسا بھی عمدہ کہا جائے اچھے شاعر کو بہر حال احساس رہتا ہے کہ مدح و منقبت کا حق ادا نہیں ہو پایا۔حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام اور اعاظمِ اُمت کے حضور خراجِ محبت و عقیدت کا مرتبہ جیسا بھی بلند ہو، اُن کی عظمتوں اور رفعتوں کا احاطہ ممکن نہیں۔کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر کس قدر مبنی بر حقیقت ہے:

ہمی شرم دارم کہ پائے ملخ را
سوئے بارگاہ سلیماں فرستم

تاہم امید ہے کہ جناب حفیظ تائبؔ کی یہ ایمان افروز شعری کاوش یقیناً اہلِ دانش کی نگاہ میں سعیِ مشکور کا درجہ حاصل کرے گی۔اُن کے یہ مناقب ہرے بھرے درختوں کی خنک چھاؤں ہیں اور اس عہدِ جراحت میں سامانِ راحت۔

□□□

جہانگیری بخاکِ ما سرشتند
امامت در جبینِ ما نوشتند
درونِ خویش بنگر آن جہان را
کہ تخمش در دلِ فاروق کشتند

ہماری مٹی کی فطرت میں بادشاہی
اور ہماری پیشانی پر امامت لکھی ہوئی ہے
تُو اپنے اندر اس جہاں کو دیکھ
جو حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں بویا گیا تھا.....!

(علامہ محمد اقبال)

میر قمر الدین منت دہلوی اور مناقب مشائخ

اقراء سلیم

ABSTRACT: Mir Qamaruddin, Surnamed Minat, was a native of Sonipat (near Panipat) and educated in Delhi. He studied all the textbooks under Hazrat Shah Abdul Aziz. He was a student of Mir Shams-u-din in Persian and Sheikh Qiyam-u-din in Urdu. Minat wrote excellent poetry in both Urdu and Persian, but his inclination was more towards Persian Poetry. He buried in Calcutta. His notable works include a Persian Diwan , a few MASNAVIS and SAKRISTAN which was written in response to Gulistan . Minat DEHLVI was brought up in an era of knowledge , mysticism, literature and poetry. His Love for Ahl al-Bayt is a prominent aspect of his personality reflected in his Persian Diwan. In 2010, his Farsi Diwan, edited by Dr. Shoaib Ahmad, was published by Oriental College, Punjab University , Lahore.

Keywords:
Mir Qamaruddin, Minat Dehlvi, Manaqib, Ahl-al-Bayt, Persian Literature in Sub-Continent.

میر قمر الدین منت دہلوی (1157ھ/ 1744ء) کا شمار بارہویں سے اٹھارھویں صدی تک کے مشہور فارسی بولنے والے مصنفین اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ منت نہ صرف فارسی کے بلکہ اردو کے بھی شاعر ہیں اور اردو کے بہت سے شعراء کی نظم ونثر میں تربیت کرنے والے استاد رہے ہیں۔ ان کے دور میں اردو شاعری کا بازار بہت گرم تھا۔ جو کوئی بھی بات کہنے کی طرف میلان رکھتا، اردو شعر کہنے پر آمادہ ہوتا تھا۔ میر قمر الدین منت دہلوی برصغیر کے اس دور میں فارسی شاعری کا پرچم بلند کرنے والوں میں سے ہیں۔ (1) ان کا پورا نام قمر الدین ولد ثناءاللہ ولد مولوی حامد حسینی ناصری مشہدی سونی پتی ہے۔ (2) ان کا خاندان مشہد کے سادات میں سے تھا جس پر وہ بہت ناز کرتے تھے۔ (3)

میر قمر الدین منت دہلوی (1157ھ/ 1744ء) میں پیدا ہوئے۔ اختلاف کے ساتھ ان کی جائے پیدائش دہلی، سرہند، بسولی تسلیم کی جاتی ہے۔(4) منت دہلوی نے تقریبا ہر اصناف شعر میں شعر کہے۔ منت کی شاعری کے موضوعات دینی، عرفانی، اخلاقی اور عشقیہ ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی، روانی اور شرینی ملتی ہے۔ ان کی زبان مشکل پسندی کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ منت دہلوی نے نعت اور آئمہ کرام، صحابہ کرام اور دیگر مشائخ کی منقبت بہت ذوق، شوق اور دلچسپی سے بیان کی ہے۔(5) ان کے دیوان کا ایک ضخیم حصہ منقبت پر مشتمل ہے۔ ان کی تصانیف میں شکرستان، قصہ ہیر ورانجھا، تہذیب و تادیب کلام، چمنستان، مرآت آصفی، رسالہ درردصوفیہ، قصہ چندرھانس، معجزالکمال شجرہ طیبہ، دیوان شعر اردو شامل ہیں۔

ڈاکٹر شعیب احمد جو اس وقت اورئینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں فارسی زبان و ادبیات کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے میر قمر الدین منت دہلوی کے فارسی دیوان کی تصحیح کی اور منت پر مقدمہ لکھا ہے جو پنجاب یونیورسٹی سے (2010ء) میں شائع ہوا۔ جس میں غزلیات، قطعات، قصائد، مثنویات، ترکیب بند، ترجیع بند، واسواخت، مرثیہ ومنقبت شامل ہے۔ جس کے مخطوطات پنجاب پبلک لائبریری، لاہور، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ہندوستان، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، دکن میں موجود ہیں۔(6) آپ کے دیوان میں جو ممدوح مناقب مشائخ ہیں ان کا مختصر سا تعارف حسب ذیل ہے۔

مناقب امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ

حضرت علیؓ (601ء-661ء) آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے چچا زاد اور داماد تھے۔ ابوطالب اور فاطمہ بنت اسد کا یہ چراغ جس نے آپؐ کو جنگ میں کبھی تنہا نہ چھوڑا، کوفہ میں نجف کی سرزمین پر دفن ہوئے۔(7) فاتح خیبر، بحر بلا کے غریق، محبت کی آگ کے سوختہ، مقتدائے اولیا، پیشوائے اصفیا تھے اور فیاضی اور سخاوت، جود وعطا، شجاعت وتہوار، فقر وصفا کے اوصاف کی وجہ سے تمام صحابہ کرام میں ممتاز تھے۔ شوکت اور قوت کی بنا پر رب تعالی کی طرف سے آپ کو اسد اللہ الغالب کے لقب ملا۔(8)۔ منت دہلوی نے حضرت علیؓ کی منقبت بیان کی ہے جس میں سے کچھ اشعار یہ ہیں۔

امام خلق و امیر دو کون و امن و امان — انیس خلوت انس و امید گاہ جہان
برادر نبی و باب شہر حکمت و علم — بہار گلشن دین ، بحر گوہر عرفان
ثبوت ثانی او را نمی توان کردن — سخن وری کہ ثنایش برون بود ز بیان
جوان عرصہ جرات، جہان جود و کرم — جمال شاہد علم وجلیس مجلس جان
حبیب حضرت حق، حیدر و حلیم وحکیم — حیات بخش دل وحسن بر رخش حیران (9)

ترجمہ: حضرت علیؓ مخلوق کے امام، دونوں جہانوں میں امن وامان کے امیر، بنی نوع کی تنہائی کے مونس اور دنیا کی امید ہیں۔ نبی کے بھائی اور شہرِعلم وحکمت کا دروازہ ہیں۔ دین کے باغ کی بہار، عرفان کے سمندر کے موتی، ان کی دوسری مثل تلاش نہیں کی جاسکتی۔ وہ ایسے بولنے والے ہیں کہ جس کا بیان ممکن نہیں۔ دیار جرات کے جوان، جہان جودوکرم ہیں۔ محبوب اور علم کی خوب صورتی ہیں اور محبوب کی محفل میں بیٹھنے والے ہیں، حضرت حق کے حبیب، بہادر، صاحب حلمت وحکمت ہیں۔ دل کو زندگی دینے والے ان کے چہرے کی تابانی سے حسن حیرت زدہ ہے۔

امام دوم حسن مجتبیٰؓ

سلام ہو امیر المومنین حضرت حسن علی بن ابی طالب (621ء-670ء) پر کہ رسول اکرمؐ کے جگر گوشہ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے صاحبزادے تھے اور تمام مخلوق میں آپؐ کے سب سے زیادہ ہم شکل تھے۔ علم حقائق و اصول میں بلند رتبے پر فائز تھے۔ مدت خلافت (8 ماہ 15 دن) ہے۔ آپؑ 47ھ/ 667ء میں شہید ہوئے۔ (10)

چیست آن ہمتک نسیم سحر ہم ہمای ہوا ہم آہوی بر
عرش سیری بہ رنگ پیک خیال چرخ پیما بسان مرغ نظر
دم رفتن نمودہ چار ہلال ہر ہلالی بود پر از اختر
خانہ بر دوش ہمچو سالک راہ در دمی از دو کون کردہ گذر
از دو سویش دو پلہ میزان تا کہ بر سنجد آن گران پیکر (11)

ترجمہ: نسیم سحر کا ہم منصب کون ہے۔ وہ ہوا کی ہما اور ہرن کی کمر جیسے ہیں، خیالات کے قاصد کی طرح عرش کی سیر کرنے والے، فلک پیمائی کرنے والے نظر کے پرندے کی طرح، انہوں نے جاتے وقت چار ہلال دکھائے اور ہر ہلال ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سالک راہ کی طرح گھر کندھے پر اٹھائے رکھتے تھے، وہ ایک لمحے میں دو جہانوں سے گزر گئے۔ وہ دونوں طرف سے میزان کے دو پلڑے تھے۔ وہ سجا سنورا وہ قیمتی پیکر امام دوم حسن مجتبیٰؓ کا ہے۔

سیّد الشہدا حضرت امام حسینؓ

امام حسین (626ء-680ء) آل محمدؐ کی شمع ہیں۔ عالم ولا کے بادشاہ، حق کے تابع تھے جب تک کہ حق ظاہر تھا۔ جب حق پوشیدہ ہوگیا آپ نے تلوار کھینچی اور جب تک اپنی جان حق تعالی کی راہ میں قربان نہ کردی، چین سے نہیں بیٹھے۔ (10 محرم 61ھ/ 680ء) کو آپؓ نے امیر المومنین کے سات

فرزندوں اور اپنے تین فرزندوں اور اٹھاسی جانثاروں کے ساتھ شہید ہوئے۔شہادت کے وقت آپ کی عمر(58)سال تھی۔(12)

بود صحیفه ی ایمان به حب تو مسطور — فروغ عرصه ی نشر از سواد این منشور
کتاب فضل تو شیرازه ای اگر خواهد — زمانه صرف کند رشته سنین و شهور
فروغ شمسه قصرت ز نه فلک گذرد — به رنگ خط شعاعی ز صفحه های بلور
هزار فرق ز اثمار تا به انوار است — بود به روضه تونسبت بهشت قصور (13)

ترجمہ: آپؓ کی محبت ایمان کے صحیفے پر درج تھی،حشر کے منشور کا صفحہ آپ کی برکت سے ہے۔آپ کے فضل کی کتاب اگر کوئی شیرازہ چاہتی ہے تو زمانہ سنین اور شہروں کو بھولا دے گا۔آپ کے محل کی دھوپ نو آسمانوں سے بھی روشن تر ہو،شعاع کی لکیر کا رنگ شیشے کے صفحات سے ہے۔پھلوں سے تجلیات ہونے تک بہت فرق ہے،آپ کے روضے کی نسبت جنت کے محلوں سے ہے۔

امام چہارم سید الساجدین امام زین العابدینؓ

علی بن حسین بن علی بن ابی طالب(659ء-713)جو امام سجاد اور زین العابدین کے نام سے مشہور ہیں۔امام حسینؓ کے فرزند ہیں۔آپ(35)سال امامت کے عہدے پر فائز رہے۔صحیفہ سجادیہ اور رسالۃ الحقوق امام سجادؓ کی کاوشوں میں سے ہیں۔94ھ میں عالم فانی سے عالم بقاء کی طرف کوچ کر گئے۔جنت البقیع میں مدفن ہے۔(14)

حدیث حلم تو تمکین هجر آموزد — نفاذ امر تو بیرون برد وقار از سنگ
به جرم لاف زنی مهر را به پیش رخت — کنند داغ به سان گناهگار از سنگ
ز صیقل تو صفا نیست شرط استعداد — رسد به آینه حسن افتخار از سنگ
مدیح خوان بهار عطای تو گردد — اگر به فرض ترا شد کسی هزار از سنگ (15)

ترجمہ: آپ کی حلمت کی باتیں ہجر کی تمکین سکھاتی ہیں،آپ کے حکم کا نفاذ پتھر سے وقار کو باہر نکال دیتا ہے۔شیخی مارنے کے جرم میں محبت کو سامنے رکھ دیا،گناہگار تو پتھر پر نشان لگا دیتے ہیں۔آپ کی چمک سے استعداد کی شرط میں پاکیزگی نہیں ہے،حسن پتھر سے ہی تو افتخار پا کر آئینے کو پہنچتا ہے۔اگر کوئی فرض کے طور پر ہزار بار بھی پتھر تراشا ہے تو مداح بیان کرنے والوں کی بہار تو آپ ہی کی عطا کی مرہون منت ہے۔

امام خامس حضرت امام باقرؒ

امام باقر (677ء-733ء) کا نام آپؐ کے نام پر محمد تھا۔آپ کا سلسلہ نسب ماں اور باپ دونوں طرف سے آپؐ سے ملتا ہے۔(16)ہشام بن عبد الملک نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔جنت البقیع میں دفن ہیں۔علوم سے واقفیت آپ جیسی شخصیت ہی کی ہوسکتی ہے۔مختلف علوم و فنون کے لوگوں نے آپ سے فیض پایا۔(17)

ای کوی تو کعبہ مطالب — وی باب تو قبلہ مارب
پیش تو ز صدق دعوی غیر — در نور بود چو صبح کاذب
تا رایت فتح تست مرفوع — مکسور بود سر نواصب
تو جانی و خلق جسم مظلم — تو نوری و خلق طین لاذب
ہرگز بہ خیال من نیاید — در وصف تو معنی مناسب (18)

ترجمہ: اے کہ آپ کا کوچہ کعبے جیسا ہے۔وہ آپ کا دروازہ ہمارے رب کا قبلہ،آپ کے سامنے صداقت سے غیر کا دعوی،صبح کاذب کی طرح روشنی میں تھا۔یہاں تک کے آپ کی فتح کا پرچم بلند ہوا اور عامل کا سر جھکا ہوا تھا۔آپ مظلوم جسم اور روح کی تخلیق ہیں۔آپ نور ہیں اور مخلوق نمناک مٹی ہے،ہرگز میرے خیال میں آپ کی صفات کے لیے کوئی مناسب معنی نہیں آتا۔

امام ششم،امام ناطق امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ

ان کا نام جعفر (702ء-765ء)،کنیت ابوعبداللہ اور لقب صادق تھا۔آپ امام باقر کے بیٹے امام زین العابدین عابدین کے پوتے اور امام حسین کے پڑپوتے تھے۔آپ ظاہر دنیاوی لباس میں رہنے والے تھے لیکن اندر لباس فقر مخفی ہوتا تھا۔(19) آپ جنت البقیع کے اسے احاطے میں دفن ہیں جہاں امام زین العابدین اور امام باقر کی قبور مبارک ہیں۔(20)

صاف گویم ہست آن نام شہ عالی جناب — سرور دین،جعفر صادق،امام انس و جان
قرۃ العین پیمبر،بضعۃ القلب بتول — ہم چو آبا ذات او مقصود امر کن فکان
پایہ اول نسازد طی زقصر رتبہ اش — وہم را گرفی المثل از عرش باشد نردبان
شام ادبار است ہم زاد روان حاسدش — صبح اقبال است با نور ضمیرش تو امان
بی تکلف ہر کہ خود را بشمرد پیشش امام — چون امام سبحہ اش از زنار باشد بر میان (21)

ترجمہ: میں صاف کہتا ہوں وہ نام شاہ عالی جناب کا ہے، جو سرور دین،جعفر صادق اور انس و

جان کے امام ہیں۔پیغمبر کی آنکھوں کی ٹھنڈک، بتول کے دل کا ٹکڑا ہیں۔اپنے آباؤ اجداد کی طرح ان کا مقصد امر کا مفہوم بیان کرنا ہے۔طی قبیلہ آپ کے محل کے رتبے سے ابتدائی بنیاد بھی نہیں پا سکتا اور اگر مثال کے طور پر آسمان سے بھی مدد پہنچے۔بدنصیب شام ہے اور ان کی حاسد روح بھی ساتھ ہے۔قبولیت کی صبح ہے اور اس کے اندر کے نور سے آپ محفوظ ہیں۔جو کوئی بھی بے تکلف خود کو آپ کے سامنے امام مانتا ہے تو امام کی تسبیح ہر وقت اس کا ذکر کرتی ہے۔

امام ہفتم،حضرت امام موسی کاظم رضی اللہ عنہ

موسی بن جعفر (745ء-799ء) امام اہل بیت میں علمی آسمان میں ان سے بہتر کوئی شاہکار نہیں ہے۔اللہ تعالی نے انہیں بے شمار رفعتوں اور بلندیوں سے نوازا۔آپ علوم مصطفوی و مرتضوی کے امین تھے۔صابر،رحم دل،دست گیر،نیک اور زاہد انسان تھے۔باب الحوائج ان کا لقب ہے۔ 35 سال امامت کی۔(22)

امام موسی کاظم کلیم طور کمال		کہ نخل امن از و یافت رنگ در صحرا
زعدل اوست کہ پہلوی خویشتن ساید		بہ شیر پنجہ زن آہوی لنگ در صحرا
حمایتش چو شود دست گیر مظلومان		کلہ زباز رباید کلنگ در صحرا
زہیبتش کہ جہان را زفتنہ ایمن کرد		بہ شیر مار شود پالہنگ در صحرا
زبیم معدلت او قرار می گیرد		پلنگ در تک دریا،نہنگ در صحرا (23)

ترجمہ:امام موسی کاظم،طور کا کمال کلیم ہیں،صحرا میں امن کا درخت ان سے رنگ پاتا ہے۔ان کے انصاف سے اپنا پہلو ٹھیک ہوتا ہے،صحرا میں لولا لنگڑا ہرن بھی شیر سے پنجہ آزمائی کرتا ہے۔جب ان کی حمایت مظلوموں کی دستگیری کرتی ہے تو باز عقل سے صحرا سے کلنگ پرندے کو چرا لیتا ہے۔ان کی ہیبت سے دنیا سکون میں مبتلا ہوگئی ہے،آپ کی بہادری سے صحرا میں رسی بھی سانپ بن جاتی ہے۔آپ کے عدل کی ہیبت سے چیتا سمندر میں اور مگرمچھ صحرا میں سکون پاتا ہے۔

امام ضامن ثامن،امام علی موسی رضا رضی اللہ عنہ

امام الحسن علی بن موسی رضاؓ 770ء-818ء مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔تعلیم و تربیت والد بزرگوار سے حاصل کی۔والد گرامی کے بعد آپ کی امامت 20 سال تھی۔امام رضا نے اسلامی ثقافت کو زندہ کیا۔(24)

امم نواز اماما،فلک جناب شہا		غلامی تو بہ از خواجگی و مولایی

به جز در تو پناهی دگر نمی بینم — که سنگ حادثه بارد ز چرخ مینایی
به درگه تو غریبانه زار می نالم — که تا غریبی من بینی و بخشایی
کریمی و ره و رسم کرم نکو دانی — به درگه تو چه حاجت شدن تقاضایی
بر آستان تو ام اصل مدعا این است — که از دلم اثر لهو محو فرمایی (25)

ترجمہ: امت کو نوازنے والے امام، غلامی آپ سے خواجگی اور مولائی پاتی ہے۔ آپ کے سوا تو مجھے کوئی پناہ ہی نظر نہیں آتی کہ جب حادثاتی طور پر بلند آسمان سے پتھر گرتے ہیں۔ میں آپ کی درگاہ میں اجنبیوں کی طرح گریہ وزاری کرتا ہوں تا کہ آپ میری عاجزی دیکھیں اور مجھے بخش دیں۔ آپ کریم ہے اور کرم کے رسم و رواج اچھے سے جانتے ہیں، آپ کی درگاہ میں تقاضا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ کے آستانے پر ہوں اصل مدعا تو یہی ہے کہ آپ نے میرے دل سے عیش وعشرت کا اثر زائل کر دیا ہے۔

امام ثامن ضامن، امام نہم حضرت امام محمد تقی رضی اللہ عنہ

محمد بن علی بن موسی (812ء-835ء) جو امام محمد تقی اور جوادالائمہ سے مشہور ہیں۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ انہیں ابوجعفر ثانی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ امام تقی لوگوں کی حاجت روائی کرنے والے اور ہر ایک سے جھک کر ملنے والے تھے۔ (26)

سلطان دین جواد تقی، آن که پنج وقت — خواند فرشته خطبه آن میر بر فلک
از بس که صیت شرع شد از حکم او بلند — از کف نهاد زهره مزامیر بر فلک
بهر بریدن رگ گردن ز دشمنش — جلاد چرخ آخته شمشیر بر فلک
آفاق پر ز دبدبه صولتش بود — نبود عجب که گاو شود شیر بر فلک
تا لطف او برد تپ محرق زآفتاب — مه را نمود قرص تباشیر بر فلک (27)

ترجمہ: جواد تقی سلطان دین ہیں کہ جن پر آسمانی فرشتے پانچ مرتبہ خطبہ پڑھتے ہیں۔ شریعت کی شہرت آپ کے حکم سے بلند ہوتی ہے، جنہوں نے ہاتھ سے دعاؤں کا سیارہ آسمان پر رکھ دیا۔ اپنے دشمنوں کی گردن کاٹنے کے لیے، جلاد نے آسمان پر تلوار اٹھائی۔ آسمان ان کی روح کے دبدبے سے بھرا ہوا تھا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ گائے بھی آسمان پر شیر بن جاتی ہے۔ یہاں تک کے آپ کی مہربانی سے سورج نے تپش پائی، آسمان پر سفیدی کی ٹکیہ نے اس چاند کو ظاہر کر دیا۔

امام دہم، حضرت امام علی نقی رضی اللہ عنہ

امام علی نقیؓ (829ء-868ء) ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کی۔ احادیث مبارکہ کا درس دیا

کرتے تھے۔ ہادی و جواد آپ کے لقب ہیں۔ لفظ ہدایت پر بہت تفصیلات فراہم کی ہیں۔ 8 سال کی عمر میں امامت کے درجے پر فائز ہوئے۔ ساری رات قیام کرتے اور دن میں روزہ رکھتے تھے۔ مشکلات، رنج و دکھ میں زندگی گزارنے کے ساتھ اسلام کا بول بالا کیا۔(28)

شاہا ز حفظ تست کہ شمشیر آفتاب — عاجز شد از بریدن برگستوران برف
گردیدہ است مزرع بد خواہ دولتت — نیمی از آن آتش و نیمی از آن برف
بر لوح نقرہ اش بہ زر شعلہ زد رقم — ہر جا کہ داد لطف تو خط امان برف
خورشید چرخ تربیتش چون گہر کند — گردد چو بر زمین کرم تو ضمان برف
نفروخت کس ز درگہ غیرت چراغ کام — آتش کسی طلب کند از آستان برف(29)

ترجمہ: اے بادشاہ، تیری حفاظت سے سورج جیسی تلوار، برف کو توڑنے سے عاجز آجاتی ہے۔ تیری حکومت کا برا چاہنے والوں کی کھیتی آدھی آگ اور آدھی برف بن گئی ہے اور اس کی چاندی کی تختی پر سنہرے شعلے سے لکھا ہوا ہے، ہر جگہ تیری مہربانی نے برف پر امن کی لکیر کھینچی ہوئی ہے۔ آسمان کا سورج آپ کی تربیت موتی کی طرح کرتا ہے تو زمین پر آپ کا کرم برف کا محافظ ہوجاتا ہے۔ خواہشات کا چراغ غیرت کی درگاہ سے کوئی نہیں بیچتا، برف کے آستان سے آگ وہی طلب کرتا ہے۔

امام یازدہم، امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ

حسن ابن علی ابن محمد (845ء-874ء) جو حسن عسکری کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ اسی سلسلہ عصمت کی ایک لڑی تھے جس کا ہر حلقہ انسانی کمالات کے جواہر سے مرصع تھے۔ ایک ہفتے کی بیماری اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے زہر دیئے جانے کی وجہ سے شہید ہوئے۔ انہیں ان کے والد کے ساتھ ان کے خاندانی گھر میں دفن کیا گیا۔(30)

امام عسکری ہستی، ز ہر عیبی بری ہستی — فروغ مہتری ھستی، چراغ مجمع ایقان
یکی بر عسکر دین شہ، دوم نور دل آگہ — سہ دیگر در دو عالم مہ، چہارم اختر تابان
نویسد مدح آبایت، کشد خنجر بر اعدایت — زند ساز تو لایت، برد از جان ترا فرمان
یکی آن منشی گردون، دوم بہرام خنجر کش — سہ دیگر زہرہ چنگی، چہارم ہندوی کیوان
کشاید خلقت از خارا، بیارد لطفت از بالا — برآرد ہیمت از صحرا، رباید جودت از عمان(31)

ترجمہ: تو امام عسکری ہے، ہر عیب سے بری ہے۔ آپ محبت کا فروغ ہیں، یقین کے چراغ کا مجمع ہیں۔ ایک عسکری دین پر بادشاہ، دوسرا دل کے نور سے آگاہ۔ تیسرا دونوں جہانوں میں چاند، چوتھا چمکتا ہوا ستارہ ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کی مداح بیان کرنے والا، آپ کے دشمنوں پر خنجر چلاتا ہے، اس نے

ولایت کا ساز بجایا اور تیرا فرمان ادا کیا۔ان میں سے ایک آسمانی منشی اور دوسرا خنجر نکالنے والا بہرام بن گیا،تیسرا سازوں کا ستارہ،چوتھا ہندی ستارہ (زحل) بنا۔آپ کا لطف و کرم پتھر میں بھی گداز پیدا کردیتا ہے،آپ کی سخاوت عمان شہر سے اور آپ کا خوف صحرا سے بھی باہر نکال لاتا ہے۔

امام دوازدہم،امام مہدی بن الحسن رضی اللہ عنہ

آپ کا لقب مہدی،امام غائب ہے۔آپ ایک تاریخی اور اہم معجزاتی شخصیت ہیں اور قیامت کے قریب میں مسیح کے ساتھ ظہور ہوں گے اور دنیا پر اسلامی حکومت قائم کرکے اسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔(32)

امام مہدی ہادی کہ زندہ گشت بدو — یکی امان و دوم امنت و سوم ایمان
گواہ شان وی آمد بسان آبایش — یکی حدیث و دوم سیرت و سوم قرآن
خدا ز روز ازل داد دشمنان ترا — یکی نکال و دوم شامت و سوم نقصان
سخن بہ مدح عدوی جناب تو باشد — یکی فسانہ دوم ہرزگی سوم ہزیان
زبخشش تو گدا را پر از زر وسیم است — یکی دو دست، دوم آستین ،سوم دامان (33)

ترجمہ: امام مہدی ہدایت دینے والے، پہلے آپ نے امان دوسرا امن اور تیسرا سکون کو زندہ کیا۔آپ اپنے آباؤاجداد کے گواہ بن کے آئے،اول حدیث،دوسرا سیرت اور تیسرا قرآن۔خدا نے روز اول سے آپ کے دشمنوں کو ایک تکلیف دوسرا دکھ اور تیسرا نقصان سے نوازا۔آپ کی بارگاہ کا شمار مدح کے زمرے میں آتا ہے،ایک افسانہ دوسرا یاوہ گوئی تیسرا نقصان۔آپ جناب کی بخشش سے ایک فقیر دونوں ہاتھوں سے،دوسرا آستین سے اور تیسرا دامن سے سونے اور چاندی سے بھر جاتا ہے۔

خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ نظام الدین محمد،فرزند احمد فرزند صالح فرزند ابوالسعید صدیقی شہابی (1060ء-1142ء) برصغیر کے عارف چشتی اور فارسی زبان کے مصنف ہیں۔کاکوری،لکھنو میں پیدا ہوئے۔علوم عرفانی شاہ کلیم اللہ جہان آبادی سے حاصل کیے۔لکھنو سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی روانہ ہوئے۔شاہ کلیم اللہ جہان آبادی نے اورنگ زیب گورگانی (1118ق) کی وفات سے کچھ سال پہلے ہی سارے دکن میں انہیں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔انہوں نے چشتیہ تبلیغ وترویج کا سلسلہ دکن میں جاری رکھا۔ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے فخر الدین ان کی جگہ پر مسند نشین ہوئے۔نظام القلوب،فوائد ذکر جہر،ارشاد وتلقین ان کی تصانیف میں سے ہیں۔(34)

دست تو دست شاہ ولایت بہ کارہا است | این سلک منتہیٰ شدہ تا شاہ بو تراب
حرفی بہ گوش بحر ز حلمت اگر رسد | تصویر لوح سنگ شود نقش سطح آب
حکمت بہ بحر منع ردایی اگر کند | شکل حباب شیشہ شود شیشہ حباب
سازد زمین بہ گوشہ خوانت نسب درست | جوید فلک بہ خیمہ جاہ تو انتساب
خود را کتاب غیب کہ لوح الٰہی است | از فخریہ بہ خاطر پاکت کند حساب (35)

ترجمہ: آپ نظام الدین اورنگ آبادی کے ہاتھ کو بادشاہت زیب دیتی ہے، یہ سلسلہ شاہ بوتراب پر جا کر رکتا ہے۔حلمت کے سمندر سے اگر کوئی بات کانوں تک پہنچتی ہے تو تصویر پانی کی سطح پر پتھر کی تختی میں ڈھل جاتی ہے۔اگر حکمت سمندر میں آپ کی جوانمردی سے انکار کرے تو بلبلہ شیشے کی صورت اختیار کرلیتا ہے، شیشے کا بلبلہ۔آپ کے نسب کو ٹھیک طریقے سے پڑھنے سے زمین گوشے کی صورت اختیار کرلیتی ہے، آسمان خیمے میں آپ کی جاہ وحشمت کا انتساب کرتا ہے۔ غیب کی کتاب خود کو جو الٰہی تختی ہے، فخریہ انداز سے آپ کے صاف دل کا حساب کرتی ہوئی پیش کرتی ہے۔

عارف کامل، فخر جہان رحمۃ اللہ علیہ

محب النبی (1797ء-1872ء) کے لقب سے مشہور زمانہ، شہسوار عرصہ ولایت تھے۔آپ کو سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ کا مجدد بھی کہا جاتا ہے۔تعلیم وتربیت والد بزرگوار سے پائی۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ کے والد نے آپ کو خرقہ خلافت پہنایا۔اجمیری دروازے کے مدرسے میں درس وتدریس میں مشغول رہے۔ نظام العقائد، رسالہ مرجیہ، فخر الحسن ان کی تصانیف ہیں۔ وصال کے وقت آپ کی عمر 73 سال تھی۔دہلی میں مدفن ہے۔(36)

ز نخل جود ثمر بخش خلق فخرالدین | کہ از ستایش خلقش زبان شود شیرین
زسیر لطف ادایش، چو رشتہ ہای نبات | دم نظارہ نگاہ جہان شود شیرین
بہ رنگ قطعہ شیرین رقم خطوط جبین | بہ گاہ سجدہ بر آن آستان شود شیرین
بہ عہد او نبود شرط فیض استعداد | چو طوطیان لب زاغ گمان شود شیرین
شمار نعمت خوانش اگر کنم بالفرض | چو نیشکر گرہم در بنان شود شیرین (37)

ترجمہ: خدایا سخاوت کے درخت سے فخر الدین کی خلقت کو ثمر بخش کہ اس کی تعریف سے اس کی مخلوق کی زبان میٹھی ہوجاتی ہے۔اس کی مہربانی کی اداؤں سے مٹھاس کے دھاگے قطعے کے رنگ سے میٹھے ہیں، جو اس کے ماتھے پر خطوط کی صورت میں درج ہیں۔جس سے کبھی تو فخر الدین کے آستانے پر مٹھاس بھرا سجدہ بھی ہوجاتا ہے۔ان کے عہد میں شرط کے فیض کی استعداد نہ تھی، طوطوں کی طرح

کوؤوں کے لب مٹھاس کا گمان کرتے تھے۔اگر بالفرض میں فخر الدین کی نعمتوں کا شمار کروں تو گنے کی طرح انگلی کے پور بھی مٹھاس سے لبریز ہو جائیں گے۔

منابع و ماخذ:

1۔ آقا بزرگ طہرانی، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ ، بیروت، دارالضواء، القسم الثانی، الجزء التاسع، س۔ن، ص1104

2۔ انوشہ،حسن،(ویراستار)،دانشنامہ ادب فارسی، ج 4،بخش سوم،تھران،وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی، سازمان چاپ وانتشارات،1380 ش،ص2428

3۔ خویشگی ،نصر اللہ خان، گلشن ہمیشہ بہار، بہ کوشش دکتر اسلم فرخی،کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1927ء،ص300

4۔ عبدالحی بن فخر الدین الحسنی ،نزہتہ الخواطر و بہجتہ المسامع والنواظر،حیدرآباد الدکن مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، 1959ء، الجزء السابع ص390

5۔ دیوان منت، دست نویس، کتابخانہ خدا بخش پٹنہ ، ہند،گ10 الف،شمارہ418

6۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی،تصحیح و مقدمہ،ڈاکٹرشعیب احمد،گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،2010ء،ص102

7۔ https//:www.britannica.com/biography/Ali Muslim- Caliph

8۔ قدوسی، اعجاز الحق ترجمہ،سرالاولیاءاردو سائنس بورڈ،طبع سوم،مطبع شیخ غلام علی اینڈ سنز فیروز پور روڈ، لاہور،1992ء،ص77

9۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح ومقدمہ: ڈاکٹر شعیب احمد،منقبت حضرت علیؑ،گروہ زبان وادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،2010ء،ص430

10۔ قدوسی، اعجاز الحق ،ترجمہ سیر الاولیاء، اردو سائنس بورڈ،طبع سوم،مطبع شیخ غلام علی اینڈ سنز ، فیروز پور روڈ، لاہور،1992ء،ص81-82

11۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح ومقدمہ،ڈاکٹر شعیب احمد،منقبت حضرت امام حسن مجتبیٰؑ،گروہ زبان وادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،2010ء،ص439

12۔ قدوسی ، اعجاز الحق ،ترجمہ سیر الاولیاء، اردو سائنس بورڈ،طبع سوم،مطبع شیخ غلام علی اینڈ سنز، فیروز پور روڈ، لاہور،1992ء،ص83

13۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی،تصحیح ومقدمہ،ڈاکٹر شعیب احمد،منقبت حضرت امام حسینؑ،گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،2010ء،ص442

14۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ی 24، ص 152
15۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت حضرت زین العابدینؑ، گروہ زبان وادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص 445
16۔ صبح نور، سیدنا امام محمد باقرؑ، میزبان ڈاکٹر غلام معین الدین نظامی، 2 جنوری 2025ء
17۔ کشف الغمہ، ص 93
18۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت حضرت امام باقرؑ، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص 447
19۔ توکلی، نور بخش، تذکرہ مشائخ نقشبندیہ، مطبوعہ مشتاق بک کارنر، لاہور، ص 57
20۔ جہان امام ربانی، اقلیم ہشتم، امام ربانی فاؤنڈیشن، کراچی، ص 377
21۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام جعفر صادقؑ، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص 449
22۔ ویکی پیڈیا، موسی بن جعفر، آزاد دائرۃ المعارف
23۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام موسی کاظمؑ، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص 451
24۔ فرہنگ وثقافت، مقالہ، حضرت امام علی موسی رضا کی سیرت، 29 مئی 2023ء
25۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام رضاؑ، گروہ زبان وادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص 452
26۔ ویکیپیڈیا، امام علی تقی، آزاد دائرۃ المعارف
27۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام علی تقیؑ، گروہ زبان وادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء ص 458
28۔ صبح نور، سیدنا امام علی نقیؑ، میزبان ڈاکٹر معین نظامی، 27 دسمبر 2024ء
29۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام علی نقیؑ، گروہ زبان وادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص 460
30۔ کراروی، نجم الحسن، چودہ ستارے، لاہور، 1973ء، ص 531
31۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام حسن عسکریؑ، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 2010ء، ص 461
32۔ دائرۃ المعارف برطانیکا آن لائن، محمد المہدی الحجہ، اخذ شدہ بہ تاریخ 8 نومبر 2007ء

33۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت امام دواز دہم، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور 2010ء، ص463

34۔ برزگر، نظام الدین اورنگ آبادی، دانش نامہ ادب فارسی، بہ سرپرستی حسن انوشہ، ج4، بخش سوم، تہران، 1380ش، ص2557–2558

35۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء ص467

36۔ فقری، عالم، تذکرہ اولیاء ہندوستان، ج1، حسیب پبلشنگ ہاوس، 2011ء، ص466–496

37۔ دیوان میر قمر الدین منت دہلوی، تصحیح و مقدمہ، ڈاکٹر شعیب احمد، منقبت الامام فخر الدین و الدنیا، گروہ زبان و ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2010ء، ص469

□□□

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا　　حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی　　تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے　　کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوئی ہے وہ جفا ہی نہیں　　ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورت سلماں ادا شناس تری　　شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثل کلیم سودا تھا　　اویسؓ طاقت دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا　　ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید　　خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جان ناشکیبا پر　　کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر
تپش ز شعلہ گر فتند و بر دل تو زدند　　چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری　　کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا　　خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

(علامہ اقبال)

مولانا ضیاء القادری بدایونی کی منقبت نگاری

ڈاکٹر محمد طاہر قریشی

ABSTRACT: Maulana Zia al-Qadri of Badaun is regarded as one of the prominent Na'at poets of the twentieth century. He dedicated his entire literary prowess to extolling the virtues and grandeur of the Noble Prophet , his companions, and the revered figures of the Muslim ummah. Through the magazine "AaSTANA", he gained particular recognition as a poet of devotional odes (MANQABAT), and due to this association, he became known as "Shaair-e-Aastana". This article focuses on his poetry. Maulana Zia al-Qadri was a powerful poet of Na'at, and what stands out—something this paper especially highlights—is the thematic diversity of his work. Despite his affiliation with a particular Sufi order, he authored entire volumes in praise of saints belonging to other spiritual lineages as well. This article illuminates this aspect of his work: the breadth of his praise encompasses nearly all prominent religious personalities. Such thematic versatility is of great significance for any poet engaged in religious poetry.

پاکستان کے اوّلین حاجی اور کراچی میں عیدمیلادالنبیؐ کا پہلا جلسہ منعقد کرنے والے [1]؎ محمد یعقوب حسین مولانا ضیاء القادری بدایونی کا شمار بیسویں صدی کے معروف نعت اور منقبت گوشعرا میں ہوتا ہے۔ ۱۸۸۳ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے سرپرست اور خالو علی احمد خان اسیر بدایونی نے تاریخی نام ''محمد فضل الرحمان'' رکھا [2]؎، جن سے شاعری میں انھیں تلمذ حاصل تھا [3]؎۔ مولانا نے ۱۸۹۷ء میں اردو مڈل پاس کرنے کے بعد انگریزی کی تعلیم لوئر مڈل تک حاصل کی [4]؎۔ ۱۸۹۸ء میں حضرت مولانا عبدالقادر بدایونی تاج الفحولؒ کے مرید ہوئے، جن کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے مولانا عبدالمقتدرؒ سے ۱۹۱۳ یا ۱۹۱۴ میں تجدید بیعت کی [5]؎۔ ۱۸۹۹ء میں برما کے

سروے کے محکمے میں ملازمت کا آغاز کیا[۶]۔ چار سال کے بعد وطن واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک ڈسٹرکٹ بورڈ کے محکمہ تعلیم، بدایوں میں ملازم رہے[۷]۔ بعد ازاں ۱۹۱۳ء میں تحصیل بدایوں میں ان کا تقرر بہ حیثیت رجسٹرار گرداور قانون گو ہو گیا اور یہیں سے ۱۹۴۰ء میں ریٹائر ہوئے[۸]۔

مولانا ضیاء القادری نے قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ''مجلسِ شیدائیانِ نبیؐ'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے تلامذہ نے ''بزمِ ضیاء'' تشکیل دی۔ دونوں انجمنوں کے تحت عید میلاد النبیؐ اور معراج النبیؐ کے جلسے منعقد ہوتے تھے، جن میں نعتیہ اور منقبتی مشاعرہ لازمی ہوتا تھا[۹]۔ مولانا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے کراچی میں ۱۹۴۸ء میں عید میلاد النبیؐ کے سلسلے میں سب سے پہلے جلسۂ عام کا انعقاد کیا، جس کے بعد سے ۱۲ ربیع الاول کے جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تا حال جاری ہے[۱۰]۔ اس کے علاوہ ۲۶ رجب کو جلسۂ معراج النبیؐ کا سلسلہ پاکستان میں بھی شروع کیا[۱۱]۔ ساری عمر نعت و منقبت کے لیے خود کو وقف کرنے والے لسان الحسان، مولانا ضیاء القادری نے ۱۹۷۰ء میں کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا[۱۲]۔ ان کے شاگرد صابر براری نے تاریخ کہی:

آہ ولیِ زماں ضیاء القادری بدایونی (۱۳۹۰ھ)[۱۳]

''تاریخِ رفتگاں'' میں صابر براری نے ایک اور تاریخ بھی لکھی ہے۔

سالِ رحلت ان کا صابر لکھ سرِ الہام سے
''فی امان اللہ ضیاء القادری جنت مکاں'' (۱۹۷۰ء)[۱۴]

مولانا ضیاء القادری اپنی ذات میں ایک دبستان تھے[۱۵]۔ انھوں نے نعت و منقبت کی دنیا میں ایک وسیع حلقۂ احباب پیدا کر لیا تھا[۱۶]۔ بقول ڈاکٹر ریاض مجید ''نعت گوئی کے علاوہ مولانا کی ایک خدمت (نعت کے ذیل میں) بہت اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے حلقۂ اثر میں نعت گوئی کو مقبولِ عام بنایا اور باقاعدہ ایک اسلوبِ نعت کی ترویج کی''[۱۷]۔ برِ اعظم پاک و ہند کے درجنوں مشہور شعرا ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ مثلاً: شکیل بدایونی (جو مولانا کے بھتیجے بھی تھے)، اختر الحامدی، صوفی عبدالشکور کمبل پوش، خادمی اجمیری، رئیس بدایونی، مختار اجمیری، ماہر شکوہ آبادی، جالب بدایونی، حفیظ وارثی، حاذق بدایونی، صابر براری (مؤلف: تاریخِ رفتگاں)، رہبر کاشمیری، پروانہ ضیائی، نسیم بستوی، وحید اجمیری، حشر القادری، ابرار بدایونی، غوث محمد خان ناظم جبل پوری اور دیگر[۱۸]۔

بعض حضرات نے، جن میں مولانا کے صاحب زادے بھی شامل ہیں، مشہور شاعر ماہر القادری کو

بھی مولانا کے تلامذہ میں شامل کیا ہے، لیکن منظر عارفی نے اپنی کتاب ''کراچی کا دبستانِ نعت'' میں مدلل طریقے سے اس کا رد کیا ہے [۱۹]۔

تصانیف

محمود، راجا رشید، ماہ نامہ ''نعت''، جولائی ۱۹۸۹ء، کلامِ ضیاء (حصہ اول)، ص ۱۵، ۱۶ اور ماہ نامہ ''مجلہ بدایوں''، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۱ء کے مطابق مولانا ضیاء القادری کی نظم ونثر میں درج ذیل تصانیف ہیں:

نظم:

۱۔ ''آثارِ بےخودی''، ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء)، مطبع قادری، بدایوں

۲۔ تاجِ مضامین، ۱۳۴۵ھ (۲۷۔۱۹۲۶ء)، عثمانی پریس، بدایوں (اولیائے قادریہ بدایوں کے منظوم مناقب)

۳۔ ''نغمۂ ربانی'' ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۹ء)، عثمانی پریس، بدایوں میلادیہ مثنوی (شاہ نامۂ اسلام کی طرز میں۔ ولادت اور سفرِ معراج)

(ماہ نامہ ''نعت'' اور ''مجلہ بدایوں'' میں سن اشاعت ۱۹۵۷ء لکھا گیا ہے، درست ۱۹۳۹ء ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی دوسرا ایڈیشن ہو۔)

۴۔ ''مرقعِ شہادت'' ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء)، نظامی پریس، بدایوں، بارِ اول، صفحات: ۲۶۴ (کربلا کے منظوم واقعات)

ایضاً، آستانہ بک ڈپو، دہلی، صفحات: ۱۹۲

دونوں اشاعتوں میں سرورق پر یہی نام اور اندرونی سرورق پر ''مرقعِ یادگارِ شہادت'' لکھا ہوا ہے۔ دونوں میں مولانا عبدالحامد قادری کی تقریظ اور مولانا قمر الدین احمد بدایونی کا مقدمہ ہے اور دونوں کا سن اشاعت بھی ۱۹۴۱ء ہے۔ تاہم دونوں اشاعتوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ دہلی کی اشاعت میں تقریظ اور مقدمے کے اختتام پر سنِ اشاعت کا اندراج نہیں کیا گیا ہے، جبکہ بدایوں کی اشاعت میں کیا گیا ہے۔ دہلی کی اشاعت میں چودہ قطعات تاریخ ہیں اور بدایوں کی اشاعت میں بارہ ہیں۔ فہرست کے مندرجات بدایوں کی اشاعت میں زیادہ ہیں اور اسی باعث صفحات کی تعداد میں بھی فرق ہے۔ اشاعتِ بدایوں ۲۶۴ صفحات اور اشاعتِ دہلی ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(ماہ نامہ ''نعت'' اور مجلہ ''بدایوں'' میں سن اشاعت ۱۹۳۹ء لکھا گیا ہے، درست ۱۹۴۱ء ہے، جیسا کہ کتاب میں درج قطعاتِ تاریخ سے پتا چلتا ہے۔)

۵۔ تجلیاتِ نعت، ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) آستانہ بک ڈپو، دہلی ۱۳۷۴ھ، (۱۹۵۵ء)، آستانہ بک ڈپو، دہلی، دوسرا ایڈیشن
۶۔ ''نغمہ ہائے مبارک''، ۱۳۶۹ھ، (۱۹۵۰ء)، کراچی (سلاموں کا مجموعہ)
۷۔ ''دیارِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء)، مکتبۂ ارباب اردو، لاہور، پہلا ایڈیشن (حج کا منظوم سفرنامہ)
۸۔ ''ستارۂ چشت'' ۱۹۵۱ء، تاج اردو کتاب گھر، کراچی (اولیائے چشت کے مناقب)
۹۔ ''جوارِ غوث الورا'' ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۴ء)، مولوی اصغر حسین صدیقی، کراچی (بغداد و دیگر کا منظوم سفرنامہ)
۱۰۔ ''چراغ صبح جمال'' ۱۳۷۸ھ (۵۹۔۱۹۵۸ء)، کراچی (قصائدِ نورانی)
۱۱۔ خزینہ بہشت، ۱۹۵۹ء، بزمِ ضیاء، کراچی (نعتیہ دیوان)
۱۲۔ ''آئینۂ انوار''، ۱۹۶۷ء، مکتبۂ دین ودنیا، لکھنؤ

ان کے علاوہ راجا رشید محمود نے ضیاء القادری کی وہ نعتیں، جو مختلف رسائل میں چھپیں لیکن ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئیں، ماہ نامہ ''نعت'' لاہور کے جولائی اور اگست ۱۹۸۹ء کے دو شماروں میں شائع کی ہیں۔

ڈاکٹر شمس بدایونی نے ایک کتاب ''خطبۂ صدارت'' (بدایوں ۱۹۴۳ء) [20] کو اور ''بزرگانِ کراچی'' کے مضمون نگار نے ''بہارِ چشت'' کو بھی شعری تصانیف میں شمار کیا ہے [21]۔

نثر:

۱۔ اکمل التاریخ (جلد اول ودوم) طبع اول، ۱۹۱۶ء، طبع جدید ۲۰۱۳ء، تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں (دوسری جلد میں شاہ فضل رسول قادری بدایونی کی سوانح ہے۔)
۲۔ دربار عرس شریف (۱۳۲۷ھ) ۱۹۰۹ء، نظامی پریس، بدایوں
۳۔ حیاتِ صدیق اکبرؓ (۱۳۷۶ھ) ۱۹۵۷ء، دارالفرقان، دہلی
۴۔ تاریخ اولیائے حق (۱۳۷۷ھ) ۱۹۵۸ء، مشہور پریس، کراچی

اس کتاب کا سنِ اشاعت راجا رشید محمود نے سہواً ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) لکھا ہے [22]۔

''تاریخ گویانِ بدایوں'' کے مؤلف نے دو مزید نثری کتب ''ہفتاد اولیا بدایوں'' اور ''تذکرۂ طیبہ'' کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ان کے کتب خانے میں موجود ہیں [23]۔ مؤخر الذکر تصنیف کا ذکر ڈاکٹر شمس بدایونی نے بھی کیا ہے [24]۔

مالک رام نے ''تذکرۂ معاصرین'' میں ایک اور نثری تصنیف ''مجموعۂ ہفت احمد'' کا ذکر کیا ہے [۲۵]۔ اس کتاب میں سات ایسے اولیائے بدایوں کا تذکرہ ہے جن کے نام کا جزو احمد ہے [۲۶]۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا تذکرہ ماہ نامہ بدایوں کی اشاعت اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۳۹ پر ''مجموعۂ کراماتِ ہفت احمد'' کے نام سے کیا گیا ہے۔

''بزرگانِ کراچی'' میں ایک اور کتاب ''روحانیت کے چوبیس ستارے'' کو بھی مولانا ضیاء القادری کی نثری تصنیفات میں شمار کیا گیا ہے [۲۷]۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے گمان ہوتا ہے کہ مولانا ضیاء القادری کی بعض تصانیف ناموں کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں، دوسرے یہ کہ ان کا بہت سا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے، خاص طور پر ایسا کلام جو مختلف ناموں سے اور مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوا اور وہ سب ان کے مطبوعہ مجموعوں میں بوجوہ شامل نہ ہو سکا۔ جیسے کہ ماہ نامہ ''آستانہ'' دہلی میں مولانا کے اپنے نام کے علاوہ ''شاعرِ آستانہ'' یا ''شاعرِ خصوصی آستانہ'' کے نام سے برسوں کلام شائع ہوتا رہا [۲۸]۔

مولانا ضیاء القادری کی نعت گوئی قیامِ پاکستان سے پہلے ہی مقبولیت حاصل کر چکی تھی [۲۹]۔ وہ انتہائی زود گو اور فی البدیہہ کہنے والے شاعر تھے [۳۰]۔ ان کے صاحب زادے لکھتے ہیں: ''اشعار قلم برداشتہ ایسے لکھتے تھے گویا کہ نثر لکھ رہے ہوں۔ ایک نشست میں سوڈیڑھ سو اشعار کہہ دینا ان کے لیے معمولی بات تھی'' [۳۱]۔ شاید اسی لیے مالک رام نے زور دے کر کہا: ''اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں کہ بہ لحاظِ کمیت ان سے بڑا نعت گو اردو تو دکنار، کسی اور زبان میں بھی مشکل ہی سے ہوا ہوگا'' [۳۲]۔

مولانا کی نعتیہ شاعری ان کے شغفِ نعت اور جذبۂ شیفتگی رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ترجمان ہے [۳۳]۔ دراصل نعت گوئی ان کا ذوق ہی نہیں پوری زندگی تھی [۳۴]۔ نعت کے ساتھ ساتھ مولانا کی منقبتی شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے۔ خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ، اہل بیتِ اطہارؓ، اولیا و بزرگانِ دینؒ کی شان میں ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ خصوصاً پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی اور اولیائے چشتؒ کی تعریف و توصیف میں پورے پورے مجموعے ہیں۔ (جوارِ غوث الواریٰ، ستارۂ چشت) حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ذوقِ نعت اور ذوقِ منقبت دونوں کے حامل تھے۔ وہ خود بھی کہتے ہیں:

وہ شاعر جس کو ذوقِ نعت ہو ذوقِ مناقب ہو
عجب کیا اس کی جانب رحمتِ باری مخاطب ہو [۳۵]

مولانا ضیاء القادری کی منقبت عقیدت و محبت سے سرشار منقبت ہے۔ لیکن بقول خواجہ حسن نظامی ''ان کے اشعار میں مذہبیت کے گہرے رنگ کے ساتھ پوری پوری شاعرانہ چاشنی بھی موجود

ہے“[۳۶]۔ وہ اپنے اشعار میں جذبۂ عقیدت کے اظہار کے لیے الفاظ وتراکیب کا ایسا انتخاب کرتے ہیں جس سے ان کے اپنے ممدوح سے محبت اور عقیدت کے جذبات نمایاں ہوکر سامنے آتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں چند عنوانات کے تحت مولانا کی منقبتی شاعری سے انتخابِ اشعار نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔ مقصود اس انتخاب کا فقط یہ ہے کہ نعت کے علاوہ منقبت کے میدان میں بھی مولانا کی ہمہ جہتی اور قادرالکلامی سے نہ صرف خوش عقیدہ قارئین کو بلکہ دنیائے ادب کو بھی روشناس کرایا جائے۔ اسی باعث ان منتخبہ اشعار پر تنقید وتجزیے سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی گئی ہے کہ مولانا ضیاءالقادری (جن کی نعتیہ شاعری میں تو اہمیت مسلّم ہے ہی) کی منقبتی شاعری میں موجود بے پناہ تنوع اور رنگارنگی کو آشکار کیا جائے۔

راقم کو باوجود تلاشِ بسیار کے مولانا ضیاء القادری کے بعض شعری مجموعے دست یاب نہیں ہو سکے۔ جن مجموعوں تک رسائی ہوسکی وہ درج ذیل ہیں:

تجلیاتِ نعت، خزینۂ بہشت، مرقعِ شہادت، نغمۂ ربانی، دیارِ نبیؐ، جوارِ غوث الورا، ستارۂ چشت، کلامِ ضیاء (اول ودوم) مشمولہ ماہ نامہ نعت، سلامِ ضیاء، مشمولہ ماہ نامہ نعت اور ماہ نامہ آستانہ (دہلی) کے ڈیڑھ سو (۱۵۰) سے زائد متفرق شمارے۔ یہی وجہ ہے کہ شعری امثال کے لیے زیرِ نظر مقالے کو متذکرہ بالا مجموعہ ہائے کلام تک ہی محدود رکھنا پڑا ہے۔ نیز حواشی کو زیر بار کرنے کے بجاے اشعار کے سامنے قوسین ہی میں متعلقہ مجموعۂ کلام کی مع صفحہ نمبر کے، نشان دہی کر دی گئی ہے۔

مناقبِ خلفائے راشدین

بعد از انبیا بزرگ اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل بے شمار ہیں۔ سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ بعض خصوصیات بیان کرتے ہوئے مولانا ضیاءالقادری فرماتے ہیں:

رفیقِ ثور و ہجرت، ہم نشینِ جلوت و خلوت
لقب ہے یارِ غارِ مصطفیٰ صدیق اکبر کا
(خزینۂ بہشت، ص ۵۷)

ان کے نزدیک مدحتِ صدیقِ اکبرؓ کے لیے لازمی ہے:

وضو کر لے زبانِ خامہ پہلے آبِ کوثر سے
ہو لذت آشنا پھر مدحتِ صدیقِ اکبرؓ سے
(خزینۂ بہشت، ص ۴۴۹)

نہایت حلیم الطبع صدیقِ اکبرؓ نے فتنۂ ارتداد و کذاب کو کچلنے کے لیے جس جوش اور ولولے اور دینی حمیت سے کام لیا وہ سیرتِ ابوبکرؓ کا ایک درخشاں باب ہے۔اس پر مولانا نے صدیقِ اکبرؓ کو اس طرح دادو تحسین کی نذر پیش کی ہے:

سرِ ارتداد و گلوئے ضلالت
ترے زیرِ خنجر ہیں صدیقِ اکبرؓ (آستانہ،جنوری ۱۹۶۰ء،ص ۶۳)

ہوئے ہر مرتد و کذاب سے جنگ آزما حضرت
جہادِ دینِ حق کا حوصلہ صدیقؓ میں دیکھا
(آستانہ،اگست ۱۹۶۱ء،ص ۵۲)

ایک حدیث شریف کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے:

عمرؓ کی نیکیاں بے شک ستاروں کے برابر ہیں
مگر ان سب سے فائق عزتِ صدیقِ اکبرؓ ہے
(آستانہ، مارچ ۱۹۵۴ء،ص ۳۹)

سیّدنا عمرؓ جو حق و باطل کے درمیان واضح فرق ثابت ہوئے، جن کے لیے دستِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم بارگاہِ ربِ جلیل میں بلند ہوا، اُن کی شان میں مولانا کہتے ہیں:

رسولِ خداؐ کی دعاؤں کا حاصل
تھا اسلام و ایمانِ فاروقِ اعظمؓ (خزینۂ بہشت،ص ۱۵۸)

حسنِ تعلیل سے کام لیتے ہوئے فلک کو ہدایت جاری کرتے ہیں:

یہ انجم یہ کواکب اُن کی روشن نیکیاں ہیں سب
فلک آ بڑھ کے نذرِ حضرتِ فاروقِ اعظمؓ دے
(آستانہ،ستمبر ۱۹۵۶ء،ص ۴۰)

خلیفۂ دوم کی ایک کرامت کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ملتا ہے،جس میں مدینے سے سیکڑوں میل دور مصروفِ جنگ حضرت ساریہؓ کو پہاڑ کی طرف جانے کی ہدایت کی گئی ہے، جسے سن کر حضرت ساریہؓ نے ایسا ہی کیا۔مولانا نے اسے سیدنا فاروقِ اعظمؓ کی روشن ضمیری قرار دیا ہے۔

مدینے سے کہا یا ساریہؓ !سوئے جبل دیکھو
تھی یہ روشن ضمیری ، یہ نظر فاروقِ اعظمؓ کی (خزینۂ بہشت،ص ۱۵۱)

حضرت عمرؓ کے رعب اور دبدبے اور جاہ وجلال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مولانا ضیاء القادری نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن میں جو ''اشداء علی الکفار'' آیا ہے، اس کے صحیح مصداق فاروقِ اعظمؓ ہی ہو سکتے ہیں۔ اگلے شعر میں مشہور حدیث شریف کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے عظمتِ عمرؓ کو مزید واضح کر دیا ہے۔

آپ کی سطوت کا قرآں میں بیاں ہے جا بجا
ہے اشداء علی الکفار ارشادِ خدا
(آستانہ، جنوری، ۱۹۵۴ء، ص ۴۸)

ہو نہ جاتی مصطفیؐ پر ختم گر پیغمبری
صاف ارشادِ نبیؐ یہ ہے ،عمرؓ ہوتے نبی (ایضاً)

بیعتِ رضوان کا تذکرہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے، جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کو حضرت عثمان غنیؓ کا ہاتھ قرار دیا تھا۔ اس واقعے کو منظوم کر کے مولانا نے خلیفۂ ثالث کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

بیعتِ رضواں میں تھا دستِ نبیؐ، دستِ غنیؓ
مرحبا کیا عظمتِ عثمانِ ذوالنورینؓ ہے (خزینۂ بہشت، ص ۴۵۳)

سردارِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو صاحب زادیاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ کے عقد میں آئیں۔ اسی شرف کے باعث آپؓ کو ذُوالنورَین کہا جاتا ہے۔

پائے الطافِ نبیؐ سے نور کے دو آئنے
ضوفشاں کیا طلعتِ عثمانِ ذو النورَینؓ ہے (آستانہ، اگست ۱۹۵۹ء، ص ۵۹)

شہیدِ مظلوم حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت کے آخر میں جب باغیوں نے آپؓ کے گھر کا گھیراؤ کر لیا اور آپؓ کی جان کے درپے ہو گئے، اس وقت اگر فوج کو حکم دیا جاتا تو فوج ان باغیوں کو کچل کر رکھ دیتی، لیکن آپؓ نے اپنی جان دینا تو گوارا کر لی مگر خود مختار خلیفہ ہوتے ہوئے بھی فوج کو حکم نہیں دیا اور خون ریزی نہ ہونے دی کیوں کہ دونوں طرف مسلمان ہی تھے۔ اپنی جان پر کھیلنے کے اس حوصلے اور جذبے کو ضیاء القادری اس طرح سراہتے ہیں:

جان خود دے دی، نہ ہونے دیا خونِ مسلم
مرحبا، حوصلۂ عفو و عطائے عثماںؓ (آستانہ، اگست ۱۹۶۱ء، ص ۵۵)

سیدنا عثمان غنیؓ کا ایک لقب ''جامع القرآن'' بھی ہے:

جمع کیں سب آپ نے آیاتِ قرآنِ مبیں
جامعِ قرآں لقب شایانِ ذو النورینؓ ہے   (آستانہ، مارچ ۱۹۵۴، ص ۴۰)

ضیاءالقادری کے خیال میں اقبال کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا'' کیوں کہ:

خود اپنے نجمِ مقدر کے جگمگانے کو
ستارے چومتے ہیں نقشِ پائے ذوالنورینؓ   (آستانہ، اگست، ۱۹۵۵ء، ص ۴۹)

خلیفۂ چہارم سیدنا علی مرتضیٰ کے علمی تفوق کی گواہی زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے جسے شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

ہیں محمد مصطفیٰ شہرِ علومِ کائنات
ہے درِ علمِ شہِ لولاکؐ بابِ مرتضیٰؓ   (ستارۂ چشت، ص ۱۹)

فاتحِ خیبر، شیرِ خدا، سیدنا علی مرتضیٰ کی شجاعت کی عکاسی ضیاءالقادری نے ان الفاظ میں کی ہے:

شیرِ خدا ہیں فاتحِ خیبر ہیں بو ترابؓ
ہیں پیکرِ جلالتِ خیرالورا، علیؓ   (آستانہ، جولائی ۱۹۶۱ء، ص ۵۲)

نجفِ اشرف میں روضۂ علیؓ پر حاضری کے دوران میں، حق تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کا راز بتاتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:

قربِ حق کا راز ہے، حبِّ نبیؐ، حبِّ علیؓ
ہے فدائے مصطفیٰ ہر جاں نثارِ مرتضےٰؓ   (جوارِ غوث الورا، ص ۶۵)

تاریخ کے صفحات میں حضرت علیؓ کے جود وسخا کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ادبی چاشنی سے بھرپور اس شعر میں مولانا ضیاءالقادری فرماتے ہیں:

ہے تا بہ لب خزانۂ عرفانِ بو ترابؓ
جامِ سفال، کاسۂ سائل نہیں رہا   (تجلیاتِ نعت، ص ۲۷)

ضیاءالقادری کی قادرالکلامی کا اندازہ ان کی وضع کردہ نئی نئی تراکیب سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ شانِ علیؓ کا اظہار ملاحظہ ہو:

علیؓ دروازۂ شہرِ علومِ مصطفائی تھے
علیؓ گنجینۂ اسرارِ شانِ کبریائی تھے   (مرقعِ شہادت، ص ۳)

مناقبِ اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیائے کرامؑ کے بعد سب سے اکرم طبقہ صحابۂ کرامؓ کا ہے۔ ضیاء القادری بھی وقتاً فوقتاً اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ملتِ حق کا یہ مستحکم مسلم ہے اصول
ساری امت سے ہیں افضل سارے اصحابِ رسولؐ (آستانہ، مئی ۱۹۵۴ء، ص ۴۷)

یہ عظمت اے تعالی اللہ! اصحابِؓ پیمبرؐ کی
ابد آثار رحمت ان پہ ہے خلاقِ اکبر کی (آستانہ، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۵۲)

شہر بصرہ سے باہر ریگستانِ بصرہ میں ایک چھوٹا سا شہر ''زبیریہ'' کے نام سے ہے۔ اس شہر کو یہ شرف حاصل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھوپھی زاد ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے، صدیق اکبرؓ کے داماد اور عشرۂ مبشرہ میں شامل حضرت زبیرؓ بن عوام کی آخری آرام گاہ یہیں ہے۔ جہاں حاضری دیتے وقت مولانا نے انھیں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

ختمِ رُسلؐ سے قرب و قرابت ہے آپؓ کو
یہ خاص افتخار ہے حضرت زبیرؓ کا (جوارِ غوث الوراؒ، ص ۷۹)

بصرہ ہی میں مشہور صحابی حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ، جو عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں، کی آخری آرام گاہ ہے۔ ان کے مزار پر دورانِ حاضری مولانا نے منظوم نذر گزرانی۔

وہ جن کی شان میں ''السابقون الاولون'' آیا
اُنھیں اہلِ شرف میں ہے شمارِ حضرتِ طلحہؓ (جوارِ غوث الوراؒ، ص ۸۲)

عشرہ مبشرہ میں شامل رازدارِ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عبدالرحمانؓ ابنِ عوف کی قدر و منزلت کا بیان بایں صورت کیا گیا ہے:

رازدارِ دین و ایماں، عبدِ رحماںؓ ابنِ عوف
گل بداماں، خلد ساماں، عبدِ رحماںؓ ابنِ عوف (آستانہ، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۶۱)

امین الامّت لقب کے حامل، جنگِ یرموک کے سپہ سالار اور عشرہ مبشرہ میں شامل حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کے اوصافِ حمیدہ کو نذرِ عقیدت:

بزرگ، مرتاض، خاصۂ حق، شریکِ بزمِ حبیبِ داورؐ
گروہِ اصحابؓ میں مکرم، فرشتہ خصلت، ابو عبیدہؓ (آستانہ، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۴۲)

عشرۂ مبشرہ ہی کے ایک اور جلیل القدر رکن، فاتحِ ایران حضرت سعدؓ ابن وقاص کی عظمت کی

عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ابد قرار ہے بزمِ جہاں میں عظمتِ سعدؓ
سعادتِ ازلی ہے نثارِ حضرتِ سعدؓ (آستانہ، مارچ ۱۹۵۹، ص ۶۱)

حضرت عمرؓ کے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید کا شمار بھی عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ انھی کی ترغیب سے ایمان لائے۔

اصحابِ عشرۂ شہِ بطحا میں ہیں شریک
اعلیٰ یہ مرتبہ ہے سعیدؓ ابنِ زید کا (آستانہ، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۶۲)

سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادمِ خاص حضرت عبداللہؓ بن مسعود، جنھیں فقۂ حنفی کا مورثِ اعلیٰ سمجھا جاتا ہے، کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

وہ صحابی خلق میں جو قبلۂ مقصود ہیں
ان میں اک ذی جاہ عبداللہ بن مسعودؓ ہیں (آستانہ، مئی ۱۹۵۴، ص ۴۷)

بصرہ میں مدفون حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کم سنی ہی میں آپؐ کے سایۂ عاطفت میں آ گئے تھے۔ مولانا نے اسی شرف کو اجاگر کیا ہے:

آپ نے آغوشِ آں حضرتؐ میں پائی پرورش
اے تعالی اللہ! شرف یہ آپ کا حضرت انسؓ (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۸۰)

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمِّ محترم، سید الشہدا حضرت حمزہؓ کو مولانا ضیاء القادری شاہِ شہیدانِ عالمِ اسلام قرار دیتے ہیں:

ہیں آپؓ شاہِ شہیدانِ عالمِ اسلام
فزوں ہے سارے شہیدوں میں عظمتِ حمزہؓ (آستانہ، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۵۹)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور چچا حضرت عباسؓ کی توصیف میں مولانا فرماتے ہیں:

ہاشمی و مطلبی، غازی و نامی عباسؓ
شہِ لولاکؐ کے ہیں عمِّ گرامی عباسؓ (آستانہ، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۵۹)

مفسرِ قرآن اور سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کی فضیلتِ علمی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

واقفِ آیاتِ قرآں حضرتِ عباسؓ ہیں
کاشفِ اسرارِ پنہاں حضرتِ عباسؓ ہیں (آستانہ، جنوری ۱۹۶۲ء، ص ۵۸)

عالمِ اسلام کے سب سے بڑے جرنیل، جنھیں دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سیف اللہ کا لقب عطا کیا گیا، حضرت خالدؓ بن ولید کی تیغ زنی کا تذکرہ:

لقب شاہِ رسلؐ نے جن کو سیف اللہ کا بخشا
صفِ اصحاب میں وہ تیغ زن ہیں حضرتِ خالدؓ (آستانہ، ستمبر ۱۹۵۸ء، ص ۵۲)

افریقی نژاد، سیاہ رنگت، بظاہر غلام لیکن جن کی عظمت و رفعت پر ہزاروں آزاد قربان، خادمِ خاصِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بلند ترین مقام پر فائز، فاروقِ اعظمؓ ایسی جلیل القدر ہستی جنھیں ''سیدنا بلال'' کہہ کر پکارتی رہی۔ جن کا فقط نامِ نامی ہی اقبال سمیت امّت محمدیہ کے ہر فرد کے باعثِ تسکین ہے اور آج تک عشاقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاکِ بلالِ حبشیؓ کو سرمۂ نظر بنانے میں فخر و انبساط محسوس کرتے ہیں۔ مولانا ضیاءالقادری بھی کیوں پیچھے رہتے:

رحمت للعالمیںؐ کی چشمِ رحمت کے نثار
عالمِ اسلام ہے سارا ثنا خوانِ بلالؓ (آستانہ، جون ۱۹۶۰ء، ص ۷۲)

اصحابِ صفہ، جن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت ابو ہریرہؓ جیسے بلند مرتبہ صحابی شامل ہیں، کو خراجِ تحسین کا انداز ملاحظہ ہو:

تمام اصحابِ صفہ جو نبیؐ کے زیرِ داماں ہیں
جہانِ زہد وتقویٰ میں امامِ اہلِ عرفاں ہیں (آستانہ، ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۳۰)

حضرت اویس قرنیؓ ایک بہت بڑے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنھیں مسلمانانِ عالم کی اکثریت صحابی مانتی ہے، کی شان میں مولانا کہتے ہیں:

ہے چشمِ اویسِ قرنیؓ، شاہدِ عینی
جلوے رخِ محبوبؐ کے پنہاں نہیں رہتے (آستانہ، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۵۲)

صحیح العقیدہ سنی اپنے عقیدے میں (اگر عوامی زبان میں کہا جائے تو) ''ڈبل پنج تنی'' ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں جتنی عقیدت ومحبت خلفائے راشدینؓ کے لیے رکھتا ہے، اتنی ہی عقیدت ومحبت اس کے دل میں اہل بیت اطہار کے لیے بھی ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ محمدؐ، صدیقؓ، عمرؓ، عثمانؓ، حیدرؓ پر کامل ایمان رکھتا ہے تو دوسری طرف محمدؐ، علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ کے بغیر ایمان کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ عقیدے کی اس پختگی کا اظہار مولانا ضیاءالقادری نے بار بار کیا ہے:

ملّت کو چار چاند لگے چار یارؓ سے
امّت کے سر نہیں قدمِ پنج تنؓ سے دور (خزینۂ بہشت، ص ۱۰۱)

رہے گا حسن کی دنیا میں رہتی دنیا تک
وقارِ پنجتنؓ و اوجِ چار یارِ عربؓ (آستانہ، مئی ۱۹۶۲ء، ص۴۷)

اقبال نے کہا تھا ''اے گرفتارِ ابوبکرؓ وعلیؓ ہشیار باش'' (خضرِ راہ، بانگِ درا) مولانا ضیاء القادری نے سوزِ دروں میں لپٹی اس تنبیہ کو غور سے سن لیا تھا۔ ان کے ہاں اس مضمون کے کئی اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

حُبِّ علیؓ و بغضِ صحابہؓ غلط غلط
کام آئے گی نہ الفتِ خامِ ابو ترابؓ (آستانہ، دسمبر ۱۹۶۷ء، ص۲۷)

اربابِ مصطفیٰ پہ تبرا دلیلِ جہل
فرقِ خصوصیاتِ علیؓ و عمرؓ، غلط (تجلیاتِ نعت، ص۸۷)

مناقبِ اہلِ بیت اطہارؑ

جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سرتاجِ خاتونانِ جنت بی بی فاطمہؓ کے مقام و مرتبے کو اجاگر کرتے ہوئے ضیاء القادری اُن کا تعارف کراتے ہیں:

جنھیں خیر النسا کہتے ہیں جو خاتونِ جنت ہیں
وہ بانوئے علیؓ ہیں بنتِ سلطانِ رسالتؐ ہیں (آستانہ، مارچ ۱۹۶۰ء، ص۵۲)

فاطمۃ الزہراؓ کی عبادت و ریاضت کا حال بتاتے ہوئے بڑی دلکش تراکیب باندھی گئی ہیں:

وہ جن کا ایک سجدہ ضامنِ عفوِ خطا کاراں
وہ جن کی جنبشِ لب شافعِ جرمِ گنہ گاراں (مرقعِ شہادت، ص۲)

دنیا بھر کی خواتین کے لیے باعثِ فخر سیدہ فاطمہؓ کے زہد و تقویٰ کی گواہی:

فخرِ مستوراتِ عالم فاطمہؓ بنتِ رسولؐ
اتقا پر جن کے نازاں دُودمانِ اہلِ بیت (خزینۂ بہشت، ص۷۳)

بی بی فاطمہؓ کے مناقب بیان کرنے میں خود کو عاجز پا کر ضیاء القادری اپنے ہاتھ کھڑے کر دیتے ہیں:

مناقب آپؓ کے کس سے بیاں ہوں، کس میں ہمت ہے
کہاں ہم بے نوا خادم، کہاں خاتونِ جنتؓ ہیں
(آستانہ، جولائی ۱۹۶۱ء، ص۵۲)

علیؓ و فاطمہؓ کی تقریبِ شادی میں دامادِ رسولؐ کی آمد کی منظر کشی کرتے ہوئے دل کش تشبیہ استعمال کی گئی ہے:

علیؓ مجلس میں دولھا بن کے آئے اس تجمل سے
کہ جیسے بوئے گل ہو منھ چھپائے دامنِ گل سے (مرقعِ شہادت،ص ۵)

حسنین کریمینؓ کے فضائل ومناقب کے بیان میں ضیاء القادری کا قلم جھومنے لگتا ہے، الفاظ رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

شبرؓ و شبیرؓ ہیں باغِ رسالت کے وہ پھول
گل بداماں تا ابد ہے جن سے بستانِ جمال (تجلیاتِ نعت،ص ۱۰۱)

خلد میں حسنینؓ ہیں محبوبِ یزدانی کے ساتھ
دو شبیہیں حُسن کی ہیں حُسنِ لافانی کے ساتھ (خزینۂ بہشت،ص ۲۸۰)

نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام حسنؓ کی ولادت باسعادت کی منظر کشی کے لیے مولانا نے ترنم ریز الفاظ وتراکیب کا سہارا لیا ہے:

ہوئے بطنِ بتولِ گل بداماں سے حسنؓ پیدا
کیا نقاشِ قدرت نے چمن اندر چمن پیدا (مرقعِ شہادت،ص ۱۰)

سیّدنا امام حسنؓ کو سلام پیش کرتے وقت الفاظ کے صوتی تاثر سے شعر کی دل کشی کو فزوں تر کر دیا گیا ہے:

سلام ان پر حسنؓ کہتے ہیں جن کو حُسن والے سب
سلام ان پر سپہرِ حُسن کے جو ماہِ انور ہیں (آستانہ،جنوری،۱۹۴۸ء،ص ۳۳)

امام حسنؓ کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ آپؓ کی ذاتِ گرامی مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کا باعث بنی، جس کی خبر امامِ موصوفؓ کے نانا سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی دے چکے تھے:

دو لشکروں میں مصلحِ اعظم ہیں آں جنابؓ
کتنے حسیں یہ وصف امامِ حسنؓ میں ہیں (آستانہ،اپریل،۱۹۵۹،ص ۶۹)

واقعۂ کربلا کے واقعات وحالات پر مشتمل ضیاء القادری کے شعری مجموعے ''مرقعِ شہادت'' کی تقریظ میں مولانا عبدالحامد قادری رقم طراز ہیں: ''اس تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حادثۂ کرب و بلا کو نہایت حزم واحتیاط، ادب واحترام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور غلط روایات نہیں

آنے دی گئی ہیں''۔تاہم اس کے باوجود شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔سید الشہدا کے تذکرۂ جلیلہ میں تمام فنی لوازمات کو بروئے کار لاتے ہوئے مولانا کے قلم کی والہیت اور سرمستی قابل دید و داد وتحسین ہے۔اسی لیے وہ خود کو منقبت خوانِ حسینؓ کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں:

دامنِ آلِ محمدؐ ہے ہمارے ہاتھ میں
عمر گزری، ہیں ضیاء ہم منقبت خوانِ حسینؓ (آستانہ، جولائی ۱۹۶۱ء، ص ۴۳)

شہید کرب وبلا، امام العاشقین، سیدنا امام حسینؓ کی رفعت وکمال کو کون جان سکتا ہے؟ اس کا جواب ضیاء القادری کی زبانی سنیے اور صنعتِ تکرار کا فن کارانہ استعمال ملاحظہ کیجیے:

حسین ابن علیؓ کا اوج و رفعت کوئی کیا جانے
حسنؓ جانے، علیؓ جانے، نبیؐ جانے، خدا جانے (مرقعِ شہادت، ص ۲۵)

بیعتِ فاسق کو خلافِ اسلام ثابت کرنے کے لیے مولانا مثال میں امام حسینؓ کی زندگی اور ان کا طرزِ حیات پیش کرتے ہیں:

خلافِ عظمتِ اسلام، بیعتِ فاسق
بھلا یہ کیسے گوارا امامؓ کر لیتے (آستانہ، اگست ۱۹۵۸ء، ص ۶۸)

مولانا ضیاء القادری کی زود گوئی بغیر قادر الکلامی کے ممکن ہی نہیں تھی۔شہیدِ کربلاؓ کے اوصاف کے بیان میں انھوں نے اپنی زبان دانی کے جوہر خوب دکھائے ہیں:

نخلِ مراد، گل بدن، سروِ ریاضِ پنجتن غنچہ لب و شکر دہن، شاہدِ سرخ پیرہن
قوتِ بازوئے حسنؓ، فخرِ زماں، شہِ زمن غرقِ لہو تہِ کفن، آہ قتیلِ بے وطن
راحتِ جانِ مصطفیٰ، پیارے حسینؓ پر سلام ابنِ علی مرتضیٰؓ، پیارے حسینؓ پر سلام
(آستانہ، ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ۶۲)

حسنِ تعلیل کی صنعت مولانا ضیاء القادری کو بہت مرغوب ہے۔بیشتر مقامات پر انھوں نے اس کا استعمال نہایت چابک دستی سے کیا ہے:

شرم سے ہے پانی پانی آج تک نہر فرات
خلد میں کوثر بہ لب ہیں تشنگانِ اہل بیت (خزینۂ بہشت، ص ۷۷)

کربلا میں امامِ عالی مقامؓ کے بھائی حضرت عباس علم دارؓ مدفون ہیں۔ان کی خدمت میں نذرانۂ شعر پیش کرتے ہوئے صولتِ عباس کو عیاں کیا ہے:

تھے قوتِ بازوئے حسین ابنِ علیؓ آپ
تھی رن میں عیاں صولتِ عباسِ علم دارؓ (جوارِ غوث الورا، ص ۵۸)

امام حسینؓ کے شہید فرزند حضرت علی اکبرؓ کی شان میں مولانا کہتے ہیں:

گلِ باغِ جناں، لختِ دلِ شبرؓ، علی اکبرؓ
جواں ہمت، حسیں صورت، قمر طلعت، مہِ انور (مرقعِ شہادت، ص ۱۴۲)

ماہ نامہ ''آستانہ'' دسمبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ''آل اطہار اور آئمۂ اہل بیت علیہم السلام کے دربارِ عالی وقار میں ہدیۂ اخلاص و ارادت'' کے عنوان سے ضیاء القادری نے آئمۂ کرام کو منظوم نذرانہ ہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔ سید الشہداؓ کے فرزندار جمند امام زین العابدینؓ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

سرورِ اہلِ طریقت، عابدِ سجدہ گزار
مقتدائے خلق، زین العابدیں سجادؓ ہیں

امام زین العابدینؓ کے فرزندار جمند امام محمد باقر کو مولانا نے بزمِ امامت کے تاجور کے لقب سے یاد کیا ہے:

تاجور بزمِ امامت کے محمد باقر
گلِ تر گلشنِ جنت کے محمد باقرؒ

امام محمد باقر کے صاحب زادے امام جعفر صادق، جن سے امام اعظم ابوحنیفہؒ بھی فیض یاب ہوئے، اپنی فضیلت علمی اور فقہی تبحّر کے لیے مشہور ہیں۔ ضیاء القادری سمجھتے ہیں کہ یہ سب صدیقؓ و حیدرؓ کا فیض ہے:

آپؒ نے صدیقؓ سے حیدرؓ سے پائے ہیں فیوض
خاصۂ محبوبِ یزداںؐ، جعفر صادق ہوئے

بغداد سے دریائے دجلہ پار کر کے کاظمین پاک کا شہر ہے، جس کی خاک میں فرزندِ امام جعفر صادق حضرت موسیٰ کاظمؒ آرام فرما ہیں:

کاظمینِ پاک کے جلوے نظر میں ہیں ضیاءؔ
ہیں امامِ موسیٰ کاظمؒ، امامِ دینِ حق

سلسلہ فیض و فضیلت میں اگلا نام امام علی رضاؒ کا ہے:

ہیں صاحبِ مقام، امامِ علی رضاؒ
عالَم کے ہیں امام، امامِ علی رضاؒ

فرزندِ علی رضاؒ، امام محمد تقی صفِ اتقیا میں بلند نام و مقام کے حامل ہیں:

ہے بارگاہِ آلِ محمدؐ میں احترامِ تقی
ہے اتقیا کی صفوں میں بلند نامِ تقی

امام علی نقی بن محمد تقی کو بہارِ گلشنِ جنت سے موسوم کیا گیا ہے:

بہارِ گلشنِ جنت، علی نقیؒ ہیں آپ
خمارِ بادۂ وحدت، علی نقیؒ ہیں آپ

اہلِ بیت اطہار کی تعریف وتوصیف میں مولانا ضیاء القادری ہمیشہ رطب اللسان رہتے ہیں۔ امام علی نقیؒ کے صاحب زادے امام حسن عسکریؒ کی عظمت ورفعت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ولایت کی عظمت، امامت کی عزت
امامِ حسن عسکریؒ کے تصدق

کئی احادیث میں امام مہدی علیہ السلام کی اس دنیائے رنگ وبو میں آمد کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ مولانا بھی امامِ موصوف کی آمد کے منتظر ہیں تاکہ:

روحِ اسلام ہو بیدار، خدائی جاگے
بزمِ کونین میں جب آئیں امامِ مہدیؒ

مناقبِ اولیائے کرامؒ وبزرگانِ دینؒ

مولانا ضیاء القادری نجف، کربلا، بصرہ، کوفہ اور بغداد کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے ہمراہ چند ساتھیوں کے بحری جہاز کے ذریعے ۱۹۵۴ء میں روانہ ہوئے [۳۲]۔ اس مقدس سفر میں وہ جہاں جہاں گئے، جن جن بزرگوں کے مزارات پر حاضری دی، ان کی خدمت میں اشعار کے نذرانے پیش کرتے رہے۔ اس طرح اس روحانی سفر کی تمام روداد ایک منظوم سفر نامے (جوارِ غوث الورا) کی صورت اختیار کرگئی۔

مولانا نے بصرہ میں تفسیر، حدیث، فقہ اور طریقت کے امام، مشہور تابعی خواجہ حسن بصریؒ کے مزارِ اقدس کی زیارت کی، جنھیں ام المومنین حضرت اُمِّ سلمہ کے رضاعی فرزند ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے:

شریعت اور طریقت پر مسلّم آپ کی شاہی
ولایت آپ کے زیرِ نگیں، خواجہ حسن بصریؒ (جوارِ غوث الورا، ص ۷۲)

بغداد میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اور ان کے شیخِ طریقت حضرت سری سقطیؒ کے مزارات ایک ہی احاطے میں ہیں۔ ضیاء القادری نے دونوں کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

آپ ہیں سرِّ الٰہی، آپ شیخ الطائفہ
اولیا کے آپ رہبر، یا سریؒ و یا جنیدؒ (جوارِ غوث الورا، ص ۷۳)

بغداد کے نواحی علاقے میں مشہور صوفی بزرگ حضرت معروف کرخیؒ آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے روضے پر حاضر ہو کر انھیں یوں خراجِ تحسین پیش کیا:

نواحِ شہر ہی میں روضۂ معروف کرخیؒ ہے
جو صدر الاولیا ہے، غوثِ دوراں ہے، بہشتی ہے (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۳۹)

قادری سلسلے سے وابستگی مولانا ضیاء القادری کے لیے باعثِ عزت ہے۔ پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں ایک پورا مجموعہ "جوارِ غوث الوریٰ" ہے۔ ان کے لیے درِ غوثؒ کی خاک سرمۂ چشم ہے:

سرمۂ چشمِ ضیاءؔ ہے جو درِ غوثؒ کی خاک
لوگ کہتے ہیں مجھے خاک نشینِ بغداد (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۱۷)

وطنِ عزیز میں روز افزوں لادینیت پر شاعر مضطرب ہے اور بے اختیار محبوبِ سبحانی سے امداد کا طالب ہوتا ہے:

ہے پاکستان میں لا دینیت کا ہر طرف غلبہ
مٹا دو غلبۂ الحاد، یا محبوبِ سبحانی (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۴۵)

تاہم مولانا نے طریقت میں اپنے جدِ امجد کا ذکرِ دل فروز دیگر مجموعوں میں بھی کیا ہے:

سر جھکاتے ہیں یہاں پر سارے قطب و اولیا
ہے مسلّم دہر میں جاہ و جلالِ غوثِ پاکؒ (خزینۂ بہشت، ص ۱۳۹)

سلطانِ عربؐ کے مہ پارے، حسنین کی آنکھوں کے تارے
حیدرؓ کے پسر ابنِ زہراؓ، یا عبدالقادر جیلانیؒ
(آستانہ، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۲۶)

عزت محبوبِ سبحانیؒ رہے گی حشر تک
تا ابد دنیا کرے گی احترامِ غوث پاکؒ (آستانہ، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۴۵)

عباسی دور کے نامور صوفی ابو العباس شیخ احمد رفاعی فقہی لحاظ سے شافعی اور طریقت میں سلسلۂ رفاعیہ کے بانی ہیں۔ یہ سلسلہ قادری سلسلے کے آغاز کے فوراً بعد ہی شروع ہوا۔ شیخ احمد رفاعی کے زہد و تقوی کے معترف امام ذہبیؒ بھی تھے۔ مولانا بھی اسی صف میں شامل ہو گئے ہیں:

مبلغ ہیں رموزِ عشق کے، عرفاں کے داعی ہیں
فنا فی الذاتِ محبوبِ خداؐ، احمد رفاعیؒ ہیں (آستانہ، جون ۱۹۵۹ء، ص ۸۵)

فقہ میں امام شافعیؒ کے مقلد اور سہروردی سلسلے کے بانی مشہور صوفی بزرگ شیخ شہاب الدین

سہروردیؒ کے تلامذہ اور خلفا میں حافظ ابنِ عساکرؒ، بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور شیخ سعدیؒ ایسی نادرِ روزگار ہستیاں بھی شامل ہیں۔ان کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

پیر و مشائخ و ولی معتقد آپ کے ہیں سب
کرتے ہیں اتقیا تمام عظمتِ شیخ سہروردؒ (آستانہ، دسمبر ۱۹۵۹ء، ص ۷۰)

حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید، جن کے مقام و مرتبے کے خود شیخ بھی معترف ہوں، معروف صوفی بزرگ ابوبکر شبلی بھی بغداد میں مدفون ہیں۔مولانا نے ان کی تربت پر عقیدت کے پھول براہِ شعر نچھاور کیے۔

سر جھکاتے ہیں ولی چومتے ہیں اہلِ سلوک
نظر آتا ہے جو نقش کفِ پائے شبلی (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۳۳)

بغداد ہی میں سراج الآئمہ، امامِ اعظم ابوحنیفہؒ بھی آرام فرما ہیں۔حنفی العقیدہ مولانا ضیاء القادری نے یہاں بھی منظوم نذرانہ پیش کیا۔

تمھاری تقلید درحقیقت ہے اتباعِ کتاب و سنت
ہو تم امامِ سوادِ اعظم، ابو حنیفہ امامِ اعظمؒ (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۳۲)

امام ابوحنیفہؒ کی تقلید ان کے لیے باعث فخر و ناز ہے:

مقلّد ہوں ضیاؔء، سنی ہوں، اچھا یا برا ہوں میں
امامِ اعظمِ اسلام کا مدحت سرا ہوں میں (جوارِ غوث الوریٰ، ص ۲۹)

علامہ ضیاء القادری نے صرف صحابۂ کرام، اہلِ بیتِ اطہار اور اولیائے عظام ہی کے مناقب بیان نہیں کیے، بلکہ فقہائے شریعت کی مدح میں بھی زورِ قلم دکھایا ہے۔ماہنامہ ''آستانہ'' دہلی کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے صفحہ ۴۷ پر ''آئمۂ شریعت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے حضور میں نذرانۂ عقیدت'' کے عنوان سے چاروں آئمۂ کرام اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور فقہِ حنفی کے دوستون (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صف آئمہ میں سب سے اعظم، حبیبِ محبوبِ ربِ اکرمؐ
ہیں قبلۂ دین و کعبۂ جاں، امامِ اعظم ابو حنیفہؒ

عاشقِ سرورِ دارینؐ، امامِ مالکؒ واقفِ عظمتِ سبطینؓ، امامِ مالکؒ
ہو تم مقبولِ عالم مقتدائے دہر ہو بے شک امامِ ملّتِ حق اے امامِ شافعیؒ تم ہو

ہوئے قرآں کی عظمت پہ قرباں اے تعالیٰ اللہ! امامِ دینِ برحق ہیں امامِ حضرتِ احمدؒ
امامِ اعظمِ ذی جاہ کے تلمیذِ اعظم ہیں امامِ مذہب و ملّت ہیں علامہ ابو یوسفؒ

امامِ مکرم، امامِ محمدؒ فقیہِ معظم، امامِ محمدؒ
ہیں شاگردِ باعزتِ بو حنیفہؒ ہیں مشہورِ عالم، امامِ محمدؒ

صاحبِ کشف المحجوب علی بن عثمان ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش، جن کے وجودِ مسعود کے سبب لاہور کو داتا کی نگری کہا جاتا ہے، برعظیم پاک وہند کے صوفیہ میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں۔ آپ کے مزار پر سلطان الہند، غریب نواز، خواجہ معین الدین چشتی نے چلہ کش ہوکر مشہورِ زمانہ شعر کہا:

گنج بخشِ فیضِ عالم، مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اس واقعے کے حوالے سے داتا گنج بخشؒ کی عظمت و رفعت کا اظہار کیا گیا ہے، جس کے لیے مولانا نے رعایتِ لفظی کا سہارا لیا ہے:

گنج بخشِ ہر دو عالم ہے ضیاؔء خواجہؒ کا قول
آج بھی دُربار ہے دربارِ داتا گنج بخش (آستانہ، جولائی، ۱۹۶۴ء، ص۷۶)

داتا صاحبؒ کے دریائے فیض سے روحانی فیض حاصل کرنے والے لاکھوں میں ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے:

ہوتے ہیں سیراب لاکھوں تشنہ کام
فیض کے دریا ہیں داتا گنج بخش (آستانہ، جون ۱۹۶۰ء، ص۷۹)

حضرت خواجہ معین چشتی کے پیر ومرشد خواجہ عثمان ہارونیؒ کو مولانا نے بجا طور مجلسِ ابرار کا چراغ کہا:

چراغِ مجلسِ ابرار ہیں عثمانِ ہارونی
سراپا مطلعِ انوار ہیں عثمانِ ہارونی (آستانہ، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۸۳)

ضیاء القادری کے نزدیک ہندوستان میں سلسلہ چشت کے جتنے بھی آستانے اور خانقاہیں ہیں، سب حضرت عثمان ہارونی کی نشانیوں کے طور پر یادرکھے جائیں گے:

ہزاروں آستانے ہند میں چشتی اکابر کے
رہیں گے تا قیامت یادگارِ خواجۂ عثمانؒ (آستانہ، مئی ۱۹۵۸ء، ص ۴۵)

برعظیم پاک وہند میں نورِ اسلام اولیا کے طفیل پھیلا۔ اولیا کے اس مقدس گروہ کے سرخیل سلطان الہند، غریب نواز حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ ہیں۔ سرزمین ہند ان کے بارِ احسان سے کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ ضیاء القادری اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نورِ اسلام سے روشن ہیں ابھی تک سینے
مسلمِ ہند پہ احساں ہے مرے خواجہؒ کا (ستارۂ چشت، ص ۲۷)

مولانا ضیاءؔ القادری کو خواجہ معین الدین چشتی سے جس قدر عقیدت تھی، اس کا اظہار انھوں نے جا بجا کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو فخریہ مے کدۂ خواجہؒ کا پرانا مے کش کہتے ہیں:

مری گھٹی میں ہے داخل خمارِ بادۂ سنجر
یہ مے کش ہے پرانا رندِ مے آشام خواجہؒ کا (آستانہ، جولائی ۱۹۶۱ء، ص ۷۹)

شانِ خواجہ غریب نوازؒ کے اظہار میں نئی تراکیب تراشی گئی ہیں:

حریمِ بارگاہِ خواجہؒ، صحنِ قصرِ جنت ہے
سحر سے شام تک آئینہ برکف شانِ رحمت ہے (دیارِ نبیؐ، ص ۱۳)

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جانشین اور بابا فرید گنج شکر کے پیر و مرشد قطب الاقطاب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ساداتِ حسینی میں سے ہیں۔ سلطان شمس الدین التمشؒ آپؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھا اور مشہور روایت کے مطابق اسی نے آپؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی۔

شیدائے شہِ لولاکؐ ہو تم، فرزندِ حسینِ پاک ہو تم
تم مہر مبیں تم ماہ جبیں یا قطب الزماں یا قطب الدینؒ (خزینۂ بہشت، ص ۲۲۹)

مولانا ضیاء القادری کی منقبتیں محض ان کی عقیدت مندی ہی کی عکاس نہیں ہیں، بلکہ ان میں فنی محاسن بھی جلوہ گر ہیں۔ دیکھیے قطبِ ہند کے اسمِ گرامی کے جزوِ آخر (کاکی) کو مصرعِ ثانی میں بطور قافیہ وجزوِ ردیف کتنی چابک دستی سے باندھا گیا ہے:

جبیں سے جن کی عیاں رحمتیں خدا کی ہیں
وہ قطبِ ہند ہیں وہ بختیارؒ کاکی ہیں (ستارۂ چشت، ص ۶۲)

اجودھن کو پاک پتن بنانے والے اور حضرت بختیار کاکی کے خلیفۂ مجاز فرید الدین مسعود المعروف بابا فرید گنج شکرؒ کا شمار سلسلۂ چشتیہ کے نمایاں ترین صوفیہ میں ہوتا ہے۔ آپؒ کی کم سِنی کی کرامت کو زبانِ شعر میں ضیاءؔ القادری بیان کرتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس کے بعد ہی نام کے بجائے آپ گنج شکر کے لقب سے مشہور ہوگئے:

یہ کرامت کم سنی میں آپ سے ظاہر ہوئی
ہو گئی خاک آپ کے منھ میں شکر، بابا فریدؒ (آستانہ، اگست ۱۹۵۹ء، ص ۷۸)

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

بہشت پاتے ہیں ان کی دعا سے ان کے مرید
کلیدِ بابِ جناں ہے زبانِ گنجِ شکرؒ (خزینۂ بہشت، ص ۱۰۵)

اقبال کے محبوب صوفیہ میں سے ایک خواجہ نظام الدین اولیا، جو سلطان المشائخ اور محبوبِ الٰہی کے القابات سے بھی مشہور و معروف ہیں۔ بابا فرید شکر گنج کے چہیتے مریدوں میں سے تھے۔ ضیاء القادری کے خیال میں ماہ سے لے کر ماہی تک جن کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے:

مسلّم شانِ محبوبی ہے اُن کی ملکِ عرفاں میں
لقب محبوب جن کا ماہ سے لے تابہ ماہی ہے (آستانہ، فروری ۱۹۵۴ء، ص ۵۲)

وہ جو لمحوں میں کسی کو بھی اپنا اسیر بنالیں، جن کے فیضِ صحبت سے خسروؒ ایسا یگانۂ روزگار اولیائے عصر کی صف میں نمایاں دکھائی دے، وہ ہستی سلطانِ اولیا، محبوبِ الٰہیؒ ہی کی ہو سکتی ہے:

خسروؒ بنے امیرِ صفِ اولیائے عصر
قربان فیضِ صحبتِ سلطانِ اولیا (آستانہ، دسمبر ۱۹۵۸، ص ۸۴)

مخدوم شیخ علی احمد صابر کلیریؒ، بابا فرید گنج شکرؒ کے بھانجے، داماد اور خلیفہ ہیں۔ آپؒ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادرؒ کی نسل میں سے ہیں۔ چشتی سلسلے کی دوسری بڑی شاخ آپؒ ہی کی نسبت سے صابری کہلاتی ہے۔ مولانا ان کی توصیف میں کہتے ہیں:

اے رہبرِ اہلِ صفا مخدوم صابر کلیریؒ
اے ہادیِ راہِ ہدیٰ مخدوم صابر کلیریؒ (ستارۂ چشت، ص ۱۱۷)

سیّد جمال الدین ہانسویؒ کا سلسلۂ نسب امام ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے۔ بابا فرید شکر گنج کے لاڈلے خلیفہ تھے۔ مشہور ہے کہ بابا فریدؒ جب کسی مرید کو خلافت نامہ عطا کرتے تو اسے ہدایت کرتے کہ وہ اس کی توثیق جمال الدین ہانسویؒ سے کروائیں۔ ضیاء القادری کہتے ہیں:

گنج شکر کے لاڈلے، آئینہ بزمِ قدس کے
پیکرِ خلقِ مصطفیٰ، قطبِ جمال ہانسویؒ (آستانہ، مئی ۱۹۶۰ء، ص ۸۵)

جانشینِ محبوب الٰہیؒ نصیر الدین محمود اپنے لقب چراغ دہلی سے زیادہ معروف ہیں۔ سلسلۂ چشت کے ممتاز صوفیہ میں آپؒ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے لیے مولانا قلمِ عقیدت کی زبانی فرماتے ہیں:

تنویرِ عرشِ رحماں، روشن چراغِ دلی
تاروں میں ماہِ تاباں، روشن چراغِ دلی (آستانہ، مئی ۱۹۵۸، ص ۵۰)

خطۂ عرب میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور، فتح پور سیکری میں رونق افروز، حضرت سلیم چشتی کو سلامی دینے ہندوستان کے سلاطین آتے تھے۔ مغل تاج دار اکبر اعظم بھی قدم بوسی کے لیے حاضر ہے، مقصود اولادِ نرینہ ہے۔ دعا کے لیے درخواست گزار ہوتا ہے۔ حضرت کی دعا سے سلطنت مغلیہ کو جہاں گیر کی صورت میں وارث مل جاتا ہے:

شہانِ ہند سلامی کو سیکری آئے
سنا جو دہر میں شہرہ سلیم چشتی کا (ستارۂ چشت، ص ۱۲۷)

امامِ ربانی مجدد الفِ ثانی کے پیر طریقت اور نقشبندیہ سلسلے کو ہندوستان میں فروغ دینے والے حضرت خواجہ باقی باللہ کا شمار کبائر اولیا میں ہوتا ہے۔ آپؒ کے فقر و غنا کے واقعات مشہور ہیں۔ ضیاء القادری خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

آپؒ ہیں تاجورِ سلطنتِ فقر و غنا
کشورِ حسن پہ ہے قبضۂ باقی باللہ (آستانہ، ستمبر ۱۹۶۸ء، ص ۸۰)

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلیفۂ مجاز شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی کے لیے اقبال فرماتے ہیں:

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار (پنجاب کے پیرزادوں سے، بالِ جبریل)

مولانا ضیاء القادری بھی حضرتِ مجددؒ کی عظمت و رفعت کے آگے سر جھکاتے ہیں:

شیخ احمدؒ پیشوائے عارفان و اولیا
الفِ حاضر کے مجدد، دورِ نو کے رہ نما (آستانہ، ستمبر ۱۹۵۸، ص ۷۰)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مغلیہ دور میں علم حدیث کی اشاعت و فروغ میں بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ آپ کی علمیت حدِ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایک زمانہ اس کا معترف تھا۔ آپؒ صاحبِ شریعت ہی نہیں صاحبِ طریقت بھی تھے۔ آپؒ کو قادری سلسلے میں حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ ملتان اور نقشبندی سلسلے میں خواجہ باقی باللہ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ مولانا ضیاء القادری کا یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے اولیا و بزرگانِ دین کے ساتھ ساتھ محدثین و مفسرین کے مناقب بھی بیان کیے ہیں۔ صاحبِ مدارج النبوۃ کی توصیف میں فرماتے ہیں:

محقق بھی، محدث بھی، مفسر بھی، مبلغ بھی
مکمل عالمِ دیں دار ہیں، مولانا عبد الحق (آستانہ، مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۴۲)

جہانِ علم میں ہے یہ وقارِ عبد الحق
محدثینِ جہاں ہیں نثارِ عبد الحق (آستانہ،فروری ۱۹۶۱ء،ص ۱۷)

مدینہ منورہ میں مدفون چشتیہ سلسلے کے نامور صوفی حضرت یحییٰ مدنیؒ کے رخِ انور کو مولانا رحمت حق کا صحیفہ سمجھتے ہیں:

کیا حسنِ دل افروز یہ اللہ غنی ہے
رحمت کا صحیفہ رخِ یحییٰ مدنی ہے (آستانہ،نومبر ۱۹۵۵ء،ص ۶۸)

حضرت شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی کو خرقۂ خلافت حضرت یحییٰ مدنی نے عطا فرمایا۔ ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کو پھیلانے میں آپؒ کا اہم کردار ہے۔ضیاء القادری نے آپؒ کی شان میں متعدد نظمیں لکھی ہیں۔کیوں کہ رسالہ ''آستانہ'' دہلی کے مدیر صاحب زادہ مستحسن فاروقی درگاہِ کلیم اللہ کے متوّلی اور سجادہ نشین تھے۔

تم ساقیِ بزمِ خواجہؒ ہو، سرمستِ شرابِ بطحا ہو
ہے تم پہ فدا ہر رند و ولی، یا شیخ کلیم اللہ ولی (آستانہ،دسمبر ۱۹۵۴ء،ص ۶۱)

پاکستان میں سہروردیہ سلسلے کو مشہورِ عالم صوفی بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی ذات پاک کی بدولت بڑی شہرت حاصل ہوئی۔کامل شیخ کی تلاش آپ کو بغداد لے گئی، جہاں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ مرجعِ خلائق بنی ہوئی تھی۔ان سے بیعت وخلافت کا اعزاز حاصل کر کے ملتان شریف کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔آپؒ کے پوتے شاہ رکن عالم کا شمار سہروردیہ سلسلے کے مایۂ ناز صوفیہ میں ہوتا ہے۔مولانا ضیاء القادری آپؒ کے مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تمھاری چشمِ حق بیں،حق نما رخ سے نمایاں ہے
خدا بینی، خدا دانی، بہاء الدین ملتانی (آستانہ،اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۵۰)

بیک وقت قاضی اور صوفی خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کو تذکروں میں سہروردیہ اور چشتیہ دونوں سلاسل سے منسوب قرار دیا گیا ہے۔تاہم مولانا ضیاء القادری انھیں سہروردی سلسلے سے فیض یافتہ قرار دیتے ہوئے ان کی شان میں فرماتے ہیں:

عیاں شام و سحر جس سے وقارِ عارفانہ ہے

حمید الدین ؒ کا وہ سہروردی آستانہ ہے (آستانہ، مارچ ۱۹۵۵ء، ص۱۷)

ضرب المثل کی حیثیت رکھنے والے مشہور ومعروف شعر:

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیں، کتھے جا اڑیاں

کے خالق پیر مہر علی شاہؒ، جن کی نسبت سے ایک چھوٹا سا علاقہ، گولڑہ بھی ''گولڑہ شریف'' بن گیا، محافظِ عقیدہ ختم نبوت اور فتنۂ قادیانیت کے لیے شمشیرِ عریاں تھے۔ انھوں نے مرزا قادیانی کو کئی بار مناظرے کا چیلنج دیا، لیکن ہر بار وہ راہِ فرار اختیار کرتا رہا۔ شاہ صاحبؒ شریعت اور طریقت دونوں میں مقامِ بلند کے حامل تھے۔ اسی لیے مولانا کہتے ہیں:

بحرِ فیضِ جاوداں، مہرِ علیؒ
مقتدائے انس و جاں، مہرِ علیؒ (آستانہ، مارچ ۱۹۶۱ء، ص۸۹)

خانقاہِ مینائیہ کے بانی، سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے شیخ طریقت، قطبِ عالم شیخ محمد بن قطب المعروف مخدوم شاہ مینا لکھنؤ میں آرام فرما ہیں۔ مولانا نے ان کے اوجِ شرف کو خراجِ عقیدت ومحبت پیش کیا ہے:

چراغِ بزمِ سلطانِ مدینہ ﷺ
مہِ اوجِ شرف، مخدوم میناؒ (آستانہ، جولائی ۱۹۵۸ء، ص۶۰)

پنجابی زبان کے عظیم شاعر سلطان العارفین سخی سلطان باہوؒ کا تعلق قادری سلسلے کی سروری شاخ سے ہے۔ نام سلطان کے ساتھ باہو کا اضافہ ان کی والدہ محترمہ نے کیا۔ یہ اضافہ اتنا مقبول ہوا کہ ''ابیاتِ باہو'' کے ہر مصرعے کے ساتھ بعد میں ''باہو'' جوڑ دیا گیا اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ابیات باہو کی تاثیر دو چند ہوگئی۔ تاہم بعض تذکرہ نگاروں کے خیال میں باہو اصل ابیات میں بھی پہلے سے شامل تھا۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مرشد لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی ملیس ہر رگے ہرجائی ہُو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھُلن تے آئی ہُو
جیوے مرشد کامل باہو جیں ایہ بوٹی لائی ہُو (ابیاتِ باہو، ص ۶۳)

ان کی شان میں ضیاء القادری یوں رطب اللسان ہوتے ہیں:

ظہورِ جلوۂ خیر البشر ﷺ سلطانِ باہوؒ ہیں
حبیبِ حق بہ عنوانِ دگر سلطانِ باہوؒ ہیں (آستانہ، جنوری ۱۹۶۱ء، ص۶۹)

ہے رخ اتنا حسیں، حیرت زدہ ہر آئینہ رُو ہے
جمالِ رحمتِ عالم رخِ سلطان باہوؒ ہے (آستانہ، نومبر ۱۹۵۸، ص ۷۸)

طریقت میں سلسلۂ ابوالعلائیہ کے بانی حضرت سیدنا ابوالعلا شاہ جہاں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے چچا امیر عبداللہ نقشبندی کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ نہایت خوش رو اور صاحبِ جلال بزرگ تھے۔ مولانا خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

صدرِ گروہِ اولیا، سیدنا ابو العلا
بدرِ شکوہِ اتقیا، سیدنا ابو العلا (آستانہ، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۷۶)

سید سالار مسعود غازیؒ، جو غازی میاں، بالے میاں اور بالا پیر کے القاب سے بھی جانے جاتے ہیں، سلطان محمود غزنوی کے سگے بھانجے تھے۔ اشاعت و تبلیغِ دین کے لیے آپؒ نے متعدد جنگوں میں نمایاں کارکردگی دکھائی اور آخر کار شہادت کے منصبِ جلیلہ کے سزاوار ہوئے۔ ان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

تیغِ جلالت، سرتاجِ ملت
شمشیرِ نصرت، سردارِ غازیؒ (آستانہ، اگست ۱۹۶۰ء، ص ۸۳)

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے محبوب مرید، فارسی کے عظیم شاعر، اردو زبان کے اولین شعرا میں سے ایک، کثیر التصانیف، ماہرِ موسیقی، طوطیِ ہند، یمین الدین امیر خسروؒ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ انھیں اپنے پیرومرشد سے انتہا درجے کی عقیدت تھی، ان کے انتقال کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور چند مہینوں بعد ہی دنیا کو الوداع کہتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ موسیقی میں امیر خسروؒ کی فنی مہارت کے پیشِ نظر ضیاء القادری اصطلاحاتِ موسیقی کا سہارا لے کر اپنی عقیدت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

معینؒ و قطبؒ و فریدؒ و نظامؒ وجد میں ہیں
صدا رباب کی ہے یا ترانۂ خسروؒ (ستارۂ چشت، ص ۹۱)

امیر خسرو کی فصاحت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مولانا معترف ہیں:

ہے دنیائے فصاحت میں حکومت میر خسروؒ کی
ابد آثار ہے عالم میں شہرت میر خسروؒ کی (آستانہ، اگست ۱۹۵۸، ص ۷۵)

ضیاء القادری اپنے پیرِ طریقت پر دل و جاں نثار کرنے کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں:

دل پہ کردوں کیوں نہ اپنی جاں نثار
دل میں رہتا ہے قیامِ مقتدرؒ (خزینۂ بہشت، ص ۱۰۲)

کبھی اپنے مربی، خالو اور استاد کو یاد کرتے ہیں:

تہِ مرقد بقیعِ اطہر میں
رحمتِ حق ہے ہم کنارِ اسیرؔ (خزینۂ بہشت، ص ۱۰۳)

نعت میں منقبت

منقبت بالواسطہ نعت اور نعت بالواسطہ حمد ہے۔ کیوں کہ تمام تعریفیں خدائے بزرگ و برتر کے لیے ہیں۔ مولانا ضیاء القادری اس حقیقت سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں جہاں حمد میں نعت اور نعت میں حمد نظر آتی ہے، وہاں نعت میں منقبتی عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اصحابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف وتوصیف ان کی شاعری کا محور و مرکز ہے۔ یہ دونوں چیزیں ان کے مشاغلِ روزانہ میں شامل ہیں:

اب ہم نے شغلِ نعت و مناقب کو اے ضیاء
من جملۂ مشاغلِ روزانہ کر دیا (تجلیاتِ نعت، ص ۳۳)

اگرچہ مولانا ضیاء القادری ہاں حمد و مناجات، نعتیہ سلام اور سلاسل طریقت کے منظوم شجروں میں بھی کثیر تعداد میں منقبتیں ملتی ہیں، لیکن بغرضِ اختصار و بخوفِ طوالت انھیں شاملِ مقالہ نہیں کیا گیا ہے اور درجِ ذیل سطور میں صرف چند نعتیہ اشعار، جو منقبتی پہلو کے بھی حامل ہیں، بطور مثال نذرِ قارئین کیے گئے ہیں۔ ان کی نعتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں:

طلب فرمائیے سوئے مدینہ مجھ بھکاری کو بحقِ حضرتِ صدیقِ اکبرؓ یا رسول اللہ
بقیعِ پاک میں دو گز زمیں مجھ کو عطا کر دو برائے حضرتِ فاروقِ برترؓ یا رسول اللہ
دکھا دو اپنا جلوہ، اپنے جلووں میں فنا کر لو پئے عثمانِ ذوالنورینؓ انور یا رسول اللہ
مسلماں ناتواں ہیں، بے کس و مظلوم امّت ہے ضعیفوں کو عطا ہو زورِ حیدرؓ یا رسول اللہ
مجھے اصحابؓ و اہل بیتؓ کی سچی محبت دو عطا ہو الفتِ شبیرؓ و شبرؓ یا رسول اللہ
(کلامِ ضیاءؔ، حصہ دوم، ص ۵۰)

زہے تقربِ صدیقؓ یارِ غارِ حبیبؐ
پسِ فنا بھی ہیں ہم پہلوئے مزارِ حبیبؐ (تجلیاتِ نعت، ص ۵۱)

اے تعالی اللہ! یہ اعزاز یہ شانِ عمرؓ
نطقِ سلطانِ رسالت ہے ثنا خوانِ عمرؓ (آستانہ، جنوری، ۱۹۴۸ء، ص ۴۵)

نبی ؐ کا صدق و عدل و حلم و تقویٰ
ہے صدیقؓ و عمرؓ ، عثمانؓ ، علی ؓ میں (تجلیاتِ نعت،ص۱۲۶)

رہے گا حسن کی دنیا میں رہتی دنیا تک
وقارِ پنج تنؓ و اوجِ چار یارِ عربؓ (آستانہ،مئی ۱۹۶۲ء،ص۴۷)

یہ نورِ نظر فاطمہؓ اور علیؓ کے
ہیں حسنینؓ ماہِ تمامِ محمدؐ (آستانہ،اپریل۱۹۶۱ء،ص۴۷)

فخرِ شاہانِ زمانہ، ترے سلمانؓ و بلالؓ
تیرے دربار کے اسکندر و دارا، محتاج (تجلیاتِ نعت،ص۶۴)

مسلمانو! تمھارے خون میں زورِ ابو ذرؓ ہے
یہ مانا لاکھ بے زر ہو، یہ مانا بے نوا تم ہو (تجلیاتِ نعت،ص۱۴۴)

ابنِ مسعودؓ و انسؓ کی شان اللہ الصمد!
عرش کے تارے بنے یہ کفش بردارِ حبیبؐ (آستانہ،مارچ۱۹۶۸ء،ص۵۰)

مولانا ضیاءالقادری کی منقبتوں کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا صرف نعت ہی کے نہیں، منقبت کے بھی بڑے شاعر ہیں۔ ان کی منقبتوں میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پہلی یہ کہ اپنے ممدوح کی فضیلت وعظمت کے اظہار میں انھوں نے مبالغے سے تو ضرور کام لیا ہے(کہ مبالغہ، شاعری اور خصوصاً اردو شاعری کے جزوِ لا ینفک کی سی حیثیت رکھتا ہے) لیکن زیادہ تر یہ مبالغہ حدود ہی میں رہا ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات مولانا کی ہمہ گیری، وسعت قلبی اور رواداری ہے۔ سلسلۂ قادریہ سے گہری قلبی وابستگی کے باوجود دوسرے سلاسل کے بزرگوں کے اوصاف بیان کرنے میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ خاص طور پر سلسلۂ چشت کے صوفیہ کے مناقب کے بیان میں وہی والہیت ، وہی سرمستی اور عقیدت کے جذبات ملتے ہیں، جس کا اظہار قادری صوفیہ کے لیے ہوتا رہا ہے۔ یہی معاملہ ائمہ شریعت کے ساتھ بھی ہے۔ حنفی العقیدہ ہوتے ہوئے انھوں نے دیگر آئمۂ کرام

کا ذکرِ دل پذیر بھی محبت اور عقیدت سے کیا ہے۔اور ان کی فقہی خدمات کو کھلے دل سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

مولانا ضیاء القادری کی منقبت نگاری کیفیت وکمیت ہر دولحاظ سے اس بات کی متقاضی تھی کہ اس کے ہر پہلو پر تفصیلی گفتگو کی جائے،لیکن یہ مختصر مقالہ اتنی طوالت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔اس لیے زیرِنظر مقالے میں عمداً اور مجبوراً مولانا ضیاء القادری کی منقبت نگاری کے صرف کمیتی پہلو پر (اور وہ بھی نہایت محدود پیمانے پر) توجہ مرکوز رکھی گئی ہے اور مناقب کے فنی محاسن سے بالعموم صرفِ نظر کیا گیا ہے، باوجود اس کے کہ ان مناقب میں صنائع بدائع اور دیگر فنی لوازمات کو شعریت کے تقاضوں کے ساتھ بھر پور طریقے سے برتا گیا ہے۔

درحقیقت مولانا ضیاء القادری کی منقبت نگاری کا مطالعہ زیادہ وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے۔تعجب در تعجب ہے کہ نعت اور منقبت کے اتنے بڑے اور اہم شاعر پر ابھی تک اعلیٰ سطح کا تحقیقی کام کیوں نہیں ہوا۔حد تو یہ ہے کہ مولانا ضیاء القادری کی کلیات تک مرتب نہیں کی جاسکی۔اسی باعث ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر شہزاد احمد اور منظر عارفی کی ہم نوائی کرتے ہوئے ہم بھی اس خواہش کا اعادہ کرتے ہیں کہ مولانا موصوف کی نعت اور منقبت دونوں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالے تحریر کیے جانے چاہییں اور ان کی کلیات بھی مرتب ہونی چاہیے۔ یہ مولانا ضیاء القادری بدایونی کا متعلقینِ نعت و مناقب پر حق بھی ہے اور فرض بھی۔

حواشی

۱۔ قادری، یوسف حسین، حضرت مولانا ضیاء القادری بدایونی، شخصیت اور شاعری، ص ۴۶
۲۔ مالک رام، تذکرۂ معاصرین، ص ۶۷۱
۳۔ ایضاً، ص ۶۷۲
۴۔ ضیاء القادری بدایونی، مولانا، کچھ اپنے بارے میں، ص ۴۰
۵۔ شمس بدایونی، ڈاکٹر، شعرائے بدایوں دربارِ رسولؐ میں، ص ۱۳۶
۶۔ ایضاً
۷۔ سکسینہ، ویریندر پرشاد، بدایوں کے اساتذۂ سخن، ص ۷۳
۸۔ مالک رام، محولۂ بالا، ص ۶۷۲
۹۔ قادری، یوسف حسین، محولۂ بالا، ص ۴۶
۱۰۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ شرف قادری، محمد عبدالحکیم، علامہ، تذکرہ اکابر اہل سنت، ص ۵۷۴
۱۳۔ شمس بدایونی، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۱۳۶
۱۴۔ ص ۱۰۸
۱۵۔ احمد، شہزاد، ڈاکٹر، اردو نعت پاکستان میں، ص ۱۶۹۔۱۶۸
۱۶۔ قادری، فاروق احمد، حضرت محمد یعقوب حسین ضیاء القادری، ص ۲۷
۱۷۔ اردو میں نعت گوئی، ص ۴۹۲
۱۸۔ ناظم جبل پوری، پیش لفظ بر، خزینۂ بہشت
۱۹۔ ص ۳۴۱، ۳۴۲
۲۰۔ شعرائے بدایوں دربارِ رسولؐ میں، ص ۱۳۷
۲۱۔ قادری، فاروق احمد، محولۂ بالا، ص ۳۷
۲۲۔ کلامِ ضیاء (حصہ اول)، مشمولہ: ماہ نامہ ''نعت''، ص ۱۶
۲۳۔ قادری، صداقت اللہ خان یوسفی، ڈاکٹر، ص ۸۶
۲۴۔ شعرائے بدایوں دربارِ رسولؐ میں، ص ۱۳۷
۲۵۔ ص ۶۷۲
۲۶۔ ایضاً
۲۷۔ قادری، فاروق احمد، محولۂ بالا، ص ۳۷
۲۸۔ کلام ضیاء (حصہ اول)، محولۂ بالا، ص ۲
۲۹۔ مجید، ریاض، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۴۹۲
۳۰۔ شمس بدایونی، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۱۳۶
۳۱۔ قادری، یوسف حسین، محولۂ بالا، ص ۴۵
۳۲۔ تذکرۂ معاصرین، ص ۶۷۲
۳۳۔ مجید، ریاض، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۴۹۲
۳۴۔ ایضاً
۳۵۔ قادری، یوسف حسین، محولۂ بالا، ص ۴۳
۳۶۔ دیباچہ بر ''تجلیاتِ نعت''
۳۷۔ ضیاء القادری، جوارِ غوث الوریٰ، ص ۴

فہرستِ اسنادِ محولہ

احمد،شہزاد،ڈاکٹر، ۲۰۱۴ء، اردو نعت پاکستان میں،حمد ونعت ریسرچ فاؤنڈیشن،کراچی
باہُو،سلطان،۱۹۷۵ء،ابیاتِ باہُو،مرتبہ،سلطان الطاف علی، الفاروق بک فاؤنڈیشن، لاہور
بدایونی،شمس،ڈاکٹر، دیکھیے: شمس بدایونی،ڈاکٹر
بدایونی،ضیاء القادری، دیکھیے: ضیاء القادری بدایونی
براری،صابر،دیکھیے: صابر براری
جبل پوری، ناظم، دیکھیے: ناظم جبل پوری
رام، مالک، دیکھیے: مالک رام
سکسینہ، ویریندر پرشاد، ۱۹۹۹ء، بدایوں کے اساتذۂ سخن،عبدالستار بدایونی، کراچی
شرف قادری،محمد عبدالحکیم،علامہ، ۲۰۰۵ء، تذکرہ اکابر اہل سنت، نوری کتب خانہ، لاہور
شمس بدایونی، ڈاکٹر، ۱۹۹۷ء،شعرائے بدایوں دربارِ رسولؐ میں،محمد عبدالستار، کراچی، باردوم
صابر براری، ۱۹۸۶ء، تاریخِ رفتگاں، ادارۂ فکرِ نو، کراچی
ضیاء القادری بدایونی، مولانا، ۱۹۳۹ء، نغمۂ ربانی، عثمانی پریس، بدایوں
ایضاً، ۱۹۴۱ء، مرقعِ شہادت، نظامی پریس، بدایوں، بار اول
ایضاً، ۱۹۴۱ء، مرقعِ شہادت، آستانہ بک ڈپو، دہلی
ایضاً، ۱۹۴۵ء، تجلیاتِ نعت، آستانہ بک ڈپو، دہلی ۱۳۷۴ھ، (۱۹۵۵ء)، آستانہ بک ڈپو، دہلی، دوسرا ایڈیشن
ایضاً، ۱۹۵۰ء، دیارِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، مکتبۂ ارباب اردو، لاہور، پہلا ایڈیشن
ایضاً، ۱۹۵۱ء، ستارۂ چشت، تاج اردو کتاب گھر، کراچی
ایضاً، ۱۹۵۴ء، جوارِ غوث الورا، مولوی اصغر حسین صدیقی، کراچی
ایضاً، ۱۹۵۹ء، خزینۂ بہشت، بزم ضیاء، کراچی
ایضاً، ۱۹۸۹ء، کلامِ ضیا (حصہ اول)، مشمولہ: ماہ نامہ ''نعت'' جولائی، مدیر، راجا رشید محمود
ایضاً، ۱۹۹۱ء، کچھ اپنے بارے میں، مشمولہ: ماہ نامہ ''مجلہ بدایوں''، کراچی، شمارہ، اکتوبر
عارفی، منظر، دیکھیے: منظر عارفی
قادری، صداقت اللہ خان یوسفی، ڈاکٹر (مؤلف)، ۱۹۵۵ء، ناشر مؤلف خود، قادری کتاب گھر، بدایوں
قادری، فاروق احمد، ۲۰۰۴ء، ''حضرت محمد یعقوب حسین ضیاء القادری''، مشمولہ: ''بزرگانِ کراچی''، از پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی قادری، مرکز فیض قادریہ احمدیہ رشیدیہ، کراچی
قادری، محمد عبدالحکیم شرف، علامہ، دیکھیے: شرف قادری، محمد عبدالحکیم، علامہ

قادری، ناصرالدین صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر، ۲۰۰۴ء، بزرگانِ کراچی، مرکزفیض قادریہ احمدیہ رشیدیہ، کراچی
قادری، یوسف حسین، ۱۹۹۱ء، حضرت مولانا ضیاء القادری بدایونی، شخصیت اور شاعری، مشمولہ: ماہ نامہ ’’مجلہ بدایوں‘‘، کراچی، شمارہ، اکتوبر
مالک رام، ۲۰۱۰ء، تذکرۂ معاصرین، الفتح پبلی کیشنز، راول پنڈی
مجید، ریاض، ڈاکٹر، ۱۹۹۰ء، اردو میں نعت گوئی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
منظر عارفی، ۲۰۱۶ء، کراچی کا دبستانِ نعت (جلد اول)، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی
ناظم جبل پوری، ۱۹۵۹ء، پیش لفظ بر، خزینہ بہشت، مشہور آفسیٹ پریس، کراچی
نظامی، خواجہ حسن، ۱۹۵۵ء دیباچہ بر ’’تجلیاتِ نعت‘‘، آستانہ بک ڈپو، دہلی، دوسرا ایڈیشن

رسائل

آستانہ، دہلی، ماہ نامہ، متفرق شمارے
مجلّہ بدایوں، کراچی، ماہ نامہ، شمارہ، اکتوبر، ۱۹۹۱ء
نعت، لاہور، ماہ نامہ، شمارہ، جولائی، ۱۹۸۹ء

□□□

ادب کے ذیل میں یہ اہتمام واجب ہے
بہ ذکرِ آلِ پیمبرؐ سلام واجب ہے
علیؓ کے ذکر کی دولت بقدرِ ظرف سہی
جنھیں نصیب ہو، اُن پر یہ کام واجب ہے

(جنید نسیم سیٹھی)

حضرت نوشہ گنج بخش قادریؒ کے کلام میں منقبت

نعمان رضا نوشاہی

ABSTRACT: This article by Nauman Raza Naushahi explores the tradition of manqabat-writing in the poetry of Noshah Ganj Bakhsh Qadri. After offering a brief introduction to the poet in the opening lines, the writer presents selected examples of manqabat from his works. These examples indicate that Shah Ganj Bakhsh Qadri was not only a skilled manqabat poet but also well-versed in the subtleties of Islamic history and religious doctrine.

حضرت نوشہ گنج بخش قادریؒ دسویں صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ، مصنف اور شاعر تھے۔ آپ کی ولادت ۹۵۹ ہجری میں ضلع منڈی بہاء الدین کے گاؤں گھوگانوالی میں ہوئی۔آپ کا نامِ نامی حاجی محمد تھا۔ آپ نے قادری سلسلہ میں حضرت سخی شاہ سلیمان نوریؒ سے بیعت کی۔آپ سے قادری سلسلہ کی ایک نئی شاخ سلسلہ نوشاہیہ کا ظہور ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ (Thomas Walker Arnold) نے اپنی کتاب 'The Preaching of Islam' میں لکھا ہے کہ آپ نے دو لاکھ سے زائد ہندوؤں کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔آپ نے سات حج پیادہ پا کیے۔آپ کے دو بیٹے اوّل حافظ محمد برخوردار بحر العشقؒ اور دوم محمد ہاشم دریا دلؒ تھے۔آپ کی ایک بیٹی سائرہ خاتونؒ تھیں۔آپ کا وصال ۱۰۶۴ ہجری میں ہوا۔آپ کا مزار ساہن پال شریف، ضلع منڈی بہاء الدین سے 700 میٹر شمال میں موجود ہے۔آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔جن میں فارسی اردو اور پنجابی زبان میں کتابیں شامل ہیں۔شاعری میں آپ کی تصنیف 'انتخاب گنج شریف' (اردو) 1975ء اور 'گنج شریف' (پنجابی) 1980ء میں حضرت شریف احمد شرافت نوشاہیؒ نے مرتب کر کے چھپوائیں۔آپ کی شاعری میں تبلیغ کا عنصر زیادہ تھا۔آپ نے مناقب بھی بیان کیے جیسا کہ کرسی نامہ (شجرہ شریف قادری) اور دیگر بزرگوں کی مناقب میں بھی لکھا ہے۔

کرسی نامہ

اوّل فقر حضرت نوں آیا جس تھوں فقر حیدر نے پایا
حسن بصری فقیر حقاناں حبیب عجمی درویش رباناں
داوٗد طائی فقیری پائی معروف کرخی پائی اولیائی
پاک فقیر جُنید بغدادی شیخ شبلی درویش تے یادی
عبدالواحد درویش سچّاناں ابوالحسن فقیر شہاناں
بو سعید سچّا ولی الٰہی شاہ جیلانی دی سدابادشاہی
عبدالوہاب سیّد جیلانی سیّد صفی الدین حقانی
سیّد احمد قادر دا پیارا سیّد مسعود درویش سوہارا
سیّد علی فقر دا پُورا شاہ میر دا سدا ظہورا
شاہ محمود فقر دا سائیں شاہ مبارک دا فقر سب جائیں
شاہ معروف معروف جگ اندر ولی شاہ سلیمان قلندر
نوشؔہ طالب ہے درگاہی خادم مرشد پاک نگاہی

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالی عنہ کی منقبت میں بھی کلام موجود ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

علی مرتضیٰؓ

مُرشد رُوپ وکھائیا جیسے علی امیر نیزہ ہاتھ گھوڑا تلے نوشہ کہے فقیر
شاہ علی مولا علی مرشد علی امیر میاں علی خاوند علی نوشہ کہے فقیر
جن پایا تن پریم سوں کہے فقیر نوشہ حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ لَا يَضُرُّ مَعَهَا سَيِّئَه

اسی طرح حضرت غوثِ اعظم کی شان میں منقبتی اشعار بھی موجود ہیں۔ جیسے:

نوشہ طالب قادری ہو کسے دا ناں
طالب قادر پاک دا دو جگ پاوے تھاں

جو دیکھا سو مرشد مانہہ نوشہ مرشد بن کوئی نا نہہ
جو دیکھا مرشد تِس اندر پیر امیر فقیر قلندر
مُرشد غوثِ اعظم پیر پیراں مرشد دستگیر میر میراں

حدیث شریف :اَلْمَهْدِیُّ مِنْ عِتْرَتِیْ مِنْ اَوْلَادِ فَاطِمَةَ (ابو داؤد) مشکوٰۃ شریف جلد ۴ باب اشراط الساعۃ فصل ۲۔ آپ نے اس حدیث کے مصداق امام مہدی آخرالزماں کی تعریف میں چند اشعار بھی کہے ہیں:

مہدی نامہ

سن ہجری حضرت جی کے جب کتنے سے ہو جاویں گے
اُن کے پاچھے بڑے امام محمد مہدی آویں گے
دُلدُل گھوڑا تلے رکھیں گے سیف گلے لٹکاویں گے
بھاگ بڑے اُن کے جن کو اپنا دیدار دکھاویں گے

بیٹھ منور منبر پر مکے دیوان لگاویں گے
آگے تخت نبوت کے سب حکم احکام چلاویں گے
نُور بھرے مُکھ سیس اُپر کلگی اور تاج جھکاویں گے
بھاگ بڑے اُن کے جن کو اپنا دیدار دکھاویں گے

آپ کو اپنے مرشد سے اتنا عشق تھا کہ ایک بار آپ دریا کی سیر کو گئے اور کنارہ پر تشریف فرما تھے۔ایک بوڑھا آدمی حاضرِ خدمت ہوا۔آپ نے اس سے پُوچھا بابا! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے عرض کی خواجہ۔آپ نے فرمایا کوئی اچھی بات سناؤ جو ہمارے دل کو خوش کردے۔اس نے کہا ایک مرتبہ میں بھلوال شریف میں حضرت سخی شاہ سلیمان نوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انہوں نے یہ شعر بولا تھا:

لال میرا میرے گھر دا چانن، میری پونجی، مال تے مایا
عشقوں وَٹھی میرے لال دی لالی، سوبھی لال ہو آیا
لالو لال میرے لال دی رنگن، روپ رنگ سوایا
شاہ سلیمان نوشہ دا چولا لال گلال کرایا

حضرت نوشہؒ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بابا خواجہ کو فرمایا کہ ”ہم نے تم کو خضرِ وقت کا منصب دے دیا ہے اور سندھ جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اب تمہارا نام ’لال اُڈیرا‘ ہوگا۔

اپنے مرشد شیخ سلیمان قادری بھلوالی کے مناقب میں بہت کلام لکھا۔جس میں ۱۶ رسالے ہیں۔ جیسے کہ مُرشد مت، مُرشد سنگت، مُرشد ٹہل، مُرشد راہ، مُرشد دان، مُرشد دیدار، مُرشد میل، مُرشد مَنتا، مُرشد شان، مُرشد سندیسا، مُرشد ظہور، مُرشد کافی، میاں پروان، سرا پروان، سچیّاں گلاّں، ہیت وہار۔ اب ہر رسالے سے چند اشعار پیش کرتا ہوں:

مُرشد مت

اللہ سچے نوں آکھ سہائی ۔ جو اوہ چاہسی تھیسی سائی
ہو کسے دی حاجت نہیں کائی ۔ ہک خدا دی سب خدائی
اُس نوں سوہے سب وڈیائی ۔ اُسدی سبھسے نال بھلیائی
توڑے لکھ کرن بُریائی ۔ اوہ برات نہ ٹالے آئی
مُرشد سچے مت دُھرائی ۔ مرشد بابا مُرشد مائی
دونویں جگ مرشد دے ایمائی ۔ مرشد دے پچھے سائی
میری میری کُوڑی دائی ۔ بَر بَر کر دی حرص ہوائی
ایہ دنیا جیوں بادل چھائی ۔ کُوڑے دنیا دار خود رائی
جنہاں وڈیائی لے پیشائی ۔ نوشہ تنہاں دی بھٹھ کمائی

آگے فرماتے ہیں:

حق دا نام درداں دا دارُومرشد کاملوں پایا
لتھا تاپ مرشد دی متیں دُکھ گیا سُکھ آیا
جیا جون خوش وقتی کیتی نوشہ نام دھیایا
مرشد جیہا وید نہ کوئی جس غفلت روگ گوایا

پیر پیغمبر جسدے اس دی کر لے یاد
آکھے نوشہ قادری ایہ مرشد دا ارشاد

مُرشد سنگت

اول خالق یاد کر جس خلق بنائی ۔ صفتاں انت شمار ناں لے نام خدائی
محنت ضائع جاوندی بِن مرشد پائے ۔ مرشد سند سو جھلا سب کجھ دکھلائے
مرشد پایاں پائے رب خاوند سچا ۔ جیں مرشد نہیں پائیا سو کُوڑا کچّا
مرشد سچا بادشاہ زورا ور وڈا ۔ نوشہ کدیں نہ چھڈیئے مرشد دا اڈا
جیویں دیوا بالیے نوشہ دیوے نال ۔ تیویں مرشد سنگ رل طالب ہوئے نال
نوشہ مرشد پاک دا چھوڑے ناہیں سنگ ۔ جے سے وسن کانیاں مُڑے نہ ہک تلنگ

مُرشد لعل

لعل جواہر نعمتاں سب مرشدوں پایئے   بن مرشد دھرگ جیونا کیوں جنم گوایئے
بولے سچ حلال کھائے سو حق دا پیارا   راضی رہے رضا تے دل مست متوارا
سچا مرد سچیار ہے جو سچ نوں ورتے   جُھوٹھا کافر دُنی دار من دُبھتا گھتے
مٹھا بولے نیوں چلے ہتھوں کجھ دیوے   آکھے نوشہ قادری سو مرشد سیوے

مُرشد راہ

حضرت مرشد سب دا نوشہ سچ کہے   جنھاں مرشد نہیں منیاں دوزخ سے پئے
مرشد ہادی ہوئے کے دتا راہ وکھا   نوشہ راہ ایہ حق دا منو ہک خدا
منیاں اللہ ہک کر منیاں محمد رسول   منیاں مرشد اپنا نوشہ بھیا قبول
نوشہ مرشد آکھیا کلمہ پڑھو ہمیش   منو مرشد دا آکھیا تاں ہوو درویش
ہتھ مرشد دے ویچیا سر اللہ دے راہ   لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مُرشد دان

مرشد دتا نام دا خیر   دل توں چا اٹھایا غیر
جس داتے دتا ایہ دان   تن من دھن اُس توں قربان
مرشد پاک محمد لکھ داتا   جَیندے دسّے ہک اللہ جاتا
جو دیوے نام جیہا دان   اُسدا منگت تے احسان
نوشہ کہے پوکار پوکار   کلمہ مرشد نوشہ سچیار

آوے جاوے دمڑا آیا نام نہ جائے   نوشہ مرشد پاک دا خیر ہمیشہ کھائے

نوشہ مرشد پاک ہے داتا سرب کلیان   ہور نہ کوئی دیوندا جو مرشد دِتا دان

مُرشد دیدار

سچا مرشد پائیا لہیے مبارک باد   چندی ہوئی سجناں تن من ہویا شاد
مرشد ویکھن اکھیاں ویکھ ویکھ ہون نہال   ہریا ہویا جیوڑا رَل مُرشد دے نال
ڈٹھے مرشد پاک دے اندر ٹھنڈ پئی   قدماں اُتے ڈھٹھیاں ویدن سب گئی
مرشد سندا ویکھنا لاہے دل دی بُھکھ   مَن دیاں سِکاں لتھیاں قسمت ہویا سُکھ
لوکاں بھانے دُکھ ہے اساں بھانے آرام   جے سر مرشد دے کم آوے تاں ڈِھل سانوں حرام

من مولے دا سر مرشد دا دھڑ سر دے ہمراہ نوشہ کہے فقیر شہانا سر دے نال سر واہ

مُرشد میل

سبھو سُکھ چاہیں پیار یا سو سُکھ مرشد پاس مرشد ملیاں حق ملے پجُے من دی آس
کلمہ آب حیات پی لتھی حرص پیاس واسا آیا سچ دا تھیا بے وسواس
مرشد تُٹھا مہر کر مٹی آس ہراس لوڑ تھوڑ کُجھ نہ رہی مطلب ہوئے راس
مرشد خاص منیاں ہو یا نوشہ خاص

مُرشد منتا

سُنیاں لکھ کہانیاں گلاں لکھ کروڑ بن ہک مرشد اپنے سب کجھ دتا چھوڑ
منیے مرشد اپنا ہور کسے نوں ناں جنہاں مرشد منیا نوشہ بہشت تنہاں

مُرشد شان

مرشد سمجھایا ذکر تینوں کوئی نہ سکے بُلا اگے پچھے واٹ گھاٹ پڑھیے نام خدا
جنہاں مرشد منیاں دم دم خیر وہا آون ہوئے سگارتھا جاون کھٹ کما
دوہیں جہانیں کم راس کمی غمی نہ کا نوشہ مرشد نواز یا کلمہ پاک پڑھا

صحبت مرشد پاک دی کرے گناہ تھوں پاک
آکھے نوشہ قادری میں مرشد دی خاک

مُرشد سندیسا

وچ شریعت مرشد لازم جو دَسّے راہ خدا
دین سکھاوے ران گواوے تن من کرے صفا
مرشد دا فرمایا کریئے چل مرشد دے راہے
پاک رسول دا نائب مرشد دل دیاں میلاں لاہے
کلمہ مرشد پائیا کہے فقیر نوشاہ
لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مُرشد ظہور

سچیاراں دے راہ وکھاون نوں ہادی مرشد وچ ظہور کیتا
اگے وہم خیال دے آون توں نوشہ حاضر ہوئے حضور کیتا

مرشد پاک نے برکت منن دی دنیا دین دے نال بھر پور کیتا
جو کجھ مرشد پاک فرما دتا اساں اکھیاں تے منظور کیتا

مُرشد کافی

اوہو ویس جو مرشد دَسّے اوہو دیس جتھے مرشد وَسّے
اوہو راہ جو مرشد لاوے اوہو بہشت جتھے مرشد جاوے
اوہو بندگی جو مرشد کہے اوہو حق جو مرشد لہے
اوہو سچ جو مرشد بولے اوہو ٹھیک جو مرشد تولے
اوہو کم جو مرشد آکھے اوہو امرت جو مرشد چاکھے
اوہو واہ جو مرشد کرے مرشد منیاں نوشہ ترے

میاں پروان

میاں وچ مدینے وسے میاں مکے والا
میں پاک محمد سائیں صادقاں دا رکھوالا
میاں دین دنی وچ رکھے فقراں دا اُپرالا
سنگ میاں دے نوشہ رلیا پوہتا توڑ سُکھالا

حوالہ جات

۱۔ انتخاب گنج شریف اُردو مرتب شریف احمد شرافت نوشاہی ناشر دارلمورخین لاہور۔ص ۹۹۔۱۰۳
۲۔ گنج شریف پنجابی مرتب سید شریف احمد شرافت نوشاہی ادارِ معارفِ نوشاہیہ ص ۱۹۰۔۲۳۲
۳۔ تذکرہ شعرائے نوشاہیہ۔مصنف سید شریف احمد شرافت نوشاہی اورینٹل پبلیکیشنز لاہور۔ص:۸۔۹

□□□

امامِ جعفرِ صادقؑ کی منقبت میں کلام
ہے اس مقام کو میرا تو دُور ہی سے سلام
پڑھے دیا ہوا اُن کا، تمام عِلم پڑھے
جو چاہتا ہے کہ مل جائے دینِ حق پہ دوام

(منظر عارفی)

پیر سیّد نصیر الدین نصیرؒ کی منقبت نگاری

محمد قاسم کیلانی

ABSTRACT: Pir SYED NASEERUDDIN NASEER GILANI is one of the prominent poets of the DABISTAN-E-DAGH school in Pakistan. His father and great-grandfather were all associated with poetry and literature, despite their distinguished spiritual lineage. SYED NASEER GILANI was a poet with a distinct style. He authored numerous works, among which his poetic collections number around ren or eleven, later compiled and published as a complete KULLIYAT. PIR NASEER wrote a total of 386 MANQABATS, reflecting his deep love for the Companions of the Prophet, the AHL-E-BAYT (the family of the Prophet MUHAMMAD PBUH, revered SAINTS, and spiritual ELDERS. The article presents an intellectual and artistic analysis of his religious poetry. Furthermore, it highlights the diversity of personalities praised in his work, including renowned SAHABA such as the Rightly Guided Caliphs, the AHL-E-BAYT of the Prophet MUHAMMAD PBUH, and the pious SAINTS of the MUSLIM UMMAH. The writer has not adopted a critical stance in this article but has simply illustrated the range of personalities through selected examples from the works of Pir SYED NASEERUDDIN NASEER.

پیر سید نصیر الدین نصیر ۱۴ نومبر ۱۹۴۹ء کو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے مضافاتی علاقے گولڑہ شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خانوادہ اپنی علمی، ادبی، ملی، دینی اور تبلیغی خدمات کے باعث برصغیر پاک و ہند میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ پیر سید نصیر الدین نصیر کے آباؤ اجداد بھی اپنے اپنے زمانہ میں علم و فضل، زہد و تقویٰ، فروغِ شریعت اور تبلیغی خدمات میں یگانۂ روزگار رہے۔ خالقِ کائنات کی طرف سے اس خانوادہ کو علم و فضل کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعر و سخن بھی خاص طور پر عطا ہوا۔

آپ کے جدِ امجد حضرت سیدنا پیر مہر علی شاہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے دادا حضرت قبلہ بابو جی بھی عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے اور اپنے قوّالوں سے اعلیٰ ادبی کلام سماعت فرماتے۔ آپ کے والدِ گرامی سید غلام معین الدین گیلانی المتخلص مشتاقؔ بھی صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام 'اسرار المشتاق' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ کے دادا جان پیر سید غلام محی الدین گیلانی (بابو جی) نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ سید نصیر گیلانی نے اپنے وقت کے مشاہیر اساتذہ سے فنِ قرأت و تجوید، درسِ نظامی اور عربی و فارسی کی تمام متداول کتب کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے اساتذۂ کرام میں؛ قاری محبوب علی لکھنوی، قاری عبدالرحمن الٰہ آبادی، علامہ اللہ بخش، علامہ فتح محمد گولڑوی، علامہ غلام محمد گھوٹوی اور علامہ فیض احمد فیض جیسی نابغۂ روزگار شخصیات شامل ہیں۔ نیز آپ کے حلقۂ احباب میں علامہ احمد سعید کاظمی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، صاحبزادہ سید ظفر قادری، حفیظ تائب، حافظ محمد افضل فقیر، علامہ عبدالحکیم شرف قادری، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، حافظ مظہر الدین مظہرؒ اور پروفیسر مرزا محمد منور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پیر سید نصیر گیلانی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ آپ صاحبِ اسلوب شاعر، ادیب، انشا پرداز اور شیریں بیان خطیب تھے۔ آپ نے اپنی خطابت سے ایک جہاں کو فیض یاب کیا۔ آپ کی تصانیف اور خطابات اصلاحِ احوال، تحفظِ عقائد اور ترویجِ قرآن و سنت کے ابواب میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ ملکی اور بین الاقوامی ادبی حلقوں میں ''شاعرِ ہفت زباں'' اور ''نصیر ملت'' کے القاب سے مشہور ہوئے۔ آپ نے تمام مقبول و معروف اصنافِ سخن میں شاعری کی۔ آپ کی نعتیں اور غزلیں فنِ شاعری میں اُسلوب و ہیئت کے اعتبار سے اہم اضافہ ہیں۔ منقبت نگاری کے میدان میں بھی آپ کی نگارشات نمایاں مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ سید نصیر گیلانی نے بتیس کتب لکھیں۔ نثری کتب و مقالات کی تعداد اکیس ہے؛ جو کہ ادبیات، تاریخ، فلسفہ، فقہ اور تصوف کے موضوعات پر ہیں۔ شعری کتب کی تعداد گیارہ ہے؛ جو حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم اور مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ آپ کے تمام کلام کو 'کلیاتِ نصیر گیلانی' کے نام سے آپ کے فرزندِ اکبر صاحبزادہ سید غلام نظام الدین جامی گیلانی نے ۲۰۱۵ء میں شائع کروایا۔

پیر سید نصیر الدین نصیر نے والدینِ سرکارِ دو عالمؐ، اولاد و امجادِ سرورِ عالمؐ، امہات المومنینؓ، آلِ اطہارؓ، خلفائے راشدینؓ اور اولیائے سلاسلِ اربعہ خصوصاً مشائخِ چشت اہلِ بہشت کی مناقب لکھیں۔ اُن کے تمام کلام کے مجموعی جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ اُنھوں نے مذکورہ بالا ہستیوں کی شان میں ۳۸۶ مناقب لکھیں ہیں۔ اُن کے کلام کی اہم ترین خوبی عشقِ اہلِ بیت ہے۔ اُنھوں نے خاندانِ نبوت اور

خلفائے راشدینؓ کی مناقب لکھنے کے بعد خاص طور پر آلِ اطہارؓ کی بارگاہ میں نذرانہ ہائے عقیدت پیش کیے؛ جو اُن کی محبت و مؤدت کا مرکز ومحور ہیں۔ اُن کے سرمایۂ مناقب میں حضرت سیدہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنھا کی شان پاک میں سات مناقب، حضرت سید نا علی المرتضیٰؓ کی شان میں اُنیس مناقب اور حضرت امام حسینؓ کی شان میں اڑتیس مناقب موجود ہیں۔ جبکہ سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں ۲۱۱ منقبتی رباعیات پر مشتمل ایک مکمل کتاب سمیت مجموعی طور پر ۲۳۶ مناقب ملتی ہیں۔ جو اُن کی اپنے جدِ اعلیٰ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی ذاتِ پاک سے عشق وعقیدت کی آئینہ دار ہیں۔ ''فیض نسبت'' اور ''الرباعیاتِ المدحیہ فی حضرۃ القادریہ'' آپ کے مکمل اور مستقل منقبتی مجموعے ہیں۔ جبکہ متاعِ زیست، آغوشِ حیرت، عرشِ ناز، رنگِ نظام اور ابیات در رنگِ باھو میں بھی جزوی طور پر مناقب موجود ہیں۔ اُن کی غزلیات میں بھی جا بجا منقبتی اشعار ملتے ہیں۔ اُنھوں نے مناقب لکھ کر اہلِ نسبت کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کی منقبت نگاری اُن کے داخلی جذبات اور ذاتی واردات کا اظہار یہ ہے۔ اُنھوں نے پاک ہستیوں کا ذکرِ خیر سعادت اور عبادت سمجھ کر رقم کیا ہے۔ آج بھی اُن کی لکھی ہوئی مناقب عوامی اور علمی حلقوں میں یکساں مقبولیت کے باعث ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ پیر سید نصیر الدین نصیر نے فیض نسبت کے دیباچہ میں منقبت نگاری کے آداب بھی مقرر کیے ہیں کہ منقبت نگاری کے منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کن اُصول وضوابط کا خیال رکھنا ضروری ہے اور کون سی ذمہ داریاں منقبت نگار پر عائد ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اگر شرعی تقاضوں سے مکمل ہم آہنگی نہ ہوگی تو شاعر کے بھٹکنے کا احتمال رہے گا۔ منقبت کے میدان میں احتیاط واعتدال کی راہ پر چلنا اشد ضروری ہے کہ کسی بھی بزرگ ہستی کی مدح بیان کرتے ہوئے توحید ورسالت کی حدوں کو نہ چھوا جائے۔

اظہارِ عقیدت، سیرتِ اولیاء کی تبلیغ وترویج، احیائے افکارِ اولیاء، تذکرۂ صالحین، ذکرِ محبوبانِ خدا باعث نجات، اہل اللہ سے اعانت واستعانت، نسبتِ رسول کریمؐ، خدا اور رسول سے بالواسطہ اظہارِ محبت اور تحفظِ ناموسِ اولیاء؛ سید نصیر گیلانی کی منقبت نگاری کے بنیادی موضوعات ومحرکات ہیں۔ منقبت نگاری کی ضمنی و ذیلی اصناف میں اُنھوں نے سلام نگاری، چادر نگاری، سہرا نگاری اور مرثیہ نگاری کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُنھوں نے چودہ خوش نصیب افراد کے سہرے لکھے ہیں اور سولہ شخصیات کی وفات پر رثائی اشعار رقم کیے ہیں۔

پیر سیّد نصیر الدین نصیرؒ کی ممدوح شخصیات

پیر سید نصیر الدین نصیر نے جن عظیم ہستیوں کے حضور باقاعدہ مناقب کی صورت میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے؛ ان کے اسمائے گرامی اور تفاصیل مناقب درج ذیل ہیں:

سیّدنا عبدالمطلب

جدِ رسول کریمؐ حضرت سیّدنا عبدالمطلبؓ بن ہاشم کی شان میں سیّدنصیر گیلانی نے ایک منقبت لکھی ہے۔ جو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور 'فیض نسبت' کی اوّلین منقبت ہے۔ حضرت عبدالمطلبؓ کے مقام و مرتبہ اور کردار و اطوار کو نصیر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

زینت کعبہ بنے انوار عبدالمطلبؓ — کس قدر اجلا رہا کردار عبدالمطلبؓ
کیوں نہ چومے باادب ہو کر فرشتوں کی نظر — قابل تعظیم ہے دستار عبدالمطلبؓ

(فیض نسبت، ص:۵)

سیّدنا حضرت عبداللہؓ بن عبدالمطلب

قبلہ گاہِ پاکبازاں، سرخیلِ زُہرہ جمالاں، والدِ سرورِ عالمؐ عظمت مآب، حضرت سیّدنا عبداللہؓ کی شان میں نو اشعار پر مشتمل ایک منقبت 'فیض نسبت' میں شامل ہے۔ حضرت سیّدنا عبداللہؓ کی شان میں سید نصیر گیلانی یوں رطب اللسان ہوتے ہیں:

بندھی حجاز میں ایسی ہوائے عبداللہؓ — خدا کا خاص کرم تھا برائے عبداللہؓ
یہی بہت ہے کہ والد ہیں وہ محمدؐ کے — بیان اور کروں کیا، ثنائے عبداللہؓ

(فیض نسبت، ص:۷)

جناب سیّدہ آمنہ سلام اللہ علیہا

والدۂ رحمت اللعالمین، عفت مآب، جناب سیّدہ آمنہ سلام اللہ علیہا کی شان میں فیض نسبت میں سات اشعار کی ایک منقبت میں شامل ہیں۔ نصیر گیلانی سرکار دو عالمؐ کی پیاری امی جان کی تقدس مآب بارگاہ میں غلامانہ اور عاجزانہ ہدیۂ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

ختم الرسل ہیں نور نظر جانِ آمنہؓ — ہم ہیں بصد خلوص ثنا خوانِ آمنہؓ
رتبہ بلند ، اور بڑی شانِ آمنہؓ — دنیا کی ساری مائیں ہیں قربانِ آمنہؓ

(فیض نسبت، ص:۹)

حضرت ابو طالبؓ

عم رسالت مآب، جناب ابو طالب بن عبدالمطلبؓ کی خدمت عالیہ میں تیرہ اشعار پر مشتمل ایک خوبصورت منقبت 'فیض نسبت' میں شامل ہے۔ یہ منقبت حسن عقیدہ و ذوقِ عقیدت کا عمدہ نمونہ ہے۔ جو شدت پسندی کے ماحول میں احترام نسبتِ خیر الوریٰ کے ایک خوشگوار جھونکے کی مانند ہے۔

نذرِ محبوبِ خدا جانِ ابو طالب ہے — ساری دنیا پہ یہ احسانِ ابو طالب ہے

ان کی آغوش کی زینت ہیں علی شیر خدا نورِ احمدؐ، تہِ دامانِ ابو طالب ہے
بعدِ تحقیقِ احادیثِ و روایات نصیر میرا دل قائل ایمانِ ابو طالب ہے
(فیض نسبت، ص:۱۱)

سیدہ حلیمہ سعدیہ نور اللہ مرقدھا

حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضائی والدہ فضیلت مآب حضرت سیّدہ حلیمہ سعدیہؓ کی شان میں بارہ اشعار کی ایک منقبت 'فیض نسبت' میں شامل ہے۔ دو اشعار خاطر نشیں ہیں۔

یہ کیا کم ہے تیری بڑائی حلیمہؓ زمانے کے لب پر مائی حلیمہؓ
وہ نعمت جو تجھ کو عطا کی خدا نے کسی اور نے کب وہ پائی حلیمہؓ

ام المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنھا

صدیقہ ٔ دارین حضرت سیّدہ عائشہ صدیقہؓ کی شان میں دو مناقب پیر نصیر گیلانی کے آخری مجموعۂ کلام 'متاعِ زیست' میں شامل ہیں۔ جنھیں کلیاتِ نصیر کی تدوین کے بعد 'فیض نسبت' میں شامل کر لیا گیا ہے۔ چھبیس اشعار پر مشتمل ان مناقب میں پیر سیّد نصیر گیلانی نے حضرت سیّدہ عائشہ صدیقہ کی عفت و پاکدامنی، نسب مبارک، سیرتِ مقدسہ اور بصیرت و فقاہت کے مختلف دریچے وا کرنے کے بعد امہات المومنینؓ کی شان میں بے ادبی کا ارتکاب کرنے والوں کو وعیدیں بھی سنائی ہیں۔ ان مناقب میں پیر سیّد نصیر الدین نصیر کی مذہبی عقیدت، علمی وسعت اور شعری لیاقت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ان اشعار میں عالمانہ مضامین کی بندش کے باوجود کہیں بھی حسن شعریت مجروح ہوتا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے حضرت سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی بارگاہ میں بصد خلوص و نیاز اپنی غلامی کا ہدیہ پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دخترِ صدیقِ اکبرؓ زوجۂ شاہِ اممؐ ہے دو گونہ اوج کا حامل مقامِ عائشہؓ
عائشہؓ کے ساتھ رخصت ہو گیا ان کا مقام ہو سکا کوئی نہ پھر قائم مقامِ عائشہؓ
پشتِ ہفتم پر بہ اجدادِ رسول ہاشمیؐ ایک ہو جاتے ہیں آبائے کرامِ عائشہؓ
جن کے علم و فضل کے آگے سرِ امت ہے خم ہے وہ اک شخصیت ذی احترامِ عائشہؓ
تجھ کو کیا معلوم تو چھوٹا تری محدود سوچ پوچھ امت کے بزرگوں سے مقامِ عائشہؓ
مل نہیں سکتا خدا، جز دولت حبِ نبیؐ مل نہیں سکتے نبی بے احترامِ عائشہؓ
آ نہ جائے سن کے زہراؓ کی طبیعت پر ملال لیجیو مت بے ادب لہجے میں نامِ عائشہؓ
کوئی اوچھا وار مت کر عائشہؓ کی ذات پر ورنہ قدرت تجھ سے لے گی انتقامِ عائشہؓ

مجھ کو ہے خلدِ سماعت ذکرِ خیر ان کا نصیر — سرمہ میری آنکھ کا گرد خرامِ عائشہؓ

(متاع زیست،ص:۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴)

شہزادگانِ رسالت مآبؐ

اللہ کریم نے اپنے پیارے محبوبؐ کو چار صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے حضرت قاسمؓ، حضرت ابراہیمؓ اور حضرت عبداللہؓ عطا فرمائے۔ حضرت عبداللہؓ طیب و طاہر کے القاب سے بھی ملقب ہوئے۔ لیکن حکمت ایزدی تھی کہ خداوندِ عالم نے آپؐ کے تینوں شہزادوں کو بچپن ہی میں اپنے پاس بلا لیا۔ پیر نصیر نے اپنے مجموعۂ مناقب ''فیض نسبت'' میں ان کی منقبت بھی شامل کی ہے۔ خاندانِ نبوتؐ کے عظیم افراد کی شان میں مناقب پیش کرنا پیر سیّد نصیر الدین نصیر کا خاصہ ہے۔ جو دوسرے منقبت نگاروں کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

قابل دید ہیں سب ماہ لقالڑکے ہیں — نور ہیں آپ نبیؐ نور نما لڑکے ہیں
طیبؓ اچھے ہیں براہیمؓ نہایت اچھے — واقعی سارے زمانے سے جدا لڑکے ہیں
رحمتیں خاص ہوئیں قاسمؓ وعبداللہؓ پر — نور ہی نور سراپا بخدا لڑکے ہیں

(فیض نسبت،ص:۱۷)

دخترانِ خیر الانام علیہ السلام

سرورِ کائناتؐ کی چار صاحبزادیاں امتِ مسلمہ کی عقیدت و ارادت کا مرکز ہیں۔ سید نصیر گیلانی نے دخترانِ خیر الانام کے حضور ''سلام'' پیش کیا ہے۔ نو اشعار پر مشتمل یہ سلام فیض نسبت میں شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نازش صدق و صفا تم پر سلام — دخترانِ مصطفی تم پر سلام
آیۂ تطہیر میں شامل ہوتم — صدقِ دل سے بر ملا تم پر سلام
زینبؓ عالی نسب تم پر درود — پیکر صبر و رضا تم پر سلام
ام کلثومؓ و رقیہؓ نیک دل — جسم و جانِ مصطفی تم پر سلام
فاطمہ زہراؓ تمھیں کہتے ہیں سب — بنت شاہ انبیا تم پر سلام

(فیض نسبت،ص:۱۹)

حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا

کلام نصیر میں آپ کی شان میں چھ مناقب ملتی ہیں۔ جن میں ایک منقبت فیض نسبت میں، تین مناقب متاعِ زیست میں (جنھیں تدوین کلیات کے بعد فیض نسبت میں شامل کر لیا گیا ہے) ایک رباعی

رنگِ نظام میں اور ایک رباعی آغوشِ حیرت میں شامل ہے۔فیض نسبت میں شامل منقبت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کیونکر نہ ہو معیار سخا فاطمہ زہراؓ ہیں دخترِ محبوبِ خدا فاطمہ زہراؓ
ہیں نورِ محمدؐ بخدا فاطمہ زہراؓ محشر میں ہیں رحمت کی گھٹا فاطمہ زہراؓ
مادر ہیں وہ زینبؓ کی حسینؓ اور حسنؓ کی ہیں آلِ محمدؐ کی رِدا فاطمہ زہراؓ

(فیض نسبت،ص:۵۸)

متاعِ زیست میں شامل تین مناقب بالترتیب اکیس، اکیس اور بیس اشعار پر مشتمل ہیں۔پہلی منقبت میں سید نصیر گیلانی، سیدہ پاکؓ کی بارگاہ میں اپنی نیازمندی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

ملائکہ تیری عظمت کے گیت گاتے ہیں ہے انبیا میں تیرا احترام یا زہراؓ
ازل سے لکھ دیا خالق نے دست قدرت سے جبینِ وقت پہ تیرا دوام یا زہراؓ
تری جناب سے ولیوں کو بھیک ملتی ہے ہیں اولیا تیرے در کے غلام یا زہراؓ
ہر ایک سانس سے آتی تھی مصطفیؐ کی مہک تری حیات پہ لاکھوں سلام یا زہراؓ

(متاعِ زیست،ص:۵۱)

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کلام نصیر میں آپ کی شان میں تین مناقب ملتی ہیں۔دو مناقب فیض نسبت میں اور ایک رباعی آغوش حیرت میں شامل ہے۔مناقبِ صدیق اکبرؓ تاریخی و قرآنی تلمیحات اور فنی محاسن سے مزین ہیں۔فیض نسبت سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مسلم ہے محمد سے وفا صدیق اکبرؓ کی نہیں بھولی ہے دنیا کو ادا صدیق اکبرؓ کی
ہم ان کی مدح گوئی داخل سنت نہ کیوں سمجھیں نبیؐ تعریف کرتے تھے سدا صدیق اکبرؓ کی

(فیض نسبت،ص:۲۵)

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

آپ کی شان میں تین مناقب کلام نصیر کی زینت ہیں۔دو مناقب فیض نسبت میں اور ایک فارسی منقبت آغوشِ حیرت میں شامل ہے۔منقبت فاروق اعظمؓ نذر قارئین ہے:

اسلام کی شوکت،صدف دیں کا گہر ہے شہکارِ رسالت جسے کہیے، وہ عمرؓ ہے
وہ صحن حرم اور وہ اک اینٹ کا تکیہ کیا تربیتِ سرورِ عالمؐ کا اثر ہے

(فیض نسبت،ص:۲۷)

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ

سید نصیر الدین نصیر کے کلام میں حضرت عثمان غنیؓ کی شان میں دو مناقب ملتی ہیں۔ایک منقبت فیض نسبت میں شامل ہے جبکہ دوسری منقبت (رباعی) آغوشِ حیرت کی زینت ہے۔فیض نسبت میں سے منقبت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ اللہ ! یہ تھی سیرتِ عثمان غنیؓ — دین پر صرف ہوئی دولتِ عثمان غنیؓ
ہر نفس شان حیا، مصدر و میزان حیا — زندگی بھر یہ رہی فطرتِ عثمان غنیؓ
وہ صحابی تھے مجاہد تھے خلیفہ تھے نصیر — ناز اسلام بنے حضرتِ عثمان غنیؓ

(فیض نسبت،ص:۳۲، ۳۳)

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

کلام نصیر میں حضرت مولا علیؓ کی شان میں انیس مناقب ملتی ہیں۔جن میں پانچ مناقب فیض نسبت میں، پانچ مناقب رنگِ نظام میں، سات مناقب آغوشِ حیرت میں، ایک رباعی متاعِ زیست میں اور ایک مسدس (ایک بند) کلیاتِ نصیر گیلانی میں شامل ہے۔فیض نسبت میں شامل جنابِ امیر علیہ السلام کی پہلی منقبت بائیس اشعار پر مشتمل، فارسی زبان میں ہے اور سلام کا آہنگ رکھتی ہے۔اس مقدس منقبت میں سید نصیر گیلانی نے حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی کو مختلف دل نواز اور جاں گداز القابات سے مخاطب کر کے سلام پیش کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

السلام اے نوع انساں را نوید فتح باب — السلام اے قبلہ گاہ عاشقاں! اے بو ترابؓ
السلام اے وارثِ علمِ رسولِ ہاشمیؐ — السلام اے نقطۂ آغاز، در ام الکتاب
السلام اے خسروِ اقلیمِ قرطاس و قلم — السلام اے تاجدارِ منبر و حسنِ خطاب
السلام اے فخر ناداری و نازِ مفلسی — السلام اے فقر را سرمایۂ کامل نصاب
زبدۂ اخیارِ عالم، سرورِ اقطابِ جود — کارواں سالارِ ملت، خسرو گردوں جناب
شرحِ کن، ناموسِ دیں، حبلِ متیں، فتحِ مبیں — صدرِ ایوانِ امامت، بندۂ حق انتساب

(فیض نسبت،ص:۳۴)

رنگ نظام میں سے ایک رباعی ملاحظہ ہو:

زین الفقرا فقیرِ بے باک علیؓ — دروازۂ علمِ شہِ لولاک علیؓ
ہوتی ہے سمندر کی طرح موج بھی پاک — معصوم محمدؐ ہیں تو ہیں پاک علیؓ

(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۶۲)

حضرت سیدنا امام حسن المجتبیٰ رضی اللہ عنہ

کلامِ نصیر میں حضرت سیدنا امام حسن المجتبیٰؓ کی دو مناقب شامل ہیں۔ایک منقبت فیض نسبت میں اور ایک رباعی متاعِ زیست میں شامل ہے۔منقبت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زمیں سے تا بہ فلک ہر طرف صدائے حسنؓ — بلند و برتر و بالا ہوا، لوائے حسنؓ
ہو کیوں نہ منزلِ جذب وسلوک زیرِ قدم — کہ غوث پاکؓ ہیں، اولادِ با صفائے حسنؓ

(فیض نسبت، ص:۶۰)

سید الشہداء حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ

کلامِ نصیر میں امام حسینؓ کی اڑتیس مناقب موجود ہیں۔ جو سید نصیر گیلانی زود نویسی، پر گوئی اور قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اکتیس مناقب فیض نسبت میں، تین رنگِ نظام میں، دو مناقب ،ابیات در رنگِ سلطانِ باہوؒ میں اور دو رباعیات متاعِ زیست کی زینت ہیں۔فیض نسبت میں دو مناقب مسدس کی ہیئت میں ہیں اور مرثیہ کا آہنگ رکھتی ہیں جو بالترتیب بیس اور اڑتیس بندوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی منقبت امام عالی مقام کی جرأت واستقامت کے بیان کے ساتھ کربلا کے خونی مناظر کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ایک بند ملاحظہ ہو:

یہ بے پناہ دھوپ کی شدت، یہ تشنگی — یہ غم، یہ اضطراب، یہ صدمے، یہ بے کسی
یہ گیسوئے حیات گریزاں کی برہمی — اور اس کے باوجود، یہ جوش دلاوری

دل ہے اداس، ہاتھ میں پھر بھی حسام ہے
اے فاطمہؓ کے لال! یہ تیرا ہی کام ہے

(فیض نسبت، ص:۱۲۱)

دوسری مسدس کا عنوان ''یومِ عاشور'' ہے۔ یہ منقبت بھی سیدنا امام عالی مقامؓ اور آپؓ کے رفقا پر ٹوٹنے والے یزیدی مظالم، مصائب، جبر واستبداد اور آپؓ کے صبر وضبط، حوصلہ واستقامت اور فضائل و مناقب کا حسین امتزاج ہے۔ 'رنگ نظام' سے ایک رباعی ملاحظہ ہو:

محبت کو تمام کر گیا ہے شبیرؓ — آفاق میں نام کر گیا ہے شبیرؓ
تا حشر نہیں جواب جس کا ممکن — سر دے کے وہ کام کر گیا ہے شبیرؓ

(کلیات نصیر گیلانی، ص:۴۶۶)

حضرت سیّدہ زینب بنتِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما

سیدہ زینبؓ کی بارگاہ میں پیر سید نصیر گیلانی نے دو مناقب (رباعیات) پیش کی جو رنگِ نظام کی

زینت ہیں۔ پہلی رباعی میں سیدہ زینب پاکؓ کے حضور استغاثہ برائے شفاعت پیش کرتے ہوئے ملتجی ہوتے ہیں۔ ردیف کی صوتی و معنوی چاشنی قابل صد داد ہے۔

عاصی پہ یہ التفات مشکل تو نہیں		لینا سند نجات مشکل تو نہیں
ناناؐ سے کہیں میری شفاعت کے لیے		زینبؓ کے لیے یہ بات مشکل تو نہیں

(کلیات نصیر گیلانی، ص:۴۶۷)

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

پیر سید نصیر الدین نصیر نے داتا گنج بخشؒ کی شان میں تین مناقب لکھی ہیں۔ دو مناقب غزلیہ ہیئت میں فیض نسبت کی زینت ہیں۔ جب کہ ایک رباعی آغوشِ حیرت میں شامل ہے۔فیض نسبت میں سے منقبتِ داتا گنج بخشؒ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل مایوس کو دیتا ہے سہارا داتاؒ		ایسا داتا ہے حقیقت میں ہمارا داتاؒ
ہے شب و روز تصور میں زیارت حاصل		سامنے ہے مرے دربار تمہارا داتاؒ

(فیض نسبت، ص:۱۶۲)

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

کلام نصیر میں غوث پاک کی مناقب کی مجموعی تعداد ۲۳۷ ہے۔جن میں سے پندرہ مناقب فیض نسبت میں، ایک منقبت تضمینات میں، ایک رنگ نظام میں، چار آغوشِ حیرت میں، ایک متاع زیست میں اور چار پنجابی ابیات در رنگ حضرت سلطان باہو میں شامل ہیں۔ جبکہ غوث الاعظم کی ۲۱۱ فارسی مناقب (رباعیات) کا مجموعہ الرباعیات المدحیہ فی حضرۃ القادریہ کے نام سے علیحدہ چھپا ہے۔فیض نسبت میں حضرت غوث الاعظم کی شان میں سید نصیر یوں رطب اللسان ہوتے ہیں:

سارا عرب، تمام عجم غوث پاکؓ کا		اللہ رے جلال و حشم غوث پاکؓ کا
اپنی گزر رہی ہے بڑی دھوم دھام سے		رحمت ہے مصطفیٰؐ کی، کرم غوث پاکؓ کا
حق نے دیا وہ مرتبۂ خاص آپ کو		چوما ہے اولیاء نے قدم غوث پاکؓ کا

(فیض نسبت، ص:۱۶۷)

پنجابی زبان میں منقبت کا مطلع دیکھیے:

یا غوث الاعظم جیلانی، فیض ترا لاثانی		لودیون گے محشر توڑی تیرے نقش نورانی

(فیض نسبت، ص:۱۸۵)

رنگ نظام میں سے ایک رباعی حضرت غوث اعظمؒ کی شان میں ملاحظہ ہو:

اتنا کوئی حق پذیر دیکھا نہ سنا
ایسا کوئی دستگیر دیکھا نہ سنا
اے ابن حسن نہیں کوئی تیری مثال
اس شان کا ہم نے پیر دیکھا نہ سنا
(کلیات نصیر گیلانی، ص:۴۶۹)

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

سید نصیر گیلانی نے خواجہ معین الدین چشتی کی مدح میں چھ مناقب لکھی ہیں۔جن میں چار مناقب فیض نسبت میں، ایک منقبت آغوشِ حیرت میں اور ایک منقبت متاعِ زیست میں شامل ہے۔ سید نصیر گیلانی نے مناقبِ خواجہ میں التجائیہ آہنگ بھی اپنایا ہے اور ان کے فضائل و محاسن بھی خوش اسلوبی سے سلکِ نظم میں پروئے ہیں۔فیض نسبت میں شامل خواجہ غریب نواز کی شان میں ایک منقبت میں نصیر گیلانی یوں مدح سرا ہوتے ہیں:

دل ربا، دل نشیں ، معین الدینؒ بھولتے ہیں کہیں ، معین الدینؒ؟
واقفِ سرِ دیں معین الدیں نازِ اہلِ یقیں معین الدینؒ
زبدۃ العارفیں معین الدیں حق جہاں ہے وہیں معین الدینؒ
رہبرِ سالکانِ راہِ طلب منزل اہل دیں معین الدینؒ
غم و آلام نے جہاں گھیرا یاد آئے وہیں معین الدینؒ

(فیض نسبت،ص: ۲۱۳)

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ

سید نصیر گیلانی نے اپنے مجموعۂ کلام ''آغوشِ حیرت'' میں ایک منقبت (رباعی) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی شان میں بھی لکھی ہے۔ملاحظہ ہو:

آں منفرد زماں بہ خوش ادراکی نور آئینہ بود در لباس خاکی
مُسترشدِ خواجہؒ ، مُرشدِ گنج شکرؒ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ

(کلیاتِ نصیر گیلانی،ص: ۹۵۷)

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی شان میں پیر سیّد نصیر الدین نصیر نے پانچ مناقب لکھیں۔جن میں سے تین فیض نسبت میں، ایک رنگ نظام میں اور ایک آغوش حیرت میں شامل ہے۔فیض نسبت میں بابا فریدؒ کے اوصاف و

مناقب سید نصیر گیلانی کی زبانی سنیں:

ہوئے ہیں دیدہ و دل محو شانِ گنج شکرؒ   زہے نصیب، ملا آستانِ گنج شکرؒ
سدا بہار ہیں اس کے تمام غنچہ و گل   خزاں کی زد میں نہیں، گلستانِ گنج شکرؒ
مٹھاس شہد کی ایک ایک حرف میں ان کے   نبات و قند سے شیریں، زبانِ گنج شکرؒ
انہیں کے باغ کے گل، صابرؒ و نظام الدینؒ   بسے ہیں دل میں مرے، دلبرانِ گنج شکرؒ

(فیض نسبت، ص: ۲۲۰)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

کلام نصیر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی شان میں تین مناقب موجود ہیں۔ جن میں ایک منقبت فیض نسبت میں، ایک رنگ نظام میں اور ایک آغوش حیرت میں شامل ہے۔ رنگ نظام سے رباعی دیکھئے:

دیتی ہے دلوں کو شاد کامی نسبت
ہے قابل فخر یہ گرامی نسبت
صد شکر کہ محبوبِ الٰہیؒ کے طفیل
حاصل ہے نصیر کو نظامی نسبت

(کلیات نصیر گیلانی، ص: ۲۷۴)

سید علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

سید نصیر گیلانی نے آپ کی مدح میں بارہ اشعار کی ایک منقبت لکھی ہے جو فیض نسبت کی زینت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عاشقان ذات حق کا مدعا کلیر میں ہے   غوث اعظمؒ کا سجیلا دلربا کلیر میں ہے
ہے بہار افزا علاؤ الدین صابرؒ کا جمال   یہ مدینے کا شجر پھولا پھلا کلیر میں ہے
جلوہ گر ہیں کاکیؒ و گنج شکرؒ، سلطان الہندؒ   دہلی و اجمیر کا روشن دِیا کلیر میں ہے

(فیض نسبت، ص: ۲۲۸، ۲۲۹)

مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی رحمۃ اللہ علیہ

پیر سید نصیر الدین نصیرؒ نے تینتیس اشعار کی منقبت (فارسی مثنوی) مولنا رومؒ کی شان میں لکھی ہے۔ جو فیض نسبت کی زینت ہے۔ چند اشعار خاطر نشین ہیں:

پیرِ رُومی آں معارف دست گاہ   خضرِ منزل بہرِ ہر گم کردہ راہ

مرشدِ پاکان و مخدومِ زمن   آں بہ تنہائی ، سراپا انجمن
پیرِ رُومی عکسِ حسنِ مطلق است   اُو دلیلِ حق، دلیلِ اُو حق است
آدمی را آگہی از خویش داد   در نہادِ عبد، طرحِ حق نہاد
خم سرِ اقبال پیشِ فکرِ اُو   وقفِ مستی فطرتش از ذکرِ اُو
چوں ز شعرش مستی و حال آیدم   رشک بر اقبالِ اقبالؒ آیدم
شاد باش اے مظہرِ بابِ علوم   آشنائے رمزِ عشق اے پیرِ رُومؒ
اے جلال الدیںؒ! امیرِ قونیہ   سید العشاق و پیرِ قونیہ
با یزید حجرۂ ایمانیاں   اے جنیدؒ و شبلیؒ روحانیاں
السلام اے مرکزِ فیضانِ عشق   السلام اے نازشِ پاکانِ عشق

(فیض نسبت،ص:۲۱۷،۲۱۸)

خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ کی شان میں ایک رباعی رنگِ نظام کی زینت ہے۔(یہی رباعی آغوشِ حیرت میں بھی شامل ہے)۔

با چرخِ رسید ست دماغ دہلی   پر شد ز شراب اُو ایاغِ دہلی
من بندۂ حضرت نصیر الدینیم   افروختہ پیر من، چراغ دہلی

(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۷۳)

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ

آپؒ کی مدح میں ایک رباعی رنگ نظام میں اور ایک منقبت فیض نسبت میں موجود ہے۔

از مقدم اوست گلستاں ، گلبرگہ
خلدے ست بزیر آسماں، گلبرگہ
آہستہ خرامید بہ گیسوئے درازؒ
شد خطۂ گلبرگہ ، ازاں گلبرگہ

(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۷۳)

خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ کی شان میں دو رباعیات رنگ نظام میں موجود ہیں۔ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہے ہند میں کیا مقامِ اورنگ آباد
ٹھنڈک میرے دل کی نامِ اورنگ آباد

تا گولڑہ و جلال پور از دہلی
کیا خوب چلا نظامِ اورنگ آباد
(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۷۴)

خواجہ فخر الدین فخر جہاں محب النبی دہلویؒ

آپؒ کی مدح میں رنگِ نظام سے ایک رباعی ملاحظہ ہو جو کہ سید نصیر گیلانی کی رباعی کے میدان میں ریاضت، کہنہ مشقی اور ہمہ وقتی اخلاص وانہماک کا عمدہ ثبوت پیش کرتی ہے:

اچھا نہیں خود کو بغض میں کھولانا
ہم ہیں وہی اُولیٰ قدَم و اَولٰنا
ماہتاب زمان و آفتاب دوراں
ہیں فخر الدینؒ فخر جہاں، مولٰنا
(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۷۵)

خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ

خواجۂ خواجگان حضرت قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی چشتی نظامی فخریؒ کی مدح میں ایک رباعی رنگ نظام کی زینت ہے۔ دیکھیے:

تو مفخرِ فخرِ نامدار آمدہ ای
سر خیلِ مشائخِ کبار آمدہ ای
اے گم شدہ در نورِ محمد ز اَزل
اَز لطف بہ خطۂ مہار آمدہ ای
(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۷۵)

خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

قبلۂ عالم حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی چشتی نظامی المعروف حضور پیر پٹھانؒ کی شان میں رباعی ملاحظہ ہو:

ایسا نہ سنا صاحب توقیر پٹھان
ولیوں کا سلیمان و ہمہ گیر پٹھان
تکنا ہو جسے قبلۂ عالم کا جمال
تونسہ میں وہ جا کے دیکھ لے پیر پٹھانؒ
(کلیات نصیر گیلانی،ص:۴۷۶)

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَ جَ شَطْــٴَـهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝۲۹

(سورۃ الفتح ۴۸، آیت ۲۹)

وارث جو ہوئے شاہ سلیمانی کے
تونسہ میں ہیں پیر خواجہٗ اللہ بخشؒ

(کلیات نصیر گیلانی، ص:۴۷۶)

خواجہ شاہ محمود تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ شاہ محمود تونسویؒ چشتی سلیمانی کی شان میں رباعی:

دیدم نہ کسے بشان خواجہ محمودؒ
عالی ست بسے جہان خواجہ محمودؒ
ناز ند بخویش صد ہزاراں چو ایاز
بر نسبت آستانِ خواجہ محمودؒ

(کلیات نصیر گیلانی، ص:۴۷۷)

خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی شان میں سید نصیر گیلانی نے چار مناقب پیش کی ہیں۔جن میں دو مناقب (فارسی غزل، اردو مثنوی) فیض نسبت میں، ایک فارسی رباعی آغوش حیرت میں اور ایک اردو رباعی رنگ نظام میں موجود ہے۔فیض نسبت میں شامل منقبت کے چند اشعار دیکھئے:

اسرارِ طریقت را، وجودت تشریحے — بیدار نگاہاں را، کتابِ عرفانی
دادر دلم از فطرت، نیازِ مقبولاں — اے خواجہ! قبولم کن برائے دربانی
چوں مہر علی جوید ، نصیر از درگاہت — فیضے کہ بہ اُو دادی، ز شاہِ جیلانی

(فیض نسبت، ص: ۲۳۰، ۲۳۱)

خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

سید نصیر گیلانی نے حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ کے وصال کے موقع پر چالیس اشعار پر مشتمل ایک منقبت مثنوی کی ہیئت اور مرثیہ کے آہنگ میں رقم کی ہے۔ جو فیض نسبت کی زینت ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عارفِ حق زُبدۂ اہلِ نظر　آں سپہرِ دینِ محکم را قمر
حیف ، آں سرمایۂ اخیار رخت　ساقیٔ میخانۂ ابرار رفت
دامن دِل ہاز دَردش چاک چاک　در فراقش سینہ ہا اندوہ ناک
خوش نہاد و عمدۃ الاوصاف بود　در صفات ، آئینۂ اسلاف بود
ذات او آئینہ دارِ معرفت　بحرِ ناپیدا کنارِ معرفت
سینہ اش معمور، از یادِ رسولؐ　عاشقِ اصحابؓ و اولادِ رسولؐ
محورِ فکرش، نظامِ مصطفیؐ　در نگاہِ او مقام مصطفیؐ
مثل قِلزم، علم و حلمش بے کراں　بود ہنگامِ سخن، کوثر بیاں
جدّ او قطبِ زمیں، غوثِ زماں　خواجہ شمس العارفینؒ، شمسِ جہاں
آستانش سالکاں را مستقر　گردِ راہش، سرمۂ اہلِ نظر

(فیض نسبت، ص: ۲۳۳)

پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ

کلام نصیر میں پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ کی چھے مناقب موجود ہیں۔ جن میں چار مناقب فیض نسبت میں، ایک رنگ نظام میں اور ایک آغوش حیرت میں شامل ہے۔ فیض نسبت میں شامل چار مناقب علی الترتیب غزل، گیت، مستزاد اور غزل کی ہیئت میں ہیں۔ پہلی منقبت کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

دلوں کے سہارے تو آنکھوں کے تارے مرے پیشوا پیر مہر علیؒ ہیں
خدا ان کو پیارا خدا کو وہ پیارے مرے پیشوا پیر مہر علیؒ ہیں
میسر جسے ہوگئی ان کی نسبت اسے مل گئی مغفرت کی بشارت
خدا کے ولی مصطفیؐ کے دلارے مرے پیشوا پیر مہر علیؒ ہیں

(فیض نسبت، ص: ۲۲۵)

سید غلام محی الدین بابو جی رحمۃ اللہ علیہ

سید غلام محی الدین گیلانی گولڑوی المشہور بابو جی رحمۃ اللہ علیہ، پیر سید نصیر الدین نصیر کے دادا جان تھے۔ آپ نے بابو جی کی مدح میں پانچ مناقب لکھی ہیں جن میں ۴ مناقب فیض نسبت میں شامل ہیں اور ایک منقبت رنگ نظام کی زینت ہے۔ فیض نسبت میں سے منقبت کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یہی زندہ حقیقت ہے، یہی سچ بات بابو جیؒ　ہزاروں وصف ہیں اور اک تمہاری ذات بابو جیؒ

کرم گستر تمہیں ہم پر رہے دن رات بابو جیؒ ہماری لاج ہے اب بھی تمہارے ہاتھ بابو جیؒ
چلیں دشمن نے چالیں اور سب الٹی پڑیں اس کو بھلائی سے بدی کو تم نے دی ہے مات بابو جیؒ
(فیض نسبت، ص:۲۴۵)

مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

سید نصیر الدین نصیرؒ مولانا بریلوی کے علمی کارناموں، تبلیغی خدمات اور شعری تخلیقات کے مداح اور ان کے مقام و مرتبہ کے معترف تھے۔ آپ نے حضرت فاضل بریلویؒ کے دس کلاموں پر تضمینات لکھ کر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ نیز فیض نسبت میں پچیس اشعار پر مشتمل ایک خوبصورت منقبت بھی اعلیٰ حضرت کی مدح میں لکھی۔ اس کے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں:

فخرِ ملت لائقِ صد احترام احمد رضاؒ محتشم، بالغ نظر، عالی مقام احمد رضاؒ
مردِ میداں، فردِ دوراں، فضلِ حق، فیضِ رسول رکنِ دیں، کوہِ یقیں، عنبر مشام احمد رضاؒ
منبعِ فیضانِ سنت، شارحِ اُمُّ الکتاب نازشِ اسلام و آبائے عظام احمد رضاؒ
نجمِ برجِ عشقِ احمد، نیرِ چرخِ ادب آسمانِ علم کے ماہِ تمام احمد رضاؒ
مجتہد، مفتی، مدرس، دیدہ ور، شاعر، ادیب متقی، عالم، فقیہِ نیک نام احمد رضاؒ
نکتہ رس، ناقد، رباعی گو، یمِ فنِ عروض پاک جوہر خوش بیاں شیریں کلام احمد رضاؒ
ہے لقب الشاہ و اعلیٰ حضرت و بحر العلوم ہے رضا اُن کا تخلص اور نام احمد رضاؒ
چھا تیرا گیا ''سلامِ جانِ رحمت'' ہر طرف تیری روحِ پاک پر لاکھوں سلام احمد رضاؒ
طے کیا آخر یہ اربابِ نظر نے اے نصیر ترجمانِ اہلِ سنت ہیں امام احمد رضاؒ
(کلیات نصیر گیلانی، ص:۴۱۶)

سید محمد اسماعیل شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سید محمد اسماعیل شاہ بخاریؒ (کرمانوالہ شریف ضلع اوکاڑہ) کی شان میں ایک فارسی رباعی 'لوح مزار' کے عنوان سے فیض نسبت کی زینت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

از بزمِ فقر، صدرِ طریقت شعار رفت دردا کہ آں سر آمدِ خیلِ کبار رفت
تاریک شد بر اہلِ محبت فضائے دہر واحسرتا! کہ عارفِ شب زندہ دار رفت
دلبندِ مرتضیٰؓ و جگر پارۂ بتولؓ ز آلِ رسولؐ، سیّدِ عالی تبار رفت
آں پاکبازِ معرفت و مقتدائے عصر باحق وصول یافتہ از روزگار رفت
آں جانشین شیر محمدؒ ازیں جہاں آخر بہ قربِ مرشدِ گردوں وقار رفت

جستم نصیر ! چوں سنۂ ارتحالِ شیخ ہاتف زغیب گفت! عبادت گزار رفت

(فیض نسبت،ص:۲۵۸)

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ

سفیر سوز و گداز، حضرت خواجہ غلام فریدؒ (کوٹ مٹھن شریف) کی شان میں فیض نسبت میں ایک منقبت شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شعر گوئی میں جدا ہے طرز اظہار فریدؒ زندگی دیتے ہیں جان و دل کو افکارِ فریدؒ
تاجداروں کو وہ خاطر میں کبھی لاتا نہیں کس قدر دل کا غنی ہے، کفش بردارِ فریدؒ
غوث اعظمؒ کے حوالے سے نصیر آیا ہے آج در سے پھیریں گے نہ خالی اس کو، سرکارِ فیدؒ

(فیض نسبت،ص:۲۵۵)

حافظ مظہر الدین مظہرؒ

کلام نصیر میں دو فارسی مناقب حافظ مظہر الدین مظہرؒ کی یاد میں عرشِ ناز میں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مظہرالدیں ، نعت گوئے نامور محرم رمزِ سخن، عالی نظر
کرد بالا در ادب معیارِ نعت اشک ہایش غازۂ رُخسارِ نعت
داشت کیفِ نعت خوانی مستقل نعرہ زن با درد مندی ہائے دل
دامنش از اشکہا ہموارہ تر ذِکر و فکرش مدحتِ خیرالبشر
در نگاہِ اُو جمالِ مصطفیٰ ذہنِ اُو محوِ خیالِ مصطفیٰ
شاد ماں اندر ثنائے شاہِ دیں بود مقصودش رضائے شاہِ دیں
داشت عجز و انکسارِ بر ملا با غلامانِ رسولِ مجتبیٰ
ربط با رومی و جامی بیش داشت مدحتِ محبوبِ داور، کیش داشت
بود مظہر بلبلِ بستانِ عشق ہر سہ دیوانش بہ نعت ایمانِ عشق
نامِ اُو لافانی از آثارِ نعت چہرہ اش تابندہ از انوارِ نعت
السلام اے آستاں بوسِ رسول السلام اے واردِ بابِ قبول

(کلیاتِ نصیر گیلانی،ص:۱۱۲۱)

□□□

شہر یار کی منقبت نگاری

ڈاکٹر نوید احمد گل

ABSTRACT: Shahryar (1909-1988), known for his profound poetic expression, seamlessly blends traditional and modern elements in his poetry. This article explores the uniqueness of style and theme of Shahryar's Manqabat Nigari. By analyzing selected examples of Manaqib (along with their Urdu translation), this study focuses on his literary techniques, use of metaphors, comprehensive imagery as well as intellectual, devotional and emotional depth. It will highlight how Shahryar pays tribute to revered personalities while addressing their spiritual themes.

Note: Muhammad Hussain Tehrani was a friend of Shehryar. On page 726 of Dewan-e-Shahryar, there is a poem titled "Marhaba Hussain" is actually about him instead of Hazrat Imam Hussain Aali Maqam Alayh-es-salam.

منقبت کیا ہوتی ہے؟ یہ بتانا قدرے مشکل ہے۔ آسانی کی خاطر یہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے کہ منقبت کیا نہیں ہوتی ہے۔ منقبت حمد و نعت نہیں ہوتی۔ منقبت میں ذاتِ باری تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ایسی ہستی کی شعروں میں تعریف کی جاتی ہے جو دینی لحاظ سے محسن ہوتی ہے۔ منقبت قصیدہ نہیں ہوتی چونکہ اس میں ہیئت کے اعتبار سے اجزائے قصیدہ کا پورا کرنا اور اسلوب میں شوکتِ الفاظ کا درلانا ضروری نہیں ہوتا۔ منقبت مرثیہ نہیں ہوتی کہ یہ زندہ شخصیت کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور اس شخصیت کے روبرو پڑھی جا سکتی ہے۔ منقبت غزل نہیں ہوتی کہ اس میں ممدوح کے ساتھ ذاتی محبوب والی بے تکلفی نہیں ہوتی۔ منقبت میں خودسپردگی اور عقیدت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ

منقبت مناجات سے کسی قدر بلند آہنگ ایسی صنفِ سخن ہے جسے سازوں کے ساتھ گا کر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔منقبت نگاری کی اس سادہ اور مختصر سی تعریف وتحدید کے بعد یہاں سید محمد حسین بہجت شہر یآر کی منقبت نگاری کا ایک تحقیقی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایران کی نئی نسل کی خلوت وجلوت میں جو شاعر برابر کا شریک ہے وہ شہر یآر ہے اور آج بھی ایران کے طالب علم اس کے شعروں کو گنگناتے اور اپنی نہایت نجی محفلوں میں گاتے، سناتے نظر آتے ہیں۔ استاد سیّد محمد حسین بہجت شہر یآر(1988ء- 1906ء) ایران کے صوبہ تبریز کے ایک گاؤں آذر بائیجان کے ایک محلہ سادات خشکناب میں پیدا ہوئے۔(محمدی، از بہار تا شہر یآر،ص 654- 653) ابتدائی تعلیم اسی شہر سے حاصل کی اور ایم۔ بی۔ ایس کے لیے تہران میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ ڈاکٹر بنتے بنتے مریض اور شاعر بھی بن گئے۔(علی زھری، مقدمۂ دیوانِ شہر یآر،ص39)

ایران کے انقلاب کے بعد بیسویں صدی عیسوی کے ربعِ آخر میں تعدادِ اشعار کے لحاظ سے شہر یآر کو فارسی زبان کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے۔(علی دہقان، مقدمہ دیوانِ شہر یآر،ص 42) شہر یآر کا اصل میدان تو غزل ہے مگر عرفانی شاعری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ اس لیے اہلِ ایران شہر یآر کو ’’شاعرِ عرفان بخش‘‘، ’’شاہ سوارِ میدانِ توحید‘‘ اور’’ طالبانِ معرفت الٰہی کے دل کی روشنی‘‘ قرار دیتے ہیں۔(سخن ناشر، مقدمۂ دیوانِ شہر یار،ص ۱۹) شہر یآر نے ہر صنفِ سخن میں بھرپور طبع آزمائی کی ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے غزل اور موضوع کے لحاظ سے اسے صوفیانہ رنگ بہت پسند ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ مثنوی، قصیدہ، دو بیتی، قطعہ، رباعی، سب اس کے دیوان میں مل جاتے ہیں۔شہر یآر نے حمد و نعت اور منقبت کے لیے ترجیحی طور پر غزل، مثنوی اور رباعی کا التزام کیا ہے۔

منقبت نگاری کے لیے حفظِ مراتب کی ترتیب مناسب سمجھی جاتی ہے لہٰذا شہر یآر کے لیے بھی یہی ترتیب روا رکھی گئی ہے۔اس میں بالترتیب حضرت علی، حضرت مخدومہ کائنات، حضرت امام حسین عالی مقام، شہنشاہِ وفا حضرت عباس علم دار، حضرت بلال اور حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی شامل ہے۔منقبت نگاری کے لحاظ سے کُلی طور پر بیت کی تعداد کا تعین کرنے کے لیے ’’دیوانِ شہر یار‘‘(شہر یار، دیوانِ شہر یار،ص ۱۲۲۵-۱) ، جو اس تحقیق کا بنیادی ماخذ ہے، سے ایک شماریاتی جدول پیش خدمت ہے:

نمبر	شخصیت	صفحہ نمبر	بیت در منقبت	صنفِ شعری
۱۔	حضرت علی (کرم اللہ وجہہ الکریم)	۹۸	۱۔۱۲	غزل
۲۔		۶۱۶-۶۱۵	۱۔۲۸	مثنوی

		۱۰۴۵	۱۔۷	مثنوی
		۱۰۵۰	۱۔۳	قطعہ
		۱۰۵۱	۱۔۳	قطعہ
		۱۰۶۵	۱۔۳۷	مثنوی
		۱۱۱۲۔۱۱۱۴	۱۔۲۶ (۱۴بند)	نظمِ معریٰ
		۱۱۳۷۔۱۱۵۵	۱۔۱۵۵	غزل
		۱۱۶۱	۱۔۲ (رباعی نمبر ۴)	رباعی
		۱۱۷۷	۳ = ۶ تا ۸	قطعہ
۲۔	حضرت مخدومہ کائنات (سلام اللہ علیہا)	۱۰۰۹	۱۔۱۳	قطعہ
۳۔	حضرت امام عالی مقام (علیہ السلام)	۹۸۔۹۹	۱۔۱۹	غزل
		۹۱۹	۱۔۸	غزل
		۹۵۵	۱۔۹	غزل
		۹۵۵۔۹۵۶	۱۸=۳۷تا۱۷	غزل
۴۔	حضرت عباس علمدار (علیہ السلام)	۹۵۵	۷=۳۱۶تا۱۰	غزل
۵۔	سیّدنا حضرت بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)	۴۰۹۔۴۱۱	۵۳=۳۶۷تا۱۵	مثنوی
۶۔	حضرت مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ)	۴۱۵۔۵۲۱	۱۔۱۲۳	مثنوی

منقبت کے حوالے سے مجموعی طور پر شہر یؔار کے دیوان میں ۵۴۸ (پانسواڑتالیس) اشعار ملتے ہیں (ایضاً، جا بجا)۔ اب ان شخصیات کے لحاظ سے شہر یؔار کی منقبت نگاری پر فکر اور فن کے حوالہ سے مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۴۰ھ)

حضرت علی کی شان میں شہر یؔار کے ہاں دوسو چھہتر (276) اشعار ملتے ہیں۔ شہر یؔار نے حضرت علی کے بارے میں دو راتوں کا بڑے افسانوی انداز میں بہت خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کلام میں شہر یؔار کے بقول رات کو حضرت علی سے اور حضرت علی کو رات سے ایک خصوصی موانست تھی۔ پہلی رات، شبِ ضربت وشہادت ہے اور دوسری رات، شبِ ہجرت ہے۔ یہاں رات حضرت علی سے اور حضرت علی رات سے تبادلۂ راز و نیاز کرتے نظر آتے ہیں۔ شبِ ہجرت کے حوالے سے شہر یؔار نے

نقل کو اصل کے عین مطابق قرار دیا ہے (ایضاً، ص 1050)۔ جبکہ شبِ ضربت کے بارے میں شہر یار یہ کہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ حضرت علی مسجدِ کوفہ میں اذانِ فجر کے لیے انتہائی اوّل وقت میں پہنچ جاتے ہیں، مسجد میں سوئے پڑے اپنے قاتل کو خود ہی جگاتے ہیں، اسے میٹھا اور گرم دودھ پیش کرتے ہیں اور پھر آخر میں اس کا پردہ بھی رکھتے ہیں۔ یا علی! یہ صرف آپ ہی کر سکتے ہیں (ایضاً، ص 615)۔

پیشوائی که ز شوقِ دیدار
می کند قاتلِ خود را بیدار (ایضاً، ص 616)

(آپ ایک ایسے امام ہیں جو دیدار کے شوق میں اپنے قاتل کو خود بیدار کرتے ہیں۔)

چه امیری که همان قاتلِ اوست
تو خدایی مگر ای دشمن دوست (ایضاً)

(آپ کیسے امیر المومنین ہیں کہ جو اپنے قاتل سے ہی دوستی نبھا رہے ہیں؟ یہ تو خدائی صفت ہے۔)

شب روان مست ولایی تو علی
جانِ عالم بفدایی تو علی (ایضاً)

(راتوں کو جاگنے والے سب آپ کی محبت میں مست ہیں۔ یا علی! اہلِ دنیا کی روح آپ پر فدا!)۔

یوں یہ ساری نظم تشخیص، خود کلامی اور دشمن دوست جیسے قولِ محال کو اپنے دامن میں لیے ہوئے محوِ خرام نظر آتی ہے۔

شہر یار کی منقبت نگاری میں حضرت علی کے لیے بے مثالیت کا رنگ غالب ہے۔ (ایضاً، ص 145) اس کے علاوہ ہر نظم کے آخر میں شہر یار اپنی طرف سے استغاثہ بھی پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (ایضاً، ص 1051) حضرت علی قاضی شُریح کو ایک عبرت ناک خطاب کرتے ہیں (ایضاً، ص 1066 - 1065) نیز از سما تا سمک حضرت علی کے علم و اختیار میں ہے۔ (ایضاً، ص 1114 - 1112) اس کے بعد حضرت علی کے عربی دیوان سے مختلف اشعار کی فارسی میں منظوم تشریح پیش کی ہے جس میں از خود کلامی کا بلند آہنگ خطابیہ رنگ پایا جاتا ہے۔ تضمین، مثالی اسوہ قرار دینا اور پھر یوں منظوم ترجمہ و تشریح پیش کرنا بھی توصیف و منقبت کی ہی مختلف شکلیں ہیں، اس لحاظ سے شہر یار نے ایک سو پچپن (155) اشعار منظوم کیے ہیں۔ (ایضاً، ص 1150 - 1137) حضرت علی ہی دنیا اور آخرت میں ہمارا آسرا ہیں۔ (ایضاً، ص 117)

مثال کے لیے چند شعر مع ترجمہ پیش کیے جاتے ہیں فنی نکات ترجمے کے ساتھ ساتھ درج کیے گئے ہیں:

علی ای ہمای رحمت تو چہ آیتی خدا را
کہ بہ ما سوا فگندی ہمہ سایۂ ہما را (ایضاً،ص ۹۸)

(یا علی آپ ایسے ہمائے رحمت اور حجتہ اللہ ہیں کہ آپ کی بدولت آپ خود اور باقی جملہ مخلوق اللہ جل جلالہ کے سائے کے علاوہ ہر طرح کے سائے سے محفوظ ہوگئی ہے)۔''ہمائے رحمت اور'' آیتِ خدا'' القاب ہیں اور ساتھ ساتھ استعارے بھی۔

دل اگر خداشناسی ہمہ در رخِ علی بین
بہ علی شناختم من بخدا قسم خدا را (ایضاً)

(اگر اللہ جل جلالہ نے تجھے ایک خدا شناس دل دیا ہے تو حضرت علی کے چہرے میں تجھے ہر چیز نظر آئے گی خدا کی قسم میں نے تو خدا کو بھی علی ہی کے چہرے سے پہچانا ہے)۔کلمہ ''خدا'' اور ''علی'' کی تکرار ''س'' اور ''ش'' کی تکرار شعر کو موسیقی کے حوالے سے بڑا حیرت انگیز بناتی ہے۔

بخدا کہ در دو عالم اثر از فنا نماند
چو علی گرفتہ باشد سرِ چشمۂ بقا را (ایضاً)

(خدا کی قسم جب سے چشمۂ بقا کا تصرف حضرت علی کے ہاتھوں میں آیا ہے تو دونوں جہانوں سے فنا کا نام و نشان مٹ گیا ہے)۔''فنا'' اور ''بقا'' کے حوالے سے صنعتِ تضاد کا التزام نہایت اثر آفرین ہے۔

مگر اے سحابِ رحمت تو بباری ار نہ دوزخ
بہ شرار قہر سوزد ہمہ جانِ ماسوا را (ایضاً)

(یا علی! آپ کی رحمت کا بادل صرف دوزخ پر نہیں برسا اور وہاں کے ماحول میں آپ کے غضب نے سوائے اللہ جل جلالہ کے باقی ہر شے کو جلا دیا ہے)۔''شرارِ قہر'' اور'' سحابِ رحمت'' کلمات بھی ہیں اور استعارے بھی۔

برو ای گدای مسکین درِ خانۂ علی زن
کہ نگینِ پادشاہی دہد از کرم گدا را (ایضاً)

(اے مسکین گدا! حضرت علی کے دروازے پر جا جو اپنے مانگنے والے کو بادشاہ بنا دینے والی انگوٹھی بھی دے دیتے ہیں)۔ یہاں ''گدا'' ایک اچھا استعارہ ہے ''ک'' اور ''گ'' کی تکرار بھی شنیدنی ہے۔

بجز از علی کہ گوید بہ پسر کہ قاتلِ من
چو اسیرِ تُست اکنون بہ اسیر کن مدارا (ایضاً)

(سوائے حضرت علی کے یہ بات اپنے بیٹے سے اپنے قاتل کے لیے کون کہہ سکتا ہے کہ بیٹا اب یہ تیرا

قیدی ہے اور قیدی سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔)

بجز از علی کہ آرد پسری ابوالعجائب
کہ علم کند بعالم شہدای کربلا را (ایضاً)

(حضرت علی کے علاوہ ایسے غیر معمولی بیٹے کس کے ہو سکتے ہیں کہ جنھوں نے پوری دنیا میں اپنی شہادت کے (شہدائے کربلا) جھنڈے گاڑ دیے ہوں)۔علی،علم اور عالم بھی ایک اچھا تاثر پیدا کر رہے ہیں۔

چو بدوست عہد بندد زمیان پاکبازاں
چو علی کہ می تواند کہ بسر بُرَد وفا را (ایضاً)

(جب تم اپنے کسی دوست سے شرفا کی طرح کوئی معاہدہ کرلو تو پھر حضرت علی کی طرح اسے وفا کرنا بھی سیکھو!)۔تشخیص،تشبیہ اور استعارہ اپنا رنگ دکھا رہے ہیں۔

نہ خدا توانمش خواند نہ بشر توانمش گفت
متحیرم چہ نامم شہِ ملک لافتیٰ را (ایضاً)

(حضرت علی آپ کو نا بشر کہا جا سکتا ہے اور نہ خدا! میں حیرت میں گم ہوں کہ ملکِ لافتی کے بادشاہ کو میں کس نام سے پکاروں!)۔صنعتِ تکرار اور تلمیح اپنا اپنا رنگ دکھا رہی ہیں۔

بدو چشمِ خونفشانم ھلہ ای! نسیمِ رحمت
کہ ز کوی او غباری بمن آر، توتیا را (ایضاً)

(اے نسیمِ رحمت! ذرا میری مدد کرنا اور ذرا میری اِن دو خون بہاتی آنکھوں کے لیے حضرت علی کی گلیوں کی دھول کو اٹھا لانا، تا کہ میں اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا سکوں)۔تشخیص اور تشبیہ دونوں کا رنگ واضح دکھائی دیتا ہے۔

بامید آنکہ شاید برسد بخاک پایت
چہ پیامہا سپردم ھمہ سوزِ دل صبا را (ایضاً)

(میں (شہریاؔر) نے پورے یقین اور امید سے اپنے پورے سوزِ دل سے صبا کے ہاتھوں بڑے پیام بھیجے ہیں کہ وہ مجھے آپ کے قدموں کی دھول تک ہی پہنچا دے)۔تشخیص اور استغاثہ دست در دست محوِ خرام دکھائی دیتے ہیں۔

چو تویی قضای گردان بدعای مستمندان
کہ ز جانِ ما بگردان رہِ آفتِ قضا را (ایضاً)

(آئی قضا کو سوائے تیرے کوئی نہیں ٹال سکتا اور محتاجوں کی دعا یہی ہے یا علی! کہ ہماری روح کو موت آ

رہی ہے، خدارا اس آفت کو ہم سے ٹال دیجیے)۔کلمۂ ’’قضا‘‘ استعارہ ہے، الف، ن اور بائے مصوت کی تکرار بڑا بھلا تاثر قائم کر رہی ہے۔

شہر یارؔ کے استغاثہ کا ایک اور رنگ ملاحظہ کیجیے:

درگہِ شاہِ ولایت، آنکہ زان بر تر ندیدم
درھمہ دربارِ سلطانِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، آستانی (ایضاً،ص۱۰۵۱)

(میں نے ولایت کے بادشاہ حضرت علی کی درگاہ سے بڑی اور کوئی درگاہ نہیں دیکھی اور سلطان نبوت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑا کوئی آستانہ نہیں دیکھا۔)

قدسیانِ بر صفہ والای آن درگاہ صَفوَت
روز و شب از مطبخ قدوسیان گسترده خوانی (ایضاً)

(کہ جس کی درگاہِ صفوت (خالص) پر فرشتے اصحابِ صفہ کی طرح صبح وشام باورچی خانے کے ساتھ اپنا اپنا کپڑا بچھائے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔)

من سگی ولگردم و ایستاده ام با گردنِ کج
بوکز آن مطبخ سرا بر سر زنندم استخوانی (ایضاً)

(میں بھی ان کا ہی ایک آوارہ کتا ہوں اور اپنی گردن کو جھکائے ان کے در پر کھڑا ہوں، ہوسکتا ہے کہ اس باورچی خانے کے اندر سے کوئی ہڈی چوس کر پھینکے اور وہ ہڈی میرے سر پر آن لگے)۔ استعارات اور تلمیحات کا ایک حسین امتزاج ہے اور شہر یارؔ نے اپنے لیے سگِ ولگرد اور با گردن کج سے جو محاکات بنائی ہے وہ بڑی اثر انگیز ہے۔

مولا علی کی بارگاہ میں اس قدر احساسِ عجز کا اظہار شہر یارؔ کی عظمت پر دال ہے۔شہر یارؔ نے مولا علی کی شان میں جس انداز سے منقبت نگاری کی ہے وہ ان کی وِلائے علوی کے ساتھ ساتھ کیفیاتِ قلبی کی بھی غماز دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد شہر یارؔ مخدومہ کائنات کی بارگاہ میں اپنی حاضری پیش کرتے ہیں۔

سیّدہ مخدومہ کائنات سلام اللہ علیہا (۱۱ھ)

شہر یارؔ نے حضرت مخدومہ کائنات کی بارگاہ بے کس پناہ میں بھی اپنی حاضری پیش کی ہے۔ یہاں وہ اپنے بیان اور زبان کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ یہ شایانِ شان ہے، لہٰذا حضرت علی کی زبانِ مبارک سے اس گفتگو کا آغاز کرتے ہیں شہر یارؔ نے یہاں یہ ماحول بنایا ہے کہ شانِ نزول آیت ’’ھل اَتیٰ‘‘ مجھے حضرت علی نے کچھ یوں ارشاد فرمائی ہے:

همسرم فاطمه ای شاهِ زنانِ عالم
ای بنای حَرَمِ قدس تُرا کعبه حریم (ایضاً،ص۱۰۰۹)

(اے میری بیوی فاطمہ تو پوری دنیا کی عورتوں کی سردار ہے اور تیرا گھر حریمِ کعبہ کے لیے حرمِ قدس ہے)۔ یہاں استعارہ ہے۔

دست پروردۂ سیمرغِ رسالت کہ تُراست
قاف حرمت قرقِ غیرتِ قرآنِ کریم (ایضاً)

(آپ سکو رسول پاک ﷺ نے پالا ہے اور آپ سکے گھر کی چار دیواری کو قران کریم کی زُمردیں غیرت اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے)۔ یہاں استعارہ ہے اور ایسی بلند پایہ ترکیبِ مبالغہ ہے کہ حقیقت کی گردِ کفِ پا کو نہیں چھوسکتی!۔

جلوۂ خالقِ اعظم ننماید بخلق
مگر از غرفۂ ''انک لعلی خلقِ عظیم'' (ایضاً)

(خالق اعظم کا جلوہ دنیا کو دکھائی نہ دیتا اگر سورۃ القلم کی آیت کے مطابق یہ نازل نہ ہوتا کہ ''بے شک تمھاری بیوی فاطمہ س خوب بڑی شان والی ہے؛ سورۃ القلم:۴)۔ تلمیح ہے اور ''ق''، ''ک'' کی تکرار بڑا خوبصورت صوتی آہنگ پیدا کر رہی ہے۔

طفلی از کوچہ ندا داد و 'ولا تقھر' خواند
نکند کآمدہ باشد بدرِ خانہ یتیم (ایضاً)

(جب ایک بچے نے گلی سے آواز لگائی کہ ''ولا تقھر'' (تمھارے لیے کوئی سختی نہیں ہے) تو یہ خیال مت کیجیے کہ گھر کے دروازہ پر کوئی یتیم آیا ہوگا)۔ تلمیح ہے اور محاکات ہے۔

از کجا کاین نہ فرستادہ حق جبریل است
تا کہ را آیتی از رحمتِ رحمن رحیم (ایضاً)

(یہ کوئی مانگنے والا نہیں بلکہ اللہ ﷻ کی طرف سے بھیجا ہوا جبرائیل ہے یہ رحمٰن اور رحیم کی کونسی نشانی ہے)۔ صنعتِ تلمیح ہے۔

بمکافاتِ کریمانِ جہان دانی چیست
وعدہ روز جزا دولت جنات نعیم (ایضاً)

(کریم لوگوں کے عمل کا دنیا میں بدلہ کیا ہے کہ روزِ جزا انھیں جنت نصیب ہوگی)۔ تلمیح ہے اور محاکات ہے۔

غرفۂ حور و لبِ حوض و حیاتِ جاوید
کہ حرام است باین جیفہ پرستانِ لئیم (ایضاً)

(یہ ہمیشہ کی زندگی، حوضِ کوثر کا پانی اور حوروں والا گھر یہ سب، فالتو پالتو کمینوں کے لیے نہیں!)۔تعریض اور مراۃ النظیر ہے۔

این علی بود کہ میگفت ببین تا زھرا
ھنرش چیست زھی ھمت آلِ حامیم (ایضاً)

(حضرت علیؑ نے فرمایا اور بی بی پاک سلام اللہ علیہا نے بھی یہی کہا ہے کہ سام بن نوح کی اولاد کی بلند ہمتی کا یہی ہنر ہے)۔تلمیحِ غریب ہے۔

علی ای صاحبِ شمشیر و لوای توحید
ای باسلامِ تو ایمانِ دو عالم تسلیم (ایضاً)

(اے علی آپ، لوائے توحید کے مالک ہیں اور صاحبِ ذوالفقار ہیں اور آپ ہی کے اسلام لانے سے دونوں جہانوں کا ایمان سلامت ہے)۔صنعتِ تلمیح اور استعارہ بھی ہے۔

آن یتیم از در این خانہ قدم وانھاد
تانشد شام عزیزانِ تو با وی تقدیم (ایضاً)

(ابھی اس یتیم نے اپنا پاؤں اس گھر سے باہر نہیں نکالا تھا کہ کہیں تمھارے پیارے شام کا کھانا اس سے پہلے نہ کھالیں)۔صنعتِ ترادف ہے۔

شیرزادانِ علی شام ندارند امشب
تایتیم این ھمہ بی شام نہ خسپد بہ گلیم (ایضاً)

(علی کے شیر زادوں نے آج بھی شام کو کھانا نہیں کھایا تا کہ یہ سب یتیم اپنے کمبل میں کہیں آج بھوکے نہ سوجائیں)۔تلمیح ہے۔

شامِ خود کس نتواند بہ فقیران دادن
زھی آن مکتبِ اسلام کہ اینش تعلیم (ایضاً)

(اپنی افطاری کا کھانا کوئی مانگنے والوں کو دیتا ہے اسلام کی کیا سعادت ہے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔)

ھل اتی نازلِ دد شانِ بتولِ عذراست
مرحبا مھبطِ تنزیلِ خداوندِ حکیم (ایضاً)

(''ھل اتی'' کی آیت کی وجہِ شان نزول بی بی پاکس کا یہی عمل ہے اے میرے حکمت والے اللہ ایسی تنزیل پر تیرا شکریہ!)۔تلمیح ہے۔

مجموعی مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کے بقول اگر مجھے تاجدارِ''ھل اَتی'' کہا جاتا ہے تو اس کی واحد وجہ حضرت مخدومہ کائنات کی ذاتِ اقدس ہے۔

حضرت امام حسین عالی مقام (۶۱ھ)

شہریؔار امام عالی مقام کی بارگاہِ عالی میں اپنی گہری عقیدتوں اور شبنمی یادوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ شہریؔار نے امام عالی مقام کی شان میں جا بجا قریباً اڑسٹھ (68) بیت منظوم کیے ہیں (شہریؔار، دیوانِ شہریؔار،ص 99-۹۸،۲۶،۷،۹۱۹،۹۵۶-۹۵۵)۔شہریؔار کے بقول امام حسین عالی مقام کے ہر انداز سے واضح ہوتا ہے کہ وہ پیش آنے والی ہر صورت حال اور مقام سے مکمل آگاہ تھے۔وہ معنیٔ ذبحِ عظیم کا مصداق بننے کے لیے ہر کام اور ہر مرحلے کو بڑی خوش دلی اور خوشنودی سے طے کر رہے تھے اور دشمنوں کے جانوروں تک کو پانی پلا رہے تھے۔

می برد در کربلا ھفتاد و دو ذبحِ عظیم
بیش از این ھا حرمت کوی منا دارد حسین (ایضاً،ص 98)

(اے امام عالی مقام جب آپ اپنے بہتر (۷۲) ساتھیوں کو کربلا میں آئینہ ذبحِ عظیم کی عملی تفسیر پیش کرنے کے لیے لے گئے تو کربلا کو منا پر فضیلت حاصل ہوگئی)۔تلمیحات ہیں اور اسلوب معادلہ ہے۔

بسکہ محمل ھا رَوَد منزل بمنزل باشتاب
کس نمیداند عروسی یا عزادارد حسین (ایضاً،ص۹۹)

(امام عالی مقام اپنے محملوں کو جس تیزی سے لے کر گئے ہیں اس سے نہیں پتا چلتا کہ یہ کوئی سوگواری ہے یا شادی ہے)۔''عروسی'' اور ''عزاداری'' میں صنعتِ تضاد ہے۔

سیرتِ آلِ علی با سرنوشتِ کربلا است
ہر زمان از ما، یکی صورت نما دارد حسین (ایضاً)

(امام عالی مقام یعنی حضرت علی کی آلِ پاک نے اپنے کردار سے کربلا کو جو سعادت بخشی ہے وہ ہر دور میں ہر انسان کے لیے ایک آئینہ ہے)۔''صورت نما'' اچھا استعارہ ہے۔

آبِ خود با دشمنانِ تشنہ قسمت می کند
عزت و آزادگی بین تا کجا دارد حسین (ایضاً)

(امام علی مقام نے اپنے دشمنوں کو اپنا پانی پیش کر دیا، ان کے یہاں عزت دینے کا کیا معیار ہوگا)۔ ''تا کجا'' کی حد کا تعین کون کر سکتا ہے؟۔

دست آخر کز ہمہ بیگانہ شد دیدم ہنوز
با دمِ خنجر نگاہی آشنا دارد حسین (ایضاً)

(میں (شہریار) نے ابھی تک سب کے ہاتھوں کو ایسے خنجر سے بیگانہ دیکھا ہے لیکن حضرت امام عالی مقام کی نگاہ اس خنجر کی دھار سے کس قدر آشنا نکلی!!!)۔(''نگاہ'' اور ''خنجر'' کی دھار میں یکسانی ہے۔)

اس کے بعد منقبت نگاری میں معنوی طور پر مرثیہ اور نوحہ کا رنگ غالب ہے۔ امام عالی مقام کے غم نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے مثلاً:

اگر چراغِ حسینی بخیمہ شد خاموش
فراغ از دو جہاں داشت با فروغِ خدا
منور است مساجد بہ چلچراغِ حسین
خدای را چہ فروغی است درفراغِ حسین (ایضاً، ص۹۱۹)

(اگرچہ خیمۂ حسینی کے چراغ گُل کروا دیے گئے ہیں مگر مسجدوں کے فانوس اُنھی سے روشن ہیں۔ دونوں جہان اللہ جل جلالہ کی وجہ سے روشن ہیں مگر امام حسین کی جدائی (شہادت) سے وہی روشنی دوبارہ اللہ جل جلالہ کی ذات میں جاجذب ہوئی ہے)۔(تجنیسِ محرف، تضاد اور مجازِ مرسل ہے۔)

شہریار نے اپنے کلام میں ایک طویل نظم ''حماسۂ حسینی'' کے نام سے شامل کی ہے:

چو بر حسین بگریی بحشر خندانی
ہر آن دو دیدہ کہ نگریست سخت مغبون شد (ایضاً، ص۹۵۵)

(جب آپ حضرت حسین عالی مقام کے لیے روتے ہیں تو آپ حشر کو مسکرائیں گے۔ اور ہر وہ شخص جو نہیں رویا وہ کوئی پتھر دل ہے)۔(صنعتِ تضاد اور مجازِ مرسل ہے۔)

چہ آتشی است کہ می جوشد اشک ھا گویی
کہ چشمھا ھمہ کارون و سینہ کانون شد (ایضاً)

(امام عالی مقام کے غم نے پتا نہیں کون سی آگ لگا دی ہے کہ ہر آنکھ سے کچھ اس طرح آنسو جاری ہیں کہ گویا ہر انسان کا دل ایک چولہا ہے جبکہ آنکھوں کی پتلیاں مرغابی بنی ہوئی ہیں)۔(تشخیص، غرابت اور پُرزور استعارہ ہے۔)

چہ نوحہ داشت سرِ نعشِ نوجوان حسین
ھزار حیف کہ لیلا ز غصّہ مجنون شد (ایضاً)

(سب نوجوان حضرت امام عالی مقام کی لاش پر کچھ اس شدت سے نوحہ گزار ہیں کہ حضرت بی بی لیلیٰ سغم سے نڈھال ہو کر غش کھائے جاتی ہیں)۔(لیلیٰ اور مجنوں اسم معرفہ بھی ہیں اور متضاد بھی، یہ شعر ایہام اور تلمیح میں ڈوبا ہوا ہے۔)

به سوز و سازِ ربابِ شکسته دل پُرسم
که شیر خواره، بخون غرقه از چه قانون شد (ایضاً)

(میں حضرت بی بی رباب سے پوچھتا ہوں کہ ایک شیر خوار کو خون میں نہلا دینا ،کہاں کا قانون ہے !!!)۔(ایہام، تلمیح اور مراۃ النظیر ہے۔)

یزید جلوۂ کارِ حسین میپوشید
ز زینبس است که این جلوه روز افزون شد (ایضاً)

(یزید حضرت امام عالی مقامؓ کے کارنامہ کو چھپا دینا چاہتا تھا یہ فقط بی بی زینبس ہیں جن کی وجہ سے یہ کارنامہ ہر روز نئی سے نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے)۔(صنعتِ تلمیح اور تضاد ہے۔)

حماسه ایست حسین از حماسه ها مافوق
هر آن حماسه که در وی رسید مادون شد (ایضاً)

(حضرت امام عالی مقام کا حماسہ باقی دنیا کی تمام حماسوں سے نرالا ہے کہ اس حماسہ کے اندر پہنچ کر انسان اپنے آپ کو فروتر کر لیتا ہے)۔(صنعتِ تکرار ہے۔)

تو شاهِ دین چه جهادی براهِ دین کردی
که مکه هم بتو ماهِ مدینه مدیون شد (ایضاً،ص۹۵۶)

(اے ماہِ مدینہ (امام حسین) آپ شاہِ دین ہیں اور آپ نے دین کے راستے میں ایسا جہاد کیا ہے کہ مدینہ تو پہلے ہی آپ کا تھا مگر نورِ اسلام کے حوالہ سے مکہ بھی آپ ہی کا مقروض ہو گیا)۔(تجنیسِ صوتی اور اور حرف ’’م‘‘ کی تکرار ہے۔)

خوشا بحالِ شما ای فدائیانِ حسین
که دین بخونِ شما ها رہین و مرهون شد (ایضاً)

(اے امام عالی مقام کے فدائیوں اللہ تمھیں خوش رکھے، دین اسلام تمھارا مقروض ہے)۔(حرف ’’ن‘‘ کی تکرار ہے۔)

چو نیک مینگری زنده این شهید انند
وگرنه هر بشری زاد و مُرد و مدفون شد (ایضاً)

(اے انسان جب تو ان شہیدوں کو بالکل زندہ سمجھے گا تو پھر تجھے ان کی زندگی صحیح سمجھ میں آئے گی ورنہ ہر شخص پیدا ہوتا ہے، مرتا ہے اور دفن ہوتا ہے)۔تضاد اور حرف ''د'' کی تکرار ہے۔

یزید نخلۂ اسلام ریشہ کن میخواست
حسین بود کہ دین زندہ تا باکنون شد (ایضاً)

(یزید تو اسلام کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا یہ فقط حسین ہی تھا جس کی وجہ سے یہ آج تک زندہ ہے)۔شہریآر کے تمام شعر امام عالی مقام کے لیے ایک ہدیہ، نذرانہ اور صلوۃ وسلام ہیں۔

''مرحبا حسین'' کے عنوان سے کلام شہریآر میں ایک چودہ (14) اشعار کی نظم شامل ہے اور تو اور تلازمات بھی کربلا والے ہیں مگر یہ نظم حضرت امام حسین عالی مقام کے بجائے شہریآر کے ایک دوست کے لیے ہے جس کا نام بھی حسین تہرانی تھا لہٰذا اِس نظم کو منقبتِ امام حسین میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔(ایضاً،ص 726)

حضرت عباس علم مدار (61ھ)

شہرآیار نے حضرت عباس علم مدار کے لیے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ بھائی تھا اور غلام بن کے رہا۔شہرآیار نے علاحدہ سے حضرت عباس کے بارے میں کوئی شعر نہیں کہا البتہ ''حماسہ حسینی'' (ایضاً،ص ۹۵۵) میں حضرت عباس کے بارے میں بڑے خاص اشعار ہیں۔ تعداد میں یہ سات اشعار ہیں اور ان کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت امام عالی مقام حضرت عباس علم دار کو یزیدی فوج کے پاس بھیجتے ہیں کہ ایک رات کی مہلت طلب کر لی جائے۔شہریآر اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

چہ عالمی ست کہ از بہرِ مہلتِ یکشب
شبیہ شیرِ خدا نزدِ روبہی دون شد (ایضاً،ص ۹۵۵)

(وہ کیا عالم ہوگا جب صرف ایک رات کی مہلت لینے کے لیے حضرت عباس جو شبیہ شیرِ خدا تھے کو کمینی لومڑیوں کے پاس جانا پڑا)۔استعارہ ہے۔

گرفت مہلت و برگشت رو بخیمۂ شاہ
بہ خاکبوسی آن خرگہِ ہمایون شد (ایضاً)

(اور جب مہلت مل گئی تو حضرت عباسؑ امام حسین کے خیمہ شریف کی طرف پابوسی کے لیے واپس آئے)۔مراۃ النظیر اور استعارہ ہے۔

امام گفت: خدا یارِ تو کہ امشب نیز
توان بہ راز و نیاز خدای بے چون شد (ایضاً)

(حضرت امام عالی مقام نے فرمایا کہ خدا تمھاری مدد کرے آج کی رات میں اپنے بے مثال خدا سے نہایت راز و نیاز کی باتیں کرلوں گا!)۔صنعتِ تلمیح،تشبیہ اور استعارہ ہے۔

سپس برادرِ با جان برابر از برِ شاہ
برفتنِ سوی شطِّ فرات ماٗذون شد (ایضاً)

(پھر امام عالی مقام نے اپنے جان برابر بھائی حضرت عباس کو دریائے فرات کی طرف ترائی میں جانے کا حکم دیا)۔صنعتِ تلمیح ہے۔

نخورد آب کہ لب تشنہ بایدم جان داد
بدوش،مشکِ پُر آب از شریعہ بیرون شد (ایضاً)

(حضرت عباس نے خود پانی نہ پیا اور فیصلہ کیا کہ مجھے پیاسا ہی مرنا چاہیے تو وہ مرغابی کی طرح نہر سے پانی کی صرف مشک بھر کر باہر نکل آئے)۔صنعتِ مراۃ النظیر،تجنیسِ محرف اور حرف ''ب'' کی تکرار ہے۔

ببازوانِ قلم ، مشکِ آب بر دندان
شہید گشت و سمٰوات محو و مفتون شد (ایضاً)

(اپنے دونوں بازو کٹ جانے کے بعد پانی بھری مشک کو اپنے دانتوں سے پکڑ لیا۔حضرت عباس شہید ہوگئے اور دنیا کو حیران کر گئے)۔مجازِ مرسل اور محاورہ بندی ہے۔

فدای ہمّت و مہر و وفای تو عباس
کہ قدّ ہر الفی پیشِ قامتت نون شد (ایضاً)

(اے حضرت عباس! آپ کی ہمت،محبت اور وفا شعاری پر قربان جائیں کہ آپ کے سامنے ہر الف قامت بندہ بھی (اپنی کمر دوتا کیے) نون محسوس ہوتا ہے)۔تشخیص اور حروفِ تہجی کا استعاراتی استعمال ہے۔

خواہ حماسہ حسینی مخصوص کربلائی پس منظر کا حامل ہے لیکن حضرتِ عباس علمدار کی وفا شعاری، ہمت وشجاعت اور عظمت کے بیان نے اسے ایک غیر روایتی منفرد رنگ اور آہنگ میں ڈھال دیا ہے۔

سیّدنا حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ (20ھ)

سیّدنا حضرت بلال کی شان میں ترپن (53) بیت شہریارؔ نے بڑے سوز و ساز میں لکھے ہیں۔(ایضاً،ص 411-409) شہریارؔ نے ان کے بارے میں منقبت میں ایک تمثیل سے کام لیا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری وصالِ پاک کے بعد حضرت بلال مدینہ منورہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔کسی روز حضرت امامِ عالی مقام نے انھیں بڑی تڑپ سے یاد کیا۔بس جب یاد کیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلال

کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ حسین مدینہ میں تمھیں یاد کرتے ہیں تو حضرت بلال حلب سے مدینہ پاک پہنچتے ہیں۔اس سارے واقعے کو شہر یارؔ نے بڑے پُرسوز انداز میں نظم کیا ہے:

خدایا پس بلالِ ما کجا رفت
اگر زندہ است چون بی یادِ ما رفت (ایضاً،ص 409)

(یا اللہ ہمارا بلال کہاں چلا گیا۔اگر وہ زندہ ہے تو ہمارے بغیر اس کی کیسے گزر رہی ہے۔)

بلال آن شب بخوابِ مہر کیشان
پیغمبر دید با حالی پریشان (ایضاً)

(سیّدنا حضرت بلال نے اسی رات خواب میں رسول پاک ﷺ کو پریشان حال دیکھا اور ان محبت سے لبریز ہستیوں کا حال سنا)۔استعارہ ہے۔

بلال از خاندان کردہ جدایی
نبینیم از حبیباں بی وفایی (ایضاً)

(سیّدنا حضرت بلال نے اسی رات اپنا گھر بار چھوڑا کہ "ہم نے کبھی محبت کرنے والے کو بے وفا نہیں پایا")۔استعارہ ہے۔

بلالی کز عزیزِ روزگار است
عزیزی کز پیغمبر ﷺ یادگار است (ایضاً)

(سیّدنا حضرت بلال کو، جو زمانے میں یگانہ تھے، آپ ایسے پیارے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کی یادگار ہیں)۔صنعتِ تجنیسِ تام ہے۔

بلال از سوز و رقت گریہ سرداد
بگریہ شرحِ خوابِ دوش در داد (ایضاً،ص ۴۱۰)

(سیّدنا حضرت بلال نے آہ وزاری شروع کر دی اور مدینہ پاک روتے پیٹتے آ گئے اور اپنے گزشتہ خواب کی تفصیل امام عالی مقام کو بتائی)۔صنعتِ تلمیح ہے۔

غلامت را بجز یادِ شما نیست
جز این آئینہ در آئینِ ما نیست (ایضاً)

(مجھ غلام کو آپ کے سوا کسی کی یاد تھی ہی نہیں، ہمارے دستور میں اس رویے کے علاوہ اور کوئی رویہ ہے ہی نہیں)۔تجنیسِ محرف ہے۔

بر آمد شیون از ہر بام و بر زن
مدینہ شد سراپا شور و شیون (ایضاً)

(مدینہ کی ہر چھت اور ہر جھرو کے سے رونے کی آوازیں آنے لگی اور سارے مدینے میں کہرام سا مچ گیا)۔ تکراراور بر، و، ش کا صوتی آہنگ ہے۔

حسین اما بسیمایی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
کنارِ آسمان روحی مجرد (ایضاً، ص ۴۱۱)

(حضرت امام عالی مقام شبیہِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں اور آسمان کے نیچے آپ جیسی کوئی ہستی نہیں)۔ استعارہ اور تشبیہ ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کرد از بہرِ تسلی
بسیمایی حسینِ خود تجلی (ایضاً)

(نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت بلال کو تسلی دینے کے لیے بصورت امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود جلوہ گری فرمائی۔)

حسین از طلعت چون ماهتابی
فرو پاشید شاں بر آتش آبی (ایضاً)

(حضرت امام عالی مقام نے اپنے چاند جیسے چہرے سے حضرت بلال کی آتشِ جدائی پر پانی ڈال دیا اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے)۔صنعتِ تضاد اور تشبیہ ہے۔

شفیعِ ما حسینِ ابن علی کُن
بما ہم ماہِ غیبت مِن جَلی کن (ایضاً)

(اے اللہ تعالیٰ حسین ابن علی کو ہمارے لیے شفیعِ محشر بنا دے اور ہمارے وہ چاند جیسے امام جو پردہ غیبت میں ہیں ان کو ہم پر ظاہر کر دے)۔صنعتِ تلمیح اور تشبیہ ہے۔

یہاں پر حضرت امام عالی مقام کی شان اور سیّدنا حضرت بلال کی شان دونوں باہم گلو آویز دکھائی دیتی ہیں۔شہر یؔار نے مکالمے کا اسلوب اپنا کر ایسی منظر کشی کی ہے کہ یہ دونوں مبارک ہستیاں ایک دوسرے سے ایک دوسرے کی ہی باتیں کرتے نظر آتی ہیں۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ (672ھ)

حضرت مولانا رومؒ نہ صرف شاعر اور صاحب طرز نثر نگار تھے بلکہ تصوف میں سلسلۂ مولویہ کے بانی بھی تھے۔مگر شہر یؔار نے اپنے یہاں ان کے جشن پر یہ نظم پڑھی تھی۔اس نظم میں شہر یؔار نے بتایا ہے کہ حضرت مولانا رومؒ اپنے پیر حضرت شمس تبریز کے مزارِ اقدس کی زیارت کے لیے آ رہے ہیں۔ان کا اپنے پیر حضرت شمس تبریزؒ کے لیے کیا والہانہ پن ہے اور رومیؒ کی آمد سے اور ان کے زیارت سے ہم

اپنے جامہ میں پھولے نہیں سماتے ہیں۔(ایضاً،ص 416-415)

شہرِ تبریز است کویِ دلبران
ساربانا بار بکشا ز اشتران (ایضاً،ص ۴۱۵)

(تبریز کا شہر تو پہلے ہی محبوبوں کی سرزمین ہے یہاں تو اونٹ ہانکنے والے خود بخود اپنے ڈیرے ڈال لیتے ہیں)۔صنعتِ تضمین اور تلمیح ہے۔

شہرِ تبریز است و مشکین مرز و بوم
مہدِ شمسؒ و کعبۂ ملایِ رومؒ (ایضاً)

(شہر تبریز کی زمین اور سرحدوں سے کستوری کی خوشبو آتی ہے جو شمسؒ تبریز کی ولادت گاہ اور حضرت مولانا رومؒ کا کعبہ ہے)۔استعارے ہیں۔

شہرِ ما از شور لبریز آمدہ ست
وہ کہ مولانا بہ تبریز آمدہ ست (ایضاً)

(حضرت مولانا رومؒ کی تشریف آوری سے ہمارے شہر تبریز میں ایک غلغلہ برپا ہو گیا ہے)۔محاکات نگاری ہے۔

تو بیا ای ماہِ مہر آئینِ ما
ای تو مولانا جلالُ الدینؒ ما (ایضاً)

(تو آجا کہ تو ہمارے لیے سورج جیسا چاند ہے کہ تو ہمارا مولانا جلال الدین رومیؒ ہے)۔القاب در اصل استعارے ہیں۔

ما ھمہ ماھی و تو دریای ما
آبروی دینِ ما، دنیای ما (ایضاً)

(ہم سب تیرے سمندر کی مچھلیاں ہیں ہماری دنیا میں عزت و آبرو تجھی سے ہے)۔تشبیہ اور استعارہ ہیں۔

سعدیا کنز اللغۃ، قاموس، تو
او ھمہ دریا و اقیانوس تو (ایضاً،ص ۴۱۶)

(شیخ سعدی ایک کنز اللغۃ ہے تو مولانا آپ ایک انسائیکلو پیڈیا ہیں۔تمام شعراء ایک ایک دریا ہیں اور رومیؒ ایک سمندر ہیں)۔تشبیہ ہے۔

ھر چہ فردوسی بلند آوا بُود
چون رسد پیش تو مشتش وا بود (ایضاً)

(وہ تمام افکار جن کی بنا پر فردوسی کا ڈنکا بجتا ہے جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو ان کی مٹھی کھل جاتی ہے یعنی اوسان خطا ہو جاتے ہیں)۔صنعتِ تلمیح اور محاورہ بندی ہے۔

گر نظامی نقشبندِ زرِّ ناب
زرِّ نابش پیش تو نقشی بر آب (ایضاً)

(اگرچہ نظامی نے خالص سونے کے زیور بنائے ہیں مگر رومیؒ تک پہنچ کر ان کا رنگ اُڑ جاتا ہے)۔ صنعتِ تلمیح اور تشبیہ ہے۔

کاروانِ عرشیان مہمانِ ماست
قدسیان بنشستہ پای خوانِ ماست (ایضاً)

(آج فرشتوں کا ایک قافلہ ہمارے یہاں مہمان ہے اور ہمارے لنگر پر تو آج بندے نہیں فرشتے بیٹھے ہوئے ہیں، یعنی مولانا رومؒ کا قافلہ تبریز آ گیا ہے)۔محاکات ہے۔

مرحبا ای عاشقانِ بیقرار
مرحبا ای چشمہ ہای اشکبار (ایضاً)

(اے بے قرار عشاق آپ کو مبارک ہو اور اے جدائی میں روتی آنکھوں تمھیں بھی مبارک ہو)۔ مجازِ مرسل ہے۔

جان و دل را صحنہ، رفت و رو کنید
از سرشک آب از مژہ جارو کنید (ایضاً)

(اپنے دل اور روح کے فرش کو اچھی طرح دھولو، یہاں اپنے آنسوؤں کا پانی اور پلکوں سے جھاڑو دو)۔ مبالغہ اور غلو ہے۔

عود سوزید و سمن سائی کنید
با صد آئینہ خود آرائی کنید (ایضاً)

(عود سلگاؤ اور چمبیلی کی بتیاں بچھاؤ، خود کو بھی مختلف طریقوں سے سجاؤ یعنی رومیؒ کی آمد پر خوشیاں مناؤ)۔ رعایتِ لفظی اور محاکات نگاری ہے۔

پردۂ پندارہا بالا زنید
غرفہ ہای چشمِ جانہا وا کنید (ایضاً)

(اپنے غرور کے پردے کو کھونٹی پر ٹانک لو اور اپنی روح کی آنکھوں کی کھڑکیاں کھول دو!)۔ استعارہ ہے۔

شانشینِ چشمِ دل، خالی کنید
شاہ را تصویرِ آن بالا زنید (ایضاً)

(اپنے دل کی آنکھوں کی پتلیاں خالی کردو اوراس میں بادشاہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی تصویر لگا لو)۔ استعارہ ہے۔

سینہ ہا سازید چون آئینہ پاک
بو کہ بینم آن جمالِ تابناک (ایضاً)

(اپنے سینے کوآئینے کی طرح چمکا رکھو شاید کہ مجھے وہ جمال تابناک نظرآجائے)۔مجازِ مرسل اورتشبیہ ہے۔

دور باشِ شاہ پشتِ در رسید
پیر در بان ہوحق از دل بر کشید (ایضاً)

(ایک وقت تھا کہ بادشاہ سلامت پچھلے دروازے سے اندرتشریف لائے اور بوڑھے چوکیدار نے شور مچا دیا)۔محاکات ہے۔

چشمِ جان بیدار این دیدار دار
پردہ را برداشت، پیرِ پردہ دار (ایضاً)

(روح کی بیدار آنکھ ہی اس کا دیدار کرسکتی ہے اور پھر تمھارا پردہ دار بھی تمھارے پردے اٹھا دے گا)۔استعارہ ہے۔

اینک آمد از در آن دریای نور
موسیٰ گویی فرود آید ز طور (ایضاً)

(لو وہ روشنی کا ایک سمندر تمھارے گھرآ گیا اور گویا کہ موسیٰ کلیم اللہ طور سے ہماری طرف آ گیا)۔ صنعتِ تلمیح اوراستعارہ ہے۔

زیرِ یک بازو گرفتہ بوسعیدؒ
بازوی دیگر جنیدؒ و بایزیدؒ (ایضاً)

(جس کے ایک ہاتھ میں شیخ ابوسعیدؒ کےعلوم اور دوسرے ہاتھ میں جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ کے علوم ہیں)۔تلمیح اورمجازِ مرسل ہے۔

خیمہ بر سر داشتہ خیّام از او
غاشیہ بر دوش شیخ جامؒ از او (ایضاً)

(عمر خیام کی جوقدرو منزلت ہے وہ ساری مولانا رومؒ کی مرہون منت ہے اور شیخ احمد جامؒ ان کے غلام نظر

آتے ہیں)۔مبالغہ اور موازنہ ہے۔

طلعتی آئینۂ دریای نور
قامتی ہیکل نمای کوہ طور (ایضاً)

(اس کا چہرہ روشنی کے ایک سمندر کی طرح شفاف ہے اور اس کا سراپا کوہ طور کی طرح تجلی اندوز ہے)۔ صنعتِ تلمیح اور تشبیہ ہے۔

گیسوانی، ہالۂ صبحِ ازل
حلقۂ خورشیدِ حسنِ لم یزل (ایضاً)

(اس کے گیسو ہیں کہ صبح ازل کا حوالہ ہے اور اس کی زلفوں کے حسین کنڈل سورج کی طرح لازوال ہے)۔ استعارہ اور سراپا نگاری ہے۔

چشم می بیند بہ سیمای مسیح
گوش می پیچد در آیاتِ فصیح (ایضاً)

(ان کی آنکھوں کی زیارت بیماروں کے لیے شفا ہے اور ان کی باتیں آیاتِ فصیح کی طرح کانوں میں رس گھولتی ہیں۔)

چون توانم نقشِ آن زیبا کشید
چشمِ من حیران شد و او را ندید (ایضاً)

(میں اس کا سراپا کیسے کھینچ سکتا ہوں میں تو خود سراپا حیرت ہوں، اسے دیکھ کیسے سکتا ہوں)۔ مجازِ مرسل اور استعارہ ہے۔

او ہمہ سرّ است چون فاشش کنم
وصفی از خورشید و خفاشش کنم (ایضاً)

(وہ تو سراپا راز ہے اور اسے کیسے کھولا جا سکتا ہے چمگادڑ بھلا سورج کے اوصاف کیسے بیان کر سکتی ہے)۔ استعارہ اور علوِ عجز ہے۔

کس نداند فاش کرد اسرارِ او
ہر کسی از ظنِّ خود، شد یارِ او (ایضاً)

(جس نے بھی اس کے رازوں کو عیاں کیا ہے وہ دراصل اس کو نہیں جانتا بلکہ جس کسی نے بھی اس کے بارے میں کوئی بات کی ہے اس نے فقط اپنے خیال کو بیان کیا ہے۔)

ہم زبانِ راز داران لال بہ
وصفِ حالِ من در او بی حال بہ (ایضاً)

(رومیؒ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے میرے ہوش بھی قائم نہیں ہیں اور رومیؒ کے بارے میں جاننے والے بھی اس کے اوصاف کے بیان میں گونگے ہیں)۔صنعتِ تجنیسِ محرف اور حرف ''ل'' کی تکرار ہے۔

محولہ بالا اشعار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ شہریاؔر نے رومی کے صوفیانہ رنگ کو اپنے منفرد شاعرانہ انداز میں اجاگر کر کے ان کے روحانی تصرف اور کاملیت کا شایانِ شان تذکرہ کیا ہے۔

شہریاؔر کے ایک معاصر ناقد کے بقول: شہریاؔر اگرچہ زیادہ عالم با عمل تو نہیں تھے لیکن مشاہدے سے صفائے قلب اور اس مادی دنیا سے رہائی کا سامان کر لیا تھا۔ وہ صوفیانہ اصطلاحات کے لذت سے خوب آشنا ہو چکے تھے۔(ترجانی زادہ،مقدمۂ دیوانِ شہریار،ص 48)

سیّد محمد علی جمال زادہ نے شہریار کی شاعری کے فنی نکات پر بات کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا وہ سب اس کی منقبت نگاری کے لیے بھی عین صواب ہے:''میں نے شہریار کے ایک سو ستر متفرق شعر پڑھے ہیں، ہر شعر سراپا لطف و ذوق اور وجد ہے۔کوئی مصرع سُست اور کمزور نہیں بلکہ ہر مصرع پہلے مصرع سے زیادہ منجھا ہوا، رواں، خوبصورت اور پُر زور ہے۔تبریز کا یہ شاعر فارسی زبان کا فخر ہے اور بے ساختہ دعائیں دینے اور بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔''(جمال زادہ،مقدمہ دیوانِ شہریار،ص 43)

اس مجلّے (نعت رنگ) کا وسیلۂ اظہار اردو زبان ہے ورنہ ترجمہ کر دینے سے شعر ذبح ہو جاتا ہے۔ شہریار کی طرف سے ان شاہان نکہت و نور کی بارگاہ میں یہ بے مایہ اور مختصر سی حاضری ہے یہ کوئی تحقیقی اور تنقیدی مقالہ نہیں البتہ اسے کسی قدر بنانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے جو کچھ زیادہ کامیاب نہیں لگتی۔

حوالہ جات

۱۔ ترجانی خان،مقدمۂ دیوانِ شہریار، ایران، تہران، کوچۂ بہار، انتشاراتِ نگاہ، ۱۳۷۰ش/ چاپ دھم۔

۲۔ جمال زادہ،مقدمۂ دیوانِ شہریار، ایران، تہران، کوچۂ بہار، انتشاراتِ نگاہ، ۱۳۷۰ش/ چاپ دھم۔

۳۔ شہریار، دیوانِ شہریار، ایران، تہران، کوچۂ بہار، انتشاراتِ نگاہ، ۱۳۷۰ش/ چاپ دھم۔

۴۔ علی دہقان،مقدمۂ دیوانِ شہریار، ایران، تہران، کوچۂ بہار، انتشاراتِ نگاہ، ۱۳۷۰ش/ چاپ دھم۔

۵۔ علی زھری، مقدمہ دیوان شہریار، دیوانِ شہریار، ایران، تہران، کوچۂ بہار، انتشاراتِ نگاہ، ۱۳۷۰ش/ چاپ دھم۔

۶۔ مجلہ کیھان فرھنگی، مدیرِ مسئول؛ دکتر فیروز اصلانی، ایران، تہران، خیابانِ فردوسی، کوچۂ شہید شاہ چراغی۔

□□□

منقبتِ امامِ حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام از جون ایلیا

محمد عاصم مجید

ABSTRACT: In this article, a single piece of Manqabat in praise of Imam Hassan e Mujtaba (A.S) by well-known Urdu poet Jaun Elia (2002) is presented. A brief overview of previous research of religious poetry (especially regarding to Manqabat) of Jaun Elia is also presented here with reference to existing literature review.

سیّد حسین سبطِ اصغر نقوی معروف بہ جوؔن ایلیا (2002ء-1931ء) کا نام اور کام اردو شعری ادب میں نا قابلِ فراموش ہے۔ان کے سات شعری مجموعے شاید (1992ء)، گمان (2006ء)، لیکن (2010ء)، گویا (2010ء)، یعنی (2014ء)، راموز (2016ء) اور کیوں (۲۰۲۴ء) شایع ہو چکے ہیں۔کلامِ جوؔن کو عوامی پذیرائی تو نصیب ہوئی لیکن نہ جانے کیوں ان کے کلام کو علمی و ادبی حلقوں میں تنقیدی اور تحقیقی نکتۂ نظر سے پرکھنے کے سلسلے میں ابھی تک تامل اور تردد کا رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔

جوؔن کے پورے مطبوعہ کلام میں مذہبی شاعری کی کوئی خاطر خواہ مثال نہیں مل سکی۔ جبکہ مندرجہ ذیل کچھ اشعار میں وہ سادات ہونے کے ناطے اپنا نسب بیان کرتے ہوئے حضرتِ امامِ حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کی شان بیان کرتے نظر آتے ہیں:

مرے دیروز میں زہرِ ہلاہل تیغِ قاتل ہے
مرے گھر کا وہی سر نام تر ہے جو بھی بسمل ہے

گذشتِ وقت سے پیمان ہے اپنا عجب سا کچھ
سو، اک معمول ہے عمران کے گھر کا عجب سا کچھ

حَسَن نامی ہمارے گھر میں اک سَقراط گزرا ہے
وہ اپنی نفی سے اثبات تک محشر کے پہنچا ہے

کہ خونِ رائگاں کے امر میں پڑنا نہیں ہم کو
کہ بس یونہی لڑائی کے لیے لڑنا نہیں ہم کو

وہ سودِ حال سے یک سر زیاں کارانہ گزرا ہے
وہ بے یاور رہا ہے اور بے یارانہ گزرا ہے

طلب تھی خون کی قے کی اسے اور بے نہایت تھی
سو فوراً بنتِ اشعث کا پلایا پی گیا ہوگا
وہ اک لمحے کے اندر سرمدیت جی گیا ہوگا

(جوؔن ایلیا،''یعنی''، لاہور(پاکستان): الحمد پبلی کیشنز، 2014ء (اشاعت چہارم)، ص:179)

محولہ بالا اشعار استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر نوید احمد گِل کی تحقیق کا نتیجہ ہیں جو ۲۰۲۰ء سے کلامِ جوؔن کے مطالعہ اور اس کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالنے کے سلسلے میں کوشاں ہیں۔ قرینہ معنوی، داخلی شہادتوں اور تلازماتِ شعری کے اعتبار سے یہ اشعار شانِ حضرت امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کے قریب ترین ہیں۔ مزید یہ کہ منقبت کا وہ روایتی انداز نہیں جو انیس، دبیر یا جوش کے یہاں نظر آتا ہے بلکہ یہ جون کا اپنا رنگِ منقبت ہے۔

بھارت میں جوؔن ایلیا پر پی ایچ ڈی کی سطح کے دو مقالے لکھے جا چکے ہیں جن میں سے نیہا اقبال کے مقالہ ''جون ایلیا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ'' میں جوؔن کی مذہبی شاعری کا ذکر موجود نہیں۔ (نیہا اقبال، ''جون ایلیا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردُو، زیرِ نگرانی پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، 2018ء، ص:272) جبکہ اقبال قاسم نے اپنے مقالہ ''جون ایلیا: حیات اور شاعری'' میں نعت و منقبت، قصیدہ، سلام اور نوحہ کے ذیلی عنوان باندھے ہیں اور جوؔن کے کلام کی اس جہت پر بات کی ہے۔ (اقبال قاسم، ''جون ایلیا: حیات اور شاعری''، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی اُردُو، زیرِ نگرانی ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ایم۔ جے۔ پی، روہیل کھنڈ یونی روسٹی، بریلی شریف، 2014ء، ص: 285) لیکن اس مقالے میں کسی شعر کا صفحہ نمبر کے لحاظ سے مکمل حوالہ سرے سے موجود نہیں۔ اور تو اور اس تحقیق میں پیش کیے گئے اشعار تلاش کرنے پر بھی کسی مطبوعہ شعری

مجموعے میں نہیں مل سکے۔ اس کے علاوہ پیش کردہ شعری مثالوں میں جون کے مجموعی رنگِ شعری کا فقدان بھی واضح نظر آتا ہے کیونکہ جون اتنا سیدھا کہنے والے نہیں تھے۔

تحقیق درست حوالے کا نام ہے اور یہ دونوں مقالہ جات جوؔن کی کسی بھی مطبوعہ کتاب سے صفحہ نمبر کا متن، حواشی یا کتابیات میں حوالہ نہیں دیتے۔ آخری کتاب ''کیوں'' کی اشاعت کے بعد نہ غیر مطبوعہ کلام کا سوال باقی رہتا ہے اور نہ حمد و نعت ہی کے حوالے سے جوؔن کے الگ سے کسی مجموعے کا سراغ ملتا ہے، اس لیے مندرجہ بالا اشعار کو جوؔن کی منقبت نگاری کے حوالے سے واحد مطبوعہ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

۱۔ اقبال قاسم، ''جون ایلیا: حیات اور شاعری''، مقالہ: پی ایچ ڈی، نگران: ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ایم جے پی، روہیل کھنڈ یونی ورسٹی، بریلی، 2014ء۔

۲۔ نیہا اقبال، ''جون ایلیا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، مقالہ: پی ایچ ڈی، نگران: پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، 2018ء۔

۳۔ جوؔن ایلیا، ''یعنی''، لاہور (پاکستان): الحمد پبلی کیشنز، 2014ء (اشاعت چہارم)۔

□□□

دیا اُسے حبیب جو فرد لاجواب تھا ۔۔۔ عمرؓ کا انتخاب تو خدا کا انتخاب تھا
نہ رہزنوں کا کچھ خطر، نہ شب کی ظلمتوں کا ڈر ۔۔۔ ہر اک کی اپنی نیند تھی، ہر اک کا اپنا خواب تھا
سکوں تھا حاصلِ بشر خوشا خلافتِ عمرؓ ۔۔۔ وہ دل جو حق سے دُور تھا اُسی کو اضطراب تھا
شعورِ وحدتِ احد، عطائے حبِّ مصطفیٰ ۔۔۔ یہ مسلموں کے واسطے حیات کا نصاب تھا
نظامِ عدل کی مہک رواں تھی دُور دُور تک ۔۔۔ یہ عہد اپنے آپ میں کِھلا ہوا گلاب تھا
عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہو اذان برملا ۔۔۔ یہ مشرکوں کے جبر کا کُھلا ہوا جواب تھا

(شاعر لکھنوی)

اصحابؓ و آلؓ کا ہے تعلق کچھ اس طرح ۔۔۔ یہ پھول تھے رسولؐ کے وہ عندلیب تھے
پوچھے کوئی جو بلبلِ شُستہ دماغ سے ۔۔۔ گل زار احمدیؐ کے سبھی گل نجیب تھے
لیکن جو اہل بیتؓ کے دشمن رہے سدا ۔۔۔ وہ دشمنانِ سرورِ دیںؐ، بد نصیب تھے

(شاکر القادری)

گوشۂ خصوصی

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

مشکلیں راہ کی جس سے ہوئیں آساں، تُو ہے
جس کے اسلام پہ ہیں سیکڑوں احساں، تُو ہے
جس کی دولت ہوئی اسلام کی تعمیر میں صرف
فقر تھا جس کا اثاثہ وہ سلیماں، تُو ہے
وصف ہے تِرا غنی، تِرا شرف ذوالنورین
اَن گنت جس کے فضائل ہیں وہ انساں، تُو ہے
اس اک احسان پہ ممنون ہے اسلام تِرا
یعنی اے محسنِ دیں جامعِ قرآں، تُو ہے

(عاصی کرنالی)

منقبت نگاری: فہرستِ مصادر و مراجع

(تخلیق، ترتیب، تحقیق، تنقید)

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

ABSTRACT: This essay offers a selective yet meaningful compilation of poetic works in Urdu, Persian, and Hindi related to MANQABAT. It includes only Poetry books; prose writings on the lives and MANAQIB of religious figures have been excluded, as their inclusion would have significantly broadened the scope. This decision also reflects the challenges of distinguishing MANAQIB from related genres, particularly those with minimal thematic relevance. The works are organized into three categories: unpublished manuscripts, published poetry, and academic studies on MANQABAT. This list is derived from personal available books, related bibliographies, and digital sources.

منقبت کی تاریخ کے ابتدائی نقوش حمد اور نعت کے ساتھ ہی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔فرزدق سے منسوب قصیدہ میمیہ وہ پہلی منقبت ہے جو اہمیت کی حامل بھی ہے اور خاصی معروف بھی ہوئی۔عربی سے یہ روایت فارسی میں اور پھر اردو میں متعارف ہوئی۔ اردو میں اس کے ابتدائی نقوش دکنی ادب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ دکنی سلاطین اور شعرا کے دواوین،مثنویات اور دیگر تصانیف میں قابلِ ذکر مناقب دیکھی جاسکتی ہیں۔ بالخصوص مثنویوں میں حمد اور نعت کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی مناقب بالعموم دستیاب ہوجاتی ہیں۔

منقبت کے لغوی معنی تعریف وتوصیف اور مدح وثنا کے ہیں۔مختلف لغات میں منقبت کے معنی اور مفاہیم تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ائمہ اہل بیت،اصحاب رسول اور بزرگانِ دین کی مدح وستائش کے لیے گئے ہیں۔ اردو شاعری کی اصناف مثلاً غزل،قصیدہ،مرثیہ،مثنوی وغیرہ اپنی مخصوص ہیئت کی بنا پر اپنی شناخت رکھتی ہیں لیکن تقدیسی اصناف مثلاً حمد،نعت،مرثیہ،منقبت،سلام وغیرہ کی سوائے

مثنوی کے کوئی مخصوص ہیئت کی حامل نہیں۔ان کا تعین ان کے موضوع کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں متعدد مناقب تخلیق کی گئی ہیں۔سب سے زیادہ مناقب ائمہ اہل بیت،شہدائے کربلا کی ہم دست ہوتی ہیں۔ ان کے بعد خلفائے راشدین،صحابہ، بزرگان دین،صلحا وغیرہ کی منقبتیں انفرادی طور پر بھی اور مکمل مجموعے کی صورت میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ائمہ اہل بیت میں سب سے زیادہ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ اور امام زین العابدینؓ کی منقبتیں کہی گئی ہیں۔ بزرگان دین میں حضرت غوث اعظمؒ،حضرت نظام الدین اولیاؒ، خواجہ غریب نوازؒ، وغیرہ کی بھی کثیر منقبتیں دستیاب ہوتی ہیں۔

راقم الحروف کچھ عرصہ سے تقدیسی اصناف بالخصوص حمد،نعت،سلام اور منقبت وغیرہ کی فہرستیں مرتب کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ محترم سید صبیح رحمانی نے منقبت نمبر نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مجھے بھی اپنے متذکرہ پراجیکٹ میں سے مناقب کی فہرست اس نمبر کے لیے فراہم کرنے کی تجویز دی۔مناقب کی ادھوری زیرِ نظر فہرست پیش خدمت ہے۔راقم الحروف کے خیال میں مناقب کی فہرست مکمل ہوتے وقت کثیر تعداد میں کتب،مقالات اور مضامین کا سرمایہ مزید جمع ہوجائے گا۔ جسے وقت کی قلت کے باعث ملتوی کردیا گیا ہے۔دوسرا یہ کہ فہرست کی اشاعت کے بعد قارئین کی طرف سے موصول ہونے والی تجاویز،سفارشات اور رہنمائی کے بعد اسے مکمل کرنے اور بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ چنانچہ قارئین کی تجاویز اور رہنمائی کے لیے شکریے کے ساتھ منتظر رہوں گا۔

فہرست مرتب کرتے ہوئے صرف منظوم کتب کو شامل کیا گیا ہے۔وہ نثری کتب جو بزرگانِ دین / اولیا/صلحا/ یا اسلاف کی سیرت/ مناقب پر مشتمل ہیں یا مناقب کے عنوان ہی سے مرتب/تصنیف کی گئی ہیں،انھیں شاملِ فہرست نہیں کیا گیا۔اگر ایسی کتب کو بھی شامل کیا جاتا تو فہرست کا حجم دوگنا بڑھ سکتا تھا۔ان کتب کو شاملِ فہرست نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مناقب/سوانح/ تذکرے یا اسی قبیل کی کتب میں تفریق کرنا اور ایسی کتب جو مناقب کے عنوان سے تو تحریر کی گئی ہیں لیکن ان میں مناقب کا مطلوبہ مواد بہت کم موجود ہوتا ہے یا ایسی کتب جن کے ناموں میں مناقب کی اصطلاح تو شامل نہیں لیکن وہ اصطلاحی مفہوم میں مناقب کے زیادہ قریب ہیں،لہٰذا ایسی کتب کو شاملِ فہرست نہیں کیا گیا۔

مناقب کی فہرست مرتب کرتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ ان کتب کو شامل فہرست کیا جائے جن میں مناقب کی تعداد چار سے کم نہ ہو چنانچہ کوشش کی گئی ہے کہ ان سے کم مناقب کی حامل کتب کو فہرست میں شامل نہ کیا جائے (یہ بھی درست ہے کہ بہت سی کتب کے اندراج میں اس اصول کی پیروی نہیں کی جاسکی۔ایسا ان کتب کے سلسلے میں ہوا ہے جو راقم الحروف کی دسترس میں نہ تھیں۔) اردو کی ادبی تاریخ کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر منظوم کتاب کے آغاز میں حمد اور نعت کو کارِ ثواب سمجھتے ہوئے شامل کیا

جاتا رہے اور یہ روایت آج بھی برقرار ہے۔قدیم کتب میں شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں حمد اور نعت شامل نہ ہو۔اکثر و بیشتر کتب میں تو منقبت بھی شامل رہی ہے۔یہاں تک کہ ہندو شعرا اور نثر نگاروں کی تصانیف/مجموعوں میں بھی اس روایت کے احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے حمد اور نعت کو شامل کیا جاتا رہا ہے۔اگر ایسی کتب جن میں ایک دو حمد و نعت شامل ہو،کو شمار کیا جاتا تو فہرست کی تعداد کئی گنا بڑھ جاتی۔ اسی طرح مناقب کے ساتھ ساتھ حمد،نعت،مناجات،غزل،نظم وغیرہ کے اندراج کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ان کے اندراج کا بھی یہی اصول پیش نظر رکھا گیا ہے۔اسی طرح جن کتب/مجموعوں میں اصناف کی تعداد کثیر ہے ان میں غالب اصناف کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔مجموعے میں اصناف یا ہیئتوں کی کثرت کے باعث سب کا تذکرہ کرنے کی بجائے وغیرہ کا لفظ درج کر دیا گیا ہے۔فہرست میں ایسی کتب بھی شامل کی گئی ہیں جو اگرچہ نثر کی ہیں لیکن ان میں چونکہ منظوم مناقب بھی شامل ہیں اسی لیے ان کا اندراج بھی کیا گیا ہے۔ایسی کتب کی فہرست کے لیے ''نظم و نثر'' لکھ کر اس کے ساتھ "مناقب" لکھ دیا گیا ہے۔یہ وہ کتب ہیں جو بالعموم بزرگانِ دین یا صوفیا کی سوانح/تذکرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔اسی طرح ایسے رسائل نمبر کو بھی شاملِ فہرست کیا گیا ہے جو کسی مذہبی/صوفی شخصیت کی یاد میں مرتب کیے گئے ہیں۔

فہرست کو تیار کرتے ہوئے مصنفین/مرتبین/مولفین کے ناموں کی بجائے کتابیات کے ناموں کو بنیاد بناتے ہوئے الف بائی ترتیب سے اندراج کیا گیا ہے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک ہی مصنف/شاعر کی تمام کتب کی نشاندہی/جمع آوری آسان نہیں۔احتیاط کے باوجود بہت سے شعرا کی تصانیف کا رہ جانا لازمی امر تھا۔دوسرا یہ کہ مصنفین کے ناموں کے اندراج میں بھی کچھ مسائل پیش آتے ہیں۔لہٰذا کتاب کے عنوان کو ہی بنیاد بناتے ہوئے کتابیات کی فہرست تیار کی گئی ہے۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کسی بھی کتاب کو تلاش کرنا آسان ہوگا۔کتاب کے نام کے بعد،مصنف/مولف/مرتب،پھر ناشر/مطبع/ادارہ اشاعت،اس کے بعد سنہ اشاعت،پھر تعداد صفحات اور آخر قوسین میں اصناف کی نشان دہی کی گئی ہے۔

فہرست کا اندراج تین حصوں میں کیا گیا ہے۔پہلا حصہ غیر مطبوعہ/قلمی منظوم کتب پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ مطبوعہ منظوم کتب پر مشتمل ہے۔تیسرا حصہ ان کتب/سندی/غیر سندی مقالات اور مضامین پر مشتمل ہے جو منقبت کے حوالے سے تحریر کیے گئے ہیں۔اس فہرست کی تیاری میں تقدیسی ادب کے ذاتی ذخیرے،فہرستوں اور انٹرنیٹ پر موجود مواد سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قلمی مسودات/کتب:

۱۔ احسن الشمائل، خواجہ کامگار خاں،اوراق،۸۲،سور ۱۶،مکتوبہ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء۔۱۷۸۴ء،

قلمی، مملوکہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ،بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص۹۷ (شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کے حالات میں)

۲۔ اسرار العالیہ فی مناقب الوالیہ، عبدالغفار بن عبدالجامع فرنگی محلی، مملوکہ آصفیہ، ص ۹

۳۔ اعجاز شاہد (ترجمہ مناقب غوثیہ)، (مثنوی)، شام لعل عطا، تصنیف ۱۲۶۶ھ، کتابت، ۱۲۸۷ھ، نستعلیق، قلمی، (شاہ عبدالقادر جیلانی، شاہد اللہ) (آصفیہ، ا، ص ۲۲۴)

۴۔ بیاض انتخاب قصائد ومناقب از شعرائے اردو، ص ۷۲، سطر ۱۰، نستعلیق، قلمی (آصفیہ۔ا، ص ۸۲)

۵۔ بیاض قصائد ومنقبت وغیرہ، مؤلف مولود خاں، ص ۴۱۴، سر ۶، نستعلیق، قلمی (آصفیہ۔ا، ص ۸۳)

۶۔ بیاض مجموعہ درنوحہ ومرثیہ ومنقبت، ظہور خان، تصنیف ۱۷/اپریل ۱۸۵۵ء، ص ۵۰۰، سطر ۸، نستعلیق، قلمی، (مرشد آباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ، ڈاکٹر عمر غزالی، مطبع گرافک پرنٹ ۲/۳۹، ا، اسمٰعیل سٹریٹ، کولکاتا۔ ۱۴، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۵)

۷۔ تحفۃ الاحباب، مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی، قلمی ۱۲۰۶ھ، ص ۳۵۶ (قاموس۔ا، ص ۱۰۲۵)

۸۔ تحفۃ النساء، (مثنوی ۹) محمد باقر آگاہ، تصنیف ۱۱۸۵ھ، مکتوبہ ۱۲۳۳ھ، ص ۳۸، سطر ۱۵، نستعلیق، قلمی (حمد، نعت، منقبت)، (آصفیہ۔ا، ص ۲۰۸)

۹۔ جبر وقدر (اردو، فارسی) (متفرق کلام مع مناقب)، فہرست مخطوطات کانگریس لائبریری امریکہ مرتبہ ڈاکٹر عباس رضا نیر جلالپوری، محسنہ میموریل فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۰۔۱۰۱

۱۰۔ حلیہء ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ۱۳۴۶ھ، اندراج نمبر ۱۱۳۴۸۹، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلمی (خستہ وشکستہ)، ص ۸۲ (نعت ومناقب)

۱۱۔ خلاصۃ المفاخر فی مناقب الشیخ عبدالقادر (ترجمہ) عبداللہ یافعی، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۲۶)

۱۲۔ رسالہ دراحوال خواجہ شمس الدین ترک، (فارسی) قلمی، مکتوبہ ۱۱۸۸ھ مملوکہ حکیم ظل، الرحمٰن، علی گڑھ، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۵۷) (خواجہ شمس الدین ترک کے حالات اورمناقب)

۱۳۔ رسالہ دراحوال خواجہ معین الدین، (فارسی) قلمی، مکتوبہ ۱۱/صفر ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء، مملوکہ حکیم ظل، الرحمٰن، علی گڑھ، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۵۷) (خواجہ معین الدین چشتی کے حالات اورمناقب)

۱۴۔ رسالہ درمناقب اہلبیت، حسین اللہ، تاریخ تصنیف، ۱۳۰۰ھ یامابعد ۱۳۰۰ھ، نمبر کتاب، ۲۹۳۹، ص ۳۳، نستعلیق، قلمی (کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات، جلد دوم، مرتبہ نصیر الدین ہاشمی، مطبع اعجاز مشین پریس چھتہ بازار حیدرآباد، ۱۹۶۱ء، ص ۳۳۹)

۱۵۔ رسالہ مناجات و منقبات، ملا افکاری نسیمی، س۔ن، ص ۴۵۰، سطر ۱۱، نسخ، نستعلیق، قلمی، (مرشد آباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ، ڈاکٹر عمر غزالی، مطبع گرافک پرنٹ ۹/۳۹ ۲/۱، اسمٰعیل سٹریٹ، کولکاتا۔ ۱۴، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۸)

۱۶۔ ریاض الجنان درمناقب اہل بیت کرامت عنوان، محمد باقر آگاہ، ص ۱۲۹، سطر ۲۴، تصنیف، ۱۲۲۷ھ، نستعلیق، قلمی، (فہرست اردو مخطوطات، کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، مرتبہ عبدالقادر سروری، مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء، ص ۱۰۵)

۱۷۔ ریاض الجنان، (منظوم) مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی، قلمی ۱۲۰۷ھ، ص ۲۴۶ (قاموس۔ا، ص ۱۰۲۵)

۱۸۔ ریاض غوثیہ، (مثنوی) شاہ غوثی بیجاپوری، تصنیف، ۱۱۹۱ھ، ص ۴۲۸، سطر ۱۳ تا ۲۸، نستعلیق، قلمی (شاہ عبدالقادر جیلانی) (آصفیہ۔ا، ص ۲۱۶)

۱۹۔ طریقہ سنیہ فی فضل الاصحاب ذوی المناقب العلیہ، محمد سالم، قلمی مملوکہ حکیم ظل، الرحمٰن، علی گڑھ، بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۶۰ (خلفا اربعہ اور بزرگ احباب کے فضائل میں)

۲۰۔ غوث نامہ، (مثنوی) لعل شاہ حیدرآبادی، تصنیف قریب ۱۲۵۰ھ کتابت ۱۳۰۸ھ، ص ۱۲۷، سطر ۱۳، نستعلیق، قلمی (شاہ عبدالقادر جیلانی) (آصفیہ۔ا، ص ۲۱۸)

۲۱۔ کبت ہائے متفرق (بزبان ہندی)، سید غلام نبی، تصنیف مابعد ۱۲۰۰ھ، نمبر کتاب ۲۴۲، ص ۲۶، سطر ۲۰۔۱۷، نستعلیق، قلمی، ص ۳۶۰ (کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات، جلد دوم، مرتبہ نصیرالدین ہاشمی، مطبع اعجاز مشین پریس چھتہ بازار حیدرآباد، ۱۹۶۱ء،)

۲۲۔ کحل الجواہر فی مناق عبدالقادر، عبدالقادر کشوری، بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۶۷

۲۳۔ کحل الجواہر فی مناقب عبدالقادر، حنیف الدین عبدالقادر بن قاضی سید محمد شریف، بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۶۷

۲۴۔ کحل العینین فی تفصیل غوث الثقلین، محمد اسماعیل، بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۶۷

۲۵۔ مجموعہ مناقب، مصنف شعرائے مختلف، سلسلہ نمبر ۲۳۱ قلمی (فہرست مخطوطات اردو، جلد اول، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ، مرتبہ عابد امام زیدی، ۱۹۶۲ء)

۲۶۔ مجموعہ مناقب، (چھ متقدمین اساتذہ کے مناقب) ــــــ (فہرست مخطوطات کانگریس

لائبریری امریکہ مرتبہ ڈاکٹر عباس رضا نیر جلالپوری محسنہ میموریل فاؤنڈیشن ،کراچی ،۲۰۱۵ء، ص ۱۰۰۔۱۰۱)

۲۷۔ محبوب القلوب، مولانا باقر آگاہ، ص ۱۶۲، س ر ۱۷، نستعلیق، قلمی (مناقب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)، (فہرست اردو مخطوطات، کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، مرتبہ عبدالقادر سروری، مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء، ص ۱۱۰)

۲۸۔ محی الدین نامہ (مثنوی)، افضل، تصنیف قبل ۱۰۹۸ھ، ص ۱۴، سطر ۱۵، قلمی، خط شکستہ، (حمد، نعت، منقبت) (آصفیہ۔۱، ص ۲۰۶)

۲۹۔ مخمس درمدرح سیدنا علیؓ، سید علی حسن بلگرامی، مکتوبہ ۲۶ شعبان، ۱۳۳۲ھ،، ص ۱۲، سطر، ۱۵، نستعلیق، قلمی (آصفیہ۔۱، ص ۱۷۳۔ ۱۷۴)

۳۰۔ مرثیہ ومنقبت، مصنف نامعلوم، ص ۲۰۰، سطر ۱۲، نستعلیق، س۔ن، (مرشد آباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ، ڈاکٹر عمر غزالی، مطبع گرافک پرنٹ ۳۹/ ۲، ۱، اسمٰعیل سٹریٹ، کولکاتا۔ ۱۴، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۹)

۳۱۔ مناقب احمدیہ مقامات سعیدیہ، شاہ محمد مظہر، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۲۔ مناقب السادات، شہاب الدین دولت آبادی، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۳۔ مناقب حضرت شیخ جیو، عبدالحلیم (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۴۔ مناقب خواجہ احرار، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۵۔ مناقب سید محمد قادری الجہری، علی شیر شیرازی، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۶۔ مناقب عارفین، شمس الدین افلاکی، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۷۔ مناقب غوثیہ واعمال/اذکار قادریہ، محمد صادق شہابی، (بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰)

۳۸۔ مناقب غوثیہ، محمد صادق شہابی، قلمی (۶۲ مناقب) مملوکہ حکیم ظل، الرحمٰن، علی گڑھ (،بحوالہ

خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹،خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء،ص ۵۲)(شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات اور مناقب)

۳۹۔ مناقب مخدوم جہانیاں،۔۔۔،(بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹،خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء،ص ۱۰۰)

۴۰۔ مناقب مرتضوی (فارسی) ،ملا محمد صالح حسینی ترمذی المتخلص بہ کشفی ،قلمی، کتابت ۱۱۱۰ھ،مملوکہ مزمل لائبریری علی گڑھ

۴۱۔ مناقب، حبیب اللہ قادری قنوجی،(بحوالہ خدابخش جرنل ۴۷۔۶۹،خدابخش اورئینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲ء،ص ۱۰۰)

۴۲۔ منقبت خاتم الانبیا۔۔۔فہرست مخطوطات کانگریس لائبریری امریکہ مرتبہ ڈاکٹر عباس رضا نیر جلالپوری،محسنہ میموریل فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۱۵ء،ص ۱۰۰۔۱۰۱

۴۳۔ نعت ومنقبت، فیاج الدین خان بندہ، قلمی، ۱۲۸۰ھ(قاموس۔ا،ص ۱۰۲۷)

۴۴۔ نوارلعین الیمین فی مناقب سیدنا علی السجاد زین العابدین، عبدالباقی بن محمد صالح المدنی، کاتب محمد مجوب العمری الحجاز، ۱۲۷۲ھ،(قلمی راقم الحروف)،ص ۴۸

مطبوعات:

۴۵۔ الدررالنظم فی مناقب غوث الاعظم (جلد ثانی) مولوی علی انور مطبوعہ ۱۳۴۵ھ(سوانح ومناقب)

۴۶۔ افکار صدیق،صدیق جونا گڑھی، ۱۹۳۸ء،ص ۹۳ (حمد،نعت،منقبت)

۴۷۔ انوار مدینہ اور دیدار خواجہ، میراحدی اجمیری، رسالہ میخانہ لکھنؤ، مارچ ۱۹۳۲ء،ص ۱۶ (نعت،منقبت)

۴۸۔ اوراق اشرف ،سید اشرف الدین احمد خان بہادر اشرف، نصرت الاسلام پریس کلکتہ، ۱۹۱۵ء، ص ۶۶ (حمد،نعت،منقبت،سلام،قصائد)

۴۹۔ بہارستان منقبت ۱۳۱۱ھ معروف بہ دیوان ظہیری، ظہیر احمد ظہیری سہسوانی، مطبع منشی نول کشور ۱۸۹۹ء،ص ۵۶ (مناقب)

۵۰۔ حرف بقا، عاصم عاصی، اردو سخن لاہور، ۲۰۲۱ء،ص ۱۴۸ (حمد،نعت،منقبت،سلام)

۵۱۔ دیوان ثانی درمدح اکمل الاولیاء جناب محبوب سبحانی، ۱۳۰۳ھ عبدالقادر مجیدی مطبع نسیم سحر بدایوں، ۱۸۸۶ء،ص ۳۶ (مناقب)

۵۲۔ دیوان رسوا(فارسی)، احمد حسن رسوا، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ،جنوری ۱۸۹۹ء،،ص ۱۵۰ (غزل،قصیدہ،منقبت)

۵۳۔ دیوان سعید خان ملتانی مقدمہ معین نظامی گروہ زبان و ادبیات فارسی دانش کدہ خاور شناسی دانش گاہ پنجاب لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۵۶ (غزل، قصائد، منقبت)

۵۴۔ دیوان سنی جان محمد سنی، مطبع مرغوب ہر دیار بمبئی، ۱۲۹۰ھ، ص ۲۶۷ (نعت، مناقب)

۵۵۔ دیوان عبداللہ قطب شاہ، مرتبہ محمد علی اثر، محمد عطا اللہ خان نشاط پبلشرز حیدر آباد، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۶ (نعت، منقبت، قصیدہ، غزل)

۵۶۔ دیوان علی نظر، سید علی نظر مرتب محمد سیادت نقوی، بک کارنر دانشمندان سٹریٹ امروہہ، ۱۹۳۳ء، ص ۱۳۰ (غزل، منقبت)

۵۷۔ دیوان منقبت سید الافراد جناب محبوب سبحانی ۱۲۹۹ھ عبدالقادر بدایونی، مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ، ۱۸۸۳ء، ص ۵۴ (مناقب)

۵۸۔ شان علی مرتب فاروق اور گلی (مناقب)

۵۹۔ عثمانیہ میخانہ الموسوم دیوان شکور، غالب پریس کھاری کنواں اجمیر، اپریل ۱۹۴۳ء (مناقب)

۶۰۔ عرفان وارث، ستار وارثی، ۱۹۸۸ء، (مناقب)

۶۱۔ علی بند و حسین بند، غلام حسنین قدر بلگرامی، صفیر بلگرامی، مطبع نور الانوار آرہ، ۱۲۹۶ھ، ص ۳۴ (مناقب)

۶۲۔ فتوحات شوق، شاہ محمد یحیی ابوالعلائی عظیم آبادی، امیر المطابع آگرہ، ۱۸۸۵ء، ص ۵۶۵ (مناقب)

۶۳۔ قیصر رتنا گیر، مرتبہ انور فرخ آبادی، نیلو سلور بک ایجنسی ممبئی، مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۸۰ (نعت، منقبت، نظم، غزل)

۶۴۔ کلام دلدار علی مذاق، دلدار علی مذاق بدایونی، وکٹوریا پریس بدایوں، ۱۳۱۴ھ، ص ۳۳۳ (نعت، منقبت، غزل، نظم)

۶۵۔ کلام میاں محمد بخش (پنجابی) مرتب محمد توصیف حیدر، چشتی کتب خانہ فیصل آباد، جولائی ۲۰۱۳ء، ص ۱۷۲ (حمد، نعت، منقبت)

۶۶۔ کلام یاسین خان نیازی حصہ اول، غلام یاسین خان نیازی، مطبع برقی اعظم جاہی شاہ علی بنڈا، ۱۳۵۴ھ، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۶۷۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ مرتبہ محی الدین قادری زور مکتبہ ابراہیمی مشین پریس حیدرابادد کن ۱۹۴۰ء، ص ۱۰۹۵ (حمد، نعت، منقبت۔ غزل، نظم)

۶۸۔ کلیات شاطر، محمد حیات شاطر، مطبع نیاز دکن حیدر آباد دکن، س۔ن ص ۶۰ (نعت، منقبت)

۶۹۔ کلیات کاشف، مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی مرتبہ اشفاق احمد قاسمی، مجلس قاسم المعارف دیو بند ۲۰۱۶ء، ص ۳۴۵ (حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم)

۷۰۔ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم (منظوم سیرت)، چندن بھان خیال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۱۰ء (حمد، نعت، سلام، منقبت)

۷۱۔ ابرِ رحمت، عرفان رضوی، برائٹ فیوچر ایجوکیشنل پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۹ء، باراول، ص۹۶ (منقبت)

۷۲۔ ابرِ رحمت، محمد عرفان رضوی، موضع کھواڑی، تحصیل و ضلع مانسہرہ، ہزارہ، ۱۹۸۹ء، ص۹۶ (مناقب)

۷۳۔ اجالوں کا سفر، سید شاہ ابوالعلائی نصیرالدین بسمل، ناشر ندارد، حیدرآباد، (بھارت)، ۲۰۰۱ء، باراول، ص۵۲۹

۷۴۔ ارمغان فائق، شاہ محمد فائق، ناشر شاعر خود، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۴ (حمد، نعت، منقبت)

۷۵۔ ارمغانِ حافظ (ترمیم شدہ) حافظ عبدالغفار حافظ، اقلیم نعت، کراچی، ۲۰۰۲ء، باردوم، ص، ۱۴۴ (حمد، نعت، منقبت)

۷۶۔ ارمغانِ سیفی، مکرم علی سیفی فرید آبادی، سید سلان احمد نقوی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ۴۸۰ (نعت، منقبت، دیگر)

۷۷۔ ارمغانِ عقیدت، (فارسی)(مؤلفین)، مرزا مقبول بیگ بدخشانی و ڈاکٹر عبدالمغنی، پیکیجز لمیٹڈ، لاہور، س۔ن، ص۲۲۱ (حمد، نعت، منقبت)

۷۸۔ ارمغانِ غوث، سید شاہ محمد غوث محی الدین مرتبہ شاہ محمد جمیل الدین حسنی، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر حیدرآباد، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۴۲۴ (حمد، نعت، منقبت)

۷۹۔ ارمغانِ مدینہ، مولانا محمد الیاس عطار قادری، مکتبہ المدینہ، کراچی، س۔ن، ص ۲۰۴ (نعت، منقبت)

۸۰۔ اساس، سرشار صدیقی، طاہرہ کشفی میموریل سوسائیٹی بہ اشتراک اثاثہ ناشرین ادب، کوئٹہ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۰ (حمد، نعت، منقبت)

۸۱۔ اساس، سرشار صدیقی، طاہرہ کشفی میموریل سوسائیٹی، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۰ (نعت، منقبت)

۸۲۔ اسرارالمشتاق، سید غلام معین الدین شاہ مشتاق، پرنٹنگ پروفیشنل، لاہور، ۱۹۹۹ء، باردوم، ص ۱۰۴ (حمد، نعت، منقبت، دیگر)

۸۳۔ اشک طالب، تحسین احمد طالب امروہوی،، بزم فانی امروہوی، بازاری بٹوال امروہہ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۲ (نعت، منقبت، غزل)

۸۴۔ اشک متبسم، سید انصار حسین انصار الہ آبادی، انجمن عاشقانِ مصطفی خداداد کالونی کراچی نمبر ۵، جولائی ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۸ (سلام و مناقب اہل بیت)

۸۵۔ اشکِ عقیدت، عبدالصبور صدیقی مرتبہ سید ابو طاہر علی بخاری، ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ ۔م۔ن، ص ۴۴ (نعت، منقبت، غزل، دیگر)

۸۶۔ اشکِ عقیدت، مولانا محمود عبدالصبور صدیقی فضیلت مرتبہ سید حسین احمد جیلانی، اردو گھر الہٰ آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۴۸ (مناقب)

۸۷۔ اشکِ متبسم، شاہ انصار اللہ الہ آبادی، انجمن عاشقانِ مصطفی، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲۸ (منقبت، سلام)

۸۸۔ اصحابی کالنجوم، حفیظ تائب، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، باراول، ۲۵۶ (منقبت)

۸۹۔ اظہارِ عقیدت، سید اظہار احمد نونہروی، شوبی آفیسٹ پریس، دریا گنج نئی دہلی، مارچ ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۹ (مناقب)

۹۰۔ اظہارِ عقیدت، اظہار قریشی، حلقہ شعر وادب، نواب شاہ، ۱۹۹۴ء، ص ۱۷۶ (نعت، منقبت)

۹۱۔ اظہارِ عقیدت، سید اظہار اشرف اشرفی اظہار، غوث العالم اکیڈمی، کراچی، نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۸۰ (نعت، منقبت)

۹۲۔ اظہارِ عقیدت، سید محمد اظہار اشرف اشرفی، غوث العالم میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی، کچھوچھہ شریف، باردوم، ۲۰۰۴ء، ص ۳۲۲ (نعت، منقبت)

۹۳۔ اظہارِ عقیدت، صدیق فتح پوری، حسان پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۶ (حمد، نعت، منقبت)

۹۴۔ اعتراف، رزاق افسر، ناشر مصنف، بزم اردو، میسور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۰ (حمد، نعت، منقبت)

۹۵۔ اعتراف، رزاق افسر، برم اردو، میسور، باراول ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۰ (حمد، نعت، منقبت)

۹۶۔ اعظمیات (حصہ اول)، قاضی صوفی اعظم القادری، سید الصوفیہ اکیڈمی، حیدرآباد (بھارت) ۲۰۰۷ء، ص ۳۱۴ (حمد، نعت، منقبت)

۹۷۔ افکارِ عقیدت، عطا عابدی، مکتبہ افکار اردو بازار دربھنگہ، انڈیا، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۰ (حمد، نعت، مناجات، منقبت)

۹۸۔ افکارِ قدس، انور ڈیرہ دونی، گوشہء ادب، ماڈل کالونی، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۹۰ (نعت، منقبت)

۹۹۔ اقبال اور مدحت آلِ عبا، مطلوب علی زیدی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اول ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۰ (نظم ونثر، منقبت)

۱۰۰۔ التحیات، عاصی فائقی، پوشاک انٹر پرائزز، کھنڈوہ، ۱۹۸۸ء، باراول، ص ۱۲۰ (نعت، منقبت، دیگر)

۱۰۱۔ الحمد للہِ الّذی، شاہ انصار اللہ الہ آبادی، حدیقہ صلوٰۃ وسلام، کراچی، س۔ن، ص ۶۴ (نعت، منقبت، دیگر)

۱۰۲۔ العشق ھو اللہ، سید عنبر علی اجمیری عنبؔر وارثی، مولانا محمد اکبر وارثی اکادمی، اللہ والی مارکیٹ لانڈھی، کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۸ (حمد، نعت، منقبت، تصوف)

۱۰۳۔ القمر الباھر فی ترجمۃ الکواکب الزاھر المعروف مناقب قطب ربانی الشیخ عبدالقادر جیلانی، سید محمد

ابوالہدیٰ آفندی رفاعی مترجم محمد عبدالحق، مطبع ہاشمی میرٹھ، ۱۳۱۴ھ، ص ۶۶ (نظم ونثر۔مناقب)

۱۰۴۔ اللہ والے، طاہر سلطانی، حمد ونعت ریسرچ، کراچی، ۲۰۱۸ء

۱۰۵۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدﷺ، ڈاکٹر ریاض مجید، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۴ (نعت، منقبت)

۱۰۶۔ انتخاب کلام محمود، نواب محمد محمود محمودؔ، ناشر اکرام محمود ایڈوکیٹ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۴ (حمد، نعت، منقبت)

۱۰۷۔ انتخاب مناقب سلیمانیہ مرتبہ یار محمد ملتانی، حمیدیہ سٹیم پریس، لاہور، ۱۳۲۵ھ، ص ۲۰۰

۱۰۸۔ انتخابِ صابرہ، فاطمہ بیگم صابرہ، پیش کش معصومہ رضا، م۔ن، س۔ن، ص ۳۲ (مناجات، منقبت، سلام)

۱۰۹۔ انوارواذکار تاج اولیا حضرت خواجہ سید مخدوم علی احمد علاء الدین صابر کلیری، طیب قریشی اشرفی دہلوی، مکتبہ نئی منزل، مین بازار اوکھلا، دہلی ۲۵۔اول ۱۹۹۱ء (نظم ونثر، نعت، منقبت، سلام)

۱۱۰۔ انوارِ پنجتن، صابر براری، مکتبہ قادریہ، کراچی، ۱۹۷۰ء، اراول، ص ۳۲ (منقبت)

۱۱۱۔ انوارِ حرا، تنویر پھول، حرا فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۰۸ (نعت، منقبت، دیگر)

۱۱۲۔ انوارِ صحابہ، منشی محمد احمد بشر جگوری، مفید عام پریس پاٹا نالہ لکھنو، مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۱۶ (مناقب)

۱۱۳۔ انوارِ عرفاں، نیر سلطان پوری، ادارہ شمع ادب لکھنو روڑ، سلطان پوری، اکتوبر ۱۹۷۵ء، ص ۲۲۳ (حمد، نعت، منقبت)

۱۱۴۔ انوارِ عقیدت، دھرمیندر ناتھ، مرکز تحقیقاتِ فارسی، دھلی نو، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۵ (نعت، منقبت، سلام، قصائد)

۱۱۵۔ انوارِ قطب مدینہ، خلیل احمد رانا، مرکزی مجلسِ رضا، لاہور، ربیع الاول ۱۴۰۸ھ، ص ۴۸۰ (نظم ونثر، مناقب)

۱۱۶۔ اوجِ عرش، اوج یعقوبی، مرتبین، محمد علی زیرک شرفی و غلام محمد اطہر شرفی، الیاس ٹریڈرز، حیدرآباد (بھارت)، ۱۹۸۵ء، ص ۲۲۸ (نعت، منقبت، مرثیہ)

۱۱۷۔ اوراقِ غم، علامہ سید محمد احمد قادری، رضوی کتب خانہ لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۵۶۰ (سوانح ومناقب)

۱۱۸۔ ایقان، جمیل نظر، جمیل نظر فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۸ (نعت، منقبت)

۱۱۹۔ آبشارِ نور، کوثر شاہجہاں پوری، مکتبہ کوثر، راچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۲ (نعت، منقبت)

۱۲۰۔ آبشار، رزاق افسر، ناشر شاعر خود، بزم اردو، حیدر علی روڈ لشکر محلہ میسور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۳۲ (حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم)

۱۲۱۔ آبِ زم زم، قمر رعینی، افقرا کیڈمی، راولپنڈی، ۲۰۰۷ء، ص ۶۴ (حمد، نعت، منقبت)

۱۲۲۔ آتش کدہ وحدت، خواجہ مستان شاہ، رنبیر پرکاش، جموں، ۱۳۱۵ھ، ص ۴۶۲ (غزل، منقبت)

۱۲۳۔ آفتابِ چشت، شاہ انصاراللہ الہ آبادی، حدیقہء صلوٰۃ وسلام، سی ۷ ۱۲ بلاک جے شمالی ناظم آباد کراچی، س۔ن، ۲۲۲ (مناقب)

۱۲۴۔ آگہی کے چراغ، گوہر کریم نگری، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۴ (غزل، منقبت، ثلاثی)

۱۲۵۔ آواز کے بوسے، سید شاہ نصیرالدین بسمل ابوالعلائی، رحیم پریس چھتہ بازار حیدرآباد، دکن، ۱۹۸۸ء، ۱۳۲ (مناقب)

۱۲۶۔ آئینہ اسرارِ معرفت (دیوان شمس صابری) شاہ شمس الدین چشتی صابری القادری، ناشر حضرت اوگھٹ شاہ، وارثی فاونڈیشن سیواسنستھان، خانقاہ عالیہ وارثیہ بچھراوں شریف، ضلع جے پی نگر (یو۔پی) دوم ۲۰۱۲ء، ص ۸۰ (مناقب)

۱۲۷۔ آئینہء عقیدت، سید ذوالفقار پھند یڑوی، صولت پبلی کیشنز، ترلوک پوری، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۱۲۸۔ آئینہء عرفاں، صابر آروی، ناشر شاعر خود، پٹنہ، اول ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۴ (مراثی، رباعیات، (مناقب)

۱۲۹۔ آئینہء عقیدت، پروین بانو پروین، ادارہ فکر جدید، نئی دہلی ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۲ (سلام، منقبت، نوحہ، مراثی)

۱۳۰۔ آیاتِ عشق (مجموعہ کلام دوم) شاہ محمد عبدالغنی نیازی، نورالعرفان، راچی، ۱۹۷۱ء، باراول، ص ۴۷۴ (حمد، نعت، منقبت، دیگر)

۱۳۱۔ آیت الانبیاء، نفیس القادری، حدیقہ صلوٰۃ وسلام، کراچی، س۔ن، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)

۱۳۲۔ آیہء رحمت، ستار وارثی، بزم وارث، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۹۱ (نعت، منقبت)

۱۳۳۔ بابِ حرم، مظفر وارثی، القمر انٹر پرائزز لاہور، نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۸ (نعت، منقبت)

۱۳۴۔ بادہء حجاز، مولانا بدرالقادری، المجمع الاسلامی، مبارک پور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۸ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۱۳۵۔ باراہ رسول، سعید نایاب لکھنوی، آل انڈیا ہندی اردو سنگم لکھنؤ ۳، ص ۱۹۸۴ء، ص ۹۶ (نعت، منقبت، سلام)

۱۳۶۔ بارشِ رحمت یعنی مجموعہ نعت ومنقبت، مولوی سلطان احمد، نظامی بک ایجنسی، بدایوں، مارچ ۱۹۶۶ء، ص ۸۰ (نعت، منقبت)

۱۳۷۔ بازگشت غم، مرتضیٰ زمان گردیزی، گردوپیش پبلی کیشنز، ملتان، ۲۰۲۳ء (منقبت، سلام)

۱۳۸۔ باغِ کلام اکبر یعنی مدائح پیغمبر، محمد اکبر خان وارثی، ۱۳۱۷ھ، ص ۶۰ (نعت، مناقب)

۱۳۹۔ بحضورِ غوث اعظم، مرتبہ فرید قریشی، نشرح فاؤنڈیشن، عزیز آباد فیڈرل بی ایریا، کراچی،

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا٘ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝۲۹

(سورۃ الفتح ۴۸، آیت ۲۹)

منقبت، دیگر)

۱۴۲۔ بزمِ نعت ومنقبت، مرتبہ سلطان احمد کیف، دارالاشاعت، پکی بازار بنارس کینٹ، ۱۹۶۵ء، ص ۱۶ (نعت، منقبت)

۱۴۳۔ بعداز خدا، انورقدوائی، ناشر شاعر خود، حبیب الدین انورقدوائی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۰ (نعت، منقبت، سلام)

۱۴۴۔ بغداد دا چن (پنجابی) ، حمید بک ڈپو، نولکھا بازار، لاہور، ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ، ص ۹۶ (مناقب)

۱۴۵۔ بوستانِ عقیدت، سردار پنچھی، ککنس پرکاشن جالندھر، ۲۰۰۸ء، ص ۴۸ (مناقب)

۱۴۶۔ بوئے گل، شمیم ٹھٹھوی، ناشر ندارد، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۹۶ (نعت، منقبت)

۱۴۷۔ بہاراں مسکراں پیّاں (پنجابی) صائم چشتی، چشتی کتب خانہ، فیصل آباد، س۔ن، ص ۹۶ (نعت، منقبت)

۱۴۸۔ بہارستانِ منقبت، ۱۳۱۱ھ، معروف دیوان ظہیری، حکیم شاہ ظہیر احمد ظہیر سہسوانی بدایونی، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ، جنوری ۱۸۹۹ء، ص ۵۶ (مناقب)

۱۴۹۔ بہارِ امجدی، موجود چشتی، دارالاشاعت: خانقاہِ امجدیہ اسٹیشن روڑ سیوان بہار، مارچ ۲۰۱۰ء، ص ۱۸۰ (مناقب)

۱۵۰۔ بہارِ عقیدت المعروف سوانح محبوب الاولیا، محمد بشیر احمد بشیر القادری، دامودر پور، مظفر پور، بہار، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۳ (مناقب)

۱۵۱۔ بہارِ گنبدِ خضرا، مولانا شفیق احمد شفیقؔ بریلوی، بزم شفیق ادب لانڈھی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۴ (نعت، منقبت)

۱۵۲۔ بہشتِ عقیدت، واثق ذائقی بنگلوری، انجمنِ غلامانِ مصطفی، راچی ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۴ (نعت، منقبت)

۱۵۳۔ بیاض نور، عقیل ہاشمی، ناشر مصنف، حیدرآباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۰ (حمد نعت، منقبت)

۱۵۴۔ بیاضِ جاں، آغا سروش، فدک انکلیو، دارالشفا حیدرآباد، ۱۴۳۳ھ ص ۴۹۶ (نعت، منقبت)

۱۵۵۔ بیاضِ نور، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ناشر خود، حیدرآباد (بھارت) ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۰ (نعت، منقبت)

۱۵۶۔ بے چراغ خیمہ، ساجد احسان، ساجد اکیڈمی، کراچی، س۔ن، ۹۶ (منقبت امام حسینؓ)

۱۵۷۔ بُستانِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، صوفی اصغر احمد اظفر بدایونی، صوفی عمر المصطفیٰ اظفری، لاہور، س۔ن، ص ۸۰ (ناقص الآخر) (نعت، منقبت)

۱۵۸۔ بُستانِ مناقب، عزیز الدین خاکی القادری، ضیاالدین پبلی کیشنز، کھارادر، کراچی، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ۸۰ (مناقب)

۱۵۹۔ پھولوں کی چادر (ریاض معطر) گل دستہ وارثی (نذر خواجہ غریب نواز)، مثنوی آئینہء جمال، از بیدم شاہ وارثی اٹاوی، خورشید بک ڈپو امیٹھی ہاوس، لکھنو، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۷ (مشترکہ کتاب) (نعت، منقبت، مثنوی)

۱۶۰۔ تابندگی، خمار انصاری، بزم تخلیق ادب، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۴۴ (نعت، منقبت)

۱۶۱۔ تاجدارِ طریقت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سکندر لکھنوی، خلیل بک ڈپو، کراچی، ۱۹۹۳ء، باراول، ص ۹۶ (منقبت)

۱۶۲۔ تاریخ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، مصنف لاالعلم، افضل بک ڈپو پھاڑی بھوجلا دہلی، ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۲ (نظم ونثر، مناقب)

۱۶۳۔ تجلی نور، کرشن بہاری نور، مرتبہ مرزا شفیق حسین شفق، ادارہء لوح وقلم، قصبہ سانکھنی، ضلع بلند شہر، یو۔پی۔مئی ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۳ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۱۶۴۔ تجلیات، سلیم ہاشمی، بزم اردو میسور، ۱۹۹۰ء، ۱۴۴ (حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم)

۱۶۵۔ تجلیاتِ شمس، حاجی شمس الحق شمسؔ پینسوی، ۵۳۔شالیمار لنک روڑ، مجاہد آباد (رام گڑھ) مغل پورہ لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۲۴ (نعت، منقبت)

۱۶۶۔ تجلّیِ بغداد، بابو محمد یوسف نوشاہی، حکیم نذیر حسین نوشاہی، شیخوپورہ، ۱۹۸۴ء، باردوم، ص ۱۱۲ (منقبت)

۱۶۷۔ تجلّی، حسین سحر، کتاب نگر، ملتان، ۱۹۹۸ء، باراول، ص ۱۲۸ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۱۶۸۔ تحریکِ ایمانی، ذوقی بھوپالی، ناشر رفاقت حسین خان ذوقی، بھوپال، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۴ (نعت، منقبت)

۱۶۹۔ تحفہء نور، نور جہاں بنت احمد عرب، نیو مجاز پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء، باراول، ص ۱۰۶ (نعت، منقبت، دیگر)

۱۷۰۔ تحیاتِ ہادی، ہادی قادری، باہتمام محمد عبدالحمید ایڈیشنل اسسٹنٹ انجینئر، مستعد پورہ حیدرآباد، ستمبر ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۲، (نعت، منقبت)

۱۷۱۔ تذکرہء غوثیہ اسم تاریخی شجرہ معرفۃ مع ضمیمہ جدیدہ مرتبہ شاہ گل حسن، باہتمام محمد عبدالاحد، مطبع مجتبائی دہلی، مارچ ۱۹۱۱ء، ص ۲۰ (نظم ونثر۔مناقب)

۱۷۲۔ ترتیل، سید اختر حسنی اختر چشت نظامی، حلقہ ارباب چشت، کراچی، باردوم، ص ۳۱۱ (نعت

منقبت سلام و دیگر)

۱۷۳۔ ترجمہ احیاء المیت فی فضائل اہل بیت منظوم، اولاد حسین، سرکاری پریس رام پور، ۱۹۲۶ء، ص ۶۴ (مناقب)

۱۷۴۔ تری آواز مکے اور مدینے، ڈاکٹر محبوب راہی، مکتبہ شاداب، ریڈ ہلز، حیدرآباد ۴ دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۰ (حمد، نعت، منقبت، سلام، مناجات)

۱۷۵۔ تسلیم و رضا، تہنیت النساتہنیتؔ، رفعت منزل، خیرت آباد، حیدرآباد (انڈیا)، ۱۹۵۹ء، ص ۹۶ (نعت، منقبت)

۱۷۶۔ تصویرِ کمالِ محبت، ادیب رائے پوری، ناشر مصنف، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۶ (نعت، منقبت)

۱۷۷۔ تضمین بر مناجات خلیفہ اول، عزیز صابری، شاعر خود، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۸ (منقبت)

۱۷۸۔ تقدیسِ شعر، مولانا صحوی شاہ، ادارہ النور، حیدرآباد (بھارت)، ۱۹۹۵ء، باردوم، ص ۹۰ (نعت، منقبت، دیگر)

۱۷۹۔ تقدیس، تابش دہلوی، ادب گاہ، کراچی، ۱۹۸۵ء، باراول، ص ۱۹۱ (نعت، منقبت، سلام)

۱۸۰۔ تمام و ناتمام، عاصی کرنالی، سید قمر زیدی، ملتان، ۱۹۹۴ء، باراول، ص ۶۷۸ (حمد، نعت، منقبت، سلام، دیگر)

۱۸۱۔ تمنائے نیاز، نیاز الدین نیاز صدیقی، ذکاء الرحمٰن یونس نقشبندی، سیالکوٹ، س۔ن، ص ۶۸ (نعت، منقبت)

۱۸۲۔ تنویرِ رسالت، قیصر عزیز، ناشر شاعر خود، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۲ (حمد، نعت، مناجات، منقبت)

۱۸۳۔ توشہء آخرت، مظفر علی پاسخ، مطبع منشی نول کشور، لکھنو، مارچ، ۱۸۸۸ء، ص ۲۴۸ (نعت، منقبت)

۱۸۴۔ ثنائے آقا، عبدالجبار اثر، جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۸ (حمد، نعت، سلام، منقبت)

۱۸۵۔ ثنائے مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ظفر سنبھلی، ناشر خود، مراد آباد، ۲۰۰۴ء، باراول، ص ۱۲۸ (نعت، سلام، منقبت)

۱۸۶۔ جادہء ارم، سید خورشید انور ارم سرسوی، زیدی بک ڈپو، بس اسٹینڈ سرسی، مراد آباد، اول ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۳ (سلام، منقبت، نوحے)

۱۸۷۔ جادہء نور، درشن سنگھ، ساون کرپال روحانی مشن، دلی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۲ (نظم، قطعات، مناقب)

۱۸۸۔ جام کوثر، اقبال حسین اقبال، ناشر شاعر خود، اندرون فتح دروازہ، حیدرآباد، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۱۸۹۔ جامع المناقب (بزبان دکنی)، مولوی رحمت اللہ لکھنوی، امیر المطابع، آگرہ، ۱۲۵۰ھ (مناقب)

۱۹۰۔ جانِ کائنات (اردو، پنجابی) صائم چشتی، چشتی کتب خانہ، فیصل آباد، ۱۹۸۵ء، بار پنجم، ص ۱۲۸

(نعت،منقبت)

۱۹۱۔ جذب صادق،صادق نقوی، باب العلوم سوسائیٹی، دارالشفا حیدرآباد، ۱۹۸۳ء،ص ۱۲۸ (منقبت،سلام)

۱۹۲۔ جذبات صادق، صادق علی فریدی، ناشرشاعرخود،محلہ رامیا پادلی محبوب نگر آندھرا پردیش،۲۰۰۷ء،ص ۱۸۸ (نعت،منقبت،غزل)

۱۹۳۔ جذبات نجمی، سید ظفر مہدی نجمی مرتبہ اسماء رفعت حسین نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۴ء،ص ۲۶۴ (حمد،نعت،سلام،منقبت،قصائد،غزل)

۱۹۴۔ جذبات نجمی،مرتبہ اسما رفعت حسین،اردو پبلشرز،۹۱ باغ منو،نیا گاؤں،لکھنؤ، ۱۹۸۴ء،ص ۲۶۴ (نعت،منقبت،سلام،غزل)

۱۹۵۔ جذباتِ حامد (جلداول) شاہ محمد عبدالحامد قادری بدایونی،مرتبہ،صاحبزادہ محمد شاہد عامر قادری، کراچی، ۲۰۰۳ء،باراول (نعت،منقبت)

۱۹۶۔ جذباتِ عقیدت، روپ کنواری، مطبوعہ نظامی پریس آہنی پھاٹک لکھنو، س۔ن،ص ۲۴ (مناقب علی ۳عدد)

۱۹۷۔ جسارت،عزیز وارثی،مکتبہ ندائے اتحاد، دہلی،۱۹۷۶ء،ص ۱۲۸ (نعت،منقبت،نظم)

۱۹۸۔ جشن عشرت،محمد خان عشرت،نظامی پریس بدایوں، (منقبت۔نظم)

۱۹۹۔ جلوے،صائم چشتی،چشتی کتب خانہ،جھنگ بازار،فیصل آباد،دسمبر ۱۹۸۴ء،ص ۹۶ (نعت،منقبت)

۲۰۰۔ جمال کربلا،جمال قریشی،ناشر شاعر،لکھنؤ،۱۹۹۵ء،ص ۱۲۸ (نعت،منقبت،سلام)

۲۰۱۔ جمالیات، بدالحسن جمالی، جمالیات اشاعت کمیٹی مدراس، ۱۹۹۵ء،ص ۲۵۲ (حمد،نعت، منقبت ودیگر)

۲۰۲۔ جمالِ یار، راشدہ عارفی، سرفراز قومی پریس لکھنو،۲۰۱۱ء،ص ۲۱۰ (نعت،سلام،منقبت)

۲۰۳۔ جمیل الشیم ،بدرالقادری،الجمیع الاسلامی،فیض العلوم،محمد آباد،اعظم گڑھ،۱۹۹۱ء،ص ۱۱۲ (حمد، نعت،منقبت،سلام)

۲۰۴۔ جمیل الشیم،مولانا بدرالقادری،المجمع الاسلامی،مبارک پور،۱۹۹۰ء،ص ۱۹۲ (حمد،نعت،منقبت)

۲۰۵۔ جناں بکف،مولانا محمد یونس مالیگ،رضا ریسرچ اینڈ پبلشنگ بورڈ،مانچسٹر،۲۰۰۰ء،ص ۱۶۳ (نعت،منقبت)

۲۰۶۔ جواہر مناقب یعنی حضرت قطب ربانی غوث صدانی سید عبدالقادری جیلانی رضی اللہ عنہ،محمد حسام الدین فاضل قادری،مطبع دستگیری چیلہ پورہ حیدرآباد، دکن، ربیع الآخر ۱۳۶۳ھ،ص ۱۶ (مناقب)

۲۰۷۔ جواہر مناقب، محمد حسام الدین فاضل قادری، مطبع دستگیری چیلہ پورہ حیدرآباد دکن، ۱۳۶۳ھ، ص۱۶ (مناقب)

۲۰۸۔ جوئے رحمت مرتبہ سید شاہ محمد جمیل الدین ، زاویہ قادریہ ٹرسٹ، ریاست نگر، حیدرآباد (بھارت)، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۰

۲۰۹۔ جہان اجاگر، نثار علی اجاگر، فرید پبلی کیشنز، اردو بازار کراچی، اگست ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۰ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۲۱۰۔ چار آئینہ منظوم، غلام حسین جوہر، مطبع اودھ اخبار، لکھنؤ، س۔ن (مدح چار یار)

۲۱۱۔ چاند ستارے، ، ع، ء، بخار علیگ، ادارہ تعمیرِ ادب، گلستان مصطفیٰ النور سوسائیٹی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۶۴ (نعت، منقبت)

۲۱۲۔ چراغ مشرق، ظہوالدین ظہور بسوانی، ناشر شاعر خود، بسواں ضلع سیتا پور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۸ (غزل، نعت، منقبت، گیت)

۲۱۳۔ چراغِ اُنس، مولانا احمد رضا خان بریلوی، اعلیٰ حضرت تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں، س۔ن، ص۴۶ (منقبت)

۲۱۴۔ چشمہ کوثر، سلیم اللہ بدایونی، (فہرست صدیق بک ڈپو لکھنو، ص ۱۳۱)

۲۱۵۔ چشمہءِ فیضِ نور، سید مہدی جعفر، شارپ ٹریک کمپیوٹرز، الہ آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۰ (نعت، منقبت)

۲۱۶۔ چشمہءِ فیض، زاہد قریشی حیدرآبادی، منصور پبلشر، حیدرآباد، یکم ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ، ص ۳۲ (مناقب)

۲۱۷۔ چشمہءِ کوثر، مولانا نعیمی، اطہر القادری اطہر، جہانِ حمد پبلی کیشنز، نوشین سینٹر دوسری منزل اردو بازار، کراچی، جنوری ۲۰۱۲ء، ص ۸۸ (نعت، منقبت)

۲۱۸۔ چمن ابراہیمی ابر بہار ۱۳۲۳ھ، مطبع سعیدی کلکتہ، ص ۳۲ (نعت، منقبت، ٹھمری، بھجن)

۲۱۹۔ چمنستان سخن، محمد حسن خان اسیر بریلوی، مطبع رفاہ عام گورکھپور، دسمبر ۱۹۰۸ء، ص ۸۰ (غزل، نعت، منقبت)

۲۲۰۔ چمنستانِ عقیدت حصہ اول، فاطمہ زیدی، احباب پبلشرز، مقبرہ گولہ گنج لکھنو، اول جون ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۲ (نعت، منقبت، سلام، مرثیہ)

۲۲۱۔ چمنِ فضیلت ۱۴۱۳ھ، قدیر احمد قدرؔ القادری، ۲۲۰۔ای، یونٹ ۱۱، لطیف آباد، حیدرآباد (سندھ)، اپریل ۱۹۹۳ء، ص ۲۰ (مناقب)

۲۲۲۔ چمنِ نعت عرف خیاباں، ابوالخیر وفاوارثی اجمیری، مرتضائی پریس، آگرہ، ص ۳۲ (حمد، نعت، منقبت)

۲۲۳۔ حدیقہء عقیدت، مظہر عارف، ناشر خود، کراچی، ۲۰۰۳ء، بار اول، ص ۲۴۴ (نعت، منقبت)
۲۲۴۔ حرف حرف خوشبو، شمیم انجم وارثی، گلستان پبلی کیشنز کلکتہ، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)
۲۲۵۔ حرفِ ثنا، محشر بدایونی، مقبول اکیڈمی، لاہور، جولائی ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۲ (حمد، نعت، منقبت)
۲۲۶۔ حرفِ معتبر، سید شمس وارثی، بزم ادب نیشنل بینک آف پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۶ (حمد، نعت، منقبت، سلام، دیگر)
۲۲۷۔ حروف مدحت، اختر ہاشمی، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۴۰ (منقبت)
۲۲۸۔ حسنت جمیع خصالہ، قمر انجم، پاکستان نعت کونسل کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۰۸ (نعت، منقبت)
۲۲۹۔ حسنِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (کشفِ غیب)، سید محمد امین علی نقوی، باب الہدیٰ، فیصل آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)
۲۳۰۔ حسین ہی حسین، سید محمد امین علی نقوی، مطبع سدرہ پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۷ (منقبت)
۲۳۱۔ حمد و نعت اور منقبت، محمد انیس الرحمان، سید سلیمان اکیڈمی، کاچی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۲ (حمد، نعت، منقبت)
۲۳۲۔ حمد و نعت و مناقب، سید احمد رئیس، معینی دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۸ (بسلسلہ عرس خواجہ غریب نوازؒ) (حمد، نعت، منقبت)
۲۳۳۔ حُسنِ کائنات، صائم چشتی، چشتی کتب خانہ، جھنگ بازار، فیصل آباد، چہارم ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)
۲۳۴۔ خاکِ درِ بُوترابؑ، کرامت غوری، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۶ (منقبت)
۲۳۵۔ خزانہء بہشت، مولانا ضیاء القادری، مرتبہ غوث محمد خان ناظم، بزمِ ضیاء، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۹۷۴ (نعت، منقبت)
۲۳۶۔ خزینہء مناقب سخی عبدالوہاب شاہ مرتبہ خان اختر ندیم، انجمن عاشقانِ مدحت مصطفی، حیدرآباد (سندھ)، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۳۲ (انتخاب مناقب)
۲۳۷۔ خزینہء مناقب،، مرتبہ خان اختر ندیم، انجمن عاشقانِ مدحت مصطفی، حیدرآباد (سندھ)، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۳۲ (انتخاب مناقب سخی عبدالوہاب شاہ جیلانی)
۲۳۸۔ خلاصۃ المناقب (درمناقب میر سید علی ہمدانی) مؤلفہ نورالدین جعفر بدخشی بہ تصحیح دکتر سیدہ اشرف ظفر، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۴۱۱
۲۳۹۔ خلفائے راشدین در قلم رو نظم و نثر فارسی، مؤلفہ فریدون سپہری، انتشار کردستان، ایران، ۱۳۷۸ھ، ص ۲۲۷
۲۴۰۔ خلقِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سید محمد حنیف اخگر ملیح آبادی، دبستانِ وارثیہ، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۲۴،

(حمد،نعت،منقبت)

۲۴۱۔ خوابِ مکرّم کے (اردو، پنجابی)،محمد مشتاق قادری، ویلز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۳ (منقبت، دیگر)

۲۴۲۔ خوشبوئے التفات، رشید وارثی، بزمِ وارث، مئی ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۸ حمد،نعت،مناقب)

۲۴۳۔ خوشبوئے مناقب، محمد اشرف رضا قادری، امین شریعت دارالمطالعہ، بلودا بازار چھتیس گڑھ، ۲۰۲۳ء، ص ۸۸ (مناقب)

۲۴۴۔ خونابۂ ذبیح، سید محمد اسماعیل ذبیح، مطبع قاسمی لکھنو، ۱۹۲۸ء، ص ۳۵۴ (حمد،نعت،منقبت،سلام)

۲۴۵۔ خیابانِ ارم، حامد امروہوی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، باراول، ص ۱۵۹ (حمد،نعت،منقبت)

۲۴۶۔ خیرالکلام، قاری منظور احمد ناظم صابری، شیخ حمید الدین حاکم ٹریننگ سنٹر، رحیم یار خان، ۲۰۰۰ء، ص ۶۳ (نعت،منقبت)

۲۴۷۔ دامن عطار، مولانا نثار علی اجاگر، جیلانی پبلشرز، کتاب مارکیٹ اردو بازار، کراچی، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۳۲ (مناقب)

۲۴۸۔ دامن محبوب، غلام صابر قدیری، دفتر بزم قدیری، قدیری منزل مرغ خانہ رام گنج، حسین آباد لکھنؤ۔۳، ۱۹۸۶ء، ۲۳۲ (نعت،منقبت)

۲۴۹۔ دامنِ محبوب، قاضی غلام صابر قدیری سندیلوی، نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۶ء، ص ۲۳۴ (نعت،منقبت)

۲۵۰۔ درالدارین فی مناقب غوث الثقلین، مطبوعہ حیدرآباد، دکن

۲۵۱۔ دربارِ کرم، شاغل ادیب، نیرنگ ادب پبلی کیشنز، زیب منزل، مشیرآباد، حیدرآباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۲ (حمد،نعت،منقبت)

۲۵۲۔ درودوسلام، عبداللہ قاسمی آزاد، مکتبہ نعیمیہ صدر بازار مئو ناتھ بھنجن، یو۔پی، جون ۱۹۸۹ء، ص ۳۲ (نعت،منقبت)

۲۵۳۔ دستہءگل، فاضل عثمانی، سہیل فاضل عثمانی، کراچی ۱۹۹۲ء، باراول، ص ۱۲۸ (نعت،منقبت)

۲۵۴۔ دشتِ گل، زبیدہ تحسین، ثمرین پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، ص ۲۵۱ (منقبت،نظم،غزل)

۲۵۵۔ دفتر برکات ۱۳۰۷ھ، المعروف بہ مناقب خواجہ، محمد شاہ عرف سید فقیر محمد فدا حسینی، مطبع رحمانی بمبئی، جمادی الآخر ۱۳۰۷ھ، ص ۸۰ (مناقب خواجہ)

۲۵۶۔ دفترِ برکات المعروف بہ مناقبِ خواجہ، فقیر امجد شاہ عرف سید فقیر محمد فدا حسینی، جمادی الآخر ۱۳۰۷ھ، ص ۸۰ (مناقب)

۲۵۷۔ دلِ ریزہ ریزہ، ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، حریم ادب، راچی، ۱۹۹۷ء، باراول، ص ۲۱۶ (نعت، منقبت)

۲۵۸۔ دمادم مست قلندر، سید محمد امین علی نقوی، آستانہ قادریہ، باب الہدیٰ، فیصل آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)

۲۵۹۔ دیوان اشعار، ابوالعطا کمال الدین محمود بن علی بن محمود خواجو کرمانی مرتبہ احمد سہیلی خوانساری، چاپخانہ حیدری تہران، ایران، ۱۳۳۶ھص ۹۱۶ (غزل، قصیدہ، منقبت)

۲۶۰۔ دیوان اول و ثانی مسمیٰ بہ بہارستانِ منقبت، فضل رسول قادر مجید، مطبع اعجازِ محمدی، حیدرآباد دکن، ۱۳۱۱ھ، ص ۸۸

۲۶۱۔ دیوان آزاد، جلد اول، محمد ابراہیم آزاد حسین پوری، مطبع مرتضائی آگرہ، اول ۱۳۵۰ھ، ص ۳۰۴ (نعت، منقبت، قصائد)

۲۶۲۔ دیوان ثانی در مدح اکمل الاولیا جناب محبوب سبحانی ۱۳۰۳ھ، عبدالقادر قادری مجیدی، مطبع نسیم سحر، بدایوں، ۱۸۸۶ء، ص ۳۶ (مناقب)

۲۶۳۔ دیوان لعل معروف بہ دریای قدرت، لعل محمد لعل، مطبع نورالاسلام حیدرآباد، دکن، ۱۳۱۱ھ، ص ۹۵ (نعتیہ قصائد، مناقب)

۲۶۴۔ دیوان منقبت سیدالافراد جناب محبوب سبحانی، مولوی محمد عبدالقادر بدایونی، مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ، ۱۲۹۹ھ، ص ۵۴ (مناقب)

۲۶۵۔ دیوان یٰسین نیازی، غلام یٰسین خان نیازی، مطبع ندارد، ۱۳۵۴ھ، ص ۲۰۵ (نعت، منقبت)

۲۶۶۔ دیوانِ ریاض، سید محمد ریاض الدین سہروردی، رومی پبلشنگ ہاؤس، کراچی، س۔ن، ص ۲۷۲ (حمد، نعت، منقبت)

۲۶۷۔ دیوانِ غالب نعت و منقبت، تحقیق و تدوین، ڈاکٹر سید تقی عابدی، شاہد پبلی کیشنز، نئ دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۸۲۰ (نعت، منقبت)

۲۶۸۔ ذخیرہ ءمناقب مع ہفت بند ملا کاشی مترجم ۔۔۔حسب فرمائش پیارے صاحب جوہر، ادبی پریس لکھنو ۱۹۲۷ء، ص ۱۷۷ (مناقب)

۲۶۹۔ ذکرحسین علیہ السلام، مولانا اعجاز اجمیری، چشتیہ صوفی مشن (انٹرنیشنل) درگاہ شریف، اجمیر، س۔ن، ص ۳۳ (مناقب)

۲۷۰۔ ذکر صل علیٰ، عزیز الدین خاکی القادری، تنظیم استحکام نعت، کراچی، جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)

۲۷۱۔ ذکرِ ارفع، مبارک مونگیری، مبارک مونگیری میموریل اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۴

(مناقب)

۲۷۲۔ رازِ نیاز، شاہ محمد تقی عرف عزیز میاں، مرتبہ بہزاد لکھنوی، خانقاہِ نیازیہ محلہ خواجہ قطب، بریلی شریف، ۱۹۴۴ء (منقبت، غزل)

۲۷۳۔ راہرو سے رہنما تک، (سیرت خلفائے راشدین) انور جلال پوری، دانش محل امین آباد لکھنو، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۶ (مناقب)

۲۷۴۔ راہِ بہشت، شارق رشید، حمد و نعت ریسرچ، کراچی، ۲۰۲۰ء (منقبت، سلام)

۲۷۵۔ رحمتِ تمام، صابر شاہ آبادی، س۔ن، م۔ن (نعت، منقبت)

۲۷۶۔ رحمتِ تمام، صابر شاہ آبادی، عزیز لیتھو الیکٹرک مشین گل برگہ شریف، ۱۹۷۳ء، ص ۶۴ (نعت، منقبت، سلام)

۲۷۷۔ رحمتِ کل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، مہر پیلی بھیتی، ناشر خود، راچی ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۴ (نعت، منقبت)

۲۷۸۔ رنگ و آب، سید محمود حسن قیصر امروہوی، سید محمود حسن قیصر امروہوی، زہرہ باغ علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۰ (منقبت، سلام)

۲۷۹۔ رنگ و خوشبو نور و نکہت، حکیم راؤ عبداللہ عزمی، حرا فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۲ء، ۱۱۲ (نعت، منقبت)

۲۸۰۔ رنگِ نظام، پیر سید نصیر الدین نصیر، س۔ن، م۔ن، ـــــــــ۔ (مناقب (رباعیات)

۲۸۱۔ روحِ دل، رئیس اختر، ادرہ دیارِ ادب، آندھرا پردیش، ص ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۸ (حمد، مناجات، نعت، منقبت، سلام)

۲۸۲۔ روحِ کائنات (اردو، پنجابی)، صائم چشتی، چشتی کتب خانہ، فیصل آباد، نومبر ۱۹۸۵ء، بار پنجم، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)

۲۸۳۔ روحِ نفیس، نفیس القادری، حدیقہ صلوٰۃ وسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۴ (نعت، منقبت)

۲۸۴۔ روشن کائنات، روشن بنارسی، ناشر شاعر خود، ہملٹن روڈ، کشمیری گیٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۷۶ غزل، نظم، قصائد، مناقب)

۲۸۵۔ روشنی کے درمیاں، محمد اقبال نجمی، فروغ ادب اکادمی، گوجرانوالہ، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۴ (حمد، نعت، مناقب، نظم)

۲۸۶۔ روشنی کے سلسلے، عبدالغنی تائب، فضلی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء، بار اول، ص ۱۶۰ (منظوم اسلامی تعلیمات، منقبت)

۲۸۷۔ روضہء رضواں حصہ سوم، مرتبہ سید محمد اصغر، مطبع اثنا عشری لکھنو، س۔ن، ص ۳۰۰ (نعت، منقبت)

۲۸۸۔ روضہء رضواں، چودھری سید محمد اصغر رضوان، باہتمام سید محمد تقی لکھنوی، جمادی الآخر

۱۳۱۹ھ،ص ۳۲۰ (مناقب)

۲۸۹۔ روضۃ النعیم ۱۳۰۱ھ شاہ امین الدین احمد فردوسی ثبات، در مطبع شرف الاخبار بہار، ۱۳۰۱ھ، ص ۱۲۹ (مناقب)

۲۹۰۔ رہبرِ نعت، صوفی رہبر چشتی، مرتبہ شہزاد احمد، مرکزی انجمن رہبر اسلام، کراچی، س۔ن، ص ۲۶۴ (نعت، منقبت)

۲۹۱۔ ریاض اکبر نو ترمیم (تیسرا دیوان) مع کیفیت چمن وارث، محمد اکبر خان وارثی، ملک دین محمد تاجر کتب لاہور، ۱۲۹۵ھ، ص ۱۱۲ (نعت، منقبت)

۲۹۲۔ ریاض الجنان، مولانا محمد باقر آگاہ مدراسی، رحمان پریس، حیدرآباد دکن، ۱۲۸۵ھ، ص ۱۹۲

۲۹۳۔ ریاض صابری مرتبہ محمد شاہ چشتی صابری، مطبع گلزار حسنی، ۱۳۱۴ھ، ص۔۔۔ (مناقب)

۲۹۴۔ ریاض صابری مرتبہ محمد عبدالحکیم خاں حاذق، مطبع حقانی، دہلی، اول س۔ن، ص ۳۲ (مناقب)

۲۹۵۔ ریاضِ صابری ۱۳۱۴ھ مرتبہ محمد شاہ چشتی صابری، مطبع گلزار حسنی، س۔ن، ص ۴۸ (مناقب)

۲۹۶۔ ریاضِ عقیدت، رئیس نعمانی، علمستان اصطبل چار باغ لکھنو۔۱، اول ربیع الاول ۱۳۹۹ھ، مارچ۔ اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۵۰ (نعت، منقبت)

۲۹۷۔ ریاضِ عقیدت، شاہ محمد رجب علی قادری، نوری پرنٹرز مچھلی بازار کلیان، ۱۹۸۸ء، ص ۶۲ (نعت، منقبت)

۲۹۸۔ ریاضِ معلیٰ، محمد ریاض الدین معلیٰ، عماد پریس حیدرآباد، ۱۳۴۰ھ، ص ۱۰۷ (نعت، منقبت)

۲۹۹۔ ریاضِ ہاشمی، محمد شرف الدین تسلیم علوی، فیروز بک ڈپو، نیو مارکٹ بنگلور ۲، ۱۳۶۶ھ، ص ۳۱۲ (حمد، نعت، منقبت)

۳۰۰۔ زادِ سبیلِ آخرت ۱۳۱۵ھ، سید اولاد حسین رضوی، منشی نول کشور لکھنو، ۱۸۹۹ء، ص ۴۴۸ (سلام، مناقب)

۳۰۱۔ زبانِ عقیدت، باقر منظور، دارالاشاعت، مدویہ چنچل گوڑہ حیدرآباد، ۱۹۸۴ء، ص ۲۳۹ (نعت، منقبت)

۳۰۲۔ زین البرکات فی مناقب اہلِ بیت، سید محمد زین العابدین شاہ راشدی، ادارہ زین الاسلام آستانہ قادریہ، شاہی بازار حیدرآباد سندھ، جون ۲۰۱۰ء

۳۰۳۔ زینت المیلاد، محمد عمر قادری وارثی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۴ (نعت، سلام، منقبت، نظم ونثر)

۳۰۴۔ زینت انجمن، ۱۸۶۷ء، عبدالرحمن، مطبع منشی نول کشور لکھنو، ۱۲۸۱ھ (منقبت، مناجات، قصائد)

۳۰۵۔ ساغر دکن ۱۳۳۵ھ، المعروف گل دستہ شیدا، مصنفہ شیخ احمد شیدا، اعظم سٹم پریس چار مینار حیدرآباد دکن، ص ۲۴ (غزل، نعت، منقبت)

۳۰۶۔ ساقیِ کوثر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خان اختر ندیم، انجمن عاشقانِ مدحت مصطفی، حیدرآباد، ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۴

(نعت،منقبت)

۳۰۷۔ سامانِ تسکین، شاہ حسین نہری، نوائے دکن پبلی کیشنز، اورنگ آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۶ (حمد، نعت، منقبت، مناجات)

۳۰۸۔ سبحٰن الذی اسریٰ، شاہ انصاراللہ الہ آبادی، ۲۰ ڈی این بلاک سخی حسن دربار شمالی ناظم آباد، کراچی، نومبر ۱۹۹۸ء، ص ۷۶ (نعت، منقبت)

۳۰۹۔ سبز گنبد نیلا آسمان، احمد فاخر، انجمن سخنوران پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۵ (نعت، منقبت، سلام)

۳۱۰۔ ستارہء چشت، مولانا ضیاء القادری، ناشر ندارد، کراچی۔ ۳،۱۹۵۱ء، ص ۱۴۰ (ناقص الاول و آخر) (منقبت، دیگر)

۳۱۱۔ سجن نت سوجھرا (سندھی) اکرم بورڈ ڈائی، امام بخش اکیڈمی، کوٹری، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۵ (منقبت)

۳۱۲۔ سحابِ فیضاں، محمد عرفان رضوی،، بزمِ نعت پبلی کیشنز، یو۔ ۳۵۰، راجا بازار، راولپنڈی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۲ (مناقب)

۳۱۳۔ سحابِ کرم، محمد عرفان رضوی،، بزمِ نعت پبلی کیشنز، یو۔ ۳۵۰، راجا بازار، راولپنڈی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳۲ (مناقب)

۳۱۴۔ سحر محفل (فارسی)، منشی برج موہن لعل، باہتمام کیم جواہر لعل مہتمم مطبع مصدرالنوادر، آگرہ، ۱۸۵۴ء، ص ۲۰۰ (مناقب)

۳۱۵۔ سخنستان وجودی، شاہ محمد خالد وجودی، مکتبہ ابراہیمیہ، عابد روڈ حیدرآباد دکن، ۱۳۷۲ھ، ص ۱۱۳ (نعت، منقبت)

۳۱۶۔ سراج السالکین، شاہ انصاراللہ الہ آبادی، حدیقہء صلوٰۃ وسلام، ۱۵۱/۸، اورنگ آباد ناظم آباد کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۶۴ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۳۱۷۔ سرمایہء حیات، غلام خواجہ میر اسعد علی ابوالعلائی المعروف حسین نواب، النور گرافکس، حیدرآباد، اوّل، اگست ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۰ (نعت، منقبت)

۳۱۸۔ سرمایہء رؤف امروہوی، رؤف امروہوی، مرتبہ حامد امروہوی، ناشر مرتب خود، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۵۰۲ (نعت، منقبت، دیگر)

۳۱۹۔ سرمایہء عقبیٰ، مہدی اعظمی، مطبع اردو چینل پبلی کیشنز، ممبئی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷۴ (نعت، منقبت)

۳۲۰۔ سرمایہء نجات، سلیم امروہوی، حسن آرٹ ٹرسٹ نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۲ (نعت، منقبت)

۳۲۱۔ سرورالبشر، منور حسن، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۴ء (مناقب علی وحسنین)

۳۲۲۔ سرورِ جرجیس یعنی قصائد جرجیس، مولوی حمایت حسین خان جرجیس، مطبع سیّدی چھتہ بازار ،حیدرآباد دکن، ۱۳۴۵ھ، ص ۱۷۵ (قصائد، مناقب)

۳۲۳۔ سروشِ سدرہ، ارمان اکبرآبادی، مرتبہ ڈاکٹر صدیقہ ارمان، شمیم بک ایجنسی، باراول، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۲ (نعت، منقبت)

۳۲۴۔ سعادت کے موتی، رجب علی نصرت نعیمی، صدیقی کیسٹ لائبریری، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۴ (نعت، منقبت)

۳۲۵۔ سفینۂ بخشش (اردو، عربی)، اختر رضا خان ازہری، ۱۹۹۰ء، برکاتی پبلشرز، کراچی، باراول، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۰ (نعت منقبت)

۳۲۶۔ سفینۂ عرفاں، صابر آروی، ناشر شاعر خود، پٹنہ، ۱۹۹۷ء، ص ۹۶ (حمد، نعت، منقبت، مراثی، نوحے)

۳۲۷۔ سلسلہ انوار کا، خاطر غزنوی، سنڈیکیٹ آف رائٹرز، پشاور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۲ (حمد، نعت، منقبت)

۳۲۸۔ سلسلۂ انوار، صابر شاہ آبادی، عمر پریس، حیدرآباد نمبر ا، مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۹۷ (نعت، مناقب)

۳۲۹۔ سلطان الاذکار فی مناقب غوث الابرار، مرتبہ شاہ محمد علم الیقین، دلپذیر پریس لکھنو، جمادی الآخر ۱۳۰۷ھ، ص ۲۱۲ (نظم ونثر۔مناقب)

۳۳۰۔ سلطانِ کربلا کو ہمارا سلام ہو، مرتبہ نعیم احمد فاروقی، الفرید کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز، ۱۱ نفیس مارکیٹ نیوانارکلی، لاہور، س۔ن، ص ۱۹۰ (نعت، منقبت)

۳۳۱۔ سلّموتسلیما، خواجہ شوق، ادبستان صفی، حیدرآباد (بھارت)، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۴ (حمد، نعت، منقبت)

۳۳۲۔ سمت کاشی سے چلا، کے، کے سنگھ مینک، مکتبہ دین وادب لکھنو، مارچ ۱۹۸۹ء، ص ۲۷ (نعت، منقبت، سلام)

۳۳۳۔ سوزنہان ناظر، سید شاہ ناظر حسین ناظر، ستارہ ہند پریس کلکتہ س۔ن، ص ۶۸ (قصیدہ (منقبت))

۳۳۴۔ سوزِ عقیدت، ڈاکٹر سردار سوز، غالب اکیڈمی آف نارتھ امریکہ انک نیوجرزی، امریکہ، اگست ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۲ (حمد، نعت، منقبت)

۳۳۵۔ سوغات، منظور حسین منظور رحمانی، زین انٹرنیشنل، مین اردو بازار، کراچی، مارچ ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۳۳۶۔ سوغاتِ عقیدت، حضرت شیخ سعدی دکنی برہان پوری، مرتبہ محمد تنویر رضا برکاتی، دارالسرور ایجوکیشن سوسائیٹی، برہان پور، ۲۰۱۷ء، ص ۳۲ (مناقب)

۳۳۷۔ سیرِ خلد، قمر مصطفوی شمس آبادی، ناشر شاعر خود، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۲ (نعت، منقبت، سلام)

۳۳۸۔ سیلِ تجلّیات، خالد محمود، یونائٹڈ ڈائری، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۲ (نعت، منقبت)

۳۳۹۔ سیلِ عقیدت، گوپی ناتھ امن لکھنوی، مرتبہ سید محمود نقوی، نشاط پبلی کیشنز، نیو برج پوری، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۶ (نعت، منقبت، قصیدہ، سلام)

۳۴۰۔ سِک متراں دی (پنجابی)، حفیظ تائب، القمر انٹر پرائزز، لاہور، س۔ن، بارسوم، ص ۱۳۶ (نعت، منقبت)

۳۴۱۔ شآبیب الرحمۃ (عربی)، حافظ محمد افضل فقیر، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۰ (حمد، نعت، منقبت)

۳۴۲۔ شانِ بندہ نواز، محمد امان علی ثاقب صابری، ہدیٰ آفیسٹ پریس پرانی حویلی، حیدرآباد، ۱۹۹۴ء، ص ۲۶ (سوانح، نعت، منقبت، سلام)

۳۴۳۔ شانِ غوث الوریٰ، مولفہ محمد امان علی ثاقب صابری، ایمرالڈ پریس ملے پلی حیدرآباد، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۱۶۰ (نظم ونثر۔مناقب)

۳۴۴۔ شانِ کائنات، چشتی، چشتی کتب خانہ، جھنگ بازار، فیصل آباد، ربیع الاول، ۱۴۰۲ھ، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)

۳۴۵۔ شانِ مخدوم صابر پاک مولفہ محمد امان علی ثاقب صابری، فیضان ولایت ٹرسٹ عارف نگر حیدرآباد، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۰ (نظم ونثر، مناقب)

۳۴۶۔ شاہِ مرداں، اختر حسین نقوی، مکتبہ فریدیہ، ساہیوال، ۱۹۸۹ء، ص ۳۴ (منقبت)

۳۴۷۔ شبستانِ عقیدت، پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی، ادارہ فیضِ ادب، کراچی، ص ۶۴ (نعت، منقبت، سلام)

۳۴۸۔ شراب الصالحین (مجموعہ سلام وتسلیم) غلام صابر قدیری سندیلوی، الواعظ پریس لکھنو، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۶ (نعت، منقبت، سلام)

۳۴۹۔ شعاعِ دل، سید الطاف علی الطاف احسانی، المعین مطبوعات، کراچی، س۔ن، باراول، ص ۸۰ (نعت، منقبت)

۳۵۰۔ شفیعِ محشر یعنی قصائد (مناقب چہاردہ معصومین علیھم السلام)، مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی، نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ، ۱۹۲۴ء، ص ۳۰۸ (حمد، نعت، منقبت)

۳۵۱۔ شکریہ وزیر، سید وزیر حسین رضوی، مطبع نامی منشی نول کشور، ۱۲۹۲ھ، ص ۱۰ مشمولہ میلاد مصطفوی ۱۲۹۷ھ (مناقب علیؑ وحسینؑ)

۳۵۲۔ شمع مناقب دستگیر ۱۲۹۷ھ یعنی پذیرائے قطب ربانی ۱۲۹۷ھ، چودھری محمد سعید الدین حسین، مطبع افضل المطابع وسعید الاخبار بدایوں، ص ۱۶ (مناقب)

۳۵۳۔ شہرِ علم کے دروازے پر، افتخار عارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، باراول، ص ۲۲۸

(حمد،نعت،منقبت)

۳۵۴۔ صاحب التاج،مظفر وارثی،علم وعرفان پبلشرز،لاہور، ۲۰۰۰ء، باراول، ۲۸۴ (حمد،نعت، منقبت،سلام)

۳۵۵۔ صاحبِ منبر ومحراب،قمر بدایونی،ادارہءصراطِ مستقیم،کراچی، ۱۹۸۵ء، باراول، ۱۲۶ (منقبت)

۳۵۶۔ صاد، تسنیم فاروقی، ناشر شاعر خود، ۱۸۴۔سی، تلسی داس مارگ، نزد ہسپتال لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۲ (نعت،منقبت،سلام،غزل)

۳۵۷۔ صباح آرزو، محمد عرفانؔ رضوی، مکتبہ ضیائیہ، اقبال روڑ،راولپنڈی، جون ۱۹۸۸ء، ص ۸۰ (مناقب پنجتن ودیگر)

۳۵۸۔ صبحِ تجلّی،شریف امروہوی،حسان نعت اکیڈمی،کراچی، ۱۹۹۰ء،ص ۶۴ (حمد،نعت،منقبت)

۳۵۹۔ صبر کے آنسو،مرتب وناشر محشر گونڈوی، گونڈہ،یو۔پی،اول ۲۰۱۳ء،ص ۱۶۴ (نعت،منقبت، غزل،نظم)

۳۶۰۔ صبغۃ اللہ ،شاہ انصاراللہ الہٰ آبادی،حدیقہءصلوٰۃ وسلام،سی ۱۲۷بلاک جے شمالی ناظم آباد کراچی،س۔ن،ص ۸۸ (نعت،منقبت)

۳۶۱۔ صحائفِ اشرفی، جاوید رسول جوہر اشرفیؔ،مکان ۳۰/ ۴ ۶۴ رحمت چوک سیکٹر ۲/ا۔۱۱،اورنگی، کراچی، ۲۰۱۱ء،ص ۳۹۲ (نعت،منقبت)

۳۶۲۔ صحیفہءعقیدت، مہدی نظمی، ہندوستان پبلی کیشنز،حسبی پورہ ،ابوکا بھٹہ ،غازی آباد، اکتوبر ۱۹۸۲ء،ص ۱۷۶ (مناقب (قصائد اہل بیت)

۳۶۳۔ صراط وسلسبیل ، شاہد نقوی، انٹرنیشنل حسینی آرگنائزیشن ،کراچی، ۱۹۹۲ء،ص ۳۰۰ (حمد، نعت،منقبت)

۳۶۴۔ صراطِ منزل،سید عاشور کاظمی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، (نعت،منقبت،نوحہ،سلام)

۳۶۵۔ صلِّ علیٰ،خواجہ شوق،ادبستان صفی،حیدرآباد (بھارت)، ۲۰۰۴ء،ص ۲۸۰ (حمد،نعت،منقبت)

۳۶۶۔ صلّو علیہ وآلہ، سید محمد اشرف قادری برکاتی، دارالاشاعت برکاتی ایٹہ، ۲۰۰۳ء،ص ۱۳۶ (حمد،نعت،منقبت)

۳۶۷۔ صہبائے حقیقت،شاعر فتحپوری،ناشر شاعر خود،چمن گنج،کانپور، ۱۹۹۵ء،ص ۱۶۰ (نعت،سلام،منقبت)

۳۶۸۔ صہبائے عشق،عبدالباری خاں کاوش رامپوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر،نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۲ (نعت،منقبت، عارفانہ غزل)

۳۶۹۔ صہبائے عقیدت،شبنم کمالی،شبنم کمالی اکیڈمی پوکھریرا سیتامڑھی،بہار، ۱۹۹۶ء،ص ۲۱۲ (نعت،منقبت)

۳۷۰۔ ضامن حقیقت، سید ضامن علی حسنی، بزم فروغ ادب، حیدرآباد، نومبر ۱۹۸۶ء، ص ۔۔(نعت، منقبت)
۳۷۱۔ ضرب لا الہٰ، انور جلال پوری، شاہد بک ڈپو، جلال پور، فیض آباد (یو۔پی)، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۲، اول (حمد، نعت، منقبت، سلام)
۳۷۲۔ ضوفشاں، محبت خان بنگش، ادارہء علم و ادب، بہزادی چکر کوٹ، کوہاٹ صوبہ سرحد، مارچ ۱۹۹۰ء ص ۸۸ (نعت، منقبت)
۳۷۳۔ ضیائے مبین، سید مبین علوی، ناشر سید ضیاء علوی، سید حسین علوی، دہلی، ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۲ (نعت، منقبت)
۳۷۴۔ ضیائے نبوت، عبدالرحیم ضیاء، مطبع مسلمانی عبداللہ مشتاق ویلور، ۱۲۸۰ھ، ص ۱۳۸ (نعت، منقبت)
۳۷۵۔ طلوعِ شمس، شمس الحق نظامی، نظامی اکادمی، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۲ (نعت، منقبت، دیگر)
۳۷۶۔ طوبیٰ، پروفیسر ہارون الرشید، ہارون اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲ (حمد، نعت، منقبت)
۳۷۷۔ طیبات غوثی، سیدی غوثی شاہ، مرتبہ مولانا غوثوی شاہ، ادارہ النور، حیدرآباد (بھارت)، ۲۰۰۲ء، بارِ ہفتم، ص ۱۶۷ (نعت، منقبت، دیگر)
۳۷۸۔ طیبات، شاہد انصاری و عبدالعلیم انصاری، ناگپور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۰ (حمد، نعت، منقبت، سلام)
۳۷۹۔ طُرّہِ سخن (اردو، فارسی)، سید اشرف الدین احمد، مطبع آصفی لکھنؤ، ۱۹۰۲ء، (نعت، منقبت)
۳۸۰۔ عرض و ثناء، گزرانیدہ میر شجاعت علی شجیع، اعظم سٹیم پریس، حیدرآباد دکن، (مناقب)
۳۸۱۔ عرفانیاتِ عارف، عارف اکبرآبادی، مرتبہ منظر عارفی، مرتب خود، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۹۶ (حمد، نعت، منقبت، مراثی)
۳۸۲۔ عرفانِ صابر، عزیز احسن، ناشر غلام جیلانی و میاں عبدالعتیق، سہارنپور، اول ۱۹۸۴ء، ص ۲۴۰ (نظم و نثر۔مناقب)
۳۸۳۔ عریضہ، عبدالوحید تاج، حمد و نعت ریسرچ، کراچی، ۲۰۱۵ء، (حمد، نعت، منقبت، سلام)
۳۸۴۔ عشقِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سید محمد امین علی نقوی، باب الہدیٰ، فیصل آباد، ۸۸۔۱۹۸۷ء، ص ۲۵۶ (نعت، منقبت)
۳۸۵۔ عطار کا دامن، عبدالکریم قادری بہلیم عطاری، جیلانی پبلشرز، کتاب مارکیٹ اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۶۴ (مناقب)
۳۸۶۔ عطائے ظہور، ارشاد حسین قمر وارثی، بزم ظہوریہ چشتیہ، قصبہ کالونی، نزد پراچہ اسپتال، کراچی، ۱۶ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ، ص ۱۲۸ (مناقب)
۳۸۷۔ عظمتِ غوثیہ، عمران القادری، حدیقہ صلوٰۃ وسلام، کراچی، س۔ن، ص ۶۷ (منقبت)

۳۸۸۔ عقیدت کا اعجاز، صلاح الدین ناصر، وجدان پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۴ (حمد، نعت، منقبت)

۳۸۹۔ عقیدت کا سفر، افتخار اجمل شاہین، بزم شادانی، شمالی ناظم آباد کراچی، جولائی ۲۰۰۴ء، ص ۷۷ (مناقب)

۳۹۰۔ عقیدت کے پھول (خاندانِ نبوت کے قدموں میں) شنکر کیموری، ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور پٹنہ، ۴۔۲۰۱۶ء، ص ۱۶۸ (نعت، منقبت)

۳۹۱۔ عقیدت کے پھول، محمد عثمان عارف نقشبندی، بیدل اکیڈمی، بیکانیر راجھستان، اگست ۱۹۸۰ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۳۹۲۔ عقیدت کے نقوش، واحد انصاری، برہانپور، سوپر آفیسٹ پریس، برہانپور، مئی ۲۰۲۲ء، ص ۱۰۵ (حمد، نعت، منقبت)

۳۹۳۔ عقیدت ہے، صلاح الدین ناصر، ادارہ تبلیغ الاسلام، نیویارک، ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۸ (حمد، نعت، منقبت)

۳۹۴۔ عقیدت (مع دیوان شاہ موجود و دیوان راحت)، کنیز فاطمہ، مرتبہ قمر النسا لکھنوی، جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۴ (حمد، نعت، منقبت)

۳۹۵۔ عقیدتوں کی مہک، رشید میواتی، خزینۂ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۲ (نعت، منقبت)

۳۹۶۔ عقیدتِ جاوداں، قمر جلالوی، مرتبہ مجاہد لکھنوی، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، س۔ن، ص ۱۹۲ (حمد، نعت، منقبت)

۳۹۷۔ عقیدت، ستیہ پال ملہوترہ عارف، ناشر شاعر خود، جالندھر، ۱۹۹۹ء، ص ۶۴ (حمد، منقبت، غزل)

۳۹۸۔ عقیدت، شاعر علی شاعر، جیلانی پبلشرز، راچی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۴ (منقبت)

۳۹۹۔ عکس جمیل، یوسف جمیل جامعی، ہفت رہزوہ کرنول ٹائمز، کرنول، ۱۹۹۳ء، ص ۵۰ (حمد، نعت، منقبت، غزل)

۴۰۰۔ عکسِ انوار (فارسی)، علامہ انوار فیروز پوری، ناشر خود، فیصل آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۲ (نعت، منقبت)

۴۰۱۔ علی کا عشق عشق مصطفی ہے مرتبہ سید حسین احمد جیلانی، اردو گھر الہ آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۴۸ (مناقب)

۴۰۲۔ عنوانِ نجات، سید عارف محمود مہجور رضوی، ٹیپو سلطان، پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۲ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۴۰۳۔ غالبات، اختر آصف زیدی، ادارہ قرطاس و قلم، ٹورنٹو، کینیڈا، دسمبر ۲۰۲۳ء، ص ۲۱۹ (سلام، منقبت)

۴۰۴۔ فانوسِ ہفت رنگ، رشیدہ عیاں، زین پبلی کیشنز، راچی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۴ (حمد، نعت، منقبت، مراثی)

۴۰۵۔ فتوح الآخرۃ ۱۳۳۱ھ معروف بہ ہفت بند، محمد عبدالرزاق بیکس جبل پوری، مطبع حکیم برہم

گورکھپور، ۱۹۱۳ء، ص ۳۰ (مناقب)

۴۰۶۔ فتوحاتِ شوق، شاہ محمد یحیٰ عظیم آبادی، مطبع امیر المطابع، آگرہ، ۱۳۰۱ھ، ص ۵۲۶ (مناقب)

۴۰۷۔ فردِ فرید، شاہ انصاراللہ الہ آبادی، حدیقۂ صلوٰۃ وسلام، سی ۱۲۷ بلاک جے شمالی ناظم آباد کراچی، س۔ن، ص ۶۴ (مناقب)

۴۰۸۔ فسانۂ الم، شاہ محمد ہاشم بہار، مرتبہ جابر حسین، بہار فاؤنڈیشن، عظیم آباد، پٹنہ، ص ۱۴۰ (سلام، منقبت، مراثی)

۴۰۹۔ فکرنجات، محمد کمال اولین حسین کمال حسینی، ادارہ ہمدانیہ گڑھی، ضلع علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص ۱۸۶ (نعت، منقبت، سلام، نوحہ، مرثیہ)

۴۱۰۔ فیض بشارت، شاغل ادیب حیدرآبادی، ناشر شاغل ادیب، حیدرآباد، ۱۹۹۶ء، ص ۴۰ (نعت، منقبت)

۴۱۱۔ فیض نسبت، پیر سید نصیر الدین نصیر، ۲۰۰۰، www.Tajdaregolra.com، ص ۹۷۲، (مناقب)

۴۱۲۔ فیضان معین، اختر اندوری، دربارظہوریہ معینیہ چشتیہ قصبہ کالونی کراچی، (مناقب)

۴۱۳۔ فیضانِ محبت، حکیم شاہ محمد اختر، کتب خانہ مظہری، کراچی، باردوم، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸۸ (مناجات، نعت منقبت، تصوف)

۴۱۴۔ فیضانِ مصطفیٰ ﷺ، اقبال احقر الہ آبادی، ناشر ندارد، کراچی، بار چہارم، ۲۰۰۵ء، ص ۹۶ (نعت منقبت سلام)

۴۱۵۔ فیوض غوثیہ مع مناقب غوثیہ، سید ممتاز علی قادری، اللہ والے کی قومی دکان، لاہور۔ س۔ن، ص ۴۲

۴۱۶۔ قبالۂ بخشش، محمد جمیل الرحمان خان قادری، باہتمام شاہ تراب الحق قادری، مصلح الدین پبلی کیشنز، کراچی، س۔ن، باردوم، ص ۱۰۸ (نعت، منقبت)

۴۱۷۔ قدم قدم اجالا، ڈاکٹر مسعود ردولوی، پرکاش پیکجرس، گولہ گنج لکھنو۔ ۱۸، ۲۰۱۵ء، ص ۲۵۳ (نعت، منقبت)

۴۱۸۔ قرآن السعدین، قمر جعفری، نجمہ جعفری، ناشر مصنفین، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۴ (حمد، نعت، منقبت، نظم، غزل)

۴۱۹۔ قریہ قریہ خوشبو، اخلاق عاطف، مکتبہ ادب اکادمی، لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۲ (نعت، منقبت)

۴۲۰۔ قصائد چہاردہ معصومین، عارف، عباسی کتب خانہ، کراچی، ص ۲۴۰

۴۲۱۔ قصائد سحر، امیر حسن خان سحر، باہتمام محمد مرزا، ۱۳۱۶ھ، ص ۷۰۹ (منقبت، غزل)

۴۲۲۔ قصائد عقیدت، محمد التفات حسین کشش بدایونی، مرتبہ مقتدیٰ احمد فرشوری بدایونی، مسلم

ایجوکیشنل پریس علی گڑھ،۱۹۶۶ء،ص۱۵۹ (نعت،منقبت)

۴۲۳۔ قصائد منقبت،حکیم غلام دستگیر قادری،مطبع فیض الکریم حیدرآباددکن،۱۳۱۶ھ،ص ۳۴(مناقب)

۴۲۴۔ قصیدہ سوادالعین فی آثارالامام الحسین،مطبع عزیز دکن، حیدرآباد،س۔ن،ص۸، (آصفیہ، س،ص ۱۶۰)

۴۲۵۔ قطعاتِ بدر،مولانا بدرالقادری،المجمع الاسلامی، ہیگ، ۱۹۹۴ء،ص ۸۰ (حمد،نعت،منقبت)

۴۲۶۔ قم باِذن اللہ،مولانا بدرالقادری، المجمع الاسلامی،ڈین ہاگ، ۱۹۹۵ء،ص ۱۲۸ (منقبت، دیگر)

۴۲۷۔ قندیلِ عرش،شریف امروہوی،مرکزی گل بہار نعت کونسل، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص ۲۰۸ (نعت،منقبت،سلام،دیگر)

۴۲۸۔ کاوش،مرزا محمد دین عادل،س۔ن،م۔ن،ص ۱۵۲ (نعت،منقبت، دیگر)

۴۲۹۔ کائنات، ہوش نعمانی،مرتبہ تبسم نشاط، بلاغت دارالاشاعت شترخانی، رام پور،۱۹۸۶ء،ص ۸۰ (نعت،منقبت)

۴۳۰۔ کتابِ عقیدت،سید عابد رضا عابد،واہی اکیڈمی، پٹنہ بہار، ۲۰۱۲ء،ص ۱۴۰ (نعت،منقبت،نوحہ)

۴۳۱۔ کرم ونجات کا سلسلہ،عبدالعزیز خان عزیز احسن، اقلیم نعت،سیکٹر ۱۱۔اے، نارتھ کراچی، مئی ۲۰۰۵ء،ص ۲۰۸ (نعت،منقبت)

۴۳۲۔ کرنیں ایک ہی مشعل کی،انجم نیازی،دارالامین لاہور،۲۰۱۹ء،۳۲۶ (مناقب،صحابہ وصحابیات)

۴۳۳۔ کشف الدجیٰ بجمالہِ، پیرزادہ برکات احمد فاروقی، اکرام الدین فاروقی،کراچی، ۲۰۰۵ء،ص ۳۸۸ (نعت،منقبت)

۴۳۴۔ کعبہ عشق،مظفر وارثی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۸۹ء،ص ۱۹۲ (حمد،نعت،منقبت،سلام)

۴۳۵۔ کلام امیر صابری، امیر صابری،س۔ن،م۔ن،ص ۱۲۶ (نعت،منقبت،سلام،غزل)

۴۳۶۔ کلام حامد،مرتبہ مولوی حامد بخش بدایونی، ناشر عبداللہ ولی بخش قادری، ۱۹۸۹ء ،ص ۱۸۰ (نعت،منقبت)

۴۳۷۔ کلام لاکلام،شاہ انصاراللہ الہ آبادی،حدیقہ صلوٰۃ وسلام،کراچی،س۔ن،ص ۱۲۸ (نعت،منقبت)

۴۳۸۔ کلامِ حامد، حامد بدایونی، مرتبہ عبداللہ ولی بخش قادری، ناشر ندارد، دہلی، ۱۹۸۹ء، باردوم، ص ۱۶۳ (نعت،منقبت)

۴۳۹۔ کلامِ رضوی، پیرزادہ سید خالد حسن رضوی، مرتبہ آفتاب نامی، ادبستان انصار، کراچی، ۲۰۰۱ء،ص ۸۰ (نعت،منقبت)

۴۴۰۔ کلامِ نصیرالدین حیدر بادشاہ ،مرتبہ شاہ عبدالسلام، ناشر مرتب، دانش محل بک سیلرز، امین آباد

پارک لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۴۴۱۔ کلامِ ولی، شاہ محمد ولی الرحمان، ، خواجہ فضیل الرحمان جمالی، جے پور، ۱۹۶۲ء، ص ۵۷۲ (نعت، منقبت، دیگر)

۴۴۲۔ کلمہ ءآخرت، ۱۲۹۶ھ، مرزاانور علی بیگ انور عظیم آبادی، مطبع نورالانوار آرہ، ص ۱۸ (منقبت)

۴۴۳۔ کلیات ثناء اللہ کریری، مرتبہ سعدالدین سعدی، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۴ (نعت، منقبت، مثنوی)

۴۴۴۔ کلیات حسن، حسن رضا بریلوی، مرتبہ محمد افروز قادری، ثاقب رضا قادری، رضا اکیڈمی ممبئی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۴۳ (نعت، منقبت)

۴۴۵۔ کلیات رضا شکوری، بابا عبدالرزاق شکوری، حمد و نعت ریسرچ، کراچی، ۲۰۲۰ء (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۴۴۶۔ کلیات رہبر، عبدالجبار، رہبر اعظمی، رہبر فاونڈیشن خالص پور اعظم گڑھ، اپریل 2015ء، ص ۲۴۸ (نعت، منقبت، غزل)

۴۴۷۔ کلیات شافی (عربی، فارسی، اردو)، سید شاہ محمد شفاالصمد، نظامی پریس بدایوں، ۱۳۶۶ھ (حمد، نعت، منقبت)

۴۴۸۔ کلیات ضیا، ظہیر احمد صدیقی (اردو، فارسی)، مونس بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۲ (حمد، نعت، منقبت، نظم، مضامین)

۴۴۹۔ کلیات عنبر شاہ وارثی، سید عنبر علی اجمیری عنبرؔ وارثی، حضرت عنبر شاہ وارثی پبلی کیشنز، جونا دھوبی گھاٹ، کراچی، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۶ (نعت، منقبت)

۴۵۰۔ کلیات قاری، حافظ محمد علی قاری (فارسی)، س۔ن، م۔ن، ص ۱۸۶ (نعت، منقبت، خمسے)

۴۵۱۔ کلیات مغموم سیٹھ محمد اسمٰعیل مغموم، داس سٹریٹ مدراس، ۱۳۴۷ھ، ص ۴۴۸ (نعت، منقبت)

۴۵۲۔ کلیات نیازی، عبدالستار نیازی، نوریہ رضوی پبلیکیشنز لاہور جولائی ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۶۰ (نعت، منقبت، غزل)

۴۵۳۔ کلیات ولی، ولی دکنی، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، لکھنو، ۲۰۰۸ء، ص ۴۳۳ (نعت، منقبت، غزل)

۴۵۴۔ کلیات ہوش ۱۳۱۳ھ، نیاز احمد خان ہوش بریلوی، مطبع گلشن فیض لکھنو، ۱۳۱۳ھ، ص ۲۲۴ (نعت، منقبت، غزل)

۴۵۵۔ کلیاتِ شائق، میر سید علی شائق دہلوی، مرتب، سید انوار علی انور، سید پبلی کیشنز، راچی،

۱۹۹۴ء، بار دوم، ص ۲۴۸ (نعت، منقبت، دیگر)

۴۵۶۔ کلیاتِ مخمور، مخمور دہلوی، مرتبہ بدر مخمور، جے۔کے آفیسٹ پرنٹرز دہلی، ، ۱۹۸۶، ص ۲۳۴ (غزل، نعت، منقبت)

۴۵۷۔ کوثرِ رحمت، رؤف امروہوی، مرتبہ احمد حسین و حامد حسین وغیرہ، دہلی، ۱۹۹۰ء، بار سوم، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۴۵۸۔ کیف و عرفاں، یوسف اجمیری، مرتبہ وفا راشدی، سعید آرٹ پریس حیدرآباد، ۱۹۶۱ء، ص ۶۴ (نعت، منقبت)

۴۵۹۔ کیفیات، ڈاکٹر مرزا اختیار حسین کیف، جماعت سالکین آغائیہ مرتضویہ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷۲ (نعت، منقبت، دیگر)

۴۶۰۔ گل آرزو، صد بند شورش، خمسہ منقبت ۱۲۹۷ھ، قوت علی شورش، صفیر بلگرامی وغیرہ، مطبع نورالانوار آرہ، ص ۱۸ (منقبت)

۴۶۱۔ گل خونچکاں، بانو طاہرہ سعید، لکی فائن آرٹ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۳۲ (منقبت، مرثیہ)

۴۶۲۔ گل دستہ پنجتن (عبدالصمد قادری)، مرتبہ خان اختر ندیم، راحیل بک ڈپو اینڈ فوٹو اسٹیٹ حالی روڈ، حیدرآباد (سندھ) س۔ن، ص ۶۰ (نعت، منقبت)

۴۶۳۔ گل دستہ شرفی چمن، مرتبہ سید شاہ محمد جمیل الدین، حیدرآباد (بھارت)، ۲۰۰۱ء، ص ۳۶ (منقبت)

۴۶۴۔ گل دستہ عقیدت بہ بارگاہِ غریب نواز، مرتبہ کمال الدین علی خان، ایشین آرٹ پرنٹرس چھتہ بازار، حیدرآباد، ۲۰۰۴ء، ص ۹۶ (مناقب)

۴۶۵۔ گل دستہ مدنی اشرفی، مرتبہ طارق سعید، ناشر مرتب، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۷ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۴۶۶۔ گل دستہ نعت و منقبت، باہتمام شیخ اسمٰعیل ذبیح رزاقی، دارالھدیٰ سبزی منڈی، حیدرآباد ۰۹۔ جون ۱۹۹۲ء، ص ۵۴ (نعت، منقبت)

۴۶۷۔ گل دستہء عقیدت، مرتبہ ڈاکٹر ایم ایم احمد، تاج پبلی کیشنز پریس، ٹیزی روڑ، بہار کالونی، کراچی، فروری ۱۹۶۸ء، ص ۵۴ (انتخاب مناقب)

۴۶۸۔ گل دستہء میراں شاہ، خواجہ میراں شاہ جالندھری، حمیدیہ سٹیم پریس لاہور، س۔ن، ص ۸۲ (مناقب)

۴۶۹۔ گل دستہء نعت و منقبت، ساجد صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء (نعت، منقبت)

۴۷۰۔ گل دستہ، محمد مدنی اشرفی اختر مرتب و ناشر طارق سعید، کچھوچھہ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۸ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۴۷۱۔ گل کدہ ء عابد، عابد چشتی، حدیقہ صلوٰۃ وسلام، کراچی، س۔ن، ص ۶۴ (حمد، نعت، منقبت)

۴۷۲۔ گل ہائے وارث، سید شمس وارثی، مکتبہ وارثیہ، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۵۴ (منقبت)

۴۷۳۔ گلزار احمدی در نعت، شیخ عبدالقادر وفا، مرتبہ قاضی ابراہیم ٹپل بندر، مطبع محمدی بمبئی، ۱۳۰۳ھ، ص ۲۱۶ (نعت، منقبت، سلام)

۴۷۴۔ گلزارِ جعفری، سید حسین علی جعفری اعظم گڑھی، ایشین پبلشرز نئی دہلی، ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۳۵ء، ص ۲۴۰ (منقبت، سلام)

۴۷۵۔ گلستانِ حسینی منقبت ۱۲۹۱ھ، شاہ نذیر احمد، مطبع مفید عام باہتمام احمد خان صوفی، ۱۲۹۲ھ، ص ۱۴ (منقبت)

۴۷۶۔ گلستانِ حمد و نعت و منقبت، سید مظفر الدین خاں حیدرآبادی، اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد، جون ۱۹۸۳ء، ص ۱۸۶ (حمد، نعت، منقبت)

۴۷۷۔ گلستانِ عقیدت، سردار پنچھی، ککنس پرکاش جالندھر، ۲۰۰۵ء، ص ۴۸ (مناقب)

۴۷۸۔ گلستانِ محمدی، شاہ محی الدین قادری، بزم نادی الھادی بارگاہ حضرت پتھر والے صاحب مستعد پورہ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸ (نعت، منقبت)

۴۷۹۔ گلشن شاداب منقبت ۱۳۰۰ھ، حامد بخش، مطبع نسیم سحر بدایوں، ۱۳۰۴ھ ص ۲۶ (منقبت)

۴۸۰۔ گلشن ناز یعنی گہر ہائے عقیدت، ڈاکٹر سید المحمود دیوان، الہلال آرگنائزیشن لندن، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۲ (نعت، منقبت)

۴۸۱۔ گلشنِ صلِ علیٰ، عظمت اللہ خان، سدرہ پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۴ (نعت، منقبت)

۴۸۲۔ گلہائے عقیدت، پنڈت دیوی پرشاد مست بریلوی، رضا برقی پریس سوداگران بریلی، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۸۰ (نعت، منقبت)

۴۷۔ گلہائے عقیدت، غلام رسول انیس نیازی، انجمن فروغ اردو جے پور راجھستان، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۲ (حمد، نعت، منقبت)

۴۸۳۔ گلہائے عقیدت، محمد مسلم نونہروی، شوبھی آفیسٹ دریا گنج نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۵۰ منقبت (قصیدہ) سلام، نعت)

۴۸۴۔ گلہائے نعت، خواجہ مسعود احمد رہبر چشتی، مرکزی انجمن رہبر اسلام، شاہ فیصل کالونی، کراچی، اگست ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۴۸۵۔ گلِ خضرا، جنبش خیرآبادی، ناردرن آفیسٹ پریس لکھنو، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۸ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۴۸۶۔ گنجینہ نعت ومنقبت، شاد قادری لکرالوی، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۸۶ء، نعت، منقبت)
۴۸۷۔ گنجینۂ عرفاں، صابر آروی، جے۔ٹی۔ایس پرنٹرس، پٹنہ ۴، ۱۹۹۴ء، ص ۹۶ (منقبت، مرثیہ)
۴۸۸۔ گنجینۂ نعت ومناقب، شاد قادری، نفیس برقی پریس، مرادآباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)
۴۸۹۔ گنجینۂ نعت ومناقب، شاد قادری، ناشر مصنف، بدایوں، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)
۴۹۰۔ گہرہائے فروزاں، محمد عرفان رضوی، مکتبہ خورشیدیہ، اردو بازار، لاہور، جنوری ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۰
۴۹۱۔ لخلخۂ محامد، رؤف امروہوی، احمد حسین سیفی، امروہہ، ۱۹۸۰ء، بارسوم، ص ۲۰۷ (نعت، منقبت)
۴۹۲۔ لفظ لفظ آس، پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی قادری، اسلامک فاؤنڈیشن آف پاکستان، کراچی، ص ۹۲ (نعت، منقبت)
۴۹۳۔ لگیاں نیں موجاں (ہن لائی رکھیں سوہنیا) (اردو، پنجابی)، محمد رفیق ضیاء قادری، کرمانوالہ بک شاپ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۲ (نعت، منقبت)
۴۹۴۔ لمعات بخشش، محمد حسین مشاہد رضوی، عتیق رشید آرٹسٹ، مالیگاوں، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴۰ (نعت، منقبت)
۴۹۵۔ لمعاتِ قمر، بیگم قمر القادری، مکتبہ ذوقی ۲۸۵ بی لطیف آباد، یونٹ ۱۰ حیدرآباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۴ (حمد، نعت، منقبت، نظم، غزل)
۴۹۶۔ لوحِ نفیس، نفیس احمد نفیس القادری، نظامی اکادمی، ۱۰/۹، ۵، اے ناظم آباد، کراچی، فروری ۱۹۹۱ء، ص ۸۰ (مناقب)
۴۹۷۔ لوحِ نفیس، نفیس القادری، مرتبہ صبیح رحمانی، نظامی اکادمی، کراچی، ۱۹۹۱ء، باراول، ص ۸۰ (منقبت)
۴۹۸۔ ماہِ تمام۔۱۸ مسدس در مدح چہاردہ معصومین، سید فراست حسین فراست زید پوری، صادق پریس لکھنو، جنوری ۱۹۳۷ء، ص ۱۶۱ (مناقب)
۴۹۹۔ مایۂ دلنشیں، سید وجاہت حسین شوقی، آفتابِ ادب، ملت اسلامیہ کالونی بھرگڑی بنگلہ حیدرآباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)
۵۰۰۔ مایہءدلنشیں، وجاہت شوقی، آفتابِ ادب، حیدرآباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت)
۵۰۱۔ مبدائے نور، شمیم نصرتی، دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد، جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۴ (نعت، منقبت)
۵۰۲۔ متاعِ کبیر، حفیظ کبیر، بزم فیظ، گوڑنگل ضلع محبوب نگر، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۴ (غزل، نعت، منقبت)
۵۰۳۔ متاعِ آخرت، پروفیسر منظر ایوبی، شاداب منظر، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۰ (حمد، نعت، منقبت، سلام)
۵۰۴۔ مثنوی مناقب خواجہ، محمد علی موج رامپوری، تخلیق کار پبلشرز یاور منزل لکشمی نگر دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۶ (مناقب خواجہ غریب نواز)

۵۰۵۔ مثنوی مناقب خواجہ، محمد علی موج، تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی ۱۹۹۹ء، ص ۵۵ (خواجہ غریب نواز کی منقبت)

۵۰۶۔ مثنوی مناقبِ خواجہ، محمد علی موجؔ رامپوری، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۵ (مناقب)

۵۰۷۔ مثنوی مناقبِ خواجہ، محمد علی موج، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۵۵ (منقبت)

۵۰۸۔ مجموعہء دحیات ومناقب، قاضی ابراہیم، حیدری پریس بمبئی، ۱۲۹۱ھ، ص ۶۲ (مناقب)

۵۰۹۔ محامد الخلفا یعنی مناقب خلفائے راشدین مرتبہ حافظ اخلاق احمد صدیقی، سجاد حسین صدیقی، ریاض ہند پریس علی گڑھ، ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۲ (مناقب)

۵۱۰۔ محامدالخلفا، حافظ اخلاق احمد، (مناقب خلفائے راشدین) مطبوعات نظامی پریس بدایوں، ۱۹۵۲

۵۱۱۔ محامد خیر الوریٰ المعروف بہ چمنستان حمزہ، محمد امیر حمزہ، کمرشل بک ڈپو چار مینار حیدرآباد، ۱۳۷۳ھ، بار پنجم، ص ۲۶۲ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۵۱۲۔ محراب نظر، واصف عابدی مرتبہ اظہر کاظمی، ناشر شاعر خود، ۱۹۹۳ء، ص ۸۶ (حمد، نعت، منقبت، نوحہ)

۵۱۳۔ مخدوم صابر کلیری، شبیر حسن چشتی نظامی، آستانہ بک ڈپو، جامع مسجد دہلی، اول، س۔ن، ص ۲۷۲ (نظم ونثر۔مناقب)

۵۱۴۔ مخزن مدحت، مرتبہ سید فہیم عباس، مولا علی پرنٹنگ ورکس حیدرآباد، اکتوبر، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۹ (حمد، نعت، منقبت)

۵۱۵۔ مخمس ہفت بند کاشی درمنقبت شیر خدا راجہ الفت رائے، مطبع منشی نول کشور، مئی ۱۹۰۸ء، ص ۳۳ (منقبت)

۵۱۶۔ مدح خواجہء دکن، مرتبہ سید مبارالدین رفعت، نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد، اول ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۸ (مناقب)

۵۱۷۔ مدح صحابہ اور تبرا، ابوسعید بزمی، مدینہ بک ایجنسی، بجنور، جوان ۱۹۳۹ء، ص ۱۰۶ (نظم ونثر۔مناقب)

۵۱۸۔ مدح صحابہ حصہ اول مرتبہ محمد شمس الدین، مطبع فخر المطابع لکھنو، س۔ن، ص ۱۶ (مناقب)

۵۱۹۔ مدح وثنا، محمد میکائیل ضیائی، اقبال آفسیٹ پرنٹرز، کانپور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۲ (نعت، منقبت)

۵۲۰۔ مدحت آلِ عبا (مناقبِ اہل بیت وسلام) شارق رشید، سلسلہ پبلی کیشنز، گلشن اقبال کراچی، جولائی ۲۰۲۴ء، ص ۱۱۳ (منقبت، سلام)

۵۲۱۔ مدحت خیر البشر، مسعود نشتری اشرفی، ناشر خوشنود احمد، فراز احمد انصاری، غفور منزل، دولت گنج اندور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۲ (نعت، منقبت)

۵۲۲۔ مدحت کے پھول، اسلامک بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، باردوم،ص 215 (نعت، منقبت، دیگر)

۵۲۳۔ مدحت مولائے کُل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سید محمد شریف الدین نیرؔ، اردو کتاب گھر، لاہور،۱۹۹۸ء، باراول، ص ۳۰۳ (نعت،منقبت)

۵۲۴۔ مدحِ ساقیِ کوثر،حسن فیاض مدراسی،تاج پرنٹرس،بڑی پیٹ وانمباڑی، ۱۹۹۲ء،ص ۸۰ (مناقب)

۵۲۵۔ مدحِ صحابہ،حامدالانصاری انجم،مکتبہ انجم جامعہ نگراوکھلائی دہلی،س۔ن،ص ۳۲ (مناقب)

۵۲۶۔ مدیح حضورنور ۱۳۳۳ھ مرتبہ غلام شبر قادری برکاتی،مطبع امیرالاقبال،بدایوں، ۱۳۳۴ھ،ص ۱۱۴ (نظم ونثر۔مناقب)

۵۲۷۔ مدینے کا آفتاب،سیدفیض الحسن شوق ہمدانی مصطفائی،ماس پرنٹرز،کراچی،س۔ن،ص ۴۵ (نعت،منقبت)

۵۲۸۔ مذاق العرفان،مولانا دلدارعلی شاہ مذاق میں قصیدہ سلطان جی وشاہ ولایت بدایونی،نظامی پریس بدایوں، ۱۹۸۶ء

۵۲۹۔ مرادالعاشقین، سیدمحمد غوث شاہ، مرتبہ حکیم سید محمد حسین ظفر، سیدعلی عباس شاہ نقوی بخاری، لاہور،س۔ن،ص ۱۰۶ (حمد،نعت،منقبت)

۵۳۰۔ مرقعِ غوثیہ،شاہ انصاراللہ الہ آبادی،عمران احمد قادری،کراچی، ۱۹۹۴ء،ص ۶۶ (منقبت)

۲۳۱۔ مرقعِ محبوبیت،شاہ انصاراللہ الہ آبادی،حدیقہ صلوٰۃ وسلام،کراچی،س۔ن،ص ۶۴ (منقبت)

۵۳۲۔ مصحفِ بیدم، بیدم وارثی،الکتاب،گنج بخش روڈ لاہور،۱۹۸۱ء،ص ۲۰۸ (نعت،منقبت)

۵۳۳۔ مضراب جاں،اختر بجنوری،مکتبہ مظہرِ فروغ ادب،کراچی،ء،ص۔۔۔ (حمد،نعت،منقبت)

۵۳۴۔ مطلع درمدح امامؑ،عطارد،مطبع اثناعشری لکھنو،مارچ ۱۸۸۸ء،ص (منقبت)

۵۳۵۔ مطلع نور (نعت ومنقبت بحضور اہلِ کسا)،خورشید رضا فتح پوری، ناشر قوسین حیدر رضا،محمد سبطین رضا (مونس)،۱۶/اکتوبر ۲۰۱۰ء،ص ۲۷

۵۳۶۔ مظہرالعلوم (اول و دوم)،شاہ انصاراللہ الہ آبادی،حدیقہء صلوٰۃ وسلام،۷۷ محبوب کلاتھ مارکیٹ،شاہراہِ عراق،صدرکراچی، ۱۴۱۷ھ، ۲۲۲ (نعت،منقبت)

۵۳۷۔ مظہرالعلوم،شاہ انصاراللہ الہٰ آبادی،حدیقہ صلوٰۃ وسلام،کراچی،س۔ن،ص ۶۴ (منقبت،سلام)

۵۳۸۔ معراجِ تخیل،شیخ عبدالحمید سالم قادری،تاج الفحول اکیڈمی بدایوں،۱۹۹۸ء،ص ۱۶۶ (نعت،منقبت)

۵۳۹۔ معراجِ تخیّل ،قاری اخلاق احمد انصاری سالک، اعلیٰ حضرت تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں، ۱۹۸۸ء،باردوم،ص ۱۶۱ (نعت،منقبت)

۵۴۰۔ معراج سخن، فصاحت جنگ جلیل مرتبہ سعید احمد جلیلی،جلیل منزل ،سلطان پورہ،حیدرآباد، ۱۹۸۴ء،ص ۹۶ (نعت،منقبت،سلام)
۵۴۱۔ معراجِ سخن، نواب فصاحت جنگ جلیل، نظامی پریس وکٹوریہ سٹریٹ لکھنو، ۱۳۴۷ھ،ص ۱۰۰ (نعت،منقبت،سلام)
۵۴۲۔ معروضہ، الیاس برنی،مطبوعہ اعظم سٹیم پریس ،حیدرآباددکن، اول شوال ۱۳۶۷ھ،ص ۱۴۸ (حمد،نعت،منقبت)
۵۴۳۔ معطرمعطر، فاضل عثمانی،سہیل فاضل عثمانی،کراچی،۲۰۰۱ء، باراول،ص ۹۶ (نعت،منقبت)
۵۴۴۔ معین (ماہنامہ،کراچی)،غریب نوازنمبر، سید شفیق احمد چشتی، جنوری ۱۹۵۸ء، باب الاسلام پریس کراچی،ص ۱۶۸ (نظم ونثر۔مناقب)
۵۴۵۔ مکارمِ مسیح ملت موسوم بہ نشتر ذیشان ۲۰۱۱ء،نصف مرکز بہار پٹنہ،۲۰۱۱ء،ص ۱۴۴ (نعت،منقبت)
۵۴۶۔ مکاشفاتِ اشرف افتخار (حصہ اول) اشرف علی اشرف افتخاری، ناشر شیخ عبدالقادر چشتی حیدرآبادی،۱۹۷۶ء،ص ۲۰۸ (نعت،منقبت،غزل)
۵۴۷۔ ممدوحِ خدا،علی فطرت، ناشرعلوی مشن مدراس،۱۹۹۱ء،ص ۱۰۶،(منقبت)
۵۴۸۔ من کنت مولیٰ،سید محمد امین علی نقوی،باب الہدیٰ،فیصل آباد،۱۹۹۵ء،ص ۱۹۲ (منقبت)
۵۴۹۔ مناقب ابرار،عاجز شاہ،مطبع فیض احمدی شیخ گلزاراحمد،دہلی،۱۲۸۱ھ،ص ۳۲ (مناقب)
۵۵۰۔ مناقب الحبیب اردو،خواجہ محمد نجم الدین سلیمانی چشتی،مترجم مولوی محمد رمضان فاروقی،مرتبہ پیرغلام جیلانی نجمی فاروقی وخواجہ حاجی محمد نجم الدین سلیمانی،خواجہ پریس دہلی، ۱۴۱۹ھ، ص۲۵۱ (نظم ونثر۔مناقب)
۵۵۱۔ مناقب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب صفوۃ الاکوان المسمیٰ بہ تحفۃ الاخوان،باہتمام نورالدین بن حیواخان،مطبع حیدری بمبئی،۱۲۷۰ھ،ص ۵۲،۴۸ (مناقب)
۵۵۲۔ مناقب اولیا،حمید ویشالوی، مرتبہ ظفر انصاری ظفر، بھارت آفسیٹ دہلی،دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۰ (مناقب)
۵۵۳۔ مناقب اہل بیت علیھم السلام،مرتبہ محمودعلی مرزا،مطبوعات نظام مذہبی تعلیمی ٹرسٹ،حیدرآباد سلسلہ عزا،س۔ن ص ۲۲۴ (مناقب)
۵۵۴۔ مناقب اہل بیت، الٰہی بخش،م۔ن، ۱۹۲۴ء (مناقب)
۵۵۵۔ مناقب اہلِ بیت، علامہ عزالحق کوثر ندوی، ادارہ پاکستان شناسی،لاہور، جنوری ۲۰۱۸ء،ص ۲۴۷ (نثر)

۵۵۶۔ مناقب آلِ محمد، نجم مظفرنگری، ناشر مصنف ۶۷ قدوائی نگر، طبل شاہ روڑ، مظفرنگر، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۸ (مناقب)
۵۵۷۔ مناقب تاجدار اولیا مرتبہ سید شاہ وثیق الارشاد علی القادری، اثبات ونفی پبلی کیشنز، کولکاتہ، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۴ (مناقب غوث اعظم)
۵۵۸۔ مناقب توکلی من تصنیف مولانا مولوی عبدالرحیم مسکین توکلی گدآ، مطبع انوارِ احمدی، لاہور، ۱۳۱۵ھ، ص ۱۶ (مناقب)
۵۵۹۔ مناقب حفیظ تائب، القمر انٹر پرائزرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، اول، ص ۱۲۷ (مناقب)
۵۶۰۔ مناقب خواجہ غریب نوازمرتبہ رشید محمود، مرکزمعارف اولیا محکمہ اوقاف مذہبی امور پنجاب، ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۶ (مناقب)
۵۶۱۔ مناقب خواجہ محمود دریائی سہروردی قادریؒ، غلام عباس المعروف سید الحاج محمد مدنی بابا الف دریائی، سنی مسلم کمیٹی گونڈل گجرات، ۲۰۲۱ء، ص ۴۹۲ (نظم ونثر۔مناقب)
۵۶۲۔ مناقب رزاقیہ، سید شاہ عبدالرزاق قادری، مطبع مجتبائی لکھنؤ، ۱۳۱۳ھ، ص ۶۰
۵۶۳۔ مناقب رزاقیہ، ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہی پریس لکھنو، جون ۱۹۲۱ء، ص ۵۶ (نظم ونثر۔مناقب)
۵۶۴۔ مناقب سید معاویہؓ، غلام قاسمی قادری، مکتبہ رحمۃ للعالمین، مشیر کالونی سرگودھا، س۔ن، ص ۲۴ (نثر)
۵۶۵۔ مناقب سید ہجویر، مرتبہ رشید محمود، مرکزمعارف اولیا محکمہ اوقاف مذہبی امور پنجاب، مئی ۲۰۰۲ء، ص ۲۷ (مناقب داتا گنج بخش)
۵۶۶۔ مناقب شعیب، مولفہ عبدالواسع صدیقی فردوسی، مطبوعہ تاج پریس باری روڑ، گیا، جولائی ۱۹۶۴ء، ص ۲۷۲ (نظم ونثر۔مناقب)
۵۶۷۔ مناقب صابر یہ گل دستہ مدحت ناصر اسم تاریخی ۱۳۱۲ھ، ناقص الطرفین (اردو، فارسی، نظم ونثر)، ص ۱۰۴
۵۶۸۔ مناقب صابری۔۔۔۔۔نظامی پریس بدایوں، ۱۹۰۸ء، (مناقب)
۵۶۹۔ مناقب علی موسوم بہ فضائل حیدری، شاہ فرید الدین عبدالشکور فرید مانک پوری، انڈین پریس لکھنو، س۔ن، ص ۱۱۶ (مناقب)
۵۷۰۔ مناقب علی، سرور انبالوی، پیغام آشنا، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۶۔۱۴۵
۵۷۱۔ مناقب فریدی حصہ دوم، مرزا احمد اختر چشتی، مطبع جانِ جہاں دہلی، س۔ن، ص ۴۸ (نظم ونثر۔مناقب)
۵۷۲۔ مناقب محسن ملت، محمد قمر الزماں مصباحی، مرکزی محسن ملت کمیٹی، رائے پور چھتیس گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۲ (مناقب)

۵۷۳۔ مناقب مشکل کشا، مرزا محمد عبدالغنی ارشد گورگان، مطبع یوسفی دہلی، ۱۹۰۱ء، ص ۳۶ (مناقب، مسدس)

۵۷۴۔ مناقب مولا علی کریم المعروف بہ بہارستان شمیم، شیخ فضل حسین شمیم، ابوالعلائی سٹیم پریس لکھنو، آگرہ، ۱۳۴۸ھ، ص ۱۱۶ (مناقب)

۵۷۵۔ مناقب مولا علی کریم المعروف بہ بہارستانِ شمیم، شیخ فضل حسین شمیم، باہتمام حافظ فیاض الدین ابوالعلائی اسٹیم پریس، آگرہ، ۱۳۴۸ھ، ص ۱۱۶ (مناقب)

۵۷۶۔ مناقبِ ابرار، میاں عاجز شاہ، مطبع فیض احمدی شیخ احمد، ذی قعدہ، ۱۲۸۱ھ، ص ۳۲ (مناقب)

۵۷۷۔ مناقبِ اہل بیت علیہم السلام (انتخاب از شعرا صوفیا کرام) اصل مع ترجمہ مرتبہ محمود علی مرزا، مطبوعات نظام مذہبی تعلیمی ٹرسٹ حیدرآباد دکن، سلسلہ نمبر ا، اول ۱۹۷۷ء، ص ۲۲۳ (مناقب)

۵۷۸۔ مناقبِ اہل بیت فی مصباح الذیت، مولوی عبدالرب، مطبع نظامی، کانپور۔ س۔ن، ص ۴۷ (نثر)

۵۷۹۔ مناقبِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہ، غلام حسین ماتریدی، ناشر امیر قافلہء حجاز حاضی شمشیر احمد برنلے، یوکے، اکتوبر ۲۰۱۸ء، ص ۴۴۹ (مناقب؟)

۵۸۰۔ مناقبِ تاجدارِ اولیا، مرتبہ سید شاہ وصیق الارشاد علی القادری، مترجم سید شاہ مرہون الارشاد القادری، مترجم فارسی، سید شاہ رقبۃ المولیٰ القادری، اثبات ونفی پبلی کیشنز ۵/۸۹ رپن اسٹریٹ کولکاتہ، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۴ (مناقب)

۵۸۱۔ مناقبِ حضرت امیر معاویہؓ مرتب چودھری محمد صدیق کھوکھر، زیر اہتمام ادارہ نصرت الاسلام، لاہور، س۔ن، ص ۱۳۱ (مناقب)

۵۸۲۔ مناقبِ خواجہ غریب نوازؒ، مرتبہ راجا رشید محمود، مرکز معارف اولیا، محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ۲۰۰۳ء، باراول، ص ۲۵۶ (منقبت)

۵۸۳۔ مناقبِ صابریہ، محمد شفیع ناصر چشتی صابری، م۔ن، ۱۳۱۳ھ، ص ۹۳ (نظم ونثر۔مناقب)

۵۸۴۔ مناقبِ غوثیہ، شاہ فضل اللہ شطاری مترجم سید محمد ظہیر الحق، ابوالعلائی سٹیم پریس، آگرہ، مارچ ۱۹۳۳ء، ص ۸۰ (نظم ونثر۔مناقب)

۵۸۵۔ مناقبِ فخریہ، نواب غازی الدین خان نظام، صفر ۱۳۱۵ھ، مطبع احمدی دہلی، ص ۵۵ (نظم ونثر۔مناقب)

۵۸۶۔ مناقبِ مشکل کشا، مرزا محمد عبدالغنی ارشد گورگانی، مطبع یوسفی، دہلی، ۱۹۰۱ء، ص ۳۶ (مناقب)

۵۸۷۔ مناقب، عبدالوحید تاج، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۹ء، باراول، ص ۱۲۷ (منقبت)

۵۸۸۔ منشائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، محمد منشا تابش، قصوری، فضل کبیر فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۸ء، باراول، ص ۹۶ (نعت، منقبت، دیگر)

۵۸۹۔ منظوماتِ میاں دلگیر، لالہ چھنو لال دلگیر مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، سرفراز قومی پریس، لکھنو ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۸ (نعت، منقبت، مثنوی)

۵۹۰۔ منظومات، راجارشید محمود، مجلس سخن، لاہور، ۱۹۹۵ء، باراول، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت، دیگر)
۵۹۱۔ منقبت حسن مجتبیٰؓ، مولفہ محمد اویس رضا قادری، نعت اکیڈمی انڈیا پبلشرز، ص ۲۵ (مناقب)
۵۹۲۔ منقبت خواجہ ولی ہند ۱۳۱۲ھ یعنی حدیقہ منقبت خواجہ پاک ۱۳۵۷ھ، علی احمد خان اسیر قادری بدایونی، مطبع عثمانی پریس، بدایوں، ۸/رجون ۱۹۳۸ء، ص ۴۸ (مناقب)
۵۹۳۔ منقبت درشاہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہم السلام، قبول، س۔ن، م۔ن، ص ۸۸ (منقبت، قصائد)
۵۹۴۔ منقبت غوثیہ، ۱۲۸۴ھ، باہتمام محمد حسین خان مہتمم اخبار دبدبہ سکندری، مطبع حسنی محمد خان، رامپور، ص ۸۸ (مناقب)
۵۹۵۔ منقبتِ غوثیہ ۱۲۸۴ھ، سعادت، مطبع حسنی محمد حسن خان، رامپور، ص ۸۸ (مناقب)
۵۹۶۔ مواجہ کے سامنے (اردو، پنجابی)، محمد زاہد نیازی نقشبندی، نوریہ رضویہ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، باراول، ص ۱۴۲ (نعت، منقبت)
۵۹۷۔ مواہب توسلی درمناقب توکلی (فارسی، اردو) مولوی محمد ابراہیم وردؔ، م۔ن، س۔ن، ص ۴۰، ۷ (منقبت، غزل، مثنوی)
۵۹۸۔ موجیں، راجیند ربہادر موج فتح گڑھی، ناشر شاعر خود، فتح گڑھ یو۔پی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۴ (نعت، منقبت، غزل وغیرہ)
۵۹۹۔ موجِ عرفان، عارف رحمانی، مرتبہ سید محمد احمد جعفری، محکمہ اوقاف، سندھ، حیدرآباد۔ص ۱۰۰ (نعت، منقبت)
۶۰۰۔ مودت نامہ مرتبہ معظّمہ نقوی، ایم۔ارسلان پبلشرز ملتان، ۲۰۲۱ء، ص ۱۲۹ (منقبت، سلام)
۶۰۱۔ مہرلامع ماہ ساطع، غلام حسین جوہر، ۱۲۳۳ھ (منقبت، خلفاوائمہ) (قاموس۔ا، ص ۱۰۲۶)
۶۰۲۔ مہرجہاں تاب، مقبول حسین شاربؔ، بزم فروغ ادب، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، ص۔۔ (نعت، منقبت)
۶۰۳۔ مہرِ جہاں تاب، مقبول شارب، بزم فروغ ادب، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۴ (نعت، منقبت)
۶۰۴۔ مہکتے حروف، ریحانہ تبسم فاضلی، فاضلی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۹ء، باردوم، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)
۶۰۵۔ میثاق (شعرعقیدت)، سرشار صدیقی، حرا فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۸ (حمد، نعت، منقبت)
۶۰۶۔ میخانہء عرفاں، سکندر لکھنوی، خلیل بک ڈپو، کراچی، ۱۹۸۳ء، باردوم، ص ۱۱۲ (منقبت)
۶۰۷۔ میخانہء غوث، سید فخر الدین فخر قادری، ناشر حکیم عبدالرحمٰن فرخ فخری قادری، مطبع قادری پریس نورمنزل محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳، ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۴ (مناقب)
۶۰۸۔ میرے اچھے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مظفر وارثی، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۳ (نعت، منقبت)
۶۰۹۔ میلاد کا راز، محمد قاسم حسین ہاشمی، مصطفی حسن قاسمی، کراچی، س۔ن، باردو، ص ۱۷۶ (حمد، نعت، منقبت، دیگر)

۶۱۰۔ میلادِ خلیل، مرتبہ مفتی محمد خلیل خان قادری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، بار دوم، ص ۱۵۲ (نعت، منقبت)

۶۱۱۔ نجات نامہ، ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر، ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۷۵ (حمد، نعت، منقبت)

۶۱۲۔ نذر اہلِ بیت، مہدی نظمی، ہندوستان پبلی کیشنز، غازی آباد (یو۔پی)، ۱۹۸۲ء، ص ۱۶۰ (مدحیہ مسدس)

۶۱۳۔ نذر حجاز، انیق جونپوری، نسیم بک ڈپو، لکھنو، س۔ن، ص ۹۸ (نعت، منقبت)

۶۱۴۔ نذر عقیدت محفل مسالمہ محرم الحرام ۱۳۷۵ھ، زیرِ اہتمام مرزا غلام عباس زاہر حیدری، ص ۴۲ (مناقب)

۶۱۵۔ نذرانہء عقیدت بحضور رحمت اللعالمین حصہ سوم، ٹھاکر کرشن سنگھ شاستری پارس، زیرِ اہتمام: جناب حبیب حسن بن حبیب مشہور الحامد تاجر محبوب نگر آندھرا پردیش، دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء، ص ۵۲ (نعت، منقبت، دیگر)

۶۱۶۔ نذرانہء عقیدت بحضور سلطان الہند غریب نواز حضرات خواجہ معین الدین چشتیؒ، محمد سبطین شاہجہانی جعفری، ناشر سید ذاکر شاہ ماڈرن بک ڈپو میلوڈی مارکیٹ، اسلام آباد، دوم دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۳۲ (مناقب)

۶۱۷۔ نذرانہء عقیدت، شاہ محمد سبطین شاہ جہانی، ماڈرن بک ڈپو، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۳۲ (منقبت)

۶۱۸۔ نذرانہء عقیدت، سید ابن حسن حسن مرزا پوری، ناشر سید صفیر حسن وغیرہ، گولڈن سٹی کشور گنج، کمپ بُل روڈ لکھنو ۳، ص ۲۳۲ (نعت، منقبت، سلام)

۶۱۹۔ نذرِ سعید، تابش صمدانی، ۳۴، وی، نیوملتان، ۱۹۸۷ء، ص ۶۴ (نعت، منقبت)

۶۲۰۔ نذرِ عقیدت بحضور سلطان الاولیا سیدنا عبدالقادر جیلانی مرتبہ ابوالفضل سید محمود، شمس الاسلام پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، ۱۳۵۶ھ، ۲۳۶ (مناقب)

۶۲۱۔ نذرِ عقیدت مولانا سید حسین احمد مدنی مرتبہ سید قسیم الحق گیاوی، تاج پریس باری روڈ گیا، مارچ ۱۸۸۶ء، ص ۹۵ (مناقب)

۶۲۲۔ نزہت العاشقین، انجم غزالی، ندیم انجم اینڈ نعیم الرحمان، سیالکوٹ، ۲۰۰۵ء، بار اول، ص ۲۰۸ (نعت، منقبت)

۶۲۳۔ نسیمِ حجاز، جگن ناتھ آزاد، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، بار اول، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت، دیگر)

۶۲۴۔ نسیمِ حجاز، سید مظفر حسین، اسرار کریمی پریس الہٰ آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۸ (نعت، منقبت، نظم، غزل)

۶۲۵۔ نسیمِ سحر، نسیم احمد فریدی، مرتبہ انیس احمد فاروقی، بابا فرید ایجوکیشنل سوسائیٹی امروہہ، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۴ (نعت، منقبت، نظم)

۶۲۶۔ نعت محل ملقب بہ ذوق نعت نبوی ۱۳۹۴ھ، اختر الحامدی، مکتبہ الرضا لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲۴

(نعت، مثنوی، سلام، مناقب)

۶۲۷۔ نعت نذرانہ، ضمیر جعفری، مکتبہ المختار، ۱۹۹۳ء، ص (نعت، مناقب)

۶۲۸۔ نعت نیر، ریاض الحسن جیلانی مرتبہ سید ضیاالحسن جیلانی شکیل، انجمن انوارالقادریہ، کراچی، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۳۸۲ (حمد، نعت، منقبت، سلام، غزل)

۶۲۹۔ نعت و مناقب (حصہ دوم)، خرابات، نذر ساقی، محمد عبدالہادی القادری، ناشر ندارد، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۲ (نعت، منقبت)

۶۳۰۔ نعت ومنقبت، سرور بجنوری، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۰ (نعت، منقبت)

۶۳۱۔ نعت ومنقبت کے پھول، کمال جعفری، اے۔بی۔سی پریس حوض قاضی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۸۸ (حمد، نعت، منقبت)

۶۳۲۔ نعتِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، محمد سعادت حسین خان شیداوارثی، مرتبہ انیس احمد انوری، مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۲ (حمد، نعت، منقبت)

۶۳۳۔ نعتِ سرور، قاری سرور علی خان قادری وجیہی، مکتبہ وزیریہ، انگوری باغ، رام پور، یو۔پی، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۸۰ (نعت، منقبت)

۶۳۴۔ نعتِ نیرّ، سید محمد ریاض الحسن جیلانی نیرّ، مرتبہ سید ضیاء الحسن جیلانی شکیل، انجمن انوار القادریہ، کراچی، ۲۰۰۰ء، باردوم، ص ۳۸۴ (حمد، نعت، منقبت، دیگر)

۶۳۵۔ نعم الرفیق فی مناقب الصدیق، مولوی محمد عبدالرب، مطبع مجتبائی دہلی، س۔ن، ص ۶۴ (نظم ونثر۔مناقب)

۶۳۶۔ نعم، کرم حیدری، تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۷۹ء، باراول، ص ۸۰ (حمد، نعت، منقبت)

۶۳۷۔ نغماتِ انور، حافظ نور محمد انور، محمد رمضان میمن اور عبدالقادر عظمت میمن، کراچی، ۲۰۰۵ء، بار دوم، ص ۴۷ (نعت، منقبت، دیگر)

۶۳۸۔ نغماتِ حیدری، حیدر لاری، نوری اکیڈمی، شعیب پور، ہوڑہ۔۲، ۱۹۹۹ء، ص ۴۸ (حمد، نعت، منقبت)

۶۳۹۔ نغماتِ طیّبات، عزیز الدین خاکی القادری، تنظیم استحکام نعت، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۸ (نعت، منقبت)

۶۴۰۔ نغماتِ عشق، شاہ محمد عبدالغنی نیازی، نورالعرفان، راچی، ۱۹۷۱ء، باراول، ص ۶۰ ۷ (حمد، نعت، منقبت، دیگر)

۶۴۱۔ نغماتِ فردوس، پروفیسر اقتدار افسر، ناشر خود، الوک پریس تلیا بھوپال، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۸ (حمد، نعت، منقبت)

۶۴۲۔ نغمہ روحی ۱۳۱۹ھ عرف مناقب اجمیری، سید تجمل حسین تجمل جلال پوری، مطبع نامی کریمی بمبئی، ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ، ص ۵۸ (مناقب)

۶۴۳۔ نغمہء روح، رونق علی خان قادری بدایونی، مرتبہ فیروز ظفر بدایونی، بریلی الیکٹرک پریس،

بریلی، ۱۹۹۳ء، ۱۲۸ (نعت،منقبت)

۶۴۴۔ نغمہءفردوس، شکیل بدایونی، مکتبہ دین وادب کچا احاطہ لکھنو، اول فروری ۱۹۴۸ء، ص ۹۰ (نعت،منقبت)

۶۴۵۔ نغمہءقدسی اساس، محمد عبدالہادی القادری، فرید اقبال قادری، راچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۸ (منقبت)

۶۴۶۔ نغمہءنور، شاکر علی شاکر خادمی، خادمیہ ویلفیئر ٹرسٹ آف پاکستان، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۳ (حمد،نعت،منقبت،سلام)

۶۴۷۔ نفس الایمان، محمد مشتاق احمد فاروقی، مرکزی بزم مشتاقانِ رسول، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۸ (نعت،منقبت)

۶۴۸۔ نکہت و نور، محمد حسین خادمیؔ اجمیری، بزم فروغ ادب، سادات منزل، روپ محل، ہیرآباد، حیدرآباد (سندھ) نومبر ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۰ (نعت،منقبت)

۶۴۹۔ نگارطیبہ، محسن رضا جونپوری، ناشر شاعر خود، رشید منزل، نزد سٹی بورڈ آفس، بلند شہر، ۱۹۹۷ء، ص ۲۰۸ (حمد،نعت،سلام،منقبت وغیرہ)

۶۵۰۔ نگاہِ مدینہ، پیرزادہ عابد علی شاہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۰ (نعت،منقبت)

۶۵۱۔ نوارالہدیٰ، پیرزادہ احسان الحق احسان فاروقی،، بیت الانوار، ا۔جے ۲۴/۵ ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۲۰ (نعت،منقبت)

۶۵۲۔ نوائے باطن، خلش رفاعی، مرتبہ ڈاکٹر جاوید رفاعی، فیضان پبلی کیشنز، بلگام کرناٹک، ۱۹۹۷ء، ص ۹۶ (نعت،منقبت،غزل)

۶۵۳۔ نوائے بےنوا، محمد یونس خان ہویدا، اکیڈمک پرنٹرز، کراچی ۱۹۹۳ء، باراول، ص ۱۱۲ (حمد، نعت،منقبت،سلام)

۶۵۴۔ نوائے سروش، شیخ عبدالحمید سالم قادری، تاج الفحول اکیڈمی بدایوں، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷ (نعت،منقبت)

۶۵۵۔ نوائے وقت، مرتبہ شہزاد احمد، انجمن ترقیِ نعت، کراچی، س۔ن، ص ۹۶ (حمد،نعت،منقبت،سلام)

۶۵۶۔ نورصابر، علیگرین صابری میگزین ۱۹۸۹ء مرتبہ قاری حافظ سید عرفان علی، آل انڈیا علیگرین صابری سرکل پنجابیان اسٹریٹ پیلی بھیت، یو۔پی، ص ۱۲۰ (نظم ونثر۔مناقب)

۶۵۷۔ نورونکہت، فیاض کاوش وارثی، اسلامی کتب خانہ سیالکوٹ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۰ (حمد،نعت، منقبت،سلام،رباعی)

۶۵۸۔ نورونکہت، ماجد جائسی، آل انڈیا یونم کلچرل سوسائیٹی کانپور، ۱۹۷۶ء، ص ۴۸ (نعت،منقبت)

۶۵۸۔ نورِعقیدت، مصلح الدین مصلح حبیبی مرصع پوری، ناشر اراکین انجمن دارالعلوم رضائے مصطفیٰ جے، کے نگر کریلی، الہٰ آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۰ (حمد،نعت،منقبت،سلام)

۶۶۰۔ نورِ لولاک، عارف جلال، بزمِ اربابِ سخن، حیدرآباد (بھارت) ۲۰۰۷ء، ص ۲۳۲ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۶۶۱۔ نورِ مدحت، خورشید رضا فتح پوری، مرتبہ علی امان شان عابدی، ناشر قوسین حیدر رضا، محمد سبطین رضا، حسینستان، میدان ایلچی خان، سلطان بہادر روڑ لکھنو، اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص ۲۷ (نعت، منقبت)

۶۶۲۔ ودیعت، عابد سعید عابد، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۹۸ (حمد، نعت، منقبت، تصوف)

۶۶۳۔ ورفعنا لک ذکرک، راجا رشید محمود، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء، بار سوم، ص ۱۳۶ (نعت، منقبت)

۶۶۴۔ وسیلہ نجات، ساحر شیوی، وجے پبلشرز، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۰ (حمد، نعت، منقبت، سلام)

۶۶۵۔ وقت کی تحریر، خواجہ سنبھلی، ناشر شاعر خود، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۰ (نعت، منقبت، غزل)

۶۶۶۔ ہاشمی گلاب، عبدالوحید تاج، بزمِ دلی، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۰ (حمد، نعت، منقبت)

۶۶۷۔ ہدیہء طاہر، بانو طاہرہ سعید، دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار حیدرآباد، سوم ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۰ (نعت، منقبت)

۶۶۸۔ ہدیہء عقیدت، محمد حسن علی رضوی مرتبہ محمد حسن علی رضوی، جمعیت خدام رضا اخبار اہلسنت و جماعت میلسی، مطبوعہ مطبع شمس ملتان، س۔ن، ص ۱۵ (مناقب)

۶۶۹۔ ہم اُن سے عشق کرتے ہیں، سید قمر حیدر، رائٹرز بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۴ (حمد، نعت، منقبت)

۶۷۰۔ ہمہ رنگ، حافظ لدھیانوی، ناشر خود، لاہور، ۱۹۹۶ء، بار اول، ص ۲۴۰ (نعت، منقبت، دیگر)

۶۷۱۔ ہمہ رنگ، درد اسعدی، بزمِ شعر و ادب حیدرآباد، ۱۹۸۱ء، ص ۱۴۲ (حمد، نعت، غزل و دیگر)

۶۷۲۔ ہندو کی نعت اور منقبت، چودھری دلو رام کوثری، مرتبہ خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ محبوب المطابع دہلی، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۴۰ (نعت، منقبت)

۶۷۳۔ ہیروں کے چہرے، صابر کوسگوی، صام آفیسٹ پریس ملک پیٹ نزد بی بی کینسر ہاسپٹل، حیدرآباد، جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۹۸ (نعت، منقبت، سلام)

۶۷۴۔ یا عبدالبہا، صابر آفاقی، ادبیات مظفرآباد، ۱۹۹۲ء، ص ۸۰ (مناقب، عقیدت مندانہ کلام)

۶۷۵۔ یا نبی، اسرار نسیمی، مرتبہ وسیم مینائی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۲ (نعت، منقبت)

۶۷۶۔ یہ تو کرم ہے ان کا ورنہ، محمد فاروق کوثر بریلوی، حرا فاؤنڈیشن گلشن فاروق، نارتھ کراچی، جولائی ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۲ (نعت، منقبت)

۶۷۷۔ انتخاب مناقب سیدنا امام زیدن العابدین رضی اللہ عنہ، مرتبہ عارف جاوید نقشبندی، ناشر مصنف، گوجرانوالہ، ۲۰۲۴ء، ص ۸۰۶ (مناقب)

سندی و غیر سندی تحقیقی مقالات/ مضامین

۶۷۸۔ حیدر آباد کرناٹک میں منقبت نگاری ۱۹۵۶ء کے بعد، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل اردو، رحمت اللہ خان، نگران ڈاکٹر راہی قریشی، گلبرگہ یونیورسٹی، ۱۹۹۳ء

۶۷۹۔ اردو میں منقبت نگاری، احسن زیدی، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۸۴ء

۶۸۰۔ دکنی مناقب کا انتخاب، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، بزم حسان سرہند منزل ملک پیٹھ حیدر آباد، ۲۰۰۰ء

۶۸۱۔ غالب دیوان نعت و منقبت، مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی، شاہد پبلی کیشنز، دریا گنج، نئ دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۸۲۱ (تحقیق و تنقید)

۶۸۲۔ جھنگ میں اردو حمد، نعت اور منقبت کی روایت، محمد رضا شاہ عابد، نگران جمیل اصغر، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۱

۶۸۳۔ پیر نصیر الدین نصیر کی منقبت نگاری کا فنی اور عروضی مطالعہ، محمد قاسم نگران حضر نوشاہی، غیر مطبوعہ مقالہ، شعبہ اردو، علامہ اقبال، اوپن یونیورسٹ اسلام آباد ۲۰۱۷ء، ص ۲۶۴

۶۸۴۔ صائم چشتی کی اردو منقبت نگاری، مقالہ نگار سید صفدر حسین شاہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل اردو، شعبہء اردو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد، اپریل ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۶

۶۸۵۔ راجھستان میں منقبت نگاری: ابتدا تا حال، ثوبیہ قمر، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، شعبہ اردو بی۔جی، کالج ٹونک، مہارشی دیانند سرسوتی یونیورسٹی، اجمیر، ۲۰۲۰ء

۶۸۶۔ اختر صدیدی کی نعت و منقبت، صبا منور، نگران مقالہ ریاض مجید اصغر، مقالہ برائے ایم۔فل اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۲۲۲

۶۸۷۔ منقبتی و رثائی ادب اور اردو شاعرات، تسنیم عابدی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۲۴ء، ص ۶۸۶

۶۸۸۔ سب رس میں نعت و منقبت، قدرت نقوی، فکر و تحقیق، دہلی، ۱۹۹۰ء

۶۸۹۔ بلوچستان میں اردو منقبت نگاری کے نئے امکانات، فاروق فیصل، اخبار اردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۰

۶۹۰۔ مرزا غالب اور منقبت حضرت علیؑ، سرفراز احمد ظفر، پیغام آشنا، اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۵۵۔۴۸

۶۹۱۔ مدح سید الشہداء (امام حسینؑ) اور غیر مسلم شعرا، صفدر حسین بیگ، پیغام آشنا، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۶۱۔۴۸

۶۹۲۔ کلام اقبال میں ذکر حسین، عاشق خواجہ جہاں گرد، پیغام آشنا اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۴۔۱۵۹

۶۹۳۔ عبدالعزیز خالد کی منقبت نگاری ایک جائزہ، امیاز احمد
humsub.com.pk/495907/imtiaz-ahmad-167/

۶۹۴۔ نظیر عابدی کی منقبت نگاری، ڈاکٹر سید تقی عابدی ۔۔۔۔۔نظیر عابدی کی منقبت نگاری
drtaqiabedi.com/

۶۹۵۔ میر تقی میر کی منقبت نگاری، طفیل احمد مصباحی
www.mushahidrazvicom/2020/01meer-taqi-meer-ki-manqabat-nigari.html

۶۹۶۔ پیر سید نصیر الدین نصیر کی منقبت نگاری، محمد قاسم گیلانی، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۲۸۴

۶۹۷۔ مولانا حسرت موہانی بطور ثنا خوانِ محمد و آلِ محمد، کرامت بخاری مشمولہ الاقربا، اسلام آباد، اکتوبر دسمبر ۲۰۱۶ء، ۱۳۱۔۱۲۶

۶۹۸۔ فارسی منقبت نگاری: مختصر تاریخ اور منتخب کلام، ڈاکٹر نیک عالم راشد، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۔۔۔ص ۴۶۴

۶۹۹۔ تقسیم سے قبل خطہ بہاولپور میں اردو منقبت نگاری، منیر احمد ملک / محمد محسن خان، متن، اردو ریسرچ جرنل شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ۳۰ جون ۲۰۲۲ء

۷۰۰۔ کلاسیکی اردو ادب میں مناقب گیلانیہ ، پروفیسر ڈاکٹر ساجد محمود ، مراۃ العارفین انٹرنیشنل، تعلیمات غوثیہ نمبر، نومبر ۲۰۲۳ء mirrat.com/article/21/1382

۷۰۱۔ منقبت نگاری و یاد کرد اہل بیت (علیھم السلام) در آثار سیوطی البرز محقق گرفی، محمد میرزای مشمولہ سیرہ پژوہی اہل بیت علیھم السلام، شمارہ، دوازدھم، سال ہفتم، بہار و تابستان، ۱۴۰۰ھ

۷۰۲۔ آسیب شناسی مناقب نگاری اہل بیت علیھم السلام، مطالعہ موردی گزارش بیرون کشیدن تیر، محمد غفوری، مشمولہ سیرہ پژوہی اہل بیت علیھم السلام، شمارہ، دوازدھم، سال ہفتم، بہار و تابستان، ۱۴۰۰ھ

۷۰۳۔ ساحر صدیقی کی نعت و منقبت نگاری، ڈاکٹر غلام اکبر، نثار احمد، تحقیق نامہ، شمارہ ۱۹، جولائی دسمبر ۲۰۱۶ء

۷۰۴۔ اردو نعت میں منقبت نگاری کی روایت، ڈاکٹر محمد شہزاد مجددی، العصر انٹرنیشنل ریسرچ جرنل آف اسلامک سٹڈیز، شمارہ ۵، جنوری، مارچ ۲۰۲۵ء

۷۰۵۔ عبدالعزیز خالد بحیثیت منقبت نگار، آمنہ شہزادی، ڈاکٹر محمد نواز کنول، ریسرچ جرنل تحقیق، شمارہ ۲، دسمبر ۲۰۲۳ء

□□□

نعت نامے

حضرت علی رضی اللہ عنہ

حیدرؓ، ابوترابؓ، علیؓ، مرتضیٰؓ ہو تم
سب نام جانتے ہیں ، خدا جانے کیا ہو تم

احزاب ہو، اُحد ہو کہ خیبر ہو بدر ہو
ہر اک جہادِ حق میں نبیؐ کی دُعا ہو تم

میدانِ کار زار اگر ہو تو لافتیٰ
منبر ہو علم کا تو سلونی قبا ہو تم

ہر حال میں ہو قوتِ بازوئے مصطفیٰؐ
ہر معرکے میں نصرتِ دینِ خدا ہو تم

عرفان و آگہی کا بھرم ہے تمھارا نام
کہتے ہیں اولیا کہ شہِ اولیا ہو تم

محرابِ آرزو میں اُجالا تمھیں سے ہے
طالب کا مدّعا ہو، طلب کی دُعا ہو تم

(امید فاضلی)

ڈاکٹر محمد طاہر القادری (کینیڈا)

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ مدّت بعد پھر کینیڈا میں آپ سے ملاقات ہوئی، جس میں آپ نے نعت رنگ کا بتیسواں شمارہ پیش کیا۔ اس کے مندرجات کا تنوع لائقِ تحسین ہے اور نعتیہ ادب میں تحقیق و تنقید کا ہمہ جہت آئینہ دار بھی ہے۔ آپ سے جن نکات پر گفتگو ہوئی مجھے یقین ہے ادب میں آپ کی توجہ مستقبل میں بھی ان پر بدستور قائم رہے گی۔ نعت ریسرچ سینٹر کراچی کا قیام نعت گوئی کی عظیم اسلامی روایت میں ایسی کڑی ہے جس کے باعث صنفِ نعت کے مقاصد تغیراتِ زمانہ کے باوجود بطریق احسن پورے ہوتے رہے ہیں۔ اس مرکز کے ذریعے آپ نے دیگر محبینِ نعت کے تعاون سے وہ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جنھیں بیک وقت مذہبی، ادبی، سماجی اور ملّی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ یہ اقدامات بلاشبہ قابلِ تقلید اور باعثِ اجر مزید ہیں۔ جس طرح نعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سعادت ہر کسی کو میسّر نہیں آتی، اسی طرح خدمتِ نعت کا یہ شرف بھی مخصوص لوگوں کو ودیعت ہوتا ہے۔ ورنہ کئی صاحبانِ وسائل جو خاطر خواہ سماجی و ادبی اعتبار کے حامل ہوتے ہیں ایسی مساعیِ جمیلہ کا قلیل حصّہ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ اس مکرمت کی وجہ یقیناً آپ کا صدقِ نیت اور اخلاصِ عمل ہے۔ میں اس تازہ شمارے کی اشاعت پر اور آپ کی طویل المدّت سعی و کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اس محنت کی قبولیت کے لیے دُعا کرتا ہوں۔

□□□

ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)

آپ تو ایک خزینے سے نواز گئے ہیں اور ایسی ایسی دل نشیں مطبوعات دے گئے ہیں کہ جو کئی دن مجھے باندھے رکھیں گی۔

اکثر کتابیں نہ پہلے دیکھی تھیں نہ ہی کہیں ان کے بارے میں سنا تھا۔ آپ نے بڑا کرم کیا اور ان کے طفیل ایسے ایسے موضوعات و متون سے نوازا کہ جو بے حد قیمتی اور بے حد قابل استفادہ رہیں گے۔

ان کے چند مصنفین سے تو میں واقف تھا لیکن مزید کئی نام اور ان کی تصنیفی خوبیوں اور صلاحیتوں سے اب خاصی واقفیت ان شا اللہ حاصل کروں گا۔ بعض کتابیں تو اپنے موضوعات اور معیار کے اعتبار سے حوالہ جاتی اہمیت و افادیت کی حامل ہیں اور آپ کا نام علمی و ادبی زمرے میں ہمیشہ نمایاں رکھیں گی۔ اس اعتبار سے میری جانب سے ان سب کی اشاعت و پیش کش پر اور انھیں مجھ عاجز کی نذر کیے جانے پر میری جانب سے تہ دل سے تشکرات اور مبارک باد قبول کیجیے۔ والسلام!

پس نوشت:

''معارف کے تقدیسی مطالعات'' جو بڑی نفاست سے آپ نے چھاپی ہے، اس میں میرا مقالہ: ''نعت نگاری کے بدلتے رجحان: تجاوز حدود کے زاویے اور رویے'' ص ۴۲۹-۴۴۷ میرے لیے اطمینان بخش ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ یہ اب دوبارہ بھی کہیں چھپے کیوں کہ یہ معارف میں کوئی تیس چالیس سال پہلے چھپا تھا اور یہ بہت اہم اور تحقیقی موضوع کا احاطہ کرتا ہے جسے اپنے موضوع و متن کے لحاظ سے دوبار چھپنا چاہیے۔

صبیح رحمانی صاحب، کیا اس کی مزید اشاعت ثانی کے لیے آپ کوئی مدد کر سکیں گے؟

□□□

ڈاکٹر عارف نوشاہی (اسلام آباد)

آپ کی عنایت اور توجہ خاص سے کتابی سلسلہ 'نعت رنگ' گذشتہ کئی سال سے باقاعدگی سے مل رہا ہے اور آج شمارہ ۳۲ (اگست ۲۰۲۴) بھی ملا۔ نعتیہ ادب پر یہ کتابی سلسلہ اب اپنے موضوع پر ایک اختصاصی نشریہ بن گیا ہے، ہر شمارے میں کئی خاص مقالات ہوتے ہیں۔ جدید و قدیم نعتیہ ادب پر ابحاث اور جدید و قدیم نعت گو شعرا کے حالات اور نعتیہ کلام کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ نعت کی تینوں بڑی زبانوں (عربی، فارسی، اردو) پر مقالات پڑھنے کو ملتے ہیں۔

نعت رنگ کے شمارہ ۳۲ میں ص ۴۹ سے شروع ہونے والے ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب کے مضمون ''انیسویں صدی کے چند نعتیہ دواوین'' میں آگے چل کر مفتی غلام سرور لاہوری کے دیوان نعت سروری کا ذکر آتا ہے، دیوان کی سنہ تصنیف وطباعت ۱۲۹۵ھ/۱۸۸۱ء لکھنے کے بعد مضمون نگار لکھتے ہیں: ''اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرور کا انتقال ۱۸۸۱ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان کسی برس ہوا ہوگا، تاریخ ادب میں اُن کی پیدائشی تاریخ کا بھی کہیں ذکر نہیں، اس اعتبار سے وہ ایک گمنام شاعر رہے ہیں۔'' (ص ۵۲) مضمون نگار کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شناسائی صرف دیوان نعت سروری سے رہی ہے اس کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری سے نہیں، جو انگریزی دور میں پنجاب اور لاہور کے معروف مورخ، تذکرہ نویس اور فارسی، اردو، پنجابی کے شاعر گذرے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں ان ذکر ملتا ہے اور لاہور سے متعلق رجال کی کتابیں بھی ان کے حالات سے خالی نہیں ہیں۔ ان کی ولادت اور وفات کے سنین یہ ہیں: (13071244 / ۱۸۲۸-1890ء)۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مفتی صاحب حج پر گئے ہوئے تھے۔ حج کے مناسک ادا کر چکنے کے بعد مدینے کے راستے میں

ہیضے کی وبا سے انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہیں۔ان کی مشہور ترین تصنیف خزینۃ الاصفیا (فارسی) ہے جو صوفیہ کا بہ حسب سلاسل طریقت ضخیم تذکرہ ہے۔اس کا اردو چربہ انھوں نے مدینۃ الاولیا نام سے تیار کیا۔تیسری کتاب حدیقۃ الاولیا اردو میں پنجاب کے مشائخ کا تذکرہ ہے۔مخزن پنجاب اردو میں پنجاب کی اہم تاریخ ہے۔ان کے حمدیہ،نعتیہ،منقبتی دواوین بھی ہیں جیسے دیوان حمد ایزدی (فارسی اور اردو حمدیہ غزلیں)؛ دیوان سروری (اردو غزلیں در مدح شیخ عبدالقادر گیلانی)؛ دیوان کلیات نعتیہ سرور (فارسی و اردو) مرتبہ مفتی محمد انور فرزند مؤلف، اس میں مصنف کے دو دیوان نعت سروری اور وصال سرور درنعت پیامبر اکرم (ص) شامل ہیں؛ دیوان وصال سرور (اردو نعتیہ غزلیں)۔مفتی صاحب اوران کے خاندان کا تفصیلی تذکرہ ہمیں ذکر جمیل مصنفہ مفتی محمد عالم ہاشمی،مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۸ء میں ملتا ہے۔

مضمون نویس نے دیوان سنی درنعت کے تعارف میں روا روی میں ص ۵۷ کے پیراگراف ۲ میں انھیں سرور (اشارہ مفتی غلام سرور لاہوری کی طرف ہے) لکھ دیا ہے۔مضمون میں کمپوزنگ کی کچھ غلطیاں بھی ہیں، جیسے: کلک سخن از پئے کو کلک سخن از پیئے اور شد سوے خلد کو شد سوئے خلد لکھنا (ص ۵۶)، یہ جملہ بندی درست نہیں: ''بوصیری کا یہ ترجمہ شاعر نے ۱۲۸۰ھ میں مکمل ہوا تھا'' (ص ۷۳) مکمل کیا تھا ہونا چاہیے۔استخراج علیحدہ علیحدہ (اس+تخراج) کمپوز ہوا ہے (ص ۷۳)؛ مرجع خاص و عام کو مرجعۂ خاص و عام لکھا گیا ہے (ص ۷۵)

میری ایک پرانی اور قلبی خواہش ہے کہ حصول برکت کے لیے نعتیہ موضوع پر کوئی مقالہ 'نعت رنگ' کے لیے پیش کروں۔لیکن افسوس کہ تا حال اس خواہش کی تکمیل کے لیے مطلوبہ فرصت اور یک سوئی نہیں مل پائی۔دعا فرمائیں۔

نعتیہ ادب سے متعلق آپ کے ادارے کی دیگر وقیع کتب بھی وقتاً فوقتاً ملتی رہتی ہیں۔اس کے لیے الگ شکریہ۔

□□□

غلام مصطفیٰ دائم (کراچی)

محترم المقام سید صبیح صاحب! امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے اور قافلۂ نعت کی حدی خوانی میں حسبِ سابق مشغول ہوں گے۔ یہ بہت خوش آئند ہے کہ اس مرتبہ نعت رنگ میں اکثر مضامین اور مقالات علمی نوعیت کے ہیں۔بعض مستقل لوگ اس مرتبہ منصۂ ظہور پر نہیں آئے اور یہ خلا خاصا محسوس ہوا۔ بہرحال! "نعت رنگ: ۳۲" کے حوالے سے مفصل تبصرے کی بجائے صرف تین امور پر اپنی

معروضات پیش کروں گا جن پر اظہارِ خیال ضروری ہے اور ان سے مزید مکالمے کی گنجائش پیدا ہونے کا بھی امکان ہے۔

(الف) آپ کے اداریے کے ایک سوال پر غور

(ب) ڈاکٹر طارق ہاشمی کے مضمون میں تقدیسی ادب کی اصطلاح پر ان کے اشکالات کا جائزہ

(ج) ڈاکٹر اکرم کنجاہی کے مضمون میں ایک اہم نکتے کی وضاحت

آپ نے لکھا: "نعت میں مدحِ رسولؐ کی بجائے شاعر کی اپنی ذات، معمولات اور تفاخرات کا ذکر غلبہ پاتا جارہا ہے۔"

میرے خیال میں اس کے کچھ علمی اسباب ہیں اور چند سماجی وجوہات۔ علمی اسباب میں ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اپنے وجود عنصری کے باطنی اور خارجی حوالوں کو نسبتِ تعلق نہ دینا ہے۔ نعت، ظاہر ہے کہ کوئی لفظی کہانی تو نہیں کہ اس کے صوت و آہنگ سے لطف لینے کی ایک عارضی ریاضت کے بعد اس سے لاتعلق پن اختیار کر لیا جائے، بلکہ یہ اعتقاد اور عمل کے زاویوں کو تعلق مع الرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہم آمیز کرنے یا اس پر برانگیختہ کرنے والی باضابطہ وجودی قوت کا نام ہے، ورنہ نعت محض رسمی سرگرمی کا نام ہو کر رہ جائے گی۔ ناعت کی ذات تک تو معاملہ نبھ جاتا ہے مگر آپ کا سوال مجموعی سیاق و سباق میں جن معمولات اور تفاخرات کی جانب اشارہ کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں عہدِ تازہ کے کچھ مسائل سبب بن رہے ہیں۔ مثلاً سیرت کا مطالعہ اور اس سے اخذِ نتائج کا رجحان نہ صرف بہت کم ہے، بلکہ سرے سے معدوم ہے۔ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آداب کی نزاکت کا مکمل اور حقیقی احساس مفقود ہوتا جارہا ہے۔ عملی دنیا میں مادی قوتوں پر انسان کے اعتماد علی الکفایہ نے ذاتِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق کو بھی معاشرے کی ظاہری اور قانونی اصلاح پر منتج سمجھ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب اور لحاظ جو ذاتِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں ہدیۂ نعت پیش کرنے میں ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے، وہ نادر اور نایاب ہوتا جارہا ہے۔ نعت سے وابستہ شعرا کے لیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تاریخی اور سوانحی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عرفانی روایت کے حقیقی حاملین صوفیوں کے احوالِ عشق سے بہرۂ وافر بھی کشید کرنا چاہیے۔ کیونکہ جتنا ادب اور تعظیم کا محض تصوراتی نہیں، عملی اظہار ان مبارک ہستیوں کے ہاں ملتا ہے، اتنا کسی دوسری علمی یا فکری جماعت/گروہ کے پاس نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی کا مضمون نہایت اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ تاہم انھیں چند مغالطے ہیں جن کا خصوصیت سے ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے حمد، نعت اور منقبت کے لیے "تقدیسی ادب" کی اصطلاح کو معرضِ بحث بنایا اور فرمایا کہ یہ انگریزی اصطلاح Sacred Literature کا ترجمہ ہے

اور اُس سے مراد الہامی متون ہیں۔ اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے آخر پہ وہ اہلِ فارس کے ایک مصنف کی استعمال کردہ "تحمیدی ادب" کی اصطلاح پر صاد کرتے ہیں اور اسے "بہت حد تک درست" اور "صحیح معنوں میں نمائندہ اصطلاح" سے تعبیر کرتے ہیں۔ انگریزی ترکیب Sacred Literature کے ضمن میں خود انھی کا فرمانا ہے کہ اس سے مراد "الہامی متون" ہیں۔ اور عالمی سطح پر یہ اصطلاح کسی ایسے متن کے لیے مروج نہیں ہوسکی "جس کا تخلیق کار انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ ہو۔" نیز انھوں نے اس قضیے کی بنیاد پر دیگر کئی مفروضات قائم کرکے ان پر اپنی رائے کو استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی علمی صلاحیت کا ایک جہان شاہد ہے۔ نعتیہ فکر میں ان کے شذرات قابلِ دید ہی نہیں لائقِ غور بھی ہوتے ہیں۔ تاہم زیرِ نظر مضمون میں ان کی جانب سے "کسل مندی کا نہایت جوشیلا اظہار" ہوا ہے۔ اسے ان کا تجاہلِ عارفانہ کہوں یا شوخیِ گفتار، ہر دو صورتوں میں آپ سے ان کی جناب میں اپنی رائے رکھنے کی جسارت کی اجازت چاہتا ہوں۔

ایک خط میں چونکہ اتنی طویل مباحث کا مقام نہیں، اگر یہ گفتگو بڑھی تو اس پر مفصل معروضات پیش کروں گا، تاہم اجمالی طور پر میں اپنی آرا پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ مکالمے کی فضا استوار ہو اور یہ قضیہ سنجیدگی سے حل کیا جاسکے۔

جنابِ محترم! سب سے پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ "تقدیسی ادب" انگریزی اصطلاح Sacred Literature کا درست ترجمہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی ادبیات/ مذہبیات میں Sacred Literature سے مراد وہ متون ہیں جو اُن کے نزدیک مقدس خیال کیے جاتے ہیں، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا Sacred کا وہ اصطلاحی معنیٰ جو اُن کے ہاں ایک اعتقادی مسئلے (یعنی مزعومہ تقدُّس) کی بنا پر وجود پذیر ہوا، اس کا لفظی ترجمہ اردو زبان میں حمدیہ و نعتیہ متون کے لیے کیا جانا درست ہے؟ تو اس کا واضح جواب "نہیں" ہے۔ پھر فرق کیا ہوا اُن کے Sacred Literature اور ہمارے تقدیسی ادب میں؟ اس کا جواب چند پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ Sacred کا معنیٰ انگریزی لغات میں متعدد اطلاقات رکھتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں درجنوں معانی موجود ہیں۔ وہ Sacred کا اصطلاحی معنیٰ درج کرتے ہیں تو اس کا توسیعی مفہوم بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً Journal of Sacred Literature کے کئی والیمز میں Sacred کا معنیٰ Revealed ملتا ہے۔ یعنی "نازل کردہ متن"۔ بالکل یہی ترجمہ عربی مصنفین الہامی کتب کا کرتے ہیں۔ مثلاً امام نسفیؒ نے اصول الفقہ کے متن "المنار" میں قرآن کی تعریف میں "المُنَزَّ لُ علَی الرَّ سُوْلِ" کے الفاظ لکھے ہیں۔ المُنَزَّ لُ کا درست انگریزی ترجمہ Revealed ہے اور جب انگریزی کے مذہبی ماہرین

Sacred کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہی معنیٰ مراد لیتے ہیں۔ یونہی ایک مصنف نے Sacred کی توضیح میں books dealing with religious themes کے الفاظ لکھے ہیں۔ میر سیا ایلیڈ (MIRCEA ELIADE) نے اپنی مشہور کتاب THE ENCYCLOPEDIA OF RELIGION میں درج ذیل الفاظ لکھے ہیں:

"Sacred literature is not limited to scriptures but can also include hymns, prayers, and other forms of religious expression that convey spiritual truths and moral guidance."

یہ مفاہیم بتاتے ہیں کہ ان سب کے ہاں بھی Sacred کا اصطلاحی معنیٰ "الوہی/ الہامی متون" ہی ہے جبکہ لغوی اعتبارات سے اس لفظ کے اطلاقات کثیر ہیں۔

یہاں میں خاص طور پر نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ و ادبیات کے پروفیسر اور چیئر چارلس سیموئل براڈن (CHARLES SEMUEL BRADEN) کی معروف کتاب THE SCRIPTURES OF MANKIND کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ چارلس کی شہرت عالمی مذاہب اور مذہبی تحریکوں کے ساتھ خاص ہے۔ لکھتے ہیں:

"What constitutes sacred literature? How does it differ from ordi- nary literature? Well, first of all, not in its being religious. For there is much religious literature that is not regarded as sacred; and a great deal of the content of so-called sacred literature is not necessarily directly religious at all, though indirectly it is usually in some way linked up with religion. In sacred literatures are found history, legislation, poetry, letters, fables, myths, drama, genealogies, prophecy, visions, laments, martial songs, indeed almost the whole gamut of literary variety is to be found. Often specific passages taken out of their setting would bear no marks of religion or of sacredness, yet the whole has somehow come to be regarded as sacred."

اس اقتباس میں یہ الفاظ خاص طور پر متوجہ کرتے ہیں:

"Indeed almost the whole gamut of literary variety is to be found."

ان محولہ اقتباسات کا ماحصل یہ ہے کہ Sacred کا اردو لفظی ترجمہ "تقدیسی" نہیں بلکہ "الوہی" یا "الہامی" ہے۔ کیوں کہ انگریزی اصطلاح کا صحیح اردو ترجمہ ضروری ہے کہ مفہوم کے اعتبار سے کیا جائے نہ کہ لفظی۔ "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (۱۸۴۲ / دہلی کالج) کے اصولِ ترجمہ نویسی میں ایک اصول

یہ بھی تھا کہ اصطلاحات کا ترجمہ لفظی نہیں بلکہ مفہوماً کیا جائے۔ اس سوسائٹی کے اصول اب تک ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ کیوں کہ وہ اتنے جچے تلے اور عملی پہلو سے ایسے معقول اور کارآمد تھے کہ آج بھی ان سے بہتر اصول نہیں بنائے جاسکتے۔

دراصل کوئی بھی اصطلاح ہو، اس کا دوسری زبان میں ترجمہ شے کی باطنی اور عملی ساخت کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے تاکہ معروض کا درست مفہوم منتقل ہو سکے۔ چونکہ ہمارے یہاں ترجمہ نویسی کے مسائل ہیں، اس وجہ سے ہر لفظ لفظی ترجمے کے ساتھ اپنایا جارہا ہے، اس سلسلے میں وہ اصول جو دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے قائم کیے تھے، ان سے استفادہ بہت ضروری ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب موصوف بطورِ اعتراض یہ ارشاد فرمائیں کہ Sacred Literature کا درست اردو ترجمہ اگر "تقدیسی ادب" نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اور کیا اُس کا کوئی وجود بھی ہے؟ تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ Sacred Literature کا درست اور مکمل بامعنی ترجمہ "الہامی ادب" ہے۔ اور اس کا وجود ہمارے یہاں ادبی اصطلاحات کی کتب میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر سلیم شہزاد نے اپنی کتاب "فرہنگِ ادبیات" میں "الہامی کتب" اور "الہامی ادب" دو اصطلاحات درج کی ہیں۔ ان کی کتاب سے صفحہ ۱۳۵ کا اقتباس پیش ہے:

"الہامی کتب اور ادب: دنیا بھر کا ادب ہمیشہ توریت و قرآن اور ویدو جاتک وغیرہ کی تحریروں سے متاثر رہا ہے۔ عام انسانی اظہار جو بعض لسانی اور فنی لوازم کی موجودگی اور خیالات کی آرائش اور زیبائش سے ادب میں تبدیل ہو جاتا ہے، اپنے استعارے اور تمثیلیں، واقعات اور نصائح الہامی کتب سے ضرور اخذ کرتا ہے۔ قدیم بھارت کے رزمیے رامائن اور مہا بھارت ویدوں کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ "پنچ تنتر" اور "منطق الطیر" کی حکایات جاتک کتھاؤں سے بے حد مماثل ہیں، "شاہنامہ" آتش پرست ایران کے پہلوانوں کو اپنے مشاہیر بناتا ہے اور "فردوسِ گمشدہ" میں زوالِ آدم اور "فردوس بازیافتہ" میں عروجِ آدم کو ملٹن نے اپنا موضوع بنایا ہے جس کا ماخذ توریت اور انجیل ہیں۔"

حمد، نعت اور منقبت کے لیے "تقدیسی ادب" کی اصطلاح کے درست اور برمحل ہونے کی میرے نزدیک چند وجوہات ہیں۔ مثلاً ان موضوعاتی اصناف کے مضامین کی روحانی ساخت میں معنوی طہارت موجود ہوتی ہے۔ جذبے کی سچائی اور اخلاص کی ندرت تقدس کا استلزام پیدا کرتی ہے۔ ان اصناف کی تخلیق میں فکری و فنی آداب کا دیگر اصناف کی بہ نسبت ارفع اور بلند ہونا ان کے تقدس کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر ہم حمدیہ و نعتیہ ادب کے لیے "تقدیسی ادب" کی اصطلاح استعمال کر سکتے ہیں اور یہی موزوں اور مروج ہے۔ لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ معنوی تقدس کی بنا پر شعری متن کے

خارجی اور فنّی پہلوؤں کو ادبی تنقید سے بے نیاز سمجھ لیا جائے۔

آخر پہ ایک اہم نکتہ اس حوالے سے درج کرنا چاہوں گا کہ انگریزی میں الہامی والوہی متون (حقیقی یا مزعومہ) کے لیے Sacred کا لفظ استعمال کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اس سے انکار نہیں کہ آسمانی صحائف کے تقدس پر ہر مذہب متفق ہے، لیکن جدید عیسائیت میں بائبل وغیرہ کے لیے Sacred کا استعمال اس وجہ سے بھی ممکن ہے کہ اس کے بتمامہٖ الوہی ہونے پر شک نہ کیا جائے۔ کیوں کہ عیسائی مذہب کے بانی سینٹ پال (پولس) کے کئی خطوط بھی انجیل میں شامل ہیں۔ عہد نامہ جدید کی ۲۷ کتب میں سے ۱۳ اس سے منسوب ہیں۔ اس کے علاوہ بعد والوں کی تحریفات کی چشمِ فلک گواہ ہے۔ اس انسانی پیوند کاری کی بنا پر انجیل متہم بالوضع والکذب ہوسکتی ہے، اس وجہ سے انھوں نے اسے "مقدس" کہہ کر انسان کے معرَضِ شک سے دور کر دیا تا کہ اس مذہبی متن کے متصل السند نہ ہونے کے داغ کو پردے میں رکھ کر ایک مزعومہ تقدس کی عیّاری کو استعمال کیا جا سکے۔ یہ محض میری ذاتی رائے ہے اور اس وجہ سے عرض کر دی کہ یوں بھی سوچنے کا پہلو نکلتا ہے۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی کے مکمل مضمون کی سطر سطر میں مکالمے اور گفتگو کی گنجائش موجود ہے، تاہم میں نے ضروری معروضات پیش کر دی ہیں۔ امید ہے مندرجہ بالا گزارشات سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہو سکے گا۔ البتہ دیگر اہلِ علم کی آرا و دلائل کی طرف بھی متوجہ ہونا ہوگا۔ قاقشال سمرقندی یاد آتا ہے:

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد ست
عالَم نہ شود ویراں، تا مے کدہ آباد ست

آخری بات ڈاکٹر اکرم کنجاہی کے مضمون کے سلسلے میں کرنا چاہوں گا۔ اپنی اس مختصر گفتگو کا عنوان "نعت میں امورِ معاد- چند ضابطے" رکھتا ہوں تا کہ بعد ازاں اسے آگے بڑھایا جا سکے۔ گزارش یہ کرنی ہے کہ نعت میں ان امور کا ذکر، جن کا وقوع انسان کی موت کے بعد متحقق ہونا ہے، کئی شعرا نے کیا ہے۔ تاہم ناقدین اس پر یہ نقد کرتے ہیں کہ یہ درست نہیں۔ مثلاً اکرم کنجاہی کے زیرِ نظر مضمون "تنقیدِ نعت کے ضروری پہلو" میں اس شعر پر ایک اعتراض وارد کیا گیا:

مل گئی حافظِ عاصی کو شفاعت کی نوید
حشر میں چاہیے کیا سایۂ رحمت کے سوا

اس شعر پر ان کے تبصرے کا ماحصَل یہ ہے کہ قیامت کے وقوع سے قبل ایسے خیالی مضامین باندھنا "احتیاط کا متقاضی" یا محلِ نظر ہے۔ اس تبصرے پر اپنی معروضات آخر میں رکھوں گا، پہلے اس موضوع پر چند اصولی باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ نعت میں امورِ معاد کو ہم تین طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں:

(الف) بہ سبیلِ تمنی و ترجّی حقائق کا مفروضہ بیان

(ب) بہ قرینۂ امکان امورِ متحققہ کا بیان (ج) بہ سبیل دعا امورِ غیر یقینی کا بیان

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں بلندیِ درجات اور مغفرت و عافیت کی دعا و تمنا کا اظہار کرنا مستحسن امر ہے۔ مثلاً شفاعت کا تمنائی اظہار، سایۂ رحمت کی طلب، نجات کے تمام اسباب کی احتیاج کا بیان وغیرہ۔ یہ امور نہ صرف متحققہ ہیں بلکہ صحیح اعتقاد اور متوازن عمل کے بھروسے خدائی نعمتوں کے وعدے کی امید پر ان کو اپنے اظہار میں لانا سعادت کیشی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قیامت کا وقوع ابھی نہیں ہوا تاہم ان امور کا مفروضہ بیان جن کا تعلق احساس کی دریافت سے نہیں بلکہ حقائق سے ہو، تمنا اور دعا کی مناسبت سے کرنا بالکل درست ہے۔ اس کی قرآن مجید میں کئی مثالیں ملتی ہیں۔ یوں ہی معراج کے واقعے میں تمثیلاً جن واقعات کو رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا، وہ اعمالِ صالحہ وسیئہ پر مترتب ہونے والے نتائج تھے جو حدیث کے مطابق یقینی طور پر واقع ہوں گے۔ ان قرائن کی روشنی میں حقائق کے مفروضہ بیان کو بہ صیغۂ تمنا اظہار میں لانے کا جواز ملتا ہے۔

ان امور کا امکانی بیان جن کا متحقق ہونا لازمی ہے اگر صیغۂ التجا و التماس سے ہو تو اس کا حکم گزر چکا۔ لیکن اگر صیغۂ عموم (مثلاً فعل ماضی یا حال کے قرینہ کے ساتھ) میں ہو تو نعت میں اس کی گنجائش پیدا کرنا مشکل ہے۔ مثلاً سیّد الابرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و اطاعت کا تعلق ہماری نجات کے لیے ضروری ہے۔ لیکن نعت میں یہ کہنا کہ

میں پل صراط سے گزرا ہوں نعت کے صدقے

مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ پلِ صراط سے گزرنا امرِ حقیقی ہے لیکن اس کا قرینہ نعت کو بنانا کس دلیل پر ہے؟ معلوم نہیں۔ البتہ یہ امکان ضرور ہے کہ نعت وسیلۂ نجات بنے لیکن پلِ صراط سے سلامت گزر جانے کے تقاضے اور بھی ہیں جن سے عملی اور اعتقادی انحراف سخت خسارے کا موجب بن سکتا ہے۔

وہ معاملات جن کا غیر یقینی ہونا اس کے یقینی ہونے پر راجح ہو اسے صیغۂ دعا و التماس کے ساتھ اظہار میں لانا دو صورتوں میں درست ہوگا۔ اول وہ امر نصوصِ قطعیہ کے متضاد بیانیے کو پیدا نہ کرتا ہو۔ دوم وہ امر عقلِ سلیم کے ذوقِ بندگی کے لیے ناقابلِ تسلیم نہ ہو۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ جتنی صورتیں بن سکتی ہیں ان کا نعتیہ اظہار تخلیقی اپج کی بہترین صلاحیت کا اظہار ہوگا۔ تخلیق کا ایک تقاضا ذوق کی تسکین بھی ہوتا ہے چاہے وہ تخلیقی متن کوئی تقدیسی سیاق رکھتا یا نہ رکھتا ہو۔

قبلہ! آپ کی اتنی سمع خراشی کافی سمجھتے ہوئے قلم روکتا ہوں۔ اللہ پاک آپ کو قافلۂ نعت کی حدی خوانی میں تادیر قائم و دائم رکھے۔ والسلام!

□□□□

زینت مسند ارشاد ہیں عبدالقادرؒ رونق محفلِ بغداد ہیں عبدالقادرؒ
ان وسیلوں سے جو بخشے ہیں خدا نے ان کو کرتے ہر ایک کی امداد ہیں عبدالقادرؒ
(منور بدایونی)

ضمیرِ دہر کا اظہار سیّد ہجویرؒ سپاہِ عشق کے سالار سیّد ہجویرؒ
وہ جن کا خامہ نظر کے لئے ہے کشفِ حجاب امین و کاشفِ اسرار سیّد ہجویرؒ
(خورشید رضوی)

اے زمزمہ حسنِ بلاغِ چشتیؒ اے ابر کرم رحمتِ باغِ چشتیؒ
اے سلسلہ و چشمِ چراغِ چشتیؒ اے بختیارِ کاکی دماغِ چشتیؒ
(سیّد اختر حسین اختر)

ہیں میرے دیدہ و دل جلوا سرائے خواجہؒ جاں ہے نثار خواجہ دل ہے فدائے خواجہؒ
صادق ہے جذب دل تو مٹ جا رہِ طلب میں کانوں میں آرہی ہے پیہم صدائے خواجہؒ
(شکیل بدایونی)

کیسے بیاں ہو رتبہ محبوبِ الٰہیؒ ہے رحمتِ حق جلوہ محبوبِ الٰہیؒ
اک لفظ میں بس ان کا ہے پیغامِ محبت اخلاص و وفا ، نعرہ محبوبِ الٰہیؒ
(سیّد حامد یزدانی)

خدا کا شکر درِ زہدِ انبیاؑ پر ہوں میں خوش نصیب عروج کرم فزا پر ہوں
ہے جاری فیضِ عمرؓ اور فیضِ مولا علیؓ میانِ عدل و شجاعت در علا پر ہوں
(سیّد اسد نقوی مسعود چشتی)

در پر شہِ وارثؒ کے رسائی ہوئی میری محکم اسی نسبت سے گدائی ہوئی میری
کیا شانِ خدا ہے کہ اس در پہ پہنچ کر محسوس ہوا جیسے خدائی ہوئی میری
(شاعر لکھنوی)

اولیا میں منفرد ہے شانِ شاہِ نقشبندؒ واصلوں کے لب پہ ہے فرمانِ شاہِ نقشبندؒ
علم وحکمت، نورِ باطن، عشق ومستی، جذب وشوق راہِ حق میں ہے یہی سامانِ شاہِ نقشبندؒ
(شہزاد مجددی)

سیّدا، مقتدا، اشرف الاولیاءؒ اے شہِ اصفیاء اشرف الاولیاءؒ
شاہِ سمنان و سلطانِ اہل یقیں نوشۂ اتقیاء، اشرف الاولیاءؒ
(عباس عدیم قریشی)

نعت ریسرچ سینٹر کی مطبوعات

1- اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر		ڈاکٹر عاصی کرنالی	600/-
2- اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ		رشید وارثی	350/-
3- نعت میں کیسے کہوں	(تنقید)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	200/-
4- غالب اور ثنائے خواجہ	(تنقید)	صبیح رحمانی	200/-
5- نعت کی تخلیقی سچائیاں	(تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	150/-
6- ہنر نازک ہے	(تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	150/-
7- اردو نعت اور جدید اسالیب	(تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	120/-
8- نعت نگر کا باسی	(تنقید)	صبیح رحمانی	150/-
9- جادۂ رحمت کا مسافر	(تنقید)	ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی	80/-
10- بہشت تضامین	(شعری مجموعہ)	حافظ عبدالغفار حافظ	250/-
11- خیر البشر	(میلاد نامہ)	نور بانو محجوب	200/-
12- نعت اور تنقیدِ نعت	(تنقید)	ڈاکٹر ابوالخیر کشفی	300/-
13- فنِ اداریہ نویسی اور ''نعت رنگ''	(تنقید)	ڈاکٹر افضال احمد انور	200/-
14- ''نعت رنگ'' اہلِ علم کی نظر میں	(مضامین)	ڈاکٹر شبیر احمد قادری	300/-
15- فہرستِ کتب خانہ نعت ریسرچ سینٹر	(کتابیات)	محمد طاہر قریشی	300/-
16- زبورِ حرم	(کلیاتِ نعت)	اقبال عظیم	450/-
17- شہہ لولاک	(شعری مجموعہ)	امان خان دل	150/-
18- جادۂ رحمت	(انگریزی مجموعہ)	جسٹس منیر مغل	200/-
19- اشاریہ ''نعت رنگ''	(بیس شمارے)	ڈاکٹر سہیل شفیق	300/-
20- سرکار کے قدموں میں	(انگریزی ترجمہ)	سارہ کاظمی	500/-
21- شہپرِ توفیق	(شعری مجموعہ)	ڈاکٹر عزیز احسن	200/-
22- قوسین	(شعری مجموعہ)	آفتاب کریمی	200/-
23- نزول	(شعری مجموعہ)	شفیق الدین شارق	100/-
24- آنکھ بنی کشکول	(شعری مجموعہ)	آفتاب کریمی	100/-
25- آپ	(شعری مجموعہ)	حنیف اسعدی	150/-

26- کرم ونجات کا سلسلہ	(شعری مجموعہ)	ڈاکٹر عزیز احسن	150/-
27- نعت اور سلام	(شعری مجموعہ)	وحیدہ نسیم	20/-
28- ممدوحِ خلائق	(شعری مجموعہ)	آفتاب کریمی	200/-
29- مرقعِ چہل حدیث	(مجموعۂ احادیث)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	300/-
30- نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش	(تنقید)	پروفیسر محمد اکرم رضا	250/-
31- نعت کے تنقیدی آفاق	(تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	150/-
32- مثنوی رموزِ بیخودی کا فنی وفکری جائزہ	(اقبالیات)	ڈاکٹر عزیز احسن	200/-
33- اُمیدِ طیبہ رسی	(شعری مجموعہ)	ڈاکٹر عزیز احسن	150/-
34- نعت شناسی	(تنقید)	ڈاکٹر ابوالخیر کشفی	300/-
35- اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ	(تحقیقی مقالہ)	ڈاکٹر عزیز احسن	700/-
36- پاکستان میں اُردو نعت کا ادبی سفر	(تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	300/-
37- نعت نامے بنام صبیح رحمانی	(مجموعۂ مکاتیب)	ڈاکٹر محمد سہیل شفیق	1000/-
38- نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے	(تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	350/-
39- تعلق بالرسول a کے تقاضے اور ہم	(سیرت)	ڈاکٹر عزیز احسن	52/-
40- دل جس سے زندہ ہے	(ظفر علی خان کی نعتیہ تب وتاب)	ڈاکٹر محمد اقبال جاوید	100/-
41- نعت رنگ کے پچیس شمارے	(ایک اجمالی تعارف)	ڈاکٹر شہزاد احمد	50/-
42- وفیاتِ نعت گویانِ پاکستان		ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ	200/-
43- ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد ونعت		صبیح رحمانی	400/-
44- اُصول نعت گوئی		حلیم حاذق	200/-
45- نعت اور جدید تنقیدی رُجحانات		کاشف عرفان	400/-
46- زمزمہ سلام		سیما منیر	ہدیہ دُعا
47- مدحت نامہ		صبیح رحمانی	600/-
48- کراچی کا دبستانِ نعت	(تذکرہ)	منظر عارفی	1000/-
49- مناقب امام حسین اور شعرا کراچی		منظر عارفی	500/-
50- کلام رضا فکری وفنی زاویے		صبیح رحمانی	500/-
51- عطرِ خیال (نعتیہ مجموعہ)		شبنم رومانی	200/-
52- یہ روح مدینے والی ہے		رئیس احمد	250/-

53- پاکستانی زبانوں میں نعت	صبیح رحمانی	500/-
54- کلیاتِ عزیز احسن	صبیح رحمانی	900/-
55-نعتیہ شاعری کے فروغ میں ’’نعت رنگ‘‘ کی خدمات	حلیمہ سعدیہ منگلوری	500/-
56-اُردو شاعری میں نعت (ابتدا سے محسن کاکوروی تک)	ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری	500/-
57-اُردو شاعری میں نعت (حالی سے حال تک)	ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری	500/-
58-حمد و نعت کے معنیاتی زاویے	ڈاکٹر عزیز احسن	400/-
59-تحمید و تحسین (حمدیہ اور نعتیہ مضامین)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	500/-
60-مناقب خلفائے راشدین اور شعرائے کراچی	منظر عارفی	800/-
61-نعتیہ شاعری کے شرعی تقاضے	ڈاکٹر عزیز احسن	250/-
62- تحسین رسالت (تنقیدی مضامین)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	2000/-
63-خوشبو کا سفر (نعتیہ مجموعہ)	محمد احمد اریب	100/-
64-نعتیہ ادب: مسائل و مباحث (خطوط کا تجزیاتی مطالعہ)	ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	700/-
65-ہماری ملّی شاعری میں نعتیہ عناصر (تحقیقی مقالہ)	ڈاکٹر محمد طاہر قریشی	900/-
66-ثنا کی نکہتیں (مجموعہ نعت برزمینِ غالب)	سیّد محمد نورالحسن نور نوابی عزیزی	300/-
67-افسر ماہ پوری کی نعت شناسی	ڈاکٹر شمع افروز	300/-
68- کشفیہ (مجموعہ نعت)	سلیم شہزاد	300/-
69-پاکستانی اُردو غزل میں حمدیہ و نعتیہ عناصر (تنقید)	محمد کاشف ضیاء	300/-
70- صبیح رحمانی کی نعتیہ شاعری (فکری و تنقیدی تناظر)	ڈاکٹر شمع افروز	700/-
71-حمدیہ شاعری کی متنی وسعتیں (تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	600/-
72-اُردو کا حمدیہ ادب۔اجمالی مطالعہ (تحقیق)	صبیح رحمانی	200/-
73-انتخاب نعت (موضوعات کے اعتبار سے)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	2000/-
74-حرا کی خوشبو (مجموعہ نعت)	انجم نیازی	500/-
75-ریاضِ حمد و نعت (تین مجموعہ نعت)	ریاض حسین چودھری	500/-
76-تقدیسی ادب کا فکری تناظر (تنقید)	ڈاکٹر عزیز احسن	700/-
77-نعت نگاری: فنی و تاریخی تناظر (تنقید)	قاضی اسد ثنائی	800/-
78-مخزنِ نعت (انتخابِ نعت)	پروفیسر محمد اقبال جاوید	600/-
79-ناعت فرخندہ بخت (تنقید)	علی صابر رضوی	500/-
80-ثنائے نژاد (نعتیہ مجموعہ)	جنید ندیم سیٹھی	500/-

81-نصابِ غلامی	(نعتیہ مجموعہ)	ریاض حسین چودھری	700/-
82-وردِ مسلسل	(نعتیہ مجموعہ)	ریاض حسین چودھری	800/-
83- کلیات نعت	(نعتیہ مجموعہ)	عبدالعزیز دباغ	800/-
84-روشنی یا نبی	(نعتیہ مجموعہ)	ریاض حسین چودھری	900/-
85-اُردو نعت میں تعظیمی بیانیہ	(تنقید)	طارق ہاشمی	600/-
86-ریاض حسین چودھری کی نعت نگار	(تنقید)	شیخ عبدالعزیز دباغ	600/-
87-اُردو میں معراج نامے	(تاریخ وتجزیہ)	ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط	700/-
Excellence of Naat-88		Dr. Aziz Ahsan	900/-
89-عہدِ رسالت میں نعت	(تحقیق وتجزیہ)	ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان	800/-
90-دبستانِ فلم کے نعت نگار	(تحقیق)	اکرم کنجاہی	600/-
91- تنقیدِ نعت: نیا تناظر نئی تفہیم	(تحقیق وتنقید)	ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	1400/-
92-عقیدت کے پھول	(نعتیہ مجموعہ)	شکیل فاروقی	600/-
93-نعت نامے	(مجموعہ خطوط)	ڈاکٹر سہیل شفیق	5000/-
94-اردو شاعری میں واقعہ معراج	(تحقیق وتجزیہ)	ڈاکٹر طاہرہ انعام	900/-
95-اردو نعت اور چند ادبی تحریکیں	(تحقیق وتجزیہ)	ڈاکٹر طاہرہ انعام	800/-
96-نعت کی تنقیدی وتحقیقی جہات	(دبستانِ نعت سے انتخاب)	ڈاکٹر سراج احمد قادری	600/-
97-نعت کے تخلیقی زاویئے	(تنقید)	ریاض حسین چودھری	800/-
98-دُرجِ نعت	(تحقیق وتنقید)	ڈاکٹر راہی فدائی	800/-
99-بہارِ قبول	(تضمینِ سلام رضا)	حامد یزدانی	500/-
100-طلوعِ سحر (کلامِ عزیز احسن کا سرائیکی ترجمہ)		فرہاد فریدی	1000/-
Longion to Pay Homage -101	(Translation)	Dr. Aziz Ahsan	800/-
Hamd Literature -102	(Research)	Sabeeb Rehmani	350/-
Naat Perception -103	(Research)	Shaykh Abdul Aziz Dabbagh	400/-
104-اُردو میں نعتیہ قصیدہ نگاری	تحقیق وتنقید	ڈاکٹر نوید عاجز	1500/-
105-اردو نعت اٹھارویں صدی میں	تحقیق وتنقید	ڈاکٹر طاہرہ انعام	1200/-
106-دیوانِ کافی	تحقیق وتنقید	ڈاکٹر محمد آصف حسنین	1250/-
107-اُردو نعت میں تلمیحات	تحقیق وتنقید	خورشید ربانی	500/-
108-''معارف'' کے تقدیسی مطالعات	تحقیق وتنقید	غلام مصطفیٰ دائم	2500/-

□□□

سرورق: تصویر مزار شریف افغانستان